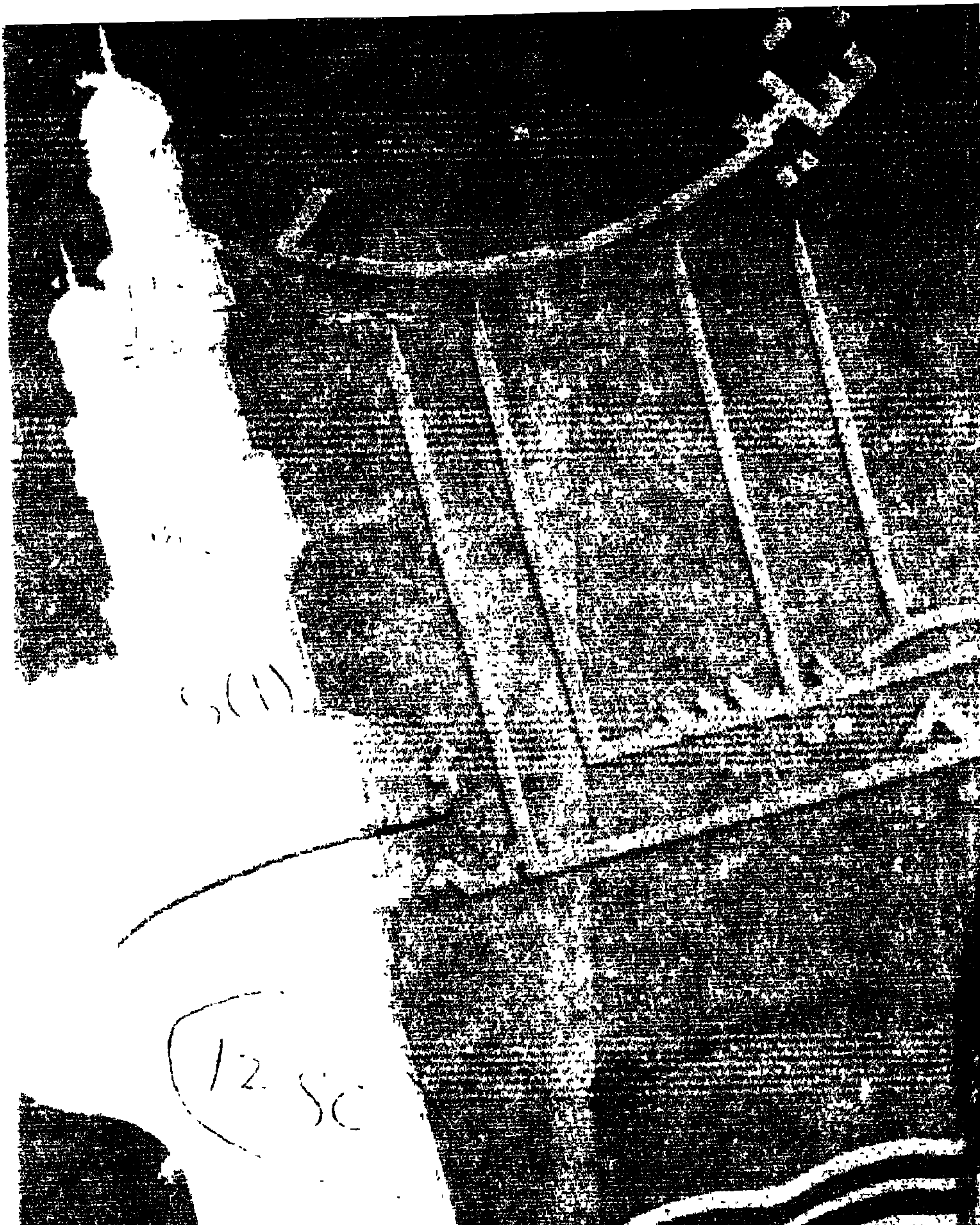
DUE DATE

Cl. No. *Acc. No.*

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.



سہ ماہی علمی رسالہ

حیدرآباد دکن

انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی ترجمان

مجلّہ طیلسانین

آٹھویں جلد۔ بہمن سنہ ۱۳۵۳ف ۔ جنوری سنہ ۱۹۴۴ء ۔ محرم سنہ ۱۳۶۳ھ پہلا شمارہ

مدیر:۔ محمد غوث ام۔ اے۔ ال ال بی (عثمانیہ)   مہتمم:۔ محمد عبد العلی بی ایس سی ال ال بی (عثمانیہ)

فہرست مضامین

صفحہ

حصۂ معاشیات

(مطبوعہ انتظامی پریس حیدرآباد دکن)

اداریہ

جامعۂ عثمانیہ کی برادری کے لئے یہ خبر موجب مسرت ہے کہ جناب محمد رحیم اللہ صاحب ام ایس سی (عثمانیہ) نے مدراس کی جامعہ سے "ڈی ایس سی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ برادر موصوف نے ..کمیات کے موضوع پر اپنی تلاش تحقیق کا جو سلسلہ جاری رکھا اس کا ایک ثمرہ یہ ہے کہ ہندوستان کی ایک وقیع جامعہ سے انہوں نے انتہائی علمی اعزاز حاصل کرلیا۔ توقع ہے کہ یہ علمی اعزاز آیندہ مسلسل علمی کامیابیوں کا پیش خیمہ اور ملک واہل ملک کی سودمندی کا موجب ہوگا۔

جامعۂ عثمانیہ کے دو اہم شعبوں کے صدروں کا تعلق جامعہ سے منقطع ہوگیا۔ جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب صدر شعبۂ فلسفہ نے اپنے وطن کشمیر کے خالصہ کالج کی صدارت پسند کی ہے اور جناب وحید الرحمٰن صاحب صدر شعبۂ طبیعات نے وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوشی حاصل کرلی اسی طرح جناب مولوی سید ابراہیم صاحب استاذ شعبۂ عربی نے بھی وظیفۂ حسن خدمت حاصل کرلیا۔ یہ تینوں اصحاب جامعہ کے سلسلۂ ملازمت میں اس وقت شامل ہوئے جب کہ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا تھا اور انٹرمیڈیٹ کے سال اوّل کی جماعت کا آغاز ہوا تھا۔ افتتاح کلیہ کی رسم بہت سادگی اور تکلفات کے بغیر عمل میں آئی تھی۔ اس وقت نو مامور اساتذہ کا اپنے علمی لباس میں ملکر بیٹھنا ہی صرف ایک ایسا منظر تھا جو بہت موثر اور دیکھنے والوں کے لئے سینکڑوں تمناؤں کا مبداء تھا۔

آج سے ۲۶ سال قبل جو اصحاب کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کے حلقۂ اساتذہ میں شامل ہوئے ان کی اکثریت اب برسر خدمت نہیں ہے۔ صرف جناب قاضی محمد حسین صاحب، جناب پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی اور جناب مولوی عبدالحمید خاں صاحب اُستاذ شعبۂ فارسی اور جناب پنڈت سبا راؤ صاحب صدر شعبۂ السنہ مقامی کے علاوہ باقی سب اساتذہ

یا تو رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے یا وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوگئے یا دوسرے سررشتوں میں منتقل ہوگئے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب اور جناب وحید الرحمن صاحب نے جامعہ کے حلقوں میں اپنے علحدہ علحدہ خصوصیات سے جو امتیاز حاصل کیا وہ اب جامعہ کی تاریخ کا جزو ہوچکا ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ گو انسان کی عمر بڑھتی جائے لیکن اس کا علم اور تجربہ مندرس نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے اگر جامعۂ عثمانیہ کے اساتذہ اپنی مدت ملازمت کے اختتام پر اپنے زمانۂ توانائی کے مرکز سرگرمی سے جسمانی طور پر دور ہوجائیں تو یہ ایک بڑا علمی نقصان ہے۔ یوں ہو تو پھر نئی نسل کو بزرگوں کے علم و تجربہ سے استفادہ کا کوئی موقع ہی نہیں حاصل رہیگا۔ بہرحال عثمانیہ برادری کی یہ مخلصانہ تمنا ہے کہ یہ دونوں بزرگ اپنے اپنے وطن میں اس آرام اور اطمینان قلب سے بہرہ اندوز ہوں جو فرض کے انجام پاجانے کے بعد میسّر ہوتا ہے۔

جناب مولوی سید ابراہیم صاحب عہد حاضر کے ایک بے بدل ادیب مانے جاتے ہیں، عربی ادب اور نعت پر ان کو جو عبور حاصل ہے وہ خداداد ہے۔ اہلِ حیدرآباد کو یہ اطمینان قلب حاصل ہے کہ گو قواعد و ضوابط کی رو سے اب جامعہ استاذ موصوف کے خدمات سے محروم ہے لیکن ان کے علم کا سرچشمہ اسی سرزمین میں اُبلتا رہیگا اور مدتوں علم کے پیاسے اس سے سیراب ہوتے رہینگے۔

جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کے بجائے شعبۂ فلسفہ کی صدارت پر جامعۂ کے ایک مایۂ ناز فرزند جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب مامور ہوئے ہیں۔ جامعۂ کی ربع صدی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک فرزند جامعۂ کو مستقل طور سے کسی شعبہ کی صدارت کا موقع حاصل ہوا۔ مبارک باشد و باشد مبارک۔ ڈاکٹر صاحب موصوف علم کے حقیقی جویا اور ان سب صفات سے متصف ہیں جو جامعہ کے شعبۂ فلسفہ کے صدر کے لئے ضروری ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ابتلا اور آزمائش کا ایک طویل دور کامل صبر اور استقامت کے ساتھ بسر کیا اور اب ایک حد تک تلافیٔ مافات ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب حیدرآباد کی نئی نسل کے رہبر اور انکو

خطرات سے بچانے کا سامان فراہم کر رہے ہیں جو اہل مشرق کی گزشتہ نسلوں ساری بطالت کا موجب ہوئے ہیں۔

جناب مولوی سید ابراہیم صاحب کی جگہ پر جامعہ کے ایک ہونہار اور سرگرم فرزند کا عمل میں آیا۔ جناب ڈاکٹر محمد عبدالمعید خاں صاحب نے جامعۂ عثمانیہ کے علاوہ خود مصر میں ادب کا مطالعہ کیا اور ممالک مغرب میں عصری طریق تحقیقات کا کافی تجربہ حاصل کیا۔ ں نے گزشتہ دو تین سال سے "اسلامک کلچر" جیسے معیاری مجلّہ کے نظم و نسق کو کامیابی عمدگی سے سنبھالا ہے۔ ان کی سرگرمی، شوق تحقیق اور فرض شناسی سے اہل ملک کو بہت کچھ توقع ہے۔

ترتیب مجلّہ

مجلّہ کا شروع سے یہ مقصد رہا ہے کہ اس کے صفحات پر فرزندان جامعہ کے ان مقالات کی اشاعت کا بھی انتظام عمل میں لایا جائے جو جامعہ کے تدریسی اغراض کے تحت مرتب ہوتے ہیں۔ انچہ اسی مقصد کے پیش نظر مجلّہ کے اس شمارہ میں جناب میر مخدوم علی خاں صاحب کا ایک سپ مقالہ شائع کیا جا رہا ہے۔

اس نوعیت کے کافی ضخیم مقالے اگر ایک ہی وقت میں شائع نہ کر دئیے جائیں تو ان کی ادیت میں کمی پیدا ہو جاتی ہے لیکن مجلّہ کے صفحات پر اس قدر ضخیم مقالوں کے ساتھ دوسرے تصر مقالوں کے لئے جگہ نکالنا دشوار ہے۔ آیندہ سے یہ امر پیش نظر ہے کہ مجلّہ کے کسی شمارہ میں ں نوعیت کے مقالے طبع ہوں اور کسی شمارہ میں دوسرے مختصر مقالے جو اہل علم و فن مرحمت فرمائیں۔

جناب مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب وظیفہ یاب صدر کلیہ جامعۂ عثمانیہ کے علم اور ربہ سے ملک کو جو فائدہ پہونچا اسکی سپاس گذاری اہل ملک کا فرض ہے۔ بہت کم لوگوں کو اس امر کا لم ہوگا کہ جناب ممدوح فارسی اور اردو میں شعر بھی کہتے ہیں۔ ابھی حال میں ممدوح نے اپنے فارسی لام کا ایک مختصر مجموعہ "مرقع سخن" کے نام سے شایع فرمایا ہے۔ کلام کا یہ مجموعہ پڑھنے والوں کے لوں میں نئی امنگ اور نیا ولولہ پیدا کرتا ہے۔ بعض شعر موصوف کی آپ بیتی اور بہت سبق آموز ہیں مثلاً۔

بے وفائی مردمان غرض　　مضطرب قلب و تنگ کامم کرد
آن کہ آموخت کیمیا از من　　عاقبت زہر در دہانم کرد

مندرجہ ذیل شعر بھی حقیقت حال کا اظہار کرتے ہیں۔

روان شد زمن در دکن جوئے علم　　بتوفیق یزدان و تدبیر و حلم
برادرنگ تمکیں و عز و وقار　　شد از سعی من جامعہ برقرار

بہ میدان حکمت بر اوج کمال　　ز من جامعہ یافت جاہ وجلال
در افواہ عالم ز تعلیم من　　فتادہ است صوت سیاق دکن
بسی رنج بردم دریں سال سی　　دکن زندہ کردم بدیں پارسی

اردو میں ممدوح نے جو شعر کہے وہ عام طور سے نامعلوم ہیں۔ البتہ ابھی ابھی ایک نظم "ہندوستان ہمارا" کے موضوع پر ہمیں رحمت ہوئی۔ اس نظم کو تبرکاً اشاعت میں شایع کیا جارہا ہے۔ مجلّہ کے صفحات کی زینت ایسی ہی نظموں سے بڑھ سکتی ہے۔ اُمید کہ یہ نظم ہندوستان کے طول و عرض میں بچوں اور بڑوں میں مسرت اور خوشی کے جذبات پیدا کرنے کی محرک ہوگی۔

فکر و نظر

اردو زبان کی کتابوں کی طباعت کے سلسلہ میں ابھی لیتھو اور اس کے ساتھ خوش نویسی سے استغنا نہیں ہوگیا لیکن حیدرآباد میں اچھے کاتب اور اچھے سنگ ساز کا گویا کال ہے۔ صدی پون صدی قبل کی حیدرآباد و مدراس میں چھپی ہوئی کتابوں کا مقابلہ موجودہ زمانہ کی مطبوعہ کتابوں سے کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔ یوں اِن دنوں خود دہلی اور لاہور میں کتابت اور طباعت کا جو معیار ہے حیدرآباد اس کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ نہ معلوم اِن امور پر ارباب طباعت کبھی غور بھی کرتے ہیں یا نہیں۔ حیدرآباد کے اہل مطابع نے اپنی ایک انجمن قائم کی ہے۔ یہ امر بہت ہی خوش آیند ہے۔ غالباً اس کا قیام کاغذ کے حصول کے لیئے ہوا تھا۔ اگر یہی اس غرض میں انجمن نے کامیابی حاصل کرلی ہے تو اب اس انجمن کا پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ حیدرآباد کے مطابع میں کتابت اور طباعت کے معیار کو

از طیبا ساتین

ہانے کی کوشش وسعی عمل میں لائے۔ اس کے بغیر حیدرآباد اچھی اردو دیدہ زیب
ابت اور طباعت کا مرکز نہ قرار پا سکیگا۔ حالانکہ یہاں اردو جامعہ قائم ہو وہاں کی
ردو کتابت اور طباعت بھی سب کے لئے معیاری قرار پانا چاہیئے۔

نہ معلوم مدارس صنعت وحرفت کے پروگرام میں فن طباعت کی تربیت شامل ہے یا
ہیں۔ اگر نہیں ہے تو یہ کام بھی انجمن مطابع کے پیش نظر رہنا چاہیئے کہ وہ اس فن کے لئے کوئی
ربیت گاہ قائم کرے یا کم از کم امتحانات کا کوئی سلسلہ جاری کرے۔

اسی طرح خوش نویسی کی ترقی اور اس پیشے کو پسندیدہ بنانے کے لئے اہل مطابع کی
نجمن کو بھی توجہ کرنی چاہیئے۔ ہمارے ملک میں پچیس تیس سال سے ٹرائپنگ کو جو اہمیت حاصل ہوگئی
ہے وہ تعجب خیز ہے۔ اگر وہی توجہ یا کم از کم تھوڑی بہت توجہ بھی خوش نویسی کی جانب مائل
ہوتی تو آج حیدرآباد میں کتابت اردو ٹائپ نویسی کا معیار اس قدر پست نہیں ہوتا۔ اگر ٹائپنگ پر
اس لئے توجہ مائل ہے کہ اس سے روزگار حاصل ہو سکتا ہے تو خوش نویسی سے بھی روزگار حاصل ہو سکتا
ہے۔ نہ معلوم مرکزی مدرسہ فنون لطیفہ میں بھی خوش نویسی کو بار ملا ہے یا نہیں۔ خوش نویسی کے
فن لطیف ہونے اور اسکے دیدہ و دل کے لئے مسرت و انبساط کا سامان مہیا کرنے کی قابلیت سے
کون انکار کر سکتا ہے۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں اس مسئلہ پر اس وقت سے
توجہ دلائی جارہی ہے جب کہ عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر صدرالمہام تعلیمات ایک
وقت منصرم ناظم تعلیمات ہوئے تھے۔ کانفرنس کے اجلاس میں خوش نویسی پر توجہ کے لئے
سب سے پہلے جو تحریک پیش ہوئی تھی وہ جناب نواب صاحب ممدوح نے ہی پیش فرمائی تھی۔
اسکے بعد ترقی و اصلاح کے کتنے مدارج طے ہوگئے لیکن خوش نویسی اب بھی محروم التفات ہے۔
بہرحال جب تک لیتھو کی طباعت کا رواج ہے ضروری ہے کہ خوش نویسی کا فن بھی توجہ کا
مستحق قرار پائے۔

---

* ہندوستان میں ملک و قوم کی ترقی کے لئے ان دنوں قوم کے صاحبان ثروت کی جو توجہ مائل ہے

وہ امید کی کرن کے مصداق ہے۔ آئے دن خبریں آتی رہتی ہیں کہ خاص خاص مقاصد کے تحت کسی ذی ہمت اور صاحب عزم فرد نے کوئی وقف قائم کیا ہے۔ ایسی کئی مثالیں بیان کی جاسکتی ہیں مثلاً ناگپور کی جامعہ کو لکشمی نارائن وقف کے چالیس لاکھ روپے کا سرمایہ حاصل ہے۔ بمبئی کی جامعہ میں کیمکل ٹکنالوجی کا شعبہ ۲۵ لاکھ روپے کے سرمایہ سے قائم ہوسکا۔ یہ سارا سرمایہ سروی، چندراوارکر نے مستطیع افراد سے حاصل کیا۔ لیڈی ٹاٹا کے یادگاری وقف سے جو بیش قرار وظائف سائنٹفک ریسرچ کے لئے دئیے جاتے ہیں اسکے اشتہارات خود ہماری جامعہ میں بھی نظر آجاتے ہیں۔ چنانچہ ابھی حال میں ۶ وظائف کے لئے درخواستیں طلب کی گئی تھیں۔ ہر وظیفہ ایک سو پچاس روپے ماہانہ پر مشتمل ہے۔ مدراس سے بھی ۱۵ فروری کو یہ خبر آئی تھی کہ ڈاکٹر کیول رام نے مدراس کی جامعہ کو تین لاکھ روپے کا عطیہ دیا ہے تاکہ کومتور کے ٹکنالوجیکل کالج کی توسیع و ترقی عمل میں لائی جائے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کو مسلمانوں میں تعلیم کی ترقی کیلئے ٹاٹا کی جانب سے پچاس ہزار روپے کا عطیہ ملا۔ ان سب سے بڑھکر حال حال میں سرکاوس جی جہانگیر کی فیاضی کا علم ہوا۔ ۲ فروری کو بمبئی سے یہ خبر آئی کہ :-

> "سرکاؤس جی جہانگیر نے بیس لاکھ روپے کا ایک وقف قائم کردیا ہے اس کی آمدنی خیراتی کاموں پر اور فلاح عامہ کے لئے استعمال کی جائے گی۔ وقف نامہ میں کہا گیا ہے کہ سرکاؤس جی جہانگیر کے انتقال کے بعد متولی اس سرمایہ کو محض پارسی فرقہ کے فلاح کے لئے استعمال کرسکینگے۔"

ہندوستان کے مختلف کلیات کے ماہ ناموں اور سال ناموں سے بھی اسی نوعیت کی فیاضیوں کا علم ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس وقت پونا کے فرگوسن کالج کا حالیہ سال نامہ پیش نظر ہے۔ اس سے مختلف سیر چشم صاحبان ہمت کی فیاضیوں کا حال واضح ہوتا ہے۔ بمبئی کے علاقہ میں کیمیکل ٹکنالوجی کی ترقی کے لئے ان دنوں بڑی سرگرمی ہے۔ بمبئی کی جامعہ کے کیمکل ٹکنالوجی کے شعبہ کے تحت رنگ اور وارنش کے ایک نئے شعبہ کے قیام کے لئے بی، جی دلال اور

اور پی، کے کوٹاوالا نے ایک لاکھ روپے کا عطیہ دیا ہے۔ اس مقصد کے تحت سر ہومی مہتا نے سات لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ پونا میں قومی کیمیائی تجربہ خانہ کے قیام کے لئے ٹاٹا نے تیس لاکھ تیس ہزار روپے کا عطیہ دیا۔

دکن ایجوکیشن سوسائٹی پونا کو تجارتی کالج قائم کرنے کے لئے بری ہان مہاراشٹرا شگر سنڈی کیٹ نے دو لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ چنانچہ کالج کو "بری ہان مہاراشٹرا کالج آف کامرس" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

دکن ایجوکیشن سوسائٹی پونا کو ۱۷ر جنوری ۱۹۴۳ء سے ۲۲ر نومبر ۱۹۴۳ء کے دوران میں پچاس ہزار روپے سے زیادہ عطیات وصول ہوئے۔ ان عطیوں میں سب سے بڑا عطیہ دس ہزار روپے کا آر بی جوگل کر کی جانب سے وصول ہوا۔ باقی عطیات تین روپے سے پانچ ہزار روپے تک ہیں۔

باہر کی ان فیاضیوں کا حال پڑھ پڑھ کر حسرت ہوتی ہے کہ کب ہمارے عزیز وطن کے سرمایہ دار اس قسم کے کار ہائے خیر کی جانب متوجہ ہونگے۔ ہماری جامعہ کو ملک کے صاحبان ثروت نے کس مقدار کے عطیے دیئے ہیں؟ ہماری جامعہ کا کونسا شعبہ کس فیاض انسان کی دریا دلی کا مرہون منت ہے؟ ہماری جامعہ میں کتنے وظائف ملک کے ارباب خیر کی جانب سے دیئے جاتے ہیں؟ کیا ایک وظیفہ بھی ماہانہ ۱۵ روپے کا ہماری جامعہ میں کسی کو ملتا ہے؟ ان سب سوال کا جواب سوا شرمندگی اور ندامت کے کیا ہے۔ ملک میں کتنے ادارے ہیں جو امرا، جاگیرداروں، ساہوکاروں اور کارخانہ داروں اور وکلا یا ڈاکٹروں کی سیر چشمی کی یادگار ہوں؟ مدرسہ آصفیہ، محبوب کالج سکندرآباد، مفید الانام ہائی اسکول، مدرسہ انوار العلوم نامپلی، ویویک وردھنی ہائی اسکول، کیشو میموریل اسکول، نوتن ودیالیہ گلبرگہ و مومن آباد، جامعۂ نظامیہ کیا ان سب اداروں میں سے کوئی ایک بھی مزید سرمایہ سے مستغنی ہو چکا ہے؟ ملک کے دو تین یتیم خانے کیا کسی مستقل سرمایہ کے حامل ہیں؟ ملک کے دوسرے تعلیمی ادارے کس حال میں ہیں؟ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کو اسکی تیس برس کی زندگی میں بس تیس ہزار روپے ہی سرمایۂ مستقل کے طور پر حاصل ہوسکے۔ ملک کا

کونسا اخبار، کونسا رسالہ، کونسا مجلہ کسی بڑے سرمایہ دار کی سرپرستی میں خالص علمی اور سماجی
خدمت کے جذبہ کے تحت جاری ہے۔ حقیقت یہ ہے ہمارے ملک کا ہر قومی ادارہ فاقہ زدہ ہے۔
لیکن اس تاریکی میں امید کی کوئی کرن کبھی کبھی نظر آ ہی جاتی ہے۔ خان بہادر محمد علاء الدین
نواب احمد نواز جنگ بہادر کی ہمدردی اور ان کا جذبۂ فیاضی اہل ملک کی لاج رکھ لیتا ہے۔
مختلف مواقع پر نواب صاحب موصوف نے رفاہی و تعلیمی اغراض کے لئے اب تک دس لاکھ روپیہ
صرف کئے ہیں۔ ابھی چند ماہ قبل نواب صاحب نے اپنی فرم کی ڈائمنڈ جوبلی کے یادگار کے طور پر
نیز اپنی ۸۵ ویں سالگرہ کے موقع پر بیواؤں، نادار، ملت عرب کے لئے ایک اقامت خانہ اور غریب
طلبہ کے لئے تعلیمی مقاصد کے پیش نظر ایک لاکھ روپے کے عطیے کا اعلان کیا۔

اسکے علاوہ گزشتہ دس پندرہ مہینوں کی بابت جو اہم عطایا کا علم ہو سکا وہ یہ ہیں۔

۱۔ عثمان شاہی اور اعظم جاہی کارخانوں نے مستقل تحقیقاتی مجلس حیدرآباد کی تحقیقی اغراض کے لئے
ایک لاکھ روپے کا مستقل وقف قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

۲۔ نوجوانان ملک کی اصلاح اخلاق و اعمال کے لئے نواب سر نظامت جنگ بہادر نے
انجمن علم و عمل کے لئے پانچ ہزار روپیے کا وقف قائم کیا۔

۳۔ عثمان شاہی کارخانے نے دس ہزار روپے مقامی رفاہی امور میں صرف کرنے کا اعلان کیا۔

۴۔ اعظم جاہی کارخانے نے بھی مقامی ضروریات کے لئے ۱۶ ہزار روپے صرف کرنے کا اعلان کیا۔

ان کے علاوہ کسی اور بڑے عطیہ کا حال معلوم نہیں۔ مجلس نمائش حیدرآباد دکن کو
سو پچاس روپے کے۔ پانچ دس عطیے اس غرض سے ملے کہ صناعوں کو تمغے دئیے جائیں۔ اس
ادارہ کا سارا دارومدار دو دو آنے کے گویا اس عطیہ پر ہے جو نمائش میں آنے والے
ٹکٹ داخلہ کے طور پر ادا کرتے ہیں۔ تو کیا ملک کی ترقی و خوشحالی میں غریبوں کا ہی حصہ
ہوگا؟ سرمایہ دار افراد کیا صرف اپنے حقوق کے لئے ہی چیخ پکار میں مصروف رہینگے؟ اہل
ملک اپنے خواب گراں سے جلد بیدار ہوں۔ ورنہ آنکھ کھلتے کھلتے دیر ہو جائے تو "چڑیاں

چک گئیں کھیت " کا مصداق ہوگا۔

ان چھوٹے موٹے عطیات سے قطع نظر اہل ملک کو شرمسار کرنے کے لئے اس زمانہ میں ایک ہستی میدان میں آئی ہے۔ محترم معاصر پیام (۲۲ فروری ۱۹۵۵ء) کا بیان ہے کہ :۔

"معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر حامد علی صاحب سابق کمشنر صفائی نے بارہ لاکھ کا ذاتی سرمایہ اپنی ذات کے لئے ایک پیسہ محفوظ کئے بغیر اپنی قوم کے طالبات وطلبہ کی طبی، صنعتی اور فنی تعلیم کے لئے وقف فرمادیا ہے۔ اور حکومت کے حوالہ کردیا ہے۔ اس سرمایہ کی نصف آمدنی صرف حیدرآبادی طلبہ وطالبات کی تعلیم کے لئے محفوظ کی گئی ہے۔"

ہمارے ملک کے ذرائع نشر و اشاعت کی باخبری پر رشک آتا ہے کہ سیر چشمی فیاضی اور ایثار کی اس صحیح اور حقیقی مثال کی ان کے پاس کوئی اہمیت نہیں۔ ملک میں اور ملک کے باہر عام طور سے اس فیاضی کا کوئی علم کسی کو نہیں ہے۔ یہ بھی ہماری مردنی اور بے حسی کی علامت ہے۔ خطاب یابی اور کسی عہدہ پر ترقی یا یوں ہی کسی معمولی ترقی اور ایثار وغیرہ پر ہمارے ملک کے اخبارات، ہمارے ملک کے قومی ادارے اور ہمارے ملک کے رہبر و قائد مبارکباد کے گیت پر گیت گانے لگتے ہیں۔ عام جلسے ہوتے، عصرانے منائے جاتے اور پھول پر پھول پہنائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب مثالِ ایثار، یہ عدیم النظیر فیاضی کسی مبارکباد کی مستحق نہیں۔ کسی جلسۂ شکریہ کی مستحق نہیں اور کسی گل پوشی کی مستحق نہیں!!

دنیا ہمہ بیدار و تو در خواب گراں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

ہندوستاں ہمارا

از جناب مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب ضمیرؔ۔ صدر وظیفہ یاب جامعۂ عثمانیہ

زیر سما رہے جنت ہندوستاں ہمارا
سب سے قدیم تر ہے نام و نشاں ہمارا

تہذیب یاں سے پھیلی چاروں طرف جہاں میں
ہے زیر بار احساں سارا جہاں ہمارا

شعر و سخن کے جوہر ہر وقت یاں سے نکلے
حاوی تھا ہر زباں پر علم اللساں ہمارا

یونان شعر و ریاضی ہم سے سبق ہیں سیکھے
نظم و نسق میں روما اک ترجماں ہمارا

جاپان و چین نے ہم سے حاصل کیا تمدن
علم و ہنر ہے ان کا عکس رواں ہمارا

ہیئت کی سب سے پہلی منزل یہیں ہوئی طے
تھا ہندسہ کا بانی پہلا مکاں ہمارا

طب اور حساب سیکھا دنیا نے سب یہیں سے
اب تک بھی سارا عالم ہے مدح خواں ہمارا

تیر و شکار تھے ملک فاتح کے ساتھ مفتوح
گویا کہ ایک ہی تھا سب خانداں ہمارا

ہم نے کبھی کی حکومت ہندوستاں کے باہر
برتاؤ ایک ہی تھا ستر و عیاں ہمارا

انسانیت کا آغاز اس ملک سے ہوا ہے
مسکین کا اشک شو تھا پیر و جواں ہمارا

توحید خالق انساں سیکھا عرب سے آخر
وقف تھا پھر بھی اس سے ویدک زماں ہمارا

وحشت مجاز کی سے مغرب رہا تھا مست
مشرق کا رہنما تھا یہ خاکداں ہمارا

زندوں پہ مہر و شفقت مردوں کی قدر و عظمت
گوتم کا فلسفہ تھا جادو بیاں ہمارا

دنیا کی ناشناسی انساں کی بے بساطی
تھا اعتقاد ان پر جوں جزو جاں ہمارا

بیگانہ و یگانہ دونوں کو ایک مانا
دشمن کو بھی یہ جانا ہے میہماں ہمارا

ظلم و ستم کو ہم نے ہر وقت پاپ سمجھا
رحم اور کرم کا گھر تھا جنت نشاں ہمارا

عالم فریفتہ تھا حسن و ادا پہ ہندی
مہر و وفا ہی مسلک تھا جاوداں ہمارا

ہندوستاں کی بیٹی تھی آبرو کی دیوی
قسمت نے رو دیا ہے کر امتحاں ہمارا

جب سے وطن بنایا غزنی ہوں یا کہ عجمی
کہتے ہیں صدق دل سے "ہندوستاں ہمارا"

یارب یہی دعا ہے سب کی ضمیرؔ کے ساتھ
رکھ قائم اور دائم دارالاماں ہمارا

عہد معاونت ۱۷۹۸ء اور حیدرآباد

از

میر مخدوم علی خاں یم۔ اے (عثمانیہ)

فہرست مضامین

تعارف

انجمن طیلسانیین عثمانیہ کے ترجمان مجلہ طیلسانیین کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتوں اور بالخصوص طیلسانیین کے علمی کارناموں کو منظر عام پر لایا جائے۔ اور اس طرح اردو زبان کی خدمت بھی کی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے فی الحال ان مقالوں کے شائع کرنے کا سلسلہ قائم کیا گیا ہے جو جامعہ عثمانیہ کے مابعد طیلسانی طلبہ ایم۔اے اور ایم ایس سی کے امتحانوں کے لئے تحریر کرتے ہیں اور جن کو خود جامعہ عثمانیہ اور بیرونی جامعات کے اساتذہ قدر کی نظر سے دیکھ کر منظور کرتے ہیں۔

توقع ہے کہ ان مقالوں کی اشاعت سے حقیقی معنوں میں علم و ادب کی خدمت انجام پائیگی۔ اب تک چھ مقالے مجلہ سے شائع ہوئے اور اب یہ ساتواں مقالہ ہے۔ امید ہے کہ یہ مقالہ بھی موضوع کے متعلق معلومات میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

اس مقالہ کے مولف نواب میر مخدوم علی خان صاحب ہیں۔ ۱۳۴۲ف میں موصوف نے جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے کا امتحان کامیاب کیا فقط

محمد غوث

مدیر مجلہ طیلسانیین

عہد معاونت اور حیدرآباد

باب اوّل

ویلزلی کی آمد کے وقت ہندوستان کی سیاسی حالت۔

مقبوضات برطانیہ ، ہندوستانی سلطنتوں سے باہمی تعلق ، ورود۔

ابتداء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو بذریعہ منشور محض تجارت کرنے اور بہ زور شمشیر اپنے مال کی حفاظت کرنے کا اختیار اور حق عطا کیا گیا تھا۔ لیکن چند ہی سال کی مدت میں وہ اپنے گماشتوں اور کارندوں کی جد و جہد اور اولوالعزمی ، دیگر اقوام کی حریفانہ سرگرمی اور دیسی حکام کی کمزوری اور ریاکاری کی بدولت بہت جلد ہندوستان میں شاہی اختیارات کی مالک بن بیٹھی گویا یہ اونے کارخانوں کے نظما ابھی اپنی تجارتی حیثیت ختم نہ کرنے پائے تھے کہ حقیقی معنوں میں خود مختار بادشاہوں کی طرح وسیع سلطنتوں پر حکومت کرنے لگے۔

اس وقت کے ہندوستانی رؤساء کی اعانت سے تنفر کرنا ان تاجروں کے لئے نہ صرف ناممکن تھا بلکہ بسا اوقات خود ان کی حفاظت کے لئے بھی سخت ضرورت تھا۔ ان کے برعکس وہ دیتے تھے نہ صرف ان کے حقوق و مراعات میں اضافہ ہوتا تھا بلکہ کمپنی کے لئے بھی نفع بخش اور وسیع تجارت کا باعث تھا۔ اس طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں کو ابتداء میں اپنا وجود مستحکم کرنے اور اپنے تجارتی کاروبار کو بڑھانے کے خیال سے سیاسی تعلقات قائم کرنے پڑے۔

مدراس

۱۶۲۵ء میں مائل کارومنڈل پر آئے۔ اور اس کے بعد مدراس سے جنوب کی طرف کے ساحل پر جو دو

آرامگاہوں میں سب سے پہلے جاگزیں ہوئے۔ اور اپنی قلمرو قائم کی۔ سات برس کے بعد انہوں نے راجۂ بسنگر سے ایک چھوٹے سے رقبۂ اراضی کا قول حاصل کیا۔ یہ مقام چناپٹم کہلایا جاتا تھا۔ اس کا نام انہوں نے مدراس رکھا۔ یہاں ایک قلعہ بنا کر اس کو قلعۂ سینٹ جارج کے نام سے موسوم کیا اور اس کے اندر انہوں نے اپنے تجارتی کوٹھوں کو محصور کرلیا۔

سنہ ۱۶۵۳ء میں کمپنی نے جس کا صدر مقام لندن تھا، مدراس کی ایجنسی کو پریسیڈنسی کا رتبہ عطا کیا۔ سترھویں صدی کے اواخر میں یہاں کی آبادی تین لاکھ تھی۔

سنہ ۱۷۰۰ء میں مدراس تین حصوں میں منقسم تھا۔ سفید شہر وہ حصہ تھا جس میں یوروپی اقوام اور خاص کر انگریز مقیم تھے۔ یہاں پر پچاس گھر، دو کلیسا جن میں ایک رومن کیتھولک اور صدر کارخانہ کا مکان تھا۔ یہ سب چیزیں اس احاطہ کے اندر تھیں جو قلعہ سینٹ جارج کہلایا جاتا تھا۔ اس شاندار نام کے مقام کی حفاظت ایک کمزور دیوار کرتی تھی جس کی حفاظت چار فوجی دستے اور چار توپ خانے کرتے تھے اور جن کی حفاظت کے لئے کسی بیرونی مدافعت کا انتظام نہیں تھا۔ یہ حصہ "سفید شہر" کہلایا جاتا تھا۔ اس کے شمال میں "کالا شہر" آباد تھا۔ جس میں خاص کر آرمنی اور ہندوستانی تاجر رہا کرتے تھے۔ اس کے شمال میں وہ حصہ تھا جہاں غریب مدراسی رہا کرتے تھے۔ ان تینوں حصوں پر مدراس کا نام مستعمل تھا اگرچہ جنوب میں "سفید شہر" سے ایک میل کے فاصلہ پر اور دو بڑے شہر موجود تھے جن میں تمام تر ہندوستانی رہتے تھے لیکن ان کا شمار مدراس میں نہیں کیا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں ان انگریزوں کی تعداد جو یہاں مقیم تھے صرف تین سو تھی جس میں دو سو سپاہی تھے لیکن ان میں سے صرف چند ہی سپاہی گری سے واقف تھے۔

مدراس انگریزوں کا صرف تجارتی مرکز تھا۔ ابتدا میں یہاں کے ارباب کار کو اس بات کا مطلق خیال نہ تھا کہ اپنے آپ کو یہاں کے دیسی رؤسا کے جھگڑوں میں شریک کریں۔ ان کا خیال ان جھگڑوں سے علیحدہ رہنے کا تھا تاکہ امن و امان حاصل رہے۔ وہ اس بات پر رضامند تھے کہ جو شخص ان جگہوں کا والی یا بادشاہ ہو، اس کو اپنا آقا سمجھیں اور اس امن و حفاظت کے لئے جو اس کی

حکومت کے تحت حاصل ہو وہ ہر معاوضہ دینے پر مستعد تھے، یہ ہے اُس قلمرو کی مختصر حالت جو سب سے پہلے انگریزوں نے تجارت کیلئے ہندوستان میں قائم کی۔ اس سے صاف صاف ان کے تجارتی مسلک اور صلح کل مشرب کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان میں تجارتی نقطۂ نظر سے آئے تھے چنانچہ اُن کو تجارتی فروغ کے خیال کے ساتھ اس بات کا بھی ضرور خیال تھا کہ ملک کے ایسے جھگڑوں میں حصہ نہ لیا جائے جس سے اُن کو اپنی تجارت میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ لیکن مقسوم ازل نے انکی قسمت میں ہندوستان کی شہنشاہی لکھی تھی اور یہ غیر ممکن تھا کہ وہ اس سے کنارہ کش رہتے۔ لہذا آخر کار ان کو بہ تحفظ مفاد ملک کے سیاسی جھگڑوں میں حصہ لینا پڑا۔ بالآخر یہ نتیجہ نکلا کہ وہ ہندوستان کے مالک بن بیٹھے۔

بمبئی

چارلس ثانی نے اپنے دور کے بیسویں سال جزیرہ بمبئی ایسٹ انڈیا کمپنی کو بطور عطیہ دیدیا۔ پانچ سال بعد جزیرہ سینٹ ہیلینا بھی اُسے عطا کردیا اور جس شوق سے یہ قابل قدر عطیے دئے گئے تھے اُسی شوق سے حکومت نے کمپنی کو فروغ اور اس کے مفاد کو ترقی دینے میں پوری مدد دی۔

اس بہت افزائی اور حمایت اور خود کمپنی کی عملی جدوجہد کی بدولت اس کے سرمایہ دار مالامال ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی پر ہر طرف سے حملے شروع ہو گئے لیکن ساتھ ہی ساتھ اُسے مدافعت کے معقول ذرائع بھی حاصل ہو گئے تھے۔ چارلس ثانی نے اپنے اٹھائیسویں سال بذریعہ قانون مراعات میں اضافہ بھی کردیا۔ جیمس ثانی نے بھی اپنی تخت نشینی کے بعد کمپنی کے حقوق میں مزید اضافہ کیا اور اُسے بہت کچھ حکومتی اختیارات عطا کردیئے۔ کمپنی کو قلعہ بنانے، فوج تیار کرنے، بذریعہ کورٹ مارشل مقدمات فیصل کرنے اور سکہ ڈھالنے کا اختیار دیا گیا۔ اس طرح ان مراعات کی بدولت کمپنی کو ایک خاص قسم کی طاقت و قوت حاصل ہو گئی لیکن کمپنی کے کارندوں نے رشوت ستانی اور جور و ستم و تشدد کے متعدد افعال سے اپنے اختیارات کی تذلیل بھی کی۔

کلکتہ

بنگال میں انگریزوں کا کارخانہ قائم ہونے کا باعث ایک واقعہ ہوا جس کے بعد اُن کی تمام ترقی اور خوش حالی کا یہ کارخانہ موجب بن گیا۔ کمپنی اپنی طاقت و عظمت کے اس آغاز کے لئے ایک طبیب کی مہارت فن کی مرہون منت ہے۔

یہ شخص جس کا نام برٹن (BOUGHTON) تھا سورت سے آگرہ روانہ ہوا اور وہاں خوش قسمتی سے شہنشاہ شاہ جہاں کی صاحبزادی جہاں آرا بیگم کے علاج کا موقع حاصل ہوا۔ جہاں آرا بیگم کا چہرہ اس وقت چراغ کی لَو سے جھلس گیا تھا اور اس کی وجہ سے سخت علیل تھیں۔ انگریز طبیب کے علاج سے کامل شفا حاصل ہوئی۔ اس کے عوض میں دیگر انعامات کے ساتھ اسے بلا ادائی محصول تجارت کرنے کا حق بھی عطا ہوا۔ یہاں سے وہ بنگال روانہ ہوا۔ اور اپنی قابلیت سے وہاں کے نواب کی بھی خوشنودی حاصل کرلی۔ شہنشاہ نے تو یہ رعایت صرف اس کی ذات کیلئے مخصوص کی تھی لیکن نواب بنگال نے یہ رعایت اس کی کل قوم کیلئے عام کردی۔ ۱۶۳۶ء میں کمپنی کے ملازموں نے جو سورت میں مقیم تھے ہگلی میں بھی اپنا ایک کارخانہ قائم کرلیا۔ یہ مقام دریائے گنگا کی ایک شاخ کے دہانے سے جو اسی شہر کے نام سے موسوم ہے تقریباً سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

اگرچہ اس واقعہ سے تجارت کیلئے جدید اور نفع بخش راستہ کھل گیا تاہم کمپنی کی حالت جو مائل بہ زوال تھی اس سے بھی نہ بدل سکی اور انگلستان کی خانہ جنگی کے زمانہ میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس جماعت کا بہ حیثیت ایک کمپنی کے قریب قریب خاتمہ ہوگیا ہے۔

الغرض ان تینوں مقاموں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدائی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ کمپنی کے متعلق ایک گمنام اور قابل مصنف نے خوب کہا ہے کہ "ایک فرد واحد کو اگر غیر محدود اختیارات حاصل ہوں تو اسے ذلت و رسوائی اور ذاتی خطرات کا خوف دلا کر ظلم و ستم سے باز رکھا جاسکتا ہے، لیکن ایک برسر اقتدار جماعت پر اس قسم کے کسی خوف کا شاید ہی کبھی کچھ اثر ہوتا ہو کیونکہ جس طرح ان کے بہترین کاموں سے انفرادی طور پر انہیں بہت کم تحسین حاصل ہوتی ہے اسی طرح جو بدترین کام ان سے

سرزد ہوتے ہیں ان کی بدنامی کا بھی ان کی ذات پر بہت تھوڑا اثر ہوتا ہے، چوں کہ انہیں نیکی کی کوئی معقول ترغیب نہیں ہوتی، اسلئے وہ اکثر اوقات بدترین خواہشات نفسانی کے غلبہ سے بدی کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ عام جماعتوں کے فیصلوں میں کبھی کبھی ایسے تکلیف دہ ظلم کی جھلک آجاتی ہے کہ جو ناقابل علاج اور ساتھ ہی ساتھ ناقابل انتقام بھی ہوتی ہے۔ ان تمام باتوں کا اطلاق بغیر کسی ناانصافی کے ہندوستانی کمپنی کے تمام اندرونی و بیرونی کاموں پر کیا جاسکتا ہے۔ حرص جو انسانی جبلت کا بدترین جذبہ ہے وہ تجارت کا پہلا اصول ہے اور اسی لحاظ سے وہ مالکان کمپنی کے باہمی اتحاد کی اصل بنا قرار پائی۔ انسانیت و انصاف جتنے کے اصول و حکمت عملی بھی نفع کی توقع یا اس کی محبت پر نثار کر دیئے جاتے تھے'

یہی مصنف مذکورہ بالا بیان میں اتنا اور اضافہ کرتا ہے کہ:-

"فیاضی کا اصول تو ہر با اختیار تجارتی جماعت کے دستور سے خارج ہی ہوتا ہے لیکن دور دراز فاصلہ پر کاروبار کرنے کے باعث کمپنی اپنے طرز عمل کی جانچ پڑتال سے بھی محفوظ تھی لہذا بلا کسی دباؤ کے من مانے طریقے پر طاقت و قوت استعمال کرنے کے معتدبہ مواقع حاصل تھے۔ یہی وجہ ہے جب کبھی اُن کے نادری احکام میں کوئی رکاوٹ پیدا کی جاتی خواہ اُن کے ملازمین کی طرف سے ہو یا ملک کے دیسی باشندوں کی طرف سے وہ بغاوت و بے وفائی پر محمول کی جاتی تھی اور سخت ترین سزائیں دیجاتی تھیں۔ وطن میں جو لوگ حکمران تھے وہ اپنے اپنے آدمی ہندوستان بھیج رکھے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے طرز عمل کا انحصار اکثر و بیشتر محض ذاتی شکایات اور خود غرضانہ خیالات پر منحصر ہو گیا اور حکومت میں بجز اس کے کوئی اور اصول اتحاد نہ رہا کہ ان میں سے ہر ایک انصاف کا خون کرنے کا مجاز تھا جتنا کہ اجارے کی خاص رعایت بھی جو ان کی تجارت کے فروغ کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی اُن کے ہاتھوں میں ہر ایک ایسے شخص کے خلاف جسے وہ مخل انداز تصور کرتے تھے ظلم کا ایک آلہ بن گئی، ان کے وحشیانہ مظالم کی ایسی مثالیں تائیدی واقعات کے ساتھ پیش کی جاسکتی ہیں جنہیں پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے"۔[۵۱]

۵۱۔ میلکم۔ جلد اول صفحہ ۱۹-۲۰۔

پہلے پہلے انگریزوں کی تین کمپنیاں قائم ہوئیں تھیں۔ پرانی ایسٹ انڈیا کمپنی نئی ایسٹ انڈیا کمپنی اور خانگی کمپنیاں۔ مندرجۂ بالا خرابیوں اور باہمی کش مکش کو ملک کے مفاد کی تحت دور کرنے کے لئے ان تینوں کو "امپیریل ایسٹ انڈیا کمپنی" کے نام کے تحت ایک کر دیا گیا۔

۱۷۴۸ء میں شہنشاہ محمد شاہ اور نظام الملک شہریار دکن کا انتقال ہوا جس کے بعد ہندوستان میں طوائف الملوکی پھیلی۔ اس وقت دکن ایک میدان کارزار تھا ۱۷۴۰ء سے ۱۷۶۳ء تک دہلی کی کمزور بادشاہت کے دوران میں حیدر آباد نے خودمختاری حاصل کر لی تھی۔ (۱۷۲۴ء)

ارکاٹ اور حیدر آباد میں وراثت کے جھگڑے جو کرناٹک کی لڑائیوں سے موسوم ہیں شروع ہوئے ان میں مظفر جنگ، چندا صاحب اور فرانسیسی لوگ بسر کردگی دوپلے ایک طرف تھے اور دوسری طرف ناصر جنگ، محمد علی اور انگریز تھے۔ ناصر جنگ اور محمد علی علی الترتیب جائز وارثان حیدر آباد اور ارکاٹ تھے لہٰذا صداقت کا اثر کہئے کہ ابتداء میں فتح مندی حاصل ہوئی۔ عام طور سے یہ خیال قائم ہے کہ کلائیو کی محنت سے ارکاٹ کو انگریزوں نے مخالفوں کے ہاتھ میں جانے سے بچا لیا حیدر آباد میں بھی اُن کا اثر قائم ہو گیا تھا لیکن عہد صلابت جنگ (۱۷۵۱ء) میں پھر فرانسیسیوں کے اثرات یہاں پر قائم ہو گئے اور اس وقت ختم ہوئے جب کہ لارڈ ویلزلی نے سب کو سلطنت حیدر آباد سے طلب کر لیا۔ ارکاٹ کی فتح سے جس کا سہرا ثابت جنگ کرنل کلائیو کے سر باندھا گیا اور جس کے بعد ہی اس عظیم الشان ہستی کی شخصیت تمام دنیا پر ظاہر ہوئی، انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم کرنے کی بنیاد قائم ہو گئی۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "کمپنی کا ستارۂ اقبال ارکاٹ میں طلوع ہوا پلاسی میں چمکا اور بکسر میں جگمگانے لگا"

جنگ پلاسی اور بنگال میں تسلط

انگریزوں نے اپنا پہلا زینہ جنوبی ہند پر ختم کر کر دوسرے پر قدم رکھا اور یہ بنگال تھا۔ علی وردی خاں نواب بنگال نے مرتے وقت اپنے نواسہ سراج الدولہ کو وصیت کی تھی کہ وہ انگریزوں کے طرز عمل کو جو دکن میں رہا تھا اچھی طور سے سمجھ لیں اور یہ نوبت بنگال میں آنے نہ دیں۔ اس وصیت پر انگریزوں کا ایک اور شخص جو بنگال کی مسند کا امیدوار تھا

گفت وشنید کرنا اور بھی نمک چھڑکنے کا باعث ہو گیا۔ دونوں یعنے انگریزوں اور سراج الدولہ کے درمیان پہلی لڑائی بیچ بیچ پر ہوئی اور ان دونوں کی باہمی کش مکش پلاسی پر ختم ہوئی مورخین لکھتے ہیں کہ اس کش مکش میں بہادری کا کوئی نام نہیں تھا لطیف یار خاں، راجہ دلیدراج، امین چند اور میر جعفر کو جو نواب سراج الدولہ کے سرگرم درباری تھے انگریزوں نے اپنے ساتھ ملا لیا اور صرف میر محی الدین اور چند فرانسیسیوں سے جو سراج الدولہ کیساتھ تھے مقابلہ ہوا اور فتح حاصل ہوئی۔

تاریخی نقطۂ نظر سے پلاسی کی لڑائی کی کوئی اہمیت نہیں ہے البتہ اس لڑائی کے بعد انگریزوں کا جو معاہدہ میر جعفر سے ہوا اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ سراج الدولہ کی جگہ پر بنگال بہار اور اوڑیسہ کے لئے میر جعفر کی صوبہ داری کا اعلان ہوا اور انہوں نے انگریزوں کو ان تمام مراعات کے دینے کا وعدہ کیا جن کے لئے اس سے قبل نواب سراج الدولہ نے وعدہ کیا تھا۔ مزید برآں کمپنی کو کلکتہ کے جنوب کی تمام اراضی اور شہر کی خندق کے اطراف چھ سو گز چوڑی زمین دینے کا وعدہ کیا گیا۔ صوبۂ بنگال میں جس قدر بھی فرانسیسی زمینات تھیں وہ انگریزوں کے حوالہ کر دی گئیں۔ میر جعفر نے یہ وعدہ بھی کر لیا کہ وہ یا اس کے جانشین ہگلی کے نیچے کبھی قلعہ بندی نہیں کریں گے اگر انگریزوں سے کسی کی لڑائی چھڑ جائے تو ہر طرح ان کی مدد کی جائیگی۔ اس طرح انگریز بھی مدد کرینگے۔ سابقہ ہنگامے کے زمانہ میں کمپنی اور اس کے ملازمین کو جو نقصانات پہونچے ہیں ان کی تلافی کر دی جائے گی۔ اس مسند نشینی کے صلہ میں ایک کروڑ روپے کمپنی کو دئیے جائینگے اور دس لاکھ روپے کلکتہ کے باشندوں کو مزید برآں بہت سی رقم کی تقسیم کا بطور انعام وعدہ کیا گیا جس میں کلائیو اور دیگر ملازمان کمپنی کے لئے بھی بڑی بڑی رقمیں منظور کی گئیں۔

پلاسی کی فتح کے بعد ارکاٹ کا طلوع شدہ ستارہ چمکنا شروع ہوا۔ یعنے پلاسی کی جنگ کے بعد انگریزوں کو اپنے حریف فرانسیسیوں کا کچھ ڈر باقی نہیں رہا۔ اور اُن مراعات کے حاصل ہونے سے جو میر جعفر کی مسند نشینی کے وقت انہیں عطا کئے گئے نہ صرف کمپنی کی مالی حالت بہتر ہو گئی بلکہ فرانسیسی قوم جو ابتدا سے ہندوستانی سیاست میں ممتاز حیثیت حاصل کر چکی

کوشاں تھی اور انگریزوں کے خلاف ہمیشہ قسمت آزمائی کرتی تھی اب اپنی کسی درخشاں کامیابی اور تفوق سے نا امید ہوگئی۔ بنگال کے قدرتی وسائل نے انگریزوں کے قدم کو اور مستحکم کیا چنانچہ اس کامیابی کے بعد کلکتہ انگریزوں کا سیاسی مرکز بن گیا اور یہاں سے وہ ان سہولتوں اور ذرائع کی بدولت جو بنگال کے قدرتی وسائل فراہم کرتے تھے رفتہ رفتہ تمام ملک کے مالک بن بیٹھے۔

لارڈ کلائیو

بنگال پر تسلط حاصل ہو جانے کے بعد گو انگریزوں کو تمام ہندوستان پر تسلط قائم کرنے کے ذرائع حاصل ہو گئے تھے اور بعد میں انہوں نے انہی ذرائع سے فائدہ اٹھا کر تمام ہندوستان پر اپنا تسلط جمایا لیکن لارڈ کلائیو کا یہ خیال تھا کہ کمپنی کو اپنے مفاد کے تحت اودھ سے آگے بڑھنے کا قطعی خیال نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ ذیل میں ہم اس کا ایک بیان پیش کریں گے جس میں اپنی حکمت عملی ظاہر کر کے امید قائم کی ہے کہ اُسکے جانشین اس پر کاربند رہیں گے۔ چنانچہ ان کے ترمیمی جانشین نا ضرور اس پر کاربند رہے۔ لیکن زمانے نے آخر کار انہیں ہندوستان کی سیاست میں الجھا دیا جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ ۱۸۵۸ء میں غدر کے بعد کمپنی کی حکومت ختم کردی گئی اور ہندوستان کا تعلق براہ راست انگلستان کے تاج اور حکومت سے کر لیا گیا بہرحال لارڈ کلائیو نے اپنی روانگی کے وقت اپنے نقطۂ نظر کا ذکر ایک سرکاری مراسلہ میں یوں کیا ہے کہ "ہمارے مقبوضات کا تعین صرف صوبوں کی حد تک ہونا چاہیے۔ ہم کو سختی کے ساتھ امن قائم رکھنا چاہیے۔ یہ ہماری کامیابی کا بڑا راز ہے۔ سوائے اپنے بادشاہ اور نواب وزیر کی محافظت کے لئے جیسا کہ عہدنامہ میں قرار پایا ہے ہم کو کسی سے خواہ مخواہ جنگ نہیں کرنی چاہیے، خصوصاً دہلی پر چڑھائی نہ صرف ہماری فوج کی بربادی کا باعث ہوگی بلکہ کمپنی کی حکومت بنگال کا بھی خاتمہ کردے گی۔"[۱]

ٹیلبوس ویلر اپنی کتاب "برطانوی ہند کے قدیم اسناد" میں کلائیو کی اس حکمت عملی پر اعتراض کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "اس کا یہ مطلب تھا کہ انگریز خاموشی کے ساتھ بنگال، بہار اور

۱۔ کلائیو مصنفہ میلسن (سلسلہ حکمرانان ہند)

اوڑیسہ میں اپنی زندگی بسر کریں اور اپنے معاملات چلائیں اور اودھ کی سرحد ہمیشہ اُن کی آیندہ کامیابی میں حائل رہے۔ [۱]

گویا بنگال میں ان کو جو اقتدار حاصل ہوا تھا اس کی سلامتی کے لئے یہ ضروری تھا کہ انگریز ملک کی سیاست میں خواہ مخواہ حصہ نہ لیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے مقبوضات میں اضافہ کرنے کی بھی کوشش نہ کریں لیکن تاریخ اس کی گواہ ہے کہ اس نظریہ پر عمل کرنا ناممکن ثابت ہوا اور کمپنی بہت جلد خواہ اپنی مرضی سے یا اپنی مرضی کے خلاف دیسی حکمرانوں کی لڑائی میں شریک ہو گئی۔

وارن ہیسٹنگز کے تحت بنگال کی تنظیم اور استحکام

وارن ہیسٹنگز کے گورنر جنرل مقرر ہونے تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی شمال میں بنگال، بہار اور اوڑیسہ کی دیوانی حاصل کرنے اور مشرقی اور مغربی سواحل کے مقبوضات کی ملکیت پر قانع رہے گی لیکن وارن ہیسٹنگز نے اپنے ہمسایوں کی دولت اور ثروت پر حاسدانہ نظر ڈالنی شروع کی اور وارن ہیسٹنگز ہی کے زمانہ سے جارحانہ حکمت عملی کا آغاز ہو گیا۔ اس لئے بعض دیسی ریاستوں سے جنگ مول لی گئی۔ جس کی وجہ سے اس زمانہ میں انگریز ہندوستان میں بہت بدنام ہو گئے۔

ہندوستان میں دور برطانیہ میں کوئی زمانہ اتنا مشہور نہیں ہے جتنا کہ وارن ہیسٹنگز کا تیرہ سال کا زمانہ ہے۔ اس دور میں ایک انچ زمین بھی کمپنی کے زیر اقتدار نہیں آئی لیکن اس زمانہ کے مقبوضات کے حصول کے تدبر نے آیندہ مقبوضات کے حاصل کرنے میں بہت مدد دی۔ وارن ہیسٹنگز کی حکمت عملی نے اس شہنشاہی کی ساخت مضبوط کی جس کی بنیاد کلائیو نے رکھی تھی۔ ہیسٹنگز کی حکمت عملی کا زیادہ تر انحصار ہندوستانی حکمرانوں کی طاقت کو کمزور کرنے پر تھا اور کمپنی نے اُسی وقت طاقت حاصل کی جب کہ یہ کمزور ہو گئے۔

۱ه [illegible]

بنگال بہار اور اوڑیسہ کی دیوانی کے حاصل ہو جانے کے بعد یہاں کے نواب ناظم کو انگریزوں نے پوری طور سے اپنے قابو میں کرلیا۔ اصل اقتدار نائبوں کے ہاتھ میں دیدیا گیا جو کمپنی کے ساختہ پر داختہ تھے، محمد رضا خاں کو مرشد آباد اور راجہ شتاب رائے کو پٹنہ کی نیابت دیگئی۔ ان ہندوستانی نائبوں کے ہاتھ سے انتظام لے لینے کے لئے اور اس ہندوستانی نیابت سے بالکل بے نیاز ہو جانے کے لئے ہیسٹنگز نے محمد رضا خاں اور راجہ شتاب رائے کو گرفتار کراکر مواخذہ کے لئے انہیں کلکتہ طلب کیا جہاں ان کا مواخذہ کیا گیا اور ایک سال کے بعد بری کئے گئے۔ اس کے بعد محمد رضا خاں کو تو دوبارہ اپنی ملازمت پر بحال نہیں کیا گیا البتہ شتاب رائے کو بہار کا رائے رایان بنایا گیا لیکن یہ شخص بدنامی کی وجہ شکستہ دل ہو چکا تھا اور جلد مر گیا۔ اس طرح حکومت دوعملی جو کلائیو نے دیوانی کے حصول کے بعد قائم کی تھی ہیسٹنگز نے ختم کردی اور ساتھ ہی ساتھ اس نے یہ بھی کوشش کی کہ دیوانی اور فوجداری کی عدالتیں جو مرشد آباد میں تھیں انہیں کلکتہ میں قائم کیا جائے۔ اسی زمانہ میں ہیسٹنگز نے نواب کے وظیفہ میں بھی کمی کردی۔ گویا نواب کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اور اس کے بدلے بنگال بہار اور اوڑیسہ پر کمپنی کا اقتدار کلیتہً قائم ہو گیا۔

کارنوالس کی دکن میں تفوق حاصل کرنے کی کوشش

اس زمانہ میں ہندوستان کا زیادہ تر حصہ مرہٹوں، صوبہ دار دکن، لکھنو اور ٹیپو سلطان کے زیر اقتدار تھا۔ کارنوالس کے زمانہ میں ٹیپو سلطان کا نام ہر ناشندہ برطانیہ کے لئے خوف کا باعث بنا ہوا تھا۔ ایک انگریز مصنف ایڈیٹر اربب کا خیال ہے کہ ''ٹیپو ایک قسم کا مشرقی بھوت تھا۔ انگریز عورتیں اپنے شریر بچوں کو اس کے نام سے ڈراتی تھیں''[۱]

---

[۱] ارلی مصنفہ ڈبلیو۔ ایچ ہٹن (سلسلہ حکمرانان ہند) صفحہ ۳۱ و ۳۲

انہی حالات کے تحت کارنوالس کو خیال ہوا کہ اگر وہ ٹیپو سلطان کو شکست دے تو کمپنی کے مدارج میں ترقی ہوگی۔ انگریزوں کا دوست دیسی طبقہ اس مسلم شہریار سے اس لئے ناراض تھا کہ ان کو ٹیپو سلطان اور ان کے باپ نواب حیدر علی کے تحت نقصانات برداشت کرنے پڑے تھے، نواب حیدر علیخاں کے انگریزوں پر فتوحات ان کے سینہ میں آگ بھڑکا رہے تھے۔ لہذا کارنوالس کو موقع حاصل ہوا کہ ٹیپو سلطان کو شکست دے کر کمپنی کا نام روشن کرے۔ چنانچہ کارنوالس نے اس موقع کو فوراً کمپنی کے فائدہ کا ذریعہ بنانا چاہا۔

قبل اسکے کہ ہم ان معاہدہ شکنیوں کا ذکر کریں جو کارنوالس نے ٹیپو سلطان کے ساتھ کیں بہتر ہوگا کہ ہم ٹیپو سلطان کے دیگر اسلامی ریاستوں کے ساتھ تعلقات بیان کریں، اس وقت تک بھی شہنشاہ مغلیہ تمام ہندوستان کے نام نہاد فرماں روا مانے جاتے تھے۔ انگریز ان کی رعایا تھے لہذا انہیں خراج ادا کرنا پڑتا تھا لیکن انہوں نے بجائے اسکے بادشاہ کے اختیارات سلب کر دیے۔ وارن ہیسٹنگز کے زمانہ تک انگریزوں نے بنگال، بہار اور اوڑیسہ کی دیوانی کے معاوضہ میں شہنشاہ مغلیہ کو برابر سالانہ خراج ادا کیا۔ لیکن جب شہنشاہ دہلی مہادجی سندھیا کے اثر میں آگئے یہ خراج بند کر دیا گیا۔ کارنوالس کے زمانہ میں سندھیا نے شہنشاہ کی جانب سے انگریزوں سے اس خراج کا مطالبہ کیا لیکن کارنوالس نے اس کی ادائی سے انکار کیا جس پر اس مرہٹہ سردار نے اپنی مصلحت کے تحت خاموشی اختیار کر لی۔

نواب اودھ کے ساتھ بھی کارنوالس کا سلوک مبنی بر انصاف نہیں تھا۔ اس ریاست پر فوجی اخراجات کا ضرورت سے زیادہ بار ڈالا گیا۔ نواب نے کارنوالس سے یہ استدعا کی کہ ہیسٹنگز سے ان کا جو معاہدہ ہوا تھا اس کے مطابق ان افواج کو برخاست کر دیا جائے لیکن کارنوالس نے ایک نہیں سنی۔ کیپٹن کینوے (CAPTAIN KENAWAY) کی کوششوں کی بدولت نہرث گنٹور انگریزوں کو حاصل ہو گیا بلکہ نظام حیدرآباد کی دوستی پر بھی انہیں اعتماد ہو گیا۔

اس طرح اپنا مطلب نظام حیدرآباد سے حاصل کرنے کے بعد کارنوالس نے یہ مناسب سمجھا کہ

ٹیپو سلطان کا مقابلہ کیا جائے، بلا کسی وجہ کے ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ چھیڑ دینا پارلیمنٹ کے قوانین کی علانیہ خلاف ورزی تھی اس لئے گورنر جنرل کی یہ کوشش رہی کہ خود ٹیپو سلطان آمادۂ جنگ ہوں لیکن گورنر جنرل نے اس کا بھی آخر کار انتظار نہ کیا بلکہ ۱۷۸۴ء میں جو معاہدہ ٹیپو سلطان کے ساتھ ہوا تھا اس کو علانیہ توڑ دیا۔ چنانچہ اپنے ایسے حلیفوں کی فہرست میں جن کے مقابلہ میں نظام حیدرآباد انگریزی افواج نہیں استعمال کرسکتے تھے عمداً ٹیپو سلطان کا نام چھوڑ دیا گیا۔ اور صرف مرہٹہ والیان، نوابان اودھ و ارکاٹ اور راجگان تنجاور اور ٹرانکور کا تذکرہ کیا گیا۔

کارنوالس کی اس حرکت کے متعلق صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس نے جنوبی ہند کے دیگر طاقتوں کو اس بات پر مستعد پایا کہ ٹیپو کو برباد کرنے میں وہ اس کی ضرور مدد کریں گی چنانچہ مرہٹوں اور نواب نظام علی خاں کے پاس ٹیپو سلطان کی مخالفت کے کافی وجوہ تھے ٹیپو سلطان کا اصل مدعا فتوحات حاصل کرنے کا تھا پس انہوں نے اُن معاہدوں کی پرواہ نہیں کی جو مرہٹوں اور نظام دکن سے کئے تھے لہٰذا یہ دونوں ٹیپو سلطان کے سخت خلاف ہو گئے۔ ٹیپو سلطان کے خلاف ان دونوں نے جنگ کی تھی جس میں ٹیپو سلطان نے کامیابی حاصل نہیں کی۔ یہ تعجب خیز امر ہے کہ ان موقعوں پر انگریزوں نے اپنے حلیفوں مرہٹوں اور نظام کی امداد نہیں کی لیکن کارنوالس نے ٹیپو سلطان پر فوراً اُس وقت حملہ ہی کر دیا جب کہ کہا جاتا ہے کہ ٹیپو سلطان کا صرف ارادہ تھا کہ راجہ ٹرانکور پر حملہ کرے۔ اس کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کارنوالس کی جانب سے اس معاملہ میں اغماض برتا جاتا اگر اس میں خود کا ذاتی مفاد نہیں رہتا اور اگر خود کو مرہٹوں اور نظام حیدرآباد کی امداد کا بھروسہ نہیں رہتا۔ پس معلوم ہوا کہ گورنر جنرل کی طرف سے یہ جو معاہدہ شکنی کی گئی وہ کلیتہً ٹراونکور کی تائید میں نہیں تھی۔

اس موقع پر مرہٹوں اور نظام حیدرآباد کو ٹیپو سلطان کے خلاف اتحاد میں شرکت کرنے کی دعوت دی گئی۔ ان سے وعدہ کیا گیا کہ ٹیپو سلطان سے جو کچھ حاصل ہوگا وہ آپس میں تقسیم کرلیا جائے گا۔ پس جس وقت یہ اتحاد ثلاثہ قائم ہوا کارنوالس نے ٹیپو سلطان کے ساتھ جنگ چھیڑنے کا بہترین موقع سمجھا اور اس کے لئے راجہ ٹراونکور پر حملہ کا حیلہ نکالا گیا۔

ٹیپو سلطان کا خود خیال نہیں تھا کہ انگریزوں سے یا راجہ ٹراونکور سے جنگ کی جائے کرنل ولکس (COLONEL WILKS) نے لکھا ہے کہ ٹیپو سلطان جنگ کے لئے تیار نہیں تھے ٹیپو سلطان نے خود اس بات کا اطمینان دلایا کہ ان کے خیالات نیک تھے اور اس امر کا مطلق خیال نہیں تھا کہ راجہ ٹراونکور کے قدیم مقبوضات پر حملہ کیا جائے، یہاں تک کہ حکومت مدراس کو لکھا کہ اس معاملہ کے متعلق سفیروں کے ذریعہ آپس میں مفاہمت کرلی جائے مگر نہ تو کارنوالس کا اور نہ مدراس کے جدید گورنر میڈوس کا ارادہ تھا کہ ٹیپو کے ساتھ صلح برقرار رکھی جائے گورنر کو معلوم تھا کہ ٹیپو سلطان کی حکومت جنگ کے لئے تیار نہیں ہے چنانچہ کارنوالس نے حکومت مدراس کو لکھا کہ "مصلحت نیز وہ نیک نامی جو اس ملک میں حاصل ہے اس کا اقتضاً یہ ہے کہ ہم نہ صرف ٹیپو سے ہرجانہ وصول کریں بلکہ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک ایسے فرماں روا کی طاقت کم کرنے کی کوشش کریں جو ہمیشہ ہماری قوم کے خلاف خوفناک دشمنی کا اظہار کرتا رہا ہے۔ موجودہ حالت میں ہمیں دیسی حکمرانوں سے امداد کی امید ہے اور ٹیپو سلطان کو فرانس سے امداد ملنے کی کوئی امید نہیں اور اگر اس موقعہ پر ٹیپو سلطان کو یوں ہی طاقتور چھوڑ دیا گیا تا آنکہ فرانسیسی پھر امداد کرسکیں تو ضرور آئندہ ایک خوفناک جنگ ہوگی"[1]

اس جنگ میسور کی پوری داستان بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ صرف یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ ٹیپو سلطان کو انگریزوں کی طاقت کے علاوہ مرہٹوں اور حکومت حیدرآباد کی طاقت سے بھی مقابلہ کرنا تھا لہذا اس وجہ سے اور بقول تھارٹن (THORTON) "یورپی سپاہ جس میں تمام کر فرانسیسی تھے عین موقعہ پر بد دل ہوگئے جس کی وجہ سے ٹیپو سلطان کو انگریزوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی"

کافی گفت و شنید کے بعد ٹیپو سلطان، کارنوالس اور ان کے حلیفوں (مرہٹوں و نظام) حیدرآباد میں عہدنامہ طے ہوا۔ اس عہدنامہ کی رو سے ٹیپو سلطان کو اپنی نصف سلطنت تین کروڑ تیس ہزار روپے اور اپنے دو لڑکوں کو بطور یرغمال دینا پڑا۔ یہ عہدنامہ ۲۳ فروری ۱۷۹۲ء کو عمل میں آیا۔ مقبوضات مفتوحہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی مرہٹوں اور نظام حیدرآباد نے آپس میں تقسیم کرلیا

---

[1] تاریخ ہند مصنفہ مل جلد پنجم صفحہ ۲۴۲۔

کارنوالس کو یہ فخر حاصل ہوا کہ سب سے پہلی مرتبہ اس کے زمانہ میں انگریزوں نے ہندوستان میں فتح کے ذریعہ مقبوضات حاصل کئے۔ اس کے قبل جن مقبوضات پر انگریزوں کو قبضہ حاصل ہوا تھا وہ فتح کے ذریعہ نہیں حاصل ہوا تھا، انگلستان اور وہاں کی وزارت نے کارنوالس کو اس سلسلہ میں بہت مدد دی۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا مصمم ارادہ تھا کہ ہندوستان میں ایک شہنشاہی قائم کی جائے تاکہ امریکہ جو اُن کے قبضہ سے نکل چکا تھا اس کی تلافی ہو سکے۔

سر جان شور کے زمانہ میں اس اصول کی ترقی میں رکاوٹ

۱۷۹۳ء میں پارلیمنٹ کی طرف سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک جدید منشور عطا ہوا جس کی رُو سے اس کی مدت اجارہ میں اور بیس سال کی توسیع کی گئی۔ اس منشور میں یہ فقرہ بھی درج تھا کہ "ہندوستان میں فتوحات اور مقبوضات حاصل کرنا اس قوم کی خواہش، راست بازی اور اصول عمل کے خلاف ہے۔"

اس صلح پسندی کو ظاہر کرنے کے لئے ایک ایسے شخص کو گورنر جنرل کی خدمت کے لئے انتخاب کرنا ضروری تھا جو خود بھی صلح پسند مشہور ہو۔ چنانچہ سر جان شور کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ جب سر جان شور نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو ہندوستان میں امن قائم ہو چکا تھا۔ ٹیپو سلطان کو شکست ہو چکی تھی اور نہ سلطنت آصفیہ اور نہ مرہٹہ حلیفوں کی یہ خواہش تھی کہ کمپنی سے تیغ آزمائی کی جائے

مہادوجی سندھیا کا انتقال بتاریخ ۱۲ فبروری ۱۷۹۴ء ہوا تو دولت راؤ سندھیا کو سلطنت حاصل ہوئی دولت راؤ کے خیالات مہادوجی سے اور بالاتر تھے چنانچہ اس کی کوششوں کی بنا پر حیدرآباد کے خلاف ایک زبردست مرہٹہ اتحاد قائم ہوا۔ نواب نظام علی خاں بہادر سے مرہٹوں کو کچھ رقم وصول طلب تھی جس کی ادائی ایک زمانہ سے نہیں ہو رہی تھی جب پیشوا کی طرف سے گوبند راؤ کالے نے اس کا سخت تقاضا کیا تو نواب نظام علی خاں نے ایک تفصیلی حساب برآمد کیا جس کی رو سے

انہیں خود دو کروڑ ساٹھ لاکھ روپیہ وصول طلب تھے۔ مرہٹوں کے اس سفیر اور مشیر الملک میں خوب بحث رہی۔ آخر کار عین دربار میں اول الذکر سے کہا گیا کہ اس حساب فہمی کے لئے خود نانا فرنا ویس کو حیدرآباد کے دربار میں حاضر ہونا پڑے گا۔ سفیر نے اس کا جواب دیا کہ نانا فرناویس کاروبار میں مصروف ہیں۔ نہیں آسکتے۔ مشیر الملک نے کہا کہ میں جلد بتادونگا کہ ہمارے روبرو وہ کس طرح آسکتے ہیں۔ یہ جملہ اعلان جنگ کے لئے کافی سمجھا گیا۔ .... فریقین نے تیاریاں شروع کیں تاکہ اپنے تنازعہ کا فیصلہ تلوار کی مدد سے کرلیں[۱]۔

جنگ اب لازمی تھی۔ حکومت حیدرآباد نے انگریزوں سے امداد طلب کی لیکن سرجان شور نے غیر جانب داری کے اصول پر مدد دینے سے انکار کیا۔ اپنی سیاسی تاریخ میں سرجان میلکم نے لکھا ہے کہ اس بات کا کافی ثبوت پایا جاتا ہے کہ جب تک مارکوئیس کارنوالس کے دوستانہ مشورول اور فوجی کارناموں کے اثرات دیسی ریاستوں پر قائم تھے اس وقت تک حکومت برطانیہ کی مداخلت مرہٹوں اور ٹیپو سلطان دونوں کو حیدرآباد پر حملہ کرنے سے ضرور روکتی تھی۔

ویلزلی کی آمد کے وقت دکن میں کمپنی کی حالت اور خطرات

ارل آف مارنگٹن مارکوئیس ویلزلی کے دور حکومت میں ہندوستان کی برطانوی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ ویلزلی کو شہنشاہی حکمت عملی کا خیال تھا، اس کے تحت ویلزلی نے ہندوستان کے ایک بڑے حصہ کو فتح کیا۔ اس سلسلہ میں ویلزلی نے ہر طریقے سے کام لیا خواہ وہ بُرا ہو کہ بھلا۔ ۲۶ر اپریل ۱۷۹۸ء کو ویلزلی کی ہندوستان میں آمد ہوئی۔ کرۂ ارض کے اس حصہ میں برطانوی مفاد اس زمانہ میں نہایت نازک حالت میں تھا۔ ٹیپو سلطان کی مخاصمانہ تدبیریں تقریباً مکمل ہو چکی تھیں۔ شہریار دکن اور سندھیا کے دربار میں فرانسیسی جماعت اپنا سکہ جما چکی تھی۔ دربار پونا

---

[۱] تاریخ مرہٹہ مصنفہ گرانٹ ڈف جلد اوّل صفحہ ۵۱۳ و ۵۱۴۔

بالکل سندھیا کے رحم و کرم پر تھا۔ راجہ برار بھی ایک زمانہ سے برطانوی عروج و ترقی کو حاسدانہ نظر سے دیکھتے تھے اب علی الاعلان مخالف سمجھے جاتے تھے۔

کرناٹک کی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ لارڈ کارنوالس کے معاہدہ میں ترمیم کرانے کی بے سود کوششوں سے نواب عمدۃ الامراء جو اب کرناٹک میں اپنے والد نواب محمد علی خاں والاجاہ کے جانشین تھے، خفا ہو گئے تھے اور اپنی ریاست کی آمدنی قبل از وقت حاصل کرنے کی غرض سے مختلف علاقے سودخواروں کے حوالے کر رہے تھے اور ایسے زمانہ میں جب کہ یہ صاف نظر آرہا تھا کہ ریاست کی حفاظت کے لئے روپیہ کی سخت ضرورت پیش آنے والی تھی اس کے وسائل اسطرح تباہ ہو رہے تھے۔

ان مشکلات کے علاوہ ولندیزیوں کے مشرقی مقبوضات اور جزیرہ لنکا کی تسخیر کی غرض سے حسب ضرورت ایک معقول فوج تیار کرنی پڑی جسکی وجہ سے مالی حالت اور کمزور ہو گئی تھی ساحل کارومنڈل کی فوج کا ایک بہت بڑا حصہ اب تک اس مہم پر متعین تھا۔

اگرچہکہ کھرلہ میں شکست ہونے کی وجہ سے نواب نظام علی خاں انگریزوں سے خفا ہو گئے تھے اور ان کے بجائے اپنی فوج میں فرانسیسی لوگوں کو شریک کر رہے تھے اور مرہٹے بھی ایک حد تک ان سے بدظن ہو گئے تھے اور ان کی فوج میں بھی فرانسیسی کافی تعداد میں پائے جاتے تھے تاہم ان سب سے ویلزلی کو کوئی فوری خطرہ نہیں تھا۔ ویلزلی کی دانست میں کمپنی کے اقتدار کا تنہا دشمن صرف ٹیپو سلطان کی ذات تھی ٹیپو سلطان کی حکومت ہر ایسی کوشش کرنے کیلئے نہایت ذوق وشوق سے تیار تھی جس کا مقصد برطانوی کمپنی کی حکومت ہند کا تختۂ الٹنا ہو۔ اس لئے ویلزلی نے سب سے پہلے حکومت میسور کی بیخ کنی کی طرف توجہ کی۔ اس مقصد کے لئے نظام اور مرہٹوں کے دربار سے فرانسیسیوں کو دور کرنا بہت ضروری تھا کیوں کہ ٹیپو کے بعد یہ دوسرے حریف تھے جو ہند میں برطانوی تختۂ الٹنے کے اہل سمجھے جاتے تھے۔

مرہٹوں حیدرآباد اور ٹیپو پر فرانسیسی اثرات

ہندوستان میں جو یورپی اقوام آباد تھیں اگر ان میں انگریزوں کو کسی سے ڈر تھا تو وہ

فرانسیسی قوم تھی، فرانسیسی قوم درحقیقت انگریزوں کی حریف۔ مقابل سمجھی جاتی تھی۔ اگر ڈوما (DUMAS) اور دوپلے (DUPLEIX) جیسے چند سردار اور ہندوستان آتے تو ممکن تھا کہ فرانسیسی انگریزوں پر غالب ہو جاتے۔ لیکن شومئی قسمت سے دوپلے کے بعد فرانسیسی گورنروں کا سلسلہ اچھا نہیں رہا جس کی وجہ سے ان کو اپنے مقصد کے حصول میں ناکامیابی ہوئی۔ پھر بھی انگریزوں کو ہر وقت ان سے خوف لگا ہوا تھا، ہندوستانی سلطنتیں بہت سی ایسی تھیں جن میں فرانسیسی عنصر کام کر رہا تھا۔ مرہٹوں کے اکثر درباروں میں فرانسیسی مقرر تھے کہ ان کی افواج کو تعلیم و تربیت دیں خود پیشوا کے دربار میں ان کی کافی تعداد تھی اور دیگر مرہٹہ سردار بھی فرانسیسیوں کو اپنے دربار میں رکھنا قرین مصلحت سمجھتے تھے۔ خصوصاً سندھیا کے پاس دی بوین جیسے سپہ سالار کی سرکردگی میں فرانسیسی فوج کا ایک بڑا دستہ تھا۔ سندھیا کی دیسی افواج بھی فرانسیسی اثرات سے منظم اور باقاعدہ ہوگئی تھی۔ اسی وجہ سے ایک زمانہ میں تمام ہندوستان سندھیا کے نام سے کانپتا تھا حیدرآباد میں یوں تو پہلے ہی سے فرانسیسی افراد پائے جاتے تھے لیکن کھرلہ کی جنگ کے بعد ان کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ فرانسیسیوں نے حیدرآباد میں ایک خاص اہمیت حاصل کر لی۔ اس سلسلہ میں (ریمو RAYMOND) کو بہت شہرت حاصل ہوئی اس سپہ سالار نے دربار آصفیہ میں فرانسیسیوں کے لئے مراعات حاصل کی تھیں اور سرکار نظام کی افواج کی تنظیم قائم کی۔ اسی طرح ٹیپو کے دربار میں بھی فرانسیسیوں کا کافی دخل پایا جاتا تھا یہاں بھی فرانسیسی سپہ سالار اور فرانسیسی دستے موجود تھے۔ ٹیپو سلطان کو فرانسیسیوں کے ساتھ اور فرانسیسیوں کو ٹیپو سلطان کے ساتھ خاص لگاؤ تھا کیونکہ وہ ایک دوسرے کی شجاعت کے قائل تھے ٹیپو سلطان پر شبہ کیا جاتا ہے کہ جمہوریہ فرانس سے بھی اتحاد کا سلسلہ قائم کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر چونکہ جنوب کی ہر ریاست میں کچھ نہ کچھ فرانسیسی اثر پایا جاتا تھا اس لئے انگریزوں کو یہ اندیشہ تھا کہ ان اثرات کے تحت جنوبی ریاستوں میں ایک ایسا اتحاد قائم ہو جائے گا جس کا مقابلہ انگریزوں کے لئے ضرور مشکل ہوگا۔ اسی طرح شمالی ہند بھی اس خطرہ سے خالی نہ تھا کیونکہ سندھیا کے پاس بھی فرانسیسی عہدہ داران فوج اور

فرانسیسی سپاہیوں کے دستے موجود تھے اور ممکن تھا کہ جنوب کی حمایت شمال کے اس چھوٹے سے شعلہ کو خوب بھڑکا دیتی کیونکہ دونوں جگہ ایک ہی عنصر کام کر رہا تھا۔

فرانسیسی انقلابی لڑائیاں
نپولین کا مصر پر حملہ

اس کے علاوہ فرانسیسیوں نے بہ ذات خود انگریزوں سے جنگ کی تھی اور یورپی قوم ہونیکی وجہ ہندوستانی سلطنتوں سے زیادہ انگریزوں کو ان کا خوف تھا۔ اس وقت فرانسیسی انقلابی لڑائیاں جاری تھیں جسکی وجہ تمام یورپ میں تھلکہ مچا ہوا تھا۔ انگریز ان لڑائیوں سے بھی مرعوب تھے۔ نپولین کے مصر پر حملہ کرنے سے ان کا خوف اور بڑھ گیا کیونکہ خیال یہ تھا کہ نپولین خشکی کے راستہ سے ہندوستان پہونچ کر ٹیپو سلطان اور دیگر ہندوستانی سلطنتوں سے مل کر جہاں فرانسیسی طاقت موجود تھی انگریزوں کو تباہ کردے گا، ٹیپو سلطان پر یہ شبہ تھا کہ انہوں نے نپولین کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دی ہے۔ جہاں فرانسیسیوں کی طاقت بڑھتی دیکھکر انگریز اپنے لئے خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ جب نپولین نے مصر پر حملہ کردیا تو انہوں نے اس بات کا تہیہ کرلیا کہ انگریزی مفاد کے لئے ہندوستان میں فرانسیسیوں کی پوری طور سے بیخ کنی کرنی ضروری ہے۔ چنانچہ ویلزلی نے پہلے نظام دکن سے روابط بڑھا کر فرانسیسی فوجوں کو ریاست حیدرآباد سے نکلوادیں اور اپنی فوجیں بھیج کر برطانوی مقصد کو مستحکم کرلیا اور جب موقع ہاتھ آیا تو ٹیپو سلطان کے ساتھ کھلی جنگ کی جس میں فتح حاصل ہونے سے فرانسیسیوں کا جو ڈر تھا وہ قطعی باقی نہ رہا۔

ہندوستانی سلطنتیں شمالی ہند
سندھیا کا عروج اور اسکا اثر ستلج تک

مادھوجی سندھیا کی آزادی کو کمپنی عہدنامہ سالبائی میں پہلے ہی تسلیم کرچکی تھی اسکے

بعد سے اس نے اپنی فوج اور اپنے علاقہ میں کافی اضافہ کرلیا تھا۔ دربار سندھیا کے قابل رزیڈنٹ مسٹر جیمس انڈرسن نے ۱۷۸۵ء میں سرجان میکفرسن کی خدمت میں سندھیا کے عروج کو روکنے کی غرض سے ایک تجویز پیش کی تھی اور یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر اسے نہ روکا گیا تو برطانوی حکومت سے اس کا ضرور تصادم ہوگا۔ اس تجویز پر کوئی عمل نہیں کیا گیا اور چونکہ لارڈ کارنوالس نے پارلیمنٹ کے مقرر کردہ عدم مداخلت کے مسلک کو عمل میں لانا اپنی حکمت عملی قرار دے لی تھی لہذا وہ اپنے آپکو اس بات کا بھی مجاز نہیں خیال کرتے تھے کہ اس سردار کی دست درازیوں کو روکنے کی غرض سے کسی قسم کی سیاسی تدبیر بھی اختیار کر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سندھیا نے ہندوستان کے تمام شمالی حصہ پر ستلج تک اپنا سکہ جمالیا۔ شہنشاہ دہلی کو اپنے قبضہ میں کرلیا۔ یوروپین افسروں اور خصوصاً فرانسیسیوں کی نگرانی میں ایک عظیم الشان اور جرار لشکر اور باقاعدہ توپخانہ تیار کیا۔ سامان حرب وآلات جنگ بنانے اور ڈھالنے کیلئے کارخانے قائم کئے الغرض ان ذرائع سے اس نے ایسی طاقت حاصل کرلی کہ سندھیا کا جانشین برطانوی حکومت کے خلاف وقت واحد میں دکن اور شمالی ہند، دونوں جگہ جنگ جاری رکھ سکا۔ جو اقتدار اس وقت کمپنی کو حاصل تھا اس سے آگے بڑھنے کی اس زمانہ میں کمپنی کو خواہش بھی نہیں تھی۔ چنانچہ ہمارے اس بیان کی تائید میں کارنوالس کی مندرجۂ ذیل تحریر پیش کی جاسکتی ہے جو سندھیا کے دربار کے رزیڈنٹ کو لکھی گئی تھی کہ "سندھیا کو جتلادینا چاہئیے کہ اس نے اس طویل مدت میں شمالی ہند میں فتوحات حاصل کیں اور اپنے حدود بڑھائے ہیں۔ ہم نے نہایت صبر وتحمل اور اعتدال سے کام لیا ہے۔ اب اگر ہمیں مجبوراً اس علاقے میں اپنے عدم مداخلت اور صلح پسند اصول کے مسلک سے انحراف کرنا پڑا تو ہمیں بڑا صدمہ ہوگا۔ تم ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ میں نے تمہیں اس بات کے اظہار کی خاص طور سے ہدایت کی ہے کہ ہمارا منشا جدید فتوحات حاصل کرنے کا قطعی نہیں ہے اور جہاں تک ہمیں ہماری حفاظت اور عزت اجازت دیگی ہم شہنشاہیت ہندوستان کے اندرونی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کرینگے۔ لیکن اگر ہمارے ہمسایوں میں سے کسی نے اپنی ناعاقبت اندیشی کی بنا پر ہم سے بے جا مطالبات کئے یا کسی اور طریقہ سے

ہماری توہین کی تو ہم پورے طور سے اس کا بدلہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس کے لئے اپنے آپ میں قوت بھی پاتے ہیں۔[۵]

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں اپنے مفاد اور استحکام کی خاطر کمپنی اپنے مقبوضات میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ اضافہ کے ساتھ کمزوری بھی پیدا ہوتی تھی اور موجودہ مقبوضات کے بھی ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ عدم مداخلت کی آڑ میں اپنی یہ کمزوری چھپائی جائے اور ستلج تک سندھیا کے جو اثرات قائم تھے انہیں قبول کر کے دریائے ستلج کو حد قرار دیا جائے اس سے آگے بڑھنے کا انگریزوں کو قطعاً خیال نہ تھا۔ کیونکہ یہاں پر سکھ قوم آباد تھی جس سے لڑائی مول لینا اور اتنے وسیع رقبہ پر اپنا اثر قائم رکھنا کوئی آسان بات نہ تھی۔

اس لئے قناعت سے کام لیا گیا اور اپنے اور سکھوں کے درمیان سندھیا کو آڑ رکھا گیا تاکہ سکھوں سے آئے دن سرحدی معاملات میں وہ جھگڑتا رہے اور یہ اپنی سرحد مستحکم ہونے سے اطمینان کی نیند سوتے رہیں۔

۱۷۷۱ء میں جبکہ شاہ عالم، نام نہاد شہنشاہ نے انگریزوں کی حفاظت ترک کی اور دہلی میں پھر داخل ہونا پسند کیا تو سندھیا نے ان کو اپنی محافظت میں لیا۔ بنا بریں سندھیا کو ایک زمانہ تک ہندوستان کا تنہا مالک سمجھا جاتا تھا۔ باجے راؤ کو بھی اپنے ساتھ ملانے میں سندھیا نے ایک حد تک کامیابی حاصل کی۔ دوسرے سردار پہلے ہی سندھیا کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اب صرف اس کے عروج کو حاسدانہ نظر سے دیکھنے کے سوائے ان کے پاس کوئی تدبیر نہیں تھی۔ سندھیا کو ان حاسدانہ تدابیر کی مطلق پروا نہیں تھی۔ وہ اپنے انتہائی عروج کو پہونچ چکا تھا۔ شمال سے جنوب تک اسکی قوت کا ہی نقارہ بجتا تھا۔ ایسے موقع پر سندھیا نے اپنی نمک حلالی کا ثبوت دینے کے لئے شہنشاہ مغلیہ کو اس بات پر رضامند کیا کہ وہ پیشوا کو وکیل مطلق کے خطاب سے سرفراز فرمائیں۔ چنانچہ سندھیا کے توسط سے یہ خطاب شہنشاہ کی طرف سے پیشوا کو عطا کیا گیا اور خود سندھیا کو نائب وکیل و صوبہ دار دہلی و آگرہ مقرر کیا گیا۔ اسی طرح

---

[۵] میلکم۔ جلد اوّل، صفحہ ۸۲۔

سندھیا نے ان دو عظیم الشان طاقتوں کو اپنا بنالیا اور دنیا کو یہ بتلادیا کہ کس طرح یہ دونوں ہستیاں زیر اثر آچکی ہیں۔

مالوہ میں اجین پر سندھیا کا اثر قائم ہونے سے ہولکر والی اندور تصادم

تکاجی راؤ ہولکر نے جو اہلیہ بائی کے ساتھ اندور میں حکمران تھا ۱۷۹۵ء میں انتقال کیا۔ اس کے جائز بیٹوں میں جانشینی کے لئے تصادم ہوا جس میں آخر کار جسونت راؤ ہولکر کو کامیابی ہوئی جسونت راؤ نے ایک جرار فوج کے ساتھ، جس میں افغان بھی موجود تھے، سندھیا کے مقبوضات پر حملہ کردیا۔ اس تنازعہ میں کبھی ہولکر کو فتح نصیب ہوتی تھی اور کبھی سندھیا کو باجی راؤ ان دونوں کے ہاتھ میں کھلونا تھا آخر کار ۲۵ اکتوبر ۱۸۰۲ء کو ہولکر نے سندھیا اور پیشوا کی افواج کو پونا کے نزدیک پورے طور سے شکست دی۔ اور ونایک راؤ کو پیشوا مقرر کیا جس کی وجہ سے باجی راؤ کو انگریزوں کی امداد طلب کرنی پڑی اور اس طرح ویلزلی کو آخر کار مرہٹوں کے معاملات میں مداخلت کرنے کا اچھا موقع حاصل ہوا۔

بھونسلا کی طاقت

برطانوی حکومت کے سیاسی تعلقات راگھوجی بھونسلا سے اب تک کبھی دوستانہ نہیں رہے تھے۔ اس فرماں روا کے ذاتی خصائل اور اس ریاست کے مقامی حالات کی وجہ سے ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ میں کسی قسم کی امداد کی توقع بھی اس سے نہیں ہوسکتی تھی تاہم لارڈ کارنوالس نے اپنے مسلک کی صداقت کو اس پر ظاہر کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا اور بالآخر ٹیپو سلطان کے خلاف جو اتحاد قائم ہوا تھا اس میں شرکت کی اس سے بھی درخواست کی۔ اس غرض کے لئے اور اس کے علاوہ دیگر چند اور معمولی تجارتی معاملات طے کرنے کی خاطر جن کا دونوں ریاستوں سے تعلق تھا ایک رزیڈنٹ بھی اس دربار میں بھیجا۔ اُسے ہدایت کی کہ وہ راجہ کو پورے طور سے اس بات کا یقین دلائے کہ محض فوجی ضروریات اور مجبوریوں کی وجہ سے برطانوی افواج کو بغیر راجہ کی

۵؎۔ سندھیا اور پیشوا کے تعلقات اور وکیل مطلق کے خطاب کے حصول کی تفصیل جنوبی ہند کے واقعات کے تحت آگے بیان کی گئی ہے۔

اجازت کے راجہ کے علاقے اٹک سے روانہ کرنا پڑا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھونسلا کی طاقت اس زمانہ میں کافی تھی جس کا احساس انگریزوں کو بھی تھا چنانچہ اسی وجہ سے کارنوالس کو اس سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنیکی ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے مسلک کی صداقت کے پردہ میں اس کو اپنا حلیف بنا کر اس کی طاقت سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل کیا جائے لیکن راجۂ برار کو ایک زمانہ سے برطانوی عروج و ترقی پسند نہیں تھی اور بالآخر ۱۷۹۶ء میں برطانوی طاقت کا یہ راجہ علی الاعلان مخالف بن گیا۔

جنوبی ہند مرہٹوں کی مرکزیت کا پونا میں خاتمہ

اس قول کے مطابق کہ "تاریخ اپنے کو دہراتی ہے" اس زمانہ میں پیشوا کی وہی حالت ہو رہی تھی۔ جو سیواجی کے گھرانہ کی حالت پیشوا کے خاندان کے ہاتھوں ہوئی تھی جس طرح پیشوا اول نے سیواجی کی اولاد کو کمزور پاکر سب اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور پونا کی سلطنت قائم کی اسی طرح ان دنوں بہت زور آور ناحقیقی پیشوا کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مختلف مرہٹہ سردار اپنی طاقت اور حکومت میں اضافہ کر رہے تھے اور پیشوا کا ان پر کوئی اثر نہیں تھا۔ پس اس طرح مرہٹوں کی مرکزیت کا پونا میں خاتمہ ہوا۔ اور اس مرکزیت کے تحت جو چار بڑے سردار تھے وہ اپنی اپنی علیحدہ آزادی و تفوق تسلیم کرانے کی کوشش میں رہے جس کی وجہ سے آخرکار ۱۸۱۸ء میں پونا کی سلطنت کلیتاً برباد ہو گئی۔

یہ چار سردار سندھیا، ہولکر، گیکواڑ اور بھونسلا تھے جو گوالیار، اندور، بروڈا اور ناگپور کے فرماں روا تھے سلطنت پونا کے یہ ہر طرح سے حکم بردار تھے مگر جب اس مرکزیت کا خاتمہ ہو گیا تو مرہٹہ طاقت ان چار میں تقسیم ہو گئی۔

سندھیا اور پیشوا کے تعلقات

ان میں سب سے مشہور اور طاقتور سندھیا تھا جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اس مرہٹہ سردار نے اپنی فراست سے اپنے تحت ایسی طاقت جمع کی تھی کہ خود انگریز صلح نامہ سالبائی کی

رُو سے سندھیا کی آزادی تسلیم کر چکے تھے بلکہ اس صلح نامہ کو عمل میں لانے کیلئے خود سندھیا کو بہت بڑا محرک خیال کیا جاتا تھا جس کے فریقین صلح نامہ ممنون تھے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کش مکش جاری رہنے کے زمانہ میں سندھیا نے متعدد مرتبہ پونا حاضر ہونے کا خیال ظاہر کیا تھا کہ ان کی سرکوبی کے احکام نافذ کرائے لیکن نانا فرناویس ہولکر کی امداد پر تھا جس کی وجہ سے سندھیا کا یہ خیال پورا نہیں ہوسکتا تھا آخر کار جب سندھیا نے اُجین سے پونا کا رُخ کیا تو بعض نے خیال کیا کہ انگریزوں نے پونا اور حیدرآباد میں جو مراعات حاصل کی ہیں اس کی مخالفت پیشِ نظر ہے بعض کا خیال تھا کہ حیدرآباد پر حملہ کرنا مقصود ہے اور بعض اس خیال میں تھے کہ شمالی ہند میں ہولکر کی مداخلت روکنا مدعا ہے۔

یہ تمام خیالات ایک حد تک قرین قیاس تھے لیکن اس بات کا یقین ہے کہ سندھیا کی خواہش تھی کہ برہمنوں پر غلبہ حاصل کیا جائے اور پونا میں اپنا اقتدار منوایا جائے ۱۷۷۹ء میں جنگ پٹن کے بعد سندھیا نے شہنشاہ سے تیسرا عامرتبہ پیشوا کے لئے وکیل مطلق کے موروثی خطاب کا فرمان حاصل کیا اور اس میں شرط یہ تھی کہ سندھیا اور اس کے ورثاء ہر حالت میں پیشوا کے نائب مقرر ہونگے۔

سندھیا نے دنیا پر یہ ظاہر کیا کہ وہ شہنشاہ کے ارشاد کی تعمیل میں وکیل مطلق کے خطاب کا فرمان پیشوا کے پاس لے جارہا ہے نانا فرناویس کو یقین تھا کہ سندھیا دکن کا رُخ کرے گا لیکن جب اس کو اس کا پتہ چلا تو اس نے ہری پنت کے ذریعہ لارڈ کارنوالس سے یہ استدعا کی کہ کپتان لیٹل (CAPTAIN LITTLE) کی افواج ہمیشہ کے لئے پونا میں متعین کردی جائیں جن کے مصارف برداشت کرنے کا من جانب پیشوا وعدہ کیا گیا۔ لیکن گورنر جنرل نے مختلف وجوہ کی بناء پر اس خواہش کو رد کردیا۔

سندھیا کو اس قسم کے اتحاد کا پہلے ہی سے اندیشہ تھا لہٰذا وہ اپنے ہمراہ یورپی اشخاص کی کمان میں بہت تھوڑی سی فوج لے کر پہونچا تاکہ نانا فرناویس کو اشتعال نہ ہونے پائے وہ ار جون کو پونا پہونچا اور دریائے موتا و مولا کے سنگم پر قیام کیا۔

نانا فرناویس نے ہر امکانی کوشش کی کہ پیشوا اس خطاب کو قبول نہ کرے اس نے مہاراجہ

ادیر راج کے خطاب کو مرہٹہ سلطنت کے دستور کے خلاف ظاہر کیا لیکن سندھیا کو ان بات پر اصرار تھا اور پیشوا کے ان خطابات کے قبول کرنے کیلئے راجہ ستارہ سے رسماً منظوری حاصل کی گئی سندھیا کی آمد کے نو دن بعد نانا فرناویس ملنے گیا سندھیا اس کے ساتھ نہایت اخلاق سے پیش آیا اور اس کی حاضری تیا مسند پر بیٹھنے سے انکار کیا اس کے بعد سندھیا پیشوا کے دربار میں حاضر ہوا اور اپنے ہمراہ کمسن پیشوا کے لئے ہندوستان کے بہت سے عجائبات اور بیش بہا اشیاء لائے جس ترک و احتشام کے ساتھ شہنشاہ کے یہ خطابات اور سرفرازیاں قبول کی گئیں ان کا اندازہ مندرجۂ ذیل اقتباس سے ہوسکتا ہے۔

"پیشوا کو وکیل مطلق کا خطاب اور اعزاز عطا کرنے کے لئے دوسرے دن ایک شاندار دربار منعقد کیا گیا اور اس دربار کو ممکنہ طور سے اثر انداز بنانے میں سندھیا نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ سندھیا کے کیمپ سے تھوڑے فاصلہ پر شاندار خیمے ایک سلسلہ میں نصب کئے گئے۔ پیشوا نہایت ہی ترک و احتشام سے وہاں آیا۔ ان عالیشان خیموں کے ایک سرے پر ایک تخت شہنشاہ کے تخت کی نمائندگی کے لئے بچھایا گیا۔ اسپر شاہی فرمان۔ خلعت اور دوسرے امتیازی اشیاء رکھے گئے۔ تخت کے قریب پہونچکر پیشوا تین مرتبہ کورنش بجالایا اور ۱۰۱ اشرفیاں نذر کے طور پر تخت پر رکھے اور تخت کے بائیں جانب اپنی نشست اختیار کی۔ سندھیا کے فارسی میر منشی نے شاہی فرمان پڑھکر سنانے کی عزت حاصل کی جسمیں علاوہ دیگر باتوں کے گاؤکشی ممنوع قرار دیئے جانے کا بھی حکم مندرج تھا۔ بعد ازاں پیشوا نے خلعت حاصل کی جو نو پارچوں پر مشتمل تھی۔ علاوہ ازیں جواہرات کے پانچ نہایت عمدہ زیور ایک عدد تلوار، ایک عدد ڈھال، قلمدان، دوات، ایک مہر اور دو شاہی مورچھل بھی تھے انکے ساتھ ایک پالکی ایک پالکی گھوڑا اور ایک ہاتھی بھی تھا۔ علاوہ اس کے چھ ہاتھی بھی تھے جنپر شاہی علم، دو ہلال، دو ستارے اور ماہی مراتب نصب تھے۔۔ ایک متصل خیمہ میں جاکر پیشوا نے شاہی خلعت پہنی واپس آکر جب وہ اپنی نشست پر دوبارہ بیٹھ گیا تو سندھیا، نانا فرناوس، اور پیشوا کے دوسرے عہدہ داروں نے مبارکباد کی نذریں گذرانیں۔ اپنی پالکی میں بیٹھکر پیشوا پونا میں داخل ہوا۔ جلوس کو دیکھنے کیلئے بے انتہا خلقت جمع ہوئی۔ اس موقع پر جس ترک و احتشام کا مظاہرہ کیا گیا اسکو پونا کے باشندوں نے شاید ہی کبھی دیکھا۔ اس رسم کو تجویز کرنے والا شخص جو با مصداق اور دھوم دھام کا متمنی ہوسکتا تھا اسکو ہزاروں باجوں کی آواز لوگوں کے نعروں، بندوقوں کی باڑ اور توپوں کی سلامی نے پورا کردیا۔"

سندھیا کو نائب وکیل مطلق مقرر کرنے کا دربار پیشوا کے پونا پہونچتے ہی مقرر ہوا لیکن اس موقع پر بھی سندھیا نے اپنی انکساری کا اظہار کیا کہ وہ پیشوا کا خانہ زاد موروثی ہے اور اس کا کام پیشوا کی کفش برداری ہے اور یہ کہ اس کو پٹیل کے خطاب سے مخاطب کیا جائے۔ بعض لوگوں نے

سندھیا کی اس حرکت کو پسند نہ کیا اور پیشوا کو وکیل مطلق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اُن حالات کے تحت سندھیا کو اپنے منصوبوں کو عمل میں لانے کے سلسلہ میں بہت احتیاط سے کام لینا پڑا۔ سندھیا کا اصل مقصد پیشوا کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔ سندھیا کا طرز عمل نانا فرناویس کے طرز عمل سے بدرجہا بہتر تھا لہذا پیشوا اور سندھیا کے تعلقات میں روز افزوں ترقی ہوئی۔ نانا فرناویس کو شروع سے ہی سندھیا کے متعلق شک وشبہ تھا لہذا اُس نے ان دونوں پر کافی نگرانی رکھی اور تنہا بات چیت کا بہت کم موقع آنے دیا۔ سندھیا نے ان امور کے متعلق اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ اُسے مطلق کسی اقتدار کی پرواہ نہیں تھی۔ گو پیشوا اور سندھیا کے تعلقات میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی لیکن ابتدا میں وہ نانا فرناویس سے بدگمان نہیں ہوا لیکن آخر کار سندھیا نے پیشوا پر پورا دسترس حاصل کر لیا۔

سندھیا نے ہمیشہ پیشوا پر اپنی فراست کے اظہار کی کوشش کی۔ اُس نے اس کثیر رقم کا ذکر کیا جو اس کو سلطنت کی وسعت دینے اور پیشوا کے لئے وکیل مطلق کا خطاب حاصل کرنے کے سلسلہ میں خرچ کرنی پڑی، اور اس بات کی درخواست کی کہ یہ رقم اس کو مرحمت ہو، شمالی ہند کے تمام معاملات اس سے متعلق کیئے جائیں اور ہولکر۔ علی بہادر کو واپس طلب کر لیا جائے اس کے جواب میں نانا فرناویس کی طرف سے ہمیشہ حساب طلب کیا جاتا رہا جس کی وجہ سے اُن کے درمیان کشیدگی زیادہ بڑھنے کا اندیشہ تھا لیکن اس وقت کشیدگی زیادہ ہونے نہیں پائی۔

نانا فرناویس کی وجہ سے سندھیا کو پوری کامیابی کا حاصل نہ ہونا

سندھیا کی اس ترقی میں بڑی رکاوٹ نانا فرناویس کی ذات تھی اسی کی وجہ سے سندھیا کو پوری کامیابی نہیں حاصل ہوئی نانا فرناویس کی بدولت سندھیا کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ سندھیا اگر کسی سے ڈرتا تھا تو وہ نانا فرناویس کی ہی ذات تھی سندھیا کو پیشوا کی پرواہ نہیں تھی مگر نانا فرناویس سے ہمیشہ خوف رہتا تھا اور ہر وقت اس پر غالب ہونے کی فکر میں لگا رہتا تھا علی ہذا نانا فرناویس بھی سندھیا کو نیچا دکھانے کی ہمیشہ تدابیر سوچتا رہتا تھا۔ باجے راؤ کو بھی اس سے سخت مخالفت تھی لہذا سندھیا کی مدد سے اس کو گرفتار کر کے احمد نگر میں قید کر دیا گیا تھا لیکن سنہ ۱۷۹۶ء میں اس کو رہا کر دیا گیا اور

وزارت دوبارہ اس کے تفویض کی گئی۔ مگر پھر اُسے وہ مراعات حاصل نہیں ہوئے جو پہلے حاصل تھے
نانا فرناویس کا انتقال ۱۳ مارچ ۱۸۰۰ء کو ہوا۔ کرنل پامر رزیڈنٹ متعین بہ دربار پیشوا کا خیال
ہے کہ نانا فرناوس کے انتقال پر مرہٹہ حکومت دور اندیشی اور اعتدال پسندی سے خالی ہو گئی۔

"WITH HIM DEPARTED ALL THE WISDOM AND MODERATION OF THE MAHRATHA GOVERNERS

گرانٹ ڈف نے اپنی تاریخ مرہٹہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے "نانا فرناویس کی شخصیت ایک
زبردست شخصیت تھی مشکل اوقات میں وہ اپنے مالک اور ملک کی بے حد خدمت کرتا تھا" ایسے شخص کی
وفات پر باجے راؤ بجائے افسوس کرنے کے خوش ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار انگریزوں نے پیشوا پر بھی
اپنا اثر پورے طور سے جما لیا اور اس کو اپنا تخت بنا کر ہی چھوڑا اس کے علاوہ دیگر مرہٹہ سرداروں
مثلاً رگھو باوغیرہ کی اندرونی شکست وریخت بھی انگریزوں نے دیکھ لی تھی اور اُن کو مرہٹوں کی طرف سے
کوئی فوری ڈر نہیں تھا۔

حیدرآباد کا مرہٹوں سے خوفزدہ ہو کر کارنوالس سے معاہدہ اتحاد کی کوشش کرنا

جیسے ہی ٹیپو سلطان کی عملی مخالفانہ پیش قدمی کی وجہ سے لارڈ کارنوالس کو ان قیود سے
آزادی ملی جو پارلیمنٹ کے قانون کی بنا پر عائد تھے تو اس نے بہ عجلت ممکنہ پوری کوشش کی کہ
حیدرآباد جنگ میں پوری تن دہی سے شریک ہو جائے رزیڈنٹ کو جو ہدایات اس نے روانہ کئے
ان میں یہ تاکید بھی تھی کہ وہ دربار حیدرآباد کو مطلع کر دے کہ سلطان اور کمپنی کے درمیان جو صلحنامہ
تھا اُسے توڑا جا چکا ہے اور ان تمام مواقع پر جو رزیڈنٹ کو حاصل ہو سکیں سلطان کی بے وفائی کو
حقیقی طور پر نمایاں کیا جائے اور بندگان حضرت اور اُن کے وزراء کو واضح طور پر سمجھا دیا جائے
کہ اس موقع پر برطانوی حکومت سے قریبی تعلقات قائم کرنے سے ان کا بڑا فائدہ ہو گا۔

اس نازک موقع پر مارکویس کارنوالس نے فرماں روائے دکن کے ساتھ یہ مسلک اختیار کیا کہ
امدادی فوج سے ان کی سلطنت کی حفاظت کا فوری انتظام کر دیا اور ٹیپو سلطان کے خلاف اُن سے
دفاعی اور اقدامی معاہدہ کر لیا اور اس کے معقول اور نفع بخش شرایط سے انہیں آیندہ کے لئے بڑے

مستقل فوائد کی اُمید دلائی اور ان کے دربار کے برطانوی رزیڈنٹ کی معرفت اس بات کی بھی اُمید دلائی کہ ان کی طاقت کو جو سب سے بڑا خطرہ اپنے ہمسایہ مرہٹوں کی غیر متناہی ہوس سے لگا رہتا ہے اس سے بھی انہیں پورے طور پر نجات مل سکتی ہے۔

اس مسلک کی تہ میں جو دانشمندی مضمر تھی وہ اس کے نتائج سے ظاہر ہو گئی۔ فرماں روائے دکن نے نہایت دلی صداقت اور تن دہی سے سلطان کے خلاف جنگ میں شرکت کی۔ اُن کی فوج کی تعداد اور آمدنی کے ذرائع کو دیکھتے ہوئے ان کی اعانت سے جس قدر فائدے کی توقع ہو سکتی تھی اگرچہ وہ اُن کے سپاہیوں کے خصائل اور ان کی حکومت کے طرز عمل سے حاصل نہ ہو سکے تاہم اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ جنگ کے خوشگوار خاتمہ میں اُن کا بہت بڑا حصہ تھا اور درحقیقت بغیر اُن کی اعانت کے یہ جنگ اس قدر بڑے پیمانہ پر نہیں ہو سکتی تھی۔ نظام دکن کی طرف سے جو اعانت کی گئی اور معاہدہ واتحاد کی اتنی کوشش جو کی گئی وہ محض اس خوف کی بناء پر تو مرہٹوں سے تھا اس معاہدہ اور اتحاد کے پردہ میں کارنوالس نے اپنا دلی مدعا حاصل کر لیا کیونکہ اس موقع پر نظام سے زیادہ انگریزوں کو نظام حیدرآباد کے اتحاد اور امداد کی ضرورت تھی تاکہ ٹیپو سلطان جیسے مرد میدان کو شکست دی جا سکے بغیر اتحاد کے مشکل تھا کہ انگریز صرف اپنی تنہا طاقت پر اُسے نیچا دکھا سکتے۔[۵]

ٹیپو سلطان کی قوت اور فوجی تنظیم سے انگریزوں کو فوری خطرہ اور مدراس کی قربت کی وجہ سے خوف میں اضافہ

نواب حیدر علی خان نے انگریزوں پر جس طرح اپنا سکہ جمایا تھا وہ ظاہر ہے۔ ٹیپو سلطان نے انگریزوں کے حق میں اپنے آپ کو باپ سے بھی زیادہ خوفناک ثابت کیا۔ ٹیپو سلطان کی اولو العزمی اور دانشمندی کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب کہ اپنے باپ کی وفات کے بعد بھی کامیابی سے جنگ جاری رکھ کر معاہدہ کیا۔ اس وقت سے انگریز ٹیپو سلطان سے برابر خائف تھے اور جوں جوں سلطان کی قابلیت ظاہر ہوتی گئی اُن کے خوف میں اضافہ ہوتا گیا اس لئے کارنوالس اور پھر ویلزلی نے ٹیپو سلطان سے

۵؎ - حیدرآباد اور مرہٹوں کے تعلقات اور کارنوالس کے اس معاہدہ کی تفصیل باب چہارم میں بیان کی گئی ہے۔

جنگ کی اور آخر کار سلطنت خداداد میسور کا خاتمہ کر دیا۔ تاریخ اس کی گواہ ہے کہ جب نواب حیدر علیخاں مدراس تک پہونچ چکے تھے تو اس کو پورے طور سے فتح کر لینے میں کوئی رکاوٹ درپیش نہ تھی یہ صرف ان کی اولوالعزمی تھی کہ انہوں نے انگریزوں کو ایسے موقع پر چھوڑ دیا اور اُن سے معاہدہ کر لینے پر قناعت کی۔ اگر انگریزوں کو ایسا موقع ملتا تو وہ ہرگز اس آسانی سے اپنے دشمن کو نہ چھوڑتے چنانچہ جب انہیں موقع ملا تو انہوں نے نہ صرف ٹیپو سلطان کو ختم کر دیا بلکہ ان کی اولاد اور سلطنت کا بھی خاتمہ کر دیا تاکہ اُن کی ترقی کے پھول میں یہ کانٹا ہر وقت کھٹکتا نہ رہے۔ الغرض نواب حیدر علیخاں کی وفات کے بعد ٹیپو سلطان نے امر سلطنت کو اس عمدگی سے سنبھال لیا اور اپنی افواج کی تنظیم فرانسیسوں کی سرکردگی میں ایسی کرلی کہ انگریزوں کو اس سے خوف پیدا ہوا کہ کہیں یہ اُن کی طاقت پر حملہ نہ کر دے خصوصاً مدراس کی نزدیکی سے انہیں ہر وقت یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ ٹیپو سلطان کا حملہ پہلے مدراس پر ہوگا اور جب یہ قبضہ میں آجائے گا تو اسکے بعد انگریزی طاقت کو کلکتہ بر باد کرنے کی کوشش کی جائیگی۔

ہند میں اقتدار حاصل کرنے کیلئے آپس میں تصادم

ایک شہنشاہی کی شکست و ریخت اور دوسری شہنشاہی کے قیام پر جن جن واقعات کا مظاہرہ ضروری ہے وہ تمام اس زمانہ میں پیش آئے مغلیہ سلطنت جیسی عظیم الشان حکومت کے کمزور ہوجانے کے بعد ظاہر ہے ہندوستان میں طوائف الملوکی کا بازار گرم تھا۔ ہر ایک ماتحت سردار کسی نہ کسی وجہ سے اپنے آپ کو رئیس بنانے کی کوشش میں تھا۔ اور ریاست کے قیام پر اس کی حفاظت اور وسعت کے لئے دوسروں سے ہمیشہ برسر پیکار رہتا تھا۔ اس زمانہ میں مرہٹوں نے غیر معمولی طاقت حاصل کرلی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کی سیادت اب انہی کے حصہ میں آئے گی۔ ٹھیک ایسے موقع پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں عروج شروع ہوا اسی زمانہ میں پیشوا کی طاقت بھی کمزور ہوتی جارہی تھی اور اُس کے ماتحت سردار خود مختار ہوکر اتنے طاقتور ہوگئے تھے کہ کمپنی کا مقابلہ کر رہے تھے پس ایک طرف سلطنت مغلیہ کے صوبہ دار جو اُسکے زوال کے بعد خود مختاری اختیار کر چکے تھے دوسری طرف سلطنت مرہٹہ کے سرداران

تیسری طرف نواب حیدر علیخاں کا وہ خاندان جو میسور میں اپنی علیحدہ ہی قائم کرچکا تھا ہندوستان میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے آپس میں وقتاً فوقتاً جھگڑتے رہتے تھے ان کے مقابلے میں کمپنی کی طاقت تھی جس نے ہندوستانی سیاست میں حصہ لینا شروع کردیا تھا اور اب وہ اس حالت پر پہونچی تھی کہ ہندوستان میں اپنا اقتدار منوانے کا خیال کرسکے۔ لہٰذا اپنے مدعا کو حاصل کرنے کے لئے کبھی وہ ایک فریق کے ساتھ اور کبھی دوسرے کے ساتھ کبھی معاہدوں کے ذریعہ اور کبھی جنگ کے ذریعہ اپنی حکمت عملی کا اظہار کرتی تھی۔ آخرکار جب اقتدار کے حصول کے لئے تصادم لازمی ہوا تو لارڈ ویلزلی جیسا ذی فہم اور بہادر شخص بہ حیثیت گورنر جنرل ہندوستان آیا اور اس نے برطانوی سیادت کو کہ شاہ و بیشتر ممالک پر اپنی جارحانہ حکمت عملی کے ذریعہ منوالیا۔ مرہٹہ سرداروں میں سب سے مشہور سندھیا ہے جس نے اس زمانہ میں ایک عظیم الشان طاقت جمع کرلی تھی جس کا مظاہرہ نہ صرف جنوبی ہند میں ہوتا تھا بلکہ شمالی ہند میں بھی سندھیا کا اثر دریائے ستلج تک تھا۔ سندھیا اپنی فراست سے شہنشاہ مغلیہ اور پیشوا دونوں کو اپنے زیر اثر لاچکا تھا۔ جب ہندوستان کی دو عظیم ہستیاں اس کے زیر اثر آچکیں تو اس کا خیال اپنے آپ ہندوستان کا تنہا مالک بنانے کا ہوا چنانچہ اس کی تکمیل کے لئے اس نے اپنی افواج کی تنظیم کی۔ فرانسیسی دستے ملازم رکھے اور فرانسیسی افسروں کے ذریعہ اپنی دیسی افواج کو یورپی اصول جنگ سے واقف کرایا جب لارڈ کارنوالس اور سرجان شور کی عدم مداخلت کا زمانہ ختم ہوا اور ویلزلی کی شہنشاہی حکمت عملی شروع ہوئی تو سندھیا کے اس رتبہ کو ہرگز اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا آخرکار سندھیا کا شمالی ہند میں اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ کمپنی سے جنگ لازمی ہوگئی۔

دکن میں کارنوالس کی جنگ کی وجہ سے توازن میں فرق

۱۷۶۹ء اور ۱۷۸۴ء کے معاہدوں کے بعد سے سلطنت میسور سے کمپنی کے تعلقات دوستانہ چلے آرہے تھے۔ لیکن ٹیپو سلطان کی بلند حوصلہ تدبیروں نے کارنوالس کو اپنے عدم مداخلت کے سبق کے خلاف کرنے پر مجبور کیا۔ جولائی ۱۷۹۰ء میں دربار حیدرآباد سے کارنوالس نے جو معاہدہ کیا اس کی وجہ سے ٹیپو سلطان کو کمپنی کے طرز عمل کے متعلق شبہ ہوگیا۔ بعد ازاں کارنوالس نے علانیہ طور پر راجہ ٹراونکور کا

حیلہ نکال کر ٹیپو سلطان سے جنگ مول لی۔ اس جنگ کے لئے ٹیپو سلطان کے خلاف ایک اتحاد ثلاثہ قائم کیا گیا۔ جس میں کمپنی، شہریار دکن اور مرہٹے شریک تھے۔ اس اتحاد کے متعلق خود لارڈ کارنوالس کا یہ خیال تھا کہ "اس وقت نظام اور پیشوا کی اعانت پر بھروسہ کرنے کی صرف یہی ایک وجہ ہے کہ اس معاملہ میں انکے ذاتی اغراض اور انتقامی جذبات شامل ہیں۔ ٹیپو سلطان سے ان دونوں کو نقصان پہونچ چکا ہے۔ لہذا یہ دونوں کسی ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے جس سے انہیں سلطان کی طاقت کم کرنے کی توقع ہو سکے"[۵۵]۔

اس جنگ میں متحدین کامیاب ہوئے جس کے بعد مقبوضات مفتوحہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی، مرہٹوں اور نظام حیدرآباد نے آپس میں تقسیم کرلیا۔ ظاہر ہے کہ اس جنگ کے بعد جنوبی ہند کے توازن قوت میں فرق آگیا۔ کیونکہ ٹیپو سلطان کی نصف سلطنت آپس میں تقسیم کرلی گئی تھی اور تین کروڑ تیس ہزار روپے بھی ان کے ہاتھ آئے۔ اس کی وجہ سے ایک طرف ٹیپو سلطان کی قوت نسبتاً کمزور ہوگئی اور دوسری طرف مخالفین کی قوت نسبتاً زیادہ ہوگئی اور اس طرح کمپنی کا پلّہ بھاری ہوگیا۔

تفوق کے لئے کمپنی کی جدوجہد

اس زمانہ میں تفوق کے لئے کمپنی کی جدوجہد مختلف طریقوں پر جاری رہی۔ شہنشاہ دہلی کی طرف سے مہادوجی سندھیا نے بہ حیثیت سرپرست کے کارنوالس سے اس سالانہ خراج کی ادائی کا مطالبہ کیا جو وارن ہیسٹنگز کے زمانہ تک انگریزوں نے بنگال، بہار، اوڑیسہ کی دیوانی کے معاوضہ میں شہنشاہ مغلیہ کو برابر ادا کیا۔ لیکن چونکہ شہنشاہ اب ایک غیر طاقت کے زیر اثر تھے اس لئے کارنوالس نے اس مطالبہ کی ادائی سے انکار کیا۔ نواب اودھ پر بھی کارنوالس نے اپنا تفوق اس طرح جتایا کہ نواب کے اس مطالبہ کو کہ ہیسٹنگز سے جو معاہدہ ہوا تھا اس کے مطابق اودھ پر فوجی اخراجات کا بار جو بہت زیادہ تھا اٹھالیا جائے اور زائد افواج برخواست کردی جائیں صاف رد کردیا۔ شہریار دکن سے اس زمانہ میں گنٹور حاصل کرلیا گیا اور ٹیپو سلطان سے علانیہ طور پر جنگ کی جاکر برطانوی تفوق جتایا گیا۔

۵۵۔ مراسلہ مورخہ ۲۸ فروری سنہ ۱۷۹۰ء بنام سر چارلس میلٹ۔

مرہٹوں کا انگریزوں سے چوکنا ہونا

الغرض اس زمانہ میں ہر طرف کمپنی تفوق حاصل کرتی جا رہی تھی۔ جس کی وجہ سے پونا کے مرہٹے انگریزوں سے چوکنے ہو گئے اور ہر معاملہ میں ان کی مخالفت اور انہیں نیچا دکھانے کی کوشش کرنے لگے چنانچہ ٹیپو سلطان سے جنگ کے بعد دربار حیدرآباد سے انگریزوں کے نہایت خوشگوار تعلقات تھے لیکن پونا کے دربار میں اس وقت کچھ اور ہی رنگ تھا۔ ٹیپو سلطان سے صلح ہو جانے کے بعد مرہٹوں کی فوج کے سردار ہری پنت نے لارڈ کارنوالس سے سلطنت مرہٹہ کے سرکش باجگذاروں اور زیر دستوں کی سرکوبی کے لئے امدادی فوج کا ایک دستہ انہی شرائط پر طلب کیا جو حیدرآباد کی امدادی فوج کے تھے۔ چونکہ اس فوج کو مادھوجی سندھیا کے خلاف جو نانا فرنویس کا دشمن اور پونا میں اپنا اثر قائم کرنے کی کوششیں کر رہا تھا استعمال کئے جانے کا اندیشہ تھا اس لئے اس تجویز کو لارڈ کارنوالس نے رد کر دیا جسکی وجہ سے دربار پونا میں انگریزوں کے خلاف عام بد دلی پھیلی۔

لارڈ کارنوالس نے دربار حیدرآباد اور پیشوا سے جو اتحاد قائم کیا تھا اس کی تکمیل کے خیال سے ٹیپو سلطان سے جنگ میں فتح حاصل ہو جانے کے بعد اس امر کی کوشش کی کہ سابقہ معاہدہ کی تمام دفعات کو واضح طور پر ایک خاص معاہدہ کی شکل میں ترتیب دے لیا جائے۔ یہاں پر ان دفعات کو واضح کرنے کی ضرورت نہیں البتہ ان کے متعلق دربار پونا کا طرز عمل دکھانا ضروری ہے اس نے انگریزی حکومت کی تجویز کو التوا میں ڈال دیا اور جواب میں تاخیر کی اور اس طور سے صاف ظاہر کر دیا کہ وہ اس قسم کے ان تمام معاہدوں سے علحدہ رہنا چاہتا ہے جن کی وجہ سے آیندہ اسے ٹیپو سلطان اور سلطنت آصفیہ کے خلاف اپنے ارادوں میں کوئی رکاوٹ محسوس ہو۔ اس بناء پر معاہدہ کا خیال قطعاً ترک کر دیا گیا۔

دربار پونا کا انگریزوں کے خلاف میلان صرف معاہدہ کی تکمیل کے انکار ہی سے ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اس کا پتہ مرہٹوں کے اس رویہ سے بھی خوب چلتا ہے جو انہوں نے کمپنی اور حیدرآباد کے تعلقات کے سلسلہ میں اختیار کیا۔ علاوہ ازیں انہیں اسی بنا پر نواب میر نظام علی خاں بہادر سے علانیہ مخاصمت ہو گئی تھی جس کا نتیجہ آخر کار جنگ کھرڈہ ہوئی۔

پونا میں وہاں کے دیوان نانا فرناویس کے علاوہ جو انگریزوں کی روز افزوں ترقی کے خطرے کو روکنے کی فکر میں تھا، مہاجی سندھیا کا طوطی بولتا تھا جو انگریزوں کا سخت دشمن اور سارے ملک میں مرہٹوں کا راج قائم رکھنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ لہذا بقول سر چارلس ہیملٹ "انہیں ہمارے (انگریزوں کی) طاقت و قوت سے بلا وجہ حسد تھا جسکی کچھ انتہا نہیں۔"[۱]

اس رائے کی تائید حکومت پونا کے ہر کام سے اور وہاں کے با اثر لوگوں کی زبان سے ہوتی ہے جیسے رزیڈنٹ نے اپنے مراسلوں میں ظاہر کیا ہے۔ علاوہ ازیں کمپنی کی طاقت میں جو اضافہ ہوا تھا اُس کے تدارک کے لئے سندھیا نے ٹیپو سلطان پر بھروسہ کیا تھا۔

متذکرۂ بالا واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ مرہٹوں اور حیدر آباد کی جنگ سے قبل مرہٹے کمپنی کی کامیابی سے کھٹکتے تھے اور اس کی طاقت دیکھ دیکھ کر ایسا رویہ اختیار کرتے تھے جسے صریح مخاصمت پر محمول کیا جا سکتا تھا۔ جب مرہٹوں کے یہ خیالات تھے تو وہ اس طاقت کے کم کرنے کے موقع کی تلاش میں ضرور تھے۔ اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ حیدر آباد کی طاقت کم کرنے سے ان کا یہ مطلب بھی حاصل ہو جاتا تھا۔

دوسرا باب
عہدِ معاونت کا آغاز

وارن ہیسٹنگز اور اودھ۔ لارڈ کارنوالس اور سر جان شور کے عہد میں وارن ہیسٹنگز کے مسلک کی تائید ہوتی۔

وارن ہیسٹنگز اور اودھ

بنگال پر تسلط قائم کرنے کے بعد ہندوستان شمالی میں سب سے پہلی مرتبہ انگریزوں کو اودھ کی سلطنت سے اس طرح سابقہ پڑا کہ میر قاسم نواب ناظم بنگال فرار ہو کر ۴ دسمبر ۱۷۶۳ء کو اودھ جا پہونچے۔ اتفاق سے شاہ عالم الہ آباد ہی میں موجود تھے۔ لہذا اس موقع کو غنیمت جان کر میر قاسم نے نواب شجاع الدولہ

[۱] میلکم۔ جلد اول صفحہ ۱۰۷۔

اپنی اعانت پر تیار کیا اور شاہ عالم بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ اس طرح یہ زبردست اتحاد ثلاثہ انگریزوں کے خلاف قائم ہوا۔ نواب شجاع الدولہ نے انگریزوں کو ان کی حرکات نازیبا یاد دلا کر ایک سخت خط لکھا اور صفائی طلب کی جس کے بعد متحدین کی فوجیں بہار میں داخل ہوئیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ میر قاسم کو دوبارہ مسند بنگال پر متمکن کیا جائے اور یہ ممکن بھی تھا کیونکہ اس زمانہ میں خود انگریزوں کی حالت ابتر تھی اور وہ اس حملہ سے بہت مرعوب ہو گئے تھے لیکن نواب وزیر کی بدقسمتی اور انگریزوں کے اقبال کی وجہ سے اس جنگ کا نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ بجائے اس کے کہ انگریز مغلوب ہوتے شہنشاہ کو ملا لیا گیا۔ جس کی وجہ سے نواب وزیر اودھ نے اپنا وعدہ ایفا کرنے کے بجائے میر قاسم کو گرفتار کر لیا لیکن یہ چیز انگریزوں کی بدگمانی دور کرنے والی نہیں تھی۔ نواب شجاع الدولہ سے جنگ جاری رہی اور بکسر کے مقام پر ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو نواب وزیر اودھ کو شکست فاش ہوئی۔ اس کے بعد بھی شرائط صلح پورے نہ ہونے کی وجہ سے انگریزوں نے خود اودھ پر حملہ کیا پہلے قلعہ چنار کا محاصرہ کیا گیا جو لاحاصل رہا۔ اس کے بعد الہ آباد پر کوچ کر کے انگریزوں نے وہاں کا قلعہ فتح کر لیا۔ نواب شجاع الدولہ کو اب مجبوراً جنگ ختم اور صلح کرنی پڑی جس کے لئے انگریزوں کو نہ صرف ایک کثیر رقم ادا کی گئی بلکہ غازی پور بھی ان کے حوالہ کر دینا پڑا۔ مجلس نظماء نے حصول غازی پور کو ان الفاظ میں ناپسند کیا کہ "چونکہ جنگ میر قاسم کے خلاف شروع کی گئی تھی اس لئے ہم اس حرکت کو پسند کرتے ہیں لیکن غازی پور کے مطالبہ اور شہنشاہ کے لئے نواب شجاع الدولہ کے مقبوضات حاصل کرنے کی کوشش کو ہم قطعاً پسند نہیں کر سکتے بلکہ اس کو کمپنی کے مفاد و حکمت عملی کے سخت منافی سمجھتے ہیں"[۵]

اس ناپسندیدگی کا نتیجہ یہ نکلا چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو مرہٹوں اور روہیلوں سے اپنے مقبوضات کو محفوظ رکھنے کے سلسلہ میں نواب وزیر اودھ کو خوش رکھنا پڑتا تھا اس لئے انہوں نے اس کے بعد اپنی حکمت عملی بدلی چنانچہ ۱۶ اگست ۱۷۶۵ء کو بمقام الہ آباد کمپنی نواب وزیر اودھ اور نواب نجم الدولہ صوبہ دار بنگال، بہار اور اوڑیسہ کے مابین جو عہد نامہ طے پایا اور جو کمپنی او

۵۔ ایضاً صفحہ ۱۲۹

نواب وزیر کے مابین پہلا باضابطہ معاہدہ ہے بالکل مساوی حیثیت رکھتا ہے اس میں کمپنی اور نواب نجم الدولہ ایک طرف اور نواب شجاع الدولہ دوسری طرف ایک دوسرے کی باہمی دوستی اور اتحاد کا وعدہ کرتے ہیں نیز انگریزوں نے نواب وزیر کے تمام مقبوضات واپس کر دیئے بجز کڑہ اور الہ آباد کے جو شہنشاہ شاہ عالم کو ذات شاہانہ کا وقار قائم رکھنے کی غرض سے دیئے گئے تھے اور انگریزی فوجیں بھی نواب وزیر کے علاقہ سے واپس بلالی گئیں۔ نواب وزیر اودھ کی طرف سے جنگ کے تعاون میں پچاس لاکھ روپے مختلف اوقات میں ادا کرنے کا اور اپنے علاقہ میں انگریزوں کو بلا محصول تجارت کی اجازت کا وعدہ کیا گیا۔[۱]

غرض اس عہد نامہ کے تمام دفعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شرائط مساوی حیثیت کے تھے اور ایک دوسرے کی دوستی اور اعانت کے لئے طے کئے گئے تھے تاکہ ہر ایک کے علاقہ میں امن اور خوشحالی برقرار رہے بعد ازآں نواب نجم الدولہ کے انتقال پر نواب سیف الدولہ کے عہد میں ۱۷۶۶ء کو عہد نامہ کی لفظ بہ لفظ اور فقرہ بہ فقرہ توثیق کی گئی۔ لیکن سلطنت اودھ کے ساتھ تعلقات کی سابق نوعیت باقی نہیں رہی اور وارن ہیسٹنگز کے زمانہ میں سب سے پہلی مرتبہ اُن تعلقات کی ابتداء کی گئی جس نے سرہنری لارنس کے قول کے مطابق ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نشو ونما کے سلسلہ میں دایہ کا کام کیا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے " انگلستان میں ہندوستان کے کسی حصہ کا اتنا چرچا نہیں ہے جتنا کہ اودھ کا ہے۔ افغانستان اور پنجاب کے مباحث جدید ہیں لیکن نصف صدی سے باشندگان انگلستان کے دماغ میں ہندوستان کے ایک ایسے صوبے کے خیالات گشت لگا رہے ہیں جو اپنے امور داخلہ میں برائے نام آزاد ہے اور جس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی مالی مشکلات کے سلسلہ میں دایہ کا کام لیا جاتا ہے"[۲]

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شاہ عالم کے مرہٹوں کے زیر حمایت چلے جانے کے بعد وارن ہیسٹنگز اور نواب شجاع الدولہ کے مابین ۱۷۷۳ء میں ایک عہد نامہ عمل میں آیا کہ

۱ھ۔ اقتباس۔ اے۔ پی۔ سن۔ معاہدات جلد ۲ صفحات ۷۶ تا ۷۹۔ ۲ھ۔ بامو صفحہ ۲۴۶

"چونکہ شہنشاہ مغلیہ نے کڑہ اور الہ آباد سے دست برداری اختیار کر لی ہے اس لئے یہ ممالک بھی نواب وزیر کے قبضہ میں دیدیئے جائیں۔ انگریزوں کی طرف سے ان میں کسی طرح کی مزاحمت نہیں کی جائے گی بلکہ وہ نواب وزیر کے اس طرح دست نگر رہیں گے جس طرح دیگر علاقے ہیں۔ نواب وزیر کی طرف سے کمپنی کو پچاس لاکھ روپے اقساط میں ادا کئے جائیں گے۔ کمپنی کی فوجیں جو نواب وزیر کی حمایت کیلئے روانہ کی جائینگی اُن کے اخراجات کی ادائی کے سلسلہ میں کش مکش سے بچنے کے لئے یہ طے پایا کہ فوج کے ایک دستہ کے اخراجات دو لاکھ دس ہزار سکہ اودھ ماہانہ ہوں۔ ان افواج کے اخراجات نواب وزیر پر اس وقت سے عائد کئے جائیں گے جب سے کہ یہ فوجیں اُن کی حدود میں داخل ہوں اور اس وقت تک برقرار رہیں گے جب تک کہ وہ صوبہ بہار کی سرحد میں واپس نہ ہوں اگر کمپنی کو نواب وزیر کی ویسی افواج کی ضرورت پڑے تو اُن کے اخراجات کی ادائی بھی کمپنی کی طرف سے متذکرہ بالا طریقہ پر ہوگی" [۱]

اس معاہدہ کے ذریعہ رقمی تعین کے ساتھ ساتھ فوجی تعین بھی کر لیا گیا یعنے ایک دستۂ فوج میں دو دستے یورپی چھ دستے دیسی اور ایک توپ خانہ ہوگا اور یہ شرط ادائی بھی واضح طور پر قرار پائی کہ فلاں وقت سے فلاں وقت تک رقم ادا شدنی رہے گی۔ اس لحاظ سے جتنے دستے جتنی مدت کیلئے درکار تھے اُن کی بابتہ رقم کا تعین کیا گیا گویا ایک غیر معین چیز کا تعین عمل میں آیا اور اس طرح رفتہ رفتہ سلطنت اودھ کو معاہدات کی تدریجی راہ اختیار کرنی پڑی چنانچہ ۱۷۷۳ء کا معاہدہ جو وارن ہیسٹنگز اور نواب آصف الدولہ کے مابین ہے وہ متذکرہ بالا عہدنامہ سے زیادہ منظم حیثیت رکھتا ہے۔ یہ فوجی امداد اور سلطنت اودھ سے اس کے مصارف کا انتظام وہ پہلی اہم شرط ہے جس پر کہ لارڈ ویلزلی نے اپنے معاونتی معاہدوں کی بنیاد رکھی۔

۱۷۷۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور نواب آصف الدولہ کے مابین منجملہ دیگر شرائط کے یہ بھی طے پایا کہ :—

۱؎ اقتباس (۲۲) ایچی سن معاہدات جلد (۲) صفحات ۸۲ تا ۸۶

"نواب وزیر صوبۂ اودھ کرہ اور الہ آباد کی حفاظت کے معاوضہ میں جو کمپنی کی طرف سے لی جائے گی بہ رضا و رغبت خود راجہ چیت سنگھ کے تحت جو علاقے تھے معہ محاصل بری و بحری و شاہی اختیارات (LAND & WATER DUTIES) کے انگریزی کمپنی کو ہمیشہ کیلئے دیدینگے۔ نواب آصف الدولہ انگریزی فوج کی امداد کیلئے تاریخ معاہدہ سے ماہانہ دو لاکھ ساٹھ ہزار روپے سکۂ اودھ ادا کریں گے اس رقم کی ادائی نواب وزیر پر ماہانہ اس وقت سے لازم ہوگی جب سے کہ کمپنی کی فوج اُن کی سرحد میں داخل ہو اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ انکی واپسی عمل میں آئے اگر نواب آصف الدولہ کو متذکرہ بالا علاقوں کے علاوہ اپنے کسی اور علاقہ کی حفاظت کے سلسلہ میں انگریزی امداد کی ضرورت ہو تو اس کا معاوضہ نوعیت کام کے لحاظ سے دیا جائے"[۱]

ظاہر ہے کہ یہ معاہدہ ۱۷۷۳ء کے معاہدہ سے زیادہ ارتقائی حیثیت رکھتا ہے اس میں اکثر ایسی چیزیں طے پائیں جو عہد معاونت کے جزو اہم ہیں۔ حفاظت کے بدلے میں معاوضہ کا یہ شکل مقبوضات تعین اس معاہدہ میں ہوتا ہے۔ فوجی مصارف میں پچاس ہزار کے اضافہ کے ساتھ ساتھ فوج کا مستقل قیام اور رقم کی ادائی عمل میں آتی ہے اس کے علاوہ غیر معمولی امداد جو متذکرہ بالا علاقوں کے سوائے دیگر علاقہ جات کی حفاظت کے سلسلہ میں طلب کی جائے گی اس کا معاوضہ علیحدہ مقرر دیا جاتا ہے۔

نواب وزیر الممالک، آصف الدولہ آصف جاہ کے اصرار پر کہ وہ انگریزی کمپنی کے اخراجات کا بار نہیں برداشت کر سکتے اور ان کے دوستانہ تعلقات رعایت کے مستحق ہیں وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل نے ۱۹ ستمبر ۱۷۸۱ء میں ان سے ایک اور معاہدہ طے کیا جسکی رو سے ہنگامی بریگیڈ اور سوائے فوج کے تین دستوں اور بجز رزیڈنسی کے دفتر کے دیگر تمام انگریزی عہدہ داروں کی تنخواہ جو اب تک نواب کے خزانہ سے ادا کی جاتی تھی بجز بقایا اور اس مدت کے لئے جو اس کی سرحد سے گزرنے کے لئے درکار ہے بند کر دی گئی۔

قصہ مختصر یہ کہ نواب پر صرف اُس ایک دستہ کے اخراجات کی ادائی لازم قرار پائی جس کا

---

[۱] - اے جی سن۔ معاہدات۔ جلد دوم، نمبر ۲۵ صفحات ۶ تا ۹۔

تصفیہ نواب شجاع الدولہ مرحوم سے ہوا تھا اور جس کے لئے اب ماہانہ دو لاکھ ساٹھ ہزار روپے سکہ اودھ ادا کئے جاتے تھے البتہ اُس میں ایک دیسی دستہ کا اضافہ کر دیا گیا جو رزیڈنسی کی محافظت کے لئے مقرر ہوا۔ اس کی تنخواہ آیندہ اگست سے ماہانہ پچیس ہزار روپے کے حساب سے قرار پائی۔ اگر آیندہ نواب وزیر کو مزید انگریزی فوجوں کی ضرورت ہو تو ان کے مطالبات اسی رو سے ادا شدنی قرار دیے گئے جب کہ وہ ان کے حدود میں داخل ہوں[۱۵]

پس معلوم ہوا کہ رعایت بے پردہ میں ابتدا میں جس فوج کا قیام عمل میں آیا تھا مصارف کی زیادتی کے ساتھ برقرار رہا۔ بلکہ اُس میں ایک دستہ اور اضافہ کر دیا گیا جو رزیڈنسی کی محافظت کے لئے مقرر ہوا۔ اس کے اخراجات کی زیادتی تو ایک یقینی امر تھا۔ ساتھ ہی ساتھ مزید افواج کے اخراجات کے متعلق بھی طے کر دیا گیا کہ وہ علیحدہ ہوں گے۔ ایک طرف رعایت کے کرشمے اور دوسری طرف اپنے مقصد کو مستقل کر جانے سے وارن ہیسٹنگز نے ویلزلی کے لئے "عہد معاونت" کا راستہ صاف کر دیا جس کا پورا پورا نمونہ سلطنت اودھ میں موجود تھا۔ جو وارن ہیسٹنگز کی ہی فراست کا نتیجہ تھا۔ ویلزلی کے مسلک کی یہ ابتدا کہی جا سکتی ہے، چنانچہ جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے اودھ کو عہد معاونت کے تحت لانے میں ویلزلی کو بہت تھوڑی تبدیلی کرنی پڑی۔

لارڈ کارنوالس اور سر جان شور کے عہد میں وارن ہیسٹنگز کے مسلک کی تائید و ترقی

عہد نامہ فیض آباد کی رو سے جو نواب وزیر آصف الدولہ نے اوائل ۱۷۷۵ء میں اپنی مسند نشینی کے بعد کیا تھا من جملہ دیگر شرایط کے یہ طے پایا تھا کہ اگر صوبۂ اودھ کوڑہ اور الٰہ آباد کے علاوہ کسی دوسرے علاقے کی حفاظت کے لئے زائد فوج درکار ہو گی تو اس کے اخراجات علیحدہ لئے جائیں گے اور انہیں ضرورت کے وقت طے کر لیا جائے گا اس عہد نامہ کے چند ماہ بعد ہی ریاست کی بد امنی اور فوج کی بے قاعدگی اور بدنظمی کی وجہ سے، نواب آصف الدولہ نے گورنر جنرل کو لکھا کہ انہیں چند انگریز افسر دیے جائیں جو چھ فوجی بٹالین کی کمان لے سکیں اور ان کے ساتھ ایک توپ خانہ اور اسی مناسبت سے کچھ سوارہ فوج بھی

---

۱۵ - اے چی سن - معاہدات جلد (۱) ص ۲۷ صفحات ۹۳ تا ۹۵

مہیا کی جائے۔ توپ خانے اور سوارہ فوج کی ترتیب پورے طور سے انگریزی حکومت کی مرضی پر چھوڑ دی گئی اور وعدہ کیا گیا کہ ان کی تنخواہ کے باقاعدہ ادا ہونے کا انتظام کر دیا جائے گا۔ اس طور سے جو فوج تیار کی گئی اُسے ۱۷۷۷ء میں کمپنی کی فوج میں شامل کر کے فرخ آباد میں رکھ دیا گیا۔ نواب کی خدمت کے لئے جو باقاعدہ فوج کانپور میں رکھی گئی تھی اُس سے اُسے ممتاز کرنے کے لئے اس کا نام عارضی فوج رکھا گیا۔ اور نواب وزیر کے ذمے اس کے اخراجات تقریباً تیس[۳۰] لاکھ سالانہ ہوئے۔

جب یہ عارضی فوج تیار ہو گئی تو نواب وزیر کو مطلع کر دیا گیا کہ جب تک انہیں اس فوج کی ضرورت رہے گی اس کے پورے اخراجات اُن کے ذمے ہوں گے۔ لیکن ناظماء نے اس شرط پر اعتراض کیا کہ اس کا مطلب واضح نہیں تھا۔ آیا یہ کہ نواب وزیر کو آزادی حاصل رہے گی کہ وہ جب چاہیں اس کو برخواست کر دیں۔ اول الذکر صورت کمپنی کے مفاد کے خلاف تھی کیوں کہ اس کی وجہ سے کمپنی کو آئندہ سخت دقتوں کا سامنا پیش آنے کا اندیشہ تھا اور ثانی الذکر صورت سے سراسر نواب کے حق میں بے انصافی ہوتی یعنی یہ کہ ایک فوج کو عارضی کہہ کر دیا جائے اور بعد میں اپنے اثرات کے تحت اس کو کبھی واپس نہ لیا جائے۔ چنانچہ جن دقتوں کا ناظماء نے اندازہ کیا تھا وہ بہت جلد پیش آئیں ۱۷۷۹ء میں نواب وزیر نے بارش کی قلت کی وجہ سے اور اپنی آمدنی کم ہونے سے اپنے آپ کو کمپنی کے مطالبات پورے کرنے کا ناقابل بتایا اور فرخ آباد کی فوج کو برخاست کرنے کی درخواست کی لیکن ہیسٹنگز نے نواب کے مطالبہ کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اودھ کی اندرونی و بیرونی حفاظت کے لئے ان فوجوں کا برقرار رہنا ضروری ہے۔

نواب وزیر نے اس وقت تو گورنر جنرل کے دلائل طوعاً و کرہاً تسلیم کر لیے اور خاموشی اختیار کر لی لیکن موقع ملتے ہی اس معاملے کو دوبارہ چھیڑ دیا چنانچہ چیت سنگھ کی بغاوت کے سلسلے میں اس نے انگریزی حکومت کو امداد دی اور اس کے صلے میں ان فوجوں کے برخاست کرنے کا پھر مطالبہ کیا جس پر ۹ ستمبر ۱۷۸۱ء کے معاہدہ کی رو سے یہ قرار پایا کہ عارضی فوج کمپنی کے حدود میں واپس بلائی جائے گی لیکن یہ شرط پوری نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ ۱۷۸۴ء میں وارن ہیسٹنگز نے لکھنؤ میں نواب سے خود بالمشافہ وعدہ کر کے ریذیڈنٹ کو اس فوج کے برخاست کرنے کے متعلق احکام بھی دے دیئے لیکن

کلکتہ پہونچ کر ان احکام کو منسوخ کر دیا اور نواب کو مطلع کیا کہ مجلس کے اراکین اس کے خلاف ہیں اور چونکہ اس کی واپسی کا زمانہ قریب تھا اس لئے اس کا لڑنا ٹھیک نہیں کیونکہ اس تحریک کو کہیں اس کی مخالفت پر محمول نہ کر لیا جائے اور اس کی وجہ سے اس کے جانشین کی حکومت پر کوئی مضر اثر نہ پڑے۔

وارن ہیسٹنگز کی واپسی اور لارڈ کارنوالس کی آمد تک جو وقفہ گذرا اس میں نواب وزیر اتنے بے چین ہو گئے کہ لارڈ کارنوالس کے ہندوستان پہونچتے ہی اپنے وزیر حیدر بیگ خاں کو فورٹ ولیم روانہ کیا تاکہ نواب کی حالت سے اُسے آگاہ کرے اور اسے بے جا بار سے نجات دلائے۔ دیوان موصوف اور گورنر جنرل کے مابین جو گفتگو ہوئی اور جو شرائط طے پائے اس کی اطلاع کارنوالس نے نواب وزیر کو بذریعہ خط مورخہ ۱۵ اپریل ۱۷۸۷ء دی۔ اس کی توثیق نواب نے ۲۱ جولائی ۱۷۸۷ء کو کی اور اس طرح سنہ ۱۷۸۷ء کا عہد نامہ طے پایا۔ کارنوالس نے اپنی رائے میں اس فوج کا قیام نواب وزیر اور کمپنی دونوں کے مفاد کے لئے ضروری سمجھا کیونکہ تنہا کانپور کی فوج نواب وزیر کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے کافی نہیں سمجھی جا سکتی تھی۔ البتہ نواب وزیر سے جو رقمیں وصول کی گئیں ہیں ان سب کی تعداد پچاس لاکھ سالانہ متعین کر دی گئی۔

اس رقم میں فوج، ریذیڈنسی اور دیگر تمام اخراجات اور مطالبات شامل تھے۔ یہ بھی وعدہ کیا گیا کہ آئندہ کوئی مزید ناواجبی مطالبہ نہیں کیا جائے گا البتہ اگر نواب کو مزید فوج درکار ہو تو اس کے مصارف علیحدہ ہونگے۔ اگر آئندہ کسی موقع پر موجودہ افواج میں کمی کر دی جائے گی تو اس کے ساتھ ساتھ اس پچاس لاکھ کی رقم میں بھی واجبی کمی کر دی جائے گی۔ کارنوالس کی تجویز کے مطابق یہ ایک رقم تھی جو ایک طرف کمپنی کے مطالبات کو پورا کرتی تھی اور دوسری طرف نواب کو اس کی ادائی میں کوئی دقت پیش نہیں آ سکتی تھی۔ اگر دقت کا اندیشہ ہو تو نواب کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنی دیسی فوج کا کچھ حصہ برخواست کر دیں کیونکہ اس کا رہنا اور نہ رہنا یکساں تھا۔

حیدر بیگ خاں کے اصرار پر آئندہ فوج ہٹائی جانے کا وعدہ کیا گیا لیکن کارنوالس کا خیال تھا

شاید ہی کبھی ایسا موقع آئے۔ ان شرایط کو کارنوالس نے نہایت موزوں خیال کیا ہے۔ کیونکہ ملک کی حفاظت خود نواب کی ذات کے لئے ضروری تھی اور معاوضہ واجبی لیا جارہا تھا۔[۵]

اس معاہدہ کے شرایط نہایت موزوں ہونے کے متعلق خود لارڈ کارنوالس کا بیان ہے کہ:

”نواب وزیر اور کمپنی کے تعلقات فی الوقت اس اساس پر قائم ہیں کہ انہیں استوار کیا جائے۔ ہم نواب وزیر کے ملک کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں اور اسکے بدلہ میں وہ اس بات پر رضامند ہیں کہ وہ ان تمام اخراجات کی بجا آوری کریں گے جو اس معاہدہ کی رو سے ان پر عاید ہوتے ہیں اور جو خود انکے لئے بہت قیمتی ہے۔ اندرونی نظم و نسق کے ذمہ دار بلا شرکت غیرے خود وہی ہیں۔ جب تک نواب وزیر اس معاہدہ کے شرائط پورا کرتے رہینگے میں بھی اپنی توجہ اس بات پر مرکوز رکھونگا کہ یہ طریقہ برقرار رہے۔“[۶]

متذکرۂ بالا بیان سے واضح ہوگا کہ فوجی امداد اور سلطنت اودھ سے اس کے مصارف کے انتظام کی حکمت عملی جو عہد معاونت کی اہم شرط ہے، اُسے لارڈ کارنوالس نے بھی اپنے عہد میں برقرار رکھا۔ وارن ہیسٹنگز نے فرخ آباد کی فوج کو برخاست کرنے سے یہ کہکر گریز کیا تھا کہ وہ اس کا ذاتی حکم تھا، اور کہیں اُس سے اس کے جانشین کی حکومت پر کوئی مضر اثر نہ پڑے۔ اسی طرح لارڈ کارنوالس نے یہ امر مناسب نہیں سمجھا کہ اپنے پیشرو کی حکمت عملی میں رخنہ اندازی پیدا کی جائے۔ لہذا ضرورت کی اہمیت بتاکر اودھ کا پورا فوجی نظام بحال رکھا گیا صرف رعایت یہ کی گئی کہ ناواجبی مطالبات گھٹا کر کل اخراجات کی تعداد پچاس لاکھ معین کر دی گئی۔ اس رعایت کے ساتھ کارنوالس نے نواب وزیر کو اندرونی آزادی کا اطمینان بھی دلایا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ ضرورت کے وقت مداخلت نہ کی جائے چنانچہ لارڈ کارنوالس کا خیال تھا کہ اودھ اور کمپنی کے تعلقات اب ماتحت حکمران کے ہو چلے ہیں جن کی وجہ سے اگرچہ اندرونی نظم و نسق میں مداخلت کی ضرورت نہیں تاہم تعلقات کے لحاظ سے یہ امر ضروری ہوتا جاتا تھا، لہذا سر جان شور نے اسی اصول کے تحت جب ضرورت ہوئی تو اندرونی معاملات میں مداخلت کر دی۔

نواب آصف الدولہ کا انتقال سر جان شور کے زمانہ میں ہوا اور نواب وزیر علیخاں جنہیں ریاست کے

---

[۵] - ایچی سن، معاہدات، جلد ۲ ص ۲۸ صفحات ۹۷ تا ۱۰۶۔ [۶] - میلکم جلد اول صفحہ ۱۱۰

وارث ہونے کا دعویٰ تھا مسند نشین ہوئے ۔ اس موقع پر نواب آصف الدولہ کے بھائی نواب سعادت علی خاں نے کمپنی کے اس فیصلے کے خلاف مرافعہ کیا۔ لیکن سرجان شور نے اس کے خلاف فیصلہ کیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اپنے ایک مراسلہ میں یہ بھی تحریر کیا کہ " میں نہایت پس وپیش کے بعد اس نتیجے پر پہونچا ہوں کیونکہ نواب وزیر علی خاں کی بابت جو عام خیال ہے کہ ان کا نسب صحیح نہیں ہے اسے رفع نہیں کیا جا سکتا اور ایسی حالت میں کمپنی کے نام اور انصاف پر بٹہ آنے سے جو خطرہ ہے اس کا بھی مجھے بخوبی احساس ہے۔[۱۵]"

ان خیالات کے ساتھ سرجان شور لکھنو روانہ ہوئے لیکن اسی مراسلہ میں یہ بھی لکھ دیا گیا کہ

" جن انتظامات کا وہاں اراوہ ہے ان میں وراثت کے لئے فیصلے کو تبدیل کرنے کا قطعاً خیال نہیں البتہ یہ ممکن ہے کہ وہاں کی رعایا کو اپنے جدید نواب سے عام نفرت ہو تو مجھے اس معاملے پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت پڑے[۱۶]"

سرجان شور لکھنو پہونچتے ہی وہاں کے دیوان تفضل حسین نے ان سے ملاقات کی اور مطلع کیا کہ نواب وزیر علیخاں اور تمام دوسرے لوگ جو آصف الدولہ کے بیٹے مشہور ہیں سب اولاد ناجائز ہیں۔ اور اس میں قطعی شبہ کی گنجایش نہیں لہذا نواب سعادت علی خاں کا مسند پر حق ہے دیوان مذکور نے یہ بھی بیان کیا کہ " مسند نشینی کے وقت اگرچہ کوئی مخالفت نہیں ہوئی تاہم اس کے بعد سے ہر شخص متحیر اور مایوس ہے لیکن چونکہ برطانوی حکومت نے اسے تسلیم کر لیا ہے اس وجہ سے کسی کی ہمت علانیہ مخالفت کرنے کی نہیں ہے[۱۷]"

اس بیان کے بعد گورنر جنرل نے وزیر علیخاں کے صحیح النسب ہونے کے متعلق مزید تحقیقات شروع کی اس کے بعد گورنر جنرل نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ غیر ناجائز بیٹے ہیں۔ لہذا ان کو معزول اور نواب سعادت علیخاں کو مسند نشین کیا جائے۔

مسند نشینی کے بعد کمپنی کے ساتھ نواب وزیر علی خاں کا طرز عمل کچھ ٹھیک نہیں۔ ہا وہ ہمیشہ اس کے مفاد کے خلاف مخاصمانہ تدابیر سوچنے میں مشغول رہے۔ گورنر جنرل کی یہ رائے تھی کہ اس کا تدارک صرف ان کو علیحدہ کر دینے سے ہی ہو سکتا ہے اس سلسلہ میں اس نے اودھ اور کمپنی کے تعلقات پر یوں تبصرہ کیا ہے

۱۵۔ میلکم جلد اول صفحہ ۱۴۶

"اودھ سے کمپنی کے معاہدے ... کچھ ہی ہوں وہ درحقیقت اس کی ایک ماتحت ریاست ہے۔ تمام لوگوں کا خیال ہے کہ شجاع الدولہ کو سلطنت کمپنی کی طرف سے بطور عطیہ کے ملی تھی اور ان کی نگاہ میں نواب وزیر کی حیثیت ایک ماتحت نواب کی سی ہے۔ ان واقعات کے لحاظ سے اگر اودھ میں زیادہ اثر جاتا رہا تو سیاسی حلقوں میں ہماری کس قدر سبکی ہو گی۔[1]"

ان تمام واقعات کی بنا پر نواب وزیر علیخاں کو معزول اور نواب سعادت علیخاں کو مسند نشین کر دیا گیا اس موقع پر گورنر جنرل اور سعادت علیخاں کے مابین جو عہد نامہ ۱۷۹۸ء کے اوائل میں عمل میں آیا بہت اہمیت رکھتا ہے۔

اس کے ذریعہ کمپنی اور اودھ کے سیاسی تعلقات چند اہم معاملات میں بالکل بدل گئے۔ اس کی رو سے ریاست کی حفاظت کمپنی کے ذمہ ہو گئی۔ یہ ان کا فرض اولین تھا۔ اس کے لئے چونکہ فوج میں زیادتی کی ضرورت تھی اس لئے نواب نے سالانہ رقم میں اضافہ کرنے کا وعدہ کر لیا جس کی تعداد اب سالانہ چھہتر لاکھ سکہ اودھ تھی زیادتی جو سعادت علیخاں کی مسند نشینی کی تاریخ سے واجب الادا تھی۔ کمپنی کی طرف سے فوج کی تعداد دس ہزار مقرر کی گئی۔ یہ قرار دیا گیا کہ فوج اس سے کم نہیں رکھی جائیگی۔ اور اگر کسی موقع پر اس فوج کی تعداد کو تیرہ ہزار سے زیادہ کرنے کی ضرورت پڑے تو نواب جو کچھ واجبی اضافہ عاید ہوا ادا کریں گے اور اگر اتفاق سے اس فوج کی تعداد آٹھ ہزار سے کم ہو تو سالانہ رقم میں کمی کر دی جائے گی۔ نواب کی طرف سے انگریزوں کی دوستی کے مدنظر انہیں قلعہ الہ آباد دے دیا گیا معہ گھاٹ وغیرہ کے جس کی آمدنی نواب کو ادا شدنی تھی۔ اس قلعہ کی تعمیر کے لئے نواب نے رقم دینے کا بھی وعدہ کیا۔ اودھ میں فوجی نقل وحرکت کلیتہً انگریزوں کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی۔ نواب سعادت علی خاں کی مسند نشینی کے سلسلہ میں جو اخراجات کمپنی کو عائد ہوئے تھے ان کو بھی ادا کرنے کا نواب نے وعدہ کیا۔ یہ بھی طے پایا کہ سالانہ رقم کی قسط اگر ناغہ ہو اور بقایا بر آمد ہو تو اس کی ادائی کے لئے معقول ضمانت پیش کی جائے گی۔ کمپنی کے مطالبات کی زیادتی کے بدلے میں نواب کے خانگی اخراجات میں کمی کے لئے نواب نے وعدہ کیا کہ کمپنی سے مشورہ کیا جائے گا۔ نواب سعادت علی خاں بغیر اجازت کمپنی کے

---

[1] بیلکم جلد اول صفحہ (۱۴۷)

کسی بیرونی یا اندرونی طاقت سے مراسلت یا کسی قسم کے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش نہیں کریں گے البتہ اپنے کاروبار، خانہ داری، موروثی جائداد، حکومت، دیسی افواج اور رعایا پر حکومت کرنے کی انہیں کامل آزادی تھی۔[1]

اس معاہدہ سے ایک طرف کمپنی کی طاقت بہت بڑھ گئی اور دوسری طرف ریاست کی قوت کم ہوگئی اور اس کے ذمے اب صرف پولیس کا نام باقی رہ گیا۔ حکمران اور ماتحت کا جو خیال کارنوالس نے قائم کیا تھا وہ اور مستحکم ہوگیا۔ اس معاہدہ میں ایک شرط اسی نوعیت کی پائی جاتی ہے۔ کارنوالس نے حسب ضرورت اودھ کے اندرونی نظم ونسق میں مداخلت کرنا کمپنی کے لئے ضروری قرار دیا تھا۔ چنانچہ سرجان شور نے وراثت جیسے مسئلہ میں ہاتھ ڈالا اور خود اپنے فیصلہ کو بدل کر سلطنت اودھ کے ساتھ ایسا عہد نامہ طے کیا جس سے کہ نواب وزیر کلیتہً کمپنی کے دست نگر ہوگئے۔ ہر ایک شرط جو کمپنی کی سیاسی ترقی پر منحصر تھی نواب سے منوائی گئی۔ یہاں تک کہ مجوزہ عہدنامہ میں ایک شرط بھی تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ مسند نشینی کا پورا دارومدار پیش کردہ شرایط کو کلیتہً قبول کرلینے پر رکھا گیا۔ جب نواب نے سلطنت کے شوق میں اسے قبول کرلیا اور اس طرح اپنی آزادی کے ساتھ ساتھ سلطنت اودھ کی آزادی کا دور حیات بھی ختم کردیا۔ فوج اور اخراجات میں زیادتی، قلعوں پر قبضہ، بقایا کے لئے ضمانت یا کفالت اور دوسروں سے تعلقات پیدا کرنے کی ممانعت یہ سب ایسے شرائط ہیں جو ایک طرف مقتدر اور ماتحت کے طاقتور اور کمزور تعلقات کو علی الترتیب ظاہر کرتے ہیں اور دوسری طرف یہی عہد معاونت کے اہم ترین شرایط ہیں۔ نیز ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرجان شور کے زمانہ میں بھی عہد معاونت اودھ میں مکمل ہوچکا تھا، ویلزلی نے صرف اس کی توسیع کی یعنے رقم کی ادائی کے معاوضہ میں ایسے علاقے حاصل کرلئے جو فوجی نقطۂ نظر سے اہم تھے۔

تیسرا باب

ویلزلی اور عہد معاونت

ویلزلی کی آمد کے وقت اس کے خیالات

سرجان شور کے بعد ہندوستان کی گورنر جنرلی پر دوبارہ لارڈ کارنوالس کو نامزد کیا گیا تھا۔

---

[1] [illegible]

لیکن اچانک اس کا تقرر کالعدم کرکے لارڈ ویلزلی کو اس عہدہ پر یہ کہکر مامور کیا گیا کہ "یہ تقرر غیر معمولی ضروریات اور اسباب کی بناء پر عمل میں لایا جارہا ہے"[1]

مجلس نظماء کے اس استدلال کی صرف اتنی توضیح کی جاسکتی ہے کہ زمانہ کے حالات کے تحت کمپنی کو ایک ایسے گورنر جنرل کی ضرورت تھی جو سرجان شور کی غلطیوں کی تلافی کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں اس کے لئے پہلے سے زیادہ نفع بخش اور مفید مراعات و وسائل حاصل کرسکے۔ ان خیالات کے تحت ویلزلی کو سمجھا بجھا کر ہندوستان روانہ کیا گیا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب انگلستان سے روانہ ہوئے تو لارڈ ویلزلی کے خیالات جارحانہ نہیں تھے انہیں مطلق اس بات کا خیال نہیں تھا کہ ایک جارحانہ حکمت عملی اختیار کرنی پڑے گی۔ اور کمپنی کے اقتدار کے سلسلہ میں گونا گوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا نیز بڑی بڑی فتوحات اور مقبوضات حاصل ہونگے۔

خیالات میں تبدیلی

لیکن لارڈ ویلزلی کا جہاز راس امید پہونچا تو یہاں چند ایسے افراد سے ملاقات ہوئی جو اس زمانہ کے ہندوستانی حالات سے بخوبی واقف تھے انہوں نے لارڈ ویلزلی کو تمام حالات سے واقف کیا۔ ویلزلی کو اس مراسلہ کے ذریعہ بھی معلومات حاصل ہوئے جو ہوٹن (HOUGHTON) جہاز کے ذریعہ کلکتہ سے مجلس نظماء کے پاس روانہ کیا جارہا تھا۔ لارڈ میکارٹنی (LORD MACARTNEY) جو حیدرعلی سے دوسری جنگ کے وقت مدراس کے گورنر تھے لارڈ ہابرٹ (HOBORT) جو مدراس کے گورنر تھے ڈیوڈ بیرڈ (DAVID BAIRD) سرنگاپٹم میں قید رہ چکا تھا۔ اور میجر کرک پیٹرک MAJOR KIRK PETRICK) حیدرآباد کے رزیڈنٹ یہ وہ لوگ ہیں جن سے لارڈ ویلزلی کی ملاقات راس امید میں ہوئی اور جنہوں نے اس زمانہ کے ہندوستانی حالات سے لارڈ ویلزلی کو واقف کرایا۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں سے واقعات معلوم ہونے پر لارڈ ویلزلی کی معلومات میں ضرور اضافہ ہوا ہوگا کیونکہ پہلے سے ہی لارڈ ویلزلی کو ہندوستانی حالات سے ناواقف نہیں کہا جاسکتا تھا بلکہ دوران قیام انگلستان میں ہی ہندوستانی معاملات سے واسطہ پڑتا رہتا تھا معلومات میں اضافہ کے

[1] ویلزلی کے حالات اور مراسلت۔ مصنفہ بیرسر جلد اول صفحہ (۱۳۵)

ساتھ ساتھ ویلزلی کے خیالات میں تبدیلی ہوئی۔ اب وہ خیالات برقرار نہیں رہ سکتے تھے جو انگلستان چلتے وقت ذہن نشین تھے۔ مذکورہ بالا اشخاص کی گفتگو کا واحد موضوع فرانسیسیوں کی سازش تھا جو ہندوستان میں ہر جگہ کام کر رہی تھی۔ ان واقعات نے ویلزلی کو فرانسیسیوں کا سخت دشمن بنا دیا کیونکہ ویلزلی کی آمد مزید چند خیالات کے تحت ہوئی وہ یہ تھے کہ ہندوستان میں امن و امان قائم کرنے کے سلسلہ میں مدافعانہ طرز عمل اختیار کیا جائے تاکہ ایک طرف بیرونی سازشوں مثلاً زماں شاہ کے حملہ کا تدارک اور دوسری طرف فرانسیسیوں کی طاقت اور ٹیپو سلطان کی مخاصمانہ سازشوں کا قلع قمع ہو جائے۔ لارڈ ویلزلی کی یہ خواہش تھی کہ حیدرآباد اور پونا کی طاقت و ثروت اور ان کی آمدنی کے وسائل برطانوی حکومت کے خلاف استعمال نہ ہو سکیں۔ ویلزلی کا خیال تھا کہ اگر یہ مدعا پورا ہو گیا تو برطانوی حکومت کو ایک ایسی غیر معمولی حیثیت حاصل ہو جائے گی کہ خود ٹیپو سلطان کو اس کے خلاف اپنی تمام کوششیں بے سود نظر آئیں گی اور بالآخر فرانسیسی حلیفوں کو چھوڑ دینا پڑے گا۔ قانع بن کر اور اپنے حقیقی مفاد کی خاطر انگریزوں اور ان کے حلیفوں سے اچھے تعلقات قائم ہو جائیں گے لیکن ویلزلی کو ٹیپو سلطان کے متعلق نیک خیال تھے اور نہ ڈنڈاس کے ہم پیشہ تھے تا ہم میابی ہوئی۔ ٹیپو سلطان نے فرانسیسی ارباب اقتدار سے مراسلت کی اس سے لارڈ ویلزلی کو شبہات پیدا ہوئے اور اپنے خیالات بدل دے۔

ویلزلی نے فوراً ٹیپو سلطان کے ساتھ جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کے لئے سب سے پہلے نظام اور مرہٹوں کی اعانت حاصل کرنا ایک لازمی امر تھا۔ اس کے حاصل ہو جانے کے بعد بہت آسانی سے ٹیپو سلطان پر فتح نصیب ہو گئی۔ اس طرح ویلزلی کی "جارحانہ" اور "عہد معاونت" کی حکمت عملی کا آغاز ہوتا ہے ویلزلی کے خیالات کا پورا پورا اندازہ مندرجۂ ذیل خط سے ہوتا ہے جو لارڈ ویلزلی نے ۱۸ اکتوبر [illegible] کو راس امید کے گورنر کی خاتون لیڈی این برنارڈ کو کلکتہ سے لکھا تھا۔

(۲) "میں نہیں جانتا کہ کس اعزاز پر تم میری اتنی ستائش کر رہی ہو۔ تمہاری طرف سے ایک آیرش امیر یا مجھے قابل عزت قرار دینے پر میں تمہارے صحیح مذاق اور عقل سلیم کا قائل ہو گیا۔ میرے معاملہ یہ ایک قابل توقیر اعزاز ہے۔ جن دوسرے انعامات کا تم نے ذکر کیا ہے ان میں سے مجھے کچھ؟

نہیں ہوا اور اسکی امید بھی نہیں۔ اور (حیران نہ ہونا) شاید تم یہ سنو گی کہ میں کچھ قبول بھی نہیں کرونگا میری اس فریاد و فغاں سے تم بھی مان لوگی کہ میرے غریب عزیز دل کے پوشیدہ اسرار سے میں کسقدر تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔ اس روشنی میں تم میری خرابی صحت کے وجوہات بھی معلوم کر سکتی ہو۔ لیکن مجھے اتنا بھی کمزور نہ سمجھ بیٹھو کہ میں کوئی فوری استعفا سوچ رہا ہوں یا اپنے جذبات کی رو میں یورپ واپس چلا جاؤں گا یا کسی طیش و تشدد کو دھیان میں لاؤنگا۔ نہیں میں ان کے احسانات واپس کرتا جاؤنگا تاکہ انہیں اپنی ناانصافی پر شرم آئے۔ میں ایک سلطنت کے بعد دوسری سلطنت کو زیر کرونگا۔ ایک کامیابی کے بعد دوسری کامیابی حاصل کرونگا۔ دولت کے بعد دولت جمع کرونگا۔ میں عظمت، دولت اور اقتدار حاصل کرونگا تا آنکہ میرے آقاؤں کی خواہش بھی رحم! ارحم! پکارنے لگے اور تب میں بتاؤنگا کہ اتنی دیر بعد احسان شناسی میں کسقدر ذلت ہے۔[۱]"

اس زمانہ کے سیاسی حالات کا صحیح اندازہ

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد ہندوستان کا اقتدار اعلیٰ صحیح معنوں میں ختم ہو چکا تھا۔ ملک میں ایک زبردست مرکزی حکومت کے خاتمہ کی وجہ سے انتشار پھیلا ہوا تھا۔ وہ حکمرانی جو ہندوستان کے کم و بیش تمام حصہ کو شمال سے لے کر جنوب تک اور مغرب سے لے کر مشرق تک اپنے تحت ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک کر چکی تھی، اپنے کمزور حکمرانوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ ختم ہو چکی تھی۔ ہر ایک شخص یہ چاہتا تھا کہ اپنی حفاظت کرے اور اپنی آدھی روٹی ہاتھ سے نہ جانے پائے اسی لئے جب انہوں نے دیکھا کہ مرکزی حکومت کا خاتمہ ہو گیا ہے تو انہوں نے خود مختاری اختیار کر لی۔ اور بعد میں اُس کوشش اور کاوش میں منہمک ہو گئے جو ملک میں اپنے تحت اقتدار اعلیٰ قائم کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہے، تاکہ اس زوال کی وجہ سے اپنی حکومت غائب نہ ہو جائے بلکہ اگر موقع ملے تو اُس حکمرانی کی جگہ خود لے لے جس کا کہ اب خاتمہ ہو رہا تھا اور جس کے یہ سب پروردہ تھے لیکن مقسوم ازل نے ہندوستان کے حصہ میں ایک ایسی قوم کی ماتحتی لکھی تھی جس کی طرز معاشرت اور ہر ایک چیز ہندوستان سے بالکل جدا تھی۔ ہندوستان پر اپنا اقتدار

۱۔ باسو صفحہ (۲۷۶)

منوانے کے سلسلہ میں ان ہندوستانی روساء کو اس قوم سے سابقہ پڑا جو اس زمانہ میں ہندوستان میں
نئی نئی آباد ہوئی تھی معاشرت اور طبائع مختلف ہونے کی وجہ سے انہوں نے ان کو نہ سمجھا اور
اُن کے جال میں آخر کار پھنس گئے۔ بہرحال کمپنی کو اپنا اقتدار قائم کرنے کا موقع مل گیا۔
صوبہ داران اودھ اور حیدرآباد سلطنت مغلیہ کے اثر سے پہلے ہی آزاد ہو چکے تھے بنگال میں
دیوانی کے حصول کے سلسلہ میں انگریزوں نے اپنا تسلط جما لیا تھا۔ مرہٹے سلاطین مغلیہ کا خوف دور
ہوجانے کی وجہ سے اپنا راج قائم کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ نواب حیدر علی خاں کے خاندان کے
تحت سلطنت میسور روز افزوں ترقی حاصل کر رہی تھی اور فرانسیسیوں نے ہندوستان میں ایک
جدا تہلکہ مچا رکھا تھا۔ ۱۷۹۸ء میں ویلزلی کی آمد کے وقت اس کے خیال کے مطابق ہندوستان کی
سیاسی حالت یہ تھی کہ ٹیپو سلطان کی مخاصمانہ تدبیریں تقریباً مکمل ہو چکی تھیں۔ حیدرآباد اور سندھیا کے
دربار میں فرانسیسی جماعت اپنا سکہ جما چکی تھی۔ پیشوا کا دارومدار سندھیا کی ذات پر تھا۔ راجہ
برار نے اب علی الاعلان انگریزوں کی مخالفت شروع کر دی تھی۔ سلطنت اودھ کی حکومت میں
مختلف تبدیلیوں کی وجہ سے وہاں ایک اشتعال پیدا ہو گیا تھا۔ اُس کے روکنے اور وہاں امن
قائم رکھنے کے سلسلہ میں جدید فرماں روا نواب سعادت علی خان انگریزوں کی اعانت اور مدد کے
طالب تھے کیونکہ برطانوی حکومت ہی نے مداخلت کر کے اُن کو مسند نشین کرایا تھا۔ نواب
کرناٹک لارڈ کارنوالس کے معاہدہ میں ترمیم کرانے کی بے سود کوششوں سے خفا ہو گئے تھے
اور اپنی ریاست کی آمدنی قبل از وقت حاصل کرنے کی غرض سے اس کے وسائل مختلف طور پر
تباہ کر رہے تھے۔

ہندوستان میں اپنا اپنا اقتدار قائم کرنے کے سلسلہ میں مندرجہ بالا طاقتوں میں سے
اکثر و بیشتر نے حصہ لیا تھا اور اسی جد و جہد کے سلسلہ میں اُن کی یہ حالت بنی تھی۔ انگریزوں کا
نواب حیدر علی خاں کے خاندان سے نواب حیدر علی خاں کے خاندان کو انگریزوں سے
ہمیشہ سے دشمنی تھی۔ ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ دوسرے پر پوری طور سے تفوق حاصل کرے۔ اسی ل

لارڈ کارنوالس نے باوجود اپنی عدم مداخلت کی حکمت عملی کے ٹیپو سلطان سے نصف سلطنت حاصل کی تاکہ ثانی الذکر کے وسائل محدود ہوجائیں اور اس طرح رفتہ رفتہ اسکی طاقت کا خاتمہ ہوجائے۔ ٹیپو سلطان اس کوشش میں سرگرداں تھے کہ کسی نہ کسی طرح انگریزوں کو نیچا دکھایا جائے۔ وہ ہر ایسی کوشش میں جو انگریزوں کے خلاف عمل میں لائی جارہی ہو خوشی سے حصہ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ بیرون ہند اور دور دراز مقامات کے فرماں رواؤں کو اپنی اعانت پر تیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ ٹیپو سلطان کو جمہوریہ فرانس سے اور فرانسیسیوں کو ٹیپو سلطان سے بہت کچھ لگاؤ تھا۔ ویلزلی کے ہندوستان پہونچنے کے چند دن بعد ہی گورنر جزیرہ فرانس کی طرف سے ٹیپو سلطان کی حمایت کے لئے ایک اعلان شائع ہوا جس میں فرانسیسیوں سے خواہش کی گئی تھی کہ وہ ٹیپو سلطان کی ہر طرح سے مدد کریں کیوں کہ وہ فرانسیسی مفاد کے تحت کام کر رہے تھے۔ اس کی تعمیل بھی ایک حد تک ہوئی۔ ٹیپو سلطان اور فرانسیسیوں کی دوستی محض انگریزوں کی مخالفت کے لئے قائم ہوئی تھی اور اسی نقطۂ نظر سے اُس میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

سرجان شور کی خود غرضی کی بنا پر شہریار دکن انگریزوں سے خفا ہوگئے تھے جنگ کھرڈلہ کے بعد انہوں نے انگریزی فوجی دستوں کو برخاست کرکر ان کی جگہ مزید فرانسیسی دستوں کو مامور کیا اور اس طرح فرانسیسیوں کی طاقت اور بھی بڑھ گئی۔ انہیں مختلف مراعات دیئے گئے جن کی وجہ سے حیدرآباد میں فرانسیسی لوگوں کی تعداد بہت کچھ بڑھ گئی اور وہ ایک بڑے رقبۂ اراضی پر قابض اور متصرف ہوگئے۔ حیدرآباد کے مقامی فوجی دستوں کی تنظیم بھی انہیں کی نگرانی میں تھی اور یہاں کی سیاست پر ان کا بہت کافی اثر تھا۔

سلطنت پونا کی کمزوری کے اثرات اس زمانہ میں نمایاں ہوگئے تھے چنانچہ اس کے ماتحت سردار جو خود مختاری اختیار کرچکے تھے اُن سب میں طاقتور اور مشہور سندھیا تھا جو پیشوا پر پورے طور سے حاوی ہوگیا تھا۔ سندھیا میں فہم اور بہادری تھی اور ہندوستان کا تنہا مالک بننے کا جذبہ اور حوصلہ موجود تھا چنانچہ اس جذبہ کے تحت سندھیا کو ہمیشہ انگریزوں سے رقابت

رہنا پسند ہیا نے اپنے فوجوں کی تنظیم کے لئے فرانسیسی افسر نوکر رکھے نیز خود خاص فرانسیسی دستے بھی موجود تھے، شمال میں بھی سندھیا کے پاس ایک فرانسیسی فوج موجود تھی اور اس طرح سندھیا کے دربار میں بھی فرانسیسیوں کا کافی دخل تھا البتہ کرناٹک اور اودھ کے علاقے پورے طور پر کمپنی کے زیر اثر آچکے تھے۔

اس طرح اس زمانہ میں ہندوستان میں کسی کو اقتدار اعلیٰ حاصل نہ تھا صرف شہنشاہ کی ایک ذات موجود تھی لیکن حکومت میں ان کا کوئی دخل نہ تھا۔ وہ ان طاقتوں میں سے کبھی ایک کے پاس اور کبھی دوسرے کے پاس جاگزیں ہونا قرین مصلحت سمجھتے تھے۔ دوسری طرف ملک میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی طاقت کلہ بہ کلہ کام کر رہی تھی اور گو انگریزوں نے بنگال میں بادشاہ گروں کا کام کیا تھا اور آخر کار بنگال کو اپنے لئے مختص ہی کر لیا اور اگرچہ فرانسیسیوں کی کوئی معتول قوت ہندوستان میں موجود نہ تھی تاہم فرانس کے سیاسی انقلاب اور نپولین کی روز افزوں ترقی اور فتوحات سے کمپنی کو بعد میں اپنے مقبوضات بھی خطرہ سے خالی نظر نہ آتے تھے اور یہ خوف و لرزہ بھی طاری تھا لیس اس زمانہ میں یہ نہیں بتایا جا سکتا تھا کہ اس کش مکش میں کون فاتح نکلے گا۔

ہندوستان میں مرکزی حکومت کی ضرورت

ہندوستان کے قدرتی وسائل ہر حیثیت سے انگلستان وغیرہ جیسے ممالک سے اعلیٰ تر ہیں رقبہ کے لحاظ سے تو ہندوستان بجائے خود ایک بر اعظم کہلانے کا مستحق ضرور ہے۔ یوں تو مختلف خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان کئی ایک حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے مگر عموماً جغرافیہ نویس اس کو تین بڑے حصوں پر منقسم کرتے ہیں۔ ایک شمالی ہند، دوسرے دکن اور تیسرا سواحل شرقی و غربی۔ شمالی ہند کا تمام حصہ بہ استثنائے راجپوتانہ نہایت ہی زرخیز ہے عموماً زمین ہموار ہے میلوں تک پتھر کنکر کا نام نہیں، ہمالیہ کا اثر شمالی ہندوستان کے موسم، بارش، زراعت وغیرہ ہر شئے پر ہے۔

شمالی ہند میں جو کام ہمالیہ کے ذمہ ہے وہ دکن میں مغربی اور مشرقی گھاٹ کے سپرد ہے۔ سواحل پر کثرت سے بارش ہوتی ہے مشرقی ساحل پر سطح کے ہموار ہونے کی وجہ سے قدرتی طور پر بھی دریا میں مختلف شاخوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ دکن کا حصہ عموماً غیر مسطح ہے، چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں

[illegible]

کثیر [illegible] موجود ہیں لیکن ان میں بھی مختلف ندیاں بہتی ہیں۔

ایک طرف دنیا کے دیگر حصوں سے علیحدہ رہنے کی وجہ سے اور دوسری طرف قدرتی وسائل [illegible] مالا مال ہونے کی وجہ سے ہندوستانی ذہنیت کچھ عجیب نوعیت رکھتی ہے نہ ترقی کی پروا اور نہ دنیا سے غرض۔ تھوڑا سا ملا کہ اس پر قانع ہوئے اور کاہل بن گئے لیکن باوجود اس کے ہندوستان ہمیشہ سے اپنے قدرتی وسائل کی بدولت دیگر اقوام کا نشانۂ حسد بنا رہا۔ اور اپنی کاہلی اور فراخ دلی کی وجہ سے ہندوستانیوں نے ہر وقت یہی مناسب سمجھا کہ خود کو آنے والی اقوام کے حوالہ کر دیا جائے۔ ہندوستان کی فضا کچھ ایسی ہے کہ آنے والی اقوام نے بھی ایک [illegible] کے بعد اپنے آپ کو دیگر آنے والی اقوام کے حوالہ کر دیا۔ اس طرح فاتح اور مفتوح کا سلسلہ ہندوستان میں ایک زمانۂ دراز سے چلا آ رہا ہے یہاں تک کہ انگریزی قوم نے سمندر کے نئے راستے سے [illegible] تک ہمالیہ کے دروں میں سے ہی بیرونی اقوام کی آمد ہوتی تھی) تاجروں کے بھیس میں آ کر [illegible] اپنا تسلط [illegible] جما لیا۔

ہندوستان کے قدرتی وسائل میں زیادہ تر زراعت کے مواقع پائے جاتے ہیں۔ اسی لئے یہاں زیادہ تر زراعتی میلان پایا جاتا ہے اور ملک کا ایک کثیر طبقہ اس میں مصروف رہتا ہے۔ صرف چند لوگ دیگر ذرائع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس طرح یہاں حکومت کرنے کا مادہ کم پایا جاتا ہے اور چونکہ ہندوستان مختلف حصوں پر مشتمل ہے اس لئے ہمیشہ یہ ہوتا آیا ہے کہ زراعتی اور صنعتی طبقات میں سے [illegible] ذہنیت رکھنے والا شخص، جس کے دل میں حکومت کرنے کا شوق رہتا ہے، نکل کر اپنے آپ کو ممتاز [illegible] اور حکومت کرنے لگتا ہے اور عام باشندے بیچارے اپنی فلاح و بہبودی کے لئے یہی مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کے زیر سایہ اور حفاظت میں آ جائیں۔ اس طرح ملک میں مختلف چھوٹی چھوٹی راجدھانیاں قائم ہو جاتی ہیں حکومت کا شوق اور اقتدار کا ولولہ ان حکمرانوں کو آپس کے جھگڑوں میں اس قدر مشغول کر دیتا ہے کہ ملک میں ایک زبردست انتشار پھیل جاتا ہے اور ہر وقت اس بات کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ایک ایسی طاقت پیدا ہو جو ہر حیثیت سے ان تمام پر

فوقیت رکھتی ہو اور ان سب کو اپنے تحت لا کر ایک مرکزی حکومت قائم کر کے اس انتشار کا خاتمہ کر دے۔ ہندوستان کی شہنشاہی زیادہ تر غیر اقوام کے حصہ میں رہی ہے یہاں تک کہ غیر اقوام بھی جو فاتحانہ جذبات کے ساتھ ہندوستان آئے تھے آخر کار مفتوح ہو گئے۔ ملک کے انتشار کو دور کرنے کے سلسلہ میں اکثر طاقتیں کامیاب رہیں لیکن کچھ عرصہ بعد ملک میں پھر طوائف الملوکی پھیلی اور اس کے دور کرنے کے لئے ہمیشہ ایک نئی طاقت پیدا ہوئی جس نے اپنے زور بازو سے ان سب کو اپنے تحت کیا اور ملک میں پھر امن و امان قائم کر دیا۔ اس سلسلہ میں جو کام شہاب الدین غوری کی شجاعت نے کیا وہی کام رانا سنگھا کی تلوار نے کیا۔ اسی طرح اور انہی وجوہ کی بناء پر ہندوستان کی سیادت کے سلسلہ میں سلطنت دہلی اور سلاطین مغلیہ کی زبردست مرکزی حکومت قائم ہوئی تھی۔

اس زمانہ میں مرکزی حیثیت صرف کمپنی کو حاصل تھی

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد ہندوستان کا شیرازہ اسی طرح بکھر گیا جس طرح ہمیشہ ایک مرکزی حکومت کے غائب ہو جانے پر بکھرا کرتا تھا۔ ملک میں پھر طوائف الملوکی پھیلی۔ ہر ماتحت رئیس جو اس وقت سلطنت مغلیہ کے زبردست پنجہ سے رہا ہوا تھا، یہ چاہتا تھا کہ دوسرے کے حقوق پر حملہ کرے۔ اس انتشار کو شمال میں سندھیا کے تحت مرہٹے اور نواب وزیر اودھ اور جنوب میں شہریار دکن، ٹیپو سلطان اور پیشوا دور کر سکتے تھے لیکن بجائے اس کے کہ کوئی ایک ہمت کر کر سیادت ہند کو اپنے ہاتھ میں لے کر مغلوں کی جگہ لیتا۔ ان لوگوں نے باہمی جنگ و جدال کا ایسا سلسلہ قائم کیا جس سے انگریزوں کو ہندوستان پر تسلط جمانے کا موقع مل گیا۔

کمپنی کی مرکزی حیثیت قائم کرنے کی تدابیر

عہد معاونت کے رواج دینے کا فیصلہ

ویلزلی نے ہندوستان کے قدرتی اور دیگر وسائل کے مد نظر یہاں پر سلاطین مغلیہ کی جگہ لینے کا ارادہ کر لیا تاکہ ایک طرف ملک میں امن و امان قائم ہو اور دوسری طرف خود کمپنی کو استحکام

حاصل ہو۔ یہ دونوں ارادے ہندوستان میں مرکزی حیثیت قائم کرنے ہی سے حاصل ہوسکتے تھے جس کے لئے لارڈ ویلزلی نے مختلف تدابیر اختیار کیں۔ اپنی آمد کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سب سے زیادہ خطرناک دشمن والی میسور کے ساتھ جنگ اور کامل فتح نے ویلزلی کے دل میں فتوحات کا شوق پیدا کردیا خواہ وہ جارحانہ طریقہ پر ہو یا امن وخاموشی سے۔ اور اُس کے نئے 'عہد معاونت' کو اپنا ذریعہ بنایا گیا۔ اگرچہ انگریز طاقتور تھے تاہم کامیابی کے ساتھ اقتدار قائم کرنے کے لئے اُنکو ہندوستانی روساء کی اعانت اور امداد کی سخت ضرورت تھی، شہریار دکن کی اعانت اور نواب وزیر کے ساتھ 'عہد معاونت' کی تکمیل نے ان کو اندرونی و بیرونی خطروں سے بے نیاز کردیا۔

حیدرآباد اور اودھ جیسی زبردست حکمرانیوں کی اعانت حاصل ہونے کے بعد ہی فرانسیسیوں کے مقابلہ میں انگریز اپنی سیادت قائم کرسکے اور اس طرح 'عہد معاونت' کے ذریعہ اکثر وبیشتر پراگندہ حکمرانیوں کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے کر ایک طرف ملک میں امن اور دوسرے طرف سلطنت مغلیہ کی جگہ لے لی۔ اور ایک زبردست مرکزی حکومت قائم کی جسکی دراصل ضرورت بھی تھی۔

عہد معاونت کے اصول

لارڈ ویلزلی نے اس حکمت عملی کے تحت معاونتی معاہدوں کا جو سلسلہ آغاز کیا اس کے عام اصول یہ تھے کہ اول کمپنی کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہو اور معاہدہ کرنے والی سلطنت اُس کے اقتدار کو قبول کرے۔

دوم ملک کے امن وامان کے لحاظ سے معاہدہ کرنے والی سلطنت اپنے تمام بیرونی اختیارات سے دست بردار ہوجائے یعنے کسی اندرونی و بیرونی طاقت سے اتحاد وارتباط اور جنگ و صلح کی گفت وشنید نہ کرے۔

سوم کمپنی معاہدہ کرنے والی ریاست کی حفاظت کی ہر طرح ذمہ دار ہو۔

چہارم ذمہ داری کے لئے کمپنی معاہدہ کرنے والی سلطنت میں فوج کا انتظام کیا کرے۔

پنجم۔ اس فوج کے مصارف معاہدہ کرنے والی سلطنت کے ذمہ ہوں۔

ششم۔ مصارف کے حصول کے سلسلہ میں اوّل نقد رقم وصول کرنے کا خیال کیا گیا لیکن بعد میں تبدیلی کر کے ایک ایسے علاقہ پر قبضہ کا خیال ہوا جس کی آمدنی سے یہ مصارف پورے ہوسکیں۔

ہفتم۔ فرانسیسیوں کا خوف جو ہر جگہ تھا اس کے پیش نظر یہ شرط نافذ کی گئی کہ ایندہ سے کوئی ماتحت سلطنت کسی یورپی قوم کو بغیر اجازت ملازم نہ رکھے۔

ہشتم۔ سلطنت کو اندرونی معاملات میں کامل آزادی حاصل رہے لیکن ان تمام شرایط کی نگرانی کے لئے ہر سلطنت میں برطانوی رزیڈنٹ مستقل طور پر رہے۔

چوتھا باب

عہد معاونت ۱۷۹۸ء ۱۲۱۳ھ اور حیدرآباد

(سلطنت آصفیہ کا قیام)---

شہنشاہ شاہ جہاں کے زمانہ میں دکن کے صرف چار صوبے [illegible] خاندیس جس کا مرکز برہان پور تھا۔ برار جس کا مرکز ایلچ پور تھا۔ تلنگانہ جس کا [illegible] نانڈیڑ تھا اور مرہٹواڑی جس کا مرکز پہلے احمد نگر اور بعد میں دولت آباد ہوا۔ ان چار صوبوں پر شاہ جہاں کے زمانہ میں پورا تسلط ہو گیا تھا اور انتظامی سہولت کے لئے ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا

(۱) پایین گھاٹ اس میں پورا خاندیس اور نصف برار شامل تھا۔

(۲) بالاگھاٹ میں باقی صوبے شامل تھے۔ ۱۶۸۶ء میں جب اورنگ زیب نے دکن کو حیطہ شہنشاہی کے فتح کیا اور بیجاپور اور گولکنڈہ کو مرہٹہ سلطنتیں ہوتے [illegible] یا نو [illegible] اضافہ ہو گیا۔ اس میں اور بھی ترقی یوں ہوئی کہ چک دیوراج نے جو اس وقت میسور کا حاکم تھا گولکنڈہ کی فتح کے بعد اورنگ زیب کی اطاعت قبول کر لی۔ اس طرح تمام کرناٹک اورنگ زیب کے قبضہ میں آگیا چنانچہ اس کو بھی بالاگھاٹ اور پایین گھاٹ میں تقسیم کر دیا گیا اور یوں [illegible] صوبوں کے بجائے چھ صوبے [illegible] دیے گئے۔ نواب آصف جاہ بہادر انہی شش صوبجات دکن کے مالک و فرمانروا قرار پائے۔

خاندان آصف جاہ کی ابتداء نواب قمر الدین خاں فتح جنگ نظام الملک آصف جاہ بہادر سے

چنانچہ یہ عہد محمد شاہ شہنشاہ جب سادات بارہہ کی خودسری اور مطلق العنانی ترقی پذیر ہوئی اور دربار شاہی کی رونق جاتی رہی اور بادشاہ برائے نام سر پر تاج رکھے تخت نشین تھے اور تمام امور سلطنت و انتظام ریاست سید حسین علی خاں امیر الامرا اور ان کے بھائی سید عبد اللہ خاں کے ہاتھ میں تھا اور ارکین سلطنت کا عزل و نصب ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ الغرض دہلی کی حالت بہت نازک ہو گئی تو نواب آصف جاہ بہادر جو عقل، دانش، فہم و کیاست میں بے نظیر تھے، دہلی کا قیام نامناسب سمجھ کر بادل ناخواستہ دکن کی جانب متوجہ ہوئے اور دریائے نربدا عبور کر کے طالب خاں سے قلعہ اسیر گڈھ اور محمد انور خاں سے برہان پور از روئے حکمت عملی حاصل کر لئے۔ جب سادات بارہہ کا تختہ اُلٹ گیا اور محمد امین خاں اعتماد الدولہ نے جو اس وقت وزارت پر مامور ہوئے تھے انتقال کیا۔ تو اب بجز نواب آصف جاہ بہادر کے اس بار عظیم کا اٹھانے والا دہلی میں کوئی دوسرا موجود نہ تھا۔ اس لئے بادشاہ نے آپ کو طلب کر کر قلمدان وزارت عطا فرمایا مگر چند ہی روز میں آپ کی طبیعت وہاں کی صحبت سے اُکتا گئی۔ کیونکہ وہاں بادشاہ کا رنگ ہی کچھ اور تھا، اور امرا کے حسد و نفاق نے دربار کی صورت ہی کچھ اور کر دی تھی۔ اس عرصہ میں حیدر علی خاں ناظم گجرات کی سرکوبی کے لئے انہیں جانا پڑا۔ جب وہاں کا انتظام کر کے واپس ہوئے تو اس حسن، خدمت کے صلہ میں بادشاہ نے مالوہ اور گجرات کی صوبہ داری عطا فرمائی اور دکن کی حکومت و وزارت بھی اُس کا ضمیمہ مقرر ہوئی۔ لیکن انہوں نے وہاں کی صحبت میں اپنا گذر مشکل دیکھا۔ آخر علالت مزاج کا عذر کر کے مراد آباد جانے کی اجازت لی اور وہاں سے نکل کر سیدھا دکن کی جانب کوچ کیا۔ یہاں حیدر آباد دکن، پر امیر الامرا کے زمانہ سے مبارز خاں عماد الملک ناظم تھے۔ جب آپ کی تشریف آوری کی خبر سُنی تو مقابلہ کے لئے نکل پڑے۔ تالۂ شکر کھیڑہ کے نواح میں لڑائی ہوئی۔ مبارز خاں مارے گئے اور نواب آصف جاہ بہادر کو فتح نصیب ہوئی اور کل ملک صوبۂ دکن کے آپ ۱۷۲۴ء ۱۱۳۷ھ کے اوائل میں مالک و فرماں روا قرار پائے۔

قطب شاہیہ زمانہ سے لارڈ کارنوالس کے وقت تک حیدر آباد کے مرہٹوں سے تعلقات

اس علاقہ میں قطب شاہی سلطنت کے زمانہ سے مرہٹوں کی قوت کا جو خوف تھا وہ اس دور میں بھی

باقی تھا۔ مرہٹوں کے متعلق میر عالم نے لکھا ہے۔

"درتمامی قلمرو کہ از کنار دریائے جنوبی تا اقصائے ہندوستان درحیطۂ تصرف اینہا بود۔ دزد درہزن وخانہ جنگ در امصار و بلداں نبود۔ کسے زہرۂ آں نداشت کہ کارد و خنجر و شمشیر درآبادیہا از نیام برآرد۔ ومسکرات از ممنوعات بود و با ایں ہمہ تسلط و حکمرانی اوئی بہمنی مفلوک گدا پیشہ را عرضی بنوشتند وخود را سیوک کہ عبارت از بندۂ پرستار است مرقوم میںمودند پس تا زمان سدہوبالاجی راؤ بمساعدات ایام ترقی بانجام رسید و بعد فوت مادہوراؤ پسرش اختتام پذیرفت۔ الملک للہ واحد القہار۔[۵۱]"

اسی سلسلہ میں میر غلام علی آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ میں لکھا ہے کہ "از قدیم الایام فرماں روایان ہند پیش از عہد اسلام و بعد آں بر اہل دکن چیرہ دست بودند ہمیشہ افواج باقاعدہ فرستادہ تمام قلمرو دکن تا لنکا وسراندیب زیر و زبر می نمودند۔ و رفتہ رفتہ نوبت بجائے رسید کہ قصہ منعکس گردید یعنے قوم مرہٹہ مجموع کشور دکن و مالوہ و گجرات واکثر صوبہ جات ہندوستان بہ تصرف آوردند وبیشتر ممالک ہندوستان را زیروزبر کردند"

اس طرح مرہٹوں نے دکن میں بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد جو پانچ سلطنتیں بہ ایں نام ہوئی تھیں ان میں اپنا کافی اثر جمالیا نیز ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی ان کا کافی اثر تھا۔ چوتھ اور سردیس مکھی ان علاقوں سے وصول کرنا مرہٹوں کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا بلکہ فرماں روایان وقت اپنے مملکت کے مفاد کی خاطر کہ وہ ان کے غاصبانہ حملوں سے برباد و تاراج نہ ہونے پائے ان مطالبات کو بہ خوشی پورا کرتے تھے۔

احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کی طاقت کم کرنے کیلئے مغلوں کے حملے آئے دن ہوا کرتے تھے جس کی وجہ سے مرہٹوں کو ترقی کرنے کا اچھا موقع ملا۔ خصوصاً آخرالذکر سلطنت کو سیواجی نے اپنا ذریعہ معاش بنایا تھا جب کبھی رقم کی ضرورت ہوتی یا کسی نقصان کی تلافی کرنا ہوتا تو سلاطین قطب شاہیہ سے اسکی پابجائی کرائی جاتی تھی۔

۵۱۔ حدیقۃ العالم مقالہ ثانی صفحہ ۲۰۷

۱۷۱۲ء میں شہنشاہ معظم کے انتقال کے بعد حکومت دکن میں اہم تبدیلیاں نمودار ہوئیں جن کے سلسلہ میں نواب نظام الملک بہادر کو دکن کا صوبہ دار بنایا گیا۔ نواب نظام الملک بہادر اورنگ آباد پہنچنے کے بعد سمبھاجی کی تائید شروع کی جس کی وجہ سے انہیں مرہٹوں کا مقابلہ کرنا پڑا ساہو کے حلقہ بالاجی وشوناتھ نے ان کا مقابلہ کیا۔ جس کا آخر کار نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں میں صلح ہوئی اور نواب نظام الملک بہادر اورنگ آباد واپس ہو گئے۔

اس کے بعد محمد شاہ کی کمزوری کی وجہ سے نواب نظام الملک بہادر نے خود مختاری حاصل کر لی۔ اس سلسلہ میں ان کو مرہٹوں سے مقابلہ کرنا تھا جس کے لئے انہوں نے ایسی حکمت عملی اختیار کی کہ بجائے ان کے حریف پیشوا کو کمزور کرنے کے اس کی تقویت کا باعث ہوئی۔

شکر کھیڑ کی لڑائی کے بعد نواب نظام الملک بہادر حیدرآباد کو، جو قطب شاہیوں کا بھی مرکز رہ چکا تھا، اپنا دارالسلطنت بنانا چاہتے تھے چنانچہ وہ یہاں سے مرہٹوں کو کسی طرح بھی نکالنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے اس مناقشہ کو پھر تازہ کیا جو ساہو اور سمبھاجی کے مابین پیش آیا تھا جس کی وجہ سے ساہو اور ان کے مابین پھر مقابلہ ہوا جس میں آخر کار نواب نظام الملک بہادر کو کامیابی نہیں ہوئی اور وہ صلح کے خواستگار ہوئے۔ باجی راؤ نے ان سے اپنے حسب دلخواہ شرائط طے کرائے اور اس طرح دوبارہ ان دونوں میں صلح ہو گئی۔

نواب ناصر جنگ شہید کے زمانہ میں ساہو سے صلح رہی چنانچہ "در عہد نواب نظام الدولہ، ناصر جنگ شہید با ساہو راجہ قواعد صلح تاسیس یافت و تا آخر عہد نواب شہید کہ دو نیم سال و کسری بود صلح بہ حال و برقرار ماند"[۵۱]

نواب صلابت جنگ بہادر کے زمانہ میں جنگ اودگیر کے بعد سات لاکھ کے علاقوں کے معاوضہ میں مرہٹوں سے مصالحت ہوئی۔ چنانچہ "نواب امیر الممالک صلابت جنگ و نواب آصف جاہ ثانی بعد از وقوع مصالحت با مرہٹہ عطف عنان عزیمت بصوب حیدرآباد نمودند"[۵۲]

۵۱،۵۲۔ حدیقۃ العالم (مقالہ ثانی) صفحہ ۲۱۲ و ۲۷۲ تا ۲۷۳۔

نواب نظام علی خاں بہادر آصف جاہ ثانی کے اوائل زمانہ میں سلطنت حیدرآباد کے تعلقات مرہٹوں سے بہت اچھے تھے۔ اس طرح اس موقع پر وہ تعلقات جو مابین حیدرآباد و مرہٹہ ایک زمانۂ دراز سے دو سلطنتوں کے تحت کبھی دوستی کے رنگ میں اور کبھی دشمنی کے رنگ میں چلے آرہے تھے اب زیادہ دوستانہ رنگ رکھتے تھے اور کسی کو یقین نہیں ہوتا تھا کہ قریب میں ان دونوں طاقتوں کے درمیان ایک ایسی جنگ ہونے والی ہے جو دونوں کی دوستی کو ایک لخت دشمنی سے بدل دے گی اور ساتھ ہی ساتھ ان دونوں ریاستوں کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھے گی۔

انہی وجوہ کی بنا پر اگرچہ سلطنت آصفیہ کو اس زمانہ میں تین قوتوں یعنے کمپنی، نواب حیدر علی خاں اور مرہٹوں کی روز افزوں جد وجہد سے اندیشہ ہوگیا تھا کیونکہ اس زمانہ میں کمپنی کی قوت کے ساتھ ہی ساتھ میسور میں نواب حیدر علی خان نے جنوب میں فروغ حاصل کرلیا تھا لیکن سب سے زیادہ مرہٹوں کا خوف تھا۔

کمپنی سے تعلقات قائم ہونے کے وقت حیدرآباد کی کمزور حالت

حیدرآباد اور کمپنی کے تعلقات سب سے پہلی مرتبہ کرناٹک کی لڑائیوں کے سلسلہ میں قائم ہوئے۔ نواب نظام الملک بہادر نے اپنے انتقال کے وقت نواب ناصر جنگ شہید کو خاص طور پر نزدیک بلا کر امور سلطنت کے متعلق چند ہدایات دیئے اور وصیت کی گویا اُنہوں نے نواب شہید کو اپنا جانشین مقرر کیا کیونکہ نواب غازی الدین خاں بہادر اُس وقت دہلی میں مشغول تھے۔ جب نواب نظام الملک بہادر کے انتقال کے بعد نواب ناصر جنگ شہید نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ لیکن ان کے مقابلہ میں نواب مظفر جنگ بہادر نے (جو آصف جاہ اول کے نواسے تھے) مسند کے لئے اپنا دعویٰ پیش کیا جس سے ملک کے اندرونی معاملات میں ایک قسم کی ابتری پھیلی ملک کا اعلیٰ طبقہ دو حصوں میں منقسم ہوگیا۔ ایک نواب ناصر جنگ شہید کا طرفدار تھا اور دوسرا نواب مظفر جنگ بہادر کا۔ اس طرح تمام ملک دو حصوں میں منقسم تھا کیوں کہ اعلیٰ طبقہ کے ارکین نے سرگروہ بن کر دیگر طبقات کو اپنے تحت کر لیا تھا ہر ایک کام میں ایک دوسرے کی مخالفت ضروری تھی جسکی وجہ سے نواب نظام الملک بہادر کا

جمایا ہوا شیرازہ بہت جلد بکھر گیا یہاں تک کہ دونوں دعویداروں میں کھلی جنگ کی ٹھیری۔ اس وقت ملک میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی قومیں موجود تھیں جو تجارت کے سلسلہ میں ہندوستان آئی تھیں ان میں آپس میں تجارتی رقابت بھڑک رہی تھی اور وہ یہ چاہتے تھے کہ اس کی ترقی کے لئے انہیں ہندوستان میں ذرائع اور وسائل حاصل ہوں۔ اس کے لئے ہندوستانی دیسی رئیسوں کی اعانت ضروری تھی چنانچہ اس جھگڑے اور ارکاٹ کے وراثتی جھگڑے نے انہیں موقع دیا۔ فوراً دو فریق ہوگئے۔ ایک طرف نواب ناصر جنگ شہید، محمد علی (وارث صوبہ داری آرکاٹ) اور انگریز اور دوسری طرف نواب مظفر جنگ بہادر، چندا صاحب (دعویدار صوبہ داری آرکاٹ) اور فرانسیسی۔ میدان رزم گرم ہوا۔ جس میں گو نواب ناصر جنگ شہید کو کامیابی نصیب ہوئی لیکن کچھ عرصہ بعد پٹھانوں کے ہاتھوں یہ شہید ہوجانے سے نواب مظفر جنگ بہادر فرانسیسیوں کی اعانت سے مسند نشین ہوئے اور حیدرآباد میں ان کے اثرات قائم ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد نواب مظفر جنگ بہادر بھی مارے گئے اور نواب صلابت جنگ بہادر مسند نشین ہوئے اور انگریزوں سے تعلقات قائم کئے۔ جس کی وجہ سے حیدرآباد میں انگریزوں کے اثرات قائم ہوگئے۔

۱۷۶۱ء میں نواب نظام علی خاں بہادر نے حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ انہوں نے بھی انگریزوں سے تعلقات قائم رکھے اور معاہدے کئے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں حیدرآباد کے اندرونی معاملات پر کتنا مضر اثر پڑا ہوگا۔ والیان ملک کی باہمی رقابت اور جلد جلد بدلنے سے ملک کی اندرونی ساخت کمزور ہوگئی۔ ایسی حالت میں انگریزوں سے تعلقات قائم ہونا ضرور ان کی تقویت کا باعث ہوا۔

حیدرآباد سے شمالی سرکاروں کا تعلق

کرناٹک کی لڑائیوں میں نواب محمد علی کی اعانت کے سلسلہ میں انگریزوں نے حصہ لیا تھا چنانچہ ۱۷۵۹ء میں لارڈ کلائیو نے شمالی سرکار پر جو چھ سال سے فرانسیسی قبضہ تھا برخواست کرکرا سے اپنے قبضہ و تصرف میں لے لیا۔ ۹ اگست ۱۷۶۵ء کو شہنشاہ شاہ عالم نے کمپنی کو بنگال و بہار اور اوڑیسہ کی دیوانی حوالہ کرتے ہوئے اس قبضہ کی بھی توثیق کردی جس کے بعد جنرل کلیوڈ (GENERAL CAILLIAUD) نے پورے طور سے ان پر قبضہ کرلیا۔ اسی سال کے اوائل میں نواب نظام علی خاں بہادر نے

کرناٹک پر حملہ کردیا لیکن جنرل کیمبل (GENERAL CAMPBELL) کے مقابلہ کی وجہ سے انہیں اپنے وطن واپس ہونا پڑا۔ اگرچہ کرناٹک اور شمالی سرکاروں کے علاقے براہ راست کرناٹک کے تحت تھے لیکن شہنشاہی انتظام کے تحت یہ صوبہ دار دکن کے ماتحت تھے اور گو نواب نظام علیخاں بہادر کو وقتیہ ناکامی ہوئی لیکن وہ کرناٹک پر دوبارہ چڑھائی کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے ایسے موقع پر حکومت مدراس نے جنرل کلیوڈ (GENERAL CAILLIAUD) کو حیدرآباد روانہ کیا تاکہ نواب نظام علی خاں بہادر سے مصالحت کر لی جائے۔ ۱۲ر نومبر ۱۷۶۶ء میں کمپنی اور شہریار دکن کے مابین ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے اول الذکر نے یہ وعدہ کیا کہ راج مندری، ایلورا اور مصطفےٰ نگر کی سرکاروں کے معاوضہ میں حیدرآباد کو سالانہ پانچ لاکھ روپے پیش کش ادا کیا جائے گا۔ اس طرح سیکاکول اور مرتضیٰ نگر گنٹور کے معاوضہ میں دو لاکھ سالانہ اس وقت سے ادا کئے جائینگے جب کہ ان پر انگریزوں کا قبضہ کرا دیا جائے۔ گنٹور چونکہ نواب بسالت جنگ بہادر کی جاگیر تھی اس لئے قرار یہ پایا کہ ان کی حیات تک یا جب تک کہ ان کا رویہ تشفی بخش رہے یہ علاقہ انگریزوں کو نہیں دیا جائے گا۔ اسی معاہدہ میں فریقین نے ایک دوسرے کی باہمی دوستی اور اعانت کا بھی وعدہ کیا۔

اس زمانہ میں نواب حیدر علی خاں والی میسور نے کافی طاقت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ اس معاہدہ کے دفعات کی رُو سے انگریزوں کے دو فوجی دستے نواب نظام علی خاں بہادر کی امداد کے واسطے روانہ کئے گئے جب کہ وہ پالیگاران کرناٹک سے محاصل وصول کرنے کی کوشش اور قلعہ بنگلور کے محاصرہ میں مشغول تھے۔ لیکن نواب حیدر علی خاں نے اپنی فراست سے اس اتحاد کو منقطع کرا کر نواب نظام علی خاں بہادر کو اپنی طرف کر لیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد آصف جاہ ثانی نے اس اتحاد کو توڑ کر پھر انگریزوں سے اتفاق کر لیا اور ۲۳ر فروری ۱۷۶۸ء کو بہ مقام مدراس ایک جدید معاہدہ طے پایا۔

اس معاہدہ کی رو سے نواب نظام علی خاں بہادر نے نواب حیدر علی خاں سے تعلقات منقطع کر لئے اور یہ وعدہ کیا کہ انگریزوں کو بالا گھاٹ کرناٹک کے حصول کے سلسلہ میں مدد کی جائیگی۔ یہ وہ علاقہ تھا جس پر حیدر علی خاں نے قبضہ کر لیا تھا اس کے معاوضہ میں کمپنی نے وعدہ کیا کہ حیدرآباد کو سالانہ

سات لاکھ روپے پیش کش ادا کیا جائے گا ایک دوسرے دفعہ کی رو سے شمالی سرکاروں پر انگریزوں کے قبضہ کی توثیق اس شرط پر کی گئی کہ چھ سال تک کمپنی کی طرف سے حیدرآباد کو دو لاکھ روپے سالانہ ادا کئے جائیں گے۔ جس کا آغاز یکم جنوری ۱۷۶۸ء سے ہوگا اس معاہدہ کے کئی سال بعد تک حیدرآباد میں کوئی اہم تغیر نہیں ہوا اور نہ کمپنی اور حیدرآباد کے تعلقات میں کوئی تبدیلی عمل میں آئی۔ ۱۷۷۹ء میں نواب بسالت جنگ بہادر نواب حیدر علی خاں سے خوف زدہ ہوکر گنٹور کو ترول پر انگریزوں کے حوالہ کرنے پر تیار ہوئے اور کمپنی نے یہ وعدہ کیا کہ اس کی حفاظت کے لئے ....

.... کمپنی کی کافی فوج رکھی جائے گی۔ اس کی اطلاع مسٹر ہالینڈ کے ذریعہ شہریار دکن کو دی گئی۔ آپ نے انگریزوں کی اس جدوجہد کو ۱۷۶۸ء کے معاہدہ کے قطعی خلاف ٹھیرایا۔ حکومت اعلیٰ نے حکومت مدراس کی اس غلطی کی معافی شہریار دکن سے فوراً چاہی اور مدراس کو احکام صادر کئے کہ گنٹور کو فوراً نظام کے حوالہ کردیا جائے چنانچہ ۱۷۸۰ء کے اواخر میں یہ علاقہ مسترد کردیا گیا۔

۱۷۸۲ء میں نواب بسالت جنگ بہادر کا انتقال ہوا۔ اب موقع تھا کہ گنٹور انگریزوں کے حوالہ کردیا جائے لیکن اس پر حکومت حیدرآباد کا قبضہ ہوگیا۔ ۱۷۸۴ء میں انگریزی حکومت نے مسٹر جانسن کو حیدرآباد روانہ کیا تاکہ اسکی واپسی کا مطالبہ کیا جائے اور کمپنی کی طرف سے اواشدنی پیش کش کے متعلق تصفیہ عمل میں لایا جائے۔

گفت و شنید کے مابین شہریار دکن نے شمالی سرکاروں کی واپسی اس شرط پر چاہی کہ پیش کش کا تمام بقایا معاف کردیا جائے گا اور ایک کروڑ روپے نقد کمپنی کو دئیے جائینگے اس طرح کرناٹک کی بھی واپسی چاہی گئی۔ رزیڈنٹ نے ان امور کی تکمیل کے لئے اعلیٰ حکومت کے پاس سفارش کی انہوں نے اس معاملہ کو مجلس نظماء کے پاس پیش کردیا۔ آخر الذکر نے مسٹر جانسن کی اس حرکت سے سخت ناراض ہوکر انہیں رزیڈنٹ کے عہدہ سے برطرف کردیا اور وہ ۱۷۸۵ء میں حیدرآباد سے واپس ہوگئے۔ شمالی سرکاروں کے متعلق گفت و شنید ایک مدت تک ملتوی رہی اور دونوں حکومتوں کے تعلقات اس زمانہ میں کچھ ٹھیک نہیں رہے۔ ۱۷۸۶ء میں لارڈ کارنوالس نے کپتان کینوے (CAPTAIN KENNAWAY) کو

حیدرآباد کو انہی ہدایات کے ساتھ روانہ کیا جو قبل ازیں مسٹر جانسن کو دیئے گئے تھے، اپنے مطالبہ کی تکمیل کے لئے اس وقت گورنر جنرل نے اپنی فوجی طاقت سے کام لیا اور چونکہ شہریار دکن اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے اس لئے پہلے معاہدہ کے مطابق ۱۷۸۸ء میں گنٹور کمپنی کے حوالہ کردیا گیا اور رقمی معاملات کا حسب ذیل تصفیہ ہوا:—

"پیش کش جو شمالی سرکاروں کی بابتہ کمپنی کی طرف سے حیدرآباد کو ادا طلب تھا اسکی مقدار ۳۳۳۴۹۷۶۷ روپے تھی محاصل گنٹور جو کمپنی کو بسالت جنگ کے انتقال (۲۵ ستمبر ۱۷۹۲ء سے ۱۱۹۷ھ) لے کر ستمبر ۱۷۹۸ء تک وصول طلب تھے اسکی مقدار ۷۶۶۳۲۸۵ روپیے تھی۔ اس رقم کے مہیا کرنے کے بعد جملہ رقم جو شہریار دکن کو کمپنی سے وصول طلب تھی۔ ۱۶۶۶۵۹ روپیے اقرار پائی"[۵۱]

اس طرح اس معاملہ کی یکسوئی ہوئی جس کے بعد گورنر جنرل نے شہریار دکن کو ایک خط لکھا جس میں ۱۷۶۸ء کے معاہدہ پر تبصرہ کیا گیا تھا خصوصاً اس معاہدہ کی چھٹی دفعہ پر خوب روشنی ڈالی گئی کہ جو امدادی فوج مقرر کی گئی ہے وہ کسی برطانوی حلیف کے مقابلہ میں نہیں استعمال کی جاسکتی۔ دارالعوام نے اس خط کی توثیق کی بعد ازآں اس خط نے معاہدہ کی صورت اختیار کرلی۔

لارڈ کارنوالس سے مراسلت اور کمپنی کی اعانت حاصل کرنیکی کوشش

۱۷۸۹ء میں ٹیپو سلطان نے ٹراونکور پر حملہ کرنے کے لئے اپنی فوجیں آگے بڑھائیں چونکہ یہ حرکت صلح نامہ منگلور (جو پانچ سال پیشتر عمل میں آیا تھا) کے قطعی خلاف تھا اس لئے لارڈ کارنوالس نے ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ کرنے کا قطعی تصفیہ کرلیا اس کے لئے شہریار دکن کی اعانت حاصل کرنا ضروری تھا چنانچہ اس سلسلہ میں حیدرآباد کے رزیڈنٹ کو جو ہدایات روانہ کئے گئے ان میں یہ تاکید بھی تھی کہ دربار حیدرآباد کو مطلع کردیا جائے کہ چونکہ ٹیپو سلطان نے اپنے اور کمپنی کے درمیان جو صلح نامہ تھا اسے توڑ دیا ہے اس لئے اس موقع پر برطانوی حکومت سے قریبی تعلقات قائم کرنے سے حیدرآباد کا بڑا فائدہ ہوگا۔

۵۱۔ ہمارے یار وفادار نظام۔ مصنفہ فریزر صفحہ (۳۷)

گورنر جنرل نے رزیڈنٹ کو یہ اختیار بھی دیدیا کہ وہ نظام حیدرآباد کو اس بات کا بھی اطمینان دلادیں کہ جب تک جنگ سے پورے فوائد حیدرآباد کو حاصل نہ ہوجائیں گے، ٹیپو سلطان سے صلح نہ کی جائیگی اور چونکہ ٹیپو سلطان کی اس حرکت سے انگریزی حکومت اب آزاد ہوگئی ہے لہٰذا وہ حیدرآباد سے ایک ایسا معاہدہ کرنے کے لئے آمادہ ہے جس کی رو سے فریقین پر ایک دوسرے کے ان علاقوں کی حفاظت لازم ہوگی جو اختتام جنگ پر ان کے زیر نگیں ہوں۔ ان ہدایات کی بموجب اور چونکہ شہریار دکن کو مرہٹوں کے خلاف انگریزوں کی اعانت کی ضرورت تھی اس لئے دربار حیدرآباد سے ایک دفاعی اور اقدامی معاہدہ قرار پایا۔ جس کی گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے ۱۲ جنوری ۱۷۹۰ء کو توثیق کی۔ اس معاہدہ کے شرائط یہ تھے کہ ٹیپو سلطان کی تادیب کی جلد تدبیر کیجائے اور آئندہ کے لئے ان کو امن میں خلل ڈالنے کے ذرائع سے محروم کردیا جائے۔ نواب میر نظام علیخاں بہادر اور پیشوا جنگ میں نہایت زبردست حصہ لیں۔ حیدرآباد سے دس ہزار سوار کا ایک رسالہ کمپنی کی فوج کے ساتھ کام کرنے کے لئے بھیجا جائے۔ اس کے اخراجات کمپنی ادا کرے گی اور صلح کے بعد بجز ان مقامات اور قلعوں کے جن پر کمپنی دیگر فریقین کی شرکت سے قبل قبضہ کرے تمام مفتوحہ علاقہ کی مساوی تقسیم ہوگی۔ خاص خاص زمیندار اور پالیگار جو پہلے حیدرآباد اور مرہٹوں کے تحت رہ چکے ہیں اگر ان کے علاقے تسخیر ہوں تو مثل سابق ان کی حیثیت قرار دی جائے گی اگر واقعات کے لحاظ سے مصلحت صحیح یہی سمجھی جائے تو اس کا تصفیہ بھی باہمی اتفاق سے ہوگا اور صلح کے بعد اگر فریقین میں سے کسی ایک پر ٹیپو سلطان کی جانب سے حملہ ہو تو ان شرائط اور اس طرز پر جو بہ میں قرار پائے سب مل کر تادیبی کارروائی اختیار کریں۔

رزیڈنٹ کی مراسلت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب میر نظام علی خاں بہادر برابر مرہٹوں کے مشتبہ رہتے رہے اور ایک مرتبہ اثنا ملاقات میں رزیڈنٹ سے انہوں نے دریافت کیا کہ جس وقت سلطنت حیدرآباد کی فوجیں کمپنی کی حفاظت کر رہی ہوں اس وقت اگر پیشوا ٹیپو سلطان کے ایما سے حیدرآباد پر حملہ کردے تو آپ کی حکومت کیا کرے گی۔ رزیڈنٹ نے شرافت آمیز جوش کے ساتھ جواب دیا

"کمپنی فرماں روائے دکن کی حفاظت کے لئے اپنی ہر چیز نثار کرنے کے لئے تیار ہوگی"[1] اس سے قدرے اطمینان ہوا لیکن گفت وشنید کی اثناء میں نواب میر نظام علی خاں متواتر اس بات پر زور دیتے رہے کہ کمپنی ان کی سلطنت کی حفاظت کے لئے اس معاہدہ میں ایک مخصوص دفعہ شامل کر دے لیکن گورنر جنرل کو یہ خوف تھا کہ شاید یہ بات مرہٹوں کے خلاف پڑے اور وہ جنگ میں مدد نہ دیں یہ خوف بجا تھا، لہذا گورنر جنرل نے نواب میر نظام علی خاں بہادر کی یہ تجویز ٹال دی لیکن اس کے ساتھ ہی رزیڈنٹ کو اس بات کا اختیار دیا گیا کہ وہ اس امر کا یقین دلادے کہ آئندہ کسی مناسب موقع پر اس کی تکمیل ضرور کر دی جائے گی۔

جس اصول کی بناء پر لارڈ کارنوالس نے فرماں روائے دکن کی یہ تجویز ٹال دی اسے اپنے ایک مراسلہ میں جو رزیڈنٹ کو لکھا تھا صاف طور پر یہ بیان کیا ہے کہ جب نواب میر نظام علی خاں بہادر اپنی اس تجویز پر غور کرلیں گے کہ مرہٹوں کی طرف سے نامناسب مطالبات کی صورت میں کمپنی مداخلت کرے تو ان پر یہ بھی روشن ہو جائے گا کہ ایسی حالت میں جب کہ مرہٹے نہایت اخلاص اور خوشی سے اس اتحاد میں شریک ہو گئے ہیں ان کی بابت میرا یہ خیال کرنا کہ وہ خود اپنے ایک حلیف کے ساتھ ناانصافی کریں گے کس قدر نازیبا ہوگا اور اس قسم کی شرط کو وہ اپنے لئے کس قدر مضر اور اشتعال انگیز سمجھیں گے۔ اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ "فرماں روائے دکن پر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میں ان کے مفاد کا لحاظ رکھنے اور ان کی خواہشات پورا کرنے کے لئے خود بہت کوشاں ہوں انہیں مطلع کر دو کہ اگر مرہٹوں کو کوئی خاص اعتراض نہ ہوا تو میں اس معاہدہ میں ایک زائد دفعہ شریک کر دوں گا کہ اگر فریقوں میں کوئی باہمی تنازعہ پیش آئے تو تیسرے فریق پر لازم ہوگا کہ وہ بحیثیت ثالث کے اس میں مداخلت کرے اور اختلافات کو از روئے انصاف اور صلح پسند طریقہ سے طے کرانے میں اپنی پوری کوشش صرف کرے"[2]

اس مراسلہ میں لارڈ کارنوالس نے رزیڈنٹ کو اس بات کا بھی اختیار دیا کہ وہ نواب میر نظام علی خاں بہادر اور ان کے وزراء کو یقین دلادے کہ :۔

---

[1] سیاسی تاریخ ہند مصنفہ سر جان میلکم جلد اول صفحہ (۵۶) [2] سیاسی تاریخ ہند، سر جان میلکم جلد اوّل صفحہ ۵۷۔

"اگر مذکورہ بالا شرط تسلیم کرلی گئی اور اس کے مطابق اگر کسی موقع پر مجھے مداخلت کرنی پڑی تو آپ دیکھیں گے کہ میں آپ کی سلطنت کو نقصان سے بچانے اور اس کا اقتدار برقرار رکھنے کے لئے ہمیشہ کوشش کروں گا۔"[1]

ان زبانی وعدوں کا یہ اثر ہوا کہ فرماں روائے دکن نے ان پر اعتبار کرلیا اور جس شکل میں کہ معاہدہ پیش ہوا تھا اسے منظور کرلیا۔ گورنر جنرل کے زبانی وعدوں سے بندگان حضرت کو جو توقعات ہوگئے تھے ان کی تائید گورنر جنرل کے مراسلہ مورخہ ۲۹ رجولائی ۱۷۹۰ء سے ہوگئی جو معاہدہ کے مسودہ کے ساتھ روانہ کیا گیا تھا۔

"مجھے کامل یقین ہے کہ تم دربار حیدرآباد میں اس بات کے ظاہر کرنے میں کچھ کسر نہ اٹھا رکھو گے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد اور وقار کے لحاظ سے اپنے وعدوں کی سختی سے پابندی کرے اور جنگ کو نہایت شدومد کے ساتھ جاری رکھنے کے لئے اپنی حکومت کی پوری قوت صرف کرے تم پر لازم ہے کہ تم ہمیشہ اس بات کا خیال رکھو کہ فرماں روائے دکن اور ان کے وزراء کو ہماری حکومت سے آئندہ کے لئے جو توقعات ہوسکتے ہیں انہیں وہ کبھی بے جا اور مغالطہ آمیز اہمیت نہ دیں اور حیدرآباد کے مفاد کے بارے میں تم خود ایسے الفاظ ہرگز استعمال نہ کرنا جن سے مرہٹوں کو حسد کرنے کا موقع ملے لیکن ساتھ ہی نواب میر نظام علی خاں بہادر اور ان کے وزراء کو اس بات کا یقین دلاتے رہو کہ اس جنگ کے جاری رکھنے میں ہمارے مفاد و مقاصد کا وہ جس قدر لحاظ رکھیں گے اور اس کا جس قدر ثبوت دیں گے اس کے معاوضے میں وہ ہمارے اخلاص و اعانت کی توقع رکھ سکتے ہیں اور وہ دیکھیں گے کہ جب کبھی ہمیں مناسب موقع ملے گا اور جہاں تک دیگر حلیفوں سے ہمارے معاہدے ہمیں اجازت دیں گے ہم دونوں حکومتوں کے درمیان تعلقات بڑھانے کے لئے ہمیشہ آمادہ رہیں گے۔"[2]

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ دونوں کی ضروریات کے تحت یہ دفاعی اور اقدامی معاہدہ مرہٹوں کے خلاف طے پایا یا ایک طرف کمپنی کو ٹیپو سلطان کے خلاف شہریار دکن کی امداد اور دوسری طرف شہریار دکن کو

---

[1] سیاسی تاریخ ہند از سرجان میلکم جلد اول صفحہ (۵۰)   [2] میلکم جلد اول صفحہ ۵۸۔

کمپنی کی اعانت کی ضرورت تھی لہٰذا جب کمپنی کی طرف سے معاہدہ پیش کیا گیا تو شہریار دکن نے اسی نقطۂ نظر کے تحت اسے منظور کر لیا چنانچہ مندرجۂ بالا واقعات اور مراسلت سے پتہ چلتا ہے کہ شہریار دکن نے ان تعلقات کے قائم کرنے کے سلسلہ میں اپنے مفاد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اور کمپنی پر ہر وقت اس بات کا اظہار کیا کہ ان کی امداد کے معاوضہ میں کمپنی پر لازمی ہے کہ وہ مرہٹوں کے خلاف ان کی سلطنت کی حفاظت کرے لیکن چونکہ اس زمانہ میں انگریزوں اور مرہٹوں کے اچھے تعلقات تھے اس لئے لارڈ کارنوالس نے اس کا کھلا اعلان اقرار اور وعدہ نہیں کیا۔ اس موقع پر صرف یہ مسلک اختیار کیا گیا کہ امدادی فوج سے سلطنت حیدرآباد کی حفاظت کا فوری انتظام کر دیا جائے۔

ٹیپو سلطان کے خلاف پیشوا سے انگریزوں کا معاہدہ

جب ٹیپو سلطان کے خلاف انگریزوں سے جنگ یقینی ہو گئی تو لارڈ کارنوالس نے حیدرآباد سے معاہدہ ہونے کے بعد اس کے خلاف مرہٹوں کو بھی اتحاد میں شامل کرنے کی کوشش شروع کی۔ چنانچہ پونا کے برطانوی رزیڈنٹ سر چارلس میلٹ کو تاکیدی ہدایات روانہ کیے گئے جو حیدرآباد کے رزیڈنٹ کو بھیجے گئے تھے۔ گورنر جنرل نے ان ہدایات میں یہ توقع ظاہر کی کہ مرہٹے جنگ میں خود اپنی فوج سے کام لیں لیکن رزیڈنٹ کو مطلع کر دیا گیا تھا کہ برطانیہ فوج کی اعانت کے بغیر مرہٹے جنگ میں مستعدی سے کام کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوں تو اس کا بھی انتظام کر دیا جائے گا۔ دوسرے مراسلے میں لارڈ کارنوالس نے رزیڈنٹ کو اختیار دیا کہ اس جنگ میں کارنوالس کے جو ارادے ہیں ان سے دربار پونا کو آگاہ کر دے من جملہ دیگر ارادوں کے یہ ارادہ بھی ظاہر کیا گیا کہ اگر نواب نظام دکن، اور مرہٹے جنگ میں شریک ہو جائیں تو پیشوا کا یہ فرض ہوگا کہ ٹیپو سلطان کو اس بات پر مجبور کرے کہ انہوں نے اور ان کے باپ نواب حیدر علی خاں نے ان دو حاکموں کے علاقے جو غصب کر لیے ہیں اور جن پر وہ اس وقت قابض ہیں ان سب سے دست بردار ہو جائیں،

راداری

علاوہ ازیں کرناٹک اور پائیں گھاٹ کا جو علاقہ ٹیپو سلطان کے تحت ہے اس سے بھی دست حاصل کر لی جائے۔

کچھ عرصہ بعد انگریزوں اور مرہٹوں میں ٹیپو سلطان کے خلاف ایک اقدامی اور دفاعی معاہدہ ہو گیا اور ۵ جولائی ۱۷۹۰ء کو اس پر دستخط ہو گئے۔ اس معاہدہ کے شرائط مجموعی طور پر حیدرآباد کے معاہدہ سے کسی قدر مختلف تھے۔ اس میں یہ طے پایا تھا کہ پیشوا کو اختیار ہوگا کہ وہ اثناء جنگ میں حیدرآباد کی طرح انگریزی فوج کا ایک دستہ اپنی اعانت کے لئے حاصل کرے اور اس کے ساتھ ہی اگر ضرورت پڑے اور مطالبہ کیا جائے تو وہ اپنی سوارہ فوج کا ایک دستہ حیدرآباد اور انگریزوں کی فوج کے ساتھ مل کر لڑنے کے لئے مہیا کرے اس طرح لارڈ کارنوالس نے ٹیپو سلطان کے خلاف جو تدابیر اختیار کی تھیں میں کامیابی حاصل ہوئی۔

اتحاد ثلاثہ کی تکمیل

ٹیپو سلطان ان مرہٹوں کو نیچا دکھا چکے تھے۔ لیکن انہیں اب بھی خوف لگا ہوا تھا ٹیپو سلطان اور [illegible] مرہٹوں کے جو زرخیز علاقے چھین لئے تھے ان کے دوبارہ حاصل کرنے کی بھی مرہٹوں کو خواہش تھی لہٰذا [illegible] دیگر اسباب کے ان وجوہ کی بناء پر بھی مرہٹوں نے اس اتحاد میں شرکت کی۔ اس طرح میسور کے خلاف انگریزوں، شہریار دکن اور پیشوا کے مابین ایک اتحاد ثلاثہ قائم ہوا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ شہریار دکن اور پیشوا کی متحدہ سوارہ فوج تعدادی پچیس ہزار نفر ٹیپو سلطان کے شمالی مقبوضات [illegible] موسم برسات کے دوران میں حملہ کرے اور جس قدر ممکن ہو سکے میسوری مقبوضات پر قبضہ کر لیں اور موسم برسات کے بعد پوری قوت سے ان سے مقابلہ کیا جائے اور اگر ضرورت پڑے تو گورنر جنرل کے طلب کرنے پر مزید سوارہ فوج تعدادی دس ہزار ایک مہینہ کی مدت میں مہیا کر دی جائے جو برطانوی فوجوں کے ساتھ کام کرے گی اور جس کے اخراجات کمپنی کی حکومت برداشت کرے گی دونوں حلیفوں کو دو برطانوی دستے دیئے جائیں گے جس کے اخراجات نواب نظام علی خاں بہادر اور پیشوا اسی مناسبت سے برداشت کریں گے جس طرح کہ ان کے دیسی دستوں کی ادائی منجانب کمپنی ہوا کرے گی۔ مفتوحہ علاقہ کی تقسیم مساوی ہوگی صرف ایسے علاقے جو کمپنی نے ان کی امداد حاصل ہونے کے قبل فتح کئے ہوں کمپنی کی ملک رہیں گے ان پر حلیفوں کو کسی قسم کا حق نہیں ہوگا۔ ایسے زمینداران اور پالیکار جو قبل ازیں شہریار دکن اور

پیشوا کے ماتحت تھے اور جنہیں حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان نے زیر کر لیا تھا۔ ان کی معاشوں کو نذرانہ کے معاوضہ میں بحال کر دیا جائے گا اور نذرانہ کی بھی رقم متحدین آپس میں تقسیم کر لینگے۔ لیکن اس کے بعد ان تعلق شہریار دکن اور پیشوا سے علی الترتیب رہے گا۔ یہ بھی قرار پایا کہ اگر معاہدہ کے طے پانے کے بعد ٹیپو سلطان کسی ایک حلیف پر یورش کریں تو دیگر حلیف اس کی متحدہ امداد کریں گے۔

ٹیپو سلطان سے جنگ اور اس کے نتائج

جب ٹیپو سلطان کے طرز عمل سے یہ امر بدیہی طور پر ظاہر ہو گیا کہ وہ برطانوی حکومت اور اس کے حلیفوں کے مخالف ہیں تو لارڈ کارنوالس نے نہ تو جنگ چھیڑنے میں بیکرانی ہیا کی اور نہ صرف فوری خطرہ کی مدافعت کی جو کمپنی کی حکومت کو اس وقت درپیش تھا۔ جب ٹیپو سلطان کے ارادوں کا پتہ چل گیا تو گورنر جنرل نے حملہ کرنے میں جلدی کی۔ اس نے ان تمام فوائد کا بخوبی اندازہ کر لیا جو فوری اور اقدامی کارروائی سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور جس وقت جنگ کا تہیہ کیا اس وقت سے اس نے کرناٹک اور ملابار کی سمت کمپنی کے حدود بڑھانے کا خیال پختہ کر لیا تھا۔ کیونکہ اس توسیع سے برطانوی حکومت کی طاقت اور اس کے وسائل میں اور بھی اضافہ ہو جاتا تھا۔ اور اس کے زبردست ترین حریف کی قوت بھی کم ہو جاتی تھی اور جب اس نے پیشوا اور فرماں روائے دکن سے اس بات کی درخواست کی کہ وہ کمپنی کے حلیف کی حیثیت سے اس جنگ میں شریک ہوں تو اس وقت بھی اس نے اس اصول کو پیش نظر رکھا اور مالی اور ملکی فوائد کے توقعات دلا کر ان کے حوصلے بڑھائے۔

لارڈ کارنوالس نے حکومت برطانیہ کی عزت برقرار رکھنے اور اس کا اعتماد قائم رکھنے کی غرض سے جس زور اور مستعدی سے جنگ شروع کی اس کا نہایت اچھا اثر پڑا۔ اور فوجی کامیابی کے علاوہ جس اعتدال سے کارنوالس نے جنگ کا اختتام ہونے دیا اس سے اس اثر میں مزید اضافہ ہو گیا۔ جب ٹیپو سلطان نے اپنی مایوس اور شکست خوردہ فوجوں کے ساتھ قلعہ سرنگاپٹم میں محصور ہو گئے تو اپنے آپ کو فاتحین کی رحمدلی اور فیاضی پر چھوڑ دیا۔ بہ الفاظ دیگر اپنے آپ کو لارڈ کارنوالس کے حوالے کر دیا۔ کارنوالس کے حلیفوں کو اس کی ذات پر اس قدر اعتماد تھا کہ انہوں نے بلا تخصیص اپنے جملہ اغراض و مفاد کی

نگرانی بھی اس کے سپرد کردی انہوں نے نہ تو کسی موقع پر لارڈ کارنوالس کی نیک نیتی پر شبہ کیا اور نہ کبھی اختلاف ہی کیا۔ ٹیپو سلطان کے وکیلوں سے ملاقات کرنے کی غرض سے لارڈ کارنوالس کے خیمے کے قریب ایک مقام تجویز کیا گیا۔ ۱۳ فروری کو سلطان کے وکیل اس مقام پر پہونچے۔ انگریزوں کی طرف سے سر جان کینوے (SIR JOHN KENNENAWAY) اور حیدرآباد کی طرف سے میر عالم اور مرہٹوں کے دو نمایندوں نے ان سے ملاقات کی۔ ان کے سامنے پہلی تجویز یہ پیش کی گئی کہ ٹیپو سلطان اپنی ریاست کے نصف علاقے سے دست بردار ہو جائیں اور چھ کروڑ روپے نقد ادا کریں لیکن سلطان کے وکیلوں کے بیان پر کہ سلطان میں اس قدر رقم ادا کرنے کی استطاعت نہیں صرف تین کروڑ روپے کا مطالبہ قائم کیا گیا اور مرہٹوں کے سپہ سالار ہری پنت کی تحریک پر اس میں تیس لاکھ روپے دربار کے اخراجات کے لئے شامل کئے گئے یہ رقم حکومت کے ان عہدہ داروں کے لئے وصول کی گئی جو جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ صلح کے ابتدائی شرایط قرار پاگئے تو ایفائے عہد و تکمیل شرایط کی ضمانت کے طور پر ٹیپو سلطان نے اپنے دو بیٹے بطور یرغمال لارڈ کارنوالس کے پاس روانہ کردیے، ۱۹ مارچ کو ضامن شہزادوں نے سلطان کے تسلیم کردہ شرایط برطانوی سپہ سالار کے حوالہ کئے اور اس صلح نامہ کی تکمیل ہوگئی۔

اتحاد ثلاثہ کے نقائص اور ان کا حیدرآباد پر اثر

لارڈ کارنوالس نے ٹیپو سلطان کے خطرہ کو دور کرنے کے لئے یہ اتحاد قائم کیا تھا۔ اور گو اس اتحاد سے اس خطرہ کا وقتیہ تدارک ہوگیا لیکن اس کی بدولت ایک دوسرا خطرہ رونما ہوا جو اس سے زیادہ خوفناک حیثیت رکھتا تھا کیونکہ یہ اتحاد ثلاثہ خود اپنی جگہ نامکمل تھا اور اس میں بہت سے نقائص پائے جاتے تھے چنانچہ پہلے بھی بیان ہوچکا ہے کہ ”جب لارڈ کارنوالس نے ٹیپو سلطان سے جنگ کے بعد اس امر کی کوشش کی کہ ان تمام دفعات کو واضح طور پر ایک خاص معاہدہ کی شکل میں ترتیب دے لیا جائے تو دربار پونا کی طرف سے انگریزی حکومت کی تجویز کو التوا میں ڈال دیا گیا اور جواب میں تاخیر کی گئی۔ اس طور سے صاف ظاہر کردیا گیا کہ دربار پونا اس قسم کے ان تمام معاہدوں سے علحدہ

رہنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے آیندہ اُسے ٹیپو سلطان اور سلطنت آصفیہ کے خلاف اپنے ارادوں میں کوئی رکاوٹ محسوس ہو" اس طرح یہ اتحاد خود اپنے اندر قطعیت نہیں رکھتا تھا چونکہ تینوں طاقتوں کو نواب حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان کے ہاتھوں نقصانات برداشت کرنے پڑے تھے لہذا ان کی تلافی کے لئے یہ آپس میں متحد ہوئے تھے تاکہ ان کی متحدہ طاقت سے اس مشترکہ دشمن (COMMON FOE) کو زیر کیا جاسکے۔ اس اتحاد کا کم از کم مرہٹوں کے پاس صرف یہی مقصد تھا اس کے علاوہ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس اتحاد سے حیدرآباد سے متعلق ان کے ارادوں میں کوئی رکاوٹ حائل ہو۔ بلکہ اس اتحاد نے دو طریقوں پر ان دو طاقتوں کے مابین جنگ قریب کردی۔ ایک یہ کہ کمپنی اور حیدرآباد کے ان تعلقات ہی کی وجہ سے مرہٹوں کی مخالفت میں زیادتی اور نواب میر نظام علی خاں بہادر سے علانیہ مخاصمت ہوگئی۔ اور دوسرے یہ کہ اس اتحاد کے شرائط کی بموجب ٹیپو سلطان سے جو علاقہ اور رقم وصول ہوئی تھی وہ معاہدہ کے فریقوں میں مساوی تقسیم کرلی گئی تھی جس سے مرہٹوں کی طاقت [illegible] مزید اضافہ ہوگیا اور جس کی وجہ سے حیدرآباد کے مقابلہ میں جنگ کرنے کے [illegible] شہریار دکن کو مرہٹوں کے خلاف ہمیشہ شک و شبہ ہی رہا تھا چنانچہ وہ معاہدہ میں مرہٹوں کے خلاف کمپنی کی مستقل طور پر اعانت حاصل کرنے کی کوشش برابر کئے چلے جارہے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ اس معاہدہ میں کمپنی ان کی سلطنت کی حفاظت کے لئے ایک مخصوص دفعہ شامل کرے [illegible] مرہٹوں کے خلاف مرضی پڑتی تھی اس لئے لارڈ کارنوالس نے یہ امر پسند نہیں کیا [illegible] اخلاص اور خوشی سے اتحاد میں شریک ہوگئے تھے تو انہیں کوئی ایسا موقع دیا جائے [illegible] لہذا ہمیشہ زبانی وعدوں سے یہ کوشش کی کہ یہ مطالبہ ٹال دیا جائے [illegible] طرف سے مطمئن ہوگئے اور اپنے ارادوں کی تکمیل اور تیاریوں میں پہلے سے زیادہ سرگرم ہوگئے۔ کسی اتحاد کے نامکمل اور ناقص ہونے کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ معاہدہ کے فریقوں کو ایک دوسرے پر اعتماد نہیں تھا۔ معاہدہ طے پاجانے کے بعد شہریار دکن کو مرہٹوں پر شک و شبہ باقی رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی اور اس طرح شہریار دکن کے مطالبہ کو پورا کرنے سے لارڈ کارنوالس کا گریز کرنا باہمی اخلاص کے

ناکمل رہنے کی ایک درخشاں مثال ہے دوسری طرف لارڈ کارنوالس کی یہ کوشش اس معاہدہ کے ناقص ہونے کا صاف پتہ دیتی ہے کیونکہ اس سے مطمئن ہوکر مرہٹوں نے نظام کے خلاف مستعدی سے تیاریاں کرنی شروع کیں جب کہ شہریار دکن کے پاس بجز لارڈ کارنوالس کے زبانی وعدہ پر بھروسہ رکھنے کے مرہٹوں کے خلاف کچھ نہیں تھا۔ اس طرح اس معاہدہ کا سلطنت حیدرآباد پر بہت برا اثر پڑا اور انہیں نقائص کا یہی نتیجہ تھا کہ جنگ کھرڈلہ سے سرجان شور نے علحدگی اختیار کی تو شہریار دکن کو بہت سے نقصانات برداشت کرنے پڑے، انہیں معلوم ہوا کہ یہ اتحاد صرف ٹیپو سلطان کے خلاف حیدرآباد اور پیشوا کی اعانت حاصل کرنے کے لئے عمل میں لایا گیا تھا اس سے زیادہ اس کے عمل میں لانے سے لارڈ کارنوالس کا کچھ مطلب نہیں تھا اور دیگر فریقین کے مقاصد اس سے جدا تھے۔

جنگ میسور کا مرہٹوں پر اثر۔ کمپنی پر بے اعتمادی

جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے فرماں روائے دکن سے جو معاہدہ ہوا تھا اس میں اختتام جنگ پر کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی لیکن پونا کے دربار میں اس وقت کچھ اور ہی رنگ تھا کیونکہ لارڈ کارنوالس نے مرہٹوں کی فوج کے سردار ہری پنت کے اس مطالبہ کو کہ سرکشن باجگذاروں اور زیردستوں کی سرکوبی کے لئے پیشوا کو بھی امدادی فوج کا ایک دستہ انہیں شرائط پر دیا جائے جن پر کہ حیدرآباد کو دیا گیا تھا، اس خوف کی بناء پر رد کردیا تھا کہ اسے نانا فرناویس کی جانب سے دیسائی کے خلاف استعمال کیا جائیگا۔ اس کی وجہ سے مرہٹوں نے کمپنی پر بے اعتمادی ظاہر کرنی شروع کردی تھی کہ ضرورت کے وقت ان سے امداد لی گئی اور جب انہوں نے مطالبہ کیا تو اعانت سے انکار کیا گیا۔ اس کے ماسوا انہیں اُس اتحاد سے بھی شک وشبہ ہورہا تھا جو کمپنی اور شہریار دکن میں جنگ میسور کے بعد روز افزوں ترقی کررہا تھا۔ لہذا انہوں نے اس طاقت سے فائدہ اُٹھاکر جو جنگ میسور کے بعد مساوی تقسیم سے انہیں حاصل ہوئی تھی اور اس بے اعتمادی کی بناء پر جو انہیں لارڈ کارنوالس کے ان حرکات کی بناء پر ہوئی تھی حیدرآباد کی علی الاعلان مخالفت شروع کردی اور اس کے خلاف جنگ کی تیاریاں بڑے زور وشور سے شروع کردیں۔

مرہٹوں کی حیدرآباد سے مخالفت اور اس کے خلاف جنگ کی تیاریاں

اس قسم کے تنازعات کے لئے ضروری مواد ان کے سیاسی تعلقات کی وجہ سے ہمیشہ تیار رہتا ہی تھا۔ حیدرآباد پر چوتھ اور سردیس مکھی کا کچھ بقایا تھا، مرہٹے اس کا مطالبہ دس سال سے برابر کرتے چلے آرہے تھے لیکن چونکہ اس دوران میں ٹیپو سلطان کے خلاف انہوں نے اتحاد میں شرکت کرلی تھی لہذا مطالبہ میں تشدد نہیں کیا گیا۔ ۱۷۹۱ء میں گوبندراؤ کالے اور گوبندراؤ پنگلے دربار پونا کے سفیروں نے شہریار دکن سے اس بات کا مطالبہ کیا کہ حساب فہمی کے لئے تنقیح ساز مقرر کئے جائیں تو انہوں نے ایک تنقیدی جواب دیا جس میں مرہٹوں کے بہت سے مطالبات ناجائز بتائے۔ اس کے جواب میں نانا فرناویس نے ایک خط لکھا جس میں ان مطالبات کو جائز قرار دیتے ہوئے شہریار دکن کے ذمہ جو بقایا تھا اس کی ادائی کا مطالبہ کیا جس میں بعض رقمیں ۱۷۷۰ء سے وصول طلب تھے۔ نواب میر نظام علی خاں بہادر نے ان میں سے بعض مطالبات تسلیم کرلئے اور بقایا کے لئے وعدہ فرمایا کہ ٹیپو سلطان سے جنگ ختم ہوتے ہی ان کی جانچ کے لئے ایک کمیشن مقرر کریں گے، شہریار دکن کا خیال تھا کہ میسور کی جنگ کے بعد وہ اس معاملہ کے تصفیہ کے لئے انگریزوں کی مدد حاصل کریں گے چنانچہ جنگ کے بعد لارڈ کارنوالس نے بھی اس بات کی کوشش کی کہ حیدرآباد و دربار پونا کے درمیان ایک معاہدہ کرا دیا جائے جس کی رو سے تمام کو فوائد حاصل ہوں اور اس طرح ہندوستان میں صلح اور امن برقرار رہے لیکن ان ارادوں میں کامیابی نہیں ہوئی۔ دربار پونا ہمیشہ اس تجویز کو ٹالتا رہا اس سے نواب میر نظام علی خاں نا امید ہوگئے تو انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ انگریزوں سے اپنی حفاظت کے لئے ایک علیحدہ معاہدہ طے کرلیں لیکن سرجان شور نے مختلف وجوہ کی بنا پر اس خواہش کو رد کردیا۔

مرہٹوں کے مطالبات شروع ہونے کے بعد سے ہی نواب میر نظام علی خاں بہادر اپنی فوج میں وسعت دے رہے تھے۔ موسو ریمو (RAYMOND) کے تحت ان کے دربار میں ایک زبردست طاقت موجود تھی جس کی بنا پر وہ یہ امید کرتے تھے کہ انگریزوں کے اغماض برتنے کی صورت میں بھی وہ مرہٹوں کے مقابلہ میں ضرور کامیاب نکلیں گے، جب گوبندراؤ کالے نے پیشوا کے مطالبات کی ادائی کا دوبارہ تقاضا

شروع کیا تو نواب میر نظام علی خاں نے ایک تفصیلی حساب برآمد کیا جس کی رُو سے انہیں خود دو کروڑ ساٹھ لاکھ روپے وصول طلب تھے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اس سفیر اور مشیر الملک میں خوب بحث رہی جس کے بعد فریقین نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

نواب میر نظام علی خاں نے خود اپنی سرکردگی میں بیدر میں ایک جرار لشکر جمع کیا۔ نانا فرناویس نے پونا میں ایک بڑی فوج جمع کی۔ اس میں دولت راؤ سندھیا، تکاجی راؤ ہولکر، راجہ برار اور گوبند راؤ اور دیگر مرہٹہ سرداروں نے بھی شرکت کی اور یہ آخری مرتبہ تھا جس میں سرداران مرہٹہ پیشوا کے تحت ایک جا متحد ہوئے۔ اس طرح جنگ کی تیاریاں مکمل ہونے کے بعد ان دونوں میں جنگ ہوئی جس میں مرہٹوں نے کامیابی حاصل کی۔

کھرڈہ کی جنگ کے بعد معاہدہ

کھرڈہ کی جنگ کے بعد جو معاہدہ شہریار دکن اور مرہٹوں کے مابین ہوا وہ جنگ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس کے ذریعہ سے یہ طے پایا کہ مشیر الملک مرہٹوں کے حوالہ کر دیئے جائینگے۔ جنوب میں موضع پرینڈہ سے لے کر شمال میں دریائے تاپتی تک ایسے علاقے جو ۱۷۶۰ء میں سداسیوراؤ بھاؤ نے فتح کئے تھے، بعد میں نواب میر نظام علی خاں بہادر کو واپس کر دیئے گئے تھے (جس میں قلعہ دولت آباد بھی شریک تھا) مرہٹوں کو دیدیئے جائینگے۔ اور بقایا و اخراجات جنگ کے سلسلہ میں تین کروڑ روپے ادا کرنے کا وعدہ کیا گیا نیز ایک علٰحدہ معاہدہ کے تحت نواب میر نظام علی خاں بہادر نے رگھوجی بھونسلا کو بھی بعض علاقے سپرد کر دیئے۔ انہوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ رگھوجی بھونسلا کا بقایا تعدادی انتیس ۲۹ لاکھ روپے ادا کر دینگے اور بھونسلا کو قدیم رواج کے تحت برار کے محاصل و مالگذاری میں اپنا حصہ وصول کرنے کی اجازت دیں گے ان تمام چیزوں کے لئے پیشوا نے رگھوجی بھونسلا کی ضمانت دی اس طرح سرجان شور کے سکوت اختیار کرنے کی وجہ سے مرہٹوں نے اپنے ایک زمانہ کا مدعا حاصل کر لیا۔

سرجان شور کی اس جنگ سے علٰحدگی۔

جس اصول کے تحت سرجان شور نے اس جنگ میں غیر جانبداری اختیار کی تھی وہ ایک طرف

عدم مداخلت کے اس مسلک کے مطابق بتائی جاتی ہے جس کا ذکر پارلیمنٹ کے ایکٹ مورخہ ۱۷۹۲ء میں کیا گیا تھا اور جس کی رو سے کمپنی کو اعلان جنگ کرنے یا لڑائی چھیڑنے کی محض اس وقت اجازت تھی جب کہ حکومت برطانیہ کے خلاف جنگ چھڑ چکی ہو یا اس کے شروع کرنے کے لئے فریق مخالف کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہوں اور دوسری طرف اتحاد ثلاثہ کے نقائص کا بدیہی نتیجہ تھی۔ ان وجوہ کی بناء پر سرجان شور نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ جنگ اتحاد ثلاثہ کے دو فریق میں خانگی حیثیت رکھتی ہے جو کہ باہمی مطالبات کی یکسوئی کے لئے پیش آئی ہے۔ اور اس کا مقصد نہ تو کمپنی کو نقصان پہونچانا یا کمپنی پر حملہ کرنا ہے اور نہ براہ راست اس کا کچھ اثر کمپنی پر پڑ سکتا ہے۔ لہذا ایسے موقع پر جنگ میں خواہ مخواہ مداخلت کرنا بیکار ہوگا۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کو مدد دینے سے مرہٹے کمپنی کے سخت دشمن ہو جائیں گے۔ یہ کمپنی کے لئے بہت مضر ہوگا۔

سرجان شور کے پاس مرہٹے حیدرآباد سے زیادہ خوفناک تھے لہذا یہ امر پسندیدہ نہ تھا کہ مرہٹوں کو خلاف کر لیا جائے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا تھا کہ مرہٹوں، کمپنی اور حیدرآباد کے غیر معمولی تعلقات کی وجہ سے ایک طرح کا جو بدگمانی پیدا ہو گیا تھا وہ اس موقع پر کمپنی کے حیدرآباد کو مدد نہ دینے سے ایک حد تک رفع ہو جا سکتا تھا۔ اس کی وجہ سے کمپنی کے ساتھ مرہٹوں کی دشمنی کا اندیشہ بھی دور ہو سکتا تھا۔ اتحاد ثلاثہ کے شرائط طے پاتے وقت اس بات کو فراموش کر دی گئی تھی کہ فریقین معاہدہ ہی سے کوئی ایک فریق دوسرے پر حملہ کر کے معاہدہ کی خلاف ورزی کرے تو تیسرے فریق کو ایسی صورت میں کیا عمل اختیار کرنا چاہئیے۔ یہ معاہدہ صرف ٹیپو سلطان کے خلاف طے پایا تھا جس سے تینوں کو کدورت تھی۔ اس وقت یہ خیال ہی نہیں کیا گیا کہ بعد میں اس نوعیت کے مختلف فریقوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہی اتحاد ثلاثہ کا ایک بہت بڑا نقص تھا اسی کی وجہ سے سرجان شور کو اس موقع پر غیر جانبداری اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا اسی اصول کے تحت سرجان شور [illegible] نظام علی خاں اپنا حق جتاتے ہیں وہ تین فریقوں [illegible] کا اتحاد ختم کر دیا گیا ہے اور ہر موقع پر تینوں کی یکجائی ضروری ہے۔ بغیر [illegible] لہذا اگر تینوں میں سے ایک فریق دوسرے فریق پر حملہ کرتا ہے تو ان تینوں کے تعلقات [illegible] مرہٹوں نے شہریار دکن پر حملہ کیا ہے تو تعلقات

بدل جانے کی صورت میں کمپنی کو اس بات کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ حیدرآباد کی مدد کرے۔ غرض ایسے غلط تاویلات ودر نقائص کی بناء پر سرجان شور نے مرہٹوں کے مقابل حیدرآباد کو مدد دینے کے خلاف فیصلہ کیا کیونکہ مرہٹوں سے اتحاد قائم رکھنا زیادہ مقدم تھا اس لئے کہ ان کی مدد سے ٹیپو سلطان نیز دیگر یورپین طاقتوں کا مقابلہ کیا جاسکتا تھا۔ حیدرآباد کے تعلقات سے یہ بات میسر نہیں آسکتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ جب انگریزوں نے حیدرآباد سے معاہدہ کرنے کی خواہش کی تو ان کے لئے وہ بڑا نازک موقع تھا اگر نواب میر نظام علی خاں بہادر زور دیتے تو وہ اقدامی و دفاعی دونوں حملوں کے وقت انہیں امداد دینے پر رضامند ہو جاتے۔ اب جب کہ ٹیپو سلطان کا خوف ایک حد تک دور ہو چکا تھا اور نظام کی اعانت کی اتنی سخت ضرورت نہیں تھی تو اپنے مفاد کے تحت حیدرآباد کے مقابلہ میں انہوں نے مرہٹوں کو خوش رکھنا قرین مصلحت سمجھا جس سے سرجان شور کی خود غرضی کا پورا پورا پتہ چلتا ہے۔

ویلزلی کی آمد کے وقت حیدرآباد اور کمپنی کی مراسلت

مذکورۂ بالا واقعات سے ظاہر ہے کہ ویلزلی کی آمد کے وقت حیدرآباد کے حالات برطانوی مفاد کے خلاف تھے لیکن چند واقعات ایسے پیش آگئے تھے جن کی وجہ ویلزلی کو اپنی کارروائی میں کامیابی کا یقین ہو گیا تھا چنانچہ مسٹر ڈنڈاس کو لکھا ہے کہ :۔

"فی الوقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دربار حیدرآباد بڑی قربانیاں کرکے ہم سے زیادہ قریبی تعلقات قائم کرنے کا خواہاں ہے۔ دیگر وجوہ کے مدنظر اگر اسکو قابل اعتراض قرار نہ دیا جائے تو یہ تعلقات ہمارے لئے زیادہ فایدہ بخش شرایط پر شاید قائم ہو سکینگے مگر شرط یہ ہے کہ ہم یہ تعلقات اظہار کرم کے طور پر نظام کو خوش کرنے کے لئے قائم کریں لیکن اگر ہم گفت و شنید اس مطالبہ پر شروع کریں کہ نظام کی فوج کے کسی جزو کو برطرف کر دیا جائے تو اس میں کسی زیادہ فائدہ کی توقع نہیں ہو سکتی"[۵۱]

اعظم الامراء کے یہ عروج کا زمانہ تھا وہ مرہٹوں اور ٹیپو سلطان سے بدظن تھے ادھر ایسے معاہدہ کے لئے آمادہ تھے جس کی بدولت حیدرآباد کو اس کے حریفوں کے مقابلہ میں امن حاصل ہو سکے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ فرانسیسیوں کی کمان میں جو فوج ہے وہ حیدرآباد کو ان حملوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔

۵۱۔ ایضاً صفحہ ۳۱۲

مزید برآں وہ اس بات سے بھی غافل نہ تھے کہ اگر اس فوج کی تعداد میں اضافہ ہوگیا تو اس سے برطانوی حکومت کو شبہ ہوگا اور ممکن ہے کہ تصادم بھی ہو جائے اور اس طرح ہندوستان کی اس تنہا طاقت سے بھی جنگ کرنی پڑے جو معقول طریقہ سے اس کی حفاظت کر سکتی ہے نیز دربار حیدرآباد اس طاقت کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ان حالات کے تحت لارڈ ویلزلی نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کپتان جیمس اکلیس کرک پیٹرک (CAPTAIN JAMES ACLILLES KIRK PATRICK) منصرم رزیڈنٹ حیدرآباد کو لکھا کہ اعظم الامراء کے ذریعہ شہریار دکن پر ٹیپو سلطان کی حریفانہ مخالفت ظاہر کرتے ہوئے عہدنامہ پانگل (TREATY OF PAUNGUL) کے ذریعہ جس اعانت اور امداد کا وعدہ کیا گیا تھا اس کا مطالبہ کیا جائے نیز فرانسیسی دستوں کی برخاستگی اور ان کی جگہ برطانوی فوجوں کی ماموری کا بھی مطالبہ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں رزیڈنٹ کو لکھا گیا کہ "اعظم الامراء کو اس امر کی جانب توجہ دلائی جائے کہ ان کے نظم و نسق کی عزت و امتیاز کا باعث ہوگا اگر ان کی وساطت سے نظام اور پیشوا اس بات پر آمادہ ہو جائیں کہ باہمی فائدہ حاصل کریں اور ایک ایسی بدنظمی و انتشار سے دائمی تحفظ کا سامان کریں جو مشترکہ طور سے حاصل کئے ہوئے فوائد کے لئے باعثِ خطرہ ہے۔[۵۱]"

اعظم الامراء اس وقت انگریزوں کے ان مراسلوں پر التفات کرنے کے لئے آمادہ تھے جنہیں انہوں نے حیدرآباد سے تعلقات بڑھانے کی خواہش ظاہر کی تھی اور چونکہ ان کے نزدیک حیدرآباد کو تمام خطرات سے بچانے کا بہترین ذریعہ یہی تھا اس لئے وہ خود بھی اس بات کے خواہاں تھے کہ انگریزوں سے قریبی تعلقات قائم ہو جائیں۔ اگرچہ شہریار دکن اُن برائیوں سے بہ خوبی واقف تھے جو حیدرآباد کو صرف انگریزوں کی اعانت پر منحصر کر دینے سے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا تاہم چونکہ وہ مرہٹوں، ٹیپو سلطان اور انگریزوں کسی کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اس لئے اعظم الامراء نے انہیں یہ بات بہ آسانی سمجھا دی کہ حیدرآباد کے مفاد کے لئے دوسروں کے مقابلہ میں انگریزوں سے اتحاد قائم کرنا بہتر و مفید ہوگا۔ بالآخر شہریار دکن نے فرانسیسی فوجوں کی برطرفی اور انگریزوں کی امدادی فوج میں اضافہ کرنے کے متعلق کمپنی سے

۵۱۔ پاسو صفحہ ۲۱۶

اسلت کرنے کے لئے اس شرط پر اجازت دے دی کہ برطانوی حکومت سلطنت حیدرآباد کو مرہٹوں کے انصافانہ مطالبات سے محفوظ رکھنے کا صریح وعدہ کرے۔

ویلزلی کا مقصد اور دربار حیدرآباد کا کمپنی سے معاہدہ

جن واقعات کی وجہ سے لارڈ ویلزلی کو حیدرآباد سے تعلقات بڑھانے کی ترغیب ہوئی وہ اتنے اہم تھے اور برطانوی مقبوضات کی بقا کا ان پر اس قدر مدار تھا کہ اس وقت لارڈ ویلزلی نے مطلق اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ اپنے اس مسلک کا دربار پونا پر کیا اثر پڑے گا، مسیو ریمو کی سرکردگی میں حیدرآباد کے فوجوں کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی تھی مزید برآں اس کی تعداد بڑھا کر چودہ[14] ہزار کردینے کے بھی احکام جاری ہوچکے تھے اور ان کی تنخواہ کے لئے ایک کثیر رقبۂ اراضی کرناٹک کی سرحد پر مختص کردیا گیا تھا جس کی وجہ سے خود ویلزلی کے خیال کے مطابق ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت حیدرآباد کو انگریزوں سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا اور اس کا اتحاد فرانسیسی طاقت کے ساتھ ہوجائے گا چنانچہ لکھا ہے کہ:۔

"اس امر میں مجھے کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے خاص حلیفوں کے دربار میں اس قسم کی ایک پارٹی کی بے روک ٹوک اور مسلسل ترقی کا قدرتی اثر یہ ہوگا کہ نہایت ہی قلیل عرصہ میں اس دربار کو ہمارے مفاد سے کوئی سروکار نہ رہیگا۔ اور بالآخر ہمارے دشمنوں کے مفاد اس دربار سے وابستہ ہوجائینگے ان درباروں میں ان لوگوں کی رائے اور مشورت پر عمل ہونے لگیگا۔ اور فوجی نظام ان کے حسب دلخواہ قائم ہوجائیگا ریمو کی فوج کو سپلن یا میدان جنگ میں کارکردگی کے نقطۂ نظر سے فی الوقت کتنی ہی بے حیثیت کیوں نہو کیا یہ غلطمندی ہوگی کہ آدمیوں کی اس قدر بڑی جماعت ان اصلاحات کو قبول کرنے کے لئے تیار رہے جو یورپ سے خاص اس مقصد سے بھیجے ہوئے فرانسیسی افسر اپنی قابلیت، محنت اور جوش سے اس خاص مقصد کے تحت مامور شدہ فوجی دستوں کے نظام میں جاری کرنا چاہیں۔ ایسے اصلاحات جو ان اصول و مقاصد کے مطابق ہوں جنکو یہ لیڈر اپنی توقعات کے برآنے کا باعث سمجھتے ہیں۔ ان حالات میں یہ فوجی دستے جن کی کارکردگی کسی سیاسی پارٹی سے بہتر نہیں ہے بہت جلد ہمارے دشمنوں کے ہاتھ میں اتنے ہی کارگزار ہوجائینگے جتنے کہ فی الوقت وہ ہمارے لئے اور نظام کے واسطے غیر مفید ہیں[1]"

---

[1] ویلزلی تالیف ہٹن صفحہ ۲۳

اس مراسلت سے ویلزلی کا پہلا مقصد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی خوفناک طاقت کو جس سے کہ برطانوی مفاد کو ہر طرح کا خطرہ تھا دربار حیدرآباد سے نکال دیا جائے اور اس کی جگہ برطانوی فوجوں کو مامور کیا جائے جو حیدرآباد کو مرہٹوں کے حملوں سے محفوظ رکھ سکیں اس سلسلہ میں وہ کپتان کرک پیٹرک کو لکھتا ہے:-

"اعظم الامرا پر یہ بات پر زور طریقہ سے ظاہر کی جائے کہ فرانسیسی پارٹی کو بے دخل کرنے کے لئے جو تجاویز مرتب کئے گئے ہیں ان کے آشکارا نہ ہونے کے لئے احتیاط عمل میں لانا ضروری ہے۔ ان پر اس تجویز کی خوبی بھی ظاہر کی جائے کہ فوج کی قطعی تخفیف میں آسانی کی خاطر اسکو چھوٹے چھوٹے دستوں میں برخواست کرنا چاہیئے تاکہ افسروں اور سپاہیوں کے ٹیپو سلطان یا سندھیا کی ملازمت میں شامل ہوجانے کی روک تھام ہوسکے۔ اگر نظام کی جانب سے اعظم الامرا ان پیش کردہ شرائط پر راضی ہوجائیں تو اس وقت تمہیں فورٹ سینٹ جارج سے فوج طلب کرنے کی ضرورت پیش آئیگی"[۵۱]

اس بات کا بھی امکان پایا جاتا تھا کہ شہریار دکن ٹیپو سلطان سے اتحاد کریں گے جو کمپنی کے مفاد کے لئے خطرناک ہوگا لہذا فرانسیسیوں کی سرکوبی کے ساتھ ہی ساتھ اس مراسلت سے ویلزلی کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس امکانی خطرہ کو دور کیا جائے نیز مرہٹوں کی دست رس سے سلطنت حیدرآباد کو محفوظ رکھا جائے۔ اس طرح ایک جانب ملک میں امن اور دوسری طرف شہریار دکن کے حقوق کی حفاظت اور اُن کا اقتدار بڑھایا جائے اور ساتھ ہی ساتھ کمپنی کے لئے ہندوستان میں اقتدار اعلیٰ حاصل کرنے کا سامان ہوجائے چنانچہ لکھا ہے کہ:-

"میرا مقصد یہ ہے کہ حکومت نظام میں کچھ تھوڑی سی کارکردگی اور قوت پیدا کروں۔ اتحاد کے قیام کے لئے یہ اقدام ایک بہت بڑے منصوبہ کا ایک جزو ہے۔ یہ اتحاد اس وقت سے پہلے ہی قائم ہوجانا چاہیئے کہ جب کہ ٹیپو سلطان یہ خیال کرسکے کہ وہ اب ہم پر حملہ کرنے کے قابل ہوگیا ہے"[۵۲]

جب فریقین کے مفاد و اغراض اس اتحاد سے اس قدر زیادہ وابستہ تھے تو ظاہر ہے کہ گفت و شنید میں زیادہ دقتیں پیش نہیں آسکتی تھیں چنانچہ لارڈ ویلزلی نے لکھا ہے کہ:-

"اعظم الامرا نے میری تجاویز کا جو خیر مقدم کیا ہے اس سے مجھے انتہائی اطمینان ہوا۔ انکی امید بھی

---

۵۱ - باسو ص ۳۱

نہ تھی کہ پہلی اطلاع دہی کے ساتھ وہ ایک ایسے منصوبہ پر اس سے زیادہ رضامند ہو جائینگے جو بہت ہی پیچیدہ مفادات پر مشتمل ہے۔ اعظم الامراء جس ... کے ساتھ مزید امدادی فوج کے فوراً سینٹ جارج سے آنے کے لئے زور دے رہے ہیں اور جسکو وہ فرانسیسی ... کے خاتمہ کے لئے ایک ناگزیر ابتدائی مرحلہ تصور کرتے ہیں۔ اس سے میری اس رائے کی کافی توثیق ہوتی ہے جو میں نے اس پارٹی کی خطرناک قوت اور اسکے بڑھتے ہوئے رسوخ کی بندش کیلئے ہماری مداخلت کی قطعی ضرورت کے متعلق قائم کی تھی"[1]

دربار حیدرآباد کا کمپنی سے معاہدہ

ان واقعات کے تحت حیدرآباد اور کمپنی کے مابین کپتان کرک پیٹرک کے توسط اور لارڈ ولزلی کے حکم سے یکم ستمبر ۱۷۹۸ء کو ایک معاہدہ اس لئے طے پایا کہ شہریار دکن نے کمپنی کی فوجوں میں جو حیدرآباد میں مقیم تھیں اضافہ کی خواہش کی تھی نیز ٹیپو سلطان کے خلاف انگریزوں کو شہریار دکن کی اعانت ضروری تھی۔ اس معاہدہ کے ذریعہ برطانوی فوجوں کی تعداد میں اضافہ اور ان کا حیدرآباد میں قیام مستقل کر دیا گیا۔ سابقہ معاہدہ کی روسے جو دو بٹالین طے پائے تھے ان میں چار کا اضافہ ہوا نیز ایک مناسب توپ خانہ بھی دیا گیا۔ اخراجات سالانہ چوبیس لاکھ ستتر ہزار اکیسو روپے قرار پائے۔ اس رقم کی ادائی ان فوجوں کے حیدرآباد کے حدود میں داخل ہوتے ہی قرار پائی۔ اور یہ وعدہ کیا گیا کہ یہ رقم ہر سال چار اقساط میں پابندی کے ساتھ ادا کی جائے گی۔ اگر اقساط کی ادائی میں تاخیر ہو تو یہ رقم اُس پیش کش کی رقم سے منہا کر لی جائے گی جو کمپنی کی طرف سے شہریار دکن کو وصول ہوتی تھی اور کبھی قسط بند ہو جائے تو اسکی پا بجائی ایسے مواضعات کے محاصل سے کر دی جائے گی جن کی مالگزاری قسط کے مماثل ہو یعنی کمپنی کو اس قسط کے معاوضہ میں ان مواضعات کی مالگزاری وصول کرلینے کا حق ہوگا۔ ان فوجوں کو ہر طرح کا آرام پہونچانا والی ملک کا فرض ہوگا۔ ان فوجوں کا یہ کام ہوگا کہ وہ شہریار دکن کی ذات اور ملک کی ہر طرح حفاظت کریں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ شہریار دکن اُن سے معمولی کاروبار کے کام لیں جیسے کہ مالگزاری وصول کرنا وغیرہ۔ ان فوجوں کے حیدرآباد پہونچتے ہی فرانسیسی فوج نیز حیدرآباد کا تمام فرانسیسی نظام برخواست کر دیا جائے گا اور آئندہ کبھی بھی کوئی فرانسیسی ریاست کی ملازمت میں یا

---

[1] باسو صفحہ ۲۱۶

بغیر اجازت ریاست میں مقیم نہیں ہونے پائے گا۔ دوسرے یورپی اقوام کے ساتھ بھی اسی کے مماثل عمل کیا جائے گا۔ اب اور آئندہ جو فرانسیسی حیدرآباد میں پائے جائیں گے وہ سب کمپنی کے حوالہ کردیئے جائیں گے۔ اس سلسلہ میں اور موجودہ فرانسیسی فوجوں کو برخاست کرنے کے سلسلہ میں کمپنی کو اپنی صوابدید پر حیدرآباد کی مدد کرنی ضروری ہے۔ برطانوی حکومت نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ غیر جانب داری اور انصاف کے اصول پر حیدرآباد اور پونا کے تنازعات کو بہ حیثیت ثالث کے طے کرے گی اور اپنے فیصلے پر پونا کی رضامندی حاصل کرے گی اور رضامندی حاصل نہ ہونے کی صورت میں وہ حیدرآباد کو مرہٹوں کے نامناسب اور بے جا مطالبات سے محفوظ رکھے گی۔ نواب آصف جاہ بہادر راؤ پنڈت پردہان کے مقبوضات پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کرسکیں گے نیز نظام دکن اور کمپنی دونوں اس بات کے مجاز نہیں ہوں گے کہ راؤ پنڈت پردہان کی سرکار سے کسی قسم کی ایسی مراسلت کریں جو ان دو (نظام اور کمپنی) میں مخفی رہے لہذا ایسی مراسلت جو آئندہ ہوا کرے اس کا اظہار شہریار دکن اور کمپنی دونوں پر ضروری ہے اور اس قسم کی مراسلت کے لئے ان دونوں کی باہمی رضامندی ضروری ہے۔[1]

اس معاہدہ کے متعلق مسٹر ونڈاس کی رائے یہ ہے کہ :۔

"نظام سے آپکا معاہدہ ہر اس خطرہ کو موثر طور سے ختم کردیتا ہے جو اس کام کے سلسلہ میں لاحق تھا۔ اور چاہے آپ اس معاہدہ کے سلبی پہلو پر غور کریں کہ فرانسیسی فوجیں ہمارے پڑوس سے ہٹادی جائینگی یا اسکے ایجابی پہلو پر کہ اس سے ہمیں مزید تقویت اور ہمارے مالیہ کے استحکام میں اعانت حاصل ہوگی۔ یہ معاہدہ مختلف نقاط نظر سے ہمارے لئے مفید ہی ہے۔

آپ نے اس سے ایک عرصہ قبل ہی میرے اس اطمینان کو محسوس کرلیا تھا جو مجھے اس معاملہ سے حاصل ہوا اور جو نہایت ہی استادانہ اور موثر طریقہ پر عمل میں لایا گیا ہے"[2]

اس طرح حیدرآباد کے سابق معاہدہ ۱۷۹۰ء میں جو کمی باقی رہ گئی تھی پوری ہوگئی۔ یعنے حیدرآباد کو معاہدۃً خواہ طریقہ پر مرہٹوں کے خوف سے امن حاصل ہوا۔ کارنوالس نے مرہٹوں کے خوف کے باوجود شہریار دکن کے

---

[1] اے چی سن۔ معاہدات جلد ۵ صفحہ ۴۹ تا ۵۰۔ [2] ہٹن۔ ویلزلی ص ۲۷

بار بار اصرار کرنے پر حیدرآباد کے معاہدہ میں مرہٹوں کے خلاف مدد دینے کی شرط کو نہیں شریک کیا۔ بلکہ زبانی وعدوں سے دلجوئی کر دی اور انہیں ٹیپو سلطان کے خلاف اپنے ساتھ کر لیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹوں نے ان زبانی وعدوں کی پرواہ نہیں کی اور اپنے عدم مداخلت کے مسلک کے تحت شہریار دکن کو مرہٹوں کے خلاف مدد نہیں دی جس کی وجہ حیدرآباد کو نقصان کثیر اٹھانا پڑا۔ ایسی صورت میں قدرتی تھا کہ شہریار دکن انگریزوں سے بدظن ہو جاتے چنانچہ انہوں نے جنگ کھرڈلا کے بعد انگریزی فوجوں کو برخواست کر کے ان کی جگہ فرانسیسی دستے مامور کئے، جب ویلزلی ہندوستان پہونچا تو حالات کے لحاظ سے کمپنی کو حیدرآباد کی اعانت حاصل کرنا لازمی تھا لہذا ویلزلی نے مرہٹوں کی کوئی پرواہ نہیں کی بلکہ اپنے جدید معاہدہ میں ان کے خلاف حیدرآباد کی مدد کرنے کا وعدہ کر لیا کیونکہ اس وقت حیدرآباد کی اعانت صرف اسی ایک صورت میں حاصل ہو سکتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد کو اطمینان حاصل ہونے سے شہریار دکن کا انگریزوں پر اعتماد زیادہ ہو گیا۔ اس طرح کمپنی کا حیدرآباد میں مستقل اثر قائم ہو گیا اور ٹیپو سلطان کے خلاف کارروائی کرنے میں حیدرآباد کے وسائل پر اسے پوری قدرت حاصل ہو گئی۔ نیز مرہٹوں کا میدان عمل جنوب میں تنگ ہو گیا کیونکہ وہ کمپنی کی مخالفت آسانی سے مول لینے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔

ٹیپو سلطان سے جنگ اور اس کے نتائج

اس طرح شہریار دکن کی اعانت حاصل ہو جانے کے بعد ویلزلی نے ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا لیکن ساتھ ہی جنرل ہیرس کو یہ اختیار دے دیا کہ اگر سلطان کی جانب سے مصالحت کی خواہش ظاہر ہو تو سلسلہ جنبانی ان شرائط صلح پر ہو سکتی ہے جو اس وقت کی حالت کے مطابق ہوں۔ اگر یہ خواہش اس وقت ظاہر کی جائے جب کہ برطانوی فوجوں نے کوئی فیصلہ کن فتح حاصل کر لی ہو یا سلطان کے دارالحکومت تک پہونچ چکی ہو تو اس صورت میں نصف سلطنت اور دو کروڑ روپے متحدین کے حوالہ کرنے کا مطالبہ کیا جائے اور شرائط کی تکمیل تک سلطان کے چار لڑکے اور چار اعلیٰ عہدہ دار بطور یرغمال حاصل کئے جائیں۔

جنرل ہیرس کی فوج حیدرآباد کی فوج کے ساتھ ۳ مارچ ۱۷۹۹ء کو بغیر کسی مقابلے کے سلطنت

میسور کے حدود میں داخل ہوگئی، ٹیپو سلطان ان فوجوں کو بڑھتا ہوا دیکھ کر جنرل اسٹوآرٹ کی
فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے آگے بڑھے جو علاقہ کورگ سے میسور کی تسخیر میں حصہ لینے کے لئے بڑھ رہی تھی،
اس کے مقابلے میں سلطان کو پسپائی ہوئی جس کے بعد انہوں نے جنرل ہیرس کی طرف رخ کیا سلطان پیٹ
اور ملاولی کے درمیان مقابلہ ہوا ٹیپو سلطان کو یہاں بھی شکست ہوئی وہ سرنگاپٹم چلے گئے جہاں
برطانوی اور حیدرآبادی فوجوں نے قلعہ کا چند روز کے بعد محاصرہ کرلیا۔

۹؍اپریل ۱۷۹۹ء تک ٹیپو سلطان نے جنرل ہیرس سے کسی قسم کی مراسلت نہیں کی اب انہوں نے
ایک خط لکھا جس میں برطانوی فوجوں کی حملہ آوری کا سبب دریافت کیا۔

جنرل ہیرس نے اس کے جواب میں ویلزلی کے خطوط کا حوالہ دے دیا۔ ۲۰؍اپریل ۱۷۹۹ء کو
ٹیپو سلطان نے صلح کی خواہش ظاہر کی جس کے جواب میں ان شرائط صلح کا مسودہ روانہ کردیا گیا جن کے
ایسے وقت میں پیش کرنے کی جنرل ہیرس کو ہدایت کی گئی تھی۔

اس کا کوئی جواب نہیں آیا، محاصرہ جاری رہا اور ۴؍مئی ۱۷۹۹ء کو قلعہ فتح ہوگیا ٹیپو سلطان
شہید ہوئے اور اس طور سے نواب حیدر علی خاں کے خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔

فتح سے زیادہ مستقل و حقیقی مفاد کا انحصار مفتوحہ علاقہ کے انتظام پر تھا۔ چونکہ کمپنی اور
شہریار دکن نے ہی اس میں حصہ لیا تھا لہٰذا انہی دونوں کو اختیار حاصل تھا کہ وہ انہیں آپس میں جیسا چاہیں
تقسیم کرلیں۔ حیدرآباد کی طرف سے لارڈ ویلزلی کو اس کے انتظام کا پورا حق دیدیا گیا تھا۔ آپس میں پورے
مفتوحہ علاقہ کی تقسیم سے چونکہ شہریار دکن کو زیادہ طاقت حاصل ہوجاتی تھی اور ان کے قبضہ میں ایسے
علاقے چلے جاتے جن سے برطانوی مقبوضات کو ہمیشہ خطرہ رہتا اس لئے ویلزلی اس نتیجہ پر پہونچا کہ
میسور میں ایک جدا سلطنت کمپنی کی نگرانی میں قائم کی جائے اور مرہٹوں کو مفتوحہ علاقہ کی تقسیم میں شریک
کرلیا جائے۔ خاندان ٹیپو سلطان کو برقرار رکھنا قطعاً مصلحت کے خلاف تھا لہٰذا راجہ میسور کے وارث کا
مسند نشین کرنے کا تصفیہ ہوا۔

اس طور سے ان معاملات کا فیصلہ ہوتے ہی ان کی تکمیل کے لئے احکام جاری کردیئے گئے سلطان

اولاد کو ویلور پہونچا دیا گیا اور قدیم حکمران ہندو خاندان کے وارث کرشنا راج اوڈیور کو گدی نشین کر دیا گیا۔ چونکہ یہ بہت کمسن تھے اس لئے ٹیپو سلطان کے دیوان پورنیا برہمن کو نئے راجہ کا دیوان مقرر کیا گیا اور دو معاہدے کئے گئے ایک تقسیمی اور دوسرا اعانتی۔ اوّل الذکر کمپنی حیدرآباد اور میسور کے درمیان تھا جس میں حیدرآباد اور کمپنی کے علاقوں کا فیصلہ درج تھا سلطان کی اولاد اور اس کے خاص خاص عہدہ داروں کے وظائف کے رقوم اور ان کے ادا کئے جانے کے طریقے بھی اس میں تحریر تھے نیز یہ بھی طے پایا کہ جو علاقہ حکومت پونا کے لئے تجویز ہوا ہے اگر اسے وہ ایک مہینہ کے اندر تسلیم نہ کرے اور کمپنی اور حیدرآباد کو چند فیصلہ طلب امور کے متعلق مطمئن نہ کر دے تو یہ علاقہ بھی کمپنی اور حیدرآباد کے مابین تقسیم کر لیا جائے گا۔ (چنانچہ بعد میں یہ علاقے حسب تقسیم کر لئے گئے) ثانی الذکر معاہدہ صرف کمپنی اور جدید سلطنت میسور کے مابین باہمی تعلقات طے کرنے کی غرض سے طے پایا جس کی شرائط کے بموجب میسور کا جدید راج سیاسی معاملات میں کمپنی کے ماتحت قرار پایا اس طرح ویلزلی کو اپنی فراست سے ایک خوفناک اندیشہ کا خوشگوار نتیجہ حاصل ہو گیا اور ایک دشمن سلطنت ایک کامل ماتحت ریاست میں بدل گئی۔

حیدرآباد سے جدید معاہدہ سنہ ۱۸۰۰ء

چونکہ ایک زمانہ سے کمپنی اور شہریار دکن میں دوستانہ تعلقات چلے آرہے تھے اور ایک حد تک ان دونوں کا مفاد ایک ہی سمجھا جاتا تھا نیز مرہٹوں کی مخاصمانہ روش جو انہوں نے ٹیپو کی شکست کے بعد سے اختیار کی تھی جاری تھی اس لئے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کمپنی اور حیدرآباد کے درمیان جو تعلقات قائم ہوئے ہیں انہیں ہر عملی طریقہ سے مستحکم کیا جائے تاکہ جنوبی ہند میں کسی قسم کی بدامنی کا اندیشہ باقی نہ رہے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے کمپنی اور دربار حیدرآباد کے مابین ایک جدید معاہدہ ۱۲ر اکتوبر سنہ ۱۸۰۰ء کو عمل میں آیا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ موجودہ دوستانہ تعلقات دائمی قرار دئے جائیں ایک فریق کا دوست یا دشمن دوسرے فریق کا بھی دوست یا دشمن ہوگا اور دونوں فریقوں میں پہلے جو معاہدے ہوئے تھے ان کی توثیق کر دی گئی۔ اگر کوئی طاقت فریقین میں سے کسی ایک کے حقوق پر بے جا یورش کرے اور ائیں پر مصر رہے تو

تو فریقین متحدہ طور پر اس کا تدارک کریں گے۔ اس شرط کو پوری طور سے واضح کرنے کے لئے گورنر جنرل نے منجانب کمپنی یہ اعلان کیا کہ شہریار دکن کے حقوق کی اس طرح حفاظت کی جائے گی جس طرح کے کمپنی کے حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے لہٰذا اگر کوئی طاقت حیدرآباد پر حملہ کرے تو اس کی مدافعت کرنا کمپنی کا فرض اولین ہوگا۔ اس مدافعانہ اور حفاظتی معاہدہ کی تکمیل کی غرض سے شہریار دکن نے اس بات کا وعدہ کیا کہ کمپنی کے موجودہ چھ دستے پیادہ اور ایک دستہ سوارہ فوج میں دو دستے پیادہ اور ایک دستہ سوارہ فوج معہ ایک مناسب توپ خانہ کا اضافہ ہمیشہ کے لئے کردیا جائے گا۔ اس طرح کمپنی کی جو فوج حیدرآباد میں مقیم رہیگی اس کی تعداد آئندہ سے آٹھ دستے پیادہ اور دو دستے سوارہ فوج معہ ایک مناسب توپ خانہ کے رہے گی اور ان فوجوں کا ہمیشہ کے لئے حیدرآباد میں قیام رہے گا۔ اس مزید فوج کے نئے مصارف کی شرح وہی رہے گی جو موجودہ فوج کے لئے مقرر ہے۔ یہ اس وقت سے قابل ادائی ہوگی جب کہ یہ فوجیں حیدرآباد کے حدود میں داخل ہوں۔ ان مصارف کی پابندی سے ادائی ہونے کے لئے شہریار دکن نے اس معاہدہ کے ذریعہ اُن تمام علاقوں کو کمپنی کے حوالہ کردیا جو انہیں صلح نامہ سرنگاپٹم ۱۷۹۲ء اور میسور کے معاہدہ ۱۷۹۹ء کے ذریعہ سے حاصل ہوئے تھے۔

لیکن چونکہ ان میں سے بعض علاقے کمپنی کی مرضی کے موافق نہیں تھے اس لئے نواب آصف جاہ بہادر نے کپل گجیندر گڑھ وغیرہ جو دریائے تنگبھدرا کے شمال میں تھے اودھونی اور ایسے علاقے جو دریائے تنگبھدرا کے جنوب میں تھے معاوضہ میں ہمیشہ کے لئے کمپنی کے حوالہ کردیئے تاکہ کمپنی کے مقبوضات کی سرحد اچھی طرح قائم رہ سکے اگرچہ ان علاقوں کی آمدنی معاہدہ کے وقت معاونتی فوج کے مصارف کی مساوی نہ تھی تاہم خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کی غرض سے کمپنی نے اس تفاوت کا مطالبہ نہیں کیا لہٰذا اس کے معاوضہ میں شہریار دکن نے بھی اسی نقطۂ نظر کے تحت یہ وعدہ کرلیا کہ انہیں جو مطالبات کمپنی سے تھے وہ معاف کردیئے جائیں گے۔ اس دفعہ کا اصلی مطلب یہ تھا کہ معاونتی فوج کے مصارف کی غرض یہ قسمی انتظام جو علاقوں کے ذریعہ سے کیا گیا تھا آخری ہو، ان علاقوں پر کمپنی کا قبضہ ہونے تک سابق معاونتی فوج کے مصارف حسبہ ادا کئے جائیں گے جس کے بعد حیدرآباد سے کسی قسم کا رقمی مطالبہ نہیں کیا جائے گا، اگر فریقین اور کسی تیسری طاقت کے مابین جنگ چھڑے بجز دو

دستوں کے جو شہریار دکن کی ذات کی حفاظت کے لئے دارالسلطنت میں رہیں گے باقی تمام معاونتی فوج معہ حیدرآباد کے چھ مقامی پیادہ دستوں اور نو ہزار سوارہ فوج کے میدان جنگ میں روانہ کردی جائے گی۔ اس طرح کمپنی کی طرف سے بھی زیادہ سے زیادہ فوج روانہ کی جائے گی تاکہ امن و امان جلد قائم ہو جائے۔ آئندہ سے بلا اجازت کمپنی حیدرآباد کی سلطنت کسی دوسری سلطنت سے کسی قسم کے بھی تعلقات نہیں پیدا کرے گی اسی طرح کمپنی کی طرف سے ریاست کے اندرونی معاملات میں قطعاً مداخلت نہیں کی جائے گی جو کلیتاً شہریار دکن کی صواب دید پر منحصر رہیں گے۔ حیدرآباد کی سلطنت سے اگر کوئی جھگڑا کرے تو کمپنی ثالث کا کام انجام دیگی اور اس کا فیصلہ ناطق رہے گا۔ فریق معاہدہ دوسرے فریق کی حفاظت اور مدد کرنا اپنا فرض اولین سمجھے گا۔ چونکہ ایک زمانہ سے کمپنی حیدرآباد پیشوا اور رگھوجی بھونسلا کے مابین دوستانہ تعلقات چلے آرہے ہیں لہٰذا ان دونوں کو بھی اس معاہدہ میں شریک ہوکر اس سے مستفید ہونے کا موقع دینا چاہیئے۔ اسی طرح ملک کے امن و امان کی خاطر دولت راؤ سندھیا کو بھی اس اتحاد میں شریک ہونیکی دعوت دینی چاہیئے، پیشوا کو اسی وقت اس اتحاد میں شریک کرلیا جائے گا، جب کہ وہ اپنے اور نواب آصف جاہ بہادر کے مابین کمپنی کو ثالث تسلیم کرے حیدرآباد کو چوتھ کی ادائی سے بری کردیا جائے۔ اس کے بعد فریقین پیشوا کا وقار قائم کرنے کی ہر طرح کوشش کریں گے جس کے لئے پیشوا کو ہمیشہ کے لئے کمپنی کی معاونتی فوجوں کی خدمات حاصل کرنی ہوگی۔ اسی طرح رگھوجی بھونسلا کو اپنے اور نواب آصف جاہ بہادر کے مابین کمپنی کو ثالث مقرر کرنا ہوگا۔ اگر اس معاہدہ کے مفاد کے خلاف جنگ لازمی قرار پائے تو فریقین اس کے خلاف پوری تن دہی سے متحدہ طور سے شریک ہوں گے اور جو کچھ مقبوضات حاصل ہوں گے وہ مساوی تقسیم ہوں گے۔ ان میں مساوی حصہ پانے کا نواب آصف جاہ بہادر کو پورا حق ہوگا جب کہ وہ اس معاہدہ کے شرائط کو وفاداری سے پورا کریں۔[1]

اس طرح نقد اقساط کے بجائے سلطنت کے مستقل علاقے حاصل کرلینے سے لارڈ ویلزلی نے ان

---

[1] ۔ اے چی سن۔ معاہدات جلد ۵ عدد ص ۶۹ تا ۸۲

ناخوش گوار تعلقات کا سد باب کردیا جو رقم کی ادائیگی کے وقت پیش آتے چنانچہ سلطنت اودھ میں یہی ہوا کرتا تھا نیز بقایا رہنے کی صورت میں ہروقت سلطنت اودھ اور کمپنی کے تعلقات میں کشیدگی رہتی تھی۔ لہذا ہیسٹنگز اور سرجان شور کے اودھ کے معاہدہ کے مقابلہ میں یہ شرط زیادہ مفید اور دیرپا ثابت ہوئی کیونکہ آمدنی کے جن ذرائع پر انگریزی فوج کا انحصار تھا اب برطانوی حکومت کے ہاتھ میں آجانے سے کسی نازک موقع پر معاہدہ کرنے والی سلطنت دھوکہ دے کر انگریزی حکومت کو معرض خطر میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ یہی آئندہ معاونتی معاہدوں کی خاص شرط رہی اس شرط کے بعد معاونتی معاہدہ کے بنیادی اصولوں کی تکمیل ہوگئی۔

حیدرآباد کے معاونتی معاہدوں پر ایک نظر

فرانسیسیوں اور ٹیپو سلطان کے خوف نے ویلزلی کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ حیدرآباد کو عہد معاونت کے تحت لائے اور اس طرح اس کی آزادی کو متاثر کردے تاکہ آئندہ سلطنت حیدرآباد کا فرانسیسیوں اور ٹیپو سلطان سے متحد ہونے یا ساز باز کرنے کا ڈر باقی ہی نہ رہے۔ لارڈ کارنوالس سے جو معاہدہ ہوا تھا اس سے سلطنت حیدرآباد ہروقت علیحدہ ہوسکتی تھی چنانچہ جنگ کھرڈلہ کے بعد شہریار دکن نے فوراً انگریزی فوج برخواست کردی لیکن عالیجاہ کے بغاوت کے سلسلہ میں انہیں واپس بلا لیا گیا تھا۔ اگرچہ انگریزی فوج حیدرآباد واپس بلا لی گئی تاہم حیدرآباد پر فرانسیسی اثرات کافی تھے کیونکہ شہریار دکن کو انگریزوں سے زیادہ فرانسیسی طاقت پر اعتماد تھا۔ ان حالات نے ویلزلی کو اس نتیجہ پر پہونچایا کہ حیدرآباد کو پوری طور سے اپنے ساتھ کرلیا جائے چنانچہ جو معاہدہ طے پایا اس کی رو سے نہ صرف فرانسیسی فوجوں کی برخاستگی عمل میں آئی بلکہ انگریزی دستوں میں بھی اضافہ کردیا گیا اور ان کا قیام ریاست میں مستقل کردیا گیا جس کے یہ معنی تھے کہ وہ اب کبھی برخواست نہیں ہوسکتے تھے اور نہ شہریار دکن اس معاہدہ سے کبھی علیحدہ ہوسکتے تھے کیونکہ ان فوجوں کے ذریعہ سے انہیں اس کی پابندی پر مجبور کیا جاسکتا تھا۔ ۱۸۰۰ء میں جو معاہدہ طے پایا اس کے ذریعہ ویلزلی نے اپنے اس ارادہ کو پوری طور سے مستحکم کرلیا جو فوجی مصارف کے لئے نقد کے بجائے سلطنت کے علاقوں کا حصول کے متعلق تھا اور دیگر شرائط ایسے منوائے گئے جن سے دربار حیدرآباد ہمیشہ کے لئے کلیتاً

کمپنی کی اعانت کا محتاج ہوگیا کیونکہ سلطنت نے اپنا علاقہ برطانوی حکومت کی اعانت کے معاوضہ میں دیدیا تھا جس کی وجہ سے کوئی فرماں روائے دکن آئندہ سے انگریزوں سے تعلقات منقطع کرنے کا خیال بھی نہیں کرسکتا تھا۔

گورنر جنرل کے اس ارادہ کی تکمیل میں اسے رزیڈنٹ حیدرآباد کی طرف سے بہت مدد ملی چنانچہ ویلزلی نے حیدرآباد کے متعلق ایسا طرز عمل اختیار کیا جس کی منظوری خود پارلیمنٹ سے بھی حاصل نہیں تھی اس کا حال مندرجۂ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے :-

"لارڈ ویلزلی کو خود پارلیمنٹ نے بھی کوئی ایسا اختیار نہیں دیا تھا کہ وہ کوئی ایسا طریق کار اختیار کرے کہ جسکی وجہ سے نظام اپنی آزادی سے محروم ہوجائیں۔ لارڈ ویلزلی کی خواہش تھی کہ جلد اپنا منصوبہ پورا کرلیں۔ اسی لئے جنرل ہیرس کو ہدایات دیتے وقت اس بات کی خواہش کی گئی کہ اس منصوبہ کے سلسلے میں حیدرآباد اور پونا کے دربار پر کوئی خبر ظاہر ہونے نہ پائے"[۵۱]

جنرل ہیرس کی مندرجہ ذیل تحریر سے بھی ان امور پر مزید روشنی پڑتی ہے :-

"اگر مجھے یقین ہوتا کہ جس فوج کے لئے معاہدہ ہوا ہے وہ صرف نظام کی معمولی خدمت کے لئے درکار ہے تو میں اس بات کی سفارش کرنے کے لئے پس و پیش نہیں کرتا کہ احکام کی تعمیل اس وقت تک ملتوی کردی جائے جب تک کہ حکومت اعلیٰ کے پاس سے اس تحریر کا جواب نہ آجائے جس میں ہماری مشکلات واضح کی گئی تھیں۔ لیکن ارل آف مارنگٹن نے خانگی طور پر یہ خواہش ظاہر کی کہ اس فوج کے لئے ساز و سامان مہیا کرنے میں حد درجہ مستعدی اور احتیاط کا اظہار کیا جائے۔ اور نیز یہ کہ ہندوستان میں برطانوی مفاد کی خاطر اس فوج کی تشکیل نہایت اہم ہے۔ اس خواہش کے پیش نظر اگر میں بورڈ کے غور کے لئے ہمارے کام کو جلد اور موثر طور سے ختم کرنے کے لئے اپنی کوئی ایسی تجویز پیش کرتا کہ جسکو میں زیادہ موزوں خیال کرتا تھا اور اس طرح حکومت اعلیٰ کی مقررکی ہوئی کسی عام تجویز کو عمل میں لانے سے ایک منٹ کی بھی تاخیر کرکے اسکے اثر کو زائل کرنے کی کوشش کرتا تو میں اپنے آپ کو مجرم خیال کرتا"[۵۲]

ان خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے لارڈ ویلزلی نے جنرل ہیرس کو ۱۹ اگست ۱۷۹۸ء کو ایک خط لکھا

[۵۱، ۵۲] - باسو ص ۳۱۷ و ۳۱۸

جس میں اپنا شکریہ ادا کرتے ہوئے۔ اپنے منصوبوں کی اہمیت اور برطانوی مقبوضات کی بقا کا ان پر جو انحصار تھا اسکو ظاہر کیا اس طرح لارڈ ویلزلی نے اپنے ارادوں کو عمل میں لانے کے سلسلہ میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کی یہاں تک کہ ۱۷۹۸ء کے معاہدہ کی رو سے حیدرآباد کی آزادی متاثر کرنے کی جو ضرورت بتائی گئی تھی وہ خود غلط ہے۔ اس معاہدہ میں ظاہر کیا گیا تھا کہ

"ہر گاہ اعلیحضرت نظام الملک آصف جاہ بہادر نے ہماری موجودہ دوستی کی عظمت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ خواہش ظاہر کی کہ آنریبل کمپنی کے جو فوجی دستے اس وقت اعلیحضرت کی خدمت میں ہیں ان میں اضافہ کیا جائے"[۵۱]

لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ شہریار دکن نے کبھی کمپنی کی فوج میں اضافہ کی خواہش ظاہر نہیں کی بلکہ لارڈ ویلزلی نے انہیں اس پر مجبور کیا تاکہ اپنے اغراض و مقاصد حاصل ہوں۔ اور چونکہ دربار حیدرآباد کے ارکین میں اتنی قابلیت نہیں تھی کہ وہ ویلزلی کی حکمت عملی کو سمجھ سکتے یا اسکے خلاف کر سکتے اس لئے انہوں نے خاموشی کے ساتھ اس کو قبول کر لیا اور اپنی آزادی متاثر کر لی حالانکہ ان کو مجبور کرنے والی کوئی چیز نہیں تھی اور اگر وہ چاہتے تو اس معاہدہ سے گریز بھی کر سکتے تھے کیونکہ ۱۷۹۰ء میں جو معاہدہ طے پایا وہ دو مساوی اور آزاد طاقتوں کے مابین تھا اس وقت تک حیدرآباد بالکل آزاد تھا اور اس کے بعد ہی اس کی سابقہ حالت برقرار نہیں رہی۔ اس کے علاوہ اس زمانہ میں سلطنت حیدرآباد کی حالت بہ نسبت پیشتر کے ٹھیک تھی، مرہٹے اور ٹیپو سلطان خود کمزور اور پسپا ہو چکے تھے جس کی وجہ سے دربار حیدرآباد کو اس زمانہ میں اپنے حریفوں کا زیادہ خوف نہیں تھا البتہ ایک حد تک انگریزوں کی حالت اس زمانہ میں مایوس کن تھی، انہیں ٹیپو سلطان کا بہت خوف تھا اگر اس وقت کمپنی کو شہریار دکن کی اعانت نہیں حاصل ہوتی تو ممکن تھا کہ ہندوستان میں کمپنی کا دور دورہ ختم ہو جاتا لیکن دربار حیدرآباد نے اس معاہدہ کو منظور کر کر انگریزوں کو ہندوستان میں اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کرنے کے سلسلہ میں بڑی مدد کی۔

لارڈ ویلزلی نے دربار حیدرآباد کے رزیڈنٹ کو یہ ہدایت کی تھی کہ اس کے منصوبوں کا اظہار

۵۱۔ اے چی سن، معاہدات جلد ۵ عشہ صد ۴۹

پہلے شہریار دکن سے نہ کیا جائے بلکہ اعظم الامراء اسکو ظاہر کیا جائے۔ شہریار دکن سے اس کو مخفی رکھنے کی کوشش اس بات کی دلیل ہے کہ اعظم الامراء پر رزیڈنسی کا اثر کافی طور سے مضبوط تھا۔ غرض اعظم الامراء نے شہریار دکن کو سمجھا کر فرانسیسی دستوں کو حیدرآباد سے برخواست کرایا اور انگریزوں سے اتحاد کرنے کی ترغیب دی، اس زمانہ میں کمپنی کے عہدہ داروں نے ہندوستانی روساء کے وزراء اور دیگر عمائدین کو رقمی امداد سے اپنا بنا رکھا تھا اس کی تصدیق ڈیوک آف ولنگٹن کی مندرجہ ذیل تحریر سے ہو سکتی ہے۔

"کرنل کلوز کو میں نے جو خطوط لکھے ہیں ان سے تم نے معلوم کیا ہوگا کہ وہاں جو کچھ گزرتا ہے اس کے متعلق حالات کا صحیح صحیح علم ہونے کے لئے میں نے انہیں دیوان کو رقم ادا کرنے کی تاکید کی ہے[۵۱]"

اعظم الامراء کو عہد معاونت میں شریک ہونے میں کوئی عذر نہیں تھا اور حیدرآباد کے حالات کے مدنظر لارڈ ولزلی کو اس قدر اطمینان تھا کہ اس نے کرنل ولیم پامر حیدرآباد کے رزیڈنٹ کو لکھا کہ

"پونا سے گفت وشنید میں بالکلیہ ناکامی بھی مجھے نظام کی طاقت اور اقتدار حاصل کرنے کی کوشش سے باز نہ رکھیگی[۵۲]"

اس طرح حیدرآباد کی آزادی متاثر کرنے میں اعظم الامراء کا بھی بڑا حصہ تھا کیونکہ انہوں نے شہریار حیدرآباد کو سمجھا بجھا کر معاہدہ میں شریک کیا ورنہ نواب میر نظام علی خاں ایسی شرکت پر پہلے رضامند نہیں تھے۔

عہد معاونت کا حیدرآباد پر اثر

اگرچہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ۱۷۹۸ء میں شہریار دکن کو انگریزوں سے معاہدہ کرنیکی کوئی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ اس زمانہ میں مرہٹے جن کا خوف سلطنت حیدرآباد پر ایک زمانہ سے طاری تھا اب خود کمزور ہو چکے تھے اور ٹیپو سلطان جنہوں نے جنوبی ہند میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا اب اس بات پر مائل تھے کہ حیدرآباد سے اتحاد کیا جائے۔ تاہم سلطنت حیدرآباد کی بقا کے لئے یہ امر ضروری تھا کہ وہ جنوبی ہند کی کسی طاقت سے دوستانہ تعلقات رکھے تاکہ ضرورت کے وقت اس کی

۵۱۔ باسو ص ۲۱۶۔ ۵۲۔ باسو ص ۱۱۵۔

اعانت سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ جنوبی ہند میں اس وقت جو حکومتیں قائم تھیں ان میں ہر حیثیت سے کمپنی کی طاقت ممتاز تھی لہذا شہریار دکن نے مناسب سمجھا کہ ۱۷۹۸ء میں جو معاہدہ ہوا تھا اس کو اور مستحکم کیا جائے۔ بہرحال باہمی اعتماد اور بھروسہ پر ہی حیدرآباد نے 'عہد معاونت' میں شرکت کی گو اسکی وجہ سے اس کی آزادی میں بعض رکاوٹیں پیدا ہوگئیں۔ 'عہد معاونت' کا پہلا اصول یہ ہے کہ کمپنی کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوگا اور معاہدہ کرنے والی سلطنت اس کے اقتدار کو قبول کرے۔ اقتدار کو قبول کرنے کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ معاہدہ میں شریک ہونے کے بعد حیدرآباد کے لئے بجز کمپنی کی اعانت پر بھروسہ کرنے کے کوئی میدان عمل باہر باقی نہیں رہا۔ اندرونی معاملات میں بھی بعض وقت نظم و نسق کے سلسلہ میں یا اگر کوئی کام شہنشاہی مفاد اور حکمت عملی کے منافی ہو رہا ہو مداخلت کردی جاتی ہے۔

مندرجۂ بالا بیان سے 'عہد معاونت' کی خامی اور اس صریح سراسر بے انصافی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اس میں کچھ خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں اگر کوئی رئیس اپنے معاون کی حکمت عملی کے موافق اور رعایا کی خوش حالی کو مدنظر رکھ کر حکومت کرے جیسا کہ سلطنت حیدرآباد کا شروع ہی سے ہمیشہ عمل اور مسلک رہا تو اس کی سلطنت کی فلاح و بہبود کے لئے 'عہد معاونت' سے کوئی بہتر چیز نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کی حفاظت کے لئے حکومت برطانیہ کے فوجی دستے ہمیشہ اور ہر طرح تیار ہیں نیز اس کا مفاد حکومت برطانیہ کا مفاد اور اس کا وقار حکومت برطانیہ کا وقار سمجھا جاتا ہے۔ کوئی اندیشہ پیدا ہو تو اس کے تدارک کے لئے حکومت برطانیہ ہمیشہ تیار ہے۔ اس نظریہ کے تحت کہا جاسکتا ہے کہ حیدرآباد کی بقا کا یہی راز ہے جب کہ دوسری ریاستیں ختم ہوگئیں۔ سلطنت میسور اور مرہٹے حیدرآباد سے کئی درجہ طاقت ور تھے اور اسی طاقت کی بناء پر کمپنی ان سے خوف زدہ تھی اور جنوبی ہند پر ان کا تسلط قائم ہو جانے کا اندیشہ تھا ثانی الذکر کی طاقت کا تو شمال میں بھی نقارہ بجتا تھا لیکن چونکہ ان کے کمپنی سے اچھے تعلقات نہیں رہے اس لئے وہ ختم ہوگئے۔ حیدرآباد چونکہ ہر وقت اپنے معاہدہ کی عزت کرتا ہے اس نے دوسری طرف سے بھی اس کا ہمیشہ لحاظ کیا جاتا ہے اور یہی اس کی بقا کا راز ہے۔

حیدرآباد کی اس حیثیت کا جنوبی ہند پر اثر

اس زمانہ میں جنوبی ہند میں جو چار قوتیں کام کر رہی تھیں وہ ایک دوسرے پر محض اس لئے غالب نہیں آسکیں کہ کوئی تنہا طاقت کسی دوسری قوت پر فتح یاب نہیں ہوسکتی تھی، کیونکہ انگریزوں، شہریار دکن ٹیپو سلطان اور مرہٹوں کے پاس کم و بیش مساوی قوت موجود تھی۔ انگریز ان سب میں اعلیٰ حیثیت رکھتے تھے اور انہوں نے حالات کے لحاظ سے حیدرآباد کو اپنا حلیف بنالیا۔ اس طرح جب دو قوتیں ایک جگہ متحد ہوگئیں تو یہ لازمی امر تھا کہ ان کا پلہ بھاری ہوجائے۔ اب جنوبی ہند میں کوئی نہ تھا جو ان کی متحدہ طاقت کا مقابلہ کرسکتا۔ اس پر بھی دوراندیشی کے تحت مرہٹوں کو ٹیپو سلطان کے خلاف متحد کرنے کی کوشش کی گئی اور جب ٹیپو سلطان کا خاتمہ ہوا تو مزید تقویت کی بناء پر عہد نامہ بسین ۱۸۰۲ء کے ذریعہ مرہٹوں کی آزادی کا بھی خاتمہ کردیا گیا۔ شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ کمپنی گو اس زمانہ میں اقتدار اعلیٰ حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھی لیکن جنوبی ہند میں ٹیپو سلطان کا خوف دامنگیر تھا۔ ٹیپو سلطان کو کوئی معمولی حریف نہیں خیال کیا جاسکتا تھا۔ ٹیپو سلطان سے مقابلہ کے لئے کمپنی کو جو ذرائع اپنے مدراسی مرکز سے حاصل تھے وہ کافی نہ تھے۔ لہٰذا انہوں نے حیدرآباد کو اپنا حلیف بنا کر مزید ذرائع حاصل کئے۔ چونکہ حیدرآباد میسور سے قریب تھا اس لئے ٹیپو سلطان کے مقابلہ کے لئے بہت سی آسانیاں حاصل ہوگئیں۔ فوج کی نقل و حرکت اور سامان رسد وغیرہ حیدرآباد کے مواضعات سے فراہم ہوسکتا تھا اس طرح انگریزوں نے میسور فتح کیا۔ میسور فتح کرنے کے بعد انہوں نے بجز ان علاقوں کے جو فاتحوں کے مابین تقسیم ہوئے باقی ماندہ ملک قدیم ہندو حکمراں کے وارث کے حوالہ کیا اس طرح عہدداران کمپنی نے ایک طرف علاقے حاصل کرکر اپنے ذرائع میں اضافہ کیا اور دوسری طرف ایک ایسی سلطنت قائم کی جو ان کے مفاد کے تحت تھی۔ اب بجائے دو قوتوں کے تین قوتیں ایک ہی مفاد کے تحت کام کر رہی تھیں اور جنوبی ہند کی چار طاقتوں میں صرف مرہٹوں کی ایک قوت علٰحدہ تھی۔ سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے شہریار دکن سے وہ تمام علاقے حاصل کرلئے گئے جو حیدرآباد کو صلح نامۂ سرنگاپٹم اور صلح نامۂ میسور سے

حاصل ہوئے تھے سنہ ۱۸۰۱ء میں نواب کرناٹک کے انتقال پر معاہدات سابق کی خلاف ورزی اور ٹیپو سلطان سے سازش کے الزام پر ریاست کے تمام سیول اور فوجی انتظامات کمپنی کے تحت کرلئے گئے اور جدید نواب کے لئے وظیفہ مقرر کردیا گیا۔ ظاہر ہے کہ مرہٹوں کی تنہا قوت ان تمام ذرائع و وسائل پر دست رس رکھنے والی قوت سے مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ جب ہولکر اور سندھیا کے بھی تنازعات سے یہ اتحاد باقی نہ رہا اور باجی راؤ تنہا رہ گیا تو بجز انگریزوں سے مل جانے کے کوئی صورت اور نہیں تھی۔ لہذا باجی راؤ نے 'عہد معاونت' میں شریک ہونے کی خواہش ظاہر کی اور اس طرح عہد نامہ بسین سنہ ۱۸۰۲ء میں عمل میں آیا جس کے ذریعہ پیشوا نے کمپنی کے ساتھ معاونتی معاہدہ کرلیا۔ اس کی رو سے پیشوا کو وہ اصول قبول کرنے پڑے جو حیدرآباد نے قبول کئے تھے۔ اس طرح محض حیدرآباد کی اعانت حاصل ہونے سے جنوبی ہند میں کمپنی نے کامیابی حاصل کی۔ گویا حیدرآباد نے کمپنی سے معاہدہ کرکے نہ صرف اپنی آزادی محدود کرلی بلکہ جنوبی ہند اور تمام ہندوستان پر کمپنی کی حکومت کا سامان فراہم کردیا۔ کیونکہ جنوبی ہند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد لارڈ ویلزلی نے شمالی ہند کی طرف توجہ کی اور وہاں بھی اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرلی۔

کمپنی کو حیدرآباد کی اعانت اور جنوبی ہند سے فراغت حاصل ہونے کے فوائد

شمالی ہند میں کمپنی نے سب سے پہلے نواب وزیر اودھ کی طرف توجہ کی۔ جب جنگ میسور سے فرصت ملی تو جن اصولوں پر نواب وزیر سے اتحاد قائم تھا انہیں بہتر بنانے کی فکر کی گئی چنانچہ سنہ ۱۸۰۱ء میں اودھ کے ساتھ ایک معاونتی معاہدہ طے پایا جس کے ذریعہ کمپنی کی فوج جو اودھ میں مقیم تھی اسکی تعداد میں اضافہ کردیا گیا اور اس کے مصارف پچاس لاکھ مقرر ہوئے۔ اس طرح سابق چہتر لاکھ ملاکر اب جملہ رقم ایک کروڑ چھبیس لاکھ سالانہ ہوگئی۔ اس کے معاوضہ میں اودھ کے تمام سرحدی علاقے کمپنی کے حوالہ کردیئے گئے اور اس طرح کٹہرہ، الہ آباد، فرخ آباد، اور گورکھپور، حاصل ہوجانے سے کمپنی کو دوآب میں داخل ہونے کے راستے حاصل ہوگئے اور اب وہ خیال باقی نہ رہا جو لارڈ کلائیو نے ظاہر کیا تھا کہ۔

"کمپنی کے مفاد کے مدنظر اس کو اودھ سے آگے نہیں بڑھنا چاہئیے" اور جس پر کہ اس کے قریبی جانشین کاربند تھے۔ چونکہ اس زمانہ میں کمپنی کے عہدہ دار جنوب کے معاملات میں اُلجھے ہوئے تھے لہٰذا یہ خیال صحیح تھا لیکن اب جنوب سے فراغت پانے کے بعد سوائے شمالی ہند کے کمپنی کے لئے کوئی میدان عمل نہیں تھا۔ اس لئے ویلزلی نے اس طرف توجہ کی اور اس طرح کمپنی کے اقتدار اعلیٰ کو اپنے ہی عہد میں دریائے جمنا تک پہونچا دیا اور یہ پیش خیمہ تھا شمالی ہند کے باقی ماندہ علاقوں کی تسخیر کا۔

متذکرۂ بالا بیان سے معلوم ہوگا کہ عہد معاونت سے کمپنی اور شہریار دکن دونوں کو باہمی فائدہ پہونچا اور یہ تعلقات ایک دوسرے کی ترقی اور استحکام کا باعث ہوئے۔ ان وجوہ کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ کمپنی اور شہریار دکن اپنے باہمی تعلقات پر جتنا ناز کریں بجا ہے اور اسی امانت اور دوستی کی وجہ شہریار دکن یار وفادار دولت برطانیہ قرار پائے۔

عہد معاونت کے اصول پر تنقید

عہد معاونت کا پہلا اصول یہ تھا کہ کمپنی کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہو اور معاہدہ کرنے والی سلطنت اُس کے اقتدار کو قبول کرے۔ لہٰذا دوسرا اصول جو قائم ہو سکتا تھا وہ یہ کہ ملک کے امن وامان کے لحاظ سے معاہدہ کرنے والی سلطنت اپنے بیرونی اختیارات سے دست بردار ہو جائے اور یہ سب کمپنی کو حاصل ہوں۔ اس کی وجہ سے آئے دن آپس میں جو جھگڑے برپا ہوا کرتے تھے اُن کا سدباب ہوگیا۔ جب معاہدہ کرنے والی سلطنت اپنے بیرونی اختیارات سے دست بردار ہوگئی تو یہ ضرور تھا کہ بیرونی سازشوں اور حملوں سے اسے محفوظ رکھا جائے۔ لہٰذا کمپنی نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی جس کے لئے اس سلطنت میں فوج کا کمپنی کی طرف سے انتظام کیا گیا۔ چونکہ یہ انتظام معاہدہ کرنے والی سلطنت کے مفاد کے تحت طے پایا تھا لہٰذا اس کے مصارف، معاہدہ کرنے والی سلطنت کو برداشت کرنے پڑے۔ مصارف پہلے نقد ادا کئے جاتے تھے لیکن جب اس کی وجہ اُلجھنیں پڑنے لگیں اور خود عہد معاونت کے مقصد کو ضرر پہونچنے کا

اندیشہ ہوا تو اس انتظام کو تبدیل کرکر سلطنت کے ایک مستقل علاقہ پر قبضہ کرلیا گیا۔ چونکہ ان دنوں فرانسیسیوں کا خوف تھا اس لئے یہ شرط بھی رکھی گئی کہ آئندہ سے کوئی سلطنت کسی یوروپین فرد کو بغیر اجازت ملازم نہ رکھ سکے گی۔ ساتھ ہی ساتھ معاہدہ کرنے والی سلطنت کو اُس کے اندرونی معاملات میں کامل آزادی دیدی گئی جس میں کمپنی کی طرف سے کوئی مداخلت نہیں روا رکھی گئی۔ ان تمام شرایط کی نگرانی ضروری تھی لہذا ہر سلطنت میں برطانوی رزیڈنٹ مستقل طور پر اسی فرض کی ادائی کے لئے متعین کیا گیا۔ یہ اصول بعد میں چل کر معاونتی معاہدوں کے شرایط قرار دیئے گئے جن کا معاہدہ کرنے والی سلطنت پر یہ اثر پڑا کہ وہ کلیتہً کمپنی کے زیر اثر ہوگئی۔ کیونکہ اس معاہدہ کے ذریعہ ہمیشہ کے لئے اس کی آزادی اس طرح محدود کردی گئی کہ ایک طرف معاہدہ کرنے والی سلطنت کو کمپنی کی اعانت پر بھروسہ کرنے کے سوا اور کوئی دائرہ عمل باقی نہیں رہا اور دوسری طرف وہ کمپنی کے خلاف مرضی کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ آیندہ سے کوئی فرماں روا انگریزوں سے تعلقات منقطع کرنے کا خیال بھی نہ کرسکتا تھا کیونکہ سلطنت اپنا علاقہ دے کر برطانوی حکومت کی اعانت کا معاوضہ ہمیشہ کے لئے پیشگی ادا کرچکی تھی۔ لہذا مصلحت اسی میں تھی کہ اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے کمپنی کی اعانت و امداد پر چھوڑ دیا جائے اور یہی ایک طریقہ ملک کے انتشار کو رفع کرنے کا تھا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے کمپنی کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا تھا جس کے تحت تمام معاہدہ کرنے والی سلطنتیں ایک رشتہ اتحاد میں پھر منسلک ہو جاتیں۔ اس طرح ہندوستان میں ایک مرکزی حکومت پھر قائم ہونے کا امکان تھا۔ چونکہ کمپنی کامیاب ہوئی اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ یہی قوت اس کی اہل تھی اور دوسرے سب ناکامیاب ہوچکے تھے۔

اگرچہ عہد معاونت کے اصول کا یہی مقصد تھا کہ کمپنی کے اقتدار اعلیٰ کے تحت ہندوستان میں ایک مرکزی حکومت قائم ہو اور ملک میں امن و امان کا دور دورہ رہے لیکن کمپنی نے اس اصول کے خلاف بھی کیا۔ چنانچہ جو اصول ہندوستانی سلطنتوں کے اعانت کے لئے بنائے گئے تھے

تاکہ کمپنی کے سایۂ عاطفت میں یہ سرسبز رہیں بعد میں چل کر انہیں اصول کو اس مقصد کے خلاف ہندوستانی سلطنتوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے سلسلہ میں استعمال کیا گیا اور اس طرح پونا، اودھ اور ستارہ کی سلطنتیں کلیتاً ختم کردی گئیں۔

اودھ کے متعلق لارڈ کارنوالس نے لکھا تھا کہ :۔

"نواب وزیر کی حکومت کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ضرورت کے وقت مجھے یا مجلس کو اس کی حکومت کے معاملات میں رائے دینے یا کسی خاص ایسے انتظام کو پیش کرنے کا جو دونوں حکومتوں کے مفاد کے لئے اہم ہو اختیار نہ ہوگا،"[۵۱]

کارنوالس کے اس خیال کی تائید سرجان شور نے اودھ کے وراثتی معاملات میں دخل دے کر کی تھی۔ اور ویلزلی نے اس کو مستحکم اس طریقہ پر کیا کہ اودھ کو عہد معاونت کے تحت لایا گیا جس کی وجہ سے اس کی آزادی کلیتاً سلب ہوگئی اور اس طرح آئندہ چل کر اس کا خاتمہ ہوگیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع ہی سے کمپنی کا ارادہ ہندوستان میں اقتدار اعلیٰ قائم کرنے کا تھا۔ ویلزلی نے اس مقصد کے حصول کے لئے 'عہد معاونت' کو اپنا ذریعہ بنایا۔ جو جارحانہ حکمت عملی سے بدرجہا بہتر تھا۔ کیونکہ ہندوستانی سلطنتوں کو غفلت میں رکھ کر اس کے ذریعہ وہی کام عمدگی سے انجام پایا جو جارحانہ حکمت عملی کے ذریعہ باوجود جنگ و جدل کے نہیں طے پا سکتا تھا۔ دوسری چیز جو عہد معاونت، کی وجہ سے ہندوستانی سلطنتوں کے حق میں بری ثابت ہوئی وہ یہ ہے کہ سلطنت کی حفاظت کا کمپنی نے ذمہ لیا لیکن والئ ملک کے خلاف رعایا کی حفاظت کا قانوناً کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ اگرچہ کمپنی کے اثر سے ایسے موقعوں پر کام لیا جاتا رہا ہے۔ گزشتہ زمانہ میں خود والئ ملک کی حفاظت کا ذمہ دار تھا تاکہ اسے بیرونی اور اندرونی حملوں سے محفوظ رکھے عہد معاونت کے ذریعہ معاہدہ کرنے والی سلطنت کی بیرونی اور اندرونی حفاظت کی ذمہ داری کمپنی نے لے لی گویا ملک کی حفاظت کے فرض سے خود والئ ملک سبکدوش ہوگیا

۵۱ - میلکم - جلد اوّل - صفحہ ۹۶ -

اس طرح ایک طرف والیٔ ملک اور رعایا میں جو خاص لگاؤ تھا باقی نہ رہا کیونکہ ملکی مفاد جو اب تک دونوں کے باہمی اتحاد کی وجہ تھا یعنی یہ کہ جب کبھی ملک کو ضرر پہونچنے کا اندیشہ ہوتا تھا تو رعایا ملک اور مالک کے لئے خون بہانے ہر وقت تیار رہتی تھی اب ملک کی حفاظت دوسرے کے ہاتھ میں چلی جانے سے اپنی نمک حلالی کا ثبوت نہیں دے سکتی تھی۔ اس طرح رفتہ رفتہ یہ جذبہ اُن میں مفقود ہو گیا۔ دوسری طرف والیٔ ملک بیرونی حملوں اور اندرونی سازشوں سے محفوظ رہنے کی وجہ انتظام مملکت سے لاپروائی برتنے کا امکان پیدا ہو گیا جیسا کہ اکثر ریاستوں میں ہوا۔ ایسے مواقع پر امن و امان کی خاطر برطانوی حکومت کو مداخلت کرنا پڑا اور کبھی رئیس کو ہٹا کر یا کبھی ملک کے نظم و نسق کو اپنے عہدہ داروں کے ہاتھ میں دے کر حالات درست کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ تمام صورتیں ظاہر میں بُری ہیں اور یہی عہد معاونت کا نتیجہ ہے لہٰذا موجودہ زمانہ میں اس بات کی ضرورت محسوس ہونے پر کہ والیٔ ملک کے خلاف رعایائے ملک کو قانوناً حقوق حاصل ہونا چاہیئے اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ ہندوستان کے آئندہ دستور میں اس دفعہ کو ضرور شریک کر دیا جائے اور جو چیز اب محض اثر کی بناء پر ہوا کرتی ہے اس کو قانونی حیثیت دے کر اس کا تعین کر دیا جائے تاکہ نہ رعایا کو برطانوی حکومت کو ذمہ دار قرار دینے کا امکان رہے اور نہ مداخلت کی صورت میں والیٔ ملک کو شکایت کا موقع رہے۔

کسی سلطنت کی آزادی کو اس طرح عہد معاونت کے ذریعہ سلب کرنا بین الاقوامی قانون کے خلاف سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ کوئی طاقت بغیر کسی وجہ کے جنگ کرتا اتنا بُرا نہیں ہے جتنا کہ اس طرح اس کی آزادی سلب کر دینا۔ عہد معاونت کا یہ طریقہ میجر کرک پیٹرک سابق رزیڈنٹ حیدرآباد کے مشورے پر لارڈ ویلزلی نے ہندوستان کی آزادی سلب کر دینے اور ہندوستان میں برطانوی مقبوضات میں اضافہ کرنے کے لئے ایجاد کیا تھا۔ اس طرح ہندوستانی سلطنتوں نے عہد معاونت کے ذریعہ کمپنی پر جو کامل اعتماد

اور بھروسہ کیا تھا۔ وہ اکثر صورتوں میں پورا نہ ہوا اور بعد کے واقعات سے ہندوستانی والیان ملک میں ایک غیر اطمینانی کیفیت سی پیدا ہو گئی اسی سلسلہ میں ایک یورپین نے ماہ جنوری ۱۸۸۷ء کے (ASIATIC QWARTERLY REVIEW) میں لکھا ہے کہ:-

"عہد معاونت کا نظام چاہے کتنے ہی اچھے طریقے سے کیوں نہ عمل پذیر ہوا ہو سوائے فریب کے کچھ نہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی عوام کی آنکھوں میں مٹی ڈالی جائے۔ اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ہوم گورنمنٹ نے جارحانہ اقدام سے اجتناب کرنے کے لئے بار بار احکام جاری کئے تھے۔ پارلیمنٹ کے احکام کی بجا آوری ناممکن تھی۔ اس لئے ایک زیادہ نرم طریقہ اختیار کیا گیا۔ بظاہر ان ممالک کو فتح نہیں کیا گیا حکمران کو حکمرانی کے تمام لوازم کے ساتھ مسند پر باقی رہنے دیا گیا۔ لیکن تمام اہم اقتدار حکمران سے ایک پولیٹیکل ایجنٹ کے ہاتھ میں منتقل کر دیا گیا۔ "فتح" کی بجائے کسی قدر نرم اصطلاح "الحاق" کا استعمال کر کے برطانوی ضمیر کی تسلی کر دی گئی۔ کمپنی نے مطمئن ہو کر مال و منافع کو اپنی جیبوں میں بھر لیا۔ لیکن احتیاط کے ساتھ اس بات کی تحقیق کرانے کی زحمت برداشت نہیں کی گئی کہ اس الحاق کے لئے کیا طریق کار اختیار کیا گیا"[۵۵]

لیکن زمانہ کی رفتار اور ضروریات نے یہ بتایا ہے کہ انگریزوں کی مداخلت اور معاونت نہ صرف ان کی بقا کے لئے ضروری ہے بلکہ ہندوستانی سلطنتوں کی فلاح و بہبود اور ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے بھی از بس ضروری ہے۔ لارڈ ویلزلی کی واپسی کے بعد لارڈ کارنوالس کو دوبارہ اس لئے گورنر جنرل بنایا گیا کہ ویلزلی کی حکمت عملی کا خاتمہ اور عدم مداخلت کا آغاز پھر شروع کیا جائے۔ سر جارج بارلو کو بھی یہی تعلیم دی گئی تھی۔ لیکن حالات کے لحاظ سے جنوبی ہند کے معاملات کی حد تک مداخلت کرنی ہی پڑی۔ لارڈ منٹو نے اپنے دور حکومت میں یہ نتیجہ

۵۵۔ تاریخ ہند مصنفہ بیورج جلد سوم صفحہ ۱۸۱

اخذ کیا کہ سلطنت کو معرض خطر میں ڈالے بغیر اور خطرات میں اضافہ کئے بغیر عدم مداخلت کے مسلک پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکام بالا کو اس بات کا کامل یقین ہو گیا کہ عدم مداخلت کے جس مسلک پر وہ چلنا چاہتے تھے اس کا برقرار رکھنا قطعی ناممکن ہے اور اس خیال کے بعد پھر ترقی کا دور شروع ہو گیا جو دراصل برطانوی سلطنت کی وسعت اس کی نوعیت اور اس کے مخصوص حالات کے لئے نہایت موزوں تھا۔ اس تبدیلی سے مارکوئس ہیسٹنگز کے کاموں میں جو سہولت ہوئی اور اس سے جو فوائد حاصل ہوئے وہ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ اپنے دور میں مارکوئس ہیسٹنگز نے مارکوئس ویلزلی کی حکمت عملی اور اس کی دانشمندی پر اپنا اعتقاد ظاہر کر کے اور ناقابل تردید واقعات پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کے خلاف طریقۂ عمل اختیار کر کے انگریزوں نے نہ صرف اپنی مشکلات میں اضافہ کر لیا بلکہ ہندوستان کے سب سے زیادہ زرخیز صوبوں میں جنگ وغارت گری کا سلسلہ آغاز کر دیا۔ اور یہ سب نتیجہ اس بات کا ہے کہ کمپنی کو مقتدر اعلیٰ کی حیثیت سے جو زبردست قوت حاصل ہوئی تھی اس کا استعمال خاطر خواہ طور سے نہیں کیا گیا بالآخر نظما یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "اب زیادہ التوا کی گنجائش نہیں ہے۔ برطانیہ کا نام برقرار رکھنے اور اپنی رعایا کی حفاظت کرنے کے لئے سختی سے کام لینے اور فوجی قوت استعمال کرنے کی ضرورت ہے[۵]"

لارڈ ہیسٹنگز نے اس طرح اپنے حکام بالا کی زبردست تائید حاصل کرنے کے بعد لارڈ ویلزلی کے سب کاموں کی تکمیل کر دی اور جس خوبی سے اس کام کا آغاز ہوا تھا اسی پر اس کا انجام ہوا۔ جب پنڈاریوں اور مرہٹوں سے جنگ ختم ہوئی تو لارڈ ہیسٹنگز نے برطانوی حکومت کی شہنشاہی کا اعلان کرنے میں قطعی پس وپیش نہیں کیا کیونکہ

---

[۵] میلکم۔ جلد اول صفحہ ۴۶۷۔

بلاشبہ اب وہی اس کی مالک تھی اور جس طریقہ سے ہندوستان کے ہر فرمانروا اور سردار نے اس اعلان کا استقبال کیا، جس کی رو سے۔ کمپنی پر عام امن برقرار رکھنے کی ذمہ داری عاید ہوتی تھی اس سے خود اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہندوستان میں امن وامان قائم کرنے کے سلسلہ میں اور انتشار رفع کرنے کے لئے۔ عہد معاونت کی کتنی سخت ضرورت تھی عہد معاونت کے اصول پر تھوڑے ہی عرصہ عمل کرنے کے بعد ظاہر ہوگیا کہ :—

لارڈ ویلزلی نے معاہدہ کرنے والی سلطنت کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کے خلاف جو شرط عائد کی ہے اس کی پورے طور پر حکومت برطانیہ پابندی نہیں کرسکتی اور ان معاہدوں سے جو حقوق اُسے بہ حیثیت مقتدر اعلیٰ کے حاصل ہوئے ہیں اُن کے استعمال اور اُن فرائض کی انجام دہی کے لئے اکثر موقعوں پر مداخلت ناگزیر ہوگی، لہٰذا ویلزلی کی روانگی کے دس پندرہ سال بعد ہی اس قسم کے مداخلت کی ضرورت ہوئی۔ اور سر چارلس میٹکاف نے ریاست بھرتپور کی سند نشینی کی وراثت کے جھگڑے میں مداخلت کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنے خیال کو مندرجۂ ذیل الفاظ میں بیان کیا :—

"درجہ بدرجہ ہماری حکومت نے ہندوستان میں سب سے زیادہ مقتدر مقام حاصل کرلیا۔ اگرچہ کہ ۱۸۱۷ء سے پہلے ہم نے کئی مرتبہ اس اقتدار کے اختیار کا استعمال کیا ہے۔ لیکن اس سال اور اس کے بعد کے سال میں جو واقعات رونما ہوئے ان کی وجہ سے ہم نے اپنا اثر بہت سارے مواقع پر زیادہ عام طور سے استعمال کیا۔ اور اس کو منوایا۔ اس وقت سے ہماری پالسی کا یہ طے شدہ اصول قائم ہوچکا ہے کہ تمام ہندوستانی ریاستوں میں امن وامان قائم رکھا جائے اور یہ بدنظمی اور طوائف الملوکی کو۔ جس سے امن عامہ میں خلل پیدا ہونے کا امکان تھا۔

رد کا جب کبھی ایک ریاست کی وراثت کے سلسلہ میں ہمیں یہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ اس اصول کے لحاظ سے ہم سوائے حقیقی جانشین کے کسی دوسرے کو تسلیم نہ کریں۔ ورنہ ہم سے غصب اور نا انصافی کی طرف داری ہوگی۔ ہمارا اثر اس قدر زیادہ ہے کہ ہم غیر جانبداری نہیں برت سکتے اور ہماری مرضی امداد کے طور پر عمل کریگی،،[۱]

مندرجۂ بالا بیان نے لارڈ ہیسٹنگز کو اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ:۔

"میں ہنوز اس رائے پر قائم تھا کہ ۔ مگر ریاستوں میں ہماری مداخلت صرف اس حد تک ہونی چاہیئے جبکہ آنریبل کمپنی کو فی الحقیقت کوئی مادی نقصان پہونچ رہا ہے ۔ یا اس کو کسی فوری خطرہ کا امکان ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ آنریبل کمپنی کے ملازمین کو میری رائے سے اتفاق نہیں ہے ۔ اس ملک کے حالات سے زیادہ واقف ہونے اور کمپنی کے مفاد کا بہتر اندازہ کرسکنے کی بنا پر دوسروں کی مخالفت کی وجہ سے مجھے اپنی رائے پر عمل کرنے میں متذبذب ہونا چاہیئے تھا،،[۲]

اس قسم کے واقعات کے بعد اندرونی معاملات میں مداخلت بھی عہد معاونت کی ایک جزو بن گئی ۔ اور قانونی معاہدوں کے علاوہ اس قسم کا ایک رواج قائم ہوگیا جس پر کہ قریب قریب ہر ہندوستانی ریاست میں کسی نہ کسی موقع پر عمل ہوچکا ہے ۔ اور یہ معاونتی معاہدوں کا ایک لازمی نتیجہ تھا ۔ فقط

۱؎ ۔ تاریخ ہند مصنفہ بیورج جلد سوم صفحہ ۱۰۱ ۔ ۲؎ ۔ تاریخ ہند تصنیف بیورج جلد سوم صفحہ ۱۸۲

ضمیمہ - ماخذات

"حدیقۃ العالم" فارسی :- یہ کتاب پہلے نواب سراج الملک بہادر کے عہدِ وزارت میں ان کے مطبع میں میر عالم کے نام سے شائع ہوئی ہے جو دیوان ریاست حیدرآباد تھے (۱۲۶۶ھ) اس کے بعد نواب فخر الملک بہادر مرحوم کے ایما پر مطبع سیدی حیدرآباد دکن میں طبع ہوئی ۱۳۰۵ھ یہ کتاب دو مقالوں پر مشتمل ہے۔ پہلے مقالہ میں ایک مقدمہ اور سات باب ہیں اور دوسرے مقالہ میں چار باب۔ مقالہ اول میں سلاطین قطب شاہیہ اور مقالہ ثانی میں سلاطین آصفیہ کا ذکر ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کے متعلق نواب عماد الملک بہادر سید حسین بلگرامی نے نواب مختار الملک بہادر کی سوانح عمری میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ کتاب مرزا عبد اللطیف شوستری نے تصنیف کی ہے۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس نسخہ کے دوسرے مقالہ کی تمہید پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب سید قدس میر ابو تراب نے میر عالم کے حسب الحکم ۱۲۲۳ھ میں لکھی ہے، جس کی تصدیق گرانٹ ڈف نے بھی اپنی تاریخ مرہٹہ میں کی ہے (جلد اول صفحہ ۴۲۸)۔ بہرحال کتاب میں قطب شاہیہ زمانہ سے ٹیپو سلطان کی آخری جنگ تک کے واقعات ہیں اور اس کا خاتمہ ٹیپو سلطان کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے اس جملہ پر کیا ہے کہ "قصہ کوتاہ مشیت ایزدی چنان بود و چنین شد"۔

(حدیقۃ العالم مقالہ ثانی صفحہ ۳۹۷ مطبوعہ مطبع سراج الملکی ۱۲۶۶ھ)

"خزانہ عامرہ" (فارسی) کتاب غلام علی آزاد بلگرامی نے ۱۱۷۶ھ میں لکھی ہے اور مطبع نولکشور کانپور میں چھپی ہے ۱۸۷۱ء اس میں ان شعرا کے حالات ہیں جن کو دربار شاہی سے کوئی نہ کوئی صلہ ملا۔ ضمناً تاریخی واقعات بھی بیان کئے گئے۔ چنانچہ شہنشاہ محمد شاہ کے عہد سلطنت حیدرآباد اور مرہٹوں کے واقعات وغیرہ درج ہیں۔

"توزک آصفیہ" (آصف نامہ) (فارسی) :- مولفہ شاہ تجلی علی حیدرآبادی۔ یہ کتاب آصف جاہ ثانی (نواب میر نظام علی خان بہادر) کے عہد کی ایک چھوٹی اور مفصل تاریخ ہے جس میں ابتدائے جلوس آصف جاہ ثانی سے ۱۲۰۶ھ تک کے واقعات درج ہیں۔ ابتدا میں آصف جاہ اول کے اجداد کا مختصر تذکرہ ہے۔ اس کے بعد آصف جاہ اول کی حکمرانی کے واقعات لکھے ہیں۔ نواب میر نظام علی خان بہادر کا تذکرہ شروع کرنے سے قبل

نواب ناصر جنگ شہید اور نواب صلابت جنگ کے ضروری حالات بھی لکھے ہیں مولف نواب میر نظام علی خاں بہادر کے اہل دربار سے تھے مولف کا انتقال ۱۲۱۵ھ میں ہوا۔ یہ کتاب سنہ ۱۳۱۰ھ میں توزک آصفیہ کے نام سے حیدرآباد میں میر احمد علی موسوی کے حواشی کے ساتھ چھپی ہے جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوگیا۔ اس کتاب کا صحیح نام جیسا کہ خود مصنف نے لکھا ہے "آصف نامہ" ہے۔

---

1 Political History of India by Major General Sir John Malcolme Part I

2 Clive by Malleson (Rulers of India series).

3 The Making of British India by Ramsay Muir.

4 The Rise of the Christian power in India by Basu 2nd Edition (1931)

5 History of British India by Mill parts 5 & 6

6 The Rise and expansion of the British Powea in India By Arbur Part II.

7 A History of the Mahratta people by Grant Duff Parts I, II & III

8 Treaties, Engagements and Sunnuds of India by Atchison Vol. II & V

9 Wellesley's Despatches by Montgomery.

10 The Danger to British India from the French and Missionary establishments 1808 by D. Hawkin.

11 Wellesley s despatches by Alison

12 Slections from state papers by Forrest.

13 Memoirs and Correspondence of Wellesly by Pearce Part I

14 Wellesley by W. H. Hutton (Rulers of Mdia series)

15 Our Faithful Ally - The Nizam by Frazer

16 A Compuhensive History of India hy Beveridge Vol. II & III

مخطوطات کے خزانے

"یادداشت منشی عزیز اللہ"

از جناب مولانا محمد مرتضیٰ مرحوم

مولانا محمد مرتضیٰ مرحوم کے قلمی مسودات میں ایک یادداشت اس عنوان سے موجود ہے کہ "انتخاب از کتاب یادداشت منشی عزیز اللہ" ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ "یادداشت از تاریخ منشی میر عزیز اللہ میر منشی رزیڈنسی جس کا تذکرہ گلزار آصفیہ میں ہے"۔ اس سے منشی عزیز اللہ کی شخصیت تو متعین ہو جاتی ہے۔ لیکن اصل کتاب کا تاحال علم نہ ہو سکا صراحت سے معلوم نہ ہو سکا کہ مرحوم نے یہ کتاب کس کتب خانہ میں دیکھی تھی۔ ان کی ایک علیحدہ یادداشت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کتب خانۂ گزیٹر میں موجود تھی — یہ کتب خانہ اب موجود نہیں ہے۔ کتابیں نہ معلوم کہاں کہاں منتشر ہو گئیں۔ مرحوم نے ایک دوسری یادداشت میں لکھا ہے کہ "کتاب تذکرہ سادات بارہہ و آصف جاہ و ناصر جنگ وغیرہ شریک جلد کتاب یادداشت عزیز اللہ"۔ اس رہبری سے بھی تاحال کتاب پردست رس نہ ہو سکی۔ مرحوم نے اس کتاب سے جو اقتباس کیا وہ موجود ہے۔ اس سے نواب میر نظام علی خاں مرحوم کے زمانہ کے بہت دلچسپ حالات معلوم ہوتے ہیں مناسب متصور ہوا کہ یہ یادداشت مجلّہ کے صفحوں پر محفوظ کر دی جائے۔ اس شمارہ میں اس کی اشاعت اس لئے بھی برمحل ہے کہ اسی زمانہ کے اہم تاریخی حالات پر ایک دلچسپ اور پُر از معلومات مقالہ مجلّہ کی اسی اشاعت میں شایع ہو رہا ہے۔ یہ یادداشت بجنسہ شائع کی جا رہی ہے۔ یہ امر صحیح ہے کہ اس میں فارسی عبارتیں بھی بہت ہیں اور ان کا ترجمہ مناسب ہوتا لیکن حجم کے اضافہ کا خوف دامن گیر ہے۔ یوں مولف کی اصلی عبارت میں ہی پڑھنے کا لطف بھی ہے۔

منشی عزیز اللہ کے بعض حالات خود اس یادداشت میں معلوم ہو جائینگے لیکن کچھ زیادہ معلومات حاصل کرنا مطلوب ہو تو گلزار آصفیہ پر رجوع کیا جا سکتا ہے۔ ان کے بیٹے التفات حسین کے حالات نگارستان آصفی میں موجود ہیں۔ مدیر۔

یادداشت از تاریخ منشی میر عزیز اللہ میر منشی رزیڈنسی بکا تذکرہ گلزار آصفیہ میں ہے

اس کتاب میں حسب ذیل خوبیاں ہیں:۔

(۱) اصل فارسی عہد ناموں کی نقل کی ہے (۲) بہت سے القاب (۳) قواعد دربار (۴) چند پولیٹکل داؤ پیچ (۵) امراء و وزراء حیدرآباد کو رقمی امداد ملنا سرکار انگریزی سے (۶) انتظام مملکت سررشتوں اور عہدوں کی تفصیل۔ غرض کہ کتاب اچھی ہے گو بہت سے وجوہ سے ناقص ہے۔

مہاراجہ بالاجی پنڈت کا معاہدہ راست بلا توسط انگریزی بذریعہ اعظم الامراء ارسطو جاہ ہوا تھا جو اس میں مندرج ہے۔ اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ انگریزی معاہدوں کے مقابلہ میں یہ کیسی سیدھی سادی عبارت ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح دولت راؤ سندھیا کا معاہدہ ہے جو بالاجی کے پونا سے بھاگ جانے کے بعد لکھا گیا تھا۔ ۱۲۱۱ سنہ ہجری۔

منشی عزیز اللہ کی چٹھیاں بنام گورنر جنرل و رزیڈنٹ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریز دیسی لوگوں سے کس طرح کام لیتے تھے۔

کرنل ولیم کرک پیاٹرک مفخر الدولہ۔ کرنل جیمس کرک پیاٹرک حشمت جنگ افتخار الدولہ مؤتمن الملک۔ صاحب والا قدر ہنری رسل ثابت جنگ۔ احترام الدولہ سرجان کنوی دلاور جنگ۔ وہ عہد نامجات جو فارسی زبان میں اس کتاب میں مندرج ہیں:۔ عہد نامہ نمبری ۸ و ۹ و ۲ و ۱۲ و ۱۱ و ۷ و ۳ و ۱۰ و ۱۳۔

یادداشت انتخاب از منشی عزیز اللہ۔

مزخرفات مشمولہ وقت حاضر باشی دربار حیدرآباد دکن کہ با نفضلے خیرخواہی قلم بند نمودہ شد:۔

(۱) خلاصہ وقت بارشاہی حضور پُر نور اگر موقع افتد مدارج خلوص و دولت خواہی و خیرخواہی و فوائد و منافع و اتحاد بین الدولتین باندازے ذہن نشین حضور پُر نور باید نمود کہ بوئے غرض و اغراق از فحوائے کلام بظہور نرسد۔ و ہم در سوال و جواب با کارگذاران سرکار دولت مدار[1] موقع و مقام دیدہ مدارج حق پرستی ولاطمعی و مراتب

[1]- سرکار دولت مدار سے سرکار آصفیہ مراد ہے۔ مدیر

لقولی و نیک نیتی سرکار عالم مدار آنریبل کمپنی با فواید اتحاد بین الدولتین بے غرضانه خاطرنشان بوسته در لوازم ازدیاد اتحاد بین الدولتین بدل و جان مصروف باید بود۔ این معنی را عین دولت خواهی اصل الاصول وکالت باید دانست۔

(۲) نیک نامی و نام آوری صاحب رزیڈنٹ که خداوند نعمت ست با قتضائے حق نمک همیشه یاد داشته در تقویم حسن خدمات و انصرام عمده امورات دقیقه فروگزاشت نباید ساخت۔

(۳) اطاعت و فرمان برداری صاحب والاقدر (صاحب کوچک) و رضاجوئی و پاسداری صاحبان ن مقدم باید دانست۔ ارشاد صاحب والاقدر بعینه منزله احکام رزیڈنٹ باید انگاشت۔

(۴) اگر سفارش مدارالمهام بجهد اعظم الامرا ضرور افتاد بحضور مناسب باشد در پرده دولت خواهی فواید سرکار بے غرضانه بلکه دولت خواهانه بعمل باید آورد۔ لجاج و اصرار بطوریکه خدانخواسته موجب عدم رضائے خاطر مبارک حضور پُر نور باشد زنهار هزار زنهار نباید کرد۔

(۵) اگر احیاناً مدارالمهام بجهد میر عالم اتفاق افتاد جهت آقتدار خود خواسته باشد که ب داب انتظام امور مدارالمهامی خود از حضور پر نور بعمل آرد این معنے را خلاف آئین وکالت و منشاء ت کلی دانسته زنهار هزار زنهار درین باب بنقشه میر عالم اقدام باید کرد بلکه درصورت ضرورت ب نقشه اعظم الامرا باستر ضاء و رضامندی حضور بعمل باید آورد۔

(۶) اگر مابین مدارالمهام و کارگذار سرکار دولت مدار باعث غرض نفسانی رنجش و کشیدگی رو دهد یک برائے پلکشی خود شماتت یک دیگر نموده باغ سبز نمایند درین صورت بمصداق شعر:-

میانجی چنانکن برائے صواب \ که هم سیخ برجا بود هم کباب

در اصلاح منشاء اختلاف بهمدگر باید کوشید و زنهار هزار زنهار بجانبی از اعدے ازاده شکست و ی دیگرے نباید ساخت۔

(۷) در جزو کل دیانت امانت راست گفتاری۔ نیک کرداری همیشه نصب العین باید داشت

(۸) راز داری عمده و نازک بلکه اصل الاصول وکالت شمرده بحضور خویش و اقربا زبان را از مقدمات

سرکار عالی مطلق آشنا نباید کرد۔

(۹) در روداد مقدمات عمده اول کیفیت مقدمه از رزیڈنٹ بخوبی دریافته قلم بند نماید بعد نقشهٔ سوال و جواب قلم بند نموده سوال و جواب از کارگذاران سرکار دولت مدار بشگفته پیشانی و کشاده جبینی بے غرضانه بلکه دولت خواهانه بعمل باید آورد۔ زنهار هزار زنهار در بین گفتگو خشن یا خدانخواسته ملتجی نباید شد۔

(۱۰) اگر احیاناً در مقدمه رزیڈنٹ بمقتضائے عنایات مشوره نمایند ۔بعد غور و تامل بسیار و ملاحظهٔ اطراف و جوانب آنچه در رائے تامل جلوهٔ استحسان دهد بوست کنده بلحاظ حقیقت بلاغرض نفسانیت معروض باید داشت۔

(۱۱) همیشه متفحص کوائف بوده آنچه از رطب و یابس بدریافت رسد بروقت بعرض رزیڈنٹ باید رسانید و احتیاطاً کوائف مزبور مع ارشادات جناب رزیڈنٹ که برآن باب شرف نفاذ یابد بقید تاریخ قلم بند باید ساخت۔

(۱۲) وقت سوال و جواب با کارگذاران سرکار دولت مدار چشم و گوش و دل و زبان حاضر و ناظر داشته در صورت سهل جوابدهی بغور و تامل مضائقه ندارد مگر در عمدهٔ مقدمات بے عرض رزیڈنٹ جواب نباید داد و خلاصه شرح ملاقات همیشه بدرستی و راستی تمام قلم بند باید نمود چه اکثر کاغذ شرح ملاقات همیشه بحضور کارگذاران دولت مدار جهت تصدیق و تصحیح از سرکار رزیڈنٹ فرستاده مے آید۔

(۱۳) چون درین عرض مدت بامتحان کلی رسید که آشنائی دولت حکم عنقا دارد بناء علیه با هیچ یک بیگانه ارتباط زیاده از حد گرم نباید ساخت بلکه درین اوقات یعنی در عالم وکالت از خودغرضان دوست نما احتیاط و احتراز جملهٔ واجبات باید دانست۔

(۱۴) طریقهٔ صلح و کل با خاص و عام مطمح نظر داشته رویه دلدهی و رضاجوئی و بردباری و تحمل در همه باب شعار خود باید ساخت و در برآمد کار سرکار عالم مدار[۱] دوستی و دشمنی و نفع و نقصان بوجه من الوجوه مد نظر نباید داشت۔

(۱۵) نظر بر حسن تمشیت کار سرکار عالم مدار از امرایان و روشناسان سرکار دولت مدار بنوعی مراسم ارتباط و اختلاط باید داشت که دوستی هم دگر ذهن نشین بلکه قریب یقین بوده باشد

(۱۶) از کیفیت و حقیقت امرایان و روشناسان سرکار دولت مدار یعنی از مدرج دولت خواهی مشارٌالیهم بنسبت سرکار عالم مدار آنر یبل کمپنی دام اقباله و هم از وضع ..... و قول و فعل مومی الیهم حتی الوسع آگاه باید بود

[۱] ۔ سرکار عالم مدار سے مولف کی مراد غالباً سرکار کمپنی ہے ۔ مدیر

تا خدانخواستہ عند الضرورت غلط فہمی بمنصۂ ظہور نرسد۔

(۱۷) در تقدیم خدمات سرکار عالم مدار حاضر الوقت بودہ کار صحیح بر چاشت نباید گزاشت بلا توقف و اہمال بجا باید آورد۔

(۱۸) داد وستد کو اغذ عمدہ بدست خود باید نمود۔ وکواغذ ہر ماہ بقید ماہوار علیحدہ علیحدہ منتظم باید داشت وہم تحریر مقدمات عمدہ بذات خود بکمال مآل اندیشی و تامل و ملاحظۂ اطراف وجوانب باید کرد۔ چنیں امور کہ حسن و قبح آں بسرکار عالم مدار یا بذات خود عائد گردد زنہار ہزار زنہار باعتماد دیگراں نباید گذاشت۔

(۱۹) سفارش جزی کلی بسرکار دولت مدار بے احکام جناب رزیڈنٹ زنہار ہزار زنہار نباید کرد۔

. . . . . . از ماہیت حواسیاں خویش۔ پیوستہ آگاہ وہوشیار باید بود۔

(۲۰) امورات جزی تا چیز مثلاً ضیافت یکے از دوستان یا ملاقات احدے از محبان بعد عرض رزیڈنٹ بعمل باید آورد و خلاصۂ امورات خانگی ہم کہ قابل عرض باشد باطلاع وے بعمل آوردن خوشنماست تا باامورات سرکاری چہ رسد۔

اسکے بعد مراتب دربار و بارنشانی وغیرہ کے لکھے ہیں۔ طریقہ ہے کہ رزیڈنٹ کے ساتھ منشی کو کس طرح دربار میں جانا چاہیئے دربار وغیرہ میں بروقت گفتگو ان کے خطاب بیان کرنے چاہیئے مثلاً معروضۂ ثابت جنگ چنیں است۔ یہاں لکھا ہے کہ "تواضع از جملۂ اخلاق پسندیدۂ اہالی حیدرآباد ست لہذا منشی را باید کہ در دربار تواضع امرایان مثل امجد الملک وغیرہ وغیرہ سروقد نماید۔ وہم سبقت در سلام از طرف خود بعمل آرد۔ درباری منشی کو مثل اور ولیوں کے مراسم معمولی ادا کرنے ضرور تھے۔ لیکن رزیڈنٹ وغیرہ ایسا نہ کرتے تھے۔ رزیڈنٹ متصل مسند کے نشست کرتا تھا حضور کو پیرومرشد سے خطاب۔ جناب گورنر جنرل بہادر کہا جاتا۔ بوقت برخاست پاندان رزیڈنٹ کو دیا جاتا۔ اکیلے منشی جائے تو عرض کرے "ثابت جنگ بہادر آداب عرض نمودہ اند"

اسکے بعد تفصیل خدمات بادشاہی مع شرح لوازم و مراسم ہر ایک مسطور ہے۔ دیوانی سے متعلق جمع خرچ آمدنی ملک۔ تنخواہ جاگیر بہ افراد سپاہ۔ عزل ونصب عاملان۔ تغیر و تبدل خدمات پیشکار۔ محرر۔ مددگار۔ تمام کاغذ سررشتہ دار کے پاس رہتے۔ سررشتہ دار کمتر تغیر می شود۔ چوں دیوان نو و پیشکار نو قراری یابد آنہا بہ واقف کاری

سررشتہ دار اجرائے کار می نمایند۔ ہرگاہ واقفیت تمام بہم رسانند و محیط می شوند می تواند شد کہ سررشتہ دار را تبدیل کنند اما سررشتہ دار ہوشیار آنقدر علم با نہا نمی دہد کہ بر و غالب آیند۔

سوال جواب کلیات۔ رسانیدن افراد مطالب بدستخط حضور۔ اجرائے امور عظیم وابستہ بمہر و دستخط دیوانی می باشد۔ و نوشت و خواند و فراہمی کواغذ مثل قبولیت عاملان و ضامنی آنہا و قول و قرار زمینداران کہ تعلق تحریر دارد متعلق بہ پیشکار (پیش دست صاحب کار)

دیوانئ حضور کہ سابق برکن الدولہ مرحوم بود ہنوز بہ کسے تعلق نیست و خود بدولت بنفس نفیس کارہائے رکن الدولہ می نمایند۔ رائے رایان کلاں نے مددگاری سررشتہ داری خدمت پیشکاری کے درجہ پہ ترقی پائی تھی)۔ رائے بھوانی داس۔ رائے سیدھل کہ نائب یعنی گماشتہ بھوانی داس ست بہ سررشتہ داری دیوانی بالوجہ قیام دارد۔

تعلقات اضلاع میں بھی اسی قسم کے پیشکار، سررشتہ دار، محرر، مددگار ہے۔ پیشکار دیوان کے تحت ہوتا ہے سررشتہ دار تحت پیشکار کے۔ محرر و مددگار ماتحت سررشتہ دار کے تغیر و تبدل ہر ایک باطلاع حضور در اختیار مسموع خود است۔ ہمیں سررشتہ دار دیوانی را سررشتہ دار مال می گویند چہ آمدنی مال از ملک و جاگیرات و خدمات ست۔

مستوفی۔ آں باشد کہ کواغذ جمع و خرچ از دیوانی و از خان ساماں و ہم از کارخانہ جات دیگر جدا جدا و از بخشی ہر رسالہ بطلب داشتہ بر تحقیق و تنقیح رساند۔ ہرگاہ کواغذ بعلاقہ جات مرسلہ در دفتر مستوفی رسیدہ بنشانئ او کہ ہم قرار دادہ اند رسید آنہا از محاسبے باقی شدند۔ مستوفی را تفوق بر امین ست۔

خانساماں آن ست کہ مخارج قطع برید، خرید فروخت سرکار، و دیگر کارخانہ جات مثل توشک خانہ و اصطبل و فیل خانہ و جنسی و باورچی خانہ وغیرہم کارخانہ جات مخارج باو متعلق بودہ۔ ایں مقابل ست بدیوان چہ دیوانی بر آمدنی ست و خان ساماں میر مخارج ست۔ درخواست از خانساماں از دیوان دارد۔

بخشی آں را گویند کہ ملازمان را بہ نوکری رسانند و ہر رسالہ سپاہ را بخشی علیحدہ می شود۔ پیشکار سررشتہ دار وکیل او را مطلوب می گردند تا کواغذ اسم نویسی فہرست دارچہ تنخواہ و حساب تقسیم تنخواہ آنہا نگہ دارد۔ بخشی سائر آنست کہ ملازمان متفرق مثل نویسندگان و اہل تعلقہ و شاگرد پیشہ و مردمانیکہ داخل رسالہ کسے ہستند در آنجا نوکر می شوند و حساب آنہا باو تعلق۔

چوں ہر کارخانہ را دارغہ یعنے سرکردہ ضرور است سررشتہ دار آں را مشرف گویند گویا مشرف پیشکار دارغہ ست نظر با متیاز خدمات کارکنی خدمات را پیشکار و کارکنی دارغہ را مشرف گویند۔

منصب دار عبارت از نوکران بادشاہی ست کہ ناظم دکن بہ نیابت پادشاہ آں را بتقرر منصبے کہ از نیم بستی تا بہ ہزاری مراتب دارد نوکری نماید۔ وتجویز نامہ برائے حضور بادشاہ بمہر خود بخشئ دکن نوشتہ حوالہ شخصے کہ بمنصب سرفراز می شود می کند و او نقل تجویز نامہ بدفتر دیوان دکن رسانیدہ سیاہۂ تجویز جاگیر بقدر منصب حاصل می نماید و موافق ہماں سیاہۂ متصدیان دیوانی سند جاگیر بمہر رئیس دکن و ہم بمہر دیوان کردہ می دہند۔ وچوں ناظم دکن منجملۂ منصب داران عمدہ ست ایں رسالہ را بخاص برادری منسوب می سازند و اگرچہ بخشی اینہا بخشی ممالک دکن ست اما چوں تنخواہ نقدی منصب داران از نا یافتن جاگیر بر خزانہ وغیرہ محالات می یابند جہت تقسیم وحساب آنہا پیشکار علاحدہ بسررشتہ دار جداگانہ قرار می یابد۔ بیرو کار منصب داران از بخشئ دکن بجز تجویز منصب نو یا اضافہ یا خطاب یا مراتب ہیچ درخواست تنخواہ نمی باشد۔

اوّل در عہد آصف جاہ خطاب تازہ دیوان دکن کہ آں را دیوان تن نیز گویند و بخشی دکن کہ حالا بر بخشی بادشاہی نامزد است از حضور بادشاہ سرفراز شدہ می آمدند و مقابلیت با رئیس دکن بلکہ مواخذہ تنخواہ جاگیر بجا می کردند۔ مداخلت آصف جاہ در ممالک بادشاہی ہیچ نہ بود ہمہ کارہا از دیوان دکن و بخشئ دکن تمشیت می یافت مگر آصف جاہ بہ نیابت بادشاہ صاحب وستخط بود۔ وکار فوجکشی و نگاہداشت سپاہ بقدر مطلوب و تنبیہ مفسدہ می فرمود و خرچ ذات بجاگیرات ذات او بود۔ دیوان خانۂ او بر آں تصرف داشت و در باقی ممالک و خدمات بادشاہی دیوان دکن متصرف بود۔ چوں وزارت با آصف جاہ قرار گرفت و تسلط بادشاہ مثل سابق نماند۔ تغیر و تبدیل بخشئ دکن و دیوان دکن با جازت بادشاہ بذمہ خود گرفتہ مختار گشت و روز بروز کارخانہ جات بادشاہی حقیر شدند۔

از ایں قبیل ست میر آتش کہ حساب وکتاب قلعہ جات بادشاہی و سامان حرب و ضرب و کرب و بارود و بان و گولہ و توپ و جمعشام قلعہ کہ عبارت از سہ بندی حصار شہر و قلعہ ست بدو تعلق داشت۔

اس کے بعد بیان کیا ہے کہ ان میں خاص وشاہی عہدہ داران۔ دیوان دکن۔ بخشئ دکن۔ میر آتش۔ کے علیحدہ علیحدہ دفاتر ہوتے تھے۔ ہر ایک دفتر کئی چھکڑوں پر لادا جاتا تھا ان کے خیمے برہم بادشاہ ہندوستان

سرخ رنگ کے ہوتے تھے اور لال کچہری کے نام سے موسوم ہوتے۔ شاہ نواز خاں کے زمانہ میں میں نے ان کی شان و شوکت دیکھی ہے۔ قریب دو سو چھوٹے سرخ خیمے گرد پیش ان تین کچہریوں کے ہوتے جسکے لئے عظیم الشان خیمے بر پا ہوتے تھے۔ ان کی خاص طور پر وقعت تھی۔ اب فقط چاوڑیوں میں حسب عادت قدیم جھنڈہ اور فرش کہار و اسرخ کا باقی ہے اور سال بسال رعایا پر پٹی ڈالکر تجدید ہوتی ہے اور بس۔

دارغۂ داغ۔ ہرگاہ جوان ملازم شود اسپ او بداغ رساند۔ و ہرگاہ اسپ کس سقط شود پوست اسپ سقطی معہ داغ سابق ملاحظہ کردہ اسپ دیگر بداغ رساند۔

پیادہ شاگرد پیشہ۔ کو حاضری لازم تھی جن کا دارغہ قرار پایا تھا۔ ماہانہ اور ششماہی تنقیح از روئے فرد۔ چہرۂ جوان و اسپ لیا جاتا تھا۔ یہ دارغہ بلحاظ کثرت فوج متعدد ہوتا تھا۔ ماہانہ موجودات کا نام داخلہ ششماہی کے موجودات داخلہ میں جوان اور گھوڑے کے حاضر ہونے کی تاریخ فرد چہرہ پر لکھی جاتی تھی۔ تاکہ فوتی و فراری یا گھوڑے کے سقط ہونے پر ان کا نام نکالا جائے۔ تنخواہ فوتی و فراری لغایت تاریخ موجودات شمار کی جاتی تھی۔ اس تعلقہ کے لئے بھی پیشکار۔ سررشتہ دار۔ محرر۔ مددگار ضرور ہیں۔ پیشکاریں۔ سررشتۂ جوانان یا سوال و جواب آنہا با دمتعلق می باشد۔

حضور نویس آنست کہ۔ ہر کاغذے کہ از دیوان و بخشی و خانساماں وغیرہم بدستخط حضوری رسد و ہر احکامی کہ رئیس در دربار فرماید سیاہہ حضور قلمی شدہ باشد و نشانی جلے خطے حضور بقید تاریخ بر جمیع کواغذ شدہ باشد۔

کیفیت آب و ہوائے حیدر آباد بالاجمال

آب و ہوا۔ رطب یا بس۔ تولد صفرا می کند۔ خیلے در بدن سرایت می سازد۔ مثلاً اگر کس غسل از آب سرد کند لرزہ در بدن پدید شود۔ اگر احدے تحت السما استراحت کند صبح ثقل در بدن محسوس می گردد۔ لہذا واقفان ہوائے حیدر آباد از ایں چنیں اموات کلیتہً احتیاط دارند و ہمیشہ سر و سینہ را از ہوا محفوظ می دارند۔ در حیدر آباد از سقم ہوا ضرر فالج و سنگ گردہ بہ نسبت ہندوستان زیادہ است۔ بیان کیا ہے کہ اسوقت بھی ڈاکٹری علاج رائج تھا۔ در حیدر آباد عارضۂ قبض علے العموم و بدیں سبب سقوط اشتہا لازم۔ استعمال

جلاب مطلقاً در حیدرآباد مرسوم نیست۔ مگر بلاچاری و کمال ضرورت۔ در حیدرآباد بسبب کثرت ترشی و بادی اکثر سنگ گردہ عارض گردد۔ دریں وقت نشستن در آب گرم تا گردن۔ علے الادام نوشیدن آب آہک فائدہ عین دارد۔ دو تین نسخہ لکھے ہیں۔ مولوی ابن علی کا ذکر ہے۔ عادات حیدرآباد دربارۂ پخت حفاظت یا دریچہ۔

شرح تحریر صاحب عالی شان[1] بحضور نواب نظام علی خاں

برحاشیہ در عریضہ صاحب عالی شان خود را بلفظ دولت خواہ یا خیرخواہ می نویسند۔ مثلاً تمہ دولت خواہ۔ ارشاد عالی۔ مترشدہ علے ارشاد والا۔ عرض حضور پر کاغذ حوض حاشیۂ بوٹہ طلائی۔ بدون نوشتہ شود۔ بدیں وضع کہ از زیر جدول متصل بنویسند و سفیدی نمی گزارند۔ بجائے مذہبوں جدولست و بر پیشانی کہ جدول خانہ دار بستہ اند نام خدا و لفظ حضور پُرنور نوشتہ می شود احیاناً اگر مسودہ بر کاغذ مذکور کفایت نکند و عبارت باقی ماند دریں صورت بر پرچۂ دیگر کہ افشاں نکلے دار باشد تکمیل می نمایند۔

نواب صاحب والا جناب۔ فیض رسان۔ مصدر فضل و احسان۔ دام اقبالہ و زاد جلالہ۔ بعد ادائے آداب نیاز و عبودیت کہ طریقۂ ارادت کیشان راسخ العقیدت ست معروض رائے عالم آرائے می دارد خاتمہ ظلکم ممدود باد۔ لفافہ کاغذ سادہ مہردار۔ بر سرنامہ بر گوشۂ اوّل لفظ عرضی۔ بر گوشۂ دوم لفظ بگذرد درمیان سفید مہر سیاہی بر کمر بند افشاں نکلے دار۔

خریطۂ بادلہ تمامی۔ یا استر سرخ و رشتۂ کلابتوں۔ مہر لکھوٹا بر رشتہ۔ وقتیکہ مسافت یک دو منزل درمیان بود و گرنہ در صورت یکجا بودن اکثر در شقۂ اسمی میر عالم بہادر ملفوف نمودہ بدول خریطۂ بادلہ می فرستند و دستخط صاحب عالی شان ہم آخر عریضہ معمول ست و ہم چنیں تاریخ بر لفافہ جائے کہ مہر می کنند بر گوشہ می نویسند بحساب قمری۔

شرح تحریر صاحب عالی شان جہت اعظم الامراء

لفافۂ کاغذ سادہ مہردار۔ درچنیں خط خود را بلفظ مخلص و مدارالمہام را بکلمہ مشفق تعبیر می سازند مثلاً در تجویز مخلص چناں برسید۔ مذکور آن مشفق چناں۔ نواب صاحب والا مناقب قدردان کرم فرمائے مخلصان سلامت اشتیاق مواصلت کثیر المنفعت خاتمہ الخ۔ ایام نشاط و کامرانی مدام باد۔

---

[1] صاحب عالی شان سے مراد رزیڈنٹ ہے

سرنامہ بمطالعۂ گرامی نواب صاحب الخ بر کمر بند افشان، نواب اعظم الامرا بہادر - آخر لفافہ سلمہ اللہ تعالیٰ - موصول باد - بر سیاہی صرف صمغ بر کمر بند - خریطہ کمخواب سُرخ رشتۂ ابریشمی مہر لکھوٹا بر رشتہ - وقتیکہ مسافت یک، دو منزل باشد در صورت یکجا بودن خریطہ ضرور نیست۔

رسم تحریر بہ میر عالم بہادر

بر حاشیہ در عہد وکالت میر مغفور دراین چنین خطوط صاحب عالی شان خود را بلفظ دوست دارد و طرف مقابل را بلفظ مہربان تحریر می کنند. مثلاً در رائے دوستدار چنیں می گذرد - وایں معنی مطابق تجویز آں مہرباں خواہد بود - بوکیل سرکار دولت مدار میر عالم - بر کاغذ سادہ سفید مہر دار - میر صاحب شفیق مہربان کرم فرمائے مخلصان سلامت - چون شرح اشتیاق دل الخ خاتمہ، ایام مسرت و نشاط مدام باد - سرنامہ بمطالعۂ ساطعہ میر صاحب الخ - نام بر کمر بند سادہ فقط میر عالم بہادر - آخر لفافہ سلمہ اللہ تعالیٰ فائز باد - تہ سیاہی بر کمر بند۔

شرح القاب حضور نظام (از طرف آنریبل ونزلی؛ ڈیوک ولنگٹن) - نواب صاحب والا مدار عالیشان منبع فضل و احسان قدردان نیاز مندان - مدظلہ العالی - خاتمہ، زیادہ عنایت روز افزوں باد - بر کاغذ حوض حاشیہ طلائی بدون مہر - سرنامہ بوالا مطالعہ نواب صاحب الخ - بر کمر بند بعنایت آصف جاہ بہادر مدظلہ العالی معزز باد - خریطہ بادلہ - مہر بالائے خریطہ لفافہ کاغذ سادہ مہر دار۔

القاب یاور الدولہ از طرف صاحب عالیشان بمطالعہ مبا ئحہ خانصاحب مہربان دوستان یاور الدولہ بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ موصول باد - خاتمہ زیادہ مسرت باد - القاب شہباز الملک داماد اعظم الامرا بمطالعۂ ساطعہ عطوفت گشتہ کرم فرمائے من سلامت [illegible] - خاتمہ زیادہ مسرت باد - منشی عزیز اللہ اپنے طرف کے عرائض و خطوط کے القاب بھی لکھے ہیں۔

نقل عریضہ مفتخر الدولہ کرنل ولیم کرک پیاترک بحضور غفران مآب نظام علی خان کہ وقت رسید انتقال کلکتہ تحریر نمودہ بود

نواب صاحب والا جناب فیض رسان مصدر فضل و احسان دام اقبالہ وزاد جلالہ - بعد ادائی آداب نیاز عبودیت بطریقہ ارادت کیشان راسخ العقیدت ست معروض رائے عالم آرائی دارد کہ چوں احترام الدولہ مرجان کنوے بہادر دلاور جنگ

بسبب عوارض مزاج تبدیل آب وہوا پیش نہاد خاطر داشتہ عزم ولایت نمود و نیز جناب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ نظر بپاس مدارج محبت واخلاص وحفظ مراتب یگانگت واختصاص کہ فیمابین سرکار دولت مدار و سرکار کمپنی انگریز بہادر مشید و مستحکم ست دولتخواہ را جہت حاضر باشی (بیاض فی الاصل) و انصرام احکام فیض ارتسام مامور فرمودند چنانچہ دولتخواہ بعزم استحصال ایں سعادت تاریخ ۵ ار نومبر ماہ انگریزی مطابق ۱۰ ار ربیع الثانی از کلکتہ روانہ شدہ امروز کہ ہفدہم جنوری مطابق ۱۴ ار جمادی الآخرے ست در مقام سید محمد سیٹھ رسید ان شاء اللہ تعالے بتائید اقبال ابد اتصال طے منازل مابقی نمودہ عنقریب بحصول شرف ملازمت سرمایۂ کرامت کہ اہم مطالب وخلاصۂ مقاصد ست مشرف ومعزز مے گردد۔ ظلکم ممدود باد۔ محررہ ۲۷ ار جنوری ۱۷۹۴ء۔

۲۸ ار جنوری کی اور ایک چٹھی ہے جو اعظم الامرا کو لکھی گئی ہے ان کے رقعہ کے جواب میں متعام نگر تلی سے ۔ اور اسی طرح تیسری چٹھی میر عالم وکیل حضور پر نور کی ایک سند ہے مورخہ ۱۹ ار رمضان ۱۲۰۹ھ ہجری بمقام نزل بورگانون کنارہ مانجرا۔ جس میں مندرج ہے کہ جو عہد نامہ ہوا ہے اس میں تفاوت نہ ہوگا۔ و سہ مقامات کے بھی عہد نامے ہیں۔ راجہ رانا میر جعفر وغیرہ ایران روس اور جلوس سکندر جاہ کے وقت پہلے سکندر جاہ نے اپنی تحریر لکھی بتاریخ ۷ ار اگست اور اس کے بعد گورنر جنرل کی تحریر ۲۴ ار اگست۔ کتاب عہد ناموں میں جا بجا کئی سی مقدم مؤخر درج کیا ہے۔

دفعۂ علیحدہ کہ علاقہ از شرکت بالتعمیم دارد۔ ذریعۂ ہذا برنظر اینکہ ملازمان ومتوسلان سرکار نواب سکندر جاہ بہادر وقت رو دادہم دولت راؤ سندھیا چنانچہ باید امداد واعانت دوستانہ کردہ بودند زیب توفیق یافت۔

دفعۂ علیحدہ کہ در ذیل عہد نامۂ مشارکت ومحافظت مویدہ مرقومۂ ۱۲ ار اکتوبر سنہ ۱۸۰۰ء مطابق ۲۲ ار جمادی الاول سنہ ۱۲۱۵ھ شمردنی ست فیمابین سرکار عظمت مدار آنریبل کمپنی انگریز بہادر وسرکار دولتمدار نواب مستطاب نواب نظام الملک آصف جاہ میر اکبر علی خان بہادر صوبہ دار دکن وفرزندان ووارثان وقائم مقامان نواب صاحب ممدوح زیب توثیق یافت۔ درحالیکہ خدانخواستہ وقوع مہمے باشتراک ہر دو سرکار ذوی الاقتدار با ہیچ یک رئیس رو دہد دریں صورت قرار نمودہ می شود کہ تا انصرام مہم آمد ورفت تمامی سرداران وجمعیت ہر دو سرکار بالانفراد یا بہیئت مجموعی در تمامی قلاع وممالک قلمرو ہر دو سرکار بلا تعرض بغیر مزاحمت خواہند شد وہم قرار نمودہ می شود کہ تمامی سرداران وعلاقہ داران ہر دو سرکار چہ از قبیل سپاہیان وچہ از فریق متصدیان حتے الوسع والمقدور عند الضرور

در امداد و اعانت سرداران و جمیعت ہر دو سرکار کہ مامور مہم خواہد بود دقیقۂ از دقائق سعی تردد فروگذاشت نہ خواہند کرد۔ ۹ر جنوری سنہ ۱۸۰۱ء م ۲۵ر رمضان ۱۲۱۵ہجری در بلدۂ حیدرآباد ثبت گردید۔

خلاصۂ حاشیہ حسب عالیشان در باب معین شدن لک روپیہ سالیانہ باعظم الامراء چنانچہ سالیانۂ مذکور تا حیات اعظم الامرا بحال ماندہ بعد فوت او موقوف گردید۔

بہ نواب صاحب والامناقب امیر اعظم ارسطوجاہ بہادر حسن نیت وصفائے طینت خیرطویت آں مشفق در ہمہ باب خصوصاً در امورات عمدۂ افزایش اتحاد ہر دو سرکار ذوی الاقتدار کہ من ابتداد بکمال دولت خواہی سرکار آصف جاہی مطمح نظر و نصب العین فرمودہ مقدمات وفاق و اتفاق سرکارین را کہ وسیلۂ عمدہ سود و بہبود ہر دو سرکار ذوی الاقتدار تواند بود بکمال خوبی استحکام و حسن انصرام فرمودند۔ اشرف الاشراف مارکوئس ویلزلی گورنر جنرل بہادر بتعمق نظر ملاحظہ و ذہن نشین فرمودہ جہت اظہار شان خلوص اتحاد کارگذاران سرکار آنریبل کمپنی انگریز بہادر چنیں منظور فرمودند کہ من ابتدائے ۱۲ر اکتوبر سنہ ۱۸۰۰ء م ۲۲ر جمادی الاول ۱۲۱۵ ہجری مبلغ یک لک روپیہ سالیانہ از سرکار آنریبل کمپنی انگریز بہادر برائے خرچ خاص سال بہ سال رسیدہ باشد۔ و ہر چند کہ در برابر امورات عمدہ کہ در بارۂ افزایش اتحاد سرکارین از آں مشفق بظہور رسیدہ ہر چہ بعمل آید کم ست برایں ہم نظر بہ تحفہ اتحاد یقین ست کہ ایں معنی مقبول و پسندیدۂ خاطر آں والامناقب گردیدہ اقبال ایں مراتب موجب خورسندی جناب گورنر جنرل بہادر و باعث ممنونی مخلص خواہد گردید۔ غرہ مارچ سنہ ۱۸۰۱ء م ۱۵ر......... سنہ ۱۲۱۵ ہجری۔ در بلدۂ حیدرآباد ثبت گردید۔

براجہ صاحب مہربان راجہ راجند بہادر نظر حسن مساعی آں مہربان در امورات ہر دو سرکار ذوی الاقتدار کہ حال و آیندہ بمقتضائے دولت خواہی بظہور خواہد رسید اشرف الاشراف مارکوئس ویلزلی گورنر جنرل بہادر مد نظر و ذہن نشین فرمودہ جہت اظہار شان قدرشناسی کارگذاران سرکار آنریبل کمپنی انگریز بہادر چنیں کارگذاران سرکار آنریبل منظور فرمودہ اند کہ من ابتدائے ۱۲ر اکتوبر سنہ ۱۸۰۰ء م ۲۴ر جمادی الاول ۱۲۱۵ہ مبلغ بست و چہار ہزار روپیہ سالیانہ سال بہ سال بآں مہربان رسیدہ باشد و چوں ایں معنی دلیل عنایات جناب گورنر جنرل بہادر ست یقین کہ باقبال آں مسرت پیرائے خاطر و دستمال

خواہند گردید۔ مرقوم صدر

سرکار آصفیہ کے معاہدات پنڈت پردہان کے ساتھ ۔ رقوم ۶ ر شعبان ۱۱۹۰ھ ہجری

نامۂ ۱۱۶۷ھ فیصلے سنہ ۱۱۷۰ھ ، ر رمضان مابین جانوجی بھونسلہ رئیس ناگپور و نواب نظام علی خان۔

نامجات کمپنی با پنڈت پردہان و بھونسلہ راگھوجی ۔ و سندھیا - و نیپال ۔

منشی رزیڈنسی کو وزیر اعظم کو نذر دینے کا طریقہ میر عالم کے زمانہ میں موقوف ہوا۔ یعنے ارسطو جاہ ۔ رکن الدولہ ۔ وغیرہ کے زمانہ میں دستور تھا۔

منشی عزیز اللہ لکھنوی کو لارڈ ویلزلی نے قید حیات ۱۵۰ ماہوار کی (۱۱ ر دسمبر سنہ ۱۸۰۱ء) پنشن جاری کی تھی۔ آغاز کار وکالت از زمانہ فخر الدولہ ۔ موتمن الملک حشمت جنگ کے زمانہ تک ۱۲ سال خدمت میر منشی رزیڈنسی انجام دی ۔ چٹھی موسومہ مسٹر ایڈمنسٹن موسومہ گورنر جنرل بابو مورخہ ۲۷ ر نومبر سنہ ۱۸۰۵ء موجب ناموافقت آب و ہوا ۔ استعفا قبول کرنے کی درخواست ہے۔

اور اس خدمت پر منشی امان اللہ کی سفارش کی ہے ۔ اس چٹھی میں لکھتا ہے " وہم کارے عمدہ در رزیڈنسی حیدرآباد در پیش نیست " یعنے لارڈ ویلزلی کی مشن کا اصلی مقصد پورا ہوگیا۔ فقط

معاصروں کے صفحے

۱۔ "۸۷-۱۷۸۵ء کے دوران میں ٹیپو سلطان کے تعلقات نظام اور مرہٹوں سے"

امپیریل رکارڈ ڈپارٹمنٹ اور مدراس رکارڈ آفس نے اپنے مخزونہ کاغذات کے جو مجموعے شائع کئے ہیں ان سے اب تک بہت کم استفادہ کیا گیا ہے۔ اُردو میں جو مقالے یا کتابیں تاریخ کے موضوع پر شائع ہوئی ہیں ان میں اس مآخذ سے کسی خاص استفادہ کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوتی حقیقت یہ ہے کہ خود سلطنت آصفیہ کی تاریخ کو روشنی میں لانے کے لئے اس مآخذ کی کافی چھان بین بہت ہی ضروری ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان مجموعہ ہائے کاغذات کے مناسب اور ضروری اقتباسات کا خود اُردو ترجمہ تاریخ کی خدمت کے مترادف ہوگا۔

بہر حال مجلہ اسلامک کلچر بابۃ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں متذکرہ صدر موضوع پر ارشاد حسین صاحب نقائی کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس مقالہ میں زیادہ تر اسی ماخذ سے مواد فراہم کیا گیا ہے جس کی جانب ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

یوں ایک طالب علم معاہدہ سال بھائی (۱۷۸۳ء) اور معاہدہ منگلور ۱۷۸۴ء سے واقف ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ انگریزوں اور ٹیپو سلطان کے اس معاہدہ کے بعد مرہٹوں اور نواب نظام علی خاں میں ایک معاہدہ اتحاد قرار پایا (معاہدہ ایت گیر ۱۷۸۴ء) ان معاہدوں کے قرار پانے کے بعد مرہٹوں نے بادامی کے قلعہ کا جو محاصرہ کیا۔ اور اسکے جواب میں ٹیپو سلطان کی ادہونی پر تاخت اور بالآخر مرہٹوں سے صلح کے ظاہری واقعات سے بھی عام آگاہی ہے لیکن ان واقعات کے پس پردہ جو ڈپلومیسی کام کر رہی تھی، انگریزوں، مرہٹوں اور نواب نظام علی خاں کے پیش نظر جو مصالح تھے ان کو غالباً اب بھی بہت کم افراد جانتے ہیں۔ ارشاد حسین صاحب نے اپنے مقالہ میں ان واقعات کے مصالح سیاسی اور ہر دربار کی ڈپلومیسی کو نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ معاہدہ منگلور سے مرہٹے کیوں خائف ہوئے، نواب نظام علی خاں سے معاہدہ کرنے میں مرہٹوں کی کیا مصلحت تھی، بادامی کے محاصرہ کے وقت نیز مرہٹوں اور نواب

نظام علی خاں کے باہمی معاہدہ میں انگریز کیوں غیر جانب دار رہے اور بالآخر ٹیپو سلطان اور مرہٹوں میں جو صلح ہوئی وہ کس مصلحت کی بنا پر تھی ان سب امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۴۔ اعظم الامرا ارسطو جاہ نے اپنے زمانۂ قیام پونا میں اپنی سیاست و تدبیر میں جو کامیابی حاصل کی اسکے بعض پہلو قاسم علی سجن لال صاحب نے اپنے ایک مضمون میں واضح کئے ہیں۔ یہ مضمون اسلامک کلچر کی اشاعت بابتہ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا ہے۔

۳۔ تاریخی کاغذات کو شائع کرانے اور ان کے مضامین سے اصحاب ذوق کو واقف کرنے کا سلسلہ دوسرے مجلات میں بھی نظر آرہا ہے۔ چنانچہ اسلامک کلچر کی اشاعت بابتہ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر پی ساران نے فرخ سیر بادشاہ کے ایک فرمان کی نقل شائع کی ہے۔ اصل خود ان کے پاس موجود ہے فرمان کے اصلی متن کے ساتھ انگریزی میں اس کا ترجمہ بھی شائع کیا ہے۔ یہ فرمان پرگنہ ساندی سرکار خیرآباد صوبہ اودھ میں بی بی فاطمہ کو ۵۱ بیگہ زمین عطا کرنے سے متعلق ہے فقط

تنقید و تبصرہ

(۱) حالی = مصنف محمد عزیز اللہ صاحب بی۔اے بی ایل۔

چھوٹی سائز (۴۸) صفحات، قیمت ۲ر

یہ کتاب سلسلۂ مطبوعات اردو سوسائٹی گورنمنٹ محمدن کالج مدراس کی پہلی کڑی ہے۔

مدراس یونیورسٹی کے بی اے کے اختیاری مضمون میں اردو کے نصاب میں تاریخ زبان ادب اردو پر بھی ایک پرچہ لازمی رکھا گیا ہے اس کے علاوہ کالج کی اردو سوسائٹی کے جلسوں میں اردو کے مشہور مصنفین کے حالات پر مضمون بھی سنائے جاتے تھے۔ اسی تقریب سے گویا زیر تبصرہ کتاب لکھی گئی۔

زیر نظر کتاب ۱۹۲۵ء میں مرتب ہوئی ہے یہ کتاب جس متن پر مشتمل ہے وہ پہلے رسالہ شمع آگرہ میں مضمون کی صورت میں شائع ہوا تھا۔ اسکو کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اس میں مولانا حالی کے تصانیف نظم و نثر پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ مولف نے اس امر کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مولانا حالی نہ صرف ایک سوشل

رخار میر تھے بلکہ اردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کرنے والے شاعر بھی تھے۔

(۲) آزاد ۔ مصنف منشی فاضل محمد عبدالجبار باشاہ صاحب مرحوم بی اے چھوٹی سائز ۱۵۵ صفحات قیمت ۱ر

یہ کتاب سلسلۂ مطبوعات اردو سوسائٹی محمدن کالج مدراس کی دوسری کڑی ہے۔ یہ کتاب بصورت مضمون ۱۹۳۶ء میں رسالہ سفینہ مدراس میں شائع ہوئی۔ جبکہ مولف انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ اس میں مختصر طور پر مولانا آزاد کے تصانیف کا تعارف اور اسپر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ افسوس کہ عین شباب میں ان کا انتقال ہوگیا۔

یہ دونوں کتابیں کالج کے طلبہ کے لئے مفید ہیں۔

مدراس کی کوئی اردو مطبوعہ کتاب یا تحریر نظر سے گزرتی ہے تو وہ زمانہ خود بخود یاد آتا ہے جب کہ مدراس کی مطبوعہ تحریریں سارے ہندوستان میں اپنی کتابت اور اپنی طباعت کے لئے نمونہ کے طور پر پیش کی جاسکتی تھیں۔ آج سے سو پون سو سال قبل جب کہ وظیفہ یاب نوابی بھی دم توڑ رہی تھی مدراس کے ارباب علم مشرقی علم و ادب کی خدمت میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ ۱۲۶۳ھ میں مطبع کنز العلوم میں نوایدبدریہ کی جو طباعت ہوئی کوئی اسکو دیکھے یا ۱۲۷۲ھ میں مطبع سرکاری کا مطبوعہ تذکرہ گلزار اعظم کا نسخہ کوئی دیکھے۔ آج بھی ان کی کتابت و طباعت دیدہ و دل کے لئے سرور و مسرت کا سامان بہم پہونچاتی ہے بے شک نوابی ختم ہوگئی لیکن اپنی زبان تو باقی ہے۔ اس کو بولنے اور سمجھنے والے کئی لاکھ ہیں۔ کئی لاکھ افراد ایسے ہیں کہ ان میں اردو لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا کیا جاسکتا ہے۔ پھر کیوں مدراس کے نوجوان اپنی زبان کی خدمت میں اور اپنی کتابوں کی کتابت اور طباعت میں اپنے بزرگوں کے معیار پر پہونچنے کی کوشش نہیں کرتے۔

— ن ۔ م —

مجلۂ طیلسانین

حصہ

معاشیات

تیسری جلد بہمن ۱۳۵۳ف ۔ جنوری سنہ ۱۹۴۴ء ۔ محرم ۱۳۶۳ھ پہلا شمارہ

مدیر مجلۂ طیلسانین:۔ محمد غوث ام اے، ال ال، بی (عثمانیہ)

فہرست مضامین

حرف آغاز

یہ امر خوشی اور مبارک باد کے لائق ہے کہ رضا کارانہ کوششوں سے مصنوعات مملکت آصفیہ کی چھٹی نمایش بھی کامیابی کے ساتھ بخیر و خوبی انجام پذیر ہوئی۔

اعلیحضرت بندگان عالی مدظلہ العالی کو ملک کی صنعتی ترقی کا جو خیال ہے اور اس سلسلہ میں جو شاہانہ توجہ و التفات مبذول ہے اس کا عکس اس تقریر دل پذیر سے منعکس ہوتا ہے جو مجلس نمائش کے صدر جناب خان بہادر سید احمد محی الدین صاحب کے سپاس نامہ کے جواب میں ارشاد ہوئی۔

نمائش کا دوسری مرتبہ بہ نفس نفیس افتتاح فرمانے کی وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ

”ملک کی عام صنعتی ترقی کی اہمیت اور اس سے میری گہری دلچسپی کا اظہار ہو۔ صناعوں، سرمایہ داروں اور مزدوروں کو معلوم ہو جائے کہ صنعتی ہنر کی ترقی، سرمایہ کے بہتر استعمال اور مزدوروں کی خوش حالی میری غائر فکر اور ہمدردی کے مرکوز ہیں“

اعلیحضرت خسرو دکن دام اقبالہٗ کا یہ ارشاد صنعتی ترقی اور مادی خوش حالی کے لئے ایک نوید ہے اب یہ اہل ملک اور بالخصوص اہل ثروت کا فرض ہے کہ وہ ایسی کوشش بلیغ عمل میں لائیں کہ ہمارا ملک ترقی کی دوڑ میں پیچھے نہ رہ جائے۔

ہندوستان میں مابعد جنگ تنظیم اور ترقی کے لئے بڑی سرگرمی ہے۔ نہ صرف سرکاری حلقوں میں بلکہ عام کاروباری حلقوں میں بھی غور و خوض کے مرحلے ایک بعد ایک طے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ تعلیم کی ترقی کے لئے سارجنٹ اسکیم مختلف منازل طے کرنے کے بعد اب حکومت کے پاس پیش کر دی گئی ہے۔ صحت عامہ کی اسکیم بھی مرتب ہو رہی ہے۔ معاشی اور صنعتی ترقی کے لئے سرکاری کمیٹیاں کام کر رہی ہیں لیکن اس دوران میں سر پرشوتم داس ٹھاکر داس کی قیادت میں

ہندوستان کے ۵ اسر برآوردہ مشاہیر نے ایک اسکیم مرتب کرکے شائع کردی ہے۔اس سے قبل بھی انفرادی طور سے دو ایک اسکیمیں ملک میں شائع ہو چکی ہیں۔

ہمارے ملک میں بھی سرکاری کمیٹیاں سرگرمی کے ساتھ مصروف عمل ہیں لیکن ضرورت ہے کہ غیر سرکاری طور پر بھی سرکاری کمیٹیوں کا ہاتھ بٹایا جائے۔ہمارے ملک میں بھی ایسے افراد کی کمی نہیں جو ملک کی ہر جہتی ترقی کا لائحہ مرتب کرسکیں۔ایک خیال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ اس قسم کی اسکیموں کے مرتب کرنے کا کوئی فائدہ اس لئے نہیں ہے کہ ان کے عمل پذیر ہونے کی کوئی ضمانت نہیں ہوسکتی۔ اس کا کوئی خیال نہیں کرنا چاہیئے۔اگر دلیل وحجت اور صحیح اور حقیقی مواد کے ساتھ کوئی لائحہ مرتب ہو تو وہ خود اپنا وزن آپ منوالیگا۔

خوش قسمتی سے ملک کے چند سربرآوردہ اصحاب نے سرکاری ملازمت کی بندشوں سے اپنے آپ کو آزاد کرلیا ہے اور کسی جاگیر و اسٹیٹ میں بازموری کی کوشش کرنے کے بجائے یہ اصحاب ملک کے کاروباری مفاد کی ترقی کے لئے سرگرم ہیں۔ ہر چند ان اصحاب کے قبل از وقت وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوشی حاصل کرلینے سے ملک کے مفاد کو ضرور نقصان پہونچا لیکن درحقیقت یہ ملک کی خوش قسمتی ہے کہ ان افراد کی قابلیت تجربہ اور قوت تنظیم سے اب ملک کو براہ راست فایدہ پہونچیگا۔ان اصحاب کے کاروباری مشاغل اختیار کرنے سے جن فوائد کی توقع ہے اس کا فی الوقت کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا۔

یہ اصحاب اور اس سے قبل جو اصحاب سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں وہ سب باہمی مشورت اور سوچ بچار سے ملک کے سامنے کوئی عملی لائحہ ایسا پیش کرسکتے ہیں جو ملک میں ہر طرف زندگی اور رونق پیدا کرسکے۔

معاشیات کے عملی مسائل ہر ملک میں گویا ہر گھڑی بدلتے رہتے ہیں ان کو مرتب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے چند افراد اپنا وقت مختص کردیں۔ ہندوستان میں اس نوعیت کا کام مسلسل انجام پا رہا ہے۔لیکن یہ کام سب کا سب انگریزی میں ہوتا ہے۔

حالانکہ ان مسائل سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو واقف کرانے کے لئے ضروری ہے کہ خود ملک کی السنہ میں بھی یہ کام وقتاً فوقتاً انجام پاتا رہے خوشی اور مسرت کا مقام ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ معاشیات نے یہ کام سرگرمی سے شروع کیا ہے اور مختلف وقتیہ مسائل پر مختصر لیکن مفید کئی کتابیں مرتب کرا کے شایع کر دی ہیں۔ اسی طرح درسی ضروریات کے لئے بھی وقتاً فوقتاً جدید تالیفوں کی ضرورت ہے۔ ان کو اس طور سے مرتب ہونا چاہیئے کہ نہ صرف طلبہ فائدہ اٹھائیں بلکہ عامۃ الناس کو بھی اپنے معاشی ماحول کا مستند طریقہ سے علم ہو سکے۔ اس کے پیش نظر مجلّہ کی اِس اشاعت سے "ہندوستانی معاشیات کے مبادی" کے نام سے ایک تالیف کی اشاعت کا سلسلہ آغاز کیا گیا ہے۔ اسکے مولف شرف الدین صاحب بی۔اے (عثمانیہ) معتمد مجلس نمایش ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ مملکت آصفیہ کے معاشیات پر اس وقت تک کوئی کتاب مستقل طور سے تالیف نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس کی ضرورت شدید ہے۔ "ہندوستانی معاشیات کے مبادی" میں مملکت آصفیہ کے مسائل بھی شامل کر دیئے گئے ہیں تاکہ ضرورت کا کسی نہ کسی طرح ازالہ ہو۔ اور آیندہ مستقل تالیفوں کے لئے یہ کام پیش خیمہ ہو سکے۔

ہر چند کسی تالیف کو کسی مجلّہ میں قسط وار شائع کرنے سے اسکی افادیت کم ہو جاتی ہے لیکن مجبوری بھی ہے۔ یوں اس تالیف کا ہر باب بجائے خود مستقل ہے اور وہ اپنے ماقبل ابواب سے علحدہ بھی ہو سکتا ہے اس لئے اسکے اس طرح شائع ہونے میں افادیت کے کم ہو جانے کا اندیشہ کم تر ہو جاتا ہے۔

حیدرآباد کا مالیاتی نظام *

از خواجہ شمس الدین صاحب متعلم ایم اے عثمانیہ

تمہید

جس طرح جسم انسانی کو چلانے کے لیے قوت و حرارت ضروری ہے اسی طرح حکومت کی مشنری کو حرکت میں رکھنے کے لیے بھی ایک قوت محرکہ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ حکومت کا مالیاتی نظام ہے۔ حکومت کی مشنری کا مالیاتی نظام پر صرف ذرائع آمدنی اور مدات خرچ کی حد تک ہی انحصار نہیں کرتا بلکہ اس نظام کی خوبی یا خرابی ہی حکومتوں کے عروج و زوال کا باعث بنتی ہے۔ حکومت کے دروبست میں مالیاتی نظام کی اہمیت کا اندازہ اس وقت بخوبی لگایا جاسکتا ہے اگر ہم اس مثال کو پیش نظر رکھیں کہ کس طرح ایک خاندان یا طبقہ کی خوشحالی اور فراغت کا دارومدار اس خاندان کے ذرائع آمدنی اور ان کے موزوں مدات خرچ پر ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ افراد یا جماعتیں اپنی آمدنی کے حساب سے اپنے اخراجات کو گھٹاتی یا بڑھاتی ہیں لیکن حکومتیں اپنے خرچ کو پیش نظر رکھ کر ذرائع آمدنی میں تغیر و تبدل یا کمی بیشی کرتی ہیں۔

جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے مالیاتی نظام کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی جارہی ہے۔ موجودہ زمانے کے ترقی یافتہ ملکوں میں حکومت کی بہت سی خرابیوں کی اصلاح کے لیے مالیاتی نظام کی اصلاح کو اس سمت میں پہلا قدم تصور کیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے عوام کے نمائندے مالیاتی نظام پر سخت قسم کی نگرانی رکھتے ہیں اور اسمبلیوں میں جب بجٹ پیش ہوتے ہیں تو اسی وقت حکومتیں

---

* اس مضمون کی تیاری میں سرکاری رپورٹوں کے علاوہ ڈاکٹر انور اقبال قریشی، ڈاکٹر حبیب حسین، ڈاکٹر [illegible] ٹامس اور پروفیسر [illegible] کے ان مضامین سے مدد لی گئی ہے جو مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

سب سے زیادہ ہدف ملامت بنتی ہیں۔

مالیاتی نظام کے اچھے یا برے ہونے کا انحصار چند خصوصیات اور خرابیوں پر ہے۔ اور زمانے کی ترقی کے ساتھ یہ معیارات بھی بدلتے جا رہے ہیں۔ اب سے کچھ زمانہ پہلے جب کہ عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل درآمد تھا حکومت کے فرائض صرف بیرونی حملہ آوروں سے ملک کی حفاظت اور اندرونی امن وامان برقرار رکھنے تک محدود تھے اور اسی لئے صرف اسی مالیاتی نظام کو سراہا جاتا تھا جس کے اخراجات کم ہوں اور جو اپنے اخراجات کی پابجائی کے لئے کم سے کم محاصل عاید کرتی ہو چنانچہ فرانسیسی معاشی، جے، بی سے (J. B. Say) نے اسی نظریے کے تحت اچھے نظام مالیہ کی یوں تعریف کی تھی کہ "مالیات کے تمام منصوبوں میں سب سے بہتر وہ ہے جس میں کم سے کم خرچ کیا جائے اور سب سے اچھے محاصل وہ ہیں جو مقدار میں بہت قلیل ہوں"۔ لیکن اب حالات پلٹا کھا چکے ہیں عدم مداخلت کی جگہ اسٹیٹ کنٹرول نے لے لی ہے حکومت کے فرائض اور ذمہ داریوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ عوام یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اجارہ داروں اور سرمایہ داروں کی خود غرضی اور لوٹ کھسوٹ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی یہی صورت ہے کہ حکومت ان کے مفاد کی حفاظت کے لئے معاشی معاملات میں زیادہ سے زیادہ مداخلت کرے اور اپنے کنٹرول کے ذریعہ معاشی قوتوں کو عوامی مفاد کے خلاف بے راہ روی سے باز رکھے اس لحاظ سے حکومت کے فرائض اور ذمہ داریوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ بیرونی حملوں سے حفاظت اور اندرونی امن وامان کی برقراری کے علاوہ تعلیم، صحت عامہ، تجارت، ونیز معاشی ومعاشرتی فلاح وبہبود کے ایسے کام بھی حکومت کے ذمہ ہیں جو ملک کے باشندوں کی دماغی، جسمانی، اور معاشی صلاحیتوں کو اجاگر کرتے ہیں۔

موجودہ دور کی حکومتوں کے ذرائع آمدنی اور مدات خرچ بہت وسیع ہوتے ہیں اور اسی نظام مالیہ کو اچھا سمجھا جاتا ہے جو ملک کے باشندوں کی خاطر زیادہ سے زیادہ خرچ کرے۔ مالیات کا یہ قدیم تصور کہ حکومت کو صرف ایسے کاموں پر روپیہ صرف کرنا چاہیئے جو تکمیل کے بعد حکومت کو مالی فائدہ

پہنچا سکیں غلط ثابت ہو چکا ہے۔ حکومت دولت نافع پہنچانے والے کاموں کے علاوہ ایسے کاموں پر بھی بے دریغ روپیہ صرف کرتی ہے جو حکومت کو کوئی فوری مالی فائدہ نہیں پہنچاتے بلکہ ملک اور اس کے باشندوں کو دور رس اور دیرپا فائدوں سے متمتع کرتے ہیں، ملک کو خوشحال بناتے ہیں اور باشندوں کی معاشی اور دماغی صلاحیتوں کو فروغ دے کر ان کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ پیدائش دولت میں اضافے کا باعث بنیں اور ان کو محصول ادا کرنے کی صلاحیت زیادہ ہو۔ تعلیم، صحت عامہ، آبپاشی، ذرائع حمل و نقل ان کاموں کی چند مثالیں ہیں۔ ذرائع آمدنی کی وسعت اور تنوع پذیری اچھے نظام مالیہ کی خصوصیات ہیں۔

محاصل اس طریقے سے عائد کئے جائیں کہ ان سے ملک کے مختلف طبقات میں دولت کی غیر مساوی تقسیم کو کم کیا جا سکے اس کے لئے ایسے محاصل جن کا بار راست محصول ادا کنندہ پر پڑے اور وہ اس بار کو دوسروں پر منتقل نہ کر سکیں عائد کئے جائیں اس قسم کے محصول کو محصول بلا واسطہ کہتے ہیں مثلاً (انکم ٹیکس اور محصول وراثت وغیرہ) محصول بالواسطہ جس کا بار محصول ادا کنندہ دوسروں پر منتقل کر سکتا ہے کم سے کم عاید کئے جائیں مثلاً دیا سلائی اور نمک کا محصول۔ محصول ادا کرنے والا تاجر اس محصول کے بار کو قیمتوں میں اضافہ کر کے صارفین پر منتقل کر سکتا ہے غریب طبقے جن کی آمدنی بہت کم ہوتی ہے زیر بار ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ بار دولت مند طبقہ پر پڑنا چاہئے اس لئے نظام محاصل کی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ محاصل کا یہی طریقہ رائج ہو محصول بالواسطہ اگر عاید بھی کئے جائیں تو ضروریات زندگی پر نہ ہوں بلکہ آسائشات و تعیشات کی چیزوں پر تاکہ ان محاصل کی آمدنی غریب طبقے کی خوشحالی کے لئے صرف کیا جائے۔ محاصل پیدائش دولت میں رکاوٹ بننے کے بجائے مدد و معاون ثابت ہوں۔ اس ملک کا مالیاتی نظام قابل تعریف ہو سکتا ہے جہاں کا نظام زر مستحکم اور لچکدار رہے تاکہ قومی ضروریات کی ہم آہنگی کر سکے۔ حکومت ملکی نظم و نسق اور حفاظتی انتظامات پر کم اور افادی یا معاشی انتظامات پر زیادہ خرچ کرے تاکہ ملک کے تمام افراد بہرہ ور ہوں اور یہ چیز قومی دولت میں اضافے کا باعث بن سکے

ان اصولوں کی روشنی میں حیدرآباد کے مالیاتی نظام کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکیگا کہ آیا حیدرآباد کا مالیاتی نظام زمانے کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق ہے یا اسی فرسودہ روش پر چل رہا ہے جو دورِ وسطیٰ سے متعلق ہے۔

حیدرآباد کے مالیاتی نظام کی قدیم تاریخ

حیدرآباد کے مالیاتی نظام کی قدیم تاریخ سے واقفیت اس کے ارتقائی مطالعے میں آسانی کا باعث بن سکے گی اور یہ معلوم ہو سکے گا کہ اب تک نظام نے کتنی ترقی کی ہے۔ مملکت حیدرآباد کی آمدنی اعلیٰحضرت غفران مکاں کی تخت نشینی کے وقت صرف چار کروڑ روپے تھی۔ جس سے قبل ہی حالت خراب ہونے کی وجہ سے حکومت کی ساکھ بہت اٹھ گئی تھی اور اس لیے حکومت کو بڑھتی ہوئی شرح سود پر بھی قرضہ حاصل کرنے کے لئے کوئی چارہ نہ تھا بلکہ مقروض رہنا پڑتا تھا اور اس طرح سے ساہوکاروں کا دور دورہ تھا۔ حکومت حیدرآباد کو فضول جنگوں اور جھگڑوں کی وجہ سے خواہ مخواہ زیر بار ہونا پڑا۔ قرض لے کر کاروبار چلانا ریاست کی مالیاتی پالیسی کا مستقل جزو بن گیا۔ حکومت پامر کمپنی سے ۲۴ فی صد شرح سود پر قرض لیتی تھی ۱۸۲۴ء تک حکومت اس کمپنی کی ۶۰ لاکھ کی مقروض تھی اور چونکہ اس کمپنی کا تعلق ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعض اعلیٰ عہدہ داروں سے تھا اس لئے اس کمپنی کو بہت سی مراعات حاصل تھیں اور بہت سے زرخیز علاقے کمپنی نے اپنے قبضہ میں لے لئے۔ چنانچہ بطور ضمانت کمپنی کو شمالی سرکار کی ۷ لاکھ سالانہ رقم معاف کر دی گئی تھی۔ پامر کمپنی کے علاوہ حکومت مجبور تھی کہ بڑھتے ہوئے اخراجات پورے کرنے کے لئے مہاجنوں سے بھی قرض لے۔ اس قرض کی ادائی میں نواب سکندر جاہ بہادر نے ایک کروڑ اور نواب ناصر الدولہ بہادر نے ۸۰ لاکھ روپے دیئے لیکن اس کے بعد بھی راجہ چندولال کی علیحدگی کے وقت ۱۸۴۳ء میں دو کروڑ کا قرض تھا۔

انیسویں صدی میں حیدرآباد کی مالیاتی تاریخ سوائے اس زمانے کے جبکہ سالار جنگ برسرِ اقتدار تھے اپنے بدترین حالت میں تھی مالیہ کا نہ تو کوئی سلجھا ہوا نظام تھا اور نہ کسی اصول کی

پابندی کی جاتی تھی غرض ہر قسم کی بد انتظامی پھیلی ہوئی تھی سرکاری خزانہ کا وجود ہی نہ تھا آمدنی اور خرچ
کے حسابات غیر مکمل تھے ذرائع آمدنی اختلاط کی حالت میں تھے اور اخراجات میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔
حکومت کا اعتبار کبھی کا ختم ہو چکا تھا حکومت کو قرض حاصل کرنے میں دقت ہوتی تھی کئی اضلاع
قرض دہندوں کے قبضہ میں رہتے تھے ایسا ہوتا کہ ان علاقوں پر قبضہ رکھنے کے لئے ہر جائز و ناجائز
کوشش کرتے تھے حسابات کو وہ اتنے پیچیدہ اور ناقابل فہم بنا دیتے تھے کہ حکومت ان قرضوں کو
بے باق کرنے اور مکفول شدہ علاقہ جات کو حاصل کرنے کی … ناکافی تھی۔

بالآخر سنہ ۱۸۵۳ء میں سر سالار جنگ اول کی … درست اور … کوششوں
کی بدولت حکومت کے مالیاتی نظام میں اصلاح … فینانس
کی ایک کمیٹی کی مدد سے انھوں نے تمام خرابیوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور بڑی حد تک
کامیاب بھی ہوئے سر سالار جنگ اول کی کوششوں سے ملک کی ساکھ میں اضافہ ہوا قرض
کا بوجھ ہلکا کیا گیا۔ رہن شدہ اضلاع واپس لئے گئے … طریقہ کو بدلا گیا۔
موازنے کے طریقہ کو رواج دیا گیا اور ہر ضلع میں سرکاری خزانے قائم کئے گئے۔

سنہ ۱۸۸۳ء تک حیدرآباد کے مالیہ کی حالت غیر متوازن ہی رہی اور ابھی سدھرنے بھی
نہ پایا تھا کہ سنہ ۱۹۰۰ء کے زبردست قحط نے ایک نئی مصیبت سے دوچار کر دیا اور اس سال
مملکت کے موازنے میں ۷۴ء ۱۱۴ لاکھ کا خسارہ پڑا اور حکومت حیدرآباد مجبور ہوئی کہ
حکومت برطانیہ سے اپنے مالیاتی نظام کو استوار کرنے کے لئے ۴۰ لاکھ کا قرض حاصل کرے۔
سنہ ۱۹۰۲ء میں مزید ۹۰ء ۴۷ لاکھ کا خسارہ ہوا اور اسی سال سر کیسن واکر نے حکومت حیدرآباد
کے محکمہ مالیہ کی باگ ڈور اپنے قابل ہاتھوں میں سنبھالی اور اپنے فہم و تدبر سے مالیہ کو مستحکم کرنے کی
کوشش کی سب سے پہلے انھوں نے ہاتھ … زرعی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے
ایک جدید … [illegible] … قائم کیا سر کیسن واکر … میں موازنے تیار رہے۔
سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۱۱ء تک اوسط آمدنی ۴۹۴ لاکھ سالانہ اور اوسط خرچ ۴۳۶ لاکھ سالانہ

رہا مزید برآں ۲۲۵ لاکھ روپے کا قرضہ بے باق کیا گیا اور ۱۲۹ لاکھ روپے نقد خزانے میں داخل کیے گئے۔ سر کیسن واکر کے بعد ۱۹۱۱ء میں سر ریجنالڈ گلانسی مالیہ کی کشتی کے ناخدا مقرر ہوئے یہ دور بھی مالیاتی ترقی میں یادگار حیثیت رکھتا ہے اس زمانے میں قیمتیں برابر بڑھ رہی تھیں۔ سنہ ۱۹۱۰ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک کے زمانے میں حکومت کی اوسط آمدنی ۴۹۵ لاکھ روپے سالانہ اور اوسط خرچ ۴۵۵ لاکھ سالانہ تھا اور اس طرح سے مزید ۲۲۱ لاکھ روپے حکومت کے خزانے میں داخل کیے گئے اور حیدرآباد کے مالیاتی نظام کی عمارت نسبتاً مستحکم بنیادوں پر قائم ہو گئی۔

نیا دور سر اکبر کی اصلاحات

جدید حیدرآباد کے مالیاتی نظام کے استحکام کی ابتداء سر اکبر مرحوم سے ہوتی ہے اور حیدرآباد کا ترقی یافتہ نظام مالیہ اُن ہی کی اصلاحات کا مرہون منت ہے۔ یوں تو سر اکبر کی کوششیں اس خصوص میں سنہ ۱۹۰۵ء سے شروع ہوتی ہیں جب کہ ان کو مالیہ کے کام میں سر کیسن واکر کو مدد دینے کے لئے بلایا گیا تھا اور صدر محاسب مقرر کیا گیا تھا لیکن ان کو آزادی کے ساتھ اپنے عزائم کو بروئے کار لانے کا موقعہ اُس وقت ملا جب وہ سنہ ۱۹۲۱ء میں حکومت حیدرآباد کے وزیر مالیہ مقرر ہوئے۔ سر اکبر مرحوم نے حیدرآباد کے مالیہ میں دو انتہائی فائدہ مند اور دور اندیشانہ اصلاحات عمل میں لائے۔ ایک تو وہ مشہور سالانہ سبیل بندی کا طریقہ ہے جس نے سر اکبر کو بحیثیت ماہر مالیات ہر جگہ مشہور کر دیا اور دوسرے مختلف اغراض کے لئے بیش قدر رقم کے ذخیرہ ہائے محفوظ کا قیام تھا۔ ان دو امور کے متعلق تفصیلی معلومات آگے پیش کی جائیں گی۔ ان اصلاحات کی وجہ سے مالیاتی نظام میں جو خرابیاں تھیں وہ بہت بڑی حد تک دور ہو گئیں۔ اور حکومت کا مالیہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔

سنہ ۱۹۴۰ء کے موازنہ کی رو سے حیدرآباد کی سالانہ آمدنی ۹ کروڑ روپے سے کچھ اوپر تھی اور اہم ذرائع آمدنی حسب ذیل تھے۔

مالگزاری	۳ کروڑ	۱۰ لاکھ

آبکاری ۔ ۱ کروڑ ۵۷ لاکھ

ریلوے ۔ ۱ کروڑ ۳۵ لاکھ

کروڑ گیری ۔ ۱ کروڑ ۲۰ لاکھ

سنہ ۱۳۵۲ ف میں نئے صدرالمہام فینانس آنریبل مسٹر غلام محمد نے جو موازنہ پیش کیا اس میں آمدنی اور خرچ بالترتیب ۹۴۳ء۲۰ لاکھ اور ۹۸۳ء۱۳ لاکھ تھا جس سے ۴۰ء۸ لاکھ کا خسارہ نکلتا ہے۔ بجٹ نوٹ میں بتایا گیا ہے کہ اندازہ موازنہ میں بلا واسطہ اور بالواسطہ جنگی اخراجات مثلاً فوج، اے، آر، پی۔ اور گرانی الونس کے لئے ۱۹۳ء۰۱ لاکھ نیز زائد از موازنہ خرچ اور دوسرے غیر معمولی اخراجات کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے جن کی پابجائی سررشتہ واری بچتوں اور جمع شدہ فاضلات سے ہوگی۔ معمولی اور غیر معمولی مصارف کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو تخمینی مصارف اور تخمینی حاصل میں ۱۹۷ء۹ لاکھ کا تفاوت موجود ہے جس کی پابجائی ضروری ہے چنانچہ سررشتہ داری بچتوں سے ۸۰ء۴۷ لاکھ اور جمع شدہ فاضلات کی سلک سے ۳۴۳ء۲۰ لاکھ سے اس کی تلافی کسی حد تک ہو جائے گی۔ ۸۲ء۳۴ لاکھ کی بقیہ رقم جو موازنہ میں توازن برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے ابواب مصارف میں تخفیف اور نیز دوسری تدابیر کے ذریعہ کی جائے گی۔

اس طرح سے کئی سال کے بعد سنہ ۱۳۵۲ ف میں حیدرآباد کا موازنہ غیر متوازی رہا لیکن سرکاری رپورٹ دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ سنہ ۴۹ ف سے سنہ ۵۱ ف کے تینوں موازنے غیر متوازن تھے جیسا کہ بجٹ نوٹ میں بتایا گیا ہے کہ "خالص مالیاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو سنہ ۴۹ ف سے سنہ ۵۱ ف تک تینوں سال کے موازنوں کو خسارہ دار موازنہ قرار دینا ہوگا۔ اس لئے کہ سالہائے مذکور کے جاریہ محاصل بمقابل مصارف کے بہت کم رہے اور زائد از پانچ کروڑ کی حد تک اس تفاوت کی پابجائی سالہائے ماسبق کی سررشتہ واری سلکوں یا مجموعی فاضلات سے ہوتی رہی"۔

سنہ ۱۳۵۳ ف کا موازنہ آنریبل مسٹر غلام محمد صدرالمہام مالیات کا دوسرا کامیاب موازنہ ہے۔ جس میں مدات آمدنی و خرچ مقابلتاً بہت کچھ بڑھ گئے ہیں۔

حصۂ معاشیات

۱

مجلۂ طیلسانین عثمانیہ

	آمدنی	خرچ	بچت
مرحلہ اندازۂ بجٹ [illegible]	۱۰۰۱۱۲ [illegible] لاکھ	۳۴۶۰۰ لاکھ	۴۵۶۶ لاکھ
مرحلہ اندازۂ [illegible]	۲۰۹ [illegible]	۱۳۱ [illegible] ۱۲۹	۸۶۸ ″

[illegible] نئے ابواب [illegible] آمدنی و خرچ

آمدنی		خرچ	
۱۔ مالگزاری [illegible]	۵۴ لاکھ	جنگی مصارف [illegible]	۱۰ لاکھ
۲۔ ریلوے	۵۱ ″	[illegible]	۳۹ ″
۳۔ آبکاری	[illegible]	۳۔ عمارات و مواصلات	۸۲ ″
۴۔ کروڑگیری	۲۵ ″	[illegible]	۵۵ ″
۵۔ محصول [illegible]	۵ ″	[illegible]	۵۰ ″
۶۔ تنباکو اور سگریٹ [illegible]	۴۲ ″	۶۔ آبادیات و حفظان صحت عامہ	۲۶ ″
۷۔ زرِ کاغذی	۶۰ ″	۷۔ پنشن	۲۶ ″
۸۔ سود	۲۰ ″	۸۔ محفوظ [illegible] قسط	۱۵ ″
۹۔ جنگلات	۳۰ ″	۹۔ زراعت	۱۰ ″
۱۰۔ برار سے آمدنی	۲۵	۱۰۔ [illegible] امدادات	۶ ″

نئے [illegible] مالیاتی [illegible] میں ایک [illegible] ترقی پسند دور کی ابتداء ہوتی ہے جس کی خصوصیات [illegible] کی جائے گی۔

مالیہ کی [illegible]

سررشتہ [illegible] کی [illegible] میں ایک بہت بڑی نظریاتی کامیابی تھی [illegible] حکومت حیدرآباد کے مالیاتی نظام [illegible] اس [illegible] لیا گیا جس [illegible] کے ذریعہ

ہر محکمہ کی اہمیت کے لحاظ سے اس کے خرچ کے لئے احتیاط کے ساتھ اندازہ کرکے تین سال کے لئے رقم مقرر کر دی جاتی ہے اور ہر سال جس قدر رقم بچ رہتی ہے وہ سوخت نہیں ہوتی بلکہ محکمہ کو حق رہتا ہے کہ وہ آیندہ سال خرچ کرے۔ لیکن سہ سالہ تہد کے آخری دن تک جو رقم خرچ نہیں ہونے پاتی اس رقم کی تقسیم عمل میں آتی ہے اس رقم کا نصف حصہ خزانہ سرکاری میں داخل ہوتا ہے اور نصف حصہ ان ہی سررشتہ جات کے سپرد کیا جاتا ہے اس طریقہ سے ایسے تعمیری کام کرنے والے محکموں کے کام میں آسانی ہوئی جن کو طویل المیعاد اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک کثیر اور مقررہ رقم کی ضرورت پڑتی تھی اس طریقے سے محکموں کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا اور کارکردگی بڑھی اور چونکہ یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ بچتوں میں محکموں کا بھی حصہ ہوگا اس لئے محکمے اندھا دھند خرچ کرنے کی بجائے بچانے لگے۔ اس طریقے کے رواج سے پہلے محکمے اس سے قطعاً بے خبر رہتے تھے کہ ان کو اپنے خرچ کیلئے آیندہ سالوں میں کتنی رقم سرکاری خزانے سے ملے گی۔ اس لئے وہ اس غیر یقینی حالت کی وجہ سے کسی دوررس اور مفید اسکیم کو تیار کرنے یا روبہ عمل لانے کی طرف راغب نہ ہوتے تھے لیکن سہ سالہ تہد کے ذریعہ ان کو اپنی آمدنی کا اندازہ ہوگیا اور مفید اسکیموں کے ذریعہ ملک کی ترقی میں مدد پہنچائی گئی۔

سر اکبر حیدری مرحوم کی اس کامیابی کی وجہ سے ملک میں ترقی کی روح دوڑنے لگی اور خود خسرو دکن نے فرمان مبارک کے ذریعہ سر اکبر کی ان الفاظ میں تعریف فرمائی تھی۔

"سر اکبر حیدری نے اپنے فینانس ممبری کے زمانے میں طریقہ سیل بندی کو رائج کرنے کے بعد جو موازنہ کا توازن قائم رکھ کر ہر صیغہ کی ترقی کے لئے معتدبہ رقم ہر سال شریک موازنہ کرکے ملک کی ترقی میں جو نمایاں حصہ لیا ہے اس سے بخوبی واقف ہوں اور ان کے تدابیر و دوراندیشی کی قدر کرتا ہوں ان سے میری خوشنودی کا اظہار کیا جائے۔"

۱۳۵۳ف سے سہ سالہ موازنہ کی بجائے سالانہ موازنہ کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور اس میں سہ سالہ موازنہ کی امتیازی خصوصیات اور فوائد کو برقرار رکھا گیا ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے

[redacted]

سہ سالہ موازنہ کا طریقہ ایسے محکموں کے لئے ضروری تھا جنہیں طویل المیعاد رقموں کی ضرورت تھی۔ تاکہ وہ کافی محفوظات قائم کرکے اپنی اسکیموں کو روبہ عمل لاسکیں اور ان میں توسیع کرسکیں لیکن معمولی خرچ کنندہ محکموں کے لئے اس اسکیم کی قطعاً ضرورت نہ تھی اور اسی لئے اُن کو جو رقم حاصل ہوتی تھی وہ اندھا دھند اور فضول مدات پر خرچ کردیتے تھے تاکہ تعہد کے اختتام پر یہ رقم ان کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ ان ہی خرابیوں کے مدنظر اس طریقہ کو ختم کردیا گیا۔ دوسری طرف ملک کی ترقی میں اس وجہ سے کوئی رکاوٹ نہیں پڑ سکتی کہ تعمیری محکموں کے لئے رقم دورِ تعہد کی سہ سالہ مدت سے بھی زائد عرصہ تک برقرار رہ سکتی ہے۔ قدیم طریقہ کو ختم کرنے کا دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ دستوری اصلاحات کے بعد مجلس مقننہ خود سالانہ موازنوں کو ترجیح دیگی تاکہ وہ حکومت کے مسالکِ آمدنی و خرچ پر نگرانی کے ذریعہ سے اثر ڈال سکے۔ سال حال کے بجٹ نوٹ میں مالیاتی نظام میں اس اہم ترمیم کے متعلق حسب ذیل توقعات قائم کی گئی ہیں " نئی اسکیم کا فائدہ دوگونہ ہے ایک تو اس میں قدیم اسکیم کی آزمودہ اور کارآمد خصوصیات برقرار رکھی گئی ہیں اور دوسرے زیادہ موثر مالیاتی نگرانی اور نیز مصارف پر نگرانی کا اہتمام کیا گیا ہے یہ نگرانی اولاً خود سررشتوں کی طرف سے اور بالآخر محکمۂ فینانس کی جانب سے عمل میں آئے گی اس طرح جو سادگی پیدا ہوگی وہ سررشتوں کے تعاون کے ساتھ حکومت کے مالیاتی اور موازنے کے انتظامات کو جدید اصولوں کے مطابق بنانے میں حد درجہ مفید ثابت ہوگی۔"

حیدرآباد کے محفوظ ذخیرے

حیدرآباد کے مالیاتی نظام کی یہ قابل تعریف خصوصیت ہے کہ اس میں مختلف اغراض کے لئے کثیر رقم کے محفوظ ذخیرے قائم کئے گئے ہیں تاکہ ایک طرف تو ان ضروری کاموں کی تکمیل میں کوئی مالی دشواری نہ پیش آئے اور دوسری طرف مستقل مدات خرچ میں کمی کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ اس کے علاوہ یہ ذخیرے اس لئے بھی حکومت کی طمانیت کا باعث ہیں کہ ان سے وقت ضرورت آمدنی اور اخراجات کے تفاوت کو دور کیا جاسکتا ہے۔ حکومت حیدرآباد

پاس حسب ذیل محفوظ ذخیرے ہیں۔

۱۔ قرضوں کی ادائی کا ذخیرۂ محفوظ	۳۳،۵۴ لاکھ
۲۔ قحط سالی کا ذخیرۂ محفوظ	۲۹۳،۳۸ "
۳۔ انڈسٹریل ایڈ ٹرسٹ فنڈ	۳۱۹،۱۵ "
۴۔ سکۂ عثمانیہ کے استحکام کا ذخیرہ	۳۶۱،۶۲ "
۵۔ زر کاغذی کا ذخیرۂ محفوظ	۵۰۰،۰۰ "
۶۔ محکمہ جاتی ذخیرۂ محفوظ	۱۸۹،۹۴ "
۷۔ امانتوں اور متفرقات کا ذخیرۂ محفوظ	۶۴،۶۷ "

ریلوے کی خریدی کے لئے ایک ذخیرۂ محفوظ قائم کیا گیا تھا جس میں ۴۳،۵۶،۸ لاکھ روپے جمع ہونے کے بعد ریلوے خریدی گئی۔

موجودہ زمانے کی ہر ترقی یافتہ حکومت اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قرض لیتی ہے۔ حکومت حیدرآباد نے جو قرض لیا ہے اس کی ادائی کے لئے اس نے ایک ذخیرۂ محفوظ قائم کر رکھا ہے جس میں ہر سال آمدنی سے ایک خاص مقدار میں رقم جمع کی جاتی ہے اور اس طرح سے حکومت کے عام موازنے اور مدات خرچ پر ان قرضوں کا زیادہ بار نہیں پڑتا اور جیسے جیسے ان قرضوں کی ادائی کا وقت قریب آتا ہے ویسے ویسے یہ ذخیرہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس سے قرضوں کو بے باق کیا جاسکے۔

دوسرا اہم ذخیرۂ محفوظ قحط سالی کا ہے۔ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے زراعت کے غیر یقینی حالت نے قحطوں کو ہندوستان کی معیشت کا ایک لازمی جزو بنا دیا ہے۔ ذرائع حمل و نقل کی پسماندگی کی وجہ سے ان قحطوں کی شدت ہندوستان میں ہمیشہ سے تباہ کن رہی ہے اور اس ترقی یافتہ زمانہ میں بنگال جب بلائے عظیم سے دوچار ہے اس کے پیش نظر قحط سالی کے ذخیرۂ محفوظ کی اہمیت خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔

قحط سالی کے فنڈ میں ۵۹ ء ۱۶ ۴ لاکھ روپے رکھے گئے تھے جس میں سے ۲۱ ء ۱۲۴۳ لاکھ روپے خرچ کئے گئے ہندوستان کی کسی دوسری ریاست میں سوائے اندور کے اس قسم کا کوئی فنڈ نہیں ہے اور اندور میں بھی یہ فنڈ صرف ۵۰ ہزار روپے کا ہے۔ اس ذخیرے سے قحط سالی کے زمانے میں معمولی آمد و خرچ میں کمی بیشی کئے بغیر قحط زدہ لوگوں کے لئے روزگار فراہم کیا جاتا ہے۔

تیسرا اہم ذخیرہ انڈسٹریل اینڈ ٹرسٹ فنڈ کا ہے یہ حیدرآباد کی صنعتی ترقی میں بہت ممد ثابت ہوا ہے اور آئندہ بھی اس سے بہت سی خوش آیند توقعات وابستہ ہیں اس فنڈ کے ذریعہ سے مختلف صنعتوں میں حکومت اپنا روپیہ لگا کر ان کی ساکھ بڑھاتی ہے اور اُن کو مشنری اور دیگر آلات خریدنے اور اپنا کاروبار وسیع کرنے کے لئے معقول شرح پر قرض مہیا کرتی ہے۔ حکومت اب تک ملک کے مختلف صنعتی کاروبار میں ۷۲ لاکھ ۱۵ ہزار روپے لگا چکی ہے اور کئی لاکھ روپے بطور قرض دے چکی ہے۔ حیدرآباد میں بہت سے کاروبار کسی نہ کسی طرح حکومت کے ممنون احسان ہیں۔

چوتھا ذخیرہ محفوظ سکۂ عثمانیہ کے استحکام کا ہے۔ حیدرآباد کا خود اپنا ایک زر ہے۔ حالی اور کلدار کے درمیان شرح مبادلہ کو برقرار رکھنے کے لئے اس ذخیرہ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی غرض سے بمبئی میں ایک ذخیرہ کلدار قائم کیا گیا جو ۱۹۳۱ء میں انگلستان کے معیار طلا چھوڑنے کے بعد انگلستان کے زر اور بیرونی زروں کی قدر مبادلہ برقرار رکھنے کے لئے ۱۹۳۲ء میں جو قیام مبادلہ فنڈ (Exchange Equalisation Fund) قائم کیا گیا تھا۔ اُسی خطوط پر کام کرتا تھا۔ قیام مبادلہ فنڈ کی تو ساری دنیا میں زر کے معاملات میں ایک جدت کی حیثیت سے شہرت ہو گئی لیکن ذخیرہ کلدار کے کام سے شاید پڑھے لکھے حیدرآبادی بھی ناواقف ہوں گے ذخیرہ محفوظ استحکام سکۂ عثمانیہ حالی و کلدار کے مابین شرح مبادلہ برقرار رکھنے کا کام کرتا ہے۔

۱۳۵۲ف کے موازنے میں بھی مزید ذخیرے قائم کئے گئے ہیں مثلاً پست اقوام کی تعلیم و ترقی کے لئے ایک لاکھ روپے کے سرمایہ سے ایک فنڈ قایم کیا گیا جس میں آیندہ اور رقم شامل کی جائے گی۔ دوسرا اہم اقدام دیہی خوشحالی کے ٹرسٹ فنڈ کا قیام ہے

جس کے لئے سنہ ۱۳۵۲ ف کے موازنے میں ۳ لاکھ کی گنجائش رکھی گئی ہے اس میں ہر سال ڈیڑھ لاکھ کا اضافہ کرکے سنہ ۱۳۵۵ ف میں اس کی مقدار ۹ لاکھ کر دی جائے گی۔ اس سرمایہ سے تعلیمات، زراعت، امداد باہمی، علاج حیوانات، طبابت اور صحت عامہ جیسے متعدد محکموں کی سرگرمیوں میں مزید امداد دی جائے گی اس کے علاوہ یہ تجویز بھی ہے کہ انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ اور سرمایہ امداد تجلط دونوں اس سرمایہ کو ایک لاکھ روپے سالانہ ادا کریں تاکہ جو امور ان دونوں سرمایوں کے مقاصد سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں ان کی تکمیل اور ترقی پر یہ رقم صرف کی جائے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے سنہ ۱۳۵۰ ف میں ۱/۲ لاکھ کا زائد عطیہ دیا گیا تھا۔ سنہ ۱۳۵۱ ف میں ایک لاکھ کا اضافہ کیا گیا اور سنہ ۱۳۵۲ ف میں ۱۰ لاکھ کا اضافہ کیا گیا اس طرح سے اس ذخیرے کو ۱/۲ ۱۲ لاکھ تک بڑھایا جائیگا اور ابتدائی تعلیم کو مفت اور عام بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

سنہ ۱۳۵۳ ف یعنے سال حال مزید تین ضروری ذخیروں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں مشہور ماہر معاشیات لارڈ کینز نے ایک پمفلٹ ذرائع خوشحالی (Means to Prosperity) کے عنوان سے شائع کیا تھا جس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ کساد بازاری کے زمانے میں حکومتوں کو چاہیئے کہ وہ موازنوں کو متوازن رکھنے کی خاطر اخراجات کو نہ گھٹائیں بلکہ اپنے موازنوں کو غیر متوازی ہونے دیں تاکہ بے روزگاری بڑھنے نہ پائے اور اس کا سدباب ہو جائے۔ لارڈ کینز کا اپنے نظریے مضروب فیہ (Multiplier) کے تحت یہ خیال ہے کہ اگر حکومت کساد بازاری کے زمانے میں ایک لاکھ کی حد تک اپنے اخراجات کم کرتی ہے تو اس سے نہ صرف ایک لاکھ بلکہ تین لاکھ کی حد تک مزید بے روزگاری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کینز کے نظریے نے معاشی تخیل میں ایک جدت کی حیثیت سے مقبولیت عامہ حاصل کرلی لیکن ایک حد تک عملی امکانات کے نقطۂ نظر سے یہ نظریہ محدود تھا کیونکہ اس میں کوئی ایسے ذرائع نہیں بتائے گئے تھے جن کی وجہ سے کساد بازاری کے زمانے میں موازنوں کو غیر متوازن رکھا جائے۔ اس عملی دقت کو دور کرکے اس نظریئے کو مکمل کرنے کا سہرا ہمارے

نئے صدر المہام فینانس کے سر ہے جنھوں نے ذخیرۂ محفوظ برائے استحکام موازنہ کے نام سے ایک نیا ذخیرہ قائم کر کے علمِ معاشیات کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

سالانہ موازنہ کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اسکی وجہ سے بچت کی رقموں اور سابق میں جمع شدہ سلکوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے گا تاکہ مالیہ کی مکمل تصویر ہمیشہ نظر کے سامنے رہے اس فنڈ میں ہر مالی سال کے ختم پر تمام ممکنہ بچتیں جمع کر دی جائیں گی اور اس طرح سے یہ خرابی دور کر دی جائے گی۔ جیسا کہ اس سے پہلے مختلف سررشتہ اپنی پرانی بچت کو آیندہ سال کی آمدنی میں شامل کر لیتے تھے اور ان کے حساب میں اصل آمدنی کے بجائے مصنوعی آمدنی دکھائی جاتی تھی اور پھر جب اس آمدنی کو بنیاد بنا کر خرچ کا منصوبہ بنایا جاتا تھا تو ظاہر ہے کہ سال آیندہ کا خرچ سال آیندہ کی آمدنی سے بڑھ جاتا تھا اور یہ چیز مملکت کے مجموعی مفاد کے خلاف تھی۔ ایسے ہنگامی حالات کے لئے تمام سررشتوں کی سلکوں اور سررشتہ واری محفوظات کی سوحنت شدنی رقموں کو یکجا کر کے ۶۰ء ۵۴ ۱۶۰ لاکھ روپے کی ایک مد محفوظ برائے استحکام موازنہ قائم کی گئی ہے جن اغراض کے لئے اس فنڈ سے رقوم حاصل کرنے کی اجازت دی جاسکے گی۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جنگ سے عاید شدہ مزید اخراجات پورے کرنے کے لئے جو سال کے معمولی آمدنی سے پورے نہ ہو سکتے ہوں۔

۲۔ موازنہ میں خسارہ کی صورت میں پابجائی کے لئے۔

۳۔ اختتام جنگ پر آمدنی میں جس کمی کا اندیشہ ہے اسکی بنا پر آنے والی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے کیونکہ اس وقت یہ ممکن نہ ہوگا کہ ایک قلیل المدت اطلاع پر خرچ کو اس قدر گھٹا دیا جائے کہ وہ تخفیف شدہ آمدنی کی سطح پر لایا جاسکے۔

۱۳۵۱ف کے اختتام پر ذخیرہ محفوظ برائے استحکام سکہ عثمانیہ میں ۸۲ء ۳۶۱ لاکھ روپے جمع تھے اگر اس میں منافع سکہ سازی اور تمسکات پر سود کی رقم کو شامل کیا جائے تو یہ رقم ۸۰ء ۴ لاکھ یعنے ۴½ کروڑ ہوگی۔ یعنے ۲ کروڑ کے چاندی کے سکوں کے لئے ۴½ کروڑ روپے

بطور طمانیت کے رکھے گئے ہیں اور اس مقصد کے لئے ۳ کروڑ کی رقم بہت کافی ہوگی۔
اور اس طرح سے زائد رقم اور زائد آمدنی ترقیات مابعد جنگ کے فنڈ میں منتقل کردی جائیگی۔
موجودہ مالیاتی سال کے اختتام تک اس میں ۳ کروڑ روپے ہوں گے یہہ ذخیرہ محفوظ دیہی
اور صنعتی ترقی اور دوسری نفع آور اور قومی تعمیری سرگرمیوں کے لئے مفید اسکیموں کے مصارف
پورے کرنے کے لئے مخصوص کردیا جائے گا۔ اس خصوص میں قدم اٹھاکر حکومت حیدرآباد نے
اپنی بیداری کا ثبوت دیا ہے اور حکومت ہند اور دیسی ریاستوں کے لئے ایک قابل تقلید
مثال قایم کردی ہے۔

مختلف مدات محفوظ کے متعلقہ تمسکات کو قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کی وجہ سے نقصان پہنچنے
کا جو احتمال رہتا ہے اس سے حفاظت کے لئے ذخیرہ محفوظ جائے تخفیف قیمت تمسکات قایم
کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ۴۰ لاکھ کی تکمیل ہونے تک حسب ذیل ذرایع سے رقوم ہر سال اس
میں شامل کی جاتی رہیں گی۔

۱۔ سکہ قرطاس کے مد محفوظ پر حاصل شدہ تمسکات کا نصف۔

۲۔ دوسرے ذخیرہ ہائے محفوظ کے تمسکات پر حاصل شدہ سود کا چوتھائی جو اس سے قبل
ان ذخیروں میں نہیں بلکہ عام آمدنی میں شمار کیا جاتا تھا۔

۳۔ ذیل کے مدات محفوظ کے تمسکات پر حاصل شدہ جملہ سود کا چوتھائی۔

(ل) سکہ عثمانیہ کے استحکام کا ذخیرہ (ب) امانتوں اور متفرقات کا ذخیرہ

اس طرح سے اس ذخیرہ محفوظ کے لئے دو کروڑ روپے حاصل ہوں گے اور اس ذخیرہ میں
۲۱،۵۲ لاکھ روپے جمع کئے جارہے ہیں۔ سونے اور چاندی کی قیمتوں میں مصنوعی اضافے
کی وجہ سے حکومت حیدرآباد مجبور ہے کہ تمسکات خریدے اور اس ذخیرہ محفوظ کی وجہ سے
اتار چڑھاؤ کے نقصانات کم ہوجائیں گے۔

سیل بندی اور محفوظ ذخیروں کے فوائد

سنہ ۱۳۳۲ف میں مالیہ کی سیل بندی کا طریقہ رائج کیا گیا اُس وقت سے اب تک سیل بندی اور محفوظ ذخیروں کی وجہ سے حکومت کے مالیہ کو جو فائدہ پہنچا ہے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۸ سال کی مدت میں یعنی سنہ ۱۳۵۰ف تک اخراجات کی مد میں آمدنی سے زیادہ ۱۶۶۶،۳۱ لاکھ روپے خرچ کیے گئے اور یہ زائد رقم ذخیروں سے حاصل کی گئی۔ ہر سہ سالہ تعہد کے اختتام پر جو توفیر حاصل ہوئی اس کی کل مقدار ۱۲۹۵،۰۵ لاکھ روپے ہے اس توفیر میں سے سنہ ۱۳۴۹ف تک ۵۷۶،۸۵ لاکھ روپے کی رقم اخراجات کی مد میں صرف کی گئی موجودہ جنگ کی وجہ سے گذشتہ تینوں موازنے غیر متوازن رہے اور سنہ ۱۳۴۹ف میں ۱۲۸،۸۸ لاکھ سنہ ۱۳۵۰ف میں ۱۹۳،۰۲ لاکھ سنہ ۱۳۵۱ف میں ۱۷۰،۶۶ لاکھ اور سنہ ۱۳۵۲ف میں ۱۱۳،۷۶ لاکھ روپے موازنوں کو متوازن کرنے کی غرض سے لئے گئے۔ سنہ ۱۳۳۲ف کے بعد سے تعلیم کے اخراجات میں ۶۵٪ زراعت میں ۹۰٪ اور صحت عامہ ۱۰۰٪ سے زیادہ امداد باہمی میں تقریباً ۱۰۰٪ کا اضافہ ہوا۔ ۸

سنہ ۱۳۳۲ف کے بعد سے مسلسل توفیری موازنوں کی بدولت حکومت کو ۱۴½ کروڑ کی بچت ہوئی جو حسب ذیل ضروریات کی تکمیل میں صرف ہوئے۔

۱۔ نئی ریلوے لائنوں کی تعمیر کے لئے	۷ کروڑ
۲۔ آبپاشی کے کاموں کے لئے	۵½ کروڑ
۳۔ شہر حیدرآباد کی برقی روشنی کے لئے	۵۰ لاکھ
۴۔ تعلقوں اور اضلاع کی برقی روشنی کے لئے	۲۵ لاکھ
۵۔ متفرق اخراجات مثلاً کانوں اور محکمہ طباعت کے لئے۔	۲۵ لاکھ

مالگزاری

حیدر آباد میں رعیت واری طریقے کا رواج ہے اس بات کے اندازہ کے لئے کہ آیا حیدر آباد میں مالگزاری کی شرح کم ہے یا زیادہ مختلف ریاستوں اور صوبوں کے اعداد و شمار اور ان کے اضافی مالگزاری کے بار کا جدول درج کیا جاتا ہے حیدر آباد میں مالگزاری کل آمدنی کا ۴۶٪ وصول ہوتی ہے بڑودہ میں ۲۶٪ اندور میں ۴۹٪ مدراس میں ۳۰٪ بمبئی میں ۲۷٪ اور بنگال میں ۲۵٪ - اس مضمون میں آیندہ صفحات میں جو جدول پیش کئے جائیں گے وہ سنہ ۱۹۴۲ء کے تیار کئے ہوئے ہیں

مالگزاری کا بار یا تعدیہ

صوبہ یا ریاست	فی مربع میل روپے	فی مربع میل آنے	فی مربع میل پائی	فی شخص روپے	فی شخص آنے	فی شخص پائی
حیدر آباد	۳۷۸	۶	۵	۱	۱۲	۰
میسور	۳۹۶	۰	۰	۱	۱۲	۶
بڑودہ	۱۰۰۴	۰	۰	۳	۵	۱۱
مدراس	۳۴۲	۸	۰	۱	۱	۶
بمبئی	۴۳۹	۱۱	۲	۱	۱۳	۹
بنگال	۳۸۴	۸	۰	۰	۱۰	۰

اوپر دیئے ہوئے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیدر آباد میں مالگزاری کا بار اوسط ہے لیکن جب حکومتی امداد کی دوسری شکلوں مثلاً دیہی تنظیم - دیہی خوشحالی کے ٹرسٹ فنڈ اور قحط کے ذخیرۂ محفوظ سے جو امداد کاشتکاروں کو ملتی ہے اس کا اندازہ لگایا جائے تو مالگزاری کا بار بہت کم رہ جائے گا مزید برآں حکومت حیدر آباد فصل کی خرابی کے مدنظر وقتاً فوقتاً مالگزاری معاف کرتی رہتی ہے - چنانچہ سنہ ۱۳۴۲ف سے اب تک کوئی دو کروڑ کی مالگزاری معاف کی گئی ہے حیدر آباد میں انکم ٹیکس اور زرعی آمدنیوں کا محصول نہیں ہے - ان محاصل

حیدرآباد کو جس قدر آمدنی کی توقع ہے اگر اس کو واقعی آمدنی میں شریک کرلیا جائے تو مالگزاری کی کل آمدنی ۶۳ بز کی بجائے ۷۰ بز ہوجائیگی۔

تجارتی آمدنی

اس ذریعے سے حیدرآباد کو کچھ زیادہ آمدنی نہیں کیونکہ یہاں ہر صنعتی ترقی ابتدائی حالت میں ہے۔ گو کہ گذشتہ چند سالوں میں کئی کارخانے قائم ہوچکے ہیں حکومت حیدرآباد کی پالیسی اس خصوص میں دانشمندانہ رہی ہے حکومت انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کے ذریعہ صرف ان ہی صنعتوں کو مدد دیتی ہے جو ترقی کرنیکی صلاحیت رکھتی ہیں جنگ سے پہلے میسور اور بیکانیر کو اس ذریعہ سے علی الترتیب ۲۵،۵ بز اور ۳۹،۵ بز آمدنی ہوتی تھی ریلوں سے بڑودہ کو ۳۶،۹ بز اور حیدرآباد کو ۷۷،۷ بز آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ ریاست میسور کو جل بجلی سے ۱۱،۷ بز آمدنی ہوتی تھی۔ ۱۳۵۲ف کے موازنے میں نظام ساگر سے جل بجلی حاصل کرنے کے لئے ۸،۵ لاکھ کی گنجایش رکھی گئی ہے جس کے متعلق ابتدائی کام ہوگیا ہے اور اسکی وجہہ سے نظام ساگر اور ملحقہ علاقوں میں مناسب صنعتوں کے قیام میں مدد ملے گی جنگ کے بعد ترقیات مابعد جنگ کی اسکیم کے تحت صنعتی ترقی کی بہت زیادہ گنجایش ہے۔ حکومت حیدرآباد نے ½۲ بز شرح سود سے ایک کروڑ کا قرضہ حاصل کیا ہے اور حکومت کا ارادہ ہے کہ برطانوی حکومت سے درخواست کرے کہ حکومت ہند کے جو اسٹرلنگ کے ذرائع انگلستان میں جمع ہیں ان سے حیدرآباد کو مبادلے کی سہولتیں دیجائیں تاکہ مشنری آلات اور پلانٹ خریدے جاسکیں ہر حکومت چند خاص محکموں کو خالص تجارتی اصولوں پر چلاتی ہے۔ ان میں آبپاشی اور ٹپے کے محکمہ شامل ہیں۔ لیکن حیدرآباد میں ان محکموں سے کوئی آمدنی نہیں ہوتی۔ ۱۳۴۹ف میں ٹپہ سے کل آمدنی ۱۴ لاکھ ۹۲ ہزار روپے ہوئی۔ لیکن خرچ ۱۵ لاکھ ۲۹ ہزار روپے ہوا برخلاف اس کے مرکزی حکومت ہند کے اعداد سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو ایک کروڑ ۶۲ لاکھ ۵۳ ہزار روپے خالص آمدنی ہوئی۔

مصارف وصولی و نظم ونسق

مصارف وصولی حیدرآباد میں سب سے زیادہ یعنے ۱۶٫۲۳٪ اور کوچین میں سب سے کم یعنے ۱۰٫۸۰٪ ہوتے ہیں یہ مصارف مدراس میں ۱۲٪ اور بمبئی میں ۱۳٪ ہوتے ہیں۔ مصارف نظم ونسق پر حیدرآباد ۲۱٪ میسور ۲۰٪ اندور ۲۲٫۵٪ جموں و کشمیر ۳۰٫۸٪ اور ٹراونکور ۲۹٫۵٪ خرچ کرتا ہے۔ حیدرآباد میں مصارف وصولی اور نظم ونسق پر اکثر نکتہ چینی کی جاتی رہی ہے اسی لئے حیدرآباد نے تخفیف مصارف کی ایک کمیٹی قایم کی ہے جس میں غیر سرکاری اراکین کی اکثریت ہے۔ تنخواہوں کی شرح میں غیر معمولی کمی کے باعث ممکن ہے کہ حکومت کو قابل افراد کی خدمات حاصل کرنے میں دقت ہو اسی لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ تعطیلات کو گھٹایا اور کارکردگی کے معیار کو بڑھایا جائے تا کہ حکومت کا کام خوش اسلوبی سے انجام پائے

تعلیم

تعلیم پر مختلف ریاستی صوبائی حکومتیں جنگ سے پہلے حسب ذیل رقمیں صرف کرتی تھیں۔

صوبہ یا ریاست	کل اخراجات کا فیصد	فی شخص اخراجات: روپے	آنے	پائی
مدراس	۱۶٫۲۳٪	۰	۹	۰
بمبئی	۱۴٫۳٪	۱	۱	۰
بنگال	۱۲٫۰۶٪	۰	۴	۱۱
حیدرآباد	۱۰٫۶٪	۰	۱۰	۱۱
میسور	۱۳٫۴۱٪	۰	۱۳	۲
ٹراونکور	۱۹٫۷۵٪	۰	۱۵	۱۰
کوچین	۱۹٫۵۵٪	۱	۸	۱۰

میسور میں یونیورسٹی کی تعلیم پر کل تعلیمی اخراجات کا پانچواں حصہ اور ٹراونکور میں ساتواں حصہ صرف کیا جاتا ہے اور حیدرآباد میں تقریباً ۱۲ لاکھ روپے اعلیٰ تعلیم پر صرف ہوتے ہیں حیدرآباد کے متعلق یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم پر بہت ہی غیر متناسب خرچ ہوتا ہے لیکن حال ہی میں حیدرآباد نے ابتدائی تعلیم کے لئے ہر ایسے موضع میں جس کی آبادی ہزار یا اس سے زیادہ ہو ایک سرکاری تحتانی مدرسہ قائم کیا ہے اس غرض سے ابتدائی تعلیم کے لئے ایک فنڈ قائم کیا گیا ہے جس کو ۱۲ ½ لاکھ روپے تک بڑھایا جائے گا۔ اس فنڈ کے علاوہ ۱۳۵۳ف میں جنگ کی وجہ سے عاید شدہ مصارف کے بعد سب سے بڑی رقم اکز ورٹ ۹ ۳ لاکھ تعلیمات پر صرف کی جائیگی جو سال گذشتہ کے مقابلے میں بقدر ۹۹ء۲ لاکھ زیادہ ہے۔ اس طرح نہ صرف مملکت کی موجودہ زرعی اور صنعتی پیداوار بڑھانے کے لئے کوشش ہو رہی ہے بلکہ حیدرآباد کو زمانۂ بعد از جنگ کی صنعتی فضا میں شایان شان حصہ لینے کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ نئے سال کے موازنہ میں حسب ذیل تعلیمی اداروں کے قیام و ترقی و توسیع کی تجویز ہے۔

جامعہ عثمانیہ سے ملحق ایک صنعتی معمل قایم کیا جا رہا ہے جہاں طلباء کو روغنیات و صابونیات میں ایم ایس سی کی ڈگری کے لئے تیار کیا جائے گا۔ گیارہ سو سے زائد ایک ایک مدرس والے مدارس کی تنظیم عمل میں لائی جائے گی۔ تحتانی مدارس کے اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائیگا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے چھ وسطانی مدارس کو فوقانی مدارس میں تبدیل کیا جائے گا۔ بعض وسطانی مدارس میں زرعی تعلیم کا انتظام ہوگا۔ صنعتی مدارس کو فوقانی صنعتی [illegible] میں تبدیل کیا جائے گا۔ نئے صنعتی مدارس قائم ہوں گے۔ خانگی تعلیمی اداروں کی امداد میں اضافہ کیا جائے گا۔ تقریباً ایک درجن اقامت خانے قائم کئے جائیں گے۔ مدارس میں طلبہ کے دوپہر کے کھانے کا انتظام ہوگا اور تمام مدارس کے ضروریات کی تکمیل کی جائے۔ اس طویل فہرست کے بعد اب کسی مزید تبصرے کی ضرورت نہیں کہ یہ خود حیدرآباد کی تعلیمی سرگرمیوں پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔

کارہائے عامہ

حکومت حیدرآباد کارہائے عامہ پر سب سے زیادہ یعنے ۱۵ بز حکومت بڑودہ ۱۴ بز وصین ۱۳ بز اور حکومت ٹراونکور ۱۲ بز صرف کرتی ہے جنگ کی وجہ سے عاید شدہ دیگر اخراجات کے باوجود اس سال حکومت حیدرآباد نے سڑکوں کی تعمیر اور ترمیم کے لئے ۴۰ لاکھ روپے کی منظوری دی ہے۔

حکومتی قرضہ

سنہ ۱۳۴۲ ف میں حکومتی قرضہ ۳۲۹۶،۳۲ لاکھ روپے تھا اور یہ بڑھتے بڑھتے سنہ ۱۳۴۹ ف تک ۱۹۰۷،۷۰ لاکھ روپے ہوگیا موجودہ زمانے میں کسی حکومت کا قرض سے پاک ہونا امکان سے باہر ہے بلکہ حکومت پر جتنا زیادہ قرض ہوگا اتنی ہی وہ زیادہ ترقی یافتہ کہلائے گی بشرطیکہ وہ قرضہ پیدا آور اغراض کی خاطر لیا گیا ہو حکومت کی ساکھ کا پتہ قرضہ کی شرح سے چلتا ہے حیدرآباد کے جدید قرضہ کی شرح برطانوی ہند کے جاری شدہ قرضے سے کم تھی لیکن پھر بھی قرضہ حاصل ہوگیا سنہ ۱۳۴۲ ف سے سنہ ۱۳۴۹ ف تک حکومت کے قرضہ میں ½ ۴ کروڑ روپے کا اضافہ ہوا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ذخیرۂ ادائی میں بھی ½ ۳ کروڑ کا اضافہ ہوا اور یہ امر کہ مجموعی قرضے اور ذخیرۂ ادائی قرض میں ۴۰ بز کا تناسب تھا قابل تعریف ہے۔ سنہ ۱۳۵۲ ف کے دوران میں ۶ بز سنہ ۱۳۵۲ ف اور ½ ۵ بز شرف تا ۱۳۶۲ ف کے قرض کے تمسکات رکھنے والوں کے لئے یہ موقعہ فراہم کیا گیا تھا کہ وہ اپنے تمسکات کو ۳ بز سنہ ۱۳۶۱ تا سنہ ۱۳۷۶ ف کے قرضہ میں تبدیل کر لیں۔ اس موقعے سے عوام نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ۵ کروڑ سے کچھ اوپر رقم میں سے صرف ۲،۰۴ الاکھ روپے واپس لئے گئے اور یہ چیز حکومت پر عوام کے اعتماد کو ظاہر کرتی ہے۔ اب حکومت کا کل قومی قرضہ ۴۴،۲۳،۹۱۳ لاکھ روپے ہے اور سنہ ۱۳۵۱ ف میں ۴۹،۴۴،۹۳ لاکھ روپے تھا کم شرح سود کے قرضے میں تبدیلی کی وجہ سے سود کے اخراجات میں ۱۵،۷ بز کی کمی واقع ہوگی۔ بعد از جنگ ضروریات کے لئے سال حال ایک کروڑ روپے ۲ ½ بز شرح سود پر لیا گیا ہے۔

حیدرآباد کا نظام زر

ریاست حیدرآباد کی یہ قابل فخر خصوصیت ہے کہ اس کے حدود مملکت میں خود اُس کے سکّے اور نوٹ جاری ہیں جنگ کے آغاز یعنی یکم دے ۱۳۴۹ف میں اجرائی زر کی جملہ مقدار ۱۷ کروڑ ۲۸ لاکھ تھی جس میں زر کاغذی ۶ کروڑ ۲۸ لاکھ اور زر فلزاتی ۱۱ کروڑ تھا۔ یکم اردی بہشت ۱۳۵۲ف میں اجرائی زر کی جملہ مقدار ۲۳ کروڑ ۱۸ لاکھ تھی جس میں سے زر کاغذی ۱۷ کروڑ ۱۸ لاکھ تھا اور زر فلزاتی ۱۲ کروڑ (جس میں سے چھ کروڑ ذخیرہ اندوزی یا گلانے کی وجہ سے گشت سے غائب ہو گئے)۔ جنگ سے پہلے کے مقابلہ میں اب تک حیدرآباد کے زر میں صرف ۳۷ بر اضافہ ہوا ہے اور اس کے اسباب موافق توازن تجارت قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ اور برطانوی ہند کا افراط زر ہیں۔

برطانوی ہند اور حیدرآباد کے سکوں کے درمیان شرح تبادلہ کے استحکام کے لئے حکومت نے ایک ذخیرہ قائم کر رکھا ہے ابتدا میں حکومت نے ۱۱۸ روپے ۱۲ کی زیادہ سے زیادہ اور ۱۱۵ روپے ۱۰ کی کم سے کم شرح مقرر کی تھی لیکن حیدرآباد کے زر کی ساکھ اور استحکام کی وجہ سے شرح مبادلہ میں اتنے زیادہ تغیرات نہیں ہونے پاتے تھے اسی لئے نئے انتظام کی رو سے شرح مبادلہ کو ۱۱۶ روپے اور ۱۱۷ روپے کی ابتدائی اور انتہائی حد کے اندر قایم کیا گیا ہے اور یہ شرح بہت کامیاب ثابت ہوئی ہے اور ابتدائی حد یعنی ۱۱۶ سکہ عثمانیہ = ۱۰۰ سکہ کلدار کی شرح مبادلہ ماہ دے ۱۳۵۲ف میں حاصل ہوئی تھی شرح مبادلہ اپنی انتہائی حد پر ابھی تک نہیں پہنچی اور انتہائی شرح مبادلہ جو اب تک حاصل ہوئی ہے وہ ۱۱۶ روپے ۱۲ سکہ عثمانیہ = ۱۰۰ سکہ کلدار کی ہے۔ جو ماہ شہریور ۱۳۵۲ف میں حاصل ہوئی تھی۔

حیدرآباد کے زر کاغذی کی تنظیم جدید ۱۳۳۸ف میں کی گئی حیدرآباد کی حکومت نے کاروبار اور پیدائش دولت میں اضافے کے ساتھ مقدار زر میں اضافے کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا۔ ۱۳۵۲ف تک نحر زر کاغذی کی کل مالیت کی صرف ایک تہائی رقم کفالت نامجات اور تمسکات کی شکل میں رکھی جاتی تھی اسی لئے ۵ کروڑ روپے تمسکات کی شکل میں رکھے گئے تھے جن سے ۲۵ لاکھ روپے سالانہ آمدنی ہوتی تھی اور اب نئے انتظام کی وجہ سے ۲/۳ رقم تمسکات میں لگائی جائے گی جس سے آمدنی میں اضافہ ہوگا۔

قومی تعمیر اور فلاح و بہبود

کسی مالیہ کا اہم ترین پہلو یہی ہوتا ہے کہ اس مالیہ کا کتنا فیصد قومی تعمیر اور فلاح و بہبود کے کاموں پر صرف ہوتا ہے۔ ۱۳۵۲ ف کے بجٹ میں صحت عامہ کے تحت شفاخانوں حفظان صحت کی اسکیموں مزید طبی سہولتوں سے علاقہ نظام ساگر میں ملیریا کا انسداد کرنے کی اسکیم اور دواؤں خوراک اور مریضوں کے بستر کیلئے مزید رقموں کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ قومی تعمیر کے سررشتوں پر حضرت اقدس اعلیٰ کی تخت نشینی کے سال جو مصارف ہوئے تھے وہ کل آمدنی کا ۱۸٫۲۳ فیصد حصہ تھے لیکن ۱۳۵۲ ف میں آمدنی کے مختلف ذرائع بڑھ جانے کے باوجود بھی ان مصارف کا حصہ بڑھتے بڑھتے ۳۴٫۹ فیصد ہو گیا ہے۔ ذیل کے جدول سے مختلف ریاستوں اور صوبوں کے قومی تعمیر پر اخراجات کا اندازہ ہو سکے گا۔

قومی تعمیر و ترقی کے اخراجات

صوبہ یا ریاست	کل آمدنی کا فیصد	فی شخص اخراجات (روپے۔ آنے۔ پائی)	فی مربع میل اخراجات (روپے۔ آنے۔ پائی)	صوبہ یا ریاست	کل آمدنی کا فیصد	فی شخص اخراجات (روپے۔ آنے۔ پائی)	فی مربع میل اخراجات (روپے۔ آنے۔ پائی)
حیدرآباد	۳۵٫۶۸	۲-۴-۱۱	۴۰۲-۰-۰	کوچین	۴۶٫۹	۳-۱۱-۹	۳۰۳۰-۰-۰
میسور	۳۲٫۶۴	۲-۰-۱	۴۴۸-۰-۰	مدراس	۳۸٫۲۴	۱-۶-۳	۴۳۵-۱۲-۰
ٹراونکور	۳۹٫۵۶	۱-۱۵-۹	۱۳۲۵-۰-۰	بمبئی	۳۳٫۱۰	۲-۳-۰	۵۶۳-۲-۱۱
بڑودہ	۳۸٫۹۰	۳-۹-۲	۱۰۶۹-۰-۰	بنگال	۳۴٫۰۳	۰-۱۳-۱۰	۵۳۰-۶-۶
جموں و کشمیر	۲۳٫۴۳	۱-۲-۱۱	۵۶-۸-۴			......	......

حیدرآباد میں بہت سے ایسے محاصل ابھی تک عائد نہیں کیے گئے مثلاً انکم ٹیکس جو دوسری جگہ آمدنی کا اہم ذریعہ ہیں۔ اگر ان محاصل کے اضافی بار Incidence کو بھی اس مفروضے کے تحت کہ افراد ہی اپنی آمدنی کو اپنی ضروریات کے لحاظ سے اچھی طرح خرچ کر سکتے ہیں اگر قومی تعمیر و ترقی کے اخراجات میں شامل کر لیا جائے تو حیدرآباد کے اعداد اور بھی قابل رشک ہو جائیں گے۔ حیدرآباد میں انکم ٹیکس گو کم شرح ہی پر سہی لیکن ضرور عائد کرنا چاہیئے تاکہ آمدنی کی عدم مساوات کم ہو سکے اس سے دو فائدے ہیں ایک تو حکومت کو قومی تعمیر اور دوسرے اخراجات کیلئے ایک مستقل ذریعہ آمدنی ہاتھ آجائیگا اور دوسرے یہ کہ محصول ادا کرنے والے افراد کو حکومت کے اخراجات

سے دلچسپی پیدا ہو جائیگی اور اس طرح حکومت اور عوام میں قریبی تعلق پیدا ہو جائیگا۔ حیدرآباد کا بیشتر حصہ جاگیرات پر مشتمل ہے ان جاگیروں پر کسی قسم کا کوئی ٹیکس عائد نہیں ہے حالانکہ صوبہ جات متحدہ کے تمام جاگیردار و تعلقدار انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں اسی طرح سے یہاں کے جاگیرداروں پر اسی قسم کے ٹیکس کا عاید کرنا ضروری ہے تاکہ غریب اور مفلوک الحال طبقات کی اس رقم سے اعانت کی جاسکے اور خود جاگیری علاقوں کے نظم و نسق کو درست کیا جاسکے۔

حیدرآباد کی معاشی جنگ

جنگ کی وجہ سے پیدا شدہ ہولناک قلت اور گرانی کے مضر اثرات سے اپنی غریب رعایا کو بچانے کے لیے حکومت حیدرآباد انتہائی کوشش کر رہی ہے سستے غلے اور کپڑے گرانی الاونس اور زیادہ غلہ اگاؤ کی مہم پر لاکھوں روپیہ بے دریغ خرچ کیا جارہا ہے اس کے باوجود بھی حکومت حیدرآباد نے اپنے حلیف برطانیہ کی اس جنگی جنگ میں اب تک جو مدد کی ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

برطانیہ عظمیٰ کے یار وفادار حضرت اقدس اعلیٰ کی ہدایت و نگرانی میں ان کی حکومت جنگ کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کے لیے ہر ممکن امداد دیتی رہی ہے زیادہ سے زیادہ مقدار میں جنگی سامان تیار کرنے کے لیے حیدرآباد کی ورکشاپوں گرنیوں اور فیکٹریوں سے کام لیا جاتا رہا میدان جنگ میں برسرکار افواج کی جدید معیار کے مطابق سربراہی کی وجہ سے زبردست مالی بار برداشت کیا گیا فوجی عمارتیں تعمیر کی گئیں اور تعمیر کی جارہی ہیں تاکہ جائے سکونت کی حد سے بڑھی ہوئی مانگ کو پورا کیا جاسکے۔

بالواسطہ اور بلاواسطہ جنگی مساعی پر اب تک جو اخراجات عاید ہوئے ہیں ان کی مقدار ۳۰۷ء۴۸ لاکھ روپے ہے اس کے علاوہ تقریباً ۲۵ لاکھ روپے ریڈ کراس سوسائٹی کو ایک لاکھ وزارت [illegible] کو ۲۰ء۴۳ لاکھ جنگی جہاز کو دیئے گئے وائسرائے کی جنگی فنڈ میں ۲۱ لاکھ دیے گئے اور متفرق جنگی امدادوں میں ۲ لاکھ روپے شامل ہیں۔ ۱۲ کروڑ روپے حکومت ہند کو جنگی قرضہ میں دیئے گئے جس میں سے ۵۰ لاکھ بلاسودی تھے۔ اس کے علاوہ اس امداد میں مختلف محاصل کی معافی اور مصارف نگرانی بھی شامل نہیں جن کی مقدار تقریباً ۴ء۱۰۰ لاکھ روپے ہے۔ موجودہ جنگ عالمگیر میں حیدرآباد کی یہ گرانقدر امداد صرف اس کے مستحکم مالیاتی نظام کی مرہون منت ہے۔ فقط

حیدرآباد میں السی کی کاشت

(از جناب محمد ریاض الحسین صاحب قریشی ۔ ایم ۔ اس سی (عثمانیہ)

حیدرآباد قدرتی وسائل میں برطانوی ہند اور ریاستوں سے بڑھا ہوا ہے۔ ہندوستان میں کسی صوبے یا ریاست میں ارنڈ یا جوار کی کاشت اس قدر وسیع پیمانے پر نہیں کی جاتی۔ مونگ پھلی کے لحاظ سے حیدرآباد کا دوسرا درجہ، اور کپاس کے لحاظ سے تیسرا نمبر ہے (ملاحظہ ہو جدول ۱)۔

حیدرآباد میں السی کا رقبہ ہندوستان کے رقبے کا ۱۰ فی صد ہے۔ لیکن اس کی کاشت کرنے والے صوبہ جات میں حیدرآباد کا تیسرا درجہ ہے۔ ممالک محروسہ کی اہم پیداوار میں السی کا بارھواں درجہ ہے۔ پانچ لاکھ ایکڑ زمین پر اس کی کاشت ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر ممالک محروسہ کے مزروعہ رقبے کے تقریباً ۱۰ فی صد رقبے پر السی کی کاشت ہوتی ہے (ملاحظہ ہو جدول ۲) ۔۔۔ مرہٹواڑہ اور کرناٹک میں السی کی ۸۹ فی صد کاشت ہوتی ہے اور باقی ۱۱ فی صد تلنگانے میں ہوتی ہے (ملاحظہ ہو جدول ۳)۔

کاشت ۔۔۔ السی کے لیے بھوری ریگڑ کی ضرورت ہے جس میں ریت اور چکنی مٹی موجود ہو۔ ایسے اراضیات جس میں گیہوں اور مکائی کی کاشت ہوتی ہے اس کے لیے موزوں ہیں۔ السی کے ۱۰۰ بیجوں کا وزن تقریباً ۴،۶ گرام ہوتا ہے۔ ایک پونڈ میں ۹۰۰۰۰ تخم ہوتے ہیں۔ السی کے پودے کو کھاد کی ضرورت ہے، ہڈی کا برادہ فایدہ مند ہے جو تقریباً فی ایکڑ ۲۰ سیر دیا جا سکتا ہے۔ ایک ایکڑ کی کاشت کے لیے ۲۰ پونڈ تخم درکار ہوتا ہے۔

السی کی کاشت ربیع میں کی جاتی ہے۔ سن اور ریشہ حاصل کرنا مقصود ہو تو پودوں کے درمیان ۶ سے ۸ انچ کا فصل چھوڑا جاتا ہے اور دو لکیروں کے درمیان ۹ انچ کا فاصلہ رکھا جاتا ہے۔

تخم کا رنگ ہلکا گلابی اور پھول سفید ہوتا ہے۔ ستمبر یا اکتوبر میں تخم ریزی ہو تو فصل فروری یا مارچ میں تیار ہوتی ہے۔ گہرے سیاہ مٹی پر کی ایک اچھی فصل امریکہ کی فصل کی طرح ۸۰۰ پونڈ پیداوار دیتی ہے۔ ارجنٹائن میں ۶۰۰ پونڈ فی ایکڑ پیداوار ہوتی ہے۔ تخم ریزی کے بعد کی بارش السی کے لیے ضرر رساں ہے۔ پھولوں کے زمانے، ابر آلود فضا بارآوری میں مزاحم ہوتی ہے۔ تخم حاصل کرنے کی غرض سے اگر کاشت کی گئی ہو تو فصل، تخم سبز رنگ سے زرد رنگ حاصل کرنے پر اور تنے کا نچلا حصہ زرد ہو کر پتے گر پڑنے پر کاٹ لی جاتی ہے۔ تخم اور ریشہ ہر دو حاصل کرنا مقصود ہو تو تنے کا نچلا حصہ نصف تک اور پتے زرد ہونے دیئے جاتے ہیں، اور تخم کا سبز سے زردی مائل ہونا بھی ضروری ہے۔ صرف ریشہ حاصل کرنے کے لیے پھول نمودار ہوتے ہی یا تخم نیم پختہ ہوتے ہی فصل کاٹ لی جاتی ہے، ورنہ ریشہ سخت ہو جاتا ہے۔

یورپ اور امریکہ میں السی کو فلاکس کہتے ہیں۔ یہ وہاں پر ریشے والا پودا ہے۔ آئرلینڈ اور بلجیم، فلاکس کی کاشت کرنے والے دو بڑے ممالک ہیں۔ فلاکس سے لینین کپڑا تیار کیا جاتا ہے۔ ریشے کے لیے فی ایکڑ ۱۰۰ پونڈ استعمال کئے جاتے ہیں، تاکہ پودے نزدیک نزدیک ہوں اور شاخیں نہ پھوٹنے پائیں، کیوں کہ شاخیں ریشے کو کمزور اور چھوٹا کر دیتی ہیں۔

السی کو صرف ایک ہی بیماری رسٹ ہوتی ہے۔ یہ بیماری عموماً نومبر میں ہوتی ہے۔ اس سے تخم کے وزن میں کمی بھی واقع ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ بیماری بہت ہی مہلک ہوتی ہے کھیت کے کھیت تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ متاثرہ پودے بہت ہی نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کے پتوں اور تنے پر چمکدار نارنجی رنگ کے دھبے صاف نظر آتے ہیں۔ رفتہ رفتہ فصل تیار ہونے پر دھبے سُرخی مائل پیلے ہو جاتے ہیں اور پھر سیاہ ہو جاتے ہیں۔ اس بیماری کا بالراست علاج نہیں کیا جا سکتا۔ عام طور پر متاثرہ محصول کو کاٹ کر جلا دیا جاتا ہے۔ السی کی بعض انواع بیماری سے محفوظ ہیں اس لیے عمدہ تخم والی نوع لیکن بیماری سے متاثر ہونے والی نوع کو ایک متوسط درجے والی نوع لیکن بیماری سے محفوظ رہنے والی کے ملاپ سے ایک عمدہ نوع حاصل کی جا سکتی ہے۔

جدول ۲ ۔ ہندوستان میں مخصوص پیداواروں کا زیر کاشت رقبہ (ایکڑوں میں) ۔

(سنہ ۱۹۳۶ء ۔ ۱۹۳۷ء)

صوبۂ بنگال، بمبئی، مدراس، صوبۂ متوسط و برار، صوبۂ متحدہ

اور ممالک محروسہ سرکار عالی، کشمیر اور میسور کے درمیان مقابلہ

صوبہ جات	چانول	گیہوں	جوار	ارنڈی	مونگ پھلی	السی	تمباکو	نیشکر	کپاس
ممالک محروسہ سرکار عالی	۱۰,۳۵,۰۰۰	۱۲,۰۸,۰۰۰	۹۰,۵۰,۰۰۰	۷,۸۱,۰۰۰	۹,۵۴,۰۰۰	۴,۶۸,۰۰۰	۶۶,۰۰۰	۵۰,۰۰	۳۰,۸۹,۰۰۰
صوبۂ بنگال	۲,۱۹,۹۱,۳۰۰	۱,۳۹,۰۰۰	۶۰,۰۰۰	۰۰	۰۰	۱,۴۱,۰۰۰	۳,۰۷,۰۰۰	۳,۵۵,۰۰۰	۵۸,۰۰۰
صوبۂ بمبئی	۱۷,۰۵,۰۰۰	۱۶,۵۵,۰۰۰	۹۰,۹۶,۰۰۰	۳۶,۰۰۰	۸,۷۲,۰۰۰	۱,۰۱,۰۰۰	۱,۳۵,۰۰۰	۷۹,۰۰۰	۳۵,۵۹,۰۰۰
صوبۂ متوسط و برار	۵۶,۲۴,۰۰۰	۳۱,۳۰,۰۰۰	۳۶,۵۸,۰۰۰	۳۰,۰۰۰	۱,۳۹,۰۰۰	۱۱,۳۱,۰۰۰	۱۲,۰۰۰	۳۰,۰۰۰	۳۹,۶۹,۰۰۰
صوبۂ مدراس	۹۹,۹۰,۰۰۰	-	۵۱,۲۱,۰۰۰	۲,۶۴,۰۰۰	۳۴,۹۵,۰۰۰	۰۰	۲,۵۳,۰۰۰	۱,۲۰,۰۰۰	۲۵,۱۲,۰۰۰
صوبۂ متحدہ	۶۰,۸۰,۰۰۰	۷۴,۸۴,۰۰۰	۲۱,۲۲,۰۰۰	۹,۰۰۰	-	۸,۹۳,۰۰۰	۷۹,۰۰۰	۲۴,۶۹,۰۰۰	۶,۸۸,۰۰۰
کشمیر	۴,۴۷,۰۰۰	۴,۴۰,۰۰۰	۸,۰۰۰	-	-	۳۷,۰۰۰	۵۱	۹,۰۰۰	۲۲,۰۰۰
میسور	۷,۴۴,۰۰۰	۲,۰۰۰	۹۰,۲۵,۰۰۰	۱,۴۳,۰۰۰	۴,۱۰,۰۰۰	-	۴۲,۰۰۰	۵۳,۰۰۰	۵۵,۰۰۰

جدول ۳ ۔ ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۲ء میں حیدرآباد میں السی کی کاشت کا رقبہ و پیداوار :-

اضلاع	رقبہ	پیداوار (ٹن)
اطراف بلدہ	۲،۸۲۱	۱۹۳
ورنگل	۶	۰
کریم نگر	۲	۰
عادل آباد	۲۶،۵۲۶	۱۲۹۵
نظام آباد	۵،۱۴۵	۳۲۶
میدک	۲،۸۵۳	۱۵۸
باغات	۱۷۷	۱۲
محبوب نگر	۷۷۲	۳۱
نلگنڈہ	–	–
اورنگ آباد	۹۳،۸۷۳	۷،۹۶۰
بیڑ	۱۵۱،۹۷۷	۱۰،۶۶۷
ناندیڑ	۳۳،۱۴۵	۲،۱۷۷
پربھنی	۱۱۶،۶۷۵	۸،۳۱۵
گلبرگہ	۳۶،۰۵۹	۳،۰۲۱
عثمان آباد	۴۳،۸۰۹	۳،۹۱۷
رائچور	۶،۱۹۴	۴۲۱
بیدر	۵۴،۶۹۳	۴،۸۲۰
جملہ	۵۷۴،۶۹۷	۴۳،۴۶۲

جدول ۳ ۔ حیدر آباد میں السی کی پیداوار فی ایکڑ، جملہ پیداوار اور مزروعہ رقبے کا پانچ سالہ اوسط اور دیگر صوبہ جات سے مقابلہ :۔

اضلاع	پیداوار فی ایکڑ (پونڈ)		جملہ پیداوار (ٹن) ہزاروں میں		مزروعہ رقبہ ہزاروں میں		
	۱۹۳۱ء۔۳۵	۱۹۳۶ء۔۴۰	۱۹۳۱ء۔۳۵	۱۹۳۶ء۔۴۰	۱۹۳۱ء۔۳۵	۱۹۳۶ء۔۴۰	
اطراف بلدہ۔	۱۱۴	۱۲۴	۱	۱	۱۲	۸	
ورنگل۔	-	-	-	-	-	-	
کریم نگر۔	۱۱۴	۱۱۱	-	-	-	-	
عادل آباد۔	۱۳۰	۱۷۷	۱	۲	۱۷	۲۷	
نظام آباد۔	۱۴۶	۱۴۸	-	۱	۳	۷	
میدک۔	۱۴۰	۱۳۴	-	-	۱	۲	
باغات۔	-	۱۲۶	-	-	-	-	
محبوب نگر۔	۶۹	۱۵۴	-	-	۱	۱	
نلگنڈہ۔	۱۲۰	-	-	-	-	-	
اورنگ آباد۔	۱۸۸	۲۴۹	۴	۹	۴۸	۸۵	
بیڑ۔	۱۶۷	۱۹۹	۴	۸	۴۵	۸۸	
ناندیڑ۔	۱۷۹	۱۷۸	۲	۳	۲۹	۳۱	
پربھنی۔	۱۷۴	۲۴۱	۳	۲	۴۶	۶۱	
گلبرگہ۔	۱۲۷	۱۷۲	۴	۵	۵۷	۷۵	

اضلاع	پیداوار فی ایکڑ (پونڈ)		جملہ پیداوار (ٹن) ہزاروں میں		مزروعہ رقبہ ہزاروں ایکڑ		کیفیت
	۱۹۳۱-۳۵	۱۹۳۶-۴۰	۱۹۳۱-۳۵	۱۹۳۶-۴۰	۱۹۳۱-۳۵	۱۹۳۶-۴۰	
عثمان آباد۔	۱۹۱	۱۹۰	۲	۴	۲۶	۵۲	
بیدر۔	۱۵۷	۲۰۱	۲	۴	۲۴	۴۱	
رائچور	۱۵۰	۱۴۴	-	-	۷	۴	
ممالک محروسہ۔	۱۲۳	۲۰۰	۲۳	۴۳	۳۱۱	۴۴۷	
صوبۂ بمبئی۔	۲۳۱	۲۰۸	-	-	-	-	
صوبۂ متوسط و برار۔	۱۹۶	۱۷۷	-	-	-	-	
صوبۂ مدراس۔	-	-	-	-	-	-	
دوسرے صوبوں میں حیدرآباد کا درجہ	-	-	۶	۵	۴	۴	
ہندوستان۔	۲۷۵	۲۶۲	۴۱۹	۴۳۵	۳۲۵۷	۳۷۲۶	
حیدرآباد اور ہندوستان میں نسبت	۰	--	۵٫۴۸	۹٫۱۹	۹٫۰۷	۱۳٫۰۴	

نوٹ:- اس مضمون کے جملہ اعداد محکمۂ نظامت اعداد و شمار ممالک محروسۂ سرکار عالی سے حاصل کیے گئے۔

تخم، ریشے اور پودے کی اہمیت —— تخم سے تیل نکالا جاتا ہے۔ تیل غذا میں استعمال کرتے ہیں۔ تیل کے ہوا میں خشک ہوجانے کی خاصیت سے فایدہ اٹھاکر اس کو صابن سازی، چھاپے کی سیاہی، رنگ، پینٹ اور وارنش میں استعمال کرتے ہیں۔ کھلی مویشیوں کے لیے اچھی غذا ہے۔ کھلی بطور کھاد بھی استعمال کی جاتی ہے۔ پتا، ڈنٹھل، تخم کا چھلکا کھاد کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بے کار ریشے سے کاغذ بناتے ہیں۔ ریشہ مثل ریشم کے چمکدار اور ملایم ہوتا ہے۔

تنے سے پوست نکال کر پارچہ ٹاٹ اسن تیار کرتے ہیں۔

تیل کے کارخانے اور درآمد و برآمد ـــ ممالک محروسہ میں جملہ ۸۶ کارخانے ہیں۔ اطراف بلدہ ۱۰، ورنگل ۵، کریم نگر ۶، میدک ۷، محبوب نگر ۹، نلگنڈہ ۲، بیڑ ۱، گلبرگہ ۸، عثمان آباد ۱، رائچور ۵، بیدر ۲ ـــ یہ کارخانے زیادہ مونگ پھلی اور ارنڈی کا تیل نکالنے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ السی کے بہت کم ہیں۔ ۱۹۳۳ء تک ممالک متحدہ امریکہ کو السی کا تیل ہندوستان ہی فراہم کرتا رہا۔ ہندوستان کی السی میں تیل کا فی صد زیادہ ہونے سے مانگ بھی زیادہ ہے۔

السی کی مارکٹنگ ـــ حیدرآباد میں السی کا مارکٹ فروری تا مئی ہوتا ہے۔ ایک گاڑی میں ۵ یا ۶ تھیلے آسکتے ہیں یعنے ۱۲ تا ۱۳ من۔ ایک تھیلے میں ۲ من ۱۲ سیر السی ہوتی ہے۔ السی درآمد نہیں کی جاتی۔ بمبئی کی بندرگاہ سے ۹۵ فی صد السی باہر روانہ کی جاتی ہے۔ ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۰ء میں جملہ برآمد ۲۱۸۵۳ ٹن تھی جس سے ۵۰۱۶۰۰ روپے رقم حاصل ہوئی۔ مندرجۂ ذیل السی کے اہم مراکز ہیں جہاں کے مارکٹوں میں مندرجۂ ذیل اسٹاک حاصل ہوسکتا ہے:ـــ

نشان سلسلہ	مقامات	ٹن	نشان سلسلہ	مقامات	ٹن
۱	جالنہ	۳۵۰۰	۵	سیلو	۲۵۰۰
۲	نظام آباد	۳۵۰۰	۶	رائچور	۱۵۰
۳	دھرم آباد	۳۰۰۰	۷	شنکرپلی	۲۵۰۰
۴	گلبرگہ	۳۰۰۰	۸	وقارآباد	

نشان سلسلہ	مقامات	ٹن	نشان سلسلہ	مقامات	ٹن
۹	ظہیر آباد	۲۰۰۰	۱۷	باسر	۵۰۰
۱۰	بیدر		۱۸	پیتاپور	۵۰۰
۱۱	پورنا	۲۰۰۰	۱۹	یادگیر	۵۰۰
۱۲	پربھنی	۲۰۰۰	۲۰	آصف آباد	۱۵۰
۱۳	اورنگ آباد	۱۵۰۰	۲۱	پرلی	۱۰۰
۱۴	بیڑم	۱۵۰۰	۲۲	لاسور	۱۰۰
۱۵	شاہ آباد	۱۰۰۰	۲۳	عمدہ نگر	۱۵۰
۱۶	ناندیڑ	۸۰۰	۲۴	لوانگی	۵۰

ہندوستان میں السی کی مارکٹنگ سے متعلق مشیر زرعی مارکٹنگ حکومت ہند کی جانب سے شایع ہوئی ہے جس میں مندرجۂ ذیل کی سفارش کی گئی ہے :-

۱۔ السی کا مارکٹ، کپاس اور دیگر اجناس کے مارکٹوں کی طرح منظم کیا جائے۔

۲۔ قیمتوں کا تعین لازمی ہے تاکہ السی کی قیمتوں میں ہر وقت اُتار چڑھاؤ نہ ہو۔

۳۔ مٹی اور کچرے سے السی کو صاف کرنے کے بعد ایک مقام سے دوسرے مقام کو روانہ کیا جائے تاکہ بے وجہ اخراجات بڑھنے نہ پائیں۔

۴۔ بارش سے السی کو شدید نقصان پہنچتا ہے اس لیے حمل و نقل میں حفاظت لازمی ہے۔

۵۔ مختلف مقامات پر اوزان مختلف ہیں، اس لیے یکسانیت کی ضرورت ہے۔

۶۔ تیل اصلی نہیں ملتا اس لیے ضرورت ہے کہ اس پر نگرانی رکھی جائے اور تیل میں ملاوٹ نہ ہو۔

ہے۔ موٹی السی کے بہ نسبت چھوٹی السی میں تیل کم نکلتا ہے اس لیے کاشتکاروں کو اعلیٰ قسم اور ترقی دادہ تخم جس سے نہ صرف پیداوار فی ایکڑ زیادہ حاصل ہو بلکہ روغن بھی مقدار میں السی سے کہیں زیادہ ملے، بطور تقاوی دیا جائے اور کاشتکاروں کو راغب کیا جائے۔

مابعدِ جنگ السی کی اہمیت ـــ جنگ کے بعد ہماری حکومت کی زرعی پالیسی دیگر حکومتوں کی پالیسی پر مبنی ہوگی۔ وہ ممالک جن کو دورانِ جنگ ہمارا مال نہ پہنچ رہا ہو وہ ہمارے مال سے بے نیاز ہوگئے ہیں۔ نہیں معلوم ایسے ممالک جنگ کے بعد کیا صورت اختیار کرتے ہیں۔

روغنی تخم سپلائی کرنے میں ہندوستان کو اولیت کا فخر حاصل ہے، چین کا نمبر دوسرا آتا ہے۔ ارنڈی کے تیل کی مانگ جنگ کے باعث دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ مونگ پھلی کے بعد السی کا نمبر آتا ہے۔ حال حال تک روس السی ارجنٹائن سے خریدا کرتا تھا لیکن اب ہندوستان سے خریدتا ہے۔

دن بہ دن ہندوستان کے صنعتی ملک بننے کے امکانات قوی تر ہوتے جا رہے ہیں۔ نئے نئے کارخانے عالمِ وجود میں آ رہے ہیں جن میں روغنیات کی کھپت لازمی ہوگی ـــ اور نئی نئی صنعتیں بھی وجود میں آئیں گی۔ ایسی صورت میں السی کے لیے بھی ترقی کے امکانات ہیں جس کی صنعتی اہمیت مسلّم ہے۔

سرپور پیپر ملز

از جناب مولوی شرف الدین صاحب بی۔اے (عثمانیہ)

رات کے وقت جب مسافر قاضی پیٹ سے بلہار شاہ کی جانب ریل کا سفر کرتے ہوئے کاغذ نگر کے اسٹیشن پر پہونچتا ہے تو وہ فوراً محسوس کرتا ہے کہ یہاں سرگرمی کا کوئی نیا مرکز آباد ہوا ہے۔ دور سے برقی روشنی کی جگمگاہٹ پہلی مرتبہ نظر آئے تو کوئی خیال نہیں گزرتا کہ اس جنگل میں بیابان میں انسان نے اپنی ذہانت و جودت کے کوئی جوہر دکھائے ہوں گے۔ لیکن جوں جوں اسٹیشن قریب آتا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسافر ایک ایسے مقام سے قریب تر ہو رہا ہے جہاں علم، جوش عمل اور حب وطن نے اپنی شان دار نمائش کے خواب کو ریاست کے صنعتی افق پر دکھایا ہے۔

اسٹیشن پر پہونچنے کے بعد مسافر کی حیثیت مہمان میں تبدیل ہو جاتی ہے اور بجلی کی روشنی سے منور سڑکوں پر سے تیز رفتار سواری میں گزرتے ہوئے ایسے مہمان خانہ میں پہونچتا ہے جہاں ساری عصری ضرورتیں مہیا ہیں۔

بستر پر پڑے پڑے کسی دل نواز صبح کے انتظار میں جبکہ ابھی کوئل کی کوک شروع نہ ہوئی ہو انسان کا خیال کاغذ اور کاغذ سازی کی تاریخ میں کچھ ضرور الجھتا ہے۔

علم کے پھیلنے اور پھیلانے میں کاغذ کا جو درجہ ہے وہ کس سے پوشیدہ ہے وہ شخص دنیائے علم کا ایک محسن اعظم تھا جس نے کاغذ ایجاد کیا۔ جن لوگوں نے اس صنعت کو ترقی دی اور اس کو معمولی قیمت پر عام دسترس میں کر دیا وہ بھی علم و تمدن کے محسن ہی شمار ہوں گے۔

ہمارے ملک کی پستی اور پریشانی کا اصلی سبب علم کی کمی اور علم سے بے توجہی رہی ہے اس ملک میں علم کے پھیلنے اور پھیلانے کا جو سامان خود ملک میں مہیا ہو تا جائے خوشی اور مسرت کا باعث ہے اس سلسلہ میں کاغذ کی سستی فراہمی کے لئے جن محبان وطن نے

کوشش کی اور کامیابی حاصل کی وہ تعریف اور ستایش سے بالا ہیں۔ مملکت آصفیہ میں علم پھیلانے کے لئے سرنوپر کا کارخانۂ کاغذ سازی ایک نشان راہ ثابت ہوگا۔

جذبات اور امیدوں میں وقت گذرتا جائے اور ابھی صبح ہونے میں دیر ہو تو ذہن میں کاغذسازی کی تاریخ بھی تازہ ہوتی ہے۔

کاغذسازی کی تاریخ

دو ہزار سال قبل مسیح میں قدیم مصری پیپرس (بردی) کے بنے ہوئے ورق پر لکھا کرتے تھے پیپرس دریائے نیل کی وادی میں اگتا ہے جس سے ایک قسم کا کاغذ بنایا جاتا تھا حقیقت میں اس کو کاغذ کا پیش خیمہ تصور کرنا چاہیئے۔ اسی طرح قدیم زمانہ میں ایرانی چمڑے پر لکھا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس چیز پر لکھنا درست نہیں جو ہمارے ملک میں نہ بنتی ہو۔

قدیم چین میں بھی کاغذسازی کی صنعت وجود میں آئی۔ یہاں کپاس کو اس غرض کے لئے استعمال کیا جاتا تھا قبل اس کے کہ عربوں کو کاغذسازی کا علم ہوتا اہل عرب اپنی تحریریں دوسری چیزوں کے ساتھ ریشم پر بھی لکھا کرتے تھے۔ آنحضرت صلعم نے کسریٰ کے نام جو مکتوب تحریر فرمایا تھا وہ ادیم ہی پر لکھا گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں قرطاس کا استعمال عام ہوتا گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کا زمانۂ خلافت (۹۹ھ) آیا تو اس زمانے میں قرطاس بہت عام ہوگیا تھا۔ لیکن ایک گراں چیز تھی۔ چنانچہ قرطاس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو بھی بیکار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ شروع میں قرطاس کے صرف ایک رخ پر لکھا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اسے بھی فضول خرچی سمجھا گیا اور دونوں رخ تحریر کے لئے استعمال ہونے لگے۔ اس کے بعد کفایت شعاری کا خیال اس قدر ترقی کرتا گیا کہ لوگ پرانے قرطاس کو دھو ڈالتے تھے اور پھر نئی تحریروں کے لئے اس کو استعمال کرتے تھے۔ غرض آٹھویں صدی عیسوی میں عربوں نے چینیوں سے کاغذسازی کا فن سیکھا اور اس کو پہلے سمرقند بغداد میں اور پھر تمام دنیا میں پھیلا دیا۔

ہارون الرشید کے زمانہ میں بغداد میں سب سے پہلے دستی کاغذسازی کا کارخانہ قایم ہوا۔

خلیفہ معتصم (سنہ ۲۲۱ھ) نے قرطاس کے تیار کرنے کا ایک کارخانہ سامرا میں قایم کیا تھا اور اس کے لئے کاریگر مصر سے طلب کئے تھے۔ کیونکہ یہ خدشہ تھا کہ مصر میں فتنہ و فساد کی وجہ سے قرطاس کی رسد کسی وقت بھی گھٹ سکتی ہے۔ وہاں اکثر بغاوتیں ہوا کرتی تھیں اور ایسی بغاوتوں کے مضر اثرات سے بچنے کے لئے یہ کارخانہ قایم کیا گیا تھا۔ مشرقی دنیائے اسلام سے یہ صنعت گیارہویں صدی عیسوی میں مراکش پہنچی اور وہاں سے آبنائے جبل الطارق کو عبور کرکے بارہویں صدی میں اسپین میں بمقام شاطبہ نکنہ ترقی حاصل کرلی اسپین کے بعد اٹلی میں اور اس کے بعد فرانس میں کاغذسازی کی صنعت جاری ہوئی۔ سنہ ۱۳۳۶ء میں جرمنی میں کاغذسازی کا پہلا کارخانہ قائم ہوا ہے۔

سنہ ۱۴۹۶ء میں انگلستان میں کاغذسازی کا پہلا کارخانہ وجود میں آیا جس کو جان ٹائی لارڈ میئر آف لندن کے فرزند نے سیلی ملز کے نام سے ہرٹ فورڈ میں قایم کیا۔ اس کے بعد خانہ جنگیوں ملکی اور حفظان صحت کے نقطۂ نظر سے کارخانوں کی مخالفت کے باعث اس صنعت کو فروغ حاصل نہیں ہوا لیکن سنہ ۱۶۷۸ء کے بعد سے کاغذسازی کی صنعت انگلستان میں مستقل بنیادوں پر قایم ہوگئی۔ امریکہ میں سنہ ۱۶۹۰ء میں صنعت کاغذسازی کی ابتدا ہوئی۔

ہندوستان میں کاغذسازی

ہندوستان میں کاغذ کی جدید صنعت کا آغاز سنہ ۱۸۷۰ء سے ہوتا ہے جب کہ دریائے ہگلی کے کنارے بیلی ملز قایم ہوئی۔ ٹیٹاگڑھ پیپر ملز کا قیام سنہ ۱۸۸۲ء میں آیا۔ بابائی گھاس شمالی ہند میں کثرت سے پیدا ہوتی ہے جو اس صنعت کے لئے اصلی خام پیداوار ہے لیکن ہندوستانی پیپر ملیں بانس کے گودے سے کاغذ بناتی ہیں۔ یہ نئی ترقی بہت امید افزا ثابت ہوئی۔ ہندوستان میں کاغذ کے اس وقت چودہ کارخانے ہیں لیکن موجودہ زمانہ میں ان کی تعداد ناکافی ثابت ہو رہی ہے۔ اس کمی کی وجہ سے بھی کاغذ کی قیمتوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ موجودہ عالمگیر جنگ سے قبل ہندوستان میں سالانہ دو لاکھ ٹن کاغذ کی کھپت تھی جس میں سے تقریباً ۱½ لاکھ ٹن کاغذ بیرون ہند سے آتا تھا۔ اور صرف

صرف لاکھوں کا کاغذ ہندوستانی کارخانوں میں تیار ہوتا تھا۔ ان کارخانوں کو بیرونی کارخانوں سے سخت مقابلہ کرنا پڑتا تھا اس کی وجہ سے مرکزی مجلس مقننہ میں ہندوستانی صنعت کاغذسازی و ترقی دینے کے لئے حکومت کو بیرونی کاغذ پر محصول درآمد عاید کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس تامینی محصول سے ہندوستانی صنعت کاغذسازی کو بہت فائدہ حاصل ہوا اور گذشتہ چند سال میں اس صنعت نے کافی ترقی حاصل کرلی ہے۔

مملکت آصفیہ میں کاغذسازی

دولت آباد کے ایک محلہ موسوم بہ کاغذی پورہ کو جواب ایک چھوٹے سے گاؤں کی حیثیت میں آباد ہے کاغذسازی میں کئی صدیوں سے شہرت حاصل تھی۔ ہر قسم کی سرکاری مراسلت اور کتب کے لئے اسی مقام کا کاغذ استعمال کیا جاتا تھا۔ دولت آباد کی ویرانی اور تباہی کے ساتھ ہی وہاں کی صنعت پر اثر پڑنے لگا تاہم پچاس ساٹھ سال قبل چھ سات سو گھرانے اس کی تیاری میں مصروف رہتے تھے اور اس کی بدولت خوش حال زندگی بسر کرتے تھے بیرونی کاغذ کے رواج کے ساتھ یہاں کی صنعت پر تباہی آگئی اور اب صرف چار، پانچ گھرانے ایسے میں کاغذ بنا کرتا ہے۔ دولت آباد کے علاوہ کاغذ بلدۂ حیدرآباد، کریم نگر، جگتیال، اور کوٹلہ میں تیار ہوتا تھا یہ مقامات بھی اچھی حالت میں تھے مگر اب زوال پذیر ہیں۔

مملکت آصفیہ میں عصری پیمانہ پر کاغذسازی کی نوید اہل ملک کو اس وقت سنائی گئی تھی جبکہ سر اکبر حیدری مرحوم نے قیام باب حکومت کے بعد کچھ دن کے لئے صدر ناظم صنعت و حرفت کے فرائض انجام دیئے تھے اس زمانہ میں سر اکبر نے مملکت آصفیہ کی صنعتی ترقی کے امکانات اور سرکاری کوششوں کی نسبت ایک طویل رزولیوشن اور اس کے ساتھ ڈاکٹر فاڈلر کی ایک مفصل یادداشت ۲۲۔ آبان ۱۳۲۸ف کو شائع کی تھی من جملہ دیگر امور کے اس میں کاغذسازی کے امکانات اور اس کے جاری کرنے کے خیال کا بھی اظہار ہوا تھا۔ ڈاکٹر فاڈلر نے خیال ظاہر کیا تھا کہ اسی کے بانسل سے کاغذ تیار ہوسکے گا۔

غرض اس زمانہ میں سرکاری دارالتجربہ قایم ہوا تو اس کے سلسلہ میں سرکاری طور پہ یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ جو اسٹاف مقرر کیا گیا ہے اس میں ایسے افراد بھی شامل ہیں جن کو کاغذ سازی کے بھی عام معلومات حاصل ہیں۔ غرض اس وقت یہ تہیہ کرلیا گیا تھا کہ کاغذ سازی کا کارخانہ بھی قایم کیا جائے گا۔ اور سرکاری طور سے یہ اعلان ہوا کہ

"ابتدائی ضروری معلومات بغرض قیام گرنی حاصل ہوگئے ہیں قیام گرنی سے اس ملک کے صرفہ کاغذ کی سربراہی ہوجائے گی جو درآمد سے پوری کی جاتی ہے"

لیکن زمانہ گذرتا گیا۔ اور اہل ملک کو جو خوشخبری دی گئی تھی وہ ابھی صرف فضا میں گونجتی رہی۔

ملک کی خوش قسمتی تھی کہ اسی دوران میں جناب خواجہ نظام الدین صاحب نے انگلستان میں تعلیم حاصل کی اور کاغذ سازی کا علم اور تجربہ حاصل کیا۔ انگلستان سے واپسی کے بعد وہ برابر ان امپیریل میں رہے۔ اور سرکاری دارالتجربہ میں تجربہ پہ تجربہ کرتے رہے۔ ۱۹۳۱ء میں صاحب موصوف اور محمد مولابخش صاحب نائب ناظم جنگلات نے ایک مشترکہ رپورٹ شایع کی اس رپورٹ میں یہ ظاہر کیا گیا کہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے اضلاع عادل آباد، کریم نگر، ورنگل اور محبوب نگر میں بانس کے بڑے بڑے جنگل موجود ہیں جہاں بانس کثرت سے پیدا ہوتا ہے ضلع عادل آباد میں سب سے اچھی قسم کا بانس پایا جاتا ہے لیکن ہر قسم کی کوشش اور جدوجہد کے باوجود اہل ملک کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا اور جناب خواجہ نظام الدین صاحب بھی شاید اپنی سعی و کوشش کو لاحاصل سمجھنے لگے لیکن ان کے صبر کا پیمانہ کبھی لبریز نہیں ہوا۔ انھوں نے اپنی کوشش اور اپنا تجربہ برابر جاری رکھا۔

سر اکبر حیدری کے رزولیوشن شایع ہونے کے بعد ۲۰ برس گزر گئے اور غالباً جناب خواجہ نظام الدین صاحب نے بھی اپنی جدوجہد کے دس برس گزار دیئے۔ جب کہ حیدرآباد اکنامک اسوسیشن کے پلیٹ فارم پر جناب سید عارف الدین صاحب نے پھر آواز بلند کی۔ اپنے ایک

مضمون میں جو صاحب موصوف نے ۲۹ ۔ نومبر ۱۹۳۵ء کو متذکرہ صدر ادارہ میں پڑھا ۔ مملکت آصفیہ میں کاغذسازی کے ایک روشن ترین مستقبل کا بھی تذکرہ کیا ۔ صاحب موصوف نے بیان کیا کہ

دو کچھ عرصہ قبل سررشتۂ جنگلات اور سررشتۂ صنعت نے ضلع آصف آباد میں کاغذسازی کا کارخانہ قائم کرنے کے امکانات کی تحقیقات کی تھی ۔ تاحال کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا ۔ ان تحقیقات نے دو اہم امور ثابت کر دیئے ہیں ۔

ایک تو یہ امر کہ آصف آباد کے قرب و جوار میں ایک معقول رقبہ میں بانس کی پیداوار ہوتی ہے ۔ اس سے کاغذ کے بنانے کا بہتر گودا تیار ہو سکتا ہے ۔ ملک میں استعمال ہونے والا ہر قسم کا کاغذ اس سے بنایا جا سکتا ہے ۔ البتہ اخباری کاغذ اس سے تیار نہیں ہو سکتا ۔

دوسرا امر یہ ہے کہ کوئلہ بھی اسی رقبہ میں حاصل ہو سکتا ہے ۔ کاغذ کے کارخانہ سے چند میل کے فاصلہ پر کوئلہ کے معدن موجود ہونے اور کوئلہ حاصل ہونے کا جو فائدہ ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ایک ٹن کاغذ کے لئے ۵ ٹن کوئلہ کی ضرورت ہوتی ہے ۔ .... اگر کوئی کارخانہ سالانہ ... ۵ ٹن کاغذ بنائے تو کارخانے سے کوئلہ قریب ہونے کے باعث سالانہ دو لاکھ روپے کی اخراجات میں کفایت ہوگی ۔

ہندوستان بھر میں کسی کارخانہ کاغذسازی کو بانس اور کوئلہ کے اس قدر قریب ہونے کا فائدہ حاصل نہیں ہے ۔ بعض کارخانوں سے جنگل یا کوئلہ سیکڑوں میل دور ہے ۔

میرے خیال میں عادل آباد کے جنگل میں ایسی نرم لکڑی موجود ہے جس سے سستا اخباری کاغذ بنانے کا کامیاب تجربہ کیا جا سکتا ہے ۔

ان فوائد کے ساتھ جو شکل کسی ایک جگہ حاصل ہو سکتے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ

کوئی کارخانہ کاغذسازی کیوں نہ کامیاب ثابت ہوگا؟"

یہ مخلصانہ صدا بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ ۱۰ سال گذر گئے اور ہم پہلے جہاں تھے وہاں ہی رہے۔

لیکن اس زمانے میں جناب میر لائق علی صاحب نے سرکاری نوکری کے تنگ دائرہ کو اپنی ذہانت، قوت تنظیم، اور جوشِ عمل کے مظاہرہ کے لئے بہت چھوٹا خیال کیا اور ہمت وجرأت سے کام آغاز کرکے کاروبار زندگی کی برتری اور فوقیت روز روشن کی طرح ثابت کردی۔

شکر سازی سے اس ملک کو شیریں کام کرنے کے بعد حیدرآباد کنسٹرکشن کمپنی نے اپنے باہمت رہبر میر لائق علی صاحب کی رہنمائی میں عادل آباد کے جنگل میں کاغذسازی کی مہم سر کرنے کی ٹھان لی۔

ان خیالات میں کچھ دیر گم ہونے اور رفعت پسندی کے دوسرے خواب دیکھنے کے بعد صبح ہونے پر اس آبادی میں جو تجربہ پہلے ہوتا ہے وہ بانس کی سینکڑوں بنڈیوں کے مسلسل چلے آنے کا نظارہ ہے۔ بانس سے بھری ہوئی یہ بنڈیاں روزانہ اس آبادی میں آتیں اور اپنا بانس اتارتیں اور پھر نیا بانس لانے کے لئے چلی جاتی ہیں۔ صرف اسی ایک بات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حرکت میں کس قدر برکت ہے، اور اس پیمانہ کے ایک کارخانہ سے روزی اور روزگار کا کیا کچھ سامان مہیا ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ کہیں مکانات کی تعمیر ہو رہی ہے کہیں سڑکیں نکالی جا رہی ہیں، کہیں جھاڑ لگائے جا رہے ہیں۔ شفاخانہ، دواخانہ، مسجد و مدرسہ بھی تعمیر ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ غرض ہر طرف کام اور عمل کی آبادی نظر آتی ہے۔

سرپور پیپر ملز کا قیام

کاغذسازی کے کارخانہ کے لئے وہی مقام موزوں ہو سکتا ہے جہاں بانس کا جنگل موجود ہو، قریب میں دریا بہتی ہو چونے اور کوئلے کے معدن قریب ہوں اور جہاں پائے جائیں نقل و حمل کی سہولتیں

میسر ہوں۔ یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ایک ٹن کاغذ کی تیاری کے لئے ۲ ۱/۲ ٹن بانس، ۳ ۱/۲ ٹن کوئلہ اور ۱/۲ ٹن چونا مطلوب ہوتا ہے۔

مذکورۂ بالا اشیاء سرپور پیپر ملز کے ۲۵ میل کے رقبہ کے اندر واقع ہیں جس سے مصارف پیداوار میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

سرپور پیپر ملز موضع کتہ پیٹ میں واقع ہے۔ اس کے اطراف بانس کے گھنے جنگل موجود ہیں ضلع عادل آباد میں بانس کے جنگل کا رقبہ ایک لاکھ ۱۸ ہزار ایکڑ پر مشتمل ہے، پداواگوندی دو میل پر ملتی ہے چونا بھی قریب میں دستیاب ہو رہا ہے۔ کتہ پیٹ سے ایک اسٹیشن اور ہے بلم پلی کے معدن زغال ہیں۔ کتہ پیٹ قاضی پیٹ اور بلہارشاہ ریلوے لائن پر واقع ہے اس کی وجہ سے کاغذ کے نقل و حمل میں بھی بڑی سہولت پیدا ہو گئی ہے۔

فروری ۱۹۳۹ء میں سرپور پیپر ملز کا قیام عمل میں آیا۔ اور حیدرآباد کنسٹرکشن کمپنی نے اس کی مینجنگ ایجنسی قبول کی۔

سرپور پیپر ملز کا مجوزہ سرمایہ ایک کروڑ روپے اور جاری شدہ سرمایہ کی مقدار ۴۵ لاکھ روپے سکۂ عثمانیہ ہے۔ جسے سو سو روپے کے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حکومت سرکار عالی نے انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ سے ۱۵ لاکھ روپے کے حصص خرید کئے ہیں جس کی وجہ سے سرکاری تائید بھی اس کارخانہ کو حاصل ہے۔

اس کارخانہ نے بانس اگانے کے لئے کارلا پیٹ اور کدمبہ کے جنگلات کے رقبہ جات تیس سال کے لئے پٹہ پر حاصل کئے ہیں۔ یہ کمپنی حق شاہی تین روپیہ آٹھ آنے فی ٹن بانس ادا کرتی ہے لیکن مجموعی رقم کسی حال میں ۲۵ ہزار روپے سالانہ سے کم نہ ہوگی۔

کارخانہ کا قیام عمل میں آتے ہی جولائی ۱۹۳۹ء میں مشنری کا آرڈر دیا گیا لیکن اس کے دو ماہ بعد ہی عالمگیر جنگ شروع ہو گئی اس کی وجہ سے مشنری کے آنے میں تاخیر کیا ہوئی کہ کارفرماؤں کی ہمت اور صبر کا امتحان بھی ہوا۔ انھوں نے ہمت نہیں ہاری سویڈن کی کچھ مشنری روس سے ہوتے ہوئے خلیج فارس کے راستہ سے آئی باقی مشنری امریکہ اور انگلستان سے کچھ مشنری ہندوستان سے بلکہ خود حیدرآباد

میں اپنی نگرانی میں تیار کرلی۔ جنگ کی وجہ سے جو کمی پیدا ہوتی گئی اس کا کچھ نہ کچھ بدل پیدا کرلیا۔ اور ہر قسم کا کاغذ بننے لگا۔ اس کارخانہ میں سالانہ پانچ تا چھ ہزار ٹن کاغذ بنانے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

مملکت آصفیہ میں بیرونی کاغذ دو ہزار ٹن درآمد ہوا کرتا تھا اس کارخانے کی بدولت حیدرآباد اب کاغذ کے لئے خود مکتفی ہوچکا ہے۔

کاغذ کی تیاری

کارخانہ کے شور و غل میں کاغذ بنتے ہوئے دیکھنا بہت صبر آزما ہوتا ہے۔ سب سے پہلے خام بانس کٹتے جاتے ہیں جن کو لاکھوں کی تعداد میں ذخیرہ کرلیا گیا ہے۔ بانس کٹ کر چورہ ہوجاتا ہے۔ بیکار کچرا الگ کرلیا جاتا ہے، کارآمد چورہ ہوا کے دباؤ سے اوپر کے حصے میں چڑھایا جاتا ہے۔ یہاں گودا تیار ہوتا ہے اس کو چار پانچ گھنٹے تک خوب پکایا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس میں کاسٹک سوڈے کا محلول ملایا جاتا ہے بانس کے گودے کو اس کے بعد کوٹا جاتا ہے، رنگین کاغذ بنانا ہو تو یہیں اس کا عمل کیا جاتا ہے۔ کاغذ کو سفید کرنے کے لئے رنگ کٹ سفوف ملایا جاتا ہے۔ بعد ازاں کاغذ بن کر آتا اور پھر کٹتا جاتا ہے اس طرح بارہ گھنٹے کے عرصہ میں ایک بے قیمت بانس سے کاغذ تیار ہوجاتا ہے۔ ان کاغذوں کو گن کر بنڈل بنائے جاتے ہیں اور فرمایش کے مطابق ان کو ریل کے ذریعہ روانہ کردیا جاتا ہے۔ اس کارخانہ میں بانس کے علاوہ پھٹے پرانے اور مستعمل کپڑوں سے بھی کاغذ تیار کیا جاتا ہے۔

رفاہی کام

سرپور پیپر ملز نے ڈیڑھ ہزار اشخاص کے لئے روزگار فراہم کردیا ہے۔ جنگ کی وجہ سے دن رات کام ہو رہا ہے۔ تین جماعتیں باری باری سے کام کررہی ہیں یعنے ہر مزدور سے آٹھ گھنٹے کام لیا جاتا ہے۔ پندرہ دن میں ایک دن کی تعطیل دی جاتی ہے۔

اس کارخانہ کے لئے کرتہ پیٹ ریلوے اسٹیشن سے بالکل متصل چھ سو ایکڑ کی اراضی حاصل کی گئی ہے اور اس رقبہ میں فیاکٹری کی وسیع اور بلند عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ اس تمام اراضی کو پیمایش کرکے مختلف قطعات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کارخانہ کی عمارت عملہ کے کوارٹرس عہدہ داروں کے رہائشی مکانات اور مزدوروں کیلئے چھوٹے مکانات

تعمیر کیے گئے ہیں۔ رفاہ عام کے کاموں میں مدرسہ، دواخانہ، تجا اور شفا خانہ تعمیر کیے گئے ہیں۔ بڑی اور کشادہ سڑکیں نکالی گئی ہیں اور آب رسانی کی اسکیم بھی مکمل کر لی گئی ہے۔ خود یہ اسکیم فن کا ایک کارنامہ ہے اور یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ملک کے اہل فن اپنے علم کو حالات سے مطابق کرنے پر پوری طرح قادر ہیں۔ امداد باہمی کا ایک اسٹور بھی قائم ہے جہاں غلہ اور شکر وغیرہ سستے داموں فروخت کی جاتی ہے۔

سرپور پیپر ملز کے اعلیٰ عہدہ داروں میں شہرتونگاب ایک … انجینئر خواجہ نظام الدین صاحب تو اس ساری سرگرمی کے روح رواں ہیں۔ انھوں نے ملک میں کاغذ سازی کی صنعت جاری کی۔ یہ … جو کامیاب سعی کی اس کا درخشان نتیجہ مبارک باد کے لائق ہے۔

حیدرآباد میں بہت کم لوگوں کو اپنی سعی کو بارآور ہوتے ہوئے دیکھنا میسر ہوتا ہے یہ دراصل خواجہ نظام الدین صاحب کی اخلاص مندی تھی کہ انھوں نے اپنی کوشش کا نتیجہ بھی دیکھ لیا۔ ان کے اطمینان قلب اور روحانی خوشی کا کوئی دوسرا اندازہ نہیں کر سکتا۔

ایک برکت جو جناب میر لائق علی صاحب کی مساعی سے ملک کو حاصل ہوئی وہ ملک کے ذی سول اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے نہ صرف قوت لا یموت، بلکہ اطمینان اور فارغ البالی کا حصول ہے۔ خود سرپور پیپر ملز میں جامعۂ عثمانیہ کے کتنے طالب علم برسر روزگار ہیں۔ دوسرے کارخانوں اور اداروں کو اس سے سبق لینا ضروری ہے۔ اگر ملک کے دوسرے … کے بڑے کارخانوں اور وسیع اور پھیلے ہوئے کاروبار میں اہل ملک کی تربیت کا اسی طرح انتظام عمل میں نہ آیا جس طرح کہ حیدرآباد کنسٹرکشن کمپنی کے کارخانوں میں انتظام عمل میں آیا ہے تو یہ ملک کی کماحقہ خدمت نہیں ہو سکتی۔ ملک میں ان کارخانوں کے وجود سے یہ منشا نہیں ہونا چاہیئے کہ ملک کے چند سو یا چند ہزار مزدوروں کی معمولی مزدوری کا انتظام ہو جائے بلکہ ان کارخانوں میں ملک کے ہونہار نوجوانوں کی ایسی تربیت بھی ہونی چاہیئے کہ وہ غیروں سے بے نیاز ہو جائیں اور کارخانے اس نظام کو ملک کے طول و عرض میں کامیابی کے ساتھ وسعت دے سکیں۔

سرکاری نوکری کے مقابل یہ دیکھا گیا کہ اس کارخانہ میں روزگار کا حصول زیادہ محنت اور زیادہ عرق ریزی کا طالب ہے۔ گو بیس فی صدی گرانی الونس، بلا کرایہ مکان، مفت روشنی اور صاف پانی کا انتظام ہے طبی امداد بھی بلا معاوضہ حاصل ہوتی ہے اور دوسری رعاتیں بھی حاصل ہونگی لیکن سوسائٹی سے دور تھکا دینے والے کام کی مشقت صبر آزما ہے۔ لیکن ان نوجوانوں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ ایک خوشحال حیدرآباد کی بنیاد ڈال رہے ہیں۔ ان کی محنت اور کوششوں سے اہل ملک سے اہلی اور ناواقفیت کا الزام دور ہوگا۔ اور ترقی و سربلندی کا راستہ طے ہوگا۔ ان نوجوانوں میں سے ہی ایسے لوگ پیدا ہوجائیں گے جو ملک کے معاشی مسائل کو حل کریں گے۔

مملکت آصفیہ میں صنعتی نظام کی ترقی کے ساتھ ساتھ کارخانوں کے مزدوروں کے مسائل بھی اہمیت اختیار کرتے جارہے ہیں۔ دنیا کے موجودہ نظام نے اس طبقہ میں بیداری کے آثار پیدا کردیئے ہیں آجکل مزدوروں کو اس امر کا بڑھتا ہوا احساس ہونے لگا ہے کہ اب آجروں کو ان سے کچھ زیادہ ہمدردی نہیں ہے۔ کیونکہ ان کو اجرتیں قلیل دی جاتی ہیں اور معیار زندگی بڑھانے کا موقع نہیں دیا جاتا صنعتی و حرفتی تعلیم کے ناقص انتظام کی وجہ سے ہنرمند مزدوروں کی موجودہ تعداد ضروریات کے لحاظ سے کافی ثابت نہیں ہورہی ہے۔ صنعتی مرکزوں کے حالات بھی کچھ ایسے حوصلہ افزا نہیں جو مزدور کو اپنی طرف کھینچیں۔ اوقات کار، ہوا، روشنی، آب رسانی اور سکونت کا غیر معقول انتظام یہ سب امور حوصلہ شکن ثابت ہورہے ہیں۔

لیکن ان تمام دقتوں کو دور کرنے کی کوشش سرپور پیپر ملز میں ہی جاں تک جاری ہے۔ صفائی اور حفظان صحت کے تشفی بخش انتظامات کئے گئے ہیں۔ مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کے لئے مکانات مہیا کئے گئے ہیں۔ مزید مکانات زیر تعمیر ہیں۔ مزدوروں کے لئے جھونپڑیوں کے بجائے مکانوں، ان کے بچوں کیلئے مرکز بہبودی اطفال، ماؤں کے لئے زچگی خانوں کا انتظام بھی توقع ہے کہ جلد ہو جائے گا علاوہ ازیں شبینہ مدارس، بازی گاہوں، دارالمطالعہ اور امداد باہمی کے ذخائر کی ضرورت بھی رفع ہوجائیگی بیمہ کی سہولتیں بھی اس کارخانے کو مہیا کرنا چاہیئے کیمیائی تجربہ خانے وسیع ہوجائیں تو ملک کے دوسرے

مسائل بھی حل ہوں گے۔ مزدوروں کی بہت ساری خرابیوں کی اصلی وجہ یہ ہے کہ مزدور تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔ اور اپنی پستی کا احساس نہیں کر سکتے۔ بہتر صورت ہوگی اگر ایسے بچوں کی تعلیم پر زیادہ توجہ کی جائے جو کارخانہ میں ابھی ملازم نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ نہ صرف بچوں کی تعلیم پر اکتفا کیا جائے بلکہ تعلیم بالغان کی طرف بھی توجہ کی جائے۔ ایسے مزدور بہت ہی کم ملیں گے جو آٹھ گھنٹے کی محنت کے بعد تعلیم حاصل کرنے کے شوقین نظر آئیں۔ بہتر صورت تو یہی ہو سکتی ہے کہ چند منتخب مزدوروں کے لئے انھیں کے اوقات کار میں تھوڑا وقت معین کر دیا جائے تاکہ یہ تعلیم حاصل کر سکیں۔ ساتھ ہی ساتھ تھوڑی بہت فنی تعلیم کا بھی انتظام ہونا مناسب ہوگا۔

غرض جناب میر لائق علی صاحب کی رہنمائی میں ملک کے متعدد سرگرم ارباب فن نے اپنی فن دانی اور تنظیم کا جو قابل ستایش مظاہرہ مہیا کیا ہے خوشی اور مسرت کے ساتھ اس کے دیکھنے کا موقع میسر ہوا۔ مملکت آصفیہ کے طول و عرض میں کاغذ سازی پارچہ بافی اور تیل جیسے بیسیوں چھوٹے بڑے کارخانے قایم ہو سکتے اور ملک سے غربت و افلاس کا سد باب کر سکتے ہیں۔

یہ خبریں آ رہی ہیں کہ دوسرے مشرقی ممالک مثل مصر اور شام وغیرہ میں خود جنگ کے دوران کا ایک علحدہ نظام العمل تیار ہو رہا ہے اور جنگ کے بعد کیلئے علحدہ تجاویز پیش نظر ہیں اسی طرح ہمارے ملک میں بھی اس نوعیت کے انتظامات ہو سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ افراد ملک ہمت اور جرأت کے ساتھ آگے بڑھیں اور اپنی دولت و ثروت کو ہمارے ملک کی خوشحالی کا ذریعہ بنائیں۔ جو موقع حاصل ہے اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے تو پھر ملک کی ترقی اور سربلندی میں مشکلیں پیش آئیں گی۔ اور آیندہ نسلیں بے عملی اور کوتاہی کا ہم پہ الزام رکھیں گی۔ فقط

ہندوستان اور کثرت آبادی کا مسئلہ

از جناب سید فخرالحسن استاذ معاشیات و عمرانیات جامعہ عثمانیہ

کسی ملک کی آبادی کے علمی مطالعے کو عام طور پر دو اہم حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ جس میں آبادی کی تعداد اور اس کے اضافہ و کمی کے اسباب وغیرہ سے بحث کی جائے۔ دوسرے وہ جس میں آبادی کی تعداد اور معیشت کے تعلقات سے یعنے آبادی کا اثر ملک کی خوشحالی پر کیا پڑ رہا ہے۔

ہندوستان کی آبادی سے متعلق اول الذکر حصہ کا جہاں تک تعلق ہے وہ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن اس سلسلے میں جو معلومات ہمیں حاصل ہوتے ہیں وہ زیادہ مختلف فیہ ہیں اس لئے میں اس وقت ان پر بحث کرنا نہیں چاہتا البتہ دوسرا جز یعنے آبادی کا ہماری معیشت سے کیا تعلق ہے اس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ ہندوستان کی معیشت کے بعض دیگر مسائل کی طرح یہاں کی آبادی کے مسئلے کا جز بھی اپنی اہمیت کے ساتھ ساتھ زیادہ مختلف فیہ بنا ہوا ہے۔ ہر وہ شخص جو ہندوستان کی معاشی پستی اور افلاس کا ذمہ دار غیر ملکی حکومت کو قرار دیتا ہے وہ عموماً یہاں کی کثرت آبادی کا منکر نظر آتا ہے۔ برخلاف اس کے اکثر معاشیین یا یوں کہیے کہ بعض نام نہاد غیر جانبدار حضرات اس امر کے مدعی ہیں کہ ہندوستان کی آبادی بہت زیادہ ہے جس کا غیر معمولی بار یہاں کی معیشت پر پڑ رہا ہے لہٰذا آبادی کو بے روک ٹوک بڑھنے نہ دیا جائے ورنہ مالتھس کے بھوت کے پنجے کا ہم بری طرح شکار بن جائیں گے۔

حالیہ مردم شماری کی رو سے ہندوستان کی آبادی تقریباً ۳۹ کروڑ ہے جس میں برما کی آبادی شامل نہیں۔ آج سے ساٹھ سال قبل یعنے ۱۸۸۱ء میں یہاں کی آبادی برما کی آبادی کو خارج کرتے ہوئے تقریباً ۲۵ کروڑ تھی جس کے معنے یہ ہوئے کہ گزشتہ ساٹھ سال میں یہاں کی آبادی میں

۴ کروڑ یا ۵۶ فیصد کا اضافہ ہوا اب اگر ہم اس کا مقابلہ بعض دیگر ممالک کے کم و بیش اس زمانے کی ساٹھ سالہ مدت یعنی سنہ ۱۸۷۰ء تا سنہ ۱۹۳۰ء کے اضافہ آبادی سے کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر ترقی یافتہ ممالک میں آبادی کی رفتار اضافہ تیز تر رہی مثلاً انگلستان میں ۷۷ فیصد جرمنی میں ۶۰ فیصد اٹلی میں ۴۲ فیصد اور ان میں سب سے کہیں زیادہ روس، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جاپان میں جہاں علی الترتیب ۱۱۵، ۱۳۵، اور ۱۴۳ فیصد کا اضافہ ہوا۔

ظاہر ہے کہ دیگر ممالک کے مندرجہ بالا اضافہ آبادی کی رفتار کے پیش نظر اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہندوستان کی آبادی کا اضافہ کچھ ایسا زیادہ نہیں جسے خطرناک قرار دیا جائے تو بادی النظر میں وہ حق بجانب معلوم ہوگا۔ اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلے ان ممالک کو آبادی کے اضافہ کا خطرہ محسوس کرنا چاہیئے نہ کہ ہندوستان کو۔ بے شک ہندوستان کی آبادی کی شرح اضافہ دیگر ممالک کے مقابلہ میں اکثر کم اور بہت کم ہے لیکن عملی طور پر اضافہ آبادی کی نسبتاً یہ سست رفتاری بھی اس مسئلہ کی اہمیت سے غافل نہیں کرسکتی۔ یہ ایک ضروری امر ہے کہ آبادی اور معیشت کے تعلق کا مطالعہ کیا جائے اور اس بات کی تحقیق کی جائے کہ اضافہ کی رفتار عام اس سے کہ وہ دیگر ممالک کے مقابل کم ہی کیوں نہ ہو اس کا اثر ہماری معیشت پر کیا پڑ رہا ہے۔ اور آیا یہ کہنا کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے کہ ہندوستان کثرت آبادی کا شکار رہے اور جب تک یہاں کی آبادی کے بڑھتے ہوئے رجحان کو روکنے کی کوشش نہ کی جائے ہمارے افلاس کا یہ ایک اہم سبب بنا رہے گا۔

کسی ملک کی آبادی کی کثرت و قلت کا تصور متوازن آبادی کے نظریے سے وابستہ ہے یعنی یہ کہ کسی خاص جگہ اور خاص حالات میں آبادی اور قدرتی وسائل جن کو دولت پیدا کرنے کے کام میں لایا جاسکتا ہے ایک ایسا توازن ہونا چاہیئے کہ بیشترین دولت پیدا ہوسکے اگر بیشترین دولت پیدا نہیں ہو رہی ہے تو پھر آبادی غیر متوازن ہے اور اس عدم توازن کی حالت میں اگر آبادی کی کمی کے سبب سے قدرتی وسائل کو کام میں نہیں لاسکتے اور ان سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے تو یہ صورت قلت آبادی کی ہوگی۔ برخلاف اس کے اگر آبادی اس قدر زیادہ ہے جو قدرتی وسائل

کو کام میں لانے کے لئے ضروری تعداد سے زیادہ ہے تو پھر یہ کثرت آبادی کی صورت کہلائے گی۔

متوازن آبادی کے اسی تصور کے تحت ہندوستان کے بعض معاشیین نے کثرت اور قلت آبادی کی صورت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مسٹر ڈنل نے سنہ ۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء کی آبادی میں سالانہ ایک فیصد اور زرعی پیداوار میں ۰۵ ء ۰ فیصد اضافے کا تخمینہ کرتے ہوئے کثرت آبادی کا خیال ظاہر کیا ہے۔ پروفیسر گیان چند نے بھی ہندوستان کی کثرت آبادی کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۳۴ء تک آبادی اور زیر کاشت رقبہ زمین میں علی الترتیب ۲۱ اور ۱۱ فیصد کا اضافہ بتلایا ہے۔ لیکن پروفیسر پی۔ جے ٹامس کا تخمینہ یہ ہے کہ سنہ ۱۹۱۰ء سے سنہ ۱۹۳۱ء تک آبادی میں ۵ ء ۱۳ فیصد اضافہ ہوا اور زرعی پیداوار میں ۲۹ فیصد اور صنعت میں ۹ ء ۱۸ فیصد، لہذا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ پیدائش دولت کے اضافہ کی رفتار آبادی کے اضافہ کی رفتار کا ساتھ نہیں دے رہی ہے اور آبادی کا ہماری معیشت پر بار پڑ رہا ہے۔

کم و بیش ایک ہی طریق تحقیق کے باوجود مندرجہ بالا تخمینوں کے ایسے متضاد نتائج کوئی تعجب خیز امر نہیں جبکہ ہندوستان میں صحیح اعداد و شمار کا بکمال دستیاب ہونا مشکل ہے۔ لیکن مسئلہ زیر بحث میں مزید شبہ اور اختلاف کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ تاوقتیکہ ان تخمینوں کی صحت و عدم صحت کا پتہ نہ چلایا جائے۔ لیکن اس جھگڑے میں پڑنے کے بجائے ہم ایک دوسرے طریقے سے کام لے کر دیکھتے ہیں کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اور اس سے کثرت آبادی کی تائید ہوتی ہے یا قلت آبادی کی۔

متوازن آبادی کے خالص معاشی تصور ہی کے تحت کثرت و قلت آبادی کا پتہ چلانے کی جو کسوٹی سب سے زیادہ مناسب اور بہتر سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ جب تک اضافہ آبادی کے ساتھ ساتھ اوسط آمدنی فی کس میں بھی اضافہ ہوتا رہے تو یہ ماننا پڑیگا کہ کثرت آبادی کا وجود نہیں ہے۔ چنانچہ کار سانڈرس Carr Saunders، جیسے مستند ماہر مسئلہ آبادی کا بھی یہی خیال ہے جس کی تائید دیگر معاشیین نے بھی کی ہے۔ لہذا اسی چیز کے پیش نظر اگر ہمیں دو باتوں کا علم ہو جائے تو

قلت یا کثرت آبادی کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ ایک تو گذشتہ کے مقابلہ میں موجودہ آبادی کی شرح اضافہ و تخفیف دوسرے گذشتہ آبادی کی فی کس آمدنی کے مقابلے میں موجودہ آبادی کی فی کس آمدنی کی شرح۔

ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ گذشتہ کے مقابلے میں آبادی مسلسل طور پر بڑھ رہی ہے۔ اب رہا فی کس آمد کا سوال۔ اس سلسلے میں اگرچہ قومی آمدنی کے مختلف تخمینے کئے گئے ہیں جو اول تو مختلف اصول کے تحت دوسرے بڑی حد تک ان کی صحت مشتبہ ہے لیکن پھر بھی ہمیں دو معاشین کے تخمینے ملتے ہیں جو بڑی حد تک ہمارے موجودہ مقصد کے لئے کارآمد ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی راؤ نے دو مختلف مدتوں میں ہندوستان کی قومی آمدنی کا تخمینہ کیا ہے ایک تو ۱۹۲۵-۲۹ء دوسرے ۱۹۳۱-۳۲ء اول الذکر مدت کا جو تخمینہ کیا گیا ہے اس میں فی کس آمدنی ۷۷ روپے اور ثانی الذکر فی کس ۶۰.۶ روپے ہوتی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فی کس آمدنی میں تخفیف ہوئی اس تخفیف کے رجحان کی تائید ایک دوسرے ممتاز معاشی کے تخمینے سے بھی ہوتی ہے۔ میری مراد مسٹر فنڈلے شیراس سے ہے جنہوں نے آج سے چند سال پہلے ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۳ء تک کے سالانہ فی کس آمدنی کے تغیرات کا تخمینہ کیا تھا جو ۱۰۹ روپے سے گھٹ کر ۶۳ روپے ہوگئی تھی نیز ان آمدنیوں کا ۱۹۱۱ء کی قیمتوں کے لحاظ سے بھی اندازہ لگایا تھا اور اس اعتبار سے بھی آمدنی میں تخفیف کا پتہ چلا یعنے فی کس آمدنی ۹۵ روپے سے ۴۷ روپے ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ اوسط آمدنی فی کس کے یہ دونوں تخمینے تخفیف کے رجحان کو ظاہر کرتے ہیں اور چونکہ ان کے ذریعہ کثرت آبادی کا حکم لگانا زیادہ صحیح سمجھا جا سکتا ہے اور نیز وہ طریقے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ان کے کثرت آبادی والے نتائج کی تائید ہوتی ہے لہذا علمی طور پر بظاہر کسی شخص کو کثرت آبادی کے وجود سے انکار کی جرات نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ طریق تحقیق کی اصولی خامی اور اعداد و شمار کی غلطی ثابت نہ کر دی جائے۔

یہاں پر بطور جملہ معترضہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ بعض ماہرین بھی کسی مسئلے کے متعلق اپنا ایک خاص خیال رکھتے ہیں اور اسی کو ثابت کرنے کے لئے ایسا طریقہ اختیار کرتے اور اعداد و شمار کے ذریعہ کچھ اسی طرح تخمینے کر لیتے ہیں کہ جن سے ان کے خیال کی تائید ہو جاتی ہے الغرض

ایسی تحریریں جو ان کے خیال کی حمایت نہیں کرتیں ان سے اغماض کر جاتے ہیں چنانچہ اسی امر کے پیش نظر ممکن ہے مسٹر ٹامس اور پروفیسر کیلیان چند وغیرہ کے تخمینے اور رائے کو بھی بے حقیقت نہ سمجھا جائے۔ لیکن ابھی پروفیسر جونز کس اوسط آمدنی والے طریقے کو استعمال کرتے ہوئے کثرت آبادی کا حکم لگایا ہے۔ نتیجہ اس پر اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی اسلئے کہ یہ طریقہ اول تو ہر ایک مسئلہ آبادی کا تسلیم کردہ ہے دوسرے آمدنی کے تخمینے نہ صرف غیر جانبدار معاشین کے ہیں بلکہ دیگر تخمینوں کے مقابلے میں صحت سے زیادہ قریب ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہم اس بنا پر تسلیم کر لیں کہ ہندوستان کثرت آبادی کا شکار ہے اور اسی لئے آبادی کو روکنے کا عملی اقدام کرنا ناگزیر ہے؟ یا یہ کہ مسئلہ زیر بحث ہنوز تصفیہ طلب ہے میرے خیال میں اب بھی ہندوستان کی کثرت آبادی پر قطعیت کے ساتھ حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ تمام اعداد و شمار صحیح ہیں اور تخمینۂ آمدنی کے تخمینے میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں تو بھی یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ آبادی کی کثرت ہے کیونکہ متوازن آبادی کا نظریہ خود بھی نامکمل اور اپنے اندر بعض ایسی خامیاں رکھتا ہے اور اس تصور کے تحت جو طریقے کثرت و قلت معلوم کرنے کے استعمال کئے جاتے ہیں وہ بھی بعض نقص رکھتے ہیں جس کی بنا پر ایک خاص آبادی کو کثرت و قلت دونوں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہاں پر چونکہ اس نظریے کے تمام اہم تصورات و معیارات[عہ] کے ذکر کا موقع نہیں ہے لہذا میں بعض ایسے امور کا ذکر کر دینا ہی کافی سمجھتا ہوں جن کے پیش نظر ہندوستان کی آبادی کثیر اور زیادہ از ضرورت بتانا خالص معاشی نقطۂ نظر سے بھی کچھ زیادہ درست معلوم نہیں ہوتا۔

عہ متوازن آبادی کے مختلف تصورات و معیارات ہیں جن کا ذکر متعلقہ ادب میں پایا جاتا ہے۔ البتہ ایک خاص تصور یعنی متوازن آبادی کا عمرانی تصور بھی ہو سکتا ہے۔ جسے معاشیین نے اب تک نظر انداز کر رکھا ہے۔ حالانکہ انسان کی اجتماعی زندگی کے لحاظ سے بہت اہم ہے خصوصاً جبکہ انسان بالکل معاشی انسان نہیں ہے۔ اس تصور پر ایک مستقل کتاب راقم الحروف کے زیر تصنیف ہے۔

اس سلسلے میں یہ چیز قابل ذکر ہے کہ ہم کثرت آبادی کے متذکرہ بالا علمی استدلال کو صحیح ماننے کے لئے زیادہ تر اس لئے بھی تیار ہو جاتے ہیں کہ ہندوستان کی تقریباً ۴۰ کروڑ آبادی کے ساتھ ساتھ یہاں کی انتہائی غربت بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے اور ہم نفسیاتی طور پر کثرت آبادی کی رائے پر آمنا و صدقنا کہہ دیتے ہیں۔ اگر ہندوستان اپنی موجودہ آبادی کے ساتھ بہت متمول ملک ہوتا اور ہمارے سامنے غربت کے بجائے امارت کا نقشہ ہوتا تو یقیناً ہم کبھی بھی کثرت آبادی کا دکھڑا نہ روتے اور اگر کوئی شخص فی کس آمدنی کا تخمینہ کرتے ہوئے یہ بتاتا کہ فی کس آمدنی فرض کیجئے دس سال کے عرصے میں دس ہزار سے کم ہو کر نو ہزار نو سو ننانوے ہو گئی ہے۔ لہٰذا ہندوستان کثرت آبادی کا شکار ہے تو ہم اسے پاگل کہتے حالانکہ متوازن آبادی کے خالص معاشی تصور کے لحاظ سے نظری طور پر اس کا ایسا کہنا درست ہوگا۔

باین ہمہ یہ واضح رہے کہ متوازن آبادی کے نظریہ کی بنیاد قانون تکثیر و تقلیل حاصل پر ہے اور اس میں یہ چیز فرض کر لی جاتی ہے کہ زیر بحث تمام آبادی پیدائش دولت میں کسی نہ کسی طرح حصہ لے رہی ہے اور جب کبھی آبادی کی مقدار کا وسائل قدرت پر بار پڑنے لگتا ہے تو دولت کی پیدائش کی مقدار کم ہونے لگتی ہے ورنہ اس کے برعکس نتیجہ نکلتا ہے۔ اسی مفروضے کے تحت پہلے تو ہم صرف اسی مقدار آبادی کو قابل بحث قرار دیں گے جو پیدائش دولت میں حصہ لے رہی ہو اور بقیہ آبادی یعنی غیر کارگذار آبادی کو خارج از بحث قرار دیں گے اس کے بعد پھر دیکھیں گے کہ کارگذار آبادی میں سے کس قدر وسائل قدرت پر بار ثابت ہو رہی ہے لیکن اس سلسلے میں یہ بات بھولنی نہیں چاہئے کہ خاص کر موجودہ زمانے میں کوئی ایسا ملک نہیں ہے خواہ کتنا ہی خوشحال کیوں نہ ہو جہاں آبادی کا کچھ نہ کچھ حصہ غیر کارگذار ہوتا ہو۔ بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس قدر بھی کوئی ملک معاشی خوشحالی اور پیدائش دولت میں عقلی تنظیم کے لحاظ سے ترقی کرتا جائے گا وہاں غیر کارگذار آبادی کی تعداد بڑھتی جائے گی۔ چنانچہ اس خیال کے پیش نظر مسٹر جی۔ ڈی برلا، ہندوستان کے مشہور مارواڑی سرمایہ دار نے آل انڈیا آرگنائزیشن آف ایمپلائرس کے ایک سالانہ اجلاس میں یہ کہا تھا کہ اگر صنعتی مزدور زرعی مزدور کے مقابلے میں بہت زیادہ اجرت طلب کریں گے تو کارخانوں میں عقلی تنظیم کے ذریعہ محنت کے

بجائے مشین سے زیادہ کام لیا جائے گا۔ اور زیادہ اجرت کے ساتھ ساتھ مزدوروں کی بیکاری بڑھ جائے گی۔ غرض ایسی صورت میں متوازن آبادی کے تصور کے تحت ظاہر ہے کہ باوجود اوسط آمدنی میں اضافہ کے رجحان کے بھی ایسی تمام غیر کارگذار آبادی کو زائد از ضرورت قرار دیا جائے گا کیونکہ اس کو خارج کرنے سے فی کس آمدنی کا اوسط پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہو جائے گا اور اس نظریے کی رو سے اس وقت تک وہ ملک بیش آباد سمجھا جائے گا جب تک کہ ایک شخص کے وجود کو بھی خارج کر دینے سے اوسط آمدنی میں ایک پائی کا بھی اضافہ ممکن ہو۔ بقول پروفیسر رابنس (L. Robbins) "نظری طور پر ایک ایسی باعث کا تصور کیا جا سکتا ہے جس کے تمام افراد کروڑپتی کی زندگی بسر کرتے ہوں لیکن اگر ایک فرد کی کمی سے بھی دیگر افراد کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے تو معاشی مفہوم میں اسے کثرت آبادی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے"۔ ظاہر ہے کہ یہ استدلال علمی اعتبار سے مضحکہ انگیز ہے۔ لیکن اس امر سے تو انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ جوں جوں کوئی ملک معاشی لحاظ سے ترقی کرتا جائے گا اور وہاں پیدائش دولت مختلف شعبوں میں جس قدر بھی عقلی تنظیم یعنی محنت کی بجائے مشین کا استعمال بڑھتا جائے گا۔ غیر کارگذار آبادی کی تعداد بھی بڑھتی جائے گی۔ اور کثرت آبادی کے حکم لگنے کا امکان بھی بڑھتا جائے گا۔ تو گویا معلوم ہوا کہ اس نظریے کا یہ ایک ایسا نقص ہے جس کی بنا پر دنیا کا ہر ملک کم و بیش کثرت آبادی کا شکار کہلا سکتا ہے عام اس سے کہ وہاں آمدنی میں اضافہ کا رجحان ہو یا نہ ہو۔

دنیا کے اکثر دولت مند ممالک میں تقریباً نصف یا نصف سے زیادہ آبادی غیر کارگذار ہے۔ مثلاً جرمنی میں ۴۸ فیصد فرانس میں ۴۴ فیصد روس میں ۸۴ فیصد انگلستان میں ۵۴ فیصد جاپان میں ۵۷ فیصد اٹلی میں ۵۲ فیصد ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۶۰ فیصد کینیڈا میں ۶۳ فیصد لیکن ہم ایسے ممالک پر اس سختی سے کثرت آبادی کا حکم نہیں لگانے حالانکہ اگر یہ غیر کارگذار آبادی کا وجود نہ ہوتا تو یقیناً وہاں فی کس اوسط آمدنی میں اضافہ نظر آتا۔ ہندوستان میں جہاں غیر کارگذار آبادی تقریباً ۵۷ فیصد جو جاپان کے مساوی امریکہ اور کینیڈا سے کم اور انگلستان سے کچھ ہی زیادہ ہے اگر ہم اسے فالتو قرار دیں تو بھی ظاہر ہے کہ

موجودہ فی کس آمدنی زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو یا دو سو روپے ہو سکے گی۔ اور غربت علیٰ حالہٖ قائم رہے گی۔ لہٰذا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اگر ہم ہندوستان کی موجودہ آبادی کو کثیر سمجھتے ہوتے اس کے اضافے میں رکاوٹ کے بجائے اگر اس میں کمی کرنا بھی بس کی بات ہو تو بھی غربت دور نہیں ہو سکتی لہٰذا آمدنی کی ایسی قلت جو غربت کی دلیل ہو آبادی کی کثرت کی دلیل نہیں ہو سکتی اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آمدنی کی یہ قلت آبادی اور وسائل کے درمیان آبادی کی کثرت کے سبب سے عدم توازن ہونے کا نتیجہ ہے بلکہ اس کے برعکس وسائل کا مکمل اور بہتر استعمال نہ ہونے کی وجہ سے عدم توازن کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے کیونکہ خود نظریۂ توازن کے صحیح معاشی تصور کی بناء پر بھی یہ مفروضہ لازم آتا ہے کہ ملک کے تمام علاوہ وسائل سے بہتر طور پر کام لیا جائے۔ لیکن یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ملک کے گونہ گوں وسائل کی فراوانی کا موزوں اور بہتر استعمال نہیں ہو رہا ہے۔ بہت سارے وسائل بیکار پڑے ہیں جس کی وجہ سے پیدائش دولت میں آبادی اور وسائل کے درمیان ایک بدترین قسم کا عدم توازن پایا جاتا ہے جس کا نتیجہ قلت آمدنی اور غربت ہے۔

پس معلوم ہوا کہ جس تصور کے تحت ہم کثرت آبادی کا خیال پیش کرتے ہیں اور آبادی کے روکنے کے مختلف موزوں اور ناموزوں طریقے کی پرچار کرتے ہیں وہ نہ تو صحیح ہے۔ اور نہ اصل مرض کا علاج۔ روس اور جاپان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جہاں آبادی کی رفتار اضافہ ہندوستان سے بہت زیادہ ہے لیکن باوجود اس کے وہاں ہندوستان کی طرح غربت و افلاس نہیں ہے۔ محض اس لئے کہ آبادی کو روکنے کے بجائے جو ایک ذیلی شئے ہے۔ وہاں اصلی اور بنیادی نقص کو دور کیا گیا یعنے مختلف شعبہ ہائے پیدائش میں ترقی کی صورت نکالی گئی اور وسائل قدرت کو پورے طور پر کام میں لانے کا طریقہ اختیار کیا گیا۔

آخر میں میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ہندوستان کی کثرت آبادی کا موجودہ نقطۂ خیال ـــــ عام اس سے کہ واقعتاً کثرت آبادی پر ہی مبنی ہو ایک۔ ایسی تجویز پر آمادہ کرتا ہے

جس سے اگر ایک طرف نسل انسانی کی تکثیر و بقا میں اصلاح کے بجائے تباہ کن رکاوٹ پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے تو دوسری طرف غربت و افلاس کے دور ہونے کا بھی کوئی یقین نہیں۔ انسان کی اجتماعی زندگی کا صرف ایک ہی پہلو اور وہ معاشی پہلو نہیں ہے بلکہ سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی پہلو بھی ہے اور اس لحاظ سے آبادی کا مسئلہ نہ صرف معیشت کا بلکہ سیاست، معاشرت اور اخلاق کا بھی مسئلہ ہے۔ لہٰذا مسئلہ آبادی کا مطالعہ ایک عمرانی اور تمدنی تصور کا محتاج ہے جب تک ہم عمرانی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کی تحقیق نہیں کریں گے اس میں کسی قسم کی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

مسئلہ آبادی کے سلسلے میں ہمارا لائحہ عمل یہ ہونا چاہیئے کہ ہندوستان کے تمام وسائل قدرت کو بہتر اور پورے طور پر کام میں لانے کی کوشش کریں اور آبادی کو محنت کا صحیح درجہ دیتے ہوئے اس میں کمی کے بجائے اصلاح کے ذریعہ کارکردگی بڑھانے کی طرف توجہ کریں۔ تاکہ ہماری غربت و افلاس کے دور ہونے کے ساتھ ساتھ آبادی کے غیر معمولی اضافہ میں اگر واقعی ایسا ہے تو ایک فطری اور صحت بخش رکاوٹ خود بخود پیدا ہو جائے جب تک ہم اس نقطۂ نظر سے آبادی کے مسئلہ پر غور نہ کریں گے اور اس طرح کا لائحہ عمل اختیار نہ کریں گے ہندوستان انسانوں کی ایسی بستی نہیں بن سکتا جو ایک ایسے معاشرے کو پیش کرے جس کے ارکان نہ تو بیکاری اور نہ گروہیت کی غیر انسانی اور مصنوعی زندگی بسر کرتے نظر آئیں بلکہ ان کی زندگی انسانیت کے شایان شان ہو اور جہاں تسکین حیات کا سامان بھی پورا ہو سکے۔ فقط

تنقید و تبصرہ

ٹرانسپورٹ ڈائرکٹری۔ شائع کردہ انجمن آسایش مسافران حیدرآباد دکن۔
ملنے کا پتہ۔ ریلوے بک اسٹال دبیرپورہ۔ قیمت ایک آنہ سکہ عثمانیہ۔ حجم ۲۲ صفحات لکھائی چھپائی اوسط۔

ٹرانسپورٹ ڈائرکٹری سال میں دو دفعہ یکم اکتوبر اور یکم اپریل کو انجمن آسایش مسافران حیدرآباد دکن کی جانب سے شائع ہوتی ہے۔ اس وقت اس کی اپریل کی اشاعت ہمارے پیش نظر ہے۔

یہ انجمن سنہ ۱۹۱۴ء سے قائم ہے۔ حمل و نقل میں سہولتوں کے لیے ارباب متعلقہ کو توجہ دلاتی ہے۔ انجمن کی جانب سے عوام کے لیے مختلف سہولتیں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے

گذشتہ سال سے اس انجمن نے ایک عملی قدم آگے بڑھایا ہے اور ٹرانسپورٹ ڈائرکٹری شائع کرنے کا سلسلہ قائم کیا ہے۔ اس میں حمل و نقل وغیرہ سے متعلق تفصیلات درج ہیں مثلاً شرح ٹیکسی، بس کے اوقات، ریلوے کے اوقات، ہوائی جہاز کے اوقات، کرایہ جات، شرح حمالی و کلداری، فہرست بنگلہ جات تعمیرات سرکار عالی و لوکل فنڈ اور تعداد کروڑگیری ممالک آصفیہ کے ریلوں کا نقشہ بھی درج کیا گیا ہے۔

ٹرانسپورٹ ڈائرکٹری اردو میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے۔ سررشتہ ریلوے سرکار عالی کی جانب سے اگرچہ ٹرانسپورٹ ڈائرکٹری شائع ہوتی ہے مگر وہ سرکاری زبان میں نہیں ہوتی اور اس سے مملکت آصفیہ کا ایک محدود انگریزی داں طبقہ ہی استفادہ کرتا ہے۔ ایک خانگی ادارہ کی جانب سے اس قسم کی کوشش قابل مبارکباد ہے۔

اس ڈائرکٹری میں مملکت آصفیہ کے آثار قدیمہ، مذہبی زیارت گاہیں، صنعتی و تجارتی مراکز کی صرف فہرست درج کی گئی ہے۔ اگر آیندہ ان کے مختصر حالات بھی درج کیے جائیں تو مناسب ہوگا فقط

"ش"

جاپان کی صنعتی ترقی

تالیف جناب ناصر علی صاحب، ام، اے (عثمانیہ) لکچرار معاشیات جامعہ عثمانیہ۔

زیر نظر کتاب سنہ ۱۸۶۸ء یعنے میجی دور کی ابتدا سے سنہ ۱۹۳۵ء تک جاپان کی صنعت کاری کی ایک مبسوط تاریخ ہے۔ ڈاکٹر انور اقبال قریشی نے اس پر ایک تعارفی پیش لفظ بھی لکھا ہے۔

مولف کتاب ناصر علی صاحب جامعہ کے ان ہونہار فرزندوں میں سے ہیں جن کے ذوق تحقیق و جستجو کا اظہار زمانۂ طالب علمی ہی سے ہو رہا تھا۔ چنانچہ آپ کے متعدد تحقیقی مضامین اور مقالے ملک کے بلند پایہ علمی رسائل میں شایع ہو چکے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی ان مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو رسالہ "سیاست" میں شایع ہوتے رہے ہیں۔

جیسا کہ ڈاکٹر قریشی نے پیش لفظ میں اشارہ کیا ہے، اس مقالہ پر کسی طرح یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا مقصد کسی قسم کا پروپگنڈا ہے بلکہ یہ ایک علمی کوشش ہے جس سے عملی فائدہ اٹھانا اہل ملک کا کام ہے۔ اگرچہ جاپان ہمارا حریف ملک ہے لیکن اس کی صنعتی ترقی ہمارے لئے سبق آموز اور لائق تقلید ہے۔ وسط انیسویں صدی تک جاپان کی صنعتی حالت بہت پست تھی لیکن اس قوم میں سنہ ۱۸۶۸ء سے ترقی کا جذبہ پیدا ہوا اور سیاسی، معاشرتی اور معاشی اصلاح کا ایک متوازن اور انقلابی پروگرام بنایا گیا جس کو روبعمل لانے میں حکومت نے نمایاں حصہ لیا۔ جاپان کے اقتصادی حالات بالکل ہمارے ملک کے سے تھے۔ عوام صنعتی کاروبار میں سرمایہ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اس دقت کو حل کرنے کے لئے حکومت نے اپنی طرف سے کاروبار جاری کئے اور جب اس کاروبار نے ترقی کی تو ملکی سرمایہ داروں نے اس طرف توجہ کی اور رفتہ رفتہ صنعتی کاروبار میں حکومت کا حصہ گھٹنے اور پبلک کا بڑھنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیسویں صدی کی ابتدا اور بالخصوص جنگ عظیم

کے دوران میں اور اس کے بعد جملہ صنعتی کاروبار خانگی افراد کے ہاتھ میں آگیا ۔

قابل مؤلف نے مختلف صنعتوں کے سنہ واری اعداد و شمار دے کر واضح کیا ہے کہ اواخر انیسویں صدی میں جاپان میں ضروری مصنوعات درآمد کی جاتی تھیں لیکن نصف صدی کے اندر اپنی اعلیٰ صنعتی تنظیم کی وجہ اس نے اتنی ترقی حاصل کی کہ بین الاقوامی بازار پر اس کی مصنوعات نے قبضہ کرلیا۔ اور ان کا مقابلہ کرنا دشوار ہوگیا۔ مؤلف کے الفاظ میں " ۱۸۶۸ء میں جاپان ایک پسماندہ صنعتی ملک تھا۔ اس کے بعد سے اس نے صنعت و حرفت کے شعبہ جات میں حیرت انگیز طریق پر ترقی کرنا شروع کی حتیٰ کہ جنگ عظیم کے اختتام تک اس نے اکثر و بیشتر صنعتوں میں ترقی کا اعلیٰ درجہ حاصل کرلیا۔ چنانچہ جاپان کا شمار دنیا کے اہم ترین صنعتی ممالک میں ہوتا ہے "۔ گذشتہ پون صدی میں جاپان کی حیرت انگیز صنعتی ترقی کسی ایک سبب یا وجہ کا نتیجہ نہیں بلکہ مختلف قوتیں اور محرکات اس کا باعث ہیں مثلاً قومی ترقی کے جذبات، حاکم و محکوم کا اشتراک، متوازن پروگرام کی ترتیب، حکومت کی جد و جہد، تعلیم کی عمومیت، نقل و حمل اور خبر رسانی کی ترقی، شرح نقل و حمل اور شرح خبر رسانی کی موزونیت، بنک کاری کی سہولتیں، دس دس سال کے وقفے سے تین جنگوں کا تسلسل، طلب کی زیادتی اور پیدائش کے وسیع مواقع، چھوٹے پیمانے کی پیدائش، ارزان محنت اور زائد اوقات کار، تامینی مسلک، مالی امداد کا طریقہ، سرکاری فرمائشات، صنعتی تحقیق اور تشہیر کے باضابطہ اور موثر انتظامات، صنعتی تنظیم کے اعلیٰ معیار، پیدائش کے طریقوں کی اصلاح، ترقی یافتہ مشنری کی ایجاد، اور استعمال نے صدیوں کی ترقی کو سالوں میں اور سالوں کی ترقی کو مہینوں میں ممکن بنادیا ۔

زیر نظر کتاب دس ابواب اور (۵۷) صفحات پر مشتمل ہے :-

۱۔ تاریخی پس منظر ۔ ۲۔ دور جدید اور صنعتی ترقی ۳۔ بنائی کی صنعتیں ۴۔ معدنی صنعتیں ۵۔ میکانی صنعتیں ۶۔ کیمیائی صنعتیں ۷۔ سرامک صنعتیں ۸۔ غذائی صنعتیں ۔

۹ [illegible]

آخر پر ان کتب کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ جو اس کتاب کی ترتیب میں زیر مطالعہ رہی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے بڑے وسیع اور وقت طلب مطالعہ کے بعد زیر بحث کتاب ترتیب دی ہے اور بڑی خوبی سے سادہ زبان اور سلیس اسلوب بیان میں جاپان کی تقریباً ایک صد سالہ صنعتی تاریخ کو ایک مختصر سی کتاب میں سمو دیا ہے۔ جا بجا ضروری جدولوں کے ذریعہ مختلف صنعتوں کی ترقی کو واضح کیا گیا ہے۔ اس اختصاصی موضوع پر اتنا مواد کسی ایک جگہ اب تک پیش نہیں کیا گیا۔ اردو دنیا میں یہ ایک بالکل جدید کوشش ہے۔ جو حضرات معاشیات سے دلچسپی رکھتے ہوں اور ترقی یافتہ صنعتی ممالک کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے یہ کتاب دلچسپ، مفید اور پر از معلومات ثابت ہوگی۔

کتابت و طباعت عمدہ، بڑی تقطیع۔ قیمت د عہم ر

س، م، ت، ہ

ہندوستانی معاشیات کے مبادی

پہلا باب

قدرتی ذرائع اور آبادی

معاشیات ہند کا مفہوم عام طور پر معاشیات ہند سے مراد ہندوستان کے معاشی مسائل کا مطالعہ ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے معاشی حالات اور ان سے متعلقہ امور کی تشریح و نیز اصلاحی تدابیر بحث کی جائے اس بحث سے مقصد محض علم کی تحصیل نہیں ہے۔ بلکہ اس کے سوا یہ دریافت کرنا بھی ہے کہ کس طرح ملک اور اہل ملک کو دولت مند اور خوشحال بنایا جا سکتا ہے۔

بیان کی وسعت اس باب میں ہندوستان کی ہیئت طبعی، قدرتی ذرائع کیفیت آبادی اور عمرانی اور مذہبی اداروں کے معاشی پہلو سے بحث کرنی مقصود ہے اور اس سلسلہ میں مملکت حیدرآباد کے متعلق بھی ضروری امور کی صراحت کی جائے گی۔

ہیئت طبعی اور قدرتی ذرائع

(معاشی جغرافیہ ہند)

رقبہ و آبادی سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق برطانوی ہند کا رقبہ دس لاکھ ۹۶ ہزار ایک سو ... مربع میل اور آبادی ۲۴ کروڑ ۷۰ لاکھ نفوس ہے۔ اس کے علاوہ دیسی ریاستوں اور ایجنسیوں کا رقبہ ۷ لاکھ ۱۱ ہزار ۳۲ مربع میل اور آبادی ۷ کروڑ ۲۰ لاکھ اس طرح مجموعی ملک کا کل رقبہ ۱۸ لاکھ ۵ ہزار دو سو تین مربع میل اور

آبادی ۳۵ کروڑ ۹۰ لاکھ نفوس ہے۔ ملک کا طول شمالاً جنوباً تقریباً دو ہزار میل اور شرقاً غرباً تقریباً دو ہزار ایک سو میل ہے سرحدی رقبہ تقریباً چھ ہزار اور ساحلی علاقہ پانچ ہزار میل کے قریب ہے اس طرح ہندوستان بجائے خود ایک دنیا ہے جو برطانیہ عظمیٰ سے بیس گنا اور روس کو چھوڑ کر براعظم یورپ کے برابر ہے۔ مملکت حیدرآباد کا رقبہ ۸۲۶۹۸ مربع میل اور آبادی ایک کروڑ ۶۳ لاکھ ۳۸ ہزار ۵ سو ۳۴ نفوس ہے۔

جغرافی محل وقوع ہندوستان کی قدرتی سرحدیں بہت نمایاں ہیں۔ شمال میں ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے شمال مغرب میں کوہ ہندوکش اور کوہ سلیمان اور شمال مشرقی سرحد پر برما ہے جو یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے قبل برطانوی ہند میں شامل تھا۔ درۂ خیبر اور درۂ بولان ہندوستان کے وہ خشکی کے راستے ہیں جو ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر واقع ہیں اور ہندوستان کو افغانستان و بلوچستان سے ملاتے ہیں۔ ہندوستان کا ساحل مغرب میں بحیرۂ عرب اور مشرق میں خلیج بنگال سے گھرا ہوا ہے اس طرح سمندری راستے سے ہندوستان میں آمد و رفت بہت آسان ہے دنیا کے دیگر حصص کے مقابلے میں ہندوستان کو بین الاقوامی تجارت کے لئے بہت اچھے موقع حاصل ہیں کیونکہ یہ ملک مشرقی نصف کرہ کے درمیان واقع ہے اور اس کو ہر قسم کے تجارتی راستے پر قابو حاصل ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں قدرتی بندرگاہوں کی کمی ہے اس کی وجہ سے جدید طرز کے بڑے جہازوں کو ٹھیرانے میں مشکل پیش آتی ہے۔ مغربی ساحل پر صرف کراچی، بمبئی، گوا، اور کوچن قابل ذکر بندرگاہیں ہیں مشرقی ساحل پر کوئی قدرتی بندرگاہ نہیں ہے۔ مدراس کی بندرگاہ کی موجودہ اہمیت کثیر اخراجات کی رہین منت ہے۔ اسی ساحل پر ویزاگاپٹم واقع ہے جس کی بندرگاہ بتدریج اہمیت اختیار کرتی جارہی ہے۔ خلیج بنگالہ کے ساحل پر کلکتہ کا محل وقوع قدرتاً بہت اچھا ہے لیکن ہگلی کی وجہ سے مزاحمت ہوتی ہے اور کیچڑ کو ہمیشہ صاف کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے چٹاگانگ کی بھی یہی حالت ہے۔ اس سے بڑی آسانی کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ہندوستان کی تجارت خارجہ بڑی حد تک صرف چار بندرگاہوں یعنی کلکتہ بمبئی، مدراس، اور کراچی تک ہی کیوں محدود رہی ہے۔ ساحلی اور سمندری تجارت کے مفاد کی غرض سے جدید اور قدیم اجڑی ہوئی بندرگاہوں کی از سر نو تعمیر فوری طور پر اختیار کی جارہی ہے۔

ہندوستان کی موجودہ جہازرانی کی حالت۔ ناقابل اطمینان ہے مشکل ہی کوئی تجارتی جہاز ایسا ہوگا جو

ہندستان کی قدیم جہاز رانی کی روایات کو برقرار رکھتا ہو جہاز رانی کے سلسلہ میں ایک اقدامی پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت پر باب پنجم میں بحث کی گئی ہے۔

جہاں تک اندرونی حمل ونقل کا تعلق ہے ہندستان کی بڑی بندرگاہوں کو تجارتی مرکزوں سے متحد کرنے کے لئے ریلوں اور سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا ہے۔ داخلی حمل نقل کے لئے شمالی ہند میں سندھ اور گنگا جیسے قابل جہاز رانی دریاؤں کی وجہ سے سہولتیں موجود ہیں اور وسیع میدانوں کی بدولت سڑکوں اور ریلوں کی تعمیر میں آسانی ہوتی ہے جنوبی ہند میں ایسی سہولتیں پائی نہیں جاتیں کیوں کہ یہ علاقہ ناہموار اور پہاڑی ہے اور سال تمام بہنے والے بڑے دریاؤں کی کمی ہے۔ ہندستان کے دیہی علاقوں میں ذریعہ حمل ونقل یعنے ریل اور سڑک کی حالت بہت خراب اور فوری توجہ کی محتاج ہے، ڈاک خانہ اور تار گھر اب ہندستان میں کافی طور پر مانوس اور وسعت پذیر ہیں لیکن ٹیلیفون اور لاسلکی جن کی اہمیت موجودہ تجارت اور معاشی جدوجہد میں پوری طرح مسلم ہو چکی ہے ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہیں ٹیلیفون کا استعمال صرف بڑے شہروں تک محدود ہے تاہم بحیثیت مجموعی اندرونی حمل ونقل کی جدید سہولتوں کے باعث شہری آبادی سے دیہاتی معاشی زندگی کی بیگانگی اب افسانۂ ماضی بن چکی ہے۔

ہندوستان کی تقسیم تین نمایاں حصوں میں۔ ہندستان حسب ذیل تین نمایاں حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) جزیرہ نمائے دکن (۲) دریائے سندھ اور گنگا کا میدان (شمالی ہندستان) (۳) کوہستان ہمالیہ

(۱) **جزیرہ نمائے دکن۔** یہ ایک بلند سطح مرتفع ہے۔ جسے بندھیاچل اور ست پڑا کے پہاڑی سلسلے دریائے سندھ اور گنگا کے میدانوں سے جدا کرتے ہیں۔ اس کے متصل ساحلی سلسلے ہیں جو مغربی گھاٹ اور مشرقی گھاٹ کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ ایک مثلث نما حصہ ہے جس کا سرا راس کماری کہلاتا ہے دکن کی یہ سطح مرتفع ناہموار اور پتھریلی ہے۔ پہاڑیوں کی چوٹیاں جنگلی درختوں سے کم وبیش ڈھکی ہوئی ہیں مغربی گھاٹ کا سلسلہ ایک مسلسل بحری دیوار کا کام دیتا ہے۔ یہ پہاڑی سلسلے باد برشکال کو روکتے ہیں جس کے باعث بارش لازماً پہاڑی حدود اور سمندر کے درمیانی تنگ قطعہ پر ہی جو کوکن کہلاتا ہے ہوتی ہے لامحالہ اندرونی حصہ

خشک اور قحط زدہ رہتا ہے۔

مملکت حیدرآباد بھی اسی جزیرہ نما میں واقع ہے۔ اس مملکت کو دو نمایاں حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک مغربی حصہ اور دوسرا مشرقی حصہ۔ پہلا حصہ مرہٹواڑی کہلاتا ہے اور دوسرا حصہ تلنگانہ۔ یہ حصے نہ صرف معاشرتی لحاظ سے بلکہ طبعی لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

دکن کے بڑے دریا نربدا، تاپتی، مہاندی، گوداوری، کرشنا اور کاویری ہیں، ان دریاؤں کا انحصار بارش پر ہے اور ہمالیہ کے دریاؤں کی طرح ہمیشہ بہتے نہیں رہتے۔ جہاں برف پگھلنے کی وجہ سے موسم گرما میں بھی پانی موجود رہتا ہے۔ جنوبی ہند کے دریا نہ صرف موسم گرما میں خشک ہی ہوجاتے ہیں بلکہ ان میں سے بعض دریاؤں کا راستہ پہاڑی دروں میں سے ہو کر گذرتا ہے جس کی وجہ سے جہاز رانی ناممکن اور مصارف آب پاشی گراں ہوجاتے ہیں۔

مملکت آصفیہ میں دو بڑے دریا گوداوری اور کرشنا بہتے ہیں۔ دریائے گوداوری ممالک محروسہ کے ضلع اورنگ آباد میں داخل ہوتا ہے اور آٹھ اضلاع کے حدود سے گزرتا ہوا شمالی سرکار میں داخل ہوجاتا ہے۔ دریائے گوداوری مملکت آصفیہ میں چھ سو میل کی مسافت طے کرتا ہے۔ اس کے معاون دریاؤں میں پین گنگا، وردھا، مانجرا، اور مانیر قابل تذکرہ ہیں۔ دریائے کرشنا مملکت کے جنوبی اضلاع میں سات سو میل سے زائد مسافت طے کرتا ہے۔ اس کے اہم معاون بھیما، موسی، اور تنگبھدرا ہیں۔

دکن کی اصلی پیداوار باجرا، جوار، چاول، روغنی تخم، شکر، دالیں، اور کپاس ہے، چائے، کافی اور مسالے بھی، ساگوان، سال، صندل اور ناریل، اس علاقہ کے خاص درخت ہیں۔

(۲) سندھ اور گنگا کا درمیانی علاقہ۔ یہ علاقہ جزیرہ نمائے دکن اور کوہ ہمالیہ کے درمیان واقع ہے جس کو دو دریا عرضاً ایک دوسرے سے علحدہ کرتے ہیں۔ اس طرح دریائے سندھ اور اس کے معاون مغرب میں اور دریائے گنگا اور اس کے معاون مشرق میں اس علاقہ کو سیراب کرتے ہیں۔ سندھ اور گنگا کا درمیانی علاقہ دریاؤں اور ان کے معاونوں پر مشتمل ہے جو بہت زرخیز اور دنیا کا وسیع ترین اور سطح زراعتی قطعہ ہے۔ اس کے جنوبانی دریا ہمیشہ رواں رہتے ہیں۔ یہ زرخیز خطہ قدیم آریائی اور ماقبل آریائی تمدن کا گہوارہ رہا ہے

نیز یہ ملک کا قدرتی گودام بھی ہے۔ بعض دریا مثلاً برہم پتر، گنگا اور سندھ کشتی رانی کے قابل ہیں۔ ریلوں کے جاری ہونے سے قبل یہی دریا زیادہ تر تجارتی حمل و نقل کی شاہراہ کا کام انجام دیتے تھے۔ ان دریاؤں کے پانی سے ہی کار ہائے آبرسانی کا بڑا کام لیا جاتا ہے جس پر پنجاب، سندھ اور صوبہ متحدہ کی خوش حالی کا بڑی حد تک انحصار ہے۔ سندھ و گنگا کے میدان کی خاص پیداوار گیہوں، جو، جوار، نیشکر، روغنی تخم، چاول، کپاس، جوٹ، نیل اور افیون ہے۔ ترکاریاں بکثرت اور مختلف اقسام کی ہوتی ہیں۔ شمالی حصہ میں سال، صوبہ متوسط میں ساگوان اور بنگال میں شہتوت کے درخت پائے جاتے ہیں۔ زرخیزی کی وجہ سے سندھ، گنگا کا درمیانی علاقہ ہندوستان کا سب سے زیادہ آباد خطہ ہے۔

(۳) **کوہستان ہمالیہ۔** شمال میں سندھ و گنگا کے میدانوں پر کوہستان ہمالیہ گویا اپنا سایہ ڈالے ہوئے ہے۔ ہمالیہ کے پہاڑ دنیا کے بلند ترین پہاڑ شمار ہوتے ہیں ان کی لمبائی ۱۵۰۰ میل ہے۔ اور پورے کوہستان ہمالیہ کا طول دو ہزار میل سے زیادہ ہے۔ یہی پربت ہندوستان کو وسطی ایشیا سے جدا کرتا ہے ناقابل عبور ہونے کے اعتبار سے ہمالیہ کے پہاڑ ہندوستان کی سیاسی ہیئت پر ہمیشہ سے اثر انداز ہیں اس سے قطع نظر بارش، موسمی ہواؤں، گرمی، سردی، رطوبت اور کاشت پر بھی ان پہاڑوں کا اثر پڑتا ہے اور اس طرح ملک کے معاشی حالات بہت نمایاں طریقے پر متاثر ہوتے ہیں۔ اس سے ہی دریا نکلا کرتے ہیں جن کا پانی ایک ہو جاتے ہیں۔ ہمالیائی دریاؤں کے معاشی فوائد کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ہمالیہ کے آبشاروں میں آبی قوت برقی کے بھی امید افزا امکانات پائے جاتے ہیں۔ یہ نباتات کی روئیدگی کا بہترین ذریعہ ہونے کے علاوہ ان سے قیمتی جنگلات کی نشو و نما بھی ہوتی ہے۔ جو بالآخر خود بارش کا موجب ہو جاتے ہیں۔

آب و ہوا اور موسم یہ ناممکن ہے کہ ہندوستان کی آب و ہوا کے متعلق کسی عمومی رائے کا اظہار کیا جائے ہر قسم کی آب و ہوا جو منطقہ ہائے حارہ و معتدلہ کی خصوصیت ہے یہاں پائی جاتی ہے بحیثیت مجموعی ہندوستان کی آب و ہوا نیم گرم کہلائی جا سکتی ہے۔ جنوبی ہند کا درجہ حرارت جو خط استوا کے قریب واقع ہے سال بھر بہت بلند رہتا ہے اس لئے موسموں میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوتی اس کے برخلاف شمالی ہند کی خصوصیت یہ ہے کہ شدت کی سردی اور گرمی پڑتی ہے جبکہ باہر تو بعض وقت

موسم گرما میں حرارت سایہ میں ۱۲۵ درجہ پہونچ جاتی ہے، موسم سرما میں پارہ ۲۵ درجہ تک نیچے اتر آتا ہے ہندستان کے جن حصوں میں موسم کی تفریق پائی جاتی ہے وہاں موسم تین ہوتے ہیں۔

(۱) سرد و خشک موسم یعنے موسم سرما جبکہ شمالی تجارتی ہوائیں چلتی ہیں۔ (۲) مرطوب موسم جبکہ جنوب مغربی باد برشکال چلتی ہے۔ (۳) گرم و خشک موسم بارش سے قبل عموماً اس زمانہ میں سخت طوفان کے ساتھ موسم اچانک بدلا بھی کرتا ہے۔

مملکت حیدرآباد کی آب و ہوا سال کے بڑے حصے میں خوش گوار رہتی ہے یہاں تین نمایاں موسم پائے جاتے ہیں۔ (۱) جاڑا ۔ جو اکتوبر سے شروع ہوکر جنوری کے آخر تک رہتا ہے۔ (۲) گرمی فروری سے شروع ہوکر جون تک رہتی ہے۔ (۳) بارش۔ اس کا موسم جولائی سے ستمبر تک رہتا ہے۔

بارش ہندوستان کی آب و ہوا کی طرح یہاں کی بارش میں بھی نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً چراپونجی میں جو آسام کی پہاڑیوں میں واقع ہے سالانہ ۴۶۰ انچ بارش کا تخمینہ کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف شمالی سندھ میں سال بھر میں ۲ انچ سے بھی کم بارش ہوتی ہے۔ آب و ہوا کے اعتبار سے جزیرہ نمائے ہند ایشیائی برشکالی خطہ کا حصہ ہے اور دوسرے خطوں کے مقابلہ میں اس حصے کو موسمی ہوائیں پوری طرح مستفید کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہندستان میں بارش کا ایک خاص موسم ہوتا ہے لیکن اس کے برخلاف انگلستان میں کسی وقت بھی بارش ہوسکتی ہے۔ باد برشکال یا مان سون کی اصطلاح ہواؤں کی تبدیلی کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ باد برشکال سارے ملک میں چلتی ہیں اور موسم کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ ان ہواؤں کو جنوب مغربی باد برشکال اور شمال مشرقی باد برشکال کہا جاتا ہے۔ موسم گرما میں زمین بحر ہند کی موجوں سے زیادہ گرم ہو جاتی ہے۔ جون کے مہینہ میں مرطوب ہوائیں بحر ہند سے نشیبی حصوں کی طرف چلتی ہیں۔ ماہ جولائی تک جنوب مغربی باد برشکال تمام ہندستان میں پھیل جاتی ہے۔ یہ ہوائیں دکن میں جنوب مغربی بنگال کے ڈیلٹا میں جنوبی اور وادی گنگا میں جنوب مشرقی رخ پر چلتی ہیں۔ دریائے سندھ کی وادی میں سب سے آخر میں یہ ہوائیں پہونچتی ہیں اور ختم بھی سب سے پہلے یہیں ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں سالانہ بہت کم بارش ہوتی ہے۔ باد برشکال پہلے مغربی گھاٹ سے ٹکراتی ہے۔ اسی لئے بارش یہاں

شدت سے ہوتی ہے۔ پھر ہمالیہ پران ہواؤں سے بارش کی شدت اپنا زور دکھاتی ہے۔ ستمبر میں باد برشکال کا زور تیزی کے ساتھ گھٹنے لگتا ہے جنوب مغربی باد برشکال سے تمام ہندوستان میں بارش ہوتی ہے۔ اور ملک کی مجموعی بارش کا تقریباً نوے فیصد حصہ اسی باد برشکال کا نتیجہ ہے اس باد برشکال سے ہندوستان میں ہواؤں کے دو دھارے پیدا ہوتے ہیں ایک بحیرۂ عرب کا دھارا اور دوسرے خلیج بنگال کا دھارا۔ پہلے دھارے سے ہندوستان کے مغربی ساحل جزیرہ نمائے ہند صوبہ متوسط اور راجپوتانہ میں بارش ہوتی ہے خلیج بنگال کے دھارے سے بنگال آسام اور بہار میں مقداراً بکثرت بارش ہوتی ہے یہاں تک کہ یہ دھارہ ہمالیہ پر جاکر رک جاتا ہے اس کے بعد یہ مغرب کی طرف پلٹتا اور بحیرۂ عرب کے دھارے سے جاملتا اور پنجاب سے لے کر بنگال کے تمام خطوں میں ایک معتدل بارش کا سبب ہوجاتا ہے۔

شمال مشرقی باد برشکال سے جو بارش ہوتی ہے اس کی مقدار مجموعی سالانہ بارش کا ۱۰ فیصدی حصہ ہے یہ درحقیقت جنوب مغربی باد برشکال کی رجعت ہے موسم سرما میں زمین سمندر سے زیادہ ٹھنڈی ہوجاتی ہے اور مرطوب ہوائیں خشکی سے سمندر کی طرف چلتی ہیں جس کی وجہ سے شمال مشرقی باد برشکال وجود میں آتی ہے۔ اس سرمائی باد برشکال سے مدراس کے شمالی اور جنوبی علاقوں میں اکتوبر سے دسمبر تک بارش ہوتی ہے ہندوستان کے دوسرے اقطاع مثلاً حیدرآباد، مدراس، صوبہ متوسط کا کچھ حصہ بمبئی اور پنجاب کو بھی زمستانی شمال مشرقی باد برشکال سے خاص فائدہ پہنچتا ہے۔

ہندوستان میں باد برشکال ہی سے فصلوں کے اوقات معین ہوتے ہیں پہلی فصل جو خریف کہلاتی ہے جون میں بوئی جاتی اور موسم خزاں میں کاٹی جاتی ہے خریف کی پیداوار، چاول کپاس اور باجرہ ہے دوسری فصل باد برشکال کے اختتام پر یعنی ستمبر میں بوئی جاکر جنوری اور مارچ کے درمیان کاٹی جاتی ہے۔ اس کو فصل ربیع کہتے ہیں گیہوں، جو، اور السی، ربیع کی پیداوار ہے۔

سالانہ بارش کو ملک کے لئے خاص اہمیت حاصل ہے۔ لاکھوں آدمیوں کی زندگی کا دار و مدار زراعت پر ہو تو مقدار بارش میں تغیرات، تقسیم اور اس کے اوقات ہی پر اہل ملک کے افلاس یا خوش حالی کا انحصار ہوتا ہے۔ بارش کا اثر ملک کے ہر شعبہ زندگی پر پڑتا ہے ملک کی صنعت و حرفت، تجارت اور مالیات کی

بہتری کا انحصار زراعت پر ہے۔ اور زراعت کی بہتری باد برشکال اور خصوصاً جنوب مغربی باد برشکال کے رحم و کرم پر موقوف ہے۔

سالانہ بارش میں جو عدم یکسانیت ہے اس کے لحاظ سے ملک کے حسب ذیل خطے قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

(۱) یقینی بارش کا خطہ۔ مثلاً آسام، مشرقی و جنوبی بنگال اور مغربی ساحلی میدان۔

(۲) غیر معین بارش کا خطہ مثلاً اودے پور، اجمیر، بمبئی، دکن جس میں مغربی گھاٹ شامل نہیں ہے۔

(۳) خشک سالی کا خطہ۔ مثلاً شمالی سندھ، مغربی راجپوتانہ اور مغربی پنجاب۔

مملکت حیدرآباد میں بارش کا سالانہ اوسط تقریباً ۳۱ انچ ہے جنوب مغربی برشکالی ہواؤں سے زیادہ بارش ہوتی ہے شمال مشرقی برشکالی ہواؤں سے بھی اوسط پانچ انچ تک بارش ہوجاتی ہے۔

مٹی کسی ملک کی اراضیاتی ترکیب کی مناسبت میں بالائی سطح اور زیر زمینی سطح پر غور کیا جاتا ہے ہندوستان میں طبقات الارض کی سب ذیل شکلیں موجود ہیں۔

(۱) گاد کا خطہ۔ یہ بہت وسیع خطے ہیں۔ اور زراعت کے لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ اس میں سندھ کا بیشتر حصہ، گجرات، راجپوتانہ، پنجاب، صوبہ متحدہ، بنگال اور مدراس کے اضلاع گوداوری، کرشنا اور تنجاور شامل ہیں۔

گاد کا ایک خط جزیرہ نمائے دکن کے مغربی اور مشرقی ساحلوں کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ گاد کی مٹی جو قیمتی کیمیائی اور نامیاتی اجزا پر مشتمل ہوتی ہے بہت زرخیز ہوتی ہے معتدل اور ایک متناسب تقسیم شدہ بارش سے خریف اور ربیع کی اکثر فصلیں ہوسکتی ہیں۔

(۲) دکن ٹراپ۔ سنگریزہ زمین۔ اس میں صوبہ بمبئی کا بیشتر حصہ، برار، صوبہ متوسط کا ایک تہائی مغربی حصہ اور حیدرآباد (دکن) کا مغربی حصہ شامل ہے، اس خطے کی زمینات اپنے خواص اور زرخیزی کے اعتبار سے باہم بہت مختلف ہیں کپاس پیدا کرنے کی اصلی سیاہ مٹی دکن ٹراپ کے پہاڑوں کے دامن میں پائی جاتی ہے تاپتی اور نربدا کی وادیوں، گجرات کے میدانوں، کاٹھیاواڑ، کرناٹک اور صوبہ مدراس کے چند اضلاع میں یہ سیاہ مٹی کپاس اور جوار کی کاشت کے لئے مشہور ہے: اس میں گیہوں، السی اور چنا

بھی اگتا ہے اس نوعیت کی زمینوں میں رطوبت کو جذب کرنے اور تری کو باقی رکھنے کی بھی بڑی صلاحیت ہے

(۳) **خطہ کرسٹلائین**۔ (قلم نما خطے) ہندوستان کی باقی زمینات کرسٹلائین خطے سے موسوم ہیں۔ اس میں مدراس، میسور، جنوب مشرقی بمبئی، مشرقی حیدرآباد اور صوبہ متوسط کا دو تہائی حصہ شامل ہے۔ یوں بحیثیت مجموعی یہ خطہ کم زرخیز ہے لیکن بعض نوعیتیں خصوصاً سرخ یا بھوری، سرخ چکنی مٹی اور میسور و مدراس کی چکنی مٹی بہت زرخیز ہے۔ جہاں نہروں سے آبپاشی ہوتی ہے وہاں اوسط درجہ کی کرسٹلائین مٹی کی خاص پیداوار چاول ہے۔ دوسری قیمتی فصلیں بھی تالابوں اور کنووں کی آبپاشی سے حاصل ہوتی ہیں۔

معدنیات صنعتی کمیشن بابتہ ۱۹۱۸ء کی رائے میں ہندوستان کی معدنی دولت اس کی اکثر کلیدی صنعتوں کے لئے خام اشیاء کی پوری طرح سربراہی کرتی ہے۔ انیسویں صدی کے آٹھویں عشرے کی ابتداء تک ہندوستانی معدنیات کو ترقی دینے کے مسئلے کی عملی کام انجام نہیں دیا گیا۔ بہرحال بعد کی تحقیقات سے ایسے نئی اقسام کی معدنیں دریافت ہو چکی ہیں جن سے دیگر صنعتوں کے فروغ کا امکان پیدا ہوگیا ہے موجودہ ذرائع حمل و نقل کی ترقی ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ اور ہندوستان کی عام صنعتی ترقی سے معدنی پیداوار کو دیرپا فوائد حاصل ہوئے ہیں۔

دوسری جنگ جو ستمبر ۱۹۳۹ء میں آغاز ہوئی ہے اس سے ہندوستان کی معدنی دولت کو مزید ترقی حاصل ہو رہی ہے۔

ہندوستان کے خاص معدنیات میں کوئلہ، لوہا، مینگنیز، سونا، چاندی، سیسہ، جست، مٹی کا تیل، ابرق، گندک، نمک، شورہ، عمارت کے پتھر، اور سمنٹ سازی کی اشیاء شامل ہیں۔

تمام خاص معدنی اشیاء کی مختصر کیفیت درج ذیل ہے۔

(۱) **کوئلہ**۔ ہندوستان میں سلطنت متحدہ امریکہ کے سوا برطانوی شہنشاہیت کے سب علاقوں سے زیادہ کوئلہ نکلتا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں ۲۷ء۷ ملین ٹن کوئلہ نکالا گیا۔ ہندوستان کے کوئلہ کا بیشتر حصہ بنگال بہار اور اڑیسہ (گونڈوانہ) کی کانوں سے نکلتا ہے۔ ان صوبوں کے علاوہ کوئلہ کی کانیں صوبہ متوسط و حیدرآباد، پنجاب، راجپوتانہ، آسام اور بلوچستان میں واقع ہیں۔ ہندوستان میں کوئلہ کی تقسیم بہت غیر مساوی ہے

جنوبی ہند میں اس کی خاص طور سے کمی ہے اس لئے بمبئی میں مغربی گھاٹ سے برقابی قوت حاصل کی گئی ہے صوبہ مدراس کوئلہ کی کمی کی وجہ سے صنعتی ترقی میں بہت پیچھے ہے اس علاقہ میں کوئلہ کے ساتھ لوہے کی بھی کسی کان کی کوئی دریافت اب تک عمل میں نہیں آسکی۔ ہندوستانی کوئلہ دوسرے ملکوں کے کوئلہ کے مقابلہ میں عام طور پر خراب قسم کا ہے۔ صرف بنگال کا ہائی کوک دوسرے ملکوں کے کوئلہ کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ ہندوستانی کوئلہ کی کمیٹی کی سفارش پر سنہ ۱۹۲۶ء میں کوئلہ کی درجہ بندی کی ایک مجلس قائم کی گئی تاکہ کوئلہ کی خوبی میں اضافہ ہو۔ ہندوستان میں اچھے کوئلہ کی حفاظت کے ذرائع بھی اختیار کرنے کی ضرورت کا احساس کرکے سنہ ۱۹۳۹ء میں کوئلہ کے کانوں کے تحفظ کا قانون منظور ہوا۔ اس قانون کی یہ غرض تھی کہ کوئلہ کے اسراف کا سدباب ہو۔

ہندوستان میں کوئلہ کی صنعت کا آغاز ریلوں کے جاری ہونے سے ہوتا ہے اور بعد میں لوہے فولاد اور دوسری صنعتوں کی ترقی کی وجہ سے معدنی کوئلہ کی طلب میں بہت اضافہ ہوگیا۔

مملکت حیدرآباد میں کوئلہ کی کانیں ضلع ورنگل میں بمقام سنگارینی، کوتھاگوڈم اور تانڈور واقع ہیں ان کانوں سے سنہ ۱۹۴۰ء میں ۱۲ لاکھ پچاس ہزار ٹن کوئلہ نکالا گیا جس سے حکومت سرکار عالی کو حق شاہی کے طور پر دو لاکھ پندرہ ہزار روپیہ کی رقم وصول ہوئی۔ حکومت ہند کی تحریک پر گورنمنٹ آف انڈیا کول مائنس اسٹوائنگ ایکٹ کے تحت مملکت میں جو کوئلہ نکالا جاتا ہے اس پر یکم دسمبر ۱۹۳۹ء سے دو آنہ فی ٹن کا محصول عائد کیا گیا۔ اس رقم کو ایک خاص مد میں جمع کیا جاتا ہے۔ جو کوئلہ کے جمع کرنے اور اس کی حفاظتی تدابیر پر صرف کیا جائے گا۔

(۲) **لوہا**۔ لوہے کی بڑی کانیں بہار، اوڑیسہ میں سنگ بھوم، کیونجھار، بونائی اور میوربھنج میں واقع ہیں۔ حالیہ انکشافات سے وہاں یہ پتہ چلا ہے کہ مسلسل چالیس میل تک تمام لوہے کا ذخیرہ پھیلا ہوا ہے۔ لوہے کی کانیں بنگال، صوبہ متوسط، مدراس اور ریاست میسور میں بھی ہیں۔ بنگال میں بارا کار آئرن ورکس سنہ ۱۸۷۵ء میں قائم ہوا۔ یہ کارخانہ موجودہ زمانہ میں بنگال آئرن کمپنی محدود میں تبدیل ہوگیا ہے اس کی وجہ سے ہندوستان میں لوہے کی جدید صنعت کا آغاز ہوا۔ ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کی بدولت

لوہے کی کچی دھات کی پیداوار میں قابل لحاظ ترقی ہوئی۔ اس کا افتتاح سنہ ۱۹۱۱ء میں بمقام سکچی (جمشید پور) ہوا۔ یہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔ سرمایہ بھی ہندوستانی ہے اور ہندوستانی صنعتی اولوالعزمی کا مظہر ہے۔

سنہ ۱۹۳۸ء میں ۲۷ لاکھ ۴۳ ہزار ٹن لوہا کانوں سے نکالا گیا۔ موجودہ جنگ کی وجہ سے لوہا زاید مقدار میں نکالا جارہا ہے۔

(۳) **مینگنیز** ۔ یہ ایک بہت قیمتی اور صنعتی دھات ہے۔ فولاد بنانے میں خاص طور پر اس کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ بھاری کیمیائی، برقی اور شیشے کی صنعتوں میں اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۷ء تک دنیا میں سب سے زیادہ مینگنیز ہندوستان میں ہی پیدا ہوتا تھا۔ لیکن اس کے بعد روس سبقت لے گیا۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں اس کی رسد ۱۰ ملین ٹن تک پہونچ گئی تھی لیکن سنہ ۱۹۳۳ء کی کساد بازاری کی وجہ سے اس کی رسد ۲ لاکھ ۸ ہزار تین سو سات ٹن تک گھٹ گئی۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں اس کی رسد میں مزید اضافہ ہوا اور اس کی مقدار ۹ لاکھ ۶۷ ہزار نو سو انتیس ٹن ہوگئی۔ موجودہ زمانہ کی جنگ سے مینگنیز کی صنعت کو بھی ترقی حاصل ہورہی ہے

مینگنیز پیدا کرنے والے بڑے علاقے صوبہ متوسط، مدراس، بمبئی اور میسور ہیں۔

(۴) **سونا** ۔ دنیا کی سونے کی پیداوار کا صرف تین فی صدی حصہ ہندوستان میں حاصل ہوتا ہے اور اس کا بڑا حصہ کولار (مشرقی میسور) سے برآمد کیا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں ہندوستان سے ۳ لاکھ اکیس ہزار ایک سو اڑتیس اونس سونا نکالا گیا جس کی قیمت ۳ کروڑ ۴۷ لاکھ روپے تھی۔

مملکت حیدرآباد میں بمقام ہٹی (ضلع رائچور) سنہ ۱۸۹۱ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک سونا نکالا جاتا تھا۔ اور ابھی حال میں تلاش کا کام پھر آغاز کیا گیا اور سنہ ۱۹۴۰ء میں اس اسکیم کے لئے دو لاکھ پچاس ہزار پونڈ کی زائد رقم منظور کی گئی۔

(۵) **پٹرولیم** ۔ ہندوستان میں معدنی تیل کے دو جدا رقبے ہمالیہ کے دو طرف واقع ہیں۔ ایک مغرب میں ہے۔ جو سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس میں آسام شامل ہے اور مجموعی مقدار کا ۸۵ فی صدی یہیں سے نکلتا ہے۔ دوسرا مشرق میں ہے جس میں پنجاب اور بلوچستان شامل ہیں۔ ہندوستان میں سنہ ۱۹۳۸ء میں

۷۰ ملین گیلن پٹرولیم برآمد ہوا۔ ہندوستان میں پٹرولیم جس مقدار میں نکالا جاتا ہے وہ پٹرولیم پیدا کرنے والے ممالک کے مقابل بہت قلیل ہے۔ موجودہ زمانے میں ہندوستان میں معدنی تیل اور پٹرول کا خرچ بہت بڑھ گیا ہے اور طلب سے رسد کم ہے۔ ہندوستان کو بہت جلد اس کا بدل تلاش کرنا ضروری ہوگا۔

(۶) **ابرق**۔ ابرق زیادہ تر برقی صنعت میں حاجز واسطے کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ اس کی پیداوار میں ہندوستان کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے اور دنیا کی مجموعی پیداوار کا ⅔ حصہ یہاں سے ہی نکلتا ہے۔ ابرق بہار، مدراس، ٹراونکور، اجمیر میواڑ، راجپوتانہ اور مملکت حیدرآباد دکن ضلع ورنگل میں پائی جاتی ہے۔

(۷) **شورا**۔ شورے کی طلب صنعتی اغراض مثلاً شیشہ سازی، غذا کے تحفظ اور کھاد کی تیاری کے لئے بہت زیادہ ہے۔ شورا زیادہ تر بہار، صوبہ متحدہ اور پنجاب میں نکلتا ہے۔ تقریباً تمام پیداوار برآمد کر دی جاتی ہے اور بہت تھوڑا حصہ ملک میں خصوصاً آسام کے چائے کے باغات میں کھاد کے لئے رکھ لیا جاتا ہے۔ کسی زمانہ میں ہندوستان کو تمام دنیا میں نائٹریٹس کی رسد کا اجارہ حاصل تھا۔ اس کو بارود اور کیمیائی کھاد کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن بھاری برآمدی محصولوں اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر ہندوستان میں شورے کی پیداوار گھٹ گئی ہے۔ بیرونی بازاروں میں چلی کے نائٹریٹس اور فرانس کے پوٹاش نمک کی مسابقت کے باعث ہندوستانی شورے کی برآمد پر ناموافق اثر پڑا۔

(۸) **نمک**۔ تقریباً تین چوتھائی نمک جو ملک میں صرف ہوتا ہے وہ اندرون ملک ہی حاصل ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اس کی رسد سنہ ۱۹۲۹ء میں ۱۱ لاکھ ۵۴ ہزار چھ سو ۴۲ ٹن رہی۔ نمک کا تقریباً ۶۰ فی صدی حصہ بمبئی اور مدراس کے ساحلوں سے سمندر کے پانی کے عمل تبخیر سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ایک دوسرا ذریعہ معدنی نمک ہے جو پنجاب میں کوہ نمک کی کانوں سے نکالا جاتا ہے۔ جھیلوں کا پانی خشک کر کے راجپوتانہ میں جھیل سانبھر سے نمک حاصل کیا جاتا ہے۔ کچھ میں کھارے پانی کو گڑھوں میں جمع کیا جاتا ہے۔ پانی خشک ہو جاتا ہے تو نمک نکال لیا جاتا ہے۔ بیرون ہندوستان سے نمک زیادہ تر بنگال میں درآمد کیا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں ٹیرف بورڈ نے نمک کو ہندوستان کے لئے خود مکتفی بنانے کے مسئلہ پر غور کیا۔ اس نے یہ رائے قائم کی کہ بنگال کے لئے عمدہ سفید نمک کی کل طلب کو ہندوستان سے

ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں سنہ ۱۹۳۱ء میں بیرونی نمک پر زائد تامینی محصول دو آنہ ساڑھے چار آنے فی من کے حساب سے عاید کیا گیا لیکن سنہ ۱۹۳۳ء میں اس کو ڈھائی آنہ تک اور سنہ ۱۹۳۶ء میں ڈیڑھ آنہ تک گھٹا دیا گیا۔ اور سنہ ۱۹۳۸ء میں برخواست کر دیا گیا۔ تامینی محصول کے زمانہ میں ملکی نمک کی پیداوار میں اضافہ ہوا اور اب توقع ہے کہ ہندوستان نمک کے لئے خود مکتفی ہو جائے گا۔

(۹) **سمنٹ سازی کی اشیاء**۔ کنکریا، چونا اور چکنی مٹی۔ ریاست بندی (راجپوتانہ) اور کٹنی میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ کوٹھیاواڑ میں پوربندر، اور نکھنو (؟) کے نیز ۔۔۔ کے قرب و جوار میں بھی یہ اچھا دستیاب ہوتے ہیں۔ سمنٹ سازی کی صنعت کا مستقبل نہایت ہی امید افزا ہے۔

ضلع گلبرگہ علاقہ حیدرآباد میں بھی سمنٹ سازی کے اشیا کثیر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں شاہ آباد سمنٹ کمپنی محدود نے ایک لاکھ ۲۳ ہزار ۵ سو پچیس ٹن سمنٹ تیار کی۔ کمپنی نے حق شاہی کی بابتہ حکومت کو ۲۹ ہزار ۶ سو چوالیس روپے کلدار ادا کئے۔

(۱۰) **دوسری معدنی پیداواریں**۔ کمتر اہمیت کی دوسری معدنی پیداواریں حسب ذیل ہیں سیسہ۔ ٹن۔ تانبا جست۔ چاندی۔ المونیم۔ کرومائٹ۔ یشب، پوٹاش، عنبر، الماس، یاقوت، اور گندک۔

نباتاتی ذرائع۔ جیسا کہ ذیل کی تفصیل سے واضح ہوگا منطقہ حارہ اور منطقہ معتدلہ کی اکثر اجناس کی ہندوستان میں کاشت کی جاتی ہے۔

(۱) **خوردنی اجناس**۔

چاول بنگال، بہار، اڑیسہ، مدراس اور بمبئی اور حیدرآباد کے علاقہ تلنگانہ میں۔ **گیہوں** شمال مغربی ہندوستان اور حیدرآباد کے علاقہ مرہٹواڑی میں۔ **جوار** اور **باجرہ** بمبئی مدراس اور حیدرآباد میں۔ **جو** صوبہ متحدہ اور بہار میں۔ **راگی**۔ مدراس، صوبہ متحدہ اور بمبئی میں **مکائی**۔ بہار، اڑیسہ، صوبہ متحدہ اور پنجاب میں۔ **چنا**۔ پنجاب صوبہ متحدہ، بہار، اڑیسہ، اور صوبہ متوسط میں۔

(۲) **جڑی بوٹیاں**۔

گرم مسالے ، مدراس ، بمبئی ، اور بنگال میں ، نیشکر ۔ کل ہندوستان خصوصاً صوبہ متحدہ میں ۔
کافی ۔ مدراس اور کورگ میں ۔ چائے ۔ آسام اور بنگال میں ۔
(۳) روغن دار تخم ۔ السی ، تل ، سرسوں ، رائی ، مونگ پھلی ، اور ارنڈی وغیرہ مدراس صوبہ متحدہ ، صوبہ متوسط ، صوبہ بمبئی اور حیدرآباد کے علاقہ تلنگانہ میں ۔

(۴) ریشے

کپاس ۔ بمبئی ، برار ، پنجاب ، مدراس اور حیدرآباد کے علاقہ مرہٹواڑی میں ۔
جوٹ ۔ بنگال میں ۔

(۵) متفرق ۔

افیون ۔ صوبہ متحدہ اور راجپوتانہ میں ۔ تمباکو ۔ بنگال ، بہار ، بمبئی ، مدراس اور حیدرآباد میں
چارہ کی فصلیں ۔ پنجاب اور صوبہ متحدہ میں ۔ سنکونا ۔ (کونین) جنوبی ہند میں
ربر ۔ آسام کی پہاڑیوں میں ۔

جنگلات ۔ ہندوستان کے بیش بہا قدرتی ذرائع میں اس کے بڑے بڑے جنگلات کا بھی تذکرہ ضروری ہے ۔ جنگلات کا انحصار زیادہ تر بارش اور بلندی پر ہے ۔ جہاں بارش بہت زیادہ ہوتی ہو وہاں ، تاڑ ، فرن ، بانس ، اور ربر کے سدابہار جنگل نظر آتے ہیں ۔ اوسط درجے کی بارش کے مقامات میں ساگوان ، سال وغیرہ کے برگ ریز جنگل موجود ہیں ۔

برطانوی ہند کے مجموعی رقبہ کا ۱/۵ حصہ سررشتہ جنگلات کے زیر نگرانی ہے ۔ آسام میں سب سے زیادہ جنگلات ہیں انسانی اور قدرتی معاشی نظام میں جنگلات سے بالواسطہ اور بلا واسطہ بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں جنگلات سے جو افادہ حاصل ہوتا ہے ۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں کہ چوبینہ اور جلانے کی لکڑی حاصل ہوتی ہے ۔ مختلف صنعتوں میں جنگلات کی پیداوار کام آتی ہے ۔ مویشیوں کے لئے چراگاہیں بسر آتی ہیں جنگلات سے خام پیداوار حاصل کرنے کثیر افراد کے لئے روزگار فراہم ہوتا ہے ۔

جنگلات کی پیداوار دو قسموں میں منقسم ہوسکتی ہے ۔

(۱) اصلی پیداوار ۔ مثلاً چوبینہ اور جلانے کی لکڑی (۲) ذیلی پیداوار ۔ مثلاً لاک، اشیائے دباغت تارپین اور رال وغیرہ ۔ جنگلاتی پیداوار کی تحقیقات سے کاغذ سازی میں جس وقت سے بانس کی افادیت ثابت ہوئی ۔ ٹیرف بورڈ کی سفارش پر حکومت نے ۱۹۲۵ء میں کاغذ سازی کی صنعت کو تامین عطا کی ۔

جنگلات کی بالواسطہ افادیت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی ۔ جنگلات کی وجہ سے آب و ہوا میں اعتدال پیدا ہوتا ہے ۔ بارش کے موسم میں جنگلات کی وجہ سے زمین کے زرخیز عناصر سیلابی نقصانات سے محفوظ رہتے ہیں ۔ جنگلات کی وجہ سے پانی کے بہاؤ میں جو روک پیدا ہوتی ہے اس کی بدولت دریاؤں میں پانی زیادہ تسلسل کے ساتھ جاری رہتا ہے ۔ زمین کی زرخیزی میں اضافہ ہوتا ہے ۔ مویشیوں اور کارآمد پرندوں کو جائے پناہ ملتی ہے ۔

غرض جنگلات کی حفاظت ہر ملک کے لئے بیحد ضروری ہے ۔ قدرت کی اس میراث کو انسانوں کی حرص و آز سے محفوظ رکھنا چاہیئے ۔ برطانوی حکومت سے قبل صدیوں تک جنگلات اہل منہ کی غفلت کے نذر ہوتے رہے ۔ اضافۂ آبادی توسیع کاشت مویشیوں کی تعداد میں اضافہ اور ریلوں کیلئے چوبینہ اور جلانے کی لکڑی کی طلب کے باعث برطانوی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں بھی جنگلات کو بہت ضائع کیا گیا ۔ لارڈ ڈلہوزی کے دور حکومت میں جنگلات کی حفاظت کرنے کا خیال پیدا ہوا چنانچہ ۱۸۵۵ء میں اس کی جانب پہلا منظم قدم اٹھایا گیا ۔ بڑے بڑے صوبوں میں ۱۸۶۴ء میں سررشتۂ جنگلات ایک صدر ناظم جنگلات کے زیر نگرانی قائم کیا گیا اس وقت سے سررشتۂ جنگلات برابر ترقی کر رہا ہے اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ۔ برطانوی ہند کے مجموعی رقبہ کا ⅕ حصہ سررشتۂ جنگلات کے زیر نگرانی ہے ۔

ہندوستانی جنگلات کی حسب ذیل قسمیں قرار پاتی ہیں ۔۔

(۱) محفوظ ۔ (۲) حفاظتی ۔ (۳) عام جنگلات ۔

جنگلات کے انتظام کا منشا یہ ہے کہ ان کو غیر ضروری قطع و برید سے بچا کر ان کی نشو نما میں اضافہ کیا جائے ۔ ۱۹۰۶ء میں ڈیرہ دون میں جنگلات کا ایک تحقیقاتی ادارہ قائم ہوا ۔ یہ ادارہ مفید تحقیقاتی کام انجام دیرہا ہے ۔ زرعی کمیشن (۱۹۲۸ء) نے اس بات پر زور دیا کہ کاشتکاروں کیلئے

جنگلات کی افادیت میں اضافہ کیا جائے۔ چنانچہ حسب ذیل عملی تدابیر اختیار کی گئیں۔

مملکت آصفیہ کے مجموعی رقبہ (۸۲۶۹۸) مربع میل میں سے (۹۵۱۶) مربع میل یا ۱۱ء۵ فیصد رقبہ سررشتہ جنگلات کی نگرانی میں ہے۔ اضلاع عادل آباد، ورنگل، کریم نگر اور محبوب نگر میں سب سے زیادہ جنگلات ہیں۔

سررشتہ جنگلات سرکار عالی کا قیام ۱۸۶۷ء میں عمل میں آیا۔ اور گذشتہ ۳۰ سال سے یہ سررشتہ مسلسل ترقی کر رہا ہے۔ محبوب آباد میں مدرسہ جنگلات قائم ہے جہاں صحراداری اور نائب امینی کے امیدواروں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ گذشتہ پانچ سال کے عرصہ میں سڑک ہائے صحرائی کی تعمیر صحرائی عجائب خانہ کا قیام، یوم تفصیل اشجار، لاکس پروری، گھریلو صنعتوں کی احیا، صنعتی و معاشی سروے صنعتی نمایش میں شرکت اور جنگلاتی رسائل و کتابچوں کی اشاعت سے جنگلات کی ترقی کے لئے ایک عام ذہنیت اور بیداری ترقی پذیر ہے۔

کارخانہ کاغذسازی سرپور کے قیام سے فروخت بانس پر حق شاہی کی وصولی سے سررشتہ کی آمدنی میں معتدبہ اضافہ کی توقع ہے۔

حیوانات ۔ ہندوستان جیسے زرعی ملک میں حیوانات کی اہمیت کے اظہار میں بھی مبالغہ درست ہے۔ ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے یہاں قدرتی طور پر ہر قسم کے جانور پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں اہم مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) گائے اور بھینس جن کی خاص طور پر دودھ کی خاطر پرورش کی جاتی ہے۔

(۲) بیل ہندوستان کے زرعی نظام معیشت میں لادنے اور کاشتکاری کے جانور کی حیثیت سے اس کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

(۳) بھیڑ، بکری سے گوشت اور اُون کے علاوہ کھاد بھی حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے جانوروں میں گدھوں اور ٹٹوؤں کا بھی شمار ہے جن سے ہر جگہ باربرداری اور سواری کا کام لیا جاتا ہے۔

اونٹ سے ریگستان (مثلاً سندھ) میں اور عموماً شمالی ہند میں حمل ونقل کا کام لیا جاتا ہے

بنگال، آسام اور جزیرہ نمائے ہند کے ساحلی علاقوں میں مچھلی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستان کے وسیع جنگلوں میں قسم قسم کے وحشی جانور، حشرات الارض اور پرندے پائے جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۵ء کی بہائم شماری کے مطابق مملکت آصفیہ میں دو کروڑ ۵۲ لاکھ ۸۰ ہزار تین سو پندرہ مویشی پائے جاتے ہیں جن میں گائے، بیل، بھینس، بکری، گھوڑے، اونٹ اور گدھے، شامل ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے مملکت حیدرآباد کو ہندوستان میں دوسرا درجہ حاصل ہے۔

ذرائع قوت ۔ ہندوستان میں کوئلہ، لکڑی کا ایندھن، تیل، الکوہل، ہوا، اور پانی کی قوت حاصل کرنیکے خاص ذرائع ہیں۔ اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے کہ دکن میں کوئلہ کی غیر مساوی تقسیم اور قلت کے باعث پانی کے سوا قوت حاصل کرنے کے دوسرے ذرائع قابل اطمینان نہیں ہیں۔ ہندوستان میں موجودہ زمانہ میں پانی ہی سب سے زیادہ امید افزا ذریعۂ قوت سمجھا گیا ہے۔ آبی قوت برقی کے استعمال میں گوکاک کو اولیت حاصل ہے جو جنوبی مہاراشٹر (بمبئی) میں آبشار گوکاک کے قریب واقع ہے۔ موجودہ دور میں ہائیڈرو الکٹرک کے وسیع انتظامات کی طرف خاص توجہ کی جارہی ہے۔ مثلاً میسور میں بمقام شیوا سمدرم دریائے کاویری کے پانی سے برقی قوت پیدا کی گئی ہے جس سے کولار کی سونے کی کانیں اور میسور کے مختلف مقامات پر بڑے بڑے کارخانے چل رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں کشمیر دریائے جہلم کے پانی سے برقی قوت تیار کی گئی اور مغربی گھاٹ صوبہ بمبئی میں ٹاٹا ہائیڈرو الکٹرک ورکس (سنہ ۱۹۱۵ء) وجود میں آیا۔ اور یہ سب برقی قوت کے ذخیرے ہندوستان کی صنعتی ترقی میں بہت بڑا حصہ لے رہے ہیں۔ ٹاٹا ہائیڈرو الکٹرک ورکس سے ۲۴۶۰۰۰ گھوڑوں کی طاقت کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے بمبئی جیسے عظیم الشان صنعتی شہر، مضافات بمبئی تھانہ، کلیان اور پونہ کے بڑے حصوں کے لئے برقی طاقت مہیا ہوتی ہے۔ بمبئی کے قرب وجوار میں کوئلہ کی جو کمی ہے اس کی تلافی پانی سے حاصل کی ہوئی اس قوت سے ہو جاتی ہے۔ ہائیڈرو الکٹرک کی ایک دوسری تجویز منڈی علاقہ پنجاب میں بھی ہے۔ یہاں بھی کوئلہ کی کمی ہے۔ اس لحاظ سے یہ اسکیم جب پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے گی تو اس سے بہت بڑے صنعتی مرکزوں کے لئے برقی قوت مہیا ہو سکے گی۔ جس میں دہلی جیسے دور دراز مقامات بھی شامل ہے۔ مدراس میں پائی کارا ہائیڈرو الکٹرک اسکیم کا کام سنہ ۱۹۲۹ء میں شروع کیا گیا۔ متور ہائیڈرو الکٹرک

اسکیم جو مشہور منڈی آبپاشی اسکیم کے ساتھ شامل ہے۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں آغاز کی گئی۔ صنعتی کمیشن کی سفارش کے مطابق حکومت ہند نے سنہ ۱۹۱۸ء میں ہائیڈرو الکٹرک کی وسیع پیمانہ پر تحقیقات کی جس سے ہمالیہ کے آبشاروں اور دریاؤں سے بھی برقی قوت حاصل کرنے کے مختلف امید افزا امکانات کا علم ہوا۔ مملکت حیدرآباد میں آئے گوداوری، کرشنا، تنگبھدرا، مانجرا، پورنا اور پین گنگا سے برقابی قوت حاصل کی جاسکتی ہے۔ ابتدائی تحقیقات مکمل کرلی گئی ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ ہندوستان ایک نہایت ہی زرخیز ملک ہے جس کو مختلف النوع قدرتی ذرائع حاصل ہیں۔ قدرت نے اپنی نعمتیں فراخدلی کے ساتھ اس ملک کو دے رکھی ہیں لیکن اس کے باوجود اہل ملک ان سے پوری طرح مستفید ہونے میں ناکام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں قدرت کی مہربانیوں اور انسان کے افلاس کا ایک عجیب وغریب تضاد دیا جاتا ہے۔

آبادی

مجموعی آبادی۔ سنہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی کل آبادی ۳۸ کروڑ ۸۰ لاکھ ہے جس میں سے برطانوی ہند میں ۲۹ کروڑ ۵۰ لاکھ نفوس آباد ہیں۔ ریاستوں کی آبادی ۹ کروڑ تیس لاکھ ہے۔ گو ہندوستان رقبہ میں ممالک متحدہ امریکہ کا نصف ہے لیکن ممالک متحدہ امریکہ کی آبادی سے ہندوستان کی آبادی قریب قریب تین گنا زیادہ ہے۔ ہندوستان کی آبادی دنیا کی کل آبادی کا تقریباً ۱/۵ حصہ ہے۔

صوبوں اور ریاستوں کی آبادی۔ ذیل کی جدول میں مجموعی آبادی اور برطانوی ہند کے مختلف صوبوں اور ہندوستانی ریاستوں کے سنہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی کی وسعت ظاہر کی گئی ہے۔ یہ اعداد حکومت ہند کے جاری کردہ اطلاعات سے ماخوذ ہیں۔

صوبہ، ریاست یا ایجنسی	آبادی سنہ ۱۹۳۱ء میں	آبادی سنہ ۱۹۴۱ء میں
(۱) اجمیر مارواڑ	۵۰۶۰۰۰	۵۸۴۰۰۰

(۲) آسام	۸۶۲۲۰۰۰	۱۰۲۰۵۰۰۰
(۳) برطانوی بلوچستان	۴۶۴۰۰۰	۵۰۲۰۰۰
(۴) بنگال	۵۰۱۱۶۰۰۰	۶۰۳۱۴۰۰۰
(۵) بہار	۳۲۳۷۱۰۰۰	۳۶۳۴۰۰۰۰
(۶) بمبئی	۱۷۹۹۲۰۰۰	۲۰۸۵۸۰۰۰
(۷) اڑیسہ	۸۰۲۶۰۰۰	۸۷۲۹۰۰۰
(۸) صوبہ متوسط و برار	۱۵۳۲۳۰۰۰	۱۶۸۲۲۰۰۰
(۹) کورگ	۱۶۳۰۰۰	۱۶۹۰۰۰
(۱۰) دہلی	۶۳۶۰۰۰	۹۱۷۰۰۰
(۱۱) مدراس	۴۴۲۰۵۰۰۰	۴۹۳۴۲۰۰۰
(۱۲) صوبہ سرحدی	۲۴۲۵۰۰۰	۳۰۳۸۰۰۰
(۱۳) پنجاب	۲۳۵۸۱۰۰۰	۲۸۴۱۹۰۰۰
(۱۴) صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ	۴۸۴۰۹۰۰۰	۵۵۰۲۱۰۰۰
(۱۵) آسام کی ریاستیں مانی پور اور کھاسی	۶۲۶۰۰۰	۷۲۵۰۰۰
(۱۶) بلوچستان کی ریاستیں	۴۰۵۰۰۰	۳۵۶۰۰۰
(۱۷) ریاست بڑودہ	۲۴۴۸۰۰۰	۲۸۵۵۰۰۰
(۱۸) بنگال کی ریاستیں	۱۸۶۳۰۰۰	۲۱۴۲۰۰۰
(۱۹) اڑیسہ کی ریاستیں	۲۶۸۳۰۰۰	۳۰۲۵۰۰۰
(۲۰) بمبئی کی ریاستیں	۳۷۲۳۰۰۰	۴۲۴۳۰۰۰
(۲۱) وسط ہند کی ایجنسی	۶۶۴۸۰۰۰	۷۵۰۲۰۰۰
(۲۲) صوبہ متوسط کی ریاستیں	۳۵۴۸۰۰۰	۴۰۵۴۰۰۰

(۲۳) ریاست گوالیار	۲۵۲۳۰۰۰	۳۹۹۲۰۰۰
(۲۴) حیدرآباد	۱۴۴۳۶۰۰	۱۶۳۳۸۰۰۰
(۲۵) ریاست جموں وکشمیر	۳۶۴۶۰۰۰	۴۰۲۱۰۰۰
(۲۶) مدراس کی ریاستیں	۴۵۳۰۰۰	۴۹۹۰۰۰
(۲۷) ریاست میسور	۶۵۵۷۰۰۰	۷۳۲۹۰۰۰
(۲۸) شمالی مغربی سرحدی صوبہ (ایجنسیاں اور قبائلی علاقہ)	۲۲۵۹۰۰۰	۲۳۷۸۰۰۰
(۲۹) پنجاب کی ریاستیں	۴۴۹۷۰۰۰	۵۴۵۹۰۰۰
(۳۰) راجپوتانہ ایجنسی	۱۱۵۷۱۰۰۰	۱۳۶۷۰۰۰۰
(۳۱) ریاست سکم	۱۱۰۰۰۰	۱۲۲۰۰۰
(۳۲) صوبہ متحدہ کی ریاستیں	۸۵۶۰۰۰	۹۲۸۰۰۰
(۳۳) مشرقی ہند کی ریاستوں کی ایجنسی	۴۲۲۲۰۰۰	۴۹۰۱۰۰۰
(۳۴) ریاست کوچین	۱۲۰۵۰۰۰	۱۴۲۳۰۰۰
(۳۵) ریاست ٹراونکور	۵۰۹۶۰۰۰	۶۰۷۰۰۰۰

کثرت آبادی کے عوامل ۔ ہندستان میں فی مربع میل آبادی کا اوسط ۱۹۵ نفوس سے زاید ہے ایک خطے سے دوسرے خطے میں کثرت وقلت آبادی کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہندستان کے اکثر حصوں میں کثرت آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے تقریباً ۴۰ انچ سالانہ بارش کافی ہوجاتی ہے بعض حصوں میں قلت بارش کی تلافی آبپاشی کے مصنوعی ذرائع سے کی جاتی ہے کثرت وقلت آبادی میں دوسری قابل لحاظ چیز زمین کی ساخت ہے۔ جہاں زمین مسطح ہوتی ہے ایک انچ زمین بھی غیر مزروعہ باقی نہیں رکھی جاتی - اس لئے ایسے مقامات پر ایک کثیر آبادی کی پرورش ہوسکتی ہے اگر پہاڑوں اور وادیوں کی وجہ سے زمین ناہموار ہو تو وہاں کاشت مشکل ہوتی ہے

لامحالہ آبادی منتشر اور قلیل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ زمین کی زرخیزی کا اثر بھی آبادی پر بہت زیادہ ہوتا ہے وہ اقطاع جو بارش کے لحاظ سے موزوں مقام پر واقع ہیں اپنی زرخیزی اور موزوں ساخت کے ساتھ کثرت آبادی میں بھی نمایاں ہیں جیسے بنگال و صوبہ متحدہ جہاں وسیع سطح میدان موجود اور زمین زرخیز ہے بقدر مناسب بارش بھی ہوتی ہے قدرتاً آبادی بھی زیادہ ہے مگر بعض اقطاع میں غیر صحت بخش آب و ہوا کی وجہ سے زمین کی ساخت اور زرخیزی سے مستفید ہونے کا موقع نہیں ہے وہاں لازماً آبادی کی کثرت نہیں ہوتی جیسا کہ آسام ہے۔

آبادی کی تقسیم بلحاظ پیشہ۔ ہندوستان میں تقریباً ۷۰ فیصدی لوگ زراعت اور اس کے متعلقہ پیشوں کے ذریعہ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں صنعت و حرفت سے تقریباً ۱۰ فیصدی آبادی کی پرورش ہوتی ہے اور اس ملک کی ایک بڑی تعداد غیر منظم صنعتوں میں مشغول ہے ان صنعتوں سے گھریلو ضروریات کی اشیاء اور سادہ آلات اور اوزار فراہم کئے جاتے ہیں [illegible] فیصدی منظم صنعتوں میں مشغول ہیں۔ تجارت، حمل و نقل میں تقریباً ۶ فیصدی کی گنجائش ہوتی ہے [illegible] حفاظت ملک تقریباً [illegible] فیصدی لوگوں کے ذمہ ہے یہ اعداد [illegible] کافی ہیں کہ زراعت ہندوستان کی عظیم اکثریت کا ایک اہم پیشہ ہے۔

قصبات اور دیہات۔ زراعت کی غالب حیثیت کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ یہاں قصبات کے مقابلہ میں دیہات کی تعداد اور اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان میں تقریباً سات لاکھ دیہات کے مقابلہ میں صرف دو ہزار پانچ سو چھپتر قصبات ہیں۔ قصبہ سے مراد ایسی بستی ہے جس میں پانچ ہزار سے زیادہ لوگ آباد ہوں یا جسے بلدی حکومت خود اختیاری حاصل ہو۔ قصبات میں جملہ آبادی کا صرف گیارہ فیصد حصہ مقیم ہے جب اس کا مقابلہ غیر ممالک سے کیا جاتا ہے تو بہت فرق معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً انگلستان میں قصباتی آبادی کی تعداد اسی فیصد ہے ممالک متحدہ امریکہ میں ۵۱ فیصد فرانس میں ۴۹ فیصد اور جرمنی میں ۴۶ فیصد ہے۔

ہندوستان کے دیہات اور قصبات کی آبادی غیر متناسب طور پر جس طرح منقسم ہے وہ ایک عام پستی کی

علامت ہے۔ تہذیب و تمدن کی شمع ہمیشہ شہروں سے روشن ہوتی ہے اور یہاں سے اس کی کرنیں دیہات تک پہونچی ہیں۔ جدید صنعتی ترقی سے قصبات کی آبادی میں اضافہ کی امید ہے اس طرح بحیثیت مجموعی ملک نہ صرف معاشی لحاظ سے بلکہ ثقافتی نقطۂ نظر سے بھی سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔

صنفی تقسیم۔ ہندوستان کی آبادی کی ایک اور قابل لحاظ خصوصیت یہ ہے کہ یہاں مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے اس حقیقت کے باوجود کہ خواتین جسمانی اعتبار سے قوی تر ہیں۔ ان کا اوسط فی ہزار مرد ۹۴۰ ہے۔ اس کمی کی توجیہہ یہ ہے کہ ہندوستان میں عورتوں کی اموات کا تناسب زیادہ ہے، جو کمسنی کی شادی، کثرت اولاد اور ماہر دائیوں کی کمی کے باعث واقع ہوتی ہیں۔

قابل کار آبادی۔ یورپ میں قابل کار آبادی کی عام حد پندرہ اور ساٹھ سال کی عمر کے درمیان ہے مگر ہندوستان میں پندرہ سے چالیس سال تک۔ اس لئے کہ یہاں بڑھاپا جلد ظاہر ہونے کے باعث کام کرنے کی صلاحیت زیادہ مدت تک باقی نہیں رہتی اس لحاظ سے ہندوستان میں قابل کار آبادی کا تناسب مجموعی آبادی کے تناسب کے مقابلہ میں صرف چالیس فی صد ہے۔ اس کے برخلاف انگلستان میں یہ تناسب ۶۰ فیصد اور فرانس میں ۵۲ فیصد ہے۔

مملکت آصفیہ کی مردم شماری کے بعض اعداد۔ سنہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق مملکت حیدرآباد کی کل آبادی ۱۶۳۳۸۵۳۴ ہے۔ دار الحکومت حیدرآباد کی آبادی ۷۳۹۱۵۹ ہے۔ جو لحاظ آبادی ہندوستان کا چوتھا بڑا شہر ہے۔ شہر ورنگل کی آبادی ۹۲۸۰۸ ہے۔ شہر گلبرگہ کی آبادی ۵۳۵۵۱ ہے۔ اور شہر اورنگ آباد کی آبادی ۵۰۹۲۴ ہے۔

مملکت آصفیہ میں سنہ ۱۹۴۱ء میں قصبات کی تعداد ۱۳۲۔ اور دیہات کی تعداد ۲۱۴۲۲۳ ہوگئی ہے۔ مندرجۂ ذیل جدول، بابتہ سنہ ۱۹۳۱ء سے یہ معلوم ہوگا کہ مملکت حیدرآباد میں آبادی کے خاص پیشوں کا تناسب فی میل کیا ہے جدید اعداد ہنوز دستیاب نہ ہوسکے۔

(۱) زراعت	۵۷۱	(۲) معدنیات	۴
(۳) صنعت و حرفت	۱۰۵	(۴) حمل و نقل	۲۵

(۵) تجارت	۱۱۶	(۶) کوتوالی و فوج	۸
(۷) سرکاری ملازمت	۱۳	(۸) پیشے	۱۹
(۹) گھریلو خدمت	۶۹	(۱۰) خانگی آمدنی	۳
(۱۱) غیر پیدا آور	۲۲	(۱۲) متفرق	۲۵

سنہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق مملکت حیدرآباد میں مردوں کی تعداد ۸۳ لاکھ ۶۴ ہزار ۷ سو ۷۵ ہے اور عورتوں کی تعداد ۷۹ لاکھ ۱۹ ہزار ۷ سو ۹۵ ہے۔

شرح پیدائش اور شرح اموات۔ ہندوستان کی شرح پیدائش اور شرح اموات دنیا کے اور ممالک کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے (شرح پیدائش ۳۶ فی ہزار نفوس اور شرح اموات ۲۶ فی ہزار نفوس ہے)۔ ایک ایسی شرح پیدائش جو بلند اور قابو سے باہر ہو عموماً بلند شرح اموات کا باعث ہوتی ہے ممالک یورپ میں شرح پیدائش اور اس کے ساتھ شرح اموات کو بھی گھٹانے کی کوشش کرنے کا ایک عام رجحان پایا جاتا ہے۔ وہاں شرح پیدائش اس لئے گھٹ رہی ہے کہ لوگ دیر سے شادیاں کرتے اور خاندان کو محدود رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بچے اگر تعداد میں کم ہوں تو اچھی طرح ان کی پرورش ہو سکتی ہے۔ اور ان کی بڑی تعداد بڑی عمر پاتی ہے۔ ہندوستان میں شرح اموات عام طور پر افلاس اور کم توانائی کی وجہ سے بہت زیادہ ہے۔ بچوں اور عورتوں میں اموات کی شرح خصوصیت کے ساتھ زیادہ ہے۔ بچپن کی شادی بھی شرح اموات میں اضافہ کا باعث ہے۔ کیونکہ اس سے ماں کی زندگی پر تباہ کن اثر پڑتا ہے۔ نتیجتاً بچہ کمزور اور بیماری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اصول حفظ صحت کی ناواقفیت اور غیر ماہر دائیوں کی وجہ سے بھی بہت خراب نتائج رونما ہوتے ہیں۔ بلاشبہ یہ تمام نقائص تعلیم اور دوسرے قوی اثرات کے تحت آہستہ آہستہ دور ہو رہے ہیں لیکن یہ رفتار اس قدر سست ہے کہ غالباً اصلاح کے لئے صدیاں درکار ہوں گی۔

ہندوستان میں مسئلہ آبادی۔ سنہ ۱۹۳۱ء اور سنہ ۱۹۴۱ء کے درمیان ہندوستان کی آبادی تقریباً ۳۵ کروڑ ۲۸ لاکھ سے بڑھ کر ۳۸ کروڑ ۸۸ لاکھ تک پہنچ گئی۔ دس سال میں ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ کا اضافہ مجموعی آبادی کے لحاظ سے کوئی بڑا اضافہ نہیں ہے لیکن حیرت انگیز ضرور ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے

کہ کیا ہندوستان میں اس قدر ذرائع مہیا ہیں کہ اس کی بڑھتی ہوئی آبادی کی پرورش کا سامان ہو سکے۔ کسی ملک کے معین حالات کے تحت بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہاں ٹھیک متوازن آبادی کیا ہونی چاہیئے۔ ہندوستان کی متوازن آبادی کے متعلق بھی کوئی قطعی رائے نہیں دی جاسکتی۔ اس لحاظ سے گو صحیح نتیجہ پر پہونچنا ممکن نہیں۔ بر این ہمہ عام حالات کے تحت ایک مناسب اندازہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس طور سے ایسا عام اندازہ قائم کرنے کے لئے حسب ذیل امور پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے۔

(۱) اضافہ آبادی پر قابو پانے کے مناسب ذرائع موجود ہیں یا نہیں۔

(۲) کسی فوری اور غیر معمولی معاشی ترقی کے امکانات پائے جاتے ہیں یا نہیں۔

(۳) ایجابی موانعات اپنا عمل کر رہے ہیں یا نہیں۔ مثلاً اگر شرح اموات خصوصاً بچوں کی بہت بلند ہے تو ہم اس سے بلا شبہہ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ایسا ملک کثرت آبادی کا شکار رہے۔

انہیں اصولوں کے تحت ہندوستان کے حالات پر غور کرنا چاہیئے۔

یہ امر کہ ہندوستان کی آبادی پر انسدادی قابو رکھنے کے اہم امور عمل پیرا نہیں ہیں۔ بہ آسانی ثابت کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً یہاں ہر شخص شادی کرتا ہے اور جتنا جلد ممکن ہو شادی کرلیتا ہے۔ مذہبی احکام سے بھی شادی کی حمایت ہوتی ہے۔ ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ اولاد پیدا کرنے کے لئے ہر ہندو کو شادی کرنی چاہیئے۔ اگر لڑکے پیدا ہوں تو بہت اچھا ہے تاکہ باپ کے کریا کرم کی رسوم ادا کریں ورنہ باپ کی روح تکلیف اور بے چینی کے ساتھ بھٹکتی پھرتی ہے۔ سماج کی بدگوئی سے بچنے کے لئے لڑکیوں کی شادی سن بلوغ کو پہونچنے سے پہلے کرنی پڑتی ہے۔ مشترکہ خاندانی زندگی کی وجہ سے بچپن کی شادی کی ترغیب ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص جو شادی کرتا ہے روزی کمانے کے بھی قابل ہو خاندان کے دوسرے ارکان شادی شدہ جوڑے کی امداد کردیا کرتے ہیں۔ لوگوں کے افلاس کی وجہ سے بھی کم سنی کی شادی ضروری ہے کیونکہ گھر کے کام کاج کے لئے بیوی کی ضرورت ہے جو اکثر کھیتوں اور دوسرے پیشوں میں اپنے شوہر کی امداد کرتی ہے۔ معیار زندگی اتنا ادنیٰ ہے کہ بچوں کی پرورش میں زیادہ صرفہ برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ بد احتیاطی اور اچھی غذا نہ ملنے سے اکثر بچے فوت ہوجاتے ہیں اور جو زندہ رہتے ہیں جلد کام سے

لگ جانے پر مجبور کئے جاتے ہیں۔ بچوں کو بغیر کسی خاص تربیت کے کام سے لگا دینا معاشرہ کے لئے نتیجتاً مضر ثابت ہوتا ہے لیکن غریب آدمی مستقبل کے ان تصورات کو پیش نظر نہیں رکھ سکتا فوری فائدہ چاہے وہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو خیال و ذہن پر حاوی ہو جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اضافۂ آبادی کو روکنے کے لئے شادی سے احتراز یا اس کا التوا ہندوستان میں عملاً موجود نہیں ہے لہذا یہ قابل تعجب نہیں ہے کہ ہندوستان کی شرح اموات دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔

جہاں تک معاشی ترقی کے امکانات کا تعلق ہے بلا شبہ زراعتی اور صنعتی نظام کی اصلاح ذریعہ بہت کچھ کیا جا سکتا ہے لیکن ہمارے زراعتی مسائل کا سطحی مطالعہ اس حقیقت کو ظاہر کر سکتا ہے کہ اس راستہ کی مزاحمتیں اور مشکلات اس قدر شدید ہیں کہ رفتار ترقی میں کوئی قابل لحاظ سرعت پیدا نہیں ہو سکتی۔ صنعتی میدان میں دوسری قومیں ہندوستان سے بہت آگے بڑھ گئی ہیں کامیابی کے ساتھ ان سے مسابقت بھی کوئی آسان کام نہیں ہے فرض کیجئے کہ بیرونی مال پر محصول لگا کر اس کی درآمد روک بھی دی جائے تب بھی تیزی سے ترقی کا امکان نہیں ہے کیونکہ اس میں بیرونی مقابلے کے علاوہ دوسرے موانعات بھی ہیں۔ محنت اور سرمایہ کے نقائص کو دور کرنے کے لئے ایک عرصہ درکار ہے۔ ہندوستان کے اکثر رجائیت پسندوں کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ آبادی کے ساتھ ہندوستان میں غیر معمولی اضافہ دولت کے ذرائع فراہم نہیں ہو سکتے ایسے ذرائع انگلستان میں اضافۂ آبادی کے باوجود صنعتی انقلاب کی وجہ سے وجود میں آئے۔

گو ہندوستان میں متعدد مہلک امراض جیسے ملیریا۔ انفلوئنزا کا بھی دور دورہ رہتا ہے اور وقتاً فوقتاً آبادی کا ایک کثیر حصہ ان کی نذر ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی یہاں شرح اموات دنیا میں سب سے زیادہ ہے اور خاص طور پر بچوں کی شرح سب سے بڑھ کر ہے۔ اس طرح ہندوستان میں کثرت آبادی کی بہت سی علامتیں پائی جاتی ہیں موجودہ حالات اور مستقبل قریب میں معاشی ترقی کے امکانات کو پیش نظر رکھ کر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ہندوستان کی عام فلاح و آسائش کے لئے یہ امر ضروری سا ہے کہ یہاں بچوں کی شرح پیدائش کو کسی قدر سست کر دیا جائے۔ چنانچہ مصنوعی ضبط تولید کی تحریک ملک میں شروع ہو چکی ہے اور واقف حال رائے عامہ کا حکومت سے یہ مطالبہ ہے کہ اس تحریک کی تبلیغ میں مدد دی جائے ضبط تولید کے دواخانے قائم ہوں اور ایسے مراکز مقرر کئے جائیں جہاں لوگوں کو اس متعلق مشورے دیئے جائیں لیکن ضبط تولید کے جیسے بعید ذرائع اختیار کرکے آبادی کی تعداد کو محدود کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بہت ضروری ہے کہ زراعتی اور صنعتی ترقی میں ممکنہ کوشش کی جائے تاکہ زیادہ کمانے سے آبادی کے

افراد کا معیار زندگی بلند ہو سکے زندگی بسر کرنے کا معیار جیسے بلند ہوتا جائے گا۔ ہندوستانی معاشرہ کی بیسیوں خرابیاں خود بخود دور ہوتی جائیں گی۔

عمرانی اور مذہبی اداروں کا معاشی پہلو

ذات پات ۔ ہندوستان میں معاشی زندگی کے مختلف مسائل نے اہل ملک کے عمرانی اداروں کی خصوصیات کے باعث عجیب و غریب شکل اختیار کرلی ہے۔ چنانچہ ایک ایسا ادارہ ذات پات کا نظام ہے جس پر ہندوستان کی آبادی کا کثیر حصہ عامل ہے۔ ایک زمانے میں شاید ذات پات کے نظام کی حمایت معاشی قوت اور کارکردگی کی بنا پر ہوا کرتی تھی جس کا دارومدار تقسیم عمل کے اصول پر تھا یہ نظام اس زمانے کے لیے موزوں تھا جبکہ صرف چند نمایاں پیشوں کا وجود تھا جب کہ تجارت کا انحصار دستکاری پر تھا اور بیٹا آسانی کے ساتھ اپنے باپ سے اس کے ہنر کو سیکھتا تھا لیکن اب متعدد پیشوں اور مشنری کی ایجاد سے دستکاری کی اہمیت مقابلتاً کم ہوگئی ہے اس طرح ذات پات کا نظام مدد و معاون ہونے کے بجائے رکاوٹ بن گیا ہے۔ یہ نظام پیشہ کے انتخاب میں فطری رجحان کے مطابق عمل کرنے سے روکتا ہے۔ جو نہ صرف انفرادی بلکہ عمرانی نقطۂ نظر سے بھی نامناسب ہے۔ اس نظام کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض ذاتیں ادنیٰ اور بعض اعلیٰ تصور کی جاتی ہیں اور ادنیٰ پیشے حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ بلاشبہ ہندوستان کی آبادی کا ایک قابل لحاظ حصہ اس نظام معاشرت کا پابند نہیں ہے اس کا اصول معاشرت یہ ہے کہ ہر جائز پیشہ قابل عزت ہے۔ کمتری اور برتری کا معیار نسل اور خاندان نہیں بلکہ فطری قابلیت ہے جو کسی خاص ذات کا اجارہ نہیں ہے۔ یہ اصول آہستہ آہستہ ہی لیکن مستقل طور سے اپنا اثر پھیلاتا جارہا ہے اور یہ احساس پیدا ہوگیا ہے کہ اپنی موجودہ شکل میں ذات پات کا نظام عمرانی اور سیاسی کمزوری کا باعث ہے۔ اور جس قدر جلد اس کا انسداد ہو جائے ملک و قوم کے لیے مفید ثابت ہوگا اسلامی معاشرت کے اثرات اور مغربی تعلیم و تمدن ذات پات کے نظام کو بلاشبہ کمزور کردیں گے لیکن دوسرے قومی اثرات مثلاً سیاسی اقتدار کے لیے کش مکش جو سیاسی اصلاحات کے وقت رونما ہوتی ہے ذات پات کے اختلافات کو تیز کردیتی ہے۔

مشترکہ خاندانی زندگی - ہندوستان میں عمرانی زندگی کی ایک اور خصوصیت مشترکہ خاندانی زندگی ہے اس نظام میں جو چند خوبیاں ہیں یہ ہیں کہ ہر فرد خاندان کی پرورش ہوتی ہے - بیواؤں اور یتیموں کو اپنے خاندان میں پناہ ملتی ہے اس لحاظ سے حکومت کو مغربی ممالک کے مقابلے میں مصیبت زدوں کی زیادہ دیکھ بھال نہیں کرنی پڑتی جب لوگوں کی ایک بڑی تعداد مل کر رہتی ہے جیسا کہ مشترکہ خاندانی زندگی میں ہوتا ہے تو خاندانی اخراجات میں بچت ہو جاتی ہے - مشترکہ خاندانی زندگی کی وجہ سے انضباط، قربانی، اطاعت اور ادب جیسی عمدہ صفات پیدا ہوتی ہیں لیکن موجودہ حالات کے تحت مشترکہ خاندانی زندگی پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ نظام ایسے کاہلوں کی پیدائش کا باعث ہوتا ہے جن میں عزت نفس اور احساس ذمہ داری کا فقدان ہے۔ موجودہ زمانے میں اکثر لوگ روزی کی تلاش میں خاندان کو چھوڑ دیتے ہیں - کوئی شبہ نہیں کہ مغربی اثرات کی وجہ سے مشترکہ خاندانی زندگی کا رواج کم ہو چلا ہے - لیکن اس خصوص میں بھی مسلمانوں کو مغربی اثر قبول کرنے کے لئے اپنے معاشرے کے کسی قدیم اصول کو ترک کر دینا نہیں پڑے گا - ان کے معاشرہ کی بنیاد خود انفرادی آزادی پر ہے۔

قوانین وراثت - ہندوستان کے قوانین وراثت انگریزی قانون کے بالکل برعکس ہیں یہاں برخلاف جائداد ورثاء کے کثیر تعداد میں منقسم ہوتی ہے۔ انگلستان میں قانون حق اولادِ اکبر کی وجہ سے غیر منقولہ جائداد صرف چند لوگوں کے قبضہ میں آجاتی ہے - جائداد اور دولت کی وسیع پیمانہ پر تقسیم ارتکازِ دولت کی بہ نسبت معاشرتی مساوات کے تصور سے زیادہ مطابق ہے - ہندوستان میں مساوی تقسیم دولت کے اصول کی وجہ سے تقسیم در تقسیم اور انتشار اراضی کی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں - صرف چند اشخاص کے ہاتھوں میں دولت کا اجتماع ہو جانے کی وجہ سے پیمانہ کبیر کی مسابقت میں رکاوٹ ہوتی ہے لیکن یہ مسئلہ زندگی کے نظریات کے بنیادی اختلاف کا مبدا ہے اور دنیا کو ابھی اسے حل کرنا ہے۔

مذہب - یہ اکثر بیان کیا جاتا ہے کہ ہماری موجودہ معاشی پستی کا سبب ہماری قسمت پرستی اور آخرت کا تخیل ہے موت کے بعد روح کی نجات کے مسئلہ میں ہم اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ اس کرۂ ارض میں دنیاوی فلاح و بہبود نظر انداز کر دی جاتی ہے - یہ امر آسانی سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ہندو مذہب اور اسلام کی طرح عیسائی بھی آخرت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن آخرت کا تصور عیسائی

قوم کی مادی ترقی میں حارج نہیں ہوا۔ یہ حقیقت بھی ہمیں فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ گذشتہ دور کی تاریخ میں اہل ہند کو بانی سلطنت، فاتح، اور نوآبادکار کا امتیاز حاصل رہا ہے۔ حکمیاتی علوم مثلاً ریاضی اور ہیئت میں ان کے کارنامے نظر انداز نہیں کئے جاسکتے۔ کسی زمانے میں ہندوستانی دست کاری کو عالمگیر شہرت اور مقبولیت حاصل تھی یہ ہرگز ممکن نہ ہوتا اگر ہندوستانی روحانیت کا تصور معاشی اور دوسری جد وجہد کو مفلوج کر دیا ہوتا۔ موجودہ حالت پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ بعض فرقے (جیسے مارواڑی جین، بھاٹیا، برہمن، بوہرے) جو ملک کی جدید تجارتی اور صنعتی زندگی میں نمایاں حصہ لیتے ہیں اور بڑی اولوالعزمی دکھا رہے ہیں انتہا درجہ قدامت پرست ہیں۔ اور موجودہ آزاد خیالی سے انھیں کوئی مس نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشی محرکات مغربی ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی بہت قوی ہیں۔ قسمت پرستی کا تعلق مذہبی تعلیمات سے بہت کم ہے یہ تاریخی اور سیاسی اسباب کا نتیجہ ہے جب لوگوں کو سیاسی اور دوسرے اسباب کی بنا پر اپنی محنت کا ثمرہ حاصل کرنے کا یقین نہیں ہوتا تو وہ لامحالہ قسمت پرست ہو جاتے ہیں۔ جب حالات مستقل اور زیادہ قابل اطمینان ہوتے ہیں تو انسان کے قدرتی محرکات زندگی کے محاسن کی تخلیق اور ان سے لطف اندوزی کی راہیں اختیار کرتے ہیں اگر مذہب اس رجحان کی قدر افزائی نہ کرے تو زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ قدیم کتابوں کی جدید تعبیر ہونے لگتی ہے یہی یورپ میں پیش آیا اور یہی ہندوستان میں پیش آرہا ہے۔ ہندومت کے بعض خصوصی عقائد مثلاً کرما کے عقیدہ کے متعلق اکثر ہندو مفکرین کا یہ خیال ہے کہ ترک علائق کی بجائے یہ عقیدہ جد وجہد کی تعلیم دیتا ہے مسلمانوں کی حد تک بھی قسمت پسندی کے یہ معنی نہیں ہوسکتے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرے ساکت و صامت ہو جائے ان کے مذہبی تعلیمات سے قطع نظر خود ان کی ۱۳ سو سال کی تاریخ عمل اور جد وجہد کی ہی مظہر ہے۔

الغرض یہ کہنا غلط ہے کہ ہندوستان میں مذہب مادی ترقی کا مخالف ہے دوسرے اثرات مثلاً سیاسی نراج کا اس صورت حال کی تخلیق میں بہت بڑا حصہ ہے۔ مصائب بھی مثلاً قحط اور بیماریاں جیسے ملیریا وغیرہ جس سے جسمانی کمزوری لاحق ہوتی ہے اہل ملک میں مردنی اور قنوطیت پیدا کرتے ہیں۔

مجلہ طیلسانین کے مقاصد اور قواعد

(۱) "مجلہ طیلسانین" انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا ترجمان ہے۔

(۲) اغراض انجمن کے لحاظ سے مجلہ میں مضامین، مقالے اور نظمیں شایع ہونگی۔

(الف) جامعۂ عثمانیہ کے منظورہ مابعد طیلسان مقالے شایع کئے جائیں گے۔

(ب) اردو مطبوعات پر تنقید و تبصرہ کیا جائے گا۔

(ج) انجمن طیلسانین عثمانیہ اور اس کے ملحقہ اداروں کی سرگرمیوں اور کاروبار کے تفصیلات کی اشاعت عمل میں آئیگی۔

(د) علمی اور ہر جہتی ترقی کے معلومات و اطلاعات شایع کی جائیں گی۔

(ھ) سیاسیات حاضرہ اور اختلافی مذہبی امور کے متعلق مضامین وغیرہ کسی صورت میں شایع نہ کئے جائیں گے۔

(۳) حسب ضرورت مجلہ کے مختلف حصے خاص خاص علم و فن سے مختص ہونگے۔ فی الوقت مجلہ کے دو حصے ہونگے ایک عام دوسرا موسوم مجلہ سائنس۔

(۴) مجلہ بہمن، اردی بہشت، امرداد، آبان، مطابق جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر میں شایع ہوگا۔

(۵) مجلہ کے ہر حصہ کی ضخامت کم از کم ۱۰۰ صفحے ہوگی۔

(۶) مضمون یا مقالہ نگاروں کو ان کے مضمون یا مقالہ کے ۲۵ نسخے بلا قیمت ارسال ہوں گے اور ریمارک کے مقالہ کے نسخے بلا قیمت ارسال ہونگے بشرطیکہ پہلے مطلع کر دیا جائے اگر ان نسخوں سے زائد نسخے درکار ہوں تو کاغذ کی قیمت قبل از قبل ادا کرنے پر انتظام عمل میں آئیگا۔

(۷) اگر مضمون یا مقالہ نگار پہلے ہی مجلہ کے خریدار نہ ہوں تو مجلہ کا وہ شمارہ جس میں مضمون شایع ہو بلا قیمت ارسال کیا جائیگا۔

(۸) سال بھر میں کسی صاحب کے دو مضمون یا مقالے شایع ہونے کی صورت میں سال مابعد کے لئے اگر قواعد انجمن طیلسانین عثمانیہ مانع نہ ہو مجلہ بلا قیمت جاری کیا جائے گا۔

(۹) اگر کوئی مضمون یا مقالہ یا نظم قابل اشاعت قرار نہ پائے تو اس کو واپس کر دیا جائے گا۔

(۱۰) اگر کسی مضمون یا مقالہ کے لئے مجلہ اپنے خرچ سے تصاویر کے بلاکس تیار کرے تو ان کو مناسب قیمت پر جس کا تصفیہ مہتمم مجلہ کرے گا۔ فروخت کیا جاسکے گا۔

(۱۱) اگر مجلہ کا کوئی شمارہ اشاعت کے مقررہ مہینہ میں وصول نہ ہو تو اس کی اطلاع مہتمم کو دوسرے مہینہ میں کر دینی چاہیئے۔

مجلہ طیلسانین کا چندہ و اشتہارات کا نرخ

مجلہ کے چندہ کے متعلق حسب ذیل امور پر عمل ہوگا

(۱) (الف) مجلہ چندہ دہندہ ارکان انجمن طیلسانین عثمانیہ کو مقررہ قواعد کے بموجب بلا قیمت ارسال کیا جائیگا۔

(ب) مجلہ کا حصہ موسوم بہ "معاشیات" معاشی کمیٹی انجمن طیلسانین کے ارکان کو اپنے چندہ رکنیت کے علاوہ سالانہ (۱) روپیہ ادا کرنے پر ارسال کیا جائے گا۔ اگر ان کو مجلہ کے دونوں حصے مطلوب ہوں تو اس کیلئے ان کو سالانہ دو روپیہ اپنے چندہ رکنیت کے علاوہ ادا کرنا ہوگا۔

(ج) مجلہ کے دونوں حصوں کی قیمت علاوہ محصول ڈاک خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ پانچ روپے سکہ عثمانیہ ہوگی اور بیرون مملکت آصفیہ سے پانچ روپیہ سکہ حکومت ہند۔

(د) مجلہ کے عام حصہ کی قیمت محصول ڈاک کے علاوہ خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ (۲) روپے سکہ عثمانیہ ہوگی اور بیرون مملکت آصفیہ سے (۲) روپے سکہ حکومت ہند۔

(ہ) مجلہ کے حصہ "معاشیات" کی قیمت مع محصول ڈاک خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ (۳) روپے سکہ عثمانیہ ہوگی۔ اور بیرون مملکت آصفیہ سے (۳) روپے سکہ حکومت ہند۔

(۲) مجلہ کے ہر حصہ کی قیمت فی نسخہ ایک روپیہ ہوگی۔ دونوں حصوں کی قیمت فی نسخہ ایک روپیہ آٹھ آنے ہوگی۔

(۳) اشتہارات کا نرخ حسب ذیل ہوگا۔

مقدار	نرخ سالانہ	نرخ فی اشاعت
پورا صفحہ پہلا ورق	۳۰ روپے	۱۲ روپے
پورا صفحہ اندرونی	۲۰ روپے	۶ روپے
پاؤ صفحہ ،، ،،	۸ روپے	۳ روپے

مقدار	نرخ سالانہ	نرخ فی اشاعت
آدھا صفحہ پہلا ورق	۲۰ روپے	۸ روپے
آدھا صفحہ اندرونی	۱۵ روپے	۵ روپے

البتہ تبادلہ کے طور پر اشتہارات کی اشاعت مطلوب ہو تو مراسلات کے ذریعہ تصفیہ ہو سکے گا۔

(۴) مجلہ کے سلسلہ میں ہر قسم کی مراسلت مہتمم مجلہ طیلسانین دفتر مجلس نمائش، نمائش گاہ باغ عام "حیدرآباد دکن" سے کی جانی چاہیئے۔

(۵) خریداران مجلہ اپنے پتہ کی تبدیلی سے مہتمم مجلہ کو بروقت مطلع فرمائیں۔

مطبوعات انجمن طیلسانین عثمانیہ جن کا ہر تعلیمی ادارہ و ہر کتب خانہ میں رہنا ضروری ہے

۱۔ "عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیاں ریاست" شاہی دور تولیت کی لبیدا و محققانہ تاریخ

مولفہ سید علی محسن صاحب یم اے (عثمانیہ) .... قیمت ایک روپیہ

۲۔ "سلطان احمد شاہ بہمنی" سلطان کے دور کی مفصل محققانہ اور مستند تاریخ۔

مولفہ۔ ظہیر الدین صاحب یم، اے (عثمانیہ) " " ایک روپیہ چار آنے

۳۔ "امام غزالی کی کلامی خصوصیات" مولفہ۔ محمد غوث صاحب (محبوب گری) ام اے (عثمانیہ) " " ایک روپیہ چار آنے

۴۔ "موضع دوبلی کی معاشی تحقیق" مولفہ۔ محمد ناصر علی صاحب۔ ام اے (عثمانیہ) " " دو روپیہ

۵۔ "دربار اودھ کا اثر لکھنؤ کی شاعری پر" مولفہ۔ محمد اعظم خاں صاحب ام اے (عثمانیہ) " " ایک روپیہ

۶۔ "معاشیات کی الف بے" مولفہ۔ محمد ناصر علی صاحب یم اے (عثمانیہ) " " آٹھ آنہ

۷۔ "عہد معاونت اور حیدرآباد ۱۸۹۸ء"

مولفہ۔ میر مخدوم علی خاں صاحب یم، اے (عثمانیہ) " "

۸۔ "بلدہ سے قصبہ تک"

مولفہ۔ مولوی محمد فاروق صاحب بی، اے، (عثمانیہ) یچ، سی، یس " " (۴ر)

۹۔ "باد الکحل"

مولفہ۔ نذیر حسین صاحب آفندی یم، یس، سی (عثمانیہ) " " (۴ر)

۱۰۔ "مقامی محاصل ان کے اقسام اور نوعیت" مولفہ۔ محمد فاروق صاحب بی اے (عثمانیہ) یچ سی یس " " (۴ر)

ملنے کا پتہ

دفتر مجلہ طیلسانین دفتر مجلس نمائش "نمائش گاہ" باغ عام فون نمبر ۲۵۵۳

انجمن طیلسانیین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی ترجمان

مجلۂ طیلسانیین

آٹھویں جلد اردی بہشت ۱۳۵۳ف - اپریل ۱۹۴۴ء - ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ دوسرا شمارہ

مدیر :- محمد غوث ام۔ اے۔ ال ال بی (عثمانیہ)   مہتمم :- محمد عبد العلی بی ایس سی ال ال بی (عثمانیہ)

فہرست مضامین

اداریہ

حیدرآباد کے طبقۂ امراء کے ایک رکن رکین نواب کمال یار جنگ مرحوم کے انتقال کو عام طور سے ایک قومی حادثہ سمجھا جاتا ہے۔ نواب صاحب مرحوم اپنے بزرگانہ اخلاق اور قومی ہمدردی کے بے لوث جذبات کی بدولت بہت سی امیدوں کا مرکز تھے۔ انھوں نے ہر حلقہ میں اپنے خدمات قومی کی بناء پر ہر دل عزیز تھے۔ افسوس کہ ایک ایسے زمانہ میں جبکہ توقع تھی کہ مرحوم اپنی قابلیت اور کردار سے قوم کو بیش از بیش فائدہ پہنچائیں گے ان کو پیامِ اجل آ گیا۔ طبقہ امراء کے نوجوان ارکان کو نواب صاحب مرحوم کی مثال ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا چاہئے۔

اس دوران میں عثمانیہ برادری کو ایک مزید صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ مولوی فضل اللہ احمد مرحوم ہر چند قومی عامہ سرگرمیوں سے دور رہے لیکن زندگی تمام علمی میں ہی۔ گشتی کتب خانہ کی بنا رکھ کر انھوں نے مقاصد جامعہ کی تکمیل میں مسلسل جدوجہد کی۔ اور مرتے دم تک کتب خانے کے ذریعہ خدمت میں رہے۔ اردو گشتی کتب خانہ نے عروج اور پستی کے مختلف دور دیکھے اور اس کی وجہ سے اس کے بانی کو بارہا مرتبہ بہت تلخ تجربہ ہوا لیکن اس کوشش کی سود مندی بھی انکار نہیں ہو سکتی۔ مولوی فضل اللہ احمد کو مبدء فیاض سے تحریر اور تقریر کی قوت بھی حاصل ہوئی تھی۔ ان کی عین جوانی میں مدراس کے بڑے بڑے مجمعے ان کی تقریریں سکوت و صامت ہو کر سنا کرتے تھے لیکن زندگی کے دوسرے دور میں اہل ملک ان کے قدرتی ملکۂ تحریر و تقریر سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ بہرحال ان کی یادگار یعنی ان کا کتب خانہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے تو ملک کے فائدہ کا کوئی نہ کوئی سامان ہو گا۔

ڈاکٹر حامد علی صاحب کے وفات کے متعلق مجلہ کے گزشتہ شمارے میں جس حزن دل کا مخلصانہ طور سے

اداریہ

حیدرآباد کے طبقۂ امراء کے ایک رکن رکین نواب کمال یار جنگ مرحوم کے انتقال کو عام طور
قومی سانحہ سمجھا جاتا ہے۔ نواب صاحب مرحوم اپنے بزرگانہ اخلاق اور قومی ہمدردی کے بے لوث
کی بدولت بہت سی امیدوں کا مرکز تھے۔ انھوں نے ہر شعبے میں اپنے خدمات قومی کی بنا پر
تھے۔ افسوس کہ ایک ایسے زمانہ میں جبکہ توقع تھی کہ مرحوم اپنی قابلیت اور کردار سے ملت کو بیش
فائدہ پہنچائیں گے ان کو پیام اجل آگیا۔ طبقہ امراء کے نوجوان ارکان کو نواب صاحب مرحوم کو
ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا چاہئے۔

اس دوران میں عثمانیہ برادری کو ایک مزید صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ مولوی فضل اللہ احمد مرحوم ہم
عامہ سے گریزاں ہوتے دور رہے لیکن زمانہ طالب علمی میں ہی اردو شستی کتب خانہ کی بنا رکھ کر انھوں نے مقا
می تکمیل میں مسلسل جد و جہد کی۔ اور مرتے دم تک کتب خانہ کے ذریعہ قومی خدمت میں رہے۔
شستی کتب خانہ نے عروج اور پستی کے مختلف دور دیکھے اور اس کی وجہ سے اس کے بانی کو بڑا مرتبہ
تلخ تجربہ ہوا لیکن اس کوشش کی سود مندی بھی انکار نہیں ہو سکتی۔ فضل اللہ احمد کو مبداء فیاض سے
تحریر اور تقریر کی قوت بھی حاصل ہوئی تھی۔ ان کی عین جوانی میں مدراس کے بڑے بڑے مجمع
تقریر میں ساکت و صامت ہو کر سنا کرتے تھے لیکن زندگی کے دوسرے دور میں اہل ملک ان کے
ملکہ تحریر و تقریر سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ بہرحال ان کی یادگار میں ان کا کتب خانہ مضبو
ط پر قایم ہو جائے تو ملک کے فائدہ کا کوئی نہ کوئی سامان ہو گا۔

ڈاکٹر حامد علی صاحب کے وقف کے متعلق مجلے کے گزشتہ شمارے میں جس عزم دل کا مخلصانہ

اظہار کیا گیا تھا وہ کچھ رنگ منہ پر لایا۔ مبارک باد، دعوت، عصرانہ، گل پوشی اور عام جلسہ، یہ سب مراحل طے ہوئے۔ عام مردنی میں یہ بھی بہت غنیمت ہے۔ لیکن درحقیقت قوم نے اس بے نظیر ایثار کی کما حقہٗ قدر نہیں کی۔ دعوت و گل پوشی سے اس فرد فرید کے اطمینان قلب کا کیا سامان مہیا ہوسکتا ہے جب کہ وہ عمر بھر ان تمام تکلفات سے دور اور پاک رہا ہو۔ اس کے اطمینان قلب کا اگر کوئی سامان ہوسکتا تھا تو یہ کہ قوم اپنی جانب سے بھی چندہ کرکے اس وقف کو کم از کم دس لاکھ روپے کی حد تک پہنچا دیتی۔ عظیم الشان جلسہ مبارک باد میں جو لوگ شریک تھے ان میں سے پانچ دس اصحاب ہی اس کمی کو پورا کرسکتے تھے۔ غرض اس وقف کی یادگار اگر کوئی ہوسکتی ہے تو یہی کہ قوم اپنی طرف سے بھی اسی قدر رقم جمع کرکے اس وقف میں شامل کردے۔ اس قسم کی تمنائیں تو بہت پیدا ہوتی ہیں لیکن دیکھنا ہیں کہاں نصیب۔

عورتوں اور بچوں کی طبی امداد کے فنڈ کو دیکھتے دیکھتے جو کامیابی حاصل ہو رہی ہے وہ مبارک باد کے قابل ہے۔ اس کام کی خوبی اور اس کی سودمندی سے کون انکار کرسکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک عام تکلیف جو وقتاً فوقتاً محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ دواخانہ عثمانیہ اور دوسرے قرب و جوار کے دواخانوں میں قصبات اور دیہات سے جو باشندے رجوع ہوتے ہیں ان کے ساتھ تیمارداری کے لیے آنے والی عورتیں اور بچے بلدہ میں سکونت کے لیے بہت بڑی تکلیفیں برداشت کرتے ہیں۔ ان کے قیام اور سکونت کے لیے کوئی خاطر خواہ انتظام دواخانوں کے نواح میں بالکل نہیں ہے۔ اگر شہر کا کوئی مخیر دولت مند اس نواح میں کوئی مسافر خانہ تیار کرے تو صدقۂ جاریہ ہوگا۔ فقط

اُردو میں سائنس کی تعلیم

از جناب مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب وظیفہ یاب صدر کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

جناب مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب ملک کے ان معدودے چند فرزندوں میں شامل ہیں جنھوں نے تحصیل علم اور خدمت ملک کے تابناک روایات قایم کیئے ۔ جناب موصوف اب بھی شب و روز خدمت ملک میں مصروف ہیں ۔ علم کی خدمت کا ذوق بھی نوجوانوں سے زیادہ ہے ۔ ان کے تجربہ اور علم کے مد نظر ان کی تحریریں غور و خوض سے پڑھنے کے قابل ہوتی ہیں ۔ ان کے مشورے قابل عمل ہوتے ہیں ۔ اسی کے پیش نظر مجلہ میں موصوف کے دو مضمون شایع کیے جا رہے ہیں ۔ ہر چند ان کو نشر گاہ حیدرآباد سے نشر کیا جا چکا ہے لیکن ان کی افادیت ہر وقت تازہ ہے ۔

۔ یہ تقریر نشر گاہ حیدرآباد سے بتاریخ ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۳ء نشر کی گئی اور اس کی اجازت سے طبع کی جاتی ہے

آج کی تقریر میں ہم بتانا چاہتے ہیں کہ اُردو زبان میں نہ صرف ابتدائی بلکہ اعلیٰ اور فنی سائنس کی تعلیم کس طرح ممکن ہوئی ۔ وہ کیسے ترقی کر سکتی ہے اور آگے چل کر تحقیقات عالیہ و عملی اطلاقات میں اس سے کیسے مدد لی جا سکتی ہے ۔ زبان انسان کے خیالات، احساسات و جذبات کی ترجمانی کا ذریعہ ہے ۔ ہر تہذیب یافتہ قوم کی زبان قوم کے ارتقا کے ساتھ از خود اپنے افراد کے دقیق و نفیس تر خیالات اور احساسات کی ترجمانی کرنے لگتی ہے ۔ اس کے بعد قوم جب علم و ہنر کی

تحصیل میں اپنے سے زیادہ ترقی یافتہ اقوام کے پہلو بہ پہلو چلنا چاہتی ہے تو ماہران تعلیم ان تمام علوم و فنون کو اپنی زبان میں منتقل کرکے اس کے ذریعہ ان علوم و فنون میں تعلیم و ترقی کا انتظام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہہ مدارج الحمدللہ ہمارے ملک میں قیام جامعۂ عثمانیہ کی منظوری کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے کچھ پہلے ہی طے کیے گئے۔ ابتدائی درسی کتب کے ترجموں سے قبل اصطلاحات کے انتخاب اور طریق کتابت وغیرہ پر غور کرنے کیلئے باقاعدہ مجلسیں قایم کی گئیں جن میں مجھ کو ابتدا ہی سے شرکت کی دعوت دیگئی اور میں نے اس دعوت کو بہ طیب خاطر قبول کیا۔ اُن مجالس میں اس وقت کے ماہران فن کے علاوہ عربی، فارسی اور اُردو زبانوں کے مستند عالم بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ اور انگریزی و دیگر زبانوں کے اصطلاحات کا صحیح مفہوم غیر فنی زبان داں اصحاب پر واضح کرکے مناسب اُردو الفاظ تجویز کئے جاتے تھے۔ جب مجھ کو کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کی صدارت عطا ہوئی تو بلحاظ تعلق و مناسبت طبیعیات، ریاضی، ہئیت، کیمیا، حیاتیات، ارضیات انجنیرنگ اور نفسیات کی اصطلاحات کی مجلسوں کا صدر بھی مجھ ہی کو بننا پڑتا تھا۔ مصرحۂ بالا فنون کی ہزاروں اصطلاحات اس طرح میرے مواجہ میں تنقید کی کسوٹی پر گھس کر دیکھی گئیں اور درسی کتب کے استعمال کے لیے منظور کی گئیں۔

ہمیں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ بیان کردینا کافی ہوگا کہ انگریزی زبان میں علمی اصطلاحوں کی تیاری کے جو طریقے اختیار کیے گئے تھے وہی اُردو کے لئے بھی اختیار کیے گئے۔ انگریزی میں منتقل ہونے سے پہلے سائنس کی اصطلاحیں لاطینی زبان میں زیادہ تر عربی اور یونانی سے یا تو مستعار لی گئی تھیں، یا ترجمہ کی گئیں تھیں۔ انگریزی زبان میں ان میں سے اکثر اصطلاحات کو بعینہ انکی لاطینی صورت میں اختیار کرلیا گیا۔ اسی وجہ سے قانون، طب اور حیاتیات کی بیشمار اصطلاحیں زبان انگریزی میں اب بھی لاطینی ہی ہیں۔ نہ صرف قدیم مروجہ اصطلاحیں اپنی لاطینی صورت میں بحال رکھی گئیں ہیں بلکہ نئی اصطلاحیں بھی جیسے جیسے حسب ضرورت تجویز کی گئیں لاطینی اور یونانی الفاظ سے بنائی گئیں بعض اوقات قواعد زبان سے دیدہ و دانستہ خلاف ورزی کرکے

سہولت کی خاطر ایک ہی لفظ دو غیر زبانوں کے الفاظ کی ترکیب سے تیار کیا گیا۔

انگریزی کے لیے ان قدیم زبانوں سے مدد لینے میں یہ مفاد بھی پیش نظر تھا کہ اصطلاح سازی کے لیے یہ قدیم زبانیں عربی فارسی یا سنسکرت کی طرح اپنی ذاتی بناوٹ اور لچک کی وجہ سے انتہا درجہ موزوں تھیں۔ اصطلاح ایک معین ومحدود اور مستقل مفہوم کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اس کے لیے قدیم علوم کی زبان کے الفاظ بہت کار آمد ہوتے ہیں کیونکہ وہ پہلے ہی سے یہ خدمت انجام دیتے آرہے ہیں۔ اگر بہ نظر ضرورت کسی لفظ کے مفہوم میں قدرے تبدیلی مقصود ہو تو وہ بھی بغیر کسی شدید قومی اعتراض کے لفظ کی ساخت یا ترکیب میں خفیف تبدیلی کرکے باسانی حاصل ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس کی اردو اصطلاحوں میں عربی اور فارسی کے سابقہ اکثر بیشتر اصطلاحیں موجود ہیں۔ یہ الفاظ ان کے سابقہ کثرت استعمال اور مسلمہ افادیت کے مدنظر اختیار کیے گئے نہ کہ اظہار لیاقت یا کسی سیاسی پالسی کے تحت۔

یہاں مثال کے طور پر ایک بات بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک اُردو بولنے والے لیکن اُردو سے کم عقیدہ رکھنے والے ریاضی داں صاحب نے مجھ سے کہا کہ علم مثلثات (ٹرگنومیٹری) کی اصطلاحات مثلاً سائین۔ کوسائین وغیرہ کا ترجمہ خواہ مخواہ جیب اور جیب التمام وغیرہ کیا گیا۔ اگر انگریزی الفاظ ہی اختیار کیے جاتے تو اچھا ہوتا۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ لفظ سائین خود عربی لفظ جیب کا لاطینی ترجمہ ہے۔ عربوں نے علم مثلثات کو عصر جدید سے پہلے دوسری تمام قوموں سے زیادہ ترقی دی ہے ابتداءً جیب کا لفظ سنسکرت سے لیا گیا لیکن عربوں نے جیب کا صحیح تر مفہوم تجویز کیا اور اس کے ساتھ زاویہ کی دوسری مثلثی نسبتیں بھی نہ صرف تجویز اور استعمال کیں بلکہ جیسا کہ ابو علی الحسن ابن علی ابن عمر المراکشی کی مشہور کتاب جامع المبادی والغایات کے جلد اول (تاریخ اشاعت ۱۲۲۹ء) سے پتہ چلتا ہے انکی قیمتیں نصف درجہ زاویہ تک کے لئے محسوب کیں۔

محقق فاضل نصیرالدین طوسی نے اپنی کتاب شکل القطاع (۱۲۵۹ء) میں ان مقادیر یا نسبتوں کو مستوی اور کروی مثلثوں کے حل سے متعلق استعمال کرکے دنیائے علم کو ان سے اور بھی زیادہ واقف کرایا۔ بڑا لطف تو اس میں ہے کہ صدیوں تک شکل القطاع کا ترجمہ لاطینی زبان میں فگیورا کیٹا Figura cata چلا آیا۔

کوئی قوم جب انتہائی تنزل کو پہنچتی ہے تو اس کو اپنی ذات پر بھروسہ نہیں رہتا۔ وہ سب کاموں میں دوسری کی دست نگر رہ کر زندگی بسر کرنا اپنے لئے غنیمت سمجھتی ہے۔ کمزوری کا احساس اس کو اس قدر پست ہمت بنا دیتا ہے کہ وہ کسی قسم کی کوشش کو بھی سودمند نہیں سمجھتی۔ شروع شروع جب اردو میں سائنس کی تعلیم دی جانی لگی تو بعض اردو بولنے والے حضرات خود معترض ہوئے کہ ہماری زبان میں سائنس کی اصطلاحیں کہاں ہیں جو ہم سائنس اردو میں پڑھا سکیں۔ جب اصطلاحیں بنائی جانے لگیں تو اہل زبان کے ایک قدامت پسند فرقہ نے اعتراض کیا کہ نئے الفاظ بنانے کا ہم کو حق ہی نہیں۔ گویا اقوام اپنا دستور، قانون، آلات حرب نقل و حرکت وغیرہ بالعمد بنا سکتے ہیں لیکن اپنی ضرورت کے الفاظ نہیں بنا سکتے۔ لسانیات سے سرسری واقفیت بھی اس غلط خیال کی تردید کرسکتی ہے۔ سچی بات کو آخر ماننا ہی پڑتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ سائنس کی ترقی کے بغیر کسی قوم کا متمدن اقوام کے ساتھ عزت کی زندگی بسر کرنا ناممکن ہے اور اس ترقی کے لیے سائنس کی تعلیم ایک طرف عام ہونا لازمی ہے تو دوسری طرف متعلمین کو تحقیقات کے انتہائی مدارج تک پہنچنا بھی ناگزیر ہے تاکہ قوم ترقی کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے نہ رہ جائے۔ یہ باتیں صرف اسی وقت حاصل ہوسکتی ہیں جب کہ خود اپنی زبان میں سائنس کی تعلیم دیجائے۔ تب کہیں دلوں سے شبہات دور ہوئے۔ اور ساتھ ہی اردو بولنے والے حضرات کو یاد آگیا کہ زمانہ سابق میں دنیا کے علوم و فنون ایشیائی زبانوں میں مروج تھے اور انہیں زبانوں کے ذریعہ ترقی کرتے تھے۔ ہئیت کی سینکڑوں

عربی اصطلاحیں (اگر ستاروں کے نام بھی شامل کر لیے جائیں تو) اب بھی انگریزی میں رائج ہیں۔ طبیعیات و کیمیا میں بھی عربوں نے بڑی بڑی تحقیقاتیں کیں۔ ابن ہیثم ابوریحان البیرونی اور جابر ابن حیان وغیرہ کے انکشافات سے اہل یورپ بخوبی واقف ہیں عرب و عجم کے ان محققین نے عربی زبان میں بڑی بیش قیمت کتابیں لکھیں۔ انھیں کے ترجموں سے قرون وسطیٰ میں اہل یورپ کو سائنس و علم ہئیت وغیرہ سیکھنا نصیب ہوا۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اُردو زبان ان علوم و فنون کی حامل اور ذریعہ تعلیم و ترقی نہو۔

اصطلاحیں جب تیار ہوئیں تو اہل فن کے پاس کتابوں کا ترجمہ یا تالیف کوئی مشکل کام نہ تھا۔ سائنس کی اردو کتابوں کے مطالعہ سے اُردو داں طالب علم انتہائی فائدہ اٹھانے لگے۔ ریاضی طبیعیات و کیمیا کی انگریزی اصطلاحیں اب زیادہ وسعت کے ساتھ سمجھ میں آنے لگیں۔ طب و نباتیات و حیوانیات کی لاطینی اصطلاحوں کا صحیح مفہوم معلوم کرنا جو محض انگریزی کتابوں کے ذریعہ تعلیم پانے والوں کے لئے انتہا درجہ مشکل امر تھا اب اُردو کے ذریعہ بہت آسان ہوگیا۔ طوطوں کی طرح ازبر یاد کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی ساتھ ہی متعلمین کو مضمون کی اجنبیت کا ڈر نہ رہا۔ جس طرح اپنا دین اپنا ملک پیارا اسی طرح اپنی زبان کے ساتھ علم بھی پیارا سمجھا جانے لگا۔ ہر اُردو داں سائنس کے کم از کم مبادیات سے واقف ہو رہا ہے۔ اساتذۂ وقت انکو جدید اور کٹھن سے کٹھن مسائل سے روشناس کرا رہے ہیں۔

اب ریاضی، ہئیت طبیعیات اور کیمیا وغیرہ کے مشکل سے مشکل کلیات اور پیچیدہ سے پیچیدہ اختراعات سے اُردو داں روز افزوں تعداد میں واقف ہوتے جا رہے ہیں۔ سائنس ان کے لئے معمہ یا طلسم نہ رہا۔ اگر ترجموں کو چھوڑ کر ماہران فن تالیفات پر اپنا وقت اور دماغ صرف کریں تو ملک کی بڑی خدمت ہو جائے گی۔ صرف کتابیں یا مقالے پڑھنے سے کوئی شخص سائنس نہیں سیکھ سکتا۔ عملی مشق بھی ضروری ہے لیکن مشق سے پہلے کتب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ آلات سائنس کی تشریح اور ان کے استعمال کے طریقے اُردو داں اشخاص

جس آسانی کے ساتھ اُردو کتابیں پڑھ کر یا تقریریں سنکر سیکھ سکتے ہیں کسی اور زبان کے ذریعہ نہیں سیکھ سکتے۔ یورپ کی اکثر زبانوں میں ماہران فن عوام کی ترغیب اور تربیت کی خاطر عام فہم کتابیں ہر سال بڑی تعداد میں لکھتے اور شایع کرتے ہیں۔ یہی طریقہ اگر ہمارے ملک میں بھی رائج کیا جائے تو ہندُستانی لوگ سائنس سے بخوبی مانوس ہو کر صنعت و حرفت کی طرف زیادہ راغب ہوں گے اور نہ صرف کش مکش حیات کی مابعد جنگ آنے والی دقتوں کا مقابلہ کر سکیں گے بلکہ اقوام عالم میں باعزت زندگی بسر کر سکیں گے۔

صنعت و حرفت کی ترقی میں روس کی حالیہ درخشاں مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ ایک قرن پہلے روس اس میدان میں ہندوستان سے کچھ زیادہ آگے نہ تھا لیکن اب وہ دنیا کی سائنس داں قوموں کی پہلی صف میں پہنچ گیا ہے اور جرمن جیسے پرانے ماہر سائنس ملک کو میکانی اور سائنٹیفک جنگ میں نیچا دکھا رہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کے تمام باشندوں کو روسی زبان میں سائنس کی تعلیم دے رہا ہے۔ سائنس تمام علوم و فنون کی بنیاد ہے۔ جب سائنس روسی زبان میں منتقل ہو گئی تو تمام صنعتوں کی نظری و عملی تعلیم بھی آسان ہو گئی۔ اردو اپنی لچک اور بناوٹ کی خوبیوں کی وجہ سے کسی بھی یورپی زبان کا مقابلہ کر سکتی ہے اور ہمارا ذاتی تجربہ بتاتا ہے کہ اردو میں سائنس کی تعلیم خاطر خواہ کامیاب ہوتی ہے اور آگے چل کر اس سے زیادہ کامیاب ہو گی فقط

سائنس اور روزمرہ زندگی

از جناب مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب وظیفہ یاب صدر کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

(یہ تقریر نشر گاہ حیدرآباد سے ۱۹ نومبر ۱۹۴۳ء کو نشر کی گئی اور باجازت طبع کی جاتی ہے۔)

انسان کو متمدن زندگی کے ابتدائی دور میں اپنے روزمرہ ضروریات آپ خود مہیا کرنے پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو غیر معمولی دماغ عطا فرما کر اس کی اعضائی اور احساسی کمزوریوں کے باوجود محض فطرت کی براہ راست تیار کی ہوئی چیزوں پر اعتماد و اکتفا نہ کرنے دیا نیز اور زیادہ موزوں اشیاء ایجاد و استعمال کرنے کی توفیق دی خور و نوش کی چیزیں فراہم کرنے، روزانہ اور موسمی تغیرات کی تکلیفوں سے بچنے، موذی جانوروں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے اور گھریلو زندگی کی سہولتیں تلاش کرنے میں وہ بتدریج سائنس اور اس کے اکتشافات سے واقف ہوتا گیا۔ اپنے سے زیادہ طاقت والے وحشی جانوروں کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنایا۔ کئی ایک کو جنگل کے مصائب سے چھڑا کر اپنے ساتھ گھریلو زندگی کا عادی کیا۔ مثل مشہور ہے "ضرورت خود ایجاد کی ماں ہے" اس طرح اس نے نہ صرف اپنے اور اپنے متعلقین کے لیے دفاع و آسایش کے ذرایع مہیا کیے بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر بڑی بڑی مخالف قوتوں پر بھی دسترس حاصل کیا۔

پہلے وہ نباتیات کے خود اپنے نشو و نما کے لئے بنائے ہوئے اغذیہ سے اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ پھر شکار کی تلاش میں آلات حرب ایجاد کرکے اپنے آپ کو تمام جاندار مخلوقات پر غالب اور ان کا حکمراں تسلیم کرایا۔ اس کے بعد کلیات فطرت سے بتدریج آگاہ ہو کر قوی فطری سے بھی مفید کام لینے لگا۔

اس کے ہر ارتقائی دور میں اس کو اپنے مفاد و آرام کے لئے، اپنے فہم و ادراک سے کام لینا پڑا۔ متمدن زندگی جب تقسیم کار کی متقاضی ہوئی اور مختلف خاندانوں یا جماعتوں کو ماحول کی مناسبت سے مختلف پیشے اور ذرائع معاش اختیار کرنے پڑے تو زندگی کے تمام شعبوں میں وہ غیر محسوس طریقہ پر سائنس سے مدد لینے لگا۔ شہری زندگی میں زراعت کے ساتھ مویشی کی پرورش اور ان سے حصول خدمت کے تدابیر سوچنے کے بعد پھر تجارت کی طرف راغب ہوا تو کشتیاں اور بادبانی جہاز بنائے۔ اس کو معلوم ہوا کہ فطرت کی اتفاقی پیداوار اس کے مقرر و معینہ حوائج کے لیے ناکافی ہے۔ اس لیے کلیات فطرت ہی کی مدد سے وہ نباتی دنیا سے مستقل اور قابل اعتماد پیداوار حاصل کرنا شروع کیا۔ درختوں کے میووں اور پودوں کی جڑوں پر زندگی محدود نہ دیکھ کر اس نے اپنے لیے خاص قسم کے اور ایک طرح سے مصنوعی کھانے مہیا کیے۔ اس کوشش میں اس کی نظر ایک خود رو گھاس پر پڑی جس کا بیج اس کی غذا کے لیے بہت موزوں ثابت ہوا تو اس نے اس کی بطور خاص نگہداشت کی اور اس طرح وہ گیہوں جو چاول اور جوار کی کاشت کرنا شروع کیا۔

روٹی کا سوال ہر وقت سب سے زیادہ اہم رہا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ انسان اپنی پرورش کے لیے سائنس کی مدد سے روٹی کیسے تیار کرنے لگا۔ پہلے اور حقیقی موجد کا پتہ چلانا خواہ وہ ایک واحد فرد ہو یا جماعت یا قوم بہت مشکل ہے۔ صحیح طور پر کون بتا سکتا ہے کہ گفتگو کا طریقہ پہلے کس قوم نے رائج کیا۔ آگ پر قابو پا کر کس نے اس کو زندگی کے روزمرہ کاموں میں سب سے پہلے استعمال کیا۔ حروف ابجد اور فن تحریر کی ایجاد کا سہرا کس کے سر باندھا جا سکتا ہے۔ پوستین کو چھوڑ کر روئی اور اون کے لباس کس ممالک کے باشندوں نے پہلے تیار کیے۔ اگرچہ یہ بخوبی واضح ہے کہ روئی کو عربوں نے یورپ میں رواج دیا۔ چنانچہ انگریزی لفظ کاٹن Cotton عربی قطن کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اور زمانۂ قدیم سے چین کے باشندے ریشم تیار کرتے آرہے ہیں۔

اکثر اوقات ایجادات اتفاقیہ طور پر منکشف ہوئے ہیں اور اب بھی زیادہ تر ایسا ہی ہوتا ہے لیکن کسی حالت میں بھی حاضر دماغی اور تلاش ضروری ہیں۔ چونکہ گیہوں کے سب سے زیادہ اقسام افغانستان اور اس کے قرب وجوار کی سرزمین میں دریافت ہوئے اس لیے عام طور پر فرض کیا جاتا ہے کہ گیہوں کی کاشت ابتداً اسی ملک سے شروع ہوئی۔ اگرچہ زمانۂ قدیم سے اس کی کاشت کا ایک ہی طریقہ چلا آ رہا ہے تاہم انسان نے اپنے ذہن رسا سے اس میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کی۔ آج کل کا گیہوں قدیم گیہوں سے بہت مختلف ہے۔ حال ہی کا واقعہ ہے کہ مارکویس نام کا گیہوں جس سے کنیڈا کا صوبہ البرٹا اس قدر مشہور ہو گیا ایک شخص سانڈرز نامی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس نے دو قسم کے گیہوں کے پودوں کو پیوند کر کے ایک ایسی قسم تیار کی جو زیادہ بار آور ہونے کے علاوہ کنیڈا کے موسم بہار کی تاخیر اور موسم خزاں کی تعجیل کے باوجود بخوبی نشو ونما پاتا ہے۔

یہی حالت چاول وغیرہ کی بھی ہے لیکن اہل مشرق چونکہ ان دنوں لکیر کے فقیر ہو گئے ہیں اور تجربہ و تحقیق کی تکلیف گوارا نہیں کرتے اس لیے چاول کی نئی اور زیادہ مفید قسموں پر بہت کم کام ہوا ہے اور اگر ہوا بھی ہے تو ہماری لاعلمی ہم کو ان تحقیقاتوں سے ناواقف بنا رکھی ہے۔

زندگی گہوارہ سے لیکر گور تک بقا کی کشمکش کا دوسرا نام ہے۔ حیوانات (یا نباتات) کے جو انواع اس کشمکش میں کامیاب رہے وہ بچ گئے بلکہ ارتقا کے بلند تر زینہ پر پہنچ گئے۔ جو ناکامیاب ثابت ہوئے وہ مٹ گئے۔ انسان بھی اگر اس کشمکش حیات میں کامیاب رہے گا تو اس کی نوع ترقی کرتی جائے گی ورنہ اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو مفقود مخلوقات کا ہوا جیسا کہ ارضیات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

دور حاضر کا انسان کئی وجوہ سے سائنس سیکھنے پر مجبور رہے۔ اگر بقائے حیات کے لیے نہیں تو کم از کم امن و آسائش کے لیے۔ ہم اس وقت چند ایسی باتیں بیان کریں گے

جن سے بخوبی معلوم ہو سکے گا کہ سائنس ہماری روزمرہ زندگی کا جزو۔ لاینفک کس طرح بن گئی اگرچہ سردست پیٹ بھرنے کی حد تک زمانہ امن میں دنیا کے بیشتر حصہ کو کافی اغذیہ بغیر کسی خاص تگ و دو کے دست یاب ہو سکتے ہیں لیکن حقیقی معنوں میں صحت مند اور خوش حال زندگی کے لیے سائنس کے جدید انکشافات سے مدد لینا ناگزیر ہے۔ سب سے پہلا اور اہم سوال صحیح اشیاء خورو نوش کا حاصل کرنا ہے۔ اناج کی اچھی کاشت کے لیے فن زراعت کی ترقی لازمی ہے۔ اور اس کے لیے موسم کے تغیرات اور ذرائع آب رسانی سے پوری واقفیت نہایت ضروری ہے۔ غذا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا کافی مقدار میں مہیا کیا جانا قیام صحت کے لیے ایک لازمی امر ہے اگرچہ یہ مقدار فی الحقیقت بہت ہی قلیل ہے۔ روٹی کے لیے خمیر کی ضرورت متقدمین کو محسوس ہوئی اور انھوں نے جو وغیرہ سے تیار ہونے والی اشیاء میں اس کا پتہ چلایا اگرچہ بدقسمتی سے خمیر کے مفید حاصلات کے ساتھ انھوں نے الکوہل یا شراب کا بُرا استعمال بھی شروع کیا جس کی وجہ سے بنی نوع انسان کی ایک معتدبہ تعداد آئے دن خلل دماغ اور فسق و فجور کی مصیبتوں میں گرفتار ہوئی اور ہو رہی ہے۔

انسان کی غذا زیادہ تر پروٹینی پر مشتمل ہے جو نباتات اور حیوانات کے گوشت سے اس کو دستیاب ہوتی ہے محنت و مشقت کے کام کرنے کے لیے اس کو توانائی نشاستہ اور شکر کی چیزوں سے مل جاتی ہے۔

ان چیزوں کے علاوہ اس کو بعض اشیاء نہایت قلیل مقدار میں لیکن لازماً استعمال کرنا پڑتا ہے۔ جو ویٹامین کہلاتی ہیں اور جن کا صحیح علم ہمیں صرف حال ہی میں ہوا۔ یوں تو ویٹامین یا حیاتین کی کئی قسمیں ہیں لیکن ویٹامین الف۔ ب۔ ج اور د نہایت اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ مرکبات انسان نادانستہ نباتی و حیوانی غذا سے حاصل کر لیا کرتا تھا۔ لیکن جب تک ان کے عدم استعمال سے اس کی جسمانی صحت متاثر نہ ہوئی وہ ان کی صحیح قدر و قیمت کا

اندازہ نہ کرسکا۔ عام کمزوری اور شب کوری (یعنے رات کو باوجود کافی روشنی کے کم دکھائی دینا) ویٹامین الف ہی کی قلت کا نتیجہ ہے۔ وہ کچھ تو ترکاریوں اور کثیر مقدار میں کلیجی کے شوربے میں موجود ہے۔ اسی لیے معدہ کے بعض کمزور بیماروں کو اطباء ان کے استعمال کی ہدایت کرتے ہیں۔

ویٹامین ب کی کمی نمو کے لیے سخت مضر ہے۔ چاول کھانے والے مشین کے ذریعہ چاول کی نام نہاد صفائی کی وجہ سے اس حیاتین سے محروم رہ جاتے ہیں۔ لیکن تیج اور دودھ وغیرہ کی مدد سے اس کمی کی بڑی حد تک تلافی ہو جاتی ہے۔ ویٹامین ج لیمو یا نارنگی کی ترشی میں موجود ہے۔ Scurvy اسکروی کی بیماری جو ایک زمانہ میں جہاز کے لمبے سفر کرنے والوں کو اس حیاتین کی کمی کی وجہ سے لب گور پہنچا تی تھی اب ان اشیاء کے استعمال سے تقریباً ناپید ہوگئی ہے۔ شہر کے باشندوں کو بھی اس ویٹامین کا استعمال ضروری ہے ورنہ وہ فساد خون کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ویٹامین د کی کمی سے رکٹس Rickets کی بیماری پیدا ہوتی ہے جس سے بچوں کی ٹانگیں ٹیڑھی ہو جاتی ہیں اور وہ پختہ عمر کو پہنچ کر احنف کہلانے لگتے ہیں۔ اس کی قلت غذا کے ساتھ مچھلیوں کے تیل استعمال کرنے یا جلد کو آفتاب یا مصنوعی ذرائع سے پیدا ہونے والی کم طول موج کی شعاعوں کے زیر اثر اپنا کام آپ خود کرنے کے قابل بنا کر رفع کی جاسکتی ہے۔ کوئی شخص دعوے نہیں کرسکتا کہ وہ سائنس کے ایک سے زاید شعبوں میں مہارت رکھتا ہے البتہ ضروری امور سے واقفیت بہت ممکن ہے۔ جو خیالات ہم اس وقت گوش گذار کررہے ہیں وہ ماہران فن متعلقہ ہی کی تحقیقات سے ماخوذ کیے گئے ہیں۔ غذا کے ساتھ چند نمکوں کا استعمال بھی ضروری ہے۔ جن حیوانات کی جلد میں پسینہ کے غدود اور مسامات ہوتے ہیں مثلاً انسان، بکرا، بیل، گھوڑا وغیرہ ان کے لیے نمک طعام (سوڈیم کلورائیڈ) کا مہیا ہونا ازبس ضروری ہے۔ نباتات سے یہ چیز حاصل نہیں ہوسکتی اس لیے

کھانے کے ساتھ اس نمک کا شریک کرنا لازمی ہے اس کے بغیر علی الخصوص محنت مزدوری کرنے والے اور منطقۂ حارّہ کے باشندے اپنی صحت کا اچھا توازن قایم نہیں رکھ سکتے۔

ہمارے ملک میں صنعت گاہوں کی قلت کی وجہ سے ان میں کام کرنے والوں کے بعض خصوصی امراض ابھی بہت کم دیکھنے میں آرہے ہیں عمیق معدنوں کے مزدوروں اور سمندر میں غوطہ لگانے والوں کو غیر معمولی ہوائی دباؤ کے تحت دیر تک کام کرکے کمتر دباؤ کی ہوا میں واپس ہونا پڑتا ہے جس کی وجہ سے خاص قسم کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح روئی دھنکنے والے، فلزات گھسنے والے مٹّی کے برتن بنانے والے اور گرد آلود سڑکوں پر کام کرنے والے مزدوروں کے پھیپھڑوں کے اندر ضرر رساں ذرات داخل ہوکر ان کی عمروں کو بہت گھٹا دیتے ہیں۔ ان مسائل کے حل کے لیے اہل یورپ و امریکہ سائنس کی مدد سے نئے نئے تدابیر سوچ رہے ہیں۔ شاید آگے چل کر سارے ہندوستان اور ایشیا کو بھی ان مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

دَورِ حاضر کی متمدن زندگی کے مسائل میں حمل و نقل کے تیز رفتار ذرائع کے استعمال سے پیدا ہونے والے امراض و تکالیف کا ازالہ بھی ایک کٹھن مسئلہ ہے۔ شہری زندگی کے ساتھ گنجان آبادی اور دخانی انجنوں کی وجہ سے ہوا کا صاف نہ رہنا یا موٹروں اور مشینوں کی کرخت آواز سے دماغوں کا برانگیختہ ہونا صحت انسانی کے لیے سخت مضرت رساں ہے۔ مہذب ممالک کے سررشتہ جات صحت عامہ آئے دن ان مسائل کو حل کرنے میں بہت وقت اور روپیہ صرف کر رہے ہیں۔

ان دنوں ریل اور بحری و ہوائی جہاز رانی، موٹر کار، تار برقی، ٹیلیفون، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور مختلف طول موج کی شعاعوں سے متاثر ہونے والی تختیوں کے ساتھ فوٹوگرافی ہماری روزمرّہ زندگی کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ ان کے ابتدائی اصول سے واقف ہوئے بغیر کوئی شخص ان سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کرسکتا۔ اس لیے اگر

اطمینان و آرام کی زندگی مقصود ہے تو ہمیں چاہیئے کہ طبیعیات کیمیا حیاتیات اصول حفظان صحت انجنیری جوہریات (میٹیورالوجی) وغیرہ سے کم از کم سطحی واقفیت حاصل کریں۔ کوئی نصاب تعلیم عامہ اس پُر آشوب زمانہ میں مکمل نہیں سمجھا جا سکتا جب تک اُس میں مصرحہ بالا علوم کی مبادیات عام فہم زبان میں شریک نہ کی جائیں۔ سائنس کے یہ مضامین ایسے ہی ضروری ہوگئے ہیں جیسے حساب تاریخ نفسیات معاشیات وغیرہ جو عام طور پر جامعاتی اصطلاح میں شعبہ جات فنون کہلاتے ہیں۔

متمدن زندگی میں ہر قسم کی بیماریوں کی روک تھام اور جب وہ رُک نہ سکیں تو ان کے علاج کے تدابیر نہایت ضروری ہیں۔ طب ایک بڑا ہی مفید اور مرکب سائنس ہے۔ اطبا کی تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ انسان کو زندگی میں عام طور پر جن بیماریوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ زیادہ تر جراثیم سے پیدا ہوتی ہیں جو مختلف ذرائع سے اس کی جلد، خون یا غذائی نالی میں داخل ہو کر اس کو بیمار بنا دیتے ہیں۔ صحت مند زندگی کے لیے ان جراثیم سے بچاؤ ضروری ہے اور جب وہ جسم میں داخل ہو جاتے ہیں تو انھی سے خاص طور پر تیار کیے ہوئے سیرم استعمال کر کے علاج کیا جاتا ہے یہ سیرم خون میں داخل ہو کر اینٹی بوڈیز Anti bodies تیار کرتے ہیں جو ان جراثیم کو مار کر ڈالتے اور ان سے پیدا ہونے والی مضر صحت اشیاء کو بے ضرر کر دیتے ہیں۔ اس بیان سے ہمارا صرف یہی مقصد ہے کہ تعلیم یافتہ انسان اطباء کے مشورہ سے بیماری سے قبل حفظ ما تقدم تدابیر اختیار کرے اور اپنے آپ کو امراض (اور خصوصاً متعدی امراض) سے حتی الامکان بچا رکھے۔

جدید طب کی حیرت انگیز ترقی اور اس کے مسیحائی کارنامے کیمیا کے بعض تالیفی ادویہ اور طبیعیات کے دقیقہ رس آلات مثلاً انتہائی طاقت کی خورد بین اور الٹرا اسنٹرفیوج وغیرہ کی ایجاد کا نتیجہ ہیں۔ بعض فلزات کو تالیفی طریقوں سے نامیاتی مرکبات کے ساتھ اس طرح تیار کیا جاتا ہے کہ نظام انسانی ان کو بہت جلد قبول کر لیتا ہے۔ خورد بین ہر قسم کے جراثیم کی پیدائش اور ان کے اتلاف کا عینی مشاہدہ کراتی ہے۔ اس کی مدد سے خون کے سرخ اور

سفید جسیموں کی کمی و کیفی حالت علانیہ معلوم ہو جاتی ہے۔ اکثر بیماریاں جو اب تک راز سربستہ سمجھی جاتی تھیں ان ہی آلات کی مدد سے افشا ہو گئیں۔ صحت مند اور موزوں و مناسب گروہ کے ایک انسان کا خون دوسرے کم خون والے انسان میں منتقل کرنے کا طریقہ اگرچہ عام طور پر جنگ کی ہولناکیوں کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے لیکن درحقیقت وہ بھی طبیعیات کے آلات کا ممنون احسان ہے۔

لاشعاعوں اور تابکاری اشیاء کے مستخرجات اور ان کے طبی، صنعتی و دیگر اطلاقات سے اس زمانہ کے مدرسہ کا ہر بچہ واقف ہو چلا ہے۔ سائکلوٹرون طبیعیات میں حال کی ایک زبردست ایجاد ہے جس سے عناصر کے شکست و ریخت میں مدد لی جاتی ہے۔ مختلف خواص کے نئے نئے ہمجا عناصر (آیزوٹوپ) اور حیاتی کیمیائی مرکبات تالیف کیے جاتے ہیں۔ ای۔ او۔ لارنس پروفیسر جامعۂ کیلفورنیا نے اس کو اس کی موجودہ شکل میں ترتیب دیا۔ اس کی صنعت پر بڑی محنت اور روپیہ صرف ہوا۔ امید کی جاتی ہے کہ جنگ کے بعد امریکہ اور یورپ کے باہر بھی اس کا استعمال ہو سکے گا اور نئی کیمیا اور نئی طبیعیات سے دنیا کو انتہا درجہ فائدہ پہنچ سکے گا۔ اس کے ذریعہ بعض ایسے تعاملات عمل میں لائے جا سکتے ہیں جو ستاروں کے اندرونی حصوں ہی میں ممکن ہیں۔ نہ صرف طبیعیات و کیمیا میں ان دونوں براہ راست انسان کی روزمرہ زندگی کے کارآمد تجربے کیے جا رہے ہیں بلکہ جیسا کہ روس کے سائنس دانوں نے بتایا ہے نباتیات و حیوانیات کے علوم بھی منظم اور اجتماعی تحقیق کی بدولت نوع انسان کی ضروریات زندگی کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل حل کرنے میں استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ سائنس کو روزمرّہ زندگی سے کتنا قریبی تعلق ہے فقط

سلطنت آصفیہ کی تعلیم نسواں کی ابتدائی تاریخ

از جناب نصیرالدین صاحب ہاشمی

آصفی دَور حکمرانی کو ہم تعلیم نسواں کی صراحت کے لیے تین ادوار پر منقسم کرسکتے ہیں۔ پہلا دور ابتدا حکومت آصفیہ سے مرحوم اعلیحضرت غفران مکاں کے عہد حکومت تک، دوسرا دور غفران مکاں کا زمانۂ حکومت اور تیسرا دور سلطان العلوم کا زمانہ جس کا آغاز ۱۳۲۹ھ سے ہوا ہے، سنہ ۱۳۳۰ھ سے ہم اس کی ابتدا کرسکتے ہیں، لیکن ہمارے مقالہ کے عنوان کے لحاظ سے صرف پہلے اور دوسرے دَور کے کچھ حالات قلم بند کیے جائینگے۔

پہلا دور

آصف جاہ اول تا آصف جاہ خامس

۱۱۳۶ھ تا ۱۲۸۴ھ

آصف جاہ اول بڑے ذی علم اور علم دوست تھے۔ آپ کے دربار میں ہمیشہ ارباب علم وفن جمع رہا کرتے۔ اشاعت تعلیم اور علوم کی سرپرستی آپ کا طرۂ امتیاز بنا رہا۔ علماء اور فضلاء آپ کے فیض کرم سے بہرہ اندوز ہوتے تھے۔ اسی طرح آصف جاہ ثانی اور زمانۂ مابعد میں علم کی سرپرستی ہوتی رہی، سلاطین آصفیہ کے ساتھ کئی ایک امراء ملک نے علم وفن کی سرپرستی کو اپنا شعار بنایا تھا، جس کی وجہ سے اولاً اورنگ آباد۔ پھر حیدرآباد علم وفن کا

مرکز بن گیا۔ علماء و فضلاء شعراء اور ادیب یہاں جمع ہو گئے۔ شمال اور جنوب کے اہل علم و فن کی سرپرستی حیدرآباد میں ہونے لگی ارسطو جاہ، میر عالم، شمس الامراء امیر کبیر اور راجہ چندو لعل وغیرہم کی معزز ہستیاں ایسی تھیں جن کی داد و دہش اور سرپرستی علوم و فنون کے باعث حیدرآباد علوم قدیم اور جدید کا سنگم بن گیا۔

ہم نے اپنے ایک دوسرے مضمون میں جو "تعلیمات آصفیہ کی ابتدائی تاریخ" کے عنوان سے شایع[1] ہوا ہے، دولت آصفیہ کے ابتدائی مدرسوں کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کر دیا ہے۔ واضح ہو کہ یہاں ذکور کے لیے تین قسم کے مدرسے ابتداء سے قایم تھے۔ پہلے وہ مدرسے تھے جو بالکلیہ سرکاری حیثیت رکھتے تھے جن کے اساتذہ کو تنخواہ ملتی تھی یہ مدرسے صدر الصدور کی نگرانی میں تھے۔ ایسے مدرسے حیدرآباد اور اورنگ آباد میں موجود تھے، اورنگ آباد میں رابعہ دورانی کے مقبرہ کا مدرسہ اور مدرسۂ فاروقیہ اور حیدرآباد میں مدرسۂ حیدرآباد شاہی مدرسے تھے، دوسری قسم میں وہ مدرسے شامل تھے جو امراء ملک نے اپنے صرفہ اور اخراجات سے قایم کیئے تھے۔ مدرسۂ فخریہ اور دیگر مدارس اس تفصیل میں آتے ہیں جن کو شمس الامراء امیر کبیر نے قایم کیا تھا۔

تیسری قسم کے وہ مدرسے تھے جن کو علماء اور شیوخ وقت نے اپنے طور پر قایم کیا تھا مثلاً مولانا شاہ شجاع الدین کا مدرسۂ شجاعیہ اور حضرت صاحب حسینی کا مدرسۂ حسینی[2] وغیرہ ان مدرسوں کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے کیونکہ یہ تمام مدرسے لڑکوں سے متعلق تھے۔

جب ہم سلطنت آصفیہ میں لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق غور کرتے اور تلاش کرتے ہیں تو

---

(۱) رسالہ ٹیچر حیدرآباد بابتہ ۱۹۳۶ء۔

(۲) ان مدرسوں کی تفصیل ہمارے مضمون مطبوعۂ رسالہ ٹیچر بابتہ ۱۹۳۶ء سے مل سکتی ہے، مدرسہ حسینی کے متعلق ہم نے ایک علیحدہ مضمون لکھا ہے جو رسالہ "شہاب" حیدرآباد کے ایک نمبر میں شایع ہوا ہے۔

ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی عورتوں کی تعلیم کا بالکل وہی طریقہ رائج تھا جو مغلیہ دورِ حکمرانی میں ہندوستان کے دوسرے حصص میں۔ چونکہ سلطنت آصفیہ مغلیہ حکومت کے شیرازۂ حکومت کو پیش نظر رکھ کر قایم ہوئی تھی اس لیے یہاں کے نظم ونسق حکومت کے ساتھ نظامِ تمدن و معاشرت بھی مغلیہ اصول کا پابند رہا۔ عورتوں کی تعلیم کے متعلق جس قدر مواد ہم دست ہوتا ہے وہ اسی نہج کا ہے جو شمالی ہند میں مغلیہ دور میں مروج تھا۔ واضح ہو کہ یہاں عام طور سے تو تعلیم نسواں کا رواج نہیں تھا۔ البتہ ابتدائی مذہبی تعلیم اکثر خاندانوں میں ہوتی تھی اور اعلیٰ تعلیم سے بعض مخصوص عورتیں مستفید ہوا کرتیں۔ ان کی تعلیم کے وہی طریقے تھے جو ہندوستان کے دوسرے مقامات میں رائج تھے یہ تفصیلات ایک علحدہ مضمون کے موضوع ہوسکتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کی تعلیم نسواں کے متعلق کسی قدر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جائے۔

(۱) اس دور میں تعلیم نسواں کی پہلی صورت تو یہ تھی کہ روساء اور امراء کی لڑکیوں کے لیے متقی معمر اور قابل افراد ملازم رکھے جاتے تھے۔ اور ان سے تعلیم دلائی جاتی تھی۔ اس خصوص میں جو معلومات حاصل ہوئے ہیں ان سے پایا جاتا ہے کہ حضرت آسف جاہ ثانی کی بیگمات میں سے بخشی بیگم صاحبہ کو علوم وفنون سے دلچسپی تھی خصوصاً مصوری سے زیادہ مناسبت تھی۔ بیسیوں مصوروں نے آپ کی سرپرستی میں اپنے ہنر کے کمال کا مظاہرہ کیا۔ آپ کی داد و دہش مشہور تھی علیٰ ہذا تہنیت النساء بیگم صاحبہ بھی علم کی سرپرستی میں ممتاز تھیں۔ مصنف گلزار آصفی نے لکھا ہے کہ حیدرآباد میں جس طرح سلطان عبداللہ قطب شاہ کی ماں حیات ماں صاحبہ شہرہ رکھتی تھیں اسی طرح یہ دونوں خواتین اپنے جود وکرم اور قابلیت کے باعث ممتاز رہیں۔

درگاہ قلی خاں (جد اعلیٰ نواب سالار جنگ بہادر) کی صاحبزادی خیرالنساء بیگم صاحبہ اور میر عالم مرحوم کی بیٹیاں نفیسہ بیگم اور صاحب بیگم جو یکے بعد دیگر منیر الملک علی زماں خاں کے

بیاہی گئیں تھیں صاحب علم وفضل تھیں[۱]۔ اس خاندان کی ایک اور خاتون نجیب النساء بھی اپنے علم وفضل کے لیے مشہور رہیں۔

اس موقع پر رکن الدولہ میر موسیٰ خاں دیوان دکن کی بیگم مہتاب کنور بائی معروف صاحب جی خانم کی متبنیٰ ماہ لقا بائی چندا کا نام فروگذاشت نہیں ہوسکتا جس کی تعلیم و تربیت قصورات میں ہوئی تھی۔ اس کی تعلیم کے لیے اس وقت کے اعلیٰ خاندان کی لڑکیوں کی طرح خاص اہتمام کیا گیا تھا، تعلیم کے لیے بڑے بڑے صاحب کمال اور عالم تبحر مقرر ہوئے تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے زمانہ میں ایک قابل اور لائق عورت تسلیم کی جاتی تھی۔ اس کو تاریخ سے خاص دلچسپی تھی، اس نے ایک تاریخ دکن جو ماہ نامہ یا تاریخ دل افروز کے نام سے موسوم اور دکن کی معتبر تاریخ شمار کی جاتی ہے، اپنی نگرانی اور سرپرستی میں مرتب کرائی اس کو شعر گوئی کا بھی بڑا اچھا مذاق تھا، شیر محمد خاں ایماء سے شرف تلمذ حاصل تھا، اس کی قابلیت کا اس زمانہ میں بہت شہرہ تھا اور اس کی تعلیم قدیم طریقوں کے مطابق قابل اساتذہ کے ذریعہ ہوئی تھی[۲]۔

اس زمانہ کے کئی امراء نامدار صاحب علم وفضل تھے وہ اپنی اولاد اناث کی تعلیم کی طرف ضرور متوجہ ہوئے ہوں گے، مگر اس وقت کوئی مواد تفصیل کے ساتھ دستیاب نہیں ہوتا اس لیے اس کی صراحت میں دشواری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اعلیٰ خاندان کی اکثر عورتیں زیور علم سے بھی آراستہ ہوتی تھیں۔

(۲) اس دور کا دوسرا طریقہ تعلیم نسواں کا یہ تھا کہ علماء اور فضلاء اپنی اولاد اناث کو خود تعلیم دیا کرتے تھے، حیدرآباد میں بیسیوں ارباب فضل وکمال ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں

---

(۱) "میر عالم" تالیف سراج الدین طالب مرحوم۔

(۲) گلزار آصفی میں کافی صراحت موجود ہے۔

جن کے علم وفضل کا شہرہ دور دور تک تھا، ان کے چشمۂ فیض سے صدہا تشنہ گان علم سیراب ہوتے رہے، اگر صرف ایک محدود زمانہ کے اہل علم وفضل کی صراحت کی جائے تو اس کے لیے بھی طویل صفحات کی ضرورت ہوگی، آصفجاہ ثانی و ثالث کے زمانہ کے بعض علماء اور ارباب فضلا کے اسما گرامی یہ ہیں، مولانا شاہ شجاع الدین، مولوی قطب الدین دہلوی، مولوی اکبر، مولوی محمود عالم، مولوی میر احمد ولایتی، مولوی عبدالعلی خاں، مولوی حافظ شمس الدین فیض، مولوی عماد الدین حسن، مولوی مظہر، مولوی بدرالدین، مولوی خواجہ شہاب الدین وغیرہ یہ سب کے سب نہ صرف اصحاب علم وفضل تھے بلکہ درس اور تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا، مصنف گلزار آصفی نے ان میں سے اکثر کے متعلق درس دینے کی صراحت کی ہے بلکہ بعض تو ایسے تھے جو نسلاً بعد نسل علم کی خدمت گذاری میں مصروف تھے۔

آصفجاہ رابع اور خامس کے عہد کے علماء کی جو فہرست مصنف تاریخ دکن نے دی ہے ان کی تعداد (۷۵) پچہتر[1] سے زیادہ ہے، بہرحال ان ارباب کمال نے اپنی اولاد اناث کی تعلیم کی طرف بھی ضرور توجہ کی ہوگی۔ اور ان کو علوم مذہبی وغیرہ سے سنوارا ہوگا، لیکن افسوس ہے کہ اس کی تفصیلی وضاحت کے لیے کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکے۔

(۳) تیسرا طریقہ تعلیم نسواں کا یہ تھا کہ بعض متوسط طبقہ کی خواتین جو قرآن شریف اور مذہبی علم وغیرہ سے واقف ہوتی تھیں، اپنے مکانوں میں محلہ اور قرب جوار کی لڑکیوں کو قرآن شریف اور مذہبی ابتدائی تعلیم دیا کرتی تھیں، ایسی تعلیم دینے والی خواتین کی سرپرستی بعض اہل خیر اور اصحاب ثروت کرتے تھے، کیونکہ تعلیم پانے والی لڑکیوں سے کوئی فیس نہیں لیجاتی تھی، اور پڑھانے والیاں اکثر بے ذریعہ ہوتی تھیں، اس موقع پر ہم چند ایسی خواتین کا تذکرہ کرتے ہیں جو حافظ قرآن تھیں اور لڑکیوں کو تعلیم بھی دیا کرتیں اس وجہ سے ان کو حکومت آصفیہ کی جانب سے ان کی قوت بسری کے لیے یومیے جاری ہوئے تھے۔

---

(۱) تاریخ دکن عبدالعلیم نصراللہ خاں صفحہ ۱۹۱۔

(۱) امتہ الرسول حافظ قرآن ایک روپیہ یومیہ (۲) حفیظ بیگم چار آنے یومیہ (۳) سیدانی حفیظ بی بی دو آنے یومیہ (۴) سیدالنساء سیدانی دو آنے یومیہ (۵) سعیدالنساء دو آنے یومیہ (۶) چاند بی بی دو آنے یومیہ۔

ان سب کو سنہ ۱۱ھ میں یومیے جاری ہوئے ہیں، اور عرصۂ دراز تک یہ جاری رہنے کا داخلہ ملتا ہے، صرف ایک سنہ میں چھ حافظ قرآن عورتوں کے نام یومیہ جاری ہونے سے اس کا پتہ چل سکتا ہے کہ اس زمانہ میں مذہبی تعلیم نسوان کا کیسا رواج ہوگا۔

ان ہی تین طریقوں سے اس دور میں تعلیم نسوان کا رواج تھا سرکاری مدرسہ تعلیم نسوان کے لیے قایم نہیں ہوا، لیکن ایک غیر سرکاری مدرسہ میں مخلوط تعلیم نسوان ہوتی تھی یعنی سنٹ جارج گرامر اسکول جو سنہ ۱۸۳۵ء میں قایم ہوا تھا، یہاں اولاً مخلوط تعلیم ہوتی تھی، اس کے بعد سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد سے زنانہ تعلیم کا حصہ علحٰدہ ہوگیا چونکہ یہ چرچ کا مدرسہ تھا اس لیے اس زمانہ میں مسلمان اور ہندو لڑکیاں اس مدرسہ سے استفادہ نہیں کرتی تھیں بلکہ زیادہ تر ایسی لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں جو عیسائی مذہب اختیار کرلیتی تھیں ان میں زیادہ تر پست اقوام کی عورتیں شامل تھیں،

دوسرا دور

عہد حکومت آصف جاہ سادس

سنہ ۱۲۸۴ھ تا سنہ ۱۳۲۹ھ

دوسرے دور کی ابتدا سنہ ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۹ء سے قرار دینا چاہئے کیونکہ اس سنہ میں مرحوم اعلیٰحضرت غفران مکاں میر محبوب علیخاں آصف جاہ سادس اپنے والد ماجد نواب افضل الدولہ

---

(۱) صداقت دفتر دیوانی و مال، اس تفصیل کے لیے میں جناب ناظم صاحب دفتر دیوانی کا مشکور ہوں۔

خاص کے انتقال پر صغیر سنی میں مسند حکومت پر جلوہ گر ہوئے، انتظام سلطنت ایک مجلس کے سپرد ہوا، جس میں شمس الامراء امیر کبیر، نواب مختار الملک اور راجہ نریندر پرشاد شامل تھے، سنہ ۱۳۰۱ھ میں کامل اختیارات کے ساتھ مرحوم کو دوبارہ مسند نشین کیا گیا، اس طرح پینتالیس سال کی حکمرانی کے بعد سنہ ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء میں غفران مکاں کا انتقال ہو گیا۔

ہمارا یہ دوسرا دور ۴۵ سال کے حالات پر مشتمل ہے اس زمانہ میں یہاں کی تعلیم نسواں میں پہلے دور کے بہ نسبت بہت کچھ ترقی ہوئی۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم نسواں کا جدید طریقہ آغاز ہوا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ہندوستان میں ہر طرف انگریزی تعلیم کا دور دورہ تھا۔ یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کا چرچا عورتوں میں بھی پھیل گیا تھا، تعلیم نسواں کی جانب لوگ متوجہ ہو گئے تھے، عورتوں کی تعلیم کے لیے متعدد زنانہ مدرسے قایم ہو چکے تھے، عیسائی مشن کے زنانہ مدارس کے علاوہ ہندو اور مسلمانوں نے بھی اپنے اپنے خاص مدرسے قایم کرنے کی ابتدا کر دی تھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عام طور پر ہندوستان میں تعلیم نسواں کی جانب پوری توجہ مبذول ہو گئی تھی، اور خود عورتوں میں تعلیم کا احساس اور بیداری کی لہر پیدا ہو چکی تھی، غرض کہ ہم نے ایسے زمانہ میں کروٹ لیکر آنکھ کھولی جبکہ ہمارے ہمسایہ ممالک میں عورتیں ترقی کے میدان میں بہت کچھ آگے نکل گئی تھیں۔

ظاہر ہے کہ جب ہندوستان کے دوسرے حصوں کے بہت بعد ہم نے تعلیم نسواں کی جانب توجہ کی تھی تو لامحالہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہنا لازمی تھا جبکہ بمبئی، مدراس اور کلکتہ کی یونیورسٹیوں سے عورتیں بی۔اے کی ڈگریاں حاصل کرکے میدان ترقی میں گامزن ہونے لگیں تو ہم اس وقت خواب غفلت سے بیدار ہو کر ابتدائی تعلیم آغاز کرنے لگے، اور پھر ہماری ترقی کی رفتار بھی نہایت سست رہی جس کی وجہ سے پینتالیس سال کے طویل

عرصہ میں ہم نے جیسی چاہئیے ترقی نہیں کی۔

اس دور میں ہم چار قسم کی تعلیم نسواں کا تذکرہ کر سکتے ہیں، ان میں سے دو طریقے تو وہی ہیں جن کا ذکر پہلے دور میں کر دیا گیا ہے، تیسرا طریقہ خانگی مدارس نسواں کا قیام اور چوتھا طریقہ خاص سرکاری مدارس نسواں کا قائم ہونا ہے۔ اب سلسلہ وار ہر ایک قسم کی تعلیم کا تذکرہ کیا جاتا ہے،

پہلا طریقہ

جیسا کہ قبل ازیں لکھا گیا ہے بعض امراء ملک اور صاحبان دولت و ثروت اپنی اولاد اناث کی تعلیم کے لیے قابل افراد اور ثقہ اصحاب کو مامور کرتے تھے، اور اس کے ساتھ استادنیاں بھی لازم رکھی جاتی تھیں اس طریقہ سے کئی امراء ملک نے اپنی اولاد اناث کو تعلیم دلائی ہے صدیوں سے یہاں یہ طریقہ تعلیم جاری تھا، اور بدستور اس دور میں بھی اس کا رواج باقی رہا۔

اس تفصیل میں بطور نمونہ بعض خواتین کا تعارف کرایا جا سکتا ہے، جنہوں نے اسی طریقہ سے تعلیم پائی اور زیور علم سے آراستہ ہوئیں۔

(۱) شہزادی جہاں دار النساء بیگم صاحبہ جو مرحوم اعلیٰ حضرت کی بہن اور نواب وقار الامراء مرحوم سابق مدار المہام سے بیاہی گئی تھیں، شہزادی صاحبہ کی قابلیت مسلمہ ہے کئی سال تک آپ نے اپنی اسٹیٹ کے کاروبار کو نہایت خوش اسلوبی سے سنبھالا تھا، اس کے علاوہ دو سال پہلے آپ نے جو خطبۂ صدارت کانفرنس نسواں میں سنایا تھا وہ آپ کی وسعت معلومات اور اعلیٰ قابلیت پر پوری طرح دال ہے۔

(۲) لیاقت النساء بیگم صاحبہ کا تعارف بھی اس عنوان میں ضروری ہے آپ شہزادی جہاں دار النساء بیگم صاحبہ کی صاحبزادی ہیں آپ کی علمی قابلیت بہت اچھی ہے، فارسی اور

اُردو، انگریزی میں مہارت تامہ حاصل ہے۔

(۳) نواب توت جنگ مرحوم کی صاحبزادیاں یعنی تمیز النسا بیگم اور سعادت النسا بیگم کا تذکرہ بھی ضروری ہے، آپ لیاقت النسا بیگم صاحبہ جیسی قابل ماں کی دختر ہیں اگرچہ تمیز النسا بیگم اور سعادت النسا بیگم عصر حاضر سے تعلق رکھتی ہیں مگر آپ کی تعلیم قدیم طریقہ کی مرہون منت ہے، اس لیے یہاں تذکرہ ضروری تھا۔

(۴) نور النسا بیگم صاحبہ جو نواب مختار الملک کی بڑی صاحبزادی تھیں اور فارسی کے ساتھ انگریزی سے بھی بخوبی واقف تھیں اپنے شوہر مکرم الدولہ کے بعد اسٹیٹ کا انتظام نہایت کامیابی اور حسن خوبی سے انجام دیا اور امراء کی لڑکیوں کے لیے ایک مدرسۂ نسواں بھی قائم کیا تھا جس کا تذکرہ اس کے موقع پر آئیگا۔

(۵) بیگم صاحبہ نواب فخر الملک بھی عربی و فارسی کی اچھی قابلیت رکھتی تھیں جس کی وجہ سے اپنی دختروں کو بھی آپ نے اچھی تعلیم دلائی،

(۶) کمال النسا بیگم، نواب سدارت جنگ مرحوم کی اہلیہ اردو فارسی میں مہارت تامہ رکھتی تھیں، شاعری سے بھی شغف تھا، ایجاد تخلص کرتی تھیں،

(۷) مسز راجہ برکت رائے آپ مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت آنجہانی کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، اردو، فارسی، انگریزی کی تعلیم گھر پر حاصل کی، مضمون نگاری اور شاعری کا شوق ہے، بچوں کے لیے نظمیں خوب لکھا کرتی ہیں، ان کا ایک مجموعہ "بچوں کے بتاشے" کے نام سے شایع ہوا ہے۔

ان کے علاوہ اعلیٰ طبقہ کی کئی ایک خواتین تعلیم یافتہ ہیں جن کی تعلیم قدیم طریقہ پر گھر پر ہوئی ہے۔

دوسرا طریقہ

اس دور کا دوسرا طریقہ تعلیم نسواں کا یہ تھا کہ علما، اور قابل اشخاص اپنی اولاد اناث کو

خود تعلیم دیا کرتے تھے، ایسی تعلیم صرف مذہبی اور ابتدائی حد تک محدود نہیں تھی بلکہ عربی و فارسی کی اعلیٰ تعلیم بھی ہوتی تھی، بعض جگہ تو انگریزی تعلیم بھی شامل تھی یوں تو بیسیوں خواتین کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے مگر بخوف طوالت صرف چند خواتین کو پیش کیا جاتا ہے، جن کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۱) خجستہ سلطانہ بیگم مرحومہ نصیر الدین حیدر کی دختر تھیں عربی، فارسی اردو میں بڑی اچھی لیاقت تھی، عرصہ دراز تک محبوبیہ اسکول میں عربی، فارسی، اردو کی معلمہ رہیں کئی کتابوں کی مصنفہ تھیں، "تاریخ تیموری" آپ کی اہم تصنیف ہے۔

(۲) صغرا بیگم ہمایوں مرزا آپ کی اردو اور فارسی قابلیت اچھی ہے، چودہ کتابیں ابتک شایع ہو گئی ہیں، آپ کی پوری تعلیم خانگی طور پر گھر ہی میں ہوئی ہے۔

(۳) رقیہ بیگم مرحومہ مولوی احمد مدنی صاحب مدرس دارالعلوم کی شریک زندگی تھیں، فارسی، عربی اور اردو اور ریاضی میں اچھی دستگاہ حاصل تھی خجستہ سلطانہ بیگم کے وظیفہ پر علحدہ ہونے کے بعد آپ ہی کو ان کی جگہ ملی، رقیہ بیگم نے اپنے باپ اور شوہر سے استفادہ کیا تھا، شاعری کا بھی شوق تھا۔

(۴) بدرالنسا بیگم خفی تخلص مولوی محمد ابوالفیض سعید الدین صاحب منصف کی دختر۔ سعید الدین صاحب اپنے وقت کے عالم اور قابل فرد تھے، اپنی لڑکی کو خود تعلیم دی تھی، بدرالنسا بیگم کو عربی، فارسی اردو کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم بھی دی گئی تھی، شاعری کا بھی شوق تھا، خفی تخلص کے ساتھ شاعری کرتی تھیں، دیوان شایع ہو چکا ہے۔

(۵) قیصری بیگم، مولوی شرف الحق مرحوم کی دختر اور مولانا نذیر احمد کی نواسی، عربی فارسی اردو کی زبردست عالمہ ہیں، قرآن شریف سے زیادہ مس ہے، آیات قرآن کو مضمون کے لحاظ سے مرتب کیا ہے، "تفہیم القرآن" اس کتاب کا نام ہے،

(۶) مریم بیگم، مولوی محب حسین کی دختر اپنے باپ سے استفادہ علم کیا، زنانہ کالج میں

عربی کی لکچرار ہیں جس سے ان کی عربی قابلیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے،

(۷) بیگم حکیم حامد حسین مرحوم نے نہ صرف عربی اور فارسی کی اعلیٰ قابلیت پیدا کی بلکہ علم طب میں کمال پیدا کیا ہے اور مطب کرتی ہیں۔

ان کے علاوہ بیسیوں خواتین کا تعارف کرایا جا سکتا ہے۔ بعض خواتین کے نام کافی ہوں گے مثلاً امتہ الفاطمہ بیگم۔ امتہ القادر بدر النساء بیگم، سکندر بیگم، امتہ العزیز بیگم، عصمت النساء بیگم وغیرہ۔ ان خواتین نے گھر پر خانگی طور سے تعلیم حاصل کرکے نہ صرف اچھی بلکہ اعلیٰ قابلیت پیدا کرلی۔ تعلیم یا تو اپنے بزرگوں سے حاصل کی یا پھر بعض اساتذہ سے خانگی طور پر حاصل کی گئی، بہرحال اس قسم کی تعلیم کا سلسلہ صدیوں سے قایم اور تاحال جاری ہے، اور یہ تعلیم صرف مذہبی اور ابتدائی حد تک نہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم بھی ہوتی تھی۔

تیسرا طریقہ اس دور میں تعلیم نسواں کا تیسرا طریقہ یہ رائج ہوا کہ خانگی غیر سرکاری مدارس تعلیم نسواں کے لیے قایم ہو گئے اور مدارس نسواں کے نام سے باقاعدہ عورتوں کی تعلیم جماعت بندی کے ساتھ ہونے لگی اور ایک خاص نصاب بھی اختیار کیا گیا۔

اسی قسم کے مدرسے اولاً غیر سرکاری طور پر قایم ہوئے اور اس کے بعد سرکاری مدرسوں کا قیام ہوا، چونکہ غیر سرکاری مدرسوں کو تقدیم حاصل ہے اس لیے ان کا تذکرہ اولاً کیا جاتا ہے۔

(۱) **مدرسۂ ڈاکٹر اگھورناتھ** ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادیا ڈی یس سی بنگال کے باشندہ تھے، ۱۸۷۷ء میں حیدرآباد آکر متوطن ہو گئے، یہاں آنے کے بعد آپ کی اولاد ہوئی، چنانچہ ۱۸۷۹ء میں مسز سروجنی نائیڈو پیدا ہوئیں، ڈاکٹر اگھورناتھ نہ صرف علم سائنس کے ایک قابل ترین فرد تھے، بلکہ ان کو ملک کی ترقی سے بھی بڑی دلچسپی تھی وہ اپنے

سینہ میں درد بھرا دل رکھتے تھے، ان کی تمنا اور خواہش تھی کہ ہمارا ملک بھی ترقی کرکے بام رفعت پر پہنچ جائے، وہ عورتوں کی تعلیم کو مقدم اور ضروری خیال کرتے تھے، اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سرکار عالی کی سلک ملازمت میں شامل ہونے کے پہلے سنہ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء (۱۲۹۰ ف) میں انہوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قایم کیا تھا، اس مدرسہ میں ہندو اور مسلم دونوں لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں، ان کی تعداد اس زمانہ کے لحاظ سے خاصی تھی یعنی پچاس ہندو اور چھبیس مسلم لڑکیاں زیر درس رہنے کا پتہ چلتا ہے[1]، جب ڈاکٹر صاحب سرکار عالی کی ملازمت میں ۱۳۱۴ھ/۱۳۰۴ ف میں شامل ہوگئے تو مجبوراً مدرسہ بند کردیا اس مدرسہ میں انگریزی، اردو، تامل، تلنگی زبانوں کے علاوہ تاریخ و جغرافیہ اور امور خانہ داری کی اور ہندوستانی موسیقی کی تعلیم دی جاتی تھی۔

(۲) مدرسہ کنراج پیٹھ[2] | اضلاع میں سب سے پہلے کنراج پیٹھ (ضلع ناندیڑ) میں ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء (۱۲۹۱ ف) میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مدرسہ قایم ہوا، اس مدرسہ کے قایم ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ناندیڑ کے مدرسہ کے صدر مدرس صاحب کا انتقال ہوگیا ان کے ورثاء کی پرورش کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، صدر مدرس صاحب کی لڑکیاں قرآن اور مذہبی تعلیم سے واقف تھیں، مولوی عظیم الدین صاحب تعلقدار نے ان لڑکیوں کو مدرسۂ نسواں قایم کرنے کی ترغیب دی اور فوراً خود اپنی جیب سے مدرسہ کے اخراجات کے کفیل بنے، اس مدرسہ میں قرآن شریف کے علاوہ اردو کی تعلیم ہوتی تھی کئی سال تک یہ مدرسہ کامیابی سے چلتا رہا۔

---

(۱) و (۲) تعلیمات آصف جاہ سابس کی حکومت میں، ص۳

(۳) نشری تقریر بیان بانو بیگم ... مورخہ ۱۶ - بہمن ۱۳۵۸ ف بعنوان "عورتوں کی تعلیم حیدرآباد میں"

زمانۂ مابعد میں سرکار عالی کے سررشتۂ تعلیمات نے اس مدرسہ کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔

(۳) ویسلین مشن گرلز اسکول | سنہ ۱۲۹۹ھ م سنہ ۱۸۸۲ء (سنہ ۱۲۹۱ ف[۱]) میں ویسلین مشن کی جانب سے سکندر آباد اور چادر گھاٹ میں ایک ایک زنانہ مدرسہ قایم ہوا، اس میں مسلم لڑکیاں شریک نہیں ہوتی تھیں۔

(۴) مدرسہ نور النساء بیگم صاحبہ | نور النساء بیگم دختر نواب محسن الملک مرحوم کا تذکرہ ہو چکا ہے، آپ ایک تعلیم یافتہ اور علم دوست خاتون تھیں آپ نے سنہ ۱۳۰۱ھ کے قبل اپنی ڈیوڑھی میں ایک زنانہ مدرسہ قایم کیا تھا جس میں امراء اور جاگیرداروں کی لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں اس مدرسہ میں تعلیم سے زیادہ تربیت کا خیال رکھا جاتا تھا نور النساء بیگم بذات خود ہر لڑکی کی ذہانت اور فراست کا امتحان فرماتیں، اور انھیں تہذیب و شایستگی، آداب و اخلاق طریقہ اور بود و باش کی تعلیم دیتی تھیں۔ امور خانہ داری سے واقف کرایا جاتا تھا دوپہر کو دسترخوان پر تمام لڑکیوں کے ساتھ خاصہ تناول فرماتیں اور خورد و نوش کے آداب بتاتیں، کئی امیرزادیوں نے اس مدرسہ سے استفادہ کیا ہے اور آج بھی وہ اعلیٰ طبقہ میں سلیقہ اور شایستگی کے لحاظ سے دوسروں کے لیے نمونہ ہیں۔[۲]

(۵) ویسلین مشن نارمل اسکول | سنہ ۱۳۰۷ھ م سنہ ۱۸۹۰ء میں ویسلین مشن کی جانب سے تلنگی نارمل اسکول قایم ہوا،[۳]

(۶) اسٹینلی گرلز اسکول | سنہ ۱۳۱۲ھ[۴] م ۱۸۹۵ء م سنہ ۱۳۰۴ ف میں اسٹینلی گرل اسکول قایم ہوا، اولاً اس کی حالت بالکل ابتدائی تھی اور پھر مڈل اسکول بنا اس کے بعد سنہ ۱۳۲۶ف

---

(۱) تعلیمات آصف جاہ سادس کے عہد میں، صفحہ ۔ (۲) تذکرہ جمیل، صفحہ ۹

(۳) تعلیمات آصف جاہ سابع کے عہد میں۔ (۴) خواتین دکن

سنہ ۱۹۰۸ء میں ہائی اسکول بنایا گیا، سنہ ۱۹۱۱ء م سنہ ۱۳۲۹ھ میں پہلی مرتبہ چار لڑکیاں اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کے امتحان میں شریک ہوئیں۔

قیام مدرسہ کے کچھ عرصہ کے بعد سرکار عالی نے اس مدرسہ کو امداد بھی مقرر کردی، اسٹینلی گرل اسکول نے زمانۂ مابعد میں جو ترقی کی اور آج جس نوبت پر پہنچ گیا ہے اس کی صراحت ہمارے مضمون سے خارج ہے، تقریباً ایک ہزار لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں جن میں ہر مذہب و ملت کی لڑکیاں شامل ہیں سرکار عالی کے امتحانات کے مطابق یہاں تعلیم ہوتی ہے۔

(۷) نوبلز اسکول سنہ ۱۳۱۷ھ م سنہ ۱۹۰۰ء میں مسز شجاعت علی جو نواب عماد الملک کی بہن اور نواب زین یار جنگ بہادر کی والدہ تھیں حیدرآباد کی عورتوں میں تعلیم کی پستی کو محسوس کرکے ایک زنانہ اسکول قایم کیا تھا، یہاں اُردو، فارسی، عربی، انگریزی کے علاوہ تاریخ جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم ہوتی تھی، اردو فارسی اور عربی کی تعلیم خود بیگم شجاعت علی دیا کرتیں، اور انگریزی تعلیم کے لیے ایک ماسٹر مامور تھے۔

چھ ماہ تک یہ مدرسہ ترقی کرتا رہا۔ اس مدرسہ میں زیادہ تر نواب افسر الملک کے خاندان کی لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں[۱]۔

جہاں تک ہماری معلومات ہیں، یہی مدرسے ہیں جو غیر سرکاری طور پر اس دور میں قایم ہوئے ان سات مدرسوں کے منجملہ صرف اسٹانلی گرل ہائی اسکول تیسرے دور میں بھی موجود ہے۔

تعلیم نسواں کا چوتھا طریقہ یعنی سرکاری زنانہ مدرسے

اس دور کی سب سے بڑی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سرکاری طور پر زنانہ مدرسے

---

(۱) اُن معلومات کے لیے ہم بیگم نذیر جنگ کے ممنون ہیں۔

قایم کیے گئے ۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے ۔ سلطنت آصفیہ کی ترقی کا آغاز اور نظم و نسق کو باقاعدہ اور منظم کرنے کی ابتدا آصف جاہ رابع نواب ناصرالدولہ کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے، نواب مختار الملک نوجوان وزیر اعظم نے سنہ ۱۲۶۹ھ م سنہ ۱۸۵۳ء میں وزارت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے کر ملک کی اصلاح کی طرف اپنی توجہ مبذول کی ایک باقاعدہ سلطنت کے نظم و نسق کو قایم کیا گیا اہل ملک کی فلاح و بہبودی، ترقی اور خوش حالی کے اسباب پر غور و خوض ہونے لگا، دوسرے امور کے قطع نظر تعلیم کی جانب بھی توجہ کی گئی، اور سرکاری مدرسے قایم ہونے لگے، چنانچہ پہلا سرکاری مدرسہ بنام دارالعلوم سنہ ۱۲۷۲ھ م سنہ ۱۸۵۶ء میں قایم ہوا[1]، اور اس کے پانچ سال بعد اضلاع میں بھی مدارس و مکاتب کھولنے کے احکام جاری کیے گئے ۔

نواب مختار الملک کو دوسرے ضروری اور موقتی امور کے مقابل اتنا وقت نہیں ملا کہ وہ تعلیم نسواں کی جانب متوجہ ہوتے چنانچہ آپ کے زمانہ میں ہم کو کوئی سرکاری مدرسۂ نسواں کا پتہ نہیں چلتا، تا آں کہ اعلی حضرت نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کا بعد بلوغ بذات خود دور حکمرانی شروع ہوا، آپ کے دور کا یہ ایک درخشاں اور تابناک کارنامہ ہے کہ سرکاری طور پر مدارس نسواں قایم ہونے لگے ۔

نواب عمادالسلطنت اور نواب آسماں جاہ کے دور مدارالمہامی میں پہلے پہل اضلاع اور بلدہ میں مدارس نسواں قایم ہوئے، تعلیم نسواں کے متعلق جدید انتظام ۱۳۰۲ھ م سنہ ۱۸۸۵ء سے آغاز ہوا، بلدہ سے پہلے اضلاع میں مدارس نسواں قایم ہوئے، واضح ہو کہ جن مدارس کا پتہ چلتا ہے وہ یہ ہیں ۔

---

(۱) تذکرہ دارالعلوم ۔

(۱) حیدرآباد کے باہر ایک مدرسہ تعلیم نسوان کا ۱۳۰۲ھ م ۱۸۸۵ء میں تھا، جس میں (۳۰) لڑکیاں زیر تعلیم تھیں، افسوس ہے کہ مقام کی صراحت مصنف گز ٹیر نے نہیں کی ہے،

(۲) مدرسہ مکراج پلی، ضلع ناندیڑ کے مدرسہ مکراج پلی کا تذکرہ قبل ازیں ہو چکا ہے سررشتہ تعلیمات کو اس مدرسہ کی اطلاع ہوئی اور ترقی کا علم ہوا تو اس کو سرکاری نگرانی میں لے لیا، اور اس کی حیثیت سرکاری مدرسہ کی ہوگئی۔

(۳) زنانہ مدرسہ نام پلی | حیدرآباد کا سب سے پہلا شاہی زنانہ مدرسہ نام پلی کا زنانہ ہائی اسکول ہے، جو ۱۳۰۹ھ م ۱۸۹۰ء م ۱۳۰۰ف میں قایم کیا گیا، مس ایونس صدر معلم مقرر ہوئیں سولہ لڑکیوں نے شرکت کی، مدرسہ پہلے اس عمارت میں تھا جس میں اب نواب داور جنگ بہادر کا قیام ہے، اس کے کچھ عرصہ بعد نام پلی کا موجودہ مکان دیا گیا،

مدراس یونیورسٹی کے میٹرک کی تعلیم یہاں ہونے لگی، قیام مدرسہ کے ایک عرصہ تک مدراس یونیورسٹی نے اس مدرسہ کو تسلیم نہیں کیا تھا اس لیے اولاً غیر سرکاری طور پر بعض لڑکیاں امتحان میں شریک ہونے لگیں سرکاری طور پر پہلے پہل ۱۳۱۶ف م ۱۹۰۶ء میں چار لڑکیاں امتحان میٹرک میں شریک ہوئیں تھیں لیکن کسی نے کامیابی حاصل نہیں کی، اس کے برخلاف مڈل کے سرکاری امتحان کا نتیجہ نہایت عمدہ رہا، یعنی تیرہ لڑکیاں شریک ہوئیں اور نو کامیاب ہوگئیں۔

اس زمانہ میں چونکہ عام طور سے تعلیم نسواں سے چشم پوشی کی جاتی تھی، مدرسہ کی تعلیم معیوب تصور ہوتی تھی، تعلیمی سہولتیں میسر نہیں تھیں لڑکیوں کے مدرسہ کی آمد و رفت میں بڑی دشواری تھی، تعلیم یافتہ شریف معلمات کا کال تھا، اس لیے مدرسہ میں لڑکیوں کے شرکت کی رفتار نہایت سست رہی چنانچہ ۱۳۱۷ف تک ان کی تعداد (۷۷) سے

---

(۱) گزٹیر صفحہ ۲۳۵ –

زیادہ نہ ہوسکی، اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی تخت نشینی کے وقت یہاں طالبات کی تعداد ایک سو کے اندر تھی۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے یہاں مدراس یونیورسٹی کا نصاب رائج تھا ڈومسٹک سائنس کی تعلیم نہیں ہوتی تھی البتہ پکوان کے لیے ایک معلمہ کا تقرر ہوا تھا، لیکن چونکہ مدرسہ کے نصاب میں اس کی تعلیم نہیں تھی اس لیے بمشکل ایک آدھ لڑکی اس کی جانب توجہ کرتی تھی

(۵) محبوبیہ گرلز اسکول اس دور کا دوسرا شاندار سرکاری مدرسہ محبوبیہ اسکول ہے اس مدرسہ کو ۱۳۱۷ف م ۱۹۰۷ء م ۱۳۲۶ھ میں قایم کیا گیا یہ مدرسہ شروع سے اعلیٰ طبقہ کی لڑکیوں کے لیے مخصوص کیا گیا تھا، اس لیے اس مدرسہ کی فیس بہت زیادہ رکھی گئی، اور معلمات میں زیادہ حصہ یوروپین خواتین کا تھا، یہاں کی تعلیم کا نصاب کیمبرج کا رکھا گیا، جو آج تک بدستور ہے۔

تعلیم نسواں کے جو مواقع نام بلی کے تذکرہ میں بیان کیے گئے ہیں اس کے مدنظر یہاں بھی ایک عرصہ دراز تک لڑکیوں کی ہمت افزائی نہیں رہی، چنانچہ تیسرے دور کے قبل اس مدرسہ میں تعلیم پانے والی طالبات پچیس تک بھی نہیں پہنچی تھیں۔

(۶) ۱۳۲۲ھ م ۱۹۰۵ء میں سرونگر کے یتیم خانہ میں مدرسۂ نسواں بھی قایم قایم ہوا، جہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ صنعت بھی شامل رکھی گئی۔ مدرسہ ملکۂ وکٹوریہ کی یادگار میں قایم کیا گیا تھا اس کے لیے سرونگر کا شاہی محل جو ناتمام تھا مکمل کرکے دیا گیا۔

ان مدارس کے علاوہ مستقر اضلاع وغیرہ میں جو مدارس نسواں قایم ہوئے ان کی نام واری صراحت دشوار ہے، اس لیے جملہ تعداد بعض سنین کے لحاظ سے لکھی جاتی ہے،

مخفی نہ رہے کہ اس میں بلدہ کے مدارس بھی شامل ہیں،

شمار	سنہ	تعداد مدارس	تعداد طالبات	کیفیت
۱	۱۲۹۵ف م ۱۸۸۶ء	۲۰	۱۳۳۰	تعداد میں سرکاری و
۲	۱۳۰۵ف م ۱۸۹۶ء	۶۸	۲۹۳۰	غیر سرکاری ابتدائی،
۳	۱۳۰۷ف م ۱۸۹۸ء	۷۳	[illegible]	وسطانی، فوقانی سب
۴	۱۳۱۵ف م ۱۹۰۶ء	۷۹	۵۲۶۵	کچھ شامل ہیں۔
۵	۱۳۱۷ف م ۱۹۰۸ء	۸۳	۵۵۵۷	
۶	۱۳۱۹ف م ۱۹۱۰ء	۸۶	۵۶۱۷	

دور ثانی کے آخر یعنی دور ثالث کے ایک سال پہلے ۱۳۲۸ھ م ۱۹۰۹ء م ۱۳۱۸ف میں بلدہ اور اضلاع میں جو مدارس تھے اور جو طالبات زیر درس تھیں ان کی تفصیلی صراحت حسب ذیل ہے۔

(۱) ہائی اسکول سرکاری ۲
(۲) ہائی اسکول امدادی ۱
(۳) مڈل اسکول سرکاری ۱
(۴) مدارس تحتانی سرکاری ۳۷
(۵) مدارس تحتانی امدادی ۴۲
(۶) مدرسہ معلمات امدادی ۲

۷۶

طالبات کی تعداد اس سنہ میں ۱۹۰۹ء م ۱۳۱۹ف میں حسب ذیل تھی،

مدارس تحتانی ۵۴۲۹

وسطانی	۸۱
فوقانی	۲۴
معلمات زیر درس	۸۳
جملہ	۵۶۱۷

رمضان ۱۳۲۹ھ م ۱۹۱۱ء م ۱۳۳۰ف میں آصف جاہ سادس کا انتقال ہوا اور اعلیٰ حضرت سلطان العلوم سریر آرائے سلطنت آصفیہ ہوئے، حضور کے عہد حکومت کو تیسرا دور قرار دیا گیا ہے اس تیسرے دور میں دوسرے سررشتوں کی طرح تعلیم نسواں میں بھی بڑی ترقی ہوتی ہے، اس کی صراحت ہمارے عنوان سے خارج ہے۔

تبصرہ۔ صفحات ماقبل میں سلطنت آصفیہ کی تعلیم نسواں کا مختصر حال تقریباً دو سو سال کا بیان کر دیا گیا ہے، اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ غیر سرکاری مدارس نسواں کا آغاز ۱۲۹۸ھ م ۱۸۸۱ء سے ہوا، لیکن سرکاری طور پر ۱۳۰۲ھ م ۱۸۸۵ء سے اس کی جانب توجہ کی گئی، ستائیس سال کے عرصہ میں بلدہ اور اضلاع کے مدارس کی تعداد (۸۶) تک پہنچی تھی، ان مدارس میں تعلیم پانے والی طالبات (۵۶۱۷) تھیں،

ممالک محروسہ سرکار عالی میں تعلیم نسواں کی جانب اول تو بہت بعد میں توجہ کی گئی۔ دوسرے اور اسباب بھی تھے جو ترقی اور توسیع تعلیم میں مانع رہے، چنانچہ مرزا مہدی خاں صاحب کوکب مرحوم مصنف گزیٹیر نے اپنی کتاب میں جو ۱۹۰۱ء میں مرتب اور ۱۹۰۸ء میں شایع ہوئی ہے، اس کی وجہ جو ظاہر کی ہے وہ حسب ذیل ہے،

"تین بڑے موانع ترقی کی راہ میں واقع ہیں۔ پہلا مسلمانوں کی رکاوٹ"
"ہے کہ لڑکیوں کو قرآن سے زیادہ نہ پڑھایا جائے مگر عام خیال اس وقت"
"ضعیف ہوتا جاتا ہے، اور لڑکیوں کو پڑھنا لکھنا اور حساب ابتدائی"

" نصاب تک اکثر مدرسوں میں سکھلایا جارہا ہے ۔ علاوہ اس کے سینا اور"
" کاڑنا اور ایک مدرسہ میں پکوان بھی سکھلایا جاتا ہے ۔ ہندوؤں کی کم عمری"
" میں شادی دوسرا مانع ہے ۔ مگر یہ کوئی ایسا سخت مانع نہیں خصوصاً جبکہ"
" ابتدائی تعلیم سے زیادہ سکھلانا مقصود نہیں، سب سے بڑی دقت"
" عدم موجودی تعلیم یافتہ استانیوں کی ہے جو تنخواہیں دی جاتی ہیں وہ"
" اس قدر کم ہیں کہ باہر سے کسی کو طلب نہیں کرسکتے ہیں اور معلمات کی تعلیم"
" کے لیے کوئی مدرسہ بھی نہیں ہے، جب تک کہ یہ ضرورت رفع نہ ہو کوئی"
" محسوس اثر کے پیدا کرنے کی امید نہیں ......" (گزیٹر صفحہ ۱۳۵)

جو موانع مرزا مہدی خاں نے بیان کیے ہیں، اس کی صداقت میں کوئی کلام نہیں ہے لیکن اس کے علاوہ بعض اور اسباب بھی ایسے تھے جو ترقی تعلیم نسواں کے مانع تھے، مثلاً مڈل اور میٹرک کا نصاب مدراس یونیورسٹی کے مطابق تھا یعنی انگریزی زبان ذریعہ تعلیم قرار دی گئی تھی جو ایک غیر ملکی اور مشکل زبان تھی، مادری زبان کی طرح اس پر عبور حاصل کرنا دشوار تھا، اس کے علاوہ مدراس یونیورسٹی کا تعلیمی معیار بہت اعلیٰ تھا، جہاں انگریزی تعلیم حیدرآباد سے ایک صدی پہلے شروع ہوئی تھی، اس طرح مدراس یونیورسٹی کے امتحان میٹرک کے نصاب پر عبور حاصل کرنا صنف نازک کے لیے دشوار تر تھا، دوسرے یہ کہ مدارس نسواں میں طالبات کو لانے کے لیے سواریوں کا پورا انتظام نہیں تھا مدارس کے فاصلہ کو طے کرنے کی سہولتیں نہیں تھیں، پھر عام طور سے تعلیم نسواں کی جانب پبلک بھی متوجہ نہیں تھی، اس زمانہ میں اناث تو کیا ذکور کی تعلیمی حالت بھی پست تھی، تعلیم نسواں کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا جارہا تھا، سررشتۂ تعلیمات اور پبلک میں تعاون نہیں تھا، غیر سرکاری مدارس کے لیے کوئی قانونی قواعد منضبط نہیں تھے ۔ غریب اور نادار طالبات کے لیے تعلیم حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ

نہیں تھا، یعنی وظایف اور امداد کا کوئی قاعدہ تھا اور نہ سرکار اور پبلک کی جانب سے کوئی رقم اس غرض کے لیے مخصوص اور موجود تھی، عورتوں کا ملازمت کرنا معیوب تصور کیا جاتا تھا، ضروریات زندگی کی ارزانی کے باعث اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھی جاتی تھی، یہ تمام اسباب تھے جس کی وجہ سے تعلیم نسواں میں جیسے چاہئے ویسی ترقی نہیں ہوئی تھی، لیکن یہ امر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ تعلیم نسواں کی ابتداء اور آغاز کے لیے آصف جاہ سادس کا دور حکمرانی سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے،

پہلے زمانہ میں ابتداء سے اعلیٰ جماعتوں تک ذکور اور اناث کے تعلیمی نصاب میں کوئی فرق نہیں تھا اگرچہ بعض مدارس میں پکوان اور سیون کا کچھ انتظام تھا لیکن اس کا لزوم نہیں تھا، اور نہ قاعدہ، ہر مدرسہ میں اس کی جانب توجہ نہیں کی جاتی تھی،

طالبات کی صحت اور تندرستی کے لیے، ورزش جسمانی کا کوئی انتظام نہیں تھا، جو زنانہ مدارس تھے ان کے مکانات غیر موزوں اور ناکافی تھے، عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس کے لیے انہیں حیدرآباد سے باہر جانے کی ضرورت ہوتی تھی۔

غرض جو کچھ کمی اور خامیاں تھیں وہ تیسرے دور میں دُور ہوئی ہیں۔ جس کا تذکرہ ہمارے عنوان سے خارج ہے۔ فقط

پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ

از جناب محمد ناصر علی صاحب ام۔ اے (عثمانیہ) لکچرار شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ

(۱) تمہید

پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب حیدرآباد دکن کے ایک اہم مصنف ہیں۔ انہوں نے اپنی تصنیفوں اور ترجموں کے ذریعہ ملک کی بڑی علمی خدمت انجام دی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بہت محدود دائرہ کے لوگ ان کے کام سے پوری طرح واقف ہیں۔ اس مقالے کا مقصد پنڈت جی کے حالات زندگی اور ان کے علمی کام کو پبلک سے متعارف کرنا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کی ذات اور ان کے کام سے واقف ہوں اور فائدہ اٹھائیں مجھے اپنے ایک تحقیقی کام کے سلسلے میں پنڈت جی کی کتاب سلسلۂ بستان آصفیہ سے بہت مدد ملی ہے جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔

(۲) پنڈت جی کے حالات زندگی

آبائی وطن اور اسلاف پنڈت جی ذات کے برہمن ہیں۔ نام مانک راؤ ولد وٹھل راؤ ہے۔ ان کا آبائی مقام مانک نگر ہے جو تعلقہ ہمناباد ضلع گلبرگہ سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ان کے دادا نیل کنٹھ راؤ صاحب یہاں کے وطن دار تھے۔ ان کے والد وٹھل راؤ صاحب نواب خورشید جاہ مرحوم کی پائیگاہ میں اول تعلقدار تھے۔ ان کی والدہ

ماجدہ کا نام بھینا بائی ہے جن کا تعلق جینگوپے (واقع گلبرگہ) کے ایک وطن دار برہمن خاندان سے ہے۔ پنڈت جی کا خاندانی شجرہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

نیلا کنٹھ راؤ

وٹھل راؤ — پانڈو رنگ راؤ — رام راؤ — تکارام پنڈت

وٹھل راؤ:
کرشنا بائی — مانک راؤ (مصنف بستان آصفیہ) لاولد — ملہار راؤ — رنگو بائی — ساوترا بائی

ملہار راؤ:
وٹھل راؤ — تانیا بائی

ولادت، بچپن اور ابتدائی تعلیم پنڈت جی یکم اگست ۱۸۶۷ء کو چہارشنبہ کے دن مانک نگر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بارگاہ خورشید جاہی میں چونکہ ایک با اقتدار عہدہ دار تھے اس لیے ان کے بچپن کا زمانہ بہت آرام اور سکھ چین کے ساتھ گذرا۔ جب یہ تعلیمی عمر کو پہنچے تو آپ کے والد بزرگ وار نے گھر ہی پر تعلیم کا انتظام فرمایا۔ منشی عبدالرحیم صاحب اردو اور فارسی کی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے اور پنڈت بھاؤ راؤ صاحب انگریزی۔ حساب اور مرہٹی کی تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے۔

مدرسہ میں شرکت، شادی اور والدین کا انتقال گھر پر تعلیم کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ انھیں حیدرآباد کے مشہور اور قدیم مدرسۂ اعزہ میں شریک کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسٹر ٹیبیٹ یہاں کے صدر مدرس تھے۔ مدرسہ میں بھی پنڈت جی اُردو، فارسی، انگریزی اور حساب کی تعلیم پاتے رہے۔ مدرسہ میں شرکت کے بعد بھی متذکرہ ہر دو اساتذہ آپ کو گھر پر تعلیم دیتے تھے اور بہت عرصہ تک پنڈت جی اِن سے فیض یاب ہوتے رہے۔

پنڈت جی کی عمر ابھی بہت کم تھی کہ برہمن گھرانوں کی رسم کے مطابق ان کی شادی لچھمی بائی صاحبہ سے کی گئی جو پانڈو رنگ راؤ صاحب جینگوپے کے ایک وطن دار کی بیٹی تھیں۔

تعلیم ابھی جاری تھی اور پنڈت جی بہت کم عمر تھے کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

امیر پائیگاہ کی سرپرستی۔ چھوٹی عمر میں والدین کے سایہ کا سر سے اٹھ جانا اولاد کے لیے بڑی مصیبت اور بے کسی کا باعث ہوتا ہے۔ والد کی بے وقت موت سے ان کی تعلیم کا متاثر ہونا بہت اغلب تھا لیکن امیر پائیگاہ نواب محمد رشید الدین خاں مرحوم نے شاید اسی چیز کو محسوس فرماتے ہوئے پنڈت جی کو ان کے والد کی خدمات کے صلہ میں موضع کوتھلی کا علاقہ بطور جاگیر عطا فرمایا جس کی وجہ سے انھیں یک گونہ معاشی سکون حاصل ہوا اور سلسلۂ تعلیم کسی رکاوٹ کے بغیر پہلے کی طرح جاری رہا۔

تعلیم کا اختتام اور علمی استعداد۔ سنہ ۱۸۸۱ء میں نواب محمد رشید الدین خاں مرحوم امیر پائیگاہ کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ ان کے فرزند نواب محمد محی الدین خاں مرحوم امیر پائیگاہ ہوئے۔ اس وقت بھی پنڈت جی زیرِ تعلیم تھے لیکن اس کے پانچ سال بعد یعنی سنہ ۱۸۸۶ء میں سلسلۂ تعلیم کو ختم کیا۔ تعلیم کے دوران میں آپ نے اردو، فارسی اور مرہٹی پر اچھا عبور حاصل کیا۔ فارسی کی مختلف کتابوں مثلاً گلستاں، بوستاں، خالق باری کریما، انوار سہیلی اور رقعات عالمگیری وغیرہ کا خصوصی مطالعہ کیا۔ اردو میں بھی مختلف ہم عصر درسی کتابیں ختم کیں۔ بالخصوص مرہٹی میں جو ان کی مادری زبان ہے اچھی دستگاہ حاصل کی۔ پنڈت جی کو فارسی سے بڑا لگاؤ ہے۔ چنانچہ ان کی مختلف کتابوں میں جگہ جگہ فارسی کا برمحل استعمال ملتا ہے۔ مزید برآں ایک سے زائد جگہ عربی جملوں کا بھی برموقع استعمال نظر آتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عربی زبان سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ جہاں تک انگریزی کا تعلق ہے اس میں اتنی مہارت رکھتے ہیں کہ ہر کتاب کو پڑھ کر سمجھ لیتے اور اس کے مفہوم کو اردو یا مرہٹی میں ادا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کی اکثر کتابوں میں انگریزی ماخذوں سے بہت کچھ مدد لی گئی ہے۔

امیر پائیگاہ کی مصاحبت تعلیم ختم کرنے کے بعد پنڈت جی نواب محمد محی الدین خاں مرحوم

امیر پائیگاہ کی مصاحبت میں داخل ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں جب نواب صاحب موصوف کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ ان کے صاحبزادے نواب محمد حفیظ الدین خاں مرحوم امیر پائیگاہ ہوئے اور پنڈت جی کو ان کی مصاحبت کی بھی عزت حاصل رہی۔

مہتممی تعلیمات سے سرفرازی ۱۹۰۶ء میں جب نواب محمد حفیظ الدین خاں مرحوم ظفر جنگ شمس الملک کا انتقال ہوا تو ان کے جانشین نواب محمد لطف الدین خاں لطافت جنگ لطف الدولہ بہادر امیر پائیگاہ ہوئے۔ نواب صاحب موصوف نے شاید پنڈت جی کے علمی شغف اور انہماک کو دیکھ کر انھیں اپنی پائیگاہ میں ۱۹۱۱ء میں مہتممی تعلیمات کے عہدہ سے سرفراز فرمایا۔ اس خدمت پر پنڈت جی ۱۹۲۷ء تک کارگذار رہے۔

رکنیت اور نظامت فوج سے سرفرازی۔ اس کے بعد نواب لطف الدولہ مرحوم نے انھیں اپنی پائیگاہ کی رکنیت فوج سے سرفراز فرمایا۔ لیکن اس عہدہ پر پنڈت جی ایک ہی سال کام کرسکے کیونکہ انھیں نظامت فوج کی خدمت تفویض کردی گئی تھی ۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک ناظم فوج پائیگاہ خورشید جاہی کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور موخرالذکر سنہ میں وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۷۲ سال تھی۔

وظیفہ حسن خدمت اور بعد کا مشغلہ۔ یوں تو ملازمت کے زمانہ میں اور اس سے بھی بہت عرصہ پہلے سے پنڈت جی پڑھنے لکھنے اور علمی تحقیق و جستجو کے کام میں مشغول تھے لیکن ملازمت سے سبکدوشی کے بعد جب ایک فریضے سے بے فکری ہوگئی تو پھر ان کی ساری توجہ تصنیفی، تالیفی اور ترجمہ کے کام کی طرف مبذول ہوگئی۔ ان کو وظیفہ پر علیحدہ ہوکر کوئی چار سال ہوتے ہیں اور اس وقت آپ کی عمر ۷۶ سال سے زاید ہے لیکن اس کے باوجود علمی خدمت میں برابر مصروف ہیں۔ بینائی میں فرق آگیا ہے چنانچہ حال ہی میں ڈاکٹر متھراداس کے ذریعہ آنکھوں پر عمل جراحی بھی کرایا گیا۔

اور ڈاکٹروں کی ممانعت کے باوجود کہ دماغی کام کو ترک کر دیا جائے طبعی شوق کی وجہ سے اس میں مصروف رہتے ہیں۔ اگر خود مطالعہ نہ کریں تو دوسروں سے پڑھوا کر سنتے ہیں۔ جو بات روزنامچے میں لکھنے کی ضرورت ہو اس کی ہدایت کرتے ہیں کتابوں کے حوالے دیتے ہیں۔ دوسروں سے مواد جمع کر اکے اس کو تنظیمی شکل دیتے ہیں۔ آجکل ان کے دو ہی مشغلے ہیں۔ ایک علمی کام اور دوسرے پرماتما کی عبادت۔

شخصیت اور عادات و اطوار پنڈت جی حسینی علم کے محلے میں رہتے ہیں۔ مجھے ایک سے زاید مرتبہ ان سے ملنے کا موقع ملا ہے۔ میانہ قد ہیں۔ نہ بہت دُبلے ہیں اور نہ بہت موٹے۔ رنگ گندمی۔ چہرہ کسی قدر لانبا۔ کمانی بھوں اونچی ناک۔ بڑی آنکھیں اور چوڑی پیشانی رکھتے ہیں۔ موچھ رکھتے اور داڑھی صاف کراتے ہیں۔

روزمرہ زندگی میں اوقات کے بڑے پابند ہیں۔ ہر کام کے لیے وقت مقرر ہے اور اسی لحاظ سے مشغول رہتے ہیں۔ عزم اور ارادے کے بڑے پکے ہیں۔ بہت سے لوگ جذبات سے مغلوب ہو کر بڑے بڑے منصوبے باندھ لیتے ہیں مگر جونہی ان کی تکمیل میں دقتیں ہوتی ہیں تو ساتھ ہی جواب بھی دے دیتے ہیں۔ لیکن پنڈت جی جذبات اور نظری احساسات کو بہت دور رکھتے ہیں۔ خیال اور عمل میں زیادہ بُعد پیدا ہونے نہیں دیتے۔ جس تصنیف تالیف کا ارادہ کرتے ہیں اُسے تکمیل کو پہنچائے بغیر نہیں رہتے۔ صبر و تحمل کا بڑا مادہ رکھتے ہیں۔ سلسلۂ بُستان آصفیہ کی ترتیب کے زمانے میں ناقدر شناسوں کے ہاتھوں ان کو بہت مصیبت اور ذلت اٹھانی پڑی لیکن آپ بڑے ضبط اور بردباری سے اُسے نظر انداز کرتے رہے اور اپنے مقصد کی تکمیل میں برابر کوشاں رہے۔ سیرت اور کردار کی نیکی پر بڑا زور دیتے ہیں۔

بزرگوں اور عالموں کے اقوال سے انھیں بڑی دلچسپی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے کمرے میں ایک جگہ دیوار پر ایک فریم آویزاں ہے جس میں تصویر کی بجائے

خوش خط اقوال لکھے ہوئے ہیں جن کا قریبی تعلق سیرت اور کردار کی پختگی اور نیکی سے ہے۔

مختصر طور پر پنڈت جی کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک خدا ترس، خدا پرست، سچائی کے دلدادہ، خوش اخلاق، با مروت، مہمان نواز، صاحب حلم و تدبر عالم با عمل ہیں۔ حقیقی کام کے قائل اور نام و نمود سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ تشہیر اور پروپگنڈا انھیں پسند نہیں۔ طبیعت میں بڑی انکساری ہے۔ ہر وقت اپنی علمی کم مایہ گی کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ نہ صرف گفتگو میں منکسر المزاج ہیں بلکہ تحریر میں بھی جگہ جگہ اس کا ثبوت دیتے ہیں۔ پنڈت جی کو دیکھ کر اور ان کی باتیں سنکر اُن نوجوانوں پر افسوس ہوتا ہے جو بہت تھوڑا جاننے کے باوجود بہت کچھ بتانے کی کوشش کرتے ہیں یا ایک دو معمولی کتابیں لکھ کر خوب پروپگنڈا کرتے ہیں۔

دو سال ہوئے ان کی رفیقۂ حیات کا انتقال ہوا۔ یہ لاولد ہیں۔ مگر اپنے بھتیجے وٹھل راؤ صاحب کو بیٹے کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ ان کے قریبی رشتہ داروں میں ان کے بھتیجے وٹھل راؤ صاحب بھی قابل ذکر ہیں۔ آج کل یہی ان کے پاس رہتے اور ان کی خدمت بجا لاتے ہیں۔

(۳) پنڈت جی کی جملہ کتابیں

بُستان آصفیہ کی چھٹی جلد میں "عرض حال" کے تحت پنڈت جی نے اپنے تصنیفی اور تالیفی کام کی ابتدا پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے: "پرمیشور کی یہ مجھ ناچیز پر بڑی منت ہے اور بڑا احسان ہے کہ ایسی حالت میں جب دس سال کی عمر میں ہی میرے سر سے والدین کا سایہ اٹھ گیا تھا اور کوئی بزرگ خاندان ایسا نہیں تھا کہ جو میری تعلیم و تربیت کی نگرانی کا بار اپنے ذمے لیتا۔ مجھے آوارہ نہیں ہونے دیا اور حسب ضرورت مرہٹی، اردو اور فارسی کی تعلیم سے بہرہ ور فرمایا اور سن شعور کو

پہنچنے کے بعد دنیا کے دوسرے فضول اور تباہ کن مشاغل تفریح میں پھنسانے کے بجائے تالیف و تصنیف کا مشغلہ مجھے اپنی عنایت بے غایت سے مرحمت فرمایا اور اس مشغلہ میں مجھے کسی خاص مدت تک نہیں بلکہ اب تک جب کہ میں اپنی عمر کے ۶۴۔ ۶۵ مرحلے طے کر چکا ہوں منہمک رکھا۔" اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے بہت ابتدائی زمانے ہی سے تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہیں۔ بستان آصفیہ کی پانچویں جلد کے دیباچہ میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے: "پبلک کی قدردانی اور ہمت افزائی نے میرے حوصلہ کو پست نہیں ہونے دیا۔ باوجود انحطاط قویٰ اور اضمحلال طبیعت اپنی دُھن (تصنیف و تالیف) میں لگا ہوا ہوں اور جب تک دم میں دم ہے برابر لگا رہوں گا۔" پنڈت جی اپنے اس وعدہ کو بطور احسن پورا کر رہے ہیں کیونکہ ابھی تک جب کہ عمر ۷۶ سال سے زاید ہو چکی ہے تصنیفی اور تالیفی کام میں ممکنہ انہماک کے ساتھ مشغول ہیں۔ ان کی سب سے پہلی کتاب تفریح الحیات کے نام سے ۱۸۹۶ء میں شایع ہوئی۔ اس سنہ کو گذرے ہوئے آج ۷۴ سال کا عرصہ ہوتا ہے چنانچہ اس دوران میں ہر دو یا تین سال کے وقفہ سے ان کی مختلف کتابیں پبلک کے استفادہ کے لیے برابر چھپتی ہوتی رہی ہیں۔ ان کی جملہ کتابوں کی فہرست سنہ طباعت کی ترتیب، سائز اور ضخامت، مطبع اور قیمت کی صراحت کے ساتھ ذیل میں دی گئی ہے۔ اسے لوگوں کی سہولت کے لیے جو ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیں کتب خانۂ آصفیہ اور کتب خانۂ جامعۂ عثمانیہ میں ان کے کال نمبر کی بھی صراحت کی گئی ہے۔

سلسلہ نشان	نام کتاب	سنہ طباعت	نام مطبع	سائز	ضخامت	قیمت	کال نمبر کتب خانہ آصفیہ	کال نمبر کتب خانہ جامعہ عثمانیہ
۱	تفریح الحیات	۱۸۹۶ء	اعجاز محمدی آگرہ	متوسط	۱۳۲	۱۲/	فن اخلاق ۳۸	موجود نہیں
۲	امیرانہ اور غریبانہ زندگی	۱۸۹۹ء	معلم شفیق	چھوٹی	۵۲	۔	فن مواعظ ۵۲	″ ″

نمبر شمار	نام کتاب	سنہ طباعت	نام مطبع	سائز	صفحات	قیمت	کال نمبر کتب خانۂ آصفیہ	کال نمبر کتب خانۂ جامعۂ عثمانیہ
۳	راجہ اشوک کا جیون چرتر	سنہ ۱۹۰۲ء	اخبار تہذیب علی گڑھ	متوسط	۱۴۰	/۱۰	موجود نہیں	۹۳۳٫۱ / اشوک ـ م
۴	وید و نیتی	سنہ ۱۹۰۷ء	قاسم پریس	؍	۷۴	/۸	؍ ؍	موجود نہیں
۵	بُستان آصفیہ پہلی جلد	سنہ ۱۹۰۹ء	انوار الاسلام پریس	بڑی	۸۳۲	۱۰؍	فن تاریخ ۶۹۷	۹۱۵٫۴۹ / م ـ ب
۶	بُستان آصفیہ دوسری جلد							
۷	اقوال بدھ	سنہ ۱۹۱۱ء	انڈین پریس الٰہ آباد	متوسط	۸۰	/۱۲	فن مذاہب ۳۴	موجود نہیں
۸	دستور حکمرانی	سنہ ۱۹۱۳ء	شمس اسلام پریس	بڑی	۱۳۸	/۱۲	فن فلسفہ ۴۷۹	؍ ؍
۹	مفید الخواتین	سنہ ۱۹۱۶ء	شمس المطابع	بڑی	۳۰۸	عہ	موجود نہیں	موجود نہیں
۱۰	حالات و مقالات سقراط	سنہ ۱۹۱۶ء	؍ ؍	چھوٹی	۲۳۲	/۱۲	؍ ؍	۹۲۱٫۹ / سقراط ـ م
۱۱	بُستان آصفیہ تیسری جلد	سنہ ۱۹۲۰ء	انوار الاسلام پریس	بڑی	۶۴۱	ہے	فن تاریخ ۱۳۲۳	۹۱۵٫۴۹۶ / م ـ ب
۱۲	خیابان آصفی	سنہ ۱۹۲۳ء	شمس الاسلام پریس	؍	۱۸۰	عہ	فن تاریخ ۱۳۱۲	۹۵۴٫۹۶ / م ـ خ
۱۳	بُستان آصفیہ چوتھی جلد	سنہ ۱۹۲۳ء	سردار پریس	بڑی	۳۱۹	للعہ	فن تاریخ ۱۴۲۴	موجود نہیں
۱۴	مرہٹوں کا تمدن	سنہ ۱۹۲۴ء	انوار الاسلام پریس	متوسط	۱۴۴	درج نہیں	؍ ۱۴۹۰	۹۵۴٫۴۴ / م و ـ م
۱۵	بُستان آصفیہ پانچویں جلد	سنہ ۱۹۲۶ء	چشتیہ پریس	بڑی	۳۴۰	للعہ	؍ ۱۵۶۳	۹۱۵٫۴۹۶ / م ـ ب
۱۶	بُستان آصفیہ چھٹی جلد	سنہ ۱۹۳۲ء	انوار الاسلام پریس	؍	۵۰۴	صہ	؍ ۱۹۱۶	۹۵۴٫۹۶۸ / م ـ ب
۱۷	بُستان آصفیہ ساتویں جلد	سنہ ۱۹۳۳ء	چشتی القادری پریس	؍	۳۷۴	؍	؍ ۱۹۱۸	موجود نہیں

جو کتابیں اوپر درج کی گئی ہیں انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) تاریخی کتابیں اور (۲) اخلاقی کتابیں۔ تاریخی کتابوں میں بُستان آصفیہ کی سات جلدیں، خیابان آصفی اور مرہٹوں کا تمدن شامل ہیں۔ اخلاقی کتابوں میں تفریح الحیات، امیرانہ اور غریبانہ زندگی، راجہ اشوک کا جیون چرتر، وید و نیتی، اقوال بودھ، دستور حکمرانی، مفید الخواتین اور حالات و مقالات سقراط

شریک ہیں۔ آئندہ صفحات میں ہر گروپ کی مختلف کتابوں کے مواد کی تشریح کی جائے گی جس سے اس مقالہ کے قارئین کو ان کی ماہیت اور افادیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

(۴) بستان آصفیہ پہلی جلد

حیدرآباد دکن کے اُردو تاریخی ادب میں یہ کتاب ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ گو کہ یہ ۱۹۰۹ء میں شایع ہوئی مگر اس کے مواد کی فراہمی میں پنڈت جی چھ سات سال پہلے سے مسلسل مصروف تھے اور اس کی ترتیب میں انہیں بہت دقتیں اٹھانا پڑیں کیونکہ انھوں نے "اکثر تاریخوں کو پیش نظر رکھ کر جو مختلف زبانوں میں دکن کے متعلق لکھی گئی ہیں ایک ایسی تاریخ لکھنے کی کوشش کی ہے جو اپنے موضوع کے لحاظ سے ان سب تاریخوں سے الگ اور ممیز ہے۔ عام طور پر جو باتیں اور جو واقعات تاریخوں میں لکھے جاتے ہیں انھوں نے صرف انہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان کے علاوہ ان باتوں کو بھی ضبط تحریر میں لایا ہے جن کو بلند پایہ مورخ ہیچ اور ناقابل التفات سمجھ کر ضبط تحریر میں لائے بغیر چھوڑ دیتے ہیں۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ کسی ملک کے متعلق ایسی باتوں اور معلومات کا فراہم کرنا جن کو واقعات کے طور پر تاریخ کے صفحات میں درج ہونے کی عزت نہ حاصل ہوئی ہو کس قدر کٹھن اور دشوار امر ہے۔"

یہ کتاب جملہ چھ ابواب اور (۴۴) فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں پانچ، دوسرے میں آٹھ، تیسرے میں گیارہ، چوتھے اور پانچویں میں آٹھ آٹھ اور چھٹے میں چار فصلیں ہیں۔ ذیل میں ان ابواب اور فصلوں کے مواد کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

پہلا باب اس باب کی پہلی فصل میں ملک کے جغرافیہ، جائے وقوع، حدود اربعہ، طبعی حالات، دریا۔ تالاب، پہاڑ۔ آب و ہوا۔ پیداوار۔ معدنیات صنعت و حرفت اور تجارت وغیرہ کے مختصر حالات بیان کیے گئے ہیں۔ مزید برآں صرف خاص مبارک، جاگیرات اور دیوانی کے علاقوں کی صراحت کی گئی ہے۔

دوسری فصل میں قطب شاہیوں کے حالات پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ فصل کے آخر میں قطب شاہی حکمرانوں کے نام، تاریخ ولادت، تاریخ جلوس، تاریخ وفات، مدت حکومت اور مدت عمر کی صراحت کی گئی ہے اور ان کا ایک شجرہ بھی دیا گیا ہے۔

تیسری فصل خاندان آصفی کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ نواب نظام الملک آصف جاہ کے دکن میں مستقلاً آجانے کے بعد سے نواب میر محبوب علی خاں مرحوم کے دور تک کے حالات پیش کیے گئے ہیں۔ سلطنت کے معاملات میں ابتداً فرانسیسیوں اور اس کے بعد انگریزوں کی مداخلت اور ان کی قوت میں اضافہ اور استحکام کی تفصیل دی گئی ہے۔ فصل کے آخری حصہ میں نواب میر محبوب علی خاں مرحوم کے عہد کے مختلف حالات بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ اس حصے کی اکثر باتیں ایسی ہیں جو دوسری جگہ شاید ہی یکجا مل سکیں۔ دولت آصفیہ کے فرماں رواؤں کا ایک نقشہ نواب نظام الملک اول کے زمانہ سے لے کر نواب میر محبوب علی خاں مرحوم کے دور تک، نام، تاریخ ولادت، تاریخ جلوس، تاریخ وفات، مدت حکومت اور مدت عمر کی وضاحت کے ساتھ دیا گیا ہے۔ نیز ایک شجرہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

چوتھی فصل میں صرف خاص مبارک کی تاریخ دی گئی ہے۔ اس کے پڑھنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ صرف خاص مبارک کا علاقہ کب اور کن حالات کے تحت دیوانی کے علاقہ سے علیحدہ ہوا۔ اس کے بعد اس کی تنظیم کے سلسلہ میں نواب میر محبوب علی خاں مرحوم کے دور حکومت تک کس قسم کی تبدیلیاں کی گئیں۔

پانچویں فصل میں نواب نظام الملک اول کے زمانہ سے نواب میر محبوب علی خاں مرحوم کے عہد حکومت تک جتنے مدار المہام او پیشکار گذرے ہیں ان سب کی مختصر سوانح عمریاں دی گئی ہیں۔ فصل کے آخر میں تمام مدار المہاموں کا ایک نقشہ نام۔ تاریخ ولادت۔ تاریخ سرفرازی۔ تاریخ سبکدوشی مدت مدار المہامی۔ اور مدت عمر کی صراحت کے ساتھ دیا گیا ہے۔ پنڈت جی نے اس امر کی

صراحت کی ہے کہ اس فصل کی ترتیب میں مختلف تاریخی کتابوں کی غلطیوں کی تصحیح کی گئی لہذا ان کا پیش کردہ مواد زیادہ صحیح ہونا چاہئیے ۔ مدارالمہاموں کے تختہ کی طرح پیشکاروں کا بھی ایک تختہ دیا گیا ہے ۔

دوسرا باب اس باب کی پہلی فصل میں محکمۂ فینانس کی ابتداء ۔ تغیرات اور تبدیلیوں کا ذکر ۱۹۰۸ء تک کیا گیا ہے ۔ فصل کے آخر میں محکمۂ فینانس کے معتمدین کے نام ۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۸ء تک دیے گئے ہیں ۔ تاریخ تقرر اور تاریخ علحدگی کی صراحت بھی کی گئی ہے ۔ ۱۹۰۶ء میں محکمۂ فینانس کے اخراجات کا ایک تختہ بھی دیا گیا ہے ۔

دوسری فصل میں دفتر محاسبی کی ابتدا اور اس کے انتظامی تغیرات کی مختصر تاریخ ۱۹۰۸ء تک دی گئی ہے ۔ آخر میں صدر محاسبوں کے نام کا ایک تختہ ۱۸۹۱ء سے ۱۹۰۸ء تک دیا گیا ہے ۔ ۱۹۰۶ء میں محاسبی کے مدات خرچ کا بھی ایک تختہ پیش کیا گیا ہے ۔

تیسری فصل میں حیدرآباد کے قدیم اور جدید سکوں کی تاریخ دی گئی ہے ۔ قدیم سکوں میں لیتین شاہی ۔ گوبند بخشی ، بہادر شاہی ، اکبری ، عالمگیری ، شاہجہانی ، سکندر حلینی ، ناصر حلینی ، ارکاٹی ، گدوالی ، مدووری ، یلاریڈی ، گرمٹکالی ، بیپلاپوری ، منڈاکی ، دولت آبادی ، گوپال پیٹھ ، اندور ، چاندور ، نارائن پیٹھ ، ناگپور ، سگور ، والیے گاپل ، امراوتی ، باغ حلینی ، شہر حلینی ، سری سکہ ، طرہ ، توکا ، زری پٹکہ ، ترنامل ، صورتی یا چہرہ شاہی کلمہ یا اکبری ، ننتھی ، ترسولی ، دوونڈی ، پیپل ناری اور ذوالفقاری کے مختصر حالات دیے گئے ہیں ۔ حیدرآباد میں حالی سکہ کی ابتدا اور اس کے تغیرات کی مختصر کیفیت ۱۹۰۸ء تک دی گئی ہے ۔

چوتھی فصل میں خزانۂ عامرہ سرکار عالی کی تاریخ اس کے قیام سے لے کر ۱۹۰۲ء تک دی گئی ہے ۔ اس محکمہ کے مہتمموں ، مددگاروں اور خزانہ داروں کی بھی ایک فہرست ۱۹۰۲ء تک دی گئی ہے ۔ مزید برآں عہدہ داروں کی تاریخ تقرر ، تاریخ علحدگی اور لیاقت کی

بھی صراحت کی گئی ہے ۔

پانچویں فصل میں ریلوں کی مختصر تاریخ دی گئی ہے ۔ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں سب سے پہلی ریل کب اور کہاں جاری ہوئی ۔ ہندوستان میں ریلوں کی ابتدا کب ہوئی۔ حیدرآباد میں ریلوں کی ضرورت کو کب محسوس کیا گیا ۔ یہاں پہلی ریل کب جاری کی گئی ۔ اس کے بعد ۱۹۰۸ء تک وقتاً فوقتاً کونسی ریلیں جاری کی گئیں ۔ ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد میں ریلوں کا جملہ میلا نہ کیا تھا ، اس کے علاوہ ۱۹۰۶ء میں محکمہ ریل کے اخراجات کا تختہ دیا گیا

چھٹی فصل نہایت مختصر ہے ۔ اس میں حیدرآباد کی بعض معدنی اشیا ، مثلاً کوئلہ ، لوہا اور تانبا وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے ۔ یہ مواد بہت سطحی ہے ۔

ساتویں فصل میں تعمیرات اور آبپاشی کے حالات دیے گئے ہیں ، محکمۂ تعمیرات کا قیام کب ہوا اور ۱۹۰۶ء تک اس میں کیا تبدیلیاں ہوئیں ان کی تفصیل دی گئی ہے ۔ ۱۹۰۶ء میں اس محکمہ کے اخراجات کا ایک تختہ بھی دیا گیا ہے ۔

آٹھویں فصل میں ممالک محروسۂ سرکار عالی کے حقیقی مدات آمدنی اور خرچ کے تختے دیے گئے ہیں ۔ صرف اعداد شمار پر اکتفا کیا گیا ہے کسی قسم کی تشریح یا تنقید یا رائے موجود نہیں ۔

تیسرا باب اس باب کی پہلی فصل میں معتمدی عدالت وکوتوالی وامور عامہ کے مختصر تاریخی حالات دیے گئے ہیں ۔ ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۷ء تک تاریخ تقرر وغیرہ کی صراحت کے ساتھ مختلف معتمدوں کے ناموں کا ایک تختہ دیا گیا ہے ۔

دوسری فصل میں دیوانی اور فوجداری اور دوسری عدالتوں کی سرگذشت دی گئی ہے ۔ ایک طویل فہرست ان اصحاب کی دی گئی ہے جو مارچ ۱۹۰۸ء کے جریدہ کی رو سے حاضری عدالت سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے تھے ۔

اسی فصل کے آخر میں امتحان وکالت اور جوڈیشل کی تفصیلات دی گئی ہیں مختلف

سنوں میں وکالت کے امتحان میں جو امیدوار کامیاب ہوتے رہے ان کی فہرست تعداد کے لحاظ سے دی گئی ہے۔

تیسری فصل میں کوتوالی بلدہ اور کوتوالی اضلاع کی تاریخ دی گئی ہے۔ حیدرآباد کے کوتوالوں کی فہرست نواب نظام الملک اول کے زمانے سے میر محبوب علی خاں مرحوم کے عہد تک دی گئی ہے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں کوتوالی بلدہ اور کوتوالی اضلاع کے اخراجات کے تختے دیے گئے ہیں۔

چوتھی فصل میں حیدرآباد کے مختلف جیل خانوں اور دارالطبع سرکار عالی کی تاریخ ملتی ہے۔ پانچویں فصل میں کاغذ مہور کی ابتدا اور تبدیلیوں کے حالات درج ہیں۔ چھٹی فصل میں محکمہ رجسٹریشن کی مختصر تاریخ دی گئی ہے۔ ساتویں فصل محکمہ صفائی، آٹھویں صدر عدالت العالیہ اور نویں ٹپے اور تار کی تاریخوں سے متعلق ہے۔ ان سب فصلوں میں زیادہ تر سنہ ۱۹۰۶ء اور سنہ ۱۹۰۰ء تک کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور مدات خرچ کے تختے بھی دیے گئے ہیں۔

دسویں فصل میں حیدرآباد میں محکمہ تعلیمات کی تاریخ دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی اداروں کی مختصر تاریخ دی گئی ہے مثلاً مدرسہ عالیہ، حیدرآباد کالج، نظام کالج، سٹی ہائی اسکول، انجنیرنگ کالج، چادرگھاٹ اسکول، زنانہ اسکول، نارمل اسکول، مدرسۂ نظامیہ، مدرسۂ اعزہ، مدرسۂ مفید الانام، دھرم ونت اسکول، گرامر اسکول وغیرہ کی تاریخ دی گئی ہے۔ فصل کے آخر میں سنہ ۱۸۸۱ء۔ سنہ ۱۸۹۱ء اور سنہ ۱۹۰۱ء میں محکمہ تعلیمات کے اخراجات دیے گئے ہیں۔ اسی طرح سنہ ۱۸۷۱ء سے ۱۹۰۷ء تک سنہ واری، طلباء کی تعداد دی گئی ہے۔ مزید برآں سنہ ۱۸۷۹ء سے ۱۹۰۷ء تک مڈل، میٹرک، ایف۔ اے۔ اور بی۔ اے کامیاب طلباء کی سال واری تعداد بتائی گئی ہے۔ منشی، منشی فاضل، منشی عالم، مولوی، مولوی فاضل اور مولوی عالم کامیاب طلباء کی تعداد

سنوں کی تفصیل کے ساتھ سنہ ۱۸۹۰ء تا سنہ ۱۹۰۰ء دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں سنہ ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد میں محکمہ تعلیمات کی منظورہ تعطیلات کی ایک فہرست دی گئی ہے۔

گیارھویں فصل میں محکمۂ طبابت کے حالات دیے گئے ہیں۔ قدیم یونانی علاج کی نوعیت اور جدید ڈاکٹری کی ابتدا اور ترقی کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ سنہ ۱۸۴۶ء سے سنہ ۱۹۰۱ء تک حیدرآباد میں جتنے مڈیکل افسر گذرے ہیں ان کے ناموں کی فہرست تاریخ تقرر کی وضاحت کے ساتھ دی گئی ہے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں محکمہ طبابت کے اخراجات بھی بتائے گئے ہیں۔

چوتھا باب اس باب کی پہلی فصل میں مالگذاری، دوسری میں کروڑگیری، تیسری میں کورٹ آف وارڈس، چوتھی میں سررشتۂ انعام اور پانچویں میں بندوبست کی تاریخ دی گئی ہے۔ چھٹی فصل میں جنگلات، ساتویں میں آبکاری اور آٹھویں میں افیون کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے ابواب کے مقابل یہ باب بہت چھوٹا ہے اور اسی لحاظ سے فصلوں کی وسعت بھی بہت محدود ہے۔ عموماً سنہ ۱۹۰۰ء اور سنہ ۱۹۰۱ء تک کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مختلف محکموں کے مدات خرچ کی بھی تفصیل دی گئی ہے۔

پانچواں باب اس باب کی پہلی فصل میں حیدرآباد کی مختلف فوجوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ دوسری فصل میں دفتر ملکی تیسری میں ٹیلیفون اور چوتھی میں سنہ فصلی کے آغاز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچویں فصل میں سنہ ۱۸۸۱ء، سنہ ۱۸۹۱ء اور سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماریوں کے اعداد دیے گئے ہیں۔ چھٹی فصل بڑی دلچسپ ہے۔ اس میں حیدرآباد کی مختلف تعطیلات کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ کونسی تعطیل کن کن ... کے تحت کس وقت سے دی جانے لگی اور کونسی تعطیلات وقتاً فوقتاً منسوخ ہوئیں۔

ساتویں فصل میں ان مختلف خطابوں کی قسمیں بیان کی گئی ہیں جو وقتاً فوقتاً آصفی حکمرانوں کی جانب سے دیے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً خان، خان بہادر، جنگ، دولہ، ملک،

خان دوران، سلطنۃ، امیر کبیر، جاہ - راجہ - راجہ بہادر - پال - ونت - مہاراجہ - رانی ـــــ وغیرہ - سنہ ۱۸۴۷ء سے لے کر سنہ ۱۸۸۲ء تک جو اصحاب خطابات سے سرفراز ہوئے ان کے نام سنہ اور تاریخ کی صراحت کے ساتھ دیے گئے ہیں -

آٹھویں فصل میں سنہ ۱۸۷۵ء سے لیکر سنہ ۱۹۰۸ء تک ایسے لوگوں کی فہرست دی گئی ہے جن پر عتاب ہوا اور جو تادیباً شہر بدر کر دیے گئے -

چھٹا باب اس باب کی پہلی فصل میں رزیڈنسی کی تاریخ پیش کی گئی ہے - سنہ ۱۷۷۹ء سے سنہ ۱۹۰۸ء تک حیدرآباد میں جس قدر رزیڈنٹ آچکے تھے ان سب کے نام آنے اور جانے کی تاریخوں کی صراحت کے ساتھ دیے گئے ہیں -

دوسری فصل میں حیدرآباد میں یورپی شہزادوں اور ہندوستان کے وائسرایوں کی آمد و رفت کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں - اس میں سنہ ۱۸۶۳ء سے سنہ ۱۹۰۸ء تک کا مواد دیا گیا ہے -

تیسری فصل میں سرکار عالی اور سرکار عظمت مدار کے مابین سنہ ۱۸۶۹ء تک وقتاً فوقتاً جو معاہدات ہوتے رہے ان کی صراحت کی گئی ہے - چوتھی فصل میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ کس طرح برار کا زرخیز علاقہ رفتہ رفتہ ہمیشہ کے لیے انگریزوں کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا -

(۵) بُستان آصفیہ دوسری جلد

پہلی اور دوسری دونوں جلدیں ایک ساتھ شایع ہوئیں اور مجلد صورت میں ایک ساتھ فروخت ہوتی ہیں - مجموعی طور پر دونوں جلدوں کے ۸۳۲ صفحات ہیں - پہلی جلد ۵۴۰ صفحات پر مشتمل ہے اور دوسری میں ۲۹۲ صفحات ہیں -

دوسری جلد میں تین باب اور (۲۳) فصلیں ہیں - پہلے باب میں ۹، دوسرے اور تیسرے میں سات سات - ذیل میں ہر باب کے مواد پر فصل واری روشنی ڈالی جاتی ہے -

پہلا باب اس باب کی پہلی فصل میں دکن کے قدیم راجاؤں اور بادشاہوں کے حالات دیے گئے ہیں۔ اصولاً یہ مواد پہلی جلد کے پہلے باب کی دوسری فصل کے ابتدائی حصے میں دیا جانا چاہئے تھا لیکن مواد کی فراہمی میں دقتوں کی وجہ سے وہاں پیش نہیں کیا جا سکا۔

دوسری فصل میں خاندان پائیگاہ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ ابوالخیر خاں شمشیر بہادر ۔ ابو الفتح خاں شمس الامرا اول ۔ شمس الامرا ثانی ۔ شمس الامرا ثالث ۔ امیر کبیر اول۔ امیر کبیر ثانی اور امیر کبیر ثالث کی سوانح عمریاں دی گئی ہیں۔

تیسری فصل میں نواب خورشید جاہ شمس الامرا خامس کی سوانح عمری بیان کی گئی ہے۔

چوتھی فصل میں نواب سرآسماں جاہ کے حالات دیے گئے ہیں۔ پانچویں فصل میں نواب اقبال الدولہ اور چھٹی میں نواب شمس الملک ظفر جنگ کے حالات پیش کیے گئے ہیں۔

ساتویں فصل نواب سرسالار جنگ اول کے خاندانی حالات سے متعلق ہے۔ اس میں سالار جنگ اول ۔ سالار جنگ ثانی ۔ اور نواب سالار جنگ بہادر ثالث کے حالات دیے گئے۔

آٹھویں فصل میں حیدرآباد کے پیش کاروں کے حالات بیان کیے گئے ہیں ۔ راجہ چندو لعل ۔ راجہ رام بخش ۔ مہاراجہ نرائن پرشاد راجہ نرندر بہادر اور مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنتہ کے حالات زندگی تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں فصل کے آخر میں پیش کاروں کے خاندان کا ایک مکمل شجرہ بھی موجود ہے۔

نویں فصل میں مختلف سمستانوں مثلاً امرچنتہ، گدوال ۔ جٹپول ۔ پالونچہ ۔ ونپرتی اناگوندی ۔ گرکنٹہ اور گوپال پیٹھ کے مختصر واقعات درج ہیں۔

دوسرا باب اس باب کی پہلی فصل میں حیدرآباد دکن کے مناظر اور مختلف عمارتوں کے حالات دیے گئے ہیں۔ مثلاً قلعہ گولکنڈہ ۔ قلعہ سرونگر ۔ پرانا پل ۔ چادرگھاٹ کا پل۔

افضل گنج کا پل، مسلم جنگ کا پل، چار مینار، چار کمان، گلزار حوض، چار محل، پرانی حویلی، گوشہ محل، فلک نما محل سرور نگر، چندو لعل کی بارہ دری، محل یوسف آباد، سردار دیلا، جیل، توپ کا سانچہ، آسمان گڑھ، مکہ مسجد، چوک کی مسجد، مسجد افضل گنج، جامع مسجد، پرانی اور نئی عید گاہ، شاہی عاشور خانہ، تالاب حسین ساگر، تالاب میر جملہ، تالاب میر عالم عثمان ساگر، سرور نگر کا تالاب، باغ عامہ، لنگم پلی کا باغ، باغ جہاں نما، بشیر باغ، فتح میدان گھنٹہ گھر، چوک کا گھنٹہ ـــــ وغیرہ ان سب کے مختصر تاریخی حالات بیان کیے گئے ہیں۔

دوسری فصل میں حیدر آباد کے مختلف کتب خانوں، انجمنوں کلبوں کے حالات دیے گئے ہیں۔ مثلاً، انڈیا لائبریری۔ حیدر آباد کلب۔ سائکل کلب۔ ینگ منس امپرومنٹ سوسائٹی۔ دار التفریح۔ انجمن نظامیہ۔ انجمن عثمانیہ۔ انجمن ثمرۃ الادب۔ انجمن خرد افروز۔ انجمن ترقی علوم قدیمہ۔ ینگ منس ویٹنگ روم لائبریری۔ اقبال کلب۔ عثمانیہ ریڈنگ روم لائبریری۔ انجمن اصلاح خیالات۔ انجمن اتفاق دکن۔ دائرۃ المعارف۔ کتب خانۂ آصفیہ۔ انجمن ترجمہ علوم و فنون۔ انجمن تدوین اہل بیت۔ انجمن حجاز ریلوے۔ مجلس مواخاۃ المسلمین۔ انجمن معیار العلوم۔ انجمن اردو۔ انجمن سرمایہ تعلیمی۔ انجمن اصلاح تمدن۔ افتخار دکن۔ انجمن معین المسلمین معہ قرضہ حسنہ وغیرہ کے حالات اس فصل میں ملتے ہیں۔ فصل کے آخر میں ایک تختہ دیا گیا ہے جس میں حیدر آباد کے بعض کتب خانوں مثلاً کتب خانۂ آصفیہ۔ کتب خانہ سردار الحکما مولوی محبّ حسین صاحب۔ کتب خانۂ شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی، عثمانیہ ریڈنگ روم۔ مجلس عدالت العالیہ۔ کتب خانۂ مولوی چراغ علی اعظم یار جنگ اور کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر میں اردو فارسی عربی کی جو کتابیں ہیں ان کی فن وار تعداد دی گئی ہے۔ اسی طرح ینگ منس امپرومنٹ سوسائٹی کے کتب خانہ، کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ سید علی بلگرامی اور کتب خانۂ نواب سالار جنگ بہادر میں جو انگریزی کتابیں ہیں ان کی بھی فن وار تعداد دی گئی ہے۔ سب سے آخر میں (۴۰) انگریزی

کتابوں کے نام درج کیے گئے ہیں جن کا تعلق حیدرآباد کی تاریخ سے ہے ۔ یہ فصل بھی مجموعی طور پر بہت مفید معلومات پیش کرتی ہے ۔

تیسری فصل میں حیدرآباد کے مختلف اخباروں اور رسالوں کے تاریخی حالات دیئے گئے ہیں ۔ اخبار شفق ۔ شوکت الاسلام ۔ ہزار داستان ۔ اخبار آصفی ۔ افسر الاخبار ۔ سفیر دکن ۔ سیدالاخبار ۔ محبوب القلوب ۔ ملک و ملت ۔ نظارۂ عالم ۔ جام جمشید ۔ عزیز الاخبار ۔ حیدرآباد دکھنی ۔ جلوۂ محبوب ۔ علم و عمل ۔ محبوب گزٹ ۔ المحبوب ۔ دکن پنچ ۔ مشیر دکن ۔ مظلوم دکن ۔ جریدہ اعلامیہ ۔ پولیس گزٹ ۔ رسالہ طبابت ۔ معلم شفیق ۔ ادیب ۔ فنون ۔ حسن ۔ الحقائق ۔ معلم ۔ معلم نسواں ۔ سحر بیان ۔ منتخب روزگار ۔ افسر ۔ دلگداز ۔ پیام محبوب ۔ شمس الکلام ۔ دبدبہ آصفی ۔ ٹیکل جرنل ۔ محبوب الکلام ۔ نسیم دکن ۔ افسانہ ۔ دکن ریویو ۔ الہادی ۔ صحیفہ ۔ مذاق سخن ۔ خیال محبوب یا محبوب عالم ۔ مخزن الفواید ۔ ادیب قانونی ۔ مقنن دکن ۔ آئین دکن ۔ تشریح القوانین ۔ تکمیل الاحکام ۔ مراۃ قوانین ۔ رسالہ مالگذاری ـــــ ان سب کے متعلق تاریخی واقعات اس فصل میں ملتے ہیں ۔ جو لوگ حیدرآباد کے قدیم رسالوں اور اخباروں کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیں ان کے لیے شاید ہی کسی دوسری کتاب میں اتنا مواد یکجا مل سکے ۔ فصل کے آخر میں انگریزی اخباروں کے نام ۔ تاریخ اجرائی ۔ تاریخ موقوفی اور ایڈیٹروں کے نام کی صراحت کا ایک تختہ دیا گیا ہے ۔ ان اخباروں میں دکن ٹائمس ۔ حیدرآباد ٹیلیگراف ۔ حیدرآباد رکارڈ ۔ دکن اسٹانڈرڈ ۔ دکن بجٹ ۔ دکن میل ۔ حیدرآباد کرانیکل ۔ دکن ٹائمس ۔ دکن پوسٹ ۔ بلیٹن ۔ دکن ہیرلڈ ۔ دکن گزٹ کے نام درج ہیں ۔

چوتھی فصل میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ حیدرآباد میں قانون تحفظ حقوق تصنیف و تالیف کا نفاذ کب سے ہوا ۔ پنڈت جی نے بتایا ہے کہ یہ قانون جولائی سنہ ۱۸۹۰ء میں نافذ ہوا چنانچہ سنہ ۱۸۹۰ء سے سنہ ۱۹۰۸ء تک اس قانون کے تحت جتنی کتابوں کی

رجسٹری کی گئی ان سب کی فن وار فہرست دی گئی ہے۔ پنڈت جی نے یہ بڑا ہی مفید کام کیا ہے کیونکہ اس کی بدولت مختلف علوم کے محققوں کو بہت مدد ملتی ہے۔ اس فہرست میں قانون کی (۹۱) تقویم کی (۲۰) لغت کی (۳) درسی (۳۵) طب کی (۱۴) ناول و ناٹک کی (۱۵) تاریخ کی (۹) دیوان کی (۵) حساب کی (۴) فقہ کی (۷) انشاء کی (۳) اخلاق کی (۶) متفرق (۵۱) اور تلنگی و مرہٹی (۱۳) کتابوں کے نام درج ہیں:۔

پانچویں فصل میں پنڈت جی نے ایک اور مفید کام پیش کیا ہے۔ اس میں فارسی۔ اردو۔ مرہٹی اور ہندی ایسی تاریخی کتابوں کے نام دیے ہیں جو یا تو براہ راست حیدرآباد دکن سے تعلق رکھتی ہیں یا جن میں حیدرآباد کے حالات کا ضمنی ذکر ملتا ہے۔ مولف یا مصنف اور سنہ طباعت کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ اس فصل میں جملہ (۱۰۷) کتابوں کے نام حروف تہجی کی ترتیب کے لحاظ سے دیے گئے ہیں۔

چھٹی فصل میں حیدرآباد کے مختلف قدیم کارخانوں کے حالات دیے گئے ہیں۔ کارخانہ قاسم صاحب بارہ گلی۔ کارخانہ توپ۔ صدر اسبار خانہ ورکشاپ۔ دارالصنائع۔ بندوقوں کا اسٹور چندولال کی بارہ دری کے قریب۔ کارخانہ صنعت ہند۔ بنک آف بنگال۔ بکنگ کمپنی۔ پامر کمپنی۔ گولکنڈہ برف کا کارخانہ۔ حیدرآباد اسپننگ اینڈ ویونگ کمپنی۔ کارخانہ کاغذ بالاپور۔ کارخانہ شال بافی گولکنڈہ۔ فلور مل۔ کارخانہ شکر وغیرہ۔ کے قیام کے مختصر حالات دیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کارخانوں کی کاروباری نوعیت مثلاً مزدوروں کی تعداد۔ پیداوار کی نوعیت اور مقدار۔ سرد بازاری یا گرم بازاری کے ان کارخانوں پر اثرات۔ کارخانوں کو حکومت کی امداد۔ مقامی مصنوعات کی برآمد۔ اسی قسم کے مال کی باہر سے درآمد۔ مقابلہ کی نوعیت اور دقتوں وغیرہ کا بھی مختصر ذکر کیا جاتا تو بہت مفید ہوتا۔

اسی فصل کے آخر میں لائف انشورنس یعنی جان کے بیمے کی بہت مختصر تاریخ دی گئی ہے۔

سب سے آخر میں مختلف کارخانوں کی ایک فہرست دی گئی ہے جو نواح حیدرآباد میں ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۸ء میں واقع تھے۔

ساتویں فصل میں قدیم مذہبی میلوں۔ کھیل تماشوں اور رسموں کے متعلق مفید معلومات دی گئی ہیں۔ بی بی کے علم۔ نعل صاحب۔ حسینی علم۔ مولا کے عرس۔ قدم رسول۔ بی بی کے چشمہ۔ تاڑبن کے علم۔ سنگیسر کی باؤلی کے علم۔ کرمن گھٹ۔ رام باغ۔ کیشوگری۔ دیول جھام سنگھ۔ دیول جلل گوڑہ۔ دیول کشن باغ۔ دیول راجہ مرلی دھر۔ دیول سیتا رام باغ۔ دیول لچھمن باغ۔ جنم اشٹمی کے میلہ۔ ناگ پنچمی کے میلہ۔ اشٹمی کے میلہ۔ پیٹلہ برج کے میلہ۔ الوال کی جاترا۔ راج باغ کے میلہ وغیرہ کے متعلق ایسی دلچسپ اور پُر از معلومات باتیں بیان کی گئی ہیں جو دوسری جگہ شاید ہی اس طرح یک جا مل سکیں۔ فصل کے آخر میں حیدرآباد کے مختلف عرسوں اور جاتراؤں کا ایک تختہ دیا گیا ہے۔

تیسرا باب اس باب کی پہلی فصل میں یتیم خانہ وکٹوریہ میموریل فنڈ کے تاریخی حالات دیے گئے ہیں۔ دوسری فصل میں مختلف دفتروں کے قیام اور شکست کی مختصر کیفیت بیان کی گئی ہے۔ تیسری فصل میں ۱۸۰۱ء تا ۱۹۰۹ء حیدرآباد کے مشہور لوگوں کی موت کے حالات نوعیت مرض۔ ایام مرض اور تاریخ موت کی صراحت کی گئی ہے۔ مشہور لوگوں کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۱۔ مرشد زادے۔ ۲۔ امراء اور روساء ۳۔ عہدہ دار ۴۔ اہل سیف ۵۔ علماء و مشائخ اور اہل اللہ ۶۔ حکیم ۷۔ شعرا۔ ۸۔ متفرق۔ اس قسم کے مواد کا کسی اور کتاب میں یکجا ملنا مشکل ہے۔ پنڈت جی یہ مواد بہ آسانی اور بالتفصیل اسی وجہ سے پیش کر سکے کہ وہ اپنی عمر کے بہت ابتدائی زمانے سے روزنامچہ لکھنے کے عادی چلے آئے ہیں۔

چوتھی فصل میں ۱۸۷۵ء تا ۱۹۰۸ء حیدرآباد کے اہم اہم مختلف واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ نمونے کے طور پر چند واقعات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں: ۱۸۷۶ء میں تنخواہ

نہ ملنے کی وجہ سے سپاہیوں نے صمصام الملک مدار المہام پر حملہ کیا۔ سنہ ۱۸۱۱ء میں ایک دُم دار ستارہ شمال مغرب سے نمودار ہوا اور کامل ایک ماہ تک طلوع کے وقت سے ۸ بجے رات تک دکھائی دیتا رہا۔ سنہ ۱۸۳۶ء میں دوپہر کے قریب حسین یار جنگ کے مکان پر عربوں اور افغانوں میں جھگڑا ہوا۔ اس خبر کا بلدہ میں پھیلنا تھا کہ تمام عربوں نے فساد برپا کر دیا اور بہت سے مقتول و مجروح ہوئے۔ یکم جنوری سنہ ۱۸۶۲ء کو شب کے بارہ بجے نہایت شدید زلزلہ شہر میں محسوس ہوا۔ ساتھ ہی ایک شعلہ فشاں ستارہ بھی مشرق سے نمایاں ہوا۔ اس کا دو ڈھائی گز کا طول تھا۔ وہ وسط آسمان پر پہنچ کر ایک مہیب آواز کے ساتھ پھٹا۔ اس میں سے تارہ منڈل کی طرح چند شعلے نکلتے ہوئے دکھائی دیئے اور مغرب کی سمت میں تھوڑے فاصلے پر پہنچ کر غائب ہو گئے۔ پھر آسمان پر روشنی اور زمین کو حرکت ہوئی یہ سب باتیں آدھے گھنٹے تک ہوتی رہیں۔ ۳۰ جون سنہ ۱۸۶۲ء سے شہر حیدرآباد میں سخت ہیضہ شروع ہوا۔ اس سے بہت لوگ ضائع ہوئے۔ ۹ مارچ سنہ ۱۸۶۶ء کو قصاص گاہ میں جلاد نے ایک خونی سائیس کو (۱۲) ہاتھ لگایا مگر اس کی گردن نہ کٹ سکی۔ ۲۸ نومبر سنہ ۱۸۹۵ء کو مولوی یوسف الدین صاحب صوبہ دار گلبرگہ رشوت دہی کے مقدمہ میں گرفتار ہوئے اور مقدمہ پریوی کونسل تک پہنچا۔ ۱۰ اپریل سنہ ۱۹۰۵ء کو شام کے ۵ بجے ایک ٹڈی دل آیا اور عرصہ تک رہا۔ زراعت اور باغات کو اس سے سخت نقصان پہنچا۔ اسی قسم کے اور بہت سے واقعات دیے گئے ہیں۔ پانچویں فصل میں ان مختلف احکامات کا ذکر کیا گیا ہے جو حکومت کی جانب سے سنہ ۱۸۰۰ء تا سنہ ۱۹۰۷ء نظم و نسق کے سلسلہ میں جاری کیے گئے۔ چھٹی فصل میں سنہ ۱۳۹۶ء، سنہ ۱۶۵۹ء، سنہ ۱۶۸۵ء، سنہ ۱۷۱۳ء، سنہ ۱۷۸۰ء، سنہ ۱۷۹۲ء، سنہ ۱۸۰۴ء، سنہ ۱۸۱۳ء، سنہ ۱۸۳۳ء، سنہ ۱۸۴۶ء، سنہ ۱۸۵۴ء، سنہ ۱۸۶۷ء، سنہ ۱۸۷۰ء، سنہ ۱۸۹۵ء، سنہ ۱۸۹۶ء، اور سنہ ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد میں جو قحط ہوئے ان کے نہایت مختصر حالات بیان کیے گئے ہیں۔ ساتویں فصل میں موسیٰ ندی کی مختلف طغیانیوں کے حالات سنہ ۱۶۳۰ء سے سنہ ۱۹۰۸ء تک بیان

کیے گئے ہیں۔ بالخصوص ۱۹۰۸ء کی طغیانی کے حالات زیادہ تفصیل سے درج ہیں۔

کتاب کے آخری حصے میں ایک ضمیمہ بھی دیا گیا ہے جس میں ایسے متفرق واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جو کتاب مکمل ہو جانے کے بعد دستیاب ہوئے۔

(۶) بستان آصفیہ تیسری جلد

بُستان آصفیہ تیسری جلد کی اشاعت کے مقصد کو پنڈت جی نے اس کے دیباچہ میں اس طرح بیان کیا ہے: "تاریخ دکن میں گذشتہ دس سال کے زمانے کو اس وجہ سے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں اعلیٰ حضرت غفران مکاں رحمتہ اللہ علیہ (نواب میر محبوب علی خاں مرحوم آصف جاہ سادس) نے رحلت فرمائی اور اسی میں سریر سلطنت آصفیہ کو اعلیٰ حضرت محی الملتہ والدین نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف جاہ سابع خسرو دکن خلد اللہ ملکہٗ نے جلوس فرما ہونے کی عزت و منزلت بخشی اور اسی میں آپ کی توجہ خسروانہ سے جامعۂ عثمانیہ اور باب حکومت اور بہت سے جدید سررشتوں کے وجود میں آنے سے ملک اور ابنائے ملک کو ترقی کے زینے پر قدم رکھنے اور مختلف انواع کی برکات حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی"

"غرض اہم واقعات اور گوناگوں ترقیات و اصلاحات کے لحاظ سے گزشتہ دس سال کا زمانہ بڑے معرکے کا زمانہ تھا۔ اگر اس کو یہ امتیازی خصوصیتیں جن کا بالاجمال اوپر ذکر کیا گیا ہے حاصل نہ ہوتیں تو مجھ کو ضرورت نہ تھی کہ میں اپنی کتاب بُستان آصفیہ کو جو اب سے دس سال پیشتر دو حصوں میں شایع ہو کر سرکاری اور غیر سرکاری طور پر خلعت قبولیت حاصل کر چکی تھی ناتمام قرار دے کر اس کے تیسرے حصے کی تدوین کی کوشش کرتا۔"

بستان آصفیہ تیسری جلد جملہ آٹھ ابواب اور (۶۶) فصلوں پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں ۶ ، دوسرے میں ۸ ، تیسرے میں ۱۱ ، چوتھے میں ۶ ، پانچویں میں ۲۱ ، چھٹے میں ۶ ، ساتویں میں ۵ ، اور آٹھویں میں ۱۲ فصلیں ہیں ۔ یہ بار پہلی اور دوسری جلدوں کے مضامین کا سلسلہ ہے ۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ اس میں سابقہ عنوانوں میں سے بعض کم کردیے گئے ہیں اور بعض کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ پہلی اور دوسری جلد کے مضامین پر پیچھے تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اگر تیسری جلد کے مضامین پر بھی اسی تفصیل سے روشنی ڈالی جائے تو بہت طوالت ہوگی ۔ پہلی اور دوسری جلدوں میں عام طور پر سنہ ۱۹۰۱ء تک کا مواد دیا گیا ہے لیکن تیسری جلد میں ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۱۹ء جو تبدیلیاں ہوئیں ان کا ذکر کیا گیا ہے یہاں پر ان جدید عنوانات کے مواد کی کسی قدر تفصیل پیش کرنا ضروری ہے جو پہلی اور دوسری جلد کے مقابل تیسری جلد میں بڑھائے گئے ۔ تیسری جلد میں جن نئے عنوانوں پر بحث کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) نخته جات عہدہ داران سیول علاقہ سرکار عالی ۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ نومبر سنہ ۱۸۸۶ء میں حیدرآباد کے سیول عہدہ داروں کی جملہ کیا تعداد تھی ۔ ان کی تنخواہیں کیا تھیں اور ان میں ہندو، مسلمان ، پارسی اور یوروپین کتنے تھے ۔ اسی طرح نومبر سنہ ۱۸۹۲ء، مئی سنہ ۱۹۰۱ء ، مئی سنہ ۱۹۱۲ء ، نومبر سنہ ۱۹۱۴ء اور مئی سنہ ۱۹۱۹ء کے متعلق بھی اس قسم کے مواد کی تفصیل دی گئی ہے ۔ فصل کے آخر سنہ ۱۸۸۶ء اور سنہ ۱۹۱۹ء کے تقابلی اعداد کا ایک نخته دیا گیا ہے ۔ یہ نخته جات باب اول پانچویں فصل میں دیے گئے ہیں ۔

(۲) سنہ ۱۹۱۱ء میں زیر نگرانی ناظم صاحب دارالضرب سررشتہ برقی قائم ہوا لہذا پانچویں باب کی پانچویں فصل میں اس کے مختصر حالات دیے گئے ہیں ۔

(۳) سنہ ۱۹۱۴ء میں زرعی انجمن ہائے امداد باہمی کے قیام کی منظوری ہوئی چنانچہ پانچویں باب کی چھٹی فصل میں ان انجمنوں کے قیام و ترقی کے مختصر حالات دیے گئے ہیں ۔

(۴) دسمبر سنہ ۱۹۱۲ء میں محکمہ زراعت قائم کرنے کی منظوری ہوئی اور ناظم زراعت کی

حیثیت سے جان کینی کا تقرر کیا گیا۔ پانچویں باب کی ساتویں فصل میں اس محکمہ کی مختصر تاریخ دی گئی ہے۔

(۵) اسی طرح آٹھویں فصل میں رصد گاہ نظامیہ، دسویں فصل میں سررشتہ مالگزاری اور گیارھویں باب سررشتہ صنعت و حرفت کے قیام اور ترقی کے مختصر حالات دیئے گئے ہیں۔

(۶) چھٹویں باب کی پانچویں فصل میں ۱۸۵۸ء سے ۱۹۱۹ء تک حیدرآباد میں وقتاً فوقتاً جس قدر طاعون ہوئے ان سب کی مختصر تاریخ دی گئی ہے۔ ہر طاعون میں جتنے افراد فوت ہوئے ان کی بھی صراحت کی گئی ہے۔

(۷) اسی باب کی چھٹی فصل میں ۱۹۱۸ء کے انفلوئنزا کی تفصیلات دی گئی ہیں۔

(۸) ساتویں فصل میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کی جنگ عظیم میں دولت آصفیہ نے کن مختلف طریقوں سے حکومت برطانیہ کو مدد دی۔

(۹) آٹھویں فصل میں محکمہ آثار قدیمہ کی تاریخ دی گئی ہے۔

(۱۰) نویں فصل میں جرائد غیر معمولی کے متعلق ایک مفید نوٹ دیا گیا ہے۔

(۱۱) بارھویں فصل میں باب حکومت کی ابتدا اور اس کے تمام اصول و ضوابط کی تفصیل دی گئی ہے۔

بستان آصفیہ کی تیسری جلد کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی اشاعت کے ذریعہ پنڈت جی نے جلد اول اور دوم کے مضامین کو ۱۹۱۹ء تک مکمل کر دیا اور بعض جدید عنوانات کا اضافہ کیا جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

(۷) بستان آصفیہ چوتھی جلد

بستان آصفیہ کی تیسری جلد کی اشاعت کے کوئی تین سال بعد اس کی چوتھی جلد شایع ہوئی۔ پنڈت جی نے اس جلد کی طباعت کے مقصد کو "عرض حال" کے تحت اس طرح

بیان کیا ہے ...... " بیاپے تحسین و آفریں کے ہمت افزا آواز سن کر قدرتی طور پر میرے دل میں مزید چونپ پیدا ہوئی۔ اور باوجود اس کے کہ اس عرصے میں خرابی صحت کے باعث میری دماغی اور جسمانی قوت مجھے جواب دے چکی تھی لیکن پھر بھی میں اپنی کوشش کو جاری رکھنے سے باز نہیں رہا۔ یعنی حصہ سوم کی اشاعت کے وقت سے اس وقت تک جو واقعات اور انتظامات رونما ہوئے تھے ان کو ایک جگہ جمع کرکے میں بستان آصفیہ میں حصہ چہارم کا اضافہ کرنے کے درپے رہا۔ پرمیشور کی کرپا اور بعض احباب کی تائید سے میں اپنی اس کوشش میں مثل سابق کامیاب ہوا اور یہ اس کامیابی کا نتیجہ ہے کہ اس وقت بستان آصفیہ کا حصۂ چہارم پبلک کے سامنے قبولیت کی امید پر پیش کر رہا ہوں ... "

تیسری جلد کی طرح بستان آصفیہ کی چوتھی جلد بھی آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ لیکن جگہ جگہ فصلوں میں مقدم و موخر کا فرق نظر آتے ہیں۔ تیسری جلد میں جملہ (۶۶) فصلیں رکھی گئی تھیں لیکن چوتھی جلد میں ان کی تعداد گھٹا کر (۴۸) کر دی گئی۔ پہلے باب میں ۵ فصل ہیں۔ دوسرے میں ۹، تیسرے میں ۱۰، چوتھے میں ۴، پانچویں میں ۷، چھٹے میں ۲، ساتویں میں ۲، اور آٹھویں میں ۹ ہیں۔ چوتھی جلد کے مضامین بہت بڑی حد تک سابقہ تین جلدوں کے مضامین کا سلسلہ ہیں۔ تیسری جلد میں عام طور پر ۱۹۱۵ء تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن چوتھی جلد میں ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۱ء جو تبدیلیاں ہوئیں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں پر ہم صرف ان عنوانات پر روشنی ڈالیں گے جو جدید طور پر چوتھی جلد میں شامل کیے گئے ہیں :-

(۱) نومبر ۱۹۱۹ء میں جو بہایم شماری ہوئی اس کے مطابق حیدر آباد میں جملہ زراعتی اور غیر زراعتی جانوروں کی تعداد کے تختے دیے گئے ہیں۔ ان تختوں کا اندراج پانچویں باب کی دوسری فصل میں ہے۔

(۲) اسی باب کی پانچویں فصل میں چاول، جوار، گیہوں مختلف قسم کی دالوں اور دوسری روزمرہ خوردنی چیزوں کی قیمتوں کے حالات ۱۸۴۱ء، ۱۸۹۴ء، ۱۹۰۱ء، ۱۹۱۲ء اور ۱۹۲۳ء کے متعلق دیئے گئے ہیں۔ تقابلی مطالعہ کے لیے یہ اعداد بہت دلچسپ اور اہم ہیں۔

(۳) آٹھویں باب کی نویں فصل میں ممالک محروسہ سرکار عالی میں مختلف سرکاری اور غیر سرکاری نمائشوں کی تاریخ دی گئی ہے۔ پنڈت جی نے بتایا ہے کہ حیدرآباد میں پہلی نمائش نومبر ۱۸۵۶ء میں بمقام چادرگھاٹ کی گئی تھی جس میں غلہ اور دوسری چیزیں رکھی گئی تھیں۔ اس کے بعد سے مارچ ۱۹۲۳ء تک وقتاً فوقتاً جو نمائشیں ہوئیں ان کا مختصر ذکر کیا گیا ہے۔

بستان آصفیہ کی چوتھی جلد کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی اشاعت کی وجہ سے ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۱ء تک کے حالات قارئین کی سہولت کے لیے یکجا ہو گئے۔ پہلی، دوسری اور تیسری جلد کے مضامین کی ۱۹۲۱ء تک تجدید ہونے کی وجہ سے ان کی افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس طرح چوتھی جلد کی اشاعت نے سابقہ جلد کے مضامین کو قدیم ہونے سے محفوظ رکھا۔

(۸) بستان آصفیہ پانچویں جلد

چوتھی جلد کی اشاعت کے کوئی تین سال بعد پانچویں جلد طبع ہوئی۔ گو کہ یہ مدت کچھ زیادہ نہیں تاہم پنڈت جی کو دکن کے متعلق کچھ نیا مواد پونا میں فراہم ہو گیا تھا لہٰذا وہ پانچویں جلد کی ترتیب کی طرف مائل ہوئے چنانچہ انہوں نے اس کی تمہید میں لکھا ہے

..... " اس سال عشرہ شریعت کی تعطیلات میں کسی مواد کی تلاش اور جستجو کی نیت سے نہیں بلکہ محض سیر و تفریح کے غرض سے مجھے پونا جانے کا اتفاق ہوا ....

علم دوست لوگوں نے وہاں ایک مجلس بھارت اتھاس سوم شودھک منڈلی، کے نام سے

قایم کر رکھی ہے ... جب تک پونا میں میرا قیام رہا میں برابر اس کی (یعنی اس مجلس کی) زیارت کرتا رہا۔ اور اس کی زیارت کے اثنا میں میری نظر سے منجملہ دوسرے قابل قدر تاریخی مواد کے بہت کچھ نادر الوجود تاریخی مواد سلطنت آصفیہ کے متعلق بھی گذرا جن کو دیکھ کر میری رال ٹپک پڑی اور جس قدر مواد کی نقل اس قلیل زمانے میں مجھ سے بن پڑی وہ کرلی۔ بالفعل اس میں سے کچھ تھوڑا سا مواد ... آصفیہ کے حصہ زیر بحث میں اردو داں پبلک کی ضیافت طبع کی غرض سے درج کیا جاتا ہے .....''

بستان آصفیہ کی تیسری اور چوتھی جلدوں میں آٹھ آٹھ باب رکھے گئے تھے لیکن پانچویں جلد میں ان کی تعداد گھٹا کر پانچ کردی گئی۔ تیسری جلد میں مجموعی طور پر ۶۶ فصلیں تھیں چوتھی میں ۸۴ لیکن پانچویں میں تو ۳۴ فصلیں رکھی گئیں۔ پہلے باب میں ۱۱ فصل ہیں۔ دوسرے میں ۹، تیسرے میں ۳، چوتھے میں ۲ اور پانچویں میں ۱۱۔ جہاں تک مواد کا تعلق ہے وہ کم و بیش اسی قسم کا ہے جو پچھلی چار جلدوں میں پایا جاتا ہے۔ پہلی اور دوسری جلد میں ۱۹۰۵ء تک کا مواد پیش کیا گیا تھا تیسری میں ۱۹۱۸ء تک تجدید کی گئی۔ چوتھی میں ۱۹۲۱ء تک کے اعداد اور حالات درج کیے گئے اور پانچویں میں مزید تین سالوں یعنی ۱۹۲۴ء تک کا مواد پیش کیا گیا۔ یہاں پر صرف ان عنوانات پر روشنی ڈالی جائے گی جو سابقہ جلدوں میں نہیں پائے جاتے۔

(۱) پہلے باب کی دوسری فصل میں دکن کی قدیم تقسیم بصراحت ضلع و پرگنہ و تعلقہ و سرکار و صوبہ دی گئی ہے۔ پنڈت جی نے اس مواد کا ماخذ بھارت ورشی مرہٹی رسالہ بتایا ہے۔ تاریخ دکن کے محققین کے لیے یہ مواد مفید ثابت ہوگا۔

(۲) دوسرے باب کی پہلی فصل میں اورنگ زیب کے عہد میں سلطنت ہند کے محاصل کا ایک تختہ دیا گیا ہے جس میں صوبہ واری آمدنی کی صراحت کی گئی ہے۔ اس کا ماخذ کاوے اتہاس سنگرہ ... کتاب بتائی گئی ہے۔

(۳) پانچویں باب کی دوسری فصل میں حیدرآباد کے مختلف قلعوں کا تاریخی مواد دیا گیا ہے۔ جن قلعوں کی تاریخ دی گئی ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔

اناگوندی۔ اندرگونڈہ۔ انتور۔ اڈونی۔ الی پور۔ بیدر۔ بھونگیر۔ بہامل میری بالکنڈہ۔ بتیس گڑھ۔ پرینڈہ۔ پانوچہ۔ [illegible]۔ دیورکنڈہ۔ رائچور۔ جگتیال۔ جعفرآباد۔ جلدرگ۔ جمالت۔ [illegible]۔ [illegible]۔ سونگل۔ سوان۔ سامان گڑھ۔ [illegible]۔ [illegible]۔ [illegible]۔ گولکنڈہ۔ [illegible]۔ میدک۔ ملیاباد۔ منصور۔ مدگل۔ نلدرگ۔ [illegible]۔ [illegible]۔ [illegible]۔ وارنگل۔ ہادگیر۔ یلگنڈل

——— ان تمام مقامات کے قلعوں کے متعلق پنڈت جی نے جو مواد دیا ہے شاید ہی کسی دوسری جگہ اس طرح یکجا مل سکے۔

(۴) کتاب کے آخری حصہ میں انھوں نے ایک اور مفید چیز پیش کی ہے۔ بستان آصفیہ کی پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی اور پانچویں جلدوں میں جس قدر عنوانات پر بحث کی گئی ہے ان سب کو ردیف ہجی کی ترتیب کے لحاظ سے اشاریہ دیا ہے۔ ہر عنوان کے آگے مختلف جلدوں کے صفحات درج ہیں۔ یہ چیز قارئین کے لیے بڑی سہولت کا باعث ہے۔

(۶) بستان آصفیہ چھٹی جلد

بستان آصفیہ کی پانچویں جلد کی اشاعت کے بعد پنڈت جی ایک طویل عرصے تک خاموش رہے۔ پانچویں جلد کو شائع ہو کر چھ سال ہو چکے تو چھٹی جلد پبلک کے سامنے پیش کی گئی۔

بستان آصفیہ کی پانچویں اور چھٹی جلدوں کے عنوانات کا مقابلہ کرنے سے مجموعی طور پر ان میں کچھ زیادہ فرق نہیں معلوم ہوتا۔ سابقہ جلدوں کی بنیاد کو برقرار رکھتے ہوئے چھٹی جلد میں عموماً ۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۰ء کا مواد دیا گیا ہے۔ اس جلد کی اشاعت کی وجہ سے

سابقہ جلدوں کا مواد پرانا ہو جانے سے محفوظ رہا اور ۱۹۳۰ء تک اس کی تجدید ہو گئی۔ سابقہ جلدوں کی طرح چھٹی جلد بھی نہایت پُراز معلومات ہے۔ چونکہ اس جلد میں تقریباً تمام قدیم عنوانات ہیں اس لیے ان کی تشریح غیر ضروری ہے۔

(۱۰) بستان آصفیہ ساتویں جلد

بُستان آصفیہ کی چھٹی اور ساتویں جلدیں ایک ساتھ شایع ہوئیں۔ دونوں کی تاریخ اشاعت مئی ۱۹۳۲ء ہے۔ ساتویں جلد کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو سابقہ چھ جلدوں سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے اور دوسری طرف ان سے بہت کچھ علٰحدہ بھی ہے۔ ملتی جلتی اس لیے کہ اس میں جتنا مواد دیا گیا ہے تقریباً سب کا سب پچھلی جلدوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ علٰحدہ اس لیے کہ اس کے مضامین میں جو ربط، تسلسل اور تنظیم پائی جاتی ہے وہ سابقہ جلدوں میں تقریباً مفقود ہے۔ ساتویں جلد کی بہتر تنظیم نے اس کی افادیت میں چار چاند لگا دیے ہیں اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بجائے خود ایک نئی کتاب ہے۔ ذیل میں اس کے مضامین کی فہرست کا خلاصہ دیا جاتا ہے جس سے اس کی ماہیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

(۱) پہلے باب میں جملہ فرماں روایانِ قطب شاہیہ، جملہ فرماں روایانِ دولتِ آصفیہ، جملہ اسمار صاحبزادگان فرماں روایانِ دولت آصفیہ اور جملہ صدر المہاموں اور معین المہاموں، معتمدین، زاید اور شریک معتمدین، اراکین ومفتیان عدالت العالیہ، صدر محاسبان، نظما، انسپکٹر جنرل اور مہتممین وغیرہ کی مکمل فہرست دی گئی ہے جس میں ۱۹۳۰ء تک کا مواد ملتا ہے۔

(۲) دوسرے باب میں کونسل، کونسل آف اسٹیٹ، کیبنٹ کونسل اور باب حکومت کا نہایت تفصیلی مواد دیا گیا ہے۔ اراکین کونسل آف اسٹیٹ، کیبنٹ کونسل اور اراکین

باب حکومت کی مکمل فہرست بھی دی گئی ہے۔

(٣) تیسرے باب میں مجلس وضع قوانین سرکار عالی کے تاریخی حالات دیے گئے ہیں۔ اس کے قیام کے بعد سے وقتاً فوقتاً جو عہدہ دار اور اراکین نامزد ہوئے ہیں ان سب کے ناموں کی فہرست درج ہے۔ ۱۸۹۶ء سے ۱۹۳۰ء تک وقتاً فوقتاً جو قوانین نافذ کیے گئے یا نافذہ قوانین میں جو ترمیم کی گئی تاریخ اور نام کی صراحت کے ساتھ ان کی ایک فہرست دی گئی ہے۔

(٤) چوتھے باب میں ۱۹۳۰ء تک حیدرآباد میں وقتاً فوقتاً جتنے صدر اعظم، صدر المہام، معین المہام، معتمدین، اراکین و مفتیان عدالت، جج، صدر محاسب، ناظم، انسپکٹر جنرل، اور مہتمم وغیرہ گذرے ہیں ان سب کی مختصر تاریخ دی گئی ہے مختصراً ساتویں جلد کو صدر اعظموں، صدر المہاموں، معتمدوں، ناظموں اور دیگر عہدہ داران محکمہ جات سرکار عالی کی تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ اس کی نوعیت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ جلد حیدرآباد کے تمام دفاتر اور تمام دفاتر کے تمام عہدہ داروں کے پاس ہونا بے حد مفید ہے۔ نہ صرف سرکاری بلکہ ایسے تمام غیر سرکاری افراد کے لیے بھی یہ جلد بہت مفید ہے جو حیدرآباد کے مختلف عہدہ داروں کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم قابل مصنف کو ان کے انتہائی مفید کام پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

(١١) سلسلہ بستان آصفیہ کے متعلق رائیں

جب بستان آصفیہ کی مختلف جلدیں پبلک کے سامنے پیش ہوئیں تو مختلف اصحاب، اخباروں اور رسالوں نے ان کی افادیت اور اہمیت کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ذیل میں سلسلہ بستان آصفیہ کے متعلق بعض رایوں کا اندراج کیا جاتا ہے:-

عالیجناب مہاراجہ کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت پیشکار دولت آصفیہ نے

تحریر فرمایا: "آپ کا یہ تحفہ دنیائے ادب میں ایک انمول جواہر ہے جس خزانے میں ایسے جواہر پارے رہیں گے اس کے مقابل کوئی دولت مند دعویٰ نہیں کر سکتا۔ شائقین اور قدردانان علم کو آپ کی قدر کرنا چاہیئے" (۶ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء)

نواب لطف الدولہ مرحوم نے اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے۔ (۷ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء) "فی الواقعی اس کتاب کے حصص بلحاظ حالات و واقعات مندرجہ کے نہایت مفید اور کار آمد پائے جاتے ہیں اور ہر دفتر سرکاری میں بغرض معلومات اس کی ایک ایک جلد رکھی جانا ضروری پایا جاتا ہے کہ تاریخ دکن کی ایک مفصل اور بسیط تالیف ہے"

نواب سر عقیل جنگ بہادر تحریر فرماتے ہیں (۸ جون سنہ ۱۹۲۰ء) ...... پائیگاہی عہدہ دار نے نہایت محنت کے ساتھ اس کی ترتیب دی ہے ...... مولف کی محنت و جانفشانی قدردانی کے لائق ہے"

اخبار مشیر دکن لکھتا ہے۔ ۶ مارچ سنہ ۱۹۲۰ء ...... اس کتاب کو معلومات گوناگوں کے لحاظ اگر اس ریاست کے ان سائیکلوپیڈیا یا دائرۃ المعارف کے نام سے تعبیر کیا جائے تو ذرا بھی خلاف واقعہ نہ سمجھا جائیگا......"

اودھ اخبار ۲۷ مارچ سنہ ۱۹۲۰ء .... "بستان آصفیہ ریاست حیدر آباد دکن اور اس کے فرماروایان و خاندان اور وزراء و امراء کی ایسی مبسوط و مکمل و مستند تاریخ ہے جس سے بہتر ہندوستان کی ایسی بڑی ریاست کے واقعات کی تاریخ اردو زبان میں اب تک نہیں لکھی گئی۔ مشہور اہل قلم مصنف نے برسوں کی محنت اور دماغ سوزی سے اس بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے ...... ہماری رائے میں اس تصنیف سے ریاست حیدر آباد کی ایک قابل قدر خدمت انجام دی ہے اور اپنی وسعت نظری سے ان اصحاب پر بھی ایک عظیم احسان کیا ہے جو اس اہم ترین ریاست کے حالات سے

دلچسپی رکھتے ہیں ...."

محمد امین صاحب مہتمم دفتر تاریخ ریاست بھوپال نے لکھا ہے: "دفتر تاریخ کا مہتمم ہوں اور اس قسم کے کاموں سے میرا تعلق ہے۔ اس لیے میں مصنف کی محنت کا صحیح اندازہ کر سکتا ہوں۔ اور بلا تامل عرض کرتا ہوں کہ یہ اوراق بڑی سخت محنتوں کے ثمر ہیں۔"

بابو سری رام صاحب ایم۔ اے مولف خمخانہ جاوید لکھتے ہیں: بستان آصفیہ فی الواقع دکن کی عظیم الشان ریاست کی قابل ستایش تاریخ ہے اور مصنف نے اس کو دلچسپ اور کارآمد بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے ..... آپ کی تالیف گراں مایہ ایک بہت بڑی ملکی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔"

شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خاں مرحوم نے لکھا ہے!" اس بستان آصفیہ میں ایسے چمن وگلشن تاریخ لگے ہوئے ہیں جن کی بہار سے دل کی کلیاں کھلتی ہیں۔ اس میں عموماً دکن کے سلاطین کے خاندانوں اور خصوصاً خاندان آصفیہ کے اس بسیط وتفصیل سے حالات لکھے ہیں کہ اس کے مطالعہ کے بعد پھر کسی اور تاریخ دکن کے پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ مصنف نے معتمد ومستند تواریخ دکن سے سلاطین ماضیہ وحال کے حالات بڑی لیاقت وقابلیت وجاں فشانی وعرق ریزی سے انتخاب کرکے لکھے ہیں۔ غرض وہ حیدرآباد نظام کے کلیات وجزئیات حالات کا آئینہ ہے۔"

ان رایوں کے قطع نظر جو شخص سلسلۂ بستان آصفیہ کا مطالعہ کرے گا وہ خود بھی پنڈت جی کی غیر معمولی محنت اور معاملات کے لحاظ سے کتاب کی افادیت کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے گا۔

(۱۲) بستان آصفیہ اور بعض دوسری کتابوں کا مقابلہ

(۱) گلیمسس آف دی نظامس ڈومینین اور بستان آصفیہ:۔ گلیمسس آف دی نظامس ڈومینین

۱۸۹۶ء میں شایع ہوئی۔ مسٹر اے۔ کلاڈ کیمبل نے اسے مرتب کیا۔ یہ بہت بڑی تقطیع کی ضخیم کتاب ہے جو ۵۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں حیدرآباد کے حکمرانوں، امیروں، عہدہ داروں مختلف قسم کے منظروں اور مشہور عمارتوں وغیرہ کی کوئی (۶۰۰) تصویریں دی گئی ہیں حیدرآباد کے متعلق کسی دوسری کتاب میں اتنی بڑی سائز کی اور اس قدر زیادہ تصویریں نہیں ملتیں۔

ابتداً اس میں خاندان دولت آصفیہ کی مختصر تاریخ دی گئی ہے۔ اس کے بعد رزیڈنسیوں اور وزیروں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ بعد ازآں بڑے بڑے امراء کے حالات پیش کیے گئے ہیں۔ نظام حکومت کی تشریح کی گئی ہے۔ عہدہ داروں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ دولت آصفیہ کی فوج، پولیس اور محکمہ طبابت کی مختصر کیفیت دی گئی ہے۔ یہاں کے اہم جنگلات اور جنگلاتی پیداوار کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔ اس کے بعد ریاست حیدرآباد کی تاریخ کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جغرافی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور مختلف قسم کے قدرتی وسائل کے مختصر حالات دیے گئے ہیں۔ حیدرآباد میں ریلوں کی ابتدا اور ترقی اور قدیم صنعتوں کی مختصر سرگذشت بھی دی گئی ہے۔ آخر میں ہر صوبے کے تاریخی جغرافی، معاشی اور معاشرتی امور کی جدا جدا تشریح کی گئی ہے۔ کتاب مجموعی حیثیت سے بہت پر از معلومات ہے چنانچہ اسی افادیت کے پیش نظر اس کا اردو میں ترجمہ بھی نیا ہو چکا ہے اور یہ تاریخ ممالک نظام کے نام سے موسوم ہے۔

قارئین اگر اس کتاب کا بستان آصفیہ سے مقابلہ کریں تو ان کے مضامین میں بہت کچھ مطابقت پائیں گے۔ گلزار آصفیہ میں ہر ہر صوبے کے حالات علحدہ طور پر تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں مگر بستان آصفیہ میں یہ تفصیل نہیں ملتی۔ لیکن بستان آصفیہ اپنے بعض مخصوص مضامین کی وجہ سے امتیازی خصوصیت رکھتی ہے۔ مثلاً "مختلف حالات، مشہور لوگوں کی موت" "خطابات و عطایات" "حیدرآباد کے اخباروں، رسالوں، انجمنوں، کلبوں، کانفرنسوں وغیرہ کی تفصیل" "طغیانیوں کے حالات" "امراض متعدی کے حالات"

"محطوں کے حالات" ——— اور اسی قسم کے بعض دوسرے مضامین۔ اس میں شک نہیں کہ بستان آصفیہ میں تصویری توضیحات نہیں ملتیں جیسی کہ گلسس میں پائی جاتی ہیں لیکن بستان آصفیہ میں جو مختلف قسم کا مواد کثرت کے ساتھ ملتا ہے وہ گلسس میں نہیں پایا جاتا۔ بستان آصفیہ کو گلسس پر اس لیے بھی ترجیح ملنی چاہیئے کہ گلسس میں ۱۸۹۸ء تک کا مواد پیش ہے۔ لیکن بستان آصفیہ سال حال تک کا مواد پیش کرتی ہے۔ اگر اس سلسلہ کی آٹھویں جلد شایع ہو جائے تو پھر دورحاضر تک کا مواد دستیاب ہو جائیگا۔

(۲) حیدرآباد گیزیٹر اور بستان آصفیہ :۔ ۱۹۰۹ء میں امپیریل گیزیٹر آف انڈیا کے نام سے ایک سلسلہ حکومت ہند کی جانب سے شایع ہوا تھا۔ چنانچہ اس میں ایک جلد حیدرآباد کے حالات اور واقعات سے متعلق ہے جسے ہم نے سہولت کی خاطر حیدرآباد گیزیٹر کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ کتاب متوسط سائز کے (۳۲۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں حیدرآباد کے معاشی جغرافیہ، یہاں کی سیاسی تاریخ، آثار قدیمہ، آبادی، زراعت صنعت و حرفت، تجارت، نقل و حمل، محطوں، نظم و نسق، قوانین، مالیات، مالگذاری دیگر مدات آمدنی مثلاً افیون، کروڑگیری، آبکاری اور اسامپ، لوکل بورڈ، بلدیہ، کارہائے عامہ، فوج، پولیس، جیل، تعلیمات، طبابت وغیرہ کے مختصر حالات بیان کیے گئے ہیں۔ بعد ازاں تمام اضلاع ممالک محروسہ سرکار عالی کے متعلق بھی علیحدہ علیحدہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً ہر ضلع کے معاشی جغرافیہ، زراعت، صنعت، تجارت، نقل و حمل اور مشہور عمارتوں اور منظروں وغیرہ کے مختصر حالات دیے گئے ہیں معلومات کے لحاظ سے یہ کتاب بھی بہت مفید ہے۔ گلسس اور گیزیٹر دونوں کا مواد بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ گلسس کا مواد ۱۸۹۸ء تک ختم ہوتا ہے لیکن گیزیٹر میں ۱۹۰۸ء تک کے حالات ملتے ہیں۔ گیزیٹر کے آخر میں حیدرآباد کی بائیگاہوں اور سمستانوں کے حالات بھی دیے گئے ہیں۔ گیزیٹر اور بستان آصفیہ کا مقابلہ کرنے سے قارئین مردود کے مضامین میں بہت کچھ

مطابقت پائیں گے۔ لیکن بستان آصفیہ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بحیثیت مجموعی مختلف قسم کا بہت زیادہ مواد پایا جاتا ہے۔ گلسس اور گیزیٹر کے برعکس بستان آصفیہ میں صوبہ واری یا ضلع واری تفصیلات نہیں ملتیں۔ گلسس اور گیزیٹر کے مقابل بستان آصفیہ کا ایک اہم نقص یہ ہے کہ اس میں مواد کی بھرمار نظر آتی ہے لیکن اس کے پیش کرنے میں ایسی تنظیم، ربط اور تسلسل نہیں پایا جاتا جیسا کہ اول الذکر دو کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ بالخصوص گیزیٹر کا پیرایۂ بیان بہت علمی نظر آتا ہے۔ بستان آصفیہ میں اکثر جگہ مواد کے صرف نقشے ہی نقشے (چارٹس) دے دیئے گئے ہیں لیکن گیزیٹر میں جہاں کہیں نقشے دیئے گئے ہیں انہیں علمی طریق پر سمجھایا گیا ہے۔

(۳) پکٹوریل حیدرآباد اور بستان آصفیہ:۔ پکٹوریل حیدرآباد کو مسٹر کرشنا سوامی مدیراج نے دو ضخیم جلدوں میں شایع کیا ہے۔ پہلی جلد جملہ ۷۴۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ جلد سنہ ۱۹۲۹ء میں شایع ہوئی۔ گلسس کی طرح اس میں بہت سی تصویریں دی گئی ہیں۔

اس کتاب میں ابتداً دکن کی تاریخ دی گئی ہے۔ بعد ازاں خاندان دولت آصفیہ کی تاریخ نظام الملک اول کے زمانے سے موجودہ فرماں روا کے زمانے تک دی گئی ہے حیدرآباد کے مختلف رزیڈنٹوں کی ایک فہرست اور ہر رزیڈنٹ کے مختصر حالات زندگی دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح مختلف وزیروں کے تاریخی حالات دیئے گئے ہیں مزید برآں اس ریاست کے نظم ونسق کے تاریخی پہلو اور موجودہ نوعیت پر روشنی ڈالی گئی ہے برار اور سکندرآباد کے حالات بھی درج ہیں اور آخر میں حیدرآباد کے مختلف تاریخی مقاموں کی تصویریں دی گئی ہیں۔ بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ پہلی جلد حیدرآباد کی قدیم وجدید تاریخ۔ یہاں کے فرماں رواؤں رزیڈنٹوں، وزیروں، نظم ونسق کے حالات اور اہم تاریخی مقاموں کی سرگذشت پر مشتمل ہے۔

دوسری جلد سنہ ۱۹۳۱ء میں شایع ہوئی۔ یہ ۶۶۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ورعثمانی کی خصوصیات۔ امیروں اور شہزادیوں کے حالات دیئے گئے ہیں۔ مزید برآں باب حکومت

پائگاہوں۔ دیگر امیروں۔ جاگیرداروں۔ ریاست کے مختلف محکموں سمستانوں اور خاص خاص فرقوں اور گروہوں مثلاً ہیر کلے، چنچہ وغیرہ کے حالات دیے ہیں۔ اس جلد میں بھی بہت سی تصویریں دی گئی ہیں۔

مواد کی نوعیت کا لحاظ کرتے ہوئے گلسر، گیزیٹر اور پکٹوریل حیدرآباد بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ اسی طرح بستان آصفیہ اور پکٹوریل حیدرآباد کے مضامین کا مقابلہ کرنے سے بہت سے مضامین مشترک نظر آئیں گے۔ پکٹوریل حیدرآباد میں رزیڈنٹوں کے ناموں کے علاوہ ہر رزیڈنٹ کی مختصر تاریخ بھی دی گئی ہے لیکن بستان آصفیہ میں رزیڈنٹوں کے نام تو ملتے ہیں لیکن ان کی زندگی کے تاریخی حالات نہیں ملتے۔ اسی طرح پکٹوریل حیدرآباد میں جاگیرداروں کے حالات بھی دیے گئے ہیں لیکن بستان آصفیہ میں اس قسم کا مواد نہیں ملتا۔ علاوہ ازیں حیدرآباد کے مختلف فرقوں اور گروہوں کی تاریخ جو پکٹوریل حیدرآباد میں دی گئی ہے بستان آصفیہ کے لیے نئی چیز ہے۔ جس طرح پکٹوریل حیدرآباد کے بعض مضامین بستان آصفیہ کے لیے نئے ہیں اسی طرح بستان آصفیہ کے بہت سے مضامین پکٹوریل حیدرآباد میں نہیں پائے جاتے۔ "مشہور لوگوں کی موت" "مختلف حالات و واقعات" ——— اور اسی قسم کے بعض دوسرے عنوانات خاص بستان آصفیہ ہی میں پائے جاتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ پکٹوریل حیدرآباد اور بستان آصفیہ مواد کی نوعیت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ لیکن مختلف قسم کے قدیم اور کم یاب مواد کی کثرت کے لحاظ سے بستان آصفیہ کی افادیت زیادہ نظر آتی ہے۔ بالخصوص اردو داں پبلک کے لیے بستان آصفیہ بیش بہا خزانہ ہے۔ یہاں پر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مضامین کے پیش کرنے میں جو تنظیم، ربط اور تسلسل پکٹوریل حیدرآباد میں پایا جاتا ہے بستان آصفیہ میں موجود نہیں۔

(۴) اسٹارڈائرکٹری اور بستان آصفیہ:- یہ ڈائرکٹری اسٹار پریس الہ آباد۔ یوپی۔

جانب سے حال ہی میں شایع ہوئی ہے۔ یہ (۶۱۱) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ریاست دکن اور شہزادگان ذی الاشان کے مختصر حالات دیے گئے ہیں۔ حیدرآباد کے موقع اور جغرافیہ کی مختصر کیفیت دی گئی ہے۔ اہم مقاموں، عمارتوں، منظروں اور تالابوں وغیرہ کے مختصر حالات بیان کیے ہیں۔ ہز اگزالٹیڈ ہائینس نظامس اسٹیٹ ریلوے اور ریلوے بس سروس کی مختصر کیفیت دی گئی ہے۔ خاص حیدرآباد و بیرون بلدہ کے نقشے دیے گئے ہیں۔ ہندوؤں کے زمانے سے موجودہ فرماں روائے عہد تک دکن کی تاریخ کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ حیدرآباد کے مختلف محکموں کے کاروبار کی مختصر کیفیت دی گئی ہے۔ نیز مختلف عہدہ داروں، امیروں، جاگیرداروں اور تاجروں وغیرہ کے مختصر حالات بیان کیے گئے ہیں۔ سب سے آخر میں تین سالہ جنتری (۱۳۴۲ف۔۱۳۴۴ف) بھی دی گئی ہے۔

بستان آصفیہ اور اس کے بعض مضامین میں مطابقت پائی جاتی ہے لیکن ضخامت مواد کی کثرت اور وسعت کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی مناسبت نہیں۔ اسٹار ڈائرکٹری کو بستان آصفیہ کے بعض مضامین کا جزو کہا جا سکتا ہے۔ اس میں زیادہ تر جدید حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۳) بستان آصفیہ کی چند خامیاں

(۱) سلسلہ بستان آصفیہ کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے سے اس کی چند خامیاں بھی نظر آئیں گی۔ مثلاً ہر قسم کا مواد نہایت کثرت کے ساتھ دیا گیا ہے لیکن ترتیب اور تنظیم کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ مواد کی بہتات فی نفسہ بہت مفید چیز ہے لیکن تنظیم کی خرابی کی وجہ سے اس کی افادیت بہت کچھ گھٹ جاتی ہے۔

(۲) ابتدائی جلدوں میں بطور خاص فصلوں کی بہت زیادتی نظر آتی ہے۔ ایک سے زاید جگہ غیر ضروری فصلیں قایم کی گئی ہیں۔ مواد کی مناسبت سے انھیں بہ آسانی دوسرے

عنوانات کے تحت ضم کیا جا سکتا تھا۔

(۳) ایک جلد کے مقابل میں دوسری جلد میں فصلوں کی حد تک مقدم اور موخر ہونے کی خامی بھی نظر آتی ہے۔

(۴) اکثر فصلوں میں صرف اعداد اور تختہ جات پیش کر دیے گئے ہیں لیکن ان کی کوئی توضیح نہیں کی گئی۔ مثلاً آبادی، مالیات اور تجارت وغیرہ کی حد تک صرف اعداد شمار ملتے ہیں۔

(۵) اس سلسلے کی تمام جلدیں بیانی ہیں اور تنقیدی پہلو تقریباً مفقود ہے۔

(۶) تاریخی حالات کی تشریح اور توضیح میں تین سنین استعمال کیے گئے ہیں:۔ (۱) ہجری (۲) فصلی اور (۳) عیسوی۔ ایک سے زاید جگہ کسی ایک واقعہ کے بیان کرتے وقت ایک ہی صفحے میں کہیں ہجری سنہ استعمال کیا گیا ہے تو کہیں فصلی اور کہیں عیسوی۔ اس سے قارئین کو تقابلی مطالعہ میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ اگر شروع سے آخر تک کسی ایک سنہ پر اکتفا کیا جاتا تو بہتر تھا۔

(۷) پانچویں جلد کے سوا کسی دوسری جلد میں انڈکس نہیں دیا گیا ہے۔ آٹھویں جلد میں جو زیر ترتیب ہے انڈکس دیا جائے تو قارئین کے لیے بڑی سہولت کا باعث ہوگا۔

مندرجہ بالا خامیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سلسلہ بستان آصفیہ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ پنڈت جی نے اس کی تالیف کے ذریعہ اردو داں پبلک پر بڑا احسان کیا ہے۔ اردو لٹریچر میں ہمیں کوئی کتاب ایسی نہیں ملتی جیسے بستان آصفیہ کا بدل کہا جا سکے۔ اس کتاب کی ترتیب میں پنڈت جی نے مختلف تاریخی کتابوں کے علاوہ نظم و نسق کی قدیم رپورٹوں سے بہت کچھ مدد لی ہے۔ حیدرآباد کے نظم و نسق کی پرانی رپورٹوں اور بستان آصفیہ میں عنوانات اور مواد کے لحاظ سے بڑی مطابقت پائی جاتی ہے۔

(۱۴) خیابانِ آصفی

خیابانِ آصفی کو بستانِ آصفیہ کی پہلی، دوسری اور تیسری جلدوں کا نہایت جامع خلاصہ کہنا چاہیئے۔ ان تین جلدوں میں جس قدر مضامین پائے جاتے ہیں انھیں پنڈت جی نے خیابانِ آصفی میں حروفِ تہجی کے لحاظ سے ترتیب دے کر ضروری مواد پیش کردیا ہے۔ اس کتاب سے ایسے لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جن کے پاس بستانِ آصفیہ کی پہلی تین ضخیم جلدوں کو پڑھنے کے لیے وقت نہیں۔

(۱۵) مرہٹوں کا تمدن

یہ کتاب پنڈت نرسہوان چنتامن کیلکر بی۔ اے۔ ال ال بی کی تصنیف مرہٹے اور انگریز (جو مرہٹی زبان میں لکھی ہوئی ہے) کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ اس میں حسب ذیل عنوانات پر روشنی ڈالی گئی ہے:۔

مرہٹوں کی فوجی قوت۔ مرہٹوں کا بحری بیڑہ۔ مرہٹوں کا ملکی انتظام۔ مرہٹوں کی سلطنت کی وسعت۔ مرہٹوں کی سلطنت کی مالی حالت۔ دفاتر۔ اسناد۔ قلعہ جات۔ ابواب اراضی۔ ملازمین دیہی۔ حفاظت عامہ۔ محبس۔ صیغہ عدالت۔ سرکاری قرضہ۔ محصولات کروڑگیری۔ تجارت و آبادی۔ دار الضرب اور سکہ جات۔ آبکاری۔ بیگاری اور غلامی۔ ٹپہ اور سفر۔ خطابات۔ ترقی تعلیم و تہذیب۔ کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ دیا گیا ہے جس میں (۷۵) تاریخی ناموں اور تلمیحوں کی صراحت کی گئی ہے۔ جن کا اس کتاب کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے جاننا ضروری ہے۔ مختلف مرہٹا حکمرانوں کے شجرے دیے گئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی اس کتاب میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مرہٹے محض لٹیرے اور آفاقی نہیں تھے بلکہ ان کی منظم حکومت تھی

اور باضابطہ نظام سلطنت تھا۔

(۱۶) تفریح الحیات

یہاں تک پنڈت مانک راؤ صاحب کی تاریخی کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب ان کی اخلاقی کتابوں کو لیجیے۔ یہ کتاب جان لباک کی انگریزی تصنیف پلیشرس آف لائف پر مشتمل ہے۔ اس میں جملہ دس باب ہیں اور حسب ذیل مضامین پر روشنی ڈالی گئی ہے:۔

خوشی اور مسرت۔ فرض منصبی ادا کرنے کی مسرت۔ کتابوں کی قدر و منزلت کتابوں کا انتخاب۔ عمدہ دوستوں کی صحبت۔ وقت کی قدر۔ سفر کی خوبیاں وطن کی خوبیاں۔ علوم حکمت۔ تعلیم۔ کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ دیا گیا ہے جس میں (۱۱۹) فلسفیوں اور مفکروں کے مختصر حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اس پر جو تبصرے ہوئے ان میں سے چند کے اقتباس یہاں دیے جاتے ہیں۔

آزاد جلد (۱۲) نمبر (۴۳) میں لکھا ہے:۔ "آج کل کے اردو لیٹریچر میں یہ کتاب مغتنمات سے ہے"۔ مشیر دکن جلد (۱۱) نمبر (۲۱) میں لکھا ہے "اس کے مولف ہمارے ملک کے ایک لایق ہونہار نوجوان ہیں۔ اس کے باوجود کہ ان کی مادری زبان اردو نہیں پھر بھی انہوں نے اس کتاب کو جس سلیس اور فصیح اردو میں مرتب کیا ہے وہ ہر طرح قابل قدر ہے"۔ اخبار عام جلد ۲۷ نمبر (۴) میں لکھا ہے:۔ "اردو دانوں کے لیے ہماری رائے میں یہ کتاب ضرور مفید اور دلچسپ ثابت ہوگی۔ نظارۂ عالم لکھتا ہے "اس کی اردو سلیس اور بامحاورہ ہے۔ یہ کتاب حکما اور فلاسفروں کے اقوال کا مجموعہ ہے جو ہر آدمی کے لیے مفید نصیحتیں اور گولڈن رولز ہیں"۔

(۱۷) امیرانہ اور غریبانہ زندگی

یہ کتاب چھوٹے چھوٹے (۲۱) بابوں پر مشتمل ہے۔اس میں ایک بادشاہ اور اس کے دربار کے ایک شاعر کے مکالمے کو پیش کیا گیا ہے جو امیرانہ اور غریبانہ زندگی سے متعلق ہے۔ بادشاہ کہتا ہے کہ امیروں کی زندگی کے مقابل غریبوں کی زندگی مجموعی طور پر بہت اچھی ہوتی ہے اور شاعر امیرانہ زندگی کی اچھائی کی حمایت کرتا ہے اور پڑھنے والا اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ گو امیروں اور بالخصوص بادشاہوں کو اشیائے راحت بہت حاصل ہوتی ہیں لیکن تفکرات کی مناسبت سے غریبوں کی زندگی ہی بہتر ہوتی ہے۔ امیروں اور غریبوں دونوں کے لیے اس کا مطالعہ یکساں مفید ہے۔

ادیب آگرہ ماہ اگست ۱۸۹۹ء جلد (۱) نمبر (۸) میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "یہ پچاس صفحے کا بڑا دلچسپ رسالہ ہے جس کی خوبی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔"

معارف علیگڈھ اگست ۱۸۹۹ء جلد (۲) نمبر (۴) لکھا ہے: "اس کا مطالعہ ہر شخص پر خواہ وہ امیر ہو یا غریب لازم ہے۔ ہم مترجم کی اس کی قیمتی محنت کی دل سے داد دیتے ہیں۔"

جلوۂ محبوب جلد (۲) نمبر (۴) لکھا ہے: "اگر پبلک اس چھوٹے سے رسالے کی بیش بہا نصائح پر عمل کرے تو بہت کچھ نفع اٹھا سکتی ہے۔"

المعلومات جے پور۔ جنوری ۱۹۰۰ء جلد (۲) نمبر (۱) لکھا ہے: "مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب نے اردو زبان میں ایک بیش بہا ذخیرہ فراہم کیا ہے۔"

(۱۸) راجہ اشوک کا جیون چرتر

جیون کے معنی زندگی کے ہیں اور چرتر مختصر حالات کو کہتے ہیں۔ یہ کتاب جملہ

گیارہ ابواب اور ایک ضمیمے پر مشتمل ہے۔ اس میں اشوک کے حالات زندگی اور فرامین کی تفصیل دی گئی ہے۔ ضمیمے میں (۱۸۵) تاریخی ناموں اور واقعات کی ضروری صراحت کی گئی ہے۔ اختلافی امور کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کتاب کا مطالعہ عام اخلاقی تربیت اور نیک سیرت کی تشکیل کے لیے بہت مفید ہے۔

پبلک گزٹ امرتسر ۱۶ مارچ ۱۹۰۳ء نے لکھا ہے: "...... کتاب قابل دید ہے"

وکیل امرتسر ۶ ر اپریل ۱۹۰۳ء تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "...... عبارت سلیس اور عام فہم ہے۔ طرز بیان دلچسپ۔ پسندیدہ اور نتیجہ خیز اور سبق آموز ہے...."

رہبر مراد آباد ۲۱ ر اپریل ۱۹۰۳ء لکھا ہے: "...... اس کتاب کے لیے بہتر رائے پیش کرتے ہوئے ناظرین سے اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں"

ہندوستانی۔ لکھنو۔ ۶ ر مئی ۱۹۰۳ء لکھا ہے: مسٹر مانک راؤ وٹھل راؤ اہل حیدرآباد نے مرہٹی زبان سے راجہ اشوک کی سوانح عمری کا ترجمہ کر کے اردو وال پبلک کا ذخیرہ معلومات بہت ہی وسیع کیا ہے......"

تالیف و اشاعت۔ لاہور۔ ۱۵ ر جون ۱۹۰۳ء لکھا ہے: ...... "اس کتاب کے شایع کنندہ نے ایسی بیش بہا کتاب مہیا کر کے اردو علم و ادب کی قابل قدر خدمت کی ہے......"

ترقی۔ لاہور۔ جون ۱۹۰۳ء لکھا ہے: "...... مولف نے حالات نہایت تحقیقات سے لکھے ہیں...... کتاب دلچسپ اور سلیس عبارت میں لکھی ہے"

مسٹر عزیز مرزا بی۔اے معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ نے لکھا ہے: "...... کیا بلحاظ برجستگی عبارت اور کیا بلحاظ قدرت تحقیقات (کتاب) ہر طرح قابل قدر ہے اور اس نے اُردو لٹریچر میں عمدہ اضافہ کیا ہے"

خان بہادر شمس العلما، مولوی ذکا اللہ صاحب نے لکھا ہے: "جیسا یہ راجہ

باعزو شان تھا ویسے ہی اس کے مصنف نے باعزت لکھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اہل قلم اس کی قدر شناسی کریں گے۔"

(۲۰) ویدور نیتی

کوروں اور پانڈوں کی لڑائی کے زمانے میں ویدور نے کوروں کے باپ راجہ دھرت راشٹر کو نصیحت کی تھی کہ حق اور صداقت سے ہٹ کر پانڈوں کو ان کے جائز حق سے محروم نہ کرے۔ نیتی کے معنیٰ نصیحت کے ہیں۔ ویدور نیتی یعنی ویدور کی نصیحت۔ ویدور کی نصیحتیں جو اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں راجہ دھرت راشٹر کے لیے مخصوص نہیں بلکہ ہر شخص ان پر عمل کر کے صداقت اور دیانت داری کا راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ یہ کتاب مرہٹی سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہے۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے دبدبہ آصفی ۱۹۰۷ء نے لکھا ہے: "...... اگر چہ وہ (کتاب) خاص ہندو مذہب کے اصول پر لکھی گئی ہے لیکن اخلاقی تعلیم سے ہر ایک مذہب کا شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے... "

وکیل۔ امرتسر۔ ۲۰ / نومبر ۱۹۰۷ء نے لکھا ہے: "...... مولف کی مادری زبان اُردو نہیں مگر باوجود اس کے انھوں نے جس سادگی کے ساتھ ...... ترجمہ کیا ہے قابل داد ہے ...... ہم قابل مولف کو مبارک باد دیتے ہیں۔"

اردوئے معلیٰ۔ اکتوبر و نومبر ۱۹۰۷ء نے لکھا ہے: "...... اس کتاب کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں ......"

کشمیر درپن جولائی اگست وستمبر ۱۹۰۷ء نے لکھا ہے: "...... مترجم نے ترجمہ کتاب میں اپنی قابلیت کو خوب ظاہر کیا ہے ...... عبارت اردو بامحاورہ وسلیس اور عام فہم ہے۔"

خان بہادر شمس العلماء مولوی ذکا اللہ مرحوم لکھتے ہیں :"..... یہ ترجمہ عجیب گلستانِ دانش و بوستانِ بینش ہے۔ جس میں نصایح اور اندازکے چمن ایسے شگفتہ ہیں کہ جن کے دیکھنے سے روح مسرور ہوتی ہے اور اس میں استعارات و تشبیہات کے گل اور پھول ایسے کھلے ہوئے ہیں کہ جن کی بو سے دماغ معطر ہوتا ہے....."

(۲۱) اقوالِ بودھ

یہ کتاب "دھم پد" کا ترجمہ ہے۔ دھم پد بودھ مذہب کی کتابوں میں اعلیٰ پایہ کی شمار ہوتی ہے۔ اس میں مہاتما گوتم بودھ کی نصیحتیں اور بودھ مذہب کے حالات شریک ہیں۔ ابتداً یہ کتاب پالی زبان میں لکھی گئی تھی لیکن بعد میں اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں کیا گیا مثلاً سنسکرت، چینی، جاپانی، ملائی، تبتی، برمی، منگولی، لاطینی، انگریزی، فرنچ، جرمن اور اسپینش۔ پروفیسر میکس ملر نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا اور مادھوراؤ شنکرراؤ صاحب نے اسے انگریزی سے مرہٹی میں منتقل کیا۔ اردو داں پبلک کو پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب کا مشکور ہونا چاہیے کہ انھوں نے اس کتاب کو مرہٹی سے اردو میں منتقل فرمایا۔ اس کتاب کے پڑھنے سے اس کی افادیت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ طبیعت کو نیکی اور سچائی کے راستے پر ڈالنے کے لیے اس کا مطالعہ بے حد مفید ہے۔ اس کتاب کی نوعیت اس قسم کی ہے کہ اس سے ہر مذہب اور ہر فرقے کا شخص فایدہ اٹھا سکتا ہے۔ زبان میں اس قدر روانی ہے کہ کہیں ترجمے کا شبہ تک نہیں گذرتا۔ بلا شک و شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کی وجہ سے اردو ادب میں مفید جزو کا اضافہ ہوا۔ پنڈت جی کا یہ کام ہر طرح قابلِ مبارک باد ہے۔

(۲۲) دستورِ حکمرانی

اس کتاب میں پنڈت جی نے رامائن اور مہابھارت کے اُس حصے کا ترجمہ

پیش کیا ہے جو راج نیتی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ کتاب بہت چھوٹے چھوٹے (۳۲) ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں بہتر حکمرانی کے اصول اور طریقے پیش کیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ بھی دیا گیا ہے جس میں ان تمام تلمیحوں کی وضاحت کی گئی ہے جن کا جاننا دستور حکمرانی کے مضامین کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ پنڈت جی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دستور حکمرانی یا راج نیتی کو اگر موجودہ پالیٹکس یا سیاست تمدن کا ماخذ سمجھا جائے تو خلاف واقعہ نہ ہوگا۔ اس کتاب کی اشاعت کی وجہ سے بھی اردو ادب میں ایک مفید جز کا اضافہ ہوا۔

(۲۳) مفید الخواتین

یہ کتاب ایک انگریزی کتاب "ڈومسٹک سائنس" کا ترجمہ ہے۔ اس کی افادیت کے پیش نظر اس کا ترجمہ مرہٹی زبان میں بھی ہو چکا ہے۔ پنڈت جی نے کچھ تو اصل انگریزی کتاب اور اس کے مرہٹی ترجمے سے مدد لیکر اسے اردو میں منتقل کیا۔ اس کتاب میں جملہ (۳۴) چھوٹے چھوٹے باب ہیں۔ ہر باب میں سوال اور جواب کے ذریعہ روزمرہ زندگی کے متعلق بہت سی مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس میں بحیثیت مجموعی (۱۲۳۳) سوالوں کے جواب ہیں۔ مثال کے طور پر چند سوالات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔

۱۔ اجزائے پرورش کس گوشت میں زیادہ ہوتے ہیں ؟
۲۔ اشتہا بعض لوگوں کو کیوں زیادہ ہوتی ہے ؟
۳۔ آنسو کا ذائقہ کیوں نمکیں ہوتا ہے ؟
۴۔ انڈے ابالے ہوے کیوں زود ہضم ہوتے ہیں ؟
۵۔ بال کیوں سیاہ کے سفید ہو جاتے ہیں ؟
۶۔ چائے کثرت کے ساتھ پینا کیوں مضر ہے ؟

۷۔ دانتوں کو اچھی طرح مضبوط رکھنے کے لیے کونسا علاج بہتر ہے ؟

اسی قسم کے بہت سے مفید سوالوں کے جواب دیے گئے ہیں۔ اس کا مطالعہ مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں مفید ہے۔ یہ کتاب نہایت قیمتی معلومات کا نایاب ذخیرہ ہے۔ پنڈت جی نے اس کا ترجمہ کر کے اردو زبان کی اچھی خدمت کی ہے۔ تحریر بڑی سلیس اور سادہ ہے۔ اس کی افادیت کے پیش نظر ہم اس کے مطالعے کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

(۲۴) حالات و مقالات سقراط

اس کتاب میں سقراط کی زندگی کے حالات اور اس کے مختلف اقوال بیان کیے گئے ہیں مثلاً رعونت اور جھوٹی مشیخت، افلاس، تعلیم، ورزش۔ انصاف، خدا کی ہستی، بندوں پر اس کے حقوق، دوستی اور اسی قسم کے دوسرے دلچسپ اور مفید عنوانات کے متعلق مشہور فلاسفر سقراط کے خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ زیادہ سادہ اور سلیس ہے۔ پیرایہ بیان دلچسپ اور مواد بہت گراں قدر ہے۔

(د ۲) پنڈت جی کی علمی خدمات

یہاں تک مانک راؤ صاحب کی تاریخی اور اخلاقی کتابوں پر علحدہ علحدہ روشنی ڈالی گئی۔ آخر میں ان کی علمی خدمات کا ذکر بھی ضروری ہے۔

مجموعی طور پر پنڈت جی کی تمام کتابوں پر غور کرنے کے بعد ہم ان کی علمی خدمات دو مختلف حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں مثلاً (۱) معاشی مورخ کی حیثیت سے (۲) سیاسی مورخ کی حیثیت سے (۳) معاشرتی مورخ کی حیثیت سے (۴) فلسفہ اخلاق کے

ی کی حیثیت سے (۵) زبان اردو کے سچے خدمت گذار اور ایک اچھے نثرنگار
حیثیت سے۔

بستان آصفیہ میں انہوں نے حیدرآباد کی آبادی، زراعت، صنعت و حرفت،
تجارت، نقل و حمل، زر اور مالیات کا بہت سارا مواد پیش کیا ہے۔ اس میں شک
نہیں کہ ان کا طرز تحریر اور پیرایۂ بیان ایسا نہیں ہے جیسا کہ آج کل کے معاشی
مورخ اختیار کرتے ہیں تاہم انھیں حیدرآباد کے ابتدائی معاشی مورخوں کی صف
میں جگہ ملنی چاہیئے۔

جس طرح سلسلۂ بستان آصفیہ میں جگہ جگہ معاشی حالات اور واقعات کی
تاریخی تشریح ملتی ہے اسی طرح حیدرآباد کے مختلف سیاسی حالات اور واقعات بھی وضاحت
کے ساتھ ملتے ہیں۔ نواب نظام الملک اول حیدرآباد میں مستقلاً منتقل ہو جانے اور
اس ریاست کی بنیاد ڈالنے کے بعد سے دور حاضرہ تک وقتاً فوقتاً جو سیاسی تبدیلیاں
ہوتی رہی ہیں انھیں پنڈت جی نے اپنی بستان میں بیان کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ
ایک سیاسی مورخ بھی کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

معاشی اور سیاسی حالات کی طرح بستان آصفیہ میں مختلف معاشرتی واقعات
اور حالات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً حیدرآباد کی مختلف جاتراؤں، میلوں، کھیل
تماشوں اور اسی قسم کی بعض دوسری باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سلسلۂ بستان آصفیہ
میں ٹھیٹ معاشرتی حالات اگرچہ بہت کم ملتے ہیں تاہم جو مواد پیش کیا گیا ہے اس
کی بنا پر پنڈت جی کا شمار حیدرآباد کے معاشرتی مورخوں میں بھی کیا جا سکتا ہے۔

فلسفۂ اخلاق کی مختلف کتابوں مثلاً تفریح الحیات، امیرانہ اور غریبانہ زندگی،
وید ورتنی، راجہ اشوک کا جیون چرتر، دستور حکمرانی، اقوال بودھ وغیرہ میں براہ راست
یا بالواسطہ اخلاق کا پرچار کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے اکثر دیباچوں میں پنڈت جی نے

نیک سیرت اور نیک کردار بننے کی اہمیت پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ نیکی، سچائی، حق اور صداقت ہی کے ذریعہ انسان کو اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں حقیقی خوشی حاصل ہو سکتی ہے اور وہ آرام اور چین کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ انہوں نے ان کتابوں کی طباعت کا مقصد بھی یہ بتایا ہے کہ لوگ انھیں پڑھیں اور اپنی زندگی کو صحیح راستے پر ڈالنے کی کوشش کریں۔ پنڈت جی کی فلسفۂ اخلاق کی تمام کتابوں کو پڑھنے کے بعد ہم انھیں فلسفہ اخلاق کے حامی کا درجہ دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مندرجہ بالا امور کے قطع نظر پنڈت جی کا شمار اردو کے خدمت گذاروں اور اُس کے اچھے نثر نگاروں میں بھی کیا جانا چاہئے۔ کیونکہ انہوں نے ترجموں تصنیفوں اور تالیفوں کے ذریعہ اُردو زبان اور اردو داں پبلک پر بڑا احسان کیا ہے۔ پنڈت جی کی مادری زبان مرہٹی ہے۔ اُن کے لیے یہ بات بہت آسان تھی کہ اپنا سارا علمی کام مرہٹی زبان میں کرتے اور اس طرح اپنی مادری زبان کی خدمت کرتے لیکن انہوں نے اپنی علمی کوششوں اور تحقیقوں کے نتائج کو مرہٹی کے بجائے اردو میں پیش کرنا پسند کیا۔ آپ ۱۸۹۶ء سے لیکر اب تک برابر علمی کام میں مشغول ہیں اور اس عرصے میں اردو لٹریچر میں کوئی (۱۷) مفید کتابوں کا اضافہ کیا۔ مرہٹی زبان کے بہت سے مفید علمی مواد کو اردو میں منتقل کر کے اسے مالا مال کیا۔ راجہ اشوک کے جیون چرتر کے دیباچہ میں آپ نے ۱۹۰۲ء میں لکھا ہے: "اردو کے سچے بہی خواہوں اور دردمندوں کا فرض ہے کہ وہ اس کو علمی زبانوں کی شہ نشین پر جگہ پانے کے لیے اس میں ناولوں اور قصوں کہانیوں کے علاوہ تاریخی۔ سیر۔ علمی اور اخلاقی کتابوں کی تعداد بذریعہ تصنیف، تالیف، ترجمہ کے بڑھا لیں۔ . . . میرے نزدیک یہ کسی طرح قرین مصلحت نہیں ہے کہ اردو دان پبلک کے مذاق کا خیال مدنظر رکھ کر اُردو زبان میں تالیف و تصنیف کی جائے اور اس کے بگڑے ہوئے مذاق کو اور بگاڑا جائے۔ بلکہ اردو زبان کی سچی ہمدردی یہ ہے کہ

ردو دان پبلک کا مذاق علمی، تاریخی اور اخلاقی کتابوں کی خواہ کتنی ہی حد تک مخالف
کیوں نہ ہو ایسی ہی کتابیں لکھنے و شایع کرنے کا سلسلہ جاری رکھا جانے" یہ رائے
پنڈت جی نے صرف دوسروں کو نہیں دی بلکہ خود بھی اس پر عمل کیا اور کر رہے ہیں۔ گندے
قصے اور ناولیں بڑی آسانی کے ساتھ فروخت ہو جاتی ہیں اور اخلاقی کتابوں کا بکنا بہت
مشکل ہوتا ہے۔ لیکن پنڈت جی نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور برابر اخلاقی کتابیں پیش
کرتے رہے۔ لہذا اس نقطۂ نظر سے بھی اردو زبان پر ان کا احسان ہے۔ اردو ان کی
وطنی زبان ہے لیکن اس کے باوجود اس پر کافی قدرت رکھتے ہیں۔ نثر نگاری کا انہیں
بہت اچھا ملکہ ہے۔ زبان بڑی سادہ، سلیس اور بامحاورہ استعمال کرتے ہیں۔ ان
کی پہلی کتاب تفریح الحیات ۱۸۹۶ء میں شایع ہوئی تھی لیکن اس میں بھی جس نوعیت
کی زبان استعمال کی گئی ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے جدید اردو کا نام دیا جاسکے۔ ۱۸۹۶ء
سے لیکر اب تک ان کا طرز بیان تقریباً ایک ہی نظر آتا ہے۔ ان کی ہر کتاب میں سلاست
اور سادگی پائی جائے گی اور جملوں کی بندش بامحاورہ نظر آئے گی۔ اس لحاظ سے انہیں
اردو نثر نگاروں میں بھی جگہ ملنی چاہئے۔

پنڈت جی کے متعلق مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اردو زبان میں حیدرآباد کے
ایک اہم مصنف ہیں۔ حیدرآباد کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مورخ کی حیثیت سے
انہوں نے بہت ہی قابل تعریف خدمات انجام دی ہیں۔ یہ اردو کے اچھے نثر نگار اور
اس زبان کے سچے خدمت گذار ہیں۔ تقریباً نصف صدی سے علمی اور تحقیقی کام میں
مصروف ہیں اور وقتاً فوقتاً اپنے علمی نتائج کو برابر پبلک کے سامنے پیش کرتے رہے
ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۷۰ سال سے زاید ہو چکی قوی مضمحل ہو چکے ہیں اور بینائی
تقریباً جواب دے چکی ہے لیکن پھر بھی علمی کام میں برابر مصروف ہیں۔ چنانچہ آج کل
بستان آصفیہ کی آٹھویں جلد کی ترتیب کا کام انجام دے رہے ہیں۔ مجموعۂ اقوال۔

مجموعۂ ضرب الامثال اور تین سو سالہ جنتری کے بھی مسودات تیار کر چکے ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ انہیں تادیر صحت و عافیت کے ساتھ سلامت رکھے اور اپنے علمی مقاصد کو پورا کرنے کی قوت اور طاقت عطا فرمائے۔ باشندگانِ ملک کا فریضہ ہے کہ ان کی علمی خدمات کا اعتراف کریں اور ان کی علمی زندگی سے کچھ سیکھنے کی کوشش کریں۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ اگر ملک کے صاحبِ ذوق تعلیم یافتہ اپنی فرصت کے گھنٹوں میں علمی شوق اور مذاق کو مدت العمر جاری رکھیں اور اپنے مذاق اور بساط کے مطابق اپنی علمی کاوشوں کو کتابی صورت میں پبلک کے سامنے پیش کریں تو اس سے اُردو زبان اور ابنائے وطن کی بڑی خدمت انجام دی جا سکے گی۔ ہر کام کے لیے شوق، عزم و ارادہ اور مستقل مزاجی ضروری ہے کیونکہ ان کے بغیر کسی کام کا عمدگی کے ساتھ انجام پانا ممکن نہیں۔ ملک کو ایسے افراد کی سخت ضرورت ہے جو مذکورہ صفتوں سے متصف ہوں۔ ملک میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی تحقیق کے لیے بڑا میدان موجود ہے فقط۔

تاریخی کاغذات کے ذخیرے

(۵)

نواب بسالت جنگ اور نواب والاجاہ کی مراسلت

از محمد عزت ام اے، ال ال، بی

کتب خانۂ سعیدیہ کے ذخیرۂ کاغذات میں نواب بسالت جنگ مرحوم اور نواب محمد علی خاں والاجاہ نواب کرناٹک کی باہمی مراسلت سے متعلق چند کاغذات موجود ہیں۔ کچھ کاغذات مجلہ کی اس اشاعت میں شایع کیے جاتے ہیں۔ باقی کاغذات آئندہ شایع کیے جائیں گے۔

نواب بسالت جنگ مرحوم حضرت آصف جاہ اول کے پانچویں فرزند تھے۔ اصلی نام میر محمد شریف تھا۔ نام اور خطاب ایک مہر میں جو چند پروانوں پر ثبت ہے یوں کندہ ہے:-

"بسالت جنگ عماد الدولہ میر محمد شریف خاں بہادر امیر الامرا شجاع الملک فدوی محمد عالمگیر بادشاہ غازی"

اس مہر میں ایک جانب "سنہ ۴" اور ایک جانب ۱۱۷۰ کندہ ہے۔

تاریخ رشید الدین خانی میں شجاع الملک کے ساتھ برہان الملک کا خطاب بھی لکھا ہے۔ محمد سراج الدین طالب مرحوم نے اپنی تالیف "نظام علی خاں" میں دربار آصف اور خورشید جاہی کے حوالہ سے "دولائی" کے خطاب کو "شجاع الدولہ" لکھا ہے[۱]۔

---

[۱] "نظام علی خاں" جلد اول صـ۳

حالانکہ اس مہر میں "عماد الدولہ" صاف طور سے کندہ ہے۔ ممکن ہے کہ خطابات بدلتے رہے ہوں۔ مآثر الامراء میں خطاب صرف "شجاع الملک امیر الامراء بسالت جنگ" درج کیا ہے۔ بہرحال نام و خطاب کی یہ ترتیب پیش نظر ماخذوں میں درج نہیں ہے۔ دوسرے اور ماخذات فی الوقت پیش نظر نہیں ہیں۔

بہرحال مآثر الامراء کا بیان ہے کہ خطاب خانی اور بسالت جنگ باپ کی زندگی میں ہی حاصل ہو چکا تھا۔ نواب صلابت جنگ مرحوم کے دور میں اولاً نظر بند رہے پھر بیجاپور کی صوبہ داری کے عہدہ پر ماموری عمل میں آئی۔ کچھ عرصہ کے بعد وکیل مطلق کے عہدۂ جلیلہ پر مامور ہوئے۔ ۱۱۷۲ھ میں نواب میر نظام علی خاں مرحوم ولی عہد قرار پاکر برار سے نواب صلابت جنگ مرحوم کی ملاقات کو آئے تو نواب بسالت جنگ بیجاپور کی جانب روانہ ہو گئے۔ تین بعد میں آکر پھر دخیل ہو گئے۔ آمدنی کم اور خرچ بڑھ گیا۔ حاشیہ کے لوگ انتظام سے عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ انھوں نے کنارہ کشی کر لی۔ نواب میر نظام علی خاں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر نواب بسالت جنگ ادہونی کی جانب روانہ ہو گئے اور حصول اقتدار کے لیے کوشش میں مصروف ہوئے۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ

"اندیشہ ہائے چند در چند بخاطر راہ داد، چوں کارے پیش نہ رفت و اکثر محالات صوبۂ بیجاپور بتصرف مرہٹہ و حیدر علی خاں در آمد بر بعضے محالات سرکار امتیاز گڈھ ادہونی و فیروز گڈھ رائچور قناعت دارد"[1]

مآثر الامرا میں یہ جو لکھا ہے کہ "اندیشہ ہائے چند در چند بخاطر راہ داد" اس سے مطلب حصول حکمرانی کی کوشش ہے۔ اس کی تصدیق پیش نظر مراسلت سے بھی ہوتی ہے۔

---

[1] مآثر الامرا جلد سوم ص ۳۲۲ و ص ۲۳۰ ۔

غرض ۱۴ ذی الحجہ ۱۱۷۵ھ کو نواب صلابت جنگ نے امور سلطنت سے کنارہ کشی کرلی اور نواب میر نظام علی خاں مسند آصفی کے زینت بخش ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ادھونی میں پہنچنے کے بعد نواب بسالت جنگ نے یہ کوشش شروع کی کہ نواب محمد علی خاں والاجاہ کو اپنی جانب ملالیں۔ افسوس ہے کہ ابتدائی مراسلت اس وقت موجود نہیں ہے۔ درمیانی مراسلت کے بعض کاغذات موجود ہیں۔ ان کی تفصیل ذیل میں ملاحظہ فرمائی جائے۔

معلوم ہوتا ہے کہ نواب بسالت جنگ نے بعض امور کو بالمشافہ ظاہر کرنے کے لیے دربار کرناٹک کے ایک امیر خواجہ سعد اللہ خاں کو اپنے پاس طلب کیا۔ نواب بسالت جنگ کا خط موجود نہیں ہے البتہ نواب والاجاہ نے ۶ ربیع الثانی ۱۱۷۵ھ کو جو خط لکھا اس کا مسودہ حسب ذیل ہے۔

(۱)

"۶ ربیع الثانی ۱۱۷۵ھ نوشتہ شد

بنام نواب بسالت جنگ

عنایت نامہ تفضل آمود مشحون التفات تضمین چینا پٹن درباب روانہ کردن خواجہ سعد اللہ خاں بہادر...... ورود فرمودہ معزز و مشکور ساخت....... درجناب تفضل انتساب طلب خان معزالیہ موجب تعجب خاطر فدویت مظاہر گردید۔ بہرکیف انصرام امر مرحمت التیام برجمیع مرام متحتم لاکن خان معزالیہ تکسر مزاج دارند و پسر ایشاں آں قدر بیمار کہ حق تعالیٰ فضل خود فرماید۔ ایں ہمہ کیفیت مشروحاً از معروضۂ خان بہادر بعرض ملازمان خواہد درآمد۔ بندہ بہ ہمہ حال از دولت خواہان سرکار فیض آثار.... آرزومند ادراک دولت

ملازمت موفور البرکت منتصور شود۔"

اس مکتوب کا مطلب یہ ہے کہ خواجہ سعد اللہ خاں کی طلبی کے لیے عنایت نامہ وصول ہوا۔ خان موصوف کی طلبی سے تعجب ہو رہا ہے۔ خان موصوف کسل مند اور ان کا بچہ شدید بیمار رہے۔ نواب والاجاہ نے خود کو نواب بسالت جنگ کا دولت خواہ ظاہر کیا ہے اور ملاقات کے لیے اشتیاق کا اظہار کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ نواب بسالت جنگ کو اس بات کی جلدی تھی کہ خواجہ سعد اللہ خاں خود کے پاس آئیں۔ نواب والاجاہ کا مندرجہ صدر خط جانے کے بعد قبل اس کے کہ وہ نواب بسالت جنگ کو پہنچ جاتا ایک اور عنایت نامہ وصول ہوا۔ یہ عنایت نامہ موجود نہیں ہے البتہ نواب والاجاہ نے جو جواب دیا اس کا مسودہ موجود ہے اور وہ حسب ذیل ہے:-

(۲)

"۹ ربیع الثانی ۱۱۷۴ھ نوشتہ شد۔

عرضی بجناب نواب بسالت جنگ

درعنایت نامۂ موسومۂ بندہ ارشاد شدہ بود کہ خواجہ سعد اللہ خاں بہادر را بجناح استعجال روانہ سازد تا بعد رسیدن ایشاں لوازم مطلوب الوقت بعنوانیکہ بار واسطہ توقف در عزیمت احقر بعمل نیاید از پیشگاہ عنایت .... خان بہادر مرحمت می شود۔ (یہاں یہ عبارت قلم زد کر دی گئی ہے کہ حسب الارشاد بخان معز الیہ در باب روانگی حضور پُر نور گفتہ شد) لاکن خان معز الیہ کسل مند اند و پسر ایشاں آں قدر بیمار کہ حق تعالیٰ فضل خود فرماید۔ ناچار متوقف۔ لہٰذا خواجہ عاصم خاں بہادر[۱] را در جناب

---

[۱] - خواجہ عاصم خاں نواب والاجاہ کے دیوان رہ چکے ہیں۔

تفضل انتساب روانہ نمود۔ مشروحاً کیفیت زبانی ایشان بعرض باریابان
آستان نوازش عنوان خواہد درآمد۔ ارزوے کمال است کہ ملازمانِ
بلا مساہمت رونق افروز وسادہ ریاست اعلیٰ (یہاں دکن کا لفظ
لکھ کر قلم زد کردیا گیا ہے) دیدہ شود۔ و درسر انجام این مرام بندۂ
عقیدت ارتسام جوہر فدویت و یکرنگی چنانچہ یادگار روزگار باشد
بظہور رساند۔ وجوہ تعویق و تدبیر ممانعت تاخیر سابق برین از عرایض
خواجہ سعد اللہ خاں بہادر بعرض درآمدہ باشد۔ انشاء اللہ تعالیٰ
درمعدودے بندہ از امور این جا بفراغ بہم می رساند و غیر از تقدیم
مراتب بندگیٔ آں جناب خیال دیگر درمیان نمی دارد آں ہمہ مفصل
خواجہ عاصم خاں بہادر بعرض والا خواہد رسانید۔ احقر از یاوری طالع
خود می دارند کہ مثل آں حضرت سردار جوہر شناس برگزیدۂ روساے
ذوی الاقتدار نظر توجہات بر احوال عقیدت آثار دارند از سبحانہ جلشانہ
با این ہمہ عطیات سایۂ ہزلیوال پایۂ ملازمان جناب را بجوارم مستظل دارد"

اس مکتوب کا مطلب یہ ہے کہ جو عنایت نامہ وصول ہوا تھا اس میں یہ ارشاد
ہوا تھا کہ خواجہ سعد اللہ خاں کو جلد روانہ کیا جائے۔ ان کے توسط سے چند ضروری
امور معلوم کرائے جائیں گے۔ تاکہ ان کے معلوم کرنے کے بعد میرے ارادوں میں کوئی
توقف نہ پیدا ہو۔ خواجہ سعد اللہ خود بھی کسل مند ہیں اور ان کا بچہ شدید بیمار ہے۔
اس لیے خواجہ عاصم خاں کو روانہ کیا جا رہا ہے۔ وہ سب کیفیت عرض کریں گے۔
خواہش تو یہ ہے کہ آپ کو ریاست اعلیٰ کی مسند پر دیکھوں (اصل مسودہ میں پہلے
ریاست دکن لکھا گیا تھا بعد میں اس کو ریاست اعلیٰ سے بدل دیا گیا ہے) اس
سلسلہ میں جو کوشش بندہ کی ہے اس کے لیے حاضر ہوں۔ اب تک جو تعویق ہوئی

اس کے وجوہ خواجہ سعد اللہ خاں کے عرائیض سے واضح ہوں گے۔ چند دن میں کرناٹک کے امور سے فراغت حاصل ہو جائے گی۔ آپ کی بندگی کے علاوہ کوئی اور خیال موجود نہیں ہے۔

رفتہ رفتہ نواب میر نظام علی خاں حیدرآباد میں کامل اختیارات کے حامل ہوتے جا رہے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نواب بسالت جنگ ادہونی میں حصول اقتدار کے لیے کوشش وسعی برابر کیئے جا رہے تھے۔ نواب والاجاہ کی تائیدو اعانت کے ساتھ انگریزی فوج کی خدمات حاصل کرنے کی دُھن اُن کو برابر لگی رہی۔ مندرجۂ ذیل مکتوب سے اسکی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ مکتوب نواب میر نظام علی خاں کی مسند نشینی سے چار ماہ قبل لکھا گیا ہے۔

عنایت نامہ جو حوالۂ مندرجہ لفافہ کے بموجب ۵ر شعبان کو وصول ہوا۔

―― (۳) ――

ہو الکریم

نامار نۂ ایالت مرتبت شہامت و بسالت منزلت

برادر عزیز القدر بورد مراحم والا باشند

مکتوب مرغوب مشتمل بر کیفیت احوال خسران مآل غلام مرتضیٰ خاں[۱] و نوید فتح قلعۂ ایلور بر تردد ات نمایاں مع کلید دست و یک عریضۂ نیاز تہنیت رسید و موجب انشراح موفور گردید ایں کار از تو آید و مردان چنیں کنند۔ آرے از ابتدا ہر شور بختے کہ طریق غدر و عناد با ایں دولت

۱۔ غلام مرتضیٰ خاں ویلور کے قلعہ دار اور حاکم تھے۔

خدا داد پیمود و بر کار فرمائی معدلت و غضب منتقم حقیقی و شامت نفس شوم
ابواب وبال و نکال ابدی بر روئے روزگارش کشود۔ ہر چند کہ زمانہ یکچند
با او مسامحت نمود از بس کور باطنی امساس بغربھی در دل ناعاقبت
اندیش جا گرفتہ او را بر سمر رعونت و ظہور حرکات ناشایستہ آوردہ
مستوجب عقوبات و استرداد مواہب ایزدی ساخت۔ چنانچہ ایں
معنی از بس اظہار و اشتہار محتاج تذکار نیست۔ مفضل متعال ہمیشہ
تائیدات غیبی مقرون روزگار دولت خواہان راسخ الاعتقاد....
شقاوت و استیصال نصیب اعدائے بد نہاد دارا د۔ آنچہ باید بکرات
بیشتر نگارش یافتہ و بفضل الہی در مقدمہ فرستادن جمعیت کلاہ
پوشان با عزیز القدر خواجہ سعد اللہ خاں ہیچ موانعے باقی نماندہ ما چشم
براہ انتظار و خاطر مشتاق ملاقات است۔ یقین کہ تا حال جمعیت
معہودہ را روانہ نمودہ خود ہم عازم حضور خواہند بود۔ والا الزم کہ
حالا بے اہمال ایں ہر دو امر اہم چہرہ آرائے فعل و شہود گردد کہ تعویق
و درنگ بعید از مناسبت است۔ دو مقدمۂ دیگر کہ حوالہ بمعروضۂ
سیادت و نقابت مرتبت محبت و اخلاص نشاں سید محی الدین صاحب
بود است ناد آں نیز می رسد۔ زیادہ چہ نوشتہ شود۔"

اس مکتوب کا مطلب یہ ہے کہ غلام مرتضیٰ خاں کی شکست اور ویلور کے قلعہ کی
فتح کا حال معلوم ہوا۔ قلعہ کی کنجی اور ۲۱ اشرفی نذر بھی وصول ہوئی، ابتدا سے یہ ہوتا
آیا ہے کہ جو بھی بد بخت اس ریاست کے متعلق غدر کیا وہ نقصان اٹھایا جس امر
کی ضرورت ہے اس کو کئی مرتبہ ظاہر کیا جا چکا ہے۔ سعد اللہ خاں کے ساتھ
کلاہ پوشوں کی فوج کو روانہ کرتے ہیں اب کوئی امر مانع نہیں ہے۔ اسی کا انتظار ہے۔

یقین ہے کہ اس وقت تک فوج بھیجی جا چکی ہوگی اور خود آپ بھی آ رہے ہوں گے۔ اگر ابھی اس کا موقع نہیں آیا ہے تو ضرور ہے کہ بلا تاخیر یہ دونوں امور عمل میں لائے جائیں۔ تعویق مناسب نہیں ہے۔

نواب بسالت جنگ خط پر خط لکھتے جا رہے تھے لیکن چونکہ خود نواب والاجاہ فرانسیسی سازشوں میں الجھے ہوئے تھے اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نواب بسالت جنگ کی فرمایش پوری نہیں کر سکتے تھے۔ بہر حال ایک اور خط بھی نواب والاجاہ کو وصول ہوا۔ وہ یہ ہے:-

عنایت نامہ جو حوالۂ مندرجہ لفافہ کے بموجب ۸ رشعبان ۱۱۸۱ھ کو وصول ہوا۔

— (۴) —

ہو الکریم

امارت و ایالت مرتبت شہامت و بسالت منزلت

برادر عزیز القدر مورد مراحم والا باشند۔

مکتوب مرغوب رسید و مضامین مندرجہ بوضوع آنجا میدہ خلوص محبت و رسوخ فدویت آں برادر عزیز القدر نقش نگین خاطر گردیدہ و توقع توقف در فرستادن جماعۂ کلاہ پوشان از روانہ شدن بطرف نیلور معلوم شد۔ مہم نیلور چنداں دشوار نیست کہ از آمدن ایں قدر جمعیت بایں خوب در انصرام آں تصورے راہ یابد۔ دریں ولا شہامت و عوالی پناہ۔ سید لطف اللہ خاں بہادر شکوہ جنگ با بلاغ اکثر مقدمات ضروری با نیل مقصود مامور شدہ می رسند۔ مشروحاً با تعلق شہامت مرتبت خواجہ سعد اللہ خاں بہادر بتقریر مراتب مفوضہ خواہند پرداخت۔ چوں

بالفعل الحاق فوج مطلوبہ در حضور ضرور است باید کہ زود خواجہ سعد اللہ
خاں بہادر را با جمعیت کلاہ پوشاں وغیرہ روانہ سازند۔ باز اگر اہم
خواہد بود فوج سرکار برائے معاونت تعین بلکہ رایات عالیات بامداد آں
برادر عزیز القدر مصروف خواہد شد۔ ہر چند کہ فوج کلاہ پوشاں بسرعت
سریعہ خواہد رسید موجب ظہور خلوص محبت و کمال عقیدت آں عزیز القدر
خواہد بود۔ زیادہ چہ نوشتہ شود۔ بیعض خاص۔

اس خط کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا مکتوب وصول ہوا۔ اور آپ کے خلوص محبت کا حال معلوم ہوا۔ کلاہ پوشوں (انگریزوں) کی فوج کا نیلور کی جانب روانہ ہونا بھی معلوم ہوا۔ نیلور کی مہم اس قدر دشوار نہیں ہے کہ فوج کے یہاں آنے میں کوئی قصور ہو۔ سیف اللہ خاں شکوہ جنگ وہاں آ رہے ہیں۔ یہ خواجہ سعد اللہ خاں کے ساتھ تفصیل سے سب امور آپ پر واضح کریں گے۔ فوج کا آنا ضروری ہے اس لیے جلد خواجہ سعد اللہ خاں کو کلاہ پوشوں کی جمعیت کے ساتھ روانہ کیا جائے۔ اگر کچھ ضرورت ہو تو نہ صرف سرکاری فوج آپ کی مدد کو آئے گی بلکہ میں خود بھی آؤں گا۔ کلاہ پوش جس قدر جلد آئیں گے اس قدر زیادہ آپ کا خلوص اور عقیدت واضح ہوگی۔

نواب بسالت جنگ نے دو تین دن ٹھہر کر پھر اسی مطلب کا خط لکھا کہ انگریزوں کی فوج بھیجی جائے۔ اس زمانہ میں ان کے نام دہلی سے بھی کوئی فرمان آیا تھا اس کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

عنایت نامہ جو حوالۂ مندرجہ لفافہ کے بموجب ۲ر شعبان ۱۱۷۵ھ کو وصول ہوا۔

(۵)

ہو الکریم

امارت و ایالت مرتبت شہامت و بسالت منزلت

برادر عزیز القدر مورد مراحم والا باشند

دریں زمان فرخندہ عنوان فرمان والا شان مشتمل بر تفضلات فروان شرف ورود ارزانی فرمود۔ نظر بر ایں کہ ظہور چنیں لطیفہ خجستہ باعث ابتہاج قلوب فدویان صادق الولاست نقل آں ملفوف ایں نوشتہ احداد یافتہ۔ بفضل جلوہ گری شاہد عنایات شاہنشاہی بر ما و جمیع دولت خواہان خصوصاً آں برادر عزیز القدر فرخندہ و مبارک باد۔ از روے نوشتہ کہ قبل ازیں مصحوب شہامت و عوالی پناہ سید لطف اللہ خاں بہادر شکوہ جنگ روانہ شدہ و تقریر خان مذکور باتفاق شہامت و عوالی مرتبت خواجہ سعد اللہ خاں بہادر کیفیت تو۔ خاطر و مرکوزات باطن مفصل معلوم گردیدہ باشد۔ مسموع گشتہ کہ بعون افضال یزدی کہ شامل حال فدویان راسخ الاخلاص است نجیب اللہ خاںؑ خام کار نقد ثبات در باختہ راہ فرار گرفت و نیلور باسانی بتصرف در آمد۔ ہر آئینہ دریں صورت موانع روانگی جمعیت کلاہ پوشان نیز از میان رفع گردید۔ یقین کہ فوج مذکور را ہمراہ خواجہ سعد اللہ خاں بہادر روانہ نمودہ باشند۔ والا حالا کہ مقدمہ بونکنور فیصل شدہ موکب منصور بکوچ ہاے متواتر متوجہ سمت کڑپہ است می باید خاں مرقوم را با فوج کلاہ پوشان بلا اہمال روانہ حضور نمایند۔ ہر چند کہ مسرعاً و مستعجلاً زود ملحق شوند بجاء اصلح و اگر بعدہ آں عزیز القدر ہم بقصد ملازمت پرداز ند مستاورد چندیں مقدمات اہم دعمدہ دفواید موفور

ؑ۔ نجیب اللہ خاں نواب والاجاہ کے بھائی اور نیلور کے حاکم تھے۔

درضمن آں متصور است ۔ زیادہ چہ نوشتہ شود ، بیض خاص ۔

اس مکتوب کا مطلب یہ ہے کہ ان دنوں جو فرمان والاشان (دہلی سے) صادر ہوا ہے اس کی نقل ملفوف ہے ۔ شاہنشاہ کے عنایات ہیں اور ہمارے سب ہواخواہوں کو مبارک ہوں ۔ اس سے قبل شکوہ جنگ کے توسط سے جو خط ارسال کیا گیا ہے اس سے نیز خود موصوف کی گفتگو سے ہمارا مدعا معلوم ہوچکا ہوگا ۔

معلوم ہوا کہ نجیب اللہ خاں ہار مان چکے اور نیلور پر آپ کا تصرف ہوچکا ہے اس طرح کلاہ پوشوں کی روانگی میں جو امر مانع تھا اس کا ازالہ ہوچکا ۔ یقین ہے کہ سعد اللہ خاں کے ساتھ یہ فوج جلد آئے گی ان دنوں میں جانب کڑپہ جا رہا ہوں فوج مذکور جلد روانہ کی جائے ۔ جس قدر جلد یہ فوج آئے گی بہتر ہوگا ۔ اس کے بعد خود آپ بھی آئیں ۔ چند امور میں شورت کرنی ہے ۔

معلوم ہوتا ہے کہ نواب والاجاہ نے فوج نہیں بھیجی اس اثنا میں نواب میر نظام علی خاں نے حکومت حاصل کرلی (۱۴ ذی حجہ ۱۱۷۴ھ) نواب بسالت جنگ ادھونی میں ہی رہے اور اپنے خیالات خام میں محو اور منہمک ۔ ان سب تفصیلات کی وضاحت یہاں بے محل ہے ۔

نواب صلابت جنگ نے ۱۱۷۲ھ میں شمالی سرکاروں کو انگریزوں کے سپرد کیا ۔ ان سرکاروں میں مرتضیٰ نگر (گنٹور) کا علاقہ بھی شامل تھا ۔ اس علاقہ کو نواب بسالت جنگ کی جاگیر میں شمول حاصل تھا ۔ ایک مکتوب میں اس کا جو تذکرہ کیا گیا ہے وہ ذیل میں ملاحظہ ہو ۔

عنایت نامہ جو حوالۂ مندرجہ لفافہ کے بموجب ۲۹ شعبان ۱۱۷۶ھ کو وصول ہوا ۔

(۶)

ہوالکریم

امارت و ایالت مرتبت شہامت و بسالت منزلت

برادر عزیز القدر مورد مراحم والا باشند۔

عرضداشتے کہ دریں ولا شہامت و جلادت دستگاہ جارجی پیکٹ گورنر ورچیناپٹن بوفور عقیدت و اعتقاد ارسال حضور نمودہ از نظر گذشت۔ معروض داشتہ کہ نواب نظام الدولہ بہادر[1] سند پنج سرکار شمالی رویۂ فرخندہ بنیاد عنایت کردہ اند۔ وراں مرتضی نگر ہم داخل است اما بگفتۂ عمدۃ الملک سراج الدولہ بہادر[2] کہ سرکار مذکور متعلقہ سرکار است بکپتان چیناپٹن نوشتہ کہ تعلقہ داران سرکار مرتضی نگر را بہیچ وجہ مزاحمت نرسد کہ شرط ارادت و کمال عقیدت بندہ کہ نسبت بہ ایں جناب دارد نیست۔ دلبسراج الدولہ بہادر نیز گفتہ کہ مرکوز خاطر بندہ انقیاد و امداد اولاد حضرت مغفرت منزلت است۔ و بہ عبدالکریم خاں کہ حالا در کن دیرا ست وقایم دوستی ارقام نمودہ کہ ارادۂ خاطر مصروف بر حراست و اقیست تعلقات سرکار و استقامت ریاست سرکار والا است۔ مفصل ایں معنی از نوشتہ سراج الدولہ بہادر روشن و ہویدا خواہد شد۔ ظہور ایں معنی موجب شہود مآثر حقوق موروثی و وثوق فدویت و اعتقاد آں برادر عزیز القدر و باعث مسرت بوفور گشت۔ آرے شیوۂ مرضیۂ سرداران و اخلاص کیشان صادق الاعتقاد ہمیں است کہ آں شہامت مرتبت غائبانہ باستحکام تمام بعمل آوردند۔ حق تعالی مرکوزات خاطر را کہ آں برادر عزیز القدر را

---

[1] نواب آصف الدولہ صلابت جنگ۔ [2] نواب محمد علی خاں والاجاہ۔

شریک دولت ساختہ بمراتب اعلیٰ رسانیدہ شود باحسن وجہ جلوہ نمود
بخشند۔ باعث تعجب است کہ آں برادر احلا ازیں مقولہ چیزے
نہ نوشتند۔ بایستے کہ از نوشتۂ آں عزیز القدر جواب وسوال مشروحاً
سمت ایضاح می یافت و مراتبے کہ گورند در حوالہ بر نوشتۂ آں لبیالت
منزلت دادہ است مفصل مفہوم می گشت۔ آ لحال ہم زود باید نوشتہ
دیگر مشروحاً با بلاغ تہا مت و حوالی پناہ محمد شاہ نثار خاں بہادر وضوح
خواہد شد۔ ہر قدر کہ مساعی مفید در کار سرکار بکار خواہد رفت و رسعی
کار آں بر دار است۔ زیادہ دیدہ نوشتہ شود۔ بعض خاص۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ چینا پٹن (مدراس) کے گورنر کی عرضداشت جو خود عقیدت
سے لکھی گئی ہے وصول ہوئی۔ اس عرضداشت میں مرقوم ہے کہ نواب نظام الدولہ نے
دہ شمالی سرکاروں کی سند عطا کی۔ ان میں مرتضیٰ نگر بھی داخل ہے۔ لیکن عمدۃ الملک
(نواب والاجاہ) کے کہنے کی بنا پر مدراس کے عہدہ دار کو لکھ دیا ہے کہ مرتضیٰ نگر
کے تعلقہ داروں کو کسی طرح سے مزاحمت نہ کی جائے۔ مزاحمت ارادت اور عقیدت
کے منافی ہوگی۔ گورنر نے یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے آپ سے یہ کہا ہے کہ ان کا
منشا حضرت مغفرت منزلت کی اولاد کی اطاعت اور امداد ہے۔ نیز عبدالکریم خاں
کو جو فی الوقت کنہ ویر میں مقیم ہیں یہ لکھا ہے کہ ارادہ یہ ہے کہ ہمارے علاقہ کی حفاظت
اور ہماری ریاست کی استقامت کی جائے۔ گورنر نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ تمام امور آپ کے
خطوط سے مفصل طور سے واضح ہوں گے۔ آپ نے یہ جو کوشش کی اس سے آپ
کی وفاداری ظاہر ہوئی تعجب ہے کہ آپ نے اب تک اس بارے میں کچھ نہیں لکھا۔
اب جلد لکھ بھیجیں۔ دوسرے امور محمد شاہ نثار خاں کے مکاتیب سے واضح ہو
گئے۔

نواب صلابت جنگ کے انتقال کے بعد نواب بسالت جنگ ادھونی میں علانیہ نواب نظام علی خاں کے مخالف اور آمادۂ پیکار ہو گئے۔ نواب نظام علی خاں نے ادہونی کا قصد کیا۔ نواب بسالت جنگ میں تاب مقاومت نہیں تھی۔ ۱۵ صفر ۱۱۷۸ھ کو اطاعت قبول کر لی۔

اطاعت قبول کرنے سے قبل محرم کے مہینے میں نواب والاجاہ کو جو خطوط لکھے ان کے من جملہ دو خطوط موجود ہیں اور وہ ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

عنایت نامہ جو کہ حوالۂ مندرجہ لفافہ کے بموجب ۱۰ محرم ۱۱۷۸ھ کو وصول ہوا۔

(۷)

ہو الکریم

امارت و ایالت مرتبت شہامت و بسالت منزلت

برادر عزیز القدر مورد مراحم والا باشند۔

رسوخ فدویت و دولت خواہی موروثی آں عزیز القدر مرکوز خاطر بودہ۔ آں امارت مرتبت را اعتقاد ایں دولت خداداد دانستہ از دل می خواہیم۔ و مرکوز باطن چناں است کہ مہام عمدہ باتفاق آں امارت مرتبت صورت سر انجام باید ؎

دو دل یک شود بشکند کوہ را۔ چوں بعضے امور ضروری کہ الحال مرکوز خاطر است بواسطۂ تحریر و پیام تمہید بیان نمی تواند یافت۔ لہذا قبل ازیں ارقام یافتہ کہ شہامت و عوالی مرتبت خواجہ سعد اللہ خاں بہادر بلا اہمال جریدہ باسرع الوقت روانہ حضور سازند تا حاصل مکنونات باطن شدہ زود تر نزد آں عزیز القدر رسیدہ ابلاغ نمایند کہ سر انجام امور مذکور فواید عظیم دارد۔ یقین کہ بہادر مذکور را بمجرد ورود نوشتۂ مسطور

روانۂ حضور کردہ باشند ۔ اگر روانہ شدہ اند بہتر والا از آنجا کہ فرصت وقت کم و بہادر مذکور ادریں جا رسیدہ باز بآں صوب رخصت شدنی است۔ حالا نظر بر دولت خواہی سرکار بے درنگ و توقف بر ترخیص بہادر مرقوم پروازند ہر چند کہ رسیدن بہادر مزبور بسرعت سریعہ صورت پذیر شود موجب استرضائے خاطر خواہد بود زیادہ چہ نوشتہ شود۔ بیض خاص

شرح دستخط خاص :۔ " بہ تعجیل عجیل زود روانہ نمایند کہ منتظر ایم "

بیض خاص ۔

اس خط کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی خیر خواہی دل میں گھر کیے ہوئے ہے ۔ آپ کو اپنی ریاست کا ستون خیال کرتا ہوں ۔ میرا منشا یہ ہے کہ امور اہم آپ کے اتفاق سے انجام پذیر ہوں ۔ چند امور ایسے دل میں ہیں کہ لکھنا مناسب نہیں ہے ۔ اس سے قبل لکھا جا چکا ہے کہ خواجہ سعد اللہ خاں کو جلد روانہ کیا جائے تا کہ بعض راز دل سے واقف ہو کر آپ کو بھی ان سے آگاہ کریں ۔ ان امور کو انجام دیا جائے تو بڑے فواید حاصل ہوں گے ۔ یقین ہے کہ خواجہ سعد اللہ خاں روانہ ہو چکے ہوں گے ۔ اگر ابھی روانہ نہیں ہوئے تو جلد روانہ ہوں ۔ فرصت کم ہے ۔

عنایت نامہ جو کہ حوالۂ مندرجۂ لفافہ کے بموجب ۲۱ محرم ۱۱۷۸ھ کو وصول ہوا۔

—— (۸) ——

۷۸۶ ھو الکریم

امارت و ایالت مرتبت شہامت و بسالت منزلت

برادر عزیز القدر مورد مراحم والا باشند۔

رسوخ فدویت و دولت خواہی موروثی آں عزیز القدر مرکوز خاطر بودہ آں امارت مرتبت را اعتقاد ایں دولت خداداد دانستہ از دل می خواہیم۔

مرکوز باطن چناں است کہ مہام عمدہ باتفاق آں امارت مرتبت صورت سرانجام یابد۔ ؎ دو دل یک شود بشکند کوہ را۔

بعضے امور ضروری کہ الحال مرکوز خاطر است بواسطۂ تحریر و پیام تمہید بیان نتوانست یافت۔ لہذا ارقام می یابد کہ بمجرد ورود این نخشتہ شہامت و بسالت مرتبت خواجہ سعد اللہ خاں بہادر را بلا اہمال جریدہ باسرع الوقت روانۂ حضور سازند تا حامل مکنونات باطن شدہ زود تر نزد آں عزیز القدر رسیدہ ابلاغ نمایند کہ سرانجام امور مذکور فواید عظیم دارد۔ بہادر مذکور ہر قدر بہ تعجیل برسد اصلح۔ زیادہ چہ نوشتہ شود" بیض خاص۔

شرح دستخط خاص :۔" الزم کہ بہادر مسطور را زود روانۂ حضور نمایند۔"

اس کا مطلب وہی ہے جو ماقبل خط کے سلسلے میں تحریر کیا جاچکا ہے۔

مخطوطات کے خزانے

تاریخ عزیز اللہ

از جناب مولوی حافظ محمد مظہر صاحب

مجلۂ طیلسانین کے شمارہ اول جلد ۵ میں تاریخ حیدرآباد مصنفہ منشی عزیز اللہ کا اقتباس درج ہوا ہے اور اس کی نسبت چند دریافت طلب امور بھی درج ہیں۔ ان کی کچھ توضیح تا بحد علم کی جاتی ہے۔

ڈیڑھ سو سال پہلے گورنر جنرل اور رزیڈنٹوں کے پاس میر منشی کا عہدہ بہت اہم رہتا تھا اور اس پر عموماً فارسی داں علما، فضلا مامور ہوا کرتے تھے۔ والیان ریاست کی برتری کی وجہ سے فارسی دان سلطنت ناگزیر تھی اس لیے تمام اہم اور راز کے امور ان کے فرائض منصبی میں شامل تھے۔ معقول ماہوار ملا کرتی تھی اور ریاستوں سے بھی کافی انعام و اکرام کا موقع تھا۔

منشی عزیز اللہ [illegible] جاہ کی [illegible] کے دور میں رزیڈنسی کے میر منشی تھے اور بڑا تقرب تھا۔ سرکار خلافت مدار کی خیر خواہی کا زیادہ دم بھرتے تھے۔ غالباً بہار کے رہنے والے تھے۔ ان کی کتاب دلچسپ اور معلومات سے لبریز ہے۔

نواب محسن الملک مرحوم نے دفتر گزیٹر یعنی دفتر ترتیب تاریخ قایم کیا تو فارسی کی نایاب اور کمیاب کتب تاریخ بھی بہ مصارف کثیرہ خرید کر مہیا کی تھیں کتب فارسی کی ایک فہرست حیدرآباد آفیرس (انگریزی) کی کسی جلد میں طبع بھی ہوئی ہے۔

یہ سنا گیا ہے کہ دفتر گزیٹر کی کتابیں جس کے ہاتھ لگیں اس کے پاس رہ گئیں۔ راقم نے [illegible] آں جہانی نائب معتمد محکمہ وضع قوانین اولاً محکمہ معتمدی فینانس کے

دگار تھے اور صیغۂ گزیٹر ان سے متعلق تھا۔ ان کے پاس بھی چند کتابیں دفتر گزیٹر کی ہ گئی تھیں۔ ذوق علم اور اردو فارسی دانی کی وجہ فارسی اور اردو کی ذاتی کتابیں بھی ان کے س تھیں۔ انگریزی کتب کا بھی کافی ذخیرہ تھا۔

رائے حکم چند کے مرنے کے بعد ان کی انگریزی اور اردو قانونی کتابیں محکمۂ وضع قوانین ں خرید لی گئیں۔ دوسری فارسی اور اردو کتابیں ان کے فرزند رائے رتن چند آں جہانی فروخت رتے چلے گئے۔ چند کتابیں مولوی علی محمد صاحب کی معرفت سے مولانا محمد مرتضیٰ مرحوم کے اس بھی فروخت کے لیے آئیں اور وہ خرید لی گئیں۔ ان کے من جملہ ایک زیر تذکرہ کتاب ھی تھی۔ ایک اور کتاب سررشتۂ عدالت سرکار عالی کی پہلی رپورٹ تھی جو مولوی مشتاق حسین قار الملک مرحوم نے فارسی میں مرتب کی تھی۔ اس رپورٹ کا اقتباس نواب فتح نواز جنگ مرحوم بر مجلس وقت نے اپنی مرتب کردہ سررشتۂ عدالت کی پہلی اردو رپورٹ میں درج کرلیا ہے۔

ان دونوں کتابوں کا تعلق دفتر گزیٹ سے رہنے کا اندراج کتابوں پر بھی تھا۔ دو روز کے بعد نہ معلوم کیا بات پیش آئی کہ رائے رتن چند نے قیمت واپس کرتے ہوئے دونوں تابیں یہ کہہ کر طلب کرلیں کہ وہ سرکاری کتابیں ہیں غلطی سے فروخت ہو گئی ہیں سرکار میں ۔ اپس ہونے کی ہیں۔ کتاب کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے مولانا محمد مرتضیٰ مرحوم نے دن بھر بیٹھ کر وہ خلاصہ مرتب کرلیا جو مجلہ میں شایع کیا گیا ہے۔ انہوں نے دوسرے دن تابیں واپس کردیں۔

میرا خیال ہے کہ یہ کتابیں سرکار میں واپس نہ کی گئی ہوں گی۔ رائے رتن چند آں جہانی کے پاس ہی ہ گئی ہوں گی رائے بیج ناتھ صاحب وظیفہ یاب معتمد مجلس وضع قوانین کو ممکن ہے کہ کچھ علم ہو یا ممکن ہے کہ کتب محکمۂ وضع قوانین میں رکھ دی گئی ہوں گی دفتر گزیٹر کی باقی ماندہ کتابیں محکمۂ فینانس میں تھیں۔

بہر طور کتاب جس کا سرسری مطالعہ میں نے بھی اس زمانہ میں جس پر کم و بیش چالیس سال زر چکے ہیں کیا تھا نہایت دلچسپ تھی۔ فقط

تنقید و تبصرہ

۱- "ناصر جنگ شہید"

از مدیر مجلہ

یہ کتاب ابن مظہر قاضی معین الدین رہبر فاروقی کی تالیف ہے۔

مولف جو ایک اخلاص پسند نوجوان ہیں مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اپنے ملک کی تاریخ کو روشن کرنے کی کامیاب کوشش و سعی میں سرگرمی اور ذوق و شوق کے ساتھ مصروف ہیں۔

زندہ قوموں میں اپنی تاریخ کو بچہ کی گھٹی میں داخل کیا جاتا ہے لیکن ہمارے خواب غفلت کی دلیل اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ اپنی زبان میں ہم نے اب تک نہ تو حضرت آصف جاہ اول کی سوانح زندگی مرتب کی اور نہ سالار جنگ اول کے کارناموں کو کسی تالیف کا جامہ پہنایا۔ خود مملکت آصفیہ کی تاریخ بھی استناد اور پورے مواد کے احصاء کے ساتھ نہیں لکھی گئی۔

ان حالات میں ملک کا ہر وہ فرد جو اپنے ملک کی تاریخ کی تھوڑی بہت خدمت کرنا چاہتا ہے ستایش اور ہمت افزائی کا مستحق ہے۔ لیکن ملک میں اس کا بھی فقدان ہے۔ توقع ہے کہ رہبر فاروقی صاحب ہمت افزائی نہ پا کر ہمت نہ ہار دیں گے بلکہ حتی المقدور اپنے مطالعہ اور کام میں کسی نہ کسی طرح مشغول رہیں گے۔

مولف نے جس موضوع پر اپنے معلومات اور مطالعہ کے نتائج مرتب کیے ہیں اس کے متعلق یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یہ موضوع ابھی تنقیح و تنقید کا بہت محتاج ہے۔

بہت مواد ابھی منتشر اور پراگندہ ہے۔ یہ سب مواد کسی ایک مرکز پر مہیا بھی نہیں ہے۔

نواب ناصر جنگ شہید کے مختصر دور حکومت میں ہی سرزمین دکن پہلی مرتبہ ہندوستان کے حکمرانوں کی تبدیلی کا تماشا گاہ بننے لگی لیکن اب تک اس دور پر کسی نے جامعیت کے ساتھ قلم اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ اس تماشہ گری میں اکیلے ناصر جنگ کا ہی حصہ نہیں تھا۔ اتفاق سے فارسی مآخذوں سے جو مواد مہیا ہو سکتا ہے وہ زیادہ تر ایک ہی نقطۂ نگاہ کو پیش کرتا ہے۔ چاہے حیدرآباد میں مرتب کی ہوئی کتابیں ہوں یا کرناٹک میں لکھی ہوئی کتابیں سب ناصر جنگ شہید کے نقطۂ نظر کو سامنے لاتی ہیں۔ نواب مظفر جنگ کا نقطۂ نظر کسی طرح معلوم نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح پٹھان نوابوں کا نقطۂ نظر بھی عام طور سے معلوم نہیں ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ پٹھان نوابوں سے متعلق بعض بہت مفصل اور مبسوط کتابیں موجود ہیں۔ ایک دو کتابیں نظر سے گزر بھی ہیں لیکن یہ کتابیں عام طور سے دست یاب نہیں ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ابھی اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ کرناٹک کے نواب محمد علی خاں والاجاہ کے زمانے کی لکھی ہوئی متعدد کتابیں اب عام طور سے حاصل ہو جاتی ہیں۔ بعض کتابوں کا انگریزی میں بھی ڈاکٹر محمد حسین نینار نے ترجمہ کر دیا ہے لیکن کرناٹک کے صوبہ دار نواب انور الدین خاں شہید اور ان کے بیٹے نواب محمد علی خاں، نواب ناصر جنگ کے طرف دار تھے۔ ان کتابوں سے بھی باہمی مراسلت اور اندرونی ریشہ دوانیوں کی وہ تفصیلات حاصل نہیں ہوتی ہیں جن سے حقیقت حال بالکل بے نقاب ہو جائے۔ ساتھ ہی انگریزی، فرنچ، مرہٹی، اور ٹامل زبانوں کے مآخذوں سے بھی استفادہ ضروری ہے۔ امپیریل رکارڈ ڈپارٹ اور مدراس رکارڈ آفس نے اپنے کاغذات کے جو مجموعے شایع کیے ہیں وہ بہت بیش قیمت معلومات پر معنوی ہیں۔ اب تک اردو میں ان تالیفوں سے کوئی تلخیص و اقتباس بھی کسی نے شایع نہیں کیا۔ اسی طرح پانڈیچری کی انجمن تاریخ نے کاغذات کے جو مجموعے شایع کیے ہیں وہ

فرنچ زبان میں ہیں۔ لیکن بہر طور ان سے بھی استفادہ ناگزیر ہے۔ اسی طرح پونا سے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے انگریزی اور مرہٹی کا غذات کے جو مجموعے طبع اور شایع کر دیے ہیں ان سے مدد لینا لازمی ہے۔ پھر خود حیدرآباد کے علاوہ مدراس، دہلی، پانڈی چری، پونا اور دیگر مقامات میں جو اصلی کاغذات عام دست رس ہیں آچکے ہیں ان کو دیکھے بغیر کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے کوئی کامیاب سعی کی۔ تلنگی، مرہٹی اور کنڑی زبانوں میں تاریخ دکن کا جو مواد ہوگا اس سے اب تک ایک عام بے خبری ہے۔ ضرورت ہے کہ ان زبانوں کے جاننے والے ہر قسم کے کارآمد مواد کو ملک کی عام زبان میں نقل کرنے کی جانب دل سے مائل ہو جائیں۔ غرض کام کا میدان بہت وسیع ہے۔ کسی ایک فردکی کوشش سعی سے یہ مہم سر نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے بڑے سرمایہ اور بہت آدمیوں کی ضرورت ہے۔ آدمی بھی ایسے ہوں جو دھن کے پکے ہوں۔ صرف روپیہ کمانا مقصد نہ ہو۔ تعصب، جنبہ داری اور عصبیت سے دور ہوں۔ پھر کام ایسے اخلاص اور دل کے لگاؤ سے ہو کہ اس میدان کے سب کام کرنے والے کھنچے کھنچے ایک مرکز پر چلے آئیں۔ ایک کے معلومات سے دوسرا استفادہ کرے اور ایک کی لیاقت دوسرے میں نیا ذوق پیدا کرے۔ باہمی اعتماد اور خلوص کی فضا پیدا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ ایک کام کرے اور دوسرا محض اپنی شہرت اور نام آوری کی تلاش میں ہو۔ اس قسم کا سامان مہیا ہو تو پھر کچھ کام ہو سکتا ہے۔ کام کی اچھی بنیاد قایم ہوگی ورنہ حیدرآباد میں اچھی اچھی اسکیمیں بہت بنیں اچھے اچھے لوگ کام پر مامور ہوے، دور و نزدیک شہرت ہوئی لیکن کام لینے والا باقی نہ رہا تو سب کام گاؤخورد ہو گیا۔ گزیٹر کے متعلق ایک مختصر نوٹ اسی شمارہ میں ایک دوسری جگہ ملاحظہ فرمایا جائے۔ ایسے کتنے کام ہوئے جن سے ہم آج واقف بھی نہیں۔

غرض خود فارسی کتابیں بھی ابھی بہت سی ایسی ہیں کہ عام طور سے دست یاب نہیں ہوتیں۔ خود ان کو بھی ایک جگہ جمع کرنے کی کوئی حقیقی، مستقل، باقاعدہ اور مسلسل کوشش نہیں ہوئی۔ مثلاً نواب ناصر جنگ کے ایک درباری کوئی نور محمد خاں تھے۔ نور محمد خاں خطاب ہے۔ اصلی نام معلوم نہ ہو سکا۔ ان کی ایک تالیف مدراس میں مولانا قاضی محمد حبیب اللہ صاحب کے کتب خانہ میں داخل ہوئی تھی۔ کتاب کا موضوع وہ جد و جہد ہے جو کرناٹک میں نواب ناصر جنگ شہید کی جانب سے عمل میں آئی۔ یہ کتاب نقل کرا کے کتب خانہ دفتر دیوانی میں پیش کی گئی۔ ناصر جنگ پر قلم اٹھانے والے ہر طالب علم منتہی کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔ مولف خود معرکوں میں شریک رہ چکے ہیں۔ سب حالات چشم دید اور ذاتی آگاہی کی بنا پر لکھے ہیں۔ مدراس کے انگریز عہدہ داران کمپنی سے جو گفت و شنید ہوئی اس میں بھی مولف کا حصہ تھا۔ یہ سب امور کہیں تفصیل سے اور کہیں اختصار سے بیان کیے ہیں۔ کمپنی کی فوجوں کے طور طریقے اور ان کے عام حالات کا بھی اچھا تذکرہ ہے کتب خانہ سعیدیہ میں کاغذات اور کتابیں جو مہیا ہیں ان سے بھی مدد لینا ضروری ہے۔ اس کتب خانہ کے مخزونہ کاغذات اور دو ایک کتابوں کے متعلق خود اسی مجلہ میں ایک سے زیادہ مضامین شایع ہو چکے ہیں۔

مولف نے "پیش کتاب" میں یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ "مرے ہوؤں کو برا بھلا کہنے کا یہ وقت نہیں"۔ لیکن اس کے باوجود دو ایک لوگوں کو "رسوائے سر بازار" قرار دیتے ہیں بھی مولف نے کچھ جلدی ضرور کی ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ واقعات اور حالات ابھی بہت کچھ تاریکی میں ہیں۔ سب فریقوں کا متعلقہ مواد ابھی فراہم نہیں ہوا ہے۔ اس کے بغیر کوئی رائے کس طرح ظاہر کی جا سکتی ہے۔ مثلاً کرناٹک میں جو کتابیں مرتب ہوئیں ان میں صاف صاف یہ لکھا ہے کہ قصور دوسرے

فریقوں کا ہے۔ ان بیانات کی تنقید اور تردید بے لاگ طور سے ہونا ابھی باقی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس افراتفری کے عالم میں ہر شخص اقتدار حاصل کرنے کا مستحق تھا۔ چونکہ مرکز بے اقتدار ہوتا جا رہا تھا اس لیے لامحالہ ضرور تھا کہ سنۃ التاریخ کے بموجب ہر وہ شخص جس میں قابلیت اور صلاحیت ہو ہاتھ پیر مارے۔ اس کے لیے کسی پر کوئی الزام نہیں رکھا جا سکتا۔ ان حالات میں جو اس وقت پیدا ہوئے عام طور سے ہر شخص دوسری کا تخیل پکایا ہی کرتا ہے۔ ہر صاحب حوصلہ بازی لگایا ہی کرتا ہے۔ ہمیشہ سے یہی دستور ہے۔ بالآخر لائق آدمی حاوی ہو جاتا ہے۔ اس وقت انگریزوں میں حاوی ہو جانے کی اہلیت تھی اس لیے وہ حاوی ہو گئے۔ چندا صاحب اور نواب محمد علی خاں اقتدار کے حصول کے لیے اگر جد و جہد کی تو کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اگر وہ مرکز جس سے یہ دونوں اپنے کو وابستہ ظاہر کرتے تھے قوی اور مستحکم ہوتا تو ان کو میدان میں آنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ دکن حضرت آصف جاہ کے انتقال کے بعد باہمی آویزش کا آماج گاہ بن گیا۔ اگر حضرت آصف جاہ کے سب فرزند ایک بھائی کے اطراف استحکام سے جمع ہو جاتے اور ایک بھائی دوسرے بھائی کے لیے قوت بازو ثابت ہوتا تو ایک چندا صاحب کیا دس چندا صاحب بھی بار مان جاتے۔ لیکن نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ، نواب صلابت جنگ اور نواب بسالت جنگ اور نواب میر نظام علی خاں سب نے آپس میں اتفاق نہ کیا۔ بالآخر یہ نواب میر نظام علی خاں کی پامردی اور فرزانگی تھی کہ سلطنت آصفیہ آج بھی قایم اور سب ذرہ ربایان آصفی کے لیے فخر و انبساط کا باعث ہے۔ خود نواب ناصر جنگ بھی باپ کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور قوت و طاقت کا غیر ضروری زیاں ہوا۔

نواب ناصر جنگ کے حالات لکھتے ہوئے یا پڑھتے ہوئے ایک سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ حضرت آصف جاہ نے کس کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا؟

حضرت آصف جاہ کا ایک وصیت نامہ جو تاریخ دکن کی کتابوں میں درج کیا جاتا ہے اس کے استناد کے کیا ذرایع ہیں ؟ - اس کے متعلق اس تالیف میں کوئی بحث نہیں ہے اس کی بہت اہمیت ہے - بعض بہت مستند عصری مولفوں کا یہ بیان ہے کہ حضرت آصف جاہ نے نواب مظفر جنگ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا - ڈاکٹر باسو اسی خیال کے حامی ہیں اور اسی پر ان کو وثوق ہے - گو خود وصیت نامہ اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ نواب ناصر جنگ جانشین بنائے گئے لیکن نفس وصیت نامہ میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے - وصیت نامہ کی کوئی مصدقہ نقل دیکھنے میں نہیں آئی جن صاحب نے اس کو بیان کیا ہے نہ معلوم اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے یا بعینہ آصف جاہ کے الفاظ ہیں - کوئی بیان ایسا نظر سے نہیں گزرا کہ وصیت کے وقت کوئی صاحب کاغذ قلم لیکر حضرت آصف جاہ کے بولے ہوئے الفاظ لکھ رہے ہوں - بہر حال اس وصیت کے متعلقہ واقعات اور اس کے فحوا سے یہ امر ثابت ہو سکتا ہے کہ حضرت آصف جاہ چاہتے تھے کہ ان کے بعد نواب ناصر جنگ جانشین ہوں - سب سے اول یہ کہ یہ وصیت نواب ناصر جنگ کو کی گئی - دربار آصف میں لکھا ہے کہ :-

" درعین حالت قلق کہ روح قصد پرواز داشت وقت سہ پہر ناصر جنگ را طلبیدہ و بعضے کلمات وصایا بر زبان آوردند "

اس وصیت کے آخر میں ارشاد فرمایا کہ :-

" الحال بروید و مردم کارخانۂ خود بر کارخانجات مامور بکنید ....
شمارا بخدائے کریم سپردیم کہ ہدایت نصیب کند و درہمہ حال نصیر و معین شما باشد "

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت آصف جاہ نے نواب ناصر جنگ کو اپنا جانشین

نامزد کیا۔ دوسرے یہ کہ اس وصیت میں یہ ہدایت بھی فرمائی کہ:-

"برادران صغیر خود را بجائے فرزندان خود دانستہ پرورش نمایند۔"

اس سلسلے میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:-

"ہدایت محی الدین خاں (مظفر جنگ) را از جملہ فرزندان خود تصور فرمودہ بہ شفقت و عنایت ازاں خود گرداند و در صدد شکست نہ باشد و گوش بر سخن غمازان ندہد۔"

وصیت کے یہ سب حوالے دربار آصف سے ماخوذ ہیں۔ ان سب حوالوں سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت آصف جاہ نے نواب ناصر جنگ کو اپنا جانشین قرار دیا۔

اس سلسلے میں ایک بات مزید یاد رکھنی چاہیئے کہ وصیت کے مختلف متن ہیں کسی ایک کے مصدق ہونے کا قطعی ثبوت مہیا نہیں ہے۔ البتہ یہ امر صحیح ہے کہ گو الفاظ میں اختلاف ہے لیکن مفہوم اور معنی میں بہت بڑی حد تک اتفاق ہے۔ علاوہ ازیں یہ وصیت بالعموم ان کتابوں میں منقول ہے جن میں نواب ناصر جنگ کے حقوق مرجح سمجھے گئے ہیں۔ نواب مظفر جنگ کے طرفداروں کا کوئی بیان دیکھنے میں نہیں آیا۔ ڈاکٹر باسو نے بھی کوئی بہت ہی قطعی ثبوت پیش نہیں کیا ہے۔

اس کے بعد جو اہم ترین سوال پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ آخر نواب ناصر جنگ شہید سے نواب مظفر جنگ کو کس بنا پر اختلاف تھا؟ - وجہ مخالفت کیا تھی؟ مولف نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے تشفی نہیں ہوتی۔ مورخین نے جو کچھ لکھا ہے اور جس کو مولف نے دہرایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نواب مظفر جنگ خود کو جانشین خیال کرتے تھے۔ نواب ناصر جنگ نے کچھ بہتر سلوک نہیں کیا۔ اس بنا پر نواب مظفر جنگ آمادہ پیکار ہوگئے۔ جو مواد پیش نظر ہے چاہے وہ دست آویزی ہو یا

کتابی اس سے تا حال یہ امر متحقق نہیں ہوا کہ دکن میں اس بے عملی کے پیدا کرنے کا خیال اولاً کس کے ذہن میں پیدا ہوا؟ آیا دوپلے نے ابتدا کی یا مظفر جنگ نے یا چندا صاحب نے؟۔

سب مورخ یہ بیان کرتے ہیں کہ نواب ناصر جنگ شہید کی مخالفت اس بنا پر تھی کہ نواب مظفر جنگ نے نواب ناصر جنگ کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ بہ زور شمشیر اپنا اقتدار منوانا چاہا۔ لیکن نواب مظفر جنگ کس بنا پر اپنے ماموں کے مخالف تھے؟۔ ان کو کس نے آمادہ کیا؟ متوسل خاں[1] نے نواب ناصر جنگ سے اختلاف کیا تھا تو اس وقت فرانسیسی لوگوں کی سازش اور چندا صاحب کی مداخلت کا گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ متوسل خاں کے ساتھ نواب ناصر جنگ کا جو مقابلہ ہوا اس میں نواب مظفر جنگ بھی ماموں کے خلاف نبرد آزما تھے۔

اس سلسلہ میں مولف نے کچھ زیادہ تفحص نہیں کیا ہے۔ عام مورخوں کے بیانات اخذ کر لیے ہیں۔ اس سوال پر دوسرے لوگ بھی کچھ غور و فکر اور حالات کی تلاش میں منہمک ہیں چنانچہ ڈاکٹر راگھوان نے اس بارے میں مدراس کے چہار ماہی مجلّہ "جرنل آف انڈین ہسٹری" میں جو مضمون شایع کیا تھا اس کا خلاصہ اس مجلہ کے شمارہ ۴ جلد ۷ میں درج کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر رگھوان اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ چونکہ نواب ناصر جنگ نے متوسل خاں کو ہلاک کرا دیا تھا اس لیے نواب مظفر جنگ ماموں سے برگشتہ ہو گئے اور جب موقع ملا بدلہ لے لیا۔

غرض مختلف واقعات اور حالات کا کما حقہ تفحص ابھی ہونا ہے۔ پھر یہ سوال

---

[1] نواب مظفر جنگ کے والد۔ ان سے نواب ناصر جنگ کی لڑائی ہوئی تھی۔

پیدا ہوتا ہے کہ مغربی قوموں سے سب سے اول کس نے امداد طلب کی ؟۔ کس نے ان کو اپنا شریک کار مقرر کیا ؟ ۔ مولانا علامہ علی آزاد بلگرامی کے اس بیان سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ

"بنائے تسلط نصاریٰ ابتداً طرح کردۂ ہدایت محی الدین خاں است کہ بعد شہادت نواب نظام الدولہ (ناصر جنگ) چہرہ شدند و لذت ملک گیری دریافتند" (مآثر الامرا صفحہ ۸۲۔ جلد دوم و صفحہ ۴۴ جلد اول)

اس طرح جب ایک مغربی قوم اپنے جدید سازوسامان اور جدید طریق جنگ سے ایک فریق کی تائید کر رہی تھی تو لامحالہ ضرورتاً اور فطرتاً اس کی ضرورت بھی تھی کہ کسی دوسری مغربی قوم کو بھی میدان میں لایا جائے تاکہ باہمی توازن میں فرق نہ پیدا ہو ۔ اگر کسی نے نواب ناصر جنگ کو انگریزوں سے استمداد کی رائے دی تو اس پر کسی تعریف کا کم موقع ہے ۔ کرناٹک میں اس وقت انگریزوں کی جو حالت اور حیثیت تھی اس کی بنا پر کسی کو یہ خیال بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ تاجروں اور نوکروں کی یہ چھوٹی سی جماعت آگے چل کر سارے ہندوستان کی مالک ہو جائے گی ۔ ہندوستان پر انگریزوں کو حکومت جو حاصل ہو گئی اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ نواب ناصر جنگ نے اس وقت ان سے استمداد چاہی ۔ اس کے وجوہ اور اسباب تو بعد میں پیدا ہوئے ۔ ان پر غور کرنا فی الوقت پیش نظر نہیں ہے ۔

نواب ناصر جنگ کے لشکر میں انگریزوں کا جو فوجی دستہ آیا تھا اس کے مزید تفصیلات نور محمد خاں نے اپنی تالیف میں زیادہ تفصیل سے بیان کیے ان کے مطالعہ کے بعد ہی کوئی رائے قائم ہو سکتی ہے ۔

اس موقع پر ایک امر کی جانب اشارہ بے محل نہ ہوگا ۔ انگریز مولفوں کی

تالیفوں سے ہمارے ملک کے مولف بھی بالعموم اپنی تالیفوں میں انگلستانی تجارتی کمپنی کے اثر ونفوذ کو عام طور سے اس اسلوب میں پیش کرتے ہیں کہ اس وقت بھی ان کی شوکت وجاہ اسی نوعیت کی تھی جو کہ اب نظر آتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ موجودہ حالت کو دیکھ کر پہلی حالت کو بھی اسی پر قیاس کر لیا جائے۔ لیکن حقیقت حال اس کے برعکس تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نوکر چاکر اس وقت بہت معمولی حیثیت میں تھے۔ ہمارے عہدہ داروں اور صوبہ داروں کو وہ خداوند اور خدایگان خیال کرتے تھے ہماری نوکری کرنے کو عزت و افتخار کا سبب خیال کرتے تھے۔ ان کے جو فوجی دستے ہمارے لشکروں میں آتے تھے سو دوسو آدمیوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان کی دھاک اس وجہ سے بندھ گئی کہ اس وقت کے معیار سے وہ جدید اسلحہ لے لیں اور جنگ و جدل کے جدید قواعد وضوابط پر کاربند تھے۔ ہماری فوج علی غول کے جھتوں پر مشتمل تھی۔ ان میں مستعدی اور ڈسپلن مفقود ہو چکا تھا۔ ٹیپو سلطان اور نواب حیدر علی خاں نے اپنی فوجوں کو جدید اسلحہ سے آراستہ کر لیا اور جدید ضوابط جنگ جاری کر دیے تو مخالفوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ بہر حال اس وقت حیدرآباد کے فرمان روا اور ان کے صوبہ دار دوسروں کے آقا اور مخدوم سمجھے جاتے تھے۔ ہم دوسروں کے محتاج نہیں تھے، دوسرے ہماری نظر کرم کے امیدوار رہتے تھے۔

بعض غیر ہندوستانی مولفوں کو اس امر کی تلاش ہے کہ قاضی دایم کے توسط سے نواب ناصر جنگ اور دوپلے میں کیا گفت وشنید ہوئی۔ حدیقۃ العالم، تزک آصفیہ، سرو آزاد اور توزک والاجاہی بلکہ نور محمد خاں کی تالیف میں اس گفت و شنید کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ توزک والاجاہی میں ایک میر دایم علی کا کچھ حال موجود ہے۔ ممکن ہے کہ قاضی دایم یہی ہوں۔ لیکن ان کا جو حال قلم بند کیا گیا ہے وہ زیادہ تر یہ ہے کہ انھوں نے فوج میں کیا خدمات انجام دیے۔ جس روز نواب

ناصر جنگ کی شہادت ہوئی اس سے پہلے میر دایم علی نے سازش کا پتہ چلالیا تھا اور نواب ناصر جنگ شہید کو اس کی خبر کردی تھی لیکن نواب ناصر جنگ نے اس کو باور نہیں کیا۔

زیر تبصرہ کتاب میں قاضی محمد دایم کا تذکرہ ہے (صفحہ ۱۰۷) لیکن ان کو فرانسیسی لوگوں کے مخالف کی حیثیت میں ظاہر کیا گیا ہے۔ بہرحال زیر تبصرہ کتاب میں دوپلے کی گفت وشنید کا حال تاریخ راحت افزا اور تحفۃ الشعرا کے حوالہ سے موجود ہے لیکن یہ امر واضح نہیں ہوتا کہ یہ گفت وشنید کس کے توسط سے عمل میں آئی۔

نواب ناصر جنگ شہید کے حالات کے سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ پٹھان نوابوں کا طرز عمل ہے۔ اس سلسلہ میں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ ابتدا میں نواب ناصر جنگ کا ساتھ دینے اور ان کے جلو میں رہنے کے باوجود پٹھان نوابوں کو کس بنا پر نواب ناصر جنگ سے اختلاف پیدا ہوا؟۔ پٹھان نوابوں اور دوپلے کے مابین ایا کوئی عہد ہوا؟ یہ امر تو ثابت ہے کہ پٹھان نوابوں نے نواب ناصر جنگ کو شہید کردیا اور یہ بھی معلوم ہے کہ سب مخالفوں میں کوئی معاہدہ ضرور ہوا اور سازش ہوئی لیکن اس کی تفصیلات کا حال کما حقہ علم نہیں ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ پٹھان نوابوں سے نواب ناصر جنگ نے ابتدا میں کیا وعدے کیے۔ یہ وعدے پورے ہوے یا نہیں؟ اگر پورے نہیں ہوئے تو کیا موانع تھے؟۔ نہیں معلوم کہ پٹھان نوابوں سے نواب ناصر جنگ کے مخالفوں نے کیا وعدے کیے؟۔ خود ان مخالفوں نے بھی اپنے وعدے پورے کیے یا نہیں، نہیں معلوم کہ اس سلسلہ میں کوئی عہد نامہ مرتب ہوا تھا یا صرف زبانی قول و قرار تھا۔

زیر نظر تالیف میں ان سوالات کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملتا۔ بہت سرسری طور سے بیان کیا گیا ہے کہ نواب مظفر جنگ کے گرفتار ہو جانے کے بعد پٹھان نوابوں نے صلح کی خواہش کی۔ اور پیش کش کے بقایا کو معاف کردینے کی

درخواست کی۔ یہ امور ایسے نہیں تھے کہ ان پر توجہ نہیں کی جاتی۔ مولف نے اس سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا ہے اس کا کوئی حوالہ بھی مرقوم نہیں ہے "ایک تاریخ نے اس امر کو بیان کیا ہے" جیسے بیانات عصری معیار تاریخ پر پورے نہیں اترتے۔ غرض یہ مسئلہ بھی ابھی بہت کچھ تلاش و تحقیق کا محتاج ہے۔

ایک امر جس کے متعلق ایک عرصہ پہلے متعدد اصحاب نے تلاش کا حق ادا کیا۔ اور جس کے معلوم کرنے کے لیے خود سر اکبر حیدری مرحوم بے چین تھے یہ ہے کہ اس مقام اور جگہ کا تعین کیا جائے جہاں نواب ناصر جنگ زخمی ہو کر گرے اور بالآخر جہاں ان کی روح پرواز کر گئی۔ اس کے متعلق اس تالیف میں کوئی خاص تحقیق عمل میں نہیں آئی ہے۔ سرو آزاد کا بیان نقل کر دیا ہے۔ غالباً مولانا سید شمس اللہ صاحب قادری نے اس بارے میں تحقیق کی ہے اگر مولانا کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا جاتا تو اس تالیف میں ایک تحقیق طلب امر کی بھی کوئی نہ کوئی مناسب توضیح ہو سکتی۔

مولانا حافظ محمد مظہر صاحب نے بھی غالباً اس سلسلہ میں کوئی تحقیق کی تھی۔

بہر حال مولف نے جو بھی کوشش کی ہے لائق قدر ہے۔ انھوں نے پہلی مرتبہ بعض ایسے ماخذوں سے استفادہ کیا ہے جو اب تک پوشیدہ تھے۔ ان کو چاہیے کہ کسی منزل پر پہنچ کر کمر ہمت نہ کھول دیں۔

ماخذوں کے سلسلہ میں کتب خانہ آصفیہ کے مخزون کتابوں کے نمبر دیے جاتے تو بہتر ہوتا۔

اسماء و اعلام کا جو املا اس کتاب میں اختیار کیا گیا ہے اس کے سلسلہ میں اگر یہ کوشش کی جاتی کہ جس زبان کا لفظ ہے اس کے تلفظ کے بموجب املا لکھا جائے تو نامناسب نہ ہوتا۔ کرناٹک کے علاقہ کے مقامات کے ناموں کا صحیح تلفظ وہاں کے کسی رہنے والے سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے۔ نیز فرنچ ناموں کے صحیح تلفظ

کا علم بھی آسانی سے ہو سکتا ہے۔ غیر زبان کے ناموں وغیرہ کے سلسلہ میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے بہت عرصہ قبل ایک مضمون لکھا تھا جو مجلہ معارف اعظم گڈھ میں شایع ہوا تھا۔ اگر اس کو بعد نظر ثانی ایک مستقل رسالہ کی صورت میں علحدہ شایع کرادیا جائے تو طلبہ اور صاحبان علم کے لیے بہت سہولت کا باعث ہوگا بلکہ بہتر ہوگا اگر ان اسماء و اعلام کے صحیح تلفظ کو بھی حروف تہجی کے سلسلہ سے اس رسالہ میں درج کر دیا جائے جو آج کل اخباروں میں آتے ہیں یا جو تاریخ ہند کے پڑھنے والوں کی نظر سے گذرتے ہیں۔ ماخذوں کی فہرست میں کتاب کے ساتھ متعلقہ کتب خانہ یا جہاں حاصل ہو سکتی ہے اس کا حوالہ وہاں کے کال نمبر کے ساتھ درج رہتا تو بہتر ہوتا۔ یہ کتاب جو ۱۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اعظم اسٹیم پریس میں اہتمام سے چھپی ہے کاغذ اور کتابت بھی بہتر ہے۔ دو روپے آٹھ آنے میں مکان ۱۲۵۰ املی بن بیرون یاقوت پورہ حیدرآباد دکن یا سن برج ہاؤس عابد بلڈنگ مصطفیٰ بازار حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔

مذہب و تمدن ۔ از سید ابو الحسن علی ندوی۔ (۱۱۲ صفحے) ۱۲ ۔ مطبوعہ جامعہ ملیہ دہلی۔

چھوٹی تقطیع اور کھرے کاغذ کے اس چھوٹے سے رسالے نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ مذہب، فلسفے اور تمدن کی بنیادیں اور مقصد کیا کیا ہیں اور ہر ایک کی خوبی یا خامی کیا ہے۔ اور آخر میں مذہب کی خوبی اور مذہبوں میں بھی مذہب اعتدال یعنی اسلام کی عقلی و عملی برتری ظاہر کی ہے جس کے سلسلے میں اسلامی تعلیم کی وضاحت کے لیے قرآن مجید کے بہت سے اقتباس پیش کیے ہیں۔ کتاب دلچسپ مطالعے کا سامان مہیا کرتی ہے۔ طباعتی غلطیاں بھی کم ہیں البتہ

عربی عبارتوں پر یہ بات پوری طرح صادق نہیں آتی ۔ مثال کے طور پر صفحہ ۶۹ پر "من عند غیر اللہ" کی جگہ "من عند اللہ" چھپ کر مفہوم ہی اُلٹ گیا ہے ۔

م ۔ ح ۔ ا

آسان رسم خط ۔ مولفۂ ڈاکٹر جعفر حسن اُستاذ عمرانیات ، جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن
چھوٹی تقطیع ، بیس صفحے ۔ ناشر ، طابع ، قیمت کسی کا ذکر نہیں ۔

اس رسالچے میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ اردو حروف تہجی میں ہم آوازی کے باعث جو مکرر ہیں ، ان کو حذف کر دیا جائے اور (ث ، ح ، ذ ، ص ، ض ، ط ظ ، ع) خارج کر دیے جائیں ۔

تحریک میں جدت ذرا بھی نہیں ۔ کچھ نہیں تو ربع صدی سے مختلف لوگ اس کا پرچار کرتے رہے ہیں اور بہ ظاہر ان میں سے اکثر نے بعد میں رجوع بھی کر لیا ۔ تقریباً پندرہ برس پہلے رسالہ ہمایوں لاہور میں جو تجویز اٹھی تھی اس میں کم از کم . جدت ضرور تھی کہ مکررات کے حذف میں اس کا لحاظ رکھا جائے کہ الگ لکھے جانے والے اور ملا کر لکھے جانے والے حروف کا گھٹانا یا بڑھانا ہو سکے ۔ یہاں کوئی خاص معیار ملحوظ نہیں رہا ہے ۔

اسی طرح (ع) اور (ا) کو بالکل ہم آواز سمجھ لیا گیا ہے ۔ معلوم نہیں (خ) اور (ق) کو کیوں الگ قرار دیا گیا ۔ یا پنجاب کے احترام میں (ق) کو حذف کر کے صرف (ک) کو کیوں نہیں کافی سمجھ لیا گیا ۔ ہمارا اشتراکی سہولتوں کے لیے (خ) اور (ھ) بھی ایک کیوں نہ کر دیے جائیں جیسا کہ ترکوں نے کیا ہے ۔ عوام الناس کے لیے (غ) اور (گ) بھی ایک ہی ہیں ۔ بعض مقاموں پر (ز) اور (ج) بھی ایک ہی ہیں ۔

جب ایسا نہیں ہو سکتا تو معلوم ہوا کہ معیار جاہل عوام کو نہیں قرار دیا جا سکتا ۔

صوتیات کی تاریخ سے ادنیٰ واقفیت بھی مزید برآں یہ بتا سکتی ہے کہ قومی تلفظ جامد اور غیر متغیر نہیں رہتا بلکہ اس میں مختلف وجوہ سے خاموش تبدیلی ہر وقت جاری رہتی ہے۔ آج (خ) اور (ق) کو الگ رکھا جائے تو کوئی یقین نہیں کہ پچاس سال بعد بھی ان کا نازک فرق ملک میں برقرار رہے گا۔ ہائے مخلوط یا دوچشمی (ھ) کی برخاست کا بھی ملک میں اس وقت عام رجحان ہے۔ چنانچہ اگر "ساتھی" میں اس کی آواز ابھی برقرار رہے تو "ہاتھی" اور "ہاتھوں" میں اس کا اثر تقریباً ختم ہو گیا ہے۔

اسی لیے یہ ممکن نہیں کہ کوئی رسم خط ہمیشہ عصری رہ سکے۔ اور آج کی اصلاح سے ایک فائدہ حاصل ہوتا ہے تو کئی نقصان بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن میں سے بعض کا تو ہمیں شان و گمان بھی نہ ہو گا۔

موجودہ رسم الخط ہمیں بعض دوسری زبانیں سیکھنے میں بے حد مدد دیتا ہے، خاص کر عربی اور فارسی جن میں علوم کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔

آرام پسندی اصل میں قومی زوال پذیری کا پیش خیمہ ہے۔ جن قوموں کی زبانیں مشکل ہیں، (خواہ صرف نحو کے اعتبار سے، خواہ رسم خط کے باعث یا کسی اور وجہ سے) ان کی قوت بقا بھی زیادہ ہی نظر آتی ہے۔

اگر جلدی ہی مقصود ہے تو پھر کیوں نہ مرمہ خط کو بھی چھوڑ کر مختصر نویسی (اسٹینو گرافی) کو ہماری زبان کا روزمرہ کا خط قرار دیدیا جائے۔ جب بچوں کو بھی شروع ہی سے یہی خط سکھایا جائے گا تو پھر کوئی دشواری نہیں رہے گی معاشی نقطۂ نظر سے وہ زیادہ مفید ہو گا۔

کسی قوم کے افراد میں قوت عمل ہو تو اس کا کوئی کام اٹکا نہیں رہتا۔ محض حروف تہجی میں کچھ کمی کر لینے سے یہ تصور کر لینا کہ بیڑا پار ہو گیا، خود فریبی ہے۔ اس سے پیدا ہونے والی عظیم تر برائیاں تفصیل کے لیے کسی اور موقع کی طالب ہیں۔ م - ح - ا

مجلّۂ طیلسانین

حصّہ

معاشیات

تیسری جلد اردی بہشت ۱۳۵۳ف۔ اپریل ۱۹۴۴ء۔ ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ دوسرا شمارہ

مدیر مجلّۂ طیلسانین:۔ محمد غوث ام اے۔ ال ال بی (عثمانیہ)

فہرست مضامین

صفحہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

روداد چھٹی معاشی کانفرنس

تمہید

بحمداللہ چھٹی معاشی کانفرنس ممالک محروسہ سرکار عالی سابقہ روایات کے مطابق معاشی کمیٹی انجمن طیلسانیین عثمانیہ کے زیر اہتمام بتواریخ ۱۳/۱۴/۱۵/ بہمن ۱۳۵۲ف باغ عامہ میں بدورانِ نمایش مصنوعات ملکی نہایت اہتمام و کامیابی کے ساتھ منعقد ہوئی۔

سنین ماضیہ کے مقابل میں یہ کانفرنس کئی لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتی ہے کانفرنس کی قرار داد عقیدت کی پیشکش پر بہ دوران کانفرنس ہی پروانۂ خوشنودی شاہانہ عطا ہوا اور حضرت والاشان ولیعہد بہادر پرنس آف برار دام اقبالہٗ کا جو افتتاحیہ پیام گرامی سرفراز ہوا۔ اُس نے معاشی کمیٹی اور معاشی کانفرنس کو وہ درجہ عطا کیا جہاں سے صحیح طور پر اہل ملک کی رہبری کی جاسکتی ہے اور اس عبوری دور میں ہر جہتی ترقی کیلئے معاشی جد وجہد کا زبردست اقدام کیا جاسکتا ہے۔ پیام گرامی کو اس جگہ زیب قرطاس کرنا ہمارے لئے باعث صد افتخار ہے۔

پیام گرامی حضرت والاشان ولیعہد بہادر دام اقبالہٗ

”کسی ملک کی حقیقی ترقی معشیت کی صحیح تنظیم کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی اور اس تعمیری کام میں معاشی کمیٹی انجمن طیلسانیین جامعۂ عثمانیہ کی مساعی قابل ستایش اور ممالک محروسہ کی خوش حالی اور عام ترقی کی ضامن ہیں نامساعد حالات، حاضرہ کے باوجود معاشی کمیٹی کی کوششیں استحکام و استقامت کا باعث ہیں۔ اور میری دلی تمنا ہے کہ یہ کانفرنس

جس کی آج افتتاح ہوئی ہے شاہ جم جاہ کے سایۂ عاطفت میں ہر طرح کامیاب ہو۔"

حسب تشریح ذیل اس کانفرنس کے چار اجلاس منعقد ہوئے۔

اجلاس اول ۔ بتاریخ ۱۳؍ بہمن ۱۳۵۳ف ۔ ۴ تا ۶ ساعت شام

اجلاس دوم ۔ بتاریخ ۱۳؍ بہمن ۱۳۵۳ف ۔ ۷ تا ۹ ساعت شام

اجلاس سوم ۔ بتاریخ ۱۴؍ بہمن ۱۳۵۳ف ۔ ۵ تا ۸ ساعت شام

اجلاس چہارم ۔ بتاریخ ۱۵؍ بہمن ۱۳۵۳ف ۔ ۵ تا ۸ ساعت شام

معاشی کانفرنس میں مقالات اور تقاریر کیلئے مندرجہ ذیل مباحث منتخب کئے گئے :۔

۱۔ تنظیم مابعد جنگ میں حیدرآباد کا معاشی موقف

۲۔ حیدرآباد میں فراہمی اغذیہ کا مسئلہ

۳۔ حیدرآباد میں بنک کاری کی ترقی کے مسائل

۴۔ صنعتی فروغ میں حکومت کی امداد۔

۵۔ حیدرآباد کی معاشی تعمیر میں امداد باہمی کا حصہ

مجلس عاملہ معاشی کمیٹی نے یہ بھی تصفیہ کیا کہ اس مرتبہ مقالات اور تقاریر کے علاوہ تحریکات بھی طلب کی جائیں جو مجلس عاملہ کی منظوری کے بعد کانفرنس میں پیش ہوں۔

کانفرنس کے اخراجات کیلئے مبلغ (۶۰۰) روپیہ سکہ عثمانیہ کی منظوری دی گئی۔ جسکے اخراجات کی تفصیل علٰحدہ شائع کی جارہی ہے۔

اجلاس اول کی صدارت عالیجناب راجہ رائے گرو داس صاحب بی۔اے۔ یل یل۔بی صدر معاشی کمیٹی نے فرمائی حمد باری تعالی سے کانفرنس کا آغاز کیا گیا۔ جناب نواب میر اکبر علی خاں صاحب نے حضرت والاشان ولیعہد بہادر دام اقبالہ کے پیام گرامی کے پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔ جناب راجہ رائے گرو داس صاحب نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا اور خواجہ حمید احمد صاحب معتمد معاشی کمیٹی نے

۰۰ ماشی کمیٹی کی سال ۵۱-۱۳۵۰ ف کی کارگذاری کی رپورٹ پڑھی۔
حسب ذیل قرار دادہائے عقیدت باتفاق آراء استادہ ہو کر منظور کی گئیں۔

قرار داد عقیدت

اعلیٰحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ

"مملکت آصفیہ کے معاشی ارتقاء یہاں کی صنعتوں کی ترقی مزدوروں کے حقوق کی حفاظت اور اہلِ ملک کی عام خوش حالی سے اعلیٰحضرت بندگانعالی متعالی مدظلہ العالی حضرت سلطان العلوم خسرو دکن و برار خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کو جو مربیانہ دلچسپی ہے وہ ہماری سوئی ہوئی قسمت کو جگا رہی ہے حضرت اقدس و اعلیٰ کی رہنمایانہ مثال کی روشنی میں خانوادہ آصفی کے عالی مرتبت شہزادگان والاشان کے شغف اور توجہ نے بھی معاشی سرگرمی کے میدان میں ہمارے حوصلے بلند اور ہمارے قدم تیز کر دئیے ہیں۔

حیدرآباد معاشی کانفرنس کا یہ چھٹا سالانہ اجلاس بکمالِ ادب حضرت بندگانِ اقدس و عالی کی بارگاہ میں جذبات عقیدت و وفاشعاری کے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔"

الٰہی آفتاب عمر و اقبال تاباں و درخشاں باد۔ آمین

قرار داد عقیدت

علیا حضرۃ شہزادی بیگم صاحبہ مدظلہا

"علیا حضرۃ شہزادی درِ شہوار بیگم صاحبہ مدظلہا ملک کی غذائی صورت حال کی اصلاح کے سلسلہ میں جس دلچسپی کا اظہار فرما رہی ہیں۔ خصوصاً غرباء کیلئے ارزاں جوار کی دوکانات کے قیام میں جو توجہ عالی مبذول ہے اور بہ نفس نفیس انکے افتتاح کیلئے زحمت فرما رہی ہیں اس پر یہ کانفرنس اپنے گہرے جذبات تشکر و امتنان کا اظہار کرتی ہے کہ اہل ملک علیا حضرت کے فنڈ میں زیادہ حصہ لینے کی عزت حاصل کریں جیسا کہ طبقۂ جاگیرداران نے اس فنڈ میں آمدنی کا ایک فیصد اور ایک فیصد رعایائے

یاگیر کے لئے مختص کرکے اس ملک کی حیثیت کا احساس کیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔ یقین ہے کہ حکومت سرکار عالی اس تجویز کو روبہ عمل لائیگی"۔

اجلاس دوم کی صدارت عالیجناب ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی صدر شعبۂ معاشیات کلیہ جامعۂ عثمانیہ نے فرمائی۔ جس میں "تنظیم مابعد جنگ میں حیدرآباد کا معاشی موقف" کے مسائل پر تقاریر و مباحث ہوئے اور آخر میں ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی نے اس موضوع پر اپنا بصیرت افروز خطبۂ صدارت پڑھا۔

اجلاس سوم کی صدارت عالیجناب کیشو آئنگار صاحب پروفیسر معاشیات نظام کالج نے فرمائی۔ جس میں "حیدرآباد میں بنک کاری کی ترقی" اور "حیدرآباد کی معاشی تعمیر میں امداد باہمی کا حصہ" کے مسائل کی بابت تقاریر و مباحث ہوئے اور جناب کیشو آئنگار صاحب نے ہر دو موضوعات کے متعلق اپنے خطبۂ صدارت میں کافی روشنی ڈالی۔

اجلاس چہارم کی صدارت عالیجناب مولوی سید عارف الدین صاحب سابق معتمد تعمیرات نے فرمائی۔ جس میں "حیدرآباد میں فراہمی اغذیہ کا مسئلہ" اور "صنعتی فروغ میں حکومت کی امداد" سے متعلق تقاریر و مباحث ہوئے اور جناب مولوی سید عارف الدین صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں ان مسائل کی بابت اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بہت سی عملی تجاویز اہل ملک کے سامنے پیش کیں۔

کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں ملک کی معاشی ترقی کی بابت جو تحریکات منظور ہوئیں وہ علحدہ طور پر شائع کی جارہی ہیں۔ غرض یہ کانفرنس نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہونچی اور اس کی مکمل روئداد ذریعہ ہذا مطبوعہ شکل میں ملک کے سامنے پیش کی جارہی ہے۔

معتمد کانفرنس

تحریکات منظورہ چھٹی معاشی کانفرنس حیدرآباد

منعقدۂ ۱۳/۱۴/۱۵/ بہمن ۱۳۵۲؁ فصلی

قرار داد عقیدت

۱۔ "مملکت آصفیہ کے معاشی ارتقاء یہاں کی صنعتوں کی ترقی مزدوروں کے حقوق کی حفاظت اور اہل ملک کی عام خوشحالی سے اعلیٰحضرت بندگانعالی متعالی مدظلہ العالی حضرت سلطان العلوم خسرو دکن و برار خلد اللہ ملکہ وسلطنتہٗ کو جو مربیانہ دلچسپی ہے وہ ہماری سوئی ہوئی قسمت کو جگا رہی ہے۔ حضرت اقدس اعلیٰ کی رہنمایانہ مثال کی روشنی میں خانوادۂ آصفی کے عالی مرتبت شہزادگان والاشان کے شغف اور توجہ نے بھی معاشی سرگرمی کے میدان میں ہمارے حوصلے بلند اور ہمارے قدم تیز کر دیئے ہیں۔

حیدرآباد معاشی کانفرنس کا یہ چھٹا سالانہ اجلاس بکمال ادب حضرت بندگان اقدس و عالی کی بارگاہ میں جذبات عقیدت و وفاشعاری کے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔"

الہٰی آفتاب عمر و اقبال تاباں و درخشاں باد۔

آمین!

۲۔ "علیا حضرت شہزادی درّشہوار بیگم صاحبہ مدظلہا ملک کی غذائی صورت حال کی اصلاح کے سلسلہ میں جس دلچسپی کا اظہار فرما رہی ہیں۔ خصوصاً غرباء کے لئے ارزاں جوار کی دوکانات کے قیام میں جو توجہ عالی مبذول ہے اور بہ نفس نفیس انکے افتتاح کے لئے زحمت فرما رہی ہیں اس پر یہ کانفرنس اپنے گہرے جذبات تشکر و امتنان کا اظہار کرتی ہے کہ اہل ملک علیا حضرت کے فنڈ میں زیادہ حصہ لینے کی عزت حاصل کریں۔ جیساکہ طبقۂ جاگیرداران نے اس فنڈ میں آمدنی کا ایک فیصد اور ایک فیصد

رعایائے جاگیر کے لئے مختص کر کے اہلِ ملک کی مصیبت کا احساس کیا ہے۔ وہ لایق ستائش ہے۔ یقین ہے کہ حکومت سرکار عالی اس تجویز کو روبہ عمل لائیگی"۔

عام تحریکات

۱۔ یہ کانفرنس محسوس کرتی ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے تحت وسیع پیمانہ پر صنعتی اور زراعتی تعلیم کے جلد از جلد آغاز کے جانیکی ضرورت ہے۔

۲۔ یہ کانفرنس اہلِ ملک سے درخواست کرتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے وہ مصنوعات ملکی استعمال کریں تاکہ صنعتی ترقی کے ذریعہ ملک کی معاشی فلاح حاصل ہو سکے۔

۳۔ یہ کانفرنس مجلس عاملہ معاشی کمیٹی سے خواہش کرتی ہے کہ سلطنت حیدر آباد میں وسیع پارچہ بافی کے امکانات پر غور کر کے تجاویز کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کرے اور اسکی رپورٹ پر اس خصوص میں ضروری کارروائی اختیار کرے اور تصفیہ کیا گیا کہ حسب ذیل اراکین کی کمیٹی مقرر کی جائے۔

۱۔ خان بہادر احمد محی الدین صاحب	۲۔ مسٹر کیشو آئینگار صاحب
۳۔ نواب میر احمد علی خاں صاحب	۴۔ سرینواس راؤ صاحب لاہوٹی
۵۔ وینکٹ راؤ صاحب	۶۔ احمد عبداللہ صاحب المسدوسی
۷۔ راجہ رائے گرو داس صاحب	۸۔ نواب میر اکبر علی خاں صاحب بار ایٹ لا
۹۔ رام کشن صاحب دھوت	۱۰۔ رگھوبیر سہائے صاحب
۱۱۔ سید محمد علی صاحب موسوی	۱۲۔ خواجہ حمید احمد صاحب

۴۔ اس کانفرنس کی رائے میں کارکردگی قایم رکھنے کے مد نظر ۵ سالہ عمر کی تکمیل کے بعد توسیع مزید کا سلسلہ قطعاً بند ہو جانا چاہیئے۔

۵۔ یہ کانفرنس حکومت سرکار عالی سے خواہش کرتی ہے کہ تری رقبہ جات میں اضافہ اور ملک کی زراعتی ترقی کے لئے ملک کے چھوٹے چھوٹے ہزارہا شکستہ ذرائع آب کی مرمت اور درستی کا کام ہر جگہ

فوراً آغاز کرے۔

۶۔ یہ کانفرنس دیہی اور شہری رقبہ جات میں مسکرات کے استعمال کی زیادتی کو تشویش کی نظر سے دیکھتی ہے۔ مسکرات کے استعمال سے اہل ملک کی کارکردگی متاثر ہو کر ملک کا سخت معاشی نقصان ہو رہا ہے۔ قیمتوں میں اضافہ کرکے مسکرات کو ترک کرانے کی پالیسی ناکام ہو چکی ہے۔ لہٰذا اس کانفرنس کی رائے میں امتناع مسکرات ہی وہ واحد صورت ہے جو اس معاشی مصیبت سے ملک کو بچا سکتی ہے۔

۷۔ معدنی دولت کی گرانی اور جنگی اغراض کے تحت اسکی بڑھتی ہوئی طلب کے مدنظر اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ فوری طور پر ماہرین فن کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو اس امر کا جائزہ لے کہ اس وقت ملک میں کون کونسی معدنیات ہیں اور کس مقدار میں ان کی برآمد ہو رہی ہے اور آیندہ ان میں ترقی کی کیا صلاحیتیں موجود ہیں۔ نیز کونسی ایسی معدنیات برآمد کی جا سکتی ہیں جن سے ملک کی صنعتی ترقی کو بعجلت فروغ ہو سکتا ہے۔

۸۔ یہ اجلاس حکومت کو اس اہم امر کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ مابعد جنگ تنظیم کے نظام نامہ میں حیدرآباد کی "سماجی تحفظ" (SOCIAL SECURITY) کا مسئلہ لازماً شامل کرے۔

معتمد کانفرنس

خطبۂ صدارت

از جناب اجے رائے گروداس صاحب بی اے ال ال بی (عثمانیہ)

جو بتاریخ ۱۴ ار بہمن معاشی کانفرنس کے پہلے اجلاس میں پڑھا گیا

ہز ہائنس پرنس آف برار حضرت ولیعہد بہادر مدظلہ العالی و معزز سامعین!

حیدرآباد کی معاشی تاریخ میں آج کا دن باعثِ صد ناز و افتخار ہوگا کہ اس کی چھٹی معاشی کانفرنس کا افتتاح خانوادہ آصفی کے علم پرور اور رعایا نواز والاشان ولیعہد بہادر سلطنت آصفیہ بنفس نفیس فرمارہے ہیں۔

اس عالمِ بے چینی میں جب کہ دُنیا کا گوشہ گوشہ جنگ و جدل کا گہوارہ بنا ہوا ہے اور دُنیا کا ہر سیاسی اور معاشی نظام تہہ و بالا ہو رہا ہے۔ یہ اعلیٰحضرت حکیم السیاست خسرو دکن و برار خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی حکیمانہ رہبری ہے کہ مملکت آصفیہ کی رعایا امن و اطمینان کے ساتھ اپنی ہر جہتی ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور بحمد اللہ ملک کی معاشی ترقی کا موقع مصنوعات ملکی کی نمایش کی شکل میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہے۔

جس کا افتتاح خود سلطان دکن و برار مدظلہ العالی متعالی کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔

ملک کی معاشی ترقی سے خانوادہ آصفی کی ہر جلیل القدر ہستی کو جو گہری دلچسپی رہی ہے۔ اس نے اس عالم پریشانی میں ملک کی رعایا کے لئے مسیحائی کا کام کیا۔ غریب رعایا کے لئے سستے داموں اجناس فروخت کرنے کی مہم میں شہزادیان دو دمان آصفی محلہ بہ محلہ دوکانوں کا جو افتتاح فرمارہی ہیں اس سے اہل ملک کے قلوب مسخر ہو رہے ہیں۔ آج اس کی مثال دُنیا کی کوئی سلطنت پیش نہیں کرسکتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس عالمی خلفشار کے زمانے میں بھی بہ فضل الٰہی ہم نہ صرف اطمینان کی سانس لے رہے ہیں۔ بلکہ دورِ عثمانی کے زرّین کارناموں کی وجہ سے ہم اس قابل بن گئے ہیں کہ ہمارے ملک کی ضرورت پوری کرنے کے بعد جو غلّہ باقی رہیگا وہ ہندوستان کے ان حصّوں کے لئے دیا جائیگا جہاں قحط اور افلاس کا دور دورہ ہے اس سے ہم دریغ نہیں کرینگے۔ یہی نہیں بلکہ خود موجودہ جنگ کے کامیاب انصرام میں ہمارا جو گراں قدر حصّہ ہے۔ آج اس کا اعتراف ہمارے حلیفوں کی زبان سے ہو رہا ہے۔

اس موقع پر بہ حیثیت صدر معاشی کمیٹی میرا یہ فریضہ ہے کہ میں ان علمی کاموں کا تذکرہ کروں۔ جن کی ذمہ داری آج سے سات آٹھ سال قبل انجمن طیلسانین عثمانیہ کی معاشی کمیٹی نے اپنے ذمہ لی ہے۔

حضرات! جہاں جامعۂ عثمانیہ دور عثمانی کا زرین علمی کارنامہ ہے۔ وہاں جامعۂ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طیلسانین کی انجمن نے اپنے علمی کارناموں سے ملک میں وہ درجہ اور مقام حاصل کرلیا ہے کہ جس کی ملک میں کوئی نظیر نہیں ملسکتی۔

قلمرو آصفیہ کی ہر جہتی ترقی میں اس انجمن کی مساعی نے ملک کے ہر مفاد اور مکتب خیال کے افراد کے ایک جا کرنے میں جو حصہ لیا ہے وہ "معاشی کمیٹی" کے قیام کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ اگرچہ کہ ابتدا میں کمیٹی کے اغراض و مقاصد صرف یہ رہے ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طیلسانین کے لئے سرکاری ملازمتیں یا فراہمی روزگار کی تدابیر اختیار کیجائیں لیکن کمیٹی کے بانیوں نے بہت جلد اس امر کو محسوس کیا کہ کسی ملک کی ترقی صرف چند محدود اغراض کی تکمیل یا چند افراد یا طبقوں کی فارغ البالی سے نہیں ہوسکتی۔ بلکہ جب تک پورے ملک کے مفاد کو پیش نظر نہ رکھا جائے اور ملک کے تمام وسائل کو کام میں نہ لایا جائے مستحکم اور پائدار مستقبل کی ضمانت نہیں کی جاسکتی۔

بانیان کمیٹی نے اہل ملک کے ہر طبقے سے تعاون عمل کی درخواست کی اور ان سب کی مشترکہ سعی و کوشش سے "معاشی کمیٹی" کا قیام عمل میں آیا۔ اور "حیدرآباد اکنامک اسوسی ایشن" اس میں ضم کر دی گئی۔ "معاشی کمیٹی" کی رکنیت ملک کے ہر اس باشندے کے لئے عام قرار دیگئی ہے جسے ملک کی معاشی جد و جہد سے دلچسپی ہو۔ نتیجتاً اس کمیٹی میں عثمانین کے ساتھ نظام کالج جامعۂ عثمانیہ علی گڑھ، آندھرہ اور دیگر جامعات کی برادری کے اہل علم حضرات کے دوش بدوش ملک کے کاروباری اداروں کے نمایندوں کا وہ اشتراک عمل حاصل ہوا ہے جس سے ملک کی معاشی جد و جہد میں سرعت کے ساتھ ترقی کی بے شمار راہیں کھل گئی ہیں۔

ملک کے امرائے عظام و جاگیرداروں کے علاوہ دیگر اہل ثروت افراد کو بھی اس کمیٹی کی کشش نے اپنی طرف کھینچا اور اس میں غیر سرکاری افراد کے ساتھ ملازمین سرکار کو بھی آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع حاصل ہے۔

اس کمیٹی نے اپنا سب سے پہلا عملی اقدام نمائش مصنوعات ملکی کے انعقاد سے کیا جس کی غرض وغایت یہ قرار پائی کہ:-

"ملک کی معاشی ترقی کے لئے ممالک محروسہ سرکار عالی کے مصنوعات اور قدرتی ذخائر پیداوار کے نمونے اور ان کی کیفیت اور حالات اہل ملک کے سامنے پیش کرنا۔ قدرتی ذخائر اور وسائل اور ترکیبوں سے استفادہ کرنے اور مصنوعات تیار کرنے کے مختلف طریقوں او ترکیبوں کا عملی مظاہرہ کرنا اور اس طرح ملک میں صنعتی کاروبار کی ترقی کے امکانات کو ظاہر کرنا اور اہل ملک میں ان کاروبار سے دلچسپی پیدا کرنا۔ ان میں حصہ لینے کی ترغیب دلانا اور ملکی مصنوعات خریدنے اور استعمال کرنے کا شوق پیدا کرنا۔ نیز صناعوں اور تاجروں کی ہمت افزائی کرنا ان کو ترغیب دلانا کہ جدید صنعتیں آغاز کریں اور طریقہ ہائے تیاری مصنوعات میں ترقی کے کوشاں رہیں۔"

معاشی کمیٹی کی منعقدہ نمائش پہلے ہی سال اسقدر کامیاب ہوئی کہ اس نے حکومت سے اپنا خراج تحسین حاصل کیا۔ نواب حیدر نواز جنگ مرحوم سابق صدر اعظم سلطنت آصفیہ نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں معاشی کمیٹی سے جن توقعات کا اظہار کیا وہ حسب ذیل اقتباس سے ظاہر ہے۔

انجمن طیلسانین کو میں مشورہ دونگا کہ وہ اپنی مساعی کو نمائش کی حد تک محدود یا ختم نہ کردیں بلکہ "معاشی کمیٹی" کی تنظیم کے ذریعہ اس کا انتظام کریں کہ ہمارے نوجوان طیلسانین اور تعلیم یافتہ حضرات ہماری صنعتوں کے مراکز پر پہنچیں۔ کاریگروں سے تعلقات بڑھائیں اور ان کی تجارتی تعلیم کی کوشش کریں۔ جس کی وجہ سے نہ صرف کاریگر خوش حالی کی زندگی بسر کرسکیں بلکہ معقول تعداد میں تعلیم یافتہ نوجوان ملک کی تجارت وحرفت کو اپنی معاش کا

ذریعہ بناسکیں۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر انجمن طیلسانیین اس مسئلہ کو ہاتھ میں لیگی۔ اور ایک ایسی پُر خلوص اور متدین جماعت تیار کریگی جو ملکی مصنوعات کی ترقی کو اپنی عملی زندگی کا نصب العین بنائے۔

ملک کی معاشی اور صنعتی پیدایش کا اقدام معاشی کمیٹی کے پیش نظر ہے۔ اس کو میں قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس خصوص میں جب آپ مزید تفصیلات مہیا کرنے کے قابل ہو جائیں تو آپ کی تجاویز پر حکومت سرکار عالی احتیاط کے ساتھ غور اور واجبی امداد سے دریغ نہیں کریگی"

پہلی معاشی کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں مولوی خان فضل محمد خاں صاحب سابق کمشنر و معتمد تعلیم صنعت و حرفت نے یہ ایں الفاظ معاشی کمیٹی سے اشتراک عمل سے آغاز کیا کہ :-

"میں بڑی خوشی سے سررشتہ تعلیم صنعت وحرفت اور دفتر تحصیل معشیت و ملازمت کی طرف سے ان کے ساتھ اتحاد عمل کی دعوت دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ دیگر سرکاری سررشتہ جات اور ملک کے تمام بہی خواہ بھی اتحاد عمل کریں گے۔ اس نمایش کے اختتام پر میری یہ خواہش ہے کہ معاشی کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی اور دفتر معیشت و ملازمت کی مشاورتی کمیٹی کا ایک مشترکہ اجلاس کیا جائے۔ اور سررشتۂ تجارت و حرفت انڈسٹریل ریسرچ لیبا ریٹری اور عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ جات کیمیا اور اقتصادیات کو بھی دعوت دی جائے۔ تاکہ اس کانفرنس میں جو تحریکیں منظور ہوں ان کو اور جو تجویز کے معاشی کمیٹی کا اتحاد عمل نہ صرف ایک دفتر یا ایک سررشتہ بلکہ ملک کے ہر سرکاری اور غیر سرکاری ادارے اور ملک کے ہر فرد کا ساتھ ہو۔ اہل ملک کو چاہیئے کہ معاشی کمیٹی کو دامے، درمے، سخنے ہر قسم کی امداد دیں، معاشی کمیٹی کو امداد دینا ملک کی امداد اور ملک کو دولت مند بنانا ہے۔"

سال گزشتہ پانچویں معاشی کانفرنس کے افتتاح کے موقع پر عالیجناب آنریبل غلام محمد صاحب صدر المہام فینانس نے معاشی کمیٹی اور معاشی کانفرنس کے مساعی کا ذکر کرتے ہوئے

اس کا اعتراف فرمایا کہ وہ اس کو نہایت اہم ادارہ تصور کرتے ہیں۔ جسے مملکت دکن کی ازسرنو تعمیر میں ایک اہم حصہ ادا کرنا ہے۔ موصوف کی رائے میں ماسبق ماہرین معاشیات اور خصوصاً ہندوستانی معاشین حقیقتوں سے ہمیشہ دور رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا بے تعلق مطالعہ انکی رہنمائی اور ان کی آرا جو حقیقی نظم و نسق کے تعلق سے بے نیاز ہو کر ظاہر کی گئیں، اس قابل نہ تھیں کہ اُن سے معاشی پالیسی کے قیام میں وہ مدد لیجاتی جن کی وہ مستحق تھیں۔ لیکن وہ اس امر کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ جامعۂ عثمانیہ کے نوجوانوں میں اتنی ہمت اور عوام کی خدمت کا اتنا جذبہ ہے کہ وہ علمی تحقیقات کو عملی تجربوں کی روشنی میں پرکھنا چاہتے ہیں۔ اور معاشی کمیٹی کے ذریعہ ماہران معاشیات اور ماہران نظم و نسق کے درمیان اتحاد عمل کے مواقع پیدا کر رہے ہیں۔

ارکین معاشی کمیٹی صرف نمایشوں کا انعقاد کر کے مطمئن نہیں بلکہ انہوں نے نمائشوں کے لئے ایک رجسٹرشدہ مجلس قائم کر کے نمایش کی پوری ذمہ داریاں اس مجلس کے سپرد کر دیں۔ اور خود ملک کے مزید معاشی مسائل اور وسائل کی تحقیقات کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اور اس عرصہ میں انہوں نے جو نظری و عملی تحقیقات کر کے ملک کی معاشی ترقی کے لئے اسکیمیں اور تجاویز مرتب کیں وہ اب اہل ملک اور حکومت کی فوری توجہ کے مستحق ہیں۔ اس موقع پر میں تفصیلات میں گئے بغیر صرف ان چند تجاویز کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، جو چھ سال کے دوران میں معاشی کمیٹی کی جانب سے حکومت کے سامنے پیش کی گئیں۔

۱۔ حیدرآباد کے لئے معاشی سروے اور ایک معاشی لائحہ عمل کی ضرورت۔

۲۔ تجارتی و صنعتی ڈائرکٹری کی اشاعت۔

۳۔ حیدرآباد کے لئے موٹر سازی۔ سیکل سازی۔ ٹوپی سازی۔ پنسل سازی و دیگر کارخانوں کے قیام کی تجاویز۔

۴۔ مصنوعات ملکی کی نکاسی کے لئے ایک مرکزی ادارہ مصنوعات کا قیام۔

۵۔ زراعتی کالجوں کے قیام کی تجاویز۔

۶۔ تنظیم دیہی۔ زرعی انجمن اور معاشی سروے کی اسکیم۔
۷۔ غذائی صورت حال سے متعلق ایک یادداشت۔
۸۔ مجلۂ معاشیات کی اشاعت۔
۹۔ معاشی کتب خانہ کا قیام۔
۱۰۔ معاشی تقاریر اور کانفرنسوں کا انعقاد۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ ان میں سے اکثر تجاویز عملی صورت اختیار کر رہی ہیں۔ معاشی کمیٹی کی سال گذشتہ کی کارگذاری کی رپورٹ ابھی آپ کے سامنے جناب معتمد صاحب معاشی کمیٹی بیان فرمائینگے جن سے تفصیلات کا اظہار ہوگا۔

جہاں ہم مقالات اور مباحث کے ذریعہ ملک کے معاشی حالات کا جائزہ لے رہے ہیں وہیں ہم ان کو عملی طور پر بھی کامیاب بنانے میں کوشاں ہیں۔ اگرچہ کہ تنظیم دیہی اور معاشی سروے کے لئے سال گذشتہ کی کانفرنس میں عالیجناب صدرالمہام بہادر نے جس مالی امداد کا ذکر فرمایا تھا اس کا ابھی تک تصفیہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ کام کما حقہ، انجام نہ دیا جاسکا۔ لیکن اگر کم ازکم اس سال رقم کا تصفیہ ہوجائے تو انشاءاللہ یہ کام بھی جلد تکمیل کو پہونچ سکے گا۔

ہماری اس سے بڑھ کر اور کیا خوش نصیبی ہوسکتی ہے کہ خاص ارشادات شاہانہ سے ہمارے مساعی کی رہنمائی ہورہی ہے۔ اور اعلیحضرت بندگانعالی متعالی مدظلہ العالی کی یہ سرفرازیاں ہمارے جذبہ جان نثاری کو مستحکم تر بنارہی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس عالم پریشانی اور دنیا کی کایاپلٹ میں یہ صرف ارشادات شاہانہ ہی تھے جنہوں نے ہمیں صحیح راہ عمل پر گامزن کیا۔ اور جو ہمارے مستقبل کے شاندار بنانے کے لئے شمعٔ ہدایت کا کام دے رہے ہیں۔ بہ تعمیل ارشاد شاہانہ مصنوعات ملکی کی نکاسی کے لئے مجلس نمائش سے مظاہرین کی ضروریات کے معلوم کرنے کے لئے ایک سوال بند ترتیب دینے اور ان کے تفصیلی جوابات حاصل کرنے کا کام فوری طور پر شروع کردیا گیا ہے۔ اور معاشی کمیٹی بھی اپنے آئندہ اجلاسوں اور تجاویز میں اس

کام کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشاں رہیگی۔

حضرت ولیعہد بہادر نے آج بکمال مراحم جس کانفرنس کا افتتاح فرمایا ہے۔ اس میں ہمارے معاشی نظام کو مستحکم تر بنانے کی تجاویز پر غور و خوص کیا جائے گا۔ اور بالخصوص ان مباحث پر مقالے پیش کئے جارہے ہیں۔ جن پر ہمارے معاشی مستقبل کا دارو مدار ہے۔ ہر اجلاس کی صدارت بلحاظ اہمیت ماہرین معاشیات فرمارہے ہیں۔ جنکی عالمانہ رائے کی روشنی میں معاشی گتھیاں سلجھ سکینگی۔ موجودہ معاشی مشکلات جو جنگ کے زمانے میں پیدا ہورہی ہیں۔ اور مابعد جنگ جو اثرات رونما ہونگے وہ انقلاب انگیز ہونگے۔ یہ مسئلہ معاشین کے غور و فکر کا ہے۔ جن مسائل پر بحث ہو گی ان کی روشنی میں غور کرنا ہے کہ جنگ کے بعد ہندوستان اور حیدرآباد کی صنعتوں کو کیا تامین حاصل ہو گی اور اسکو دیگر ممالک کے مسابقت میں کن تجاویز پر عمل کرنا ہے۔ حیدرآباد اپنی وحدت کے لحاظ سے ایک سیاسی موقف بھی رکھتا ہے مسائل ذیل موجودہ دور میں قابل غور ہیں۔

۱۔ تنظیم مابعد جنگ میں حیدرآباد کا معاشی موقف۔

۲۔ حیدرآباد میں فراہمی اغذیہ کا مسئلہ۔

۳۔ حیدرآباد میں بنک کاری کی ترقی۔

۴۔ صنعتی فروغ میں حکومت کی امداد۔

۵۔ حیدرآباد کی معاشی ترقی میں تحریک امداد باہمی کا حصہ۔

یہ وہ مباحث ہیں جن پر آیندہ اجلاسوں میں غور کیا جائیگا۔ اور ہر اجلاس کے صدر اپنے خطبات میں ان پر کافی روشنی ڈالیں گے۔

اسوقت قلمرو آصفیہ کے لئے سب سے اہم جو مسئلہ ہے وہ اس کی معاشی خود اکتفائی کا مسئلہ ہے۔ جس کا ہمارے نزدیک یہ مطلب ہے کہ ہم اپنے ملک کے قدرتی وسائل سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کے قابل ہو جائیں۔

اور ہم کسی بیرونی اسکیم یا تجویز میں اسوقت تک حصہ نہ لیں جب تک کہ خود ہم اپنے معاشی وسائل اور معاشی مفادات کا پوری طرح جائزہ نہ لے لیں۔ اس لئے تنظیم مابعد جنگ میں ہمارا معاشی موقف اسوقت تک قائم نہیں ہو سکتا ہے جبتک کہ ہمارے ملک کا ایک معاشی سروے فوری طور پر نہ کیا جائے۔ اس کام کے لئے معاشی کمیٹی نے حکومت کے ساتھ تعاون عمل کی جو خواہش کی ہے اس کے متعلق ہماری یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ حکومت اس معاشی کمیٹی کو مختلف مجالس میں کافی نمایندگی عطا کریگی۔

یہ امر بھی باعث مسرت ہے کہ حیدرآباد میں فراہمی اغذیہ کے متعلق معاشی کمیٹی کی مجلس عاملہ نے سال گذشتہ جو یادداشت پیش کی ہے۔ اسکی اکثر تجاویز کامیاب رہیں۔ اور ان پر عمل ہو رہا ہے۔ اب جو نئے مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔ ان کی بابت معاشی کانفرنس اور معاشی کمیٹی اپنی غور کردہ تجاویز مرتب کرکے آیندہ پیش کرے گی۔ اسی طرح حیدرآباد میں بنک کاری کی ترقی صنعتی فروغ میں حکومت کی امداد اور حیدرآباد کی معاشی تعمیر میں امداد باہمی کی سعی سے متعلق کانفرنس کے مباحث کی روشنی میں معاشی کمیٹی جو تجاویز مرتب کرے گی وہ بھی بہت جلد اہل ملک اور حکومت کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔

آخر میں میں ان ساتھیوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جنہوں نے معاشی کمیٹی اور معاشی کانفرنس میں میرا ہاتھ بٹایا اور توقع ہے کہ ان مسائل پر غور کرکے ایک اسکیم یا خاکہ حکومت سرکارعالی کے پاس پیش کرنے میں میری اعانت فرمائیں گے۔

آخر میں اپنا خطبہ اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اعلیحضرت قدر قدرت کے دور ہمایونی میں یہ ملک ہمیشہ ترقی کرتا رہے اور رعایا رشاد وآباد رہے۔ اور گلستان آصفی ہمیشہ سرسبز وشاداب پھلتا پھولتا رہے۔

اس دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد فقط

خطبۂ صدارت

از جناب ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی صدر شعبۂ معاشیات جامعۂ عثمانیہ

(جو بتاریخ ۱۴ر بہمن معاشی کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں پڑھا گیا)

"تنظیم مابعد جنگ کے مسائل"

جنگ کے اختتام پر ہندوستان میں ازسر نو تعمیر کے مسئلہ پر آج کل کثرت کے ساتھ بہت ہی مبہم اور غیر معین مباحث ہو رہے ہیں حالانکہ ازسر نو تعمیر کی اسی مقام پر ضرورت ہے جہاں کچھ تخریب ہوئی ہو۔ صرف انہی مغربی اور مشرقی ممالک میں دوبارہ تعمیر کی تجویز درست ہے جو اس تباہ کن جنگ کے مہیب اثرات کی زد میں آچکی ہیں۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے جنگ کی وجہ سے براہ راست اس ملک پر کوئی تباہی نازل نہیں ہوئی ہے ہمیں ابھی اپنے مسائل پر غور و فکر آغاز کرنا ہے اس لئے ہمارا مسئلہ تنظیم کا ہے نہ کہ دوبارہ تعمیر کا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ جس مسئلہ سے آئندہ دوچار ہونا ہے حکومت حیدرآباد نے اس کی نوعیت کا صحیح اندازہ کیا ہے اور مسایل مابعد جنگ سے جس محکمہ کو نبٹنا ہے اس کا نام تنظیم مابعد جنگ رکھا گیا ہے۔

اب ہمیں اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ تنظیم مابعد جنگ کا مقصد کیا ہے اور کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ اگلے صفحہ کے اعداد کی بنا پر یہ مسئلہ مختلف فیہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ چین کے استثنیٰ کے ساتھ جس کے اعداد و شمار ناقابل حصول ہیں۔ دوسرے ممالک کے مقابلہ میں ہندوستان میں معیار زندگی سب سے زیادہ پست ہے۔

نام ملک	سال زیر تخمینہ	آمدنی پونڈ میں
ہندوستان	سنہ ۱۹۳۱ء	۵
انگلستان	"	۷۶
آسٹریلیا	"	۷۰
ممالک متحدہ امریکہ	سنہ ۱۹۳۳ء	۸۹
فرانس	سنہ ۱۹۳۰ء	۴۱
زیکوسلاویکیا	سنہ ۱۹۲۵ء	۲۵
ڈنمارک	سنہ ۱۹۲۷ء	۵۵
جرمنی	سنہ ۱۹۲۵ء	۳۹
اطالیہ	سنہ ۱۹۲۷ء	۲۴
مصر	سنہ ۱۹۲۸ء	۲۱
جاپان	سنہ ۱۹۲۵ء	۱۲
بلغاریہ	سنہ ۱۹۳۲ء	۹
روس	سنہ ۱۹۰۵ء	۱۰

قومی تنظیم کا مقصد کلیتاً یہی ہونا چاہیئے کہ معیار زندگی کے اس پست ترین درجہ کو بلند کیا جائے اور ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ آیندہ پانچ سال کی عرض مدت میں اس معیار کو دگنا کر دیں۔

کہا جاتا ہے کہ مساعی مابعد جنگ کا مقصد یہ ہے کہ ہر فرد بشر کو چار آزادیاں عطا کی جائیں اور سب سے اہم آزادی جو درکار ہے وہ اس خوف کا استیصال ہے جو بھوک اور غربت کی بنا پر پیدا ہوتا ہے اس کام کی دقت کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۳۳ء میں انگلستان میں مسٹر راونٹری (ROUNTRY) نے تخمینہ لگایا کہ ایسے خاندانوں پر

جہاں بچوں کی تعداد تین ہے ۲ و ۱۵ فیصد بچوں کے لئے مناسب غذا کی فراہمی اور ایسے خاندانوں میں جہاں بچوں کی تعداد چار ہے ۲۴ فیصد بچوں کے لئے ناگزیر ضروریات زندگی کی فراہمی مشکل ہے ہمارے پیش نظر کام کے وقت کا صحیح صحیح اندازہ لگانے کے لئے یہ اعداد بہت کافی ہیں۔ انگلستان جیسے دولت مند ملک میں جہاں کی قومی آمدنی ہندوستان کے مقابلہ میں ۱۵ گنا زیادہ ہے ایسے خاندانوں میں جہاں چار بچے ہوں اگر ۲۴ فیصد بچوں کے لئے اشیائے مایحتاج کی فراہمی مشکل ہو تو ہندوستان کی صورت حال کیا ہوگی جہاں انگلستان کے مقابلہ میں شرح پیدائش تو بلند تر لیکن شرح آمدنی پست تر ہے۔ میں اس حقیقت سے واقف ہوں کہ ہندوستان کے مقابلہ میں انگلستان میں معیشت کے مصارف بہت زیادہ ہیں لیکن جملہ متعلقہ امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اس ملک میں غربت اور دوسرے مصائب بہت زیادہ ہیں لہذا قومی زندگی کو اس لعنت سے نجات دلانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اب میں اپنے خطبہ کو زیادہ ٹھوس بنانے کے لئے یہاں ان تدابیر سے بحث کروں گا جن کی مدد سے ہم آئندہ پانچ سال کے دوران میں اپنی قومی آمدنی کو دُگنا کرسکیں۔ فرض کیجئے کہ مملکت حیدرآباد کی آبادی ایک کروڑ ۷۵ لاکھ ہے اور آمدنی فی کس ۶۰ روپیے سالانہ ہے اس لحاظ سے جملہ قومی آمدنی سالانہ (۱۰۵) کروڑ ہوگی اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ان پانچ سالوں کے دوران میں قومی آمدنی کو دوچند بنانے کے لئے مطلوبہ سرمایہ کی مقدار کیا ہوگی مذکورہ بالا تقریباً ۱۲ ممالک کے اعداد و شمار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قومی سرمایہ اور اصلی آمدنی میں ۷ء۲ کا تناسب ہے لیکن یہ تناسب صنعت اور لگائے ہوئے سرمایہ کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔ سرمایہ جتنا زیادہ لگایا جائے گا یہ تناسب بھی اسی لحاظ سے زیادہ ہوگا۔ حیدرآباد جیسی مملکت میں جہاں زیادہ سرمایہ لگائے جانے کی توقع نہیں ہے ہم فرض کرلیتے ہیں کہ قومی سرمایہ اور اصلی آمدنی میں (۲) کا تناسب ہے اس مفروضہ کی بناء پر آمدنی کو دُگنا کرنے کے لئے پانچ سال کی مدت میں تقریباً ۱۰۵ کروڑ یا ایک سال کے لئے

۴۲ کروڑ روپیہ کی ضرورت لاحق ہوگی اگر دوسرے پنجسالہ دور میں اس آمدنی کو پھر دوچند یعنے ۱۰۵ سے ۲۱۰ کروڑ روپے تک پہنچانا مطلوب ہو تو ۸۴ کروڑ یا سالانہ ۱۶۸ کروڑ روپیہ درکار ہوں گے۔

پیش نظر اسکیم کو روبہ عمل لانے کے لئے سرمایہ کی فراہمی

اگرچیکہ جنگی حالات نے مالیاتی وسائل میں وسعت پیدا کردی ہے اور "حرکت میں برکت ہے" کے قدیم مقولہ کو صحیح ثابت کر دیا ہے۔ پھر بھی ہم کو ہوائی قلعے تعمیر نہ کرنے چاہئیں۔ انسانی قوت، اراضی خام پیداوار اور مشنری کے اعتبار سے پیداوار کی مقدار ہر ملک اور سوسائٹی میں محدود ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ملک میں افراد کی کثرت ہے لیکن آبادی کے لحاظ سے رقبۂ اراضی نسبتاً کم ہے خام پیداوار زیادہ مقدار میں نہیں پائی جاتی اور بحیثیت مجموعی مشنری کی تو اس قدر قلت ہے کہ کافی عرصہ تک ہم اس کی درآمد پر مجبور رہیں۔ جہاں تک حصول قرضہ اور برآمد کی صلاحیت کا تعلق ہے ہماری قوت درآمد بھی بہت محدود ہے اپنے عظیم الشان تجربہ کے ابتدائی سالوں میں روس نے مشنری اور تربیت یافتہ مزدوروں کی قلت محسوس کی تھی اور یہ قلت اسکیم کی رفتار ترقی پر اثر انداز ہوئی۔

قومی آمدنی میں سالانہ ۲۰ فیصد کی شرح سے اضافہ کرنے کے لئے ہر سال ۴۲ کروڑ روپیہ صرف کرنے کا مسئلہ اس وقت حیدرآباد کے سامنے ہے بنیادی سوال صرف یہی ہے کہ کیا یہ رقم حاصل کی جاسکتی ہے؟ پانچسال کی عرصہ مدت میں ۲۱۰ کروڑ روپیہ کی فراہمی کوئی آسان کام نہیں۔ اس رقمی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے قومی وسایل معاش کی کلیتہً چھان بین کرنی ہوگی۔ ہمارے اکثر غیر پیداوار مصارف میں شدت کے ساتھ تخفیف کرنی پڑے گی اور اصول پس اندازی کی کامل طور پر تنظیم کرنے کی ضرورت داعی ہوگی۔ زیور اور جواہرات کا وجود باقی نہ رہے گا۔ اس کے علاوہ ہمیں پیش نظر مقصد کے حصول میں بہت کچھ تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی۔ اصول کفایت شعاری کی ترویج کے لئے مملکت کے گوشہ گوشہ میں بنکوں کا قیام لازمی ہوگا۔ ہمارے اسٹیٹ بنک کو وکٹوریہ (آسٹریلیا) کے اسٹیٹ بنک کے اصول کی

تقلید کرنی ہوگی۔ ریاست وکٹوریہ کی آبادی تقریباً ۲۰ لاکھ ہے جہاں اسٹیٹ بنک کی ۲۰۰ شاخیں اور ۴۰۰ ایجنسیاں قایم ہیں۔ اس بنک کا جمع شدہ سرمایہ ۶۵ ملین پونڈ سے زیادہ ہے۔ یہاں کے باشندوں میں پس اندازی اور پیداوار اغراض کے لئے سرمایہ لگانے کی اہمیت کو ذہن نشین کرانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ آسٹریلیا اور دیگر جدید ممالک کو تشہیر کی اہمیت کا اچھی طرح اندازہ ہے اور ہمارے لئے بھی مناسب ہوگا کہ اس خصوص میں ان ممالک کی اتباع کی جائے۔ ہماری اس وسیع آبادی میں پس اندازی کی اہمیت کو ذہن نشین کرانا چاہیئے۔ اور اس مہم کو کامیاب بنانے کے لئے ملک میں ممکنہ تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ اس نکتہ کی مزید تفصیل کے لئے ہم آسٹریلیا کی ایک مثال کی توضیح کریں گے ۱۹۲۷ء میں وکٹوریہ کے اسٹیٹ بنک نے ایک محکمہ قائم کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مزدوروں میں کفایت شعاری کی عادت پیدا کریں۔ کارخانوں اور تجارتی اداروں میں کفایت شعاری کے کلب قایم کئے گئے تاکہ مزدور اپنی کمائی بنک میں جمع تو کرادیں لیکن ان کو بنک تک آنے کی ضرورت نہ پڑے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۷ء کے دوران میں بنک کی جانب سے کارخانہ داروں اور دکان داروں کو ۸ ملین سے زاید ایسے لفافے مہیا کئے گئے جن پر کفایت شعاری کی ہدایات درج تھیں جن کا منشا یہ تھا کہ مزدور پیشہ افراد اپنی آمدنیوں میں سے تھوڑا بہت پس انداز کرنے کی عادت پیدا کریں کارخانوں اور دکانوں کے ملازمین کو تنخواہیں ان لفافوں کے اندر بند کرکے دی جاتیں اور نتیجتاً بنک کی ہدایات ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی تھیں۔

ہندوستان جیسے نسبتۃً پست تر ملک میں ضروری ہے کہ اس نوعیت کے کام کو زیادہ وسیع پیمانہ پر انجام دیا جا کاشتکاروں میں پس اندازی کی صفت پیدا کرنے کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ بنک کاشتکاروں کے کھیتوں پر سے غلہ حاصل کرنے کا طریقہ اختیار کریں اور غلہ کی فروخت سے جو رقم حاصل ہو وہ کاشتکار کے کھاتے میں جمع کردی جائے۔ کاشتکار غلہ کی حوالگی کے لئے بڑی مستعدی کے ساتھ آمادہ ہوجائیگا کیونکہ عرصۂ دراز سے وہ اس کا عادی ہے اور اس کا مقصد بھی

اس کو اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا۔ فصل کاٹنے کے زمانہ میں کاشتکار بہت مصروف ہوتا ہے اور شہر تک جانے کی اس کو فرصت نہیں ملتی اس زمانہ میں پیداوار پر قبضہ کرنے کے لئے مختلف قسم کے لوگ اپنے مطالبات کے ساتھ اس کے گرد جمع ہوجاتے ہیں ان مطالبات کی تکمیل کے بعد کاشتکار کے پاس اتنی مقدار میں غلہ بچ نہیں رہتا کہ وہ اس کو اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے محفوظ کردے "وہ پہلے آنے والے کی سب سے پہلے خدمت کی جائے گی" کے اصول پر کاربند ہوتا ہے۔ اگر بنک کے کارندے ٹھیک وقت پر کاشتکار کے یہاں پہونچ جائیں تو وہ اس کی حقیقی خدمت انجام دیں گے اور اس کو اس کی نادانی کے خطرناک عواقب سے بچا سکیں گے۔

یہ استدلال پیش کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں زیر کاشت اراضی بہت ہی قلیل ہے اس نوعیت کا کام بنک کے لئے کچھ زیادہ مفید ثابت نہ ہوگا۔ اگر مسئلہ کو محدود نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس فریضہ کی انجام دہی میں بنک کی ناراضی حق بجانب متصور ہوگی لیکن جو مسئلہ قومی نقطہ نظر سے اس قدر اہم ہو اس پر اتنی تنگ نظری کے ساتھ غور کرنا بڑی نادانی ہوگی۔ اسٹیٹ بنک کو جس کے قیام کا مقصد جلب منفعت سے زیادہ ملک کی خدمت گذاری ہے اس قسم کے فرائض انجام دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہنا چاہئے۔ ایسی خدمت سے بنک کو منافع حاصل نہ ہوگا اور ممکن ہے کہ اس کو بھی خسارہ برداشت کرنا پڑے لیکن کفایت شعاری کے جذبہ کو بروئے کار لاکر اور مختلف قسم کے معاملات کرنے والے گاہک فراہم کرکے بنک رفتہ رفتہ اپنے خسارہ کی تلافی کرسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں نیوزیلینڈ کے ایک بنک کے تجربات کی توضیح اس موقع پر خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں جب کہ راقم السطور نے نیوزیلینڈ کے بنک کا معائنہ کیا۔ معلوم ہوا کہ کاشتکاروں کو طویل المیعاد قرضے عطا کرنے کے لئے بنک نے ایک خصوصی شعبہ قائم کیا ہے۔ سرمایہ کی فراہمی کے لئے بنک نے ½ ۷ فیصد سالانہ شرح سود پر عوام کے ہاتھ ڈبنچرس فروخت کئے لیکن کفالتی قرضہ جات کے لئے اس نے کاشتکار پر ½ ۶ فیصد سالانہ سود کی شرح سے سود عائد کیا۔

ایک تجارتی بنک کے لئے ½ ۲ فیصد سود ادا کرنا اور ½ ۶ فیصد کی شرح سے منافعہ حاصل کرنا بہت بڑی حماقت ہے۔ لیکن مجھے یقین دلایا گیا کہ اِن قرضہ جات کی داد و ستد میں بنک پر جو خسارہ عاید ہوتا ہے۔ کاشتکاروں کے ساتھ دوسرے معاملات کے سلسلہ میں اس کی تلافی ہو جاتی ہے اگر بنک دیگر کاروبار کی انجام دہی اپنے ذمہ نہ لیتا تو یہ سارا منافعہ کسی اور جگہ منتقل ہو جاتا۔

بنک کے آئندہ گاہکوں میں کفایت شعاری کا جذبہ پیدا کرنے کی اہمیت کا ہندوستان میں پورا پورا اندازہ لگانا چاہیئے خواہ اس تدبیر سے فوری منافعہ حاصل نہ ہوتا ہو اور اس مقصد کے حصول میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہیئے اور اس اسکیم کو کمسن بچوں سے آغاز کرنے میں بھی دریغ نہ ہونا چاہیئے۔ آسٹریلیا کی مختلف ریاستوں کے ارباب حل و عقد نے نہایت دانشمندانہ طور پر اس امر کی اہمیت تسلیم کی ہے کہ مدرسہ کے کمسن طلبا کے ذہن جذبۂ کفایت شعاری کی پرورشی کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ اور اس کے ذریعہ مستقبل میں پس اندازی کے بہتم بالشان نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر ریاست وکٹوریہ کے کفایتی بنک نے مدارس میں تقریباً تین ہزار چھوٹے بنک قائم کئے جائیں جہاں بچے نہایت معمولی رقوم امانتاً جمع کرا سکتے ہیں۔ گزشتہ تیس سال کے دوران میں فی بچہ چار آنے کی برائے نام رقم کے لئے بنک نے دس لاکھ محفوظ امانتی صندوقچیاں فروخت کیں۔ بچے اور قلیل آمدنی والے دیگر افراد ان صندوقچیوں میں چھوٹی چھوٹی رقوم امانتاً جمع کرتے ہیں اور جب یہ بھر جاتی ہیں تو رقم کفایتی بنک میں جمع کر دی جاتی ہیں۔

آسٹریلیا کے کفایتی بنک نے پینی بنک (PENNY BANK) کا شعبہ قائم کیا ہے جہاں ایک آنہ کی سی حقیر رقم بھی بطور امانت قبول کی جاتی ہے تقریباً تمام سرکاری مدارس میں اس بنک کی شاخیں قائم ہیں۔

مذکورہ بالا مثالوں سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ اعلیٰ متمدن ممالک میں بھی کفایت شعاری کے جذبہ کی تخلیق اور بنک میں رقوم جمع کرانے کی ترغیب اور اس کے لئے

سہولتوں کی فراہمی کو کس قدر اہمیت دی جاتی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ پانچ سال کی مدت میں حیدرآباد اسٹیٹ بنک کم سے کم سو شاخیں قائم کرے۔ میں ہندوستان کے بھارت بنک کی مثال بیان کرنا چاہتا ہوں جس نے ایک سال کے اندر سو شاخیں قایم کی ہیں۔ ان شاخوں کو چلانے کے لئے اگر بھارت بنک کو ایک سال کے اندر سو منتظمین مہیا ہوسکتے ہیں تو قومی وسایل دولت کی تنظیم کے سلسلہ میں سو تربیت یافتہ افراد کی فراہمی میں مجھے کوئی دقت نظر نہیں آتی۔ بشرطیکہ اس کے انصرام کے لئے ہم آمادہ ہوں۔

طلاء اور زیورات کی فروخت

اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے صرف سونے اور چاندی کی برآمد پر امتناع عائد کرنا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ ترغیب وتحریص کے ذریعہ مملکت کے سونے اور چاندی کے ذخیرہ کو اکٹھا کرنا بھی لازمی ہے تاکہ اس لائحۂ عمل کی تکمیل کے لئے سرمایہ فراہم ہوسکے۔

بیرونی سرمایہ

اتنا سب کچھ کہنے اور سننے کے بعد بھی مجھے یقین نہیں کہ ابتدائی منازل میں اس اسکیم کو بروئے کار لانے میں کامل سرمایہ حدود مملکت ہی کے اندر فراہم ہوسکے گا۔ میرے لئے سب سے مسرت کا باعث ہوگا اگر تجربہ سے میرے اس اندیشہ کی تردید ہو جائے لیکن میں جس امر پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ملک کے وسایل کی توسیع وتعمیر کو محض اندرونی سرمایہ کی قلت کے باعث پس پشت نہ ڈال دینا چاہیئے۔ بیرونی سرمایہ کی درآمد پر کسی کو اعتراض کی وجہ نہیں ہے بشرطیکہ بیرونی تسلط بھی اس کے ساتھ ملک میں دخل نہ پائے۔

فنی ترجیح وقت کا مسئلہ

ایک اور اہم مسئلہ تنظیم کے سلسلہ میں سلجھانا ہے وہ فنی ترجیح وقت کا مسئلہ ہے سلیس زبان میں اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی خاص منزل پر پیدائش اشیاء کی جو تدابیر اختیار کی جائیں گی ان کے متعلق ارباب تنظیم فیصلہ کریں گے کہ اشیاء کی پیدائش کے لئے محنت اور سرمایہ کس تناسب میں استعمال

کیا جائے گا۔ اس مسئلہ پر ماہرین فن اور معاشیین کے نقاط نظر میں بہت بڑا اختلاف پایا جاتا ہے اس اختلاف کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ایک ہی چیز کی تیاری اور پیدائش کے لئے کئی متبادل طریقے موجود ہیں ایک ہی چیز کو مختلف طریقوں یعنے زیادہ محنت کم سرمایہ یا کم محنت اور زیادہ سرمایہ۔ استعمال کر کے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ایک ماہر فن اپنی پیشہ ورانہ مہارت کی بدولت پیدائش اشیاء کے لئے جدید ترین حکمیاتی طریقے استعمال کرتا ہے۔ ایسے طریقے گو سہل ہوتے ہیں لیکن ان پر وقت اور سرمایہ کی زیادہ مقدار صرف ہوتی ہے۔ ان کے لئے قیمتی اور بھاری بھرکم مشین درکار ہوتے ہیں۔ اس خصوص میں مجھے ڈاکٹر لوک ناتھن کی رائے سے پورا اتفاق ہے جن کا بیان ہے کہ "فنی ترجیح وقت" کوئی علمی مسئلہ نہیں۔ بلکہ ایک اساسی مسئلہ ہے جس سے ارباب تنظیم کو دوچار ہونا ہے۔ روس میں ماہرین فن اور بالشویزم کے حامیوں نے جن کی ذہنی صلاحیت "تشکیل سرمایہ" کے ادراک پر قادر نہ تھی اپنے جوش و خروش کے ساتھ بڑے بڑے اور جدید کارخانے قایم کرنے شروع کئے۔ بعض کارخانے اتنے عظیم الشان تھے کہ آٹھ یا دس سال کے بعد بھی ان کی تعمیر مکمل نہ ہو سکی۔ اس طرح سرمایہ کی ایک بڑی مقدار کو اس مقصد کے لئے مختص کرنا پڑا اور دیگر عملی مقاصد کے لئے ۸ یا ۱۰ سال تک سرمایہ کی قلت محسوس ہوئی۔ یہ صورت حال بالآخر عوام کی خستہ حالی پر منتج ہوئی۔ ابتدائی سالوں میں اگر روسی پیدائش اشیاء کے لئے نسبتاً کم پیچیدہ طریقے استعمال کرتے اور چھوٹے چھوٹے کارخانے تعمیر کرتے تو ایک یا ڈیڑھ سال کے عرصہ میں ان کی تکمیل ہو سکتی اور اس طرح عوام کو مصائب اور پریشانیوں سے نجات دلا سکتے۔ اگر اہل روس کو تشکیل سرمایہ کے سادہ نظریہ سے کچھ زیادہ واقفیت ہوتی تو روسی قومی آمدنی اور اس اعتبار سے روسی معاشی و عسکری قوت شاید اس سے دوچند ہوتی جو روس پر جرمن حملہ سے قبل تھی۔

اگر سرمایہ کی قلت نہ ہوتی اور ہم خوش قسمتی سے پیدائش اشیاء کے لئے بہترین طریقے استعمال کر سکتے تو فنی ترجیح وقت کے مسئلہ کی اتنی اہمیت باقی نہ رہتی لیکن بدقسمتی سے ہمارے

مقاصد کثیر اور ان کے مقابلہ میں مسابقت اور وسایل درحقیقت بہت محدود ہیں۔ ملک میں انسانی قوت ضرورت سے زیادہ لیکن سرمایہ اور محنت کی قلت ہے اس لئے پیدائش اشیاء کے لئے ہم کم پیچیدہ طریقے استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ ورنہ ہمارے جوش و خروش کی غلط رہنمائی ہوگی۔

پروفیسر ہیک نے سچ کہا ہے کہ اگر مشین کی لاگت کے مقابلہ میں انسانی محنت ارزاں قیمت پر فراہم ہوسکتی ہے۔ جس کی بجائے اس مشین کا استعمال ہورہا ہے تو ایسا کارخانہ جہاں مشینوں سے کام لیا جاتا ہے ملک کی کوئی قابل قدر متاع نہیں ہے اس کے قیام میں جو صرفہ عاید ہوا ہے وہ سرمایہ کی محض تضیع ہے۔

اندیشہ ہے کہ ہندوستان میں بعض جوشیلے افراد کی کوششوں کے باعث جو بلا لحاظ لاگت واشیاء قابل حصول بہترین ذرایع اختیار کرنے کے حامی ہیں ہماری صحیح رہنمائی نہ ہوسکے۔ مثلاً پروفیسر کے ٹی شا نے تنظیم کے اصول بیان کرتے ہوئے مشورہ دیا ہے کہ بجز اشیاء کی صنعت وغیرہ میں جہاں صغیر پیمانہ پر اشیاء کی تیاری مناسب، وموزوں ہے زراعت اور دیگر تمام صنعتوں کی جہاں تک ممکن ہوسکے قومی وسایل کے تعمیر کے ایک جز کی حیثیت سے بہ پیمانۂ کبیر تنظیم کرنی چاہیئے ایسے تمام وسیع کاروبار میں جدید ترین اور بہترین مشنری اعلیٰ ترین حکمیاتی فن کاری بہترین ماہرانہ محنت اور معقول طریقہ کار کو ایک مسلّمہ اصول کے طور پر اختیار کرنا کرنا چاہیئے۔" کے ٹی شا کا یہ مشورہ نظری طور پر نہایت معقول ہے بشرطیکہ ہمارے پاس وسایل کی فراوانی ہو لیکن ہمارے موجودہ حالات کے تحت اس مشورہ کو قبول کرنا پرلے درجہ کی نادانی ہوگی۔

پروفیسر کے ٹی شا کے خلاف ڈاکٹر لوکناتھن نے اپنے پرمغز سلسلہ مضامین میں جو رسالہ "ایسٹرن اکنامسٹ" میں شایع ہوئے ہیں پیدائش اشیاء کے سلسلہ میں ملک کے معاشی حالات کا لحاظ کئے بغیر پیچیدہ طریقوں کے استعمال کے فریب کو پوری طرح بے نقاب کیا ہے اس نے نہایت صحیح طریقہ پر یہ تجویز پیش کی ہے " فنی ترجیح وقت کی اسکیم کے تعمیل میں ارباب تنظیم کے لئے سہ گانہ مسایل درپیش ہوتے ہیں اوّل یہ کہ موزوں اور نمایندہ فنی ترجیح وقت کا تعین کرنا چاہیئے

تاکہ سرمایہ کی زیادہ سے زیادہ کفایت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پیداوار کا یقین حاصل ہو سکے۔ دوم یہ کہ اضافہ سرمایہ کی مناسب شرح کا تعین ہونا چاہیئے اور سوم یہ کہ پورے نظام معیشت میں سرمایہ کی مساوی تقسیم عمل میں آئے تاکہ جدید پارچہ بافی مل کے استعمال سے اس صورت حال کا اعادہ نہ ہونے پائے کہ ایک طرف تو بیش قیمت خود کار اور جدید فنی مشین ہوتی ہیں تو دوسری طرف دستی پارچہ باف نہایت بھدے آلات استعمال کرتے ہیں۔

توضیح

ہماری اس تخیلی تصویر کو عملی صورت دینے کے لئے اب ہم ایک مثال پر غور کریں گے۔
فی الحال ہندوستان میں پارچہ بافی کے چار مختلف طریقے رائج ہیں۔ پہلا پارچہ بافی کی معمولی گھریلو صنعت جس میں بھدے آلات مستعمل ہیں اور قلیل سرمایہ فی مزدور کے حساب سے استعمال کیا جاتا ہے مزدوروں کی کثیر تعداد کام کرنے کے باوجود ماحصل نہایت قلیل ہوتا ہے۔ دوسرا ترقی یافتہ دستی کرگہ جس پر بہت زیادہ سرمایہ لگایا جاتا ہے۔ تیسرا پیمانہ صغیر کی صنعتیں جن کے لئے صرف سادہ کرگھے چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں مستعمل ہیں۔ چوتھا جدید پارچہ بافی مل۔ ان طریقوں کی متعلقہ تفصیلات کا تخمینہ درج ذیل ہے۔

آلات کی نوعیت	فی کس عاید شدہ صرفہ روپیہ میں	فی کس پیداوار گز	تناسب	سرمایہ کی اکائی پر صرف شدہ محنت
۱۔ جدید مل (پیمانۂ کبیر کی صنعت)	۱،۲۰۰	۶۵۰	۱٫۹	۱
۲۔ برقی کرگہ (پیمانۂ صغیر کی صنعت)	۳۰۰	۲۰۰	۱٫۵	۳
۳۔ خودکار کرگہ (گھریلو صنعت)	۹۰	۸۰	۱٫۱	۱۰
۴۔ دستی کرگہ (〃)	۳۵	۴۵	۰٫۸	۳۰

اب فرض کیجئے کہ ارباب تنظیم نے سرمایہ اور محنت کی ایک خصوصی مقدار پارچہ بافی کی صنعت کے لئے مختص کی ہے اس لحاظ سے گھریلو، پیمانۂ صغیر اور پیمانہ کبیر کی صنعتوں کو کیا درجہ حاصل ہوگا۔ تاوقتیکہ ارباب تنظیم اس سے واقف نہ ہوں کہ اسکیم کی خاص منزل پر پیدائش

اشیاء کے کس طریقہ کا استعمال مناسب ہوگا تنظیم کی بجائے وسایل کی تفضیح ہوگی اگر ارباب تنظیم نے پورا سرمایہ دستی پارچہ بافی کی صنعت پر استعمال کیا تو صورت حال کی سادہ صراحت سے واضح ہوگا کہ مجموعی پیداوار کا تناسب مستعملہ سرمایہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوگا لیکن اگر یہی سرمایہ پیمانہ کبیر کی صنعت پر استعمال کیا جائے تو اول الذکر کے مقابلہ میں تین گنا زیادہ محنت درکار ہوگی اور نتیجتاً انسانی قوت کی قلت محسوس کی جائے گی اگر زیادہ بھدے آلات استعمال کئے جائیں تو انسانی قوت کی کمی ظاہر ہوگی اس کے برعکس زیادہ ترقی یافتہ آلات استعمال کئے جائیں تو انسانی قوت ضرورت سے زاید ہو جائے گی۔ اس لئے تقسیم ایسی ہونی چاہیئے کہ انسانی قوت کی نہ تو قلت محسوس ہو اور نہ کثرت۔

اس طریقہ سے تنظیمی لائحہ عمل کی ایک خاص منزل پر فنی ترجیح وقت کا مناسب تعین عمل میں آسکتا ہے جس سے گھریلو چھوٹی صنعتوں کا مقام خود بخود معین ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ارباب تنظیم کو چاہیئے کہ اضافہ سرمایہ کی شرح بھی معین کردیں اس کا تعین نظام صنعت کی رفتار و ترقی کے بموجب ہوگا جو ہماری معاشرتی حکمت عملی کے تابع ہوگی۔ اس کام کے ابتدائی منازل میں اگر ہمارا قدم سست پڑجائے تو مختلف صنعتوں میں استعمال شدنی سرمایہ کے تعین کا فرض حکومت انجام دے گی تاکہ آخر میں عوام معاشی پریشانیوں میں مبتلا نہ ہوں۔

تنظیم مابعد جنگ میں زراعت کی اہمیت

آج کل تنظیم مابعد جنگ کے متعلق بہت کچھ سننے میں آرہا ہے لیکن ساری توجہ صرف نظام صنعت کی ترقی پر مرکوز ہے۔ فی الحقیقت بعض حلقوں میں تنظیم عبارت ہے صنعتی تعمیر سے بلاشبہ صنعتی نقطۂ نظر سے ہندوستان بہت پیچھے ہے اور صرف موجودہ جنگ کے دوران ہی میں ہم نے اپنی صنعتی ذمہ داری کو محسوس کیا ہے۔ سرعت کے ساتھ ملک کے نظام صنعت کی ترقی سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا اور میں تو اس کا پوری طرح حامی ہوں لیکن یہاں جس بنیادی مسئلہ پر میں زور دینا چاہتا ہوں کہ ملک کی زراعت کو ترقی دینی چاہیئے۔ زراعت میں، میں

شیرخانوں ترکاری اور میوؤں کی کاشت کو بھی شامل کرتا ہوں جو ملک کی (۷۰) فیصدی آبادی کا پیشہ ہے۔ اس حقیقت کی بنا پر کہ اس ملک کی اہم زراعتی پیداوار دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلہ میں بہت کم ہے ہمارے ملک کی زراعتی خستہ حالی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ذیل کی جدول سے غذائی اجناس کی نسبت ارباب تنظیم کی غور و فکر کے لئے کافی مواد فراہم ہوسکتا ہے۔

(پیداوار فی ایکر)

اجناس	ہندوستان	برطانیہ	جاپان	متحدہ امریکہ	آسٹریلیا	کینیڈا	مصر	اطالیہ
گیہوں	۶۳۶	۱۸۶۰	.	۸۴۶	۷۱۴	۹۷۲	.	.
چاول	۷۲۸	.	۲۰۳۵	۱۷۷۱	.	.	.	.
جو	۹۵۰	۱۴۸۸	۱۵۰۰	۱۲۰۰	۱۲۵۰	.	۲۰۰۱	۳۲۵۸
روئی	۱۰۲	.	.	۱۴۱	.	۱۳۳۴	۱۴۴۰	۶۷۲
نیشکر	.	.	.	.	.	.	۳۵۲	.

اگر اس ملک میں زراعتی پیداوار کی شرح کو دیگر متمدن ممالک کے معیار پر لانا مقصود ہو تو قومی تنظیم کے لائحہ عمل میں زراعتی تنظیم کو اہم ترین مقام حاصل ہونا چاہیئے تاکہ موجود پیداوار کو دگنا کیا جاسکے اور صنعت کی اس طرح تنظیم ہونی چاہیئے کہ زراعتی کاروبار کو پیداآور بنیاد پر چلایا جاسکے۔ ہمارے کروڑہا ہموطنوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی بھی ایک آسان اور موثر ترین تدبیر ہوسکتی ہے۔ صنعتی نظام کی ترقی کی اسکیم میں صرف اُن ہی صنعتوں کی تنظیم کو تقدیم حاصل ہونی چاہیئے جن کی زراعتی مقاصد کے لئے سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

زراعتی ترقی کو میں بہت وسیع معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ بڑی بڑی اور کیمیائی صنعتیں زراعتی ارتقاء کے لئے بہت ضروری ہیں کیونکہ وہ زراعتی آلات اور کیمیائی کھاد کی تیاری میں ممد و معاون ہوتی ہیں۔ ذرائع حمل و نقل کی ترقی بھی زراعتی پیداوار کی فروخت وغیرہ کے لئے اسی طرح ضروری ہے، اندرونی تجارت کا فروغ بھی اس مقصد کے لئے

ضروری جس سے مزارعین کا قریبی اور گہرا رشتہ ہے۔ برقابی کی تنظیم جتنی زراعت کے لئے ضروری ہے صنعتوں کے لئے اتنی ضروری نہیں ہے کیونکہ بڑے بڑے صناع برقی قوت محرکہ خود پیدا کر سکتے ہیں لیکن یہ مزارعین کے بس کی بات نہیں ہے۔

الحاصل زمانۂ مابعد جنگ میں ہمارے سرمایہ اور مساعی کا بہت بڑا حصہ زراعتی تنظیم کے لئے وقف ہونا چاہیئے اور تنظیم کے لائحہ عمل میں اس کو خصوصی اہمیت دینے کی ضرورت ہے فقط

خطبۂ صدارت

از جناب کیشو اینگار صاحب پروفیسر معاشیات نظام کالج

(جو ۱۴ / بہمن کو معاشی کانفرنس کے تیسرے اجلاس میں انگریزی میں پڑھا گیا)

"معاشی تنظیم، بنک کاری اور اتحاد باہمی"

معاشیین کا فریضہ | گذشتہ جنگ عظیم کے بعد مسٹر جے، ام کینز (J.M. KEYNES) نے (جو اب لارڈ ہیں) ("REVISION OF THE PEACE THEORY") اور "[ECO]NOMIC CONSEQUENCE OF THE PEACE"
نام کی دو تالیفات شایع کیں جن میں انہوں نے اپنے بے نظیر واضح انداز بیان میں حامیان صلح کانفرنس کی لغزشوں کو بے نقاب کیا تھا۔ اُس وقت اُن انتہا پسند بلکہ انقلابی سمجھا گیا لیکن آج لارڈ کینز برطانوی وزیر خزانہ (CHANCELLER OF THE EXCHEQUER) کے دست راست ہی نہیں بلکہ معاشی مسایل میں اقوام متحدہ کے ایک نہایت اہم مشیر بھی ہیں۔

مسز جون رابنسن (MRS. JOAN ROBINSON) BRITISH ECONOMICAL JOURNAL کی حالیہ اشاعت میں لکھتی ہیں "مسایل زر سے متعلق اس ملک میں رکارڈو (RECORDO) کی تجاویز ۱۹۲۵ء میں قبول کر لی گئیں تھیں لیکن اب اس زمانہ کی تاریخ میں کچھ ایسا تغیر رونما ہورہا ہے کہ شاید ان تجاویز کو روبہ عمل لانے میں کچھ زیادہ عرصہ نہ لگیگا۔

مسز رابنسن نے کینز اور WHITE CURRENCY تجاویز کے سلسلہ میں مذکورہ صدر خیال ظاہر کیا ہے۔ ہم بیچارے ہندوستانی معاشیین بھی یقین واثق رکھتے ہیں کہ موجودہ معاشی مسایل کا تجربہ کرنے اور کامیاب طریقہ پر اُن سے عہدہ برآ ہونے میں ہمیں بھی اپنا فریضہ

انجام دینا چاہیئے۔ اگر حکومت کے ارباب بست وکشاد اس معاملہ میں باعزت نہ سہی رواداراً رویہ ہی اختیار کریں تو اس ملک کے مسائل کا صحیح حل دریافت کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

مجھ سے خواہش کی گئی ہے کہ میں ابھی اس متداول مسئلہ پر بحث کروں یعنے یہ بیان کروں کہ حیدرآباد کی معاشی تنظیم میں بنک کاری اور تحریک امداد باہمی کی کیا اہمیت ہے؟ اصل مسئلہ پر بحث شروع کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ ایک بنیادی امر کی تفصیلات کو کامل وضاحت کے ساتھ ذہن نشین کر لیا جائے۔

مقصد تنظیم۔ وہ کیا امور ہیں جن کی ہم تنظیم کرنا چاہتے ہیں۔ معاشی کشمکش اس پیچیدہ دور میں مسایل ذیل کی واجبیت کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔

(۱) دولتمند طبقہ کی خواہش ہے کہ ان کے معاشی امتیازات اور متوقعہ آمدنیوں کا تحفظ کیا جائے محض اس بنیاد پر کہ وہ بہتر ورثہ کے مالک بنائے گئے ہیں اور دیگر نسبتاً کم خوشحال طبقے اپنے پیدائشی ماحول پر قانع رہیں۔

(۲) بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ معاشی طاقت (POWER ECONOMY) ہی ایک عملی اور مستحکم معاشی نظام ہے۔ نازی جماعت نے اس کو آزمایا لیکن وہ ناکام رہی تاہم اس خیال کو ہنوز تقویت حاصل ہے۔ لندن ٹائمز کی حالیہ اشاعت میں ذیل کا خیال ظاہر کیا گیا ہے "طاقت کے حقائق کو تسلیم کرنا ہی ایک بین الاقوامی ادارہ کے لئے مضبوط اساس کا کام دے سکتا ہے؟

حال، حال میں فیلڈ مارشل اسمٹس (FIELD MARSHALL SMUTS) نے پیشین گوئی کی ہے کہ اقالیم ثلاثہ —— امریکہ، برطانیہ اور روس اسی نوعیت کی طاقت کا استعمال کرینگے۔

(۳) بعض لوگ ایک "متوسط راہ" کے تعین کی سفارش کرتے ہیں جس کے ذریعہ مختلف ممالک کی معاشی تنظیم کے اختلافی عناصر کو مٹایا جائے تاکہ عام اختلاط کی بدولت ایک قسم کا بین الاقوامی معاشی توازن قائم ہو سکے۔

(۴) کہیں ماتحت ممالک کو مستقل طور پر "سکون بخش" مہلت عطا کی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس مہلت کی بقا حاکم ممالک کے اشارہ پر منحصر ہے جیسا کہ دولت برطانیہ کے ماتحت ممالک اس زمرہ میں شامل ہیں

(۵) آخری نظریہ (WELFAR ECONOMY) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے بیوریج اسکیم (BEVORIDGE SCHEME) اور امریکہ کے NATIONAL RESOURCES PLANNING BOARD کی اسکیموں کے ذریعہ اس نظریہ کا اعلان کیا گیا ہے۔ برطانیہ کے روشن خیال طبقہ کی رائے ہے کہ انیسویں صدی میں برطانیہ نے دنیا کو سیاسی آزادی بخشی تھی، آج بیسویں صدی میں اس کا فریضہ ہے کہ دنیا کو سماجی اور معاشی آزادی سے بہرہ اندوز کرے۔ نہایت ہی اعلیٰ مقصد ـــــ لیکن سماجی اور معاشی حریت کی اس مہم میں ہندوستان کو محض عدم گنجایش کی بنا و پر کیا اُسی طرح نظرانداز کردیا جائے گا جس طرح سیاسی آزادی کے معاملہ میں اُسوقت سے ابتک مسلسل اس کو پس پشت ڈالا جارہا ہے۔

منشور اوقیانوس اور حالیہ دیگر اعلانات کے ذریعہ آخرالذکر مقصد کے ساتھ وابستگی کا غیر مبہم الفاظ میں یقین دلایا جارہا ہے لیکن اس کے باوجود ہم یہی کہینگے کہ اس امر کا فیصلہ کرنے سے قبل کہ ہم کس طریقہ کو اختیار کرینگے اور کس رفتار سے گامزن ہونگے صورت حال کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ حیدرآباد میں یا سارے ہندوستان میں بہ حیثیت مجموعی کس قسم کی معاشی تنظیم عمل میں لائی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ معاشرتی فلاح و بہبود حاصل ہوسکے۔ اسکے جواب میں مختلف چیزیں پیش کی جاتی ہیں۔

اکثر صنعتی تنظیم کا نام لیتے ہیں۔ بہتوں کا خیال ہے کہ بہتر صحت اور تعلیم سب سے مقدم ہے دوسری چیزیں خودبخود درست ہو جائینگی۔ ایک تیسرا خیال ہے جو آجکل بہت سرعت سے ترقی پذیر ہے کہ چھوٹے پیمانہ ہی پر سہی جدید اصول کے تحت زراعت کی تنظیم کرکے عوام کی حقیقی آمدنی میں اضافہ کیا جائے۔ دیہات میں ذرائع آمد و رفت کی اصلاح کی جائے۔ مزارعین کے لئے ایسی سہولتیں مہیا کی جائیں کہ وہ اپنی تجارتی اشیاء کو بآسانی منڈیوں تک پہنچاسکیں اور وہاں حتی الامکان دلال کے واسطہ سے بے نیاز ہوکر بہتر قیمتیں حاصل کرسکیں۔ ذرائع آبپاشی کو زیادہ وسیع کیا جائے جسکے لئے کافی امکانات موجود ہیں۔ پیمانہ صغیر کی

دیہی صنعتوں کی ترقی کے لیۓ دیہات میں ارزاں برقی قوت مہیا کی جائے۔ اس نوع کی تنظیم سے سیاسی میدان میں بھی ایک نئے انداز کی قیادت وجود میں آئے گی اور دیہی آبادی کو شہری دستبرد سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ صحت تعلیم نیز اس ملک کے مناسب حال صنعت حرفت یہ سب چیزیں اس قسم کے ماحول میں لازمی طور پر ترقی کرتی رہینگی۔

اس کا ذکر کرنے کا یہاں موقعہ نہیں ہے کہ مذکورہ صدر امور میں سے کونسا نظام العمل حیدرآباد کے لیۓ مناسب ہوگا اور اس کے وجوہ ترجیح کیا ہیں؟ میں صاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے لیۓ صحیح راہ عمل یہی ہوگی کہ ہمارے نظام العمل میں زراعت کو تقدیم حاصل ہو۔ ہم میں سے اکثر "یک کرشمہ چند کار" کے اصول کو پسند کرتے ہیں چنانچہ اُن کا خیال ہے کہ زراعت اور صنعت دونوں کو ترقی دینی چاہیئے، ملک کا معیار زندگی بلند کرنا چاہیئے، بیرون ملک کی تجارت بھی نشو و نما پانی چاہیئے تاکہ ایک لین دار (CREDITOR) معاشی وحدت کی حیثیت سے حیدرآباد کا معیار بلند ہو سکے۔ عظیم تر حیدرآباد کو وجود میں لانے کی کوشش کرنی چاہیئے لیکن کیا میں اس امر کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرا سکتا ہوں کہ ہماری قومی آمدنی نہایت محدود ہے لہذا ہم کو اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ کہ اسوقت ہمارے سامنے سرکاری اعداد و شمار نہیں ہیں جن کی بنا پر فی کس آمدنی معلوم کی جا سکے تاہم سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء میں برطانوی ہند کے لیۓ (۶۲) روپیہ کا اندازہ لگایا گیا ہے لیکن اس ملک میں دائرۂ آمدنی کی وسعت کا لحاظ کرتے ہوئے مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارا پست ترین طبقہ اس سے بہت کم پر گزارہ کرتا ہوگا۔ پنجاب کی معاشی مجلس تحقیقات (PUNJAB BOARD OF ECONOMIC ENQUIRY) کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاٹاناٹا نامی ایک گاؤں میں کھانے، کپڑے اور مکان کے لیۓ فی کس تین پائی روزانہ یا چھ روپیہ سال کا خرچ عاید ہوتا ہے۔ اس کے بالمقابل سال حال یعنی سنہ ۱۹۳۰ء میں برطانیہ میں فی کس آمدنی (۹۰) پونڈ اور امریکہ میں (۵۰۰) اسٹرلنگ بتائی گئی ہے۔

حیدرآباد میں جیساکہ عام طور پر ہندوستان کا حال ہے ہم اُن قومی ضروریات سے بھی محروم ہیں جو اقل ترین معیار زندگی کے لئے ناگزیر ہیں اور یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ غذائی ضروریات ہماری پہلی توجہ کی مستحق ہیں۔ اس امر میں کونسی معقولیت ہے کہ ہم دوسری ضروریات کے حصول کی فکر و تردد کریں جبکہ ہم عوام کی صحت اور ان کی خوش حالی کے تحفظ کی خاطر کافی مقدار میں غلہ، دالیں، دودھ، گوشت، پھل اور ترکاریاں تک پیدا کرسکنے کے قابل نہیں ہیں۔

میں اس موقعہ پر نصابی کتاب کے انداز میں اُن تمام امور کی طویل فہرست دینا نہیں چاہتا جو اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہیں اسوقت خصوصیت کے ساتھ صرف ان چند امور کی طرف توجہ دلانے پر اکتفا کرونگا جو نہایت اہم ہیں۔ سب سے پہلے بنک سے متعلقہ مسایل ہیں۔

حیدرآباد اسٹیٹ بنک کا مستقبل

ادارہ جاتی نظام کے ذریعہ مالی آزادی

مالیاتی، معاشی یا سیاسی آزادی ادارہ جاتی نظام کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے — مالی آزادی کے تحفظ کا واحد ذریعہ دنیا میں ہرجگہ ایک مرکزی یا ریزرو بنک کا قیام ہے۔

بنک کاری صحیح معنوں میں حکومتی مالیہ کے شمول کے ساتھ قومی مالیات ہے۔ حکومت سرکارعالی نے اسٹیٹ بنک کو قائم کرکے اس کارعظیم کی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے موزوں ترین ذریعہ فراہم کیا ہے۔ منشاء قانون کے مطابق اس بنک کو ترقی کرکے کچھ عرصہ کے اندر مملکت کے نیشنل ریزرو بورڈ کی صورت اختیار کرنی چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اصول تقدیم کے لحاظ سے عوام کی بچت کو اکٹھا کرنے اور تجارتی اغراض کے لئے سرمایہ کی مقدار میں اضافہ کرنے کی بھاری ذمہ داری بھی بنک ہذا پر عائد ہوتی ہے۔ عوامی اور حکومتی حلقوں میں فرایض کی تکمیل کے لئے بنک کو مناسب تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ خارجی مالیات ملک کی اندرونی معاشی تنظیم میں گنجایش معین کرنے کا جہاں تک تعلق ہے بنک حکومت کا ایک فنی ادارہ ہے — اس

دور رس فرائض کے انصرام کے بغیر حیدرآباد اسٹیٹ بنک ہندوستان کے ایک ایسے چھوٹے رئیس کے مشابہ ہوگا جس کے خطابات شاندار اور معاہداتی حقوق تو بھاری بھرکم ہیں لیکن اسکے اختیارات اور دائرۂ عمل نفی کے برابر ہے۔ دوسرے مرکزی بنکوں کی طرح ح۔ا۔ب کے لئے بھی ضروری ہے کہ قرضہ اور زر دونوں مسایل کو اپنے حصۂ اقتدار میں شامل کرے۔ یہی وجہ تھی کہ برطانوی ہند میں امپیریل بنک آف انڈیا کے وقار اور اثر کے باوجود ریزرو بنک آف انڈیا معرض وجود میں آیا اور یہی وہ استدلال ہے جسکی بناء پر امپیریل بنک آف انڈیا اور حکومت دونوں کے لئے لازمی ہے کہ وہ ایسے امکانات پیدا کریں کہ قانون حیدرآباد اسٹیٹ بنک کے وجوہ ونحواء میں بنک کا جو لائحہ عمل تجویز کیا گیا ہے اس کو عملی جامہ پہنائیں۔ ظاہر ہے کہ اس خصوص میں ہمیشہ حکومت کی زیادہ سے زیادہ رہبری اور اشتراک عمل ضروری ہیں جس کے لئے خود بنک کا قانون کلیدی مسایل میں حکومت کو کثیر اختیارات عطا کرتا ہے

نظام زر کو اپنے قبضہ میں لینے اور اس کے لائحہ عمل کو بروئے کار لانے کا مطلب ہی ایک ایسے مفرد ادارہ کا قیام ہے جو موازنہ معاشی وسایل کی تنظیم اور دیگر ضروری مسایل پیدا کر دیتا ہے۔ حیدرآباد کے لئے جداگانہ نظام زر کا قیام اس امر کی دلیل ہے کہ۔ قومی موازنہ کی نگرانی، متبادلہ قومی کفایت کی تعین کاروباری مسایل میں مت کی تعلیم وتربیت اور بعض خصوصی پیداوار کی نشو ونما کے لئے جو کچھ عرصہ تک ہماری توجہ کی محتاج ہے ایک مرکزی بنک کی ضرورت ناگزیر ہے۔ لہذا جبکہ بنک کا قانون مجموعہ قوانین میں شامل ہے اس کے فرائض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وجوہ نحواء یا اصل قانون میں معین طور پر ان کا ذکر موجود ہے۔ لیکن بنک کے موجودہ طریقۂ عمل سے اسکی حیثیت ایک ایسی خاتون کی سی معلوم ہوتی ہے جس کو اس مکان میں چھوڑ دیا گیا ہے جسمیں مطبخ نہیں ہے اور اس کا مودی خانہ ضروری اشیاء کے وجود سے یکسر خالی ہے۔

کچھ عرصہ قبل ایک ماہر معاشیات نے مجھ سے سوال کیا تھا کیا یہ بنک ترقی کرکے ریزرو بنک کی

شکل اختیار کریگا؟ حیدرآباد اسٹیٹ بنک کی موجودہ جد وجہد کا جہاں تک تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ریزرو بنک کے وجود میں آنے سے قبل امپیریل بنک آف انڈیا کی طرح اسٹیٹ بنک کی حکومتی کاروبار کے انصرام کے ساتھ تجارتی بنک کے فرائض بھی انجام دے رہا ہے اگر اسی اصول پر کام میں اضافہ ہوتا چلا جائے تو صورت حال مشکل تر ہو جائیگی اور بنک کو صحیح راستہ پر لگانے کے لئے دقتوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس موقعہ پر ایک تمثیل یاد آتی ہے۔ سری رام کرشنا نے اپنے ایک پیرو چیلے کو متاہلانہ زندگی بسر کرنے اور دوسرے کو بحالت تجرد عوام کی خدمت کرنے کا مشورہ دیا۔ اول الذکر معتقد مشورہ کے اس اختلاف سے متردد ہوکر گروجی سے اسکی وضاحت طلب کی۔ گرو نے جواب دیا کہ مشورہ ہر ایک کی شخصی صلاحیت کے مطابق ہے۔ ایک متاہلانہ زندگی کے لئے اور دوسرا خدمت خلق کے لئے زیادہ موزوں ہے اسلئے مشورہ دیا گیا کہ خدمت خلق میں ازدواجی زندگی کی مصروفیات حائل نہ ہوں۔ قانون حیدرآباد اسٹیٹ بنک کے وجوہ وفحوا میں زر کے ایک جداگانہ شعبہ کے قیام کا جو ذکر کیا گیا ہے اسکی بنا پر اس مسئلہ میں کسی اختلاف رائے کی گنجائش باقی نہیں ہے۔

ملک کے مرکزی بنک کے فرائض کی نہایت وضاحت کے ساتھ جو تفصیل بیان کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

۱۔ تقسیم زر کو منضبط کرنا اور اس کے استحکام وتحفظ کا انتظام کرنا۔ ۲۔ اندرون و بیرون ملک ادائی رقوم کی سہولتیں بہم پہونچانا۔ ۳۔ ملک کے معاشی حالات کی ضرورت کے بموجب قرضے جاری کرنا اور ۴۔ زراعت تجارت وصنعت کی ترقی کی تدابیر فراہم کرنا۔ اگر ان واضح مقاصد کے باوجود اسٹیٹ بنک اپنی موجودہ ڈگر ہی پر قائم رہے جو قانون کے مغائر ہے تو ایک وقت آئے گا جبکہ موجودہ قانون کو رفع کرکے ایسا قانون وضع کرنا ہوگا جسکی بنا پر ایک حقیقی مرکزی بنک کا وجود لازمی ہو۔ بنک کی اسوقت تک کی کارگزاری کو

قانون کے منشاء و مقاصد سے صریح اغماض تصور کرنے کی بجائے کام کی بے ترتیبی پر محمول کرنا زیادہ مناسب ہوگا جو عموماً ابتدائی منازل کے دوران میں وقوع پذیر ہوا کرتی ہے۔ اس امید افزاء نظریہ کے تحت یہاں ان اہم امور کی نسبت کچھ بیان کیا جائے گا جن سے بینک کو نپٹنا ہے۔

شعبۂ زر سکۂ عثمانیہ کی حال ہی میں معین کردہ تین کروڑ روپیہ کی محفوظات کو جو طویل المیعاد امانتوں میں لگائی گئی ہیں سکۂ قرطاس کی محفوظات میں ضم کر دینا چاہیئے بشرطِ ضرورت شعبۂ زر کے لئے (REFLATION) کی گنجائش باقی رہے۔ مبادلۂ زر کے استحکام اور مختلف مقدار کے کرنسی نوٹوں کو نقدی سکہ میں تبدیل کرنے کے لئے سکۂ قرطاس کی محفوظات کو استعمال کرنے کا موجودہ طریقہ محفوظات پر ایک ایسا بار ہے جسکو ترک کیا جا سکتا ہے اور یہ عمل معیار مبادلہ کے سلسلہ میں ساری دُنیا کے مروجہ عام طریقہ کے بھی مطابق ہوگا۔

محکمۂ کرنسی کو چاہیئے کہ جو رقم سکۂ قرطاس کے مد محفوظ کے تحت ظاہر کی گئی ہے وہ نقد رقم ہی کی شکل میں امانت رکھے۔ بہتر تو یہ ہوگا کہ یہ نقد رقم طلا کی صورت میں محفوظ رکھی جائے۔ لیکن موجودہ طریق کار یہ ہے کہ حکومت سرکار عالی قلیل مدت کے لئے امپیریل بینک آف انڈیا میں کلدار رقم جمع کر دیتی ہے جس سے حکومت کو سود حاصل ہوتا ہے۔ لیکن بینک کو چاہیئے کہ اپنے استحکام اور وقار کے پیش نظر یہ انتظام برخاست کر دے۔ اگرچہ کہ اس کارروائی سے اُس رقم کا نقصان ہوگا جو بہ طور سود ملا کرتی ہے تاہم اس بات کی ضمانت حاصل کرنے کے لئے کہ بینک مالی خلل اندازیوں سے محفوظ رہے اس نقصان کو برداشت کرنا پڑے گا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی حکومت نے دنیا کا (۸۰) فی صد زر طلائی سود پر چلائے بغیر محض بلاوجہ محفوظ نہیں رکھا ہے۔ آج برطانوی معاشیین اور ماہران مالیات جو بار بار واشنگٹن کی زیارت کر رہے ہیں اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ امریکہ کے وفاقی خزانہ میں سونے کے ذخائر موجود ہیں۔

یہاں تک تو ان بے بنیاد نظریوں کی حقیقت فاش کردی گئی ہے جو اندرون ملک سکہ کی ترویج کے سلسلے میں سونے اور چاندی کی نسبت مشہور ہوگئے تھے۔ اس لئے اب بنک کو کو چاہیئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نوٹوں کی اجرائی کا اصول اختیار کرے جن کی مجموعی معداً تغیر پذیر ہونی چاہیئے۔ پہلے نوٹوں کی اجرائی کے لئے ایک تہائی (؟) کی اعظم ترین حد مقرر کردی گئی تھی لیکن بعد ازآں قانون حیدرآباد اسٹیٹ بنک نے اس قدر ترمیم کردی ہے کہ دس فی صد تک گنجایش رکھی جاسکے۔ دیگر مدات آمدنی (مثلاً ٹریڈ بل TRADE BILLS) کے بالمقابل جو اجرائی (ISSUF) ہوتی ہے اس کی نسبت غالباً حکومت کے پیش نظر تجویز یہ ہے کہ نوٹوں کی "COVERED" اجرائی کو گھٹادے۔ لیکن بنک کے لئے بہتر یہ ہوگا کہ وہ MAKE-SHIFTS اجتناب کرے اور کسی موزوں اصول کی مستقل طور پر پابندی کرے۔

بین الاقوامی زر (کرنسی) سے متعلق BANCOR اور UNITAS کی جو دو اسکیمیں ہیں ان میں سے کسی ایک اسکیم کے روبہ عمل لائے جانے کے بعد بنک کو چاہیئے کہ فوراً ہی حیدرآبادی سکہ کو براہ راست اس اسکیم سے منسلک کرنے کی کوشش کرے۔ اگرچہ کناڈا سلطنت برطانیہ میں شامل ہے لیکن وہ اسٹرلنگ (برطانوی پونڈ) کے دائرۂ ترویج میں شامل نہیں بلکہ مالیاتی نقطۂ نظر سے اس کا تعلق ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ڈالر سے ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ خود برطانوی ہند بین الاقوامی زر کی اسکیم میں شامل ہوجائے۔

بنک کی ایک دوررس ذمہ داری یہ ہوگی کہ وہ سکہ حالی کی شرح تبادلہ کو BANCOR یا UNITAS یا معیار طلاء کے لحاظ سے اس سطح پر قایم کردے جو ممالک محروسہ سرکار عالی کی ضروریات اور وقار کے پیش نظر موزوں و مناسب ہو۔ آج کل بعض غوضمند جماعتیں [illegible] صنعت گر بنائے جانے نیز خارجی مالیات پر [illegible] اقتباس جو [illegible] کی تصنیف سے [illegible] ہم [illegible] سے بہتوں کی غلط فہمی [illegible] "معیار طلاء کا تعطیل کھیلنے یا قایم شرح [illegible] قومی تجارت کا نظام

نافذ کرنے کا بنیادی قاعدہ یہ ہے کہ وہ ملک جس کی تجارتی سلک آمدنی میں اضافہ کی باعث ہو تقریباً مساوی شرحوں پر طویل مدت کے لئے بیرون ملک قرضے دیا کرے لیکن اس کے برعکس اگر کسی ملک کی حکومت اور وہاں کے باشندے بیرون ملک قرضے دینے پر آمادہ نہ ہوں تو اس ملک کو چاہیئے کہ اپنی آمدنی کے تختے میں کوئی فاضل رقم شریک نہ ہونے دے۔ تاہم اگر تجارتی توازن برقرار رکھنے میں یا اپنے قرضہ دہی کی شرحوں اور دوسرے ممالک کی شرحوں میں مطابقت پیدا کرنے میں معمولی اور عارضی طور پر ناکامی ہو تو طلاء اور قلیل میعاد والی محفوظ رقوم کو اندرون و بیرون ملک منتقل کرتے رہنے سے اس ناکامی کی تلافی ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر عدم توازن مسلسل اور زبردست ہو تو اس سے تجارتی نظام پر ایسا بار پڑے گا جس کا وہ متحمل نہ ہو سکے گا۔"

یہاں یہ بھی واضح کر دینا چاہیئے کہ بیرون ملک قرضے دینے میں اپنی دقتوں اور جھگڑوں کا سامنا ہوگا جو بیرونی قرضے حاصل کرنے میں پیش آیا کرتی ہیں۔

آج کل سکۂ کلدار کی قیمت تیزی سے گرتی جا رہی ہے اس لئے کہ اندرون ملک رقمی آمدنی حقیقی آمدنی سے بہت زیادہ ہو چکی ہے اور بیرون ملک بھی اسٹرلنگ کی قیمت، جس پر خود سکہ کلدار کی قیمت کا انحصار ہے آزاد بازار (FREE MARKET) میں گرنے لگی ہے۔ ان حالات میں کیا یہ ممکن نہیں کہ سکۂ حالی کی قیمت کو سکۂ کلدار کے ساتھ ساتھ گرنے سے بچایا جائے؟ کسی کرنسی کی قوت خرید کا دار و مدار قوم کی موثر قوت پیداوار پر ہوتا ہے نہ کہ بیرونی مالی توازن پر۔ حکومت حیدرآباد کا امپیریل بنک آف انڈیا میں رقوم محفوظ کرنا (جن کی کفالت "BACKING" پر مقامی زر کاغذی اجرا کیا جاتا ہے) بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ حکومت ہند کا اسٹرلنگ کی شکل میں اپنی فاضلات کو جمع کر رکھنا۔ اس طرح کلدار رقوم محفوظ کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حکومت حیدرآباد حکومت ہند کو ان کی بابت محصول ادا کرتی رہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ یہ محفوظ شدہ رقومات بھی اصول فرسودگی سے متاثر ہوتی ہیں۔ مستحکم پالیسی کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہماری محفوظ مدات

نقیفی اور LIQUID ASSETS حالت میں قایم ہیں اور شرح تبادلہ کے سلسلے میں ہمارا سکہ کلدار سکہ سے وابستہ نہ رہے۔

اہل ملک روز بروز سکہ قرطاس کے عادی ہوتے جارہے ہیں۔ اسکے علاوہ خارجی سلک کی سطح کو بلند تر کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ ان حالات کے مدنظر علمی اعتبار سے یہ درخواست کی جاسکتی ہے کہ اس امر کی تفصیلی اور فنی جانچ کی جائے کہ عارضی طور پر سکہ حالی کی قیمت تبادلہ کو بڑھانا مناسب ہوگا یا نہیں۔ شرح تبادلہ کے اس اضافہ میں کسی ایسی بین الاقوامی قرارداد کی بموجب ردوبدل ہوسکے گا جو زمانۂ مابعد میں طے پاجائے۔

خزانہ کا کاروبار

یہاں اختلاف رائے کی زیادہ گنجایش نہیں۔ لیکن اس سلسلے میں تین امور بہ طور خاص اہم ہیں ایک تو یہ کہ حکومت کی نقد سلک میں، جو بنک میں محفوظ رکھی جائے گی ریلوے سرکار عالی کی نقد سلک بھی شامل کی جانی چاہیئے۔ مالیات کا یہ بنیادی اصول ہے کہ حکومت کی جملہ نقد سلکیں یا تو خود حکومت کے پاس رہیں یا حکومت کے خازن کے پاس اور قانون حیدرآباد اسٹیٹ بنک کی رو سے بنک ہی خازن ہے۔ دوسرے یہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہوسکے بنک کی شاخیں قایم کردی جائیں تاکہ حکومت کے رقمی کاروبار میں نیز خود بنک کے دوسرے کاروبار میں سہولتیں پیدا ہوجائیں۔ تیسرے یہ ہے کہ ان تمام امور کی نسبت جو رقم محفوظ کرنے یا تبدیل (CONVERT) کرنے سے متعلق ہوں اس بنک کو مشیر فنی قرار دیا جائے۔ "CUSTODIAN" کی اصلاح اس مفہوم پر حاوی ہے۔

بنکروں کا بنک

اس بنک کا فریضہ یہ ہوگا کہ اس مملکت میں ہر قسم کی بنک کاری کی تنظیم کرے اور BILL MARKET کو فروغ دے۔ اس کے لئے تشہیر و تفہیم نیز ا:ا:ئی رسوم سے استثنا حاصل کرنا ضروری ہوگا۔ بنک کو ان اشخاص سے کاروبار نہیں کرنا چاہیئے جو دوسرے بنکوں کے کھاتہ دار ہوں۔ آج کل بنک صرف چلر کی اجرائی اور DEPOSIT ADVANCE کا کاروبار

کر رہا ہے جس سے عام لوگوں کے علاوہ رقم چند اور ٹکے لال جیسے ساہوکار بھی مستفید ہو رہے ہیں۔ اس لئے ان حالات کے نتائج پر بھی غور کر لینا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ حکومت کی سرپرستی کی وجہ سے بنک ایک ممتاز حیثیت کا مالک ہے اور ٹکے لال ایک بنک سے مسابقت کی ہرگز ہرگز توقع نہیں رکھ سکتا لیکن اس کے برخلاف ایک دوسری خرابی پیش آرہی ہے وہ یہ کہ رقموں کے جمع کرنے اور قرضہ دہی کے کاروبار میں چونکہ بنک کسی سے مسابقت نہیں کرتا اس لئے رقم چند نے اپنی شرحیں ۴ سے ۱۲ فی صد تک بڑھا دی ہیں۔ اس طرح قانون حیدرآباد اسٹیٹ بنک نافذ کرنے کا اصلی مقصد جاتا رہا اور بنک کاری کی شرحیں گھٹنے کے بجائے بڑھنے کی طرف مائل ہیں۔ اگر بنک اپنی شرائط رکنیت کا اعلان کردے اور ان افراد اور اداروں سے کاروبار ترک کردے جو بنک کے رکن نہ ہوں تو رقم چند مجبور ہو جائے گا کہ اپنی شرحیں ۳ اور زیادہ سے زیادہ ۹ تک مقرر کرے۔

تمام بنکروں کو خواہ وہ انفرادی حیثیت سے کاروبار کرتے ہوں یا اداروں کی حیثیت سے اس بنک میں شریک کر لینا چاہیئے۔ بنک کو چاہیئے کہ وقتاً فوقتاً ELIGIBLE PAPOR کا تعین کرے اور رقم جمع کرنے میں سہولتیں مہیا کرے نیز جو بنک رکنیت قبول کریں انہیں مزید DISCOUNT دے۔ علاوہ ازیں RESERVE SAPOS، جمع شدہ سرمایہ کا بیمہ۔ اور کھلے بازار میں کاروبار کی بدولت بنک ساری ریاست میں اپنی مالی ساکھ قائم رکھ سکے گا۔ لیکن اس منزل پر پہنچنے تک ہل چلانے، بیج بونے، پودوں کو از سرنو ترتیب دینے اور گھاس پات دور کرنے کے سارے مراحل بنک ہی کو انجام دینے ہوں گے تب کہیں جا کر وہ فصل حاصل کر سکے گا۔

حکومت کی جانب سے انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کا قیام اس بات کی دلیل ہے کہ حکومت ملکی صنعتوں خصوصاً چھوٹے پیمانے کی صنعتوں، کی ضروریات کو اچھی طرح محسوس کرتی ہے لیکن اس فنڈ کے تحت صنعتوں کی مالی امداد کے لئے جو رقمی گنجائش رکھی گئی ہے وہ وسیع قومی پیمانہ پر

ملکی صنعتوں کی تنظیم کے لئے محض ناکافی ہے۔ درست طریقہ تو یہ ہوگا کہ اس کام کی مالی اور علمی تنظیم حیدرآباد اسٹیٹ بنک کی وساطت سے عمل میں لائی جائے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے بنک کی جانب سے جس قدر جلد کسی اسپیشل افسر کا تقرر عمل میں آئے گا اسی قدر ملک میں بہتر روزگار حاصل کرنے کے مواقع درخشاں ہوں گے۔

اعداد و شمار

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بنک کاری کے اعداد و شمار کی فراہمی اور ترتیب کا مرکز "مجلس محفوظات وفاقی" (فیڈرل ریزرو بورڈ) ہے اگر حیدرآباد اسٹیٹ بنک کو مرکزی بنک کی حیثیت حاصل کرنی منظور ہو تو اس کے اولین فرایض یہ ہوں گے کہ وہ قومی آمدنی کا اندازہ لگانے کے لئے ملک کی پیداوار سے متعلقہ اعداد و شمار فراہم کرنے کا انتظام کرے، صحت و باقاعدگی کے ساتھ تھوک فروشی کی قیمتوں، اخراجات زندگی اور عام کاروباری معاملات کی نشان دہی کرنے والے اعداد اور حقایق کے اندراجات رکھے اور بنک کاری سے متعلقہ اعداد و شمار تالیف دے۔

تحقیق و تعلیم

جن امور کی نسبت اعداد و شمار کی ترتیب فی الوقت ممکن نہ ہو ان کی حد تک بنک کی جانب سے تحقیقاتی کارروائی کا انتظام کیا جانا چاہیئے مثلاً (COST AND CONSUMPTION SERVEY) یا زرعی قرضوں کے بار کا تجزیہ وغیرہ حکومت ہند کی جانب سے جو تالیفات شائع ہوتی ہیں مثلاً "تبصرہ تجارت ہند"، "ہندوستانی بنکوں سے متعلقہ تختہ جات، اعداد و شمار" "ہندوستانی کرنسی اور مالیہ" "ہندوستان میں تحریک امداد باہمی" وغیرہ یہ دراصل ریزرو بنک آف انڈیا کے مجوزہ نظام العمل کی پہلی کڑی ہیں۔ موجودہ حالت کا اقتضا یہ ہے کہ اس قسم کی تالیفات شایع کرنے کے سلسلہ میں حیدرآباد بھی آگے قدم بڑھائے۔

بر اعظمی مالیات

کل قومی اساس پر مملکت کی جملہ بچتوں کو ایک جگہ اکٹھا کر لینے اور پھر زمانۂ امن کے وسایل کو مختلف کاروبار میں شریک کرنے کا کام صرف ایک مرکزی بنک ہی انجام دے سکتا ہے حکومت کو چاہیئے کہ قلیل اور طویل میعاد کے زرعی قرضے اجرا کرے، صنعتی مالیات کی طرف خاص کر وہ جن کا تعلق چھوٹے پیمانے کی صنعتوں پر ہو (اور سرمایہ تقریباً تیس لاکھ سے کم ہو) توجہ کرے اور گھریلو صنعتوں میں باہمی ربط قایم کرے۔ ایک "صفر" پروگرام (؟) کے لئے جسے ایک اور قطعی اسکیم کی پیش رفت کے طور پر آغاز کر دینا چاہیئے، سرمایہ فراہم کرے، یہ ایسے امور ہیں جو اندھی معاشی قومیت سے مختلف ہیں اور دوسروں کے لئے نہ تو جارحانہ ہیں اور نہ تکلیف دہ بلکہ ان سے ممالک محروسہ سرکار عالی کے اس حق کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ اپنی سہولت اور پسند کے مطابق اپنا گھر آپ بنانے کی مجاز ہے۔

مشترکہ منافعہ کا مقصود

ابتداء ہی سے بنک کو حیدرآباد کی مالی آزادی حاصل کرنے اور حکومت و عوام کے فائدہ کی خاطر مملکت میں بنک کاری کے جدید نظام کی تنظیم کا ایک ذریعہ تصور کرنا چاہیئے۔ اس مقصد کے تحت بنک کو چاہیئے کہ نفع اندوزی سے احتراز کرے۔ حصہ داروں کے تقسیم شدنی منافعوں کو صرف سود کی شرح تک محدود کر دینا چاہیئے۔ ادارہ جاتی مالیات کے ذریعہ مالیاتی آزادی، افراد قوم کے لئے مکمل روزگار کی خاطر ان میں محرکات کی تحقیق کی ضرورت اقتضاء یہ ہے کہ حیدرآباد اسٹیٹ بنک جلب منفعت کے اصول کو ترک کر دے۔ حصہ داروں کے منافعہ نہیں بلکہ قومی منافع اس کا مقصود غائی ہونا چاہیئے۔

تحریک امداد باہمی کے نتائج

جدید بنک کاری کا جہاں تک تعلق ہے امداد باہمی کی تحریک نے گذشتہ تیس سال کے عرصہ میں بہت ہی قلیل کام انجام دیا ہے۔ زرعی انجمنوں کا سرمایۂ مشغول ایک روپیہ فی مزروعہ

ایکڑ اراضی کی شرح سے بھی فراہم نہیں کیا گیا۔ قلیل المیعاد قرضوں کی اجرائی کا موجودہ تناسب ایک فیصد ضروریات کی بھی تکمیل نہیں کرسکتا اگرچہ کہ امداد باہمی کے اصول پر دیہی قرضہ کی انجمنوں کے لئے توسیع کے لئے کافی گنجایش ہے تاہم صرافہ کے کاروبار کے لئے کامل نظم وضبط اور اسکو عام مالیاتی ہئیت ترکیبی کے ساتھ وابستہ کرکے دلیسی ساہوکاروں کو باقی رکھا جائے تو بڑی حد تک اس مسئلہ کا حل نکل آتا ہے۔ ان تمام اعتراضات کے باوجود عام طور پر ہندوستان کی طرح حیدرآباد میں بھی امداد باہمی کی تحریک ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کی بدولت عوام مشکلات پر غالب آسکتے ہیں اور زندگی کے اس کم سے کم معیار کے حصول میں یہ تحریک ان کی مدد کرتی اور ان کے مذاق کی طرح تربیت کرتی ہے کہ وہ اپنے موجودہ ماحول اور اس کے اقتضاءات کی قدر پہچان سکیں۔

عوام کے پیشوں اور دیگر تفصیلات سے متعلق جو اعداد وشمار یہاں پیش کئے جاتے ہیں وہ مردم شماری کی رپورٹ بابتہ سنہ ۱۹۳۱ء سے اور امداد باہمی کے سلسلہ میں اعداد ۱۳۴۸ و ۴۹ ف کی سالانہ رپورٹوں سے ماخوذ ہیں۔ ہماری مملکت میں ۲۱,۶۹۷ دیہات اور ۲,۱۸۸ امداد باہمی کی دیہی انجمنیں ہیں۔ کئی دیہات ایسے ہیں جہاں ایک سے زاید انجمنیں قایم ہیں۔ اسلئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ حکومت کی ۲۵ سالہ جدوجہد کے بعد اوسطاً ہر سات دیہاتوں کے منجملہ ایک گاؤں میں ایک زرعی انجمن قایم کی گئی گویا ہر سات میں چھ دیہات نظر انداز کردے گئے۔ لیکن صورت حال اس سے بھی بدتر ہوتی جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انجمنوں کی تعداد کا اس تناسب سے بھی وجود باقی نہیں ہے۔ موجودہ انجمنیں غیر متحدہ مساعی کا نتیجہ ہیں جن کے قیام کو عرصۂ دراز گذرچکا ہے۔ اسوقت ہزارہا دیہاتی ایسے ہیں جنہوں نے نہ تو کبھی اس تحریک کا نام سُنا اور نہ کسی انجمن سے انہیں واسطہ پڑا۔

دیہاتوں میں آباد مکانات کی تعداد ۲,۹۱۶,۷۴۰ ہے اگر اسکو دیہاتوں کی تعداد سے تقسیم کیا جائے تو اوسطاً فی گاؤں ۱۳۴ دیہی خاندان حاصل ہوتے ہیں۔ زراعت کے ذریعہ

کمانے والوں کی تعداد ۲,۷۴۳,۴۰۳ ہے اگر اسکو دیہات کی تعداد پر تقسیم کیا جائے تو ایسے کمانے والوں کی فی گاؤں اوسطاً تعداد ۱۲۶ حاصل ہوتی ہے۔ اگر بعض تولداروں کو اس میں سے خارج کردیا جائے تو اوسط فی گاؤں ۱۱۲ تک پہنچ جاتا ہے۔ ۳,۱۸۰ انجمنوں کی رکنیت ۷۰,۵۱۴ ہے اس طرح ہر زرعی انجمن کی اوسط رکنیت ۲۳ ہوتی ہے۔ لہذا اوسطاً ہر سات کے منجملہ ایک گاؤں میں چھ زرعی خاندانوں کے منجملہ ایک خاندان میں یا چھ زراعت پیشہ اشخاص کے منجملہ ایک فرد اور ہر پانچ کاشتکاروں میں صرف ایک رکن ہے۔ بالفاظ دیگر ہر ۴۲ خاندانوں میں سے ایک یا ہر ۴۲ زراعت پیشہ اشخاص میں سے ایک اور ہر ۲۵ کاشتکاروں کے منجملہ صرف ایک کاشتکار کا نام انجمن امداد باہمی کے رجسٹرات میں درج ہوتا ہے۔ حکومت کی ۲۵ سالہ جد و جہد اور ایک کروڑ روپیہ کے صرفہ کے بعد زرعی آبادی کے تین فیصدی کو اس تحریک سے روشناس کرایا گیا ہے۔ فی الحقیقت یہ فیصد بہت ہی کم ہے کیونکہ اس میں کم سے کم ۲۵ فیصد ارکان اس اعتبار سے قابل نظر انداز ہیں کہ یا تو انہوں نے قرضہ حاصل نہیں کیا یا اپنی انجمنوں سے ایسے قرضے حاصل کئے ہیں جنکی ادائی ان سے ناممکن ہے۔

مزارعین یعنی ان کاشتکاروں کی تعداد جو کسی حصۂ اراضی پر قابض نہیں ہیں ۲,۷۷,۳۴۳ ہے۔ دوسروں کی اراضی کو لگان پر حاصل کرنے والے کاشتکار اس میں شامل نہیں ہیں۔ زراعتی مزدوروں کی تعداد ۹۴۲,۳۴۸ ہے اس طرح مجموعی آبادی ۱,۳۱۹,۷۲۵ ہوتی ہے۔ اتنی بڑی آبادی کا انحصار اگرچہ کہ کاشتکاری پر ہے لیکن اس کے قبضہ میں کوئی اراضی نہیں ہے ان اعداد و شمار میں چرواہوں اور ماہی گیروں کی کثیر تعداد شامل نہیں کی گئی ہے۔ اپنی ذاتی اراضی پر کاشت کرنے والے مزارعین کی تعداد ۷۰۸,۱,۶۴۹ ہے خود کاشت نہ کرکے اپنی مقبوضہ اراضی کو لگان پر اٹھادینے والوں کی تعداد ۶۹۷,۳۱۱ ہے۔ یہاں یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تحریک کے نصب العین کے بموجب جو عوام کے سامنے پیش کیا گیا ہے خود محنت کرکے زرعی پیداوار کے ذریعہ اپنی کمائی حاصل کرنے والے ہر تین افراد کے منجملہ صرف ایک شخص اس تحریک میں

شرکت حاصل کر سکتا ہے اور زرعی پیداوار سے کمائی حاصل کرنے والی ۶۶ فیصدی آبادی پر اس کے دروازے بند ہیں اسلئے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ " امداد باہمی کا جو مطلب حیدرآباد میں سمجھا جاتا ہے اس کے لحاظ سے یہ تحریک سارے کاشتکاروں کے لئے نہیں بلکہ صرف ایسے مزارعین کے لئے ہے جو اراضی کے مالک ہیں۔ عام طور پر ساری دُنیا میں امداد باہمی کے " صلائے عام " کے اساسی اُصول کی حیثیت میں تسلیم کیا جاتا ہے اور کسی کو اس میں شرکت کی ممانعت نہیں ہے لیکن ۶۶ فیصدی زرعی آبادی کو ہم نے قانوناً اس تحریک کی شرکت سے محروم کر دیا ہے اور ۲۵ سالہ تجربہ کے بعد بھی اس بے زبان بڑی اکثریت کے لئے موزوں انجمنوں کا قائم کرنا تو کُجا ان کے قیام کا تصور بھی پیدا نہیں کیا ہے۔

تین فیصدی دیہی آبادی کی بھی جو اس تحریک میں شریک ہے مالی حالت کیا؟ انجمنوں کا ۸۴ لاکھ (۵۸ لاکھ اصل اور ۲۶ لاکھ سود) روپیہ ان پر واجب الادا ہے۔ ۱۳۴۱ف میں محاصل مالگزاری کی مقدار ۲۹۵ لاکھ روپیہ تھی اور ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے بموجب کاشتکار اور غیر کاشتکار کی مجموعی تعداد ۲۴۶۰۰۱ ہے۔ اگر حاصل شدہ مالگزاری کی مجموعی مقدار کو زمینداروں کی تعداد سے تقسیم کریں تو فی زمیندار فی سال (۲۷) روپیہ کا اوسط حاصل ہوتا ہے۔ اس شرح اوسط کے لحاظ سے ۴۱۵۰۷ ارکان ۱۹ لاکھ روپیہ بطور مالگزاری ادا کرینگے لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ حیدرآباد میں ایسے بڑے زمیندار بھرے پڑے ہیں جنہیں امداد باہمی کی تحریک میں کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔ بہرحال دیہی زرعی انجمنوں میں ارکین کی بہت بڑی اکثریت مالگزاری کے طور پر بہت قلیل رقم ادا کرتی ہے اسلئے ان ارکان پر عاید شدہ لگان کے اوسط کا تخمینہ بجا طور پر عام اوسط کا نصف یعنے چودہ روپیہ فی کس رکھا جاسکتا ہے گویا مجموعی مالگزاری تقریباً دس لاکھ روپیہ معین کیجا سکتی ہے اور اگر ۴۱۵۰۷ کے مجموعی قرضہ کو انجمنوں کی تعداد سے تقسیم کریں یعنے ۸۴ لاکھ کو (بڑے زمینداروں کے استثنیٰ کے ساتھ) بہ لحاظ اوسط حاصل شدہ مجموعی مالگزاری سے تقسیم کریں تو اس حقیقت کا علم ہوگا کہ ارکین اوسطاً اپنی

واجب الادا رقم مالگزاری سے ۸ گنا زیادہ انجمنوں کے قرضدار ہیں۔ اس رقمی ذمہ داری پر ساہو کاروں کا قرضہ متزائد ہے۔

ہمارے اس نظام کے نقائص اُس مالی اعانت سے اور زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں جو حال ہی میں انجمنوں کو دی گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تنظیم جدید میں اراکین کو زرعی قرضہ دینے کی تجویز بھی شامل ہے تاکہ کاشتکاری کو فروغ حاصل ہو اور کاشتکار ساہو کار کے پنجہ سے نجات حاصل کر سکیں۔ ۱۳۴۸-۴۹ف میں اراکین کو ۵ ر ۷ لاکھ روپیہ قرضہ دیا گیا۔ اس رقم کو ارکان کی مجموعی تعداد سے تقسیم کرنے کے بعد اداشدہ قرضہ کا اوسط فی کس ۱۰۶ روپیہ حاصل ہوتا ہے۔ زر مالگزاری کا اوسط فی کس چودہ روپیہ ہے۔ غور کیا جائے کہ اس تناسب کے پیش نظر امداد باہمی کی تحریک پر کس حد تک اعتماد پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تفصیلات بیان کرنے سے زیادہ اس حقیقت کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ اراکین ساہو کار کے آگے ہاتھ پھیلانے سے کس طرح احتراز کر سکتے ہیں۔

اب آئیے وصولی قرضہ کے طریقہ کا جائزہ لیں۔ ایک سال کے دوران میں ارکان سے ۶ ر ۱۳ لاکھ روپیہ وصول کیا گیا اس لحاظ سے اوسط ادائی فی کس (۱۹) روپیہ ہوتی ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ زرعی مصارف (جو انجمن کے علاوہ کسی اور جگہ سے فراہم کئے جاتے ہیں) برداشت کرنے اور اپنے خاندان کی ضروریات زندگی کی فراہمی کے بعد (۱۴) روپیہ مالگزاری ادا کرنے والا کسان انجمن کے قرضہ میں (۱۹) روپیہ ادا کر سکے؟ اگر اس نے یہ رقم ادا کی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ ساہو کار سے قرضہ حاصل کیا گیا ہے۔

المختصر جس اصول پر اس تحریک کا نظام چلایا جا رہا ہے اُس کے لحاظ سے ۶۶ فیصد زراعت پیشہ افراد کے نام انجمنوں کی فہرست میں درج ہیں لیکن فی الحقیقت ان قلیل التعداد انجمنوں میں بھی حیات کے آثار نہیں پائے جاتے ہیں اور چونکہ قرضہ کی ادائی میں ان کی حیثیت سے بہت زیادہ وصول کیا جاتا ہے اس لئے نتیجہ کے طور پر انجمنوں سے اراکین کی وابستگی بہت کم ہوتی ہے۔

نیز جدید قرضے اتنی مقدار میں جاری نہیں ہوتے کہ ان سے کم از کم مافات کی تلافی ہوسکے۔

گذشتہ صفحات میں ہمارے استدلال کی بنیاد اوسط تخمینوں پر مبنی ہے اس لئے شاید اعتراض پیدا ہو کہ اوسط تخمینے صحیح نہیں ہوا کرتے۔ یہ درست ہے مگر ایک عام اندازہ قائم کرنے اور حالات پر طائرانہ نظر ڈالنے کا یہی ایک صحیح طریقہ ہوسکتا ہے ورنہ یقین ہے کہ تفصیلات اور اور عملی مشکلات میں ہم اُسی طرح گھر جائینگے جسطرح آج امداد باہمی کا محکمہ گھرا ہوا ہے۔ اسقدر تو کہا جاسکتا ہے کہ تین فیصدی کام کا انصرام اس اعتبار سے کہ ۲۵ سال کے دوران میں ابتدائی کام کی تکمیل کی گئی یقیناً قابل استحسان ہے مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ موجودہ حالات میں غیر تعلیم یافتہ اور ناعاقبت اندیش عوام کے باوجود بہترین کام انجام دیا گیا ہے۔ بہار اور بمبئی کی بھی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی کہ وہاں حیدرآباد سے زیادہ بہتر کام انجام نہیں پاسکا۔ یہ کہنا بھی مناسب نہ ہوگا کہ رائے عامہ کی رجعت پسندی نے اس سے زیادہ ترقی کرنے کی اجازت نہیں دی اور یہ کہ امداد باہمی کوئی سحر نہیں کہ غیر مشروط طریقہ پر سب کچھ کر گذرے۔ اس کے برخلاف لوگوں کے اذہان میں یہ امر متمکن کرنا چاہیئے کہ محکمۂ مردم شماری کے فراہم کردہ اعداد ہی مستند خیال کئے جاسکتے ہیں جن کی بنیاد پر ہم اپنی کامیابی کا اندازہ لگا سکتے ہیں ہمیں اس حیرتناک کام کو بہ نظر استحسان دیکھنا چاہیئے کہ جو تحریک امداد باہمی کے ذریعہ۔ وِس، ڈنمارک اور قریب مقامات پنجاب اور ٹراونکور میں انجام پایا ہے۔ ٹھنڈے دل سے غور و فکر کے بعد ہمیں چاہیئے کہ ایک معقول اور مناسب نصب العین مقرر کریں اور اس کے حصول میں پوری تندہی سے کام انجام دیں۔ مرتبہ لائحہ عمل کے لحاظ سے اگر نصف کام بھی انجام پاجائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے

ہمارا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیئے ؟ پانچ سال کی عرض مدت میں زرعی آبادی کے کم سے کم دسویں حصہ کو اس تحریک میں شریک کرلینا چاہیئے جس کے لئے اس مقررہ مدت کے اندر کوشش کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونا چاہیئے۔ دس فیصدی زرعی باشندوں کی تعداد تخمیناً تین لاکھ ہوگی جو موجودہ اراکین کی تعداد کا چار گنا ہے۔ اراکین کے رجسٹر یا ان کے کھاتوں میں ان کے نام کا

اندراج مطلوب نہیں ہے بلکہ اوّلین مقصد یہ ہے کہ ان کی تربیت کی جائے اور ان کے ذہن و دماغ میں تحریک کے اُصول او علمی طریقے متمکن کئے جائیں۔ اس موقعہ پر خواندگی تعلیم دو مختلف اصطلاحوں کو ملحوظ رکھ کے ایک دوسرے کا مترادف تسلیم نہ کیا جائے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ ہمیں سب سے پہلے دیہی عوام کی ان سہولتوں کو پیش نظر رکھ کر خدمت انجام دینی ہے۔ "غیر محدود ذمہ داری" اور "ساکھ" کے قدیم و فرسودہ راگ الاپتے ہوئے اس کام میں تاخیر ہرگز نہ کرنی چاہیئے۔

زمین گروی بنک

موجودہ زمانہ حیدرآباد میں زمین گروی بنک قائم کرنے کا بہت ہی موزوں اور مناسب وقت ہے۔ ایک وقت وہ تھا جب ہم کہا کرتے تھے "جائدادوں کی کوئی قیمت نہیں ہے" طویل المیعاد زرعی قرضہ کی اُصولی تنظیم کے لئے سرمایہ کسطرح مہیا کیا جائے"؟ اگر اب ہم یہ کہیں کہ زرعی پیداوار کی قیمتوں میں اضافہ کے ساتھ کسان اپنی حالت کو درست کرنے کے قابل ہوسکینگے تو گویا ہم اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ منافعہ کا بہت ہی قلیل حصہ اس کاشتکار کے ہاتھ میں پہنچ رہا ہے جو دراصل غلہ اُگا رہا ہے اور یہ کہ اس کی اعلیٰ صلاحیتوں نے صورت حال کو بہتر بنانے میں بڑی مدد پہنچائی ہے۔ الحاصل تین سے چار سال کی مدت میں ایک کرور کے قرضے ادا کرنے کی اسکیم موجودہ افراط زر کی صورت کو رفع کرنے میں بڑی حد تک ممد و معاون ہوگی۔

مسٹر ایس۔ ام بھروچہ نے اندازہ لگایا ہے کہ زرعی اراضیات پر ۶۵ کرور روپیہ قرض کا بار عاید ہے اگرچہ کہ معمولی قرضوں کو انہوں نے اپنے حساب میں نظر انداز کردیا ہے لیکن واضح طور پر اسکا علم نہیں ہوا ہے کہ موصوف نے تمام قلیل المیعاد قرضوں کو اپنے تخمینے سے خارج کردیا ہے شاید یہ بجا طور پر فرض کیا جا سکتا ہے کہ ۶۵ کرور روپیہ کا یہ بار طویل المیعاد قرضوں کی صورت میں صرف کسانوں پر ہی عاید ہے۔ بہرحال اگر اس میں کوئی اضافہ نہ کیا جائے تو آئیندہ چھ سال کی مدت میں تعمیری کام کو ترقی دینے کے لئے یہ رقم بہت ہی حقیر ثابت ہوگی۔ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ ۱۵ کرور روپیہ کی

حد تک صورت حال بہتر اور محتاج اعانت نہیں ہے، ۱۰ کرور کا قرضہ ایسی بڑی جماعتوں نے حاصل کیا ہے کہ اُن کو بھی اعانتی اسکیم میں شامل کرنے کی ضرورت نہیں مزید دس کرور مایوس کن صورتوں کے لئے محفوظ ہے باقی تیس کرور، ممالک محروسہ میں زراعتی کاروبار کے لئے تقریباً ایکسال کے مصارف ہیں۔ قرضہ جات میں تخفیف کا عمل ہر مقام پر کامیاب ثابت ہوا ہے اور اس مقصد کے لئے مزید پندرہ کرور علیحدہ کرنے پڑینگے اس طرح کسانوں پر طویل المیعاد قرضوں کا جو بار عاید ہے ان کی اصولی تنظیم کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اس مسئلہ سے نمٹنے کے لئے دہ سالہ اسکیم بنا کر ابتدائی تین یا چار سال تک کم سے کم پانچ کرور کی رقم اراضی کی کفالت پر بطور قرض جاری کرنا چاہیئے۔ یہاں یہ اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا تخمینہ میں زراعت کے تعمیری کاموں کے لئے طویل المدت باہمی امداد کی کوئی سبیل نہیں نکالی گئی ہے۔ زمین گروی بنک کے قانون میں یہ تجویز موجود ہے کہ ممالک محروسہ کا مرکزی زمین گروی بنک حیدرآباد اسٹیٹ بنک کے ماتحت ہوگا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے۔

دو سال قبل زمین گروی بنک کاری سے متعلق قانون وضع کیا گیا تھا اور اب ضرورت ہے کہ حکومت اس مقصد کی تکمیل کے لئے ایک خصوصی عہدہ دار کا تقرر کرے۔ اگر بعد میں ضرورت داعی ہو تو جرمنی کے رنٹین بنک (RENTEN BANK) کے اُصول پر سکۂ عثمانیہ کی کفالت کے لئے تین کرور کی رقم کی اجرائی حکومت کے لئے بہت آسان ہو جائے گی۔

بارش اور مویشی بیمہ

دوسرا میدان جس کے لئے فوری اعانت درکار ہے بارش اور مویشی کا بیمہ ہے۔ امداد باہمی کی تحریک نے دیگر ممالک میں اس خصوص میں قابل لحاظ کامیابی حاصل کی ہے۔ اگر ابتداء ہی سے اس مسئلہ کو حکمیاتی نقطۂ نظر سے نمٹا جائے اور حکومت کی جانب سے فراہم کردہ سرمایہ قحط کو امداد باہمی کے مرکزی نظام کے تحت بارش اور مویشی کے بیمہ کی اغراض کے لئے استعمال کیا جائے تو بہت بڑی کامیابی کا یقین ہے۔ یہاں یہ امر باعث دلچسپی ہوگا کہ اسپین میں ابتداءً اس تحریک کے نفاذ سے حکومت کا

مقصد یہ تھا یہ تھا کہ زراعتی اعانت کو باقاعدہ طریقہ سے منظم و منضبط کیا جائے۔ یوکرین میں زرعی کاروبار کے لئے بیمہ کا طریقہ جاری کرنے کا منشا یہ تھا کہ اُن اسباب کا قلع قمع کیا جائے جن کی بنا پر کاشتکار کو مختلف قسم کے خسارے برداشت کرنے پڑتے ہیں تاکہ بعد کی منازل میں بیمہ کی ضرورت کا سوال ہی درپیش نہ ہو۔ اسپین کے شاہی فرمان مورخہ ۹ ر ستمبر ۱۹۱۹ء کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

"جس ادارہ کی ہم جانچ پڑتال کر رہے ہیں وہ ایک ایسے نظام کے سوا کچھ نہیں جس کے توسط سے عبوری دور میں جبری بیمہ نافذ کیا جائے جس کی تحقیق حکومت نے اس سے قبل ہی آغاز کر دی ہے۔ اسکا بنیادی مقصد یہ ہے کہ خسارہ کی تلافی کے لئے حکومت کے اُس بڑے سرمایہ کی جو امر کے اعتبار سے کہ نقصانات کی ایک بڑی مقدار کی تلافی کے لئے مخصوص ہے باحسن الوجوہ تنظیم کرے کیونکہ اس مد کا بار سرکاری خزانہ پر جسقدر کم عائد ہونا کافی متصور ہوتا ہے۔ حکومت کی مالی اعانت قلیل اور غیر منضبط ہونے کے علاوہ اس میں بے قاعدہ تقسیم کے نقائص بھی پائے جاتے ہیں لہذا اسکی فوری ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ سرکاری خزانہ سے فراہم کردہ اور موجودہ ایسے وسایل سے حکمیاتی طریقہ پر استفادہ کیا جائے جن کے ذریعہ حصول مقصد میں رہنمائی، تعاون اور تقویت حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس عارضی طریقہ سے جو جبری بیمہ کی جانب ایک اقدام ہے بیمہ کی اہمیت پر زور دینے کی ضرورت داعی ہوئی ہے۔"

یوکرین میں بیمہ کے اداروں کی کارگزاری کو "غیر مستقل اور عارضی" خیال کیا جاتا ہے۔ اُن کا تصور ہے کہ:-

"اشتراکی ملک میں انفرادی سے لے کر اجتماعی نظام معیشت تک امداد باہمی کے تحت بیمہ اور اسی سلسلہ میں تلافیٔ نقصانات کے اداروں کو صرف عبوری دور میں اہمیت حاصل ہے۔ ملک کا خصوصی مفاد صرف اُن تدابیر کو اختیار کرنے میں مضمر ہے جو

ایسے نقصانات کا انسداد کرے جو بیمہ اور تلافی نقصانات کے اداروں کے قیام کا موجب ہوں اسی لئے امداد باہمی کے تحت بیمہ کے ادارے ابتدا ہی سے مسئلہ کے اسی پہلو کی جانب متوجہ ہیں۔"

اس طرح ابتدائی منازل میں ان اداروں نے اسکیموں کی ترتیب اور حفاظتی تدابیر تجویز کرنے کی جانب اپنی توجہ وقف کر دی ہے۔ یہ دونوں طریقے حیدرآباد کے لئے مفید ہو سکتے ہیں۔ امساک باراں کی وجہ سے ہر سال قابل لحاظ لگان کی معافی دینی پڑتی ہے اگر بیمہ کی انجمنوں کا قیام عمل میں آئے تو ان کے ذریعہ ملک کی مشکلات کا ارتفاع ہو سکتا ہے۔ ہمارے پاس تنظیم دیہی کی اغراض کے لئے معقول سرمایہ موجود ہے جو بہ زمانۂ انتفاع زرعی مشکلات کو رفع کر سکتا ہے۔

ابتدا ہی میں ارباب اقتدار کی توجہ کو مرکوز کرنے کے لئے بارش کے فقدان اور اتلاف مویشی کے خلاف بیمہ کے ذریعہ حفاظتی تدابیر کا کام کافی سے زیادہ ہونا چاہیئے۔ اس وسیع میدان عمل میں حاصل شدہ تجربہ کی بنا پر دوسرے مسائل کی جانب بعد میں بھی توجہ کی جا سکتی ہے۔ ژالہ باری کی مصیبت امساک باراں سے کچھ کم نہیں ہے۔ یہ تو قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔ موسمی حالات کی بھی کوئی صحیح پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح یہ صاف ظاہر ہے کہ انسانی محنت کے مقابلہ میں مصائب کا تناسب تغیر پذیر ہے۔ یہ تناسب فرانس میں ۱۸۹۰ء میں ۳۰ فیصد تھا ۱۹۰۸ء میں ۱۲۶ فیصد تھا۔ اس کے باوجود فرانس، یوکرین اور متحدہ امریکہ میں ژالہ باری بیمہ کا عام رواج ہے۔ مصارف محنت میں تخفیف کی خاطر ان ملکوں میں جبری طریقوں کے نفاذ پر غور کیا جا رہا ہے۔ اس امر کے ثبوت میں کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ زمانۂ ماسبق میں امساک باراں کے خلاف ہندوستان نے کسی انسدادی تدابیر پر غور کیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت اس کی وجہ قرار نہیں پا سکتی کہ اس خصوص میں کسی تحقیق کی ابتدا ہی نہ کی جائے یا اسکو فی الحال ملتوی کر دیا جائے۔ کسی نہ کسی وقت بہر حال اس کی جانب قدم اٹھانا ہی پڑیگا۔ کسی اور ملک میں بھی امساک باراں کی انسدادی تدابیر اختیار نہیں کی گئیں جسکی وجہ شاید یہ ہے کہ ان مقامات پر اس کی کوئی شدید ضرورت لاحق نہیں ہوئی۔ ہندوستان میں

سال کے صرف چند مہینوں میں بارش ہوتی ہے۔ مشاہدہ کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ عملاً ہر علاقہ میں امساک باراں کا ایک دور آتا ہے لیکن غنیمت یہ ہے کہ مختلف علاقوں میں یہ صورت مختلف سالوں میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ ژالہ باری کے موقعہ پر نہ حفاظت کی یہ صورت ہے کہ رقبۂ کاشت بہت زیادہ وسیع ہو۔

سر جان اسٹریچی نے ہندوستان کے موازنہ کو "موسم بارش کی قمار بازی" سے تعبیر کیا ہے لیکن حقیقتہً اس زمانہ میں یہی موازنہ سارے برطانوی ہند میں امساک باراں کے خلاف ایک معقول ذریعہ تحفظ ثابت ہوتا تھا۔ ایک مقام کی بہتر فصل کسی دوسرے مقام کی خراب فصل کی تلافی کر دیتی تھی۔ ابتداء میں بیمہ کے ماہرانہ حساب و کتاب کی ترتیب مشکل کام ہوگا اسلئے تجربہ اور مشاہدہ کی بناء پر کام کی ابتداء کی جاسکتی ہے۔

جان کا بیمہ کرانے سے ایک معقول آمدنی کی توقع ہے لیکن بارش اور مویشی بیمہ کے ذریعہ بھی آمدنی میں خاصا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ آخرالذکر کے ترویج کی ہندوستان میں فوری ضرورت ہے دوسرے یہ کہ بارش اور مویشی بیمہ کے ادارہ جات کسی مقام میں امساک باراں اور اتلاف مویشی سے متعلق حکمیاتی اور منظم طریقہ پر فراہم کردہ مواد کے ماخذ کی حیثیت سے بہت بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ برطانیہ کی زرعی عدالت کا بیان ہے۔" امداد باہمی کی بیرونی بیمہ کمپنیوں کے ذریعہ امراض وغیرہ کی نسبت بہت ہی مستند مواد حاصل ہوا ہے اور اس حقیقت کی بناء پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حکومت محکمۂ زراعت کے توسط سے اس نظام کو ترقی دے"۔ تیسرے جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جاچکا ہے یہ ادارے مختلف قسم کی حکومتی اعانت کا ذریعہ بننے میں بہت مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ چوتھے خاص طور پر بشمول حیدرآباد جنوبی ہند میں دودھ وغیرہ کی قلت تو بالکل واضح ہے اس لئے مویشی بیمہ کمپنیاں اس قلت کو دور کرنے میں مدد و معاون ہوسکتی ہیں۔ جیسا کہ متحدہ امریکہ میں ان کمپنیوں نے معقول مقدار میں خالص دودھ فراہم کیا ہے۔ بارش اور مویشی بیمہ کمپنیوں کا وجود ہندوستانی کاشتکار کے دل میں ایک نئی امید اور خود اعتمادی کی تخلیق کا باعث ہونا چاہیئے جس کا وہ فی الحال تصور

نہیں کر سکتا۔

تجارت امداد باہمی اور حکومتی اجارہ داری ان نظاموں کے ذریعہ زرعی بیمہ نے ترقی کی ہے۔ روایات اور ہندوستانی حالات کا اقتضاد یہ ہے کہ حکومت زرعی بیمہ کا اجارہ حاصل کرے باقی دو متبادل نظامات کے لئے ایک مناسب مدت کے اندر کامیابی کے مواقع نہیں ہیں۔ اگر برطانیہ اور امریکہ جیسے ممالک میں مختلف قسم کی شہری بیمہ کمپنیوں کا انتظام خود حکومت کرتی ہے تو سماجی، معاشی اور مالیاتی وجوہ کی بناء پر یہ حکومت کے لئے مناسب اور موزوں ہوگا کہ اس ملک میں حکومت دیہی بیمہ کمپنیوں کے انتظام کی ذمہ داری قبول کرلے۔

اس مقالہ میں اعداد و شمار پیش کرنا بے محل ہوگا اسلئے صرف چند عمومی تجاویز جو متعدد ممالک کے تجربہ پر مبنی ہیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ حیدرآباد میں بارش اور مویشی بیمہ کے تحفظ کے لئے مدافعتی تجاویز حسب ذیل ہیں۔

۱۔ تاوقتیکہ کم سے کم تعداد اور قیمت کی پالیسیاں فروخت نہ ہوجائیں کوئی منافعہ ادا نہ کیا جائے۔ زرِ حصص کی اقساط مکمل ادا ہوچکنے کے بعد فوری مطالبہ کی صورت میں ادا شدہ اقساط ۵ فیصد سود کے ساتھ مسترد کی جاسکتی ہیں۔

۲۔ بصورت مطالبہ ۸۰ فیصدی زیادہ بیمہ شدہ فصل اور مویشی فروخت نہ ہوسکینگے۔ اس طریقۂ عمل سے پالیسی رکھنے والا تساہل اور غفلت کا عادی نہ بن سکیگا۔

۳۔ مطالبات اُسی وقت قابلِ ادائی متصور ہونگے جب یہ اطمینان ہوجائیگا کہ مقامی انجمن یا ماہرفن کے مشورہ پر عمل کیا گیا ہے۔

۴۔ متعدی اور وبائی امراض سے حفاظت کے طور پر جبری ٹیکہ اندازی۔ ابتداء میں یہ عمل صرف اُن علاقوں میں کیا جائیگا جو دواخانۂ علاج حیوانات کے قریب واقع ہوں۔

۵۔ زلزلہ، جنگ، آتشزدگی اور قدرتی اسباب تخریب کی صورت میں منافعہ کی عدم ادائی

۶۔ دائرہ عمل جسقدر زیادہ وسیع ہو خطرہ کے ازالہ کا امکان زیادہ ہوگا۔

۷۔ مرکزی ادارہ کے ذریعہ مکرر بیمہ کا انتظام اگر حکومت یہ کام انجام دے تو زیادہ بہتر ہے۔ اس خصوص میں اسٹلی کی عدالت نے رائے ظاہر کی ہے کہ

"مکرر بیمہ کے لئے گنجایش کی فراہمی ضروری ہے۔ ایک مرکزی ادارہ کی بھی ضرورت ہے جو کسی خاص جماعت میں اُن نقصانات کو برداشت کرے جو شدید و بائی اشاعت کا نتیجہ ہوں۔"

۸۔ بیمہ کی سہولتیں نیک نیت کاشتکاروں تک محدود ہونی چاہئیں۔ اور پالیسوں کا سلسلہ ۱۰۰ سے ۱۰۰۰ روپیہ تک ہو سکتا ہے پالیسی کی قیمت کی انتہائی مقدار ان کی تعداد کے لحاظ سے بہ تدریج بڑھائی جاسکتی ہیں

۹۔ مروجہ سہولتوں اور سرمایہ کے ساتھ چھوٹے تالابوں کا انتظام بارش اور مویشی بیمہ کے مقامی ایسے ابتدائی اداروں کے سپرد کئے جائیں جنکی کارکردگی کا اطمینان کرلیا گیا ہو۔ اس طریقہ سے تری رقبۂ اراضی کے لئے پانی کا بہتر بندوبست ہو سکتا ہے۔

۱۰۔ ظاہر ہے کہ ابتدا میں صرف اُن ہی علاقوں میں یہ کام انجام پاسکیگا جہاں خطرات، مصائب نسبتاً کم اور بارش کا اوسط بہت بلند ہو اور جہاں ذخیرہ ہائے آب کا انتظام زیادہ بہتر حالت میں ہونے کے علاوہ فراہمی آب کی متبادل صورتیں مثلاً ندی اور کنوئیں کا پانی وغیرہ قابلِ حصول ہو۔ مدراس کے مرکزی زمین گروی بنک نے ابتدائی دس سالوں کے دوران میں اپنا دائرہ عمل صرف تری اراضی کی حد تک محدود رکھا تھا کیونکہ خشکی کی اراضی کے مقابلہ میں تری اراضی میں فصل کی خرابی کے اندیشے بہت کم تھے۔

زرعی بیمہ کے سلسلہ میں حکومت کی امداد مندرجۂ ذیل اصولوں پر ہونی چاہیئے جو دُنیا کے مختلف ممالک کے تجربہ وعلم کی روشنی میں مرتب کئے گئے ہیں۔

۱۔ تعلیم اور اشاعت

اطالیہ کی حکمت عملی اور لائحۂ عمل کی نسبت حسب ذیل اقتباس باعث دلچسپی ہوگا:۔

"بیمہ کی انجمنیں یا وفاقی اداروں کے قیام کے لئے کابینۂ مجاز کو نمایندے روانہ کرنیکا اختیار حاصل ہے تاکہ وہ زرعی بیمہ کے قیام کی خاطر مقامی حالات اور متوقعہ خطرات پر غور و فکر کریں، مقامی صلاحیت کو اُجاگر کریں اور متعلقہ جماعتوں اور حامیوں کو لکچر دیتے اور اداروں کی کارروائیوں میں اپنی ذمہ داری پر حصہ لینے کی دعوت دیں اس کے علاوہ کابینہ کی نشر و اشاعت کا کام بھی انجام دے سکتی ہے جس میں مقامی تغیر پذیر زرعی حالات اور متوقعہ خطرات کی خصوصی نوعیت کے اعتبار سے زرعی بیمہ کے انتظامی اور فنی پہلوؤں کی تنظیم پر خاص توجہ دیجائے گی۔ کابینہ کام کے ابتدائی یا آخری منازل میں انجمنوں اور وفاقی اداروں کو بھی کھاتے، رجسٹرات اور اس مقصد کے لئے دیگر ضروری مطبوعہ چیزیں فراہم کریگی۔ یہ امر اور زیادہ اہم ہے کہ کابینہ مجاز کو قواعد و ضوابط بابتہ سنہ ۱۹۲۰ء کے تحت وفاقی اداروں کے نام امدادی رقوم منظور کرنے کا اختیار حاصل ہوا ہے کیونکہ نظم و نسق کے نقائص کے علاوہ بعض دیگر وجوہ کی بناء پر ان اداروں نے اپنے ذاتی سرمایہ کا ایک حصہ کچھ اس طرح ضائع کردیا ہے کہ ان کے تنظیمی وجود کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ یا ان کی سالانہ میقات خسارہ کے ساتھ اختتام کو پہنچی ہے یا اپنی مد محفوظ میں سے غیر معمولی رقوم حاصل کرکے فاضل ہڑتہ صرف کردیا ہے۔ یہ خسارہ استثنائی حالات کا نتیجہ ہے اسکو ناقص انتظام یا ایسی رقمی تقسیم پر محمول نہیں کیا جاسکتا جو کسی قانون یا قواعد کے تابع نہ ہو اور نہ اسکو انجمن کی فنی یا مالی تنظیم کے مادی نقص سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ رقمی امداد اُن وفاقی اداروں کو دیجاسکتی ہے جو وسیع ہوچکے ہوں یا قصد ہو کہ بیمہ کی شاخوں کے قیام کے ذریعہ اُن کا دائرہ عمل وسیع کیا جائے جنکے منجملہ وہ ادارے بھی شامل ہیں جو قانون کی رو سے قائم ہیں یا وفاقی اداروں کو ان کی کارگزاری کی ابتدائی منزل میں رقمی اعانت عطا کی جاسکتی ہے۔"

(۲) بنیادی رقمی اعانتیں اور غیر واجبی خسارے

جیسا کہ قبل ازیں وضاحت کی جا چکی ہے عمومی شرائط یہ ہیں کہ ابتدا میں رکنیت کم سے کم ہونی چاہیئے اور منافعہ کی ادائی کے بعد غیر واجبی خساروں کی تلافی کے لئے رقمی اعانت عطا کرنے سے قبل انجمن کی کارکردگی کی نسبت اطمینان کر لینا چاہیئے۔ فرانس میں یہی طریقۂ عمل رائج ہے۔

(۳) حصص کی خریدی

اگر مرکزی انجمن کی حیثیت خانگی ہے تو جیسا کہ ہنگری میں ہوا کرتا ہے حصص کی خریدی ضروری ہے۔

(۴) سرکاری زرعی اسباب کا جبری بیمہ

بیمہ کاروبار کے آغاز کا یہ بہت عمدہ ذریعہ ہوگا کیونکہ حکومتیں عموماً کھیتوں اور مویشی کی مالک ہوتی ہیں اس کے علاوہ عوام کے لئے یہ ایک بہت اچھی رہنمائی ثابت ہو سکتی ہے۔

(۵) آزاد فنی مشورہ

نشر و اشاعت اور تعلیم کے ساتھ ساتھ یہ عمل ایک معقول اور باقاعدہ عملہ کو مستلزم ہے۔ درحقیقت کام آغاز کرنے کے لئے یہ ایک بہت ہی درست طریقہ ہوگا۔

(۶) مالی سہولتیں

زراعتی (بارش اور مویشی) بیمہ اداروں کو دس سال کے لئے چنگی یا کروڑگیری کے محصول سے مستثنیٰ کر دینا چاہیئے تاکہ اراکین پر مالی بار میں تخفیف پیدا کی جائے اور اس طرح کامیابی کے امکانات پیدا ہو سکیں۔

(۷) حکومتی بیمہ سرمایہ

اس سرمایہ کا انتظام ایک مجلس کے ذریعہ ہونا چاہیئے کیونکہ اس کو انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کے مقابلہ میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جب ادارہ قائم ہو جائے تو ہر قسم کی موقتی معافیاں اور مالگزاری کے تعین میں مستقل تخفیف عمل میں لائی جانی چاہیئے تاکہ مرکزی ادارے کے ذریعہ کاشتکاروں کے مابین بیمہ کے فوائد کی تبلیغ کی جا سکے جس کی کامیابی کی عملاً اس تدبیر کے ذریعہ ضمانت دی جا سکتی ہے۔

حیدرآباد میں اس قسم کے اداروں کے قیام کے سلسلہ میں جو عملی تجاویز پیش کی جاسکتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں :۔

(۱) ایک موزوں شخص برما، آسٹریلیا، کینیڈا اور ممالک متحدہ امریکہ کو روانہ کیا جائے تاکہ ان مقامات پر ابتدائی، قانونی اور مرکزی زرعی بیمہ اداروں کے کام اور اس کے مضمرات کا بخوبی مطالعہ کر سکے۔

(۲) اسکی واپسی کے بعد امداد باہمی کے اصول پر ایک مرکزی بارش اور مویشی بیمہ انجمن کا قیام عمل میں لایا جاسکتا ہے۔ ۱۸۳۷ء میں ریفائزن (RAIFFEISEN) نے جاگار (JAGAR) کو لکھا تھا۔

"تجربہ کی بناء پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی اداروں کے قیام کے ذریعہ اجزائی قرضہ جات کا طریقہ آغاز کیا جائے۔ یہ طریقہ انجمنوں کی نشوونما کے لئے محور کا کام دیگا"

قرضہ کی نسبت جو کچھ زور دیا گیا ہے وہ ہندوستانی زرعی بیمہ اداروں پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے۔

(۳) کاروبار کا کم سے کم معیار قائم ہونے تک یہ انجمن ارکین سے انفرادی طور پر معاملہ کرسکتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مقررہ لائحہ عمل کے مطابق مملکت میں تعلیم اور اشاعت کا کام بھی انجام دینے کے علاوہ مقامی کاروبار کی تکمیل کی غرض سے ضلع اور تعلقہ میں انجمنیں قائم کرکے ان کو مرکزی ادارہ سے ملحق کرسکتی ہے اس کے بعد مرکزی ادارہ اپنے دائرہ عمل کو تعلیم، نشر و اشاعت اور بیمہ کے کام تک محدود کرسکتا ہے۔

(۴) حکومت کو چاہیئے کہ ایک کرور کے سرمایہ سے بارش اور مویشی بیمہ کا فنڈ قائم کرے جسکا سود حکومت کے منظورہ مقاصد کے لئے صرف مرکزی انجمن کے لئے لائق استعمال ہوسکتا ہے۔

(۵) زر مالگزاری اور مالگزاری میں موقتی معافیوں میں مستقل تخفیف کی وجہ سے تمام منافع نذر بیگا مرکزی انجمن کو ادا کیا جاسکتا ہے اس طرح کاشتکاروں کی حوصلہ افزائی ہوسکتی ہے کہ اپنی آپ اعانت سے لئے اس نوع کی تنظیم کی جانب متوجہ ہوں۔

(۶) بعد کی منزل میں جبکہ مرکزی انجمن کی جمع شدہ محفوظات کی معتد بہ مقدار حاصل ہو تو انجمن اراکین کے لئے طویل المیعاد قرضوں کی ادائی کے مسئلہ پر غور کیا جا سکتا ہے۔ سویٹ روس، ریاست میسور کے محکمۂ بیمہ اور زیادہ قریب حیدرآباد کے محکمۂ بیمہ کی کامیابیاں قابلِ لحاظ ہیں۔

تعلیم امداد باہمی اور تشہیر

انجمن ہائے فراہمی، انجمنہائے آجرین، اجتماعی کاشتکاری، دیہی صارفین کے گودام اور انجمن ہائے فروختگی دوسری مفید تجاویز ہیں جن کی تفصیلات بیان کرنے میں میں اپنا وقت صرف نہیں کروں گا۔ کثیر المقاصد انجمنوں کا تو کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ لیکن اس نوعیت کی تمام انجمنوں کی بنا ڈالنے اور ان کو مستحکم بنیادوں پر چلانے کے لئے امداد باہمی کی معقول تعلیم اور تشہیر اساسی ضروریات ہیں۔ ۱۹۳۹ء-۴۰ء میں برطانیہ میں ہر ابتدائی طالب علم کے لئے ۶ پونڈ ۲ شلنگ ایک پنس کا خرچ عاید ہوتا تھا۔ اس ریاست میں مدرسہ جانے کی عمر والے کم از کم ۳۰ لاکھ افراد ہیں۔ ہر درجہ اور ہر قسم کی تعلیم کے لئے مصارف کی شرح یکساں فرض کر لی جائے (ابتدائی تعلیم ہی کا معیار بطور مثال سامنے رکھا جائے) تو برطانوی شرح کے اعتبار سے حیدرآباد میں صرف تعلیم پر تقریباً ۱۲۵ کروڑ روپیہ صرف ہونا چاہیئے جو مملکت کی موجودہ آمدنی سے دس گنا زاید ہے۔ سارجنٹ اسکیم میں برطانوی ہند کے لئے مصارف کی مجوزہ شرح کے لحاظ سے حکومت حیدرآباد کو تعلیم پر سالانہ ۱۲ کروڑ روپیہ سے زیادہ صرف کرنا چاہیئے۔ بالغوں کے لئے کیا امداد باہمی کی تعلیم ۵ لاکھ روپیہ سالانہ کی مستحق نہیں ہے؟ محکمۂ انجمن امداد باہمی کا موجودہ موازنہ تقریباً ۵ لاکھ ہے۔ معاشی تنظیم کی کسی معقول اور مستحکم اسکیم میں امداد باہمی کی تعلیم اور تشہیر کے لئے مزید ۲۵ لاکھ روپیہ کی فراہمی بہ لحاظ تناسب یقیناً موزوں ہو گی۔ تساہل پسندانہ طریقۂ عمل اور عدیم المثال بیفکری و اطمینان کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا پڑیگا۔

سماجی اغراض کے لئے روپیہ لگانے میں خطرات

اس مقالہ کا عنوان ایک دوسرے نقطۂ نظر سے بھی زور دئیے جانے کا مستحق ہے۔ بعض ماہرین مالیات کا خیال ہے۔ "ان تمام امور میں خطرہ کا عملاً کیا ہے؟ اور اسکا ذمہ دار کون ہے؟ سابقہ

غلطیوں سے کیا ہم کو سبق حاصل نہیں کرنا چاہیئے؟ مملکت میں امداد باہمی کی تحریک کے قیام کے لئے کیا حال ہی میں ۱۵ لاکھ روپیہ مختص نہیں کئے گئے ہیں؟ معاشئین کے نزدیک ان استفسارات کا جواب یہ ہے؟ " تحریک کی حمایت میں حکومت نے بہت ہی اچھا کیا کہ محولۂ بالا رقم منظور کی ہے۔ ہمیں اور حکومت کو اس کا علم ہے کہ اگر ضرورت ہو تو اس قرضہ کو قلمزد کرنے کے لئے حکومت کو تیار رہنا چاہیئے ایک ریاست میں عرصہ تک کنوئیں کھودنے کی غرض سے قرضہ دیا جاتا رہا ہے۔ محکمۂ مالیات کے معتمد نے ریاستی نظم و نسق کے صدر کو توجہ دلائی کہ ان قرضہ جات کے سود اور اصل رقم کی اقساط کی ادائی اطمینان بخش نہیں ہے لہذا آیندہ سے اس قسم کے قرضوں کا سلسلہ مسدود کر دیا جائے۔ نظم و نسق کے صدر نے مسکرایا اور نہایت ہی ٹھنڈے دل سے جواب دیا کہ ان قرضوں کی رقم دراصل عوام ہی کا روپیہ ہے جو اسی کے ایک زبوں حال طبقہ کی فلاح بہبود کے لئے مخصوص ہے اگر قرضوں کا استرداد توقع کے مطابق نہیں ہے تو حکومت کو چاہیئے کہ وہ اس حقیقت کو زیادہ وزن دے کہ ان قرضوں سے کسانوں کی معاشی حالت بہتر ہوتی ہے اور یہ صورت سینکڑوں طریقوں سے حکومت کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ لہذا اس قسم کے قرضوں کے متعلق تصور کرنا چاہیئے کہ روپیہ ملک کی سماجی اغراض میں لگایا گیا ہے اور سود و اصل کی صورت میں اس کا پھر حکومت کو واپس ملنا کچھ زیادہ ضروری نہیں ہے معاشئین اس تصور میں صرف اس امر کا اضافہ کرینگے کہ اگر ہم نے مملکت کی جانب سے دنیا کی آزادی کی بقاء کے لئے کروڑہا روپیہ صرف کیا ہے (اس شبہ کے باوجود کہ مابعد جنگ کی دنیا میں یہ مقصد کس حد تک ممکن الحصول ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ اس آزادی سے ہم کسقدر متمتع ہو سکتے ہیں) تو کیا یہ صورت استدلال کے لئے کافی نہیں ہے کہ حدود مملکت کے اندر قومی پیدآور اغراض کی بناء اپنے وسائل کو ضائع کرنے کا خطرہ مول لینے کے لئے ہمیشہ تیار رہیں۔

مکمل روزگار حکومت اور عوام

قومی نہ کہ صرف حکومتی رفتار، قومی نہ کہ وہ منافعہ جو صرف حصہ داروں میں تقسیم ہو اور قومی حدود — یہ وہ مسایل ہیں جو سرکاری اور غیر سرکاری ماہرین مالیات ح۔ا۔ب اور محکمۂ امداد باہمی کی توجہ کے مستحق ہیں۔ آمادہ اور ذمہ دار رائے عامہ کی مدد سے ان امور میں تھوڑے ہی عرصہ کے دوران میں بہت بڑی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

ضمیمہ

ہندوستان کی انجمنیں بیمۂ مویشیوں کے ۱۹۳۴-۳۵ء به دوران سال

انجمنوں کی تعداد ۲۴۰ (بمبئی میں ۱ اور ۲۳۹ برما میں جن میں سے ۸۰ حقیقتاً مشغول بہ کاروبار)

تعداد شرکاء - ۲۵۴۶ — مقدار بیمہ شدہ بہ دوران سال ۱۲٫۶۵۰ روپے - وصول شدہ پریمیم - ۵۳۴ روپے - ضمنی عطائے وصول شدہ - - بیمہ شدہ مویشی - ۲۶۸ راس - فوت شدہ مویشی ۱۷ راس - اداشدہ مطالبات — ۶۱۴ روپے - مصارف انتظام - ۴۸۳ روپے - سلک بہ دست بہ اختتام سال - ۱۸٫۲۵۴ روپے - مکرر بیمہ شدہ خطرات ۳٫۸۵ روپے - مکرر بیمہ پر اداشدہ پریمیم ۱۰۴ روپے -

پنجاب اور کورگ میں انجمنہائے بیمہ کاروبار کر رہی تھیں لیکن ۱۹۳۴-۳۵ء میں غالباً وہ بند ہوگئی تھیں کیونکہ برطانوی ہند کی رپورٹوں میں اس سال کی بابت وہاں کی انجمنوں کے کوئی اعداد موجود نہیں ہیں -

ہندوستان کی مرکزی انجمنہائے مکرر بیمہ امداد باہمی (انجمنہائے بیمہ) کا کاروبار بہ دوران سال ۱۹۳۴-۳۵ء

صوبہ .... برما

تعداد انجمنہائے مکرر بیمہ - ۱۲ - تعداد انجمنہائے ملحقہ — ۱۲ - انجمنہائے ملحقہ کے خطرات کے مکرر بیمہ کا تناسب ½ - خطرات مکرر بیمہ شدہ کی رقم — ۵۲۵۰ روپے - پریمیم وصول شدہ ۴۷ روپے - تعداد مویشی بیمہ شدہ بہ ملحقہ انجمنہائے بیمہ - ۱۸۱ روپے - ضائع شدہ مویشی - ۱ راس مطالبات اداشدہ انجمنہائے ملحقہ — ۱۷ روپے - مصارف انتظام - ۳ - ۸۰ روپے - سلک بہ دست بہ اختتام سال - عام ۱۷۴ ،۲ روپے مد محفوظ ۱۳٫۶۹۸ روپے

سرکاری چندہ و قرضہ جات وغیرہ

ہندوستان کی انجمنہائے بیمہ امداد باہمی (زرعی) بہ استثناء برمایہ دوران سال ۳۹-۱۹۳۸ء

تعداد انجمن ـ ایک (بیمۂ مویشی) تعداد شرکاء ـ ۵ ـ مقدار بیمہ ـ × ـ پریمیم وصول شدہ ـ ضمنی وصول شدہ رقوم × تعداد مویشی بیمہ شدہ × ـ مویشی ضائع شدہ ـ × ـ مطالبات ادا شدہ × ـ مصارف انتظام ـ ۲ ـ سلک بہ دست بہ اختتام سال ـ ۲۴۲ ـ تعداد خطرات مکرر بیمہ شدہ ـ × ـ مقدار پریمیم ادا شدہ برائے مکرر بیمہ ـ × ـ

برطانیہ عظمیٰ

دی اگریکلچرل اینڈ جنرل کواپریٹیو انشورنس سوسائٹی محدود

کا قیام سنہ ۱۹۰۰ء میں برطانیہ میں عمل میں آیا۔

تفصیل کاروبار انجمن ـ آتش ـ موٹر کار ـ ٹرکٹر ـ مویشی ـ حادثہ و زندگی ـ سرکاء سنہ ۱۹۳۵ء میں ۲۴۲ ۵ ۵ ـ خالص رقم پریمیم وصول شدہ بعد منہائی ادائی رقوم بابت مکرر بیمہ جات = ۱۲٬۳۷۷ پونڈ ـ مطالبات بہ دوران سال سنہ ۱۹۳۵ء = ۶۳٬۹۴۶ پونڈ ـ منافع حصص بہ دوران سال ۵ فیصد بونس آتش ۱۵ فیصد ـ سرمایہ حصص ادا شدہ ـ ۹۰۹۶ پونڈ سرمایہ محفوظ ـ ۳۱٬۲۳۸ پونڈ ـ

"نیشنل فارمرز یونین میوچول انشورنس سوسائٹی محدود

کا قیام سنہ ۱۹۱۰ء میں عمل میں آیا ـ اس کا کاروبار تمام ممالک متحدہ برطانیہ میں ہوتا ہے ـ

تفصیل کاروبار ـ آتش ـ ٹرکٹر ـ مویشی ـ تعداد شرکاء بہ دوران سال ..... ۸۰ سنہ ۱۹۳۵ء پالیسی ہائے اجرا شدہ ـ ... ۱۶۰ سنہ ۱۹۳۵ء کی رپورٹ میں پریمیم کی بابت اعلان ـ

"اگر شرکاء نیشنل فارمرز یونین میوچول انشورنس سوسائٹی محدود" کے بجائے ٹیرف آفیس میں بیمہ کردیا کرتے تو وہ گذشتہ سات سال کی مدت میں سوسائٹی میں ادا شدہ رقوم کے مقابل میں (۱۷٬۳۰۵۴۳) پونڈ اضافہ پریمیم ادا کرتے ہیں۔"

سنہ ۱۹۳۴ء میں جملہ ادا شدہ پریمیم کی رقم کی ۷/ا فیصد بچت رہی۔ علاوہ ازیں (۱۵۰) گائے کے کلب اور (۳۰۰) سوروں کے کلب بیمہ کا کاروبار کرتے ہیں کچھ عرصہ سے ان کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔

جانوروں کے ذبح کے بیمہ کے کام کی تنظیم خود قصاب انجام دیتے ہیں۔ شہد کی مکھیوں کی حفاظت کے بیمہ کا کاروبار انگلستان اور اسکاٹ لینڈ میں جاری ہے۔ اس کاروبار سے انتہائی منفعت کی مقدار جو ایک شریک نے حاصل کی $\frac{1}{2}$ ۷ پونڈ رہی۔

ممالک متحدہ امریکہ

"فارمرز یونین میوچول انشورنس کمپنی آف کیناس"

آگ، بجلی، ژالہ باری، آندھی و دیگر حادثات کے بیمہ کا کاروبار کرتی ہے۔

سنہ ۱۹۳۴ء میں تعداد تمسکات ۱۷۸۴۰۔ بیمہ کی رقم ۱/۴۱ ۷ ملین ڈالر۔ صرف سنہ ۱۹۳۳ء میں ۲/۲۰ ملین ڈالر روانہ کئے گئے۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں وصول شدہ پریمیم کی رقم ۵۷۵,۱۷۰ ڈالر اور مطالبات کی شکل میں ادا شدہ۔ ۱۱۹۹۵۷ ڈالر۔ کمپنی کی جملہ آمدنی ۔ ۲۲۳,۷۵۱ ڈالر۔ سرمایہ محفوظ ۔ ۲۵۶,۰۲۵ ڈالر۔

آندھی کے حادثات کا بیمہ بالخصوص ریاست البنائس (ILLINOIS) میں ہوتا ہے وہاں پانچ ضلع واری کمپنیاں کام کر رہی ہیں اور کثیر تعداد میں دیہی کمپنیاں موجود ہیں۔

ژالہ باری کے حادثات کا بیمہ مشترکہ سرمایہ دار کمپنیاں اور میوچول اور حکومتی ادارے انجام دیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے ممیز ہوتے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں میوچول کمپنیوں کی تعداد ۔ ۳۷۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں وصول شدہ پریمیم کی مقدار ۲۵و۴ ملین ڈالر۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں مشترکہ سرمایہ دار کمپنیاں ۔ ۱۱۵۔ وصول شدہ پریمیم کی مقدار ۱۰و۱۲ ملین ڈالر۔ مطالبات کی مقدار ۔ ۶و۱ ملین ڈالر۔

فرانس

فرانس میں زرعی بیمہ کا کاروبار محدود ذمہ داری کی کمپنیاں، میوچول اسوسیشن انجام دیتی ہیں۔

۱۹۲۳ء میں پہلے درجہ کی ۶ انجمنیں اور دوسرے درجہ کی ۱۱۷ انجمنیں تھیں۔ ۱۹۱۱ء میں دس ہزار جانوروں کے بیمہ کی کمپنیاں تھیں۔ اور ۸۷ مکرر بیمہ کی کمپنیاں ۱۹۲۹ء میں چھ ہزار کے قریب میوچول انشورنس کمپنیاں تھیں۔

شرکا کی رقم ۔ ۲۲۸ء ۳۱۱ ملین۔ مقدار انشورنس ۔ ۲۳۶۱ ملین فرنک۔ ادا شدہ اقساط ۔ ۱ء ۲۳ ملین فرنک۔ نقصانات ۔ ۴ء ۲۳ ملین فرنک۔

۱۹۳۴ء "نیشنل آفس فار لائیو اسٹاک انشورنس" سے ۱۵ مکرر بیمہ کی کمپنیاں اور ڈھائی ہزار مقامی انجمنیں ملحق کی گئیں۔

تعداد شرکاء ۔ ۶۷،۰۰۰ ۔ بیمہ شدہ مویشی ۔ ۱۶۵،۰۰۰ راس۔ مقدار بیمہ ۔ ۲۰۰ ملین فرنک۔

"لا میوچو لائٹ آگریکول" فرانس کے سب سے قدیم بیمہ کی کمپنی ہے۔ جو حادثات، آندھی اور مویشیوں کے بیمہ کا کاروبار کرتی ہے۔ مویشیوں کے بیمہ کے بعد آگ کے بیمہ کا درجہ ہے۔

فرانسیسی افریقہ۔

۱۹۳۴ء میں فرانسیسی افریقہ میں ۲۷ بیمہ کی بڑی کمپنیاں تھیں جنکے کامیاب کاروبار کے اعداد حسب ذیل ہیں۔

ژالہ باری کے خلاف بیمہ کا کاروبار ۔ ۱ء ۲۴ ملین۔ آگ کے خلاف بیمہ کا کاروبار ۔ ۹ء ۲۴۹ ملین جانداروں کا بیمہ ۔ ۹ء ۴ ملین۔ حادثات کے خلاف بیمہ کا کاروبار ۔ ۸ء ۱۱۶ ملین۔

روس

فلکس کا کاروبار ۱۹۱۰ء سے "دی سنٹرل اسوسیشن آف فلکس گرورس" انجام دے رہی ہیں۔

۱۹۱۰ء میں "آل ایشیا کو اپریٹیو انشورنس" کا آغاز ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں زرعی بیمہ کے کاروبار کا حکومتی اجارہ کے تحت احیاء کیا گیا جسکے تحت آگ، طوفان، اور مویشیوں کا کاروبار بھی کیا جارہا ہے۔ لیکن نئے معاشی مسلک کے مطابق امداد باہمی کی بعض انجمنوں کو بھی اس کی اجازت دی گئی لیکن شرط یہ قائم کی گئی کہ بڑے بیمہ کی صورتوں میں مرکزی حکومت کے اداروں میں مکرر بیمہ کرایا جائے۔

آسٹریلیا

"دی کواپریٹیو انشورنس سوسائٹی آف آسٹریلیا" کا قیام ۱۹۱۹ء میں عمل میں آیا۔ یہ سوسائٹی آگ، حادثہ اور موٹر کار کے بیموں کا کاروبار کرتی ہے۔

۱۹۳۲ء میں اس کا خالص منافع ۲۲ ہزار آسٹریلین پونڈ سے زاید ہوا اور سات فیصدی منافع کی تقسیم عمل میں آئی۔

اطالیہ

۱۹۲۵ء میں ایطالیہ میں ۴ بڑی شترکہ سرمایہ دار کمپنیاں اور ۹۹ میوچول سوسائٹیز تھیں۔ مویشیوں کے بیمہ کا خاص کاروبار تھا۔ میوچول کمپنیوں کے شرکار کی تعداد ۳۵ ہزار تھی ۱۹۲۳ء میں "نیشنل اگریکلچرل انشورنس" کا قیام عمل میں آیا اور ۹۹ میوچول سوسائٹیز کا ان سے الحاق کر دیا گیا۔ ۱۹۲۴ء میں نیشنل فیڈریشن آف میوچول انشورنس" کی رجسٹری ہوئی جس نے مرکزی تنظیم کا تمام کاروبار اپنے ذمے لیا۔ ۱۹۳۱ء میں طوفان کے بیمہ کمپنیوں کی تعداد ۲۰ تھی جن کی ذمہ داری محدود تھی اور ۷ میوچول کمپنیاں تھیں جن کے پریمیم کی مقدار ۳۷ ملین لیرا تھی ژالہ باری اور زرعی بیمہ کے تمام نظام کی حکومت کی نگرانی کے تحت غیر نفع آور طریق پر تنظیم کی گئی۔ آگ کی زرعی بیمہ کی انجمنوں کی تعداد ۲۰۰ تھی۔

جرمنی

فریڈرک اعظم نے ۱۷۶۵ء میں اس تحریک کا آغاز کیا۔ وہاں خانگی بڑی انجمنیں ہیں اور ۹ ہزار چھوٹی انجمنیں ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں بڑی انجمنوں نے تقریباً ۲ لاکھ جانوروں کا بیمہ کیا۔ اور چھوٹی انجمنوں نے تقریباً ۲۴ لاکھ جانوروں کا بیمہ کیا۔ جن جانوروں کا بیمہ کیا گیا ان میں گھوڑے گائے بیل، سور اور بکریاں شامل ہیں۔ جرمنی میں یہ طریق عمل رہا ہے کہ جو نقصان جانوروں کی موت کے علاوہ کسی اور طور پر ہوا ہو اسکو (COVERED RISK) میں شامل کیا جاتا ہے۔ چھوٹی انجمنوں کی مروجہ پالیسیوں کی مقدار ۷ ہزار ملین مارک ہے۔ ۱۹۳۵ء میں سات بڑی انجمنوں نے ۴۲ لاکھ جانوروں کا بیمہ کیا اور مروجہ پالیسیوں کی رقم ۲۰ کروڑ مارک ہوئی۔ سات بڑی انجمنوں نے ۱۹۳۵ء میں تقریباً ۲ کروڑ مارک کے مطالبات ادا کئے۔ "دی جرمن فارمرز سروس جنرل سوسائٹی" کو ۱۹۳۴ء ۴۵ لاکھ مارک پریمیم وصول ہوا۔ اور ۸ لاکھ مارک دوران سال میں مطالبات میں ادا کئے گئے۔ انتظامی مصارف ۱۰ لاکھ ہوئے۔ ۱۳ لاکھ مارک ادا شدہ حصص کی رقم تھی اور ۸ لاکھ مارک محفوظ میں تھے۔ اور جملہ اثاثہ ۴۴ لاکھ مارک تھا۔ اس میں سے ۲۲ لاکھ بنکوں میں محفوظ تھا اور ۸ لاکھ کے مشغولہ تمسکات تھے۔

خطبۂ صدارت

از

مولوی سید عارف الدین صاحب وظیفہ یاب چیف انجنیر و معتمد تعمیرات

(جو ۱۵ ر بہمن ۱۳۵۲ف کو کانفرنس کے چوتھے اور آخری اجلاس میں پڑھا گیا)

معزز حاضرین! میں اراکین کمیٹی کا ممنون ہوں کہ انہوں نے آج کے جلسہ کی صدارت پر مجھے نامزد فرما کر مجھے ایک اہم مسئلہ پر آپ سے خطاب کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔

ملک کے غذائی موقف پر میں کچھ زمانہ سے غور کر رہا ہوں۔ آج سے دس بارہ سال قبل میں نے محسوس کیا تھا کہ ہندوستان کا غذائی موقف جس میں حیدرآباد بھی شامل ہے تشفی بخش نہیں ہے۔ آبادی کی زیادتی کے ساتھ ساتھ پیداوار اور غذا میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے اور جب تک غیر معمولی جد و جہد نہ کی جائے یہ مسئلہ مشکل تر ہوتا جائے گا اور یقیناً روز بروز ایسی آبادی کی تعداد بڑھتی جائے گی جن کی مستقل زندگی نیم فاقہ کشی کی حالت میں گزر رہی ہے۔ بہ حیثیت انجنیر آبپاشی میں نے محسوس کیا کہ چونکہ مختلف قسم کے کاشت کو اگر پانی دیا جائے تو پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے آبپاشی کے ذرائع کی توفیر ایک حد تک پیداوار کی زیادتی میں مدد دیگی۔ ہر جگہ تالاب اور نہریں نہیں بنائے جاسکتے مگر باؤلیات بہ کثرت مقامات پر بنائے جاسکتے ہیں۔ اگر باؤلیوں کی ڈزائن بدلی جائے اور آلہ ہائے آب کشی ایسے بنائے جائیں جن کی بدولت ایک طرف تو کفایت کے ساتھ باؤلیاں تیار کئے جاسکیں جن سے فی باؤلی سالانہ کم از کم ۵۰ ایکر کاشت کی جاسکے۔ دوسری طرف پانی کھینچنے کا خرچ بمقابلہ موٹ کے یک ثلث تک گھٹ جائے تو پھر باؤلیات نفع بخش ہو سکیں گی۔ بفضلہ تعالےٰ چند سال کے تجربہ کے بعد میں ان میں کامیاب ہوا۔ باؤلیات کا نفع تو بہت پھیلا ہوا ہوگا مگر بڑے اور چھوٹے دیگر ذرائع آبپاشی بھی بہت ضروری ہیں جہاں تک کہ انجنیر آبپاشی کا تعلق ہے کہ افزائش اغذیہ کا صرف ایک

مسئلہ قابل حل نکل آیا۔ مگر پھر ایک سوال پیدا ہوا کہ سب سے بہتر آبپاشی کے تجاویز کیا ہو سکتے ہیں آیا صرف دھان کی کاشت کرنا مناسب ہے یا گیہوں اور جوار اور دیگر اجناس کو پانی پہنچا کر پیداوار بڑھانا زیادہ نفع بخش ہے۔ تھوڑی سی تحقیقات کے بعد یہ معلوم ہوا کہ تابی کی کاشت میں جس قدر پانی خرچ ہوتا ہے اسکو ربیع میں جوار اگانے میں صرف کیا جائے یا گیہوں کی کاشت کی جائے تو چار گونہ زیادہ رقبہ کاشت ہو سکتا ہے اور پیداوار بھی تقریباً چار گونہ ہو سکتی ہے۔ علی ہذا جانوروں کے لئے چارہ بھی چار گونہ بلکہ جوار کی صورت میں بہ مقابلہ پرال کے آٹھ گونہ زیادہ پیدا ہو سکتا ہے میں نے چیف انجنیر آبپاشی کا جائزہ لینے کے بعد جبکہ تابی کے لئے تالابوں میں پانی کم آیا تھا محکمہ مالگزاری کو اس مسئلہ کی طرف توجہ دلائی اور خواہش کی تھی کہ بطور تجربہ بعوض تابی کے دھان کے جوار پیریں اور اسپر کچھ عمل بھی ہوا اور جہاں ایسا کیا گیا نتیجہ بہت مفید ثابت ہوا۔ چنانچہ اس سال ویرا کے نیچے تقریباً ۱۲ ہزار ایکڑ جوار بوئی گئی کیونکہ تالاب میں پانی ربیع کا موسم گزارنے کے بعد آیا رعایا کو کثیر فائدہ ہوا اور آبی نہ ہونے کا کوئی غم نہ ہوا۔ اگر تابی کی جاتی تو صرف ڈھائی یا تین ہزار ایکر سے زیادہ نہ ہوتی مگر اب تک یہ تجربہ نہیں کیا گیا کہ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ کس کس قسم کی کاشت کو کس حد تک آبپاشی کے ذریعہ سے اگانا کاشتکار کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہوگا۔ اس تجربہ کی سخت ضرورت ہے ذرائع آبپاشی کے امکانات کی تفصیل میں میں اس وقت جانا نہیں چاہتا مگر اتنا بتلا دینا چاہتا ہوں کہ میری تحقیقات میں جو میں نے حکومت سرکار عالی کے فرمانے پر ہیڈرو الکٹرک اور آبپاشی کے امکانات کے متعلق کی تھی یہ معلوم ہوا کہ بڑے ذریعوں سے تقریباً ۳۶ لاکھ ۴۴ ہزار ایکر اور بذریعہ باؤلیوں کے میرا خیال ہے کہ کم از کم دس لاکھ ایکر کاشت کئے جا سکتے ہیں اور یہ بھی آئندہ کافی غلہ فراہم کرنے کے لئے ناکافی ہوگا۔

دوسرا سوال ایرو کا ہے۔ پانی کے ساتھ ساتھ ایرو کا مہیا کرنا بھی ضروری ہے گوبر ایک ایسا ایرو ہے جو ہر قسم کی کاشت کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں نائٹروجن فاسفورس اور پوٹاس تینوں موجود ہیں نائٹروجن ہورس کے پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے جو زمین کو بہتر کرتا ہے اور جس میں وہ جراثیم نشو و نما

پاسکتے ہیں جو ہوا سے نائٹروجن حاصل کر کے زمین میں پہنچاتے ہیں اس کھاد کی خوبی سے سب واقف ہیں مگر ظاہر ہے کہ زیادہ مقدار میں یہ نہیں مل سکتا۔اس کی ضرورت سخت ہے کہ اس کا بدل کوئی ایک کھاد یا مختلف کھاد ایسے معلوم کئے جائیں جو کثیر مقدار میں مہیا کئے جاسکیں۔یوں تو مختلف قسم کے کھاد تیار کئے گئے ہیں جو کسی ایک قسم کی کمی کو پورا کرتے ہیں اور بعض بعض قسم کے درختوں اور فصلوں کے لئے بعض زمینات میں مفید ثابت ہوئے ہیں مثلاً مونگ پھلی کی کھلی، دھان کے لئے بعض حالات میں مفید معلوم ہوئی ہے۔ مگر اس کا علم رعایا کو عام طور پر نہیں ہے کہ کس قسم کی زمین میں کتنی کھلی ڈالنے سے پیداوار میں کتنا اضافہ ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔یہ ضروری نہیں کہ بہت صحیح علم ہو مگر خرچ و نفع کا اندازہ بھی لگ جائے تو بڑی بات ہے۔ چند سال سے یہ خیال کیا جارہا ہے کہ گوبر کے ساتھ کچرا وغیرہ ملا کر گڑھوں میں محفوظ کیا جائے جس کو کمپوز (COMPOSE) کہتے ہیں یا شہروں کا کچرا اور فضلا وغیرہ ملا کر رکھا جائے جس کو ولیج رفیوز (VILLAGE REFUSE) کہتے ہیں تو مفید ایرو جلد تیار ہو سکتا ہے۔ان میں نائٹروجن کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔اس قسم کے ایرو پر تجربہ ہو رہا ہے اگر اس طرح سے ایرو تیار کرنا ممکن ہے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ بذریعہ پانی کے جوار کی کاشت چارہ کی غرض سے اُگائی جائے اور اس خشک چارہ کو بعوض کچرے کے گوبر کے ساتھ ملا کر ایرو تیار کیا جائے۔ اگر یہ ترکیب کارگر ثابت ہوجائے تو پھر ایرو کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہوجائیگا اور ایک ایکر سے سبز ایرو (GREEN MANURE) مثلاً سن یا تیل وغیرہ کے فصل کو کاشت کر کے اس کو اس طرح محفوظ کر دیا جائے جس طرح کچرا محفوظ کیا جاتا ہے اور اس سے ایرو تیار کیا جائے اس قسم کا ایک تجربہ آج سے ۱۲ سال قبل مدراس میں کیا گیا تھا کہ نیشکر کے رس نکالنے کے بعد جو چورا کہ رہ جاتا ہے اس میں ایک قسم کے جراثیم داخل کئے گئے جو ہوا سے نیٹروجن (NITROGEN) تیار کرتے ہیں تقریباً دو ماہ کے بعد نیٹروجن (NITROGEN) کی مقدار ½ فیصد سے بڑھ کر ۳۹ء۱ ہوئی جو گوبر کے نٹروجن سے دگنی ہے۔ میں نے مدراس کو لکھ کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس تجربہ کو آگے نہیں بڑھایا گیا اس لئے کہ قصبات اور شہروں کے کچرہ سے ایرو بنانا کامیاب ثابت ہوا۔ کاش یہ تجربہ قایم رکھا جاتا۔ آج ہم کو اس سے بڑی مدد ملتی پیدا ہوئی ہوتی اور

دیگر متعدد قسم کے ایرو تیار کئے جارہے ہیں مگر یہ سستی قوت برقی کے محتاج ہیں قوت برقی کے ساتھ ان کی ترقی بھی ضروری ہے۔ یہ محکمہ زراعت کا کام ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ایرو کے تجربہ پر کثیر رقم صرف کی جائے اور جلد اور وسیع پیمانہ پر نتائج حاصل کئے جائیں۔ اسی طرح عمدہ قسم کے بیج کی فراہمی پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔

یہی تین طریقے یعنی آبپاشی، کھاد عمدہ بیج ایسے ہیں جس سے زمین کی پیداوار کو بڑھایا جاسکتا ہے ایک اور طریقہ یہ کہ جو قابل کاشت زمینات میں کاشت نہیں ہورہی ہے ان کو کاشت پر اٹھایا جائے یہ کام محکمۂ مال کا ہے مگر اولاً یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ کہاں کہاں کتنا رقبہ اس قسم کا موجود ہے۔ اس کے بعد ہی جیسے جیسے خواہشمند پیدا ہوتے جائیں ان زمینات کو کاشت پر اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہاں تک تو میں نے آپ حضرات کے سامنے فراہمی اغذیہ کے ایک پہلو یعنی انکی پیداوار میں اضافہ کے امکانات کو نہایت مختصر طور پر پیش کیا ہے۔ اس کا دوسرا پہلو بھی نہایت غور و فکر کا محتاج ہے اور وہ یہ کہ اغذیہ فراہم کرنے کے بعد ان کو حسب ضرورت استعمال کرنے کی رعایا میں استطاعت پیدا کرنا۔ قبل جنگ باوجودیکہ غلہ پیٹ بھر کھانے کے لئے کافی نہیں اگتا تھا غلہ مہنگا نہ تھا۔ یہ صرف کثیر رعایا کی مالی زبون حالی کا نتیجہ ہے۔ اغذیہ کی مقدار پیداوار کو بڑھانے سے کیا فائدہ اگر لوگوں میں اپنی قلیل ترین ضرورت کے موافق بھی خریدنے کی قابلیت نہو۔ موجودہ حالت تو یہ ہے کہ جو لوگ خود غلہ اگاتے ہیں انکی بڑی تعداد خود پیٹ بھر نہیں کھاسکتی۔ معاشین نے اس کے متعدد وجوہ معلوم کئے ہیں مثلاً کاشتکار کا مقروض ہونا اور سود نا واجبی طور پر بڑھا ہوا ہونا۔ ایک وجہ مالی زبون حالت کی ہے۔ اس کا ایک حل یہ نکالا گیا ہے کہ شرح سود گھٹائی جائے اور بذریعہ بنکہائے زراعتی اور امداد باہمی انجمنوں کے مالی امداد کی جائے مگر پھر بھی سود ہلکا کرنے کے باوجود جب تک مالی حالت بہتر نہ ہو اور وہ اپنی ضروریات کو پورا کرکے پس انداز نہ کرسکیں تو قرضہ کیسے ادا ہوگا۔ یہ حل گو ایک حد تک درست ہے مگر کافی نہیں دوسرا یہ کہ بہت سے لوگوں کے پاس زمین اس قدر کم ہے کہ اس پر ان کی گزر اوقات نہیں ہوسکتی اس پر بھی وہ ان کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اس کے لئے یہ حل تلاش کیا گیا ہے کہ ملکی صنعت میں ترقی دی جائے جس میں

بڑی صنعتیں اور دیہی صنعتیں دونوں شامل ہیں۔ ۱۹۳۱ء کی برطانوی ہند کی رپورٹ مردم شماری سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آبادی کا صرف تقریباً ۹،۶ فیصد حصہ کا دارومدار صنعت پر ہے اور ۷۵ فیصد کا دارومدار زراعت پر بڑی اور چھوٹی صنعتوں میں دس یا زیادہ سے زیادہ ۱۵ فیصد آبادی کے ذریعہ معاش کو زراعت سے صنعت کی طرف منتقل کردیا جائے تو اس سے اتنا مال پیدا ہوگا کہ ہندوستان کی موجودہ قوت خرید اس کو استعمال نہ کرسکے گی۔ اور جب تک اس میں استطاعت پیدا ہو آبادی اور بڑھ جائے گی۔ اس سے ایک ہی اہم نتیجہ نکلتا ہے کہ بڑی صنعتوں کی ترقی دیہات میں بسنے والوں کی معاشی اصلاح میں زیادہ مؤید ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے ایک طبقہ کی آبادی کی معاشی حالت بہتر ہوگی اور اور حکومتوں کی آمدنی بڑھے گی جو ملک کے ترقی اور اصلاح کے کاموں میں صرف کی جاسکے گی۔ اس کے ساتھ ایک اندیشہ یہ بھی لگا ہوا ہے کہ اجرت کی زیادتی اغذیہ وغیرہ کی قیمتوں کو کہیں اتنا گراں نہ کردے جس سے ہماری قیمتیں دیگر ممالک کی قیمتوں سے زیادہ نہ ہوجائیں۔ اگر ایسا ہوا تو زراعت پیشہ طبقہ کی مالی حالت بجائے درست ہونے کے اور گر جائے گی۔ چند کے نفع کی خاطر زیادہ کو نقصان پہنچے گا اور آخر میں سب متاثر ہوں گے اس اندیشہ کے امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر اس کو رد کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی مواد و اعداد و شمار بالکل نہیں ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ صنعت و حرفت میں ترقی نہ کی جائے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ زراعت کی ترقی اس طریقہ پر کی جائے کہ اگر اجرت گراں بھی ہو تو زراعت پیشہ طبقہ کی قوت خرید بڑھتی جائے جس سے ان کے معیار زندگی میں اضافہ ہو۔ سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس قسم کی ترقی کے لئے کس قسم کا نقشہ یا پلان (PLAN) تیار کیا جائے پلان تیار کرنا تو بہت دور کی بات ہے آج تک کسی نے کوئی صاف راستہ بھی دریافت نہیں کیا جس پر چلنے سے پلان تک پہنچ سکیں۔ میں ایک زمانہ سے اس راستہ کی تلاش میں ہوں اولاً اس کو معاشی نقطۂ نظر سے تلاش کیا پھر میں نے انجینئرنگ آبپاشی کے نقطۂ نظر سے اور انڈسٹریل (INDUSTRIAL) انجینئرنگ کے نقطۂ نظر اور فن زراعت کے نقطۂ نظر سے ڈھونڈا۔ ہر نقطۂ نظر میں ایک مقام نظر آیا مگر جب تک جملے نقطہائے نظر کو ملا کر غور نہ کیا ان کے آپس کا تعلق واضح نہ ہوا۔ سب پر مجموعی نظر ڈالنے سے ایسا معلوم ہورہا ہے

راستہ کچھ کچھ صاف ہو رہا ہے جس کو مختصراً آپ حضرات کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں اور آپ پر چھوڑتا ہوں کہ آپ خود اندازہ لگالیں کہ آیا اس راستہ پر چلنے سے ہمیں منزل مقصود ملے گی کہ نہیں۔

سب سے اول میں ان چند بنیادی اصولوں کو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جن پر یہ عمارت قائم کی جاسکتی ہے۔

۱۔ کیا آپ تصور کرسکتے ہیں کہ ہندوستان جیسے بڑے ملک کے لئے کوئی اور ملک غذا ہتیا کرسکتا ہے اگر اس کا جواب قطعی نفی میں ہے تو کیا یہ مناسب ہوگا کہ آپ اپنے پیداوار کی قیمتوں کو دوسرے ممالک کی قیمتوں پر منحصر رکھیں۔ مثلاً ہندوستان کے لئے چاول ۹۵ فیصد مقدار خود ہندوستان پیدا کرتا ہے اور ۵ فی صد برما سے آتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہمارے چاول کی قیمت کو بلالحاظ اس کے کہ وہ کس قیمت پر پیدا ہو رہا ہے۔ برما کے چاول کی قیمت سے متعلق کیا جائے۔ اگر برما کے چاول ہمارے چاول کے مقابلہ میں بہت سستا پیدا ہوتا ہے تو اس قیمت پر ہمارے چاول کو فروخت کرنا ہمارے تمام چاول پیدا کرنے والے کاشتکاروں کو تباہ کرنے کا باعث ہوگا۔ پانچ فی صد کی خاطر ۹۵ فی صد کو خراب کرنا کسی اصول سے بھی چاہے وہ معاشی ہو، اخلاقی ہو، یا قانونی ہو جائز نہیں ہوسکتا کیا یہاں خود مکتفی ہونے کا اصول لازمی نہیں ہوتا۔ ہم کو ۵ فی صد کی تکمیل کرکے خود مکتفی ہوجانا ضروری ہے اور اگر ضرورت ہو تو برما کے چاول پر زائد ٹیکس لگایا جائے مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ شاید ضرورت نہ ہوگی۔ اگر حالات اس کے برخلاف ہو تو ہم صرف ۵ فی صد خود پیدا کرتے ہیں اور ۹۵ فی صد باہر سے منگواتے ہیں اور ہماری قیمت باہر کی قیمت سے بہت زیادہ ہو تو پھر ہم کو خود مکتفی ہونے کا خیال ترک کردینا بہتر ہے اور اگر فرق تھوڑا ہے تو ہم کو خود مکتفی ہونے کی ضرور کوشش کرنی چاہیئے یہی حال روئی تیل پیدا کرنے والے اجناس اور غریبوں اور متوسط لوگوں کے کپڑوں وغیرہ کا ہے۔ اس لئے ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونا چاہیئے کہ ہم خود مکتفی کیوں نہ ہوں۔ یہ نہیں کہ خود مکتفی کیوں ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہندوستان اتنا بڑا ملک ہے اور اس کے مختلف حصوں کے حالات و اعداد بھی ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ غریبوں کے ضروریات غذا اور کپڑے وغیرہ کی حد تک ہندوستان کو ایک وحدت تصور کرنے کی بجائے

اس کو مختلف ایسے حصوں میں تقسیم کر کے جہاں کے حالات قریب قریب یکساں ہوں ہر حصہ کو
بڑی حد تک خود مکتفی بنایا جائے یعنی (REGIONAL SELF SUFFICING) قائم کی جائے
اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر حصہ اپنے آپ کو بند کر کے دوسروں سے متعلق نہ رکھے بلکہ حتی الامکان اپنے ابتدائی
ضروریات زندگی کو اول خود پورا کرنے کی کوشش کرے بعد از آں دوسروں کی مدد کرے یعنے دوسروں کی
مدد کرنے کی خاطر خود کو تباہ کر دے بالفاظ دیگر ہر حصہ کا پرائیس اسٹرکچر (PRICE STURUCTURE)
آزاد ہو جانا چاہیئے دوسرے حصوں کے پرائیس اسٹرکچر سے ہندوستان کی ابتدائی ضروریات زندگی کی قیمتیں بین الاقوامی بازار
سے آزاد ہوتا چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بغیر اس اصول پر کار بند ہوئے ہم ہندوستان کے غریبوں کی
معاشی حالت کو درست نہ کر سکیں گے۔

۲۔ ہر حصۂ ملک میں جہاں خود مکتفی ہونے کا اصول قائم کیا گیا ہو وہاں کی پیدا شدہ اشیاء کی
قیمتوں کو جو وہاں صرف ہوتی ہوں لوگوں کی محنت سے متعلق کیا جائے بجائے کسی سکہ رائج الوقت کے
اس کی مثال یہ ہے کہ فرض کیجئے کہ ایک مزدور کو معمولاً سال میں تین سو دن اور ہر روز آٹھ گھنٹے کام کرنا
چاہیئے تو ہم کو قیمتوں کو ایسا معین کرنا چاہیئے کہ وہ ۲۴۰۰ گھنٹوں کی قیمت کے معاوضہ میں اپنی پوری
ضروریات زندگی کو اس معیار کے ساتھ جو اس کے لئے مقرر کیا گیا ہو حاصل کر سکے۔ اس سے بحث نہیں کہ
اس کی اُجرت چار آنہ روزانہ ہے کہ ایک روپیہ مختلف قسم کی محنت اور مختلف قسم کے معیار زندگی
سے متعلق ضروری اعداد وغیرہ کے فراہم کرنے کے بعد اس تعلق کو دریافت کیا جا سکتا ہے۔ یہ مشکل
مسئلہ ضرور ہے مگر میں اس کو قابل حل سمجھتا ہوں۔ ہم کو مختلف طبقوں کے معیار زندگی میں کچھ تناسب
قائم کرنا ضروری ہے۔ فرض کیجئے کہ سب سے کم معیار زندگی کو اکائی تصور کیا جائے تو اس کے
مقابلہ میں لوہار بڑھائی سنار وغیرہ کی معیار زندگی کا نمبر دو ہو یعنی دگنی بڑھی ہوئی ہو تو یہ
ظاہر ہے کہ بڑھائی وغیرہ کی ایک دن کی محنت کی قیمت معمولی مزدور کے دو دن کے محنت کے
برابر ہوگی اور اس اعتبار سے ہر ایک کی بنائی ہوئی چیزوں کی قیمت مقرر کی جائے گی۔ مگر جو
چیزیں باہر فروخت کے لئے بھیجی جائیں گی ان کی قیمت باہر کے بازار پر منحصر ہوگی۔

۳۔ ہر شخص کو سال میں ۳۰۰ دن اور ۲۴۰۰ گھنٹے کام کرنا چاہیئے اور اگر اتنا کام نہ ملے تو اس کے لئے کوئی کام مہیا کیا جانا چاہیئے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر شخص مرد ہو یا عورت دو تین قسم کا کام کرنا جانے۔

۴۔ ہم کو ایسے طریقے نئے معلوم کرنا چاہیئے جس سے ہر شخص کی محنت سے زیادہ سے زیادہ چیزیں بنائی جاسکیں۔ بالفاظ دیگر کسی کام کو کرنے کے لئے کم سے کم وقت درکار ہو اگر کوئی شخص بہ حالت موجودہ ایک کام کو دو دن یعنی ۱۶ گھنٹوں کی محنت سے تیار کرتا ہے اور بعد ازاں کسی اور طریقہ سے ایک دن یعنی آٹھ گھنٹوں میں تیار کرے تو ظاہر ہے کہ وہ سال بھر میں زیادہ کام کرے گا اور چاہے وہ پہلے سے زیادہ نہ کمائے مگر وہ زیادہ چیزیں خریدنے کے قابل ہوگا۔ بشرطیکہ مذکورۂ بالا اصولوں پر عمل کیا جائے۔

۵۔ مختلف اشیاء کی پیداوار کو ایک خاص نہج پر لے چلنا ضروری ہے۔ کوئی ایسی چیز پیدا نہ کی جائے جو کسی نہ کسی کے کام نہ آئے۔ اگر ایک چیز ضرورت کے موافق تیار کردی گئی ہے اور پھر بھی لوگ بیکار ہیں تو کوئی دوسری چیز تیار کرکے اس کو فروخت کیا جائے اور اس طرح سے معیار زندگی کو بڑھایا جاسکتا ہے۔ مثلاً سوت کا کپڑا ضرورت کے موافق تیار ہوگیا ہے اور جولاہے بیکار ہیں تو ان سے ریشم کا کپڑا تیار کرواکر تقسیم کیا جائے اس اصول کے یہ معنی ہوئے کہ محنت کسی کی بیکار نہ ہوگی بلکہ ایک کی محنت دوسرے کی محنت سے تبادل ہوگی۔ محنت کے تبادلہ کا یہ اصول بہت غور و فکر کا محتاج ہے۔

ان سب اصول کا خلاصہ یہ ہے کہ دیہات میں رہتے والے لوگوں کی معیار زندگی کو بڑھایا جائے اور معیار کو اسی محنت سے پورا کیا جائے اس طرح جتنے لوگ بیکار ہیں اسی مناسبت سے معیار زندگی کو بڑھانے کی قابلیت رکھتے ہیں بشرط صحیح طریقہ پر کام لیتا ہے۔ جب ابتدائی زندگی کے ضروریات کا بڑا حصہ آپس کی محنت سے حاصل ہوجائے تو پھر وہ ایسا کام کریں جس سے دوسروں کی ضروریات پورے ہوں اور اس کے معاوضہ میں اپنی دیگر ضروریات پورے کریں۔

آپ کے سامنے میں نے دیہی زندگی کے تعمیر جدید کے چند اصول پیش کئے ہیں مگر نیز عمل کس طرح سے

شروع کیا جائے اس کے متعلق ایک خاکۂ عمل نمونتاً پیش کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے اول ہم کو ہر قسم کی کاشت کے متعلق اعداد حاصل کرنا ضروری ہے جس سے اس کی پیداوار کے مختلف کاموں پر انسانوں اور جانوروں کے کتنے گھنٹوں یا دنوں کی محنت درکار ہے معلوم ہو سکے۔ یہ بھی معلوم رہنا چاہیئے کہ بحالت موجودہ کم از کم زیادہ سے زیادہ اور اوسط کے اعداد کیا ہیں۔ اگر پانی دیا جائے تو کس زمین کو کسقدر پانی درکار ہوتا ہے معلوم ہونا ضروری ہے۔ جب چیف انجنیر آبپاشی کا کام میرے سپرد ہوا تو مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ نظام ساگر کے تحت جو پانی صرف ہو رہا ہے اسکی مقدار فی ایکر کیا ہے اور کتنا پانی ضائع ہو رہا ہے اس کا علم نہ تھا اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا علم نہ ہونے تک معقول طریقہ پر اور کفایت کے ساتھ تقسیم آب کرنا ناممکن ہے اور یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ دھان اور نیشکر وغیرہ کے لئے کس قدر پانی حقیقت میں صرف ہو رہا ہے اور آیا اس میں کفایت کی جا سکتی ہے۔ اس کی تحقیقات کرنے کے لئے ایک عملہ حکومت نے منظور فرمایا۔ میں نے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کی کہ بحالت موجودہ دھان اور نیشکر کی کاشت پر فی ایکر لوگوں اور جانوروں کا کتنا وقت صرف ہوتا ہے۔ کیا پیداوار ہوتی ہے؟ خرچ و نفع کیا ہے کس حد تک محنت میں کفایت کی جا سکتی ہے تاکہ خرچ کم ہو اور کس طرح سے پیداوار کو بڑھا کر نفع زیادہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال ان دونوں اقسام کی کاشت کو اکنامک سروے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
مکمل کرنا مقصود تھا۔ میرے رہنے تک مجھے دھان کی کاشت کے اعداد وہ بھی صرف ایک فصل کے مل سکتے تھے اس کے متعدد اجزاء کے منجملہ صرف چند اجزاء کے اعداد نمونتاً درج کرتا ہوں۔ ۱۱۲ ایکر ہے جس میں ۱۴۶ نمبر تھے یہ مواد جمع کیا گیا تھا اوسط رقبہ فی نمبر ۸ ر ۲۷ گنٹہ سب سے کم ۲ گنٹے اور سب سے زیادہ ۹ گنٹہ تھا۔

۱۔ ناگرنے کے لئے فی ایکر اوسطاً ۱۶ گنٹے۔ سب سے زیادہ فی ایکر ۲۰۰ سب سے کم فی ایکر ۱۴۔

۲۔ جملہ کاموں پر ایک انسان کی محنت کا وقت گھنٹوں میں اوسط فی ایکر ۴۴ سب سے زیادہ فی ایکر ۴۰ ر ۳ ا سب سے کم فی ایکر ۱۱۲۔

۳۔ بیج کا وزن پونڈ میں اوسط فی ایکر ۹۶ پونڈ سب سے زیادہ فی ایکر ۲۱۳ سب سے کم فی ایکر ۲۶۔

۴۔ ایرو کا خرچ اوسط فی ایکر ۔ ۔ ۷ ۔ ۷ روپیہ سب سے زیادہ فی ایکر ۰ ۔ ۵ روپیہ سب سے کم فی ایکر ندارد۔

۵۔ پیداوار دھان پونڈ میں اوسط فی ایکر ۱۶۱۸ پونڈ سب سے زیادہ فی ایکر ۲۷۵۲ سب سے کم فی ایکر ۳۴۵۔

۶۔ پرال کا وزن پونڈ میں اوسط فی ایکر ۹۳۴ سب سے زیادہ فی ایکر ۲۵۲۴ سب سے کم فی ایکر ۳۴۰۔

۷۔ جملہ آمدنی روپیوں میں اوسط فی ایکر ۱۸ روپیہ سب سے زیادہ فی ایکر ۵۸ روپیہ سب سے کم فی ایکر ۔ ۔ ۸ ۔ ۲۶ روپیہ

۸۔ جملہ خرچ روپیوں میں جن میں گھر کے لوگوں کی محنت کا صلہ شامل نہیں ہے اوسط فی ایکر ۔ ۔ ۵ ۔ ۲۳ روپیہ سب سے زیادہ فی ایکر ۱۰۴ روپیہ سب سے کم فی ایکر ۔ ۔ ۵ ۔ ۔ ۱۰ روپیہ۔

۹۔ آمدنی جن میں گھر کے لوگوں کی محنت کا صلہ بھی شامل ہے اوسط فی ایکر ۔ ۔ ۱۱ ۔ ۴۷ روپیہ سب سے زیادہ فی ایکر ۱۱ ۔ ۱۲۶ روپیہ سب سے کم فی ایکر ۔ ۔ ۱۵ ۔ ۱۰ روپیہ نقصان۔

اعداد بالا سے ایک نتیجہ یہ نکالا جاسکتا ہے کہ آیا جس کاشت کو رعایا نسلاً بعد نسلاً کرتی چلی آرہی ہے اس کے متعلق آج تک ان کو یہ نہیں معلوم کہ کتنی زمین پر کتنا بیج ڈالنا چاہیئے یا یہ کہ کتنی زمین کتنے گھنٹہ میں ناگر کی جاسکتی ہے اور کتنے آدمیوں کی محنت کتنے وقت تک درکار ہے.... اگر کم از کم چودہ گھنٹوں کی ناگرکشی کافی ہوسکتی ہے تو ۳۲۰ گھنٹے ناگر کرنے کے کیا معنی اور ۱۴۶ گھنٹہ کا اوسط بھی بہت زیادہ ہے اس طرح اگر ۱۱۲ گھنٹوں کی انسان کی محنت سے ایک شخص نے چاول اگائے تو دوسرے نے ایک ہزار آٹھ سو چالیس گھنٹوں کی محنت استعمال کیوں کی اور اوسط (۳۴۰٫۳) گھنٹوں کی محنت نکلتی ہے یہ بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اس غیر معمولی تفاوت سے صرف لاعلمی کا پتہ چلتا ہے اگر رعایا لاعلم ہے تو کیا کوئی اشخاص اور بھی ہیں جو اپنے کام کی بناء پر بتلاسکیں کہ کس قسم کا غلہ وغیرہ فی ایکر کتنے آدمیوں کی محنت سے بکفایت اگایا جاسکتا ہے۔ کس حد کے درمیان اس کو رہنا چاہیئے کیا اس کے متعلق کوئی معلومات رعایا کے سامنے رکھے گئے ہیں۔ اگر یہ ابتدائی مواد بھی حاصل نہیں ہوسکتا تو زراعت کی ترقی کے لئے ہماری چیخ و پکار صدا بہ صحرا سے زیادہ نہیں نکال سکتی۔ سب سے اول ہم کو کاشت کا مواد متذکرۂ بالا مختلف مقامات سے حاصل کرنا چاہیئے اس سے خود ہم کو ایسا مواد مل جائیگا کہ

پھر سال حال کی تجربہ کی بڑی حد تک رہنمائی کرسکے گا۔ بعد ازاں بڑے پیمانہ پر تجربہ کرکے اپنے مواد کی اصلاح کرسکتے ہیں اور وقتاً فوقتاً رہنمائی کو صحیح اور بہتر بناسکتے ہیں اور یہ اصلاح تو ہمیشہ جاری رہے گی لہذا ترقی زراعت کی حد تک مقامی حالات کی دریافت صحیح اصول پر کی جائے میں تجربہ سے زیادہ مقدم اور ضروری سمجھتا ہوں۔

اولاً صحیح مواد جمع کرلیا جائے اور بعد ازاں اس کی بناء پر تجربہ کیا جائے ہندوستان میں جو سالہا سال سے ہو رہا ہے وہ اس کا اُلٹا ہے چونکہ بغیر موجودہ حالات کو جانچنے کے ہم تجربوں پر ٹیکا لگائے بیٹھے ہیں اور زراعت کے تجربوں سے نتیجہ اخذ کرنے کے لئے مدت دراز چاہیئے۔ ہماری رفتار ترقی بہت سُست ہے۔ زراعت کے تجربوں کے لئے کیا حیدرآباد میں اور کیا ہندوستان میں جو عملہ مقرر ہے اور جتنی رقم صرف کی جاتی ہے اور جس چھوٹے پیمانہ پر تجربے کئے جاتے ہیں وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں جتنا کہ ہونا چاہیئے۔ امریکہ جرمنی اور روس وغیرہ کے ممالک سے ہم کو سبق لینا چاہیئے مگر کام کا ڈھنگ ہمارے حالات کے موافق ہو۔ ہمارے حالات کو سمجھنا اور ہمارے تجربوں کی نوعیت کو اس پر صحیح منطبق کرنا اصلی قابلیت اور ذہانت کی دلیل ہے جو ایسے عہدہ دار میں ہونی چاہیئے جو ان تجربوں کو چلانے کا ذمہ دار ہو۔ یہ بھی ذہن نشین کرنے کی بات ہے جو شخص حالات کو صحیح سمجھتا ہے اور کام کرنے اور کرانے کا تھوڑا بہت بھی تجربہ رکھتا ہو اس کے لئے صحیح اصول پر کام کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ وہ صرف موقع کا محتاج ہے اگر موقع مل جائے تو وہ ان لوگوں سے بھی تیز اور عمدہ کام کرکے بتلائے گا جو صرف اتنا جانتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح کام نکل جائے کام کے سقم اور خوبیوں کو عام لوگ تو ایک طرف متعلقہ لوگ بھی کم سمجھتے ہیں۔ یہ صرف اس وجہ سے کہ اس پر غور کرنا ان کے لئے بار خاطر ہے اور یہی بار خاطر حالات کو سمجھنے سے انکار کراتا ہے اور یہی بہت سی خرابیوں کا ذمہ دار ہے۔ سب سے زیادہ خرابی صحیح آدمی کا انتخاب نہ کرنا اور اس سے کام نہ لینا ہے۔

اس وقت تک جو کچھ خیالات اور معلومات کو آپ کے سامنے میں نے پیش کئے ہیں وہ اس خاکہ عمل کی تمہید ہیں جو آخر میں تفصیل کے طور پر آپکے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جس کا تعلق فراہمی اغذیہ سے ہے۔

حضرات! قبل اس کے کہ ہم کوئی خاکۂ دیہی تعمیر جدید کا بنائیں ہم کو ان لوگوں کی موجودہ معیار زندگی کی تفصیل معلوم کرنے کی ضرورت ہے جو دیہات کا غریب طبقہ زراعت پیشہ اور وہاں کے مزدوروں کا ہے اس کے بعد ہم ایک معیار زندگی معین کرکے جس کا امکان نظر آتا ہو اس کو پورا کرنے کی تدبیر کرنی چاہیئے جب اس طرح کام کرنے لگیں گے تو ہم کو صحیح معلوم ہوسکے گا کہ ہم اپنے معیار میں کہاں تک کامیاب ہوسکتے ہیں اور ان میں کیا تبدیلی کی ضرورت ہے میں نے کچھ لوگوں کے معیار زندگی کو دریافت کرکے ایک معیار زندگی تمثیلاً تجویز کی ہے جس کا تعلق بالفعل صرف غذا اور کپڑے سے ہے۔ تختہ ذیل سے اس کی تفصیل معلوم ہوگی ان میں میں نے کم از کم چاول گیہوں یا جوار کی مقدار روزانہ اوسط ڈیڑھ پونڈ یعنے تین پاؤ رکھی ہے اس حساب سے فی کس سالانہ ۵۴۷ پانچسو سینتالیس پونڈ غذا چاہیئے اور ہزار آدمیوں کے لئے جن میں عورتیں اور بچے شامل ہیں ۶۸۳۸ چھ ہزار آٹھ سو اڑتیس من درکار ہوں گے۔ اس طرح سے میں نے دال، مرچ، املی، نمک، ہلدی، ادرک، لہسن، پیاز، شکر، یا گڑ، سبز ترکاریاں اور گڈے مثلاً آلو، اروی وغیرہ جلانے کی لکڑی کپڑوں کے لئے روئی گوشت کھانے اور پکانے کے لئے تیل کا معیار مقرر کیا ہے دودھ روزانہ فی کس پاؤ سیر کے حساب سے سالانہ فی کس ۱۷۲ پونڈ اور ایک ہزار آدمیوں کے لئے ۲۱۵۰ من درکار ہوگا۔

کم از کم مقدار

شمار	اجناس	فی کس روزانہ	فی کس سالانہ	سالانہ فی ہزار
۱	چاول جوار باجرہ وغیرہ	ڈیڑھ پونڈ	۵۴۷ پونڈ	۶۸۳۸ من
۲	دال	دو اونس	۴۶ ״	۵۷۵ ״
۳	مرچ	۱۲ ماسہ	۹ ״	۱۱۲٫۵ ״
۴	املی	۸ ماسہ	۶ ״	۷۵ ״
۵	نمک	۱۲ ״	۹ ״	۱۱۲٫۵ ״
۶	ہلدی	۲ ״	۱½ ״	۱۸٫۷۵ ״

۷	ادرک	۱	ماشہ	۳/۴	پونڈ	۹٫۹۷۵	من
۸	لہسن	۱	"	۳/۴	"	۹٫۹۷۵	"
۹	پیاز	۲½	تولہ	۳۲	"	۴۰۰	"
۱	شکر	۱	اونس	۲۳	"	۲۸۷٫۵	"
۱	دودھ	۸	"	۱۷۲	"	۲۱۵۰	"
۱۱	بھاجی وغیرہ	۱	"	۲۳	"	۲۸۷٫۵	"
۱۲	آلو وغیرہ	۲	"	۴۶	"	۵۷۵	"
۱۴	گھی	۱	"	۲۳	"	۲۸۷٫۵	"
۱۵	تیل کھانے کے لئے	۱	"	۲۳	"	۲۸۷٫۵	"
۱۶	تیل جلانے کے لئے	۱	"	۲۳	"	۲۸۷٫۵	"
۱۷	لکڑی	۱½	پونڈ	۵۴۷	"	۶۸۳۸	"
۱۸	گوشت	۳	اونس	۶۹	"	۶۸۲٫۵	"
۱۹	کپڑا			۴۸	مربع گز	۴۸۰۰۰ مربع گز	
۲۰	روئی					۱۳۰۰۰ پونڈ	

الف۔ کپڑوں اور روئی کا معیار اس اندازہ پر منحصر ہے کہ ہر عورت کو چار جوڑے اور مرد کو چھ جوڑے سالانہ ضروری جن میں کم از کم دو شیروانیاں یا کوٹ شامل ہیں اس پر سے یہ سرسری اندازہ یہ ہے کہ اوسط فی کس سالانہ ۴۸ مکسر درعہ گز کپڑا چاہیئے۔ ایک ہزار آدمیوں کے لئے تقریباً ۱۳ ہزار پونڈ روئی درکار ہوگی ان ضروریات کو زمین سے حاصل کرنے کے لئے تین صورتیں ہیں۔

ا۔ تمام اجناس سوائے باغات کے خشکی زمین سے بغیر پانی کی مدد کے حاصل کئے جائیں ان میں سب سے زیادہ رقبہ جوار باجرہ یا گیہوں کا ہوگا اور دوسرے درجہ پر تیل پیدا کرنے والے

اجناس اور روئی کا ہوگا۔

۲۔ جوار اور گیہوں اور دیگر اجناس کو پانی کی مدد سے اُگایا جائے ان میں چاول شامل نہیں ہیں۔

۳۔ اصل غذا جوار اور گیہوں کے بجائے چاول کی ہوگی اور باقی چیزیں بھی اکثر پانی کی مدد سے اُگائی جائیں گی۔

اس تقسیم سے مجھکو یہ معلوم کرنا مقصود تھا کہ ایک ہزار آدمیوں کی خوراک اور کپڑے کے لئے ان تینوں مختلف حالات میں جو ہمارے ملک میں نظر آتے ہیں رقبہ کس قدر چاہیئے آبادی کس قدر چاہیئے اور تیل اور لہسن وغیرہ کتنے چاہئیں ان جانوروں کا چارہ وغیرہ مختلف اجناس سے کس قدر فراہم ہوسکتا ہے اور کتنا مزید فراہم کرنا پڑے گا۔ ذرائع آبپاشی کے لئے باؤلیوں کا ذریعہ تصور کیا گیا ہے اگر باؤلیوں سے معیار زندگی پورا ہوسکتا ہے تو تالابوں سے زیادہ کفایت سے پورا ہوگا ان سب کو آپ کے سامنے پیش کرنا نہیں چاہتا ان کا مختصر خلاصہ حسب ذیل ہے۔

مدات	جوار گیہوں خشک پیداوار	جوار گیہوں آبپاشی کی مدد سے	چاول
۱۔ رقبہ زمین ایکر میں	۱۶۸۳ ایکر	۹۱۷	۱۱۳۳
۲۔ تعداد آبادی جو زراعت کیلئے ضروری ہے ان میں بچے وغیرہ شامل ہیں۔	۶۵۶	۶۳۳	۱۶۲۳
۳۔ تعداد آبادی جو دیگر کاموں کیلئے ضروری ہے مثلاً لوہار، بڑھائی، تجارت پیشہ وغیرہ	۱۷۴	۱۹۷	۲۰۷
۴۔ جملہ تعداد آبادی	۸۳۰	۸۳۰	۱۸۰۳
۵۔ تعداد جانوران مماثل بڑے جانوروں کے	۹۴۲	۹۲۲	۱۳۶۸

متذکرہ اعداد کو صحیح اعداد تصور نہ فرمائیے ہر ایک صرف سرسری اندازہ ہے جو مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ صحیح اندازہ کے لئے میرے پاس کافی مواد نہیں ہے۔ ان میں بعد تحقیقات بہت کچھ فرق ہوجائیگا اور جب صحیح اندازہ کیا جاسکے گا۔ اگر صحیح اندازہ اس کے قریب نکلے تو

یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مجوزہ معیار زندگی بہت زیادہ ہے اس کو کم کرنا پڑے گا۔ یہ عام خیال ہے کہ ضرورت سے زیادہ تعداد ہماری زراعت میں مشغول ہے۔ اعداد بالا سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہم کو یہ دریافت کرنا ہوگا کہ کس طرح ہم کم آدمیوں سے زراعت کر سکتے ہیں۔ اور ہمارا مطمع نظر یہ ہونا چاہیئے کہ ہزار آدمیوں کے غذائی و دیگر ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تقریباً پانچویں کی آبادی کو استعمال کیا جائے ۲۰۰ یعنے ۲۰ فیصد آدمی ممکن ہے کہ دیہات میں دیگر ضروریات کو پورا کرنے کے لئے درکار ہوں اور باقی ۳۰۰ آدمی یعنے ۳۰ فیصد شہروں میں رہیں گے۔ اور ان میں سے تقریباً ۱۵ تا ۲۰ فیصد دوسرے بڑے اور چھوٹے صنعتوں میں لگ جائیں گے۔ ہم کو تحقیقات کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم یہ نتیجہ کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنی فی ایکر پیداوار کو دوگنا کرنے میں کامیاب ہوگئے تو نہ صرف ۵۰۰ آدمی کی آبادی سے ایک ہزار کے ضروریات فراہم کر سکیں گے بلکہ آئندہ بڑھنے والی آبادی کے لئے ایک زمانۂ دراز تک کافی زمین بچا رکھیں گے۔ لہذا سب سے اول جو ہم کو کرنا ہے وہ یہ کہ ہم از کم مرہٹواڑی سے ایک اور تلنگانہ سے ایک موضع منتخب کریں اور اس کے ساتھ ساتھ دو نئے مواضعات کے لئے زمین لے کر زیادہ کریں جہاں ایسے لوگ بسائے جائیں جو بالکلیہ ایک خاص معاشی معیار اور پلان پر کام کرنے کے لئے تیار ہوں نئے مقامات پر تو کام بالکلیہ امداد باہمی کے اصول پر چلے گا اور تقریباً ہر شخص کی زندگی ایک خاص غرض کے لئے مختص ہوگی۔ تین سال میں ہم کو بڑی حد تک نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔ پرانے مواضعات میں ہم کسی کو ملکیت سے علحدہ نہیں کریں گے۔ ہر شخص کو اس کی ملکیت کے معاوضہ میں پانچ سال تک معاوضہ دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ اگر وہ ہمارے ساتھ شریک ہو کر کام کرنا پسند کرے تو اس کو موجودہ معیار زندگی کا یقین دلایا جائے گا اگر معیار زندگی بڑھ جائے تو ان میں وہ شریک ہوگا۔

دیسی صنعتوں کا پلان بھی اس کے ساتھ ہوگا چونکہ ان کا موضوع جداگانہ ہے یہاں اس کی بحث بے موقع ہوگی۔ میرے پاس اس کے خاکہ کا پلان بھی ایک حد تک موجود ہے۔ مگر میری دانست میں

ہمارا پہلا اصول یہ ہونا چاہیئے کہ دیہات میں سب مل کر اپنے معیار زندگی کو بڑھانے کے لئے سامان مہیا کریں اس کے بعد جو وقت بچے دوسروں کے لئے سامان مہیا کریں۔ اس سے جو فائدہ ملے حاصل کریں اور اس سے خود کے دیگر ضروریات کو فراہم کریں یا اپنی ضروریات کو نظرانداز کرکے دوسروں کی ضروریات کے لئے سامان مہیا کرنا ہندوستان کے حالات کے تحت صحیح اصول نہ ہوگا۔

اس طریقہ میں کام تو ہر موضع میں بلکہ ملک کے الگ الگ حصوں میں مجموعی حیثیت سے ایک پلان پر آنا ہوگا مگر کسی کو اپنا حق ملکیت کھونے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اگر ہم اس طریقہ میں کامیاب ہوگئے تو ہم اپنا ایک جداگانہ معاشی نظام قائم کرسکیں گے۔ جو غالباً سب سے بہتر ہوگا۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ ایک ایک دن (اشتراکیت) ہندوستان کی تہذیب کو الٹ دیگا۔ اس مجوزہ نظام معیشت میں معاشی اطمینان .... کے بڑے بڑے امکانات مجھے نظر آتے ہیں۔ ان میں کیونکہ آئے دن کے قیمتوں کے اختلافات کا جھگڑا نہیں ہوگا۔ اور برسات کی کمی بیشی کے مضر اثرات سے بڑی حد تک محفوظ رکھ سکے گا۔ اس کا طریقہ بھی نکالا جاسکے گا۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کام کون کرے۔ بغیر اقتدار اور روپیہ کے ایسے کام چل نہیں سکتے۔ اقتدار اور روپیہ سوائے حکومت کے کسی اور کے پاس نہیں۔ حکومت بھی بغیر ملک کی پوری تائید کے محض قوت سے ایسے کام نہیں چلا سکتی۔ لہذا اس کی ضرورت ہے کہ ملک کی طرف سے ایک قومی انجمن یا کمیٹی بنائی جائے جس میں سب طبقوں کے بلا لحاظ مذہب و ملت صاحب فہم و فکر و ذی اثر حضرات شریک ہوں۔ اور اس مسئلہ پر غور کرکے ایک تجویز مرتب کریں اور حکومت کی اعانت سے اس کام کو چلائیں۔ مجھے یقین ہے کہ تین سال کے اندر ہم کو راستہ مل جائیگا اور ملک کی معاشی تعمیر جدید کا نقشہ ڈال سکیں گے۔

آپ حضرات سے آخر میں معافی چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کا وقت لیا اور یہ فیصلہ کہ میری تجویز ملک کے لئے مفید ہونے کا امکان رکھتی ہے یا نہیں اور آیا یہ مزید غور و فکر کی مستحق ہے کہ نہیں آپ پر چھوڑتا ہوں۔

زیادہ غلّہ اُگاؤ کی مہم

از جناب اکبر علی صاحب متعلّم (نظام کالج)

نپولین کا قول ہے کہ "فوجیں پیٹ کے زور پر چلتی ہیں"۔۔۔۔۔۔۔" یہ مقولہ سول آبادی پر بھی یکساں طور پر صادق آتا ہے۔ ہندوستان کی غذائی صورت حال ایک نہایت ہولناک اور انتہائی حل طلب مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ کا دارومدار روپیہ پر ہے لیکن کیا یہ کہنا زیادہ صحیح نہ ہوگا کہ جنگ کی مشین کو حرکت میں لانے والی قوت، غذائی ضروریات ہیں؟ اس وقت تمام کرۂ ارض پر مختلف ملکوں نے اپنی وسیع فوجوں کو جنگ میں شریک کر دیا ہے۔ اقوام متحدہ اپنی پوری قوت موجودہ جنگ میں کامیابی کے حصول اور اس طرح بنی نوع انسان کی آزادی کے لئے صرف کر رہی ہیں، مگر یہ آسان کام نہیں۔ اس عظیم الشان کش مکش میں ہر شخص کو مقدور بھر حصہ لینا چاہیئے۔ وقت کی سب سے بڑی ضرورت کارکردگی ہے جسے باقی رکھنے کے لئے ہمیں اپنی غذائی ضروریات کی طرف کما حقہ توجہ کرنا ضروری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بھوکوں کو صرف صداقت، حقانیت اور اخلاق کے نام پر دعوت عمل دے کر ان سے لبیک کہنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ آخر اس کا کیا راز ہے کہ نازی قوت کے سمندر کی موجیں برطانیہ کی اخلاقی قوت اور اعتماد نفس کی چٹان سے ٹکرا ٹکرا کر رہ جاتی ہیں؟ اس کا جواب دینے کے لئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ برطانیہ آج اپنی غذائی ضروریات کے لئے بیس کروڑ پونڈ کی رقم خرچ کر رہا ہے اس طرح اہل ملک کے خورد و نوش کی کفایت کی جا رہی ہے اور ملک کے لوگ خوش خوش فتح کی طرف قدم بڑھائے چلے جا رہے ہیں۔

آج کل بنگال کا غذائی موقف نہایت المناک منظر پیش کر رہا ہے صورت حال بد سے بد تر ہو گئی ہے۔ ہزارہا آدمی فاقوں سے مر رہے ہیں، ملیریا، ہیضے اور چیچک جیسی وبائیں تمام صوبے میں پھوٹ پڑی ہیں جن کی وجہ سے مصیبتوں میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ بیچارے لوگ جن کی قوت مقاومت

بالکل زائل ہو چکی ہے دھڑا دھڑ مرتے جارہے ہیں۔ اس المناک صورت حال کی، جو اس حد کو پہنچ گئی ہے، متعدد وجوہ ہیں۔ برما کے قبضے سے نکل جانے کا اثر بنگال اور ہندوستان کے دیگر اضلاع پر ہوا لیکن صوبۂ بنگال کی حکومت اس وقت صورتِ حال کی نزاکت سے خبردار نہ ہوئی کیونکہ اس سال کی بہترین فصلوں سے جو غلہ حاصل ہوا تھا اُس کا ذخیرہ موجود تھا جو ابتدائے سال میں بازار میں آیا تھا، اور تاجروں یا کاشتکاروں کے قبضہ میں موجود تھا اِس کے بعد بنگال کے چاول پیدا کرنے والے علاقہ میں طوفان اور سیلاب کی بلائیں نازل ہوئیں جن کی وجہ سے نہ صرف آئندہ موسم کی فصلوں کا ایک حصہ تباہ ہوگیا بلکہ تاجروں اور کاشتکاروں کے ذخیرہ میں سے بھی کچھ حصہ ضائع ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گذشتہ فصل کی پیداوار بہت خراب یعنی سالہائے ماسبق کے مقابلہ میں کوئی ۲۵ فیصد کم ہوئی۔ چھوٹی کشتیوں کی میسر نہ آنے کی وجہ سے جنہیں برما سے یورش کے خطرہ کی بنا پر محفوظ کر دیا گیا تھا اجناسِ غذا کی تقسیم میں بھی رکاوٹ واقع ہوئی۔ علاوہ بریں ریلیں مشرقی ہندوستان میں فوجی آدمیوں اور سامان جنگ لیجانے میں لگی ہوئی تھیں۔ حکومت باہر سے غلّہ لانے کے لئے جہاز حاصل کرنے میں ناکام رہی حالانکہ یہ چیز صاف نظر آرہی تھی کہ باہر سے غلّہ لائے بغیر صورتِ حال خطرناک ہو جائے گی۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ یہ چیز ہوئی کہ تباہی کی نوبت پہنچنے کے بعد بھی حکومت نے ایک عرصۂ دراز تک ملک سے غلّہ کی برآمد کو روا رکھا۔ ان سب چیزوں نے صورتِ حال کو سنگین بنا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اجناس غذا کی پیداوار میں کمی واقع ہوئی اور تقسیم کما حقہ نہ ہوسکی۔ تاجر ہر قسم کی اجناس کی ذخیرہ بازی پر اتر آئے تاکہ زیادہ قیمتیں حاصل کریں اور کاشتکاروں نے اپنے پاس کا فاضل غلّہ نکالنا بند کر دیا کہ کہیں آیندہ پھر انہیں گراں قیمتوں پر نہ خریدنا پڑے۔

مرکزی حکومت نے اس مسئلہ کو پوری اہمیت دے کر حکومت بنگال کی امداد کے لئے متعدد تدابیر اختیار کی ہیں۔ شمالی مغربی ہندوستان سے کلکتہ اور اس کے آگے خوردنی اجناس لے جانے کے لئے روزانہ اسپیشل ٹرینیں چلانے کے انتظامات کئے گئے ہیں گذشتہ اپریل کی ابتدا سے مرکزی حکومت کی طرف سے بنگال کو جو اجناس غلّہ پہنچائی جا چکی ہیں ان کی مقدار دو لاکھ ٹن چاول اور دو لاکھ ٹن

دیگر اجناس غلہ ہے لیکن صورت حال اتنی نازک ہے کہ آسانی سے اصلاح ممکن نہیں۔ بنگال میں صورت حال کو اعتدال پر لانے کے لئے اگر کئی سال نہیں تو کم از کم کئی مہینے تک مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہوگی۔

بہ حیثیت مجموعی تمام ہندوستان پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ گذشتہ چند سال کے اندر ہندوستان میں زراعت کی حالت نہایت دردناک رہی ہے۔ زمانہ ماقبل جنگ میں بھی زراعت کے میدان میں بہتر کارکردگی مفقود تھی۔ تقریباً ۹۷ ملین (نو کروڑ ستر لاکھ) ایکڑ قابل زراعت اراضی بنجر اور چار کروڑ ستر لاکھ ایکڑ افتادہ تھی۔ حقیقی رقبہ زیر کاشت ۲۱۰ ملین (اکیس کروڑ) ایکڑ تھا۔ اس طرح گویا ہر ۱۰۰ ایکڑ پر ۷۰ ایکڑ آراضی غیر مزروعہ رہی۔ اگر کوشش کی جاتی تو نئے مرغزار اور نئے باغ و راغ" پیدا کرکے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔

اس سلسلہ میں چند تقابلی اعداد قابل توجہ ہیں ۱۹۳۱ء-۱۹۳۲ء میں چاول کی اوسط پیداوار ہندوستان میں فی ایکڑ ۱۳۵۷ پونڈ تھی اور اس کے مقابل جاپان میں ۲۷۷۷ پونڈ اور اٹلی میں ۴۶۰۱ پونڈ فی ایکڑ تھی۔ گیہوں کی اوسط پیداوار فی ایکڑ صرف ۶۵۲ پونڈ تھی حالانکہ مصر میں ۱۶۸۰ پونڈ، سلطنت متحدہ میں ۱۲۸۱ پونڈ، جاپان میں ۱۵۰۰ پونڈ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۹۷۳ پونڈ فی ایکڑ تھی۔ ہندوستان میں روئی کی اوسط پیداوار فی ایکڑ مصر کی پیداوار کے ایک تہائی سے بھی کم ہے۔ وشکر کی پیداوار کیوبے اور جاوا کے مقابلہ میں کہیں کم ہے۔

ہندوستانی زراعت کی ادنیٰ پیداآوری کا ذکر کرتے ہوئے سر ایم۔ وسویسریا لکھتے ہیں "زمانہ ماقبل جنگ (۱۹۱۴ء سے پہلے) کے معمولی حالات کی بناء پر حساب کیا جائے تو برطانوی ہندوستان کی اوسط پیداوار بہ شمول رقبہ سیرابی ۲۵ روپیہ فی ایکڑ سے زیادہ نہیں ہوسکتی حالانکہ جاپان میں اس پیداوار کی مقدار ۵۰ روپے سے کم نہ ہوگی"۔ موصوف ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ جبکہ ہندوستان میں (۱۹۲۹ء کی معاشی پستی سے قبل) زرعی آمدنی فی کس ۵۹ روپیہ تھی سوئیڈن میں اسکی مقدار ۱۰۲ روپیہ، ممالک متحدہ امریکہ میں ۷۵۱ روپیہ اور کینیڈا میں ۲۱۳ روپیہ تھی۔

بارش کا غیر یقینی ہونا، امساک باراں کے خلاف بیمے کے انتظام کی عدم موجودگی اراضی کی

تقسیم در تقسیم اور انتشار، اہل دہ کی عدم صلاحیت کارکردگی، قدیم وضع کے آلات زراعت کا استعمال، سیلاب، ژالہ باری، امراض اور سب سے بڑھ کر دیہی مقروضیت وہ اسباب ہیں جو ہندوستان میں کمیٔ پیداوار کا باعث ہیں۔ جنگلی جانوروں، چوہوں، ٹڈیوں اور دوسرے کیڑوں کوڑوں سے بھی کچھ کم نقصان نہیں پہنچتا۔ چنانچہ مختلف سررشتہ جات زراعت نے کسی حد تک کامیابی کے ساتھ ان چیزوں کا علاج معلوم کرنے اور اس کے مقبول عام بنانے کی طرف توجہ کی ہے۔

غذائی اجناس کے مقابلہ میں تجارتی اجناس کی کاشت کی طرف عام رجحان کی وجہ سے حالیہ زمانہ میں ہندوستان میں غذائی صورت حال اور زیادہ نازک ہوگئی ہے لیکن یہ حقیقت نہایت المناک ہے کہ ہماری رعایا دیے بسی سے قیمتوں کے بین الاقوامی اتار چڑھاؤ کا شکار بنی ہوئی ہے۔ وہ مجبور ہے کہ یا تو وہ بین الاقوامی ساز کی آواز پر رقص کرے یا فاقہ اختیار کرے۔ چنانچہ جب تجارتی اجناس مثلاً سن، ارنڈی، روئی وغیرہ کی قیمتیں بڑھ گئیں تو ہندوستان کے کاشتکاروں نے ان اجناس کی اتنی کاشت کی کہ ان اجناس کی پیداوار ملک کی ضروریات سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ زیادہ نفع کی کوشش کی وجہ سے کاشتکاروں کے تجارتی فصول کی طرف توجہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ غذائی اجناس کی رسد میں کمی واقع ہونے لگی۔

اس صورت حال کی کچھ ذمہ داری ارباب حل و عقد پر بھی عائد ہوتی ہے۔ آزاد تجارت کا اصول ابتداً حکومت ہند کے نزدیک جزو ایمان رہا ہے اور غالباً یہی وہ چیز ہے جسے ہمارے ملک کی پیداوار میں روز افزوں کمی کا ایک سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔ حکومت نے ملک کی ضروریات کو اتنی تاخیر سے محسوس کیا کہ گویا بعد از خرابی بصرہ خواجہ بیدار شد۔ اسلئے ابھی بہت کچھ تلافی مافات کرنا ہے۔

غذائی صورت حال کے خراب ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اجناس غلہ کی بڑی بڑی مقدار میں فوجی ضروریات کی سربراہی کے کام میں آرہی ہیں۔ اس طرح فوجی ضروریات سول آبادی کی سربراہی میں کمی کا باعث ہوئیں۔ سول آبادی کی وسیع طلب اور مقابلتہً گھٹی ہوئی رسد نے مل جل کر قیمتوں کو خطرناک حد تک بڑھا دیا ہے۔

چاول جو ہندوستان کی بڑی پیداوار اور ملک کے اکثر و بیشتر باشندوں کی خاص غذا ہے اس کی کاشت کا رقبہ ہندوستان کی جملہ زیر کاشت اراضی کا ۲۹ فیصد ہے اور چاول کی پیداوار میں ہندوستان کا نام جہاں دنیا کی مجموعی مقدار پیداوار کا ۳۹ فیصد چاول پیدا ہوتا ہے، سر فہرست نظر آتا ہے۔ تاہم معمولی حالات میں بھی ہماری چاول کی پیداوار ہماری ضروریات سے ۱۰ فیصد کم ہوتی ہے۔ برما، ہندوستان کی چاول کی درآمد کا سب سے بڑا سرچشمہ تھا جہاں سے ۱۹۳۹ء-۱۹۴۰ء میں ۱۸۰۹۰۰۰ ٹن چاول کی درآمد ہوئی تھی۔ لیکن فی الحال چونکہ برما غنیم کے ہاتھ میں ہے اس لئے ہمارے پاس چاول کی کافی حد تک کمی ہے۔

گذشتہ ایک یا دو سال سے بد دیانت تاجروں کی ایک جماعت اپنا گھر بنانے اور لاکھوں جفاکش انسانوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈال کر دولت جمع کرنے کے موقع سے فائدہ اٹھانے میں لگی ہوئی ہے ذخیرہ اندوزی اور احتکار سے نہ صرف قیمتوں میں اضافہ ہوگیا ہے بلکہ قحط کے حالات پیدا ہو گئے ہیں ایک طرف چند دولت مند تمتع کر رہے ہیں اور دوسری طرف ملک کے غریب لوگ تنگدستی اور عسرت کا شکار ہو رہے ہیں۔

ہماری غذائی پالیسی کا ایک نقص غلط تقسیم کا رجحان رہا ہے۔ ملک میں جو کچھ پیدا ہوتا ہے اس کی علی السویہ تقسیم عمل میں آنی چاہیئے۔ ہمارے تمام غذائی وسائل کو مشترکہ استفادہ کے لئے جمع کیا جانا چاہیئے۔

نگرانی نرخ اشیاء کی با دلِ ناخواستہ کوششیں بارآور ثابت نہیں ہوئیں۔ سٹہ بازی نے افراط زر کو بڑھا دیا ہے۔ حکومت کے لئے چور بازار کی جو ہماری موجودہ غذائی مصیبت کا سب سے بڑا سبب ہے روک تھام ممکن نہ ہو سکی۔

لیکن کل کی غلطی کا آج ازالہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ذیل میں چند تجاویز پیش کی جاتی ہیں جو غذائی صورت حال کے بارے میں ہمارے مصائب کے ازالہ میں مدد دے سکیں گی۔

(۱) ابھی تک اجناس غذائی کی کاشت کے رقبہ میں اضافہ کی بہت بڑی گنجائش ہے مناسب بہوتوں کے

ساتھ فصولِ غذا کی کاشت کے رقبہ میں (۹۷ + ۴۷) ۱۴۴ ملین ایکر کی حد تک اضافہ کیا جاسکتا ہے چاول کی پیداوار میں اضافہ کی غرض سے بعض پراجکٹ ہائے آبپاشی کے تحت عارضی طور پر تا بیجُ کاشت میں اضافہ کیا جانا چاہیئے۔

(۲) کاشت عمیق کے طریقے پر عمل کیا جائے۔ مناسب کھاد اور ترقی یافتہ ذرائع کے استعمال سے ہماری زمینوں سے غلّہ کی زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے سررشتۂ زراعت کو اجناس غلّہ کے بہتر اقسام کے بیج، نیز کھاد تقاوی کے اصول پر فراہم کرنا چاہیئے۔

(۳) اُن کاشتکاروں کے لئے جو اجناس غذا کی کاشت کرتے ہیں امدادیں منظور کی جانی چاہئیں۔

(۴) امور ذیل کے بارے میں سررشتۂ مال کے اختیارات کی تقسیم عمل میں آنی چاہیئے۔

(الف) عطائے حقوق مقابضت

(ب) مراعات۔

(ج) پیداوار قرضہ جات۔

متعہ جہد تہدار کارروائی نہایت ضروری ہے۔ اس بارے میں حکومت کو بصیغہ مال نہایت اوجہد ریاستی اختیار کرنا چاہیئے اور جو رعایا اجناس غذا کی کاشت کرے اُسے مراعات اور سہولتیں عطا کی جانی چاہئیں۔ پراجکٹ ہائے آبپاشی کے تحت ہلکی آبپاشی کے لئے کاشتکاروں کو لگان میں معافیات دینا اور آبیانہ (محصول آب) میں تخفیف کرنا چاہیئے۔

(۵) (ا) تعلیم یافتہ بے روزگاروں اور (ب) زمین نہ رکھنے والے کاشتکاروں کے لئے نوآبادیوں کا قیام۔ وادی پنجاب اور نظام آباد میں آبادکاری کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ قابل تقلید ہے۔

(۶) ہندوستان میں آبپاشی کا مسئلہ بے حد اہم ہے کیونکہ یہاں بارش غیر یقینی، بے وقت نا کافی، کہیں کم کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ فی الحال حکومت ہند نے ۵۴ کروڑ روپیہ کارہائے آبپاشی تیار کئے ہیں۔ اس میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ جو تالاب آبپاشی کا کام نہیں دے رہے ہیں یا خشک

ہوگئے ہیں انہیں توڑ دیا جانا چاہیئے اور شکستہ ہائے تالاب کے رقبوں میں ربیع کی کاشت کرائی جانی چاہیئے۔ صرشتۂ آبپاشی کو مہم افزائش پیداوار غلہ کے تحت ایک مقدم ضرورت کے طور پر ایسی نہروں کی درستی اور مرمت کرانا اور باؤلیوں اور دیگر ذرائع آب کی تعمیر کرانا چاہیے جو کاشت میں مدد دے سکیں۔

(۷) دوامی بندوبست کو ختم کر دینا چاہیئے۔

(۸) دو فصلہ اراضی میں جو صرف ۴ ملین (چالیس لاکھ) ایکر ہے اضافہ کیا جانا چاہیئے۔ کوچین اور میسور کے مزرعوں کی مثالیں قابل تقلید ہیں۔

(۹) چھوٹے مزارعین کو مراعات دینا چاہیئے۔ اور بڑے کھاتہ داروں پر آسام کی طرح زرعی ٹیکس عاید کیا جانا چاہیئے۔ زرعی آمدنی کو ہمیشہ کے لئے محصول سے مستثنیٰ کرنے میں نہ تو روایتی اعتبار کوئی واجبیت ہے اور نہ اصولی نقطۂ نظر سے۔ انتظامی مشکلات ضرور ہیں لیکن وہ اتنی بڑی نہیں کہ ان پر غالب آنا ناممکن ہو، خصوصاً اس وجہ سے کہ ہندوستان میں کاغذات دیہی کی داشت کا بڑی خوبی سے انتظام کرنے والا عملہ موجود ہے۔ علاوہ بریں زرعی پیداوار کی قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے کاشتکار اور زمیندار دونوں خوب نفع حاصل کر رہے ہیں۔ زرعی آمدنی پر تدریجی نوعیت کا انکم ٹیکس لگانے سے بہت سے غیر معاشی کھاتے معاشی بنائے جاسکیں گے۔

(۱۰) ایک اور تدبیر یہ ہے کہ زرعی تحقیق سے مقامی مسائل میں کام لیا جائے۔ کیونکہ اس طرح ہماری غذاؤں کی مقدار اور قسم دونوں میں ترقی ہوسکتی ہے۔ ہندوستان میں مزارعین ابھی تک کاشت کے قدیم طریقوں پر قایم ہیں حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ پیداوار کی زیادتی ترقی دادہ آلات زراعت کے استعمال پر منحصر ہے۔ لوہے کے ہل، شکر کے کھانے، پمپ کے ذریعہ پانی کھینچنے کی مشین، مراون بیلچہ، تخم ریزی کی مشین اور ریا پانی کے لفٹ کا رواج کسی حد تک ہو چلا ہے لیکن اگر صورت حال کو ترقی دینا ہے تو ابھی بہت کچھ کرنا ہوگا۔ ہندوستان جیسے چھوٹے چھوٹے کھاتہ داروں کے ملک میں جن مشکلات کا پایا جانا قدرتی ہے ان پر، اتحاد باہمی او مشترکہ زراعت کے اصول پر کام کر کے غلبہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بالائی سندھ، بہار کے شمالی حصے اور صوبجات متوسط میں بڑے بڑے

زمیندار ٹراکٹر اور دیگر جدید آلات زراعت استعمال کر رہے ہیں اور اگر ان طریقوں کا مظاہرہ کیا جاتا رہے تو ان وقت بچانے اور بہتر کام کرنے والے آلات کے استعمال سے ہماری غذائی پیداوار میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ خشک کاشت کی توفیر کے لئے بھی تحقیق کی جانی چاہیئے۔ ہاتھ اور مویشیوں کے ذریعہ جو آلات زراعت استعمال کئے جاتے ہیں ان کو ترقی دینے کی بھی بہت گنجائش ہے۔ کاشتکار کو ترقی دادہ آلات زراعت کے استعمال پر آمادہ کرنے کے لئے پروپگنڈا بھی ضروری ہے۔

سررشتہ جات زراعت، مجالس زراعت اور انجمن ہائے اتحاد باہمی کی مساعی سے پروپگنڈے اور تعلیم کے ذریعہ ان اختراعات کے لئے میدان تیار کرنا چاہیئے اور انہیں اس طرح رکھنے کا انتظام کرنا چاہیئے کہ وہ کاشتکار کے لئے آسانی سے قابل حصول ہوں۔ ریلوے کے ارباب حل و عقد کو آمادہ کرنا چاہیئے کہ زرعی آلات اور مشینوں کے کرایہ میں رعایت کے سوال پر مزید ہمدردانہ غور کریں۔

(۱۱) ہندوستان کے کاشتکار جن جانوروں کو پالتے ہیں ان میں سے گائے بیل بھینس وغیرہ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو کھیت بے جتے رہ جائیں گودام اور کوٹھے خالی رہیں اور کھانے پینے کا آدھا مزا جاتا رہے کیونکہ ایک ایسے ملک میں جہاں باشندے زیادہ تر سبزی خوار ہوں، دودھ مکھن اور گھی نہ ہو تو رہ کیا جاتا ہے یہ صحیح ہے کہ ملک میں مویشیوں کی کافی بڑی تعداد موجود ہے لیکن عام طور پر ان کو غذا ایسی خراب ملتی ہے کہ مویشی کے کام کرنے کی طاقت میں بہت کمی ہے۔ مویشیوں کے مسئلہ کو حسب ذیل طریقوں سے حل کیا جا سکتا ہے۔ علاج حیوانات کے شفاخانوں کی تعداد میں اضافہ کیا جانا چاہیئے۔ امراض متعدی کی روک تھام کے لئے موقتی علاج کا انتظام کیا جانا چاہیئے۔ جن بیلوں سے سخت کام لیا جائے انہیں خصی کیا جانا چاہیئے۔ اور مویشی کی خرید کے لئے بالاقساط ادائی کی زیادہ سہولتیں دی جانی چاہئیں۔

(۱۲) رعایا کو مزید ذرائع آمدنی فراہم کرنے کی غرض سے دیہات میں ضمنی صنعتیں جاری کرنا چاہیئے۔ کاشتکاری کے کام سے خالی رہنے کے زمانہ میں رعایا کی ہمت افزائی کی جانی چاہیئے کہ وہ اپنا وقت ڈیری فارم، چٹنیاں اور مربے بنانے، مرغی خانہ اور بھیڑیں پالنے کے کاموں میں

صرف کر کے فائدہ حاصل کریں۔ اس طرح جو غذائی پیداوار حاصل ہوگی اُس سے اس کی مصیبت ہلکی ہو جائے گی اور جو مالی فائدہ حاصل ہوگا وہ اس کے لئے کافی سہارا ہوگا۔

(۱۳) کاشتکاروں کے لئے زندگی، بارش اور مویشی کے بیمہ کا انتظام ہونا چاہیئے انہیں سستی برقی قوت فراہم کی جانی چاہیئے۔ اور زرعی پیداوار کو بازار میں نکالنے کی سہولتوں کا انتظام کیا جانا چاہیئے۔

(۱۴) قانونِ اقل شرح زرعی مزدوری کے مماثل کسی مناسب قانون کی ہمیں سخت ضرورت ہے تاکہ کاشتکار اپنی توجہ پیداوار پر مرکوز کر سکے۔ اس کے پہلو بہ پہلو ہمیں لوکل فنڈ کے نظم و نسق کی اصلاح کی بھی ضرورت ہے لوکل فنڈ کی رقم جو اس وقت ایک آنہ فی روپیہ کی شرح سے وصول کی جاتی ہے کلیتہً اصلاحِ دیہات کے لئے صرف کی جانی چاہیئے۔

(۱۵) سر جوگندر سنگھ کی رائے میں بحالت موجودہ اراضی کی پیداوار میں اضافہ کا سب سے بہتر اور زود اثر طریقہ اچھی قسم کی کھاد کا استعمال ہے کاشتکار کے گھر کی کھاد تمام سائنس دانوں کے نزدیک بہتر ہوتی ہے۔ جس میں کھاد کی تمام خوبیاں جمع ہوتی ہیں۔ گوبر کو ایندھن کے ایندھن کے طور پر استعمال کرنے کے زیاں کارانہ طریقہ کو روکا جانا چاہیئے اور دوسری قسم کے ایندھن کے استعمال کو رواج دینا چاہیئے۔ گانوں کے قریب کی بنجر زمینوں میں ایندھن حاصل کرنے کی غرض سے درخت نصب کرنا چاہیئے اور گاؤں سے جہاں تک نزدیک ہوسکے ایندھن کے ذخیرے رکھنا چاہیئے۔ سبز پتوں کی بہترین کھاد حاصل کرنے کی غرض سے سررشتہ جنگلات کو جنگل سے فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔ چین میں کسی قسم کا نامیاتی کوڑا کچرا نہیں جو آخر کار پھر کھیتوں کو نہ پہنچ جاتا ہو۔ سررشتہ زراعت کے پروپگنڈے کے نتیجہ کے طور پر نہروں کے تحت اور رقبہ جات سیرابی میں امونیم سلفیٹ، ہڈی کا چورا مچھلی کی کھاد اور کھلی کا استعمال ہونے لگا ہے۔ اس کے استعما کو روز بروز زیادہ رواج دیا جانا چاہیئے۔

(۱۶) حکومت کو اقل قیمت کی ذمہ داری دینا چاہیئے تاکہ دیرپا قیمتوں کی وجہ سے ہندوستان کے کاشتکار کو اجناس غذائی پیداوار کے لئے مزید اراضی کاشت کرنے کی ترغیب ہوسکے۔

(۱۷) حکومت کو مختلف صوبجات کے مابین آزاد تجارت کی اجازت دینا چاہیئے تاکہ بدانتظامی کی مصیبتوں کی روک تھام ہوسکے۔

(۱۸) یہ امر موجب اطمینان ہے کہ حکومت ہند نے ذخیرہ اندوزوں اور سٹہ بازوں کی سزا دہی کے لئے اور چور بازار کی کارروائیوں کی روک تھام کے لئے قانون منظور کیا ہے۔

(۱۹) انگلستان کی طرح فوج کو ایک حد تک اپنی خوردنی اجناس خود پیدا کرنا چاہیئے۔

(۲۰) متحدین کی افواج کے خور و نوش کو متحدین کی مشترکہ ذمہ داری قرار دینا چاہیئے۔

(۲۱) جہازوں کے ذریعہ حمل و نقل کے انتظام میں آسٹریلیا سے گیہوں کی درآمد کو تقدیم حاصل ہونا چاہیئے۔

(۲۲) انگلستان کی طرح خوردنی چیزوں کی فروخت کا بہتر انتظام ہونا چاہیئے تاکہ درمیانی لوگوں کے واسطے ممکنہ طور پر گھٹایا جاسکے۔

(۲۳) آمیزہ خوراک کا استعمال۔

(۲۴) جنگ کے دوران میں پبلک باورچی خانوں کے ذریعہ معیاری اشیاء ما یحتاج کی غرباء کے ہاتھ کفایت شعارانہ نرخوں پر فروخت۔

ان تدابیر سے ان خوردنی چیزوں کی قیمتیں کم ہوجائیں گی جن کی قیمتیں بڑھ کر دوگنی ہوگئی ہیں حالانکہ انگلستان میں قیمتوں میں صرف ۲۵ فیصد اضافہ ہوا ہے۔

(۲۵) کاشتکار کو غلّہ وغیرہ فروخت کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے صارفین کی ضرورت کی چیزیں مثلاً کپڑا اور دیا سلائیاں تبادلہ میں دی جانی چاہیں۔

(۲۶) اجناس کی قیمتوں کی ادائی سونے یا چاندی کی شکل میں کی جائے۔

تنظیم مابعد جنگ میں حیدرآباد کا موقف

از جناب احمد عبداللہ صاحب متعلم ایم۔ اے آخری (نظام کالج)

یہ واقعہ ہے کہ اقوام عالم جو سرگرمی دوران جنگ میں دکھلاتی ہیں اور جس ہمہ تن کوشش کے ساتھ اسکے جیتنے میں مصروف رہتی ہیں، وہ امن کے قائم ہوتے ہی دھیمی پڑجاتی ہیں۔ نہ وہ پہلی سی سرگرمی باقی رہتی ہے اور نہ وہ جوش وخروش۔ گذشتہ جنگ عظیم میں متحدین نے دُنیا کے سامنے جتنے اعلیٰ خیالات پیش کئے ان میں سے بہت کم نے مابعد جنگ عملی صورت اختیار کی۔ اسکی ایک وجہ یہ تھی کہ دوران جنگ میں انہوں نے کوئی ایسا لائحہ عمل مرتب نہیں کیا جس پر کہ بعد میں عمل کیا جاتا یہی وجہ ہے کہ آج باوجود جنگ کی مصروفیتوں کے دنیا کے ہر گوشہ میں ارباب فکر و نظر مسائل مابعد جنگ کے حل کرنے میں اتنے منہمک ہیں۔ حکومت حیدرآباد نے بھی ان ہی امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک کمیٹی کی تشکیل دی ہے جس میں ہماری ریاست کے قدرتی وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے متعلق غور کیا جارہا ہے۔ اسکے علاوہ یہ امر بھی زیر غور ہے کہ ہمارے معاشی اور تعلیمی نظام میں ایسی تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں جن سے رعایا کی مالی اور تعلیمی حالت بہتر سے بہتر ہوجائے۔

مابعد جنگ حیدرآباد اور برطانوی ہند کو تقریباً ایک ہی قسم کے معاشی مسائل سے دوچار ہونا پڑے گا۔ سب سے پہلے ملک کو صنعتی بنانے کا مسئلہ ہمارے درپیش ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہم بہت ہی خوش قسمت ہیں کہ مغربی ممالک نے بڑے پیمانے پر صنعتیں قائم کرکے ہمیں اس کے فوائد اور نقصانات سے آگاہ کردیا۔ اس قسم کی صنعتوں کے خیال سے فوراً ہی ہماری نظروں کے سامنے تجارتی چکر کا بھیانک نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ اکثر معاشئین کا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں صنعت بر پیمانہ کبیر کے قیام سے تجارتی چکر کا وقوع پذیر ہونا لازمی ہے۔ اسکی وجہ سے مغربی ممالک میں جتنی کچھ تباہ کاریاں ہوئیں اس سے آپ حضرات بخوبی واقف ہیں۔ اسکا سب سے زیادہ تباہ کن پہلو مسئلہ بیروزگاری ہوتا ہے۔

ایک دوسرا پیچیدہ اور حل طلب امر دیہی اور شہری آبادی کے موجودہ تناسب کا ہے۔ بڑی صنعتوں کے قیام سے دیہی آبادی کا ایک حصہ سمٹ کر چند مقامات پر جمع ہو جائیگا اور اکثر مغربی ممالک میں دیکھا گیا ہے کہ دیہات کے وہی لوگ کارخانوں میں رجوع ہوتے ہیں جن کی کارکردگی اعلیٰ ہوتی ہے ایسے زمانہ میں جب کہ ہماری زراعت کی ترقی کے لئے اعلیٰ کارکردگی کے لوگوں کی ضرورت ہے اس طرح اعلیٰ زرعی مزدوروں کا کارخانوں میں منتقل ہونا بہت ہی مضر ثابت ہوگا۔ اسکے علاوہ آبادی کا چند صنعتی مراکز میں جمع ہو جانا انیک گوناگوں مسائل پیش کرتا ہے کہ جن سے مغربی ممالک بھی آج تک عہدہ برآ نہیں ہو سکے تیسری اہم بات یہ ہے کہ بڑے پیمانہ پر صنعتیں قائم کرنے کے لئے ہمیں فی الحال غیر ممالک سے مشین اور پرزوں کی شکل میں سرمایہ کی درآمد کرنی ہوگی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان ممالک سے میکانی ماہروں اور فن دانوں کی بھی درآمد عمل میں آئیگی جو ہمارے معاشی مفاد کے لئے مضرت رساں ثابت ہونگے

ایک بنیادی مسئلہ جس پر ہمیں اپنے ملک میں مغربی طرز کی صنعتیں قائم کرنے سے پہلے غور کرنا ہوگا وہ صنعت بر پیمانہ کبیر کے مقصد سے متعلق ہے۔ اسکا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ بھاری بھاری مشینوں سے اس طرح کام لیا جائے کہ کم سے کم مزدور لگا کر زیادہ سے زیادہ مصنوعات تیار کی جائیں۔ اگر مابعد جنگ ان ہی اصولوں پر صنعتوں کی تنظیم ہوگی تو ہمارا تنظیم کا مقصد بھی فوت ہو جائیگا۔ ملک کو صنعتی بنانے سے قبل ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ہمارے ہاں کن عوامل کی بہتات ہے اور کون کمیاب ہیں یہ معاشی اصول ہے کہ جہاں مزدوروں کی کمی ہو وہاں پیداوار کے ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جن میں مشنری کا استعمال زیادہ ہوتا کہ مزدوروں کی قلت محسوس نہ ہو اسکے برخلاف جس ملک میں مزدوروں کی کمی نہ ہو وہاں پیداوار کے ایسے طریقے اختیار کئے جانے چاہئیں جن میں مزدوروں کی زیادہ سے زیادہ کھپت ہو سکے۔ ان حالات میں دیو ہیکل مشینوں کا استعمال کہاں تک جائز قرار دیا جا سکتا ہے اسکا اندازہ آپ حضرات بخوبی کر سکتے ہیں۔ اپنی ضروریات اور ملک کے معاشی وسائل کو ملحوظ رکھے بغیر کسی خاص طریقہ پر فوراً کاربند ہو جانا قوم کے لئے ایک نئی آفت مول لینا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک کے لئے ابھی کسی بیورج اسکیم کی ضرورت نہیں بلکہ صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ہر شخص کو کھانے کپڑے اور رہائش سے مطمئن

کر دیا جائے ۔ اسلئے کہ ہمارا معیار زندگی اتنے پست درجہ پر ہے کہ اس کو صفر کا درجہ بھی نہیں دیا جا سکتا بلکہ نفی میں بیان کرنا پڑیگا ایسی حالت میں ہمیں چاہیئے کہ اپنی ساری توجہ اس مقصد کے حاصل کرنے پر مرکوز کر دیں کہ ملک کے ہر فرد کو کھانا کپڑا اور مکان میسر ہو سکے ۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے میں نہیں سمجھتا کہ صنعت بر پیمانۂ کبیر کا قیام لازمی ہے ۔ کیونکہ آپ ان بڑی بڑی دیو ہیکل مشینوں کو لے کر آخر کرینگے کیا ؟ کیا اُن سے غربا کیلئے غلّہ فراہم کرینگے یا ان کے لئے چھوٹے چھوٹے مکانات تعمیر کرینگے یا کم از کم ان کا تن ڈھا نکینگے ؟ مغربی طرز کی صنعت کا نفاذ ہمارے ملک کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا ۔ ہم کو ایک ایسا طریقہ اختیار کرنا پڑیگا جس میں ساری آبادی کسی نہ کسی شغل میں مصروف رہ سکے یہ ممکن ہے یہاں کوئی یہ اعتراض کرے کہ اس قسم کا طریقہ رائج کرنے سے ہمارا معیار زندگی زیادہ بلند نہ ہو سکے گا لیکن حالات کا جائزہ لینے پر یہ بات واضح ہو جائیگی کہ حقیقت اس سے بالکل جدا ہے ۔ اور اگر بالفرض ہمارا معیار زندگی زیادہ بلند نہ بھی ہو سکے تو وہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ ہم اپنے معیار کو بلند کرنے کی خواہش میں بڑی بڑی قربانیاں دینے کے لئے تیار ہو جائیں جسکی قوت برداشت ہم میں بالکل باقی نہیں رہی اس میں کوئی شک نہیں کہ کمیونسٹ حکومت نے پنج سالہ تنظیموں کے ذریعے اس کو دنیا کا ایک بڑا صنعتی ملک بنا دیا ۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنی ہو گی کہ روسیوں نے اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے تمام مصائب ہنسی خوشی اس لئے برداشت کیا کہ وہ سرمایہ دار حکومتوں کے مقابلہ کے لئے اپنے آپ کو صنعت بر پیمانۂ کبیر کے ذریعے جلد سے جلد مسلح کر لینا ضروری سمجھتے تھے ۔ چنانچہ روسی اُس زمانہ میں اپنی قومی آمدنی کا ایک تہائی حصہ ہر سال صنعتی پیدائش میں مشغول کرتے رہے ۔ کساد بازاری کے زمانہ میں تو انہیں قومی آمدنی کی ایک تہائی سے زیادہ رقم پیدائش دولت میں مشغول کرنی پڑی ۔

اسکے علاوہ کمیونسٹ حکومت نے روس کو صنعتی بنانے کے جوش میں زراعت اور صنعت کے درمیان توازن قائم نہیں رکھا صنعت پر سرمایہ لگانے سے قومی آمدنی میں تو اضافہ ہو گیا لیکن اشیاء خوردنی اور دوسری ضروریات زندگی کی پیداوار میں کوئی معتدبہ اضافہ نہیں ہوا ۔ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۲ء کے درمیان روس کی قومی آمدنی سولہ فیصد بڑھ گئی لیکن اسکے باوجود معیار زندگی میں کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوا لوگوں کے پاس قوت خرید کا فقدان تو نہیں تھا
۱ لیکن ضرورت کی چیزوں کا دستیاب ہونا مشکل تھا ۔ ۱۹۳۲ء میں بہ نسبت ۱۹۲۸ء کے دودھ، گوشت اور انڈوں کی پیداوار آدھی ہو گئی تھی اس کے برخلاف

غیر غذائی اشیاء کی پیداوار میں ۶۶ فیصد اضافہ ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ دیہی آبادی کا ایک حصہ جو غذائی اجناس کی پیداوار میں مشغول تھا۔ شہروں میں منتقل ہو کر کارخانوں میں رجوع ہو گیا۔

اس ضمن میں ایک مزید بات یہ معلوم ہوئی کہ ہمیں اپنے ملک کو صنعتی بنانے کے لئے یہ سوچنا ہوگا کہ لائٹ، میڈیم اور ہیوی انڈسٹریز میں کس کو ترجیح دینی چاہیئے۔ ہمارے حالات کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ لائٹ انڈسٹری کو فوقیت حاصل ہو۔ اسلئے کہ ہمیں ابتدا میں اشیائے صرف کی زیادہ ضرورت ہوگی جنہیں لائٹ انڈسٹریز ہی تیار کرسکتی ہے۔

آخر میں ہم صنعت کاری کے مالیاتی پہلو پر نظر ڈالینگے چونکہ ہمارا ملک ابھی اعلیٰ قسم کی مشنری اور پرزے تیار کرنے کے قابل نہیں ہوا اسلئے ہمیں غیر ملکی سرمایہ سے تیار کی ہوئی چیزیں درآمد کرنی پڑینگی جس سے ہماری مالی حالت پر اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس وقت ہماری جدید صنعتوں میں بیرونی سرمایہ کا حصہ تقریباً ۷۰ ستر فی صد ہے۔ جوٹ کی صنعت میں ۹۰ فی صد، شکر کی صنعت میں ۷۰ فی صد اور کاغذ کی صنعت میں ۷۵ فی صد۔ ایسی حالت میں بجائے مشینوں کی درآمد کرنے کے بجائے اگر ایسی صنعتوں کی جانب توجہ کی جائے جن میں کم سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس طرح ہندوستان کے ۵ کروڑ بیروزگاروں کو بھی روزگار ملنے کی امید پیدا ہو جائیگی۔ اس لحاظ سے زراعت اور گھریلو صنعتیں تنظیم مابعد جنگ میں ہماری توجہ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

ہمارے ملک میں زراعت اور زراعین کی حالت جتنی ناگفتہ بہ ہے اس سے آپ حضرات بخوبی واقف ہیں یہاں ہم زراعت اور زراعین کی تباہی کے وجوہات اور ان کو بہتر بنانے کے مناسب طریقوں پر غور کرینگے۔ اکثر معاشئین کا خیال ہے کہ ہمارے ملک کی معاشی حالت درست کرنے کے لئے زراعت کو اعلیٰ سے اعلیٰ طریقہ پر چلا کر لوگوں کی قوت خرید میں اضافہ کیا جائے، دیہات کے ذرائع آمد و رفت کو ترقی دی جائے، کسانوں کو اپنی پیداوار کی نکاسی کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تاکہ انہیں درمیانی طبقہ سے نجات حاصل ہوسکے جو ان کے منافع کا بڑا حصہ ہضم کر جاتا ہے۔ ذرائع آب پاشی میں زیادتی کی جائے جس کی ہمارے ملک کو سخت ضرورت ہے، اور گھریلو صنعتوں کی ترقی کے لئے، ارزاں بجلی کی

قوت دیہاتوں میں پھیلائی جائے۔ یہ تجاویز اتنی اہم اور مفید ہیں کہ آیندہ ہمارے ملک کی معاشی تنظیم میں ان پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔

ہندوستان باوجود دنیا کے بڑے زرعی ممالک میں شمار کئے جانے کے اپنی آبادی کے صرف ۵/۶ حصہ کے لئے غذا پیدا کرتا ہے۔ بقیہ آبادی کی غذائی چیزیں ہمیں درآمد کرنی پڑتی ہیں۔ اسکے مختلف وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ زراعت پر حکومت نے خاطرخواہ توجہ نہیں دی ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۹ء تک ہمارے زرعی حالات میں نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی اور نہ ہی اس پر کافی سرمایہ لگا اسکو ترقی دینے کی ممکنہ کوشش کی گئی اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس ملک میں زراعت پر سالانہ دو پیسے فی شخص خرچ کئے جاتے ہیں اور ممالک متحدہ امریکہ میں بھی خرچ چودہ[۱۴] روپیے ہے۔ دوسری وجہ حکومت کی عدم مداخلت اور آزادانہ پالیسی ہے۔

اکثر ممالک میں زمینات پر کاشت کرنے سے زرعی پیداوار میں اضافہ، جدید آلات کے استعمال اور اعلیٰ طریقوں کے رواج سے مصارف پیدائش میں کمی اور پیداوار فی ایکر میں زیادتی اور کسانوں کے لئے نکاسی کی سہولتیں یہ وہ اسباب ہیں جن سے زرعی پیداوار کے اخراجات میں کمی واقع ہوگئی اور نتیجتاً انکی قیمتیں گھٹنے لگیں۔ جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ہے حکومت کے آزادانہ مسلک کی وجہ سے ہمارے ملک کی زرعی پیداوار کی قیمتیں بھی گرنا شروع ہوئیں لیکن ہمارے پیدائش کے اخراجات میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ کیسے ہوتی جبکہ یہاں نہ تو جدید آلات استعمال کئے گئے نہ نکاسی کی سہولتیں پیدا کی گئیں بلکہ آبادی کے بڑھنے، زمینات کے چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہوجانے اور زارعین پر محصول، مالگزاری اور سود کا بوجھ زیادہ ہونے سے اخراجات میں زیادتی واقع ہوگئی۔ اس طرح ہماری زرعی پیداوار کے اخراجات اور قیمتوں کا توازن بگڑ گیا اور زارعین کو ایک عجیب صورت حال کا مقابلہ کرنا پڑا ایک طرف بڑھتے ہوئے اخراجات اور دوسری طرف گرتی ہوئی قیمتیں۔ چاروناچار غریب کسانوں کو ساہوکار کے سامنے اپنا دست دراز کرنا پڑا۔ قرض داری کا یہ سلسلہ اتنا طول کھینچا اور اتنی گہری جڑیں پکڑا کہ کسانوں اور ساہوکار کا تعلق غلام اور آقا کا ہوکر رہ گیا۔ حکومت حیدرآباد کو چاہیے کہ آیندہ معاشی تنظیم میں کسان کو اس قرض سے نجات دلائے جو مسٹر بھروچہ کی رپورٹ کے مطابق ۶۴ کروڑ ۵۰ لاکھ ہے۔ دوسری کوشش

یہ ہونی چاہیئے کہ زراعت کے ایسے جدید اور اعلیٰ طریقے رائج کئے جائیں جن سے فی ایکڑ زاید سے زاید پیداوار حاصل ہوسکے۔

ہندوستانی کسانوں میں ایک عجیب بات یہ دیکھی گئی کہ وہ زراعت کو کاروباری نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کو زندگی کا فرض سمجھکر انجام دیتے ہیں۔ اسکی وجہ سے ہندوستان میں بہت سی ایسی زمینات پر کاشت کی جارہی ہے جنہیں غیر منفعت بخش کہا جاسکتا ہے یعنی جن پر کاشت کرنے سے کسی قسم کا منافع حاصل نہیں ہوتا۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر زرعی اجناس کی قیمتوں میں زیادتی یا کمی کسانوں کے طرز عمل میں کسی قسم کا فرق نہیں پیدا کرتی۔ قیمتوں کے بڑھنے سے نہ تو وہ مزید زمینات خرید کرکے اپنے کام کو بڑھاتے ہیں اور نہ قیمتوں کی کمی ان کو کاشتکاری سے روکتی ہے بلکہ اکثر الٹا اثر ہوتا ہے جب قیمتیں گرتی ہیں تو کسان مزید زمینات پر کاشت کرنے لگتے ہیں تاکہ آمدنی میں جو کمی واقع ہوئی ہے اس کو برابر کردیا جائے۔ اس مزید پیداوار کے مارکٹ میں آنے سے قیمتیں اور زیادہ کم ہو جاتی ہیں۔ اس چکر کا اثر یہ ہوتا ہے کہ کسانوں کو زیادہ سے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے جس کا کوئی خاص معاوضہ نہیں ملتا۔ چنانچہ ایک طرف تو اسکی کارکردگی گھٹ جاتی ہے اور دوسری طرف غیر منفعت بخش زمینات کی کاشت بڑھ جاتی ہے جن سے کسی قسم کا منافع حاصل نہیں ہوتا۔ اس طرح جب زرعی اجناس کی قیمتیں بڑھتی ہیں تو کسان زیادہ فائدہ اٹھانے کے لئے دوسری زمینات پر کاشت نہیں کرتے۔

ہماری زراعت کی ایک اور عجیب و غریب خصوصیت انکا مالیاتی پہلو ہے۔ کسان جو قرض لیتا ہے اس کی شرح سود کہیں زیادہ ہوتی ہے اُس شرح پیداوار سے جو قرض لی ہوئی رقم کو زراعت پر لگانے سے اسکو حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح زارعین کی مالی حالت روز بہ روز بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہماری ریاست میں بنک کاری کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے اور اسٹیٹ بنک ساہوکاروں پر اس قسم کا کنٹرول رکھے کہ ساہوکاروں کی شرح سود بنک کی شرح سود سے زیادہ متجاوز نہ ہونے پائے۔ اسکے علاوہ بنک رہن اراضیات اور اتحاد باہمی کی انجمنوں کا جال ساری ریاست میں پھیلا دینا ہوگا۔ اس وقت ممالک محروسہ سرکار عالی کے علاقہ میں ۲۱۶۹۷ گاوں ہیں اور

زرعی امداد باہمی کی انجمنوں کی تعداد صرف ۳۱۰۸۰ ہے اس لحاظ سے سات گاؤں کیلئے ایک سوسائٹی کام کرتی ہے۔ پچیس سال کے بعد بھی اس تحریک کو زیادہ ترقی نہیں ہوئی اور زرعی آبادی کا صرف ۳ فیصد حصہ ان انجمنوں کا رکن ہے۔ ان انجمنوں کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ خود اپنی جانب سے زارعین کے حالات دریافت کرکے ان کو قرض دینے کی کوشش نہیں کرتیں بلکہ توقع کی جاتی ہے کہ زارعین پیش قدمی کرینگے۔ ہماری دیہی آبادی کے حالات سے جتنی کچھ بھی لاعلمی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہم کیسے اُمید کرسکتے ہیں کہ وہ لوگ اپنے واقعات قلمبند کرکے دفتر انجمن امداد باہمی میں درخواست گذارینگے جرمنی جیسے ملک میں جہاں کی آبادی اتنی تعلیم یافتہ ہے انجمنیں اپنی جانب سے کسانوں کے حالات دریافت کرکے ان کو قرض دیتی ہیں۔

امداد باہمی کی انجمنوں کے ساتھ ساتھ بنک رہن اراضیات کے ذریعہ کسانوں کے آبائی قرض کو رفع کرنے کی کوشش بھی کرنی چاہئے۔ یہاں قرض کے مسئلہ کو اتنی اہمیت دینے کی ضرورت اسوجہ سے بھی گئی کہ اس ایک چیز کے سبب ہماری ساری دیہی آبادی مفلسی کا شکار بن گئی ہے اور ایک زرعی ملک میں قرض داری کے دیہی اثرات مترتب ہوتے ہیں جو ایک صنعتی ملک میں بیروزگاری سے پیدا ہوتے ہیں۔

اس سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ زرعی قرض کا مسئلہ کتنا اہم ہے۔ زمانہ کی رفتار کے ساتھ اس کا بار بھی بڑھتا جارہا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں یہ قرض ۳۰۰ کروڑ تھا اور آج ۱۲۰۰ کروڑ تک پہنچ گیا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور توجہ طلب امر اجناس کی نکاسی ہونے تک انکو محفوظ رکھنے کا ہے۔ مختلف قسم کے کیڑے ہر سال تقریباً ۲۰۰ کروڑ روپے کا غلہ برباد کردیتے ہیں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ دیہاتوں میں غلہ کے گودام تیار کئے جائیں جس سے ایک طرف غلہ کی رسد میں اور دوسری طرف کسانوں کی آمدنی میں کافی اضافہ ہوگا۔ زارعین کی آمدنی کو بڑھانے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ درمیانی طبقے کو بے دخل کیا جائے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ مصارف اگر گیہوں کی خریداری میں

ایک روپیہ ادا کرتا ہے تو اس میں سے صرف نو آنے چھ پائی پیدا کنندہ کو وصول ہوتے ہیں اور باقی درمیانی اشخاص ہضم کر جاتے ہیں۔ ہماری حکومت نے حیدرآباد کمرشیل کارپوریشن قائم کر کے بہت ہی بہتر کام انجام دیا ہے۔ جنگ کے بعد بھی اگر یہ کارپوریشن نفع حاصل کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ ملک کے مفاد کی خاطر اپنا کام جاری رکھے تو درمیانی طبقے کے عنصر کو ہمارے معاشی نظام سے بالکل نیست و نابود کر دیا جا سکتا ہے۔

زرعی مسائل کا ایک اور پہلو زمینات کی ملکیت سے متعلق ہے۔ اس سلسلہ میں موجودہ قوانین بہت ہی مضرت رساں ثابت ہو رہے ہیں۔ زمینات اتنے چھوٹے چھوٹے حقوں میں منقسم ہو چکی ہیں کہ ان پر انفرادی طور سے کاشت کرنا کاروباری نقطۂ نظر سے فائدہ مند نہیں رہا۔ جنگ کے بعد اگر ہماری حکومت آسامیوں کی اصلاحات کے قوانین وضع کرے اور اتحادی کاشت (کلیکٹیو فارمنگ) کے طریقے کو رواج دے تو ملک کی خوش حالی کا باعث ہو گا۔

زراعت کے ان تمام پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت اسلئے لاحق ہوئی کہ اس کو آج کل بیسک مین آف انڈین انڈسٹریز کہا جا رہا ہے اور جب تک اس مریض کو صحت نہ ہو جائے کسی قسم کی صنعتی تنظیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ خود صنعت کی ترقی کا انحصار زارعین کی قوت خرید پر ہے اسلئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زرعی پیداوار ہی ہماری دولت کی بنیاد قرار دی جا سکتی ہے۔

ہماری معاشی تنظیم کا دوسرا بہت ہی اہم مسئلہ گھریلو صنعتوں کا ہے۔ جیسا کہ ابتداء میں بیان کر دیا جا چکا ہے کہ مغربی طرز پر صنعت بر پیمانہ کبیر کا قیام ہمارے لئے فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتا۔ اسلئے کہ ہمارے ہاں بڑھتی ہوئی آبادی کو کام سے لگانے کا سوال ہے۔ صنعت بر پیمانہ کبیر کے قائم کرنے کا نتیجہ صرف یہ ہو گا کہ چند بڑے بڑے صنعتی شہر عالم وجود میں آجائیں گے اور کروڑ پتیوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائیگا۔ لیکن ان صنعتوں کی تیار کی ہوئی مصنوعات کو خریدنے والے کتنے ہونگے؟ جب کہ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کیلئے کوئی روزگار نہ ہو اسی طرح ان کے پاس قوت خرید کا فقدان ہو گا۔ اسوقت ہندوستان کا شمار دنیا کے آٹھ بڑے صنعتی ممالک میں

ہونے کے باوجود اس کی صرف بیس لاکھ آبادی جدید قسم کی صنعتوں میں کام کر رہی ہے ایک ایسا ملک جسکی آبادی میں ہر سال ۵۰ لاکھ کا اضافہ ہوتا ہو بھلا اس قسم کی صنعتیں کہاں تک روزگار پیدا کرسکینگی۔ اسکے برخلاف ہماری قدیم چھوٹی اور گھریلو صنعتوں میں جو اتنی اُجڑ چکی ہیں اب بھی ایک کروڑ پچاس لاکھ آدمی کام کرتے ہیں اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے ملک کے حالات کے لحاظ سے کس قسم کی صنعت زیادہ موزوں ہوگی۔

دستکاری اور گھریلو صنعتوں میں ہمیشہ سے حیدرآباد کی حیثیت بہت ہی نمایاں رہی ہے آج بھی اورنگ آباد کا ہمرو، پیٹھن کی ریشمی و زردوزی توریں، نرمل کی نقاشی اور لکڑی کے کھلونے، کریم نگر میں چاندی کا نقش و نگار، ناندیڑ اور نارائن پیٹھ کی پارچہ بافی، سنگاریڈی و آرمور کی ریشمی بافت، ورنگل کی قالین سازی، بیدر کی دستکاری حیدرآباد کی وہ صناعیاں ہیں جن کی آج تک مانگ ہے۔ اس زمانہ میں بھی جب کہ مشین سے تیار کی ہوئی مصنوعات نے ہماری منڈیوں پر تسلط حاصل کرلیا ہے دیہی آبادی کی اکثر ضروریات گھریلو صنعتیں پورا کرتی ہیں۔ صناعوں کی مالی حالت اتنی بدتر ہوتے اور ان کے مال کی نکاسی کے لئے خاطر خواہ سہولتیں نہ ہونے کے باوجود ان کی صنعتوں کا اس وقت باقی رہنا انکی صلاحیت حیات و بقا کا بہترین ثبوت ہے اور ان کی ترقی کے امکانات کا یقین دلاتا ہے۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ان ہی اشخاص کو جو مصنوعات تیار کرتے ہیں خام اشیاء کی فراہمی کا کام بھی انجام دینا پڑتا ہے اور اپنے مال کی نکاسی کی ذمہ داری بھی ان ہی پر ہوتی ہے۔ تنظیم مابعد جنگ میں ان تینوں کاموں کو علحدہ گروہ کے سپرد کیا جانا چاہیئے تاکہ صناع اطمینان سے اپنی صنعتوں کی ترقی میں مشغول رہ سکیں۔ بنک اس قسم کی صنعتی ترقی میں بہت کچھ مدد دے سکتے ہیں۔ اگر وہ صناعوں کو جدید آلات اور خام اشیاء کی خریدی کے لئے بہت ہی قلیل شرح سود پر قرض دیں تو صنعتوں کی وسعت اور ترقی کا باعث ہوگا۔

گھریلو صنعت اور دستکاری کے علاوہ حیدرآباد میں لائٹ اور میڈیم انڈسٹریز کے لئے بھی کافی گنجائش موجود ہے۔ اس قسم کی انڈسٹریز کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے ہماری ریاست میں اُن تمام عوامل کی بہتات ہے جن کی ہمیں ضرورت لاحق ہوگی۔ کوئلہ کی پیداوار میں بنگال اور

ر کے سوا حیدرآباد کو تمام صوبوں اور ریاستوں پر فوقیت حاصل ہے۔ خام پیداوار کے لحاظ سے
ہم بہت ہی خوش قسمت ہیں۔ روغنی بیج اور روئی کے بکثرت دستیاب ہونے کی وجہ سے
ل سازی اور پارچہ بافی کی صنعتوں کو کافی فروغ دیا جا سکتا ہے۔ ملک میں جنگلات اتنے پائے
اتے ہیں کہ کاغذ سازی کے کارخانوں میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ جوار کی پیداوار اتنی وافر ہے کہ
ں سے نشاستہ بنانے کے کارخانے قائم کئے جا سکتے ہیں۔ چرم سازی کی صنعت کو بھی حیدرآباد میں
قی دی جا سکتی ہے۔ جنوبی ہند، آب وہوا کے لحاظ سے چمڑے کی دباغت کے لئے بہت ہی
زوں ثابت ہوا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں جس قدر چمڑوں کی دباغت ہوتی ہے اس میں
حصہ حیدرآباد کا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ نباتاتی دباغت کے علاوہ کیمیائی دباغت کیلئے بھی
ارخانے قائم کریں اس طرح حیدرآباد کے چرم کی نہ صرف ہندوستان میں بلکہ سارے یورپ اور
ریکہ میں مانگ ہوگی۔ دوسری صنعتیں جن میں حیدرآباد کو مرکزی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے وہ
منٹ دیا سلائی اور سگریٹ کی ہیں۔ اس طرح ہم دستکاری اور گھریلو صنعتوں کے
ساتھ ساتھ ان لائٹ اور میڈیم انڈسٹریز کو ترقی دے کر اپنی ریاست کو معاشی حیثیت سے
بہت ہی طاقتور بنا دے سکتے ہیں البتہ ضرورت صرف تنظیم کی ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں دو اہم
تیں یاد رکھنی ہونگی ایک تو یہ کہ ہماری ریاست کو خودمکتفی بنانے کا خیال اپنے ذہن سے
نکال دینا چاہیئے۔ یہ معاشی فلسفہ کسی طرح بھی ملک کی خوشحالی کا باعث نہیں ہو سکتا جرمنی نے
اس پر عمل کیا لیکن بالکل ناکامی ہوئی آخرکار نازی حکومت کو ایسے علاقے فتح کرنے پڑے
جہاں سے جرمن صنعت کے لئے خام اشیاء فراہم ہو سکتی تھیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ
مابعد جنگ کے معاشی نظام کی بنیاد ایسی اساس پر رکھی جائے کہ جس میں نظام سرمایہ داری کے
ارتقاء کے لئے کم سے کم گنجائش رہے۔ مغربی ممالک کے تجربہ نے بتلا دیا کہ اس قسم کی سرمایہ داری
قوم کی معاشی ترقی میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔

آخر میں ہم تنظیم مابعد جنگ کے تعلیمی پہلو پر طائرانہ نظر ڈالینگے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہونا

چاہیئے کہ انسان میں قدرت کی جانب سے جتنی خوبیاں ودیعت کی گئی ہیں اُن کو پوری پوری طرح ابھارے اور ان کی نشو نما کرے ۔علم ایک ایسا طلسم ہے جو انسان کی زندگی میں روح پھونک دیتا اور سماج کو متحرک بنا دیتا ہے۔ علم سے مسلح ہو کر انسان محکومی، جہالت، توہمات اور تنگ نظری کا مردانہ وار مقابلہ کر سکتا ہے ۔ہماری معاشی اسکیمیں اسوقت تک کامیاب نہیں ہوسکتیں جب تک کہ عوام میں شعور پیدا نہ ہو۔ یہ شعور صرف تعلیم کے ذریعہ ہی پیدا کیا جا سکتا ہے ۔یہاں اس بات کا تذکرہ کرنا ضروری ہو گا کہ آج کل اکثر مغرب زدہ حضرات اس نظریہ کے حامی ہوتے جا رہے ہیں کہ تعلیمی نظام میں مذہب کا دخل بے ضروری ہے یہ بالکل غلط، بے معنی اور جاہلانہ خیال ہے۔ بغیر مذہبی تعلیم کے انسان کی زندگی بالکل پھیکی ہو کر رہ جائیگی خود مغربی ممالک میں مذہب کی اہمیت کو محسوس کیا جا رہا ہے۔ حال میں مسٹر آر۔ اے بٹلر انگلستان کے بورڈ آف ایجوکیشن کے صدر نے انگلستان کے تعلیمی نظام میں اصلاحات کی ایک اسکیم پیش کی ہے ۔ انہوں نے اپنی اسکیم میں مذہبی تعلیم کو لازمی قرار دیا ہے۔ ہر صبح لڑکے عبادت کرنے کے بعد مدرسہ کے سبق شروع کیا کرینگے بٹلر اسکیم کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اب تک انگلینڈ میں پرائمری ایجوکیشن لازمی قرار دی گئی تھی لیکن آئندہ سے سکنڈری یعنی ثانوی تعلیم بھی لازمی قرار دی جائیگی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمیں اس میدان میں ابھی کتنا کام کرنا ہے۔

ہندوستان کیلئے بھی حکومت ہند کے مشیر تعلیم مسٹر جان سارجنٹ نے ایک بہت ہی اچھی اسکیم پیش کی ہے۔ اس کے مطابق چھ سے چودہ سال تک کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے پرائمری تعلیم ضروری قرار دی جائیگی۔ ان میں سے بیس۲ فی صد کے لئے ثانوی تعلیم کا انتظام کیا جائیگا۔ اسکے بعد کم از کم پندرہ میں ایک کو یونیورسٹی تعلیم کے لئے منتخب کرنے کی تجویز کی گئی ہے تعلیم بالغان کا خیال بھی ملحوظ رکھا گیا ہے کمرشیل اور ٹکنیکل تعلیم کی وسعت کا انحصار ہماری صنعت حرفت کی ضروریات پر چھوڑ دیا گیا۔ ہے ۔مسٹر سارجنٹ نے لڑکوں کی صحت پر بہت زور دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سال میں دو چار مرتبہ طبی معائنہ کرنا کافی نہیں ہوگا بلکہ معائنہ کے بعد لڑکوں میں

جو کمزوری پائی جائے اسکے علاج کی ذمہ داری بھی حکومت کو لینی ہو گی۔ اس اسکول میڈیکل سرویس کیلئے سات ہزار پانچ سو ڈاکٹر اور پندرہ ہزار نرسیں درکار ہونگے۔ یہ ساری اسکیم جب عملی صورت اختیار کریگی تو سالانہ ۳۱۲ کروڑ روپیے صرف ہونگے۔

مابعد جنگ حکومت حیدرآباد بھی اگر سارجنٹ اسکیم پر عمل کرے تو ملک کی تعلیم کا نقشہ بدل جائیگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری حکومت بہت ہی فراخ دلی سے تعلیم پر روپیہ خرچ کرتی رہی ہے لیکن سارجنٹ اسکیم کو ممالک محروسہ میں رائج کرنے کے لئے ہماری حکومت کو بارہ (۱۲) کروڑ روپیہ سالانہ خرچ کرنا ہوگا۔ موجودہ حالات میں صرف تعلیم پر اتنی بڑی رقم صرف کرنا ایک ناممکن امر معلوم ہوتا ہے لیکن جب زراعت اور صنعت کی ترقی سے ملک مالدار ہوتا جائیگا تو اتنی رقم کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوگی۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنی ریاست میں زرعی تعلیم کو زیادہ فروغ دیں۔ دو چار زرعی کالجوں کا قایم کر دینا کافی نہیں بلکہ دیہات کے ہر اسکول میں زراعت کے جدید طریقوں کے متعلق باقاعدہ تعلیم دینی ہوگی۔

آخر میں اس ریاست کی ایک شدید ضرورت کی جانب آپ حضرات کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں ممالک محروسہ کے معاشی حالات کا اب تک کسی وسیع پیمانہ پر سروے نہیں کیا گیا۔ ضرورت ہے کہ چند معاشین کے سپرد یہ کام کیا جائے تاکہ ہمیں ٹھیک طور پر اپنے پوزیشن سے واقفیت ہوسکے دوسرے یہ کہ چند ایسے ادارے قائم کئے جائیں جن میں ہمیشہ معاشی مسائل پر ریسرچ ہوتا رہے اس سے ہماری معاشی ترقی کی رفتار بڑھ جائے گی۔

رپورٹ معاشی کمیٹی بابتہ ۱۳۵۲ف

مرتبہ مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی۔اے معتمد اعزازی معاشی کمیٹی

مجلس عاملہ دورِ ۱۳۵۲ ف کے لئے جو مجلس عاملہ منتخب ہوئی اس کے عہدہ دار اور ارکین کے اسماء حسب ذیل ہیں:۔

(۱) لچھمی نارائن صاحب گپتا بی۔سی۔ایس صدر
(۲) عبدالقیوم صاحب ایچ۔سی۔ایس نائب صدر
(۳) خواجہ حمید احمد صاحب بی۔اے معتمد
(۴) محمد یوسف الدین صاحب یم۔اے نائب معتمد
(۵) عز الدین صاحب خازن
(۶) شنکرجی صاحب بی۔اے ال ال بی رکن
(۷) شرف الدین صاحب بی۔اے ″
(۸) محمد غوث صاحب یم۔اے۔ال ال بی رکن
(۹) میر محمود علی صاحب یم۔اے ″
(۱۰) نواب میر اکبر علی خانصاحب بی۔اے ال ال بی (لندن) ″
(۱۱) ظہیر الدین احمد صاحب یم۔اے ایچ۔سی۔ایس ″
(۱۲) عبدالقادر صاحب بی ایس سی (لندن) ″
(۱۳) مشتاق احمد خانصاحب یم۔اے (کنٹب) ″
(۱۴) صابر علی ہاشمی صاحب نمائندہ سررشتۂ تعلیم صنعت و حرفت

معاشی کمیٹی کی جانب سے مجلس نمائش میں نمائندگی کی غرض سے حسب ذیل تین ارکین منتخب کئے گئے۔

(۱) لچھمی نارائن صاحب گپتا (۲) ظہیر الدین احمد صاحب (۳) خواجہ حمید احمد صاحب

پانچویں نمائش مصنوعات ملکی حسب سابق نمائش کے انعقاد کا کام مجلس نمائش نے انجام دیا اور سال زیر رپورٹ میں اس نمائش کو یہ امتیاز حاصل ہوا کہ اعلحضرت قدر قدرت نے بہ نفس نفیس افتتاح فرمایا اور اس ضمن میں جو فرمان شاہانہ صادر ہوا وہ عثمانیین اور اہل ملک کے حق میں باعث صد عز و افتخار ہے۔ مجلس نمائش اور معاشی کمیٹی اُن ارشادات شاہانہ کی تعمیل میں ہمہ تن مصروف ہے جو بالخصوص ملکی اشیاء کے زیادہ سے زیادہ تیاری اور ان کی نکاسی اور ان کے استعمال سے متعلق مرقوم ہیں اور ان کی تعمیل میں ضروری اسکیموں کی تدوین و ترتیب کی جانب عملی اقدام کیا جارہا ہے۔ پانچویں نمائش مصنوعات کی تفصیلی کیفیت

مجلس نمایش کی روداد سے ظاہر ہوگی اس موقع پر اس کا اظہار ضروری ہے کہ ایسی نمایشوں کے ذریعہ ملک میں جو معاشی بیداری پیدا ہوری ہے اس کے نتایج اب منظر عام پر آرہے ہیں۔ اور اراکین مجلس نمایش اور معاشی کمیٹی ان مصنوعات کی بابت ایسی تحقیقات میں مصروف ہوگئے ہیں جن سے ان کی ترقی کی نئی صورتیں پیدا ہوسکیں اور صناعوں اور محققین میں آپس میں زیادہ ربط قایم ہوسکے۔

پانچویں معاشی کانفرنس معاشی کمیٹی انجمن طیلسانین عثمانیہ کے زیر اہتمام پانچویں معاشی کانفرنس کا انعقاد بتواریخ ۱/ و ۲/ اسفندار ۱۳۵۲ف عمل میں آیا۔ اور بحمداللہ یہ کانفرنس پوری طرح کامیاب رہی۔ گزشتہ پانچ سال کے دوران میں اس کانفرنس نے بتدریج ترقی حاصل کرکے ملک میں اپنا ایک خاص مقام حاصل کرلیا ہے۔ چار سالہ سرگذشت چوتھی معاشی کانفرنس کی رُوداد کے ساتھ شایع کر دی گئی ہے اس وقت ناظرین کے سامنے پانچویں معاشی کانفرنس کی مختصر کیفیت پیش کرنی مقصود ہے۔ مجلس عاملہ معاشی کمیٹی نے پانچویں معاشی کانفرنس کے انعقاد کے انتظامات کے سلسلہ میں حسب ذیل اراکین کی ایک کمیٹی مقرر کی :۔

(۱) لکشمی ناراین صاحب گپتا ایچ۔سی۔یس صدر معاشی کمیٹی۔
(۲) عبدالقیوم صاحب ایچ۔سی۔یس نائب صدر معاشی کمیٹی۔
(۳) میر اکبر علی خانصاحب بیرسٹرایٹ لا رکن
(۴) میر محمود علی صاحب ایم۔ اے "
(۵) ظہیرالدین احمد صاحب ام۔ اے۔ ایچ۔سی۔یس "
(۶) عبدالقادر صاحب بی۔یس۔سی (آنرز) (لندن) "
(۷) خواجہ حمید احمد صاحب بی اے معتمد کانفرنس

اس کمیٹی نے کافی غور و خوض کے بعد کانفرنس کے انعقاد و انصرام کے متعلق ضروری امور انجام دیئے۔ طئے پایا کہ کانفرنس کا افتتاح آنریبل غلام محمد صاحب صدرالمہام فینانس سے کرایا جائے۔ کانفرنس کے دونوں اجلاسوں کی صدارت کیلئے محمد الیاس برنی صاحب (سابق صدر

شعبۂ معاشیات جامعۂ عثمانیہ) ناظم سررشتہ تالیف وترجمہ جامعۂ عثمانیہ سے درخواست کی گئی۔
لکشمی نارائن صاحب گپتا صدر معاشی کمیٹی کانفرنس کی مجلس استقبالی کے صدر قرار پائے۔

کانفرنس میں مباحث کے لئے حسب ذیل چار موضوعوں کا انتخاب کیا گیا:۔

(۱) حیدرآباد میں محاصل اندازی کا مسلک

(۲) حکومت اور زمانۂ جنگ کے معاشی مسائل۔

(۳) کاشتکار اور زمانۂ جنگ کے اثرات

(۴) حیدرآباد میں صنعتی سرمایہ کا مسئلہ

ملک کے مشہور ماہران فن اور اہل قلم حضرات سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے گراں قدر خیالات سے مستفید کریں۔ چنانچہ کانفرنس میں جو خطبات اور مقالات پڑھے گئے ان کا مجموعہ اہل ملک کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ قبل ازیں ملک کے جملہ روزآنہ و ہفتہ وار اخبارات کے ذریعہ کانفرنس کے خطبات کی کافی تشہیر ہو چکی ہے۔ اخبار رہبر دکن۔ مملکت اور سلطنت نے خاص معاشی نمبر بھی شائع کئے ہیں لیکن مجموعتہً ان سب کو ایک ساتھ بطور روداد شایع کرنا بہرطور ضروری متصور ہوا۔ عوام اور ارباب حکومت نے اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں جو حصہ لیا معاشی کمیٹی ان کی بے حد ممنون ہے۔

کانفرنس کے لئے فیضمآب نواب سر محمد احمد سعید خاں بہادر بالقابہ صدر اعظم باب حکومت نے اپنی نوازش سے جو پیام مرحمت فرمایا وہ حسب ذیل ہے:۔

"بعض ناگزیر مصروفیات کی بناء پر میں پانچویں معاشی کانفرنس کے اجلاس میں شرکت نہ کرسکا لیکن میں کانفرنس کی کامیابی کا دلی متمنی ہوں اور مجھے توقع ہے کہ اس کانفرنس کے مباحث ملک کی معاشی جدوجہد میں شمع ہدایت کا کام دینگے۔"

اس کانفرنس کے نتیجہ کے طور پر معاشی کمیٹی جو عملی تجاویز اختیار کر رہی ہے ان کی تفصیل کسی موقع پر پیش کی جائیگی۔

معاشی کتب خانہ کا قیام | سال زیر رپورٹ میں بحمد اللہ معاشی کمیٹی کے حسن اقدام سے ملک میں معاشی

کتب خانہ کا قیام عمل میں آیا جس کا افتتاح میر احمد علی خانصاحب صدر انجمن طیلسانین کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس کتب خانہ میں معاشیات سے متعلقہ فنی منتخبہ کتب جمع ہونا شروع ہو گئی ہیں۔

فی الوقت جن خاص مباحث سے متعلق کتابیں جمع کیجا رہی ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) زراعت	(۵) آبپاشی	(۹) تجارت	(۱۳) تحریک مزدوران
(۲) جنگلات	(۶) آبکاری	(۱۰) بنکنگ	(۱۴) ساہوکارہ
(۳) تنظیم دیہی	(۷) صنعت و حرفت	(۱۱) انشورنس	(۱۵) ریلوے تعمیرات
(۴) معدنیات	(۸) مالیات	(۱۲) امداد باہمی	(۱۶) مشترکہ سرمایہ دار کمپنیاں
(۱۷) کارخانجات	(۱۸) بازارات	(۱۹) اعداد شمار وغیرہ	

لیکن چونکہ موجودہ زمانہ میں معاشی کتب بہت نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ اسلئے یہ ضرورت معلوم ہوتا ہے کہ ان کے حصول کیلئے نہایت سرگرمی کے ساتھ ایک ایسی مہم شروع کی جائے جس کے تحت ہندوستان کے مختلف کتب فروشوں سے بہ عجلت ممکنہ فنی کتب حاصل کیجا سکیں۔ اور حیدرآباد میں ایک مرکزی معاشی کتب خانہ کی عصری ضرورت کی تکمیل ہوسکے۔ اس غرض کیلئے معاشی کمیٹی ایک اسکیم مرتب کر رہی ہے۔ جس کے تحت معاشی کتب خانہ کو مستحکم بنیادوں پر توسیع ہوسکے۔

تنظیم دیہی کے مسائل پر تحقیقات اور سروے کی اسکیم ممالک محروسہ سرکار عالی میں ایک بڑے پیمانہ پر تنظیم دیہی کے کام کی انجام کیلئے سرکار عالی خاص شغف سے سعی فرمارہے ہیں اس غرض کیلئے ایک جداگانہ معتمدی کے ساتھ ایک مجلس تنظیم دیہی کا قیام عمل میں آیا جو گزشتہ دو تین سال سے بہت مفید کام انجام دے رہی ہے۔ معاشی کمیٹی حیدرآباد نے اس اقدام کا خیر مقدم کیا اور ایک علمی جماعت ہونیکی حیثیت سے اس نے چند مثالی مواضع کے معاشی حالات کا جائزہ (معاشی سروے) اور اس سے متعلقہ تحقیقاتی امور کی بابت ایک باضابطہ اسکیم مرتب کرکے حکومت کے سامنے پیش کی جس کی تفصیلات مجلہ طیلسانین کے سابقہ نمبر میں شایع کی جاچکی ہیں۔ اس موقع پر اشارتاً اسکیم کے چند نکات پیش کئے جانے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔

معاشی کمیٹی کے پیش نظر فی الوقت ایسے چھ مواضعات کا انتخاب کرنا ہے جو تلنگانہ مرہٹواڑی

ورکرنا تاکہ ۔ کی خصوصیات کی صحیح نمایندگی کرسکیں اور ارادہ ہے کہ معاشیات کے ایسے ماہر طیلسانئین کو جو خدمت خلق کا جذبہ رکھتے ہوں اور ان مواضع میں قیام کی طرف راغب ہوں، ان مواضع میں انہیں کم از کم چھ ماہ کی مدت کے لئے ٹھیرایا جائے اور یہ اصحاب تمام مقامی مسائل مثلاً مواضع کے مختلف طبقہ جات، یعنی زمیندار کاشتکار شکمیدار، زرعی مزدور، ساہوکاران وغیرہ کی معاشی حیثیت فی کس آمدنی اور قرض کی مقدار اور اخراجات زراعت اور پیداوار آلات کشاورزی کھاد اور مویشی کے متعلق تفصیلی حالات اگر کوئی ضمنی صنعتیں موجود ہوں ان کے متعلق مسائل صفائی صحت عامہ اور مارکٹنگ سہولتوں ذرائع آب وحمل ونقل کے مقامی مسائل کا مطالعہ کریں ۔ یہ متعلمین ایک مرکزی کمیٹی کے زیر ہدایات کام کرینگے جو چند ماہرین پر مشتمل ہوگی ۔ ان ماہرین میں معاشیات کے پروفیسران اور متعلقہ سررشتہ جات سرکار عالی کے نمایندے رہینگے۔

اس طور پر مواضعات سے راست مواد حاصل کرنے کے بعد معاشی کمیٹی اہل ملک اور حکومت کے سامنے ایک تفصیلی رپورٹ پیش کریگی جس میں کمیٹی کی سفارشات شامل رہینگی۔

اس اسکیم کو روبہ عمل لانے کے لئے پندرہ ہزار روپیہ کا ایک تفصیلی موازنہ حکومت کی منظوری کے لئے پیش کیا جا چکا ہے۔ اور توقع ہے کہ اس کی منظوری کے فوراً بعد کمیٹی اس ضمن میں عملی کام شروع کردیگی۔

تجاویز برائے قیام انجمن دیہی | مجلس عاملہ معاشی کمیٹی نے سروے اسکیم کے ساتھ ایک انجمن تنظیم دیہی کے قیام کی بابت بھی چند قواعد منظور کرکے حکومت کے سامنے پیش کئے اس مجوزہ انجمن کے تحت کمیٹی کا یہ منشاء ہے کہ وہ بلدہ حیدرآباد سے اندرون پانچ میل کسی موضع میں ایک مرکز تنظیم دیہی کا قیام عمل میں لائے جس کے ذریعہ تنظیم دیہی سے متعلقہ امور کا عملی تجربہ کیا جائے اور اہل ملک کو زیادہ اپنے کاموں میں حصہ لینے کیلئے متوجہ کیا جاسکے ۔ اس انجمن کے تحت دیہی صنعتوں کو فروغ دینے زرعی ترقی، عام صفائی و بہتر غذا کے فراہم کرنے کا ارادہ ہے۔

زرعی انجمن کے قواعد وضوابط | وسیع پیمانہ پر ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو زراعت کی جانب عملی طور پر راغب کرنے کے لئے معاشی کمیٹی ایک زرعی انجمن قائم کرنے کے لئے کوشاں ہے چنانچہ اس غرض سے

مختلف اہل فکر حضرات سے ان کی تجاویز طلب کیگئیں اور ۱۳۵۱ف میں ایک زرعی انجمن کے جو قواعد مرتب ہوئے ان پر نظر ثانی کیگئی۔ مولوی خلیل اللہ صاحب، مولوی یوسف علی صاحب اور عبدالعزیز صاحب کی تجاویز کی بنا پر ایک ذیلی کمیٹی قایم کیگئی جس میں امداد باہمی کے مختلف اصولوں کے پیش نظر از سرنو چند قواعد مدون کئے گئے جن کے تحت بڑے پیمانہ پر زراعت کا کام آغاز کئے جانیکی صورت پیدا کی گئی۔ لیکن اس اہم کام کو شروع کرنے سے پہلے مجلس عاملہ معاشی کمیٹی نے یہ مناسب خیال کیا کہ ان قواعد کی عملیت کی بابت مزید غور کر لیا جائے۔ چنانچہ یہ کام جدید مجلس عاملہ کے ذمہ کیا گیا۔

غذائی صورت حال سے متعلق معاشی کمیٹی کی یادداشت سال زیر رپورٹ میں معاشی کمیٹی کی مجلس عاملہ نے موجودہ پریشان کن غذائی صورت حال کی اصلاح کے سلسلہ میں نو معرکت الآرا قرار دادیں منظور کیں جو محکمۂ سرکار میں پیش کیگئیں۔ یہ قرار دادیں ملک کے تمام اخبارات میں شایع ہوئیں ان میں سے اکثر قرار دادیں منظور ہو کر روبہ عمل لائی جا رہی ہیں۔ یہ قرار دادیں مجلہ طیلسانیین کی سابقہ اشاعت میں شایع ہو چکی ہیں اس لئے ان کا اعادہ نہیں کیا گیا۔

مجلۂ معاشیات کمیٹی کے پیش نظر ابتداء سے ایک رسالۂ معاشیات جاری کرنیکی تجویز رہی۔ لیکن رقمی گنجایش کی کمی کی بنا پر یہ تجویز پوری طرح روبہ عمل نہ لائی جا سکی البتہ معاشی کمیٹی نے یہ تصفیہ کیا کہ فی الوقت مجلۂ طیلسانیین کے ساتھ ایک حصہ معاشی مضامین کا شائع کیا جائے جو حصۂ معاشیات کے نام سے موسوم ہو اور اسکی (۱۰۰) کاپی مجلۂ طیلسانیین سے علٰحدہ کر کے شائع کی جائیں۔ اس کام کے لئے عبدالقیوم صاحب، محمد غوث صاحب یوسف علی صاحب اور خواجہ حمید احمد صاحب کی ایک ذیلی کمیٹی مقرر کیگئی اور یہ طئے پایا کہ حصۂ معاشیات کی ترتیب اور اشاعت کے لئے تین سو روپیہ مجلۂ طیلسانیین کو دیے جائیں۔

ممالک محروسہ میں ڈرائینگ کے امتحانات کی تجاویز انجمن طیلسانیین عثمانیہ کچھ عرصہ سے اس تجویز پر غور کر رہی تھی کہ ملک میں ڈرائینگ کے امتحانات کا انتظام کیا جائے۔ اس تجویز کو عملی شکل دینے کے لئے انجمن طیلسانیین نے یہ کام مجلس عاملہ معاشی کمیٹی کے سپرد کیا اور معاشی کمیٹی نے اس بارے میں محکمۂ تعلیمات اور بالخصوص مرکزی مدرسہ فنون لطیفہ سے ضروری مشورے و مباحث کئے یہ امر

عث مسرت ہے کہ اس غرض سے ایک مناسب نصاب کی ترتیب عمل میں لائی جارہی ہے۔

مجلس عاملہ کے اجلاس و دیگر امور دوران سال میں مجلس عاملہ کے (۱۰) اجلاس منعقد ہوئے جن میں متذکرۂ بالا امور کے علاوہ دیگر انتظامی امور اور حسابات کے تصفیے عمل میں آئے۔ اور ان اجلاسوں میں ملک کے عام معاشی جد و جہد اور بیداری کے متعلق مختلف تجاویز زیر غور ہیں۔ جنہیں آیندہ سال روبہ عمل لایا جائیگا۔ دوران سال میں تقریباً پچاس اصحاب کو معاشی کمیٹی کا رکن بنایا گیا۔

المختصر ۱۳۵۲ف میں معاشی کمیٹی نے جو کام انجام دیئے اونکی مختصر روداد اہل ملک کے سامنے پیش کر دیگئی۔ اس ضمن میں کمیٹی کے آمدنی و مصارف کا ایک تختہ علٰحدہ شائع کیا جارہا ہے۔ جس سے ظاہر ہوگا کہ کمیٹی نے نہایت ہی قلیل سرمایہ سے اہل ملک کی زبردست معاشی خدمت اپنے ذمہ لی ہے اور اور اراکین معاشی کمیٹی رضاکارانہ طور پر ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس قدر تھوڑے عرصہ میں معاشی کمیٹی کو جو کامیابی ہوئی ہے اس کی بڑی وجہ حکومت اور اہل ملک کا وہ تعاون ہے جو اس کمیٹی کو ہر موقع پر برابر حاصل رہا۔ معاشی کمیٹی کی اہمیت اس وجہ سے بھی اور بڑھ جاتی ہے کہ اس میں اہل فکر حضرات کے ساتھ اہل عمل کا بھی برابر اشتراک و اتحاد شامل ہے۔ اور سرکاری و غیر سرکاری اراکین اس کے مشاغل میں برابری کا حصہ لیکر ملک کی معاشی جد و جہد میں وہ ذوق عمل پیدا کر رہے ہیں جس سے بجا طور پر حیدرآباد کا معاشی مستقبل شاندار اور درخشاں نظر آرہا ہے۔ آخر میں ہماری یہ دعا ہے کہ:۔

تا ابد خالق عالم یہ ریاست رکھے ٭ تجھکو عثمان بہ صد اجلال سلامت رکھے

آل و اولاد کو اللہ دے عمر خضری ٭ ان سے آباد ترا خانۂ دولت رکھے

آمین ثم آمین

خواجہ حمید احمد۔ بی۔ اے عثمانیہ
معتمد اعزازی معاشی کمیٹی

[redacted]

تختۂ حسابات آمدنی و خرچ متعلقہ معاشی کمیٹی، انجمن طیلسانین عثمانیہ من ابتدائے یکم آذر سنہ ۵۱ ف لغایتہ ۳۰ آبان سنہ ۵۲ ف

نمبر شمار	تفصیل ابواب جمع	پائی	آنہ	روپیہ	نمبر شمار	تفصیل ابواب خرچ	پائی	آنہ	روپیہ
۱	سلک گذشتہ سنہ ۵۱ ف	۹	۹	۱۱۸۶	۱	خریدی فرنیچر	۰	۸	۱۳۰
۲	چندہ ارکین	۰	۰	۶۸	۲	درستی ٹائپ رائٹر	۰	۷	۴۲
۳	امداد از سررشتۂ تعلیم صنعت و حرفت	۰	۰	۲۰۰۰	۳	کرایہ دفتر	۰	۰	۱۲۲
۴	سلامت چندہ جات و اکتسابات سوسائٹی بضمن انضمام معاشی کمیٹی	۶	۱۴	۱۴۴	۴	مصادر	۰	۳	۱۰۰
					۵	ٹکٹ ٹپہ	۰	۵	۱۳
۵	آمدنی از نمائش برآمعاشی کانفرنس	۰	۰	۲۵۰	۶	طباعت	۰	۸	۳۱
۶	آمدنی کتب	۱۰	۱۴	۹	۷	معاشی سروے کے مضامین	۱۰	۱۲	۵۶
					۸	اخراجات سعی معاشیات خیرۂ طیلسانین	۰	۰	۳۰۰
					۹	اخراجات تنخواہ عملہ دفتر	۰	۰	۶۰۱
					۱۰	اخراجات طباعت روداد کانفرنس	۰	۰	۱۵۰
					۱۱	سالانہ کانفرنس	۶	۲	۴۹۴
					۱۲	جلد بندی	۰	۱۱	۲۹
					۱۳	متفرق	۴	۱۵	۸۶
					۱۴	خریدی کتب	۲	۱۲	۴۷۷
						سلک اختتامی سنہ ۵۲ ف	۳	۰	۹۹۲
	میزان	۱	۷	۳۶۵۹		کل میزان	۱	۷	۳۶۵۹

باب ۲

ہندوستان میں معاشی تغیر

ہندوستان میں معاشی تغیر ۔ اب مختصر طور سے معاشی نظام اور تنظیم کے ان بنیادی تغیرات کا تذکرہ مناسب ہے جو گذشتہ سو سال میں ہندوستان کی عام زندگی اور محنت پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ جو تغیرات عمل میں آئے ہیں ان کو ایک حد تک صنعتی انقلاب سے موسوم کیا جاسکتا ہے لیکن یہ تبدیلیاں اپنی نوعیت کے لحاظ سے اس قدر کمل اور انقلابی ثابت نہیں ہوئیں جیسے کہ انگلستان میں "صنعتی انقلاب" کی وجہ ظہور پذیر ہوئیں۔ قدیم نظام کے اثرات دیہی علاقوں میں خصوصاً ابھی تک موجود ہیں۔ ہندوستان کے معاشی نظام کی تبدیلی کو صنعتی انقلاب کے بجائے معاشی تغیر سے موسوم کرنا مناسب ہوگا۔ ہندوستان میں قدیم اور جدید معاشی نظام دوش بدوش پایا جاتا ہے

قدیم معاشی نظام کی خصوصیات ۔ مارسین نے معاشی اعتبار سے دنیا کے ملکوں کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے ۔

(۱) وہ ملک جو قدیم معاشی نظام کے تحت ہیں اور وہاں کوئی صنعتی انقلاب پیدا نہیں ہوا۔ مثلاً ہندوستان، مصر اور مشرقی یورپ کے بعض ممالک ۔

(۲) وہ ملک جنہوں نے جدید معاشی نظام اختیار کر لیا ہے جہاں درحقیقت صنعتی انقلاب رونما ہو

مثلاً انگلستان جرمنی، ممالک متحدہ امریکہ ۔

قدیم معاشی نظام کے ممالک کی خصوصیات حسب ذیل ہیں ۔

(۱) مسابقت اور معاہدے کے بجائے رواج اور قدیم حیثیت کا غلبہ ۔

(۲) ناقص ذرائع حمل ونقل کی وجہ سے دیہات کی خود مکتفی زندگی بسر اور شہروں سے ان کی بیگانگی ۔

(۳) زراعت کی فوقیت دوسرے پیشوں پر اور نتیجتاً دیہی آبادی کا شہری آبادی پر غلبہ

(۴) بازار کے محدود ہونے کی وجہ سے تقسیم عمل کی سادہ حالت ۔

(۵) گھریلو صنعتوں اور دستکاری کا پیمانہ صغیر پر چلایا جانا ۔

(۶) زر کی عدم موجودگی اور تبادلہ اشیاء کا رواج ۔

(۷) اعتبار کا فقدان اور ربا کا رواج ۔

ان کے برخلاف جدید معاشی نظام سے تعلق رکھنے والے ممالک کی حسب ذیل خصوصیات ہوتی ہیں ۔

(۱) معاہدے اور مسابقت کی آزادی ۔

(۲) ترقی یافتہ ذرائع حمل ونقل کی وجہ سے صنعتی دنیا کے مختلف حصوں کے باہمی قریبی تعلقات

(۳) صنعت اور تجارت کی اہمیت اور شہری آبادی کی دیہی آبادی پر غلبہ ۔

(۴) بازار کی وسعت اور مشنری کے استعمال کی وجہ سے تہ بہ تقسیم عمل ۔

(۵) کثیر سرمایہ کے ساتھ پیمانہ کبیر کی صنعت اور بڑے بڑے کارخانوں اور صنعتی شہروں میں مزدوروں کا اجتماع ۔

(۶) تبادلہ اشیاء کے طریقے کے بجائے زر کا نظام ۔

(۷) اعتبار اور بنک کاری کی ترقی اور ربا کی عدم موجودگی ۔

یہ امر لازم نہیں ہے کہ مذکورہ بالا خصوصیات سب کے سب کسی ملک میں پائے جائیں۔ اس امر کا امکان ہے کہ پہلی قسم کے ممالک دوسرے قسم کے ممالک کی خصوصیتیں اختیار کرلیں۔ اور فی الوقت ہندوستان معاشی تغیر کی حالت سے گذر رہا ہے اور دونوں طرح کی خصوصیتیں اس میں پائی جاتی ۔

لیکن ترقی کا رخ دوسرے نظام کی خصوصیات کی طرف بہت زیادہ ہے۔

ہندوستان کی قدیم معاشی تنظیم

دیہات ۔ قدیم زمانہ میں ہندوستان دیہات کا ملک تھا اور آج کل بھی یہی حالت پائی جاتی ہے۔ خود مکتفی گاؤں قدیم ہندوستان کے نظام معیشت کا ایک لازمی عنصر تھا۔ شمالی ہندوستانی گاؤں زیر کاشت رقبوں کا ایک مجموعہ ہوتا ہے۔ جہاں کچھ بنجر زمینات ہوتی بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتی ہیں۔ عموماً اس کا ایک مرکزی حصہ ہوتا ہے۔ جہاں مکانات واقع ہوتے ہیں۔ گاؤں کی زمینات چاروں طرف پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ دیہات میں اکثر درختوں کے جھنڈ کے ساتھ ایک چاوڑی ہوتی ہے جس کو دفتر کہنا چاہیئے۔ یہاں عہدہ داران دیہی اپنا دفتر رکھتے اور کام چلاتے ہیں۔

ہندوستان میں گاؤں کے انتظام کی دو خاص نوعیتیں ہیں۔ (۱) رعیت واری (۲) زمینداری

رعیت واری گاؤں میں ہر کاشتکار زمین کے علحدہ حصہ کا مالک ہوتا ہے۔ وہ براہ راست حکومت کو مالگذاری ادا کرتا ہے۔ (بمبئی، مدراس، اور برار میں یہ طریقہ رائج ہے) مملکت آصفیہ میں بھی رعیت واری طریقہ رائج ہے۔ دوسرا زمینداری طریق جو صوبہ متحدہ اور پنجاب میں رائج ہے۔ گاؤں کی زمین کا مالک زمیندار ہوا کرتا ہے یا ایسے شرکار ہوتے ہیں جو مشترکہ طور پر مالگذاری کی ادائی کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ گاؤں خواہ کسی نوعیت کا ہو قدیم زمانہ میں خود مکتفی ہوتا تھا۔ اس کی زراعتی اور حرفتی ضروریات کے لئے محنت، سرمایہ اور مہارت جس چیز کی بھی ضرورت ہوتی خود اسی کے حدود میں دستیاب ہو جاتی۔ باشندگان دیہات کے تین طبقے ہیں۔

۱۔ **کاشتکار** ۔ جن کی دیہی آبادی میں کثرت ہوتی ہے۔ دو گروہوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں زمیندار اور پٹہ دار۔ ان کی زمینات کے رقبے عموماً چھوٹے ہوتے ہیں۔ اور کاشتکار اپنے ارکان خاندان کی مدد سے کاشت کرتے ہیں۔ وہ خطرات برداشت کرتے ہیں۔ یا تو خود اپنا ذاتی سرمایہ استعمال کرتے ہیں یا گاؤں کے ساہوکار سے قرضہ لیتے ہیں اور کبھی کبھی نمک اور دوسری اشیا

ما یحتاج اور آسائشی چیزوں کے لئے جو گاؤں میں نہیں ملتی کسی قریبی بازار میں اپنی پیداوار سے تبادلہ کرتے ہیں۔

(۲) **دیہی عہدہ دار**۔ ہر گاؤں کے عہدہ دار ہوتے ہیں۔ اور ہر گاؤں جس طرح سابق میں انتظام مملکت کی اکائی ہوا کرتا تھا۔ اب بھی ہے۔ گاؤں کا اعلیٰ حاکم پٹیل یا نمبردار ہوتا ہے۔ مملکت آصفیہ میں پٹیل کا لفظ رائج ہے یہ موروثی ہوتا ہے اور گاؤں کے امن وامان کا ذمہ دار ہے۔ مالگزاری بھی وصول کرتا ہے۔ اس کو خدمات کے صلہ میں وطن داری زمین حاصل رہتی ہے۔ اس کے سوا گاؤں میں کلکرنی یا پٹواری ہوتا ہے۔ مملکت آصفیہ میں پٹواری کا لفظ مستعمل ہے۔ یہ گاؤں کے دستاویزات اور حسابات کی حفاظت کرتا اور ان کے تمام اخراجات کا داخلہ رکھتا ہے۔ ان دو عہدہ داران دیہی کے علاوہ گاؤں میں چوکیدار بھی ہوتا ہے۔ جو دیہی نگرانی کرتا ہے مجرموں کو گرفتار اور پولیس کی امداد کرتا ہے۔ گاؤں میں ہرکارہ بھی ہوتا ہے قدیم زمانے میں پنچایت جیسے گاؤں کے بزرگوں کی ایک جماعت بھی ہوتی تھی جو تنازعات کا فیصلہ کرتی اور عام طور سے اہل دیہات کو متحد رکھتی تھی۔

(۳) **گاؤں کے دستکار**۔ بڑھئی، لوہار، کمہار، موچی، ساہوکار (جو عام طور سے غلہ فروش بنیا بھی ہوتا ہے) سنار اور تیلی ہر گاؤں میں ہوتے ہیں۔ دستکار گاؤں کے باشندوں کی خدمت انجام دینے کے لئے موروثی طور سے ذمہ دار ہوتے ہیں ان کو گاؤں میں مکانات دیئے جاتے اور اپنی خدمات کا معاوضہ زمین یا غلہ کی صورت میں سالانہ پابندی کے ساتھ پاتے ہیں۔ دستکار جو اشیاء تیار کرتے ہیں چونکہ ان کے لئے بازار محدود ہوتا ہے اس لئے تقسیم عمل بہت ناکمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیہی صنعت ہنوز بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔

قدیم دیہی زندگی۔ ہر گاؤں تقریباً خودکفتی اور آزاد تھا۔ صرف نمک اور چند اشیائے تعیش گاؤں کے بیوپاری یا بیرونی سوداگروں سے خریدے جاتے تھے۔ بیرونی دنیا سے اس کے تعلقات منقطع تھے اور باہمی تبادلہ صرف ان ہی اشیاء تک محدود ہوتا تھا۔ جن کو آدمی یا بارکش جانور لے جاسکتے تھے۔ اچھی سڑکیں بڑی تعداد میں مفقود تھیں۔ البتہ شیر شاہ کے دور کی

نے ٹیکس بنانے کی جو ابتدا کی وہ مابعد دور میں بھی باقاعدگی کے ساتھ جاری رہی۔ سندھ اور گنگا کے صرف چند قدرتی دریائی راستے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ داخلی تجارت کافی طور سے ترقی نہ کرسکی۔ ہر ایک گاؤں کو اپنی احتیاجات کا خود کفیل ہونا پڑتا تھا معمولی حالات میں زندگی بسر ہو جاتی تھی۔ لیکن قحط کے زمانہ میں سخت مشکل کا سامنا ہوتا تھا۔ زر کا کم استعمال تھا اور اشیاء کا اشیاء سے تبادلہ ہوا کرتا تھا چونکہ عام طور پر غلہ کی ہی مانگ رہتی تھی۔ اس لئے یہی معیار قدر شمار ہوتا تھا۔ گاؤں کے دستکاروں کی اُجرت کا تعین بہت پیچیدہ تھا لیکن عمل در آمد کی بنا پر جو اجرت ادا کی جاتی تھی اس کو چار و ناچار قبول کرنا ہی پڑتا تھا۔ مسابقت کے مقابلہ میں عمل در آمد پر ہی معاشی تعلقات کا مدار تھا۔ مشترکہ خاندانی زندگی، ذات پات کے طریقے اور اہل دیہات کی قدامت پرستی کی وجہ سے مزدوروں کا نقل وطن ممکن نہ تھا۔ گاؤں میں موجودہ زمانہ سے زیادہ اُس وقت اتحاد اور یکجہتی پائی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر گاؤں کے تالاب، نادر اور راستے خود گاؤں والے ہی مفت تعمیر کر دیتے تھے۔ اس زمانہ میں اس اجتماعی زندگی کی کمزوری بہت تشویش انگیز ہے۔ رسوم۔ رواج پیدائشی حیثیت ہی کو گاؤں کی زندگی میں حاکمانہ اہمیت حاصل تھی۔ رسوم رواج سے ہندوستان کے قدیم معاشی نظام میں لگان اجرت اور قیمت کا تعین عمل میں آتا تھا۔ اور رواج میں تبدیلی ناممکن تھی۔ کسی خاص ذات اور خاندان میں پیدا ہونے کے بعد سماج میں اس کی حیثیت متعین ہو جاتی تھی اور تعلقات کی آزادی باقی نہیں رہتی تھی۔

دیہاتی نظام زندگی میں تغیر۔ انتظامی مرکزیت اور مغربی تہذیب کے اثرات سے انفرادی آزادی کے تخیل کی وسعت پذیری اور ذرائع حمل ونقل میں انقلاب کی وجہ سے دیہات کی معاشی زندگی کا نظام بدل رہا ہے۔ مالگذاری پولیس اور عدالت کی جدید انتظامی مرکزیت نے قدیم گاؤں کی خود مختارانہ حکومت کو کمزور کر دیا ہے۔ مغربی انفرادیت کے اثر سے ہندوستانی دیہات میں قدیم اجتماعی احساسات زائل ہو رہے ہیں۔ ریلوں کا جال بچھ جانے سڑکوں کی تعمیر اور موٹربس کے جاری ہونے سے ذرائع حمل ونقل میں انقلاب پیدا ہوگیا۔ اور

شہروں سے گاؤں کی بیگانگی باقی نہ رہی۔

تغیر پذیر دیہات کی بنیادی خصوصیتیں۔

(۱) سب سے پہلے گاؤں کی قدیم خود مکتفی زندگی کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب اہل دیہات، کپڑے، گیاس کا تیل، الومنیم کے برتن، شکر، چائے، دیا سلائی، چھتری، قینچیاں، سینے کی مشین، وغیرہ باہر سے خریدتے ہیں اور ان کے معاوضہ میں مختلف زرعی پیداواریں بازار کے لئے مہیا کرتے ہیں۔ جس سے بیرونی دنیا میں ان اجناس کا تبادلہ عمل میں آتا ہے۔

(۲) قحط کی مصیبت کم ہو گئی ہے کیونکہ دور دراز مقامات سے غلہ کی درآمد میں سہولتیں مہیا ہو گئیں ہیں۔ قحط پہلے غذا اور زر دونوں کا ہوا کرتا تھا۔ اب قحط قلت زر کی وجہ سے واقع ہوتا ہے اور قحط زدہ علاقوں میں عارضی بے روزگاری پیدا ہو جاتی ہے لیکن فاقہ کشی کی نوبت نہیں آتی ممکن ہے کہ کسی سال کسی خاص گاؤں میں کوئی پیداوار نہ ہو لیکن دوسرے مقامات سے درآمد کے ذریعہ اس کی تلافی کی جا سکتی ہے۔ بنگال کے قحط کو ایک استثنائی صورت خیال کرنا چاہیئے۔

(۳) اشیاء سے اشیاء کے تبادلہ کے بجائے زر کا نظام رواج پا گیا ہے کیونکہ بیرونی دنیا سے تجارت وسعت پا گئی ہے۔ اور جو لوگ گاؤں سے باہر تلاش روزگار میں جاتے ہیں وہ گھر پر کے لئے نقد رقم بھیجا کرتے ہیں۔ مالگزاری اور دوسرے محاصل، لگان، سود اور اجرت کو اب بڑی حد تک نقد ادا کرنا پڑتا ہے۔ دستکاروں وغیرہ کی خدمات کے معاوضہ میں غلہ دینے کا قدیم طریقہ اب بھی گو کسی قدر باقی ہے۔ لیکن اس کی اہمیت بڑی حد تک گھٹ گئی ہے۔

(۴) اہل دیہات کی بود و باش کا قدیم غیر تبدیل پذیر طریقہ اب بدل رہا ہے۔ اکثر اپنی آمدنی میں توفیر کی غرض سے شہروں میں نقل وطن کرنے لگے ہیں۔ نقل وطن معاشی ضرورت کی خاطر ہوتا ہے اور ترقی یافتہ ذرائع حمل و نقل کی وجہ سے سہولتیں حاصل ہو گئی ہیں۔

(۵) مسابقت اور معاہدہ کی وسعت سے اب عمل درآمد اور پیدائشی حیثیت کی اہمیت تدریجاً کم ہو رہی ہے۔ ذات پات اور مشترکہ خاندانی زندگی کے طریقے کسی قدر کمزور ہو چکے ہیں۔ لگان،

قیمتیں اور اجرتیں مسابقت کے زیر اثر آتی جا رہی ہیں۔ پٹہ داروں کے مابین سخت مسابقت کی وجہ تحفظ مفاد کی خاطر قانون پٹہ داران کی ضرورت داعی ہوئی۔ مغربی تہذیب، زر کے استعمال اور نقل و حمل کی ترقی نے اس تبدیلی میں مزید سرعت پیدا کر دی ہے۔

زراعت اور دیہی دستکاریوں کے تغیرات ۔ (۱) زراعت کا نظام تجارتی بنیاد پر قائم ہو گیا اور دیہات سارے ملک سے وابستہ ہو گئے۔ ہندوستان کی زرعی پیداوار مثلاً کپاس، جوٹ، روغنی تخم، گیہوں اور چاولوں کو دنیا کے بازاروں میں جگہ حاصل ہے۔ سنہ ۱۸۶۹ء میں نہر سوئز کے افتتاح کی وجہ سے زرعی پیداوار کے بازار تمام دنیا میں قائم ہو گئے۔ مختلف فصلوں کو مختلف علاقوں سے مخصوص کرنے کا رجحان بھی پیدا ہو رہا ہے۔ مثلاً بمبئی میں کپاس، پنجاب میں گیہوں اور بنگال میں جوٹ۔ زراعت میں تجارتی مفاد پیش نظر ہو جانے کے باعث غیر غذائی اشیا مثلاً کپاس اور جوٹ غذائی اشیا کی جگہ حاصل کر رہے ہیں۔

بندرگاہوں اور اندرونی تجارتی مرکزوں میں ایک جدید اور پیچیدہ تجارتی تنظیم وجود میں آ رہی ہے۔ جو درمیانی افراد، تھوک فروش اور برآمد کرنے والے تاجروں کے قابو میں ہے۔ زمین کی قوت نمو پر بہت بار پڑ چکا ہے۔ اور زمینات تیزی کے ساتھ تقسیم ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن قدیم زراعتی طریقہ اب تک برابر جاری ہے۔

(۲) دیہات کی دستکاریاں بھی تغیر کی حالت سے گذر رہی ہیں۔ مشین کی بنی ہوئی سستی اشیا، کپڑے، المونیم کے برتن اور گیاس کے تیل نے، جولاہوں، کمہاروں اور تیلیوں کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اب دیہات کو تمام دستکاروں کی احتیاج ناگزیر نہیں رہی ہے۔ بڑھئی اور سناروں نے قصبات میں توطن اختیار کر کے اپنی حالت درست کر لی ہے۔ جن دستکاروں نے ایسا نہیں کیا وہ مشکلات سے دوچار ہو رہے ہیں۔ بعض پیشہ وروں نے اپنے آبائی پیشے ترک کر دیئے۔ اور گاؤں کے مزدوروں کی صف میں شامل ہو گئے یا قصبات میں نقل مقام کر گئے۔

قصبات اور صنعتیں قدیم معاشی نظام میں ۔ اگرچہ کہ برطانوی دور حکومت سے

قبل ہندوستانی آبادی کی اکثریت دیہات میں آباد تھی لیکن اس کے ساتھ قصبات کی ترقی کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر دیا گیا تھا۔ بعض شہر مثلاً اجمیر، بنارس، اور الہ آباد زیارت گاہیں تھیں۔ دہلی، لکھنؤ، گلبرگہ بیدر، بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈہ، بیجانگر، اورنگ آباد وغیرہ سلطنتوں کے پایہ تخت یا صوبوں کے مستقر تھے۔ مرزاپور اور سورت تجارتی مراکز تھے۔ شہری صنعت زیادہ ترقی یافتہ حالت میں تھی۔ دیہی صنعت کے مقابلہ میں یہاں تقسیم عمل کافی ترقی یافتہ ہو چکی تھی۔ حرفتی پیشہ وروں کے جتھوں نے اپنی حالت منظم کر لی تھی۔ زر اور ہنڈیوں کا استعمال عام طور پر مروج تھا۔ دور گذشتہ میں ہندوستان اس زمانے کے معیار کے مطابق نہ صرف ایک زرعی ملک بلکہ ایک عظیم صنعتی ملک بھی تھا۔ قدیم زمانے سے ہندوستان کی ہنرمندی اور دستکاری کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ پارچہ بافی اس ملک کی گویا قومی صنعت تھی۔ روئی کی صنعت کے اہم مراکز ڈھاکہ، لکھنؤ احمد آباد، ناگپور، نانڈیڑ اور مدورا تھے۔ دیہات کی صنعتیں اسلحہ سازی، ڈھال، مینا کاری کے برتن، جواہرات سونا۔ چاندی کے تار۔ سنگ تراشی، دباغت اور چمڑے کا کام کاغذ سازی اور عطر سازی کی بھی صنعتیں موجود تھیں۔ جہاز سازی ترقی یافتہ حالت میں تھی اور لوہے کی صنعت کو بڑا عروج حاصل تھا۔

قدیم صنعتوں کے زوال کے اسباب۔ مندرجۂ ذیل اسباب ہندوستانی صنعتوں کے زوال کے باعث ہوئے۔

(۱) قومی سلطنتوں کا مفقود ہو جانا جس کی وجہ سے صدہا صنعتیں اہل دربار اور امراء کی سرپرستی سے محروم ہو گئیں۔ (۲) بیرونی اثرات کا مخالفانہ عمل۔ برطانوی حکومت کے قیام سے بالواسطہ قدیم حرفتی جتھے کمزور ہو گئے۔ اہل ملک بالخصوص تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کا مذاق بدل گیا۔ انہوں نے حکمران قوم کے معیار کو اختیار کر لیا۔ اور مغربی مصنوعات زیادہ پسندیدہ قرار پاگئیں۔ (۳) ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی پالیسیاں کا طرز عمل۔ انیسویں صدی کے وسط میں قبل اس کے برطانیہ عظمیٰ میں آزاد تجارتی مسلک اختیار کیا گیا۔ قدیم نوآبادیاتی مسلک کے تحت ہندوستانی صنعتیں انگریزی صنعتوں کے تابع

کی گئیں اور برطانیہ عظمیٰ میں اس پر گراں محاصل عاید کئے گئے۔ (۴) مشین سے تیار کی ہوئی مصنوعات سے مسابقت۔ ہندوستان کی قدیم صنعتوں کے زوال کی ایک اہم وجہ مشین کا بنا ہوا مال ہے۔ یہ مال برطانیہ عظمیٰ اور دوسرے ممالک سے درآمد ہونے لگا۔ ہندوستان میں ریل اور سڑکوں کی وسعت کی وجہ سے بھی یہ مسابقت تیز ہوگئی۔ (۵) تجارتی معاملات میں حکومت ہند کی عدم مداخلت۔ جنگ عظیم ۱۸-۱۹۱۴ء کے آغاز تک حکومت ہند کی پالیسی یہ تھی کہ صنعتوں کو اس کے حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ ریلوں کی وجہ سے ایک طرف بیرونی مصنوعات کی درآمد میں اور دوسری طرف خام پیداواروں کی برآمد میں سہولتیں بہم پہنچ گئیں۔ ان اسباب کی وجہ سے ملک کی معاشی زندگی پر دوررس اثرات مترتب ہوئے۔ ملکی صنعتوں کے زوال کی وجہ سے دیہات کے توطن میں وسعت پیدا ہوگئی۔ تقریباً تین چوتھائی لوگوں کی زندگی کا انحصار زراعت پر رہ گیا۔ پہلے شاید ۶۰ فی صدی آبادی کا انحصار زراعت پر تھا اور ۴۰ فیصدی صنعت و حرفت کے ذریعہ زندگی بسر کرتے تھے۔ گو ملک کی بیرونی تجارت میں اضافہ ہوا لیکن برآمد زیادہ تر زرعی پیداوار اور درآمد زیادہ تر مصنوعات پر مشتمل تھی اس طرح ملک کی قومی معاشی زندگی میں ترقی کے لئے صرف ایک ذریعہ رہ گیا۔

صنعت و حرفت میں تغیرات۔ ۱۸۵۰ء ہی سے جبکہ ہندوستان کی صنعتی حالت بہت ہی پست ہو چکی تھی۔ مغربی طرز کی جدید منظم صنعتوں کی ترقی کا سلسلہ آغاز ہوا۔ اس وقت سے انگریز تاجر اور سرمایہ داروں نے چائے کافی اور نیل کی کاشت شروع کی۔ اس سے ہندوستانی خصوصاً بمبئی کی تجارت پیشہ جماعت کو اس قسم کے کاروبار شروع کرنے کی ترغیب ہوئی بمبئی والوں کو اس معاملہ میں ہندوستان کی رہنمائی کا شرف حاصل ہے۔ اس طرح بمبئی کو ہندوستان کے صنعتی صدر مقام کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ انیسویں صدی کے وسط میں یہاں پارچہ بافی کے کارخانے قائم ہوئے۔ اسی زمانہ میں جوٹ کے کارخانے کلکتہ کے اطراف و جوانب میں قائم ہوئے لیکن سرمایہ اور ہمت اہل یورپ کی تھی۔ اس کے بعد معدنی اور دوسری مختلف صنعتوں مثلاً روئی اوٹنے اور دابنے

لوہے اور فولاد کے ڈھالنے، چاول پیسنے اور روغن نکالنے کے کارخانوں میں صنعتی انقلاب رونما ہو ابتدائی ترقی کی رفتار بہت سست رہی۔ سودیشی تحریک (جس کی ابتدا ۱۹۰۵ء سے ہوئی) اور ۱۹۱۴ء-۱۸ء کی جنگ عظیم صنعتی ترقی کی موجب ہوئی۔ ۱۹۲۳ء میں امتیازی حفاظتی پالیسی مزید ترقی کی محرک ثابت ہوئی۔ اگرچہ کہ اب تک صرف ۲ فی صد آبادی نے منظم صنعتوں کو اپنے پیشہ کے طور پر اختیار کیا ہے۔

متذکرۂ بالا معاشی تغیر سے قصبات کی تعداد میں کسی حد تک اضافہ ہوا ہے ریلوے، جہازرانی اور جدید صنعتوں کی نشوونما مثلاً ٹاٹا کے آہنی اور فولادی کارخانے کے باعث جمشید پور وغیرہ نئے قصبے آباد ہو گئے۔ لیکن صنعتی انقلاب کے بعد برطانیہ عظمیٰ میں جس تیزی سے شہریت کو ترقی ہوئی اس سے مقابلہ کیا جائے تو ہندوستان میں رفتار ترقی بہت سست ہے۔ شہری آبادی ہندوستان میں اب بھی مجموعی آبادی کا صرف گیارہ فی صدی ہے۔ تجارتی راستوں کے بدل جانے اور دستکاری کے زوال کی وجہ سے چند قصبات کو زوال ہوا۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کی ترقی کے ضروری ذرائع اپنے اثرات کو برابر محسوس کر رہے ہیں۔

خلاصہ ۔ ہندوستان ایک معاشی تغیر کے دور سے گذر رہا ہے۔ اگر ایک طرف ہم بعض شہروں مثلاً بمبئی اور کلکتہ کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ وہ یورپ کے اکثر ترقی یافتہ ممالک کی معاشی حالت کی سطح پر پہنچ رہے ہیں اور دوسری طرف وسیع دیہی رقبوں میں قدیم نظام کی جھلک اب تک باقی ہے گو اب یہ کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ عام رجحان یہ ہے کہ یہاں بھی ان ہی ممالک کے حالات پیدا کئے جائیں جہاں صنعتی انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ ہندوستان کی موجودہ صنعتی ترقی میں دوسرے ممالک کی طرح بعض نقائص بھی پائے جاتے ہیں مثلاً کارخانوں کے شہروں میں کثرت آبادی، گھریلو صنعتوں کا زوال، عورتوں اور بچوں سے محنت کا استحصال ناجائز لیکن ہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ یہ نقائص ناگزیر ہیں۔ بلکہ قانون سازی اور دوسرے طریقوں سے ان کا انسداد ممکن ہے۔

باب ۳

زراعت

ہندوستان میں زراعت کی اہمیت ۔ ہندوستان کی تقریباً تین چوتھائی آبادی کا ذریعہ معیشت زراعت ہے ۔ زراعت ہی اس ملک کا گویا سب سے بڑا قومی پیشہ ہے ۔ لیکن قلیل پیداوار ، منتشر رقبہ ، کاشتکار کی مقروضیت اور مارکٹنگ کے نقائص کے اعتبار سے اس پیشہ کی حالت نہایت پست ہے ۔

زرعی پیداوار

برطانوی ہند میں مختلف فصلوں کے رقبہ واری اعداد و شمار

دیہی کاغذات بابتہ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء کے مطابق برطانوی ہند کا کل رقبہ ۵۱ کروڑ دس لاکھ ایکڑ ہے ۔ جنگلات کا رقبہ ۶ کروڑ ۸۰ لاکھ ایکڑ مجموعی رقبہ کا ۱۳٫۲ فی صدی ہے ۔

ناقابل کاشت رقبہ ۸ کروڑ ۹۰ لاکھ ایکڑ مجموعی رقبہ کا ۱۷٫۴ فیصدی ۔

مزروعہ افتادہ رقبہ ۹ کروڑ ۷۰ لاکھ ایکڑ مجموعی رقبہ کا ۱۹ فیصدی ۔

بنجر مزروعہ رقبہ ۔ ۴ کروڑ ۷۰ لاکھ ایکڑ مجموعی رقبہ کا ۹٫۲ فیصدی ۔

زیر کاشت رقبہ ۔ ۲۰ کروڑ ۹۰ لاکھ ایکڑ مجموعی رقبہ کا ۴۱ فیصدی

مجموعی مزروعہ رقبہ ۔ ۲۴ کروڑ ۴۰ لاکھ ایکڑ (اس میں آبپاشی کا رقبہ ۵ کروڑ ۵۰ لاکھ ایکڑ ہے)

مملکت آصفیہ میں علاقۂ دیوانی کا مجموعہ رقبہ ۳ کروڑ ۱۳ لاکھ ایکڑ یا مملکت کے مجموعی رقبہ کا ۵۹،۲۴ فیصد ہے ۔ باقی ۲ کروڑ ۱۵ لاکھ ایکڑ علاقہ صرف خاص مبارک پائیگاہوں اور جاگیرات وغیرہ پر مشتمل ہے ۔

سررشتۂ اعداد و شمار کے سالنامہ بابتہ سنہ ۱۹۳۹ء کے مطابق مملکت آصفیہ میں حسب ذیل رقبہ جات ہیں

جنگلات کا رقبہ ۶۳ لاکھ ۹۹ ہزار ایکڑ

ناقابل کاشت رقبہ ۹۹ لاکھ ۵۲ ہزار ایکڑ

مزروعہ افتادہ رقبہ ۱۸ لاکھ ۳۶ ہزار ایکڑ

غیر مزروعہ رقبہ ۳۲ لاکھ ۸۶ ہزار ایکڑ

زیر کاشت رقبہ ۲ کروڑ ۷۰ لاکھ ایکڑ

ذیل کے جدول سے برطانوی ہند میں سنہ ۱۹۰۱-۲ء کے مقابلہ میں سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء کی فصلوں کی اضافی اہمیت واضح کی گئی ہے ۔

غذائی اشیاء	سنہ ۱۹۰۱-۲ء بحساب ۱۰ لاکھ ایکڑ	مجموعی زیر کاشت رقبہ فی صد مقابلہ	سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء بحساب ۱۰ لاکھ ایکڑ	مجموعی زیر کاشت رقبہ فی صد مقابلہ
چاول	۷۰،۰۰	۳۱،۸	۷۰،۱	۲۸،۶
گیہوں	۱۸،۶۱	۸،۴	۲۶،۱۳	۱۰،۷
جو	۶،۲۲	۲،۸	۶،۱	۲،۵
جوار	۲۱،۸۲	۹،۸	۲۱،۶۸	۸،۹
باجرہ	۱۳،۲۰	۵،۹	۱۳،۳۶	۵،۴

غذائی اشیاء	سنہ ۱۹۰۱-۰۲ء بحساب ۱۰ لاکھ ایکڑ	مجموعی زیر کاشت رقبہ فیصد مقابلہ	سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء بحساب ۱۰ لاکھ ایکڑ	مجموعی زیر کاشت رقبہ فی صد مقابلہ
راگی	۳٫۷۵	۱٫۷	۳٫۴۱	۱٫۴
مکائی	۶٫۲۰	۲٫۸	۵٫۷۷	۲٫۳
چنا	۹٫۷۸	۴٫۴	۱۱٫۶۹	۴٫۸
دوسرے غلہ اور دالیں	۲۰٫۳۵	۱۲٫۴	۲۸٫۸۲	۱۱٫۸
میزان	۱۷۷٫۰۰	۸۰٫۰	۱۸۷٫۰۵	۷۶٫۴
ترکاریاں میوے مسالے اور متفرق غذائی فصلیں	۸٫۰۳	۳٫۷	۶٫۷۷	۲٫۹
نیشکر	۲٫۶۰	۱٫۲	۳٫۶۳	۱٫۵
مجموعی غذائی اشیاء	۱۸۷٫۶۳	۸۵٫۰	۱۹۷٫۴۵	۸۰٫۷
غیر غذائی اشیاء				
السی	۲٫۲۷	۱٫۰	۲٫۴۴	۱٫۰
تل	۳٫۷۵	۱٫۷	۲٫۲	٫۹
رائی اور سرسوں	۲٫۸۸	۱٫۳	۳٫۵۴	۱٫۴
مونگ پھلی	..	—	۵٫۵۴	۲٫۲

روغن دار اشیاء	سنہ ۱۹۰۱-۰۲ء بحساب ۱۰ لاکھ ایکڑ	مجموعی زیر کاشت رقبہ فیصد مقابلہ	سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء بحساب ۱۰ لاکھ ایکڑ	مجموعی زیر کاشت رقبہ فیصد مقابلہ
ناریل	—	—	٫۶۸	٫۳
ارنڈی	—	—	٫۴۰	٫۲
دوسرے روغن دار تخم	۲٫۰۷	۱٫۴	۱٫۴۹	٫۶
میزان	۱۱٫۹۷	۵٫۴	۱۶٫۲۹	۶٫۶
ریشے دار پودے				
کپاس	۱۰٫۳۰	۴٫۷	۱۳٫۳۴	۵٫۵
جوٹ	۲٫۲۸	۱٫۰	۲٫۱۲	۱٫۳
دوسرے ریشے	٫۵۶	٫۲	٫۰۷	٫۳
میزان	۱۳٫۱۴	۵٫۹	۱۷٫۲۳	۷٫۱
دیگر غیر غذائی اشیاء				
نیل	٫۷۹	٫۴	٫۰۴	٫۰۲
افیون	٫۶۱	٫۳	٫۰۱	٫۰۰۳
کافی	٫۱۲	٫۰۵	٫۱۰	٫۰۴
چائے	٫۴۹	٫۳	٫۷۴	٫۳۰
تمباکو	٫۹۵	٫۴۵	۱٫۱۸	٫۴۸
چارہ کی فصلیں	۲٫۹۴	۱٫۴	۱۰٫۴۷	۴٫۲۸

	سنہ ۲-۱۹۰۱ء بحساب ۱۰ لاکھ ایکڑ	مجموعی زیر کاشت رقبہ فی صد مقابلہ	سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء بحساب ۱۰ لاکھ ایکڑ	مجموعی زیر کاشت رقبہ فی صد مقابلہ
متفرق اشیاء	۱٫۷۱	٫۸	۱٫۰۶	٫۴۴
میزان	۳۲٫۷۲	۱۵٫۰	۴۷٫۱۲	۱۹٫۳۰
مجموعی مزروعہ رقبہ (بشمول اس رقبہ کے جس پر ایک سے زیادہ مرتبہ کاشت ہوئی)	۲۲۰٫۳۵	۱۰۰	۲۴۴٫۵۷	۱۰۰

مندرجہ بالا جدول سے ہندوستان کی وسیع پیداوار کے علاوہ اس امر کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ غذائی اشیاء کو غیر غذائی اشیاء پر اہمیت حاصل ہے ملک میں جو خوراک صرف ہوتی ہے وہ سب زرعی پیداوار سے مہیا ہوتی ہے اس کے علاوہ کثیر مقدار میں غیر غذائی پیداوار مثلاً روئی، جوٹ اور روغنی تخم بڑی اور اہم مصنوعات کے کام آتی ہے۔ یہ ہماری خارجی تجارت کا بڑا ذریعہ ہے۔ ہندوستان میں کاشت وسیع کی ترقی کے لئے جو بھی گنجایش ہے اس سے کہیں زیادہ کاشت عمیق کے لئے گنجایش ہے

ہندوستان کی اہم فصلیں۔

(الف) غذائی اشیاء

(۱) چاول۔ ہندوستان کی فصلوں میں چاول سب سے زیادہ ممتاز پیداوار ہے۔ اور آبادی کے بڑے حصے کی غذا کا جزو اعظم ہے۔ کل مزروعہ زمین کے ۲۹ فیصدی سے کچھ زیادہ رقبہ پر اس کی کاشت

ہوتی ہے۔ چانول ہندوستان میں مرطوب مقامات میں زیادہ کاشت کیا جاتا ہے۔ بنگال، بہار، اڑیسہ، اور مدراس چانول کی پیداوار کے خاص صوبہ جات ہیں۔ صوبۂ متحدہ، صوبہ متوسط، آسام اور بمبئی میں بھی کافی مقدار میں چانول پیدا ہوتا ہے۔ زیادہ تر موسم سرما میں چانول کی کاشت ہوتی اور دسمبر و جنوری میں اس کی فصل کٹتی ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں دھان کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں اس زمانہ میں شاہی زراعتی ریسرچ کونسل چانول کی تحقیقات میں خاص طور پر مصروف ہے۔

مملکت آصفیہ میں چانول کی کاشت سمت تلنگانہ میں ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء میں آٹھ لاکھ ۶۱ ہزار ایکڑ رقبہ پر اس کی کاشت کی گئی اور ۳ لاکھ ۸۲ ہزار ٹن کی پیداوار ہوئی۔ کل ہندوستان میں چانول کی پیداوار کے لحاظ سے حیدرآباد کا درجہ چھٹواں ہے۔

(۲) **گیہوں**۔ رقبہ کے لحاظ سے چانول کے بعد گیہوں کو اہمیت حاصل ہے۔ کل مزروعہ رقبہ کے گیارہ فی صدی حصہ پر گیہوں کی کاشت ہوتی ہے۔ یہ ربیع کی خاص فصل ہے۔ اکتوبر سے دسمبر تک اس کی تخم ریزی ہوتی ہے اور مارچ سے مئی تک اس کی فصل کاٹی جاتی ہے۔ پنجاب صوبۂ متحدہ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کے باشندوں کے غذا کا دارومدار گیہوں پر ہے۔ دوسرے صوبوں میں اس کی کاشت برآمد کی خاطر کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں گیہوں کی پیداوار کے خاص مقامات پنجاب، صوبۂ متحدہ، صوبۂ متوسط، اور برار وسط ہند کی ریاستیں، بمبئی، بہار اور اڑیسہ ہیں۔ پنجاب اور صوبۂ متحدہ میں جو رقبہ گیہوں کی کاشت کے لئے مخصوص ہے وہ مجموعی رقبہ کا دو تہائی حصہ ہے۔ جنگ عظیم سے قبل ہندوستانی گیہوں کثیر مقدار میں برآمد کیا جاتا تھا۔ لیکن خود ہندوستان میں گیہوں کھانے والوں کی آبادی میں اضافہ ہونے کی وجہ اس کی برآمد گھٹ گئی ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہندوستانی گیہوں کی تامین کے لئے بیرونی گیہوں پر گراں محصول عاید کردیا گیا ہے۔ کیوں کہ ارزاں بیرونی گیہوں خاص کر آسٹریلیا کا ہندوستانی بازاروں میں بکثرت درآمد ہونے لگا تھا۔ سندھ میں سکھر براج اور پنجاب کی نہری نوآبادیوں کی ترقی سے گیہوں کے رقبہ میں اضافہ ہوا ہے۔

مملکت آصفیہ میں مرہٹواری اور کرناٹک کے اضلاع کے باشندوں کی خاص غذا گیہوں ہی ہے۔

سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں گیارہ لاکھ ۸۵ ہزار رقبہ پر اس کی کاشت کی گئی۔ اس کی پیداوار ایک لاکھ ۴۲ ہزار ٹن رہی۔ کل ہندوستان میں گیہوں کی پیداوار کے لحاظ سے حیدرآباد کا نواں درجہ ہے۔

(۳) جو ۔ خاص طور پر صوبہ متحدہ بہار اور پنجاب میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ انسان اور جانور دونوں کی غذا ہے۔ ملک سرکار عالی میں اس کا زیر کاشت رقبہ ۱۱ ہزار ایکڑ ہے سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء میں اس کی پیداوار دو ہزار ٹن رہی۔ بلدۂ حیدرآباد کے اطراف اور فوجی رقبوں میں اس کی کاشت کی جاتی ہے۔

(۴) جوار اور باجرہ ۔ یہ دونوں اجناس مدراس اور بمبی کے ملحقہ علاقوں کے غریب باشندوں کی اہم غذا ہیں۔ ان سے مویشیوں کے لئے اچھا چارہ ملتا ہے۔ جوار اور باجرہ کی زیادہ تر بارانی زمین پر کاشت ہوتی ہے۔ باجرا خریف کی پیداوار ہے۔ جوار خریف اور ربیع دونوں موسموں میں بوئی جاتی ہے۔ جوار اور باجرہ کی برآمد نہیں ہوتی۔

مملکت آصفیہ میں جوار کا زیر کاشت رقبہ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۸۷ لاکھ ۳۳ ہزار ایکڑ ہے جو کل ہندوستان میں سب سے بڑا رقبہ ہے۔ اور باجرہ کا رقبہ ۱۶ لاکھ ۱۹ ہزار ایکڑ تھا۔ ان ہر دو اغذیہ کی پیداوار علی الترتیب سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء میں ۱۲ لاکھ ۴۲ ہزار ٹن اور ایک لاکھ ۱۰ ہزار ٹن رہی۔

(۵) دالیں ۔ تمام ہندوستان میں بوئی جاتی ہیں اور لوگوں کی عام غذا ہے۔ صوبہ متحدہ، پنجاب، بمبی، صوبہ متوسط، اور بنگال میں خاص طور پر ان کی کاشت کی جاتی ہے۔ دالوں میں خاص طور پر چنے کی بہت اہمیت ہے۔ صوبہ متحدہ میں مجموعی رقبہ کا نصف حصہ چنے کی کاشت کے لئے مختص ہے۔ داخلی طلب زیادہ ہونے کی وجہ سے بہت کم مقدار میں اس کی برآمد ہوتی ہے۔ مملکت آصفیہ میں چنے کا زیر کاشت رقبہ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء ۵ لاکھ ۴۴ ہزار ایکڑ تھا اور سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء میں اس کی پیداوار ایک لاکھ ۸۴ ہزار ٹن رہی۔

(۶) مرکالی کا زیر کاشت رقبہ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۵ لاکھ ۷۹ ہزار ایکڑ ہے۔ اور اس کی پیداوار ۹۶ ہزار ٹن رہی۔

(۷) پھل، ترکاریاں اور مسالے :۔ ہندوستان میں میوہ کی کاشت ترقی یافتہ

حالت میں نہیں ہے۔ کیونکہ لوگوں کی غربت کی وجہ سے داخلی طلب بہت کم ہے اور اس کی برآمد کے لئے ذرائع حمل و نقل اچھی حالت میں نہیں ہیں۔ وغیرہ ان کے حفاظتی طریقہ ناقص اور ان کا بازار بہت محدود ہے۔ سررشتۂ زراعت اب اس کی طرف خاص توجہ کر رہا ہے چنانچہ لیشاور کی وادی میں زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ مسالے مثلاً کالی مرچ، ادرک، الائچی اور سپاری کی کاشت جنوبی ہند کے زیریں علاقہ میں ہوتی ہے۔ اگرچہ کہ مسالوں کی بعض قسمیں ہر جگہ کاشت کی جاتی ہیں۔

سررشتۂ زراعت سرکار عالی نے باغات کی نسبت تشہیر و اشاعت شروع کی ہے۔ باغ کے مالکوں کے لئے مشورہ اور امداد کی سہولتیں مہیا کی ہیں۔ میوے اور ترکاری کا زیر کاشت رقبہ ۲ لاکھ ایکڑ پر پھیل گیا ہے اور اس سے باغات کی پیداوار میں خاصہ اضافہ رونما ہوا ہے۔ یہاں کے خاص میوے موز اور آم ہیں۔

(۱) **نیشکر** ۔ گنّے کا اصلی وطن غالباً ہندوستان ہے۔ یہاں اس کا زیر کاشت رقبہ دوسرے ملکوں کے رقبہ سے زیادہ ہے۔ لیکن ایک ایکڑ پر جس مقدار میں نیشکر پیدا ہونا چاہیئے اس قدر مقدار کا حاصل نہ ہونا، ملکی طلب کی کثرت ۔ جاوا سے شکر کی درآمد کے خلاف عدم تحفظ اور صنعت شکر سازی کی ناقص تنظیم کے باعث گذشتہ زمانہ میں غیر ملکی شکر کی کثیر مقدار میں درآمد ناگزیر ہوگئی تھی لیکن مسرت کا مقام ہے کہ سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں حفاظتی پالیسی اختیار کی گئی اور شاہی زراعتی مجلس تحقیقات نے نیشکر کی کاشت کی تحقیقات میں کافی دلچسپی لی۔ ہندوستانی شکر کی صنعت سرعت کے ساتھ ترقی پذیر ہے۔ اور جہاں تک نفس شکر کا تعلق ہے۔ ملک کی پیداوار خود مکتفی ثابت ہو رہی ہے۔ ہندوستان میں فی الحال نیشکر سے زیادہ تر گڑ حاصل کیا جاتا ہے۔ صوبہ متحدہ، پنجاب، بہار، اڑلیسہ، مدراس اور بمبئی نیشکر کی کاشت کے خاص صوبے ہیں۔

نظام ساگر کی نہروں کی آبپاشی کے علاقے میں نئی قسم کی نیشکر کی کاشت کو رواج دینے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ بودھن ضلع نظام آباد میں نظام شوگر فیاکٹری کا کارخانہ قائم ہوگیا۔ اور یہاں شکر بن رہی ہے۔ نیشکر کا زیر کاشت رقبہ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۴۴ ہزار ایکڑ ہے۔ اس کی پیداوار

(۹۱) ہزار ٹن رہی۔ نیشکر کی پیداوار کے لحاظ سے حیدرآباد کا دسواں نمبر ہے۔

(ب) غیر غذائی اشیاء

(ا) روغنی تخم۔ ہندوستان میں مختلف روغنی تخم کی کاشت ہوتی ہے۔ مثلاً السی، تل، رائی، سرسوں، مونگ پھلی، ناریل، ارنڈی، بنولہ، موٹر، دھنیاں، زیرہ، اجوائن، اور کاروی۔ روغنی تخم بہت اہم ہیں اور کل مزروعہ زمین کے تقریباً (۷) فیصدی رقبہ میں ان کی کاشت ہوتی ہے اور سالانہ ایک کثیر مقدار برآمد ہوتی ہے۔ اگرچہ کہ جنگ عظیم کے بعد بیرونی بازاروں میں بڑھتے ہوئے مقابلہ کی وجہ سے روغنی تخم کی برآمد بہت کچھ متاثر ہو چکی ہے۔ یہ امر محسوس کیا جاتا ہے کہ ہندوستان نے ابھی تک روغنی تخم سے مفید مطلب کام لینا نہیں سیکھا ہے۔ صرف روغن نکالنے کی مقامی صنعت کو ترقی دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ روغنی تخم میں مونگ پھلی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ممالک متحدہ، صوبہ متوسط، بہار، اڑیسہ، بمبئی، پنجاب اور مدراس روغنی تخم کی پیداوار کے خاص صوبہ ہیں۔

مملکت آصفیہ کو روغنی تخم کی پیداوار کے لئے بڑی اہمیت حاصل ہے اور ہمہ قسم کے روغنی تخم مثلاً مونگ پھلی، ارنڈی، السی، تل، سرسوں، اور رائی یہاں پیدا ہوتے ہیں۔ مونگ پھلی کے زیر کاشت رقبہ میں کافی توسیع ہو رہی ہے۔ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں مونگ پھلی کا زیر کاشت رقبہ ۱۹ لاکھ ۵۹ ہزار ایکڑ تھا اور پیداوار ۲ لاکھ ۳ ہزار ٹن ہوئی۔ حیدرآباد کو اس کی کاشت کے لئے ہندوستان میں تیسرا درجہ حاصل ہے۔

سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں ارنڈی کا زیر کاشت رقبہ ۲ لاکھ ۰۰ ہزار ایکڑ تھا۔ اور اس کی پیداوار ۵۰ ہزار ٹن ہوئی۔ ارنڈی کی پیداوار کے لحاظ سے ہندوستان میں اس کو پہلا درجہ حاصل ہے۔ ہندوستان کے کل رقبہ کا ۴۳ء۵ فیصدی مملکت آصفیہ ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ ارنڈی کی کاشت کے اصلی مراکز اضلاع نلگنڈہ، ورنگل اور محبوب نگر ہیں۔

سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں السی کا زیر کاشت رقبہ ۵ لاکھ ۲۶ ہزار ایکڑ تھا اور اس کی پیداوار

کے لحاظ سے اس کو ہندوستان میں تیسرا درجہ حاصل ہے۔

سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں تل کا زیر کاشت رقبہ ۵ لاکھ ۸۴ ہزار ایکڑ تھا۔ اور اس کی پیداوار ۳۴ ہزار ٹن ہوئی۔

(۲) ریشے۔ کپاس اور جوٹ اہم پیداواریں ہیں۔ (الف) کپاس سب سے ممتاز ریشے کی پیداوار ہے۔ ایک بڑے رقبہ میں اس کی کاشت کی جاتی ہے۔ کپاس کی زیادہ تر کاشت بمبئی صوبہ متوسط برار، پنجاب صوبۂ متحدہ کی ریاستوں اور مدراس میں ہوتی ہے۔ کپاس کی پیداوار کے لحاظ سے ممالک متحدہ امریکہ کے بعد ہندوستان ہی کا درجہ ہے۔ ہندوستانی کپاس عموماً چھوٹے ریشہ والی ہوتی ہے۔ اور اعلیٰ قسم کی صنعت پارچہ بافی کے لئے موزوں نہیں ہے۔ امریکی اور مصری کپاس ہندوستانی کپاس سے اعلیٰ قسم کی شمار ہوتی ہے۔

سررشتۂ زراعت ملکی کپاس کو ترقی دینے اور ہندوستان میں امریکی قسم کی اعلیٰ کپاس کی کاشت کی افزایش کے لئے کوشش کر رہا ہے۔ فی ایکڑ زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی بھی کوشش ہو رہی ہیں۔ تقریباً ۶۰ فی صدی خام کپاس برآمد کر دی جاتی تھی۔ جاپان چین اور براعظم یورپ کے بعض ممالک جنگ سے قبل ہندوستانی کپاس کے خریدار تھے اور اب حال میں سندھ کے لانبے ریشہ دار کپاس کی پیداوار میں اضافہ کی وجہ سے لنکاشائر کے کارخانوں میں بھی ہندوستانی کپاس کی خریداری میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں جو انڈین کاٹن کمیٹی مقرر ہوئی تھی اس نے کپاس کی کاشت اس کی تجارت آمیزش سامان کی کم قیمت کی اشیا درآمد کے متعلق مختلف سفارشات کیں۔ اس کی سفارش پر انڈین سنٹرل کاٹن کمیٹی قایم ہوئی تاکہ سررشتۂ زراعت اور کپاس کے تاجروں کے مابین قریبی تعلق قایم رہے اڈین سنٹرل کاٹن کمیٹی نے کپاس کی اصلاح اور قانون سازی میں بہت سی مفید خدمات انجام دی ہیں۔ کپاس کی تجارت میں اصلاح کے لئے سنہ ۱۹۲۳ء میں ایسٹ انڈیا کاٹن ٹریڈ اسوسی ایشن قایم ہوی جو خاص تحقیقاتی کاموں میں مصروف ہے۔

جہاں تک تمام کپاس کا تعلق ہے برطانوی صوبہ جات اور ریاستوں میں کاشت زیادہ ہوا کا جو حصہ

اور ہندوستان کی کل پیداوار کا ۳۸ فیصدی یہاں سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ کپاس کی پیداوار کے لحاظ سے مملکت کو ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔ لیکن یہ کپاس اعلیٰ درجہ کی نہیں ہوتی اس لئے سنہ ۱۹۲۶ء سے گاورانی کپاس پر تجربے کئے جا رہے ہیں۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں کپاس کی کاشت اور اس کے نقل و حمل پر چند پابندیاں عاید کی گئیں۔ مرہٹواڑہ میں فی ایکڑ کپاس کی پیداوار کا اوسط ۸۰ پونڈ اور تلنگانہ و کرناٹک میں ۴۰ پونڈ ہے مملکت آصفیہ میں گاورانی کپاس کی اب زیادہ کاشت کی جا رہی ہے۔ جو معمولی کپاس کے تخم سے بلحاظ خوبی تار اور مجموعی مقدار کپاس کے بڑھیا مانی جاتی ہے۔ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۳۴ لاکھ ۳۰ ہزار ایکڑ رقبہ پر اس کی کاشت کی گئی۔ اس کی پیداوار سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں پانچ لاکھ ۲۸ ہزار بیل ہوئی۔

(ب) جوٹ کی پیداوار کے لئے ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے اس کی کاشت بنگال میں گنگا اور برہم پتر کے ڈلٹا، آسام، بہار، اڑیسہ تک محدود ہے۔ گاد کی وجہ سے یہاں کی زمین زرخیز ہے اور کھاد پر کچھ خرچ کئے بغیر اس کی وسیع فصل تیار ہوتی ہے۔ خارجی تجارت میں کپاس کے ساتھ خام جوٹ اور جوٹ کی مصنوعات کا بھی درجہ ہے۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں جوٹ کا زیر کاشت رقبہ ۴۴ لاکھ ۴۴ ہزار ایکڑ تھا۔ جنگ کی وجہ سے جوٹ کی کھپت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ انڈین سنٹرل جوٹ کمیٹی جو سنہ ۱۹۳۶ء میں قایم ہوئی اپنا تجربہ خانہ قائم کرکے جوٹ اور جوٹ کی پیداوار کی تحقیقات میں مصروف ہے۔

(ج) نیل کی سرگذشت بہت ہی تغیر پذیر رہی ہے ارزاں مصنوعی جرمنی رنگ کی مقبولیت سے پہلے ہندوستانی نیل کی صنعت کو فروغ حاصل تھا۔ سنہ ۱۹۰۷ء تک نصف سے زاید قیمت وار رنگ اور دباغتی اشیا برآمد کی جاتی تھیں اس کے بعد برآمد اور خود زیر کاشت رقبہ بر عمل ہے اس صنعت کا مستقبل غیر یقینی ہے۔ ارزاں کاشت اور اندازِ صنعت پر اس کی کامیابی کا انحصار ہے نیل کی کاشت مدراس، صوبہ متحدہ، بہار، اڑیسہ اور بنگال میں ہوتی ہے نیل کی خارجی تجارت کے لحاظ سے صوبۂ بہار کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

(۴) **افیون** حکومت ہند کی پالیسی کی وجہ سے افیون کا زیر کاشت رقبہ تدریجاً گھٹایا جارہا ہے بین الاقوامی معاہدات کی رو سے طبی اغراض کے علاوہ دوسرے مقاصد کے تحت افیون کی برآمد بند ہوچکی ہے۔ ملک میں بھی اس کے استعمال پر سخت نگرانی کی جاتی ہے صوبہ متحدہ میں حکومت سے خاص اجازت لے کر اس کے پودے کی کاشت کی جاسکتی ہے۔

(۵) **کافی** ہندوستان میں ایک غیر ملکی پودا ہے۔ ریاست میسور، مدراس، کورگ، کوچین اور ٹراونکور میں اس کی کاشت ہوتی ہے۔ یوروپی بازاروں میں برازیل کی ارزان کافی کے مقابلہ کی وجہ سے ہندوستان میں اس کی کاشت بہت متاثر ہوئی ہے۔

(۶) **چائے** چین کے سوا دنیا میں سب سے زیادہ چائے ہندوستان میں ہوتی ہے چائے ملک کی سب سے بڑی نخل بندی کی صنعت ہے۔ ملک میں چائے نوشی کا رواج بڑھنے اور ممالک غیر میں برآمد کی وجہ سے اس کی کاشت عرصہ تک ترقی پذیر رہی چائے کی پیداوار کے خاص مقامات آسام، بنگال، مدراس، پنجاب (کانگڑا) صوبہ متحدہ اور ٹراونکور میں برطانیہ ہندوستانی چائے کا سب سے بڑا بازار ہے اور وہاں کی درآمد میں ۹۰ فیصدی حصہ ہندوستانی چائے کا ہوتا ہے۔ دنیا کی معاشی کساد بازاری ضرورت سے زائد پیداوار، جاوا اور سیلون کی مسابقت کی وجہ سے چائے کی کاشت بہت متاثر ہوئی ہے

(۷) **تمباکو** - تمباکو کے دو خاص مرکز مشرقی و شمالی بنگال اور جنوبی ہندوستان میں تمباکو کی پیداوار کے خاص صوبے، مدراس، بنگال، بہار و اڑیسہ، بمبئی، صوبہ متحدہ اور پنجاب ہیں۔ پیداوار کی کثیر مقدار تو یہیں خرچ میں آجاتی ہے۔ البتہ مدراس سے قابل لحاظ مقدار میں برآمد ہوتی ہے۔ دہلی اگریکلچرل ریسرچ انسٹیوٹ تمباکو کے بہتر بنانے کے مسئلہ پر غور کررہا ہے بیرونی تمباکو اور سگریٹ کثیر مقدار میں ابھی تک درآمد ہوتے ہیں۔ ان پر بھاری درآمدی محصول عاید کرنے سے ملک میں اس کی کاشت اور ملکی تمباکو کے استعمال میں اضافہ ہورہا ہے۔

سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں مملکت آصفیہ میں تمباکو کا زیر کاشت رقبہ ۱۰۰ ہزار ایکڑ اور اس کی پیداوار

۲۴ ہزار ٹن ہوئی۔ تمباکو کی پیداوار کے لحاظ سے حیدرآباد کا ہندوستان میں آٹھواں نمبر ہے۔ تمباکو کی پیداوار کے خاص اضلاع نلگنڈہ اور بیدر ہیں۔

(۸) **چارے کی فصلیں**۔ ہندوستان میں مویشیوں کی بڑی تعداد کے مقابلہ میں چارے کی فصلوں کا زیر کاشت رقبہ بہت کم ہے۔ اس کی کاشت کے خاص رقبے پنجاب، بمبئی اور صوبہ متحدہ ہیں سررشتہ زراعت اس کی کاشت اور چارہ کے محفوظ کرنے کی جانب زیادہ توجہ کر رہا ہے۔

(۹) **ربر**۔ موجودہ صنعت میں ربر ایک اہم خام پیداوار ہے زیادہ تر جنوبی ہندوستان میں پیدا ہوتا ہے۔ ربر کی زیادہ مقدار برآمد کر دی جاتی ہے ہندوستان میں دنیا کی مجموعی پیداوار کا صرف تین فیصد پیدا ہوتا ہے۔

قلت پیداوار اور اس کے اسباب۔ ہندوستان میں ان ممالک کے مقابل جہاں زراعت بہتر ترقی یافتہ حالت میں ہے تقریباً تمام فصلوں میں فی ایکڑ بہت قلیل پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں کپاس فی ایکڑ ۸۰ پونڈ سے ۱۰۰ پونڈ تک حاصل ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ممالک متحدہ امریکہ میں ۲۰۰ پونڈ اور مصر میں ۳۰۰ سے زائد ۴۰۰ پونڈ تک ہوتی ہے۔ ہندوستان میں نے شکر کی مقدار کیوبا کی شکر سے ⅓ جاوا سے ⅙ اور ہوائی سے ⅕ کم ہوتا ہے۔ قلت پیداوار کے اسباب یہ ہیں۔ غیر یقینی بارش، سیلاب، ژالہ باری، کہر اور دوسرے موسمی اثرات، جنگلی جانوروں اور چوہوں، ٹڈوں اور دوسرے امراض سے نقصانات، کاشت کے ناقص طریقے، چھوٹے اور منتشر قطعات اراضی اور کاشتکاروں کی بے سروسامانی۔ آبپاشی میں اضافہ اور سررشتہ زراعت کی جانب سے انسداد امراض اور طریقہ کاشت کی اصلاح کی کوششوں سے امید ہے کہ پیداوار کی مقدار میں اضافہ ہوگا۔

زمین اور اس کے مسائل

تقسیم و انتشار اراضی۔ اب زمین کے دو خاص مسائل یعنے تقسیم و انتشار اراضی اور آبپاشی سے بحث کی جائے گی۔

ہندوستان کی زراعت کا سب سے بڑا نقص تقسیم و انتشار اراضی ہے۔ زمین کا رقبہ نہ صرف وسعت میں بہت چھوٹا ہوتا ہے بلکہ مختلف مقامات پر منتشر بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مسٹر رام لال بھاٹیہ نے بیرام پور (پنجاب) میں تحقیق کی ہے کہ وہاں ۵۴ء۳ فی صدی ایسے کاشتکار ہیں جن کی زمینات ۲۵ مختلف مقامات میں ہیں۔ پنجاب کے ۲۳۹ مواضعات میں خاص تحقیقات کی گئی تھی معلوم ہوا کہ ۱۷ء۹ فی صدی کاشتکاروں کی زمین ایک ایکڑ سے کم تھی۔ ۲۵ء۵ فی صدی کاشتکاروں کی ایک ایکڑ سے ۲ ایکڑ تک ۱۴ء۹ فی صدی کاشتکاروں کی چار سے پانچ ایکڑ اور ۱۰ء۸ فی صدی کی ۵ ایکڑ سے ۱۰ ایکڑ تھی موضع پمپلا سوداگر (ضلع پونا) میں ڈاکٹر مان کی تحقیق کے بموجب ۱۸ فیصدی کاشتکاروں کے کھیت دس ایکڑ سے کم اور ۶۰ فی صدی کاشتکاروں کے پانچ ایکڑ سے بھی کم تھے۔

تقسیم و انتشار اراضی کے اسباب۔ آبادی میں اضافہ، صنعتوں کی مناسب توسیع کا فقدان بلکہ زوال مشترکہ خاندانی زندگی کے زوال کی وجہ سے انفرادیت کا رجحان، ہندوؤں اور مسلمانوں کے قوانین وراثت اور رسوم و رواج تقسیم اور انتشار اراضی کے خاص اسباب ہیں۔ خاندانی جائداد ورثاء میں بٹ جاتی ہے۔ انتشار اراضی کے ساتھ تقسیم در تقسیم بھی عموماً ہوا کرتی ہے کیونکہ ہر حصہ دار خاندانی زمین سے ایک ایک ٹکڑا چاہتا ہے خواہ ایک سے زیادہ جگہ واقع کیوں نہ ہو بجائے اس کے کہ ایک غیر منقسمہ حصہ اراضی حاصل کی جائے۔ اس طریق کار کا مقصد یہ ہے کہ حصول پر مکمل مساوات حاصل ہو۔

اسلامی وراثت کے قوانین کے ساتھ تقسیم جائداد کے جو قواعد اسلامی فقہا نے قرار دیئے ہیں ان کی روشنی میں یہ بہت ممکن ہے کہ حالیہ زمانہ میں پیدا شدہ مشکلات پر قابو حاصل کر لیا جائے۔ اصلی قوانین سے ناواقفیت کی بناء پر پیدا شدہ مشکلات ناقابل حل معلوم ہوتے ہیں۔

تقسیم و انتشار اراضی کے نقصانات۔ تقسیم در تقسیم اور انتشار اراضی کے نقصانات بہت اہم ہیں۔ چھوٹے قطعات اراضی پر کاشت کرنے میں مختلف طرح سے نقصان واقع ہوتا ہے۔

دو بیل اور ایک ہل جیسے معمولی ساز و سامان سے بھی غریب کاشتکار ہمیشہ اپنے مفید مطلب استفادہ نہیں کر سکتا۔ اور اس طرح مصارف کاشت لامحالہ بڑھ جاتے ہیں۔ بعض وقت زمین کے قطعات اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ان میں اچھی طرح سے ہل نہیں چلایا جا سکتا۔ اور کاشت بھی نہیں کی جا سکتی۔ باڑہ لگانا کنووں کی کھدوائی اور دوسرے کارآمد امور بکفایت عمل میں نہیں لائے جا سکتے۔ احاطہ بندی اور مینڈ بنانے میں کثیر رقبہ بے کار رہتا ہے۔ کم محنت میں زیادہ افادہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ انتشار اراضی کی صورت میں ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں جانا محنت اور وقت کے رائگاں جانے کا باعث ہوتا ہے اسی انتشار کی وجہ سے سرحدی نزاعات بھی ہوا کرتے ہیں تقسیم در تقسیم اور انتشار اراضی کی وجہ سے مسابقت کا میدان گویا باقی ہی نہیں رہتا اور کاشت عمیق نہیں کی جا سکتی۔ ایسے خطہ ہائے اراضی کی کاشت نہ تو زراعت کی ترقی میں ممد ہوتی ہے اور نہ ان سے پیداوار میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

غرض ہندوستان میں غیر معاشی کھیتوں کی بڑی تعداد ہے جن میں کاشتکاری نفع بخش نہیں ہے۔

اصلاحی تدابیر۔ حال ہی میں اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اختیاری اور قانون کے ذریعہ جبری کوششیں کی جا رہی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ کسانوں کو ایک ایسا معاشی رقبہ حاصل ہو جو بقول کٹنگ "کوئی شخص اپنی یا اپنے خاندان کے ضروری اخراجات کی تکمیل کے بعد آرام سے زندگی بسر کر سکے" اس مقصد کے حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ زمین محنت اور راس المال کے مابین ایک ایسا رشتہ قائم کیا جائے کہ جس سے آجر کو ممکنہ نفع حاصل ہو۔ اور مقصد یہ ہو کہ افراد کو مناسب رقبہ حاصل ہو کر ان کو اپنی معاشی حالت کی اصلاح کا موقع ملے۔

منتشر اراضی کو یکجا کرنے کی مفید تدابیر انجمن ہائے امداد باہمی کی جانب سے اختیار کی گئی ہیں چنانچہ پنجاب میں سنہ ۲۱-۱۹۲۰ء سے سررشتہ امداد باہمی کے تحت اس کام کا آغاز ہوا ہے۔ اس تجربے سے مفید نتائج حاصل ہوے اس سے زمین زیادہ پیداوار اور قیمتی ہو گئی۔ مقدمہ بازی اور لڑائی جھگڑے کم ہو چکے ہیں اصلاح و ترقی کی خواہش قوی اور نمایاں ہو گئی۔ لیکن اس تحریک کی رفتار بہت سست ہے۔

بڑودہ کے ایک موضع میں پٹہ داروں کو منتشر اراضی یکجا کرنے کی اجازت دی گئی لیکن کامیابی

نہیں ہوئی۔ صوبہ متوسط میں انضمام اراضی کے قانون بابتہ ۱۹۲۸ء سے اچھے نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ جس کی تحقیقات گڈھ ڈیویژن سے ابتدا کی گئی ہے۔ صوبہ مدراس اور صوبہ متحدہ میں بھی اس کام کا آغاز ہو چکا ہے۔

۱۹۲۷ء میں صوبہ بمبئی میں ایک ناکام کوشش کی گئی۔ مسٹر جی ایل مہتا نے مجلس وضع قوانین میں انضمام اراضی کے بارے میں مسودہ قانون پیش کیا تھا۔ سخت لیکن غیر منصفانہ مخالفت کی وجہ سے مسودہ واپس لے لینا پڑا۔ اس سلسلہ میں زرعی کمیشن کے ایک انتباہ کو یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ تقسیم در تقسیم اور انتشار اراضی کے مسئلہ پر زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے اور جو گروہ اس سے متاثر ہوں ان کی رائے اور عصبیت پر بھی نظر رکھنی ضروری ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اس میں جبر و تشدد کا عنصر لازمی ہوگا۔ لیکن اس کا نفاذ آخری منزل پر ہونا چاہیے تاکہ ضدی پٹہ داروں اور آسامیوں کی پیدا کردہ مشکلات پر غلبہ حاصل ہو سکے۔

مملکت آصفیہ میں تقسیم و انتشار اراضی ۔ ممالک آصفیہ میں ابھی تقسیم و انتشار اراضی کے مسئلہ کے حل کرنے کی جانب کوئی توجہ نہیں ہوئی ہے۔

محمد ناصر علی صاحب۔ موضع دوپلی (ضلع نظام آباد) کی معاشی تحقیق ۱۹۳۹ء میں کی ہے۔ صاحب موصوف کی تحقیق کے بموجب موضع دوپلی میں اوسط رقبہ فی پٹہ دار ۴ء۷ ایکڑ سے زائد نہیں اور اراضیات کی وسعت میں بتدریج تخفیف ہوتی چلی آرہی ہے چنانچہ ۱۹۰۴ء میں اوسط رقبہ فی پٹہ دار ۲۲ء۸ ایکڑ تھا تو ۱۹۳۰ء میں اوسط رقبہ گھٹ کر ۴ء۵ ایکڑ ہو گیا۔ موضع زیر بحث میں جملہ کاشت شدہ اراضیات کا لحاظ کرتے ہوئے ۴ء۷۰ فیصد اراضیات پانچ ایکڑ سے کم ہیں ۲ء۲۱ فیصد اراضیات ۴ تا ۱۰ مختلف قطعات اور ۴ء۵ فیصد اراضیات زائد از دس قطعات پر مشتمل ہیں۔ اس سے زرعی زمین، زرعی محنت اور زرعی اصل کے عدم تناسب کی وجہ سے مزارعین کے مصارف کاشت بڑھ جاتے ہیں۔ آمدنیوں میں تخفیف ہوتی ہے اور تخفیف آمدنی معیار زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ اور یہی تقسیم و انتشار اراضی کے اہم نقصانات ہیں۔

راقم الحروف نے موضع پھول مری (ضلع اورنگ آباد) میں معاشی تحقیق ۱۹۳۶-۳۷ء میں کی تھی۔ موضع پھول مری میں ہر کاشتکار کے رقبہ اراضی کا اندازہ اوسطاً (۱۶) ایکڑ سے زائد نہیں ہے۔ ذرائع آبپاشی کی موجودگی میں اتنی اراضی ایک کاشتکار خاندان کے لئے آسودہ حالی سے بسر کرنے کے لئے کافی تصور کی جاسکتی ہے۔ مگر بہت سے کاشتکار ایسے ہیں کہ جن کے پاس ذرائع آبپاشی موجود نہیں ہیں۔ اور اون کو خشکی کی کاشت پر بسر اوقات کرنی پڑتی ہے۔ ایسے کاشتکاروں کے لئے یہ رقبہ کافی نہیں ہے۔ بہت سے کاشتکار ایسے بھی ہیں کہ ان کے قبضہ میں جو اراضیات ہیں اون کا رقبہ اس قدر کم ہے کہ ان کو ہر وقت مصروف رکھنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اراضیات مختلف مقامات پر منتشر ہیں مثال کے طور پر ایک کاشتکار کے اراضیات اکیس (۲۱) مختلف مقامات پر پھیلے ہوئے ہیں جس کا رقبہ ۴۶ ایکڑ ہے اور اس کا دہارہ ۱۵۵ ہے۔ اس سے نگرانی ناکافی اور ناقص ہوتی ہے نیز ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں آنے جانے سے وقت بیکار صرف ہوتا ہے۔ موضع پھول مری میں خشکی کا سب سے چھوٹا نمبر جو ایک کاشتکار کے قبضہ میں ہے اس کا رقبہ صرف تیس گنٹے ہے دھارا ایک روپیہ ہے۔ باغات کا سب سے چھوٹا نمبر کا رقبہ ۱ ایکڑ ۴ گنٹہ ہے جس کا دہارہ چھ روپے ہے۔

یہ تو دیوانی علاقوں کی تفصیل بیان کی گئی۔ بڑی جاگیروں پائیگاہوں اور صرف خاص مبارک کے اراضیات صدہا مواضعات میں منتشر طور پر پھیلے ہوئے ہیں حکومت کی تھوڑی سی کوششوں سے ان مسائل کو بخوبی حل کیا جاسکتا ہے۔

آبپاشی کی اہمیت اور فوائد۔ ہندوستان میں جب تک زراعت کا انحصار غیر یقینی بارش پر ہے اس پیشہ کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہے گا اس لئے ضروری ہے کہ جہاں جہاں ممکن ہو آبپاشی کا انتظام کیا جائے۔ ہندوستان کے چند علاقوں مثلاً سندھ راجپوتانہ اور جنوب مغربی پنجاب میں بارش مفقود ہے۔ اور مصنوعی طریقہ پر آبپاشی کے بغیر کاشت نہیں ہوسکتی بعض علاقوں مثلاً سطح مرتفع دکن میں جہاں بارش غیر یقینی اور غیر مساوی مقدار میں برستی ہے۔ وہاں قلت آب کو دور کرنے

کے لئے آب پاشی ضروری ہے۔ چاول اور نیشکر کے لئے بہت زیادہ اور مسلسل پانی کی ضرورت ہے۔ سرمائی فصلوں کے لئے بھی مصنوعی آبپاشی کی ضرورت ہے۔ پانی کے مہیا کرنے پر ہی زراعت پیشہ لوگوں کی خوش حالی کا انحصار ہے اسی وجہ سے قدیم زمانہ سے ہندوستان میں کنوؤں اور تالابوں کا رواج تھا۔ چنانچہ تالاب پاکھال اور دولت آباد کا درۂ آبشار آج بھی اس زمانہ کی آبپاشی کو یاد دلاتے ہیں۔

آبپاشی کے فوائد بے شمار ہیں۔ پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ خشک قطعات اراضی میں مستقل زراعت قایم ہو سکتی ہے۔ قحط اور خشک سالی میں ان ذرایع سے مصیبتوں میں کمی ہو جاتی ہے۔ زرعی صوبوں مثلاً پنجاب میں ریلوے کو بہت منافع ملتا ہے اور حکومت کو بھی براہ راست مالی منفعت حاصل ہوتی ہے۔ آبپاشی سے اچھی زراعت ہو تو برآمدی تجارت (مثلاً گیہوں اور کپاس) کو بہت فائدہ ہوتا ہے س کے ساتھ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ نہروں سے آبپاشی میں زائد پانی اور نمکین مادے بہت مضرت رساں ہیں۔ قدیم زمانہ میں اس کی طرف توجہ نہیں کی جاتی تھی۔ بعض وقت کھاد آبپاشی کی وجہ سے کمزور ہو جاتی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ نہروں کے علاقوں میں ڈرینج کا انتظام کیا جائے اور پانی کے استعمال میں احتیاط برتی جائے۔

کارہائے آبپاشی کی قسمیں ۔ ہندوستان میں کارہائے آبپاشی کا تین اہم ذرائع حسب ذیل ہیں:۔ (۱) کنویں (۲) تالاب (۳) نہریں

نہریں بھی تین قسم کی ہیں۔ (۱) سیلابی نہریں۔ (۲) دوامی نہریں (۳) کار ہائے ذخیرہ آب۔

(۱) کنویں ۔ ہندوستان میں کنویں آبپاشی کا بڑا جز ہیں۔ ملک میں پچیس لاکھ کنویں ہیں جن سے تقریباً ۲۵ فیصدی رقبہ سیراب ہوتا ہے۔ کنوؤں کی ملکیت خانگی ہوتی ہے۔ حکومت ان کی کھدوائی میں مدد کرتی ہے چنانچہ اس غرض کے لئے تقاوی قرضے دیئے جاتے ہیں۔ کنوؤں پر پاور پمپ اور نل کنواں تعمیر کرنے میں بھی امداد کی جاتی ہے۔

(۲) تالاب ۔ تالاب ہندوستانی زراعت کی امتیازی خصوصیت ہیں۔ مدراس میں تالاب سب سے زیادہ ترقی یافتہ حالت میں موجود ہیں۔ جہاں ۳۵ ہزار سے زائد تالاب ہیں۔ اس کے برعکس

پنجاب اور سندھ میں تالاب نہیں ہیں۔

(۳) **نہریں** ۔ اب ہندوستان میں آبپاشی کی سب سے اہم شکل نہروں سے قرار پائی ہے، حکومت خاص طور پر ان کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں مقامی حالات کے تحت جداجدا قسم کی نہریں بنائی گئی ہیں۔ ذیل میں ان کی صراحت کی جاتی ہے۔

(الف) سیلابی نہریں ۔ براہ راست دریا سے پانی لیا جاتا ہے۔ یہ موسمی نہریں ہیں اور ان میں اسی وقت پانی آتا ہے جبکہ دریا بھرپور بہتے ہیں، اور پانی ایک خاص سطح پر پہنچ جاتا ہے سندھ اور پنجاب کی زمینات میں اسی قسم کے نہروں سے آبپاشی ہوتی تھی اور اب بھی کچھ قدر رواج ہے

(ب) دوامی نہریں ۔ دریا کے اطراف بند بنا کر تعمیر کی جاتی ہیں جو سال بھر بہتی ہیں اور زمینات کی آبپاشی ہوتی ہے صوبہ متحدہ، پنجاب اور مدراس میں اس قسم کی نہریں پائی جاتی ہیں۔

دریائے سندھ پر جو بند تعمیر کیا گیا اس کا نام سکھر براج ہے اس کا افتتاح ۱۹۳۲ء میں ہوا اس سے سیلابی نہریں دوامی نہروں میں تبدیل ہو گئیں ہیں اور سال بھر بہتی رہتی ہیں۔

(ج) ذخیرۂ آب کی نہریں۔ بارش کے پانی کو جمع کرنے کے لئے کسی وادی پر بند تعمیر کیا جاتا ہے وہاں جو پانی جمع ہوتا ہے وہ نہروں کے ذریعہ تقسیم ہوتا ہے۔ اس قسم کی نہریں دکن صوبہ متوسط اور بندیل کھنڈ میں تعمیر کی گئی ہیں کیونکہ یہاں کے دریا صرف بارش میں بہتے ہیں۔ اسی لئے مصنوعی ذخیرۂ آب بنانا پڑتا ہے۔

سرکاری کارہائے آبپاشی کی تقسیم ۔ ۱۹۲۱ء تک سرکاری کارہائے آبپاشی کی تقسیم حسب ذیل تھی۔

(۱) کارہائے پیداآور ۔ (۲) کارہائے حفاظتی (۳) کارہائے خورد۔

(۱) **کارہائے پیداآور** ۔ ان کی تعمیر کے دس سال بعد اصلی سرمایہ پر اس قدر خالص مالگذاری وصول ہونے کی توقع ہوسکتی تھی کہ سالانہ مصارف سود کی تکمیل ہو جائے اس قسم کے کارہائے آبپاشی زیادہ تر شمالی ہند اور مدراس میں ہیں۔ ۱۹۲۸-۲۹ء میں۔ ۱ کروڑ ۸۸ لاکھ ایکڑ رقبہ اس قسم کے کارہائے

آبپاشی سے سیراب ہوا۔ اس وقت تک اس پر ۱۱۴ کروڑ لگایا گیا۔ اور تقریباً ۹ کروڑ روپیہ کی اس سے خالص آمدنی ہو چکی ہے۔ کارہائے آبپاشی کی یہ واحد نوعیت ہے جس کی تعمیر کے لئے حکومت نے قرضہ حاصل کیا تھا۔

(۲) کارہائے حفاظتی سے براہ راست آمدنی کی توقع قایم نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ دکن جیسے غیر یقینی بارش کے قطعات میں قحط کا انسداد مقصود تھا۔ اس کے اخراجات قحط و بیمہ کے مد سے ادا کئے جاتے تھے۔ ایک عرصہ کے بعد اس قسم کے کام بالواسطہ پیداآور ہو جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء میں ۲۸ لاکھ ۴۰ ہزار ایکڑ رقبہ اس سے سیراب ہوا۔ ان کاموں پر ۳۹ کروڑ روپیہ کا سرمایہ لگایا گیا تھا۔

(۳) کارہائے خرد۔ ان کا شمار متفرق کاموں کی قسم میں ہوا کرتا تھا۔ خاص کر چھوٹے چھوٹے تالاب جن کو برطانوی حکومت نے اپنے دور میں درست کیا یا تعمیر کیا۔ مالگذاری کے مد سے ان پر رقم خرچ کی گئی۔

سنہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے یہ قدیم تقسیم بدل گئی ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ کس مد سے رقم حاصل کی گئی۔ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ مفاد عامہ کے کسی کام کو قرضہ لے کر چلایا جائے۔ حفاظتی اور کارہائے خرد کی تقسیم حذف کر دی گئی ہے۔ اب کارہائے آبپاشی کی خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے حسب ذیل تقسیم عمل میں آئی ہے۔

(۱) پیداآور (۲) غیر پیداآور (۳) وہ رقبہ جات جو بغیر سرمایہ لگائے سیراب ہوتے ہیں۔

کارہائے آبپاشی میں ترقی ۔ سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء کے اختتام پر آبپاشی اور دریائی جہازرانی پر صرف شدہ مجموعی سرمایہ کی تعداد ۱۵۲ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے تھی۔ اس کے مقابل سنہ ۱۹۰۱-۰۲ء میں ۴۲ کروڑ ۴ لاکھ روپے تھی۔ سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء کی سالانہ آمدنی ۱۴ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے تھی اور اخراجات ۴ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے ہوئے۔ اس لئے صرف شدہ اصل پر ۶ء۸۵ فی صدی خالص آمدنی وصول ہوئی۔ سنہ ۱۹۰۰-۰۱ء میں رقبہ آبپاشی ایک کروڑ ایکڑ تھا۔ اور سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء میں ۳ کروڑ ۲۰ لاکھ ایکڑ تک بڑھ گیا۔ اور پیداوار کی قیمت میں ۱۰۹ کروڑ روپے تک اضافہ عمل میں آیا۔

(بہ استثنائے کار ہائے غیر سرمایہ) آب پاشی کی شرح معاوضہ ہر صوبہ میں فصل اور نہروں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ پنجاب میں شرح معاوضہ نیشکر کی اراضی کے لئے سات روپیہ آٹھ آنہ سے بارہ روپیہ فی ایکڑ اور گیہوں کے لیے تین روپیہ چار آنہ سے پانچ روپیہ چار آنہ فی ایکڑ ہے۔ پنجاب میں رقبہ آبپاشی سب سے زیادہ ہے۔ جہاں کل رقبہ زیر کاشت کا تقریباً ۴۱ فیصد حکومت کے کار ہائے آبپاشی سے سیراب ہوتا ہے صوبہ جات مدراس متحدہ اور سندھ کو بھی آبپاشی کی سہولتیں میسر ہیں۔ جنوبی بمبئی اور صوبہ متوسط (بہ استثنائے برار) میں آبپاشی کے لحاظ سے بہت کم ترقی ہوئی ہے بنگال اور آسام نے بھی آبپاشی کے لحاظ سے بہت کم ترقی کی ہے۔ لیکن وہاں موافق بارش کی وجہ سے اس کی احتیاج بھی زیادہ نہیں ہے۔ برطانوی ہند میں تمام ذرائع آبپاشی سے سیراب شدہ رقبہ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۵ ۵ کروڑ ۵ لاکھ ایکڑ تھا جس میں سے دو کروڑ ۹ لاکھ ایکڑ نہروں سے ۶۰ لاکھ ایکڑ تالابوں سے ایک کروڑ ۴۰ لاکھ ایکڑ کنوؤں سے اور دیگر ذرائع سے ۷۰ لاکھ ایکڑ سیراب ہوا

آبپاشی سے متعلق حکومت کی پالیسی۔ قدیم دور میں آبپاشی کے جو ذرائع مہیا کئے گئے تھے وہ آخری دور کی افراتفری میں برباد ہوگئے۔ برطانوی حکومت کے ہاتھ میں اقتدار آیا تو شمالی ہند کی چند موجودہ سیلابی نہریں (گنگا اور جمنا کی نہریں) اور مدراس کے ذخائر آب اور تالاب بہتر حالت میں تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں ان امور پر کوئی توجہ ہی نہیں کی گئی۔ لیکن انیسویں صدی کے وسط سے حکومت قدیم کار ہائے آبپاشی کی ترمیم اور تجدید کرنے لگی۔ اس کے بعد حکومت نے حاصل کرکے پیداآور کار ہائے آبپاشی کے استحکام و تعمیر کی جدید پالیسی اختیار کی۔ انسداد قحط کی خاطر قحط کمیشن بابتہ سنہ ۱۸۸۰ء نے دکن میں پیداآور کار ہائے آبپاشی کی تعمیر کی سفارش کی۔ لیکن کثیر مصارف کی وجہ سے رفتار ترقی بہت سست رہی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں حکومت کی آبپاشی کی پالیسی میں ایک جدید باب کا آغاز ہوا۔ اس سال آبپاشی کے کمیشن نے بہت سی سفارشیں کیں۔ کہ جس قدر جلد ممکن ہو خصوصاً دکن میں حفاظتی اور پیداآور کار ہائے آبپاشی کی توسیع کی جائے کمیشن نے کرشنا اور تنگبھدرا پراجکٹ کی بھی سفا

کمیشن کی بعض سفارشوں پر عمل ہوا اور اب حکومت نے ریلوں کی تعمیر کی جو پالیسی تھی اس کے بجائے آبپاشی کی طرف توجہ مبذول کی بہت سے نئے کام آغاز کئے گئے اور مصارف سرمایہ دو گنے سے بھی زیادہ ہو گئے۔ سنہ ۱۹۰۹ء کی اصلاحات کے بموجب آبپاشی کا کام صوبہ جات کے تفویض ہوا۔ ۱۹۲۲ء کے بعد سے مختلف صوبوں کی حکومتیں کارہائے آبپاشی میں سرگرمی دکھا رہی ہیں۔ انیس بڑے اور اہم کام یا تو مکمل ہو چکے ہیں۔ یا زیر تعمیر ہیں نئے اہم کارہائے آبپاشی حسب ذیل ہیں۔

(۱) وادی ستلج پراجکٹ واقع پنجاب سنہ ۱۹۳۳ء میں یہ کام مکمل ہوا۔ جس پر ۳۲ کروڑ ۳۱ لاکھ روپے لاگت آئی اندازہ کیا گیا ہے کہ پچاس لاکھ ایکڑ رقبہ سیراب ہوگا۔

(۲) سکھر براج واقع سندھ سنہ ۱۹۳۲ء میں مکمل ہوا۔ تقریباً ۲۶ کروڑ روپے لاگت آئی تخمینہ کیا گیا ہے کہ پچیس لاکھ ایکڑ رقبہ سے زائد سیراب ہوگا۔

(۳) کاویری ذخیرہ آب اور میسور پراجکٹ سنہ ۱۹۳۴ء میں مکمل ہوا۔ تقریباً ۷ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے صرف ہوئے۔ تیس لاکھ ایکڑ رقبہ کی سیرابی کا اندازہ کیا گیا ہے۔

(۴) بمبئی میں لائیڈ ڈام سنہ ۱۹۲۶ء میں تکمیل کو پہنچا۔

(۵) صوبہ متحدہ میں سارد اور دو نہروں کے ذریعہ قابل لحاظ ترقی کی گئی ہے۔

(۶) بنگال ڈاموڈ نہر بہت اہم ہے۔

مملکت آصفیہ میں آبپاشی سررشتہ تعمیرات کا قیام سنہ ۱۸۶۰ء میں عمل میں آیا سنہ ۱۸۹۶ء خیال ہوا کہ بڑے بڑے تالابوں کی نہ صرف وسیع طور پر ترمیم کرنے کی بلکہ ان کو اصلی حالت پر لانے کی ضرورت ہے۔

مملکت آصفیہ کے لئے مثل دیگر زراعتی ممالک کے اس امر کی ضرورت ہے کہ علاوہ آسمانی بارش کے مصنوعی ذرائع آبپاشی بھی موجود رہیں۔ بہت سے اجناس ایسے ہیں جن کے لئے بارش کے علاوہ مزید پانی لازمی ہے۔ موسم گرما کے فصلوں کے لئے بارش کا پانی ناکافی ہوتا ہے۔ اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ جو پانی موسم بارش میں زائد از ضرورت ہو وہ تالابوں کنوؤں اور باولیوں میں روک لیا جائے۔ دکن پر قدیم

سے ذرائع آبپاشی بکثرت موجود تھے۔ تلنگانہ میں بہت کم گاؤں ایسے ہیں۔ جہاں تالاب نہ ہو۔ اور جہاں نہیں ہیں اوس کے قرب وجوار میں ایسا بڑا تالاب موجود ہے جس سے متعدد گاؤں سیراب ہوتے ہیں اور بعض ندیوں سے انی کٹ بھی نکالے گئے ہیں مگر اٹھارویں صدی کی عام بدامنی اور شورش کی وجہ سے ان سے شکست و ریخیت کی مرمت نہ ہوسکی نتیجہ یہ ہوا کہ آبادی منتشر ہوگئی زراعت کے عوض گھنے جنگل پیدا ہوگئے۔ سرسالارجنگ کے زمانہ سے پھر کوشش ہورہی ہے کہ ان کی مرمت ہو جنگل صاف کیے جائیں نئی نہریں نکالی جائیں۔ ابتداء میں کام آہستگی سے ہوا۔ سر آسمانجاہ کے دور وزارت سے کثیر رقم صرف ہونے لگی۔

سررشتۂ تعمیرات عامہ کے تحت کارہائے آبپاشی کی دو قسمیں ہیں

(۱) معمولی ذرائع آبپاشی۔ جیسے تالاب انی کٹ اور نہریں جن کے سرمایہ اور محاصل کا حساب نہیں رکھا جاتا۔

(۲) دریاؤں کی وادیوں پر بڑے بڑے ذخائر آب جیسے کہ ویرا، پالیر، اور نظام ساگر وغیرہ جن کے سرمایہ اور محاصل کے حسابات رکھے جاتے ہیں۔

سررشتۂ تعمیرات کے بڑے بڑے اور مخصوص کارہائے آبپاشی کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) نظام ساگر مملکت میں یہ سب سے بڑی آبپاشی کی اسکیم ہے جو ۱۹۲۴ء میں آغاز کی گئی اور ۱۹۳۰ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس ذخیرہ آب کی تعمیر مانجرا ندی پر کی گئی ہے۔ اس کی تعمیر کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ نظام آباد میں ۲ لاکھ ۷۵ ہزار ایکڑ رقبہ کی آبپاشی کی جائے ۳۱-۱۹۳۰ میں اس پراجکٹ کے تحت نو ہزار ایکڑ کا رقبہ سیراب ہوا تو ۴۲-۱۹۴۱ء میں ایک لاکھ ۹ ہزار ایکڑ رقبہ سیراب ہوا۔ اس پراجکٹ پر ۴ کروڑ ۴۲ لاکھ روپے صرف ہوئے اندازہ کیا گیا ہے کہ صرف شدہ سرمایہ پر دس فیصدی منافع حاصل ہوگا۔

(۲) ویرا پراجکٹ یہ ذخیرہ آب تعلقہ کھمم ضلع ورنگل میں تعمیر کیا گیا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس پر ۳۴ لاکھ روپیہ صرف ہوئے۔ اس پراجکٹ سے ۱۴ ہزار ایکڑ رقبہ سیراب ہو رہا ہے۔

(۳) پالیر پراجکٹ ۔ یہ ذخیرہ آب بھی تعلقہ کھمم ضلع ورنگل میں واقع ہے۔ یہ پراجکٹ ۱۹۲۹ء میں ۴۲ لاکھ روپیہ کے صرفہ سے تعمیر ہوا۔ ۱۹۴۰-۴۱ء میں دس ہزار ایکر رقبہ پر کاشت ہوئی تھی۔

(۴) اولی پراجکٹ ۔ انسداد قحط کی غرض سے ۱۹۳۶ء میں اس پراجکٹ کا کام ضلع بیڑ میں آغاز کیا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں اس کا کام تکمیل کو پہنچا۔ ۴ لاکھ پچاس ہزار روپیہ کا صرفہ عاید ہوا۔ اس پراجکٹ کے تحت ایک ہزار ایکڑ خریف تین ہزار چھ سو ایکڑ ربیع کی آبپاشی مقصود ہے۔

(۵) ڈنڈی پراجکٹ ۔ اضلاع محبوب نگر و نلگنڈہ کو قحط کی بار بار کی تباہ کاریوں سے بچانے کے لئے اس پراجکٹ کا کام ۱۹۳۹ء میں شروع کیا گیا اس کا زیر آب مجموعی رقبہ ۴۵ ہزار ایکر ہے اس پر چار لاکھ روپے سے زاید رقم صرف ہوئی ہے۔

مملکت آصفیہ کا رقبہ آبپاشی ۱۳ لاکھ ۳۱ ہزار ایکڑ ہے جس میں نہروں سے ایک لاکھ ۴۴ ہزار ایکڑ تالابوں سے ۹ لاکھ ۱۷ ہزار ایکڑ کنوؤں سے ۴ لاکھ ۳۶ ہزار ایکڑ اور دیگر ذرائع سے ۱۵ ہزار ایکڑ رقبہ سیراب ہوتا ہے۔

تنگبھدرا پراجکٹ کے متعلق ہمسایہ حکومتوں سے گفت و شنید ہو کر معاہدات کی تکمیل میں ایک عرصہ لگا اس پراجکٹ کا ابتدائی کام بھی آغاز کر دیا گیا ہے۔ رائچور جیسا قحط زدہ خطہ اس سے سیراب ہو سکے گا لیکن جہاں اس قدر اعلیٰ پیمانہ پر آبپاشی کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ وہاں ہمیں ان علاقوں کو بھی بھول نہ جانا چاہیئے جو پانی کے ان خزانوں سے اس قدر فاصلہ پر واقع ہیں کہ جہاں پانی کی فراہمی نہیں ہو سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت کی جانب سے اکثر علاقوں میں کندیدگی باولیات کا کام ہو رہا ہے۔ لیکن اس کام کی نوعیت آبرسانی کی حد تک محدود ہے آبپاشی کے اغراض کے لئے وسیع پیمانوں پر زیر زمین پانی سے کام لینے کی ضرورت شدید طور سے پائی جاتی ہے۔

پنجاب کی نہری نو آبادیاں ۔ پنجاب کی آبپاشی کی تاریخ میں نہری نو آبادیوں کا بہت اہم حصہ ہے۔ ۱۸۸۵ء سے قبل ملک کا یہ وسیع خطہ غیر یقینی بارش کی وجہ سے ریگستان تھا جو اب جنوبی چناب، جہلم اور باری دوآبہ کی نہروں سے سیراب ہوتا ہے۔ ان نئی نہروں سے سیراب شدہ

رقبوں میں لوگوں کو بسانا پڑا۔ ان نوآبادیوں کے باقاعدہ نقشے مرتب کئے گئے۔ زمین کے قطعات کو بڑے اور چھوٹے مربع و مستطیل رقبوں میں تقسیم کیا گیا۔ سڑکیں تعمیر ہوئیں۔ گاؤں کے سرحدیں مقرر کی گئیں۔ عہدہ داران مال گنجان اضلاع سے موروثی زمینداروں یا پٹہ داروں میں سے آبادکاروں کو منتخب کرتے تھے اور ان کو نوآبادیوں میں بسایا جاتا تھا۔ مختلف نوآبادیوں میں زمینات کے عطا کرنے کے لئے جدا جدا قواعد قرار دیے گئے۔ ہر شخص کو اوسط چالیس سے پچاس ایکڑ رقبہ اراضی دیا جاتا ہے۔ ذی مرتبت موروثی زمینداروں اور اولوالعزم اشخاص کو زیادہ رقبہ دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کی خاص فوجی اور ملکی خدمات کے صلہ میں بھی عطا کی جاتی ہے۔ یہ نوآبادیاں جو کبھی غیر مزروعہ اور ویران تھیں اب زرخیز نہری نوآبادیات میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ لائل پور، شاہ پور، منٹگمری تین خاص نوآبادیاں ہیں۔ دوسری نوآبادیاں سدہانی، سواج، پراجنگ، چونیاں، شمالی پنجاب اور شمالی جہلم میں ہیں۔ ان نوآبادیوں کا مجموعی رقبہ پچاس لاکھ ایکڑ ہے۔ حکومت پنجاب کو ان نوآبادیوں سے خالص منافع مالگذاری وصول ہو رہی ہے۔ مسٹر ایم ایل ڈارلنگ کے الفاظ میں "یہ نوآبادیاں پنجاب میں خوشحالی کا باعث ہوئیں جو پہلے کبھی خواب و خیال بھی نہ تھا۔"

مملکت آصفیہ میں سر علی امام نے جب وہ صدر اعظم تھے ایک سررشتہ ترقیات عامہ قائم کیا تھا تاکہ ملک کے غیر آباد حصہ کو آباد کیا جائے لیکن بعد میں کام جاری رکھا نہیں گیا۔ ترقیات عامہ کی اسکیم کے حسب ذیل مقاصد تھے۔

(۱) چالیس لاکھ ایکڑ رقبہ غیر مزروعہ و صحرائی کو مزروعہ اور آب پاشی کے قابل بنایا جائے۔

(۲) برطانوی ہند کے متمول مسلمانوں کو ترغیب دلائی جائے کہ اس رقبہ کے معتدبہ حصہ کو خود زمینداری حاصل کریں تاکہ مسلمانوں کی اقلیت تعداد کی دشواریاں اور پیچیدگیاں رفع ہو جاسکیں۔

(۳) ضلع عادل آباد کو ترقی دی جائے۔ سڑکیں وغیرہ بعجلت ممکنہ تعمیر کرائی جائیں اور اس کے لئے نصف حق شاہی کام میں لائی جائے

(۴) عادل آباد کے معدنوں سے استفادہ کیا جائے

(۵) اس کام کی تکمیل کے لئے سررشتۂ مال کا ایک اعلیٰ افسر بطور معتمد ترقیات عامہ مامور ہو اور ایک ماہر چیف انجینیر کو مقرر کیا جائے۔

(۶) عادل آباد کا انتظام متعلق مال جنگلات و لوکلفنڈ کا تعلق صیغہ ترقیات عامہ سے ہو۔

محنت ساز وسامان اور تنظیم

ہندوستانی کاشتکار۔ زمین کے مسئلہ پر غور کرنے کے بعد اب ہم ہندوستانی زراعت یا دیہی معاشیات کے مسائل یعنے محنت یا خود کاشتکار اس کے ساز و سامان اور اس کے تنظیمی کاروبار کا مطالعہ کریں گے۔

یہ ظاہر ہے کہ کامیاب زراعت کا انحصار کاشتکار کے اوصاف پر ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہندوستانی کاشتکار یورپی یا امریکی کاشتکاروں کی بہ نسبت ذہانت، اولوالعزمی اور کارگزاری میں پیچھے ہیں دیرپا خشک سالی، زمین پر کاشت کا بار، دیہی رقبوں میں تعلیم اور حفظان صحت کی سہولتوں کا فقدان، قرضوں کا بار اور ذات پات کے رواج کی وجہ سے اس کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر واکر جیسے بیرونی اہل نظر نے ہندوستانی کاشتکاروں کی محتاط کاشتکاری سخت محنت اور ان استقلال کی بہت کچھ تعریف کی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ اس میں اپج کم ہوتی اور روایاتی طریقوں پر صدہا سے زیادہ کاربند رہتا ہے۔ اس کی قدامت پرستی اصلاح اور ترقی میں اکثر مانع آتی ہے۔ کاشتکار اور اس کا ماحول اصلاح طلب ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ثابت ہوں۔ گاؤں کے ماحول اور احتیاجات کے لحاظ سے سب سے پہلے ایک وسیع دیہی تعلیمی اسکیم کی ضرورت ہے دیہی تعلیم میں لاٹکی سینما، مناظری قندیل، نمایش اور مظاہروں سے کام لینا چاہیئے دوسرے یہ کہ پینے کے پاک و صاف پانی، طبی امداد اور بہتر مکانات کی فراہمی ضروری ہے تاکہ اہل دیہات کی صحت مندی ترقی کر سکے۔ کاشتکار کی قدامت پرستی پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے راستوں، نقل و حمل اور ڈاک کے بہتر انتظام کے ذریعہ سے دیہات اور شہر کے مابین زیادہ تعلق قائم کرنیکی

ضرورت ہے یہ بھی ضروری ہے کہ غائب زمینداری کا نظام دور کیا جائے اور زمیندار کو دیہات کی زرعی ترقی میں بذات خود دلچسپی اور انہماک سے حصہ لینے پر مائل کیا جائے اس طرح اگر ہماری مملکت کے جاگیردار اپنے علاقوں میں مستقل بود و باش اختیار کریں تو توقع ہے کہ دیہات کی اصلاح میں بہت کچھ ترقی ہوگی جاگیردار کے قیام کی وجہ سے مدرسہ خود بخود قائم ہوجائے گا۔ تاکہ خود ان کے بچوں کی تعلیم کا بندوبست ہوسکے۔ ڈاک خانہ بھی اسی طرح قایم ہوجائے گا۔ نیز لامحالہ سڑکوں کی حالت درست ہوجائے گی اور طبی امداد کا بھی انتظام ہوجائیگا۔

کاشت کا طریق ۔ ہندوستانی کاشتکار بڑی حد تک کاشت وسیع کے طریقہ پر عمل کرتا ہے جو اس کی مقبوضہ اراضی کے مختصر رقبہ کے مدنظر غیر موزوں ہے۔ اس کے برخلاف چین و جاپان میں کاشت بہت ہی عمیق اور زمین کی انتہائی قوت تک کی جاتی ہے۔ ہندوستانی کاشتکار کی مشکلات کا حل بھی کاشت عمیق کا طریقہ اختیار کرنے پر منحصر ہے جس میں مستقل اصلاح اور آبپاشی پر زیادہ رقم خرچ کرنا پڑے گی بہتر کاشت اور تخم کے انتخاب میں احتیاط سے کام لیا جائے۔ دوری فصلوں کا بہتر نظام مرتب کیا جائے۔ خالص اور اچھے قسم کے تخم کو زراعت میں بڑی اہمیت حاصل ہے چنانچہ فراہمی تخم کی چند انجمنیں اور مزرعے قایم ہیں ملک کے تمام حصوں میں بہ تعداد کثیر ان کے قیام کی ضرورت ہے۔

اضافہ پیداوار کے لئے بہتر کھاد کا استعمال لازمی ہے۔ ہندوستان میں زمین کے لئے مناسب کھاد اور اس کی حفاظت کا مسئلہ نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ گوبر بطور ایندھن استعمال ہوتا ہے حالانکہ اس کو زیادہ تر کھاد کے کام میں آنا چاہیئے۔ اور ایندھن جنگلات سے مہیا ہونا چاہیئے۔ دیہات میں کھاد محفوظ کرنے کے لئے گڑھے مفید ثابت ہوں گے۔ سررشتۂ زراعت کے پرچار سے نہروں اور دوسرے آبپاشی کے رقبوں میں کھاد جیسے امونیم سلفیٹ ۔ ہڈی کا چورہ ۔ کھلیوں کی کھاد اور کھلی بتدریج کثیر مقدار میں استعمال ہورہی ہے۔

سازوسامان ۔

(۱) **آلات و اوزار** ۔ ہندوستانی کاشتکار اب بھی بڑی حد تک اپنے قدیم اور سادہ آلات

اوزار استعمال کرتا ہے جو ارزاں اور ہلکے ہوتے ہیں۔ ان کا بنانا اور درست کرنا آسان ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ آلات بہرحال پیداآوری میں اضافہ کے لئے ضروری ہیں۔ آہنی ناگر، سراون، بیلچہ، چارہ کاٹنے کی مشین، نیشکر کچلنے والے آلات اور پانی کھینچنے کی چھوٹے مشینوں کا اب کسی حد تک رواج ہو چکا ہے لیکن اس میں مزید ترقی کی گنجائش ہے۔ امریکی طریقہ جس میں وسیع زرعی مشنری کا استعمال ہوتا ہے ہمارے ملک کے لئے بیکار ہے۔ کیونکہ یہاں کے کسان غریب ہیں البتہ امداد باہمی کے اصول پر مشترکہ کاشتکاری میں اس قسم کے محدود مشنری کا استعمال ممکن ہوگا۔ سررشتۂ زراعت شعبۂ انجنیرنگ کے ذریعہ ترقی یافتہ آلات واوزار کے استعمال کو مقبول بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔

مملکت آصفیہ میں سمت مرہٹواری اور کرناٹک میں ترقی یافتہ لوہے کے ہل مقبول ہیں۔ زرعی آلات میں چرخی، بھوسہ نکالنے کی کل، اور نیشکر کچلنے کی مشین کا رواج بڑھ رہا ہے۔ باغات کے مالک باغبانی کے آلات اب بڑھی ہوئی تعداد میں استعمال کرنے لگے ہیں۔ بعض کارخانوں نے آلات واوزار تیار کرنا شروع کردیا ہے۔ اس طرح مملکت میں ایک جدید صنعت ترقی پا رہی ہے۔

(۲) **مویشی** ۔ ہندوستانی کاشتکاروں کے پاس مویشی کی بڑی اہمیت ہے یہی عملاً قوت محرکہ کا ذریعہ بھی ہیں۔ ہل چلاتے اور پانی کھینچتے ہیں۔ کھاد کا بڑا ذریعہ ہیں۔ نقل وحمل کے کام آتے ہیں اس لحاظ سے ہندوستان کے مویشیوں کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ یہہ صحیح ہے کہ ملک میں مویشی بہت زیادہ تعداد میں ہیں لیکن عام طور پر وہ کمزور ہوتے ہیں اور بہتر پرورش نہ ہونے سے ان کی کارکردگی میں انحطاط پیدا ہو رہا ہے۔ ناکارہ مویشیوں کی ایک کثیر تعداد مذہبی اعتقادات کی وجہ سے کم کھائی نہیں جاتی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے بڑے حصوں میں دسمبر سے جولائی تک چارہ کی کمی رہتی ہے۔ چارہ کے فصل کے اضافہ، ان کے ذخیرہ کرنے اور چارہ کو کفایت سے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ نسل کشی کی جانب بھی توجہ نہیں ہے۔ اس کی جانب احتیاط اور وسعت کے ساتھ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کو اس طرف پیش قدمی کرنی چاہیئے۔ سررشتۂ علاج حیوانات نسل کشی او انفارمیشن جیسے امراض کے علاج اور روک تھام کی مفید خدمات

انجام دے رہا ہے۔ رنڈرلپسٹ مرض کی وجہ سے کاشتکار کو سخت نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال ہندوستان میں علاج حیوانات پر توجہ ناکافی ہے اور اس میں توسیع کی ضرورت ہے۔ مویشی کا بیمہ بہت مفید ثابت ہوگا۔

سررشتۂ علاج حیوانات سرکار عالی ۔ سرسالار جنگ اول نے سب سے پہلے دکن کے گھوڑوں اور یابوں کی پرانی نسل کو ترقی دینے اور ان کی پرداخت کی اہمیت کو محسوس کیا۔ چنانچہ انھوں نے ایک آسٹریلین کو ایک بڑی رقم اس غرض سے دی کہ وہ ایک اسٹڈ فارم قائم کرے۔ اس غرض کیلئے لنگم پلی کا انتخاب کرکے وہاں گھوڑوں کے لئے احاطے بنائے گئے لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی اس کے بعد علی بن عبداللہ مہتمم افزایش نسل حیوانات مقرر ہوئے انھوں نے گھوڑوں کی نسل بڑھانے کی جانب خاص توجہ کی۔

سنہ ۱۸۹۷ء میں حیوانات کا علاج کرنے اور ان کے متعدی امراض کا انسداد جدید اصول پر کرنے کے لئے کوئی سرکاری سررشتہ قایم نہ تھا۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں ہنگولی میں ایک اسٹڈ فارم چھوٹے پیمانہ پر بطور آزمایش قائم ہوا۔ یہ اسٹڈ فارم اب جدید ترین طریقہ کے مطابق چلایا جارہا ہے۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں تمام مملکت میں بہائم شماری کا کام آغاز کیا گیا۔ رنڈرلپسٹ جیسے امراض کے علاج اور اس کی روک تھام کے لئے سنہ ۱۹۳۴ء میں پچاس ہزار روپے کی رقم منظور کی گئی۔ اسی سال اضلاع میں ایک خاص رجسٹر مرتب کیا گیا۔ تاکہ اس میں مویشیوں کی ہلاکت کا اندراج ہوا کرے۔ ہر ہفتہ عہدہ داران دیہی کو یہ بتانا پڑتا ہے کہ کس بیماری سے کتنے مویشی ہلاک ہوئے۔ اضلاع میں نمایش کا انعقاد عمل میں آنے لگا اور انعامات دیئے جاتے ہیں تاکہ اچھے نسل کے مویشیوں کی پرورش کی ترغیب ہو۔

سنہ ۱۹۳۴ء کی بہائم شماری کے مطابق مملکت آصفیہ میں مویشیوں کی تعداد ایک کروڑ تیس لاکھ تھی۔ فی مربع میل ان کی تعداد ۷۵۰۱ ہے اور ایک سو ایکڑ کے زرعی رقبہ میں ان کی تعداد (۴۳) ہے۔

سنہ ۴۱-۱۹۴۰ء میں حکومت نے مملکت حیدرآباد میں مرغیوں کی بیماریوں کی تحقیق کے لئے ایک اسکیم منظور کی۔ اس کے نصف اخراجات امپریل کونسل آف اگریکلچرل ریسرچ کے ذمہ ہوں گے۔ اور بقیہ نصف اخراجات سررشتۂ علاج حیوانات اور سررشتۂ زراعت علی السویہ طور پر برداشت کریں گے۔

دیہی صنعتیں ۔ دوسرے کاروبار کی طرح زراعت میں بھی تنظیم کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ حالت موجودہ ہندوستان میں داخلی تنظیم (مثلاً معاشی نقطۂ نظر سے محدود قطعات اراضی مستقل اصلاح و ترقی اور ذیلی صنعتیں) اور خارجی تنظیم (مثلاً مارکٹنگ) بہت خراب حالت میں ہے۔

ہندوستان میں ذیلی صنعتوں کے فقدان نے چھوٹے کاشتکاروں کی معاشی حالت کو بہت پست کر دیا ہے۔ ان کی موجودگی میں کاشتکار اپنی محنت کو پورے سال پر مساوی طریقہ پر پھیلائے رکھنے اور اپنی معاشی حیثیت و حالت درست رکھنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ زرعی پیشہ کی موسمی خصوصیات کی وجہ سے موجودہ زمانہ میں دیہی محنت ضائع ہوتی ہے۔ سرد بازاری کے موسم میں جس کی مدت ملک کے مختلف حصوں میں ۱۵۰ دن سے ۲۷۰ دن فی سال ہے۔ کاشتکار عملاً بے کار رہتا ہے۔ جیسا کہ مسٹر ڈارلنگ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ "ایک چھوٹے کاشتکار کے قرضدار نہ ہونے کی صرف یہی صورت ہے کہ وہ کفایت شعاری اور تندہی کے ساتھ زندگی بسر کرے، اور اپنی فرصت کے اوقات میں کوئی دوسرا کام دھندا کرتا رہے جیسے کہ جاپان، فرانس، جرمنی، اور اٹلی میں ہوتا ہے۔ شیرخانہ افزائش مویشی خاص ذیلی پیشے ہیں۔ حسب ذیل دیہی صنعتیں ایسی ہیں کہ جن کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مرغبانی، میووں کی کاشت، تجارتی باغبانی، گڑ سازی، ہمکیات۔ ہاتھ سے اناج پچھوڑنا، ریشم کے کیڑوں کی پرورش، مگس پروری، دباغت، بوریہ سازی، صابن سازی، کھلونا سازی، بانس کی صنعت اور بیسلہ بافی، رسی سازی، دستی کاغذ سازی، بیڑی سازی، کمہار کا کام، چوڑی سازی وغیرہ ظاہر ہے کہ یہ تمام صنعتیں ہندوستان کے ہر مقام کے لئے مفید نہیں ہو سکتیں۔ ذیلی صنعت کے مناسب انتخاب کے لئے جغرافیائی تحقیق کی ضرورت ہے۔

دستی کتائی کی دیہی صنعت پر ان دنوں بہت توجہ کی جا رہی ہے کیونکہ گاندھی جی کی وجہ سے چرخہ مرکز توجہ بنا ہوا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ دستی کتائی بہت سادہ اور آسانی سے سیکھی جا سکتی ہے۔ اسکا جب چاہے کام کیا جا سکتا ہے۔ جب چاہیں چھوڑ سکتے ہیں تاکہ زراعت میں اس سے کچھ ہرج نہ ہو۔ چرخہ کے خلاف میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہمیشہ کھدر کارخانہ کے بنے ہوئے ملایم اور جاذب نظر ارزاں

کپڑے کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ نہیں کرسکتا۔ بہرحال جب تک کاشتکار کو دوسرے منفعت بخش ذیلی صنعت کا بدل نہ ہو۔ دستی کتائی ہی اس کے موازنہ کو سالانہ متوازن کرتی رہے گی۔ لیکن مشین کا مقابلہ چرخہ کب تک کرسکے گا۔ یا مقابلہ کر بھی سکتا ہے یا نہیں۔ بہت غور طلب مسئلہ ہے بعض لوگوں کا خیال کہ اس مسئلہ کا امید افزا حل یہ ہے کہ دیہی علاقوں میں مقامی ضروریات اور برآمد کے لئے زرعی پیداوار کی تیاری یعنے روئی اوٹنے، ناریل چھیلنے بھوسہ نکالنے روغن برآری اور چانول کے کارخانے قائم کئے جائیں لیکن اس کے باوجود مشین کا مقابلہ ہر حالت میں پیش آئے گا اور قیمتوں میں جو تفاوت رہے گا۔ اس کا حل دریافت طلب ہے۔

زرعی پیداوار کی فروخت ۔ زراعتی خارجی تنظیم کا تیسرا مسئلہ زرعی پیداوار کی فروخت کا ہے۔ تاکہ کاشتکار کو زیادہ فائدہ حاصل ہو۔ فروخت پیداوار کے موجودہ طریقے میں بہت سے نقائص پائے جاتے ہیں۔ ہندوستانی کاشتکار کا انحصار عموماً ساہوکار پر ہوتا ہے اور کاشتکار کی فصل اکثر پیشگی رہن ہو جاتی ہے۔ اس کے سوا صد ہا منظم پیشہ ور تاجر اور درمیانی اشخاص کاشتکار کی محنت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس کے علاوہ خواندگی کا ادنیٰ معیار باضابطہ منڈیوں اور کاشتکاروں میں اتحاد عمل کی کمی اوزان اور پیمانوں کی بے قاعدگی پیداوار کو ذخیرہ کرنے کی ناکافی سہولتیں اور دیہات میں ذرائع آمدورفت کے ناکافی انتظام یہ سب کاشتکاروں کی دوسری رکاوٹیں ہیں۔ سرمایہ کی کمی اور سرکاری زرلگان کی نقد ادائے گی کی وجہہ سے کاشتکار کو اپنی پیداوار کم قیمت سے فروخت کردینی پڑتی ہے۔ اور اس طرح اس کو اچھی قیمت نہیں ملتی۔ منڈیوں میں دلالوں کے ذریعہ فروخت پیداوار کا طریقہ بھی نقصان رساں ہے۔ بڑھیا کمیشن کے علاوہ دیگر غیر قانونی مصارف بھی ہیں۔ جو ایک ضرورت مند فروشندے کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

غرض یہ ظاہر ہے کہ دیہی خوشحالی اور اصلاح کے لئے ایک منظم فروخت پیداوار کے نظام کی ضرورت ہے۔ اصلاح کی حسب ذیل دو صورتیں مناسب ہوں گی۔

(۱) امداد باہمی کے ذریعہ فروخت کا انتظام (۲) باضابطہ منڈیوں کا قیام ۔

(۱) انجمن ہائے امداد باہمی - پیداوار فروخت کرنے کی انجمنیں خاص کر گجرات اور کرناٹک میں کپاس کی فروخت کے لئے کسی قدر ترقی یافتہ حالت میں ہیں پنجاب میں اور صوبۂ متحدہ میں گیہوں کی فروخت کے لئے امداد باہمی کی دکانیں قایم ہیں۔ بنگال میں جوٹ کی فروخت کے لئے انجمن قائم ہے۔ فروخت پیداوار کے لئے انجمن ہائے امداد باہمی کے قیام سے بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں مثلاً بعض درمیانی اشخاص اور ان کے بڑھیا کمیشن کے اخراجات عائد نہیں ہوتے صحیح اوزان اور پیمانے کا استعمال ہوتا ہے پیداوار کی ٹھیک ٹھیک درجہ بندی ہوتی ہے اور اچھی قیمت وصول ہوتی ہے پیداوار پر پیشگی رقوم بھی ملتی ہیں۔ تحریک فروخت پیداوار کی ترقی بہت محدود رہی ہے۔ جس کے اصلی وجوہ انتظامی قابلیت کی کمی اراکین پر انجمن کا عدم اقتدار اور رقمی گنجایش کی کمی ہے۔

(۲) باضابطہ منڈیاں - صوبہ بمبئی کے چند اضلاع میں بمبئی کاٹن مارکٹ ایکٹ بابتہ ۱۹۲۷ء کے تحت باضابطہ منڈیاں قائم ہوئیں یہ منڈیاں مدراس میں ۱۹۳۳ء میں صوبہ متوسط میں ۱۹۳۵ء صوبہ سرحدی اور پنجاب میں ۱۹۳۹ء میں قایم ہوئیں ان سے فروخت پیداوار کی تنظیم کی جاتی ہے یہاں خرید و فروخت باضابطہ قواعد کے تحت ہوتی ہے ایک مارکٹ کمیٹی قایم کی جاتی ہے جس میں پیدا کنندگان اور آجروں کے نمایندے شریک ہوتے ہیں۔ اوزان اور پیمانے کے معین کرنے کی طرف بھی زیادہ توجہ کی جارہی ہے۔ رسوم و رواج اور قدامت پرستی کی وجہ سے اس میں اصلاح بہت تدریجی طور سے ہو رہی ہے۔

حکومت ہند نے زرعی پیداوار کی فروخت کی جانب بہت توجہ کی ہے۔ اپریل ۱۹۳۴ء میں مسٹر اے، ایم لیونگ اسٹون کا تقرر مارکٹنگ کے ماہر کی حیثیت میں امپیریل کونسل آف اگریکلچرل ریسرچ کے اسٹاف کے ساتھ کیا گیا ہے۔ زرعی کمیشن (۱۹۲۸ء) کی سفارش کے بموجب مارکٹنگ کے ایک مرکزی دفتر کا عملہ اور صوبہ داری مارکٹنگ آفیسر بھی مقرر کئے گئے ہیں۔ یہ جدید تنظیم مختلف صوبوں میں خاص فصول سے متعلق مارکٹنگ کی تحقیقات میں مصروف ہے۔ تاکہ آیندہ کے لئے ترقی کی ایک عام بنیاد دریافت کی جائے۔ گیہوں، السی اور تمباکو کی مارکٹنگ سے متعلق جامع رپورٹیں

شائع ہو چکی ہیں۔ زرعی پیداوار سے متعلق گریڈنگ اور مارکٹنگ ایکٹ بابتہ ۱۹۳۷ء منظور ہو چکا ہے جس سے کاشتکاروں کو بیش بہا فوائد حاصل ہوں گے اور اپنی پیداوار کی واجبی قیمت ملے گی۔ آل انڈیا ریڈیو کے ذریعہ مارکٹ کی خبریں سنانے کا بھی انتظام ہو چکا ہے۔

مملکت آصفیہ میں زرعی پیداوار کی فروخت۔ زرعی مارکٹوں کا قانون نشان (۲)، بابتہ ۱۳۳۹ف کے بموجب ۱۹۳۱ء میں پانچ باضابطہ منڈیوں کا قیام، ناندیڑ، سیلو جالنہ، عمری، اور لاتور میں عمل میں آیا۔ برطانوی ہند کے مماثل قوانین کے مقابلہ میں قانون زراعتی مارکٹ حیدرآباد کا اطلاق روئی کے علاوہ دیگر زرعی پیداوار پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ پس یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے اس خصوص میں سرکار عالی نے آگے قدم بڑھایا۔ قانون مذکور کا زرعی پیداوار پر اطلاق ہونے کی وجہ سے مارکٹوں میں مختلف دشواریاں پیش آتی ہیں۔ مگران دشواریوں کا زیادہ تر دفعیہ ہوتا رہا۔ بائع و مشتری و نیز عام رعایا کو قانون مذکور کے مفید نتائج کا احساس ہوتا جا رہا ہے۔ اسی وجہ سے اس قانون کا نفاذ ۱۹۳۷ء میں مزید بارہ مقامات پر عمل میں لایا گیا ۱۳۴۸ف میں ان کی تعداد ۲۲ ہو گئی اس قانون کے لحاظ سے کمیشن (اڑت) کی انتہائی مقدار، ناپ اور دوسرے اخراجات کا تعین کر دیا گیا ہے۔ زرعی پیداوار میں چالیس اقسام کے اشیاء شامل ہیں اور ان کی فروخت باضابطہ منڈیوں کی نگرانی میں کی جاتی ہے۔ باضابطہ منڈیوں میں کام کرنے والے مثلاً، خریدار، اڑتیا، دلال، ناپنے اور تولنے والے تمام لائسنس یافتہ ہوتے ہیں۔ اور ان کے جھگڑے ثالثی کے ذریعہ طے پاتے ہیں۔

باضابطہ منڈیوں کے قیام سے بہت سے فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔ بازار کے صحیح حالات بروقت معلوم ہو رہے ہیں۔ اوزان اور پیمانے معین ہو گئے ہیں۔ عثمانیہ سکہ کا رواج بڑھ رہا ہے کاشتکاروں سے مذہبی یا خیراتی نام سے کوئی حصہ پیداوار یا قیمت وصول کرنا موقوف ہو چکا ہے۔

مملکت حیدرآباد، امپریل کونسل آف اگریکلچرل ریسرچ کے ساتھ زرعی پیداواروں کی فروخت کے سروے کے متعلق باہمی تعاون کر رہی ہے۔ اہم فصول مثلاً، چانول، گیہوں، مونگ پھلی، میوؤں کے

علاوہ دودھ، گھی، چمڑے اور کھالوں کی سروے کی جا رہی ہے۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں چنے، مکائی کا جو اور لاک کی مارکٹنگ سروے کا کام جاری رہا۔ انڈوں اور چاول کی درجہ بندی کا کام آغاز کیا گیا۔

دیہی قرضداری

دیہی قرضداری کا تخمینہ۔ ہندوستان میں دیہی معیشت کا ایک اہم مسئلہ دیہی قرضداری کا بار ہے۔ سنٹرل بنکنگ انکوائری کمیٹی کی رپورٹ سنہ ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی اس کمیٹی نے برطانوی ہند کے صوبہ جات میں جملہ زرعی قرضداری کا اندازہ تقریباً نو سو (۹۰۰) کروڑ روپے کیا تھا۔ صوبہ جات کے اعداد حسب ذیل ہیں۔

بمبئی (بشمول سندھ) ۸۱ کروڑ روپے۔ مدراس ۱۵۰ کروڑ روپے۔ بنگال ۱۰۰ کروڑ روپے صوبۂ متحدہ ۱۲۴ کروڑ روپے، پنجاب ۱۳۵ کروڑ روپے۔ صوبۂ متوسط و برار ۳۶½ کروڑ روپے بہار و اڑیسہ ۱۵۵ کروڑ روپے، آسام ۲۲ کروڑ روپے۔ مرکزی حکومت کے زیر اقتدار رقبے ۱۸ کروڑ روپے کورگ ۵۵ لاکھ روپے۔

ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی چھوٹے کاشتکار کو قرضہ لینا پڑتا ہے۔ ہندوستانی کاشتکار برطانوی حکومت سے قبل بھی قرضدار تھا لیکن خاص کر حالیہ دور میں دیہی قرضہ میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ قرضہ کی مقدار موجودہ زمانہ میں ۹۰۰ کروڑ ہے قرضہ کی کثیر مقدار سے کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا لیکن چونکہ یہ قرضے زیادہ تر غیر پیداواری اغراض کے لئے اور بہت بڑھیا شرح سود سے لیے گئے ہیں اس لئے قرضہ کی کثیر مقدار اندیشناک خیال کی جاتی ہے۔

قرضداری کے اسباب۔ موجودہ کے ابتدائی اقتباس کے قطع نظر دیہی قرضداری کے حسب ذیل اصلی وجوہ ہیں۔

(۱) زمین پر آبادی کا انتہائی بار اور تقسیم و انتشار اراضی آبادی کا اضافہ اور دیہات میں خاص کر آبادی زیادہ تر زرعی پیشہ اختیار کرنے کی وجہ سے زمین پر بہت بار عائد ہو چکا ہے۔ کمل اور

مفید کاشتکاری کے لئے درحقیقت جس قدر زراعت پیشہ افراد کی ضرورت ہے اس سے کہیں زیادہ تعداد میں لوگوں کی زندگی کا انحصار زراعت پر ہو گیا ہے ۔ اس کے علاوہ اراضی کا کثیر حصہ تقسیم در تقسیم اور انتشار اراضی کی وجہ غیر معاشی ہے ۔ اور بہترین موسمی حالات میں بھی بہت کم آمدنی ہوتی ہے ۔ گھریلو صنعتوں کے زوال اور دوسرے ذیلی پیشوں کے فقدان کی وجہ سے بھی کاشتکار کی معاشی حالت ابتر ہو گئی ہے ۔

(۲) فصل کی غیر یقینی حالت ۔ بمبئی دکن جیسے بارش کے غیر یقینی خطوں میں برشکالی زمانہ میں زراعت کرنا گویا ایک جوا ہے ۔ عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پانچ سال کے زراعتی دور میں ایک سال اچھا، ایک سال خراب اور تین سال متوسط ہوتے ہیں ۔ صرف اچھے سالوں میں کسان قرضدار نہیں ہوتا ۔

(۳) قحط اور رنڈر پسٹ جیسے امراض سے مویشی ہلاک ہو جاتے ہیں ۔ اس کی وجہ سے بھی کاشتکار کی معاشی تکالیف میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔ اور مویشی کی خریدی کے لئے اکثر قرض لینا پڑتا ہے ۔

(۴) مقدمہ بازی سے رغبت اور فضول خرچی اور اسراف قرضداری کے اسباب بیان کئے جاتے ہیں ۔ ہندوستانی کسان عام طور پر کفایت شعار ہوتا ہے ۔ مگر بعض موقعوں مثلاً موت اور شادی کے رسومات پر اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرتا ہے اس کی بڑی وجہ رسم و رواج اور تعلیم سے غفلت ہے ۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ پہلے دوسرے اور تیسرے سبب کی وجہ سے کاشتکار زیادہ قرضدار ہوتا ہے ۔

(۵) موروثی قرضے جو باپ سے بیٹے پر منتقل ہوتے ہیں موجودہ قرضداری کا ایک اہم سبب خیال کئے جاتے ہیں ۔ " صدہا لوگ قرضداری کی حالت میں پیدا ہوتے ہیں ۔ قرضدار رہتے ہیں ۔ اور اپنے ورثا پر قرضہ کا بار چھوڑ کر مر جاتے ہیں ۔"

(۶) عصری ترقیات ۔ مسٹر ڈارلنگ کہتے ہیں کہ " خوشحالی بھی قرضہ کا ایسا ہی سبب ہے جیسا کہ فصل کی غیر یقینی حالت ۔ ہندوستان میں امن و امان کا قیام شہروں میں اضافے اور ہندوستانی پیداوار کے لئے دنیا کے بازار کھل جانے کی وجہ ساہوکار سے قرضہ حاصل کرنے میں زمین قابل

ضمانت ہوگئی ہے جس کی وجہ غیر تعلیم یافتہ کسان کو قرضہ حاصل کرنے کی خواہ مخواہ ترغیب ہوتی ہے۔

(۷) ساہوکار اور رباخواری ۔ برطانوی عدالتوں کے قائم ہونے اور ان کے ضوابط نے ساہوکاروں کو بہت زیادہ سہولتیں بہم پہنچائیں اور دیہات کے باشندوں کی اجتماعی قوت و اثر میں انحطاط پیدا ہوجانے کی وجہ سے ساہوکاروں پر دیہاتی معاشرہ کا اخلاقی دباؤ کم ہوگیا۔ لامحالہ ساہوکاروں نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ کاشتکاروں کی حالت کمزور ہوگئی۔ بڑھیا شرح سود اور رباخواری کی وجہ سے رعیت کو لوٹنے کا موقعہ ہاتھ آیا۔ اور ان کے قبضہ سے بہت سی دیہات نکل گئیں۔ ساہوکار بڑھیا شرح سود قرار دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اوس کو اکثر اپنی رقم کے ضائع ہونے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔

(۸) مالگذاری ۔ بقول ڈارلنگ بہت اضافہ مالگذاری اور اس کی وصولی میں تشدد کی وجہ سے بھی قرضداری میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔ اصول مالگذاری کو زیادہ لچکدار بنانے کی ضرورت ہے تاکہ مصیبت کے وقت خواہ وہ قلت بارش کی وجہ سے ہو یا قیمتوں میں تخفیف کا فوری التوا یا معافی منظور کی جاسکے ۔

مملکت آصفیہ میں دیہی قرضداری کا تخمینہ اور تدابیر۔ کاشتکاروں کی مالی حالت کی اصلاح کی طرف حکومت آصفیہ کی توجہ ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں کاشتکاروں کی مالی حالت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے حیدرآباد کے تمام اضلاع میں جو تحقیقات کرائی گئی ہیں ان کا حال مسٹر ایکگار کی چار ضخیم جلدوں سے واضح ہوتا ہے۔ ممالک محروسہ میں زرعی قرضداری کس حد تک پھیلی ہوئی ہے اس کی تحقیق مسٹر جے وی جوشی کی نگرانی میں ۱۳۴۰ف میں دیوانی دیہات میں تحقیقات عمل میں لائی گئی ہر تعلقہ کے دیہات کو مالگذاری اہمیت اور آبادی کے لحاظ سے تین درجوں میں تقسیم کرکے ہر تعلقہ سے تین نمونے کے دیہات کا انتخاب کیا گیا۔ جو نتائج اس تحقیقات سے برآمد ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ ممالک محروسہ کی کل زرعی آبادی کی زرعی قرضداری کی مجموعی مقدار تقریباً ۶۴½ کروڑ روپے ہے اور یہ کہ اوسط شرح سود اتفاقاً ۹ فیصد ہے اور اراضی تیزرفتاری سے کاشتکاروں کے ہاتھ سے

منتقل کرساہوکاروں کے ہاتھوں میں چلی جارہی ہے۔ تحقیقات کی رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے
کہ اگرچہ زرعی قرضے کی مقدار زیادہ ہے لیکن کاشتکار دیوالیہ نہیں ہے اور اپنی اراضی کی
سے ادائی کرسکتا ہے بشرطیکہ مناسب امدادی تدابیر اختیار کی جائیں کیونکہ زرعی زمینات کی مالیت موجودہ
تشخیص مالگزاری سے ۲۶ گنا زیادہ بتائی جاتی ہے۔ کاشتکاروں کی امداد کے لئے جو تدابیر پیش کی گئیں
وہ یہ ہیں۔ انتقال اراضی کی روک تھام بجہت سے قرضوں کا تصفیہ، قرضوں کی ادائی کے لئے
زمین گروی بنکوں کا قیام، امداد باہمی کے اصول پر فروخت پیداوار کا بندوبست قانون کے ذریعہ
ساہوکاری کی نگرانی، سارے ممالک محروسہ میں معیاری اوزان اور پیمانوں کا رواج، دیہی پنچایتوں کا قیام
اور زرعی مقبوضات کا استحکام و حفاظت۔ ان سفارشوں پر جو عمل کیا گیا اس کو آگے چل کر بیان کیا جائیگا۔

قرضداری کے متعلق حکومت ہند کی پالیسی - دکن کے بلووں کی کمیشن بابتہ ۱۸۷۵ء
کے بعد دیہی قرضداری کے مسئلہ کی نزاکت نے عوام کی توجہ کو منعطف کیا حکومت نے بھی اس مسئلہ کے
حل کرنے میں وقت ضرورت مختلف تدابیر اختیار کیں سب سے پہلے ضابطہ دیوانی میں بعض ترمیمات
کی گئیں۔ آلات و اوزار اور مویشی ضبطی سے مستثنیٰ کرائے گئے۔ قانون امداد کاشتکاران دکن بابتہ
۱۸۷۹ء کے تحت عدالتوں کو قرضدار کاشتکار اور قرضخواہ کے مابین معاہدہ اور اس کے پس منظر
تحقیقات کا کاشتکار کے ساتھ رعایت کے پیش نظر شرح سود میں کمی کے ذریعہ دستاویز معاہدہ
کی تبدیلی اور اگر ضرورت ہو تو اراضی کے تحفظ کا اختیار حاصل ہوا یہ قانون غیر موثر ثابت ہوا
کسی حد تک ان سہولتوں سے ناجائز فائدہ حاصل کیا جانے لگا۔ قانون سود ۱۹۱۸ء میں ترمیم کے
بعد از سر نو مرتب و منظور ہوا جس کے ذریعہ قابل وصول سود کی انتہائی مقدار معین کی گئی۔ زرعی کمیشن
نے قرضوں کے قواعد اور بعض صوبہ واری تحقیقاتی کمیٹیوں نے ساہوکاروں کو اجازت نامہ جاری کرنے کی
سفارش کی ہے پنجاب ریگولیشن آف اکاونٹس ایکٹ بابتہ ۱۹۳۰ء کے ذریعہ ساہوکاروں کے لئے
لازمی قرار دیا گیا کہ باقاعدہ حساب کتاب رکھیں اور ہر ایک قرضدار کو اس کے حساب کی ایک
فرد دی جائے۔ اکثر صوبوں میں ساہوکاروں کا [illegible] قرضے کے [illegible] کے لئے قوانین نافذ کئے۔

اور بعض صوبوں میں ساہوکاروں کے لئے اجازت نامہ کا حصول اور ان کی رجسٹری لازمی قرار دی گئی
دیہاتی قرضہ کا زیادہ امید افزا حل رضاکارانہ اساس پر قرضوں کا باہمی سمجھوتہ ہے جس کو بنک کاری
کی مرکزی تحقیقاتی مجلس نے تجویز کیا۔ اس طریقہ کو اختیار کرنا اس وجہ سے بہت ضروری ہے کہ پچھلے قرضوں
کا بار بہت بڑھ گیا ہے۔ ساہوکار بھی ثالثی کے ذریعہ قرضوں کا سمجھوتہ کر لینے پر آمادہ نظر آرہے ہیں۔
صوبۂ متوسط، پنجاب، بنگال، مدراس اور بعض ہندوستانی ریاستوں مثلاً بھاؤنگر میں اس قسم کی
کوشش جاری ہیں۔ شرح قرضہ کا جبری تعین بعض صوبوں میں ضروری خیال کیا گیا ہے چنانچہ ۱۹۳۸ء
میں مدراس میں یہ طریقہ بذریعہ قانون نافذ کیا گیا۔ ۱۹۳۹ء میں بمبئی میں بھی ایک مسودہ قانون
پیش کیا گیا تھا جس کے ذریعہ ادائی قرضہ کی مجالس قائم کرنا پیش نظر تھا۔ تاکہ قرضوں کا باہمی تصفیہ
ہو سکے۔ مدعا یہ تھا کہ جبری طور سے لین دار کی حیثیت کے لحاظ سے قرضہ مقرر کیا جائے۔

بعض صوبوں میں قانون انتقال اراضی کا خیال بھی پیدا ہوا تاکہ انتقال اراضی پر پابندیاں
عاید کی جائیں۔ قانون انتقال اراضی پنجاب سنہ ۱۹۰۰ء کے تحت غیر زرعی طبقوں کو نہ تو زرعی طبقہ
کے کسی رکن سے زمین خریدنے کی اجازت ہے اور نہ زمین کو بیس سال سے زیادہ کے لئے رہن
لینے کی۔ بہرحال اس قانون سے دیہی ساہوکاری پر بالعموم مخالف اثر مرتب ہوا ہے اور ایسے ساہوکاروں
کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے جو کاشتکاروں سے ناجائز فائدہ اٹھایا کرتے ہیں۔

قانون قرضہ برائے اصلاح اراضی ۱۸۸۳ء اور قانون قرضہ کاشتکاران ۱۸۸۴ء کے ذریعہ
حکومت کاشتکاروں کو تقاوی قرضے عطا کرتی ہے لیکن حکومتی قرضوں کا یہ طریقہ دفتریت کی چکر
اور قرضوں کی بازیافت میں سختی برتنے کے طریقے کے باعث مقبول نہیں ہوا۔ انجمن ہائے امداد باہمی
اور زمین گروی بنکوں کے ذریعہ امداد باہمی کے اصول پر قرضوں کی فراہمی ان تمام طریقوں کے مجموعہ
حکومت نے دیہی قرضداری کے ارتفاع میں اختیار کئے ہیں بہت امید افزا ثابت ہو رہے ہیں۔

مملکت آصفیہ میں زرعی قرضداری کے ارتفاع کے تدابیر۔ زرعی قرضہ
کو قابو میں رکھنے کے لئے قانون انتقال اراضی، قانون مصالحت قرضہ اور قانون ساہوکارہ ۱۹۳۶ء

میں لفظاً عمل میں آیا ساہوکاروں نے جو ان تدابیر کے متعلق شروع ہی سے معاندانہ روش رکھتے تھے بڑی حد تک قرضہ دینا موقوف کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاشتکاروں کو نئی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ان مشکلات کا ازالہ ایک حد تک حکومت کے خصوصی قرضوں سے ہوا اور یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ قرضوں میں کچھ نہ کچھ کمی ہو گئی ہے۔ جو ممکن ہے کہ آگے چل کر کاشتکاروں کے حق میں مفید ثابت ہو اس سے کاشتکاروں میں کفایت شعاری خود اعتمادی اور آزادی کی امنگ پیدا ہو جائیگی۔ ایک بات جو نظر انداز نہیں کی جا سکتی یہ ہے کہ قرضہ [illegible] کی وجہ سے گو مشکلات ضرور پیش آئیں لیکن کوئی اراضی بغیر کاشت نہیں چھوڑی گئی اور ثابت ہو گیا کہ کاشتکار اپنے انتظامات بغیر ساہوکاروں کی مدد کے عمل میں لا سکتا ہے۔

سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۳۳ء کے دوران میں ۲۶ مجالس مصالحت قرضہ قائم کی گئیں نیز سنہ ۱۹۴۰ء میں مختلف تعلقوں میں مصالحتی مجالس قرضہ کی تعداد ۱۶ تھی۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں جملہ ۳۵۲۹ مقدمات جو ۳۴ لاکھ ۴۶ ہزار روپے کی مالیت کے تھے بغرض تصفیہ مجالس میں پیش ہوئے اور مجموعی طور پر جملہ [illegible] مقدمات کا تصفیہ کیا گیا۔ جو [illegible] لاکھ ۳۴ ہزار روپے کے قرض سے متعلق تھے۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں جملہ ۱۰۲۶ مقدمات جو [illegible] لاکھ [illegible] ہزار روپے کی مالیت کے تھے پیش ہوئے اور مجموعی طور پر ۴۰۰ مقدمات کی یکسوئی کی گئی جو [illegible] لاکھ ۱۸ ہزار روپے کے قرض سے متعلق تھے ان کا [illegible] لاکھ ۸۲ ہزار میں تصفیہ کیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ اضافہ نرخ ہائے اشیاء اور نتیجۃً زراعت پیشہ کی مالی بہتری نے بڑی حد تک مجالس کے کام کو متاثر کیا۔ تاہم مجالس کی کارکردگی کے نتائج معمولی اور مایوس کن ہیں۔ مقامی عہدہ داران مال کو چاہیے کہ اپنے اپنے حدود اراضی میں مجالس مصالحت قرضہ کی امکانی حد تک تشہیر کرائیں۔ اور عہدہ داران عدالت کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ مقدمات کا عاجلانہ تصفیہ کریں۔ کیونکہ عاجلانہ تصفیہ ہی ان مجالس کو مقبول بنا سکتا ہے۔ فی الحال ان مجالس کے قیام کا مقصد پورا نہیں ہو رہا ہے۔

قانون انتقال اراضی ۔ دستورالعمل انتقال اراضی کو ۱۹۳۵ء میں پہلی دفعہ اضلاع اورنگ آباد اور عثمان آباد میں تجربے کے طور پر نافذ کیا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۴۰ء سے دستورالعمل بنام قانون امتناع انتقال زرعی اراضی نافذ کر دیا گیا اس قانون کے نفاذ کی غرض و غایت یہ ہے کہ بجز خاص صورتوں کے زرعی اراضیات غیر کاشتکار طبقوں کے قبضہ و تصرف میں جانے نہ پائیں اور ڈگریوں کی تعمیل میں انہیں فروخت نہ کیا جا سکے نیز مقررہ طبقات کے اراکین کے درمیان قابل انتقال اراضی کی کم ترین اور زیادہ سے زیادہ مقدار کا تعین کر دیا گیا ہے تاوقتیکہ اراضی کی منتقلی کے بعد منتقل کنندہ کے قبضہ میں ۵۰۰ روپیہ سالانہ کی آمدنی کی اراضی باقی نہ رہے اس طبقہ کے کسی منتقل کنندہ کو اس طبقہ کے کسی دوسرے رکن پر اراضی منتقل کرنے کا حق نہ ہوگا۔

قانون ساہوکاراں ۔ ۱۹۳۷ء میں قانون ساہوکاران منظور کیا گیا۔ یہ محسوس کیا گیا کہ جب تک ساہوکاری لین دین کی معقول نگرانی نہ کی جائے جو قوانین کاشتکاران کو زرعی مقروضیت سے نجات دینے کی غرض سے نافذ کئے گئے ہیں بے نتیجہ ثابت ہوں گے چنانچہ قانون ساہوکاران کے اجرا کے ساتھ ساتھ ساہوکاروں کے ناموں کی رجسٹری بھی لازم قرار دی گئی اور ان پر لازم گردانا گیا کہ رجسٹری کی اجازت نامے حاصل کرنے کے علاوہ مقررہ اوقات پر حسابات کی تفصیل قرض لینے والوں کے سامنے پیش کیا کریں۔

ہندوستان میں تحریک امداد باہمی

ہندوستان میں امداد باہمی کے ذریعہ دیہی قرضداری کے ارتفاع کی تجویز سب سے پہلے نکلسن نے پیش کی جو مدراس کے ایک سیویلین تھے انھوں نے یورپ کے زرعی اور دوسرے بنکوں کے حالات کا خاص طور پر مطالعہ کیا تھا موصوف نے اپنی رپورٹ سنہ ۱۸۹۵-۹۷ء میں قرضہ کے لئے جرمنی کی ریف آیزن انجمنوں کے اصول پر امداد باہمی کے ادارے قائم کرنے کی تجویز و سفارش کی چنانچہ سنہ ۱۹۰۴ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل سے قانون انجمن ہائے امداد باہمی (برائے قرضہ) منظور ہوا ابتداء میں اس قانون کی رو سے صرف قرضہ کی دیہی اور شہری انجمنیں قائم کی جاسکتی تھیں اور غیر قرضہ نوعیت کی دوسری تمام انجمنیں اس قانون کے دائرہ سے باہر تھیں۔ دس یا اس سے زیادہ اشخاص قرضہ کی انجمن قائم کرسکتے تھے بشرطیکہ سب ارکان ایک ہی گاؤں یا ایک ہی ذات یا ایک ہی فرقہ یا ایک ہی شہر سے تعلق رکھتے ہوں۔ دیہی انجمنوں کی ذمہ داری غیر محدود رکھی گئی لیکن شہری انجمنوں کی صورت میں ذمہ داری انجمنوں کے اختیار پر چھوڑ دی گئی۔ دیہی انجمنوں کی صورت میں تمام منافع اور شہری انجمنوں کی صورت میں چوتھائی منافع مد محفوظ میں جمع کرنے کی شرط عائد کی گئی۔ انجمن اپنا سرمایہ اراکین کے فیس داخلہ حصص امانتوں اور بیرونی قرضوں کے ذریعہ فراہم کرتی تھیں اور حاصل شدہ سرمایہ سے صرف اراکین کو قرضہ دیا جاسکتا تھا۔ تمام صوبوں میں انجمنوں کے معائنہ اور نگرانی کی غرض سے رجسٹرار مقرر کئے گئے حکومت نے اپنے لئے حسب ذیل چند خاص اختیارات محفوظ رکھے۔

(۱) لازمی معائنہ اور تنقیح حسابات۔ (۲) اگر ضرورت متصور ہو تو کسی انجمن کو برخاست کردینے کا رجسٹرار کو اختیار ہوسکتا مگر اس کا مرافعہ صوبہ واری حکومت کے پاس کیا جاسکتا تھا۔ (۳) قواعد سازی کا وسیع اختیار۔ اس قانون کے تحت رجسٹر ہونے والی انجمنوں کو حکومت نے ان کی ہمت افزائی کے لئے چند مراعات عطا کئے مثلاً ان کو انکم ٹیکس فیس اسٹامپ اور فیس رجسٹریشن سے مستثنیٰ کیا گیا۔ انجمن کے قرضہ کو دوسرے قرضخواہوں پر ترجیح دی گئی حکومت کی جانب سے نئی انجمنوں کو ابتداءً تین سال تک بلا سود کے حسب ضرورت بھی قرضہ عطا کیا جاتا تھا۔

اس تحریک کو ہر صوبہ میں ترقی حاصل ہوئی چنانچہ سنہ ۱۲-۱۹۱۱ء میں انجمنوں کی تعداد ۸۱۰۰ اراکین کی تعداد ۳ لاکھ ہو گئی اور ان کا سرمایہ زیر استعمال تین کروڑ ۲۵ لاکھ روپے تھا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں نیا قانون امداد باہمی منظور ہوا اس نئے قانون کی رو سے ہر قسم کی انجمن ہائے خرید و فروخت پیدائش دولت بیمہ اتفاقیہ وغیرہ کی تشکیل بھی قانون کے دائرہ میں شامل ہو گئی۔

اس قانون کی رو سے حسب ذیل مرکزی انجمنیں مسلم قرار دی گئیں۔

(۱) اتحادی انجمنیں جو باہمی نگرانی و تنقیح کے لیے بنیادی انجمنوں پر مشتمل ہوں۔

(۲) مرکزی بنک۔ بعض وقت انجمنیں اور بعض اوقات افراد اس کے ارکان ہوتے ہیں تاکہ بنیادی انجمنوں کو فراہمی سرمایہ میں مدد دیں۔

(۳) صوبہ واری بنک۔ جس کے ارکان افراد ہوتے ہیں۔ بعد میں انجمنوں کو بھی شریک کیا گیا۔ تاکہ تمام صوبہ میں سرمایہ کی فراہمی میں مدد دی جائے۔

یہ کام عموماً مرکزی بنک کے توسط سے انجام دیا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۲ء کے قانون سے تحریک امداد باہمی کو مزید ترقی ہوئی۔ پیداوار کی فروخت۔ مویشیوں کے بیمے، دودھ کی فراہمی، سوت اور کھاد کی خریدی، آلات واوزار اور معمولی ضروریات زندگی کی انجمن قائم ہوئیں اور ترقی کرنے لگیں۔ اکتوبر سنہ ۱۹۱۵ء میں حکومت نے میکلیگن کمیٹی کا تقرر کیا تاکہ اس تحریک کے مالیاتی ذرائع کا جائزہ لیا جائے۔ مختلف صوبہ جات میں امداد باہمی کی مالیاتی تنظیم کے بارے میں کمیٹی نے مفید سفارشیں کیں سنہ ۱۹۱۹ء کے دستوری اصلاحات کے بعد امداد باہمی کا کام صیغۂ منتقلہ کے طور پر صوبہ واری حکومتوں کے تفویض کر دیا گیا۔ بمبئی میں سنہ ۱۹۲۵ء میں ایک مسودہ قانون انجمن ہائے امداد باہمی منظور ہوا۔ بعد میں دوسرے صوبہ جات میں بھی عمل آوری ہونے لگی۔

بہر حال امداد باہمی کے اس اصول سے اراکین کی ناواقفیت، غیر منظم انتظام، داخلی عدم نگرانی، ادائی رقوم میں عدم پابندی اور بڑی بڑی رقم قرضہ کا بقایا رہ جانے کے نقایص کو دور کرنے کے لیے حکومت اور خود انجمنوں کو منظم کوشش کرنی چاہیے۔

تحریک امداد باہمی کے متعلق اعداد و شمار

ہندوستان میں تحریک امداد باہمی کے متعلق اعداد سنہ ۱۹۳۹ء حسب ذیل ہیں۔

اس سال انجمن ہائے امداد باہمی کی مجموعی تعداد ۱۳۹۶۲۲ تھی ان میں زرعی انجمنیں ۱۱۸۰۴۴ اور غیر زرعی انجمنیں ۲۰۹۰۰۶ مرکزی انجمنیں ۶۱۰ بشمول صوبہ واری اور مرکزی بنک اور بنکنگ یونین

نگرانی و ضمانت کرنے والی انجمنوں کی تعداد ۵۲۱ تھی۔

سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں انجمنوں کی تعداد صوبہ جات میں حسب ذیل تھی۔

مدراس ۱۴۳۰۴، بمبئی ۵۲۸۹، سندھ ۱۴۰۶، بنگال ۳۲۷۴۲، بہار ۷۷۶۱، اڑیسہ ۲۷۲۶، صوبہ متحدہ ۳۵۸۹۱، صوبہ متوسط اور برار ۴۰۰۴، آسام ۱۷۹، شمال مغربی سرحدی صوبہ ۸۶۹، دہلی ۳۰۹، اجمیر میواڑ ۴۴۹، کورگ ۳۰۹، پنجاب ۲۵۱۰۳

بعض ہندوستانی ریاستوں میں بھی اس تحریک کو بہت فروغ ہوا ہے۔ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں بنیادی انجمنوں کے اراکین کی تعداد ۶۰ لاکھ ۰۰ ہزار اور سرمایہ زیر استعمال ۷۰ کروڑ ۰۰ لاکھ روپیہ تھا۔ اگرچہ کہ یہ اعداد حقیقی ترقی کو ظاہر کرتے ہیں لیکن ملک کی آبادی اور وسیع رقبہ کے لحاظ سے ترقی کی اچھی کافی گنجائش ہے۔

زرعی قرضہ کی بنیادی انجمن کا دستور اور کام ۔ کل ہندوستان میں زرعی قرضہ کی بنیادی انجمن جملہ انجمنوں کی تعداد کے تقریباً ۹۰ فی صدی ہیں۔ ان کی تنظیم انتظام اور کام پر اجمالی تبصرہ کیا جاتا ہے۔

ایک ہی گاؤں کے دس باشندے امداد باہمی کی انجمن قائم کر سکتے ہیں۔ اراکین کی تعداد ایک سو سے زیادہ نہ ہونی چاہیئے تاکہ انجمن پر کافی نگرانی قائم رہے۔ ذمہ داری غیر محدود ہوتی ہے اس کی وجہ سے انجمن کی ساکھ یا اس کا اعتبار بیرونی قرضداروں کی نظر میں بڑھ جاتا ہے۔ انتظام کی نوعیت عمومی اور امدادی اصول پر ہوتی ہے۔ جلسہ عام میں تمام اراکین مجلس عاملہ کے اراکین کا انتخاب کرتے ہیں اور سالانہ تخمینہ وصول باقی بھی منظور کیا جاتا ہے۔ مجلس عاملہ انجمن کے انتظامی امور کی نگرانی کرتی اور نئے اراکین کی شرکت منظور کرتی ہے۔ معتمد تنخواہ یاب ہوا کرتا ہے۔ سرمایہ زیر استعمال دو ذرایع سے حاصل کیا جاتا ہے (۱) داخلی ذرایع جس میں فیس شرکت اراکین کی امانتیں حصص اور مد محفوظہ شامل ہے۔ (۲) خارجی ذرایع اس میں دوسری انجمنوں حکومت اور مرکزی مالیاتی ایجنسیوں جیسے مرکزی اور صوبہ واری امداد باہمی کے قرضے اور امانتیں شامل ہیں۔ ریزرو بنک آف انڈیا ایکٹ بابتہ سنہ ۱۹۳۴ء کے تحت امداد باہمی کے صوبہ واری بنکوں کو ریزرو بنک سے قلیل المیعاد قرضے جن کی مدت تین ماہ سے زیادہ نہ ہو مل سکتے ہیں

جو چند سالوں میں داخلی ذرائع خصوصاً اراکین کی امانتوں میں کوئی خاطر خواہ ترقی نہیں ہوتی ہے۔ البتہ خارجی ذرائع کے ذریعے امداد باہمی کی مالیات میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قرضے عموماً پیداآور اغراض مثلاً خریدی تخم، مویشی کھاد اور کاشتکاری کی دوسری ضروریات جیسے لگان اور ادائی مالگذاری کی غرض سے حاصل کیے جاتے ہیں انجمنوں سے متعلق اصلاحات اور پچھلے قرضوں کی ادائی کے لئے طویل المیعاد قرضے نہیں دیے جاتے۔ اس مقصد کے لئے مختلف صوبوں میں رہن کردنی بنکات قائم کئے جا رہے ہیں۔ غیر پیداآور اغراض جیسے ادائی رسوم وغیرہ کے لئے قرضوں کی منظوری اصولاً ممکن نہیں لیکن رعایا کو ساہوکاروں کے پنجے سے محفوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ قرضوں کی ادائی کا وقت مقرر کر دیا جاتا ہے تاکہ اراکین فصل کی کٹائی کے بعد قرضے اور قسطیں پابندی کے ساتھ ادائی لازمی ہے۔ التوا صرف خاص حالات کے تحت منظور کیا جاتا ہے۔

امداد باہمی کی اصلی ضمانت قرض گیرندہ کی ایمانداری اور اس کے عادات و اطوار ہیں اسی کے ساتھ زیورات کی شکل میں مساوی ضمانت بھی قبول کی جاتی ہے۔ قرض گیرندہ کو عموماً اراکین کی ہم ضمانت فراہم کرنی پڑتی ہے۔

تمام اخراجات کی منہائی کے بعد منافع محفوظ فنڈ میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ لیکن قانون ۱۹۱۲ء کے تحت اگر حصص ہوں تو ان پر منافع تقسیم ہو سکتا ہے۔ خیرات اور تعلیم پر بھی کچھ رقم صرف کی جا سکتی ہے۔ انجمن اور اس کے اراکین کے تنازعات ثالثی کے ذریعہ طے پاتے ہیں۔ کسی انجمن کا انتظام خراب ہو تو رجسٹرار تحقیقات کے بعد اس کو مسدود کر سکتا ہے۔

تحریک امداد باہمی کے فوائد۔ تحریک امداد باہمی کے باعث کئی مادی فوائد حاصل ہوئے ہیں مثلاً کاشتکاروں اور دستکاروں کو آسان شرائط سے قرضے مل رہے ہیں اور سود کی ادائی میں کفایت ہو گئی ہے۔ اکثر دیہات میں ساہوکاروں کا اجارہ ختم ہو چکا ہے امداد باہمی کے بنکوں کی ترقی سے رقم پس انداز کرنے کی عادت بڑھ رہی ہے۔ مختلف طرح سے زراعت کو بھی فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔ کسان کی متعدد احتیاجات کی تکمیل سے اس تحریک نے اس ملک کی زرعی تنظیم کو بڑی ترقی

عطا کی ہے۔ اس نے سررشتہ زراعت کو بہتر تخم، مویشی اور ترقی یافتہ آلات و اوزار کو مقبول عام بنانے میں بھی مدد دی ہے۔ مختلف قسم کی انجمنیں قرضہ دینے کے علاوہ پیداوار کی فروخت، زرعی اور دیگر ضروریات کی خریدی اور فراہمی میں بھی مدد دیتی ہیں۔ ان امور سے ملک کی جدید زرعی تنظیم کی سرعت کے ساتھ بہتری کی توقع ہوسکتی ہے جیسا کہ شاہی زراعتی کمیشن نے خیال ظاہر کیا ہے۔ تحریک امداد باہمی نے کاشتکار کو بہتر کاشت اور بہتر کاروبار اور بہتر زندگی کے وسائل کے حصول میں بڑی مدد دی ہے۔

غیر زرعی مقاصد کے لئے بھی انجمنیں قائم ہوئیں مثلاً شہری بنک (جن کی تنظیم جرمنی کے شلز۔ ڈیلش بنکوں کے اصول پر کی گئی) پارچہ بافوں اور دستکاروں کی انجمنیں، کارخانے کے مزدوروں اور تنخواہ یاب ملازمین کی انجمنیں، تعمیر امکنہ کی انجمنیں اور انجمن ہائے صارفین مفید کام انجام دے رہے ہیں لیکن ابھی ترقی اور وسعت کی بڑی گنجائش ہے۔ امداد باہمی کی انجمنیں گھریلو صنعتوں اور دستی پارچہ بافی کے لئے بھی بہت ممد و معاون ثابت ہو رہی ہیں۔

امداد باہمی سے معاشی اور مادی فوائد کے علاوہ ذہنی اور اخلاقی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ بقول مسٹر ڈارلنگ "امداد باہمی کی ایک اچھی انجمن میں مقدمہ بازی، فضول خرچی، نشہ، اور قمار بازی کے بجائے سرگرمی، خود اعتمادی، راست بازی، تعلیم، ثالثی کے ذریعہ تصفیہ، کفایت شعاری، اپنی مدد آپ کرنے اور باہمی امداد جیسی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔" انجمن امداد باہمی حکومت خود اختیاری اور شہری فرائض کی تربیت گاہ خیال کی جاسکتی ہے۔

مملکت آصفیہ اور امداد باہمی کی تحریک۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں ۱۹۱۳ء میں سررشتہ امداد باہمی کا قیام عمل میں آیا۔ ابتداء میں یہ تحریک تجربہ کے طور پر شروع کی گئی تھی۔ قانون امداد باہمی نشان ملک کا نفاذ ہوا۔ پھر ۱۳۲۳ف مطابق ۱۹۱۳ء میں عمل میں آیا۔ ابتداء میں تو اس تحریک کے تحت صرف بلدۂ حیدرآباد کے نواح کے دیہات میں کسانوں کو قرضہ کی تقسیم ہوئی۔ ۱۹۱۹ء میں اس امر کی پہلی منظم کوشش کی گئی کہ مختلف اقسام کی غیر قرضہ جاتی امداد باہمی

کی انجمن بنائی جائیں۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں بلدۂ حیدرآباد میں ایک صدر بنک قایم ہوا اس سال انجمنوں کی تعداد ۲۰۵۔ اراکین کی تعداد ۶۰۰۰۔ اور سرمایۂ زیر استعمال ایک لاکھ ۸۶ ہزار روپے تھا۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں ایک کمیٹی جو مسٹر گلانسی معین المہام فینانس، نواب عماد الملک اور مسٹر کرشنماچاری مشیر قانونی پر مشتمل تھی اس غرض سے بنائی گئی کہ وہ اس تحریک کے انتظام اور اس کی رہنمائی کے اصول مرتب کرے۔

ملکتی بنک۔ اس تحریک کو قوت دینے کے لئے ملکتی بنک قایم کیا گیا تاکہ وہ ان تمام انجمنوں کے لئے سرمایہ مہیا کرے جو ممالک محروسہ میں قایم ہوں لیکن رفتہ رفتہ جب اضلاع میں بھی بنک قایم ہوتے گئے تو انجمنوں سے اس کا براہ راست لین دین محدود ہوگیا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۳ء میں اس کے دستور اساسی میں تبدیلی ہوگئی اور اسے صوبہ داری بنک قرار دیا گیا جس کا تعلق براہ راست صرف مرکزی بنکوں سے رہ گیا وہ انجمنیں جو اس وقت تک اس بنک سے ملحق تھیں اضلاع کی بنکوں سے ملحق کر دی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اراکین کی تعداد ۴۱۵ اور ۴۶ مرکزی بنکوں اور دو سو انجمنوں پر مشتمل ہے۔ ملکتی بنک نے سرعت کے ساتھ ترقی کی ہے۔ اس کا سرمایۂ منظورہ دس لاکھ روپیہ، سرمایہ جاری شدہ پانچ لاکھ ۵۰ ہزار، سرمایہ اداشدہ پانچ لاکھ ساٹھ ہزار اور محفوظات کی رقم دس لاکھ دو ہزار ہے۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں منافع کی مقدار ۳۸ ہزار روپیہ رہی۔

مرکزی بنک۔ اب ممالک محروسہ کے تقریباً ہر ضلع میں ایک مرکزی بنک قایم ہے سنہ ۱۹۲۲ء تک۔ تو یہ اصول تھا کہ ہر ضلع میں ایک صدر بنک ہو۔ لیکن انجمنوں کی تعداد بڑھنے کے ساتھ اور صدر بنکوں کے کاموں میں اضافہ ہونے کے باعث یہ محسوس کیا جانے لگا کہ اضلاع کے علاوہ تعلقوں میں بھی مرکزی بنک قایم کرنا ضروری ہے۔ اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ ان بنکوں کو گاؤں کی انجمنوں سے قریب تر ہونے کا موقع مل جائے گا۔ سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں مرکزی بنکوں کی تعداد ۴۱ اراکین کی تعداد ۳۹۴۳ تھی اور ۶۷ لاکھ ۸ ہزار روپے کے مشغول سرمایہ سے کام ہو رہا تھا اس میں سے تقریباً ایک تھائی بنکوں کا ذاتی سرمایہ ہے۔ جس کے منجملہ ۱۵ لاکھ روپے محفوظات ہیں۔ اور ۱۲ لاکھ روپے حصص۔ ان اعداد کی اہمیت کا اندازہ

اس وقت بخوبی ہو سکتا ہے۔ جب یہ خیال کیا جائے کہ سنہ ۱۹۲۶ء تک مرکزی بنکوں کی مجموعی محفوظ رقم صرف ایک لاکھ روپے تھی۔

زرعی انجمنیں۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح ممالک محروسہ سرکار عالی میں بھی امداد باہمی کی تحریک اس خاص مقصد کے تحت شروع کی گئی تھی کہ زراعت پیشہ باشندوں کی امداد کی جائے جو پشتہا پشت سے مقروض ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اس تحریک کے ابتدائی زمانہ میں بقیہ ہندوستان کی طرح یہاں بھی یہی غلطی کی گئی کہ گاؤں کی قرضہ دہندہ انجمنوں سے یہ غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی کہ کسان کے سارے ساہوکاری قرضہ ادا کرائے جائیں تاکہ وہ اپنی زندگی از سر نو شروع کرے۔ انجمنیں قرضہ دینے میں بہت فیاض تھیں لیکن جس وقت معاشی حالت بدلی اور زرعی پیداوار کے نرخ میں کمی ہو جانے کے باعث زراعت پیشہ طبقہ کی قوت ادائی میں بھی کمی واقع ہوئی تو معلوم ہوا کہ قلیل مدت کے لئے حاصل کیا ہوا روپیہ طویل مدت کے لئے قرض دینا کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اب یہ رائے ہے کہ انجمن امداد باہمی کی رقموں سے صرف کسانوں کو فصلوں کے موقع پر قرض دینا چاہیئے۔ چنانچہ اب قرض دینے کے وقت کسان کی قوت ادائی پر نظر رکھی جاتی ہے۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں انجمن ہائے زرعی قرضہ کی تعداد ۴۰۲، اراکین کی تعداد ۱۰۳۱۵ اور سرمایہ زیر استعمال ۳۹۶۰۰ تھا۔ سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں انجمنوں کی تعداد ۴۴۸۲، اراکین کی تعداد (۸۰۴۴۵) سرمایہ زیر استعمال ۷۰ لاکھ ۴۰ ہزار روپے تھا۔ گویا ممالک محروسہ سرکار عالی کے اکیس ہزار دیہات میں سے ۴۰۲۴ دیہات میں قرضہ دینے والی انجمنیں موجود ہیں۔

مجموعی طور پر گذشتہ سالوں میں تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپے بطور قرضہ دیا گیا اس میں سے تقریباً ایک کروڑ روپے واپس ہو چکے ہیں۔ گذشتہ آٹھ سال کی معاشی کساد بازاری نے انجمنوں کی مالی حالت پر بہت تباہ کن اثر کیا تھا۔ اور اس کا بعد اثر انجمنوں پر بھی پڑا اور متعدد رعایتیں کرنی پڑیں۔ قرضہ دینے والی انجمنوں نے نہ صرف زراعت پیشہ افراد کو براہ راست فائدہ پہنچایا بلکہ ان سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ دیہات میں شرح سود بہت گھٹ گئی ہے جب ایک گاؤں میں

انجمن امداد باہمی قایم کی جاتی ہے تو اس کے شرح سود کی کمی کے باعث مقامی ساہوکاروں کو مجبور ہو کر اپنی شرح سود گھٹانی پڑتی ہے۔

حکومت نے اب اس کا اعتراف ہو چلا ہے کہ دیہی قرضہ کا مسئلہ صرف قرضہ دینے والی انجمنوں کے ذریعہ حل نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ انجمن کاشت کے موسم میں ضروری مدد دیتی ہیں۔ یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مختلف اصول پر اب ایسے ادارے قایم کرنے چاہیں جو زیادہ طویل مدت کے لئے قرضہ دے سکیں۔ اس مقصد کے تحت حکومت کے پیش نظر زمین گروی بنک کی اسکیم ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اس قسم کی بنکوں کا ایک نظام جلد قایم ہو جائے گا۔

غیر زراعتی انجمنیں ۔ انجمن ہائے قرضہ زرعی کے علاوہ غیر زرعی انجمنیں بھی موجود ہیں۔ سنہ ۱۳۴۰ف ۱۹۳۰ء میں انجمنوں کی تعداد ۶۰۰، اراکین کی تعداد ۱۵۴۱، متغول سرمایہ ۶۱ لاکھ ۱۴ ہزار روپے تھا جس کے منجملہ ملوکہ سرمایہ ۳۹ لاکھ ۲۴ ہزار روپے تھا۔

ان انجمنوں میں تنخواہ یاب ملازمین کی انجمنیں سب میں ممتاز ہیں۔ یہ انجمنیں سرکاری محکموں کے ملازمین کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی ہیں کیونکہ اس سے قبل اپنی ضروریات کے لئے انہیں مقامی ساہوکاروں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا تھا۔ مالی اعتبار سے امداد باہمی کی تحریک میں یہ انجمنیں سب سے زیادہ خوش حال ہیں۔ سنہ ۱۳۴۰ف ۱۹۳۰ء میں ان کی تعداد ۲۹۶، اراکین کی تعداد ۲۱ ہزار سات سو سرمایہ مشغول ۶۳ لاکھ ۵۰۶ ہزار روپے اور ملوکہ سرمایہ ۲۹ لاکھ روپے تھا۔

شہری بنک ۔ غیر زرعی انجمنوں کا ایک اور امید افزا پہلو شہری بنک ہیں۔ شہری بنک سب سے پہلے سنہ ۱۳۳۶ف ۱۹۲۷ء میں قایم کئے گئے تھے اس وقت شہری بنکوں کی تعداد چار، اراکین کی تعداد ۴۲۲، اور سرمایہ زیر استعمال ۲۲ ہزار روپے تھا۔

سنہ ۱۳۴۰ف ۱۹۳۰ء میں ان بنکوں کی تعداد ۱۱۱، اراکین کی تعداد ۱۷ ہزار تو سو ۴۴ مشغول سرمایہ ۴۰ لاکھ روپے اور ملوکہ سرمایہ چھ لاکھ روپے تھا۔

صناعوں کی انجمنیں ۔ دستی پارچہ بافی حیدرآباد کی ایک قدیم صنعت ہے۔

پارچہ باف عموماً اتنی اجرت پاتے ہیں کہ مشکل سے اپنی زندگی گذار سکیں۔ چنانچہ پارچہ بافوں کی امداد باہمی کی انجمنیں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہیں۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں پارچہ بافوں کی انجمنوں کی تعداد ۱۰۷۔ ارکین کی تعداد ۱۶۰۰، سرمایہ مشغول دو لاکھ روپے اور مملوکہ سرمایہ صرف ایک لاکھ روپے تھا۔

دوسرے صناع مثلاً صنعت بیدری کے کام کرنے والوں، غذ بنانے والوں، چتیل کا کام کرنے والوں وغیرہ کی انجمنوں کی تعداد ۳۳۳، اراکین کی تعداد ۵۰۰، سرمایہ مشغول ۵۶ ہزار روپے اور مملوکہ سرمایہ ۳۷ ہزار روپے تھا۔

انجمن ہائے فروخت پیداوار۔ زرعی پیداوار کی فروخت کی جانب اب خاص توجہ کی جا رہی ہے اور اس امر کا انتظام کیا گیا ہے کہ انجمن ہائے امداد باہمی کے ذریعہ بہتر تخم، کھاد اور آلات زراعت مہیا کئے جائیں اور اہم فصلیں مثلاً روئی، نیشکر اور روغنی تخم امداد باہمی اصول پر فروخت ہوں، خاص خاص صورتوں میں کاشتکاروں کی رقمی امداد بھی کی جائے۔

سررشتۂ زراعت کے تعاون سے کپل، جالنہ، سیلو، اورنگ آباد، ناندیڑ، پربھنی، رائچور اور گلبرگہ میں کپاس کی فروخت کا انتظام کیا گیا ہے۔ جو نتائج برآمد ہوئے ان سے واضح ہوتا ہے کہ اگر کام کرنے والے مخلص اور ایماندار ہوں تو یہ انجمنیں کاشتکاروں کے لئے عام انجمن ہائے امداد باہمی سے زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔

کپاس فروخت کرنے کی انجمنوں کی تعداد سنہ ۱۹۴۰ء میں دس، اراکین کی تعداد ۱۰۱۹، مشغول سرمایہ ۲۰ ہزار روپے تھا۔ زرعی پیداوار فروخت کرنے کی انجمنوں کی تعداد دس، اراکین کی تعداد ۳۸۶، مشغول سرمایہ ۰۸ ہزار روپے اور مملوکہ سرمایہ ۳۹ ہزار روپے تھا۔

غلے کے بنک۔ غلے کے بنک دیہات میں کافی مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔ اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ جب وہ ترقی یافتہ اجناس کی تقسیم کا کام اپنے ذمہ لیں گے تو دیہی معیشت میں ان کو ایک اہم جگہ حاصل ہو جائے گی۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں ان بنکوں کی تعداد ۱۵۸، اراکین کی تعداد ۶،۲۶ تھی۔ حصص کے طور پر جو غلہ جمع کیا گیا اس کی مجموعی تعداد ۲ لاکھ ۸۰ ہزار سیر تھی۔

اراکین کو جو قرض دیا گیا۔ اس پر ۵۹ ہزار پانچ سو سیر کا نفع ہوا۔

صدر جمعیت امداد باہمی۔ ابتدائی دس سال میں جب انجمنوں کی تعداد کافی ہوگئی اور جب یہ انجمن مملکت کے مختلف ضلاع میں مختلف قسم کے کاروبار انجام دینے لگیں تو اس بکھرے ہوئے شیرازہ کو منظم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۳ء میں صدر جمعیت امداد باہمی قایم کی گئی۔ صدر جمعیت امداد باہمی سے الحاق شدہ انجمنوں کی تعداد سنہ ۴۱-۱۹۴۰ء میں ۳۴۸۳ تھی۔ اس جمعیت کے فرائض میں تبلیغ و اشاعت، تعلیم و نگرانی شامل ہے۔ ہر سال یہ جمعیت سررشتۂ امداد باہمی کے عہدہ داروں اور امیدواروں کی تعلیم کے لئے بلدۂ حیدر آباد و اضلاع میں تعلیمی جماعتیں قایم کرتی ہے۔ "کاؤں سدھار" ماہوار رسالہ اس کی جانب سے شایع ہوتا ہے۔

امداد باہمی انشورنس سوسائٹی۔ مملکت میں ملکی بیمہ کمپنیوں کی کمی کے مدنظر سنہ ۱۹۳۷ء میں قانون امداد باہمی کے تحت انشورنس سوسائٹی کی رجسٹری کی گئی۔ سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء میں بوجہ جنگ کاروبار بیمہ کو عام طور پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن انجمن نے باوجود ان غیر مساعد حالات کے جو کاروبار کیا وہ ہمت افزا ہے۔ سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء کے ختم پر جملہ رقم حصص ۳۹۶۰۰ روپے رہی اقساط بیمہ کی بابتہ ۲۷۹۱۴۵۳ روپے آمدنی ہوئی تا ایف انشورنس فنڈ کی مقدار ۵۲۲۱۱۳ رہی اس سال ۵۹۰۱ روپے کا خالص منافع بر آمد ہوا۔ مد محفوظ کی رقم ۲۶۹۷ روپے ہے۔

انجمن ہائے تعمیر امکنہ۔ امداد باہمی کے خوشگوار نتائج کی نمایاں مثال محلہ ٹیلی (بلدۂ حیدر آباد) کی وہ انجمن ہے جو سکونتی مکانات کی تعمیر کے لئے سنہ ۱۹۳۶ء میں قایم ہوئی۔ سررشتہ امداد باہمی کے متعدد کارناموں میں اس اسکیم کی کامیاب تکمیل بھی شامل ہے۔ اس اسکیم کا منشا یہ ہے کہ بلدۂ حیدر آباد میں کم تنخواہ یاب سرکاری ملازمین کے واسطے مکانات فراہم کئے جائیں۔ یہ انجمن اپنے اراکین کے سامنے بہت آسان شرائط پیش کرتی ہے۔ جن کے تحت وہ اپنے ذاتی مکانات تعمیر کر سکتے ہیں۔ انجمن مذکور نے مجلس آرائش بلدہ سے ایک زمین حاصل کر کے جس کا رقبہ ۱۸ ہزار مربع گز ہے ۱۳۱ مکانات تعمیر کرائے ہیں۔

اس تجربہ کی کامیابی کی وجہ ایک اور انجمن کی بنا ڈالی گئی جس کا بھی یہی مقصد ہے۔ اس انجمن نے بھی سلے پلی میں ۲۵ ہزار مربع گز زمین حاصل کرلی ہے جس پر چالیس مکانات زیر تعمیر ہیں۔

انجمن ہائے قرضۂ حسنۂ امداد باہمی۔ حیدرآباد نے اکثر اہم اور جدید ترین امور میں برطانوی ہند کی رہنمائی کی ہے چنانچہ امداد باہمی کی انجمنوں میں بلاسودی کاروبار کا آغاز بھی حیدرآباد میں پہلے ہوا ہے چند بلاسودی انجمنیں یہاں کامیابی سے چل رہی ہیں۔

تحریک امداد باہمی کے بعض اصلاحی تدابیر۔ امداد باہمی سے اخلاقی تعلیم اور خالص معاشی فوائد صرف پیمانۂ صغیر پر حاصل کئے گئے ہیں۔ انجمن ہائے امداد باہمی کے بعض نقائص کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مثلاً ادائی رقوم میں عدم پابندی، غیر منظم نگرانی اور بقایا وغیرہ بہت سی حالتوں میں اصلی اتحاد کم ہوتا ہے اور اکثر ارکان انجمن سے محض مالی فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان میں دیہی آبادی کی جہالت اور غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے امداد باہمی کی کامیابی میں بڑی دشواری ہے۔

ریزرو بینک آف انڈیا نے یہ سفارش کی ہے کہ طویل و قلیل قرضے علحدہ علحدہ انجمنیں دیا کریں۔ امداد باہمی کی انجمنیں اپنے ذخیرۂ محفوظ کو تقویت دیں۔ غیر پیداآور اغراض کے قرضوں کی تعداد میں کمی کی جائے۔ مرکزی صوبہ واری بنکوں اور قرضوں کی انجمنوں کی دوبارہ تنظیم کی جائے۔ امداد باہمی کے عملہ کو امداد باہمی دیہی معاشیات اور بنک کاری کے عملی اور نظری اصولوں سے آگاہ ہونا چاہیئے۔ سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں امداد باہمی کے نقائص کو دور کرنے اور اصلاح کی خواہش پائی جاتی ہے اگرچہ کہ ترقی کی رفتار سست ہے۔ زرعی کمیشن نے خوب کہا ہے کہ "اگر تحریک امداد باہمی ناکام ہوجائے تو دیہی ہندوستان کی امیدیں فنا ہوجائیں گی۔"

زمین گروی بنک۔ ۱۹۰۴ء میں تحریک امداد باہمی کے آغاز سے اب تک جو تجربہ ہوا اس سے ظاہر ہے کہ قرضہ کی انجمنیں مرکزی اور صوبہ واری بنک صرف قلیل المیعاد قرضہ مہیا کرسکتے ہیں۔ لیکن بھاری شرح سود کے قدیم قرضوں کی ادائی اراضی کی مستقل ترقی اور عام طور پر بہتر زرعی طریقہ کو رائج کرنے کے لئے طویل المیعاد قرضوں کی ضرورت ہے۔ اب اس امر کا کافی احساس ہوچکا ہے

کہ ان اغراض کی تکمیل کے لئے زمین گروی بنک قایم کئے جائیں اور بڑی حد تک امداد باہمی کے اصول پر ان کی تنظیم ہو تاکہ چھوٹے کاشتکاروں کی ضروریات پوری ہوں اور حکومت بھی امداد کرے۔

بعض صوبوں مثلاً پنجاب، بنگال، صوبہ متوسط، صوبہ متحدہ، بمبی، مدراس اور آسام میں اس قسم کے گروی بنک قایم ہو چکے ہیں مدراس نے اس خصوص میں کافی ترقی کی ہے چنانچہ وہاں سنہ ۱۹۳۰ء میں زمین گروی بنکوں کی تعداد ایک سو انیس (۱۱۹) تھی۔ موجودہ زمانہ میں زمین گروی بنک کی ارزان شرح اور زمینات کی ضمانت پر طویل المیعاد تمسکات کی اجرائی کی وجہ سے بھی اس قسم کے بنک قایم کرنے کی ترغیب ہو رہی ہے۔

حکومت بمبئی نے اس قسم کے سترہ بنک صوبہ کے مختلف حصوں میں قایم کئے ہیں۔ صوبہ مدراس کی طرح ایک مرکزی گروی بنک بمبئی میں قائم ہو چکا ہے تاکہ مرہونہ اراضیات کے تمسکات کی اجرائی میں سہولت ہو۔ گروی بنک تمسکات کے علاوہ حصص بھی جاری کرتے ہیں اور طویل المیعاد امانتیں محفوظ رکھتے ہیں۔ اراضی کی کفالت پر قدیم قرضوں کی ادائی قیمتی زرعی آلات کی فراہمی اور اراضی کی خریدی اور ان کی اصلاح کی غرض سے طویل المیعاد قرضے دس سے تیس سال تک کی مدت کے لئے دیا کرتے ہیں۔ صوبہ واری حکومتیں مختلف طریقوں سے ان بنکوں کو مدد دیتی ہیں۔ اکثر صوبوں میں حکومت ان بنکوں کے جاری کردہ تمسکات پر ادائی سود کی ذمہ داری بھی لیتی ہے تمسکات کا ایک جز خود بھی خریدتی ہے اور مالگذاری کے عہدہ داروں کے خدمات بلا معاوضہ اراضی کی صحیح تشخیص کے لئے مستعار دیتی ہے۔ اراضی کی صحیح تشخیص گروی بنک کے ذریعہ اس کے اراکین کو قرضہ دینے سے پیشتر ضروری ہے۔ رہن اراضی کی تمسکات بہت مستند تمسکات خیال کئے جاتے ہیں۔ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ہندوستان میں زمین گروی بنکوں کی تعداد ۳۴۲ تھی۔ اراکین کی تعداد ۳۰۴۹۲۔ اور جملہ مشغول کاروباری سرمایہ کی مقدار چھ کروڑ ۲۶ لاکھ روپے تھی۔

ممالک محروسہ میں قانون گروی بنک منظور ہو چکا ہے۔ قیام بنک کے متعلق ضروری انتظامات زیر غور ہیں۔ توقع ہے کہ مستقبل قریب میں زمین گروی بنکوں کا قیام عمل میں آجائیگا۔ اس کا مقصد

یہ ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے مزارعین کو ان کی اراضی کی کفالت پر طویل المدت قرضہ دے کر ان کی مدد کی جائے تاکہ وہ اپنے ذاتی قرضہ جات کی ادائی زراعتی کاروبار کی ترقی اور دیگر مقاصد زندگی کی تکمیل کا انتظام کرسکیں اور ان میں کفایت شعاری اور اپنی مدد آپ کرنے کا مادہ پیدا ہوسکے۔

سررشتۂ زراعت کا ارتقاء۔ زرعی ترقی میں حکومت اور سررشتۂ زراعت کی کوششوں کا ذکر کیا جاچکا ہے اب زراعت سے حکومت کے تعلق کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ کاشتکاروں کی حالت کی اصلاح اور زرعی طریقوں کو ترقی دینے کی ضرورت کو حکومت نے ایک عرصہ قبل تسلیم کرلیا ہے۔ سب سے پہلے اڑیسہ کے قحط ۱۸۶۶ء کے زمانہ میں سررشتہ زراعت کے قیام کا خیال پیدا ہوا اسکے بعد لارڈ میو کی حکومت ۱۸۶۹ء نے اس پر غور کیا لیکن عملاً قحط کمیشن (۱۸۸۰ء) کی سفارش پر ۱۸۸۱ء میں اس سررشتہ کا قیام عمل میں آیا۔ مختلف صوبہ جات میں زراعت کے سررشتے قایم ہوئے۔ وزیر ہند نے ڈاکٹر واکر کو سال ۱۸۸۹ء میں ہندوستان روانہ کیا تاکہ جدید سائنس کے نقطۂ نظر سے زراعت کی ترقی کے لئے مشورہ دیں اور رپورٹ پیش کریں انھوں نے اپنی رپورٹ میں زرعی تعلیم اور اصلاح پر زور دیا۔ چنانچہ ان کے مشوروں کی بناء پر اس سررشتہ کے کام میں سرعت پیدا ہوئی۔ سال ۱۹۰۱ء میں شاہی اور صوبہ واری حکومتوں کو مشورہ دینے کے لئے ایک انسپکٹر جنرل زراعت مقرر ہوا۔ سال ۱۹۱۲ء میں یہ عہدہ برخاست کردیا گیا۔ اور اس کا کام اگریکلچرل ریسرچ انسٹیٹیوٹ پوسا کے ڈائرکٹر کے تفویض ہوا جو ۱۹۲۹ء تک حکومت ہند کا مشیر زراعت بھی تھا پوسا کا ادارہ سال ۱۹۰۳ء میں قایم ہوا۔ اس کے ساتھ اعلیٰ ٹریننگ اور خود بھی مختصر عملی تعلیم کے لئے کالج بھی قایم کیا گیا۔ سال ۱۹۳۶ء میں یہ ادارہ نئی دھلی میں منتقل کردیا گیا۔ لارڈ کرزن نے مسٹر ایچ فیپس امریکی سیاح اور مسٹر ڈیوڈ ساسون کے شاہانہ عطیوں کو اس نئے تحقیقاتی ادارہ کے کام میں لگایا۔ سال ۱۹۰۵ء میں سررشتۂ زراعت میں بعض جدید اصلاحات نافذ کی گئیں۔ اور زرعی تجربوں تحقیقات۔ مظاہروں اور تعلیم کے لئے رقمیں گنجائشیں مہیا کی گئیں۔ سال ۱۹۰۸ء میں پونا میں زراعتی کالج کی بنا ڈالی گئی۔ بعد ازاں اسی قسم کے کالج کانپور، ناگپور، لائل پور، کوئمبتور میں قایم کئے گئے۔ بعد میں سررشتۂ زراعت کو زرعی انجینئروں کے تقرر سے اور زیادہ مستحکم کیا گیا۔ یہ

انجینیر زرعی مشنری کی تنصیب اور ان کے استعمال کے متعلق کاشتکاروں کو ضروری مشورہ دیتے تھے۔
سنہ ۱۹۰۵ء میں ایک مجلس ہند زرعی بورڈ قایم کیا گیا۔ تاکہ صوبہ واری زرعی مفاد کے مابین باہمی تعلقات قایم ہو جائیں اور اپنے سالانہ جلسوں میں مشترکہ مفاد کے مسائل پر بحث کریں اور حکومت ہند کے پاس اپنی سفارشات پیش کریں۔ سنہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے صوبہ واری حکومتوں پر حکومت ہند کی نگرانی کم ہو گئی ہے کیونکہ زراعت کا سررشتہ منتقلہ ضیغہ قرار دیا گیا ہے۔ شاہی زرعی کمیشن (۱۹۲۸ء) کی سفارش پر جولائی سنہ ۱۹۲۹ء میں ترقی کا ایک قدم اٹھایا گیا۔ اور زرعی تحقیقات کے لئے ایک شاہی مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے ساتھ حکومت ہند کے مشیر زراعت کے فرایض بھی اسی جدید مجلس کے سپرد کرد‌یئے گئے۔ سررشتۂ زراعت کو سررشتۂ امداد باہمی کی بھی مدد حاصل ہے۔ صوبہ بمبئی میں بعض ادارے مثلاً ڈسٹرکٹ ایگریکلچرل اسوسی ایشن اور تعلقہ کے مجالس ترقیات عامہ بھی سررشتۂ زراعت کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

سررشتۂ زراعت کا کام - صوبہ واری سررشتہ ہائے زراعت مندرجۂ ذیل کام انجام دیتے ہیں۔

(۱) مزرعوں اور تجربہ خانوں میں تحقیقات اور تجربے۔

(۲) زرعی رہنمائی کے کام میں تنظیم، جدید طریقہ ہائے زراعت اور ترقی یافتہ آلات و اوزار کا استعمال، نئی قسم کی کھاد کی ترویج، مویشی، تخم کی تقسیم، تیز قسم کے ترقی یافتہ اجناس (مثلاً کپاس، گیہوں، چاول، نیشکر وغیرہ) کی کاشت۔

(۳) زرعی تعلیمات - مدارس میں تعلیم پر نگرانی کے علاوہ پیشۂ زراعت کے بنیادی مسائل مثلاً زرعی کیمیا، اصلاح اراضی اور حشرات الارض کے ذخیرہ پر بھی مفید کام ہو رہا ہے۔ حکومت کے مزرعوں یا کاشتکاروں کے کھیتوں پر سررشتۂ زراعت کی جانب سے مظاہرے کئے جاتے ہیں وقتاً فوقتاً زرعی اور مویشیوں کی نمایش بھی منعقد کی جاتی ہے۔ اس سے قبل سررشتۂ علاج حیوانات کے کام کی تفصیل پیش کی جا چکی ہے۔ معقول سرمایہ کی کمی، کام کی وسعت، دفتریت کا چکر، دیہاتی

عوام کی قدامت پرستی اور تعلیم کا فقدان وہ رکاوٹیں ہیں جو فوری اصلاح میں حائل ہیں۔ تاہم ان پر تدریجاً غلبہ حاصل کیا جا رہا ہے۔

یہاں شاہی کونسل کے اس کام کی جانب اشارہ کیا جا سکتا ہے جو زرعی تحقیقات کے سلسلہ میں انجام دیا جا رہا ہے جس کا اصل مقصد یہ ہے کہ تمام ہندوستان کے زرعی تحقیقاتی کاموں میں ترقی رہنمائی اور باہمی اشتراک کی راہیں پیدا کرے۔ اور اسی طرح زراعت کے صوبہ واری سررشتوں کو زرعی اور علاج حیوانات کے متعلقہ امور میں مدد دے۔ اس کونسل کی تشکیل انتظامی اور مشاورتی مجالس پر مشتمل ہے۔ زرعی کمیشن نے اس کونسل کو ۵۰ لاکھ روپے کا ابتدائی عطیہ دینے کی سفارش کی تھی لیکن اپنے قیام کے ابتدائی چھ سالوں کے دوران میں اس نے زرعی تحقیقات پر ایک کروڑ سے زاید رقم صرف کی ہے۔ زرعی ترقی کے سلسلہ میں مختلف مفید تجاویز کو روبہ عمل لایا گیا جن میں سے نیشکر کی صنعت اور زرعی مارکٹنگ کی تنظیم و اصلاح خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

معاشی تحقیقات کی صوبہ واری مجالس - یہاں مرکزی بنکنگ انکوائری کمیٹی بابت سنہ ۱۹۳۱ء کی ان سفارشات کی جانب توجہ دلائی جاتی ہے جن میں ہر صوبہ کیلئے معاشی تحقیقاتی مجالس کے قیام کا مشورہ دیا گیا ہے۔ تا کہ زراعت کے بارے میں ترقی پذیر اور تعمیری پالیسی اختیار کرنے کے لئے حکومت کو معلومات فراہم کی جائیں۔ مرکزی بنکنگ انکوائری کمیٹی نے پنجاب کی مجلس تحقیقات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ جو سنہ ۱۹۱۹ء میں قائم ہوئی۔ اور سرکاری و غیر سرکاری اراکین پر مشتمل ہے۔ اس مجلس کا کام سرکاری امداد سے چلایا جا رہا ہے۔ اس مجلس نے کثیر تعداد میں مواضعات کی زرعی تحقیقات کا کام انجام دیا ہے زرعی کھیت کی تقسیم اور اس کا تصرف شدہ غذائی شرح، مزرعہ کا حساب و کتاب، خاندانی مواد اور کاشتکاروں کی معاشی حالت کی بابت مفید معلومات جمع کی ہیں۔

سررشتہ زراعت سرکار آصفیہ اگرچہ دسمبر ۱۸۹۰ء میں سررشتہ تجارت و حرفت کے فرائض میں زراعتی نظامت کے فرائض بھی شامل تھے لیکن چند ہی دنوں میں یہ سررشتہ تخفیف ہو گیا۔ اور بعد ازاں سنہ ۱۹۱۲ء میں دوبارہ سررشتۂ زراعت قائم ہوا۔ اس سررشتہ کے قائم کرنے کی

اگرچہ غرض یہ تھی کہ کرمانی کپاس کو ترقی دی جائے سنہ ۱۹۱۹ء کے بعد سررشتۂ زراعت کی توجہ صرف کپاس ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ نیشکر، تمباکو اور دیگر فصلوں کی کاشت کی تحقیقات آغاز کی گئی۔ اور تجرباتی مزرعے قائم کیے گئے۔

اب سررشتۂ زراعت کے کام کو اس کی نوعیت کے لحاظ سے حسب ذیل شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) شعبۂ تحقیق میں وہ خالص فنی نوعیت کی تحقیقات شامل ہے جس کے ذریعہ حکمیاتی نظریوں کو زراعت کے عملی کام میں استعمال کیا جا سکے۔ اس قسم کے کام کی غرض سے سررشتہ کے تحت نباتیات، فارم، کیمیا، حشرات اور مرغبانی کے شعبے قائم ہیں۔

(۲) شعبۂ تجرباتی میں تحقیقات سے جو مسلمہ نتائج حاصل ہوتے ہیں ان کو تجرباتی مزرعوں میں آزمایا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم کیا جائے کہ بڑے پیمانہ پر کاشتکاری میں یہ کس حد تک قابل عمل ہیں اور کفایت شعاری کے نقطۂ نظر سے کام دے سکتے ہیں یا نہیں۔

(۳) مظاہرہ اور پرچار کے شعبہ میں ان نفع بخش نتائج کا مظاہرہ کرنا اور رعایا کو ان کے استعمال کی ترغیب دینا جو تجربے اور تحقیق سے مفید ثابت ہو چکے ہیں۔ نیز جملہ زرعی معاملات میں انہیں مشورہ دینا اور جن اشیاء کو نفع بخش بتایا گیا ہے ان کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے میں مدد دینا۔

مملکت کی پانچ اہم ترین فصلوں یعنے چاول، ارنڈی، گیہوں، جوار، اور کپاس کے پودوں کی افزائش اور پرورش کا کام جاری ہے۔ چنانچہ مزرعہ حمایت ساگر میں چاول اور ارنڈی پر، پربھنی کے مزرعہ میں گیہوں اور جوار اور کپاس پر، رائچور کے مزرعہ میں کپاس پر تجرباتی کام ہو رہا ہے۔ کاشتکاروں اور باغات کے مالکوں کو کیڑوں کی ان بیماریوں کے انسداد سے متعلق جو فصلوں میں پھیل جاتی ہیں۔ حتی الامکان مشورے دیئے جاتے ہیں۔ کیمیائی شعبہ مٹی کے تحقیقاتی کام کے علاوہ کھاد اور تخم کے نمونوں کا تجزیہ کرتا ہے۔

حمایت ساگر میں مرغی خانہ اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ مملکت کی آب و ہوا کے لحاظ سے بہترین قسم کی مرغیاں پیدا کی جائیں۔

سررشتۂ زراعت کی جانب سے حمایت ساگر، سنگا ریڈی، پربھنی، ورنگل، رودرور، اورنگ آباد
حیدرآباد اور رائچور میں تجرباتی باغ قایم کئے گئے ہیں۔ ان باغات میں متعدد اقسام کی مقامی اور غیر ممالک کی اقسام
بھی اُگائی جاتی ہیں تاکہ تجارتی پیمانہ پر کاشت کے لئے موزوں ترین اقسام کا انتخاب کیا جائے
اور ان کے تخم حاصل کئے جائیں اور ان کا مظاہرہ کیا جائے۔

اس سررشتہ کی جانب سے زرعی اصلاحات نافذ کرنے کے لئے ممکنہ طریقے استعمال کئے جاتے
ہیں جو طریقہ سب سے زیادہ کاشتکار پر اثر ڈالتا ہے یہ ہے کہ عملی مظاہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے
اور اس کے گاؤں کے حالات تحت کیا جائے۔ چنانچہ دیہات میں امدادی مزرعے اور مظاہراتی
خطے قایم کئے گئے ہیں۔ امدادی مزرعے کاشتکاروں کی ملک ہوتے ہیں جن کو سررشتہ
نے منتخب کرتا ہے کاشتکار کو پابند کیا جاتا ہے کہ اپنی زمین کا ایک حصہ مظاہراتی تجربہ یا اصلاحی
کے لئے سررشتہ کے حوالے کردے اور اس کو اچھے طور پر فصلوں کی وہ خاص قسمیں اُگانی پڑتی ہیں
جن کے تخم کی سررشتہ کو دوسرے کاشتکاروں میں تقسیم کرنے کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔ تجرباتی
اور مظاہراتی رقبہ کے تمام مصارف سررشتہ برداشت کرتا ہے۔ تجربہ یا مظاہرہ ختم ہونے کے بعد پیداوار
زمین کے مالک کو دے دی جاتی ہے کاشتکار اس امر کا پابند ہوتا ہے کہ اس کے رقبہ کی ساری
پیداوار سررشتہ کے ہاتھ فروخت کردے جس میں وہ سررشتہ کے سفارش کردہ ترقی یافتہ تخم
بوتا ہے۔ فی الحال مملکت حیدرآباد میں اس قسم کے ۲۴ مزرعے موجود ہیں۔

سررشتۂ زراعت کی جانب سے بعض مزرعوں پر جماعت کاشتکاری اور باغبانی کا بھی انتظام
عمل میں لایا گیا ہے۔ اس جماعت کا مقصد کاشتکاروں کی اولاد کو زراعت کے جدید طریقے سکھانا ہے
طلبہ کو کاشتکاری کے ترقی یافتہ اصولوں کے مطابق عملی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ مدت تعلیم دو سال ہے
حمایت ساگر، پربھنی اور رودرور، نظام آباد کے مزرعوں میں اس قسم کے تربیت کے انتظامات کئے گئے ہیں

ممالک میں امپیریل کونسل آف اگری کلچرل ریسرچ کی حسب ذیل اسکیمیں جاری ہیں۔
(۱) خشک کاشتکاری کی تحقیقات کی اسکیم رائچور میں۔ (۲) ارنڈی اور چاول کی اصلاح کی اسکیم

حمایت ساگر میں۔ (۳) میووں کو ترقی دینے کی اسکیم سنگاریڈی اور اورنگ آباد میں۔ (۴) نیشکر کی اشاعت کی اسکیم رودرور میں۔

کپاس۔ مملکت حیدرآباد میں سنٹرل کاٹن کمیٹی کی حسب ذیل اسکیمیں جاری ہیں۔

(۱) کپاس کی نباتیاتی تحقیقات کی اسکیم بمقام پربھنی۔ (۲) کپاس کے کیڑے بولی ورم کو صاف کرنے کی اسکیم بمقام ناندیڑ۔ (۳) کپاس کے تخم کی تقسیم بمقام اچو ر (۴) کمپٹا کپاس کی ترقی و اصلاح کی اسکیم بمقام رائچور۔

سررشتۂ زراعت کی جانب سے ایک زرعی انجمن بھی قایم ہے۔ اور ایک سہ ماہی رسالہ حیدرآباد فارمر بھی شایع ہوتا ہے۔

دیہی تنظیم۔ زرعی کمیشن نے صحیح تنقید کی ہے کہ زراعت میں کوئی اصلی ترقی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تاوقتیکہ خود کاشتکار، معیشت، تعلیم، حفظ صحت کے ایک بہتر معیار حصول کا آرزومند نہ ہو۔ کاشتکار کو چاہیے کہ سائنس، دانشمندانہ قوانین اور اچھے نظم و نسق سے استفادہ کرے۔ بہتر زندگی کے مطالبہ کو صرف متحدہ کوشش کی بنا پر ہی تقویت حاصل ہو سکتی ہے اور اس سے دیہی آبادی کی عام حالت میں اصلاح ہو سکے گی۔ اس خصوص میں تقدیم کی ذمہ داری حکومت پر عاید ہوتی ہے اور اس مقصد کے حصول میں سررشتہ ہائے مالگذاری جنگلات، زراعت، امداد باہمی، تعلیمات، صحت عامہ، صنعت و حرفت اور تعمیرات کی تنظیم اور باقاعدہ کوششوں کی ضرورت ہے۔ جنگ کی جدوجہد بہت کچھ دیہی باشندوں کی زندگی سے وابستہ ہے عوام کی ہمدردی دلچسپی اور امداد بھی بہت ضروری ہے صرف چند سرگرم اور بلند خیال عہدہ داروں کی انفرادی کوششوں سے کوئی مستقل نتایج حاصل نہیں ہو سکتے اس قسم کی کوششوں کی ایک مثال مسٹر ایف۔ ایل۔ برین۔ آئی۔ سی۔ ایس کے ان تجربوں میں نظر آتی ہے جو وہ ضلع گرگاؤں پنجاب میں عمل میں لائے۔ سنہ ۱۹۳۷ء کے وسط سے ہندوستان کے اکثر صوبہ جات میں دیہی تنظیم کا کام وسیع پیمانے پر شروع کیا گیا ہے۔ سر فریڈرک سائیکس گورنر بمبئی کے عہد ۱۹۳۲ء میں سرکاری عہدہ داروں اور غیر سرکاری اصحاب کے اتحاد عمل کی بنیاد پر دیہی تنظیم کی اسکیم جاری کی گئی۔

یہ ارکان موضع، تعلقہ اور ضلع کی کمیٹیوں میں کام کرتے ہیں۔

زرعی اصلاح، دیہی صنعتیں، دیہی حفظ صحت، تعلیم، تعمیر امکنہ اور دیہی سہولتوں کی فراہمی اس کے اہم مقاصد ہیں۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں بمبئی میں کانگریسی وزارت نے ایک جدید سررشتۂ تنظیم دیہی کے کام کو قائم کیا اور اب تربیت یافتہ اشخاص کی نگرانی میں توقع کی جاتی ہے کہ ہر گاؤں میں اس کام کی خاطر خواہ ترقی ہو سکے گی۔ حکومت ہند نے بھی تحریک اصلاح دیہات میں دلچسپی لیکر صوبہ جات کو ایک کروڑ روپے کی رقم سنہ ۳۶-۱۹۳۵ء کے موازنہ سے عطا کی۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ محض اس جد و جہد سے زرعی مسائل حل نہیں ہو سکتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ صنعتی اور عام معاشی ترقی بھی ضروری ہے۔

تنظیم دیہی مملکت آصفیہ میں۔ اصلاح دیہات کا کام سرکاری طور پر بعض اضلاع میں، عہدہ داران ضلع کی انفرادی کوشش سے عمل میں آنے لگا یا وائی ایم سی اے جیسی غیر سرکاری انجمنوں نے اس کا آغاز کیا۔ ہندوستان میں اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے پر سرکاری طور پر اس کا آغاز بہت بعد میں کیا گیا لیکن ممالک محروسہ سرکار عالی کو سرکاری طور پر اس کام کے آغاز کی اولیت حاصل ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۲ء میں انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کی امداد سے سب سے پہلے پٹنچرو میں تنظیم دیہی کے ایک مرکز کا افتتاح عمل میں آیا۔

تنظیم دیہی کے کام کی کامیابی کے لئے جو بنیادی اصول پیش نظر رکھا گیا ہے کہ مفاد عامہ کے سررشتہ جات کے باہمی تعاون و اتحاد عمل کے ساتھ اس امر کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ خود دیہی آبادی میں یہ صلاحیت پیدا ہو کہ وہ خود اپنی منفردہ اور اجتماعی ترقی کی تدابیر اختیار کرے اور ان ذرائع سے استفادہ کرے جو آئے دن ملک کی ترقی کے لئے منجانب سرکار مہیا کئے جاتے ہیں۔

اس سلسلہ کی پہلی کڑی صدر مجلس تنظیم دیہی ہے جس کا صدر مقام بلدہ حیدرآباد ہے اور جس کے اراکین مفاد عامہ کے سررشتوں کے ذمہ دار اعلیٰ عہدہ داران ہیں۔ کام میں سہولت اور خوش اسلوبی پیدا کرنے ایک علحدہ معتمدی تنظیم دیہی کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ صدر مجلس کے تحت ہر ضلع کے مستقر پر مجلس ضلع ہوتی ہے اور مجلس ضلع کے زیر نگرانی مجلس تحصیل ہوتی ہے۔ ان مجالس میں سرکار عالی عہدہ داران

انجمن ہائے مساوی تعداد میں غیر سرکاری نمائندے بھی شریک ہوتے ہیں۔
مجلس میں فارم بیمہ دیہی تنظیم کا کام ایک ایسے موضع میں شروع کیا جاتا ہے جس کی آبادی متوسط
ہو اور مستقر تحصیل سے پانچ سے دس میل کے فاصلہ پر سڑک سے قریب واقع ہو۔ ایسے منتخب موضع
میں بہبودی دیہی کی انجمن قائم کی جاتی ہے۔
سال ۱۹۴۰-۴۱ء میں دیہی تنظیم کے کام کے لئے منتخب کردہ دیہات کی تعداد ۱۲۰ تھی۔ وسیع پیمانہ پر
ویلیج کی ترویج کو روکا گیا۔ حکومت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مفاد عامہ کے سررشتوں کو چاہیئے کہ ابتداء میں تعلقہ
میں صرف ایک یا خاص حالات میں دو منتخب مواضعات میں اس کام کو پوری قوت کے ساتھ جاری کریں
اور زیادہ تر زور اس پر دیا گیا کہ خود دیہاتی آبادی اس تحریک میں دلچسپی لے۔ اور انہیں موجودہ انجمنوں کے
رکن بننے کی ترغیب دی جائے۔ غرض نتیجہ یہ ہوا کہ اب اراکین کی تعداد (۱۵۲۶۹) ہو گئی ہے۔
سال ۱۹۴۰-۴۱ء میں چند منتخب مواضعات میں ۹۰ ضلع کے بنک تھے مختلف مرکزی مقامات پر
بیج دیہی بنک کھولے گئے۔ دیہی تنظیم کے ۷۰ مواضعات میں بہتر تخم کی تقسیم عمل میں آئی۔ کھاد کے گڑھے
کھدوائے گئے۔ [illegible] زرعی صنعتیں جاری کی گئیں۔ میووں کے درخت نصب کئے گئے۔ [illegible] کھدوائی
گئیں۔ سڑکوں کی تعمیر کی گئی۔ حفظانِ صحت کا لحاظ رکھا گیا۔ لڑکیوں اور بالغوں کی تعلیم ترقی پذیر ہے۔
دیہات میں اشیاء کی صنعت تقسیم کا کام [illegible] ہوتا جا رہا ہے۔ نمائش ہائے اطفال منعقد کی گئیں
تمام تر توجہ اس امر پر ہے کہ دیہی صنعتوں، پیشیوں کی پرورش و نگہداشت اور کاشت کے
بہتر طریقوں کو عام کر کے پیداوار کو ترقی دی جائے۔ ضلع کے منتخب مواضعات میں ایک دوسرے
سے مسابقت کرنے کا ایک اچھا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ ۱۰۰ سو روپے سے لے کر تین سو روپے تک
اس موضع کو دیئے جاتے ہیں جو تنظیم دیہی کے مواضعات میں بہتر ثابت ہوتا ہے۔ مجلس ضلع کے اراکین
امداد باہمی کے مسائل پر تقسیم انعامات کے لئے ان تمام مواضعات کا دورہ کرتے ہیں۔ جہاں تنظیم
دیہی کا کام ہوا ہے۔ یہ مواضع اپنی عملی ترتیبوں کو دیگر مواضعات کے مقابلہ میں پیش کرتے ہیں۔ اس سے
امید افزا نتائج پیدا ہو رہے ہیں۔

جنگ اور مابعد جنگ کے زمانہ میں زرعی پالیسی۔

سنہ ۱۹۳۹ء کے اختتام پر جنگ کے آغاز کی وجہ سے دیہی معیشت اور ملک کی زراعت کی آیندہ ترقی کے مسائل بہت ہی اہم اور ہوگئے ہیں اس جنگ کی وجہ سے جو حالات پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کی اصلاح کے لئے ایک درکار ہوگی اور نیز مابعد جنگ کی معاشیات کی تنظیم پر غور و فکر ہونا ہے اس کے لئے ضرورت ہے پیدائش دولت اور تقسیم دولت میں باہمی ربط اور توازن قایم رکھا جائے۔ ملک کی ساری آبادی معاش کے بالکل نئے مسئلوں سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ ممکن ہے کہ جو مشکلات پیدا ہو رہے ہیں ان میں روز افزوں اضافہ ہوتا جائے۔ ممکن ہے کہ آیندہ حالات پر کسی نہ کسی طرح قابو حاصل کر لیا جائے۔ زرعی پیداوار کے سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیئے کہ قدیم بازار خاص طور سے براعظم یورپ اور مشرق بعید میں عارضی طور پر بند ہو چکے ہیں اور نئے بازار مثلاً ایران اور ترکی میں کھل رہے ہیں۔ بیرونی بازار بند ہو جانے کی وجہ سے روغنی تخم اور کپاس کی قیمتیں گر رہی ہیں اور اسی کے ساتھ زراعت پیشہ اشخاص کی قوت خرید بھی متاثر ہو رہی ہے۔ برما سے چانول کا آنا بند ہو چکا ہے۔ ہندوستان میں دفاعی ضروریات میں اضافہ ہو رہا ہے اور اندرون ملک نقل و حمل کے مشکلات کی وجہ سے خوردنی اشیاء کی قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہو گیا ہے۔ اور زیادہ غلہ اگانے کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ جنگ کے بعد بھی یہ اثرات ایک عرصہ تک باقی رہیں گے اس لئے ضرورت ہے کہ زمانہ جنگ اور مابعد جنگ کی زرعی پالیسی کا تعین کیا جائے۔

اس سلسلہ میں حکومت ہند نے اپریل سنہ ۱۹۴۲ء میں فراہمی غذا کی کانفرنس کا انعقاد دہلی میں کیا جس میں صوبہ جات اور ریاستوں کے نمایندے بھی شریک تھے تاکہ زیادہ غلہ اگانے کی مہم کو کامیاب بنایا جائے اب اکثر صوبہ جات میں اس اسکیم پر عمل کیا جا رہا ہے اور اس کا آغاز خوش آیند ہے۔

حکومت حیدرآباد کو بھی زمانہ جنگ کے معاشی مسائل مثلاً فراہمی اور تقسیم اجناس خوردنی کے مسئلہ کا سامنا ہو رہا ہے چنانچہ حکومت سرکار عالی نے نگرانی نرخ اشیاء کا ایک سررشتہ محکمہ مال کے تحت اور کمرشیل کارپوریشن بھی قایم کیا ہے مملکت آصفیہ میں زیادہ غلہ اگانے کی مہم سنہ ۱۹۴۲ء میں شروع کی گئی تھی۔

حمایت۔ ۱۹۴۹ء میں اس مہم میں زیادہ سرگرمی پیدا کرنے کی غرض سے حکومت سرکار عالی نے یہ تصفیہ کیا ہے۔ کہ انجمن ہائے کاشتکاروں کو ۲ لاکھ سے زیادہ کی امداد کی جائے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ محض نفع آور پیداوار کی بجائے کیا پیداوار زیادہ سے زیادہ مقدار میں اگائی جائے۔

جنگ کے بعد کی تعمیر جدید اور ترقی کے مسائل حکومت سرکار عالی کی توجہ کا مرکز بنتے جا رہے ہیں۔ ملک کی آبادی کی ترقی اور تعمیر جدید کے خاکوں کے لئے ایک مجلس کا قیام عمل میں آیا ہے۔ زرعی پیداوار کی نوعیت اور اس کی مقدار میں ترقی اور کاشتکار طبقہ کی فلاح کے سلسلہ میں جو کام لیا جائے گا اسے مندرجہ ذیل عنوان کے تحت تقسیم کیا گیا ہے

(۱) آبپاشی کی ترقی اور پانی سے برقی قوت کے حصول میں اضافہ۔

(۲) زراعت پر سائنٹفک تحقیقات۔

(۳) تجرباتی مزرعوں میں ترقی۔

(۴) زرعی مدرسوں اور کالجوں کا قیام۔

(۵) مختلف علاقوں کے خام مال کی بنیاد پر دیہی صنعتوں کی ترقی۔

(۶) جنگلات سے متعلق نئی پالیسی کا قیام جنگلات کی پیداوار اور وسائل سے زیادہ سے زیادہ استفادہ۔

(۷) مویشیوں کی اصلاح اور طبی علاج کی آسانیاں۔

(۸) نو آبادیوں کا قیام

(۹) ملک کے قدیم باشندوں اور پست طبقوں کی بہتری کی تدابیر۔

(۱۰) رسل و رسائل میں ترقی۔

مالگذاری

ہندوستان کی مالگذاری پر تاریخی نظر۔ (۱) عہد ہنود:۔ قدیم زمانہ سے ہندوستان کی حکومت کاشتکاروں سے پیداوار کا ایک حصہ حاصل کرتی رہی ہے۔ منو کے قوانین کے

بموجب بادشاہ کو اختیار تھا کہ کل پیداوار کا ۱/۶ حصہ وصول کرے۔ مگر جنگ اور نازک اوقات میں ۱/۴ چوتھائی حصہ حاصل کر سکتا تھا۔ مالگذاری جنس کی صورت میں ادا کی جاتی تھی رفتہ رفتہ خصوصاً مسلمانوں کی سلطنت قائم ہونے کے بعد نقد ادائی کا طریقہ رائج ہوا۔

(۲) عہد مغلیہ۔ مغلوں نے ہندوؤں کے قدیم طریقہ مالگذاری میں کوئی بنیادی تغیرات نہیں کیے بلکہ صرف ان کے طریقے کو قاعدہ کے تحت کر دیا۔ اور مالگذاری کا باقاعدہ حساب و کتاب جاری کیا۔ اس سلسلہ میں شہنشاہ اکبر اور اس کے قابل وزیر مالیات مظفر خان اور راجہ ٹوڈرمل کا مشہور بندوبست اراضی خاص طور پر قابل ذکر ہے انھوں نے شیرشاہ سوری کے اصلاحات مالگذاری سے استفادہ کیا۔ اراضی کی پیمائش کے بعد چار درجوں میں اس کو منقسم کیا گیا تھا اور مجموعی پیداوار کا ایک تہائی حصہ حکومت کا حصہ قرار دیا گیا۔ بندوبست کی میعاد نوسالہ تھی۔ دکن میں ملک عنبر احمد نگری اور مرشد قلی خاں نے اس قسم کے اصلاحات کیے۔ مرہٹوں کا نظام مالگذاری بھی اسی نوعیت کے بندوبست پر مبنی تھا۔

شاہان مغلیہ کے تنزل کے زمانہ میں مالگذاری کے طریقہ اور مدت کاشت میں ایک اہم لیکن ناخوشگوار تبدیلی ہوئی اس طریقے کے تحت مالگذاری وصول کرنے کا اختیار بعض ٹھیکہ داروں کو دیا جاتا تھا۔ جو حکومت کو مجموعی آمدنی کا ۱/۲ حصہ ادا کرتے اور بقیہ رقم بطور معاوضہ خود رکھ لیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان ٹھیکہ داروں نے اپنی حالت مستحکم کر کے زمین کے موروثی حقوق حاصل کر لیے۔ اس طرز آمد کے تحت ٹھیکہ دار اصلی کاشتکار پر بڑا ظلم ڈھاتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین کی مدت کاشت اور حقوق میں بہت پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ اور ابتدائی طریقہ مالگذاری باقی نہ رہا۔ خاص کر بنگال میں ٹھیکہ داروں نے زمینداری حیثیت حاصل کر لی۔

(۳) برطانوی عہد۔ ان حالات کے تحت برطانوی ماہرین نظم و نسق کے لئے کام بہت مشکل ہو گیا تھا۔ ان سے ابتداء میں بہت سی غلطیاں سرزد ہوئیں۔ مختلف صوبجات کے لئے ایک موزوں طریق کار کو روبہ عمل لانے میں ایک کافی مدت گذر گئی۔ سنہ ۱۷۶۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیوانی عطا ہونے کے بعد کلائیو کی دوعملی نظام والی حکومت کی وجہ سے ابتدائی بدنظمی میں اور ابتری پیدا ہو گئی۔

سنہ .... یاں کا انسداد ہوا۔ اور متعدد تجربوں کے بعد ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس نے بنگال میں دوامی بندوبست جاری کیا جس کی رو سے اراضی پر زمینداروں کے مالکانہ حقوق تسلیم کرلئے گئے۔ اور مالگذاری کی مقدار بھی ہمیشہ کے واسطے معین ہوگئی۔ جدید بندوبست کے نتائج کچھ زیادہ خوش آیند نہ تھے۔ ابتدا میں زمیندار مالگذاری کے بارگران کو ادا کرنے سے قاصر تھے اور کاشتکاروں پر سختی کیا کرتے تھے کاشتکاروں کے حقوق کے تحفظ اور زمینداروں کے مظالم سے ان کو محفوظ رکھنے کے لئے ۱۸۵۹ء اور ۱۸۸۵ء میں ضروری قوانین کا نفاذ ناگزیر ہوگیا۔ اضافۂ لگان اور بے دخلی کے قواعد مقرر کئے گئے دوامی بندوبست کی ابتدائی پالیسی جو ۱۷۹۵ء میں بنارس اور شمالی مدراس کے بعض حصوں میں رائج ہوچکی تھی۔ سنہ ۱۸۲۲ء میں ترک کردی گئی۔ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف صوبوں میں میعادی بندوبست کا طریقہ بیس سے تیس سال تک مقرر کیا گیا اور اس طرح اودھ کے تعلقدار صوبۂ متوسط کے مالگذار پنجاب اور شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے محال، مدراس، بمبئی اور برار کی رعیت عارضی طور پر میعادی بندوبست سے دوچار ہوئی۔

بندوبست سے کیا مراد ہے ۔ بندوبست کی اصطلاح امور ذیل کے تعین پر مشتمل ہے۔

(۱) پیداوار یا لگان کا وہ حصہ جس کی حکومت مستحق ہے۔

(۲) شخص یا اشخاص جو اس کو ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

(۳) اراضی پر مالکانہ حقوق اور مفادات کے باضابطہ تحریری دستاویزوں کا تحفظ۔

تعین مالگذاری کے لئے زمین کی تشخیص کی جاتی ہے۔ مالگذاری کی شرح زمین کے مختلف مدارج کے مطابق مقرر ہوتی ہے اور گاؤں کے مختلف حلقوں اور حصوں میں زمین کو منقسم کیا جاتا ہے۔ اس طرح مقبوضہ اراضی پر محصول کی مقدار معین ہوتی ہے۔ مالگذاری اقساط سے وصول کی جاتی ہے۔ عام طور پر فصلی تباہی اور محصول کی جزوی یا کلی خرابی کی صورت میں بھی معافی یا التوا منظور کیا جاتا ہے۔ مختلف صوبجات میں مالگذاری کی تشخیص کے جو مختلف اصول اختیار کئے گئے ہیں ان کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

دوامی بندوبست بمقابلہ عارضی بندوبست ۔ بندوبست مالگذاری اپنی مدت کے لحاظ سے دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) دوامی بندوبست جس میں مالگذاری ہمیشہ کے واسطے معین کر دی جاتی ہے۔ جیسا کہ [redacted] شمالی مدراس اور بنارس میں رائج ہے۔

(۲) عارضی بندوبست جس میں ایک مدت معین کے لئے مالگذاری مقرر کی جاتی ہے۔ یہ مدت بمبئی، مدراس اور صوبہ متحدہ میں تیس ۳۰ سال صوبہ متوسط میں بیس ۲۰ سال اور پنجاب میں چالیس ۴۰ سال مقرر ہے۔ (تحت ترمیم قانون بندوبست بابتہ ۱۹۲۹ء)

کسی زمانہ میں دوامی اور عارضی بندوبست کے مسائل ہندوستان میں مابہ البحث رہ چکے ہیں۔ آر، سی، دت، آنجہانی نے دوامی بندوبست کو تمام ہندوستان میں جاری کرنے کی حمایت کی اور لارڈ کرزن نے حکومت ہند کی جانب سے اس کی مخالفت کی۔ دوامی بندوبست کی حمایت میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے حکومت کو مستقل مالگذاری وصول ہوتی ہے اور اس کے وصول میں اخراجات بھی نسبتاً کم عائد ہوتے ہیں۔ دوامی بندوبست سے زرعی ترقی اور خوش حالی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ دوامی بندوبست کے مقابل عارضی بندوبست کے نقائص یہ ہو سکتے ہیں مثلاً مالگذاری کی نظر ثانی کے وقت کاشتکاروں کی پریشانی، ہر نئے بندوبست کے لئے قیمتی آلات کی فراہمی، محنت و صرفت اور دیگر اصلاحی امور کی راہ میں ہونا اور عہدہ داران مالگذاری کے ہاتھوں میں اقتدار کا ارتکاز۔

اس کے برعکس دوامی بندوبست سے سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ حکومت کو مالگذاری کے امید افزا اضافہ سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ دوامی بندوبست سے غائب زمینداری طریقہ کے نقصانات رونما ہوتے ہیں۔ اور پٹہ داروں کی محافظت کے لئے حکومت کو خاص قوانین بنانے پڑتے ہیں۔ اس کی طرف بھی اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ اب عارضی بندوبست کے نظام میں بہت کچھ اصلاح ہو چکی ہے جس میں اراضی کی درجہ بندی اور اس کی نوعیت کے دیگر امور کو مستقل حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ نیز خانگی طور سے زمین میں جو اصلاحات عمل میں لائے گئے ہیں ان کی وجہ سے نامناسب اضافہ ہونے نہیں دیا جاتا

ضرورت کے وقت التوا اور نظرثانی بھی عمل میں لائی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ عارضی بندوبست
جو دو طریقوں کے ذریعہ حکومت کے مطالبات اور کاشتکاروں کے حقوق کے مابین ایک خوشگوار
کی صورت پیدا کی گئی ہے۔ آج کل رائے عامہ عارضی بندوبست سے گویا راضی ہو چکی ہے۔ اور
مدت۔ کہ بندوبست کے ذریعہ مناسب شرح مالگزاری اور انتظام مالگزاری پر قانونی نگرانی
کر کے مزید اصلاح کی تلاش ہے۔ بنگال میں حکومت نے دوامی بندوبست کے سلسلہ میں غور کرنے
کے لئے ایک کمیشن سر فرانسیس فاؤلر کی صدارت میں قائم کیا۔ اس رپورٹ کی بنا پر مارچ ۱۹۴۳ء
میں حکومت کی جانب سے لیجسلیٹو اسمبلی میں اعلان ہوا کہ حکومت دوامی بندوبست کو برخاست کر دینا
چاہتی ہے۔ تعلقداروں اور زمینداروں کو لگان وصول کرنے کے لئے جو حقوق حاصل ہیں ان کا معاوضہ
ادا کر دیا جائیگا۔ اور متعلق راست قائم ہو جائے گا۔ اولاً ایک یا دو اضلاع [illegible] اس کا نفاذ
عمل میں آئے گا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ معاوضہ کی ادائی میں ۳۰ کروڑ روپے کے مصارف عاید ہوں گے۔

بندوبست کی تین بڑی قسمیں ۔ بندوبست کی تقسیم میعادی لحاظ سے بھی کیجا سکتی ہے۔ یعنے وہ طریقہ جس کے تحت اراضی پر قبضہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کی تین بڑی قسمیں ہیں۔

(۱) زمینداری اس میں ایک شخص یا چند مشترکہ قابضین وسیع اراضی حاصل کرتے ہیں اور
مالگزاری ادا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس قسم کا طریقہ بنگال میں رائج ہے۔

(۲) محال واری نظام۔ گاؤں کی اراضی مشترکہ جماعتوں کی ملکیت ہوتی ہے جس کے
ارکان بالاشتراک یا انفرادی طور سے مالگزاری ادا کرتے ہیں۔ آگرہ اور پنجاب کے بعض حصوں میں
یہ طریقہ رائج ہے۔

(۳) رعیت واری طریقہ میں زمین کے ہر قطعہ کا مالک علحدہ شخص ہوتا ہے۔ پٹہ دار انفرادی
حیثیت میں مالگزاری کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ بمبئی مدراس اور برار میں یہ طریقہ رائج ہے۔

میعاد کی ان تین بڑی قسموں کے علاوہ بیڈن پاول نے بندوبست کی تین اور بڑی قسمیں بیان کی ہیں۔

(۱) زمینداری بندوبست۔ ایک علحدہ قطعہ اراضی کسی ایک زمیندار کے تحت ہوتا ہے

اس میں یا تو دوامی بند و بست کی اساس پر جیسے بنگال، شمالی مدراس اور بنارس میں ہے۔ یا عارضی بند و بست کی بنیاد پر جیسے اودھ کے تعلقدار ہیں (بنگال میں بھی اس قسم کے چند زمیندار) [illegible] پٹہ دار زمین کی کاشت کرتے ہیں اور زمیندار کو لگان ادا کرتے ہیں۔

(۲) محال واری بند و بست۔ قطعہ زمین اشخاص کے تحت ہوتا ہے جیسا کہ صوبۂ [illegible] اور پنجاب میں ہے۔ صوبۂ متوسط [illegible] کو بھی اسی طریقہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ پنجاب میں پٹہ داروں کی کوئی قابل لحاظ جماعت [illegible] ہے اور تقریباً نصف زمینات (بشمول جدید نو آبادیات) پر مالکان اراضی قابض ہیں اور یہ خود ہی کاشت کرتے ہیں۔ اگرچہ نظری حیثیت سے یہاں مالگذاری ہر ایک کاشتکار سے منفرداً وصول نہیں کی جاتی بلکہ گاؤں کے مشترکہ پٹہ داروں سے جو مشترکہ طور پر اس کی ادائی کے ذمہ دار ہیں لیکن عملاً مالگذاری فرداً فرداً وصول کی جا سکتی ہے۔ پنجاب کے کسانوں کی عموماً وہی حالت ہے جو بمبئی اور مدراس کے کسانوں کی ہے۔

(۳) رعیت واری بند و بست۔ ہر شخص منفرداً زمین کا مالک ہوتا ہے جیسا کہ مدراس، بمبئی اور برار میں ہے۔ آسام اور کورگ میں بھی رعیت واری بند و بست ہی ہے لیکن سرکاری طور پر اس کو رعیت واری بند و بست نہیں کہا جاتا۔

تشخیص مالگذاری کا اصول۔ محال واری طریقہ میں بشمول پنجاب، مالگذاری فنی حیثیت سے جائداد کی خالص آمدنی کا ایک جز دیکھی جاتی ہے۔ یہ آمدنی جائداد کی حقیقی آمدنی اور بعض متفرق منافعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جو بنجر زمینات، میوے اور جنگلی پیداوار سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ اس آمدنی میں حکومت کے حصہ کی مقدار وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہے۔ ابتدا میں اس کی شرح بہت زیادہ تھی ۱۸۳۳ء میں ۶۶ فی صدی گھٹا دی گئی۔ ۱۸۵۵ء میں سہارنپوری قاعدے کے تحت اس میں مزید ۵۰ فی صدی کمی کر دی گئی۔ سرکاری بیانات کے مطابق اس آمدنی میں جو حصہ حکومت کو حاصل ہوتا ہے وہ اکثر صورتوں میں ۵۰ فی صدی سے کم ہے۔ ۱۹۲۹ء میں پنجاب میں حکومت کے حصہ کو خالص پیداوار کے ۲۵ فی صدی تک کم کر دیا گیا۔ مدراس میں نظری حیثیت سے تشخیص مالگذاری کا اصول خالص پیداوار

ذرعیت پر مبنی ہے (یعنے اصلی پیداوار میں سے اخراجات کاشت منہا کرنے کے بعد، ہوتا ہے وہ تقریباً نصف حصہ مالگذاری کی زیادہ سے زیادہ شرح ہے) بمبئی اور برار میں تشخیص مالگذاری کا کوئی ایسا معین اصول نہیں ہے بلکہ مروجہ طریق تجربہ اور بعض عام معاشی حالات پر منحصر ہے موجودہ زمانہ میں ادر اجارہ داری کے قدیم تنازعات پر زر لگان کے تعین کا اصول قرار دیا گیا ہے۔ سندھ میں مالگذاری کی شرح بارش پر نہیں بلکہ ذرائع آبپاشی پر منحصر ہے کیونکہ بارش یہاں بہت ہی قلیل مقدار میں ہوتی ہے۔ صوبہ بمبئی کے مقابلہ میں بندوبست کی میعاد بھی یہاں مختصر ہے۔

اراضی اور حکومت کی ملکیت۔ ہندوستان میں مالگذاری کے تعلق سے حسب ذیل دو اہم مسائل مابہ النزاع ہیں۔

اول یہ کہ اراضی آیا حکومت کی ملکیت ہے یا انفرادی ملکیت۔ دوسرے مالگذاری محصول ہے یا لگان۔ حکومت کی ملکیت کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ برطانوی اقتدار سے قبل حکومت وقت نے کبھی تنہا ملکیت اراضی کا دعویٰ نہیں کیا۔ اس لئے برطانوی حکومت سابقہ حکومتوں کی جانشین ہونے کی بناء پر اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دور حکومت میں قطعی طور پر خانگی ملکیت تسلیم کی گئی تھی۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں جب مغلیہ سلطنت کو زوال آیا تو مختلف غاصب ... نے زر مالگذاری یا ملکیت کا دعویٰ کیا۔ برطانوی حکومت ہند نے ہر جگہ زمین کی خانگی ملکیت کا حق ... ہے۔ ملک کے بڑے رقبوں (مثلاً بنگال اودھ اور تمام شمالی ہند) میں زمینداروں کی ملکیت کے حقوق تسلیم کر لئے گئے ہیں۔ رعیت واری طریق کے صوبوں مثلاً مبئی میں بھی رعیت یا کاشتکار کی حالت زمیندار سے مختلف نہیں ہے۔ جب تک وہ مالگذاری ادا کرتا رہتا ہے زمین کی ملکیت کے تمام حقوق اس کو حاصل رہتے ہیں۔

بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان میں زمین کی ملکیت کے متعلق جو نظریہ ہے وہ دراصل انگلستان کے اصول اور دوسرے ممالک کے اصولوں کی گویا ایک درمیانی صورت ہے

مالگذاری محصول ہے یا لگان۔ اگر زمین کی ملکیت خانگی تسلیم کر لی جائے تو اس سے

نکلتا ہے یہ منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ مالگذاری محصول ہے لگان نہیں ہو سکتا یہ مسئلہ اس قدر پیچیدہ ہے کہ ابھی تو کوئی قطعی حل پیش نہیں کیا جا سکتا بعض وقت یہ کہا جاتا ہے کہ اگر اراضی پر حکومت کی ملکیت تسلیم تو اس حق کو بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ حکومت کو کامل معاشی لگان کی وصولی کا بھی اختیار حاصل ہے ایک ایسا نتیجہ ہے جس سے ہم [illegible] نہیں سکتے۔ اس [illegible] یہ مالیات کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ محصول ادا کرنے والے کی معاشی حیثیت کو متاثر کئے بغیر عملاً ہر قسم کا کامل معاشی لگان محصول جا سکتا ہے بشرطیکہ معاشی لگان کو اجرت، منافع اور سود سے تمیز کیا جا سکے۔ اسی کے عدم ملکیت کے تصور کے اساس پر غیر معاشی کھیت کو بھی مالگذاری سے مستثنیٰ کیا

نظریۂ رکارڈو اور ہندوستان میں مسئلہ مالگذاری۔ جیسا کہ اوپر بیان

تشخیص مالگذاری کے اصول عام حالات کے تحت ہر صوبہ میں مختلف ہیں۔ اور حکومت کا یہ خیال ہے کہ تمام برطانوی ہند میں مالگذاری کو معاشی لگان کے ایک مناسب اساس پر مقرر کیا گیا ہے لیکن اگر ہندوستان کے بہت سے غیر معاشی کھیتوں کی نسبت تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا جس کا دعویٰ حکومت نے کیا ہے حقیقت میں ان زمینوں کا اس قدر محصول حاصل کر لیا جاتا ہے کہ [illegible] ترین ذرائع باقی رہ جائیں۔ کسی اور مقام پر صحیح صحیح تعین نہیں کیا جا سکتا۔ زمین پر غیر معمولی بار بوجہ مسابقت اور پیشوں کی کمی کے سبب مالگذاری فی حیثیت اراضی کے حقیقی محصول سے بلند تر ہونا ممکن ہے۔ زرعی اغراض کے لئے روپیہ لگانے کا رواج یا فی حقیقت معاشی ضرورت کی مزید تقویت کا باعث ہے۔ رکارڈو کے نظریہ کے لحاظ سے تشخیص مالگذاری کو معاشی لگان سے کوئی رشتہ نہیں ہے اگرچہ کسی حالت میں بھی مالگذاری کو اکتسابی آمدنی میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

اصلاح کی ضرورت۔ ہندوستانی محصول اندازی کی تحقیقاتی کمیٹی بابت ٢٥-١٩٢٤ء کی تجویز کے مطابق معیاری شرح مالگذاری میں زمین کی سالانہ قیمت کے لحاظ سے ٢٥ فیصدی تک کمی کرنے کی ضرورت پر زور دیا جا رہا ہے۔ زمین کی سالانہ قیمت سے مراد مجموعی پیداوار میں سے

ثت ا ۔ کے اخراجات ، اور اس کے خاندان کے مصارف اور اس کے معاوضہ محنت کا منہا
۔ یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تشخیص مالگذاری پر نظر ثانی کرنے کا طریقہ صوبہ پنجاب کے
ہ قانون بابتہ ۱۹۲۸ء کے مطابق دستور ساز جماعت کے ذمہ کیا جائے تشخیص مالگذاری
یال اور حکومت کا حصہ خالص پیداوار کا پچیس فیصد کا مقرر کر دیا جائے ۔
سوال کے تحت صوبہ متحدہ اور صوبہ متوسط میں قوانین منظور ہو چکے ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں بمبئی کی
میں بھی ایک مسودہ قانون ، قوانین مالگذاری کی ترمیم کی نسبت پیش کیا گیا تھا ۔
س کا لفاظ چند منتخبہ رتبہ جات میں عمل میں آیا ہے ۔

رمیں سررشتہ مالگذاری ۔ جب نواب سر سالار جنگ اول (۱۸۵۳ء)
مہام ہوئے تو مملکت کا نظم و نسق صرف دو دفاتر واقع بلدہ میں انجام پاتا تھا ۔ یہ دو دفاتر
یعنے دفتر مال و دفتر دیوانی وغیرہ دار وں کی نگرانی میں تھے ان کا کام یہ تھا کہ مملکت کے حسابات اور
کا رجسٹر مرتب رکھیں ۔ اس وقت تک حکومت کا صرف یہ کام تھا کہ مالگذاری
گذاری کا طریقہ یہ تھا کہ ملک یا تو تعہداروں کو دیا جاتا تھا یا تعلقداروں
میں کیا جاتا تھا ۔

سر سالار جنگ نے اپنے صلاحات کی ابتدا اوبنہ ترتیج اس طرح کی کہ وصول مالگذاری کے اس
برخاست کر کے ایسے عہدہ دار مقرر کئے جن کی تنخواہ خزانہ شاہی سے ادا کی جاتی تھی ۔
عہدہ دار تعلقدار کہلاتے تھے ۔ تعلقدار جو اس طرح پر مدار المہام کے تحت ہوتے تھے ہمیشہ
سرکار سے طالب ہدایت ہوتے تھے ۔ لہٰذا ایک جدید دفتر جس کا نام منشی خانہ تھا قایم کرنا پڑا
جس کا کام یہ تھا کہ مدار المہام اور تعلقداروں کے مابین مراسلت کا ذریعہ بنا رہے ۔
۱۸۶۵ء میں منشی خانہ برخاست کر کے اس کی جگہ مجلس مالگذاری کا قیام عمل میں آیا تاکہ وہ
کل علاقہ دیوانی کی مالگذاری کی نگرانی اور انتظام کرے ۔ اس وقت ممالک محروسہ کی تقسیم اس طرح
تھی کہ ملک ضلعوں میں منقسم تھا ۔ ہر ضلع میں کئی تعلقے اور ہر تعلقہ میں کئی گاؤں ہوتے تھے ۔ یہ تعلقے

ایک تحصیلدار مقرر تھا جس کا بڑا کام وصول مالگذاری اور دیوانی و فوجداری مقدمات کا تصفیہ تھا۔ ہر تعلقہ اور ضلع میں سرکاری خزانے قایم کئے گئے اور متعلقہ تحصیلدار اور تعلقدار کے ماتحت رکھے گئے۔

سنہ ۱۲۷۰ف میں جدید قایم شدہ اضلاع کے پانچ صوبہ جات بنائے گئے جن پر ایک صدر تعلقدار مقرر ہوا۔ اس کے بعد مالگذاری کا ایک صدر المہام بھی مقرر ہوا۔ سنہ ۱۲۷۹ف تک پٹیل اور پٹواریوں کو ان کے خدمات کا صلہ یا انعام بشکل انعامات ملتا تھا۔ اس سال سے ان کے انعامات ضبط کر لئے گئے اور ان کو مالگذاری وصول شدہ پر ایک فیصد کے تحت فی صدی رقم دی جانے لگی اور جو اراضی انعام ان کے قبضہ میں تھی۔ اس کی جمع کے بجا اس شرط سے ان کے قبضہ میں رہنے دی گئی کہ وہ محصول سرکار ادا کیا کریں۔

مجلس مالگذاری سنہ ۱۳۱۱ف تک قایم رہی اس کے بعد اس کو برخاست کر کے معتمدی مال قایم کی گئی۔ سنہ ۱۳۲۰ف میں دائرکٹر جنرل و معتمد کا عہدہ قایم ہوا۔

انتظام مالگذاری ۔ مملکت کی اراضی باعتبار نوعیت قبضہ دو عام قسم کی ہیں:

(۱) وہ اراضی جو راست سرکاری انتظام کے تحت ہے اور جس کی آمدنی سرکار کو ہوتی ہے۔ یہ اراضی دیوانی یا خالصہ کہلاتی ہے۔

(۲) وہ اراضی جس کی آمدنی کلی یا جزئی طور پر کسی خاص غرض کے لئے دیدی گئی ہے۔

دوسری قسم کی اراضی ذیل کی دو قسموں پر مشتمل ہے۔

(الف) وہ اراضی جو صرف خاص سے موسوم ہے۔ یہ اراضی اعلیٰ حضرت کی ملک ہے۔ اور اس کی آمدنی مصارف خاص اعلیٰ حضرت میں صرف ہوتی ہے۔

(ب) یہ اراضی شاہی ملیہ ہے اور اس کی آمدنی کلی یا جزئی طور پر کسی شخص یا اشخاص کو بطور جاگیر یا انعام دی گئی ہے۔ اراضی دیوانی پر رعایا کا قبضہ رعیت واری طریقہ پر مشتمل ہے۔ دو کروڑ ایکڑ یا مملکت کا پچاس فیصدی سے زیادہ زمین، زمینداروں کے قبضہ میں اسی طریقہ پر ہے یہ زمیندار دو ہی

جن کو کوئی خاص حلیہ یا خاص استحقاق زمین کے متعلق نہیں ہے۔ یہ طریقہ بالکل علاقہ بمبئی کے طریقہ
کے مماثل ہے۔

طریق متذکرہ صدر کے مطابق ہر ایک کھیت ایک زمین مقبوضہ سمجھی جاتی ہے جو اصطلاح
میں پٹہ کے نام سے مشہور ہے جو رعیت کو راست سرکار کی جانب سے دیا گیا ہے جو زمیندار
پٹہ کا قابض ہے خواہ وہ ایک شخص ہو خواہ چند حصہ دار ہوں وہ درج رجسٹر شدہ قابض
پٹہ دار کہلاتا ہے۔ حق قبضہ اس بات پر منحصر ہے کہ پٹہ دار برابر سرکاری لگان
ادا کرے۔ اگر وہ سرکاری مطالبہ ادا نہ کرے تو اس کا حق ساقط ہو جاتا ہے اور زمین بحق
سرکار ضبط ہو جاتی ہے۔

ہر ایک کھیت یا سروے نمبر پر لگان علحدہ مشخص ہو کر ۳۰ سال تک وہی لگان مقرر رکھا
جاتا ہے۔ جن زمینوں میں ذرائع آبپاشی نہیں ہیں۔ یا جن کی آبپاشی باولیوں کے ذریعے ہوتی ہے
ان کی مقررہ سالانہ رقم ہوتی ہے اور فصل خراب ہونے یا زمین بلا کاشت پڑے رہنے
پر کوئی معافی نہیں دیجاتی۔ لیکن جن زمینوں کی آبپاشی تالابوں یا ندیوں کے ذریعہ سے
ہوتی ہے ان میں پانی نہ ہو تو سالانہ معافی دیجاتی ہے۔ جدید بندوبست کے وقت معاشی
حالات کے لحاظ سے شرح لگان پر نظر ثانی کی جاتی ہے۔ لیکن اگر پٹہ دار نے اپنے صرفہ سے
زمین کو ترقی دی ہو تو لگان کی شرح میں کوئی اضافہ نہیں کیا جاتا ہے۔

باقاعدہ مدت قبضہ ایک سال ہوتی ہے لیکن اگر پٹہ دار سرکاری لگان اور مطالبات
برابر ادا کرتا رہے تو وہ زمین پر غیر معین مدت تک قبضہ رکھ سکتا ہے۔ پٹہ دار کو یہ حق ہے
اپنے کھیت کے متعلق مکانات بنائے باولیوں کی تعمیر اور مرمت کرے یا اور طرح پر زراعت
ترقی دے۔ لیکن زراعتی زمین اغراض زراعت کے سوا دوسرے کاموں میں بلا سرکاری منظوری
کے نہیں لائی جا سکتی۔

صرف خاص مبارک ۔ یہ اراضی شاہی ملک ہے اور اس کی آمدنی فرماں روا کے

ذاتی مصارف میں صرف ہوتی ہے۔ قبل ازیں اعلیٰحضرت کے ذاتی مصارف کے لئے خزانۂ دیوانی سے نقد رقم دی جاتی تھی۔ لیکن چونکہ اس ادائی میں بہت بے قاعدگی ہونے لگی اس لئے ناصر الدولہ کے زمانۂ حکومت میں دیوانی سے بعض اراضی کر کے ذاتی انتظام میں لے لی گئی۔ اراضی صرف خاص کا انتظام ایک علیحدہ سررشتہ سے متعلق ہے جو ایک صدر المہام کے تحت ہے۔ جو راست اعلیٰحضرت کے تحت کام کرتے ہیں۔

علاقۂ صرف خاص مبارک کا کل رقبہ ۱۱۳۷ مربع میل ہے جو ۱۸۹۴ ہے۔ صرف خاص مبارک کی مالگذاری ایک کروڑ روپے وصول ہوتی ہے۔ بہ اغراض انتظامی دو قسموں میں منقسم ہے۔

(۱) مفوضہ علاقے۔ جو بغرض انتظام دیوانی کے تفویض کر دیئے گئے جن کا انتظام بجانب سررشتۂ صرف خاص عہدہ داران دیوانی کرتے ہیں۔ ... کے بعد ان تعلقات کی خاص آمدنی صرف خاص میں جمع کی ...

(۲) زیر نگرانی۔ ان تعلقات میں ضروری عملہ کا تقرر اور ان کی تنخواہ کی ... صرف خاص سے ہوتی ہے۔ اور عہدہ داران دیوانی کی صرف عام نگرانی ہے۔

پائیگاہ۔ نواب نظام علی خاں نے ابوالخیر خاں کو فوج رکھنے کے لئے جاگیر دی تھی۔ یہ فوج حضور کی فوج کہلاتی تھی اور اس وجہ سے اس کا نام جاگیر پائیگاہ ہوا۔ پائیگاہ کا رقبہ ۱۰۲۵ مربع میل ہے جو ۱۰۲۴ دیہات پر مشتمل ہے اور سالانہ ... لاکھ روپے مالگذاری وصول ہوتی ہے۔

جاگیر۔ جاگیر ایک یا چند مواضع کی عطا ہوتی تھی۔ جو کسی نمایاں خدمت کے صلہ میں یا صرف متعلقہ کی شان و شوکت قایم رکھنے کے لئے دی جاتی تھی۔ اس کی

(الف) التمغا جاگیر۔ التمغا سے وہ جاگیر مراد ہے جو معافی بالگذاری شاہی مہر ... جاتی تھی۔ یہ ایک مستقل دوامی اور موروثی جاگیر ہے اور اس کے حقوق بذریعہ ہبہ منتقل نہیں ہوسکتے ہیں۔ بصورت عدم موجودگی ورثاء یہ جاگیر داخل سرکار ہو جاتی ہے۔

(ب) ذات جاگیر۔ بڑے بڑے رقبہ جات زمین کی یہ عطا محض بغرض پرورش ... ہر ایک کی ... اور اس میں خدمت کی کوئی شرط نہیں ہوتی۔

(ج) ... جاگیر۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ معطا معطی لہٗ کے خدمات کی ... مقرر کی جاتی تھی۔ اس قسم کے جاگیروں کی بڑی تعداد سرکار میں ... ہوئی۔

(د) مشروطی جاگیر۔ کسی خاص مذہبی، دیوانی یا فوجی خدمت کی ادائی کیلئے ... لحاظ سے ... اور اس وقت تک باقی رہتی ہے کہ شرط عطا پوری ہو۔

... جاگیر۔ یا تو معطی لہٗ کی پرورش کے لیے دی جاتی ہے۔ جن کے ... غیر مشروطی عطا ہو یا اون کے دیگر ذرائع معاش کے علاوہ ہوتی ہے۔

موجودہ زمانے میں جاگیرات کی تعداد تقریباً ۱۲۶۴ ہے۔ اس کے رقبہ کا اندازہ نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ دو تہائی جاگیرات کی ابھی پیمائش و بندوبست ہونا باقی ہے۔

سمستان ۔ مسلمان فاتحین کا یہ قاعدہ تھا کہ جن رؤساء وغیرہ پر وہ فتح حاصل کرتے تھے ان سے سالانہ ایک مقررہ رقم بطور خراج لیتے تھے اور ان کو اپنے ملک کا انتظام بلا مداخلت کرنے کے لیے چھوڑ دیتے تھے جب تک کہ وہ خراج برابر ادا کرتے۔ ...

علاقہ میں تھا۔
اس خراج کا ... نہیں تھا اور جس راجہ یا رئیس پر یہ لگایا جاتا تھا اس کو پیش کش
اس وقت ممالک محروسہ میں حسب ذیل پیش کش گذار ہیں۔
(۱) گدوال۔ (۲) ونپرتی۔ (۳) جٹپول۔ (۴) امرچنتہ (۵)
(۶) پاپنا پیٹ (۷) دوم کنڈہ (۸) پالونچہ (۹) گرگمنٹہ۔
سمستانوں کے مواضعات کی تعداد (۶۶۰) ہے جس سے ...
مالگذاری وصول ہوتی ہے۔

تشخیص مالگذاری۔ تلنگانہ میں اراضی خشکی کی مالگ...
اور زیر نہر و فصلہ تری کے لئے ... فی ایکڑ ہے۔ باغات ...
ہے۔ اضلاع مرہٹواڑی میں اراضی خشکی کے لئے ... اور تری ...
ہے۔ سمت کرناٹک میں ... اراضی خشکی کے لئے ...
اور اراضی باغات کے لئے ... ہے۔
واضح رہے کہ برطانیہ ہند کے ہمسایہ اضلاع ...
گذشتہ تیس سال سے مملکت کے مالگذاری کی یہ پالیسی رہی ...
ہو جائے یا بارش کم ہو یا قحط سالی ہو جائے تو معافیت ...
رکھا گیا ہے کہ مصارف کاشت وضع کرنے کے بعد ... کا ...
سرکاری حق کے طور پر وصول کیا جاتا ہے۔

مسئلہ قولداری۔ حکومت نے تحفظ حقوق قولداران کے لئے
کمیٹی مقرر کی تھی۔ جس نے اس امر کی سفارش کی کہ قانون تحفظ قولداران کو
نفاذ عمل میں لایا جائے۔ مجلس مقننہ نے مسودہ مذکور کو ایک منتخب کمیٹی کے سپرد
کیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ جب یہ مسودہ قانون کی حیثیت حاصل کرے گا تو قولدا
کے حقوق کا بڑی حد تک تحفظ ہو سکے گا۔ اور ان کی حالت بہتر ہو جائے گی۔

... زیر ... پس منظر کر مکمل ... اصلا

(الف) ... حکومت نے صدر المہام بہادر کی صدارت میں ایک کمیٹی
... جاتی تھی ... ہر پہلو کی چھان بین کر کے رپورٹ پیش کرے۔
... کے ذریعہ تمام مفادات کے نمایندوں کی تحریری و زبانی شہادتو

... ا

... ہو جاتی ...

ہر ایک کمیٹی

جاتا ہے جن زمینوں پہ

... مقرر

... وی ...

... میں

سرسالار ...
... کے لحاظ سے ...

زمین کو ... دی جاتی

یا ...

ا ب

[illegible] پاس تھا اور جس راجہ یا رئیس پر یہ لگایا جاتا تھا اُن کو پیش [illegible] دستور میں حسب ذیل پیش کش گذرتی ہے۔

مجلّہ طیلسانین دستور

(۱) "مجلہ طیلسانین" انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا ترجمان ہے۔

(۲) اغراض انجمن کے لحاظ سے [illegible] مضامین، مقالے اور نظمیں شائع ہونگی۔

(الف) جامعۂ عثمانیہ کے [illegible] طیلسانین مقالے شائع کئے جائیں گے۔

(ب) اردو مطبوعات پر تنقید [illegible] کی جائے گی۔

(ج) انجمن طیلسانین عثمانیہ اور [illegible] کی سرگرمیوں اور کاروائیوں [illegible]

(د) علمی اور ہر جہتی ترقی کے معلومات، اطلاعات شائع کی جائیں گی۔

(ھ) سیاسیات حاضرہ اور اختلافی مذہبی امور کے متعلق مضامین وغیرہ کسی صورت میں [illegible]

(۳) حسب ضرورت مجلہ کے مختلف حصے خاص خاص علم و فن سے متعلق ہونگے۔ فی الوقت مجلہ کے دو حصے [illegible]

(۴) مجلہ بہمن اردی بہشت، امرداد آبان مطابق جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر [illegible]

(۵) مجلہ کے ہر حصہ کی ضخامت کم از کم [illegible] صفحے ہوگی۔

(۶) مضمون یا مقالہ نگاروں کو ان کے مضمون یا مقالہ کے دو نسخے بلا قیمت ارسال [illegible] نسخے بلا قیمت ارسال ہونگے بشرطیکہ پہلے اطلاع کر دیا جائے [illegible] زائد نسخے درکار ہوں تو کاغذ [illegible]

(۷) اگر مضمون یا مقالہ نگار پہلے سے مجلہ کے خریدار نہ ہوں تو مجلہ کا وہ شمارہ جس میں مضمون شائع ہو بلا قیمت ارسال کیا جائے گا۔

(۸) سال بھر میں کسی صاحب کے دو مضمون یا مقالے شائع ہو [illegible] اگر [illegible] انجمن طیلسانین عثمانیہ [illegible] مانع نہ ہو مجلہ بلا قیمت جاری کیا جائے گا۔

(۹) اگر کوئی مضمون یا مقالہ یا نظم [illegible] واپس کر دیا جائے گا۔

(۱۰) اگر کسی مضمون یا مقالہ کے لئے مجلہ [illegible] تیار کرے تو ان کو مناسب قیمت پر جس کا تصفیہ مہتمم مجلہ [illegible] کیا جائے گا۔

(۱۱) اگر مجلہ کا کوئی شمارہ [illegible] اطلاع مہتمم کو دو مہینے میں کر دینی چاہیئے۔

مجلہ طیلسانین کا چندہ اشتہارات کا نرخ

مجلہ کے چندہ کے متعلق حسب ذیل امور پر عمل ہوگا

(الف) مجلہ چندہ دہندہ ارکان انجمن طیلسانین عثمانیہ کو مقررہ قواعد کے موجب بلا قیمت ارسال کیا جائیگا

(ب) مجلہ کا حصہ سوم "معاشیات" معاشی کمیٹی انجمن طیلسانین کے ارکان کو [illegible] چندہ رکنیت کے علاوہ ماہانہ [illegible] ادا کرنے پر ارسال کیا جائیگا۔ اگر ان کو مجلہ کے دونوں حصے مطلوب ہوں تو اس کیلئے ان کو سالانہ دو روپیہ [illegible] چندہ رکنیت کے علاوہ ادا کرنا ہوگا۔

(ج) دونوں حصوں کی قیمت علاوہ محصول ڈاک، خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ پانچ روپیہ سکہ عثمانیہ [illegible] ہوجائی [illegible] ہر ایک [illegible] بیرون مملکت آصفیہ سے پانچ روپیہ سکہ حکومت ہند۔

[illegible] حصہ کی قیمت محصول ڈاک کے علاوہ خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ (۳) روپے سکہ عثمانیہ [illegible] مملکت آصفیہ سے (۳) روپے سکہ حکومت ہند۔

[illegible] حصہ "معاشیات" کی قیمت مع محصول ڈاک خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ (۲) روپے [illegible] عثمانیہ ہوگی اور بیرون مملکت آصفیہ سے (۲) روپے سکہ حکومت ہند۔

[illegible] کے لحاظ سے [illegible] کی قیمت فی نسخہ ایک روپیہ ہوگی۔ دونوں حصوں کی قیمت فی نسخہ ایک روپیہ آٹھ آنے ہوگی۔

[illegible] اشتہارات کا نرخ حسب ذیل ہوگا۔

مقدار	نرخ سالانہ	نرخ فی اشاعت	مقدار	نرخ سالانہ	نرخ فی اشاعت
پورا صفحہ پہلا ورق	۳۰ روپے	۱۲ روپے	آدھا صفحہ پہلا ورق	۲۰ روپے	۸ روپے
پورا صفحہ اندرونی	۲۰ روپے	۶ روپے	آدھا صفحہ اندرونی	۱۵ روپے	۵ روپے
[illegible] صفحہ	[illegible] روپے	۳ روپے			

البتہ تبادلہ کے طور پر اشتہارات کی اشاعت مطلوب ہو تو مراسلت کے ذریعہ تصفیہ ہوسکے گا۔

(۴) مجلہ کے سلسلہ میں ہر قسم کی مراسلت مہتمم مجلہ طیلسانین دفتر مجلس نمائش، نمائش گاہ باغ عامہ حیدرآباد دکن کے توسط کی جانی چاہیے۔

(۵) خریداران مجلہ اپنے پتہ کی تبدیلی سے مہتمم مجلہ کو بروقت مطلع فرمائیں۔

مطبوعات انجمن طیلسانیین عثمانیہ جن کا ہر تعلیمی ادارہ و ہر کتب خانہ میں ہونا ضروری ہے

۱۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیان ریاست" شاہی دور تولیت کی بسیط اور محققانہ تاریخ
مولفہ سید علی محسن ایم۔ اے (عثمانیہ) ....

۲۔ "سلطان احمد شاہ بہمنی" سلطان کے دور کی مفصل محققانہ اور مستند تاریخ۔
مولفہ ظہیر الدین صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ)

۳۔ "امام غزالی کی کلامی خصوصیات"، مولفہ محمد غوث صاحب (محبوب نگری) ام اے

۴۔ "موضع دوپلی کی معاشی تحقیق"، مولفہ محمد ناصر علی صاحب ام اے (عثمانیہ)

۵۔ "دربار اودھ کا اثر لکھنو کی شاعری پر" مولفہ محمد اعظم صاحب ام اے

۶۔ "معاشیات کی الف بے" مولفہ محمد ناصر علی صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ)

۷۔ "عہد معاونت اور حیدر آباد ۱۷۹۸ء"
مولفہ میر مخدوم علی خاں صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ)

۸۔ "بدھ سے تعصب تک"
مولفہ مولوی محمد فاروق صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) ایچ۔ سی۔ ایس

۹۔ "پاور الکحل" مولفہ نذیر حسین صاحب آفندی ایم۔ ایس سی (عثمانیہ) ایم۔ ایس۔ سی (۴ر)

۱۰۔ "مقامی محاصل کے اقسام اور نوعیت" مولفہ مولوی محمد فاروق صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) ایچ۔ سی۔ ایس (۲ر)

۱۱۔ "ہندوستانی معاشیات کے مبادی" مولفہ شرف الدین صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) زیر طبع

ملنے کا پتہ

دفتر مجلہ طیلسانیین دفتر مجلس نمائش نمائش گاہ باغ عام فون نمبر ۲۵۵۳

دی حیدرآباد پرفیومری اینڈ کا ... تصویر

... کی اشاعت ... مقبولیت اور اس کی فرمائشوں کے

... دوسرا ایڈیشن ... پانچ ماہ ... طبع ثانی کی تکمیل کر دی گئی

... بیش بہا اضافوں ... شائع ہونے کے سبب لائق

... ۱۶۵ ... شریک ہیں نیز

کتاب کی زینت کو ... صفحوں ... قیمتی مضامین بھی درج تھے

اور ... ۲۱۰ ... تجربہ کردہ

... ہے

... ۵۸ ... ہے

... محلہ مغل پورہ حیدرآباد دکن

مجلہ طیلسانین عثمانیہ

انجمن طیلسانین جامعہ عثمانیہ کا علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ

مُدیر

محمد غوث ام۔ اے ال ال بی (عثمانیہ)

مُہتمم

محمد عبد العلی بی ایس سی ال ال بی (عثمانیہ)

سالانہ چندہ (عہ) علاوہ محصول ڈاک۔ قیمت فی پرچہ ایک روپیہ آٹھ آنے

دفتر مجلہ طیلسانین نمائش گاہ باغ عامہ حیدرآباد دکن۔ فون ۲۵۵۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجلہ طیلسانین عثمانیہ۔ حصہ عام

جلد (۸) شمارہ (۳) — فہرست مضامین — جولائی ۴۴ ۱۹ء

فہرست مضامین

اداریہ قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر کی وفات حسرت آیات پر حیدرآباد کی ساری مسلم آبادی سوگ وار ہے۔ نہ صرف حیدرآباد بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمان اس سانحۂ عظیم میں یکساں شریکِ غم ہیں۔ قائدِ ملت کی اچانک وفات کا دکھ وقتی نہیں بلکہ دائمی ہے۔ جتنی دنیا تک مرحوم کی یاد مردم شناس اور درمند دلوں کو بے چین کرتی رہیگی۔ مرحوم کے ساتھ مسلمانوں کی غیر معمولی وابستگی بڑی حد تک ان کی پُر خلوص خدمات اور عدیم المثال ایثار میں مضمر ہے۔ مسلمانانِ ہند اور خاص طور پر مسلمانانِ حیدرآباد کی فلاح اور بہبود کے لیے آپ نے سب کچھ قربان کر دیا۔ گو کہ وہ زندہ نہیں ہیں لیکن ان کا نام اور کام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہیگا۔

حیدرآباد کو اُن کی ذات سے بڑی توقعات تھیں۔ آپ کی جسمانی حالت اور عام صحت کے پیشِ نظر کسی کو اس کا گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ آپ اس قدر جلد دنیا سے چل بسیں گے۔ نہ معلوم آپ کی وفات میں قدرت کی کیا مشیت ہے!!

مسلمانانِ حیدرآباد اس ناقابلِ تلافی نقصان کا حس تو رکھی اتم کر رہے ہیں۔ خطیبِ ملت ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکی ہے لیکن اس کی لافانی تلقینات مسلمانوں کے لیے ہر وقت شمعِ ہدایت کا کام دیتی رہیں۔ مرحوم کی پُر خلوص اور دردمند آواز اپنی زبان بے ریانی سے سننے والے کانوں کے لیے ہمیشہ یہی کہتی رہیگی: "مسلمانو!! ایک سچے مسلم کی زندگی بسر کرو۔ مکر، فریب، دغابازی اور جلبِ منفعت کو ٹھکرا کر دیانت داری، راست بازی، صداقت اور ایثار کو اپنا شعار بناؤ۔ انفرادی مفاد کو اجتماعی مفاد میں ضم کر دو کیونکہ یہی خصوصیات تمہارے شاندار مستقبل کی ضامن ہیں" مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ اپنے محبوب قائد کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔ محض رنج و غم کے اظہار کے لیے رسمی جلسے منعقد کرتے رہنا بیکار ہے۔

ہم دست بہ دعا ہیں کہ خدا مسلمانوں کو عملِ صالح کی توفیق عطا فرمائے۔ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ان کی بیگم صاحبہ اور دوسرے پس ماندوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

قائد ملت کے وصال پر

دل شاد اگر نہیں تو ناشاد ہی سہی
لب پر نغمہ نہیں تو فریاد ہی سہی
ہم سے دامن چھڑا کے جانے والے
جا جا اگر تو نہیں تری یاد ہی سہی

امجد حیدرآبادی

آہ! قائدِ ملت

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

قائدِ ملت، بہادر خاں، امیر المسلمین ❊ جوشِ مذہب اور اسلامی حمیت تجھ میں تھی
جسم پر تیرے قبائے رہبری ٹھیک آ گئی ❊ حُسنِ صورت تجھ میں تھا شانِ قیادت تجھ میں تھی
تیرا مسلک حق پرستی تیری فطرت حق شناس ❊ یعنی ہر باطل سے ٹکرانے کی ہمت تجھ میں تھی
زندگی تو نے گذاری تھی مجاہد کی طرح ❊ کفر کی طاقت سے لڑ جانے کی طاقت تجھ میں تھی
قصر و ایوان میں بھی تو پیغام حق دیتا رہا ❊ اس قدر آزاد اور بے باک جرأت تجھ میں تھی
تجھ سے ڈرتے اور کتراتے رہے اہلِ نفاق ❊ اس لیے کہ مردِ مومن کی فراست تجھ میں تھی
کتنے طوفانوں میں بھی گھر کر رہا ثابت قدم ❊ زخم کھا کر مسکرا دینے کی عادت تجھ میں تھی

تیرا اُٹھنا تھا کہ اک کہرام برپا ہو گیا
اب ہوا ظاہر کہ پوشیدہ قیامت تجھ میں تھی

اہلِ ساحل کو نہیں احساس کیا جاتا رہا ❊ چھوڑ کر کشتی بھنور میں ناخدا جاتا رہا
لوگ کہتے ہیں کہ اک بیدار انساں چل بسا ❊ ہم یہ کہتے ہیں ہمارا رہنما جاتا رہا
جسکے نغموں نے خزاں میں پھونک دی روحِ بہار ❊ باغ سے وہ بلبلِ شیریں نوا جاتا رہا
نبضِ ملت پر رکھیگا کون اپنی انگلیاں ❊ درد باقی رہ گیا درد آشنا جاتا رہا

کس کی باتیں اب ہماری محفلیں گرمائیں گی ✤ وعظ و تقریر و خطابت کا مزا جاتا رہا ۱
ہائے وہ رکعت کہ جو پوری نہ ہو کر رہ سکی ✤ مقتدی سجدے میں تھے اور مقتدا جاتا رہا
کتنے بچے ہیں کہ جو محروم شفقت ہو گئے ✤ کتنی بیوائیں ہیں جن کا آسرا جاتا رہا

اک مجاہد اک قلندر اک مسلماں اٹھ گیا ۳

ایک شیدائے محمد مصطفےٰ جاتا رہا

شمع افسردہ ہے پروانے بھی ہیں سہمے ہوئے ✤ سوگ میں ہے انجمن کی انجمن تیرے لیے
یاد تیری اب کسی دل سے نکل سکتی نہیں ✤ مدتوں روئیں گے ارباب وطن تیرے لیے
تیرے غم میں بن گیا ایک ایک گھر ماتم کدہ ✤ کس قدر غمگین ہیں اہل دکن تیرے لیے
قبر پر تیری سدا رحمت کا مینہ برسا کرے ✤ یہ دعائیں کر رہے ہیں مرد و زن تیرے لیے
گنبد خضرا سے تیری سمت جب دیکھیں حضور ✤ نور کی چادر ہی بن جائے کفن تیرے لیے
قرب حق کے لہلہاتے باغ میں کھلتے رہیں ✤ لالہ و گل یاسمین و نسترن تیرے لیے
جب تو جائے لیکے پیشانی میں سجدوں کے نشاں ✤ کھول دے آغوش جنت کا چمن تیرے لیے

اور کریں حوران جنت عرض یہ تیرے حضور

تیرے ماہر کی بھی ہے نذر سخن تیرے لیے

ماہر القادری

سوزِ ناتمام

رولے اب جی کھول کر اے دیدۂ خوننابہار ⁂ اور کرلے اور کچھ جیب و گریباں تار تار
دل ہی قابو میں نہیں کیا کیا چھپایا جائیگا ⁂ کتنے طوفانوں کو سینے میں دبایا جائیگا
گنگ ہے حسنِ زباں، عزمِ محبت کیا کہوں ⁂ کس قدر اندھا ہے آئینِ مشیت کیا کہوں
کتنی صدیوں کی سسکتی آرزوؤں کا ثمر ⁂ کتنے دل کتنی تمناؤں کا بے قیمت گہر
آہ کس دل سے کہیں سوئے جناں جاتا رہا ⁂ کارواں سوتا ہے، میرِ کارواں جاتا رہا
تیغِ عالمگیرؒ و ٹیپوؒ کی امانت چھن گئی ⁂ جراتیں سکتے میں ہیں روحِ شجاعت چھن گئی
گلفشانی چپ ہے امیدوں کا گلشن لٹ گیا ⁂ علم روتا ہے کہ آگاہی کا دامن لٹ گیا
اک تذبذب سا ہے پیدا عشق کی تفسیر میں ⁂ خوابِ جوہرؒ، نعرۂ اقبالؒ کی تعبیر میں
ذہن و فکر و غور کو ہے موت سی آئی ہوئی ⁂ موت کی تاریکیاں ہیں ہر طرف چھائی ہوئی
وحشتوں میں ٹھوکریں سی کھا رہی ہے زندگی ⁂ زندگی کے حال سے گھبرا رہی ہے زندگی
آہ اس طوفان کو پہچاننے والا نہیں ⁂ وقت کی چشمِ غضب کو جاننے والا نہیں
چاک ہے دامانِ گل اور نکہتیں پابند ہیں ⁂ جن کے اشکوں کی ضرورت تھی وہ آنکھیں بند ہیں

آہ! اب کس کو پکاریں ہمتِ پرواز دے!!
اے امیرِ کارواں آواز دے آواز دے!!

نظر حیدرآبادی

قائدِ ملت کی وفات پر

اے قائد تجھے میں کیا بتاؤں کیا کیا تو نے ÷ قیامت سے بہت پہلے قیامت کی بپا تو نے
جہاں کے مٹنے والوں کو دیا درسِ بقا تو نے ÷ کیا تھا ہم کو رازِ زندگی سے آشنا تو نے
حوادث کے تھپیڑوں میں تبسم تو نے سکھلایا ÷ غلام آباد میں آزاد رہنا تو نے بتلایا
تجھے ناکامیوں نے گُر سکھائے کامرانی کے ÷ ہیں سکّے ساری دنیا پر تری جادو بیانی کے
اسی ظلمت کدے میں اک دیا تو نے جلایا تھا ÷ اسی بستی میں آزادی کا گھر تو نے بسایا تھا
جنم پایا تھا اے قائد دکن کی خاک سے تو نے ÷ مگر نسبت رکھی اپنی شہِ لولاکؐ سے تو نے
ہمیں اب باور آیا گدڑیوں میں لعل ملتے ہیں ÷ ہمیں اب باور آیا شیر بھی انساں سے ملتے ہیں
جو تھا سپنا کبھی اب وہ حقیقت بن کے ابھرا ہے ÷ خیالِ شاعرِ مشرق عمل کا جامہ پہنا ہے
پرویا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو ÷ بتائی راہ تو نے قومِ مسلم کے جوانوں کو
غلامی میں بھی تیور ان کے شاہوں کے بنا ڈالے ÷ رموزِ خسروی تو نے سبھی ان کو سکھا ڈالے
ترے ہر لفظ کو ہر بات کو ہم ارمغاں سمجھے ÷ فدائی تیرے تجھ کو ایک گنجِ شائگاں سمجھے
مگر اے گنجِ خوبی تجھ کو مٹی میں نہ سونا تھا ÷ ہماری دل کی دنیا کو نہ یوں اک دم ڈبونا تھا

ہزاروں پی گئے آنسو ہزاروں چھلکے پیمانے
رہیں آباد اے مغفور قائد تیرے میخانے

اکبر صدیقی ایم۔ اے (عثمانیہ)

پریم چند اور اُن کی افسانہ نگاری

پہلا باب - پریم چند کی مقبولیت اور اُن کے متعلق اُردو میں ادب

ابتدائی کتابیں ۱۹۰۹ء تک پریم چند سے بہت کم لوگ واقف تھے ۱۹۰۴ء میں جب کہ ان کا ناول (ہم خرما وہم ثواب) شایع ہوا تو مصنف کی حیثیت سے ان کی ادبی زندگی شروع ہوئی۔ اور وہ رفتہ رفتہ روشناس ہونے لگے۔ ۱۹۰۹ء میں (سوز وطن) کی اشاعت اور اس پر پریم چند کے خدایانِ مجازی کا بگڑنا اور انھیں انتہائی حد تک پریشان کر دینا کچھ تو ان کی شہرت کا بھی باعث ہوا اور اُن کے خیالات پر بھی کافی اثر انداز ہوا (جلوۂ ایثار) کی اشاعت نے انھیں بہت زیادہ مشہور کر دیا حالانکہ اس سے پہلے وہ کچھ کہانیوں (ہم خرما وہم ثواب) اور (روٹھی رانی) کے مصنف بن چکے تھے۔ ابتدائی کہانیوں میں راجپوتوں کی شجاعت اور جانبازی کو بیان کیا گیا تھا اور چونکہ انھوں نے اپنے لیے ایک علحدہ میدان پیدا کر لیا اس لیے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ (جلوۂ ایثار) اور اس کی پیشرو کتابوں نے مہاتما گاندھی - موتی لال نہرو - اور لاجپت رائے کی تقریروں کا کام کیا اور وہ لوگوں کو ایک نئے طریقے سے اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

مقدمۂ امتیاز علی تاج ۱۹۲۵ء تک ان کی کہانیوں کی تعداد بھی کافی ہو چکی تھی اور لوگ اُن کے نام اور کام سے واقف ہو چکے تھے اس اثنا میں (پریم پچیسی) اور (پریم بتیسی) منصۂ شہود پر آ چکی تھیں۔ موخر الذکر ۱۹۲۵ء میں شایع ہوئی اس کی طبع دوم پر امتیاز علی تاج نے مقدمہ لکھا۔ یہ پریم چند کے ادبی کارناموں پر پہلی تنقید تھی اس میں انھوں نے پریم چند کے قصوں کی

خصوصیات پیش کی ہیں ان میں خاص کر عمیق مطالعہ فطرت۔ واقعات روزمرہ کا بیان اور اندازِ بیان کی سادگی کو بہت سراہا ہے اس کے علاوہ ان کی بے تکلف روش اور اس اثر کا بھی ذکر کیا ہے جو قاری پر مترتب ہوتا ہے۔ سدرشن کی (بہارستان) کے لیے پریم چند نے جو مقدمہ لکھا ہے اس میں سدرشن کی حسب ذیل خصوصیات بیان کی ہیں۔

۱۔ وہ جذبات کو بہت اپیل کرتے ہیں۔
۲۔ ہر ایک کہانی میں کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور ہے اور جذبہ انسانی کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔
۳۔ لطافت بیان کا بھی کافی سرمایہ موجود ہے۔
۴۔ کہانی کے پلاٹ ڈرامیٹک ہیں۔
۵۔ افسانے اساسی جذبات پر قایم کیے گئے ہیں۔
۶۔ ناقد صاحب نے پریم چند کی سدرشن کے لیے کہی ہوئی ان خصوصیات کو پریم چند پر منطبق کر دیا ہے۔

مغربی ممالک میں کسی مصنف کو ابھارنے اور چمکانے والے نقادانِ فن ہی ہوتے ہیں اس کی تقلید یہاں بھی ہے اس مقدمہ کی حیثیت مال کو کھرا بتلانے والے عطار کی تھی لیکن عطر نے خود اپنی بو کو اتنی شدت سے پھیلایا کہ عوام اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ زمانہ کو ناولوں سے زیادہ مختصر افسانوں کی ضرورت تھی اور پریم چند نے " چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کے مقولے پر عمل کیا اور زمانہ کا ساتھ دینے کے لیے اپنے افسانوں کے لیے ایک خاص تخیل قایم کر لیا۔ اور اس پر کاربند رہے۔ ان کی ترقی اور مقبولیت کا راز صلاح الدین احمد مدیر ادبی دنیا کے الفاظ میں یوں ہے۔

"پریم چند خارجی عناصر سے متاثر نہیں تھے ان کے افسانوں کا ماحول اور ان کے کردار سراسر ہندوستانی ہیں۔ ... پریم چند ایک ہمہ گیر طبیعت لے کر آئے تھے اور انہوں نے

زندگی کو بہت سے زاویوں سے دیکھا گو اپنے عروج کے دنوں میں کچھ اصلاح پسند ہوگئے تھے اوران کا یہ رجحان ان کے ناولوں سے بدرجہ غایت نمایاں ہے۔ اور اگرچہ بسا اوقات وہ کسی معاشرتی برائی یا اصلاحی مقصد کو مرکز بنا کر اس کے گرد اپنی کہانی کا جال بنتے تھے اور ان کا یہ اسلوب زمانہ قبل از جنگ کے معاشرتی اور اقتصادی نظام اور اس دور کی قدروں سے خوب مطابقت رکھتا تھا۔ لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ آج کل کے نفسیاتی افسانے کی بنیاد بھی انھی نے رکھی اور افسانے میں کرداری تعمیری اہمیت کو بھی سب سے پہلے انھوں نے ہی محسوس کیا۔" [1]

پروفیسر آل احمد سرور کا بھی خیال بالکل صحیح ہے وہ لکھتے ہیں۔

"بیسویں صدی کے نت نئے انقلابات اور پریم چند کے اثر نے افسانہ نگاری میں نت نئے رجحانات پیدا کر دیے اب افسانہ نگاری صرف تفریح نہ رہی وہ فریاد کی ایک لے بن گئی۔" [2]

اس طرح انھوں نے افسانہ نگاری کو فریاد کی لے بنا دیا اور روز بروز مقبول نام ہوتے گئے تاج صاحب کے مقدمے نے لوگوں کی افسانہ خوانی کی آتش شوق کو بھڑکایا۔ اردو ادب میں یہ پہلی کوشش تھی کہ پریم چند کے کارناموں پر فنی نقطہ نگاہ سے تنقید کی گئی۔ پریم چند پروفیسر سروری کی نظر میں دنیا ئے افسانہ اور کردار اور افسانہ کا مرتبہ اپنے فن پر اردو زبان میں پہلی کتابیں ہونے کی حیثیت سے بیحد بلند ہے پروفیسر سروری پریم چند کے متعلق فرماتے ہیں۔

"پریم چند پہلے قصہ نگار ہیں جنھوں نے مختصر قصوں کو اعلیٰ پایہ پر پہنچایا۔ اردو مختصر قصہ لکھنے کے لیے انھوں نے وہی کام کیا جو شر رنے ناول یا اسٹی ون سن نے انگریزی مختصر افسانہ کے لیے کیا۔ مگر شرر یا اسٹی ون سن کو ناول یا مختصر قصوں کا موجد نہیں تسلیم کیا جاتا اسی طرح پریم چند بھی اردو مختصر قصہ نگاری کے موجد نہیں کہے جا سکتے۔ لیکن ان کو مختصر قصہ نگاری میں اختصاصی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ ان کے قصے ہندوستانی زندگی

---

[1] ۔ ادبی دنیا جنوری ۱۹۴۳ء۔ [2] ۔ تنقیدی اشارے صفحہ ۲۳۔

پاکیزہ اور مانوس مرقعے پیش کرتے ہیں۔ ان کا حزنیہ قصہ ہمیشہ طربیہ سے زیادہ
موثر ہوتا ہے۔ منشی پریم چند کے حزنیہ قصوں کے پڑھنے سے اثر تمام بدن میں
بجلی کی طرح دوڑ جاتا ہے لیکن طربیہ اثر اس پایہ کا نہیں۔ منشی پریم چند کے قصوں
میں اختصار الفاظ کی خصوصیت حیرت انگیز ہے۔ ان کے قصے میں مقامی رنگ
کی بہترین جھلکیں موجود ہیں۔"

(دنیائے افسانہ) کی اشاعت کے بعد بھی پریم چند نو سال تک زندہ رہے ان کے اسلوب بیان میں پختگی آ گئی اور ان کے خیالات میں بلندی اور حقیقت پسندی پیدا ہو گئی۔

تاریخ ادب اردو میں پریم چند کا ذکر | (دنیائے افسانہ) کے بعد رام بابو سکسینہ کی تاریخ کا ترجمہ مرزا محمد عسکری نے ۱۹۲۹ء میں شائع کیا۔ یہ ادب اردو کی موجودہ تاریخوں میں سب سے زیادہ مستند کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ پریم چند کے متعلق لکھا ہے۔

"سید ان قصہ نویسی کے شہسوار ہیں۔ چھوٹے چھوٹے قصے لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور حق یہ ہے کہ آپ کے مختصر افسانے اس زمانے کے کثیر التعداد و نام نہاد ناولوں کے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہیں جو سچے موتیوں کو جھوٹے پتھروں کے ساتھ ہوتی ہے۔ آپ کو دیگر ناول نگاروں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ آپ نے ہندوستانی دیہات کے سچے نقشے اور یہاں کے کسانوں کو سمجھا ہے۔ ان واقعات کو نہایت عمدہ طریق سے اپنے ناولوں میں بیان کیے ہیں۔ آپ کبھی مبالغے کو اپنی تصانیف میں بار نہیں آنے دیتے اور نہ کبھی حق اور سچائی سے انحراف کرتے ہیں۔ آپ کی عبارت بہت سنجیدہ اور زور معلوم ہوتا ہے۔ لطیف استعارات اور تشبیہات سے عبارت کی خوبی اور بڑھ جاتی ہے۔ ... آپ نفسیات کے بھی پورے ماہر ہیں آپ کے کلام میں ظرافت اور کہیں درد بھی رنگ دکھاتا ہے جیسے کہ دھوپ اور چھاؤں۔ آپ کے کیرکٹر نہایت خصوصیت جیتی جاگتی تصویریں ہوتی ہیں۔"[1]

پریم چند کے متعلق وقار عظیم ندوی کی رائے | ۱۹۳۵ء میں وقار عظیم ندوی نے (فن افسانہ نگاری) اور

---

[1] تاریخ ادب اردو صفحہ (۱۴۰)

(ہمارے افسانے) دو کتابیں شایع کیں۔ اصل میں یہ دونوں کتابیں ایک ہی ہیں پہلی کتاب فن افسانہ پر ہے اور دوسری اردو افسانوں اور افسانہ نگاروں پر۔ پہلی کتاب جو فن افسانہ نگاری پر لکھی گئی ہے اس میں لوازم افسانہ بتلائے گئے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ہر لازمہ افسانہ کے ساتھ وقار عظیم صاحب نے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ ان میں پریم چند۔ سدرشن۔ نیاز اور مجنوں کے افسانوں سے زیادہ مثالیں دی گئی ہیں۔ مثال کے لیے اس کتاب کا ایک باب (افسانہ کی سرخی) ہے اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ افسانے کے عنوانات مختلف طور پر قایم کیے جا سکتے ہیں۔ پریم چند کے متعلق لکھا ہے۔

> ”پہلی چیز جس پر افسانہ کی بنیاد ہے وہ تحریک ہے اور پریم چند کے اکثر افسانوں کی سرخیاں مثلاً (آہ بے کس) (مامتا) (اندھیر) (کرموں کا پھل) (غیرت کی کٹاری) (تریا چرتر) (خون سفید) وغیرہ افسانے پڑھنے کے بعد اگر ہم ان سرخیوں پر نظر ڈالیں گے تو اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ واقعی یہی سرخی موجودہ افسانے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے۔“

دوسری چیز وہ سرخیاں جہاں کسی مخصوص صفت کا ذکر ہے زیادہ نمایاں اور تصور زا ہیں مثلاً بڑے گھر کی بیٹی۔ نمک کا داروغہ وغیرہ۔

چوتھے باب ”افسانے کی فنی ترتیب“ میں رقم طراز ہیں کہ۔

> ”ترتیب کا بہترین مواد اکثر افسانہ نگاروں کے نزدیک مقامی رنگ ہے اور اس لیے ہر زبان کے اچھے اچھے افسانہ نگار اپنے لیے کسی نہ کسی خاص مقامی خصوصیت کو مخصوص کر لیتے ہیں اور اپنے افسانوں کی بنیاد اس پر رکھتے ہیں۔ اردو میں پریم چند اور ان کا اثر قبول کرنے والوں نے افسانے اس رنگ کی بہتر سے بہتر مثالیں پیش کر سکتے ہیں . . . . .“

وہ فطرت انسانی کی شیریں اور تلخ حقیقتوں پر عبور رکھتے ہیں انھیں نفسیات نے عام انسانی فطرت کی نازک لطافتوں سے آگاہ کر رکھا ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ انسانی فطرت کی کونسی رگ کس وقت چھیڑنی چاہئے اور کس رگ کا کس وقت چھیڑا جانا خطرناک اور

خلاف فطرت ہے۔ اس کی صد ہا مثالیں ہمیں پریم چند کے افسانوں میں ملیں گی جن میں سے اکثر میں انہوں نے دیہاتی زندگی کو اپنا پس منظر بنایا ہے اور اپنے افسانے کی بنیاد بھی اسی ترتیب سے رکھی ہے۔"

اس کے بعد تقریباً ہر باب میں وقار عظیم صاحب نے پریم چند کے افسانوں سے مثالیں دی ہیں اور ان کی خدمت کو بجا طور پر سراہا ہے۔

ان کی دوسری کتاب (ہمارے افسانے) دو حصوں پر تقسیم کی گئی ہے پہلا حصہ (ہمارے افسانے) ہے اور دوسرا (ہمارے افسانہ نگار) ان میں پریم چند کا نام سر فہرست ہے اور ان کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

> "پریم چند اردو افسانہ نگاری کے بادشاہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں قریب قریب وہ ساری باتیں موجود ہیں جو مختلف حیثیتوں سے افسانے کو بلند بناتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔
> انہوں نے اپنے افسانوں کو ایک نہیں بیسیوں طریقوں سے دلچسپ اور دلکش بنایا ہے اور ہر مذاق کا آدمی انھیں پسند کرنے پر مجبور ہے۔"

پریم چند کے افسانوں کی خصوصیت ان کے افسانوں کی پہلی خصوصیت جذبہ قومی ہے اور اس میں وہ تمام افسانے آجاتے ہیں جو ہندوستان کی عظمت و جلال سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں راجپوتوں کی زندگی سے تعلق رکھنے والے افسانے نہایت بلند پایا ہیں۔

دوسری خصوصیت ان کا مقامی رنگ ہے اور اس میں وہ افسانے شامل ہیں جو دیہاتی اور ہندو گھرانوں کی زندگی سے متعلق ہیں ...... دیہاتیوں کے مصائب کو ایسے طریقے سے بیان کیا گیا ہے کہ ہم پڑھنے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں اس کا ایک سبب یہ ہے کہ پریم چند دیہات کی حسین فضاؤں کو ہماری نگاہوں کے سامنے جما دیتے ہیں اور جب ہمیں دلچسپی ہو جاتی ہے تو پھر ان کے آفات کا دکھڑا سنا کر ہماری آنکھوں سے گنگا جمنا بہا دیتے ہیں۔

تیسری خصوصیت فطرت انسانی کا گہرا مطالعہ ہے۔ افسانہ نگار نفسیات سے زیادہ کام لے کر افسانہ کو بلند معیار پر لے جاتے ہیں۔ پریم چند کے افسانے نفسیاتی مطالعہ اور مشاہدہ سے بھرے پڑے ہیں اس سے پریم چند نے اس قدر کام لیا ہے کہ اپنے اسٹائل میں اپنے طرز بیان میں اور اپنے جملوں میں جہاں تشبیہات دیتے ہیں تو انھیں نفسیاتی محسوسات کو کام میں لاتے ہیں۔

ان کے کردار زیادہ تر مثالی ہوتے ہیں جن کے اعمال ہمارے لیے نمونہ بن سکتے ہیں وہ اپنے کرداروں کو عموماً ابتدا ہی میں ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور ان کی خصوصیات سے بھی واقف کرا دیتے ہیں۔

ان کے افسانوں کا خاص حسن اصول کے خلاف ان کی تفصیلات ہی میں ہے۔ آخر میں وقار عظیم صاحب نے ان کی زبان کے متعلق اپنی رائے اس طرح پیش کی ہے۔

> "وہ ہر چیز کو نہایت آسان اور پر لطف زبان میں بیان کرتے ہیں۔ . . . . ہندی اور فارسی کے لفظوں اور ترکیبوں کا شیریں امتزاج تشبیہوں اور استعاروں کی عمومیت اور نفسیاتی عالمگیریت۔ الفاظ کا برمحل استعمال یہ چیزیں پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ . . . . ان کا طرز بیان شگفتہ ہے اور جا بجا مزاج کے نازک اور چھوٹے ٹکڑے خوب صورت نیلے آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے معلوم ہوتے ہیں۔
>
> پریم چند اور ان کے افسانوں کے متعلق مبالغہ نہ معلوم ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند کے افسانے ہندوستان کی سرزمین کی بہترین پیداوار ہیں۔"

ادارۂ رسالہ (زمانہ) نے (یادگار پریم چند) کے نام سے ۱۹۳۶ء میں ایک خاص نمبر نکالا اس کو چھوڑ کر اور کوئی ایسی کتاب اردو میں نہیں کہ پریم چند کے متعلق تفصیلی مواد دے سکے (یادگار پریم چند) بہت ضخیم ہے اور پریم چند کے متعلق شاید ہی کوئی ایسی بات ہو جو چھوٹ گئی ہو (پریم سوگ) حسام الدخاں غوری سکندر آبادی نے شائع کی اس میں مصنف نے پریم چند کی حیات اور ان کے ادبی کارناموں سے زیادہ شخصی تعلقات پر زور دیا ہے۔ اس سے پریم چند کی قلمی زندگی پر روشنی پڑتی ہے اور یہ کتاب پریم چند آنجہانی کے ہے

نذرِ عقیدت کا کام دے سکتی ہے۔

"مجلس" میں پریم چند کی یاد | ۳۴ - ۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج میں محفلِ ادب منعقد ہوتی تھی جس میں مقالے پڑھے جاتے اور علمی مباحث پر گفتگو ہوتی اس "مجلس اُردو" کے اراکین نے اپنے مقالوں کو "مجلس" کے نام سے کتابی شکل میں شایع کیا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے "مجلس اردو" کے اراکین موجودہ زمانے کے مشہور انشا پرداز اور مصنفین ہیں۔ اس "مجلس اُردو" میں آغا عبدالحمید صاحب نے اپنا مقالہ "پریم چند" سنایا تھا۔ جو اس کتاب میں سب سے پہلے شایع ہوا ہے۔

آغا صاحب نے ان ناولوں پر تنقید کی ہے اور افسانوں پر عام رائے کا بھی اظہار فرمایا ہے۔ اس رائے سے پروفیسر آل احمد سرور بھی متاثر ہوئے ہیں۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے مضمون کی تیاری میں اس کتاب سے بھی مدد لی ہے۔ چونکہ اکثر جملے مشترک ہیں اس لیے ہم نے پروفیسر صاحب موصوف کی کتاب سے اقتباس لے لیا ہے جو آگے کہیں ملیگا۔

آغا صاحب پریم چند کے متعلق فرماتے ہیں۔

"پریم چند ایک اعلیٰ درجہ کے قصہ گو اور بیسوں جیتے جاگتے کرداروں کے خالق ہیں۔ غالباً وہ پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اپنے گرد و پیش کو ایک عمیق اور بے تعصب نظر سے دیکھا اور اپنی معاشرت کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہ یقیناً پہلے ناول نویس ہیں جنھوں نے انسانی دل کو بغور اور ہمدردانہ دیکھا اور اس کی حرکات کا تجزیہ کیا ہے[1]

گو پریم چند ایک حقیقت نگار ہیں مگر ان کی حقیقت نگاری بے جان جزو دانی ہو کر نہیں رہ جاتی وہ اپنے شاعرانہ طرز بیان سے اس میں ایک رومانی ماحول پیدا کر دیتے ہیں ... پریم چند کی حقیقت نگاری ان کے ناولوں کو تاریخی سندات کی اہمیت بخشتی ہے[2]

پریم چند قصہ کی ترتیب میں بہت دسترس نہیں رکھتے۔ وہ پلاٹ کی تعمیر فرما لی

---

[1] مجلس صفحہ (۹)۔ [2] مجلس صفحہ (۱۵)۔

طرح نہیں کر سکتے بناوٹ کے لحاظ سے ان کے ناولوں میں کوئی تنوع اور جدت نہیں ان کے ناول بہت غیر مربوط اور غیر منظم ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو وہ مختصر افسانوں کا سلسلہ بن کر رہ جاتے ہیں۔"[1]

وہ زندگی کو ایک نقاد کی طرح دیکھتے ہیں اور ان کے ناول صحیح معنوں میں زندگی کی تنقید ہیں لیکن وہ یاس پرست اور تباہ کن نقاد نہیں زندگی پر جو سوال اٹھاتے ہیں اس کو گالزوردی کی طرح وہیں نہیں چھوڑ دیتے کہ پڑھنے والے کو خود اس کا جواب تلاش کرنا پڑے بلکہ جواب کے متعلق کچھ اشارے بھی کر دیتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پریم چند نے زندگی کو سمجھنے اس کے معنے ڈھونڈھنے اور اس کا نظام جاننے کے لیے ایک زبردست کوشش کی ہے۔ ۔ ۔ یہ کوشش بذات خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ زندگی کو دیکھ کر اس پر سوال کرنے کی ہمت ہر ایک میں نہیں ہوتی۔"[2]

"وشال بھارت" میں پریم چند پر اظہار خیال | ۱۹۳۶ء میں "وشال بھارت" کے ہندی رسالے میں ہندی کے افسانہ نگاروں پر ایک تفصیلی مضمون شایع ہوا ہے اس مضمون کا خلاصہ اُردو اکتوبر ۳۶ء میں چھپا ہے۔ پریم چند کے متعلق لکھا گیا ہے کہ انھوں نے۔

" ہندی ادب کو بہت متاثر کیا ہے اور ایک عرصہ تک یہ اثر باقی رہے گا وہ موجودہ دور کے سب سے زیادہ مقبول ترین مصنف ہیں۔ پریم چند بے زبان عوام کے ترجمان ہیں۔ کسان کے جذبات۔ حالات اور خیالات کی اتنی صحیح تصویر ہندوستان کے کسی مصنف نے اب تک نہیں پیش کی۔"

ہندوستان کے تین سب سے باکمال افسانہ نویس ٹیگور۔ شرت چندر اور پریم چند زندگی کے تین مختلف شعبوں کے مالک ہیں ٹیگور نفس کی ایک ایک باریکی کو بے نقاب کر سکتا ہے۔ شرت چندر گھر کے ہر پہلو سے آشنا ہے اور اس میدان میں اس کا کوئی ہمسر نہیں اور جب انسان اپنی شخصیت کو کھو کر گھر سے باہر قدم رکھتا اور بھیڑ میں گھل مل جاتا ہے تو پریم چند کا دائرہ شروع ہوتا ہے۔"

"افسانہ" میں پریم چند کا ذکر | ان کتابوں کے بعد ۱۹۳۷ء میں اور تین کتابیں پروفیسر مجنوں

---

[1] مجلس صفحہ (۲۰) [2] مجلس صفحہ (۳۷)۔

جلد طبع نہیں

گورکھپوری کی کتاب (افسانہ) صغیر احمد جان کی (تنویر ادب) اور علی حسنین زیبا کا مقالہ (اردو ادب بیسویں صدی میں) شایع ہوئیں۔

مجنوں کی کتاب انگریزی افسانوی ادب کی مختصر تاریخ بھی کہی جا سکتی ہے۔ جس میں روس۔ فرانس۔ امریکہ۔ اور انگلستان۔ کے سب ہی ادیب شامل ہیں۔ پروفیسر مجنوں نے اپنی کتاب کو ختم کرتے ہوئے اردو افسانہ نگاروں پر اظہار خیال کیا ہے۔ پریم چند کے متعلق وہ ایک جامع اور مختصر رائے پیش کرتے ہیں۔

"پریم چند ان افسانہ نگاروں میں ہیں جن کا معترف شبلی جیسا انشا پرداز رہ چکا ہے پریم چند فطرت کی طرف سے افسانہ نگاری کا فن لے کر آئے ہیں۔ انہوں نے اپنا موضوع ہندوستان کے طبقۂ عوام کو رکھا ہے پریم چند کبھی مکمل زندگی کا نقشہ نہیں پیش کرتے ان کے افسانوں کے اجزائے ترکیبی چند چھوٹے چھوٹے مگر دلکش اور بصیرت افروز واقعات ہوتے ہیں۔ پریم چند کا مطمح نظر بڑی حد تک خارجی یا تمثیلی ہوتا ہے ان کے افراد قصہ اپنے حرکات و سکنات اور بات چیت سے خود اپنے کردار پر روشنی ڈالتے ہیں ان کے مزاج میں ایک انفرادی خصوصیت ہوتی ہے جو کسی دوسرے افسانہ نگار میں نہیں پائی جاتی ..... پریم چند کا اسلوب بیان ان کا اپنا ہے جو نہایت سادہ بے تکلف مگر دل پذیر ہوتا ہے۔"

صغیر احمد جان صاحب نے تاج صاحب کے مقدمہ (پریم بتیسی) دوم سے مواد لیا ہے لیکن آخر میں ایک بات لکھتے ہیں۔

"اگرچہ منشی صاحب مختصر افسانوں کے بانی ہیں لیکن ابتدا ہی سے آپ نے اس فن میں وہ کمال حاصل کر لیا کہ اب تک کوئی اور افسانہ نگار آپ کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔"

علی حسنین زیبا نے اپنے مقالے میں تاج صاحب کے الفاظ نقل کر دیے ہیں۔

پریم چند کے متعلق پروفیسر اعجاز حسین کی رائے | ۱۹۴۰ء میں "مختصر تاریخ ادب اردو" دوسری دفعہ کچھ

اضافہ کے ساتھ شایع ہوئی۔ اس میں تحریر ہے کہ۔

"پریم چند کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے کبھی ایک لمحہ کے لیے یہ نہیں خیال ہو سکتا کہ ہم ان لوگوں کے حرکات و سکنات کا مطالعہ کر رہے ہیں جو ہم میں سے نہیں ہیں وہی روزمرہ زندگی وہی صبح و شام جس سے ہم کو روز دو چار ہونا پڑتا ہے ان کے افسانے دلچسپ مواد ہیں۔ جس عام زندگی کو ہم خشک اور اتنی سادی سمجھتے ہیں کہ دلکشی کا شاید کوئی عنصر نہ ہو۔ اسی کو پریم چند اپنے انداز بیان سے بغیر تصنع کے اتنی پر لطف بنا کر افسانے میں دکھا دیتے ہیں کہ سرتاپا دلکش ہو جاتی ہے۔

آپ کے روداد افسانہ کا مخزن دیہات ہے: ہاں کے لوگوں کی سیدھی سادی زندگی۔ سیرت سچائی اور ایمانداری اور کبھی کبھی بعضوں کی بے ایمانی۔ چالاکی فتنہ پردازی کا نقشہ پریم چند کے افسانوں کی جان و مال ہے۔۔ ۔ ۔ ہر چیز کو جیسا وہ دیکھتے ہیں ویسا ہی اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ پریم چند کے افسانے انسانی کردار کے روشن آئینے ہیں۔ ۔ ان کے افسانوں میں مکالمہ نہایت مہتم بالشان خصوصیت ہے۔۔ ۔ منشی جی کی زبان نہایت شستہ اور رواں ہے سادگی اس کا جوہر ہے یوں تو فارسی و ہندی کے الفاظ عام طور سے وہ لاتے ہیں مگر اپنا مطلب نکالنے کے لیے بعض وقت ایسے ہی ہندی کے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جو اردو میں رائج نہیں لیکن اس خوبی کے ساتھ لے آتے ہیں اور نامانوس نہیں معلوم ہوتے"[1]

دوسرے ایڈیشن میں اعجاز صاحب نے اس ایک فقرہ کا اضافہ فرمایا ہے۔

"اپنی زندگی کے آخری دور میں منشی جی کے خیالات اور اس کے ساتھ ان کے آرٹ میں البتہ ایک واضح تبدیلی نظر آتی ہے افسانوں میں حقیقت نگاری کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ ۔ ۔ ادب کے ترقی پسند مسلک سے وہ اپنے کو وابستہ کر دیتے ہیں ہندوستانی پس منظر کو قایم رکھتے ہوئے ان کے افسانے اور ناولوں میں ہمہ گیری بڑھ جاتی ہے یہ تمام خصوصیات ان کے افسانے (کفن) میں بیک وقت مرکوز ہو گئی ہیں لہذا اس کو ہم منشی جی کا شاہکار کہہ سکتے ہیں۔ اور غالباً یہ اس لیے اتنا پسند کیا گیا کہ آج دنیا کے بہترین افسانوں میں شمار ہونے لگا ہے"[1]

---

[1] مختصر تاریخ ادب اردو صفحہ ۴۳۲ مطبوعہ ۱۹۴۰ء۔

پریم چند کے متعلق جینندر کمار کی رائے دہلی ریڈیو نے مشہور اور بڑے لوگوں پر تقریریں نشر کرائی ہیں ان کا ایک مجموعہ "کیا خوب آدمی تھا" کے نام سے جامعہ ملیہ نے شایع کیا ہے۔ جینندر کمار نے اپنی شیریں زبان میں دہلی ریڈیو کی دعوت پر ایک مضمون نشر کیا ہے۔ وہ ہندی کے مشہور افسانہ نگار ہیں اور پریم چند کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد غالباً موجودہ افسانہ نگاروں میں ان کا درجہ سب سے بلند ہے۔ ان کا یہ مضمون پریم چند کی چھپن برس کی زندگی کا مختصر خاکہ ہے وہ لکھتے ہیں کہ۔

> "ہندوستان میں ہندی اور اُردو جب تک ہیں پریم چند کا نام مٹ نہیں سکتا۔ وہ دھندلا بھی نہیں ہو سکتا۔ دونوں زبانوں کو پاس لانے میں اور ان دونوں کو گھر لانے میں ان کا بہت ہاتھ ہے۔ ان کے خیالات ہندوستان کی زندگی میں گھل مل گئے ہیں اور وہ ہماری تاریخ کا جز بن گئے ہیں۔
>
> وہ کھلی آنکھوں اور کھلی عقل سے چیزوں کو دیکھتے پرکھتے تھے لیکن آپس کے برتاؤ میں اتنے جاگے ہوئے تھے کہ کہا نہیں جا سکتا۔
>
> وہ ایشور کے وجود کے قائل نہیں ہوتے تھے کہ ایشور اور دھرم اچھے سے زیادہ برے کے کام میں لائے جاتے ہیں، وہ مصیبت زدوں کی حالت دیکھ کر خدا کے منکر ہو جاتے تھے۔
>
> پریم چند کی زندگی بھی لگن کا ایک نمونہ تھی اور وہ آدھی زندگی نہیں تھی اس میں ہم سب کے سیکھنے کے لیے بہت کچھ سبق مل سکتے ہیں۔"

۱۹۴۲ء کی مطبوعات میں پریم چند کا ذکر ان کتابوں کے علاوہ گذشتہ سال ۱۹۴۲ء میں اردو ادب میں اور چار کتابوں کا اضافہ ہوا جن میں پریم چند کے ادبی کارناموں پر تنقید کی گئی ان میں پہلی کتاب پمفلٹ کی شکل میں ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ کی تصنیف "اردو ادب جنگ عظیم کے بعد" ہے دوسری "تاریخ ادب ہندی" مولفہ ظہیر الدین احمد علوی۔ تیسری کتاب "نئے ادبی رجحانات" پروفیسر اعجاز حسین صاحب مصنف "مختصر تاریخ ادب اُردو" کی ہے۔ چوتھی کتاب "تنقیدی اشارے" پروفیسر آل احمد سرور کے نشر شدہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اکثر باتیں وہی کہی ہیں جو ہم دوسرے اور حضرات کی آرا میں نقل کر آئے ہیں صاحب موصوف نے ان کی دو خصوصیتیں بتلائی ہیں ایک جذبۂ قومی دوسرا مقامی رنگ۔ اس کے بعد لکھتے ہیں۔

"تفصیلات کا ذکر عموماً افسانے کے لیے عیب ہوتا ہے اس کی بجائے تصور آفرینی سے مدد لی جایا کرتی ہے۔ لیکن پریم چند جزئیات اور تفصیلات ہی کو حسن بناتے ہیں۔ یہ صحیح کہ ان کے افسانوں میں رومان کی کمی ہے لیکن پریم چند جس زندگی کا نقاش تھا اس کے لیے رومان کا مفسر بننا قدرت دشوار تھا تاہم رومان کا کامل فقدان نہیں۔"

دوسری کتاب "تاریخ ادب ہندی" ہے علوی صاحب نے ان کی ناول نگاری پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے ہندی ناول نگاری میں شاندار دور کی ابتدا کی ان کی کامیابی کا راز خود ان کی حسب ذیل خصوصیات میں ہے۔

۱۔ سماجی زندگی کی مصوری اور اس کی خرابیوں کو دور کرنا۔

۲۔ دیہاتیوں کے دکھ سکھ کا احساس کرنا۔

۳۔ انسان کی نفسیاتی تصویرکشی و اصلاح۔

۴۔ طنز و تشنیع کے عوض میٹھی میٹھی چٹکیاں لینا۔

۵۔ حقایق نگاری۔

۶۔ بیان کی روانی زور۔ اور مولانا شرر کا رنگ اختیار کرنا۔

یہ وہ خاص موضوعات ہیں جو پریم چند کی شہرت اور ان کی تصنیفات کی جان ہیں۔[1] علوی صاحب نے پریم چند کے افسانوں کے متعلق کچھ نہیں لکھا بلکہ ہندی کی ساری افسانہ نگاری کے لیے صرف ایک صفحے میں اشارے دیدیے اور چار پانچ صفحے میں افسانے کی

---

[1]۔ تاریخ ادب ہندی صفحہ (۱۵۴)۔

لازمی تو پڑھے ہونے۔ اس سے نہ تو پریم چند کے افسانوں ہی پر روشنی پڑتی ہے اور نہ ان کے متعلق ہم کوئی اور مواد حاصل کر سکتے ہیں۔ البتہ ہندی زبان میں پریم چند کے ناولوں کے متعلق ایک کتاب شایع ہوئی ہے جس کا نام "پریم چند کی اپنیاس کلا" ہے اس میں "گئودان" کے علاوہ باقی سب ناولوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

"نئے ادبی رجحانات" کو مصنف نے "مختصر تاریخ ادب اردو" کی اشاعت کے دو سال بعد شایع کیا اس لیے ہمیں پریم چند کے متعلق کوئی نئی چیز نہیں ملتی اس میں بھی اسی ایک جملے کی تشریح کی گئی ہے کہ زیادہ تر حال میں افسانہ کا موضوع سماج ہے۔ ہندوستانی سماج میں دیہاتیوں کی اکثریت ہے غریب زیادہ ہیں اور انہیں کے حالات کی عکاسی کی گئی ہے ان کے حالات لکھنے میں پریم چند پیش پیش رہے۔ اور ان کی زندگی ہی سے افسانہ نگاروں کا ایک بہت بڑا گروہ ان کی تقلید کرنے لگا جس میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی شریک ہیں یہ لوگ پریم چند کے پیام اور ان کے خیالات کی نہایت دلآویز اور دلچسپ انداز میں اشاعت کر رہے ہیں۔ ان کا ذکر ہم اگلے باب میں کریں گے۔

پروفیسر آل احمد سرور کی رائے | اس سلسلے کی آخری کڑی پروفیسر آل احمد سرور کی کتاب "تنقیدی اشارے" ہے۔ ناول نگاری کے سلسلے میں صاحب موصوف نے نذیر احمد سے مرزا رسوا تک تمام ناول نگاروں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان سب کے ناولوں کے متعلق رائے دینے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

> "یہاں تک کوئی ایسا نہیں جو اجسے اول درجہ کا ناول نویس کہا جا سکتا لیکن عین حالت انتظار میں اس برادری میں پریم چند کا داخلہ ہوتا ہے جو اردو ناول کو بلندی وسعت اور گہرائی عطا کرتے ہیں۔ پریم چند صرف مختصر افسانے لکھنے ہی میں کمال نہیں رکھتے بلکہ وہ بہت بڑے ناول نویس بھی ہیں بازار حسن۔ چوگان ہستی۔ گوشۂ عافیت۔ پردۂ مجاز۔ نرملا۔ غبن۔ میدان عمل۔ اردو کے بہترین ناولوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں کہوں گا "چوگان ہستی" اردو کا بہترین ناول ہے۔ اب تک

جتنے ناول نگار گذرے وہ صرف زندگی کے ایک گوشے کی تصویر بنانے پر قانع تھے پریم چند کا میدان اتنا ہی وسیع ہے جتنی کائنات۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے ناصر اور درجنوں جیتے جاگتے کرداروں کے خالق ہیں۔ وہ ہندوستان میں بیٹھ کر ایران و توران کے افسانے نہیں لکھتے۔ وہ یہیں کے مال سے اپنی دکان بساتے سجاتے ہیں۔ مقامی رنگ مقامی خصوصیات ان کے یہاں اول سے آخر تک جھلکتی ہیں۔ انسانی فطرت کے بہت بڑے نباض اور نفسیات کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ ان کا مشاہدہ تیز قوی ہے۔ انہیں کرداروں کا پیدا کرنا اور انھیں بڑھنے پھلنے پھولنے کا موقع دینا انہیں خوب آتا ہے۔ ان کی حقائق نگاری میں شعریت بڑی ہوتی ہے اور ایک بے تابی ایک آوارہ نگہی جھلکتی ہے جو آرنلڈ بینٹ کی یاد دلاتی ہے وہ شاعر بھی ہیں فلسفی بھی۔ ان کا ایک خاص تصور حیات ہے وہ غریبوں اور مظلوموں کے بڑے ہمدرد ہیں۔ کسانوں کے جذبات اور دیہاتی زندگی کے موقعے ان کے یہاں بڑی کثرت سے ملتے ہیں۔ بجائے غربت اور بیماری۔ رسم و رواج کا بھوت۔ دولت کی غلط تقسیم۔ مذہب کے نام پر انسانیت کا خون پریم چند سے دیکھا نہیں جاتا اس کے لیے انہوں نے بڑے تیز تیز نشتر تیار کیے ہیں پریم چند کا خیال یہ ہے کہ "انسان کی فطرت نہ بالکل سفید ہوتی ہے نہ بالکل سیاہ اس میں دونوں رنگوں کا عجیب اتصال ہوتا ہے اگر حالات گردوپیش اس کے موافق ہوئے تو فرشتہ بن جاتا ہے اور ناموافق ہوئے تو شیطان وہ حالات مذکورہ کا محض ایک کھلونا ہے۔" مگر پریم چند اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ ہماری سیرت ہی ہماری تقدیر ہے۔ پریم چند ایک بہت بڑے تعمیری نقاد ہیں وہ زندگی کی بھول بھلیاں دیکھ کر مایوس نہیں ہوتے بلکہ اس میں سے ایک راستہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی مصلحانہ کوششوں کو بعض انقلاب پرست اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ پریم چند اس خلیج کو پاٹنا نہیں چاہتے جو امیر و غریب کے درمیان ہے اسے کم کرنا کافی سمجھتے ہیں لیکن اس دور میں یہ بھی کچھ کم غنیمت نہیں۔ سورداس۔ سمن۔ دنے۔ نرملا اور گیان شنکر ان کے غیر فانی کردار ہیں یہاں آکر معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں افراد کی فتح و شکست نہیں ہوتی بلکہ گروہ یا مقصد کی فتح یا شکست ہوتی ہے پریم چند کی زبان ناہموار ہے۔ فارسی کے فقروں کے ساتھ ساتھ ہندی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ہندی لکھتے لکھتے فارسی پر اتر آتے ہیں۔ بایں ہمہ ان کا طرز سادہ عام فہم اور پُر زور ہے۔ سادگی میں جوش پیدا کرنا ان کا کمال ہے۔ . .

ان کے بعد اب تک کوئی اردو اس پایہ کا ناول نگار نہیں پیدا ہوا ہے[1]

پریم چند کی افسانہ نگاری کے متعلق پروفیسر موصوف کا یہ خیال ہے:۔

"پریم چند جو درجنوں لازوال کہانیوں کے خالق ہیں افسانہ نویسی کے گُر سے پوری طرح واقف نہ تھے وہ قصے کی ترتیب کا بہت اچھا سلیقہ نہ رکھتے تھے اور اکثر ادھر ادھر کی باتوں میں کہانی کا اصل مقصد بھول جاتے تھے۔ مگر چونکہ وہ شدید احساس اور تیز نظر کے مالک تھے۔ اس لیے ان کی نظر زندگی کے حقایق پر پڑتی جاتی تھی اور وہ براہ راست زندگی سے خام مواد تیار کر لیتے تھے۔ افسانہ نگاری سے انھوں نے تنقید حیات کا کام لیا۔ ان کے اوپر میتھو آرنلڈ کا وہ فقرہ صادق ہوتا ہے جو انھوں نے ایک یونانی ڈرامہ نویس کے متعلق کہا تھا۔

پریم چند آخر وقت میں ترقی پسند ادب کے پیشوا بن گئے تھے اور "کفن" ان کے اس دور کی بڑی اچھی مثال کی کہانی ہے۔ میں اسے اردو کی بہترین کہانیوں میں سمجھتا ہوں اس میں ایک لفظ بھی بیکار نہیں ایک نقش بھی دھندلا نہیں۔ شروع سے آخر تک جیسی واقعیت اور تلوار کی سی تیزی اور صفائی ہے۔ پریم چند نے ایک دفعہ تو حقیقت کو مردانہ وار دیکھا ہے"[2]

کتابوں کے علاوہ دیگر ماخذ | ان کی کتابوں کے علاوہ ہندوستان میں جتنے رسالے شایع ہوتے ہیں ان میں اکثر ایسے ہیں کہ اپنے سالانہ نمبر اور افسانہ نمبر وغیرہ شایع کرتے رہتے ہیں بعض رسائل میں افسانہ نگاری پر کوئی مضمون آجاتا ہے تو اس میں بھی پریم چند کا ذکر موجود ہوتا ہے۔ ایسے رسائل میں ساقی۔ ہمایوں ادبی دنیا۔ عالمگیر شاہکار۔ ادب لطیف۔ اردو۔ زمانہ۔ ادیب۔ سہیل۔ نگار۔ ایشیا۔ نئی زندگی۔ جامعہ۔ نیا ادب۔ سب رس۔ ہندستانی ادب۔ معاصر۔ ندیم کالجوں کے مجلے۔ اور دوسرے ان گنت رسائل ہیں جن میں اگر افسانہ نگاری پر کوئی مضمون شایع ہوا ہے تو اس میں پریم چند کا ذکر کیا گیا ہے حقیقت تو یہ ہے اردو میں ناول نگاری اور افسانہ نگاری پر کوئی مضمون اس وقت تک مکمل نہیں کہلایا جا سکتا جب تک کہ اس میں پریم چند کی خدمات کا ذکر نہ کیا گیا ہو اور اس طرح اردو ادب کی کوئی تاریخ بھی اس وقت تک مکمل نہ ہوگی جب تک کہ اس میں پریم چند کا نام نہ آئے۔"

---

[1] تنقیدی اشارے صفحہ ۱۱۰ [2] تنقیدی اشارے صفحہ ۲۲۔

دوسرا باب۔ حالات زندگی

پیدائش | منشی پریم چند کے والد عجائب لال پانڈے پور (بنارس) کے قریب ایک چھوٹے سے موضع ڈھوالہی میں رہتے تھے۔ دایم المریض بیوی اور ایک لڑکی ان کے خاندان کے افراد تھے ۱۸۸۱ء م ۱۹۳۷ سمبت میں ان ارکان میں ایک اور لڑکے کا اضافہ ہوا۔ عجائب لال نے اپنے بیٹے کا نام دھنپت رائے رکھا۔ اس نے دھن تو اتنا نہ پایا جتنا کہ نام اور اس نام کے جاننے والے بھی بہت کم ہیں۔ آج اس دھنی کو سب پریم چند ہی پکارتے ہیں۔

بچپن | عجائب لال بیس روپیے ماہوار کے منشی ڈاک خانہ تھے اور انتقال کے وقت تک انھیں چالیس روپے کی ترقی مل گئی تھی ساتھ ہی ساتھ افراد خاندان میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور وہ تنگی تلخی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ غریب تھے لیکن علم کے قدرداں تھے اور اپنے لڑکے کو انھوں نے رواج زمانہ کے مطابق مذہبی اور فارسی کی تعلیم دلائی ابھی پریم چند سات سال کے بھی نہ تھے کہ ان کی والدہ نے انتقال کیا اور والد نے دوسری شادی کر لی۔ اس طرح پریم چند مامتا سے محروم ہو گئے لیکن والد کی شفقت اور تعلیمی ذوق نے انھیں سیدھے راستے پر ڈال دیا تھا۔

تاہل | ابھی پندرہ سال ہی کے تھے کہ والد نے ان کی شادی رچا دی مگر اس قید کے باوجود وہ ہائی اسکول پہنچ گئے ابھی تک سایہ پدری باقی تھا اور انھیں کسی قسم کی فکر کی ضرورت نہ تھی لیکن مشیت ایزدی نے انھیں یتیم بنا دیا اور اس کے ساتھ ہی گھر والوں کی پرورش کا بار بھی ان کے سر پڑ گیا۔ زیر پرورش لوگوں میں پریم چند، ان کی بیوی، سوتیلی ماں، اور ان کے دو لڑکے گویا پانچ آدمی تھے اور کمانے والا کوئی نہیں۔ اثاثہ والد کی تیمارداری تجہیز تکفین

اور [illegible] میں [illegible] ہو گیا اور اب فکرِ روزگار پریم چند کے سر سوار ہو گئی۔

تعلیم لیکن انھیں اپنی تعلیم سے اتنا شغف تھا کہ وہ اس کو چھوڑنا پسند نہ کرتے تھے ہم یہاں انھیں کے الفاظ نقل کرتے ہیں تاکہ ان کے ذوقِ علم کا اندازہ لگایا جا سکے۔

"مجھے ایم اے پاس کرنے وکیل بننے کا ارمان تھا سرکاری ملازمت اس زمانہ میں بھی اتنی ہی مشکل سے ملتی تھی جتنی کہ اب۔ دوڑ دھوپ کرکے شاید دس بارہ روپیہ کی کوئی جگہ پا جاتا مگر یہاں تو آگے پڑھنے کی دھن تھی مگر پاؤں میں لوہے کی نہیں اشٹ دھات کی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور میں پہاڑ پر چڑھنا چاہتا تھا۔"[۱]

وہ کوئنز کالج بنارس میں پڑھتے تھے اور بانس کی پھاٹک پر ایک لڑکے کو پڑھانے جایا کرتے تھے بانس کی پھاٹک سے پریم چند کا گھر پانچ میل دور تھا شام کے وقت چھ بجے ٹیوشن سے واپس ہوتے اور رات کے آٹھ بجے گھر آتے اور پھر دوسرے دن آٹھ ساڑھے آٹھ بجے صبح گھر سے نکل جاتے اور مسلسل بارہ گھنٹے گھر سے باہر رہتے۔ ان مصیبتوں سے میٹرک کا امتحان درجۂ دوم میں کامیاب کیا۔ کوئنز کالج میں درجۂ اول میں کامیاب ہونے والوں کی فیس معاف ہوتی تھی اس لیے انھیں درجۂ دوم میں کامیاب ہونے سے بڑی مایوسی ہوئی مگر ان کی خوش قسمتی سے اسی سال ہندو کالج کھل گیا اس کے پرنسپل رچرڈسن تھے۔ پریم چند ان سے ملے تاکہ واقعات کا اظہار کریں لیکن پرنسپل اونچی کرسی کے آدمی ہوتے ہیں وہ ایسے طالبعلموں سے نہیں ملتے جو فکرِ روزگار کے مارے اور علم اور روٹی دونوں کے بھوکے ہوتے ہیں۔ پریم چند کا بھی یہی حشر ہوا۔ اور انھیں رچرڈسن نے عہدہ دارانہ مخصوص جملہ دہرا دیا "گھر میں کالج کی بات نہیں منتا" حالانکہ کالج میں چپراسیوں کا حکم چلتا ہے وہ صاحب سے ملنے نہیں دیتے۔ غرض پریم چند لوٹ آئے اور سفارشوں

۱۔ زمانہ یادگار پریم چند نمبر صفحہ (۳)

کی تلاش میں پھرنے لگے۔ غریب کو سفارش بھی مشکل ہی سے ملتی ہے مگر جو بندہ یا بندہ ٹھاکر نرائن سنگھ رکن مجلس انتظامیہ ہندو کالج نے ان کی سفارش کر دی اور وہ رقعہ لیے خوشی خوشی گھر آئے مگر دو ہفتے تک بیمار رہے اور پرنسپل سے ملنے کا موقع نہ پا سکے۔ جب صحت ہوئی تو گئے اور رقعہ دکھایا۔ آزمائشی امتحان کے لیے متعلقہ مدرسین کے پاس بھیجے گئے۔ انگریزی کے استاد مطمئن ہو گئے مگر۔

"حساب کے پروفیسر بنگالی تھے۔ میں نے اپنا فارم دکھایا۔ نئی درسگاہوں میں عموماً وہی طلبہ آتے ہیں جنھیں کہیں جگہ نہیں ملتی یہاں بھی یہی حال تھا۔ کلاسوں میں کم استعداد اور ناقابل طلبہ بھرے پڑے تھے پہلے ریلے میں جو آیا وہ بھرتی ہو گیا۔ بھوک میں ساگ پات سبھی لذیذ معلوم ہوتا ہے مگر اب پیٹ بھر گیا تھا طلبا چن چن کر لیے جاتے تھے پروفیسر صاحب نے حساب میں میرا امتحان لیا اور میں فیل ہو گیا فارم پر حساب کے خانہ میں ناقابل اطمینان لکھ دیا گیا تھا[۱]"

ٹیوشن | اب وہ پرنسپل کے پاس کس منہ سے جاتے ایک وکیل صاحب کے پاس پانچ روپیہ کی ٹیوشن کر لی اور یہیں انھیں رہنے کو بھی جگہ مل گئی۔ اب وہ صرف ناول پڑھتے اور مطالعہ کرتے رہتے۔ ان کی زندگی مر مر کے جئے جانے کا نام تھی۔ بے روزگاری میں خانگی ملازمت کا تنکے کا سہارا اور سارے خاندان کا بار ان کے لیے عذاب سے کم نہ تھا۔

ملازمت | ۱۸۹۹ء میں ان کی خوش قسمتی کہیے کہ وہ اپنی ایک کتاب جبکر ورتی (علم الحساب) انتہائی مجبوری کی صورت میں فروخت کرنے کے لیے ایک دوکان پر گئے اور وہیں اسکول کے ایک ہیڈ ماسٹر سے ان کی ملاقات ہوئی جس نے انھیں اپنے مدرسہ کی اٹھارہ روپے کی جائداد پر مامور کر لیا۔

ادبی زندگی | پیٹ کی فکروں سے نجات ملی تو پریم چند کے قلم میں روانی پیدا ہوئی اور ۱۹۰۱ء سے

---

[۱] ۔ یادگار پریم چند صفحہ (۵)

انھوں نے لکھنا شروع کیا۔ ٹیگور کی بہت سی کہانیوں کے ترجمے کیے پہلا ناول (ہم خرما و ہم ثواب) ۱۹۰۲ء میں اور (پریما) ہندی میں ۱۹۰۴ء میں شایع ہوئے۔ وہ ۱۹۰۲ء میں ٹریننگ کالج الہ آباد کی پریپریٹری کلاس میں داخل ہوئے۔ انٹرنس کامیاب امیدوار ایک سال اسی کلاس میں تعلیم پاتے تھے اور دوسرے سال جونیر کلاس میں ۱۹۰۴ء میں انھوں نے جونیر سرٹیفکیٹڈ ٹیچر کی سند لی ۱۹۰۵ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور پر تبادلہ ہوگیا۔
"سوزِ وطن" کی اشاعت | ۱۹۰۷ء سے انھوں نے اپنی کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ ان کی سب سے پہلی کہانی (دنیا کا سب سے انمول رتن) رسالۂ (زمانہ) میں شایع ہوئی اور پھر وہ (زمانہ) کے لیے کہانیاں لکھتے رہے۔ ۱۹۰۸ء میں کانپور سے مہوبا ضلع ہمیرپور پر تبادلہ ہوا یہاں پانچ کہانیوں کا ایک مجموعہ (سوزِ وطن) کے نام سے ۱۹۰۹ء میں شایع کیا۔ پریم چند کی عرفیت نواب تھی اسی مناسبت سے وہ اپنے ادبی کارنامے نواب رائے کے نام سے شایع کراتے تھے۔ چنانچہ (سوزِ وطن) پر بھی نواب رائے چھپا تھا۔ ان کہانیوں میں وقتی سیاسی رجحانات کا اظہار تھا یعنے صوبہ بنگال کی تقسیم اور "گرم دل" کانگریس کے متعلق خاکے تھے۔ یہ پانچوں کہانیاں حب الوطنی کے نظر افروز رنگ سے رنگی ہوئی تھیں۔ لیکن حب وطن کے دوسرے معنے باغیانہ خیالات تھے اس لیے پولس نے مصنف کی تلاش شروع کی۔ چونکہ یہ مجموعہ انھوں نے نواب رائے کے نام سے شایع کیا تھا اور دوسری بات یہ کہ اس کتاب پر مطبع کا نام بھی سہواً طبع نہ ہوا تھا اس لیے پولیس پریشان رہی آخر خفیہ پولیس نے پریم چند کو پالیا اس وقت یہ ہمیرپور ضلع میں ناظر تعلیمات تھے۔ کلکٹر صاحب نے انھیں بلایا اور ایک ایک کہانی کا مطلب پوچھا اور بالآخر کہدیا کہ تم نے حکومت کے خلاف لکھ مارا ہے۔ اس لیے اس کا جرمانہ یہ ہے کہ ساری کاپیاں حکومت کے حوالے کردو۔ اور آئندہ بغیر اجازت کچھ نہ لکھو۔ پریم چند نے حکم کی تعمیل کی۔ تین سو کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں باقی سات سو سرکار کے حوالے کیں اور یہ سمجھے کہ "سستا ہی چھوٹا" لیکن یہ تو تمہید ہی تھی ضلع کے

عہدہ دار تو اس بات پر تل گئے تھے کہ پریم چند کو بغاوت کی سزا دیں مگر ان کی نیکی آڑے آئی اور انسپکٹر آف اسکولس نے انھیں ان مخمصوں سے نجات دلادی۔ انہوں نے ۱۹۱۰ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کیا ان کے مضامین انگریزی منطق فارسی اور تاریخ دور موجود تھے۔ ان کے افسانے "زمانہ" (کانپور) "ہمدرد" (دہلی) اور "ادیب" (الہ آباد) میں شایع ہوتے تھے۔ "ہمدرد" مولانا محمد علی کا روزنامہ تھا اور انھوں نے پریم چند کو ہر قصہ کا تیس تیس روپے معاوضہ دیا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے "جلوۂ ایثار" لکھا یہ آخری کتاب ہے جس پر نواب رائے کا نام لکھا تھا اس کے بعد انہوں نے اس نام کو چھوڑ کر پریم چند رکھ لیا اور کچھ عرصہ تک یہ نام (زمانہ) کے لیے مخصوص رہا۔

پریم چند کی علالت انھیں مہوبا ضلع ہمیر پور ہی میں وہ منحوس تحفہ ملا جو ان کا عمر ساتھی بن گیا یہ معدے کی شکایت تھی اور تقریباً لاعلاج۔ انھوں نے ۱۹۱۴ء میں اپنی درخواست سے بستی کے ضلع میں نیپال کی ترائی کے قریب تبادلہ کرالیا۔ مگر اس تبدیل آب و ہوا کا اثر یہ ہوا کہ مہوبا میں جو پیچش کا مرض انھیں شروع ہوا تھا اور ترقی کر گیا۔ اور انھیں اپنی صحت کی بہتری کے لیے رخصت لینی پڑی۔ وہ چھ مہینے علاج کرتے رہے لیکن بے سود۔ آخر پھر بستی میں آ ٹھیرے اور ۱۹۱۵ء میں دورہ کی ملازمت کی بجائے مدرسہ کی مدرسی قبول کرلی تاکہ اوسط اور بہتر غذا میسر آسکے۔

۱۹۱۸ء میں اول مددگاری نارمل اسکول گورکھپور پر ان کا تبادلہ ہوا اور ہندی کے مشہور ادیب مہابیر پرشاد پوتدار سے ملاقات ہوی جن کے مشورہ پر انہوں نے ہندی زبان میں "سرسوتی" سرسوتی کے لیے کہانیاں لکھیں۔ "سیوا سدن" (بازارِ حسن) اور "پریم آشرم" بھی یہیں لکھے گئے۔ بی۔ اے کا امتحان بھی انھوں نے یہیں کامیاب کیا۔ پوتدار جی کے مشورے سے انھوں نے پانی کا علاج شروع کیا لیکن اس سے تو ندنکل آئی اور پیدل چلنا دوبھر ہوگیا اس لیے پھر علاج چھوڑ دیا۔

ناظر بیسی سرگرمیاں از ملازمت سے استعفا | وہ اس اسکول میں تاریخ خاص طور پر پڑھاتے تھے۔ اصل کتاب کا سبق تو چند منٹ میں ختم کر دیتے اور پھر ایسی باتیں کہتے جو تاریخ میں نہ ہوتیں اور اکثر اسی تاریخ کے خلاف مواد فراہم کر کے بتلاتے اور کہتے کہ یہ کتابیں قوموں میں نفاق پیدا کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں۔

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ کانگریس کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو دیہات کے دورے کر رہے تھے۔ اور رعایا، زمیندار اور حکومت ان تینوں کو ان کے حقوق سے واقف کرا رہے تھے۔ کسانوں کو بے دخل کرنا ان پر ظلم کرنا اور ان کے مال و اسباب کو ضبط کر لینا اب اتنا آسان نہیں رہا تھا۔ یہ دور عدم اشتراک کے پرچار اور ترک موالات کا تھا۔ کسانوں کا اتحاد حکومت کے دل میں سیماب کی طرح رقص کر رہا تھا۔ ان پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں اور کسانوں کو جن پر بھروسہ تھا انہیں قید کیا جا رہا تھا۔ غرض ہر طرف بدنظمی اور بے اعتمادی نظر آتی تھی۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ بھی ہو چکا تھا۔ اسی اثنا میں مہاتما گاندھی نے گورکھپور کا دورہ کیا اور دو لاکھ کے عظیم الشان مجمع میں تقریر کی۔ اس تقریر سے متاثر ہو کر پریم چند نے فروری ۱۹۲۱ء میں ملازمت سے استعفا دے دیا۔ اور ایک گاؤں میں جا بسے۔

فکر روزگار | گاؤں میں جانا ان کے لیے صحت کا پروانہ تھا۔ انھوں نے غلامی سے کیا نجات پائی مرض مزمنہ سے بھی انھیں چھٹکارہ مل گیا۔ وہ وہاں ایک سال گذارنے کے بعد مارچ ۱۹۲۲ء میں بنارس چلے گئے اور مہینے بھر کے بعد کانپور جا کر مارواڑی اسکول کے مدرس ہو گئے۔ مگر ایک سال کے اندر ہی اندر کاشی ناتھ جی منیجر اسکول سے مخالفت ہو گئی اور انھیں اس ملازمت سے بھی دست کش ہونا پڑا۔

مارچ ۱۹۲۳ء میں وہ بنارس چلے گئے اور اپنے وطن میں سکونت اختیار کی۔ کئی ہزار کے صرفہ سے ایک مکان تعمیر کرایا۔ پھر ہندی ادب کے مشہور سرپرست شیو پرشاد جی کی

ایماء سے رسالہ (مریادا) کے مدیر رہے کیونکہ (مریادا) کے سابق مدیر بابو سمپورن آنند عدم اشتراک کی تحریک کے سلسلے میں جیل جا چکے تھے۔ جب وہ اپنی سزا کی میعاد ختم کر کے واپس آئے تو شیو پرشاد جی نے انھیں کاشی ودیا پیٹ میں مدرسی کی جگہ دی۔

سرسوتی پریس کا قیام | ایک سال تک یہاں کام کرنے کے بعد انھوں نے تین آدمیوں کے اشتراک سے "سرسوتی پریس" قایم کیا۔ اس میں انھوں نے اپنے ساڑھے چار ہزار روپے لگائے تھے لیکن تجارتی ناتجربہ کاری کی بنا پر نقصان اٹھاتے رہے اور آخر ۱۹۲۵ء میں ہندی ادب کے دارالاشاعت گنگا پستک مالا آفس لکھنؤ میں لائبریری اسسٹنٹ کی سو روپے ماہوار کی جائداد قبول کر لی۔

مطبع نول کشور سے تعلق | دس ماہ تک کام کرنے کے بعد بھی گذارہ کی کوئی صورت نظر نہ آئی اس لیے اپریل ۱۹۲۶ء میں بنارس آ کر جون ۱۹۲۸ء تک رہے جولائی ۲۸ء میں دو سو روپے ماہوار پر (مادھوری) لکھنؤ کی ادارت قبول کی اور نومبر ۳۱ء تک یہیں رہے اور اپنی ہمہ جہتی قابلیت سے (مادھوری) کے معیار کو بہت بلند کر دیا۔ وہ اس کے ساتھ مطبع نول کشور کی اردو ہندی کی درسی کتابیں بھی تیار کرتے تھے۔ منشی بشن نرائن بھارگو مالک مطبع کے انتقال پر اسٹیٹ کورٹ کی نگرانی میں آ گئی اور مرزا محمد عسکری صاحب آسی صاحب لکھنوی اور منشی پریم چند نے نومبر ۱۹۳۱ء میں نول کشور سے اپنا تعلق منقطع کر لیا۔ اور اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے ۱۹۳۳ء تک لکھنؤ میں مقیم رہے اور اس کے بعد بنارس چلے گئے۔ ۱۹۳۵ء تک سرسوتی پریس کا کام کرتے رہے۔

رسالہ "ہنس" کا اجراء | انھوں نے اپنے پریس کے کاروبار کو بڑھانے اور اس کو ترقی دینے کی امکان بھر کوشش کی۔ جنوری ۱۹۳۰ء میں (ہنس) جاری کیا مگر جون میں یعنے صرف چھ مہینے بعد اس سے ایک ہزار کی ضمانت طلب ہوئی تو بند کر دیا اور چھ مہینے بعد جب یہ حکم منسوخ ہو گیا تو جنوری ۱۹۳۱ء میں دوبارہ جاری کیا۔ تیسرے نمبر میں ایک کہانی

"قاتل" شائع ہوئی جس کی بنا پر ان سے دوبارہ ضمانت طلب کی گئی لیکن مسٹر بنا لال کلکٹر بنارس کی سفارش پر معافی مل گئی اور (ہنس) نکلتا رہا۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء بھارتیہ ساہتیہ پریشد نے اس کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا۔ جون ۱۹۳۶ء میں سیٹھ گوبند داس کے ایک مضمون کی اشاعت کی وجہ سے ضمانت طلب کی گئی۔ جس کی بنا پر اراکین انتظامی کمیٹی نے اس کو بند کر دینے کا اعلان کیا۔ ان کی یہ حرکت پریم چند کو ناگوار گذری اور انھوں نے دوبارہ اس کو اپنی ملکیت میں لے لیا۔ اور باوجود نقصان کے تادم مرگ چلاتے رہے اب بھی شیو رانی دیوی اور ان کے ہونہار صاحبزادے مسٹر سری پت رائے کی نگرانی میں (ہنس) پریم چند کی یادگار بنا ہوا نکل رہا ہے۔

پریم چند اور ہندی ادب | یوں تو پریم چند ابتدا ہی سے ہندی میں لکھتے رہتے تھے لیکن ان کا زیادہ وقت اردو لکھنے میں گذرتا تھا۔ نی زمانہ بھی اردو کے مصنفین کی کتابیں بڑی مشکلوں سے فروخت ہوتی ہیں اور ایک ہزار کے ایڈیشن کی فروخت کے لیے برسوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ یہی حال پریم چند کا ہوا۔ وہ ملازمت سے کنارہ کش ہونے کے بعد ہندی کی طرف زیادہ راغب ہوئے۔ اور ۱۹۲۵ء سے تو اس میں شدت پیدا ہو گئی۔ (مریادا۔ ۱۹۲۳ء) (مادھوری ۱۹۲۸ء) (ہنس ۱۹۳۳ء) اور (جاگرن ۱۹۳۳ء) کی ادارتیں اور اہتمام اس کا ثبوت ہیں۔ موخر الذکر ہفتہ وار اخبار تھا جو شنکر جی ندیاس کے زیر اہتمام نکلتا تھا۔ پریم چند کا خیال تھا کہ اس پرچہ سے مطبع ترقی کریگا۔ مالی امداد ملے گی اور ان کی فکریں دور ہو جائیں گی لیکن اس کے برخلاف دو ہی سال میں انھیں دس ہزار کا خسارہ ہو گیا۔ اور ان کی کمر ہمت ٹوٹ گئی اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مطبع کے کارندوں نے بھی ان سے دغا کی اور انھوں نے "جاگرن" کو مجبوراً بند کر دیا۔ لیکن اس دس ہزار کے گڑھے کو بھرنے کی فکر سوا ہو گئی۔

فلم کمپنی کی ملازمت | وہ مجبور ہو کر "اجنتا سینی ٹون" بمبئی میں ڈرامہ نویس کی حیثیت سے

ساڑھے سات سو روپے ماہوار پر کام کرنے لگے ۔ مگر یہاں انھیں جتنا زیادہ روپیہ ملا اس سے زیادہ ان کے ضمیر کا خون ہوا جو ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ تھیٹر کے مالک آجر تو ہوتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو آمر بھی سمجھتے ہیں۔ ان کی ہاں میں ہاں ملانا اور دربار داری ان کے ملازمین کے فرائض میں داخل ہو جاتی ہے ۔ خواہ کوئی کام اس کی طبیعت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ سینما کمپنی کے معاملہ میں اور ماحول سے زیادہ مخرب اخلاق اور ضمیر شکن شاید ہی کوئی دوسرا پیشہ ہو۔

یہاں پریم چند کے فن ۔ ان کی زبان اور ان کے کارناموں کو سراہنا تو کجا ان کی تحریروں کی تراش خراش کرکے ان کی صورتیں مسخ کی گئیں۔ ان کے دو افسانے ڈرامہ کی شکل میں پیش کیے گئے ۔ جن میں ایک "مزدور" تھا اور دوسرا "نوجیون" اس سے پہلے "سیوا سدن" (بازار حسن) کو بھی قلمبندی کے لیے خریدا گیا لیکن یہاں بھی ارباب سینما کی وہی آمرانہ روح کارفرما رہی اور ان کے یہ تینوں ناول جو قلمبندی کے لیے حاصل کیے گئے یا جن کی قلمبندی کی گئی سب کا ناس ہوا اور پریم چند برداشتہ خاطر ہو کر معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے مارچ ۱۹۳۵ء میں بنارس واپس ہو گئے ۔ اور سرسوتی پریس کے کاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھا۔

انتقال | موبا ضلع ہمیر پور کا مرض انہیں تحفتاً مل ہی چکا تھا ۔ اب بمبئی کے ایک سالہ قیام نے ان کی رہی سہی صحت کو اور بھی خراب کر دیا۔ معدہ کی کمزوری بڑھتی گئی آخر جون ۱۹۳۶ء میں ان کے مرض میں زیادتی ہوئی اور وہ جلندھر کا شکار بنے ۔ وہ علاج کے لیے لکھنؤ گئے لیکن مرض میں افاقہ نہ ہونے سے واپس آ گئے اور بنارس میں ہومیو پیتھک علاج شروع ہوا۔ لیکن مرض الموت کا کوئی علاج نہیں۔

۷ / اکتوبر کی صبح سے دست آنے شروع ہوئے شام تک کئی دست آئے اور طبیعت نڈھال ہو گئی آخر ۸ / اکتوبر کی منحوس صبح نے اقلیم افسانہ نگاری کے شہنشاہ کو ہمیشہ کی نیند میں

سلادیا۔

ہم پہلے ہی لکھ آئے ہیں کہ پریم چند کی شادی ان کے والد نے کمسنی ہی میں کردی تھی۔ ابھی وہ پندرہ سال کے تھے کہ ان جھگڑوں میں آ پھنسے اور صرف ایک سال بعد والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کو یہ شادی راس نہ آئی بیوی سے الگ رہ کر انھوں نے کئی سال گذار دیے لیکن اپنی بیوی کے کفیل وہ خود ہی تھے اور مستقل طور پر ماہانہ انھیں رقم ارسال کردیا کرتے۔ ابھی یہ بیوی زندہ تھی کہ پریم چند نے شیورانی دیوی نامی ایک بیوہ خاتون سے بیاہ کرلیا وہ کنوار ضلع فتح پور کی رہنے والی ہیں ان کے والد نے ان کی شادی بہت کم عمری میں کردی تھی اور وہ شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی بیوہ ہوگئیں سماج کے رسم و رواج کے خلاف ان کے والد نے نیا جرأت آموز اقدام کیا اور پریم چند سے ان کا بیاہ کردیا۔

شیورانی دیوی کی ادبی خدمات انھیں ہندی میں معمولی شُد بُد تھی لیکن شادی کے بعد انھوں نے ایسی استعداد بہم پہنچائی کہ آج ہندی کی مشہور افسانہ نگار ہیں اور ان کے ترجمے دیگر زبانوں میں بھی شایع ہوتے ہیں۔ ان کی سولہ کہانیوں کا ایک مجموعہ (ناری ہردے) اور دوسرا مجموعہ (سیندور کی رکھشا) کے نام سے شایع ہوچکا ہے۔ پریم چند کے ساتھ انھوں نے نہ صرف ادبی کام کیے بلکہ سیاسیات میں بھی عملی حصہ لیا۔ لکھنو میں بائیکاٹ کے متعلق دھرنا رکھنے کے سلسلے میں انھیں ڈیڑھ ماہ کی سزا ہوئی۔ پریم چند کی وفات کے بعد بھی وہ قومی اور ادبی خدمات میں سرگرمی سے حصہ لیتی ہیں۔ ان کے بطن سے ۱۹۱۹ء میں سری پت رائے گورکھپور میں پیدا ہوئے اور امرت رائے ۱۹۲۲ء میں کانپور میں۔ ایک اور لڑکا بھی گورکھپور میں پیدا ہوا تھا جس نے بعارضہ چیچک انتقال کیا۔ انھیں ایک لڑکی بھی ہے۔

خانگی زندگی والد کی زندگی تک تو انھیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی لیکن ان کے انتقال کے بعد تو آسمان ہی ٹوٹ پڑا۔ انھیں اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ پالنے اور تعلیم جاری رکھنے کے لیے پانچ روپیہ کا ٹیوشن کرنا پڑا آخر ان کی ملازمت اٹھارہ روپیہ کی حقیر رقم سے

شروع ہوئی۔ اور ان کی ادبی زندگی کی ابتدا کا بھی یہی زمانہ ہے۔ وہ زمانہ کے لیے کہانیاں لکھنے لگے۔

ہندی کتابوں سے آمدنی | ان کا پہلا ناول (ہم خرما و ہم ثواب) نکلا اس سے کوئی مالی فائدہ نہیں ہوا۔ لیکن جرأتیں ضرور بڑھ گئیں۔ اس کے بعد (سوز وطن) شایع کیا اور اس کی جو درگت ہوئی اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ہندی میں (پریما) پہلا ناول تھا اس سے بھی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا دوسرا ناول (سیوا سدن) (بازار حسن) لکھا اور کلکتہ پستک ایجنسی نے صرف پہلے ایڈیشن کے لیے ساڑھے چار سو روپے پیش کیے۔

یہ پہلا اتفاق تھا کہ پریم چند کو ادیب ہونے کا احساس ہوا۔ اس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی جب انھوں نے (پریم آشرم) گوشۂ عافیت لکھ کر دیا تو اسی ایجنسی نے اس کتاب کے لیے تین ہزار روپے دیے۔ تیسرا ناول (نرملا) چاند پریس الہ آباد نے ۱۹۲۳ء میں شایع کیا اور ۱۹۲۸ء میں (رنگ بھومی) گنگا پستک مالا آفس لکھنؤ سے شایع ہوا اور پریم چند کو دو ہزار روپے ملے۔

یہ ان کی پہلی کتاب تھی جو ناگری رسم الخط میں لکھی گئی۔ یہ صوبہ متحدہ کی اس سال کی بہترین تصنیف سمجھ کر ہندوستانی اکیڈمی نے مصنف کو پانچ سو روپے نذر کیے اس کے بعد (کایا کلپ) لکھ کر انہوں نے اپنے ہی پریس سے شایع کیا اور ناگری پرچارنی سبھا بنارس نے اس کتاب پر دو سو روپے انعام دیا۔ اس کی ۱۹۳۶ء تک پانچ ہزار سے زائد کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں۔ غرض پریم چند جب تک ملازم رہے بہت عسرت میں زندگی گذارا کیے۔ اُردو کے دیگر مصنفین کی طرح وہ بھی مفلس ہی رہے۔ لیکن ہندی افسانوں اور کتابوں سے ان کو مدد ملتی رہی۔

اُردو کتابوں سے آمدنی | انھیں اردو تصانیف سے بہت کم آمدنی ہوئی۔ مولانا محمد علی نے اردو میں ایک ایک کہانی پر تیس تیس روپے دیے اور یہ غالباً ان کی ایک کہانی کا اُردو میں

سب سے بڑا معاوضہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی بعض رسالوں نے معاوضہ دیا مگر برائے نام (برائے نام)
سے تو جو ملا لے لیا اس لیے کہ وہ گھر کا پرچہ سمجھتے تھے۔

پریم چند نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے۔

"اردو سے اب تک دو ہزار روپے ملے ہوں گے (چوگان ہستی) اور (کنج عافیت)
دونوں آٹھ سو میں دیدیئے کوئی ناشر ہی نہ ملتا تھا۔"

(چوگان ہستی کے متعلق ایک ناقد کی رائے ہے۔

"اگر پریم چند نے ساری عمر میں صرف یہی ایک ناول لکھا ہوتا تو بھی ان کو دنیا کے کامیاب افسانہ نویسوں میں عزت کی جگہ مل جاتی۔ برنرڈ کی جسارت۔ رسل کی آزادی۔ ڈکنس کی غربت نگاری۔ گالزوردی کا سا طنزیہ تبسم۔ ڈوما کی نقشہ کشی۔ راشد کی تشبیہیں۔ نظامی کی سادگی۔ نفیسی کی عظمت۔ شرر کا جوش۔ رسوا کی معنویت۔ اور ٹیگور کی لطافتیں اگر ایک جگہ اور پورے تناسب کے ساتھ دیکھنی ہوں تو اس ناول کی سیر کیجئے شاید یہی وجہ ہے کہ چینی۔ جاپانی۔ مرہٹی۔ جرمنی اور ہندی سبھی زبانوں میں اس کے ترجمے یکساں مقبول ہیں۔

"وردز ازاے تھیٹر" اور "لائف از اے اسٹیج" ایسے کامیاب ناول بھی اس کے ساتھ تولے جائیں تو شاید ہلکے ٹھیریں۔"[1]

اور (گوشۂ عافیت) کے متعلق اسی ناقد نے لکھا ہے۔

"زبان نہایت ہموار۔ پیاری۔ لوچیلی۔ اور اتنی ستھری اور میٹھی ہے کہ فارسی خط میں اردو اور ناگری حرفوں میں ہندی معلوم ہوتی ہے۔"[2]

ان دونوں کتابوں کو اردو کے پبلشر نے صرف آٹھ سو میں لیا اور اب تک اس کے بیسیوں ایڈیشن شایع کر دیے۔ ایسی صورت میں پریم چند کی روحانی تکلیفوں کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اردو پبلشروں کی اکثر جگہ شکایت کی ہے اور [illegible] اشک کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

---

[1] زمانہ پریم چند نمبر صفحہ ۱۵۱ [2] زمانہ پریم چند نمبر صفحہ ۱۸۳۔

"بک سیلروں کا تجربہ آپ سے زیادہ تلخ مجھے ہوا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے ڈیڑھ سو روپے دبائے بیٹھا ہے۔ لاہور ہی میں ایک دوسرا پبلشر میرے سات سو روپے ہضم کرنا چاہتا ہے۔ اخبارات کا یہ حال ہے بک سیلروں کا یہ بیچارہ مصنف کیا کرے؟"[1]

ان دلگداز اور حسرت آمیز الفاظ میں سینکڑوں افسانے پنہاں ہیں۔

ایڈیٹر زمانہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"(پردۂ مجاز) ابھی تک پبلشر نے نہیں بھیجا۔ کئی خطوط لکھ چکا نہ روپے بھیجتا ہے نہ کتابیں نہ جواب دیتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سرد بازاری بلائے جان ہو رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کتابوں کی کافی بکری نہیں"[2]

گورکھپور سے ایک اور خط انہیں کو لکھا ہے۔

"(پریم پچیسی) حصہ اول کو چھپے ہوئے چار سال ہوئے مگر ابھی تک نصف پڑی ہوئی ہے حصہ دوم کی مشکل سے ڈیڑھ سو جلدیں بکیں۔ میں اس سے بہتر نہیں لکھ سکتا اور بہتر کامیابی کی امید نہیں رکھتا"

ایک خط میں وہ ذرا خفگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں لیکن حقیقت ہے۔

"اردو پڑھنے والوں کی تعداد کم نہیں ہے لیکن غالباً سب مفت کے پڑھنے والے ہیں سب کو دعویٰ نامہ نگاری ہے سبھی اہل قلم ہیں پڑھنے والا کوئی نہیں ہے"[3]

منشی جی نے ایک خط میں یہاں تک لکھ دیا ہے۔

"اب ہندی لکھنے کی مشق بھی کر رہا ہوں۔ اردو میں اب گذر نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بال مکند گپت مرحوم کی طرح میں بھی ہندی لکھنے میں زندگی صرف کروں گا۔ اردو نویسی میں کس ہندو کو فیض ہوا ہے جو مجھے ہو جائے گا"[4]

مگر یہ پریم چند کا اپنا خیال تھا۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ۱۹۲۵ء تک سارے مصنفین کا یہی حال تھا کہ ان کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن بمشکل چھپتا تھا۔ خود علامہ اقبال کی تصنیف (بانگ درا)

---

[1] زمانہ پریم چند نمبر ۱۱۱ - [2] و [3] زمانہ پریم چند صفحہ ۱۰۹ ۱۰۸ -

جو پہلی دفعہ ۱۹۲۴ء میں صرف تین ہزار شایع ہوئی دو سال تک نہیں نکل سکی۔ حالانکہ اس وقت تک ان کی شہرت بقول مولوی عبدالرزاق صاحب راشد مرتب (کلیات اقبال) کے کشمیر سے راس کماری تک اور گجرات سے بنگال تک پھیل چکی تھی اور پنجاب کا تو بچہ بچہ ان سے واقف تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بہت بڑے مفکر اور فلسفی تھے بلکہ اس لیے کہ وہ پنجاب کے بڑے جلسوں میں شرکت کرتے اور انجمن حمایت الاسلام کے عظیم الشان جلسوں کو چاہتے تو رلاتے اور چاہتے تو ہنساتے تھے۔

بہر حال منشی پریم چند کی زندگی بحر متلاطم تھی۔ یتیم ہونے کے بعد سے مرنے تک انہوں نے آرام کی صورت نہیں دیکھی۔ ادنیٰ مزدور کی طرح دن رات کام کرتے تب کہیں اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھر سکتے تھے۔

ایڈیٹر (زمانہ) کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"مجھے ان خرخشوں سے اس وقت نجات مل جانی چاہیے تھی تاکہ کسی گوشہ میں باطمینان پڑا ہوا کچھ لکھا پڑھا کرتا۔ مگر یہاں ابھی بال بچے پال رہا ہوں جو کام چالیس کی عمر میں ہونا چاہیے وہ ستاون سال میں ہو رہا ہے جب آدمی پنشنر ہو جاتا ہے۔"[1]

یہ بات بھی نہیں کہ وہ لالچی تھے روپیہ جمع کرنے کی ہوس تھی یا اچھا کھانے پینے اور زندگی عیش و آرام سے بسر کرنے کا خیال تھا۔ اس لیے کہ وہ صرف پیٹ بھرنے اور قومی کام کرنے کی خاطر ہر کڑی سے کڑی مشکل برداشت کر لیتے تھے۔ ایک مصنف اپنے خیالات کو اپنی تصانیف میں ظاہر کر کے قوم کو بیدار کر سکتا ہے۔ اور پریم چند یہی کر رہے تھے۔ اس کے لیے وہ اپنا دماغ اور دولت دونوں چیزوں کو فیاضانہ لٹا رہے تھے اور اس دھن میں انھیں نہ اپنے لباس کی پروا تھی اور نہ اپنے کھانے پینے کی۔ یوں بھی وہ دائمی

---

[1] یادگار پریم چند صفحہ (۱۱۳)

مرض کا شکار تھے اور اچھی غذاؤں سے مجبوراً اجتناب کرنا پڑتا تھا جس کی عادت ان میں بہت کم تھی۔

اخلاق و عادات | وہ خود ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بڑی آفتیں اور مصیبتیں جھیل کر تعلیم حاصل کی تھی اور اپنے پیر پر آپ کھڑے ہوئے تھے اس لیے ان میں کبر و نخوت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ وہ ہر ایک سے ہنس کر ملتے اور انتہائی اخلاق و مروت سے پیش آتے لوگ ان کو خطوط لکھ کر ان کے دوست بن گئے تھے جب وہ ہندوستان کے مسلّمہ ادیب بھی بن گئے اس وقت بھی ان میں رعونت اور تکبر پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کے برخلاف وہ۔

نہد شاخ پر میوہ سر بر زمین

کے مصداق بن گئے۔

بے تعصبی | انھوں نے کبھی نہ اپنی زبان سے کسی کا دل دکھایا اور نہ قلم سے۔ مذہبی رواداری اور بے تعصبی میں وہ ضرب المثل تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انھوں نے اردو کو چھوڑ کر ہندی زبان کو محض اس لیے اختیار کیا کہ وہ اردو کو ترقی نہیں دینا چاہتے تھے لیکن ہم جہاں تک غور کرتے ہیں نتیجہ ایسا نہیں پاتے۔ جس طرح افسروں کے ڈر سے (سوزِ وطن) کے ساتھ انھوں نے اپنے قلمی نام نواب رائے کو دفن کر دیا اسی طرح پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر انھوں نے ہندی میں لکھا۔ اور اس میں انھیں مالی فائدہ ہوا۔ اردو کی کئی کتابیں لکھنے پر بھی وہ فکرِ معاش سے اتنے آزاد نہ ہو سکے جتنے ہندی میں چند افسانے اور ناول لکھ کر۔ اس کو تعصب پر محمول کرنا ان کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہوگا۔

بردباری | ہر مصیبت میں صابر و شاکر رہنا ان کا شیوہ تھا۔ بڑی سے بڑی مصیبت بھی انھیں پست ہمت نہ کر سکتی تھی ایک دفعہ انھیں خود بدن ڈھانکنے کے لیے کپڑے نہ تھے ان کی بیوی نے انھیں کپڑے خریدنے کے لیے روپے دیے تو انھوں نے پیسیں کے طا زمین میں تقسیم کر دیے۔

اس سے ان کے جذبہ ایثار و ہمدردی اور رقیق القلبی کا پتہ چلتا ہے ۔ یا اور ایسی کئی مصیبتیں تو جسمانی ہیں جنھیں بعض انسان تو خندہ پیشانی سے جھیل جاتے ہیں اور ابرو پر بل نہیں آنے دیتے ۔ اور اکثروں کو تو مجبوراً جھیلنی ہی پڑتی ہیں ۔ لیکن ماں باپ کو اولاد کا غم جیسی مصیبت ہے اس سے بڑھ کر مصیبت اس وقت شاید ہی کوئی نظر نہ آئے اس وقت بھی پریم چند میں وہی سکون اور وہی صبر و استقلال نظر آتا ہے ۔ ۱۹۲۰ء میں جب ان کا ایک بچہ چیچک کے عارضہ سے انتقال کر گیا تو منشی دیا نرائن نگم کو ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

"تقدیر نے تو اپنی دانست میں سزا دی ہوگی لیکن یہاں فکروں کا آدھا بوجھ سر سے دور ہو گیا مجھے بھی مرنے دیجئے اس گوشہ میں"[1]

جب وہ خود مرنے لگے تو بجائے اس کے کہ انھیں عام انسانوں کی طرح اپنی موت پر افسوس ہوتا اور ڈاکٹر اور عزیز و اقربا تسکین دیتے الٹا وہی اطمینان دلاتے ہیں مرنے سے پہلے انھوں نے اپنی بیوی سے کہا ۔

"تمھیں میری روح و قلب کی طاقت ہو ۔ گھبرانا مت ۔ کیونکہ تم بھی یہاں بیٹھی نہ رہو گی"[2]

یہ اس بلند مرتبہ مصنف کا کردار ہے جس نے افسانے کی دنیا میں نام پیدا کیا اور اردو ادب کو معراج کمال تک پہنچنے میں مدد دی ۔

تصویر کے پریم چند | مرزا محمد عسکری مترجم تاریخ ادب اردو سکسینہ نے پریم چند کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے ۔

"میانہ قد ۔ چھریرا بدن ۔ کتابی چہرہ ۔ ناک نقشہ نہایت درست ۔ آنکھیں بڑی اور نمایاں سفید صافہ باندھے ہوئے جو ان پر بہت زیب دیتا تھا ۔

ایک اور تصویر ہے پستہ قامت ۔ دبلے پتلے آدمی تھے مگر مضبوط ۔ بچہ کھونے پر انگلیوں کو موڑنا معمولی انسان کے لیے آسان نہ تھا ان کی وضع قطع سادی تھی ۔ اچکن ۔ پائجامہ یا کھلے گلے کا لمبا کوٹ پہنتے تھے غرض وہ اتنے سادہ کپڑے پہنتے تھے کہ اس سے زیادہ تصور ہی نہیں ہو سکتا ان کی ذاتی ضروریات اس قدر کم تھیں کہ چھوٹے پیمانہ پر مہاتما گاندھی نظر آتے تھے"[3]

---

[1] ۔ یادگار پریم چند صفحہ ۱۴ ۔ [2] ۔ یادگار پریم چند صفحہ ۱۴ ۔ [3] پریم چند زمانہ نمبر صفحہ ۸۷ ۔

تیسرا باب - افسانہ - ارتقا اور فن

افسانہ کیا ہے | اب ہم یہ دیکھیں گے کہ پریم چند نے جس صنف ادب کو چار چاند لگا دیے وہ کیا ہے اور اس کی نشو و نما کس طرح ہوتی ہے۔

افسانہ کہانی ہے، ایسی کہانی جو ہمیں مہد سے لحد تک بہلاتی رہتی ہے۔ ہم اپنے بچپن میں اس کے لیے گوش بر آواز رہتے تھے۔ لڑکپن میں ان کہانیوں کو مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ جوانی کی کئی راتیں ہم نے کہانیاں پڑھنے میں گذار دیں۔ غرض جہاں ہم بہل جاتے ہیں ان باتوں میں ہمیں دلچسپیاں اور رنگینیاں نظر آتی ہیں اور کیف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ یہ سب کہانیاں ہیں البتہ ان کہانیوں کے معیار جدا جدا ہیں۔ کوئی کہانی ہمیں بے جان اور پھیکی سی معلوم ہوتی ہے اور کوئی جاندار۔ کوئی ہمیں ہنساتی ہے اور کوئی رلاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کہانی پڑھنے سے ہمیں رنج ہو رہا ہے ہم اپنے دل کو مسوس رہے ہیں لیکن پھر بھی پڑھے جاتے ہیں۔ بعض وقت آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارا بہا دیتے ہیں لیکن کہانی نہیں چھوڑتے اور جب کہنے والا اس کمال سے کہے تو اس کے کیا کہنے۔ جب یہ دلچسپی کمال کا درجہ حاصل کر لیتی ہے تو تاثیر بن جاتی ہے اور ہم مجسم درد۔

قدیم تخیل | ان کہانیوں کے متعلق قدیم تخیل یہ ہے کہ یہ دل بہلائی کے لیے کہی جاتی تھیں۔ بادشاہوں کے دربار میں داستان گو مقرر تھے جو سر دربار بھی کہانیاں کہتے اور یہی کہانیاں بادشاہ کے لیے لوری کا کام دیتیں۔ گلی کی نکڑ پر یا کسی دروازے کے سامنے بڑے بوڑھے اور بچے جمع ہو جاتے اور وقت گذاری کے لیے کہانیاں کہی جاتیں۔ مگر ان دونوں کہانیوں میں فرق ہوتا بادشاہ اپنے شایان شان کہانی سنتا۔ ماضی کے یادگار قصے اس کے گوش گذار کیے جاتے اور بچوں کو بوڑھے انہیں کہانیوں سے جری اور مرد میدان بناتے۔

زمانہ کروٹیں لیتا رہا اور کہانیاں بھی اپنے پہلو بدلتی رہیں۔

قدیم افسانوی ادب | الیڈ اور اڈیسی اور رستم و اسفندیار کی کہانیوں کا دور گذر گیا اور گلستان بوستان اور ایسپ کی کہانیاں کہی جانے لگیں۔ جب زمانہ اور بھی گذر گیا تو کہانیوں میں رومانیت پیدا ہو گئی اور ان میں عشق و محبت کے گن گائے جانے لگے۔ ان کو فن کا رتبہ یورپ اور امریکہ میں حاصل ہوا۔ واشنگٹن ارونگ اور اڈگار ایلن پو نے امریکہ میں۔ لا لینس۔ جوائس اور سٹیون سن نے انگلستان میں اس پر خاص پابندیاں عائد کیں۔ اس سے پہلے تک من گھڑت قصے لکھے جاتے ملٹن جنت کی اور ڈانٹے دوزخ کی سیر کراتا تخت ہوا میں اڑتے تعویذ اور فلیتے بڑے بڑے مافوق الفطرت کام کر جاتے۔ اس کے بعد محبت کی دنیا آباد ہوئی۔

لیکن مذکورہ بالا مغربیوں نے ان تمام چیزوں سے ہٹ کر زندگی کے ہر مرحلہ کو اپنے افسانے کا موضوع بنا لیا۔" انسانی جذبات۔ غم و غصہ۔ سرور و انبساط۔ رشک و حسد۔ ظلم و ستم۔ رحم و کرم۔ خوف و ہراس۔ حسن و عیب۔ اور معصیت و عفت فطرت اور اس کی نیرنگیاں فلسفہ اور اس کی باریک بینیاں نفسیات اور معاشرہ غرض کوئی ایسی چیز نہیں بچی جسے افسانے کے پلاٹ کے لیے استعمال نہ کیا گیا ہو۔"[1]

یہ لہر دنیا کے سارے ادب میں دوڑ گئی۔ روس۔ اٹلی۔ امریکہ۔ ترکی۔ انگلستان غرض کہ ہر اعلیٰ زبان میں ایسے افسانے لکھے جانے لگے اور افسانہ آسمان سے زمین پر آ رہا یعنے " ادب برائے ادب" کا خیال فرسودہ ہو گیا اور ادب برائے زندگی کی برقی لہر دوڑ گئی اب افسانوں کے کردار ہم آپ جیسے انسان بن گئے ورنہ اب تک فوق الانسان ہی تھے۔ مغربی ممالک کے سیاسی رجحانات کا اثر ادب پر بھی پڑتا گیا اور عصری افسانہ نگاروں نے مقامی سیاست اور حکومت کے تانے بانے سے اپنے افسانے تیار کیے اور

---

[1] ۔ ہمارے افسانے صفحہ ۸۔

اس طرح حکومت کے مظالم رعایا کے سامنے آتے گئے اور ان کے قلوب کو آزادی کے ہنگوروں میں جھلانے لگے چنانچہ روس اور فرانس کا انقلاب افسانہ نگاروں ہی کا رہین منت ہے جن میں ڈاسٹفسکی۔ گورکی۔ ترجینیف اور چیخوف اور فرانسیسوں میں والٹیر سے موپاساں تک کم و بیش سب شامل ہیں۔

ہندوستان میں افسانہ نگاری | ان اثرات سے ہندوستان بھی بچنے نہ پایا۔ یہاں بھی افسانے کے ارتقائی مدارج وہی ہیں جو اور دوسرے ادبیات میں پائے جاتے ہیں۔ گر غدر کے بعد جس طرح تمام دوسرے اصناف ادب میں تغیر ہوگیا اسی طرح افسانہ میں بھی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اور عصری افسانہ نگاروں نے باغ و بہار، آرائش محفل اور فسانہ عجائب کی راہ کو قطعاً ترک کرکے اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی۔

نذیر احمد | "اُردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد ہیں بعید از قیاس افسانوں کی جگہ اصلی واقعات اور صحیح معاشرت کو قصہ کی صورت میں پیش کرنے کا سہرا انھیں کے سر ہے[1]"

"ان کی زبان بہت آسان صاف اور سادہ ہوتی ہے البتہ کبھی کبھی بڑے بڑے عربی و فارسی کے غیر مانوس الفاظ لاتے ہیں اور کہیں رنگین عبارت اور صنائع بدایع سے اور بعض واقع پر انگریزی الفاظ سے کام لیتے ہیں جن سے ہمارے نزدیک عبارت میں بجائے چستی اور خوب صورتی کے بھونڈاپن اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔۔ ان کی نثر کا جوہر اعلیٰ ان کا ظریفانہ رنگ ہے۔۔۔۔۔ ان کی ظرافت بہت بلی اور لطیف ہوتی ہے اور اس میں پھکڑپن مطلق نہیں ہوتا[2]"

نذیر احمد نے افسانوں میں گھر یلو زندگی کے واقعات صاف صاف بیان کیے ہیں اور اس وقت کی ہر لحاظ سے تمدنی کیفیت پیش کردی ہے لیکن وہ دہلی کے باہر نہ نکل سکے۔ ان کے افسانے کی ساری چیزیں دہلی کی ہیں۔ انھوں نے فطرت سے زیادہ قربت حاصل کرلی

---

[1] داستان تاریخ اردو صفحہ ۵۱۵۔ [2] تاریخ ادب اردو حصہ نثر صفحہ ۶۱۔

اور لوگوں نے لیے دلچسپی کے سامان فراہم کر دیے اور ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کی۔ ان کے ناولوں کے نمونے نامکمل سہی لیکن نقش اول کہلانے کے مستحق ہیں۔

سرشار | سرشار نے اپنے وطن لکھنو کی ٹکسالی زبان استعمال کی۔ محاورہ اور روزمرہ کی شوخی کو اپنا خاص رنگ بنایا طرز ادا مقفیٰ ضرور ہے لیکن ناموزوں نہیں معلوم ہوتی۔ "انھوں نے ایک ایسا طرز اختیار کیا تھا جو افسانہ نویسی کے واسطے موزوں تھا۔ ان کے قصے میں لوگ نفس قصہ سے زیادہ عبارت سے دلچسپی لیتے ہیں"[1] ان کے ناول میں خامیاں ضرور ہیں ان کے ناولوں میں پلاٹ اور کردار میں یکسانیت نظر نہیں آتی لیکن ان کی زبان اور اسلوب کی دلچسپی اور دلکشی میں پڑھنے والا اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ اس کو ان خامیوں کا کم احساس ہوتا ہے۔

شرر اور سجاد حسین | یہ خامیاں سجاد حسین کے ہاں یکسر ندارد ہیں ندرت بیان کے لحاظ سے بھی ان کا مرتبہ بلند ہے مزاحیہ ناولوں کی کامیابی کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ شرر نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی اور دفتر کے دفتر اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ ان کی منظر نگاری مشہور ہے۔ "ناول کا ہر باب اور ہر باب کے تقریباً دو صفحے منظر کشی کی نذر ہو جاتے ہیں" ان پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اگر ان کے ناولوں میں کردار کے نام بدل دیے جائیں تو پھر ناولوں کو ممیز کرنا مشکل ہو گا۔ "تاریخی ناولوں میں صداقت کو بھی ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے"[2] لیکن یہ ظاہر ہے کہ وہ تاریخ نہیں لکھ رہے تھے بلکہ ان کا مطمح نظر ناول لکھنا تھا اگر ایسا نہ کیا جاتا تو تاریخ اور ناول میں کیا فرق باقی رہ جاتا۔ ان خامیوں کے باوجود بھی انہوں نے اردو ناولوں کو انگریزی ناولوں کے شانہ بہ شانہ لا کھڑا کیا۔ انہوں نے اردو ادب میں اسکاٹ کی جگہ لی۔ اس کا ٹ سلنے در پردہ

۱؎ تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۲۰۔ ۲؎ دنیائے افسانہ۔

تبلیغ کی اور باکمال ناول نگار بنا۔ شرر اپنے مقصد کو چھپا نہ سکے اور لوگوں کو انگشت نمائی کا موقع مل گیا۔

محمد علی اور راشد الخیری | حکیم محمد علی بھی انھیں کے ساتھی ہیں" راشد الخیری نے نذیر احمد کی اتباع کی اور پھر ان میں انفرادیت پیدا ہوگئی۔ انھوں نے عورت کی المناک زندگی کو اپنا موضوع بنا لیا اور اس طرح اردو افسانے میں ان کو خاص جگہ مل گئی۔ مگر ہر افسانہ ایک ہی انداز رکھتا ہے اور دو تین چیزیں پڑھنے کے بعد وہ تازگی محسوس نہیں ہوتی"[1] * "غم والم کی شدت جس کو بیان کرتے ہوئے زبان رکتی ہے ان کے قلم سے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان ہو جاتے ہیں اسی رجحان کی وجہ سے علامہ راشد الخیری کے ساتھ "مصور غم" کا لقب بہت زیب دیتا ہے"[2]

موجودہ افسانہ نگار | اب وہ زمانہ تھا کہ ساری دنیا اقتصادی مصائب میں گرفتار تھی۔ سیاسی انتشار اور حکومت اور رعایا کے درمیان اختلافات پیدا ہو چکے تھے ان چیزوں کا اثر ادب پر بھی پڑا ناولوں کے لکھنے اور پڑھنے کی فرصت نہ پا کر لوگ مختصر افسانہ نویسی اور افسانہ خوانی کی طرف راغب ہوئے اور مصنفین کو ان کی طلب پوری کرنی پڑی۔ ان میں نیاز۔ پریم چند۔ پطرس۔ رشید احمد صدیقی اور مجنوں گورکھپوری پیش پیش رہے اور ہندوستانیوں کے قومی، تمدنی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، تاریخی اور سماجی حالات کو اجاگر کیا اور ان کی تحریروں کو پڑھ کر ہر شخص یہ سمجھنے لگا کہ " میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" اور یہی وہ ادب ہے جو دنیا کے اور دوسرے عصری ادبیات کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان لکھنے والوں میں اور بھی چند نام ہیں جن میں سجاد حیدر، سدرشن، اعظم کریوی، افسر میرٹھی، علی عباس حسینی، حامد علی خاں،

---

[1] ۔ افسانہ (مجنوں) صفحہ ۱۴۴۔ [2] ۔ مختصر تاریخ ادب اردو (اعجاز) صفحہ ۱۰۸۔

ایم اسلم اور عظیم بیگ چغتائی قابل ذکر ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے طرح طرح کی جدتیں اور رنگینیاں پیدا کی ہیں اور کر رہے ہیں۔ محبت اور عورت کے دلکش نظریوں پر بحث کی جا رہی ہے ان کے دو گروہ ہو گئے ہیں۔ پہلے گروہ میں نیاز فحبوری۔ سجاد حیدر اور ل۔ احمد ہیں۔ ان لوگوں نے زنانہ ادب لطیف کی بنیاد ڈالی اور ان کے نزدیک عورت۔

"نرم ترین مخلوق، ہم پر حکمرانی کرنے والی، ایک لذت ہے مجسم ایک تسکین ہے متشکل ایک سحر ہے مرئی ایک نور ہے مادی"

ان کے نزدیک عورت کا حسن صرف دیکھنے کے لیے ہے آزاد ہو میدہ، آغوش سے دور۔ مجنون کہتے ہیں محبت بلا ازدواج قایم رہ سکتی ہے اور اس میں مذہب و ملت کی تفریق بے مقصد ہے۔ دوسرا گروہ عورتوں کو برائیوں کا خزینہ قرار دیتا ہے[1]

انھیں جھگڑوں سے تنگ آکر علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس ۔ آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

راشد الخیری، پریم چند، سدرشن اور سلطان حیدر جوش کے افسانوں کی عورتیں ہندوستانی ہیں جنکا خاص جوہر نسائیت ہے جو شرم و حیا کے مجسمے ہیں۔ پریم چند، سدرشن اعظم کریوی اور عظیم بیگ نے راجپوتنیوں کی عظمتیں بیان کرکے ہم پر ان کا سکہ بٹھا دیا۔ ان کا اپنی آن کے لیے سب کچھ قربان کر دینا۔ سب کچھ چھوڑ بیٹھنا لیکن بات کو بنائے رہنا اتنے موثر اور دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ ہم داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کی تکلیفوں میں ہم روتے ہیں اور ان کی خوشی کے موقع پر ہم بھی خوش ہوتے ہیں غرض ان کی تحریر پر ہم اس طرح چلتے ہیں گویا ایک گمراہ اندھیرے میں دور ٹمٹماتے دیے کی طرف چلا جاتا ہے۔

---

[1] ۔ ہمارے افسانے صفحہ ۹۵ اور دیباچہ رنگلار (مجموعہ افسانہ حامد علی خاں)

پریم چند نے عورتوں اور دوسرے ہر نقطۂ خیال کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ سدرشن نے ہندوؤں کے گھرانے کی حالت کا خاکہ کھینچا اور راشد الخیری اور فضل حق قریشی نے مسلمانوں کے گھرانوں کی۔ حامد اللہ افسر نے ہندوستانیوں کے عام ذہنی رجحانات کو اپنے افسانوں کا پس منظر بنایا۔ اور پریم چند کے اصلاحی رنگ سے متاثر ہو کر سدرشن۔ اعظم کریوی۔ علی عباس حسینی اور پروفیسر مجیب نے کامیاب افسانے لکھے۔ افسر کا ڈالی کا جوگ علی عباس کا افسانہ آئی سی ایس۔ اور پروفیسر مجیب کے افسانوں میں کیمیا گر۔ باغی اور بتھر نہایت کامیاب ہیں۔ کیمیا گر میں حکیم مسیح کا جذبۂ خدمت اور حب وطن۔ باغی میں بغاوت کے باریک نکات اور بڑے بابو کا کردار اور پتھر میں ہندوستانیوں کا تساہل بڑی خوبی کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے اور افسانہ کا خاتمہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ پروفیسر مجیب نے "روسی ادب" پر تفصیلی اور مبسوط تاریخ دو جلدوں میں لکھی ہے۔ روسی ادیبوں کا اثر بھی ان کے افسانوں پر نظر آتا ہے۔ پریم چند کی طرح وہ بھی واقعات بیان کرتے ہیں اور کرداروں کی سیرت نمایاں ہوتی جاتی ہے اور ان کی ساری زندگی پڑھنے والے کے سامنے آجاتی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی افسانہ نگار ہیں جن کا ذکر ہم نے اگلے باب میں کیا ہے۔ غرض اس طرح سارے ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا مجموعی خاکہ ہمارے افسانوی ادب میں پیدا ہو گیا۔

ترقی پسند ادب | پریم چند اور عظیم بیگ نے انتقال کیا اور ان کے بالکل آخری زمانہ میں چند ایسے مصنفین منصۂ شہود پر آئے جو عصری میلانات کو شدت کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کرنے لگے۔ ان کے گروہ کو ہم ترقی پسند مصنفین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ دور اشتمالی حقیقت نگاری کا دور ہے جس میں زندگی بجلی کی طرح کوند رہی ہے اور سماج کی عمارت کی کڑیاں چٹخ رہی ہیں . . . . . . اب زندگی پہ پردہ کم پڑا دکھائی دیتا ہے اور سمجھنے والے اسے بھی اٹھا دینے پر مصر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں

ہمیں بیک وقت مشین کی پوری پیچیدگی سے آشنا کر دیتے ہیں سماج میں افراد کی جنسی اور معاشی کشمکش کو اس کے تعلقات کے ساتھ سمجھنا انھوں نے اپنا شعار بنالیا ہے۔ لیکن ان کے بعض اراکین اپنے افسانوں میں سماج کی اتنی عریاں تصویریں پیش کرتے ہیں کہ انھیں دیکھنا تو طبیعت گوارا نہیں کرتی۔ "نئے زاویے" کے بعض افسانے رشید جہاں کا افسانہ (آصف جہاں کی بہو) عصمت چغتائی کی (ضدی) اور (لحاف) مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں اس سے ہمارے ادب میں ترقی کے امکانات کم ہیں اور ہمیں تو مایوسی ہی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مگر راجندر سنگھ بیدی اپنے افسانوں کے مجموعے (گرہن) کے دیباچے میں ہمیں یقین دلاتے ہیں۔

"ایک نیا اہم دور کشمکش میں ہے۔ آندھی سے پہلے جو ایک خاص قسم کی اُمس ہوتی ہے اس کا ظہور ہمارے ادب میں بھی ہے اس میں کوئی بھی جنبش کوئی بھی زندگی کے آثار نظر نہیں آتے بلکہ ایک خاص قسم کے تخریبی و اخلاقی رجحانات پیدا ہو رہے ہیں جن سے ہمیں قطعی مایوسی کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔ ترقی پسندی کے رسوائے عام نام کے تحت تو جنسی کیچڑ اچھالا جا رہا ہے اور جس سے لوگوں کو ادب کی صورت مسخ ہو جانے کا بے بنیاد اندیشہ ہے ایک ایسے ہی انحطاطی دور کی ترجمانی کرتا ہے لیکن۔

اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔

بیدی کی یہ تلقین اس لحاظ سے صحیح ہے کہ ترقی پسند ادیبوں میں اچھے اور برے سبھی شامل ہیں اور ان میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے بعض ارزاں شہرت کے متلاشی ہیں اور بعض کی نظر سماجی حالات پر گہری ہوتی ہے۔ موخر الذکر طبقہ واقعی طور پر ترقی پسند ادیبوں کے خوابوں کی تعبیر کو پورا کرے گا اور بیدی صاحب کا اشارہ غالباً اسی طرف ہے۔ ان ادیبوں کے افسانوں کے متعلق اردو ۴۰ء کے ایک نمبر میں شاہد لطیف نے لکھا ہے کہ اس نئے ادب سے بھوک اور نفسانیت کو نکال لیا جائے تو بہت کم باقی

بچے گا۔ اس تہی مائیگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر نے ادب کے پرانے ذخیروں سے یک قلم منہ موڑ لیا ہے اور ان کو سرے سے قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ ادب لطیف اگست ۱۹۴۷ء میں ایڈیٹر صاحب لکھتے ہیں کہ "ہمارا ترقی پسند ادب بھی مغرب کی کورانہ تقلید میں زمین کو ضرورت سے زیادہ کریدنے لگا ہے وہ اس آسمان کو بالکل بھول جاتے ہیں جس پر سرمایہ ملت ٹیگور بے جا نکلا جس کی وضاحت سرت چندر چٹرجی نے اپنے لازوال افسانوں میں کی۔ ادب کو زندگی کا آئینہ ہونا یقیناً ضروری ہے اور اگر یہ نہ ہو تو ایسا ادب جز دانوں ہی کے کام کا رہ جائے گا۔

اپنی تائید میں ہم ترقی پسند مصنفین کی جماعت کے ایک رکن اختر انصاری کے الفاظ پیش کرتے ہیں۔

"ادب کی دو خصوصیتیں ہیں ایک یہ کہ وہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہِ راست تعلق رکھتا ہو دوسرے یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آئے۔"[1]

منشی پریم چند کہتے ہیں۔

"ہم ادب کو تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو آزادی کا جذبہ ہو حسن کا جوہر ہو۔ تعمیر کی روح ہو زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے سلائے نہیں کیونکہ اور زیادہ سونا موت کی علامت ہو گی۔"[2]

اس طرح ترقی پسند ادب کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کے بعد ہم ان مصنفین کے کارناموں پر نظر ڈالیں گے جو اپنے آپ کو ترقی پسند ادیب سمجھتے ہیں اور سرسری طور پر معلوم کریں گے کہ وہ اپنے مقاصد کی کہاں تک تکمیل کر رہے ہیں۔

سجاد ظہیر کا نام سرفہرست ہے اس لیے کہ وہ انجمن کے پہلے معتمد ہیں انھوں نے

---

[1] نیا ادب مئی و جون ۱۹۴۱ء پاکٹ بک افادی ادب صفحہ ۴۰ ۔ [2] نیا ادب نیا ہے صفحہ ۷۴

اپنے دوران قیام یورپ میں فرانس کے مزدوروں کی بیداری، آسٹریا کا ناکام مزدور انقلاب اور بلغاریہ کی کیمونسٹ پارٹی کے[1] ڈمیتروف کے مقدمہ کے واقعات دیکھے اور سُنے اور مغربی مصنفین کے ساتھ ساتھ خود بھی دمیتروف کی جرأت و ہمت سے متاثر ہوئے اور اس طرح ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں شریک ہو گئے (انگارے) کی کہانیاں کے بعد (بیمار)،(ایک ایکٹ ڈرامہ) اور (لندن کی ایک رات) ایک طویل مختصر افسانہ لکھا۔ ان کے دوسرے ساتھی احمد علی ہیں جو اپنے کام میں سرگرمی کے لحاظ سے سجاد ظہیر کے بعد آتے ہیں۔ سجاد ظہیر نے ہندوستان آکر ترقی پسند ادب کا پرچار کیا اور احمد علی کے علاوہ اور بھی ادیب اور شاعر انجمن کے مقاصد کی بلندیوں پر نظر رکھتے ہوئے رکن بن گئے۔ احمد علی کی تالیف (انگارے) ترقی پسند مصنفین کا پہلا کارنامہ ہے۔ (مہاوٹوں کی ایک رات) احمد علی کا افسانہ ہے جو بہت ادیبانہ شان کا حامل ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں، اختر انصاری۔ حیات اللہ انصاری، علی سردار جعفری، عصمت چغتائی، اختر حسن رائے پوری۔ سعادت حسن منٹو۔ کرشن چندر۔ اوپندر ناتھ اشک۔ راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی، ملک راج آنند، گوپال متل، نیاض محمود، علی عباس حسینی، پیرزادہ احمد ندیم قاسمی اور احتشام حسین یہ سب اسی کشتی کے سوار ہیں اور اپنے حسب مقدور کام کیے جا رہے ہیں۔ ان میں اختر رائے پوری، اختر انصاری عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، اشک، بیدی، حسینی اور قاسمی تیز نگار ہیں۔

"عصمت چغتائی، جنسی آزادی کی حامی ہیں ان کے پلاٹ ہمیشہ یکساں ہوتے ہیں پلاٹ۔ کرداروں کی تخلیق اور زبان و بیان میں سب ترقی پسند افسانہ نگاروں سے آگے ہیں اور ان کے جملے اس قدر بے ساختہ اور برجستہ ہوتے ہیں کہ کہانی بلند ہو جاتی ہے ان کا آرٹ حد درجہ بے باک اور خوفناک حد تک حقیقت پرست ہے"[2]

---

[1] ۔

[2] ۔ اُردو جولائی ۳۴ء۔

"اشک کا معمول ہے کہ یا تو وہ ایک خالص فنی چیز لکھتے ہیں یا پھر منشی پریم چند مرحوم کی طرح کسی سماجی برائی کو مرکز بنا کر اس کے گرد اپنی کہانی کا جال بنتے ہیں اور پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اس برائی کا ایسا گہرا اثر ڈالتے ہیں جو مدتوں محو نہیں ہوتا۔"[1]

"اختر انصاری جس نقطۂ نظر سے سماج کے مناظر کو دیکھتے ہیں اسی طرح پیش کرتے ہیں تصنع نہ ان کے بیان میں ہے نہ اسلوب میں۔ رومان جس نے آج کل ادب کو گندہ کر رکھا ہے ان کے ہاں اس کا دخل نہیں۔"[2]

"بیدی کا رجحان تحلیلی ہے وہ اپنی کہانیوں میں پنجاب کی زندگی اور اس کے رسم و رواج اور ان کی اصلاح پر زور دیتے ہیں۔ بیدی زندگی کے تجربوں کو صرف نئی شکل میں نہیں بلکہ زیادہ موثر شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ سماج کی ناجائز پابندیوں سے ان کی بغاوت دھیمی آنچ کی طرح کھیل رہی ہے۔ اور جب کسی کسی جگہ شعلہ کی لپک اٹھتی ہے تو اس کی روشنی میں بہت سے محل گرتے دکھائی دیتے ہیں۔"[3]

"حسینی رنگینی پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ دیہات سے متعلق افسانوں کے موضوع میں بلا کا طنز اور اس کے اظہار میں قیامت کی صناعانہ نازک آفرینی سے کام لیا گیا ہے۔ زبان کی نرمی افسانے کو کہانیوں کی طرح پر کیف بناتی ہے۔ منٹو کا تنوع۔ مشاہدہ زبان و بیان کی لطافتیں سب میں ایک پختہ کار افسانہ نگار کی شان ہے۔ ان کے ہر افسانے میں ایک نیا موضوع ملتا ہے۔"[4]

دیگر ارکین میں بھی کم و بیش یہی صفات پائی جاتی ہیں جن کی مشق زیادہ ہوتی جا رہی ہے ان کی نظر سطحی نہیں رہی بلکہ وہ سماج کی تاریکیوں میں دیے جلا رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں کہ ان کی کوششیں بار آور ثابت ہوں۔

---

[1]۔ سالنامہ ادبی دنیا ۴۰ء۔ [2]۔ اردو ۴۱ء۔ [3]۔ نیا ادب مئی ۴۱ء۔ [4]۔ نیا ادب ستمبر ۴۱ء۔

افسانہ کی ساخت - خارجی پہلو | ساخت کے اعتبار سے افسانے کے دو پہلو ہیں ایک خارجی اور دوسرا داخلی - خارجی پہلو سے مراد افسانہ کا سرسری خاکہ جس پر افسانہ کی بنیاد کھڑی کی جاتی ہے اور داخلی پہلو سے مراد اس کا خاکہ - کردار - اسلوب - زبان - موضوع الفاظ کا استعمال اور ہر وہ خوبی جو افسانہ کو موثر اور دلچسپ بنا سکے - اس کے بنیادی عناصر آغاز افسانہ - مقصد کی یک نظری یا افسانہ نگار کا نقطۂ خیال کشمکش - منتہا اور خاتمہ ہیں -

افسانہ کی ابتدا اور انتہا | افسانہ کی ابتدا جتنی اچھی ہوگی پڑھنے کے لیے لوگ اسی قدر راغب ہوں گے اور پہلی سطر سے دوسری سطر کی طرف رغبت ہوگی - طول طویل تمہید یا موقع و محل کے مناظر اب افسانہ کی ابتدا کے لیے سم قاتل کا حکم رکھتے ہیں - دوسری بات یہ ہے کہ افسانہ نگار ابتدا کے بعد اپنا مقصد واضح کر دے کہ وہ اپنے کرداروں سے کیا کام لینا چاہتا ہے - تیسری چیز کرداروں کے خیالات کا تحفظ اور پھر اس کی انتہا جہاں پڑھنے والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ اختتام کس طرح ہوگا اس کے بعد خاتمہ بھی اسی طرح اچانک ہوگا - اس لیے کہ جب قاری نے تصفیہ کر لیا ہے کہ آگے یہ انجام ہونے والا ہے تو اس کو زیادہ انتظار میں رکھنا افسانہ کی خامی ہے اور ہوگا - بعض اچھے افسانہ نگار اپنے افسانے اس طرح ختم کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس شبہ میں رہتا ہے کہ ابھی افسانہ اور باقی ہے حالانکہ وہ اپنا مقصد اور نقطۂ نظر اپنے کرداروں کے ذریعہ ظاہر کر چکتے ہیں - یہ بھی ضروری ہے کہ بڑھتی ہوئی دلچسپی کے ساتھ باہمی ربط قایم رہے ورنہ جہاں سے لغزش ہوگی وہاں افسانہ خوان کی دلچسپی ختم ہو جائے گی -

داخلی پہلو | داخلی حیثیت سے پلاٹ کا بہتر ہونا ضروری ہے اور اس کے لیے اکتساب سے زیادہ قابلیت کی ضرورت ہے جس کا مطالعہ وسیع اور جس کی نظر گہری ہوگی وہ آسانی سے پلاٹ بنا سکتا ہے - لیکن اس کو حسب موقع پھیلانا اور سنوارنا بھی ضروری ہے اور اس کے لیے خاص سلیقہ کی ضرورت ہے دوسرا جز کردار نگاری ہے - یہ کہدیا جاتا ہے کہ

کرداروں کو جیتی جاگتی تصویریں ہونا چاہئے انسانی کردار کی صحیح نقلیں ہی جیتی جاگتی تصویریں ہوسکتی ہیں۔ صاحب کمال کردار نویس وہی مصنف سمجھا جاتا ہے۔ نقل کو اصل کر دکھائے۔ واقعات کردار کو ابھارتے ہیں یہ قانون فطرت ہے[1]"

انسان کی نفسیاتی قسموں کی کردارکشی کرنے والے مصنف زیادہ کامیاب ہوتے ہیں کرداروں کا اعلیٰ خصوصیات کا حامل ہونا نہایت ضروری ہے پڑھنے والا کرداروں کے ساتھ ساتھ چلتا ہے بشرطیکہ کرداروں میں لے چلنے کی قوت ہو۔ اگران کی قوت زائل ہو جائے تو افسانہ شتر بے مہار بن جائے گا۔ افسانے کا ارتقا بھی تدریجی ہونا ضروری ہے۔ اس کی زبان میں حلاوت اور شیرینی ہونی چاہئے اسلوب بیان بھی افسانے میں خاص اہمیت رکھتا ہے اگر خداداد ملکہ ہو تو پھر افسانہ نگار کے وارے نیارے ہیں اور نہ ہو تو اکتساب سے کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔" تمثیلی رنگ یعنے ڈرامائی انداز بھی خاص اہمیت رکھتا ہے[2] لیکن لطیف الدین احمد اکبرآبادی اس کو غیر اہم سمجھتے ہیں[3] ممکن ہے وہ اس سے گفتگو اور بحث و تمحیص مراد لیتے ہوں لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ قاری افسانہ پڑھتا ہے لیکن طرز تحریر اس کو ایسے مناظر بتاتی ہے جس کو وہ حقیقت سمجھتا ہے۔ عبارت پڑھ کر وہ ہنستا بھی ہے اور عبارت ہی پڑھ کر وہ اپنے رخساروں پر گنگا جمنا بہتے دیکھتا ہے یہی افسانہ نگار کی سحر کاری ہوتی ہے

کم سے کم الفاظ کا استعمال بشرطیکہ مفہوم میں الجھن نہ ہو زور بیان اور طرز ادا میں زبان کی گھلاوٹ اور روانی الفاظ کا انتخاب اور فقروں کا در و بست افسانے کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ افسانہ نگار اپنے افسانے کو خواہ مختصر لکھے یا طویل اس کی طرز ادا اور زبان اس کی کامیابی اور ناکامی کی ذمہ دار رہتی ہیں۔ اسی سے کشش

---

[1] - سالنامہ ساقی ۳۸ء - ل احمد - [2] - دنیائے افسانہ - [3] - سالنامہ ساقی ۳۸ء

قایم رہتی ہے۔ حقیقت نگاری اور مکالمہ بھی جزو لازم ہیں۔ اگر افسانہ نگار حقیقت سے دور ہو جائے تو پھر وہ مافوق الفطرت اشیاء کا ذکر کرے گا جس کا زمانہ گذر چکا۔ مکالمہ سے تحریر میں کمی ہو جاتی ہے اور کردار کو سمجھنے میں بہت زیادہ سہولت ہوتی ہے۔ بہر حال افسانہ نویس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک کامیاب مقرر کی طرح پہلے ہی فقرے سے قاری کی توجہ کو اپنی گرفت میں لے لے اور پھر جوں جوں افسانے کو بڑھائے اپنے ناظر کی دلچسپی میں اضافہ کرتا جائے حتیٰ کہ کلائمکس پر پہنچ کر اس طرح افسانے کو ختم کردے کہ جو اثر وہ قاری پر ڈالنا چاہتا ہے وہ تمام تر شدت کے ساتھ اس پر مسلط ہو جائے۔

چوتھا باب۔ پریم چند کے موضوع

مقصد افسانہ نگاری | پریم چند نے تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور جس موضوع پر انھوں نے لکھا اس کو معراج کمال تک پہنچا دیا ان کے افسانوں سے اگر ان کے خیال یا موضوع کو الگ کر لیا جائے تو سارے افسانے بالکل بے رنگ اور تلخ ہو جائیں۔ ان کی افسانہ نگاری کا مقصد ہی یہ تھا کہ اپنی معاشرت اور تمدن کے نقائص کو پیش کیا جائے اور ان کی ممکنہ اصلاح کی جائے۔ ان کے اس جذبہ خدمت نے ان کے قلم سے ایسی ایسی چیزیں لکھوائیں جو اردو ادب کی زندگی تک ہمیشہ بہ نظر استحسان دیکھی جائنگی۔

ان کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد ہمارے ذہن میں مختلف خیالات گھومتے ہیں کبھی ہم انھیں راجپوتوں کے دربار کا نیم تاریخی داستان گو سمجھتے ہیں اور کبھی دیہاتیوں کا دردمند، کبھی مصور فطرت اور کبھی رفارمر، کبھی ہم انھیں ہندوستان کے رسم و رواج کو قید و بند سے آزاد کرانے والا رہنما پاتے ہیں اور کبھی بازار حسن کا گرگ باراں دیدہ سمجھنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ غرض وہ ہر رنگ کی تصویر کھینچتے ہیں جو اتنی دلکش ہوتی ہے کہ ہماری نظریں ہٹائے نہیں ہٹتیں یہی مصور کی کامیابی کا راز ہے۔ تصویر پر کسی نے گہری نظر ڈالی تو مصور کی محنت ٹھکانے لگ گئی پریم چند کی تصویریں بھی دلکش اور نظر افروز ہیں وہ اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے۔

ازدواج بچگان | ان کے مختلف موضوعات کو جن کا تعلق سماج اور معاشرت سے ہے ہم مقامی رنگ سے تعبیر کریں گے۔ کوئی ناول اور کوئی افسانہ اس سے خالی نہیں نظر آتا۔ رسم و رواج کی بندشیں انھیں طائر قفس بنا دیتی ہیں۔ اور وہ سی کیفیت سے متاثر ہو کر

جو مطلب نہیں
اپنا پہلا ناول (ہم خرما وہم ثواب) لکھتے ہیں ۔ دھنک دھاری لال کی تقریر کا یہ حصہ ان کے ناول کی بنیاد ہے ۔

"حضرات سب خرابیوں کی جڑ ہماری لاپروائی ہے ۔ ہماری حالت بالکل نیم جان مریض کی سی ہے جو دوا کو ہاتھ میں لئے کر دیکھتا ہے مگر منہ تک نہیں لے جاتا ۔ ہاں صاحبو ہم آنکھیں رکھتے ہیں مگر اندھے ہیں ہم کان رکھتے ہیں مگر بہرے ہیں ہم زبان رکھتے ہیں مگر گونگے ہیں ۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ ہم کو اپنی معاشرت کے نقائص نظر نہ آتے ہوں ۔ ہم تمام اچھی باتوں کو جانتے ہیں اور مانتے ہیں ۔ ــــــ مگر جس طرح مسائل اخلاق پر ایمان رکھ کر بھی گمراہ ہوتے ہیں خدا کے وجود کے قائل ہو کر بھی منکر بنتے ہیں اسی طرح اصلاح تمدن سے اتفاق رکھتے ہیں مگر ان پر عمل نہیں کرتے"[1]

امرت رائے ناول کے ہیرو مغربی تعلیم یافتہ ہیں اور اپنے قدیم رسم و رواج کے بندھنوں کو توڑنے کا عزم کرتے ہیں بِدھوا آشرم کی بنا ڈالتے ہیں اس کو کامیابی سے چلا کر اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں ۔ اس ناول میں پریم چند نے ازدواج بیوگان پر بہت زور دیا ہے اور بیوہ کے تکالیف کا دلنشیں انداز میں خاکہ کھینچا ہے ۔ مثلاً وہ رام کلی کے متعلق اس کے نوعمری میں بیوہ ہونے ، شباب کی تمناؤں کو پامال ہونے اور جذبات کی طوفانی دھارا سے ضبط نفس کا بند ٹوٹنے کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں ۔

"اس کا نام رام کلی تھا بیچاری دو برس سے رنڈاپا بھوگ رہی تھی اس کا سن بھی مشکل سے سولہ سترہ برس کا ہوگا چہرہ مہرہ بھی پرانہ تھا خط و خال نہایت دلفریب ۔ اگر پورنا (ایک لحاظ سے ہم خرما و ہم ثواب کی ہیروئن) آم کی طرح زرد تھی تو اس کا چہرہ جوش جوانی سے گلابی ہو رہا تھا ۔ بال میں تیل نہ تھا آنکھوں میں کاجل ۔ نہ مانگ میں سیندور نہ دانتوں میں مسی تاہم اس کی آنکھوں میں وہ شوخی تھی ۔ چال میں وہ لچک اور ہونٹوں پر وہ تبسم جس سے ان بناوٹی آرائشوں کی ضرورت باقی نہ تھی وہ مٹکتی ادھر ادھر تاکتی مسکراتی چلی جارہی تھی ۔ ... راستہ میں ہزاروں آدمی ملے سب کی نظریں ان دونوں عورتوں (رام کلی اور پورنا) کی طرف پڑتی تھیں ۔ فقرے چست کیے جاتے تھے مگر پورنا سر کو اوپر اٹھاتی ہی نہ تھی ہاں رام کلی البتہ مسکرا مسکرا کر معشوقانہ انداز سے ادھر ادھر دیکھتی تھی ایک آدھ برجستہ جواب بھی دیتی" (باقی)

---

[1] ہم خرما و ہم ثواب صفحہ ۳ ۔

اکبر الہ آبادی ہندی میں[1]

کچھ عرصہ ہوا، اُردو کے ایک جلسے میں میں نے ایک مختصر سی تقریر میں اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہندی ادب کی دنیا میں اکبر الہ آبادی کا کلام بہت مقبول ہوا ہے۔ تب سے چند اصحاب کی یہ فرمایش رہی ہے کہ میں اس کے متعلق کچھ اور واقعات تفصیلی طور پر عرض کروں۔ اب جبکہ اس اُردو کانفرنس کو منانے کا تصفیہ کیا گیا، مجھ سے پھر یہی فرمایش کی گئی۔ وقت اتنا کم دیا گیا کہ جو باتیں آسانی سے خیال میں آگئیں انھیں میں نے قلمبند کردیا ہے۔

آج سے بیس بائیس سال پہلے کی بات ہے، ہندی ادب میں مرحوم پنڈت پدم سنگھ شرما کا بہت بول بالا تھا۔ انھیں بہاری لعل کی ست سئی کی تنقیدی شرح پر الہ آباد کے کل ہند ہندی۔ ساہتیہ سمیلن (انجمن ہندی ادب) نے بارہ سو روپیہ کا "منگلا پرساد" انعام دیا تھا۔ صاحب موصوف سنسکرت اور ہندی ادب کے ایک مسلم اُستاد تھے۔ وہ نہ صرف سنسکرت اور ہندی بلکہ اُردو اور فارسی کے بھی عالم تھے۔ ایک ہندی دو ہے اور اردو شعر کے متعلق انہوں نے مولانا حالی سے خط و کتابت کی تھی جو شایع ہوچکی ہے۔ ہندی اردو اور سنسکرت کے کسی اُستاد شاعر کا شاید ہی کوئی بیت الغزل یا ضرب المثل والا شعر ہو جو اُن کی زبان پر نہ تھا۔ جس مجلس میں بیٹھ جاتے صرف شعر و شاعری ہی کے

---

[1] یہ مضمون اُردو کانفرنس زیر صدارت عالیجناب نواب سر مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات بتاریخ ۲ فروری ۱۹۴۴ء بمقام جامعہ عثمانیہ پڑھا گیا۔

چرچے رہتے تھے۔ شاعر اپنا کلام سنا کر خوش ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کا کلام سناتے ہوئے تھکتے نہ تھے۔ اُن کی پُرلطف نثر اسی سنسکرت ہندی اردو کے استادانہ شاعری کی چاشنی میں پکی ہوئی ہے جو ہندی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ پنڈت پدم سنگھ شرما اکبر کی شاعری کے بڑے مداح تھے۔ شاید اکبر بھی اپنے کلام کو اتنے شوق سے پڑھ کر سناتے ہوں گے جیسے کہ پنڈت پدم سنگھ شرما سناتے تھے اور جب وہ کسی سلسلہ میں اکبر کا شعر پڑھتے تھے ساری مجلس میں نہ صرف واہ واہ ہو اٹھتی تھی بلکہ ان سے وہ شعر کئی مرتبہ پڑھوایا جاتا تھا۔ اکبر کا سارا کلام انھیں یاد تھا۔ جب الہ آباد جاتے اکبر سے ضرور ملاقات کرتے وہ کہتے تھے کہ اکبر انھیں اپنے ایک خاص کمرے میں بٹھا کر اپنی نئی نظمیں سنایا کرتے تھے۔ وہ ان باتوں کا ذکر بڑے شوق سے کیا کرتے تھے۔

پنڈت پدم سنگھ شرما اور کچھ دوسرے ہندی ادیبوں کی بدولت اکبر کے کلام کا چرچا ہندی ادب کی دنیا میں ہونے لگا۔ ہندی رسم الخط میں ان کے اشعار کا مجموعہ میرٹھ۔ دہلی اور الہ آباد سے شائع کیا گیا۔ ہر اخبار میں ان کا چرچا تھا۔ اکبر کے اسلوبِ بیان کی تقلید کی بھی کوششیں ہوئیں۔ نثر میں بھی ہنسی مذاق کے مضامین لکھنے ایک مستقل جگہ کی تلاش میں خاص اخبار شائع ہونے لگے جن میں سماجی سیاسی اور طرح طرح کے پیچیدہ سوالات کو مذاقیانہ طرز میں پیش اور حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان دنوں کلکتہ سے ایک ہفتہ وار رسالہ نکلتا تھا جس کا نام 'متوالا' تھا اس میں متوالا نام کے نیچے اکبر کا یہ شعر جلی حروف میں لکھا رہتا تھا ؂

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہے تو اخبار نکالو

اسی طرح مختلف اخباروں میں ان کے مختلف اشعار شائع کیے جاتے تھے سیاسی معاملوں میں تو اُن کے اشعار سند کے طور پر پیش کیے جاتے تھے۔ اس اخبار کی جلدیں اس وقت

میرے پاس نہیں ہیں اگر ہوتیں، تو میں پوری تفصیل کے ساتھ ان میں شایع کیے ہوئے اکبر کے کلام کا تذکرہ کر سکتا۔ جو اشعار ان میں بہت پسند کیے گئے تھے ان میں سے چند نیچے دیے جاتے ہیں۔ ساہتیہ چاریہ پنڈت شالگرام شاستری جی نے جو سنسکرت ادب کے بہت بڑے عالم اور استاد تھے اکبر کے اس شعر کی بڑی داد دیتے تھے۔

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج ہوتا ہے لیڈر کو مگر آرام کے ساتھ

یہ پھبتی "لیڈر" کے اڈیٹر سی۔ وائی۔ چنتامنی پر کسی گئی تھی۔ ہندی اور اردو کی بحث کے متعلق ان کی یہ رباعی بہت مشہور ہو گئی تھی۔

ہم اُردو کو عربی کیوں نہ کریں ؛ وہ ہندی کو بھاشا کیوں نہ کریں
بحثوں کے لیے اخباروں میں ؛ مضمون تراشا کیوں نہ کریں
آپس میں عداوت کچھ بھی نہیں ؛ مگر ایک اکھاڑا قایم ہے
جب اس سے فلک کا دل بہلے ؛ ہم لوگ تماشہ کیوں نہ کریں

ان کا یہ شعر بھی بہت پسند کیا جاتا تھا۔

چال میں تلوار ہے دل کی گھڑی ؛ توپ سے اس کو ملانا چاہیئے

ان کا یہ شعر میں نے کئی جلسوں میں پڑھتے ہوے سنا۔ دیکھئے کتنا چبھتا ہوا شعر ہے

قدر والوں کی طبیعت کا عجب رنگ ہے آج
بلبلوں کو ہے یہ حسرت کہ وہ الّو نہ ہنے

اسی طرح اور بہت سے اشعار تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اُردو کے مصنفین اکبر کے کلام کا اس جوش و خروش سے حوالہ دیتے تھے یا نہیں۔ لیکن ہندی میں اکبر کے کلام کی بڑی دھوم تھی۔

بات یہ تھی کہ اکبر نے جو لکھا تھا وہ روزمرہ زندگی کی چیز تھی جس کو سمجھنا مشکل نہ تھا

اور جو سمجھتے ہی دل میں اتر جاتی تھی۔ حالات کے بدل جانے سے زمانہ جس طرف کھنچا جا رہا تھا اور جو کچھ لوگوں کے دلوں پر بیت رہی تھی اکبر کی شاعری اسی کا ایک گہرا مطالعہ تھا۔

اکثر شاعر لوگ دُور کی کوڑی لاتے ہیں۔ زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ نقلی چیزوں پر نقلی رنگ چڑھاتے ہیں یا ان کی چیزوں کو روزمرہ کے حالات کو اپنی شاعری کی حد سے باہر سمجھتے ہیں انھیں ان سیدھی سادی چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں معلوم ہوتی برعکس اس کے اکبر روزمرہ کی زندگی کے حالات اور واقعات کو ایسی کہانی سے محسوس کرتے تھے اور ان کی تہ تک اس طرح پہنچ جاتے تھے کہ ان کا راز ان سے چھپا نہ رہتا تھا۔ اکبر کی شاعری روزمرہ کی معمولی زندگی کے ہمیشہ پیش آنے والے پہلوؤں کی ایک باریک چھان بین ہے۔

ہنسنا جتنا آسان ہے ہنسانا اتنا ہی مشکل ہے۔ پھر عام طور پر ہنسی بے معنی اور عامیانہ ہوتی ہے جسے ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ ایسا مذاق جو پُر لطف، میٹھا، گدگدا اور بامعنی ہو جس سے بے ساختہ ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑے اور جسے ٹھکرایا نہ جاسکے آسانی سے میسر نہیں ہوتا۔ اتنا ہی نہیں کبھی مرتبہ ہنسی رونے کی ہی ایک دوسری صورت ہوتی ہے جب رونا ختم ہو جاتا ہے آنسو سوکھ جاتے ہیں تب بے بسی اپنے آپ کو ہنسی کی شکل میں نمایاں کرتی ہے۔

اکبر نے اپنی شاعری سے جہاں لوگوں کے دلوں کو گدگدا دیا ہنسا دیا وہاں اس نے ایک ٹیس بھی پیدا کی وہ ہنسی کئی جگہ صرف ہلکے مذاق کی شکل میں ہے۔ ایسے اشعار میں کہیں الفاظ کی دلچسپ بندش ہے کہیں ہلکا سا چلبلا پن ہے۔ لیکن ہر جگہ اس مذاق کے پیچھے کوئی نہ کوئی ایک سا خیال ہے۔ ہنسی ختم ہو جاتی ہے لیکن یہ خیال ختم نہیں ہوتا۔ بعض جگہ جہاں مذاق کا رنگ گہرا ہے۔ وہاں ہنسی تو ہے لیکن وہ ہنسی دل میں چبھنے والی اُس بے بسی کو نمایاں کرتی ہے جس کی کسک اور تڑپ کو آنسو کسی طرح نہیں جھلکا سکتے یہ مذاق، یہ ہنسی، اُس بجلی کی چمک جیسی ہے جو پانی سے بھرے کالے بادلوں

کی طرف اشارہ کر کے خود پھر وہیں بادلوں میں چھپ جاتی ہے۔

اکبر کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہمیں یورپین تمدن کا ہندوستان کے سماجی۔ معاشی سیاسی اور اخلاقی حالات پر جو اثر پڑ رہا ہے اور اس سے جو پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں ان کو ایک اچھوتے مذاقانہ رنگ میں پیش کیا گیا ہے اور چونکہ اس میں گہری سچائی ہے اس لیے دل اس سے فوراً متاثر ہو جاتا ہے۔ آج کل سماجی، سیاسی، اور ہر قسم کے معاملات کو ہنسی بھرے دلچسپ کارٹونوں میں پیش کرنیکی کوشش کی جاتی ہے ان کارٹونوں کا مقصد صرف ہنسی تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ اس طرح سوال کی پیچیدگیوں کو اوران کے اثرات کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ مین نے کئی مہذب حضرات کے پاس کاٹے ہوئے کارٹونوں کی نابلیں دیکھی ہیں۔ جو ان کا وقتاً فوقتاً مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ دلی سے نکلنے والے "ہندوستان ٹائمز" میں شنکر کے کارٹونوں کو بہت پسند کیا جاتا ہے کہتے ہیں کہ لارڈ ولنگڈن ان کو اتنا پسند کرتے تھے کہ جب صبح چائے کی ٹیبل پر آتے تھے تب ہنستے ہوئے دریافت فرماتے تھے ؟ "What Shankar Has to say to-day About us"

اکبر نے اپنی شاعری میں شاعری کے ذریعے ان مسائل کو بعض جگہ لفظی کارٹونوں میں پیش کرنے کے آرٹ کو پیدا کر کے اردو زبان میں ایک نئی جدت اور حسن پیدا کر دیا ہے۔ مین نہیں سمجھتا کہ ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں کسی شاعر نے اس طرح کے آرٹ کو اس خوبی، نزاکت، گہرائی اور کامیابی کے ساتھ مروج کیا ہے مجھے پورا یقین ہے کہ اگر اکبر کے کلام کا ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا جا سکتا تو ان میں بھی وہ ایسا ہی مقبول ہوتا جیسا کہ وہ ہندی جاننے والوں میں ہوا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کا ترجمہ کرنا قریب قریب ناممکن ہے اور ہر سچی شاعری کی تقریباً یہی حالت ہوتی ہے۔ اس کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔

بہت سے نقاد اکبر کو ایک تنگ نظر شاعر کہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اکبر

دقیانوسی خیالات کا آدمی تھا، وہ سائنس کے خلاف تھا، وہ کسی قسم کی ترقی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا خیال کرنا اکبر کے ساتھ ناانصافی کرنا ہے۔ یورپی تمدن کا ہندوستان کے عوام پر کیا اثر پڑا ہے اس نے اپنی شاعری میں اسی پہلو کو نقش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر یورپین تہذیب کسی دوسری شکل میں ہندوستان میں آئی ہوتی تو ہو سکتا ہے کہ اس کے اثرات کچھ اور ہی ہوتے پھر اکبر نے پرانی دقیانوسی چیزوں پر بھی گہری چٹکیاں لی ہیں۔ انہیں اس نے ویسے ہی نہیں چھوڑ دیا ہے مثال کے طور پر آپ کو معلوم ہی ہے کہ مشرقی شاعر معشوق کی کمر اتنی پتلی بتاتے ہیں کہ وہ دیکھی ہی نہیں جا سکتی۔ اکبر نے اس پر کیا میٹھی چٹکی لی ہے:۔

یورپ نے خوردبیں سے کمر اُن کی دیکھ لی
مشرق کی شاعری کا مزہ کرکرا ہوا

اسی طرح ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

میرا ٹٹو زیادہ مشرقی ہے شیخ صاحب سے
کہ وہ موٹر پہ چڑھتے ہیں یہ موٹر سے بھڑکتا ہے

اسی طرح اور بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

بات یہ ہے کہ اکبر ان حضرات میں سے تھے جو اپنے زمانے کی، اپنے تمدن کی اپنے اخلاق کی خوبیوں کو سمجھتے تھے۔ جنہیں باہر کی ٹیپ ٹاپ ترک بھڑک اور جگمگاہٹ سے چکاچوندھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ چیز کی حد تک پہنچنے والے لوگوں میں تھے۔ ایسے زمانے میں جبکہ یہ کہا جا رہا تھا کہ یہ بیسویں صدی ہے زمانہ روشنی کا ہے ترقی کر رہا ہے۔ اکبر جیسا شاعر ہی کہہ سکتا تھا:۔

جس روشنی میں لوٹ ہی کی آپ کو سوجھے
تہذیب کی تو میں اس کو تجلی نہ کہوں گا

لاکھوں کو مٹا کر جو ہزاروں کو ابھارے
اس کو تو میں دنیا کی ترقی نہ کہوں گا

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

جان ہی لینے کی حکمت میں ترقی دیکھی
موت کا روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

ہم کونئی روش کے حلقے جکڑ رہے ہیں
باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں

تہذیب اور انسانی ترقی کو وہ ایک ہی چیز سمجھتے تھے اور جب زمانے نے ملک کی یہ تباہ اور پست حالت کردی تو وہ اس کی کیسے تعریف کر سکتے تھے۔ یورپ کی تقلید کے لیے بھی انہوں نے لکھا ہے۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں:۔

عزم کر تقلید یورپ کا ہنر کے زور سے
لعنت کیا گر لد گئے موٹر پہ زر کے زور سے

اب میں کچھ مختلف مضامین پر ان کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جو ہندی کی دنیا میں بڑے شوق سے پڑھے اور سنے جاتے ہیں۔ گریجویٹ ہونے کے متعلق آپ فرماتے ہیں:۔

کمال نہیں گریٹ ہونا اچھا ؛ دل ہونا برا ہے پیٹ ہونا اچھا
پنڈت ہو مولوی ہو دونوں بیکار ؛ انسان کو گریجویٹ ہونا اچھا

امتحان میں پاس ہونے اور نوکریوں کے متعلق آپ فرماتے ہیں:۔

کالج میں دھوم مچ رہی ہے پاس پاس کی
عہدوں سے آرہی ہے صدا دور دور کی

دیکھئے پاس اور دور لفظوں میں کیا لطف پیدا کیا ہے فرماتے ہیں :۔

یہ سب منصوبے ترقی کے ہوئے سب پائمال ⁂ بیج مغرب نے جو بویا وہ اُگا اور پھل گیا

ڈاسن نے ایک جوتا بنایا میں نے اک مضمون لکھا ⁂ میرا مضمون رہ گیا یاروں میں جوتا چل گیا

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ لارڈ کرزن نے ہندوستانیوں کو جھوٹا کہدیا آپ اسے برداشت نہ کر سکے۔ آپ نے اس کے جواب میں ایک نظم لکھی جس کا یہ مصرع بہت مشہور ہے ؎

"جھوٹے ہیں ہم تو آپ ہیں جھوٹوں کے بادشاہ"

لارڈ کچنر اور لارڈ کرزن کے جھگڑے کے بارے میں آپ فرماتے ہیں :۔

کرزن و کچنر کی حالت پر جو کل ⁂ وہ صنم تشریح کا طالب ہوا

کہدیا میں نے کہ یہ ہے صاف بات ⁂ دیکھ لو تم زن پہ نر غالب ہوا

فرماتے ہیں :۔

مٹاتے ہیں جو یہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں
مجھے حیرت تو ان پر ہے جو اس مٹنے پہ مرتے ہیں

مٹنے پر مرنا کیا بات کہی ہے۔ لڑکوں کی تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں :۔

تعلیم ہے لڑکوں کی اک دام بلا سب
اے کاش کہ اس عہد میں ہم باپ نہ ہوتے

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :۔

ولولے اٹھتے ہیں دل میں دیکھکر ان کا جمال
حوصلے ہوتے ہیں پست ان کی نظر کو دیکھکر

یورپ کی اندھی تقلید کے متعلق آپ فرماتے ہیں :۔

رنگ چہرہ پہ اہل یورپ کا تو آ کہ ہے محال ⁂ مفت اپنے آپ کو تم نے تماشہ کر دیا

بھاپ اور بجلی کے بارے میں فرماتے ہیں :-

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائیگی اک دن اور اڑ جائیگی بھاپ
دیکھنا اکبر بچائے رکھنا اپنے آپ کو

ہندو مسلمانوں کے متعلق ان کی ایک رباعی اور دو اشعار عرض کرکے میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں :-

چغلیاں اک دوسرے کی وقت پر جڑتے بھی ہیں ❊ ناگہاں غصہ جو آجاتا ہے لڑ پڑتے بھی ہیں
ہندو اور مسلم ہیں پھر بھی ایک اور کہنے میں سچ ❊ ہیں نظر آپس کی ہم ملتے بھی لڑتے بھی ہیں

کہتا ہوں میں ہندو مسلماں سے یہی
اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

ونشی دھر

❊

زمانۂ قدیم کے کتب خانے

ہر قوم کا سب سے قیمتی ذخیرہ اُس کا کتب خانہ ہوتا ہے اس لیے کہ اس میں اس کی تاریخ وتمدن سے متعلق تمام واقعات، اس کا ادب، اس کے ذہنی اور دماغی کاوشوں کے سب شاہکار مختلف صورتوں میں یکجا محفوظ کیے جاتے ہیں۔ موجودہ طرز تحریر اور کاغذ کے ایجاد سے پہلے انسانی خیالات کو مختلف نقوش، نشانات اور تصویروں کی شکل میں پتھروں، دھاتوں، ہڈیوں، اینٹوں، لکڑی کے تختیوں، چمڑوں اور تاڑ کے پتوں وغیرہ پر نقش کرکے محفوظ کیا جاتا تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ جس چیز کو سب سے پہلے اس طرح محفوظ کیا گیا ہوگا وہ مذہبی یا اہم سیاسی نوعیت کی ہوگی اور اسلیے ایسے دستاویزات کو سب سے پہلے کسی مقدس یا ایسے ہی اہم مقام پر جمع کیا گیا ہوگا۔ اس لیے اکثر محققین کا خیال ہے کہ دنیا کے اول ترین کتب خانے معبد اور پرستش گاہیں ہوں گی اور ان کے کتب خانہ دار پجاری یا راہب ہوں گے۔ چونکہ زمانۂ قدیم میں لکھنا پڑھنا زیادہ تر راہبوں اور پجاریوں ہی تک محدود تھا اس لیے یہی کتب خانوں کے قیام اور ترقی کا باعث ہوئے۔ نظموں اور گیتوں سے ادب کی ابتدا ہوئی۔ ان کو تحریر میں محفوظ کرنے سے پہلے سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچایا گیا۔ اس قسم کے سب سے پہلے مجموعے جس کا ہم کو علم ہے وہ ایکا بٹانا میں میڈیوں کے قدیم اور مشہور مجموعے، شوسا میں ایرانیوں کے قدیم ذخائر اور ناساز میں مصریوں کے تصویری تحریر کے ذخائر ہیں۔ موجودہ مفہوم میں کتب خانہ اُس وقت تک وجود میں نہیں آیا جب تک کہ دنیا نے سائنس اور فنون وغیرہ میں ترقی نہیں کی۔

تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ بابل اور اشوریا میں سب سے پہلے کتب خانوں کا وجود تھا ۔ نینوا کے شاہی محل کی کھدائی میں (۱۸۵۰ء) سر ہنری لییارڈ کو بعض ایسے کمرے ملے جن کے فرش ایک فٹ کی گہرائی تک مٹی کی تختیوں سے جن پر نقوش کندہ تھے بھرے پڑے تھے ۔ یہ شاہ اسوربانی پال کا کتب خانہ تھا جو اشوریوں میں بہت بڑا علم پرور بادشاہ گذرا ہے ۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس میں کوئی دس ہزار مختلف نوعیت کی تصنیفات تھیں جن میں سے بعض کو کئی تختیوں میں مکمل کیا گیا تھا ۔ اس کتب خانہ کو منظم حالت میں رکھا گیا تھا اور ان کی فہرست بھی تیار کی گئی تھی ۔ اور اس بات کا بھی ثبوت موجود ہے کہ بادشاہ نے اپنی رعایا کو اس کے استعمال کی اجازت دے رکھی تھی ۔ اس کتب خانہ کا بہت سا حصہ اب برٹش میوزیم میں منتقل کیا گیا ہے ۔ مگر اندازہ کیا گیا ہے کہ ابھی اس کی بیس ہزار تختیاں اور ان کے بہت سے ٹکڑے جمع کرنے ہیں ۔

مصر میں چھ ہزار سال قبل ہی سرکاری منشی اپنے بادشاہوں کے حالات زندگی اور اہم واقعات تحریر کیا کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ اخلاق، فلسفہ، طب اور دوسرے فنون پر نسخہ جات تحریر اور محفوظ کی گئیں ۔ یہاں ناول اور مذاقیہ ادب بھی پایا جاتا ہے ۔ بابل کی طرح ہیلی پولیس بھی ایک علمی مرکز بن گیا تھا اور ہر عبادت خانے کے ساتھ مقدس اور حکمت کی کتابوں کو لکھ کر محفوظ کرنے کے لیے نقل کرنے والوں کی ایک جماعت ہوتی تھی ۔

مصر کا سب سے مشہور کتب خانہ شاہ اوزی ماندس کا تھا ۔ یہ ثابت ہوا ہے کہ شاہ رامیسیس دوم کا دوسرا نام اوزی ماندس تھا جو تقریباً بارہ سو سال قبل مسیح حکومت کرتا تھا اس کتب خانے کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ مغربی تھیبی میں رامی سیم میں تھا اور یم ۔ بانت نامی ایک شخص تھا جو تھیبی کے کتب خانوں کے ناظموں میں سے ایک تھا ۔ تھیبی کے ایک کمرے میں بعض تصاویر ہیں جن میں کتابوں کے

نقل کرنے والوں کو اپنے کام میں مشغول بتایا گیا ہے۔ خزانہ جات اور ذخیرہ اجناس کے ساتھ ذخیرہ کتب کے بھی شاہی کمرے ہوتے تھے اور ہمیں ایک ایسے مدرسہ اور کالج کا بھی علم ہوا ہے جس کا کام کتابوں کو نقل کرکے ان کی تعداد میں اضافہ کرنا تھا اور ان کو صندوقوں ۱
یا بڑے بڑے مرتبانوں میں محفوظ رکھا جاتا تھا۔ شہر ممفیس میں بھی ایک بڑا کتب خانہ تھا۔ مصری ادب کو ایرانی حملوں سے بہت نقصان پہنچا اور بہت سے کتابیں حملہ آور ساتھ لے گئے۔ اس کے بعد یونانی اور رومی حملوں کے باعث اس پر غیر قومی اثر غالب رہا۔ ۲

یونانیوں میں سب سے پہلا شخص پی سسکراٹس تھا جس نے بڑی تعداد میں کتابیں جمع کیں۔ افلاطون کو بھی کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا اور اگر اسطرابو کے بیان پر یقین کیا جائے تو سب سے پہلے باضابطہ کتب خانہ ارسطو کا تھا جو اس نے مرتے وقت ایک وصیت کے ذریعہ اپنے ایک شاگرد کے لیے چھوڑا تھا۔ کہا جاتا ہے ارسطو نے کتابیں جمع کرنے کا شوق شاہان مصر کو منتقل کیا تھا۔ اور یہ بات یقینی ہے کہ اسکندریہ کے کتب خانے قدیم زمانے کے کتب خانوں میں سب سے زیادہ اہم ہیں۔ طالیمیوں کے روشن زمانے میں علماء اور حکماء کی ایک جماعت اُن کے دار السلطنت میں بستی تھی۔ طالیمی فلادلفس نے یونان اور ایشیا میں اپنے کارندوں کو قیمتی کتب جمع کرنے کے لیے بھیجا اور ذخیرہ کتب کے اضافہ میں اخراجات کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کے جانشین یوراجٹس نے اُن تمام کتابوں کو جو غیر ممالک کے لوگ ساتھ لاتے تھے کتب خانے کے لیے ضبط کر لینے کا حکم دے رکھا تھا۔ البتہ اُن کے مالکوں کو اُن کے نقل کر لینے کی اجازت تھی۔

اسکندریہ کے علماء یونانی علماء کی طرح علیحدگی پسند نہ تھے اور نہ انھوں نے تنگ نظرانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ مصری اور عبرانی ادب کے خزانے اُن ہی کے ذریعہ یونانی میں ترجمہ کیے گئے۔ اسکندریہ میں دو کتب خانے تھے اور ان میں کتابوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ آلس گیلیس نے ان کی تعداد سات لاکھ بتائی ہے اور سینکا نے چار لاکھ کو موجود

کتابوں کے مقابلہ میں یہہ کتابیں چھوٹی ہوتی تھیں۔ ہومر کی الیاڈ چوبیس جلدوں یا کتابوں میں تھی۔

کتابیات کے پہلے تجربے اسکندریہ کے کتب خانوں کی فہرستوں کے تیار کرنے میں کیے گئے۔ کیالیمیکس ان کتب خانوں کا ایک مشہور مہتمم تھا۔ طالیمی فیلیڈلیفس کے حکم سے جو اس نے فہرست تیار کی تھی اُس میں اُس نے کتابوں کو ایکسوبیس حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ جب سیزر نے اسکندریہ کے جہازوں کو آگ لگادی تو اتفاقی طور پر شعلے بروکیم کے بڑے کتب خانے تک پہنچ گئے اور اس کا ایک حصہ تباہ ہوگیا۔ مارک انطونی نے کلیوپیٹرا کی خاطر اس نقصان کی تلافی کے طور پر گامم کا کتب خانہ پیش کیا جو غالباً بروکیم میں رکھا گیا اس لیے کہ یہی مقام آریلیس کے زمانے تک اسکندریہ کے علماء اور ادباء کا مرکز تھا۔ یہہ قیاس کہ یہاں کتب خانہ صدیوں تک اچھی حالت میں رہا اور اس وقت تباہ ہوا جبکہ مسلمانوں نے ۶۴۰ء میں حضرت عمر کے زمانے میں اسکندریہ پر حملہ کیا بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ جب آریلین نے ۲۷۳ء میں بروکیم کو تباہ کیا تو ایک کتب خانے کے تباہ ہوجانے کا بہت امکان ہے اور ۳۸۹ء اور ۳۹۱ء میں تھیوڈوسی لیس نے سیرا پیم کی تباہی کا حکم دیا اور وہاں کی کتابوں کو عیسائیوں نے لوٹ لیا نامساعدت روزگار اور علوم وفنون سے لاپروائی کے باعث بہت سی کتابیں ضایع ہوگئیں اور مصر میں بدقسمتی سے جو لوٹ مار کا دور دورہ رہا اُس میں کتب خانوں کا بہت سا حصہ تباہ ہوگیا۔ اس لیے یہہ کہنا کہ مسلمانوں نے اس کو تباہ کیا اور حضرت خلیفہ دوم نے اس کی بربادی کا حکم دیا بالکل بے بنیاد اور سراسر غلط ہے یہہ بیان ابوالفرج کی روایت پر (جس کا ماخذ بھی کمزور ہے) مبنی ہے جو ایک یہودی نثراد عیسائی تھا اور جیسا کہ گبن کا خیال ہے ایک غیر ملکی شخص کا بیان جس نے چھ سو سال کے بعد اس واقعہ کو بیان کیا ہم عصروں کی خاموشی کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ مولانا شبلی کا بھی یہی خیال ہے جنھوں نے

اس موضوع پر ایک اچھا اور محققانہ مضمون لکھا ہے۔

طالیمیوں کے کتب خانوں کی شان و شوکت اور شہرت پر شاہان پرگامم رشک کرتے تھے اور اُن سے مسابقت کی خاطر بھی وہ علم و ادب کی ہر ممکن طریقے سے مدد کرتے اور اس کی ترویج و ترقی میں کوشاں رہتے اس لیے پرگامم کا کتب خانہ بھی بہت مشہور تھا۔ یہاں کی دو لاکھ کتابیں بعد میں مصر میں منتقل کی گئیں۔

قدیم رومی چونکہ جنگجو تھے اس لیے انھوں نے کتابوں کی زیادہ پروا نہ کی۔ اس لیے پہلا کتب خانہ وہ تھا جس کو ایمیلیس پالس مقدونیہ کی فتح کے بعد روم لے آیا تھا۔ مفتوح بادشاہ کی جائدادوں سے صرف کتب خانہ ہی کو اس نے اپنے لیے محفوظ رکھا اور بعد میں اپنی اولاد کے لیے بطور ورثہ چھوڑا۔ اس کے بعد سلا ایتھنس سے ایپلیکن کا کتب خانہ لے آیا اور لوکیولس اپنے مشرقی فتوحات سے ادب کے بڑے اور عمدہ ذخیرے ساتھ لے آیا (۷۰ ق م) اور اپنے دوستوں اور اہل علم کو ان سے استفادہ کی اجازت دی۔ اور اس لیے اس کا کتب خانہ اور اس کے قریب کے راستے اور مقامات پر اکثر لوگ اور خصوصاً یونانی آیا کرتے تھے۔ اب امرا اور مالدار لوگوں کے لیے اچھا کتب خانہ رکھنا ان کی امارت کا ایک لوازمہ ہوگیا تھا اور اس میں بعض لوگوں نے اس قدر غلو کیا تھا کہ وہ سنیکا کی حقارت اور لوسین کی طنز کا نشانہ بنے۔ سیسرو اور اٹی کس جس جوش و شغف سے اپنے ذخیرۂ کتب میں اضافہ کرتے تھے اس سے روم و یونانی ادب کے شائقین واقف ہیں۔

مشہور رومی مورخ پلانی کے قول کے مطابق اسی نی یس پولیو پہلا شخص تھا جس نے عوام کے لیے ایک کتب خانہ قایم کیا اور اس کے اخراجات بھی اپنے ذمہ لیے۔ پولیو کے کتب خانے کے بعد شہنشاہ آگسٹس نے عوام کے لیے دو کتب خانے قایم کیے ان میں سے ایک اس نے اپنی بہن آکٹے ویا کے نام سے (۳۳ ق م) قائم کیا۔ یہ کتب خانہ

ایک خوبصورت عمارت پورٹس اکٹویا کے اوپر کے حصے میں تھا اور اس کا نچلا حصہ چہل قدمی کے لیے تھا۔ دوسرا کتب خانہ پالاٹائین پہاڑی پر اپالو کے مندر سے متصل تھا کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو حصے تھے ایک یونانی اور ایک رومی۔ اکٹوی ین لائبریری اس آگ میں تباہ ہوگئی جو ٹائی ٹس کے زمانے میں تین روز تک روم میں فروزاں تھی۔ اور پالاٹائین لائبریری بھی کوڈی ئس کے زمانے کی آگ میں تباہ ہوئی۔ شہنشاہ آگسٹس کے بعد بھی اس کے جانشین کتب خانوں میں اضافہ کرتے رہے اور جو کتب خانے آگ میں تباہ ہوئے تھے ان کو دوبارہ قائم کیا گیا۔ اس طرح چوتھی صدی عیسوی میں روم میں تقریباً اٹھائیس کتب خانے تھے۔

صرف روم ہی میں عام کتب خانے نہ تھے اٹلی، یونان، مشرقی صوبوں، ایشیائے کوچک اور افریقہ میں چوبیس مقامات کے نام ایسے ملتے ہیں جہاں عام کتب خانے تھے۔ ان میں سے اکثر مندروں سے متعلق تھے اور خانگی افراد کی فیاضی سے ان کے اخراجات کی پابجائی ہوتی تھی۔ چنانچہ چھوٹے پلائنی نے اپنے شہر والوں کے لیے جس کتب خانے کو کومم میں وقف کیا اس کے اخراجات دس لاکھ سسٹر سے ہوئے۔ اس نے میلان کے کتب خانے کی امداد کے لیے بھی ایک کثیر رقم دی تھی۔ بعض کتب خانوں سے کتابیں مستعار بھی لیجا سکتی تھیں۔

افی سس (ایشیائے کوچک) اور تیمی گڈ (الجیریا) میں حال کی تحقیقات کی بنا پر ان کتب خانوں کی عمارت اور طرز ترتیب کے متعلق کافی معلومات فراہم ہوئے ہیں۔ افی سس کے کتب خانے میں روشنی چھت میں ایک مدور شگاف میں سے آتی تھی۔ تیمی گڈ کے کتب خانہ کی عمارت پامپی آئی کے برآمد شدہ کتب خانے کی عمارت سے بہت ملتی ہے اور اس میں کتابوں کے رکھنے کا ایک نظام بھی تھا۔ یہ تمام عمارتیں ایک عام نقشے کے مطابق ہیں جو ایک ہال نے لمبے کمرے اور بہت سے

کتابوں کے رکھنے کے کمروں پر مشتمل ہے۔ مطالعہ کا کمرہ یا تو مستطیل یا نیم دائرے کی شکل کا ہوتا تھا اور اس میں آنے کا راستہ ایک شاندار پورٹیکو اور ستونوں سے ہوتا تھا۔ داخلہ کے مقابل ایک محراب میں لازمی طور پر ایک بت رکھا جاتا تھا۔ سابق میں پرگامم میں جو منروا (دیوی) کا بت تھا اس کو اب برلن میں محفوظ کیا گیا ہے۔ جووی نیل کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر کتب خانوں میں اس دیوی کا بت رکھا جاتا تھا۔ مطالعہ کا کمرہ مشہور مصنفوں کے بسٹس (بالائی حصہ کا مجسمہ یا تصویر) یا ان کے قد آدم بتوں سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ مصنفوں کی تصویریں اور چہرے لکڑی کے ان صندوقچوں اور تختوں پر جن میں کتابیں رکھی جاتی تھیں مختلف رنگوں سے نقش کیے ہوئے ہوتے تھے۔ بعض ایسی تصویروں سے دیواریں بھی آراستہ کیجاتی تھیں۔ نشستیں ایسی ہوتی تھیں جنھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا تھا یا جن کو حرکت دیا جا سکتا تھا۔ ان کی تصاویر موجود ہیں۔ کتابوں کی درجہ وار تقسیم کیجاتی تھی اور ان کے جلد نما شکنجے قیمتی لکڑی کے بنے ہوئے ہوتے تھے اور ان پر بہت کافی نقش کیا جاتا تھا۔ ان پر نمبر شمار بھی پڑا ہوتا تھا تاکہ فہرست کے حوالے میں سہولت ہو۔ ہر اکیولینیم میں جو ایک خانگی کتب خانہ برآمد ہوا ہے اس میں ایک ہزار سات سو چھپن قلمی نسخے کمرے کے اطراف چھ فٹ کی بلندی تک دروازوں پر رکھے ہوئے پائے گئے۔

بعد کے عیسائی کتب خانوں نے اپنے بیشتر رومی اور یونانی کتب خانوں کے نقشہ ہی کو لیا روم کے عام کتب خانے کا نقشہ واٹیکن کے کتب خانے میں (جسکی سکسٹس پنجم نے ۱۵۸۸ء میں مختلف رنگوں سے منقوش لکڑی کے جلد نما شکنجوں نصف قد کی مورتوں اور قدیم برتنوں سے آرایش کی تھی اب تک محفوظ ہے۔

جیسے جیسے روم میں کتب خانوں کی تعداد بڑھتی گئی ویسے ویسے مہتمان کتب خانہ جات کی شخصیت بھی اہم ہوتی گئی۔ یہ عہدہ عموماً کسی غلام یا آزاد شدہ شخص کے ذمہ ہوتا تھا

ان کتب خانوں کے منتظموں کے بہت سے نام ہمارے لیے کتبوں میں محفوظ ہیں۔ کتب خانوں کی عام نگرانی ایک خاص عہدہ دار کے ذمہ کیجاتی تھی۔ اس طرح شہنشاہ نیروؔ کے زمانے سے ٹراجن اور ڈیانی سی لس سے الگزانڈریں تک یہ خدمت خطیبوں کے ذمہ کی جاتی تھی۔ شہنشاہ ہیڈرین یہ خدمت اپنے سابق استاد و اتالیق جولی لیس وسٹی نس کے سپرد کی تھی جو بعد میں اسکندریہ کے عجائب خانے کا مہتمم بن گیا تھا۔

جب شہنشاہ قسطنطیس نے باسفورس پر کے نئے شہر کو اپنی دار السلطنت بنایا تو اس نے وہاں ایک کتب خانہ قایم کیا جس میں غالباً پہلی مرتبہ عیسائی ادب کو شریک کیا گیا۔ عیسائی کتابوں کی باضابطہ تلاش کی گئی اور یہ طریقہ اس کے جانشینوں کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ شہنشاہ جولی ین اور تھیوڈی سی لیس ثانی میں بہت اضافہ کیا بعد الذکر کے انتقال کے وقت اس کی تعداد ایک لاکھ جلدوں تک پہنچ گئی تھی۔ تھیوڈی سی لیس کے ایک ضابطہ قانونی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتب خانے کے ساتھ نقل کرنے والوں کی ایک جماعت ملازم تھی۔ یہ کتب خانہ ۴۷۷ء میں جل گیا اور بعد میں اس کو مکرر قایم کرنے کی کوشش کی گئی اور وہ قایم کیا گیا۔

جیسے جیسے عیسائیت کو ترقی ہوتی گئی ویسے ویسے ایک خالص عیسائی ادب وجود میں آیا اور کتب خانہ کلیسائی تنظیم کا ایک جز بن گیا۔ اسقف الگزانڈر نے ۲۵۰ء میں یروشلم میں ایک کلیسائی کتب خانہ قایم کیا اور رفتہ رفتہ عیسائیت کی تلقین کے لیے ہر کلیسا کے ساتھ ایک کتب خانہ قایم کرنے کا رواج ہو گیا۔

چار پانچ صدیوں تک پڑھنا لکھنا صرف پادریوں کا اجارہ رہا۔ چونکہ اس زمانے میں کتابوں کے جمع کرنے ان کی نقل کرنے اور تصنیف و تالیف کا کام بہت کچھ ان ہی لوگوں کے ذمہ تھا اس لیے عیسائی مذہب سے متعلق بہت سا ادب جمع ہو گیا جو خانقاہوں کے مشہور کتب خانوں کی زینت تھا۔ انگلستان میں یارک اور کنٹربری کے کتب خانے

مشہور تھے۔ الکوئین جب لورس کا اسقف مقرر ہوا تو اس نے یہاں کے کتب خانے میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ اسی طرح شہنشاہ شارلیمین نے فلڈا کے کتب خانے میں اضافہ کیا۔ یہ کتب خانہ ۷۴۴ء میں قایم ہوا تھا اور قرونِ وسطیٰ میں اس کو وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

کتب خانوں کے انتظامات کا ارتقا سینٹ بنی ڈکٹ کے احکام سے چھٹی صدی عیسوی میں ہوا۔ راہبوں کو علٰحدہ علٰحدہ کتابیں لینے اور اُن کو پوری طرح پڑھنے کی ہدایت تھی جلد بندی۔ کتابوں کی درستی، فہرست بنانے اور مطالعہ کے متعلق بعد میں قواعد بنائے گئے۔ ابتدا ہی سے بینیڈکٹائنوں نے طلبہ کو کتابیں مستعار لینے اور مطالعہ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ سال کے آخر میں کتابوں کی تنقیح ہوتی تھی۔

قدیم ایران میں درختوں کی چھال پر کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ جب اس قسم کا بہت سا سرمایہ جمع ہوگیا تو کھنڈر میں جو اصفہان کا ایک ضلع تھا ایک بڑا کتب خانہ بنوایا گیا اور یہ تمام کتابیں وہاں رکھوا دی گئیں۔ اس جگہ کے انتخاب کی وجہ یہ تھی آب و ہوا کے اعتدال کے مدنظر یہ مقام سب سے بہتر تھا۔

اسلام کے زمانہ تک یہ کتب خانہ بالکل ختم ہو چکا تھا اور اس کا نام و نشان تک باقی نہ تھا لیکن چونکہ اس کے متعلق روایت چلی آتی تھی اس لیے اکثر شایقین اس کی تلاش و جستجو میں رہا کرتے تھے کہتے ہیں کہ بعضوں کو اپنی تلاش کا ثمر ملا۔ اس لیے کہ اس عمارت کے نیچے کے حصہ سے چند صندوق برآمد ہوے جن میں کتابیں رکھی تھیں۔ یہ کتابیں یونانی زبان میں تھیں اور چمڑے پر تحریر کی گئیں تھیں۔ بعض کتابیں ایسی تھیں جنھیں پڑھا نہیں جا سکا۔

اسلام میں کتابوں کے جمع کرنے اور اُن کو کتب خانے کی صورت میں ترتیب دینے کا زمانہ بنی اُمیہ کے عہد سے شروع ہوتا ہے اور اس خاندان میں جس شخص نے

پہلے قدیم تصنیفات کی جستجو اور تلاش کی وہ خالد بن یزید تھا۔" خالد کے بعد تالیفات اور تصنیفات کو بے انتہا ترقی ہوئی اشعار عرب۔ لغت انساب، غزوات۔ سیر۔ تفسیر۔ حدیث فقہ کلام وغیرہ کے متعلق ایک بڑا سرمایہ پیدا ہوگیا۔ خلیفہ منصور نے غیر زبانوں کی سینکڑوں کتابیں عربی میں ترجمہ کرائیں یہاں تک کہ خلیفہ ہارون رشید نے اس عجیب و غریب عظیم الشان دار العلم کی بنیاد ڈالی جس کا نام بیت الحکمۃ تھا۔

یہ بیت الحکمہ دو حصوں میں منقسم تھا ایک کتب خانے کے لیے خاص تھا اور دوسرا غیر زبانوں کے ترجمے کے لیے۔ اس عظیم الشان کتب خانے میں عربی زبان کے علاوہ ہندی، سنسکرت، یونانی، قبطی، کالڈی زبانوں کی بے شمار کتابیں مہیا کی گئی تھیں۔ یحییٰ برمکی نے (جو ہارون رشید کا وزیر اعظم تھا) ہندوستان سے مشہور پنڈت اور حکیموں کو دربار میں بلایا اور انہی پنڈتوں کے ذریعہ ہندوستان کا بہت سا علمی سرمایہ بغداد پہنچا۔ چونکہ اہل برامکہ فارسی الاصل تھے اس لیے فارسی کتابیں بھی بڑی تعداد میں فراہم کی گئیں۔ خلیفہ ہارون رشید کتابوں کی فراہمی اور تدوین میں نہایت ہی بے تعصبی سے کام لیتا تھا۔"

مامون رشید نے بھی فارسی تصنیفات کی فراہمی میں بہت کوشش کی اور اس سے زیادہ کوشش اس نے یونانی کتابیں فراہم کرنے اور ان کا ترجمہ کرانے میں کی۔ مامون نے اس مشہور کتب خانہ میں عرب جاہلیت کے زمانہ کا بہت کچھ سرمایہ جمع کیا تھا جس میں قصائد، اشعار کے علاوہ بعض مشہور خطوط اور دستاویزات بھی تھے۔

مامون کے عہد سے کتابوں کے جمع کرنے کا شوق تمام بغداد میں پھیل گیا اکثر درباری و امرا بلکہ علما، بڑے بڑے کتب خانے رکھتے تھے اور کتابوں کے مہیا کرنے میں بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے فتح بن خاقان متوکل باللہ کے وزیر کا کتب خانہ اس زمانہ میں بے نظیر سمجھا جاتا تھا۔

چوتھی صدی ہجری میں تمام ممالک اسلامیہ میں جا بجا کتب خانے تیار ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں غالباً سب سے بڑا اسپین کا کتب خانہ تھا۔ اس کو خلیفہ حکم مستنصر نے قایم کیا تھا اسپین، مصر، شام، بغداد، فارس وخراسان کے اضلاع میں خلیفہ کے بہت سے کارندے اور تاجر نادر اور عمدہ قدیم وجدید کتابوں کے جمع کرنے پر مامور تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتب خانے میں تقریباً چار لاکھ کتابیں تھیں۔ خلیفہ کو کتابوں کی درستی اور زیب زینت کا بھی بہت خیال تھا، اس کام کے لیے اس نے بہت سے اچھے خوشنویس، مصحح اور جلد ساز ملازم رکھے تھے۔

مصر میں فاطمیین فرماں روا صاحب علم اور اہل علم کے قدرداں تھے اور ان میں سے تقریباً ہر ایک نے بڑے بڑے کتب خانے قایم کیے تھے۔

عضد الدولہ نے شیراز میں بہت بڑا کتب خانہ قایم کیا تھا۔ یہ کتب خانہ شاہی محل سے متصل تھا۔ اس کی عمارت کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے۔ "یہ ایک بڑا اور لمبا مکان ہے جس میں بہت سے کمرے ہیں اور ان میں بہت سی بڑی الماریاں دیوار سے لگی کھڑی ہیں۔ الماریوں کی لکڑی پر منقش و مذہب ہے۔ ہر فن کے لیے علحدہ کمرہ ہے اور اس کی علحدہ فہرست ہے۔ کتب خانے کے انتظام ونگرانی کے لیے عہدہ دار مقرر ہیں اور ہر ایک کو یہاں آنے کی اجازت نہیں۔ صرف مقررہ لوگ ہی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔"

ان سب کتب خانوں میں سب سے بڑا اور اسپین کے کتب خانے کا مد مقابل فاطمیین مصر کا کتب خانہ تھا۔ جو شاہی محل کا ایک حصہ تھا۔ اور چالیس کتب خانوں پر مشتمل تھا اس کتب خانے کی تعداد دو لاکھ سے چھ لاکھ کتب تک بتائی گئی ہے۔ اس میں مشہور کتابوں کے متعدد اور نایاب نسخے تھے۔ بطلیموس کا بنایا ہوا کرہ بھی یہیں تھا۔ کتابوں کے جمع کرنے کا شوق امرا اور عہدہ داروں کو بھی بہت تھا اور وہ

اس کو اپنی امارت کا لوازمہ سمجھتے تھے۔ علماء نے بھی بعض اچھے کتب خانے قایم کیے تھے۔ الحسین بغدادی کا کتب خانہ بہت ہی بے نظیر سمجھا جاتا تھا۔

چوتھی صدی ہجری میں ممالک اسلام میں عام کتب خانوں کا رواج ہوا اور ایک امیر سالور بن اردشیر نے ۳۸۲ھ میں بغداد میں ایک دار العلم بنوایا اور پہلی مرتبہ بہت سی کتابیں عوام کے مطالعہ کے لیے وقف کیں۔ اس کے بعد ۳۹۵ھ حاکم بامراللہ نے جو فاطمی خاندان سے مصر کا فرماں روا تھا ایک بہت بڑا کتب خانہ تعمیر کیا۔ کہتے ہیں کہ اس دار العلم کا نہایت شوکت و شان سے افتتاح کیا اور بہت سے علماء نے اس رسم میں حصہ لیا۔ اس وقت مکان کو بہت کچھ آراستہ کیا تھا اس کتب خانہ میں کتابوں کے مطالعہ اور نقل و کتابت کی عام اجازت تھی اور سہولت کی خاطر کاغذ قلم دوات وغیرہ خود کتب خانہ کی جانب سے فراہم کیے جاتے تھے۔ اور بعض طالبان علم کو تنخواہیں بھی دی جاتی تھیں تاکہ وہ اپنا پورا وقت تحصیل علم میں صرف کریں اور اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔

اس زمانے سے پبلک کتب خانوں کا رواج عام ہوگیا تھا اور تمام ممالک اسلامیہ میں سینکڑوں کتب خانے قایم ہوگئے تھے۔ نظام الملک جس نے نظامیہ بغداد کی بناء ڈالی یہ عام حکم دے رکھا تھا کہ جس جگہ کوئی ممتاز عالم ہو اس کے لیے ایک مدرسہ اور مدرسے کے ساتھ ایک کتب خانہ تعمیر کیا جائے۔ مدرسوں کے علاوہ مسجدوں میں بھی کتب خانے قایم ہوگئے تھے چنانچہ قسطنطنیہ میں جس قدر مشہور مسجدیں ہیں ہر ایک کے ساتھ ایک بڑا کتب خانہ بھی ضرور رہے۔

افسوس ہے کہ بغداد مصر اور اسپین کے مشہور مذکورہ کتب خانے بعد کے حملوں، طوائف الملوکی اور زمانہ کے نشیب فراز کی وجہ سے تباہ ہوگئے۔ لیکن ان کے باقیات الصالحات اب بھی قسطنطنیہ مصر، بغداد اسپین اور یورپ کے مشہور کتب خانوں میں باقی ہیں۔

(نوٹ:۔ اس مضمون کا ایک حصہ نشر گاہ اورنگ آباد سے نشر کیا گیا تھا۔) **خواجہ محمد یوسف الدین**

صلیبی جنگیں[1]

الف

(۱) مفکرین نے اکثر اس مسئلہ کے متعلق غور و فکر کی ہے جس کو مقدراتِ تاریخ کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اِن مقدرات میں ہمیشہ مشرق و مغرب کی کشمکش بھی شامل ہے۔ یونانی مورخ ہیرودوٹس نے اپنی تاریخ اسی سوال سے شروع کی ہے کہ ان دونوں کی معرکہ آرائی کی کیا وجہ ہے! اور ہمارے شاعر آج بھی مغربی ملکوں کے شور و غوغا سے مشرق کی خاموش نفرت کا ذکر کرتے ہیں یا اس سخت فرق کا اظہار کرتے ہیں جو دونوں کو دواماً ایک دوسرے سے جدا کیے ہوئے ہے۔ زمانۂ قدیم کی طروجنی و ایرانی جنگیں: شام میں کراسوس و مہرقل کے معرکے: محارباتِ صلیبی اور عثمانی فتوحات: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب واقعات میں ایک ترتیب و تناسب ہے اور ان سے قیاس ہوتا ہے کہ اِن واقعات کا اعادہ باقاعدہ ہوتا رہا ہے۔ لیکن مشرق و مغرب کی یہ کشمکش متعدد تاریخی حقایق کے جغرافیائی حل میں پوشیدہ ہے! تاریخ صرف کسی مقام پر چند کشمکشوں کی وقایع نگاری سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ جب ہم مشرق و مغرب کی ظاہری کشمکش کو اِن حقیقی کشمکشوں میں تحلیل کریں گے جو دو متسابق دینوں، نسلوں اور تمدنوں میں ہوتی رہیں اور جن کی نوعیت ہر دور میں بدلتی رہی ہے تو تب ہی تاریخ میں گہرائی کے ساتھ وسعت بھی پیدا ہوگی۔ یقیناً یہ صحیح ہے کہ مختلف النوع جغرافیائی اسباب کی بنا پر

---

[1] یہ مضمون مشہور انگریزی کتاب لیگسی آف اسلام کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ ہے۔

بحیرۂ متوسط کا مغربی ساحل، قسطنطنیہ سے اسکندریہ تک، مدت مدید تک تاریخ کا معرکۃ الآرا خطہ رہا ہے۔ خواہ یہ بحیرۂ اسود کی راہ سے ہو یا بحیرۂ احمر کی یا بیروت سے صحرا پار کر کے۔ غرض یہی وہ علاقہ ہے جہاں سے یورپ ایشیا سے ہم کنار اور اس کی پیداوار و اسرار سے روشناس ہوتا ہے۔ خواہ مصر میں ہو یا اقریطش میں، بیت المقدس میں ہو یا اثینہ میں غرض یہی وہ علاقہ ہے جہاں تمدنوں، دینوں اور فلسفوں نے اپنا نشیمن تلاش کیا ہے۔ ایسے مقام پر بہت سی مخالفتوں کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ بعض مخالفتیں معاشی تھیں؛ بعض مذہبی تھیں: بعض سیاسی تھیں: بعض نسلی تھیں: اور بہت سی ملی جلی تھیں: ہر ایک آویزش بجائے خود انفرادی طور پر اچھی طرح سمجھی جا سکتی ہے۔ اس قسم کی سب سے بڑی مخالفتوں میں ایک مخالفت مغربی نصرانی لوگوں، نصرانی تمدن اور نصرانی مذہب اور اسلامی لوگوں، اسلامی تمدن اور اسلامی عقاید کے درمیان تھی۔ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ابتدا، سیدنا عمرؓ کی فوجوں کے مقابلہ میں "پہلے صلیبی مجاہد" ہرقل کی بمقام یرموک ۶۳۶ء میں شکست سے ہوئی، لیکن یہ کب ختم ہو گی؟ اس کی تاریخ کون بتا سکتا ہے؟ کسی وقت تو یہ اصلاً مذہبی رہی: اور کسی وقت اس پر سیاسی حیثیت غالب رہی۔ بہر حال یہ کشمکش دو مختلف قسم کی قوموں میں رہی۔ گو خاص کر رومانسی و سلافی ایک جانب تھے اور عرب و ترک دوسری جانب؛ لیکن اس کی حیثیت ہمیشہ مخلوط ہی رہی جس میں اصلاً دو تمدن مصروف پیکار تھے۔ اس کشمکش کا ایک باب حروب صلیبیہ بھی ہے۔ یہ باب ۱۰۹۶ء سے شروع ہوتا ہے: اگر ہم اس کو خطۂ شام میں آخری نصرانی سہارے کے اٹھ جانے کی مدت تک لے جائیں تو اس کا خاتمہ ۱۲۹۱ء میں ہوا۔ اور اگر قدیم صلیبی تحریک کے رفتہ رفتہ ختم ہونے والی باقیات کا لحاظ کریں تو اس کی عمر پرتگیزوں کی جہازرانی اور کولمبس کے انکشافات تک قرار پاتی ہے۔

(۲) حروب صلیبیہ کے دو رخ ہیں۔ گو یہ صحیح ہے کہ شروع ہی سے صلیبی جنگوں میں

دوسرے رجحانات بھی موجود تھے لیکن ابتدائی محرک کے لحاظ سے یہ ایک روحانی تحریک تھی جو خود بخود ایک رومانی ادارہ کی معروضی شکل میں نمودار ہوئی۔ یہ ایک "مقدس جنگ" تھی ــــــ ایسی جنگ جو عیسائی عالموں کے نظریہ کے مطابق صرف عادلانہ ہی نہیں تھی بلکہ اس کو پورا تقدس بھی حاصل تھا۔ یہ جنگ ایک ایسی شے تھی جو نصرانی دولت عامہ کو جنگ کی مشترکہ جدوجہد کے لیے نصرانیت کے سب سے بڑے دشمن کے خلاف متحد و مربوط کرتی تھی۔ لیکن نتائج کا اعتبار کرتے حروب صلیبیہ میں ارض مقدس کی خلاصی بھی شامل تھی: یہ نصرانی مغرب کا اسلامی مشرق میں در آنا تھا۔ حروب صلیبیہ گویا بنیاد تھی ایک نصرانی مملکت یعنی "بیت المقدس کی لاطینی بادشاہت" کی جس نے بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل پر اپنے ڈیرے ڈالے تھے۔ مشرقی جانب اس کی نظریں موصل و بغداد پر تھیں اور جنوبی جانب قاہرہ و مصر پر۔ اول الذکر ایک زیادہ وسیع موضوع ہے؛ آخرالذکر اپنی مخصوص و انفرادی دلچسپیاں رکھتا ہے۔ بیت المقدس کی لاطینی بادشاہت میں حروب صلیبیہ نے خاص انداز اختیار کیا اور یہاں ان سے اپنے مخصوص نتائج ظاہر ہوئے ــــــ الف۔ جنگ آزما طبقوں کا عروج؛ ب۔ شامی بندرگاہوں میں اہل جنیوا و اہل وینس کی طرف سے تجارتی کوٹھیوں کا قیام؛ ج۔ ایشیائے بعید سے تجارتی و نصرانی تبلیغی تعلقات کا ارتقاء۔ یہاں نصرانیت و اسلام میں ایک مسلسل تخالف اور ایک مستقل تعلق قایم ہو چکا تھا۔ یقیناً یہی صورت حال اسپین میں بھی تھی لیکن ایک لحاظ سے یہاں یورپ کی عام توجہ مرکوز ہو گئی تھی جو اسپین میں کبھی نہیں ہوئی۔ جس طرح دور کے پہاڑ قریبی منظر سے ابھرتے نظر آتے ہیں اسی طرح جب لاطینی بادشاہت پر نظریں جمتی ہیں تو عام پس منظر انتہائی وضاحت سے پیش نظر ہو جاتا ہے؛ ــــــ بحیرۂ متوسط کے نشیبی ساحل کا جغرافیائی پس منظر: اسی نشیبی ساحل پر نصرانی و اسلامی قوتوں کی گذشتہ صدیوں کی کشمکش کا تاریخی پس منظر۔

(۳۰) ہم کہہ سکتے ہیں کہ جغرافیائی نقطۂ نظر سے بحیرۂ متوسط دو ہیں۔ ایک تو مغرب کا بحیرۂ متوسط ہے جس کی حدود یہ ہیں: مشرقی جانب اس کی سرحد اطالیہ و صقلیہ تک ہے، اس میں راس بِنوزِرتو واقع جنوب مغربی صقلیہ اور راس بونہ واقع شمال مشرقی تونس کے درمیان قریباً ایک سو میل چوڑا بحری راستہ ہے۔ دوسرا بحیرۂ متوسط مشرق میں ہے جو صقلیہ کے مشرقی ساحلوں سے شروع ہو کر ایشیائے کوچک و شام کی سرحدوں تک پہنچتا ہے۔ صقلیہ وہ مقام ہے جو تاریخ میں بار بار میدان جنگ بنا یا دو بحیرہ متوسطوں کا مقام اتصال رہا۔ ایک ہی سمندر کے دو نصفاً نصف ٹکڑے ——— مشرقی و مغربی بحیرہ متوسط ——— عہد قدیم میں دو تمدنوں کے مسکن رہے ہیں۔ مغرب میں لاطینی تمدن تھا؛ اور جب نصرانیت نے غلبہ پایا تو اس بنیاد پر رومی کلیسا اور مغرب کی مقدس رومی شہنشاہیت نمودار ہوئی؛ مشرق یونانی تمدن کا گہوارہ تھا؛ اور وہاں یونانی کلیسا اور بازنطینی شہنشاہیت نے ترقی کی۔ ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کا ظہور اسی منقسمہ صورت حال میں ہوا۔ اپنے قوت گھر مکہ سے نکل کر برقی رو کی طرح پھیلتا ہوا وہ شام میں ضیا پاشی کرنے لگا! اور عرضاً پورے شمالی آفریقہ پر چھا گیا؛ اور پھر آبنائے جبل الطارق کو عبور کر کے جبال البرانس کے دروازوں تک آ پہنچا۔ قرون وسطیٰ کے شروع ہوتے ہوتے تک دونوں بحیرۂ متوسطوں یعنی مغرب کے جنوبی و مغربی کناروں اور مشرق کے جنوبی و مشرقی کناروں تک مستقلاً اپنے قدم جما لیے۔ بحیرۂ متوسط کے دونوں حصوں کے اسی نشیبی ساحل پر نصرانیت اسلام سے معرکہ آرائی میں مصروف رہی، صلیبی محاربات سے بھی پہلے ان معرکوں میں کچھ نہ کچھ صلیبی جنگوں کا رنگ ڈھنگ آ چکا تھا۔ لیکن جب گیارویں صدی کے آخر میں صلیبی معرکوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ان کی خصوصیت یہ رہی کہ مغرب کی لاطینی نصرانیت منتقل ہو کر مشرق آ گئی جو اب تک اس سے الگ تھلگ رہی تھی اور یہ کہ ایک طرف تو

یہاں اس کا تعلق یونانی کلیسا اور مشرقی شہنشاہیت سے ہوا اور اس کی حیثیت برائے نام ان کے تابع کی سی رہی اور دوسری طرف یہ نصرانیت کھلے مخالف کی حیثیت میں مشرق کے مسلمانوں سے دوچار ہوئی۔ محاربات صلیبی کا شاید سب سے زیادہ بارآور اور ابتدائی عنصر مغرب کے مشرق میں داخل ہونے کا سادہ واقعہ ہے لیکن اس سادہ واقعہ میں بھی پیچیدگیاں ہیں کیونکہ جس مشرق میں مغرب داخل ہوا تھا وہ خود بھی اپنی گتھیوں میں الجھا ہوا تھا۔ لاطینی نصرانیت کو صرف بازنطیہ کی یونانی نصرانیت سے نہ صرف صلح کرلی تھی بلکہ اس سے اپنے تعلقات بھی استوار کرنے تھے۔ مسلمانوں میں بھی تفرقہ پڑچکا تھا: سنی ترکوں کو، کہ مغربی ایشیا میں شمال میں بحیرۂ اسود سے لیکر جنوب میں بحیرۂ احمر تک مسلط ہو چکے تھے، شام کی نزاعی سرزمین پر شیعی خاندان فاطمیہ سے ٹکرانا پڑا اور صلیبی مغرب کو ایک ایسی مخالفت کا انکشاف کرنا پڑا اور جہاں تک ہوسکے اس کو بہتر طریقہ پر استعمال کرنا تھا جس سے اس (مغرب) کو بمشکل آگاہی تھی۔[1]

---

[1] - ۱۰۹۶ء میں جو موقف تھا وہ سنہ ۲۰۱ ق م سے بعض مشابہتیں رکھتا ہے جب رومیوں نے مشرق میں اپنی کارروائیاں شروع کیں تو ان کو بھی اسی طرح تین قوتوں سے دوچار ہونا پڑا: الف۔ مقدونوی بادشاہت اس کی حکومت یونان اور شمالی جزیرۂ اجینیہ پر باسفورس تک تھی۔ ب۔ ایشیائے کوچک کے سلوسی اور ج۔ مصر کا بطلیموسی خاندان۔ دوسری طرف بنیادی اختلافات تھے۔ رومی آئے تو وہ یونانی تہذیب سیکھنے کے لیے تیار اور اس کی ہر چیز کے مداح تھے۔ گیارویں صدی عیسوی کے آخر تک لاطینی نصرانیت خاص اپنی تہذیب کو نشوونما دے چکی تھی جس حد تک مسلمانوں سے سیکھ سکتی تھی وہ اپنے ہی وطن میں اندلس وصقلیہ سے سیکھ سکتی تھی؛ علاوہ ازیں رومی ایک نئی اور مختلف دنیا میں آچکے تھے؛ گیارہویں صدی عیسوی کے "فرنگیوں" نے بازنطیہ میں کچھ ایسی چیزیں لیں جو خود ان کی روایات سے مشابہ تھیں گو اس نے ترقی کا ایک مختلف رستہ اختیار کیا۔ جیساکہ ہم دیکھیں گے اس معاملہ میں انھوں نے شام ومصر کے مسلمانوں کی نسبت کرتے شاید بازنطینیوں سے زیادہ سیکھا

(۴) تاریخی حیثیت سے دیکھا جائے تو ممند پار کے اسلام کے خلاف لڑنے کے لیے لاطینی نصرانیت نے جو بحری سفر اختیار کیا سمجھنا چاہیے کہ وہ گویا مغربی بحیرۂ متوسط میں نصرانیوں اور مسلمانوں کے ایک طویل سلسلہ اختلافات کا انتہائی نقطہ تھا؛ تاریخی پس منظر کا یہ بڑا عنصر ہے، ہمیں چاہیئے کہ حروب صلیبیہ کو اسی پس منظر میں دیکھیں ۔ ساتویں صدی عیسوی کے اختتام تک عربوں کا تسلط شمالی آفریقہ کے بربروں پر قایم ہو چکا تھا اور ۷۱۱ء و ۷۱۸ء کے مابین اسپین میں عربوں و بربروں کی فتوحات جبال البرانس تک پہنچ چکی تھیں ۔ نویں صدی عیسوی کے دوران میں —— ۸۲۷ء سے ۸۷۰ء تک جب کہ سراقوسہ مفتوح ہوا —— شمالی آفریقہ کے قیروانی اغالبہ صقلیہ فتح کر چکے تھے؛ اور انہوں نے عارضی یورشیں اور قزاقی ریاستیں قایم کر کے جنوبی اطالیہ کو کم بیا گنا اور آبروزی تک روند ڈالا تھا ۔ اسپینی مسلمان پراونس، شمالی اطالیہ حتی کہ سوستان تک پر چھاپے مارتے رہتے تھے؛ اور بحری قزاق کا بیکا، سردانیہ پر بار بار متواتر حملے کرتے رہتے؛ مسلمانوں کے تمدن نے صرف اسپین و صقلیہ میں کچھ رفعت حاصل کی ہے؛ لیکن دونوں مقاموں پر اس کی آب و تاب یکساں تھی اور ان ہی دونوں مقاموں سے فرانس و اطالیہ پر اس کا اثر پڑتا رہا ۔ قرطبہ کا فلسفہ اور وہاں کے بڑے فلسفی ابن رشد کا نفوذ جامعہ پیرس تک ہوا ۔ صقلیہ میں نارمن بادشاہوں اور ان کے جانشین فریڈرک دوم کے زمانہ میں بلرمو کو عربی وضع کے محلوں، عرب جغرافیہ دانوں اور عرب شاعروں نے زینت بخشی ۔ کہا گیا ہے کہ:۔ اسلامی عناصر نے مقامی طور پر مغرب کو جو تہذیبی برکات عنایت کیں وہ کم سے کم اتنی ہی اہم ہیں جتنی کہ حروب صلیبیہ کے دوران میں مشرق کے اثرات [1] لیکن خواہ مغرب نے کتنے ہی برکات حاصل کئے ہوں نصرانی سرزمین پر

---

[1] ۔ علامہ بیکر کی رائے "کیمبرج تاریخ عہد وسطیٰ" میں؛ جلد دوم صفحہ ۳۹۰ ۔

وہ ایک دوسرے عقیدے کے ماننے والوں کے قبضہ کو گوارا نہیں کر سکتا تھا اور گیارہویں صدی عیسوی میں نصرانیوں کے اقدام سے پہلے اسلامی فوجیں مغربی بحیرۂ متوسط سے رفتہ رفتہ دست کش ہونے لگیں۔ ۱۰۰۲ء میں (ابن عامر) منصور اعظم کی وفات کے بعد اندلس میں شمال کی چھوٹی چھوٹی نصرانی قوتوں کی —— لیون، قشتالیہ، ارغون اور نبرہ —— طرف سے توسیع مملکت کا دور شروع ہو چکا تھا۔ ۱۰۸۵ء میں چھٹے الفانسو قشتالوی نے طلیطلہ فتح کیا[1] اور ارغون نے ۱۱۱۸ء میں سرقسطہ فتح کیا۔ بازنطینی حاکموں اور عرب حملہ آوروں کے جھگڑوں سے جنوبی اطالیہ پارہ پارہ ہو چکا تھا اور بالآخر گیارہویں صدی عیسوی کے نصف اول میں رومیوں کے ہاتھ لگا؛ ۱۰۶۰ء اور ۱۰۹۱ء کے درمیان رومیوں نے صقلیہ بھی فتح کر لیا۔ ۱۰۱۶ء کے قریب پوپ بینی ڈکٹ ہشتم پیسا کے باشندوں کو سروانیہ پر قبضہ کرنے کے لیے اکسا چکا تھا؛ اور اہل جینیوا اور اہل وینس کے ابھرنے تک مغربی بحیرۂ متوسط میں مسلمان بحری قزاقوں کی جو دہشت ان پر تھی ختم ہو چکی تھی۔ گیارہویں صدی عیسوی کے ختم ہوتے ہوتے مسلمانوں کا قبضہ صرف جنوبی اسپین اور شمالی آفریقہ تک محدود ہو گیا؛ اور بارہویں صدی عیسوی میں صقلیہ کے نارمن خود ان کے افریقی قلعوں تک بڑھ کر ان پر حملہ کرنے لگے۔ اب ایک زیادہ مستحکم اور زیادہ ترقی یافتہ مغرب خود اپنے گھر میں اپنا آپ حاکم بن رہا تھا۔

(۵) یہ تھی مغرب کی صورت معاملات جب کہ حروب صلیبیہ کے لیے مشرق سے اس کی طلبی ہوئی۔ اگر اس کی وجہ صرف ایک ہی تھی تو پھر اس طلبی کے دو رخ ہیں۔ سلجوقی ترک کہ ابتداءً کرائے کی فوجوں کا کام دیتے تھے[2] خلفاء بغداد پر فی الواقع حاوی ہو چکے

---

[1] ۱۰۸۶ء میں مرابطین کے نئے حملوں سے اس کی ترقی میں سخت رکاوٹ پیش آئی لیکن اس سے تحریک میں جو رکاوٹ پیدا ہوئی تھی وہ عارضی ثابت ہوئی۔

[2] یہاں فاضل مقالہ نگار کو مغالطہ ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آٹھویں عباسی خلیفہ (بقیہ حاشیہ صفحۂ آئندہ)

تھے، اس لیے سلجوقی ترکوں کے دباؤ سے ایک طرف تو یہ نتیجہ نکلا کہ شام میں قاہرہ کے کمزور فاطمی خلفاء (۱۰۷۰ء) کے ہاتھ سے بیت المقدس نکل گیا اور دوسری طرف ایشیائے کوچک میں بازنطینی فوجوں کو ملاذ کرد کے مقام پر بہت بڑی شکست ہوئی (۱۰۷۱ء) بیت المقدس کی احتیاجوں اور بازنطیہ کی ضرورتوں دونوں نے مغرب کو اپنی مدد کے لیے آواز دی؛ اور پہلی صلیبی جنگ ——— ۱۰۹۶ء تا ۱۰۹۹ء ——— اسی دوگونہ طلبی کا جواب تھا۔

اس طلبی کا جواب دینے کے لیے مغربی یورپ کی معاشرتی ترقی اور مذہبی طور طریق دونوں نے ایکا کیا۔ گناہ بخشوانے کی خاطر استغفاری زیارت کرنے کی رسم مغرب میں قدیم سے ہے؛ بیت المقدس سب سے زیادہ محترم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ دوسرے متبرک مقاموں کی بہ نسبت سب سے زیادہ دور بھی تھا اس لیے یہاں سے دوہرا ثواب ملتا تھا، اور اسی سبب سے یہ مقام مدت دراز سے اس قسم کے زائروں کی منزل مقصود بنا ہوا تھا۔ اب یہ کعبۂ مقصود خطرہ میں تھا: خطرہ کو دور کرنا ضروری تھا۔ آخرکار راستوں کو پُرامن بنانے اور آئندہ زیارتوں کے کعبۂ مقصود

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہارون الرشید کے بیٹے معتصم نے (۸۳۳ء تا ۸۴۲ء) خراسانیوں کا زور توڑنے کے لیے ماوراء النہر کے قریباً چار ہزار ترکوں کو اپنی فوج خاصہ میں شامل کیا جو رفتہ رفتہ قوت پکڑ کر خلیفہ پر حاوی ہوتے گئے۔ سلجوقی ترکوں کا ظہور گیارہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں ہوا۔ سلجوقی ترک خلفاء بغداد کے ملازم بھی نہیں رہے انہوں نے وسط ایشیا ہی میں اسلام قبول کیا اور بڑے راسخ العقیدہ و پرجوش مسلمان ثابت ہوئے اور بہت جلد ان کی سیادت کا دائرہ سوائے مصر کے قریباً پورے اسلامی علاقہ تک وسیع ہو گیا۔ خواجہ نظام الملک طوسی ان ہی کا مشہور وزیر ہوا ہے۔ سلجوقیوں کے عروج کے وقت اول الذکر ترکوں اور اسی سلسلے کے دوسرے ترکوں کا زور ختم ہو چکا تھا اور سلجوقیوں کے عروج کے وقت خلفاء بغداد پر آل بویہ کا اثر تھا۔ غرض معتصم کے بلائے ہوئے ترکوں اور سلجوقیوں میں کوئی تعلق نہیں۔ (مترجم)

کو آزاد کرنے کی خاطر صلیبی مجاہد زائروں کی ایک بڑی مسلح جماعت کی حیثیت سے آپہنچے؛ بیت المقدس میں بادشاہت قایم کرتے والے یہی مہم جو زائر تھے اور اس بادشاہت کو باقی رکھنے کے لیے بعد کو سال بسال جو لوگ آتے رہتے تھے وہ بھی اسی قسم کے مہم جو زائر ہوتے تھے کلیسا کے زیر اثر جاگیرداری نظام کا جوار تھا، ہوا وہ بھی حروب صلیبیہ کا ایک دوسرا اور متوازی سبب تھا۔ گیارہویں صدی عیسوی سے مجالس کلیسا اور پاپاؤں کی توجہ، خانگی جھگڑے ٹنٹوں کے بارے میں فوجی معاشرہ کے جھگڑالو جذبات کی طرف مصروف رہی۔ پہلے پہل تو انہوں نے اندرونی جھگڑوں کو امن اور ہدنۃ خدا جیسے اداروں کے ذریعہ روکنے کی کوشش کی: بعد میں ان جذبات کے رُخ کو "عدل" و "احترام" کی جنگوں کی طرف پھیرنا چاہا۔ اس مطلب کے لیے انہوں نے کچھ تو مہم جو کی رسم افتتاح کے موقع پر ـــ حق کی حمایت کرنے اور ظلم و زبردستی کو روکنے کے لیے ـــ اس کے ہتیاروں کو وقف کرنا شروع کیا، اس طرح انہوں نے ایک نئے نظام فتوۃ کے پیدا کرنے میں مدد دی؛ اور پھر کچھ اس بات کا مطالبہ کرکے اپنا مقصد پورا کرنا چاہا کہ خانگی جھگڑوں فساد والی برائی کو کافروں کے خلاف جنگ کرنے کے تقدس سے بدل دینا چاہئے: چنانچہ پوپ اربن دوم نے کلرمونٹ میں صلیبی جنگوں کی تبلیغ کرتے ہوئے ۱۰۹۵ء میں ایسا ہی کیا۔ اس طرح داخلی امن و امان کے مقصد کے رشتہ کو مقدس جنگ کے رشتہ سے جوڑ دیا گیا؛ اور یکے بعد دیگرے متعدد کلیسائی مجلسوں نے ایک ہی سانس میں عارضی ربانی صلح اور نصرانی جہاد دونوں مقاصد سے اتفاق کرنا شروع کیا۔

یہاں تک تو صلیبی جنگوں میں "معراج زائر" اور "جہاد مقدس" دونوں حیثیتوں کا رنگ نمایاں ہے۔ لیکن مسیحی جہاد ان دونوں سے کچھ زیادہ تھا یا ان سے کچھ کم بھی تھا۔ سب سے پہلے تو یہ بات تھی کہ اس سے جاگیری کثرت آبادی کا مسئلہ حل ہوتا تھا۔

جاگیری امراء کے چھوٹے لڑکوں کو اپنے وطن میں بہت کم مواقع تھے مثلاً (Tranored 'l' Hantaville) کے بہت سے جانشینوں کی بہت سی اولاد اچھی طرح زندگی نہ گذار سکتی، اگر صقیلہ میں کوئی نارمن بادشاہت یا بیت المقدس میں کوئی لاطینی بادشاہت قایم نہ ہوئی تھی۔ اس قسم کی بادشاہتیں جاگیری نوآبادیاں تھی؛ یہ جاگیری توطن پذیرں کے لیے نکلنے کا راستہ مہیا کرتی تھیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس سے ترقی پذیر اطالوی بندرگاہوں کی تجارتی امنگوں کے لیے ایک نئے منفذ کا موقع فراہم ہوتا تھا؛ شامی ساحل پر کی دینی، پیوی اور جنیوی باشندوں کی کوٹھیاں کہ ایشیائی تجارت کے بڑے رستوں پر منڈیوں کا کام دیتی تھیں، لاطینی توطن پذیری کی تاریخ میں کوئی معمولی عنصر نہیں ہیں۔ اطالوی جہاز توسب سے پہلی صلیبی جنگ ہی میں صلیبی مجاہدوں کے ساتھ آئے اور ان کی ترقی میں مدد دی، محاصروں کی جنگ کے لیے اطالوی شہروں کی مدد ناگزیر تھی جس کی وجہ سے بعد کو بیت المقدس کی بادشاہت نے نشوونما حاصل کی؛ اطالوی ذرایع حمل ونقل زائروں کے سالانہ قافلوں کو لاتے لے جاتے تھے؛ اور بھلائی برائی دونوں کے لیے صلیبی جنگوں کے روحانی محرک میں تجارتی غرض بھی شامل ہوتی تھی۔

(٦) یہ تھے وہ مختلف عناصر جن کے ساتھ شام میں مسلمانوں کی پھوٹ کے خوش آئند وقع نے مل کر بالڈون اول اور بالڈون دوم کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ۱۱۰۰ء اور ۱۱۳۱ء کے درمیان یروشلم کی بادشاہت قایم و مستحکم کرسکیں لیکن یہ بادشاہت ابھی قایم ہوئی ہی تھی کہ اس کی تباہی کا خطرہ شروع ہوگیا۔ نصرانی دباؤ نے اسلامی ردعمل پیدا کیا۔ موصل اس ردعمل کا مرکز تھا۔ اس مقام پر سلجوقی سلطنت کے کھنڈروں میں ——— اس لیے کہ پہلی صلیبی جنگ شروع ہونے سے قبل ہی سلجوقی سلطنت زوال پذیر ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی۔ ——— ۱۱۲۷ء کے قریب اتابک زنگی

کی شخصیت نمودار ہوئی ۔ اس نے اپنی طاقت اپنے رقیب امراء میں بڑھانی شروع کی اور ۱۱۴۴ء میں لاطینیوں سے الرہا چھین لیا ۔ لاطینیوں کی ترقی میں سب سے پہلی اور سخت رکاوٹ یہی تھی ۔ اس کا جانشین نورالدین (۱۱۴۶ء تا ۱۱۷۴ء) جوابی جنگ (جہاد) کے مذہبی جذبے سے بہت سرشار تھا؛ اس کے دوران حکومت میں اس کا سپہ سالار شیرکوہ اور شیرکوہ کا بھتیجا صلاح الدین مصر فتح کرکے اس کو اپنے آقا کی زیر سیادت لا چکا تھا ۔ چونکہ اب موصل و شام دونوں طرف سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور جہاد کا تازہ ولولہ ٹھنڈے پڑے ہوئے صلیبی جوش سے مقابلہ کے لیے تیار تھا اس لیے بادشاہت کے لاطینیوں نے جلد ہتیار ڈال دیے ۔ جولائی ۱۱۸۷ء میں نصرانیوں کو حطین پر شکست اٹھانی پڑی؛ اسی سال اکتوبر میں بیت المقدس بھی فتح ہو گیا ۔ صلاح الدین کو اپنی تمناؤں کا پھل مل چکا تھا؛ مسجد اقصیٰ میں پھر اذاں کی آوازیں آنے لگیں، وہ مسجد اقصیٰ جہاں تک ایک رات اللہ نے اپنے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سیر کرائی تھی ۔

تیسری صلیبی جنگ صلاح الدین کے انجام دیے ہوئے کام کو نقصان پہنچانے میں ناکام رہی ۔ تب بھی شمال شام میں لاطینی کچھ مدت کے لیے انطاکیہ وترپولی کے شہر پر قابض رہے ۔ اسلحہ کی قوت سے نہیں بلکہ سیاست کاری سے شہنشاہ فریڈرک دوم نے ایک مختصر مدت (۱۲۲۰ء، ۱۲۴۴ء) کے لیے شہر یروشلم دوبارہ حاصل کرلیا؛ لیکن یروشلم کی بادشاہت ختم ہو چکی تھی ۔ تیرہویں صدی عیسوی میں بہت سی صلیبی جنگیں ہوئیں لیکن جیسا کہ بہت ٹھیک کہا گیا ہے یہ جنگیں "سوائے فلسطین کے ہر جگہ" ہوتی رہی ۔ صلیبی مجاہدوں کو اپنے مقصد میں شبہ پڑ گیا تھا؛ اور وہ اسی بے یقینی کی حالت میں قسطنطنیہ (۱۲۰۲ء تا ۱۲۰۴ء) سے مصر (۱۲۱۸ء تا ۱۲۲۱ء اور ۱۲۴۹ء تا ۱۲۵۰ء) بلکہ تونس (۱۲۷۰ء) تک مارے مارے پھرتے رہے ۔ صرف ایک صلیبی جنگ میں

کامیابی ہوئی اور یہ جنگ نصرانی شہر قسطنطنیہ فتح کرنے اور کچھ مدت (۱۲۰۴ء تا ۱۲۶۱ء)
کے لیے فرانسیسیوں اور اہل وینس میں منقسم کرنے میں کامیابی ہوئی۔ قسطنطنیہ نے صلیبی
جنگیں برپا کرنے میں جو کچھ حصہ لیا تھا وہ ان ہی کے ساتھ ختم ہو گیا؛ اور اگر وہ دو صدیوں
کے درمیان میں ——— ۱۲۶۱ء سے ۱۴۵۳ء تک ——— اپنی کم زور زندگی گذارنے
کے لیے دوبارہ زندہ ہوا بھی تو اس کو موریہ فرانسیسیوں کے دست تصرف میں اور
اقریطش بحیرۂ ایجنیہ کے مجمع الجزائر اہل وینس کے قبضہ میں دینے پڑے۔ پہلی صلیبی جنگ
فرانسیسی جاگیرداری نظام اور اطالوی شہروں کی بحری قوت کے تعاون سے ہوئی۔
تیرویں صدی عیسوی میں فرانسیسی جاگیرداری نظام کی توجہ یونان کی طرف مبذول رہی
اور اسی دوران میں اہل وینس و اہل جینیوا مشرق سے تجارت کرنے والی جدید منڈیاں
کریمیا و بحیرۂ اوزاف پر قایم کرتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فلسطین کو لاوارث جہاز
کی طرح چھوڑ دیا گیا اور مرکز ثقل رومی مشرقی شہنشاہیت کے کھنڈروں میں منتقل ہو گیا
ہے۔

لیکن تیرویں صدی عیسوی کے نصف اول میں امید کی ایک نئی کرن نظر آئی؛
اور ایشیائی معاملات کی جدید تبدیلی پر مغرب میں مسرت کا اظہار کیا گیا کیونکہ اس سے
خوش آئند باتوں کی توقع ہو رہی تھی۔ چنگیز خاں نے ایک عظیم الشان منگول سلطنت قایم
کر دی تھی جو نصرانی تھی اور نہ اسلامی۔ یہ سلطنت مشرق میں پیکن سے لے کر دریائے
ڈینیپر تک اور مغرب میں فرات تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کو چار خوانین میں تقسیم کیا گیا تھا
اور ہر خان کا علاقہ ایک سلطنت کا رتبہ رکھتا تھا؛ خصوصاً ایرانی حصہ، جس کا صدر مقام
تبریز تھا، مشرقی بحیرۂ روم سے اتنا قریب تھا کہ اس کا یہاں کے معاملات میں شریک
ہو جانا آسان تھا۔ منگول رواداری تھے: ایشیائے کوچک کے نسطوری نصرانی ان کے
زیر حکومت پھولتے پھلتے رہے، تو پھر کیوں نہ ان کو نصرانی بنا لیا جائے؟ اور آخر کار

کیوں نہ حروبِ صلیبیہ کے بنیادی مقصد کو ایسے بڑے پیمانہ پر حاصل کرلیا جائے جو اس سے پہلے کبھی خواب میں بھی نہیں دکھائی دیا تھا؟ سفرا آئے اور گئے: پوپ انوسنٹ چہارم نے جان ڈی پیان کارپن کو ۱۲۴۵ء میں ایک بڑے سفر پر روانہ کیا اور لوئی نے ولیم ربروتی کو بھی ۱۲۵۰ء میں ایک دوسرے سفر پر روانہ کیا مبلغ مصروف کار تھے اور چین جیسے بعید تر مقام پر بھی کلیساؤں کی بنیاد پڑچکی۔ یہ محض ایک خواب تھا: فلسطین کو کوئی مدد نہیں ملی۔ انطاکیہ و تریبولی اور جو چند چھوٹے چھوٹے مقبوضات بیت المقدس کی پرانی بادشاہت کے ساحل پر لاطینیوں کے قبضہ میں رہ گئے تھے ان کو کچھ عرصہ کے لیے آزاد چھوڑدیا گیا۔ اختلافات کی وجہ سے صلاح الدین کے جانشینوں میں پھوٹ پڑگئی تھی، اور لاطینی ان ہی اختلافات کی برکت سے باقی رہے۔ لیکن مصر کے ملوک سلاطین کے ساتھ احیا شدہ مجاہدانہ اسلام پیدا ہوچکا تھا: ملوک سلاطین نے ۱۲۵۰ء میں قاہرہ کے تخت پر قبضہ کیا۔ ان سلاطین کے گل سرسبد بیبرس نے ایران کے منگولی خان کو شکست دے دی جس نے ایک مرتبہ شام میں قدمچہ قایم کرنے کی کوشش کی تھی: اس نے دمشق پر قبضہ کیا (۱۲۶۰ء) ضلع انطاکیہ کا زور توڑدیا اور آخرکار اس کو اپنے مقبوضات سے ملحق کرلیا (۱۲۶۸ء)۔ اس کے جانشین قلاؤن نے تریپولی فتح کرکے اپنے ممالک محروسہ میں شامل کرلیا (۱۲۸۹ء): اور اس کے بیٹے و جانشین خلیل نے عکہ بھی فتح کرلیا (۱۲۹۱ء) کہ شامی ساحل پر لاطینیوں کی آخری پناہ گاہ تھی۔ تیرہویں صدی ختم ہونے ہونے تک ایشیائے کوچک کے علاقہ خاص سے لاطینی نصرانیت کا بالکلیہ اخراج ہوچکا۔

نصرانیت صرف جزیروں میں باقی رہی۔ قبرص، جس کو رچرڈ اول نے تیسری صلیبی جنگ میں یونانیوں سے لڑکر حاصل کیا تھا، لوسگنی بادشاہوں کے زیر حکومت فلسطین کے لاطینی جاگیرداروں کا ملجا و ماوی بن گیا۔ آئین، یروشلم کے جاگیرداری آداب اسی مقام پر چلتے رہے اور ان کی تدوین بھی یہیں ہوئی، آزاد ریاست کی حیثیت سے

قبرص کی بادشاہت ۱۴۸۹ء تک باقی رہی اور اس کے بعد اہل وینس کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ اسی طرح مکمل طور پر عکہ ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ہم جودوں نے ۱۳۰۹ء میں جزائر رہوڈ پر قبضہ کر لیا اور ۱۵۲۳ء تک کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو جزیرہ میں سنبھالے رکھا، اس کے بعد وہ مغرب اور مالسٹہ منتقل ہو گئے۔ بزمانہ قرون وسطیٰ مشرقی بحیرۂ متوسط میں لاطینیوں کی موجودگی کی چند بہترین یادگاریں ان ہی دو جزیروں میں اب بھی باقی ہیں۔ اس طرح جس زمانے میں قبرص اور جزائر رہوڈ میں جاگیری امارت قایم ہو چکی تھی اہل وینس اقریطش اور شمال کے متعدد جزیروں پر قابض تھے؛ یہ گویا چوتھی صلیبی جنگ کا مال غنیمت تھا؛ اور اہل جنیوا کو جینیوں نے ۱۲۶۱ء میں پالیولوگی کو قسطنطنیہ کا تخت دوبارہ حاصل کرنے میں مدد دی تھی، نہ صرف پیرا کا محلہ انعام میں دیا گیا بلکہ جزائر لسباس اور کیو اس ـــــ پر قبضہ کر کے انھوں نے اپنے آپ کو خود بھی انعام دے لیا۔ اس لیے قرون وسطیٰ کے اختتام تک لاطینی نصرانیت نے مشرقی بحیرۂ متوسط پر اپنا قبضہ قایم رکھا؛ خواہ وہ جزیروں تک ہی محدود کیوں نہ رہی ہو اور گو اس کے مقبوضات اسلامی اقتدار سے چھینی ہوئی فتوحات کی بجائے بازنطینی سلطنت کے کھنڈر ہی کیوں نہ ہوں تاہم لاطینی نصرانیت نے اپنے مقدس مرکزوں سے اسلام کے خلاف جنگ جاری رکھی اور صرف اس وقت اس کشمکش سے دست کش ہوئی جب عثمانی ترکوں کی فتوحات نے مشرقی بحیرہ متوسط کو بند سمندر میں تبدیل کر دیا۔ بلاشبہ ۱۶۶۰ء تک بھی کاندیہ سرنگوں ہوا اور نہ وینس نے سرزمین شام و فلسطین پر کے اپنے آخری بڑے قلع کو ہاتھ سے جانے دیا۔

ب

(ا) مشرقی بحیرۂ متوسط میں مغربی نصرانیت کی طویل مہموں اور مشرقی مسلمانوں سے

لہ۔ ملاحظہ ہو اسٹبز کے "تاریخ عہد وسطیٰ و حالیہ" پر خطبات میں سے قبرص کے متعلق دو خطبے۔ Stubbs

اس کے ہوں تعلقات سے کیا نتائج نکلے ؟ اس سوال کے درحقیقت دو رخ ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ سوال مشرق و مغرب کے تعلق کی صرف ایک شکل کے نقطۂ نظر سے حروب صلیبیہ کے ثمرات کا ہے ـــــ مغرب پر مشرقی عناصر اور مشرق سے لی ہوئی تحریکوں کے اثر کا سوال اس کے بعد مغربی معاشرے کے دائرہ میں عمل پذیر ہونے والی عام تحریک کے نقطۂ نظر سے حروب صلیبیہ کے اثرات کا سوال ہے ـــــ مغربی معاشرہ پر ایک ایسی تحریک کے اثرات کا سوال جو خود اس سے فوراً پیدا ہوئی اور اسی پر زبردست ردعمل کیا۔ مورخوں نے اکثر ان دو سوالوں کو گڈمڈ کر دیا ہے لیکن اس پریشان خیالی نے جو مغالطے پیدا کیے ان کو اس سوال کی تفریق و تقسیم روک سکتی تھی۔

مثال کے طور پر اس قسم کے مبالغہ آمیز بیانوں کے لیے ہم ہنے اَم روش کی "عام تاریخ تہذیب" سے اس حصہ کو پیش کر سکتے ہیں جو حروب صلیبیہ سے بحث کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرون متوسط کی تمام نشو و نما کو حروب صلیبیہ ہی سے منسوب کیا گیا ہے بلاشبہ مذہبی میدان میں صلیبی جنگوں نے پاپائی نظام کی سطوت کو گھٹایا، رہبانیت پر ناقابل تلافی اثر ڈالا اور نصرانیت سے مخالف عقیدوں کی ترقی میں مدد دی۔ معاشری و معاشی میدان میں مختلف طبقوں کے درمیان عظیم تر مساوات پیدا کی، آزاد کاشت کاری کو ترقی دی، صناعوں کی برادریوں کو نشو و نما دی اور تجارت و صنعت کے پھولنے پھلنے میں مدد دی۔ سیاسیات کے میدان میں حروب صلیبیہ کے بعد ہی ریاستوں کا نظام پیدا ہوا، حکومت کی مرکزیت میں اضافہ ہوا، تحریری قوانین منضبط ہوئے اور ایک باقاعدہ عدالتی نظم و نسق نمودار ہوا۔ تہذیب کی عظیم المرتبت دنیا میں صلیبی جنگوں کے بعد ہی فلسفہ نے اپنے سب سے بڑے مفکر پیدا کیے اور ان محاربات کی وجہ عربوں سے جو تعلقات قایم ہوئے ان کو استوار کیا، حتیٰ کہ تصوف نے بھی علمی حیثیت اختیار کی قدیم زبانوں کے مطالعہ نے وسعت و بارآوری میں ترقی کی، تاریخ نگاری اور جغرافیہ نے

نئی قوت حاصل کی؛ مقامی شاعری پیدا ہوئی؛ عزلی فن تعمیر رومی طرز تعمیر کا وارث ہوا اور بُت تراشی و مصوری میں لطیف تر مذاق رونما ہوا۔

کچھ اس قسم کی پریشان خیالی، اسی قسم کا مبالغہ اور "اس کے بعد لہذا اس کی بنا پر" Post hoc ergo propter hoc والا مغالطہ ہانس پرٹسٹر[1] کی فاضلانہ و مرعوب کن کتاب "حروب صلیبیہ کی تہذیبی تاریخ" میں بھی ہویدا ہے۔ یہ ایک زبردست عالمانہ کتاب ہے لیکن بعض حیثیتوں سے اصلاً غیر تنقیدی ہے۔ پہلی بات یہ کہ پرٹسٹر اس طرح لکھنے پر مائل ہے گویا ۱۱۰۰ء و ۱۳۰۰ء کے درمیان دو صدیوں میں یورپ کی ترقی میں حروب صلیبیہ ہی ایک عنصر ہے اور یہ کہ ان دو سو سالوں کے نشو و ارتقاء کی علت العلل صرف اسی ایک عنصر میں موجود ہے اور ان ہی عناصر نے مشاۃ ثانیہ، عہد انکشاف و عہد اصلاح کے جدید یورپ کو پیدا کرنے میں مدد دی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت سے عناصر میں صلیبی جنگیں بھی ایک عنصر تھے؛ جب ہم اس کو ایک ہی اور عمومی حیثیت سے سمجھاتے ہیں تو "علت واحد" کے مغالطہ کو "اس کے بعد لہذا اسی کی بنا پر" والے مغالطہ سے ملا دیتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ گو پرٹسٹر تسلیم کرتا ہے کہ اسپین و صقلیہ عربی اثرات کے اہم ذریعے تھے لیکن اس سلسلے میں وہ خود اپنے تسلیم کیے ہوئے بیان کو بھول لینے اور فلسطین کو بڑی حد تک اور قریباً تنہا ذریعہ بتانے کی طرف مائل ہے۔ وہ لکھتا ہے: "تہذیبی نشو و نما کے بہت سے علاقوں میں فلسطین ایسا مقام ہے جہاں ہم کو فرنگیوں میں مشرقی و مغربی عناصر کا پہلا مستقل تعلق ملتا ہے اور یہی وہ مخلوط ذخیرہ ہے جس کے متعلق کہنا چاہتے کہ یہ مشرق و مغرب کے درمیان عمل ارتباط کا پیش خیمہ ہے۔"[2] یہاں ہم پھر "علت واحد" کے مغالطہ کا مشاہدہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے

---

[1] Miltelalters برلن ۱۸۸۳ء پانچ کتابوں میں۔ جن میں سے چوتھی کتاب معاشی تہذیب پر ہے اور پانچویں کتاب جو تاریخ تہذیب پر حروب صلیبیہ کے اثرات پر مشتمل ہے خاص توجہ کی مستحق ہے۔

[2] صفحہ ۴۵۲۔ از روئے انصاف یہ بھی کہنا ہے کہ پرٹسٹر یہ مانتا ہے کہ "مشنیں کیمیائی زندگی کے میدان میں اصولاً ایک مختلف عمل کا کام کرتا معلوم ہوتا ہے۔"

اور جب ہم کو یہ یاد آتا ہے کہ دوسرا سبب یعنی اسپین و صقلیہ میں مشرقی و مغربی عناصر کا ارتباط
زیادہ قوی و گہرا تھا تو یہ مغالطہ اور زیادہ بڑا معلوم ہوتا ہے۔ سب سے آخر یہ کہ پرٹز کی
کتاب پڑھتے ہوئے اس تاثر سے بچنا مشکل ہے کہ تقریباً ۱۱۰۰ء میں جو دو تہذیبیں تھیں ان کا ۲
موازنہ کرتے ہوئے اس نے لاطینی تہذیب کو گھٹایا اور عربی مشرق کی تہذیب کو بڑھایا ہے
تاکہ محاربات صلیبی کے اثرات دکھانے کے لیے زیادہ جگہ نکلے اور جتنا ہماری شہادت تسلیم
کرنے کی اجازت دیتی ہے اس سے زیادہ بیان کرنے کے لیے اس نے گویا زیادہ مال درآمد ۳
کرنے کے لیے خالی بازار مہیا کیے ہیں ٹھیک اسی زمانے میں مغربی یورپ عظیم الشان گرگوری
دور سے گذر رہا تھا، فکر و نظر کو اسی زمانے میں ترقی ہو رہی تھی جن کا منتہا ابیلارڈ میں ملتا ہے،
فرانسیسی دینی مجلس کو اسی عہد میں عروج حاصل ہوا، تامینوں کی قوت اور ان کے طرز تعمیر کا
پھیلانا اسی زمانے سے متعلق ہے، وہ صنعتی و تجارتی انقلاب بھی اسی زمانے میں رونما ہوا
جس کا سراغ گیارویں صدی کے آخری زمانے میں ملتا ہے۔ درآں حالیکہ ——————
۱۱۰۰ء کے قریب مشرق کی عربی تہذیب اپنے عروج پر نہیں تھی۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے اس کے
برخلاف صلیبی جنگوں کے شروع ہوتے وقت مشرق کی ترقی کا آفتاب ڈوب رہا تھا؛
ہمیں یہ بات کبھی نہ بھولنی چاہئیے کہ جہاں تک تاریخ تہذیب کا تعلق ہے ایک نیا اور ترقی
پذیر مغرب ایک پرانے اور زوال پذیر مشرق پر حملہ آور ہوا تھا۔

(۳) "صلیبی جنگ" یہ دو لفظ گویا جادو کا ایک بول ہے اور جادو کے بول کی حیثیت ۲
مقناطیس کی سی ہوتی ہے جو اپنے دائرہ اثر میں بہت سی غیر ضروری باتوں کو کھینچ لاتا ہے۔
ہر وہ چیز جو حروب صلیبیہ کے دوران میں مغربی یورپ میں واقع ہوئی اس سے متعلق نہیں
تھی ——— بہت کم ایسی تھیں جو اس کی آفریدہ ہوں۔ اگر کوئی صلیبی جنگ نہ ہوئی ہوتی
تو بھی غالباً مغربی نصرانیت اپنی تجارت کو مغربی بحیرہ متوسط تک لے آتی اس لیے کہ گیارہویں
صدی عیسوی کے نصف آخر میں اس کی شہری زندگی اور تجارت تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔

مغربی تجارت بحیرۂ اسود کے شمالی کنارے مشرقی کاروانی رستوں کی آخری حدود پہ اپنی منڈیاں قایم کرنے کی کوشش کرتی جہاں سے اس کو وہ شاہ راہ مل جاتی جو بحیرۂ خزر کے شمال اور بحیرۂ ارال کے مغرب سے ہوکر بخارا و سمرقند کو جاتی ہے؛ یا پھر شاہی بندرگاہوں میں اپنی کوٹھیاں قایم کرتی جہاں سے وہ فارس و خلیج فارس پہنچ سکتی اور اس طرح اس کو وہ بحری رستہ مل جاتا جو ہندوستان اور وہاں سے چین کو جاتا ہے۔

محاربات صلیبی نے جو کچھ کیا یہ تھا کہ اس کی وجہ سے شام میں ایک جاگیری ریاست قایم ہوگئی جس پر کچھ تو انفرادی طور پر جاگیردار قابض تھے اور کچھ صلیبی سورمائیں اور فوجی راہبوں کی اجازت یافتہ تحریکیں متصرف تھیں؛ شام کی اس جاگیری ریاست کے ساتھ کچھ مدت کے لیے تجارتی جذبہ خاص طور پر وابستہ رہا اور اس سلسلے میں اس نے اپنی حدود میں مختلف احاطے بنا دیے تھے جن میں وینس، جنیوا، اور پیسا کے باشندے ساحل کے کنارے کنارے بندرگاہوں میں بس گئے تھے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ یہ تجارتی جذبہ بلاشرکت غیرے صرف ان شاہی احاطوں ہی سے وابستہ نہیں تھا: اور یہ کہ وہ قسطنطنیہ اور بحیرۂ اسود سے بھی اپنے تعلقات رکھتا تھا؛ مزید یہ کہ چوتھی صلیبی جنگ کے بعد اور تیرویں صدی عیسوی کے دوران میں یہ تعلقات زیادہ گہرے اور زیادہ متنوع ہوگئے تھے۔ بہرطور بارویں صدی کے دوران یعنی پہلی اور تیسری صلیبی جنگ کی درمیانی مدت میں شام نصرانیت اور مشرقی بحیرہ متوسط کے مسلمانوں کے تعلقات کا خصوصی مرکز توجہ بنا رہا۔ مغربی نصرانیت پر یہاں اسلام اپنا اثر ڈال سکتا تھا؛ اسلامی اثرات کچھ تو جاگیری ریاست پر ——— اس کے راست تعلق اور مغرب پر اس تعامل کے ردِعمل کے طور پر ——— پڑتے تھے اور کچھ تجارتی شاہراہوں پر عمل تقطیر سے۔ یہی وہ راہ ہے جس کا ہمیں مطالعہ کرنا ہے۔

مگر یہ بھی یاد رکھنا اور دہرانا ضروری ہے کہ اسلام اسپین اور صقلیہ پر مسلط ہوچکا تھا

اور وہاں سے بھی وہ مغرب پر اثر ڈال سکتا تھا۔ وقتِ واحد میں کئی قوتیں کام کر رہی تھیں؛ گو ہم کسی ایک قوت کے حقیقی و انفرادی دائرہ اثر کو متعین نہیں کر سکتے تاہم یہ قیاس قایم کر سکتے ہیں کہ اسلام نے موصل، بغداد و قاہرہ کے صدر مقاموں سے مغربی نصرانیت پر اتنا زیادہ گہرا اثر نہیں ڈالا ہے جتنا کہ اسپین و صقلیہ کے صدر مقاموں سے ۔ اس قیاس کی تقویت کے دو سبب ہیں - پہلا یہ کہ شام میں تمدنوں کے اختلاط کا ویسا قوی اثر کبھی قایم نہیں ہوا جیسا کہ ہم کو روجر دوم اور فریڈرک دوم کے زمانے میں صقلیہ میں نظر آتا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ شام کے لاطینی باشندوں نے اسلامی تہذیب کے ذخیروں کو اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہ خود ان سے قریب و متصل تھے لیکن یہ لوگ اسلامی تہذیب کو خارجی طور پر اس طرح اختیار کرنے کے کبھی قابل نہیں ہوئے جس طرح کہ مغربی بحیرۂ متوسط کے نصرانی جنہوں نے قرطبہ و اسلامی اسپین کے تمدن کو اختیار کیا تھا۔

یروشلم کی لاطینی بادشاہت میں تہذیبی اختلاط کا فقدان بلکہ کسی درجہ کی تہذیب کا فقدان قابل لحاظ بات ہے۔ صقلیہ میں مختلف ذخیروں کے ——— یونانی، نارمنی، لمباڑڈی، عربی و بربری میل طاپ نے ایک غیر معمولی مخلوط تمدن پیدا کیا۔ یہاں ہم کو نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ نارمن بادشاہوں کے دربار میں عرب جغرافیہ دانوں اور شاعروں کی سرپرستی کی جاتی تھی بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک بادشاہ کا وزیر خاص ولیم اول کے لیے افلاطون کی دو کتابوں Phaedo اور Memo اور ارسطو کی علم حوادث سماوی کے ایک حصہ نیز دیوجانس لارطوس کی تحریروں کا ترجمہ کرتا ہے۔ فریڈرک دوم کا دربار اس سے زیادہ مشہور تھا؛ جیسا کہ دانتے نے اپنی کتاب De Volgari Eloquio میں لکھا ہے اطالوی شاعری کی ابتدا اسی مقام پر ہوئی؛ ارسطاطالیسی فلسفہ کی تشریح کے مابہ النزاع سوالوں کو خود ایک بادشاہ اسی مقام پر مرتب کر سکتا تھا یا اس کے لیے مرتب ہو سکتے تھے۔ یہ کتاب یعنی "سوالات صقلیہ" ایک عربی مخطوطے کی صورت میں

اب بھی باڈلین کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یروشلم کی فوجی بادشاہت ایک بھدی فوجی نوطن پذیری تھی جس میں تمدنی خوبیاں پیدا کرنے کا کوئی ولولہ نہیں تھا یا کم سے کم ایسا کرنے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ یہ ایک بیرونی انبوہ تھا جو قلعوں اور چھاؤنیوں میں پڑا ہوا تھا۔ شامی دیہات میں زمین جوتنے والوں یا شہروں میں ان صناعوں سے اس کا کوئی قریبی تعلق قایم نہیں ہوا جو اس زمانے کی طرح آج بھی بافندگی، کوزہ گری اور طلائی و نقرئی صنعتوں میں مصروف رہتے ہیں۔ لاطینی ایک تنگ ساحلی علاقہ میں منتشر طور پر پھیلے ہوئے تھے اور ان کو ایک وسیع اور گنجان اسلامی علاقہ کے مقابلہ میں اس کی مدافعت کرنی پڑتی تھی؛ گو وہ محسوس کرتے تھے کہ وہ بیت المقدس کے نور سے فیض یاب ہو رہے ہیں اس لیے کہ بیت المقدس ان کے نزدیک دینی حرارت خانہ اور کرۂ ارض کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ قرون وسطیٰ کے بڑے بڑے تمدنی مرکزوں سے دور ہوگئے تھے جو اس وقت روم و پیرس میں تھے۔

اگر ان میں جذب و اخذ کرنے کی صلاحیت ہوتی بھی تو (اور اخذ و قبول کرنے کے لیے ان کی مدت حکومت بہت مختصر تھی اور ان کا قیام بہت مشکوک و مخاصمانہ تھا) ان کے قریب کوئی ایسا اسلامی تمدن نہیں تھا جس سے وہ کچھ حاصل کر سکتے مغربی بحیرۂ متوسط کے پیش نظر عربی اسپین کی تہذیب موجود تھی۔ ابن رشد جیسا فقیہ، طبیب و فلسفی بارھویں صدی عیسوی کے آخر تک اس مقام پر تعلیم دیتا رہا؛ یہودیوں نے عربی فلسفہ سے اپنا تعلق اس مقام پر قایم کیا اور اس کے زیر اثر میمونڈ نے ارسطو اور عہد نامہ قدیم میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی؛ ۱۲۰۰ء سے پہلے تک لاطینی نصرانیت ارسطو کی تعلیمات کے لیے صرف اسی تنہا ماخذ سے فائدہ اٹھا سکتی تھی جو اس کے پاس بوتھیس کے کیے ہوئے ارغنون Organon کے ترجمہ کی صورت میں تھا لیکن اس کے بعد اس نے ارسطو کی تعلیمات سے زیادہ گہری واقفیت حاصل کی جامع طور پر

وہ کتب خانہ جو شہر کی فتح کے بعد اسپینیوں کے ہاتھ لگا وہ بعد کو عالموں کے لیے گنجینۂ فیض بن گیا؛ اور اسپین کا عربی ارسطو تیرہویں صدی عیسوی کی مدرسیت کا ایک ماخذ تھا۔ سب کچھ اسی پر ختم نہیں ہوا۔ سلسلہ کوہ پرنیز کے جنوب کی سرحدی جنگ شاعری کا موضوع بن گئی؛ اور ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ انگریزوں اور اسکاچستانیوں کی سرحدی لڑائیوں نے خاص ہمارے سرحدی گیت پیدا کیے ہیں یا جس طرح تارش میں یونانیوں اور ترکوں کی کشمکش نے بازنطینی رزمیہ نظم پیدا کی اسی طرح نصرانی اور پے نم کی لڑائیاں رومان کا گیت اور فسانۂ سِیَد کا موضوع قرار پائیں۔ مشرق میں صورت حال اس کے برخلاف تھی۔ یہاں عربی فلسفہ پہلی صلیبی جنگ تک انحطاط پذیر ہونے کے لیے شروع ہوا تھا؛ اور بارہویں صدی عیسوی کی کسی سرحدی جنگ نے کسی مقامی شاعری کو تقویت نہیں دی۔ ۱۰۳۷ء میں مشہور حکیم ابن سینا ہمدان میں فوت ہو چکا تھا؛ غزالی، جن پر یہ الزام عاید کیا جاتا ہے کہ وہ جس فلسفہ کے قائل تھے اسی کو انہوں نے تباہ کر دیا، ۱۱۱۱ء میں بمقام خراسان وفات پا چکے تھے اور ۱۱۵۰ء میں بغداد میں ایک خلیفہ کتب فلسفہ کے ایک ایسے کتب خانے کو آگ میں جھونک دیتا ہے جس میں خود ابن سینا کی تحریریں بھی شامل تھیں۔ ایسے زمانے میں مشرقی لاطینیوں کے لیے اسلامی علوم کا مطالعہ کرنا بہت مشکل تھا؛ اور نہ دئی نئی چیز پیش کرنے کے لیے ان کے گرد و پیش کا نیا پن ان کو ابھار سکتا تھا، ارض مقدس میں کوئی نئی شاعری پیدا ہوئی اور نہ کوئی فن جس جہانگرد شاعروں نے صلیبی جنگ کو اپنے گیتوں کا موضوع بنایا تھا وہ مغرب کے تھے؛ اگر کسی فُلیشر کا ٹری یا ولیم ٹائری کے دم قدم سے وقایع نگاری نے ترقی کی یا کسی جان ابیلبی یا کوئی فلب نواری نے قانونی کتابیں لکھیں تو صرف یہی ایسی پیداواریں تھیں جن کو ترقی دی جاسکتی تھی۔

اسی طرح یروشلم کی بادشاہی کے لاطینیوں نے تہذیب کی دنیا میں مشرقی مسلمانوں سے بہت ہی کم سیکھا اور خود بھی کسی ایسی چیز کو نشوونما نہیں دی جو مغرب کو متاثر کرسکتی۔

یقیناً اس پر بحث بھی ہو سکتی ہے کہ صلیبی جنگوں نے مغربی تمدن کے ارتقا میں جو خاص خدمت انجام دی وہ لاطینی نصرانیت کو اسلامی مشرق سے مربوط کرنا نہیں ہے بلکہ لاطینی نصرانیت کا بازنطینی سلطنت اور یونانی نصرانیت سے تعلقات پیدا کرانا ہے۔ پہلی صلیبی جنگ سے قبل کم نامی کی خلیج نے مغربی کلیسا اور سلطنت کو مشرقی کلیسا اور سلطنت سے جدا کر رکھا تھا۔ ۹۶۸ء میں لوٹپراں کریمونوی، اوٹو اول کی طرف سے ایک مشہور سفارت پر قسطنطنیہ جاتا ہے؛ ۱۰۵۴ء میں لیو نوبن لیو کے سفرا قسطنطنیہ میں نظر آسکتے تھے؛ لیکن مشرق و مغرب کے تعلقات صدیوں تک وقتی و شاذ و نادر ہی رہے۔ ۱۰۹۶ء کے بعد سے شاہان نورمنوسی نے مغربی دول سے مسلسل تعلقات قایم کر لیے تھے؛ ۱۲۰۴ء کے بعد لاطینی مشرقی شہنشاہیت میں توطن پذیر ہو گئے۔ تیرویں صدی عیسوی میں کورنیتھ کا فلامندری اسقف اعظم، ولیم ماربیکی اور اس کا ہم کار رہنمائی برابنتی سینٹ تھامس کے ساتھ مل کر ارسطو کی "اخلاقیات" و "سیاسیات" کا ترجمہ کرتے اور مغرب کو یونانی فلسفہ کے ذخیرے تک پہنچانے کے لیے اسپین کے علاوہ ایک دوسرا رستہ پیدا کرتے ہیں۔ چودویں صدی کے آخر اور پندرویں صدی کے دوران میں بازنطینی عالموں نے یونانی اندوختہ کی پوری دولت اطالیہ منتقل کر دی اور اس طرح اطالوی نشاۃ ثانیہ کے لیے یونانی مواد مہیا کیا۔ گو صلیبی جنگ کا خاص سیلاب قسطنطنیہ پر سے نہیں گذرتا تھا لیکن مغرب کے لیے علم و ادب کا گراں ترین ذخیرہ انھوں نے قسطنطنیہ ہی سے واپس دلایا۔

(۳) بایں ہمہ ایسے طریقے تھے جن سے حروب صلیبیہ نے مغربی یورپ کے ارتقا کو متاثر کیا ہے، اس اثر کا ذریعہ شام کی طرف ان کی توجہ اور وہ لاطینی ریاست تھی جو ان کی وجہ سے عارضی طور پر قایم ہوئی تھی۔ سب سے اول اور سب سے آگے ہم لسانی شہادت پر توجہ دے سکتے ہیں —— ان مغربی الفاظ پر جو عربی میں داخل ہوئے اور ان عربی الفاظ پر جو مغربی زبانوں میں سرایت کر گئے۔ مغرب سے لیے ہوئے الفاظ کی

تعداد عربی میں بہت کم ہے۔ پرنسٹر نے مثال کے طور پر چار لفظ دیے ہیں جو عربی میں داخل ہوئے یعنی امپرور Impenator نسطل = Castellum برج = Burgus اور عرشہ = Grossus لیکن مغربی زبانوں میں جو عربی الفاظ لیے گئے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہم کو صرف انگریزی زبان کے Caravan (کاروان) Dragoman = (ترجمان) Jar = (جرہ) اور Syrup (مشرب) جیسے الفاظ پر قیاس کر لینا چاہئے؛ براعظم کی رومانی زبانوں نے عربی سے براہ راست الفاظ منتقل کیے ہیں لیکن انگریزی نے بہت بڑی حد تک براعظمی زبانوں سے بالواسطہ عربی الفاظ لیے اس لیے اگر ہم رومانی زبانوں کی طرف توجہ کریں تو معلوم ہوگا کہ مغرب نے عربی زبان سے جو الفاظ لیے ہیں ان کی فہرس بہت آسانی سے طویل ہوسکتی ہے مثلاً Douane = (دیوان) Gabelle = (قابل؟) Felucca = (فُلک) Chebec = (شُبک؟ سہ مستولی جہاز) اور اسی قسم کے الفاظ ملاحظہ کیجئے۔ لیکن ان مستعاروں کے انتساب میں نمایاں لسانیاتی مشکلیں ہیں۔ فلسطین ہی وہ تنہا مقام ہے اور نہ محاربات صلیبی کا دور ہی وہ زمانہ ہے جب کہ اس قسم کے الفاظ وضع ہوسکتے تھے۔ مستعار لینے کے دوسرے مقامات اسپین وصقلیہ بھی ہوسکتے ہیں۔ سوئز کی مشرقی و مغربی دونوں جانب عربی بولنے والی دنیا سے مغرب کے صدیوں کے تعلقات بھی دوسرے مقامات و دوسرے زمانے میں بھی ہوسکتے ہیں، خواہ یہ تعلقات تجارتی ہوں یا بحری قزاقی کے۔ یہ صحیح ہے کہ مغرب آج بھی تجارت میں Bazar = (بازار) Dinar = (دینار) Tariff = (تعریف) Zechin = (سکہ)، بحریات میں Admiral = (امیرالبحر) اور Arsenal = (دارالصناعہ)، گھریلو زندگی میں Alcove = (القبّہ) Carafe = (غرف) Mattress (مطرح) اور Sofa = (صفّہ) یا پھر Amulet (حُمُل؟) Elixir۔

(الاکسیر) اور Talisman = (طلسم) جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے نیز عربی موسیقی کی اصطلاحیں جیسے Lute = (عود) اور Naker = (نقارہ) اب بھی استعمال کرتا ہے یا کر چکا ہے۔ لیکن اس قسم کی اصطلاحوں کے رواج کو حروب صلیبیہ سے منسوب کرنے سے پہلے ہم کو عربی اور رومانسی علم الالسنہ کا مطالعہ کرکے ان کے رواج کا صحیح مقام اور ٹھیک زمانہ متعین کرنا پڑے گا۔

(۴) حروب صلیبیہ جنگوں کا ایک طویل سلسلہ ہے ـــــــ یہ جنگیں نئے دشمنوں کے خلاف نئے پیروؤں کو ساتھ لے کر اور نئے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اور بعض اعتبار سے نئے اصول فن کی تحت لڑی گئی۔ قدرتاً ہم کو یہ معلوم کرنے کی توقع ہونا چاہئے کہ ان جنگوں نے مغرب میں فن حرب کی نشو و ارتقاء پر کچھ اثر ڈالا ہوگا۔ بعض لکھنے والوں کی رائے ہے انگلستان میں ایڈورڈ اول ـــــــ کے عہد حکومت میں جس قسم کے "ہم مرکزی" قلعے عام طور پر تعمیر ہوئے وہ یروشلم کی لاطینی بادشاہت کے حربی فن تعمیر کے نمونوں پر بنائے گئے تھے اور خود یہ قلعے بھی عربوں کے ترمیم کردہ قلعوں کے نمونوں پر بنائے گئے تھے، جو اصلاً بازنطینی تھے لیکن جب عرب شام آئے تو وہاں انہوں نے ان میں ترمیم کر دی تھی۔ اس دلیل کی اتباع کرتے ہوئے پرٹنز یہ خیال کرتا ہے کہ گو فلسطین میں فوجی مدافعت کا عام خاکہ نارمنوں کے قلعہ گیری نظام کا خوشہ چین رہا ـــــــ مثلاً جس قسم کے قلعے ہم کو دریائے دلش کی وادیوں اور جنوبی ویلز میں ملتے ہیں ـــــــ لیکن وسیع تر قلعوں کے مختلف حصوں کی ترتیب نیز ان حصوں کے اضافہ میں عربی اثرات کا سراغ لگایا جا سکتا ہے جن کا مغرب کے قدیم تر فوجی طرز تعمیر میں فقدان ہے، اور مدافعت کے بہت سارے نئے طریقوں میں بھی ان اثرات کا پتہ لگ سکتا ہے جن کو معانیات محاصرہ کے اصول فن نے ضروری بنا دیا تھا اور جو مشرق میں ترقی پائے تھے۔ اس طرح یہ عالم دوہری فصیل جو "ہم مرکز" قلعوں کا جزو لازم ہے کے استعمال اور دو فصیلوں کے درمیان ایک

مزید مینار یا دیدبان کی تعمیر کو عربی مصادر سے ماخوذ بتاتا ہے۔[1] اس کا یہ بھی قیاس ہے کہ Vexin میں رچرڈ اول کا بنایا ہوا مشہور قلعہ Chateau Gaillard مشرقی اثرات کا اظہار کرتا ہے۔ دوسری طرف اس بات پر بھی اصرار کیا جاتا ہے کہ "ہم مرکز" قسم کے قلعے مغرب میں نشوونما پا لیے اور صلیبی مجاہد اس کو مشرق لے گئے؛ بہرطور اتنا تو یقینی ہے کہ یہ نارمنوں کی ہندسی مہارت خود اپنے ہی ذرایع سے اس قسم کی طرز تعمیر کو نشوونما دینے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی جس کا اظہار فلسطین میں ہونے سے پہلے مغربی یورپ میں ہو چکا تھا۔ البتہ ہم یہ بات زیادہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ صلیبی جنگوں نے مصافیات محاصرہ کی نشوونما کو ترقی دی تھی ان کی وجہ سے نقب زنی اور سرنگ اندازی کے فن کا استعمال ہونے لگا، منجنیقوں کی گاڑیوں اور فصیل شکن آلات پیدا ہوئے اور شاید آگ اور آتش افروز مادوں کا استعمال بھی ہونے لگا لیکن یہاں بھی اس کی ابتدا کرنے والے عربوں سے زیادہ بازنطینی ہو سکتے ہیں اور ۱۱۵۹ء میں محاصرہ کریمیا میں ارض مقدس کے جس ماہر مہندس سے فریڈرک اول نے کام لیا تھا وہ شاید عربوں کا نہیں بلکہ یونانیوں کا شاگرد ہو۔ کہا جاتا ہے کہ صلیب دار کمان (غلیل) ایک مشرقی عطیہ ہے؛ سپاہی اور اس کے گھوڑے کے لیے زرہ بکتر اور چار آئینہ کا استعمال صلیبی جنگوں کے اثرات سے منسوب کیا گیا ہے؛ زرہ بکتر کے نیچے روئی کی گدیاں یا زیرپوش پہننے کو بھی اسی اصل سے ماخوذ بتایا گیا ہے؛ اور فرنگی جنگ آزمانے کم سے کم فلسطین میں جنگ کرتے وقت اپنی پیشانی اور گردن کو مشرقی تمازت سے محفوظ رکھنے کے لیے عربی کوفیہ کو استعمال کرنا سیکھا۔

---

[1] ۔ اس قسم کا آگے کو بڑھا ہوا خصوصاً پھاٹک یا داخلے کے مقام پر بنا ہوا مینار اصطلاحاً دوہرا مینار Barbican کہلاتا ہے۔ اس لفظ کے متعلق یہ قیاس آرائی ہوتی رہی کہ ممکن ہے کہ یہ عربی (یا فارسی) لفظ سے مشتق ہو [illegible]

فوجی معلومات بہم پہنچانے کے لیے نامہ بر کبوتروں کو استعمال کرنے کی ترکیب ایسی تھی جو عربوں سے لی گئی البتہ یہاں یہ اضافہ کرنا ہے کہ نارمنی صقلیہ کی دستاویزوں میں بھی نامہ بر کبوتروں کا ذکر عام طور پر ملتا ہے؛ اور یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ فتح کے جشن مناتے وقت چراغاں کرنا، دیواروں اور کھڑکیوں پر قالین یا جھالر لٹکانا بھی شاید اسی ذریعہ سے لیے گئے ہوں گو ہوسکتا ہے کہ انسانی جذبات کا لحاظ کرتے یہ باتیں غیر قدرتی یا کسی مقام سے مختص نہ معلوم ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ مردانہ کھیلوں کے مقابلوں کے رواج کو بھی صلیبی جنگوں نے ترقی دی ہو کہ یہ قریہ (شمشیر زنی) کی مشقوں سے مشابہت رکھتے تھے؛ اور نقابتی نشانوں (طراز) کا بڑھتا ہوا استعمال بھی شام میں مسلمانوں سے تعلقات کی بنا پر معلوم ہوتا ہے۔ بلاشبہ نقابتی (خاندانی) نشانات جیسے دو سرا عقاب، کنول کا پھول یا دو کنجیاں تو وہ ضرور استعمال کرتے تھے؛ اور بہت سے نقابتی طغرے بھی اسی اصل سے نکلے ہیں علاوہ ازیں نقابت کی بعض مسلمہ اصطلاحیں جیسے Azure = (لاجورد) اور شاید Gules = (گُل) بھی اسی اصل کے خوشہ چیں ہیں۔ تمام یورپ میں نقابتی طغروں کے اصول میں جو باقاعدگی پیدا ہوئی وہ بھی غالباً حروب صلیبیہ کی وجہ سے ہوئی کہ "نقابت کے نشانات، اصطلاحیں اور اصول تمام یورپی ملکوں میں یکساں ہیں"۔

(۵) حروب صلیبیہ کے دوران میں تجارت بھی جنگی مہمات کے پیچھے پیچھے چلنا شروع ہوئی اور فرنگی جنگ آزماؤں کے قدم پر اطالوی تاجر بھی تیزی سے روانہ ہوئے۔ یہ صرف شام کی پیداوار اور صنعت کا معاملہ نہیں تھا: یہ ہندوستانی چینی اور مسالہ کے جویروں کی پیداوار و صنعت کا بھی معاملہ تھا۔ یہ صحیح ہے ـــــ اور پہلے ہی ہمیں ایک موقع پر اس کے ذکر کا موقع ملا ہے ـــــ کہ اگر صلیبی جنگیں نہ ہوئی ہوتیں تو بھی یہ تجارت ہوتی اور اپنے نتایج پیدا کرتی؛ اور یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ پہلی صلیبی جنگ کے آغاز سے کئی سال پہلے وینس نے بازنطیہ سے ہوکر مشرقی منڈیوں تک اپنا رستہ

نکال لیا تھا؛ اس لیے ہم ہر اس مشرقی چیز کو حروب صلیبیہ یا کم سے کم صرف حروب صلیبیہ
ہی سے منسوب نہیں کر سکتے جس سے مغرب قرون وسطی کے زمانے میں روشناس ہوا؛
اس طرح اس روشناسی کے بعد ہی تجارتی رستوں اور منڈیوں کے بڑھنے اور پھیلنے
کو بھی صرف حروب صلیبیہ ہی سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ساتھ ہی ہم اس تجارتی
محرک سے بھی انکار نہیں کر سکتے جو شام میں لاطینی توطن پذیری کی وجہ سے ہوا اور جس نے
شام کی پوری پیداوار وصنعت و حرفت تک اپنی رسائی پیدا کر لی۔ علاوہ ازیں اس نئے
قبضہ سے بھی انکار نہیں ہو سکتا جو اس توطن پذیری نے ایک طرف تو دمشق کی منڈیوں
تک اور دوسری طرف براہ رقہ و دریائے فرات بغداد کی منڈیوں پر کر لیا تھا۔ اس طرح
ہم فلسطین سے مغربی بحیرۂ متوسط کے علاقوں میں نئے پودوں، فصلوں اور درختوں کے
پھیلنے کی توجیہ کر سکتے ہیں —— تل اور خرنوب، مکئی اور چاول، لیموں اور تربوز، خوبانی
اور عسقلان۔ اسی طرح ہم مغرب میں نئی نئی صنعتوں اور پہناؤں یا کم سے کم قدیم صنعتوں
اور پہناؤں کے ترقی پذیر رواج کے پھیلنے کو بھی سمجھا سکتے ہیں —— روئی Cotton =
قطن) موصل کا Muslin بغداد کا بلدہ چین یعنی کمخواب، شہر دمشق کا Damasks
یا Damascenes یا Sarsenet بازنطیہ کا بادلا دمیاطی =
(دمیاط) اور سوتی منقش کپڑا اور Atlas = (اطلس) جو مشرق ہی میں تیار ہوتا
تھا، مشرق قریبہ اور وسط ایشیا کے شال، دوشالے اور قالین، سنہری روغن، نئے
نئے رنگ جیسے Carmine = (قرمزی) اور ارغوانی؛ اسی طرح مٹھیے، عرق
گرم مسالے، خوشبوئیں اور دوسری چیزیں جیسے پھٹکری، ایلوا، لونگ، لوبان، نیل اور
صندل؛ پہنے اوڑھنے کی چیزیں جیسے اونٹ کی اون کا بنا ہوا کپڑا Camlet
(جمل)، جبہ یا اُبٹن، شیشے کے آئینے، فن کوزہ گری کے نوادر، شیشہ کی صنعتیں، سونے
چاندی کی خوبصورت مصنوعات اور میناکاری بلکہ تسبیح بھی جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ

یہ ہندوستان کے بدھوں کا عطیہ ہے جو براہِ شام مغرب میں داخل ہوا۔

غرض حروب صلیبیہ مشرق سے تجارت کرنے کی راست ذمہ دار نہیں تو کم سے کم اُن کو تقویت دینے کا باعث ضرور ہوے اور بارویں صدی عیسوی میں وہ شام کی حدود سے آگے نہیں بڑھی تھی لیکن بعد کو اس نے تجارتی رستوں کی ترقی نیز ہنڈی اور مالیات کے نئے ذریعوں کی نشوونما پر کچھ کم اثر نہیں ڈالا۔ عہد وسطیٰ میں یورپ کی تجارتی شاہ راہ جو وینس سے شروع ہو کر کوہ پرینی سے ہوتے ہوے کولون تک پہنچتی تھی اور وہاں سے دو شاخہ ہو کر لوبک کی طرف مڑ کر بالٹک یا بحیرۂ شمال پر برگسی تک جاتی تھی، اسی شاہراہ پر اس زمانے میں مشرقی تجارت کی پوری گرم بازاری رہتی تھی؛ اور اسی رستہ پر یعنی جو لمبارڈی اور دریائے رہائن سے ہوتے ہوے فلاندر اور شمالی فرانس سے گذرتا تھا عہد وسطیٰ کے شہر اور تجارتی جماعتیں زیادہ گنجان طور پر آباد تھیں۔ ساتھ ہی بحیرۂ متوسط میں جہاز رانی کے باقاعدہ نظام کو ترقی ہوئی؛ اس سے کچھ تو اشیائے تجارت کی حمل و نقل ہوتی تھی اور کچھ ارض مقدس جانے والوں کو مدد ملتی تھی؛ اس کے مرکز وینس اور مارسیلز میں تھے اور اس کو روبہ عمل لانے میں فوجی طبقوں نے مالکانِ جہاز اور جہاز ران شراکتوں سے اتحادِ عمل کیا تھا۔ زائروں اور جنگ آزماؤں کو سمندر پار سفر کرنے اور عارضی طور پر تبدیل مقام کرنے نیز مشرقِ بعید کی تجارتی ضرورتوں نے ہنڈوی طریقہ کو ترقی دی؛ جنیوا، پیسا یا سینا سیئنا میں بنک کاروں کی جماعتیں قایم ہوئیں؛ ان کی شاخیں فلسطین میں کھلی گئی اور وہاں کا رواج ہونے لگا؛ فوجی طبقوں خصوصاً فوجی راہبوں کی کوٹھیاں زرِ امانت رکھنے اور قرضہ دینے کے بنک بن گئے۔ حروب صلیبیہ اور ان کی ترقی دی ہوئی تجارت کا ایک عجیب مالیاتی نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ارض مقدس میں اہل وینس نے بیزنطینی عربی کے نام سے ایک سکہ ڈھالا۔ سونے کا یہ سکہ اندرونِ ملک (جو ساحل سے متصل نہ ہو) کے مسلمانوں سے تجارت کرنے کی غرض سے تھا اور لاطینیوں کا مسکوک کیا ہوا شاید یہی سب سے پہلا سکہ ہے؛ اور پوپ جیسا کچھ

جلد ... نہیں

احتجاج کرنے یعنی ۱۲۴۹ء تک ان طلائی سکوں پر عربی عبارت —— کوئی مختصر قرآنی آیت، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام اور ہجری تاریخ و سنہ میں کندہ ہوتا تھا، جنوبی فرانس میں تیرویں صدی عیسوی تک بھی اسی قسم کے سکوں کا رواج پایا جاتا ہے۔

(۶) تعمیرات، فنون، صنائع اور روزمرہ زندگی کے عام ڈھانچہ میں ہم بعض ایسے اثرات کا سراغ لگا سکتے ہیں جو دو صدیوں میں بزمانہ حروب صلیبیہ مشرق سے مغرب میں داخل ہوئے۔ فی الواقع ایسا خیال کرنے کی کوئی بنیاد نہیں معلوم ہوتی کہ حروب صلیبیہ نے مغرب کے عام فن تعمیر پر اس سے زیادہ کوئی اثر ڈالا ہو جتنا کہ "ہم مرکزی" قلعوں کی مخصوص نشو و نما پر۔ اسلامی فن تعمیر کا کوئی عام طرز نہیں ہے۔ فاتح عربوں کو جس ملک میں مقامی طرز تعمیر ملتا گیا اسی اعتبار سے وہ ہر ملک میں مختلف رہا؛ باقاعدگی صرف تزئین و آرائش میں ملتی ہے۔ مسلمان ایک قسم کی نوک دار کمان بنایا کرتے تھے لیکن یہ قوطی فن تعمیر سے مختلف ہوتی تھی؛ چونکہ اسلام جانداروں کی نقل کرنے سے منع کرتا ہے اس لیے مسلمان ہندسی شکلیں استعمال کرتے ہیں لیکن ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی جس سے معلوم ہو کہ انھوں نے مغربی قوطی فن تعمیر کے سہ گوشہ پیچ پیتا نقش و نگار کو —— بلندی درجہ پر پہنچنے کے وقت متاثر کیا ہو[1]۔ ارض مقدس کی مذہبی فن تعمیر کی یادگاریں اپنے طرز میں قریباً سب کی سب خالص مغربی ہیں اور مغربی اصول و اساس کے مطابق تعمیر ہوئی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مقامی عناصر نے مقامی تنوع پیدا کیا مثلاً جب فلسطین میں شہتیر دستیاب نہیں ہوتے تو کلیساؤں کی تعمیر میں مسطح چھت بنائے گئے یا پھر مقامی نجاروں اور سنگ تراشوں نے قدرتاً مشرقی روایات سے متاثر ہو کر ایک ایسی عمارت میں مشرقی موڑ یا جوڑ

---

[1] برٹنز —— حوالہ مذکور ص ۴۱۹ —— کا خیال ہے اور اس کو تسلیم ہے کہ یہ محض قیاس ہے کہ: اسلامی اثرات نے مغرب کو شاید نکیلا نعلی کمان اور نصف دائرہ دار کمان سے روشناس کیا ہے جو خود بہت سی چھوٹی چھوٹی کمانوں سے بنتی ہے۔ غرض اس طرح ممکن ہے کہ ان کمانوں نے پیچ پیتا اور تزئین و آرائش کی مختلف شکلوں کے پیدا کرنے میں مدد دی۔

داخل کر دیے جو فی الجملہ مغربی نقشے پر تعمیر ہوئی ہے[1] دیواروں پر پیچ در پیچ خطوط سے آرائش کرنے کا کام اصلاً اسپینی عربوں کا ہے نہ کہ مشرق کا؛ اور اگر حروب صلیبیہ نے مغربی فن سنگ تراشی میں نئے عناصر کا اضافہ کیا ہے تو یہ عناصر اسلامی الاصل ہونے سے زیادہ بازنطینی الاصل ہیں مصوری کوئی اسلامی فن نہیں ہے؛ اور ارض مقدس کے کلیساؤں کی پچی کاری بازنطینی اثر کے تحت ہوئی ہے۔ فنون وصنائع کے تنگ تر دائرے ہی میں ہم شاید عربی اثرات کا سراغ سب سے زیادہ لگا سکیں۔ خود یروشلم کی بادشاہی میں امراء کے مکانات عربی نمونوں پر بنائے گئے ہوں گے جن میں صحن، سنگ مرمر کا فرش، فوارے اور جھرنے ہوتے تھے؛ ہو سکتا ہے کہ اندرونی زیب و زینت اور فرنیچر میں بھی اسی نمونہ کی نقل کی گئی ہو۔ اطالیہ خصوصاً وینس میں فن نمونہ سازی پر مشرقی طلائی و نقروی اور جواہرات کے کام کی درآمد کا اثر انداز ہونا بھی ممکن ہے؛ اور مشرق کا عاج کا کام، میناکاری، قالین و شجر بافی نے بھی مغرب پر بہت بڑی حد تک اسی قسم کا اثر ڈالا ہوگا۔ قرون وسطی میں دیواروں پر پیچ دار نقش و نگار کے رواج کو ہم اسی معنی میں استعمال کر سکتے ہیں جن معنی میں ہم اٹھارویں صدی عیسوی میں جداری کاغذ، سنہری روغن اور فرنیچر کو "چینی مذاق" کے مطابق کہتے ہیں ممکن ہے کہ مسیحی تبرکات رکھنے کے لیے ارض مقدس کے زائر عربی صندوقچے خرید کر اپنے وطن لائے ہوں؛ غالباً وہ مشرق کی ہمیانی بھی استعمال کرتے ہوں گے جس کا استعمال بعد کو پیرس میں بہت ہونے لگا تھا؛ ممکن ہے کہ وہ مغرب میں قرنا بھی لے آئے ہوں جس کی گونج کبھی شام میں سنائی دیتی تھی۔

---

[1] ۔ [illegible] کلیساؤں کی تعمیر میں [illegible] جن کی تعداد [illegible] [illegible] [illegible] جو آج بھی ان کے نشانات مل سکتے ہیں۔ ۔ ۔ [illegible] مسیح کے کلیسا [illegible] [illegible] [illegible] بعض مغربی کلیساؤں کی بھول بھلیاں یا راہ ہائے یروشلم [illegible] [illegible] کے بعض [illegible] [illegible]

سائنس اور فلسفہ کی دنیا میں مشرق کے مسلمانوں سے زیادہ اسپین کے مسلمانوں نے لاطینی مغرب کو اپنے عطیے پیش کیے ہیں۔ بلا شبہ کچھ ریاضیاتی علوم مشرق سے ضرور لے گئے ہوں گے۔ ایلری لارڈ باتھوی کے متعلق، جس نے اسلامی ہیئت اور ہندسہ کا مطالعہ کیا تھا، مشہور ہے کہ اس نے بارویں صدی عیسوی کے نصف اول میں مصر، ایشیائے کوچک اور اسپین کا سفر کیا تھا۔ لیونارڈو فیبوناکسی لفرنیوں میں جبر و مقابلہ کا پہلا عالم مانا گیا ہے، یہ فریڈرک کا ہم عصر تھا اور اسی کے نام پر اپنا "مجذور صحیح" نامی رسالہ معنون کیا تھا؛ اس کا بھی مصر و شام کا سفر کرنا پایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ عربی ہندسوں اور علم حساب کی نشر و اشاعت کچھ نہ کچھ حد تک اس تجارتی گرم بازاری کی منت کش ہو جو اطالوی بندرگاہوں اور شام کے مابین جاری تھی۔ ریاضی کی طرح طب بھی اسلامی علوم کی خاص پیداوار تھی؛ لیکن اس پیداوار کا وطن اور یورپ میں اس کے پھیلنے کی ابتدا، شام سے زیادہ اسپین سے ہوئی، مگر شامی اثرات کے متعلق زیادہ سے زیادہ ممکنہ قیاس وہ ہے جو جنوبی فرانس اور فلسطین کے درمیان تجارتی تعلقات اور مونٹ پلر میں ایک طبی مدرسہ کے عروج کو ایک دوسرے سے متعلق قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں تیرویں صدی عیسوی کا کلامی فلسفہ مشرق کے اسلامی فلسفیوں کا راست زیر بار احسان نہیں ہے۔ نصرانی روایات اور تعلیماتِ آبا کے علاوہ کلامی فلسفہ نے جو مواد استعمال کیا وہ اسپینی مسلمانوں کی ارسطا طالیسیت تھی اور ارسطو کے وہ علوم تھے جو اس نے راست بازنطیہ سے حاصل کیے۔

(۷) فنون و ادبیات پر حروب صلیبیہ کا اثر شاید زیادہ گہرا اور زیادہ دیرپا ثابت ہوا۔ ان جنگوں کا ایک راست نتیجہ مشرقی زبانوں کا مطالعہ ہے۔ بہر طور یہ ارتقا خود ان جنگوں کی وجہ سے اتنا نہیں ہوا جتنا کہ ایشیائی تبلیغ کی وجہ سے جو صلیبی لڑائیوں کے بعد ہی شروع ہوئی اور جس کا مقصد منگولوں کو نصرانی بنانا تھا۔ سب سے

پہلے کٹلان کے ریمنڈس للس نامی ایک شخص نے مشرقی مطالعہ کی نشوونما کو آگے بڑھانے کی کوشش کی تاکہ اس کو پر امن صلیبی جنگ کا ذریعہ بنائے جس میں خالص روحانی اسلحہ کام میں لائے جائیں۔ ۱۲۷۶ء میں اس نے بمقام میرامر عربی تعلیم کے لیے راہبوں کا ایک کالج قایم کیا؛ ۱۳۱۱ء میں شاید اسی کے ایما پر ویانا کی کونسل نے پیرس، لووین اور سلامنکا کی جامعات میں مشرقی زبانوں ——— عربی و تاتاری ——— کے شعبے قایم کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس شخص کی مضطرب مخلص روح نے اسے ۱۳۱۴ء میں بمقام تونس شہادت دلادی اور اس کی کوششوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مشرقی تبلیغ جس کا وہ پرجوش حامی تھا، حسب سابق جاری رہی؛ لیکن، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، اس کا نتیجہ مشرقی علوم کی ترقی سے زیادہ جغرافیائی علوم کی ترقی نکلا۔

ادبیات کی دنیا میں حروب صلیبیہ نے بہت سی تاریخیں پیدا کیں اور خود یہ جنگیں بہت سے مغربی شاعروں کا موضوع بن گئیں۔ حروب صلیبیہ کے مغربی مورخوں میں ایک گم نام نارمنی شخص ہوا ہے، اس نے "رزمیہ فرنگیاں" لکھی ہے اور پہلی جنگ کے وقایع قلمبند کیے ہیں؛ فلوتیر کارٹری کی "تاریخ بیت المقدس" نہ صرف پہلی جنگ کا حال بتاتی ہے بلکہ ۱۱۲۷ء تک لاطینی بادشاہی کی تاریخ بھی بتاتی ہے؛ ان سب سے زیادہ صیدا کا اسقف اعظم ولیم ہے۔ اس کی کتاب "ماورا بحر اقطاع پر انجام پائے ہوئے واقعات کی تاریخ" تیئیس جلدوں میں ۱۱۸۴ء تک کے واقعات پر پھیلی ہوئی ہے؛ یہ تاریخ ایک فرانسیسی ترجمہ کی صورت میں عہد وسطیٰ کی ہم عصر علمی پیداوار اور حروب صلیبیہ کی کہانی کی خاص بنیاد ہے۔ ولیم صیدائی نے صرف لاطینیوں کے کارنامے قلمبند نہیں کیے ہیں؛ اس نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد کے تمام مسلمان بادشاہوں کی ایک "تاریخ" بھی تالیف کی ہے؛ گو اب یہ تالیف ناپید ہے لیکن اس کے جو نشانات ولیم ترپیولوی کے رسالہ "حالت عرباں" ۱۲۷۳ء میں باقی ہیں وہ مولف کی دنیائے اسلام سے واقفیت کی وسعت اور اسلام کی

خوبیوں و خصوصیتوں پر اس کی گہری نظر کی تصدیق کرتے ہیں۔ خاص مشرقی مصادر میں شمالی شام کے ایک شیخ اسامہ ابن منقذ کی خود نوشت سوانح حیات ہے اور بارویں صدی عیسوی کے حالات پر مشتمل ہے؛ ابن اثیر کی تاریخ اتابکاں اور بہاالدین کی لکھی ہوئی سلطان صلاح الدین کی سوانح بھی قابل ذکر ہے۔ لیکن مغرب میں حروب صلیبیہ کے واقعات کسی نہ کسی طرح تاریخ سے فسانوں میں تبدیل ہو گئے۔ اس کی طرف "رولینڈ کا گیت" نے پہلے ہی رہنمائی کر دی تھی؛ یہ نظم جنوبی اسپین میں نصرانیت اور اسلام کے درمیان سرحدی جنگ کے موضوع پر شاعرانہ تخیل کی بازی گری کا نتیجہ ہے۔ حروب صلیبیہ کے ابتدائی دور ـــــ شاید پہلی ہی جنگ کے دوران میں اس قسم کی خیالی بازی گری نے ایک فسانہ گھڑنا شروع کیا جو تاریخ کے ساتھ ساتھ تو چلا مگر اس سے بہت مختلف ہوتا گیا۔ یہ فسانہ پچھلے قیدیوں کا گیت (۱۱۳۰ء) اور انطاکیہ کا گیت (۱۱۸۰ء) میں نمودار ہو چکا تھا، جس طرح "رولینڈ کا گیت" نے رولینڈ اور البور کو پر عظمت بنایا تھا اسی طرح اس نے پیٹر راہب اور گاڈ فرے بولونوی کو پر عظمت بنایا۔ یہ فسانہ من مانے طور پر صلیبی جنگوں سے کھیلتے ہوئے ان کی تیز روشنی کبھی ادھر کبھی ادھر ڈال کر ایسی داستان پیدا کرتا ہے جو صدیوں تک حقیقت کا منصب غصب کیے رہی۔ یہی داستان تھی جو تاسو کو ملی۔ اس نے اپنی "آزاد یروشلم" میں اس داستان کو سپاہیانہ لباس پہنا دیا۔ یورپ کے دل سے جس حد تک حروب صلیبیہ کا نقش محو ہو چکا تھا اس کا اظہار اس سے بہتر کسی اور چیز سے نہیں ہوتا۔ ڈی سانکٹس کہتا ہے: تاسو کی خواہش تھی کہ وہ ایک ایسی نظم لکھے جو واقعتاً رزمیہ ہوتی اور اس میں مذہبی جوش کارفرما ہوتا۔ جو ممکن ہے تاریخی ہو اور حقیقت کے قریب یا بظاہر درست۔ لیکن وہ کیا لکھ سکا؟ درحقیقت قرون وسطیٰ کی شاعری میں حروب صلیبیہ کبھی کوئی بڑا موضوع نہیں

لہ ۔ ملاحظہ ہو ہان ہیل کی کتاب پہلی صلیبی جنگ کی تاریخ۔

بن سکے جیسا کہ شارلیمن یا برطانیہ اور گول میز بنے[۱] بلاشبہ انھوں نے دو بڑے موضوعوں کو متاثر کیا ہے: شارلیمن کو ایک صلیبی مجاہد کی شکل میں پیش کیا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ اس نے قسطنطنیہ بلکہ بیت المقدس کا سفر کیا تھا؛ اور انگلستان کے شاہ آرتھر کو جن شاعروں نے اپنا موضوع سخن بنایا تھا انھوں نے اپنے قصوں پر کچھ نہ کچھ صلیبی جنگ کا رنگ چڑھانا سیکھا؛ اور اگر قرون وسطی صلیبی جنگوں سے پُر نہ ہوے ہوتے تو Morte d'Arthur وہ نہ ہوتی جیسی کہ وہ درحقیقت تھی۔ لیکن اسی قسم کے اثرات میں کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو مسلمانوں سے لی گئی ہو۔ رزمیہ دور میں بہترین قسم کی جنگ کی حیثیت سے یہ بے دینی کے خلاف دینی جنگ کا صرف ایک تخیل ہے؛ اور یہ کہ یہ خیال، تمہائی قدیم ہے جتنا کہ ایران و توران کی نزاع کا خیال۔ اسلام نے بذات خود قرون وسطی کے شاعرانہ ذخیرہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا بجز اس کے کہ یورپ نے اس کو بے دینی کا زندہ نمونہ بناکر پیش کیا۔ ممکن ہے کہ اکاسن اور نکولٹ کے قصے کے مصنف نے اسلامی مصادر سے کچھ اخذ کیا ہو؛ لیکن اگر اس نے ایسا کیا بھی ہے تو اس کا اس طرح مستعار لینا حروب صلیبیہ سے متعلق نہیں ہے؛[۲]

۱۔ بر نٹنز کا خیال ہے کہ ابتدائی صلیبی مجاہدوں کے "رزمیے" جو کبھی غیر معمولی دلچسپی پیدا کر چکے تھے صلیبی جنگوں کے ختم ہونے ہونے تک اپنی یہ صفت کھو چکے تھے۔ جیمس وٹری (۱۲۴۰ء) James of Vitry جو تمثیلوں یا اخلاقی قصوں کے ایک مجموعہ کا جامع ہے، کہتا ہے: لکھنے والوں کے لیے سوائے حروب صلیبیہ کے تمام دوسرے موضوع زیادہ دلکش تھے۔ حوالہ مذکور صفحہ ۴۹م۔

۲۔ برنٹز کا قیاس ہے کہ ممکن ہے صلیبی مجاہدوں نے ہندوستانی قصوں کا ایک مجموعہ کلیلہ دمنہ مغربی یورپ لایا ہو۔ فاضل موصوف یہ بھی اضافہ کرتے ہیں کہ طروبوں نے اپنی نظموں میں مشرقی عناصر بھی داخل کردئیے تھے اور ان نظموں نے ایک ایسے پل کا کام دیا جس پر سے گذر کر مشرقی قصص و حکایات بوکیاکشو اور اطالوی ناول نگاروں تک پہنچتے تھے۔ حوالہ مذکور الصدر صفحہ ۵۰م۔

مجلا طیلسا ہین

Sonet اور پھر اگر اس "اسلامی" نظریہ میں کچھ صداقت ہے، جس کی رو سے نہ صرف
کی ابتداء کو مشرق سے جوڑا گیا ہے بلکہ قافیہ وار عشقیہ نظموں کی شکل کو بھی، تو یہاں پھر یہ
کہنا پڑے گا کہ حروب صلیبیہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ چیز تاریخ صقلیہ سے متعلق
ہے، قریباً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا عہد وسطیٰ کے یورپی شاعروں کو مشرق کا تصور بڑے ۲
کی داستان اور سکندر کی مہمات سے پیدا ہوا نہ کہ صلیبی جنگوں سے۔ بلکہ کوئی شخص یہاں
تک بھی کہنے پر آمادہ ہو جائے گا کہ پیرس کا کونٹ رابرٹ اور طلسمان کے زمانے تک بھی
صلیبی جنگیں مغربی رومانستی کا حقیقی مواد نہیں بن سکیں۔ لیکن اگر خود حروب صلیبیہ نہیں تو ۳
کم سے کم حروب صلیبیہ ہی سے اخذ کیے ہوئے ایسے موضوع قرون وسطیٰ کے رومانی
روایات کا ایک جز بن گئے۔ ایسے بہت سے قصے ہیں کہ مثلاً ایک صلیبی مجاہد اسلامی
ملک میں قید ہو گیا تھا اور اس کو ایک مسلمان شہزادی نے نجات دلائی جو اس سے محبت
کرنے لگی تھی یا یہ کہ ایک عورت مدت دراز تک غم فراق سہنے کے بعد اپنے صلیبی سپاہی
شوہر کی واپسی سے مایوس ہو کر دوسری شادی کرنے والی ہی تھی کہ وہ آپہنچا ——
لیکن کبھی تنہا اور کبھی کسی مسلمان شہزادی کے ساتھ۔ لیکن ان چیزوں سے رومان کی
سطحی آرائش ہوتی ہے اور وہ حروب صلیبیہ کے حقیقی جوہر یا روح تک نہیں پہنچتے[۱]۔

ج

اس اثر کے سوال کو نظرانداز بھی کر دیں جو اسلامی مشرق نے حروب صلیبیہ کی رو کے
ذریعہ سے یا یروشلم کی بادشاہی کی آب گذار نلی —— اگر اس کو ایسا کہا جا سکے ——
کے ذریعہ سے مغربی یورپ پر ڈالا، تب بھی ایک دوسرا اور وسیع تر سوال باقی رہ جاتا ہے
(باقی)

---

[۱] ۔ یہاں یہ بات قابل اضافہ ہے کہ ممکن ہے حروب صلیبیہ کی عرصہ مدت میں مغربی موسیقی مشرقی
موسیقی سے متاثر ہوئی ہو خواہ کتنے ہی چھوٹے پیمانہ پر سہی۔

تنقید و تبصرہ

۱۔ مرقع خیال جناب مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب وظیفہ یاب صدر کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کا شمار ملک کے ان نامور فرزندوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی اعلیٰ قابلیت اور علمیت سے ملک کی خدمت کی درخشاں روایات قائم کیں۔ موصوف کی ساری زندگی تحصیل علم اور خدمت ملک میں بسر ہوئی۔ سائنس ان کا موضوع ہے اور اسی کے پڑھنے پڑھانے میں ان کی عمر کے بہترین سال صرف ہوئے۔ ہرچند بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان پر مغربی ثقافت کا رنگ بہت گہرا ہے لیکن در اصل ان کو مشرقی اور مغربی ثقافت کا سنگم کہنا چاہیئے۔

کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ موصوف کو مبداء فیاض سے طبع موزوں بھی میسر ہے۔ ابتدا میں جب بعض رسائل میں "ضمیر" کی دو دبیری فارسی نظمیں شائع ہوئیں تو بہت کم لوگوں کا ذہن پروفیسر سائنس عبدالرحمن خاں صاحب کی جانب منتقل ہوا ہے۔

انسان اپنے بعض بلند خیالات اور نازک جذبات نظم میں ہی حسن و خوبی کے ساتھ بیان کر سکتا ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ جناب ضمیر اپنے خیالات، جذبات اور تجربوں کو اب نظم کا جامہ پہنا رہے ہیں ان کی نظمیں بھی ان کی باقیات الصالحات میں شمار ہونگی۔

"مرقع خیال" کے نام سے جناب مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب نے اپنی فارسی نظموں کا مجموعہ ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن کے توسط سے شائع کیا ہے۔ ہرچند یہ مجموعہ مختصر اور ۱۹۴ اشعار پر مشتمل ہے لیکن یہ مختصر و بیرے مطولات سے بدرجہا بہتر اور سبق آموز ہے۔

تمہید کے طور پر لکھا ہے کہ

"میں نے اردو اور فارسی میں کبھی کبھی کچھ شعر کہے ہیں۔ جب کبھی کسی بات کا دل پر اثر ہوا کچھ کہہ لیا اور لکھ لیا۔ بعض اوقات لکھنے کی بھی فرصت نہ ملی، جو کہا یاد سے

جاتا رہا اس مجموعہ میں چند نظمیں زمانہ طالب علمی کی ہیں اور چند زمانۂ وظیفہ حسن خدمت کی ملازمت کے دوران میں کام اتنا تھا کہ شعر لکھنے کا بہت کم موقع ملا۔"

اس مجموعہ میں حسب ذیل عنوانوں کے تحت نظمیں درج ہیں۔

۱۔ حمد ربانی ۲۔ نعت ۳۔ مناجات ۴۔ خطاب با قوام آزادی پسند ۵۔ خطاب بہ مسلمان ۶۔ سلطان محمود غزنوی ۷۔ آدم شاہ ۸۔ طوطی آتوریاں ۹۔ سائنس کے استاد کے مزے پر نظم ۱۰۔ ارسطو ۱۱۔ تعلیمی خدمات ۱۲۔ اپنی مصروفیتیں ۱۳۔ ایڈون آرنولڈ کے اشعار کا ترجمہ ۱۴۔ ترجمہ مقولہ کلی انتیبز ۱۵۔ دوست کی راست بازی ۱۶۔ اسبے وفائی مردمان غرض ۱۷۔ رباعیات ۱۸۔ خطاب بہ مسلمانان دور اول۔

مشرقی شاعروں نے اپنی نظموں کے جو مجموعے مرتب کئے ان میں غالباً سب نے "حمد ربانی" کا فرض ضرور ادا کیا ہے۔ یوں اسلامی دور کا جب سے آغاز ہوا ہر کتاب جو لکھی گئی خواہ وہ عربی میں ہو یا فارسی میں خواہ نظم میں ہو یا نثر میں حمد و نعت سے شروع ہوئی اور ہر مولف نے اپنے علم و ذوق اور موضوع کتاب کے بموجب اپنی طبع رسا اور قابلیت کے جوہر دکھائے ہندوستان میں بھی حمد و نعت سے کتاب کا آغاز گویا ایک لازمہ تحریر تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں اس کے پابند تھے۔ اب جب کہ روحانیت کا اثر زوال پذیر ہے تحریر کتب کے یہ روایات بھی معدوم ہوتے جاتے ہیں۔ اس مجموعہ نظم کا آغاز حمد و نعت سے ہوا ہے گویا مشرقی شاعروں کے روایات کو برقرار رکھنا پسندیدہ اور مناسب ہے۔

اہل علم خداشناس ہوتے ہیں تو گویا اپنے علم کی رہبری میں ہی آسمان کے کہکشان اور ثوابت وسیاروں کے علم نے حمد ربانی میں کیا اچھے اشعار کہلوائے ہیں۔

ایں کائنات راکہ نگنجد بقید وہم = یک امر تو ز غیب برون کرد ناگہان

ہر شئے گرفت از رہ تقدیر ت ارتقا = فرمان تست ضابطۂ فطرت جہان

ہر ارتعاش جوہر و ذرہ یہ عمل = مصروف خدمت تو بہر جا و ہر زمان

صد کہکشان نہفتہ بہر گوشۂ فلک = ہر اختر آفتاب در آغوش کہکشان

پیغام حمد تو رسد از ہر شعاع نور = تسبیح خوان جمیع کواکب بر آسمان
ادراک و عقل با ہمہ تحقیق و جستجو = در حلّ عقد کہنۂ تو حیران و سرزنان
یک راز دہر اگر بشود منکشف ضمیر = صد دیگر آید از پس وہ پیچیدہ تر از آن

خدا کی ذات و صفات میں تدبر کرتے ہوئے حیات اور انسانی زندگی کا معمہ بھی سامنے آتا ہے۔ زمان اور مکان کے نہایت مشکل مسائل سامنے آجاتے ہیں۔ انسانی زندگی میں نوحۂ غم اور نغمۂ شادی جیسے دو متضاد عناصر کا کیا مقام ہے ان سب کے متعلق دو شعر "حمد ربانی" کے سلسلے میں یہ کہے ہیں کہ ؎

دور حیات ماضی و مستقبل است و حال = ایں بے ثبات وان دو نماد چیستان
مقصود زندگی عمل صالح است و بس = شادی و غم سیاست نفس است و امتحان

ہزاروں مسلم اور غیر مسلم مولفوں اور شاعروں نے پیغمبر اسلام صلعم کی مدح و توصیف میں زور قلم دکھایا ہے اور آپ کی سیرت و زندگی کے بیان و اظہار میں اخلاص اور عقیدت کا خراج ادا کیا ہے۔ مارگولیوتھ آنجہانی نے لکھا تھا کہ اس کا سلسلہ غیر منقطع اور اس میں شامل ہونا موجب افتخار ہے۔ جب کسی غیر مسلم کا یہ خیال ہو تو پھر کوئی مسلم کیوں نہ اسکو اپنی نجات کا ذریعہ خیال کریگا۔
جناب ضمیر نے نعت پیغمبری میں حقیقت کو کس بہتر طریقے سے اشعار میں سمویا ہے ؎

ہر زمان مشغول حق بودی و ہم مشغول خلق = حامل پیغام رب پیش تو جبریل امین
دعوت اسلام دادی ہر گدا و شاہ را = چار سو بر بحر و بر در ہفت اقلیم زمین
مسکن مالوف تو کاشانۂ تاریک و تنگ = در شب معراج پرواز تو بر عرش برین
تا عمل پیرا بماند انسان براہ دین تو = پر سکون بد زندگی و مرکب جذبات کین
جملہ غزوات و سرایائی سبیل اللہ بود = نے چو تہذیب جدید از بہر مال مغلین
دور حاضر زبہ بیں یا وصف ایجادات نو = دیو و شیطان منفعل ہول بیابانتر نگین

عصر حاضر میں مغربی مادیت کے غلبہ سے انسانی فضایل اخلاق اور بزرگی کے قدیم آزمودہ

آداب کا چولا بدل گیا ہے۔ اسکی وجہ سے زندگی اور انسانیت پر ضبط کا عالم طاری ہے۔ قوم کے بزرگ اس انقلاب سے سہمے جا رہے ہیں۔ ان کے علم کا عمق اور تجربہ و مشاہدہ کا وجدان آج کوئی یاد دلا رہا ہے کہ اس انقلاب کی بنیاد متزلزل ہے۔ جناب ضمیر کا دردمند دل بھی اس سے متفکر ہے ہر زمانہ میں ہوتا آیا ہے کہ رذائل کے غلبہ کے وقت ارباب دانش و بینش بھی کچھ دادو داد کی سند بھی نہیں لا سکتے۔ ایسے وقت میں سوا اسکے اور کیا ہو سکتا ہے کہ حالات سے باخبر انسان خالق کی بارگاہ میں اپنے دل کے درد کا اظہار کرے۔ چنانچہ کس دردو الم جوش سے کہا ہے کہ

یارب چہ شد کہ فطرت انساں دگر شدہ است = خوف تو از قلوب خلائق بدر شدہ است
آن نوع را کہ برسر عالم تشاندی = غارت گر متاع ہمہ بحر و بر شدہ است
دانش برائے امن و امان آفریدہ = اطلاقش از امان بہلاک بشر شدہ است
تہذیب بود بانی تنظیم و عدل و خیر = تہذیب حال حامی بیداد و شر شدہ است
مہر و وفا کہ افضل اخلاق آدمی است = عصر جدید مطلق از وے بے خبر شدہ است
عالم کہ فیض علم تو دانش کلید دہر = غافل ز اقتدار قضاو قدر شدہ است
زاہد بجز رضائے تو چیزے طلب نکرد = اکنوں حریص دولت دنیا و زر شدہ است
در مالہ ہمہ عطا کن فلاح خلق = سعی مدبران زمین بے اثر شدہ است

اس وقت دنیا جس خلفشار میں مبتلا ہے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ

خوف خدا نماند در اقوام خود پرست = کردند جملہ خلق اسیر عذاب جنگ

نظم عالم بھی جس بنیاد پر استوار ہو سکتا ہے اسکے سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ

نظم جہاں محال بجز عدل و راستی = ما جنگ می کنیم پئے سد باب جنگ

ہر چند مذہب جدال و قتال کا حامی نہیں ہو سکتا لیکن خود جنگ تا حق کے سد باب کے لئے بعض وقت مدافعتی یا خود اختیاری جنگ ناگزیر ہے گویا اسی کی طرف اشارہ ہے کہ "ما جنگ می کنیم پئے سد باب جنگ"

ذیل کے شعر میں بھی گویا اسی کی جانب اشارہ ہے

مذہب اگرچہ حامی جنگ و ستیز نیست — شد لیک ناگزیر بما انتخاب جنگ

آمازوں کی غارت گری کی اصلی وجہ یہ ہوئی کہ دوسری قومیں صلح و امن کے خوش گوار تخیلات میں غلطاں و پیچاں تھیں جبکہ یہ ہمیشہ تیار اور مستعد رہتے ہیں ہی تجارت ہے۔ کوئی شخص اقدامی منصوبے اسی وقت سوچتا ہے جب کہ اسکو دوسرے لوگ کمزور نظر آئیں۔ اس کے متعلق اس شعر میں اشارہ کیا ہے کہ

تا از زمین بار نشود ظلم آمری — در دست تیغ باید و پا در رکاب جنگ

ایک قوم دوسری قوم پر اسی وقت غالب ہوتی ہے جب کہ "باہمی نااتفاقی، قوت انتظامی کی کمی، ترقی کی کثرت، نظام معاشرت کی خرابی، امراء اور عوام کا عدم تعاون حالات زمانہ سے بے خبری" کسی قوم کو گھن کی طرح کھانے لگے۔ محمود غزنوی کو ہندستان میں ان حالات کی وجہ سے ہی اقدام کا خیال پیدا ہوا اور کامیابی بھی اسی وجہ سے حاصل ہوئی کہ قوم ہند اخلاقی اعتبار سے تنزل پذیر تھی۔ چنانچہ "سلطان محمود غزنوی کی وفات پر ایک نظم" کے عنوان سے جو شعر لکھے ہیں ان میں اس پہلو کو واضح کیا ہے۔ لکھا ہے کہ

به هند بستان دین و آئین نه بود — عمل بر روایات پیشین نه بود

بر ارشاد و تو بیداد ائمہ اعتقاد — زبر انگشتا فات او یان شاد

حکومت بدست برهمن اسیر — کشتری ز خدمات جنگی نفیر

گرفتار مردم بچنگال باج — فرو مانده از ظلم رسم و رواج

رعیت ز بیداد مجبور بود — که مرتبہ زنده در گور بود

بجائے خدا بنده معبود گشت — نبات و جمادات مسجود گشت

یہ ایک حقیقت تاریخی ہے کہ محمود غزنوی کے دور میں علم و حکمت کی ترقی بھی بہت ہوئی۔ غزنی اس زمانہ میں علم و حکمت کا مرکز تھا۔ ابو ریحان بیرونی نے اسی زمانہ میں ہندوستان آکر سنسکرت میں کمال پیدا کیا۔ فوج کشی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے بارے میں علمی تحقیقات بھی

بلند درجے پر پہونچ گئی۔ یہ اشعار گویا واقعہ کا بیان ہیں کہ

بیار استم باز بزم سخن = دگر تازہ شد یاد عہد کہن
در آفاق صبح محبت دمید = بباغ جہاں باد رحمت وزید
بہ شد باز روشن چراغ علوم = سبق بر د غزنین زیونان و روم
فقیہ و مہندس ادیب و حکیم = زہر گوشہ در سایہ ام شد مقیم
درخشان نمودند چوں آفتاب = حکیمان من آریائی حساب
بداننداقوام عصر جدید = چہ گل ہائے دانش زفیضم دمید
تعجب کنند ایں چہ اعجاز بود = کہ غزنیں زما گوئے سبقت ربود

ان اشعار کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل نوٹ جو اس مجموعہ کلام میں بطور تعلیق لکھا گیا ہے ایک دلچسپ حقیقت کا انکشاف کرتا ہے:۔

”ابو ریحان محمد البیرونی نے گیارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں بڑی محنت سے سنسکرت سیکھی اور ہند وطریقۂ کتابت اعداد کا حقیقی راز معلوم کرلیا۔ اور صفر کی اہمیت کو بھی پالیا۔ اس کے ذریعہ علمائے عرب و ایران اور پھر ان کے توسط سے علمائے یورپ اس مفید طریقۂ حساب سے بخوبی واقف ہوگئے۔ سیالات کے خواص سے واقفیت حاصل کرکے اشیاء کی کثافت اضافی کے صحیح تعین کے متعلق البیرونی اور اس کے زمانہ کے حکماء اسلام نے بڑی کامیابی کے ساتھ تجربے کئے۔ ان کے اخذ کئے ہوئے نتائج کی صحت کو یوروپ انیسویں صدی کے وسط تک نہ پہونچ سکا۔ اسی طرح مشاہدات فلکی میں البیرونی اور اس کے ساتھیوں کو جو کمال حاصل تھا آٹھ نو سو سال بعد بھی لوگوں کو بہ مشکل حاصل ہو سکا۔“

کلام کے اس مجموعہ میں بعض نظمیں اور شعر خود شاعر کی زندگی اور کام پر بھی اشارہ کرتے ہیں ”تعلیمی خدمات“ کے عنوان سے جو چھوٹی سی نظم ہے وہ تعلّی نہیں ہے حقیقت ہے لکھا ہے کہ

روا شد زمن در دکن رسم علم = بہ فیق یزداں و تدبیر و حلم

برا رنگ تمکین زعزو وقار = شد از سعی من جاہ حیدر آباد

بمیدان حکمت برا اوج کمال = زمن جامعہ یافت جاہ و جلال

افواد عالم ز تعلیم من = فتادہ است شوق سیاق دکن

تاریخ بردم دریں سال سی = دکن ندہ نام باین پالیسی

اس نظم کی تشریح و توضیح کی جائے تو معلوم در دل کیا کیا لکھوادے۔ لہ ملی بات سے بات نکلی ہی آتی ہوتی ہے۔ مناسبت مقام کے لحاظ سے حیدرآباد کی تاریخ کا ایک پہلو پیش نظر لانا بے محل نہ ہوگا۔ مدعا یہ ہے کہ حیدرآباد کے ارباب اختیار کی اس عام روش کا تذکرہ کیا جائے جو دراصل حیدرآباد کی سست رفتاری کی اصلی وجہ ہے۔ گذشتہ ۶۰ سال کی طویل مدت میں بڑے بڑے نامور اکابر قوم حیدرآباد کی حکومت اور اقتدار و اختیار کے مرکز و محور رہ چکے ہیں لیکن جب کبھی کسی شخص کو اقتدار حاصل ہوا اس کا منشاء اور مدعا یہ ہوگیا کہ وہی نظم و نسق کا مدار اور منبع بنا رہے۔ اسی اقتدار پسندی کا اثر تھا کہ محسن الملک جیسے نامور رہبر قوم کے ہاتھوں جوں ہی کہ ان کے ہاتھ میں کل اقتدار مرکوز ہوگیا، مولوی نذیر احمد صاحب جیسے ادیب اور مقتدائے قوم بالجبر حیدرآباد سے رخصت کردیے گئے۔ چند ہی دن نہ گذرے کہ محسن الملک کو وقار الملک جیسے مصلح قوم اور خدا ترس انسان نے بیکار اور عملاً خانہ نشین کردیا۔ وقار الملک میں یہ خواہش انتہائی درجہ کو پہونچی ہوئی تھی کہ وہی سب کام کریں۔ بعد میں سرور الملک کا بول بالا ہوا تو وقار الملک کا دبدبہ ختم ہوگیا۔ یہی سلسلہ بعد میں بھی چلا۔ اسی پر کہا ہے کہ

بے وفائی مردمان غرض = مضطرب قلب و تلخ کام کرد

آں کہ آموخت کیمیا از من = عاقبت زہر در طعامم کرد

اس سے اُن کو مالی نقصان بھی بہت ہوا لیکن خود دُور بین لیکر بیٹھ گئے۔

مال و زر و زمین چہ حقیقت بہ فیلسوف = مریخ و مشتری و عطارد بچنگ ما

لیکن ملک کو اس سے جو نقصان پہونچا اس کی کوئی تلافی نہیں ہوئی۔ خدمت سے کنارہ کشی کے بعد اپنی مصروفیتوں کے متعلق لکھا ہے کہ:

مشغول حق بکنج قناعت نشستہ ایم ÷ ہست انہماک سپہر سماوی درنگ ما

پہنائے چرخ پیش مہندس شکار گاہ ÷ انجم در و نشانۂ تیر و تفنگ ما

ثعبان و حوت و قیطس و سرطان بر آسماں ÷ در دُور بین شدند شکار نہنگ ما

از کہکشاں بلند پر و کاوش حکیم ÷ تا منتہائے دہر خرام خدنگ ما

مال و زر و زمین چہ حقیقت بہ فیلسوف ÷ مریخ و مشتری و عطارد بچنگ ما

انھوں نے کہا ہے کہ "دکن زندہ کردم بدیں پالسی" اس کے متعلق کوئی اشارہ نامناسب نہیں۔

واضح ہو کہ حیدرآباد کی پس ماندگی کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ سرکاری خدمتیں موروثی ہو گئیں لایق باپ کی اولاد کو لایق ہونا ضروری نہیں ہے چنانچہ موروثی خدمات کی بنا پر ملک کے نظم و نسق کی باگ ایسے افراد کے ہاتھوں میں آگئی جو کام کے نااہل تھے۔ سر سالار جنگ اوّل نے اسکی اصلاح شروع کی اور خدمت کے لیے لیاقت شرط قرار دی۔ ابتدا میں خود لایق اہل ملک میدان میں آئے اور اصلاح و تجدد کا نیا دور شروع ہوا۔ لیکن بعد میں جب باہر سے لوگ بڑے بڑے عہدوں پر آنے لگے تو اہل ملک میں قنوطیت پیدا ہوگئی۔ اُن کی لیاقت و کاردانی کے جوہر خوابیدہ ہو گئے۔ اہل ملک میں رجال علم مفقود ہو گئے۔ مولوی عبدالرحمن خاں صاحب نے اپنے تدبر اور مصلحت کوشی سے اہل ملک میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش شروع کی اور کیا جامعہ میں اور کیا جامعہ سے باہر فرزندان ملک کو ترغیب و تشویق کے ذریعہ حصول علم پر آمادہ کیا اور بعد تحصیل علم اُن پر ذمہ داریاں سونپ کر کام کے قابل بنایا۔ یہ فخر و نازش بجا ہے کہ

در افواہ عالم ز تعلیم من　=　فتادہ است صوت سیاقِ دکن

"خطاب با مسلمانان" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے وہ ان کے بے تاب دل کی جلن کا صحیح مرقع ہے۔ ہر چند اس نظم میں مسلمانوں سے خطاب ہے لیکن حقیقت میں اس کا مخاطب مشرق کا ہر وہ شخص ہے جو کسی نہ کسی مذہب و اخلاق کا پابند ہے۔ اس نظم کی اخلاص مندی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

مشرق ز شفق سرخ چو یک چشمۂ خون است　=　بر پیش شیاطین سر انسان نگوں است
آفاق پر از فتنہ و آشوب جنوں است　=　تکبیر ز دل گوئے و بتائید امان خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

"تہذیب" طرف دار تعدی شد و اجبار　=　در صورت انسان شدا بلیس نمودار
ہر قوم بقوم دگر آمادۂ پیکار　=　اخلاص بدست آر و بتالیف دلاں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

عالم ز تعصب شدہ است احمق و اعمیٰ　=　تلقین مذاہب ہمہ بے مطلب و معنی
ایمان متزلزل ز سراب ز ر دنیا　=　قران بہ بغل گیر و تعلیم جہاں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

تو وارث گنجینۂ ایمان و یقینی　=　تعبیر رواداری و دانائی و دینی
پیغام ازل را تو مبلغ بز مینی　=　بر مسلک توحید ز سودائے بتاں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

در جسم ہوا لرزہ ز طیارۂ جنگ است　=　بر طفل و زن و پیر بسر بارش سنگ است
شرمندہ ز افعال بشر خرس و پلنگ است　=　از ہند و عرب ترک و عجم نعرہ زناں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

فریاد ز "تہذیب" سیہ کاری "تہذیب"　=　فریاد ز بے دینی و غداری "تہذیب"

دنیا ہمہ در نزع زخونخواریٔ "تہذیب" = اے مسلم خوابیدہ با حیاء جہاں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

مدیر مجلّہ

(۲) استالن

فرد اور جماعت کے تعلق کا تعین انسانی تہذیب کا ایک مرکزی مسئلہ رہا ہے لیکن حالیہ زمانہ میں نظام حکومت کی تشکیل میں اس مسئلہ کے کسی ایک حل کے اختیار کرنے میں ملکتوں کی ہیئت سیاسی اور عمرانی تقررات پر بنیادی اثر پڑ رہا ہے۔ روس میں اس مسئلہ کا حل ایک جدید عمرانی نظام کی ترویج سے کیا جا رہا ہے۔ ان کی کامیابی یا ناکامی کا تصفیہ نظری بحث سے قطع نظر موجودہ جنگ میں اس نظام استحکام مختلف معاشی اور عمرانی مسائل کے کامیاب حل کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔

اگر تاریخ کو شخصیتوں کے کارناموں کا تذکرہ سمجھا جائے تو کسی ملک کی تحریکات سیاسی تقررات اور سماجی نظام کے مطالعہ کا موزوں طریقہ اس کی شخصیتوں اور مدبرین کے حالات و سوانح کی واقفیت ہے۔ اسی لحاظ سے روسی انقلاب کا پس منظر اور وہاں کے موجودہ نظام کے محرکات کا صحیح علم آج بہاری کی سب سے عظیم الشان شخصیت استالن کی سوانح حیات سے ہو سکتا ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر جناب آصف علی صاحب بیرسٹر نے اسٹیفن گراہیم کی تصنیف استالن کا ترجمہ شائع کیا ہے۔

اصل کتاب کا ترجمہ ۲۶۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور مترجم صاحب ۷۵ صفحات کا ہمہ گیر مقدمہ اشتراکی معرکے ارتقا اور روسی زندگی میں انکے روبہ عمل آنے کی ایک واضح تقریر ہے اگرچہ مترجم صاحب نے اسکو صرف "ایک اڑتی پڑتی نظر" قرار دیا ہے۔

اشتمالی نظام کے نظری مباحث کی تکمیل مارکس اور اینگلز نے کی۔ لینن نے روس کے حالات کی روشنی میں اسکے تنظیمی پہلو کو اجاگر کیا اور آخر میں استالن نے عملی طور پر کامیابی سے روس میں اس کو مروج کیا۔ اس اعتبار سے استالن آج روسی اشتمالیت کی مرکزی شخصیت ہے اور اس سلسلے

نظام کے تحرک اور تقدم کا محرک وہی ہے اس لئے اس کی سوانح اسکے نقطۂ نظر عقائد اور تقررات سے واقفیت میں مدد ہو سکتی ہے اور انہیں سے روس کے مستقبل کے بارے میں پیش قیاسی کیجا سکتی ہے۔ بقول مترجم اگر سیرت میں استالن کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ بظاہر کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی بلکہ استالن کی انسانی کمزوریاں اس طرح دکھائی گئی ہیں کہ اس سے اسکی خوبیاں دبی ہوئی نظر آتی ہیں اور یہی غیر جانب داری کتاب کی خصوصیت ہے۔

"استالن" کے مطالعہ سے یہ گہرا اثر مرتب ہوتا ہے کہ کسطرح ایسے معمولی کفش دوز کا لڑکا روسی سامراج کے مقابل ہوگیا اور باوجود آلام و مصائب کے اس نے اپنی ہمت اور جوانمردی سے اس کا شیرازہ بکھیر دیا۔ آزادی کے خواہشمندوں کے لئے ایک سبق ہے۔

ترجمہ غنیمت ہے گیرتھ رام فیروز پوری اور سراج الدین احمد نظامی کیطرح روانی اور بہاؤ نہیں بعض نئی ترکیبیں معاشیاتی چھدری تفصیلات" اڑتی نظر" سماعت پر بار ہیں۔ یہ کتاب جامعہ ملیہ سے مل سکتی ہے۔

ابو العارف

(۴) پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ۔ از محمد ناصر علی صاحب ام۔ اے (عثمانیہ)

لکچرار شعبۂ معاشیات۔ بڑی تقطیع۔ ۴۲ صفحات قیمت ایک روپیہ کواپریٹیو اسٹور جامعۂ عثمانیہ۔

پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب حیدرآباد دکن کے ایک اہم مصنف ہیں۔ انہوں نے اپنی تصنیفوں اور ترجموں کے ذریعہ ملک کی بڑی علمی خدمت انجام دی ہے لیکن اس کے باوجود بہت محدود دائرے کے لوگ ان کے کام سے پوری طرح واقف ہیں۔ محمد ناصر علی صاحب تعریف کے قابل ہیں کیونکہ انہوں نے اس مقالے میں پنڈت جی کی زندگی کے حالات اور علمی کام کو مفصل طور پر بیان کیا ہے تاکہ عوام پنڈت جی سے واقف ہوں اور ان کی کتابوں سے استفادہ کریں۔ مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ریڈر شعبۂ تاریخ نے اس مقالے پر پیش لفظ لکھا ہے چنانچہ موصوف نے پنڈت جی کو حیدرآباد کے صف اول کے مورخوں میں جگہ دی ہے۔ امید کہ اہل ملک پنڈت جی کے کام کی پوری طرح قدر کرینگے۔

سید محمد تقی ہاشمی

(۴) آفتاب دکن ۔ از حمید اللہ خاں صاحب شیدا معتمد اعزازی ادارۂ ادبیات اُردو شاخ پربھنی ۔ چھوٹی تقطیع حجم ۱۶۶ صفحات کتابت و طباعت پاکیزہ ۔ گٹ اپ نہایت عمدہ ۔ قیمت عہ/ ملنے کا پتہ محبوبیہ کارخانہ جلد سازی حیدرآباد) :

اس کتاب میں آفتاب دکن یعنی قائد ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر مرحوم کی سوانح حیات پیش کی گئی ہے ۔ کتاب کے ابتدائی حصے میں قائد ملت کے متعلق مشاہیر ہند مثلاً قائد اعظم محمد علی جناح، آنریبل فضل الحق، علامہ عبد الماجد دریابادی، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، آنریبل سید عبد العزیز اور دیگر حضرات کے تاثرات دیئے گئے ہیں۔ ان کے پڑھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کل ہندوستان میں مرحوم کس قدر اعلیٰ اور بلند درجہ رکھتے تھے ۔ بیانات کے بعد سوانح عمری دی گئی ہے اور بعد ازاں انجمن اتحاد المسلمین کے تاریخی حالات بیان کئے گئے ہیں۔

یہ کتاب نہایت پُر از معلومات ہے ۔ جو اصحاب اپنے محبوب قائد کے حالات زندگی اور انجمن اتحاد المسلمین کی کارگزاریوں سے واقف ہونا چاہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ بہت مفید ہے ۔ حمید اللہ خاں صاحب شیدا قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے آفتاب دکن کی ترتیب کے ذریعہ ملک کی وقتی ضرورت کو پورا کیا۔ جگہ جگہ کتابت اور طباعت کی غلطیاں ہیں ۔ امید کہ انہیں دوسرے ایڈیشن میں دور کیا جائے گا۔

(۵) ابن خلدون ۔ از محمد عبد القادر صاحب بی ۔ اے (مدراس) بی ایس سی آنرز (لندن) لکچرار شعبۂ معاشیات جامعۂ عثمانیہ ۔ چھوٹی تقطیع حجم ۳۲ صفحے قیمت ۶/ ناشر ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد دکن عابد روڈ۔

محمد عبد القادر صاحب جامعۂ عثمانیہ کے ان اساتذہ میں سے ہیں جو نہایت خاموشی طریقے پر علمی اور تحقیقی کام میں مصروف ہیں ۔ اُردو کے علاوہ موصوف کے ایک سے زاید مقالے انگریزی معاشی ادب کے نہایت معیاری رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔

زیر تبصرہ رسالہ مصنف کی اردو مطبوعات میں سے ایک ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں ابن خلدون پر کافی تحقیقی کام ہوا ہے اور یورپی زبانوں میں کئی کتابیں اور مقالے لکھے گئے ہیں لیکن محققین نے اپنی توجہ زیادہ تر مصنف کے فلسفۂ تاریخ اور عمرانی نظریوں کی طرف مبذول کی ہے اور چند مستشرقین نے اُس کے سیاسی خیالات پر بھی بحث کی ہے۔ اس کتابچہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں قارئین کی توجہ ابن خلدون کے معاشرتی اور سیاسی خیالات کے علاوہ معاشی خیالات کی طرف مبذول کرائی گئی ہے اور اس مفکر کے بعض ایسے خیالات سے روشناس کرایا گیا ہے جن کی طرف اب تک بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ اگر لایق مصنف، ابن خلدون کے معاشی خیالات پر مزید تحقیقات کرکے مبسوط کتاب مرتب فرمائیں تو یہ ایک اہم خدمت ہوگی۔ یہ رسالہ بہت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔

(۶) **اشتراکی روس** از محمد عبد القادر صاحب بی۔ اے (مدراس) بی ایس سی آنرز (لندن) لکچرار معاشیات جامعۂ عثمانیہ۔ چھوٹی تقطیع۔ حجم ۲۹ صفحے قیمت ۶ ر۔ ناشر ادارۂ ادب جدید حیدرآباد دکن۔ عابد روڈ۔

دور حاضرہ میں معاشرتی اور سیاسی نقطہ نظر سے روس کی جو اہمیت ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھے لکھے حلقوں میں روسی معاشرت اور سیاست کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا رجحان دن بدن بڑھتا جارہا ہے۔ اس رسالے میں بتایا گیا ہے کہ انقلاب سے پہلے روس کا کیا حال تھا؟ انقلاب کیوں رونما ہوا؟ انقلاب کے بعد روس میں کس قسم کا سیاسی اور معاشی نظام اختیار کیا گیا؟ روس کے پانچ سالہ معاشی لائحہ عمل کی خصوصیات کیا ہیں؟ علاوہ ازایں روسی نظام میں طریقۂ تعلیم، افراد کی آزادی اور عورت کی حیثیت کے متعلق ضروری مواد دیا گیا ہے۔

اردو کا لٹریچر بہت محدود ہے۔ اس کی سخت ضرورت ہے کہ سیاست معشیت اور معاشرت کے مختلف پہلوؤں پر چھوٹے چھوٹے عام فہم رسالے زیادہ سے

زیادہ تعداد میں طبع کیے جائیں۔ زیر تبصرہ رسالے میں جدید روسی معاشرت، معشیت اور سیاست کے اہم پہلوؤں کے متعلق نہایت جامع اور مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

زبان نہایت شستہ اور پیرایہ بیان بہت صاف اور مربوط ہے۔ اگر ادارہ ادب جدید مصنف موصوف سے دور حاضرہ پر اسی قسم کے اور رسالے لکھوائے تو اس سے پبلک کی معلومات میں بہت اضافہ ہوگا۔

(۷) ہٹلر کا نیا نظام ۔ از امتیاز حسین خاں صاحب بی کام آنرز (لندن) لکچرار کامرس جامعۂ عثمانیہ۔ چھوٹی تقطیع ۔ ۵۶ صفحات قیمت ۱۰ ناشر ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد دکن۔

امتیاز حسین خاں صاحب جامعۂ عثمانیہ کے قابل اساتذہ میں سے ہیں۔ ہٹلر کا نیا نظام آپ کی حالیہ تصنیف ہے۔ اس سے قبل آپ کے دو رسالے جنگ اور روپیہ اور جنگ اور مالیہ چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں آپ نے نازیت کے تاریخی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے جرمنی اور یورپ میں نازیوں کے قائم کردہ نظام نو اور معاشی زندگی کا ایک خاکہ پیش کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ ہٹلر کا نیا نظام ایک بہت بڑا فریب ہے۔ اس نظام کا آخری مقصد نازی حکومت کے اقتدار کو زیادہ سے زیادہ وسیع اور مستحکم بنانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ جرمنی اور یورپ میں ہٹلر کے نئے نظام کے متعلق جو اصحاب معلومات حاصل کرنا چاہیں ان کے لئے اس رسالے کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

(۸) پیام ادب بابتہ جون ۱۹۴۴ء ۔ ادارۂ اشاعت اردو قابل مبارکباد ہے کہ اس کی جانب سے اردو ادب کی نہایت تعمیری خدمت انجام دی جارہی ہے۔ اس ادارے کی جانب سے اب تک متعدد کتابیں طبع ہو کر پبلک کے

استفادہ کے لئے پیش ہو چکی ہیں۔ پیام ادب کے نام سے گذشتہ ایک سال سے ایک ماہوار رسالہ بھی جاری کیا گیا ہے۔ رسالہ معیاری ہے اور اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نہایت اعلیٰ کتابت اور طباعت کے ساتھ بروقت شائع ہوتا ہے۔ اس کے حالیہ شمارے میں حسرت موہانی، علی اختر، ماہر القادری، محمد نصیر الدین، نظیر لدھیانوی، ارشد تھانوی اور اندرجیت شرما وغیرہ کی غزلیں اور مضامین وغیرہ شائع ہوئے ہیں۔ جو لوگ اردو ادب کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں ان کے لئے یہ رسالہ بے حد مفید ہے۔ سالانہ چندہ چھ روپیہ کلدار۔ فی پرچہ آٹھ آنے کلدار۔ ملنے کا پتہ ادارۂ اشاعت اُردو عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

(۸) ہندستانی ادب کا افسانا نمبر:- ہندستانی ادب ایک ماہوار ٹھیٹ علمی ادبی رسالہ ہے جو چار سال سے جناب مولوی غلام محمد خاں صاحب ام۔ اے (عثمانیہ) معزز رکن بلدیہ کی ادارت میں نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ مولوی غلام محمد خاں صاحب سے پوری عثمانی برادری بخوبی واقف ہے۔ صاحب موصوف نے مادر جامعہ اور اس کے ہونہار سپوتوں کی فلاح وبہبود اور ان کے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے زبردست ایثار کا ثبوت دیا۔ علم و ادب اور ہندستان کی عام زبان کی خدمت کی خاطر پیشۂ صحافت کو اپنا نصب العین بنا لیا۔

'ہندستانی ادب' ہندستان کے ان چند چوٹی کے رسالوں میں شمار کیا جاتا ہے جو صحیح معنی میں علمی اور ادبی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ہندستانی ادب نے اپنے معیار کو تھوڑی سی مدت میں نمایاں طور پر بلند کر کے اور کئی ایک خاص نمبروں کے باعث ملک کے ممتاز علمی ادبی رسالوں اور نامور و مشہور ادیبوں سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔

اگرچہ یہ رسالہ جنگ کی بلا نازل ہونے کے بعد جاری ہوا اور حالات زمانہ دن بدن بد سے بدتر ہوتے گئے لیکن اس کے باوجود خاں صاحب کے پائے استقلال کو جنبش تک نہ ہوئی حوادث ومصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ برابر آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں حالانکہ ان کے بعض

اداریوں سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ہندستانی ادب برابر نقصان برداشت کئے جا رہا ہے - زیر نظر شمارہ ایک خاص نمبر ہے جس کی ضخامت ۱۳۲ صفحہ ہے ٹائٹل آرٹ پیپر پر رنگین چھپا ہے - اس شمارہ میں چکنا کاغذ استعمال کیا گیا ہے - لکھائی چھپائی نفیس ہے - ان تمام خوبیوں کے باوجود "افسانا نمبر" کی قیمت صرف عمر روپیہ رکھی گئی ہے جو حالات حاضرہ کا لحاظ کرتے قیمت کم بھی کم ہے -

یوں تو آئے دن افسانہ نمبر نکلتے رہتے ہیں لیکن ان نمبروں کے افسانے مشکل ہی سے اپنے حقیقی معیار پر اترتے ہیں - افسانہ نمبروں میں ایسے بہت کم نمبر نکلتے ہیں جو گندہ ادب سے پاک ہوں - آجکل افسانوں کا جو بھی ذوق پیدا ہو چلا ہے اس سے نوجوان ذہنیتیں بری طرح مجروح ہو رہی ہیں -

افسانہ نویسی کا مقصد محض دماغی تفریح نہ ہونی چاہیئے بلکہ اس کا کچھ اصلاحی نتیجہ بھی نکلنا چاہیئے - فحش نگاری کی وبا عام ہو چکی ہے اور باد سموم کی طرح اپنے زہریلے اثرات پھیلاتی چلی جا رہی ہے - یہ چیز نہ صرف نقصان پہنچانے والی ہے بلکہ ہمارے ادب پر ایک بدنما داغ بھی ہے - زیر نظر شمارے کے تمام تر افسانے گندہ خیالات سے پاک ہیں - ان میں زیادہ تر نفسیاتی اور اصلاحی قسم کے افسانے درج ہیں - روحانی افسانے بھی موجود ہیں لیکن ایسے نہیں جن سے شہوانی جذبات بھڑک اٹھیں نہ صرف افسانے ہی اعلیٰ قسم کے اور معیاری ہیں بلکہ افسانوی ادب سے متعلق ابتدا میں جو مقالے درج کئے گئے ہیں ان سے بھی افسانے لکھنے اور پڑھنے والے بہت کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں - ہمارے ادب کی ترقی کے لئے ایسے ہی کامیاب اور ہم پایہ افسانہ نمبروں کی ضرورت ہے -

اس کامیاب ادبی کوشش پر ہم اپنی برادری کے ایک سچے ادبی خدمتگزار یعنی خانصاحب موصوف کو دلی مبارکباد دیتے ہیں اور ان کے رسالے کی ترقی کے لئے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہیں -

آخر میں ہم عثمانی بھائیوں سے پرزور الفاظ میں اپیل کرتے ہیں وہ ہندستانی ادب کے مستقل خریدار بنکر اسکی کامیابی اور ترقی میں مدد معاون ثابت ہوں - سالانہ چندہ پانچ روپے نمونہ کا پرچہ - از منیجر ہندستانی ادب عظیم پورہ حیدرآباد دکن طلب فرمائیے -

محمد ناصر علی

مجلۂ طیلسانین جلد ۵ شمارہ ۳
بابتہ جولائی ۱۹۴۴ء

حصۂ معاشیات

انجمن طیلسانین جامعۂ عثمانیہ کا علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ

مُدیر

محمد غوث ام۔ اے ال ال بی (عثمانیہ)

مُہتمم

محمد عبد العلی بی ایس سی ال ال بی (عثمانیہ)

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ آٹھ آنے
دفترِ مجلۂ طیلسانین نمائش گاہ باغ عامہ حیدرآباد دکن فون ۲۵۵۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجلہ طیلسانین حصہ معاشیات

جلد ۸ شمارہ ۳	فہرست مضامین	جولائی ۱۹۴۴ء

اسلام کے معاشی نظریے

(۱) زندگی کے مختلف زاویہ ہائے نگاہ

اس وقت دنیا میں زندگی کی جو کشمکش نظر آ رہی ہے یہ سب حضرت انسان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہے۔ جوں جوں زندگی کی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں ویسے ویسے انسانی جدوجہد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جو چیزیں اس جدوجہد کا باعث ہوتی ہیں ان کا مقصد انسانی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ پیدائش دولت اسی لیے عمل میں آتی ہے کہ صرف میں لایا جائے اور انسانی احتیاجات کو پورا کیا جائے۔ انسانی ضروریات کے متعلق مذاہب کے دو زاویہ ہائے نگاہ ہیں ایک زاویہ نگاہ تو رہبانیت کا ہے کہ انسانی ضروریات کو کم سے کم کیا جائے اور یہی اس کا معراج ہے۔ ہندوستان میں گاندھی جی آج کل کچھ اسی قسم کا فلسفہ حیات نئے سرے سے پیش کر رہے ہیں۔ اکثر و بیشتر مذاہب کچھ اسی قسم کی تعلیم دیتے رہے ہیں لیکن اسلام پہلا مذہب تھا جس نے اس باطل فلسفہ کے گرداب سے لوگوں کو بچایا اور انسان کو خوشخبری دی کہ دنیا کی تمام چیزیں اسی کے لیے پیدا کی گئی ہیں اور اس کو پوری آزادی دی کہ وہ خدا کی تمام نعمتوں سے جائز طور پر کما حقہ فائدہ حاصل کرے چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض "جو کچھ کہ زمین اور آسمان میں ہے سب تمہارے لیے مسخر کیا گیا"

اگر دوسرے مذاہب کے فلسفہ پر آج دنیا میں پورا عمل ہوتا تو عالم کا یہ رنگ جو ہم دیکھ رہے ہیں کبھی نہ دیکھتے۔ یہ اسلام کی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ اس نے دنیا کو دین سے کم اہمیت نہیں دی۔ اور رہبانیت اور دنیا داری کی زندگی بسر کرکے دنیا کو حاصل کرنے کا راستہ بتلایا اور اس اعلیٰ معراج کو دنیاوی مراحل کامیابی سے طے کرکے انسان پہنچتا ہے۔ اسلام کے اس اصول نے انسان کو صحیح راستہ پر ڈال دیا ہے اور اس کو بتا دیا ہے کہ دنیا اور دین میں کیا تعلق رکھے۔

اسلام کی سب سے بڑی خدمت:- اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ایک طرف تو اس نے انسان کو رہبانیت کے پنجہ سے نجات دلائی اور دنیا کی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کا موقع دیا اور پیدائش دولت میں مسلسل اضافہ کرنے کے طریقے بتا کر اس کو ترقی، تمدن، تہذیب اور شائستگی کے راستہ پر ڈال دیا اور دنیا کی تمام نعمتوں اور قدرت کے تمام ذرائع سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ یہ بہت بڑی انسانی خدمت ہے۔ لیکن اگر انسان کو محض دنیا کی حرص میں گرفتار رہنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا تو دنیا میں فساد، ظلم و ستم کرتا ہے اس کی کوئی حد باقی نہیں رہتی اور معاشی غلامی تو سیاسی غلامی سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان امیر ترین ممالک کا حشر دیکھ رہے ہیں۔

نظام سرمایہ داری پر عمل پیرا ہیں اور دولت کی بہتات نے انکو معمولی انسانی حقوق تسلیم کرنے سے بھی اندھا کر دیا ہے۔ امریکہ جیسے مہذب ملک میں کم سے کم ۵۰ فیصد لوگ ایسے ہیں جنکو پوری مناسب غذا نہیں ملتی دنیا کو ہی ایک منتہائے عمل اور نصب العین قرار دینا انتہائی غلطی ہے۔

اسلام کی دوسری حد بندی :- اسلام کی دوسری بڑی حد بندی یہ ہے کہ اس نے دنیا داری کو جائز قرار دیا لیکن اسے انسانی زندگی کا آخری مطمح نظر قرار نہیں دیا۔ اس نے دنیا داروں کے سامنے ایک اس سے بھی بہتر اور پاکیزہ زندگی کا نقشہ پیش کیا ہے جسے حاصل کرنے کے لیے دنیاوی زندگی اس طریق سے گزارنا ضروری ہے کہ وہ اپنی حاصل کردہ نعمتوں میں اپنے دوسرے بھائیوں کو بھی شامل کرے اور دنیاوی زندگی کا نصب العین سمجھ کر ان کے ذہنیات میں گرفتار نہ ہو جس میں آجکل دنیا دار گرفتار نظر آتے ہیں۔ دنیا ہی کو ایک منتہائے عمل قرار دینا انتہائی غلطی ہے۔

غرض اس مسئلہ پر ازحد اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے کہ معاشی نقطۂ نظر سے زندگی کا کونسا معیار بہتر ہے آیا ہم کو چند سیدھی سادھی ضروریات پر قناعت کرنا اچھا ہوگا یا دنیا کی نعمتوں اور تعیشات سے دل بھر کر لطف اٹھانا؟ حکماء کے ایک طبقہ نے تو نفس پروری اور عشرت پرستی کو زندگی کی غرض و غایت قرار دیدیا اور دوسرے نے نفس کشی اور ریاضت کو اعلیٰ مقصد ٹھہرایا۔ سچ پوچھئے تو یہ دونوں فرقے افراط اور تفریط میں جا پھنسے۔ خدا کی بے شمار عطیات سے خواہ مخواہ دست کش رہنا بھی کفران نعمت ہے۔ اور تمام عمر تن پروری کی نذر کر دینا اور بھی گمراہی ہے۔ دنیا کی لذتوں کا لطف اٹھانا اور پھر بھی نفس پر قابو رکھنا گو دشوار سہی لیکن زندگی کا سب سے کامیاب طریق یہی ہے۔ اور اسلام نے اپنے پیروؤں کو اسی طریق کی ہدایت کی ہے کسی زمانہ مسلمان ایک ہی وقت میں پکے دنیا دار اور خدا پرست اور صاحب ثروت اور فقیر منش بنکر اس طریق کی خوبیاں دنیا پر ثابت کر بھی چکے ہیں چنانچہ مولانا رومؒ نے اسی نکتہ کی یوں توضیح کی ہے ؎

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

مذہبی اور اخلاقی پہلو سے قطع نظر کرتے ہی طریق اعتدال معاشی نقطہ نظر سے اصولاً اور تجربتہً بہترین ثابت ہو رہا ہے۔" ۱

۱ (علم المعیشت صفحہ ۷۴، از پروفیسر الیاس برنی صاحب)

(۲) معاشی مسائل انسان کی دنیاوی زندگی سے وابستہ ہیں

قرآن مجید نے انسانی زندگی کے تین دور قرار دیئے ہیں:۔

ایک دَور زندگی کا وہ ہے جہاں ہر وہ چیز جو آدمی کا دل چاہے گا، جو چیز کہ مانگے گا اور جس سے آدمی لذت گیر ہو گا، خواہش کرے گا، بموجب اس کی خواہش اور ارادہ کے وہ پوری ہو جائیں گی۔ زندگی کے اسی دور کو" معاد" کہتے ہیں۔ قرآن نے اس زندگی کی خصوصیات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم و لکم فیھا ما تدعون۔ " تمہارے لیے اس میں وہ سب کچھ ہے جو تمہارا دل چاہے گا، اور تمہارے لیے وہ بھی ہے جو تم مانگو گے۔"

اور اسی کے قریب قریب دوسرے الفاظ میں کہا ہے، قرآن کا وعدہ ہے کہ زندگی کے اس دور میں آدمی موجودہ دور کے بعد داخل ہو گا، اس کے مذکورۂ بالا آثار چند علمی و عملی شرط کے ساتھ وابستہ ہیں جن کا ماننا اور جن پر عمل پیرا ہونا اسی زندگی میں ضروری ہے، بہرحال یہ دور تو موجودہ دور کے بعد آئے گا۔

دوسرا دور انسانی زندگی کا قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے جو موجودہ دور سے پہلے تھا اور یہ وہی دور ہے جس میں آدم اور زوج آدم کے متعلق قرآن میں ہے کہ ان کو ایک جنت اور باغ میں رہنے کا حکم دیا گیا اور اسی کے ساتھ کہا گیا:

و کلا منھا رغداً حیث شئتما " تم دونوں خوب جی بھر کر جہاں سے چاہو کھاؤ"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قریب قریب جس حال میں اس وقت لاکھوں اور کروڑوں جاندار چیزیں انسان کے سوا نظر آتی ہیں، جس میں بعض چیونٹیوں جیسی چھوٹی اور بعض ہاتھیوں اور اژدھوں جیسی بڑی بھی ہیں وہ بھی جنکی چوبیس ۲۴ گھنٹے کی ضرورت صرف خشخاش کے کسی دانہ سے پوری ہو جاتی ہے اور وہ بھی جن میں ہر ایک کو چوبیس گھنٹوں میں سیروں اور منوں غذا کی ضرورت ہے لیکن باوجود اس کے تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے یہ سارے جاندار زمین کے اسی کرہ پر بغیر ان معاشی بے چینیوں اور پریشانیوں کے جن میں ان ہی جیسا ایک اور جاندار یعنی انسان اسی کرہ پر مبتلا ہے وہ اپنی اپنی زندگی گذار رہے ہیں۔

تیسرا دور انسانی زندگی کا وہ دور ہے جس میں وہ موجودہ حالت میں گرفتار ہے قرآن مجید نے اسی زندگی کی خاص خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

لقد خلقنا الانسان فی کبد "ہم نے انسان کو سخت مشقت اور محنت میں پیدا کیا"

غالباً توراۃ کا یہ مشہور جملہ کہ جب آدم سے دور اول کی زندگی چھینی گئی تو اس وقت خدا نے زمین پر بھیجتے ہوئے ان کو فرمایا:

"تکلیف کے ساتھ تو عمر بھر اس سے کھائے گا .... تو اپنے منہ کے پسینہ کی روٹی کھائے جب تک کہ زمین میں پھر نہ جائے۔"[1]

موجودہ زندگی کی یہی "کبدیت" (سخت مشقت) دراصل ان گوناگوں پیچیدہ مسائل کی بنیاد ہے جسے معاشیات یا معاشی مسائل کہتے ہیں۔

(۴) انسانی خواہشات لامتناہی ہیں

موجودہ زندگی میں یہ کبدیت کیوں پیدا ہوئی؟ قرآن نے اس کا بھی جواب دیا ہے کہ

---

[1] توریت - پیدائش باب ۳ نمبر ۱۷ اور نمبر ۱۹۔

جس فطرت کو لے کردہ اس زندگی میں قدم رکھتا ہے قرآن میں اس کی تعبیر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

ان الانسان خلق ھلوعاً۔ "انسان سخت لالچی بے صبرا پیدا کیا گیا ہے۔"

روائیتوں میں انسانی فطرت کا حال بیان کرتے ہوئے جو آیا ہے:

لوکان لابن آدم وادیاً من مال لاتبغی الیہ ثانیاً ولوان لہ ثانیاً لاتبغی الیہ ثالثاً ولا یملا جوف ابن آدم الا التراب۔

"اگر ابن آدم کے لیے ایک وادی مال سے ہو تو چاہے گا اسکے ساتھ دوسری ہو اور اگر دوسری ملی گی تو چاہے گا اس ساتھ تیسری اور آدم کا پیٹ تو مٹی کے سوا اور چیز سے نہیں بھرتا۔"

ترمذی نیز بخاری، کتاب الرقاق پ۲۶ بروایت ابن عباس وابن زبیر۔

اسی آیت کی تفسیر کسی شاعر نے فارسی میں اس طرح کی ہے:۔

"دادم آرزوہا آفرینی"

"مگر کارے نداری اے دل اے دل"

اور اُردو میں یہ ترجمہ کیا ہے:۔

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں ۔ کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

غرض یہ سب انسان کی فطری ہوس کو ظاہر کرتے ہیں۔ عارف شیراز نے فطرت کے اسی اقتضاء سے گھبرا کر ساربانِ حیات کو جو یہ حکم دیا ہے۔

سر منزل قناعت نتواں ز دست دادن

اے ساربان فرو کش کیں رہ کراں ندارد

اس حکم میں وہ راہ جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے وہ یہی ہے۔

پھر اسی "ہلوعیت" (بے قناعتی) کے سلسلہ میں انسانی فطرت میں ایک اور فطری جذبہ

اضافہ ہوا جس کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

زین للناس حب الشھوات من النسآ والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث۔

"خواہشوں کی محبت آدمیوں کے لیے آراستہ کی گئی یعنی عورتوں کی، لڑکوں کی اور سونا چاندی کے ڈھیر کی خواہش اور نشان کیے ہوئے فوجی گھوڑے، مویشی، اور کھیتی"

جیسا کہ "زین" کے فعل مجہول کا اقتضا ہے بظاہر خود انسان کا قصور نہیں بلکہ جس نے اس کی فطرت بنائی ہے اسی نے ان چیزوں کو اس کی فطرت کے سامنے بنا سنوار کے پیش کیا ہے گویا ان امور کی خواہش بھی فطری ہے۔

(۴) انسان مال کا دلدادہ ہے

لیکن اس کے ساتھ فطرت کے حدود سے آگے نکل کر اس عقلی وجود نے اپنے اختیار سے ایک اور نظریہ کا اضافہ کیا جس کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

یحسب ان مالہ اخلدہ "خیال کرتا ہے کہ مال اسے ہمیشہ رکھے گا"

ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مال اس کو موت سے خلاصی بخشتا ہے۔ آئے دن مالداروں کو مرتا ہوا دیکھتا ہے وہ یہ خیال کیسے قائم کر سکتا ہے کہ مال آدمی کے وجود یا حیات کو دوام اور بقاء عطا کرتا ہے؟ بلکہ اس کا مطلب وہی ہے جو آدمی سمجھتا ہے کہ معاشی اعتبار سے جس شخص کا سوسائٹی میں جو معیار قائم ہو جاتا ہے اس معیار کو خود اس کے لیے یا اس کی آئندہ نسلوں کے لیے جو چیز باقی رکھ سکتی ہے وہ مال و دولت ہی ہے۔

الغرض معیار زندگی کے وجود و بقا ہی کے لیے ہر شخص "سرمایہ" کی فکر میں سرگرداں ہے۔ اگرچہ عام مفسرین نے تو نہیں لکھا ہے لیکن قصہ آدم میں جس "شجرہ ممنوعہ" کا ذکر ہے

غیر معتبر روایتوں میں بعضوں نے "حنطۃ" (گیہوں) بعضوں نے "عنب" (انگور) بعضوں نے "شجر عقل" بعضوں نے "شجر اختیار" اور مختلف معانی بیان کیے ہیں لیکن خود قرآن مجید نے شیطان کی زبان سے ایک جگہ "شجرۃ" کے مضاف الیہ کو "الخلد" قرار دیا ہے شیطان نے آدم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

یا آدم ھل ادلك علی شجرۃ الخلد وملك لا یبلی؟ "کیا میں تمہیں ایک ایسے سدا بہار درخت کی طرف رہنمائی کروں اور ایسے ملک کی طرف جسمیں قدامت نہیں آتی"

یعنی بجائے شجرۃ البر (گیہوں کا پودا) شجرۃ العنب (انگور کا پودا) شجرۃ العلم شجرۃ الاختیار کے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے آدم کو "شجرۃ الخلد" یا دوام و خلود عطا کرنے والے درخت کی طرف راہ نمائی کی۔ اب جب دوسری جگہ جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ آدمی مال کے متعلق یہ خیال رکھتا ہے کہ وہ اس کو دوام عطا کرتا ہے اس سے اگر یہ نتیجہ پیدا کیا جائے کہ آدم کی وہ زندگی جس میں دوسرے جانداروں کی طرح معیار زندگی کی بقاء و دوام کی فکر سے آزاد ہو کر رہنے کا حکم دیا گیا تھا اس آزادی کو آدم نے اسی شجرۃ الخلد اور سرمایہ اندوزی کے خیال میں کھو بیٹھا تو جو کچھ ہو رہا ہے اور آدمی جس حال میں گرفتار ہے یہ اسی کی تعبیر اور تفسیر ہو جائے گی بلکہ آگے جو "ملك لا یبلی" کا لفظ ہے یعنی اس کی یہ مملوکہ اور مقبوضہ چیز پارینگی اور کھنگی سے پاک ہے۔ اور پرانے ہوں یا نئے معاشیین انھوں نے زر یا روپیہ کی جو یہ تعریف کی ہے کہ۔

"سریع الزوال چیزوں میں قدر جلد زائل ہو جاتی ہے۔ لیکن زر جیسی دیرپا چیز میں قدر عرصہ دراز تک برقرار رہتی ہے"[1]

الدمشقی نے "زر" کی تعریف کرتے ہوئے ایک خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ

---

[1] ۔ علم المعیشت از پروفیسر الیاس برنی صاحب صفحہ ۲۵۳۔

"البتاءُ علی طول الدفن" کہ اس کے دفن کرنے پر جتنا زمانہ بھی گذر جائے لیکن پھر بھی وہ باقی رہتا ہے کیا نوؤں اور کیا پرانوں دونوں نے روپیہ میں اسی صفت کو نہیں پایا ہے؟ جس کی طرف "لا یبلی" (جو پرانا نہ ہو) کے لفظ سے شیطان نے اشارہ کیا تھا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ روپیہ ہی ایک ایسی چیز ہے کہ اگر کوئی قرض لیکر سو برس بعد بھی کسی کو واپس کرے تو اس کو اسی قسم کے تر و تازہ روپیے دینے پڑیں گے جیسے اس نے لیے تھے۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ امتداد زمانہ سے اس میں گھنگی یا فرسودگی پیدا ہوگئی یا کیڑے لگ گئے۔ آٹھ آٹھ دس دس ہزار برس کے پرانے دفینے آج عراق اور مصر موہنجدارو (سندھ) اور ملکت آصفیہ کے علاقوں مسکی ضلع رائچور اور کنڈہ پور میں کھد رہے ہیں ان میں جو چیز اپنی اصلی حالت پر بغیر کسی تغیر و انقلاب کے مل رہی ہے یہ ہی "شجرۃ الخلد" (روپیہ) ہے۔

(۵) انسان روپیہ کے ذریعہ بے نیاز بننا چاہتا ہے

شیطان کے اسی اغوائی مشورہ کا ذکر فرماتے ہوئے قرآن ہی میں ہے کہ آدم کو اس نے یہ بھی باور کرانا چاہا تھا کہ "خلد" کے اس شجر سے خدا نے جو تم کو روکا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس درخت تک تمہاری رسائی ہو جائے گی تو تم "ملک" (فرشتہ) ہو جاؤ گے۔

مَلک در اصل ایک ایسی ہستی کی تعبیر ہے جو باوجود حیات و زندگی۔ احساس اور عقل رکھنے کے ہر قسم کے احتیاجات سے پاک ہو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ہی نے بخل کی توجیہہ کرتے ہوئے مال کے متعلق آدمی کے اس جذبہ کا اظہار کرتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ مال مجھے بے نیاز اور دوسروں سے بے پرواہ و غنی کر دے گا اور یہ کہ مال اسے خالق ہو یا مخلوق آئے دن ہر ایک کی نیاز مندیوں کی جھنجھٹ سے نجات دیدیتا ہے

جیسا کہ سورۃ اللیل میں ہے:

واما من بخل واستغنیٰ۔ "اور جو بخل کرتا ہے اور بے نیاز بنتا ہے"

میں کہا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ روپیہ جمع کرنے والے یہی سمجھتے ہیں کہ اپنی ضرورت پر ہم قابو یافتہ ہو جاتے ہیں کہ ہر چیز کا روپیہ سے بآسانی تبادلہ ہو سکتا ہے خرچ میں مرض میں دوسری ضرورتوں میں روپیہ کے بعد کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ چیک پر دستخط کیا اور سب کچھ آگیا، گویا فرشتوں میں عدم احتیاجی کا جو پہلو پایا جاتا ہے روپیہ کے ذریعہ سے آدمی اس "ملکوتی" مقام کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

(۶) افراد انسانی میں تفاوت

لیکن انسانی فطرت کی اس "ھلوعیت" (بے قناعتی) سونے چاندی کے ڈھیر (القناطیر المقنطرۃ) سے اس کی قدرتی و پیدائشی دلچسپی اور ان میں خلود اور دوام "بے نیازی" اور تونگری کی طمانیت کا احساس یہ ساری باتیں ایک طرف اور ان ہی کے ساتھ افراد انسانی کے متعلق قدرت ہی کا یہ عمل جس کا ذکر قرآن میں بایں الفاظ فرمایا گیا ہے:

واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق۔ "خدا نے تم میں بعضوں کو بعض پر روزی میں فضیلت دی۔"

یعنے ہم میں اگرچہ ہر شخص "ہلوعیت" (بے قناعتی) اور سونے چاندی کے ڈھیر "القناطیر المقنطرۃ" کی فکر میں سرگرداں ہے۔ مگر قدرت نے بھی جمادات سے زیادہ نباتات میں اور نباتات سے زیادہ حیوانات میں اور حیوانات میں سب سے زیادہ بلکہ نتہا سے زیادہ تفاوت نوع انسانی کے افراد میں پیدا کر کے ایک ایسی صورت پیدا کر دی جس کا ذکر قرآن ہی میں ہے ا

نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیوة الدنیا۔ ترجمہ۔ ہم نے انسانوں کی زندگی میں انکی روزیوں کو تقسیم کر دیا ہے۔

اور یہ واقعہ ہے کہ پیدایشی طور پر ہم میں بعض کا ارسطو اور افلاطون گاندھی اور ہٹلر جیسے لوگوں کے دل و دماغ لیکر پیدا ہوتا ہے جو صدیوں بعد پیش آنے والے واقعات کو ابھی سے پہچانتے ہیں اور ہم میں بعض ایسے بھی پیدا ہوتے ہیں جو صرف اس لیے کہ خود اپنے کو نہ بھول جائیں اپنے گلے میں کوڑیوں کا ہار پہنتے ہیں جیسا کہ عرب کے ہبنقاء[1] کا قصہ مشہور ہے اور یہ تو ایک مثال ہے ورنہ دماغی، ذہنی، عقلی، اخلاقی اور جسمانی قوتوں کے اعتبار سے جو بین تفاوت انسانی نوع کے مختلف افراد میں پایا جاتا ہے اتنا تفاوت کہ قوت کے اس سلسلہ میں ایک آسمان پر ہوتا ہے اور دوسرا زمین پر۔ اسی نے کسب کی قوتوں میں بھی تفاوت پیدا کیا اور اس تفاوت نے بعضوں کو اونچا اور بعضوں کو نیچا کر دیا۔ ایک کے پاس جو کچھ ہے وہ دوسرے کے پاس نہیں۔ اسی کا نتیجہ وہ ہوا جس کا ذکر قرآن ہی نے سورہ زخرف کی مذکورہ بالا آیت کے بعد اس طرح کیا ہے:۔

ورفعنا بعضھم فوق بعض درجات لیتخذ بعضاً سخریا۔ "اور برتری بخشی تم میں بعض کو بعض پر مختلف مدارج کے حساب سے تاکہ تمہارے بعض بعض سے کام لیں"۔

الغرض دنیاوی زندگی کی ان ہی خصوصیات نے معاشی قوانین کے ایک ایسے جال کو پیدا کر دیا ہے جس کے گوناگوں پھندوں میں پھنس کر انسانی فطرت تڑپ رہی ہے۔ ہانپ رہی ہے اور یوں اس کی یہہ زندگی "کبد" (محنت مشقت) بن گئی ہے۔ بقول

---

[1] ہبنقاء عرب کا ایک احمق تھا اس نے کوڑیاں تاگے میں پرو کے گلے میں ڈال لی تھیں کہ کہیں گم نہ ہو جاؤں جب تک اس کو اپنے گلے میں دیکھا کرتا سمجھتا کہ میں، میں ہوں اور ابھی موجود ہوں گم نہیں ہوا ہوں۔ صناجة الطرب فی تقدمات العرب۔ نوفل آفندی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کہ "اگر آدمی کو اپنی حاجتوں کو رفع کرنے کے لیے کچھ نہ کرنا پڑتا" مثلاً حاجت ہی نہ ہوتی (گویا آدمی فرشتہ ہوتا) یا جن چیزوں سے رفع ہوتی ہیں وہ اسے یوں ہی بیٹھے بٹھائے مل جایا کرتیں" جیسا کہ "الحیوۃ الآخرۃ" کے متعلق قرآن نے بیان کیا ہے کہ اس عالم میں آدمی اپنے اندر "کن فیکونی" قوت کو لے کر پیدا ہوگا اور ٹھیک جیسے اس زندگی میں خیالی طور پر ہر چیز کو اپنے خیال میں آدمی پیدا کرلیتا ہے۔ اُس وقت بجائے خیال کے واقعہ میں بھی ان کی تخلیق پر قادر ہو جائے گا تو بقول ڈاکٹر صاحب

"نہ معیشت ہوتی نہ معاشیات"

اور "دنیا کی تمام جامعوں میں معاشیات ہی کا درس کل ہی سرے سے بند ہو جائے"[1]۔ یا اگر حاجت بھی ہوتی لیکن اس حاجت کی تکمیل کے لیے آدمی کو اس سے زیادہ کام نہ کرنا پڑتا جتنا کہ "حیوانات" اس زمین پر کروڑوں برس سے کر رہے ہیں گویا دنیا دی زندگی (الحیوۃ الدنیا) سے پہلے "آدمیت" جس حال میں تھی اسی میں رہتی لیکن بقول ڈاکٹر صاحب "جب تک ایسا نہیں ہوتا اس وقت تک یاد رکھنا چاہئے کہ ان معاشی قوانین اور اُس کبدیت سے آدمی کو نجات نہیں مل سکتی۔ قرآن نے اس کبدیت کی جو توجیہہ پیش کی ہے اس کے متعلق ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:" اس حقیقت کو بھولیے تو کیسے بھولیے کہ انسان کو اپنی آرزوں کے پورا کرنے کے لیے جن مادی چیزوں کی ضرورت ہے وہ محدود ہیں اور اس کی آرزوں کی کوئی حد و انتہا نہیں قدرت نے اس کی نطرت میں سیری نہیں دی اس کا ذہن اور اس کا دل ہر وقت نئے نئے مقاصد نئی نئی آرزوں کا مولد ہے"[2]

(۷) کیا فطرت نے بخل سے کام لیا ہے؟

---

[1]۔ معاشیات، مقصد اور منہاج صفحہ ۶۹ شائع کردہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد۔ [2]۔ ایضاً صفحہ ۷۔

ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ قول کا دوسرا جز تو ظاہر ہے قرآن کی اس "ہلوعیت" (بے قناعتی) کی لفظی تعبیر ہے لیکن پہلا جز کہ انسانی آرزوں کے پورا کرنے کے لیے جن مادی چیزوں کی ضرورت ہے وہ محدود ہیں اسی بنیاد پر "قدرت" کے متعلق یہ دعوی کرنا کہ "ذرایع کی فراہمی میں اس نے بڑے بخل سے کام لیا ہے" قطع نظر تعبیر کے، واقعہ کے اعتبار سے بھی در اصل غور ہے، کیونکہ فطرت کا یہ بے تہاہ سمندر جس کے اندر سے ہر دن حیرت انگیز انکشافات
۲ کا ظہور ہوتا رہتا ہے، ابھی تو دنیا صرف برق بھاپ اور ریڈیو وغیرہ کے کمالات پر سروھن رہی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ قدرت کا یہ صدف لاہوتی کن شہوار موتیوں کو اگلنے والا ہے! اس لیے مادی چیزوں کی محدودیت کے شکوہ کی جگہ اگر ذرایع کی فراہمی سے یہ مطلب لیا جائے کہ انسان جن حالات میں اس دنیاوی زندگی میں مبتلا ہے اس کی فطرت کے لامحدود مطالبوں کے جو ذرایع ہیں ان کی فراہمی کے لیے وہ سازگار نہیں ہے تو اس کی تائید واقعات سے ہوگی، اور خود قرآن نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اسی سورہ میں جن میں انسان کی کبدیت (محنت۔ مشقت) کا ذکر کیا گیا ہے اس کے پہلے نوع انسانی کی ایک اور خصوصیت پر بھی

ووالد وما ولد "قسم ہے باپ اور اس (لڑکا) کی جس کو اس نے پیدا کیا۔

کے الفاظ سے تنبیہ کی گئی ہے جس کا بظاہر یہی مطلب معلوم ہوتا ہے کہ اگر نوع انسانی کا حال کسی ایسی چیز کا ہوتا جو بجائے لامحدود افراد میں منقسم ہونے کی کسی فرد واحد مثلاً آفتاب کی شکل میں موجود رہتی اور جیسے آفتاب کا ایک ہی فرد نا معلوم زمانہ سے موجود ہے اسی طرح انسان بھی بجائے اس طریقہ کے کہ باپ پیدا ہوتا ہے بڑھتا ہے جوان ہوتا ہے بوڑھا ہو کر مر جاتا ہے۔ پھر باپ سے اسی قسم کا ایک بیٹا پیدا ہوتا ہے اور وہ بھی انہی زینوں کو ختم کر کے مر جاتا ہے۔ یہ نہ ہوتا بلکہ ایک ہی آدمی ابتدا سے اس وقت تک ان ہی عقلی و جسمانی قوتوں کے ساتھ موجود ہوتا جو انسان میں پائی جاتی ہیں تو ذرایع کی

محدودیت اور تنگی کی جو حیثیت آج ہے شاید صورت حال اس کے بہت کچھ مختلف ہوتی۔ آج یہ حال ہے کہ ایک آدمی پیدا ہوتا ہے جیسے جیسے بڑھتا ہے اس کے تجربات اور معلومات بڑھتے جاتے ہیں عمل کی مہارت اور مشق میں ترقی کرتا جاتا ہے کہ اچانک اس پر اس کے قویٰ پر انحطاط شروع ہوتا ہے وہ گرنے لگتا ہے گرتے گرتے بالآخر جیسا کہ قرآن کا دعویٰ ہے :-

"ثم رددناہ الی ارذل العمر لکیلا یعلم من بعد علم شیاً۔" ترجمہ۔ پھر ہم نے اس کو بڑی عمر تک پہنچایا تاکہ جاننے کے بعد کچھ نہ جانے۔

اور پھر مر جاتا ہے اب اس کی جگہ اس کا لڑکا تجربات و معلومات کے اسی سبق کے ابجد کو پھر شروع کرتا ہے کسی نتیجہ تک وہ بھی پہنچتا ہے کہ یہ بھی ختم ہو کر اسی سلسلہ کو اپنے جانشین کے ذریعہ سے پھر نئے سرے سے شروع کراتا ہے۔ یوں ہی "والد وما ولد" کا سلسلہ جاری ہے اور اسی لیے کسی کی کوشش اپنی انتہائی کمال کے نقطہ تک پہنچنے نہیں پاتی ورنہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم میں جب کسی صاحب عقل و دماغ کو کچھ دن بھی جینے کا موقع مل جاتا ہے تو زندگی کے جس شعبہ کے متعلق بھی اس نے تجربات شروع کیے ہوں اس میں حیرت انگیز انکشافات کا اعلان کرتا ہے بالفرض اگر عمر طبعی کی محدود مدت کے بجائے ان موجدین اور اختراعین کو آفتاب کے برابر نہ سہی کم از کم ایک ایک ہزار سال بھی جوانی کی امنگوں اور شباب کی قوتوں کے ساتھ اس دنیا میں جینے کا موقع دیدیا جاتا تو آج کروڑہا انسانوں کی فکر و نظر نے جو چیزیں پیدا کی ہیں یہ واقعہ ہے کہ وہی اکیلا اور پرانا کہنہ مشق انسان ایسے انکشافات و معلومات تجربات و مشاہدات کا ذخیرہ پیدا کر سکتا تھا جس کے مقابلہ میں ہماری موجودہ علمی و عملی کوششیں شاید صفر کا درجہ اختیار کر لیتیں۔

ایک ہی علم نہیں بلکہ ہر علم اور ہر فن کے مفکروں اور تجربہ کاروں پر "والد وما ولد" کا قانون اگر نہ عمل کرتا اور ہر سلسلہ میں ایک ایک وجود کو ٹھوس امر بنا دیا جاتا تو دنیا آج

جس حال میں ہے قطعاً اس سے مختلف ہوتی اور "معاشیات" و معاشی ذرائع کی نوعیت بھی دوسری ہوتی۔

اور میرے نزدیک قرآن نے ان الفاظ سے سچ پوچھیے تو اسی کبدیت کے ایک سبب کی طرف "والد وما ولد" کے الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

(۸) انسان آرزوں کا ایک سمندر لیکر پیدا ہوتا ہے۔

انسان بلکہ تقریباً نوع انسانی کا ہر فرد اپنے اندر آرزوں اور تمناوں کے سمندر لیکر پیدا ہوتا ہے قدرتی قوانین کے لامحدود ذخیرہ کے سامنے اپنے آپ کو کھڑا پاتا ہے۔ اسے امید ہوتی ہے کہ ذرا ہم نے زور لگایا اور اپنے مقصد تک پہنچے لیکن "والد" کی عمر تمام ہو جاتی ہے اور وہ بیچارہ ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

کہتا ہوا "ماولد" کے لیے جگہ خالی کر دیتا ہے۔ غریب ماولد پھر انہی امنگوں اور نئے ولولوں کے ساتھ پھر اسی سبق کو دہرانے میں مشغول ہوتا ہے وہلم جرا۔

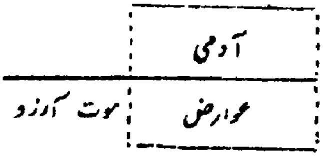
دنیاوی زندگی (الحیواۃ الدنیا) کا یہی واقعہ ہے، خواہ ہم اس سے جتنا بھی اغماض سے کام لیں لیکن جو واقعہ ہے وہ بہر حال واقعہ ہے۔ غالباً اسی کی طرف "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم" نے اس مشہور حدیث میں اشارہ فرمایا جو "حدیث خطوط" سے موسوم ہے "ابن مسعود راوی ہیں:۔

خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطاً مربعاً وخط خطاً فی الوسط وخط خطاً خارجاً وخط خطوطاً

"رسول اکرم نے چار لکیریں یعنی مربع شکل بنائیں اور پھر بیچ میں ایک لکیر کھینچی اور ایک لکیر مربع سے باہر پھر بہت سی چھوٹی لکیریں کھینچی جو اس بیچ والی

صغاراً الی هذا الذی فی الوسط من
جانبه الذی فی الوسط فقال :
هذا الانسان وهذا اجله محیط
به وهذا الذی هو خارج امله و
هذه الخطوط الصغار الاعراض
فان اخطاء هذا نهشه هذا وان
اخطا هذا نهشه هذا ۔

لکیر سے ملی تھی اور فرمایا کہ یہ انسان ہے اور یہ
اس کی موت ہے جو اس کو گھیرے ہوئے ہے اور وہ
لکیر جو مربع سے باہر ہے وہ اس کی آرزو اور
امیدیں ہیں اور درمیان کی چھوٹی چھوٹی لکیریں
وہ پیش آنے والی اعراض ہیں اور اگر چوک
گیا تو وہ پکڑ لیتا اور اگر یہ چونک گیا تو یہ
پکڑ لیتا ہے ۔



"آرزوؤں کی محدودیت" یا انسان کی "بے قناعتی" اور موت زندگی کے ہزاروں عوارض وعوائق حرص ۔ حرج ناکامیابی ۔ نامرادیاں ان میں انسان جس طرح گھرا ہوا ہے اس کی یہی واقعی تمثیل ہے اور ہماری کبدیت (محنت مشقت) کے منجملہ اور اسباب کے ایک بڑا سبب یہ بھی ہے ۔

اس میں شک نہیں ہے کہ "والدیت اور مولودیت" کے اس نظام میں جس میں ہر پرانا پھر نیا اور ہر انتہا پھر ابتدا بن جاتی ہے ۔ لیکن "ماولد" "والد" سے یا پچھلی نسل پہلی نسل کے متروکات سے نفع اٹھاتے ہوئے بہ ظاہر کچھ نہ کچھ آگے قدم بڑھاتی چلی جارہی ہے لیکن یہی کوشش اگر بجائے اس نظام کے ہر شعبہ حیات کے ایک ایک والد کے سپرد کردی جاتی تو ترقی کی یہ سست رفتار خدا جانے کتنی تیز ہوتی لیکن بقول ڈاکٹر صاحب :-

"جب تک ایسا نہیں ہوتا اس وقت تک یاد رکھنا چاہیئے کہ ذرائع کی محدودیت

اور انسان فطری مطالبات کی "محدودیت" کا قصہ یوں ہی باقی رہے گا اور جب تک یہ قصہ باقی ہے (کبدیت) اور معاشی مشقتوں کا گھاؤ انسانی فطرت کے اندر "الحیوٰۃ الدنیا" میں یوں ہی ٹپکتا رہے گا۔

(۹) معاشی مسائل کی بنیاد

گذشتہ بالا قرآنی اشارات سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں معاشی مسائل کی بنیاد جو صرف لفظ "پیٹ" پر قایم کی جاتی ہے اگر یہ صرف تعبیر ہے تو مضایقہ نہیں ورنہ غریب پیٹ کی حد تک تو انسانوں سے بھی بڑے بڑے پیٹ والے پیٹو اس دنیا میں موجود ہیں۔ ہاتھی بھی ہے اور وصیل مچھلی بھی۔ لیکن آدمی کے گھرانوں کے سوا اور دوسری جگہ اسی بدنام "پیٹ" نے ان مسائل کو کیوں پیدا نہیں کیا؟ پیٹ کی حد تک ـــ تو حکیم الشعرا شاعر رکن حضرت امجد نے ٹھیک طور پر لکھا ہے ؛ـــ

مفت بیچاری ضرورت ہر جگہ بدنام ہے

مفت بیچارہ شکم ہی ہر جگہ بدنام ہے

ابن آدم اپنے ہاتھوں مورد آلام ہے۔

در قضائے تنگ دنیائے حاجت لبسیار نیست

آنچہ ما در کار داریم اکثرش درکار نیست

لیکن سچی بات وہی ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے کہ یہ سب کچھ دنیاوی زندگی میں ہماری ان فطری خصوصیتوں کا نتیجہ ہے جنھیں لے کر ماں کے پیٹ سے آدمی اس دنیا میں آتا ہے۔

اور ان ہی خصوصیتوں کی بنیاد پر مذکورہ بالا "کبدیت" (معاشی مشقت) ہماری موجودہ زندگی کا ایک اہم سوال بن گئی ہے۔

(۱۰) مذاہب کا پرتو لوگوں کی معاشی زندگی پر

آج ہی نہیں تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے آدمی اس سوال کے حل کرنے میں مصروف ہے کہ اگر ان مشقتوں کا بالکلیہ خاتمہ نہ ہو سکے تو کم از کم ممکنہ حد تک ان دشواریوں میں کیا آسانیاں پیدا کی جا سکتی ہیں؟ مختلف قوموں نے مختلف زمانوں میں اس کے مختلف حل پیش کیے ہیں اور آج تک آدمی اسی ادھیڑبن میں مصروف ہے۔ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جنہوں نے بجائے "باہر" کے خود انسان کے "اندر" کی طرف توجہ کر کے انسان کی "کبدیت" (معاشی مشکلات) اور دکھ میں خفت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مہاتما بدھ کی طرف جو یہ خیال منسوب ہے کہ "نروانا" اور نجات کا استحقاق کسی کو اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی فطرت کو "بے مدعا" بنانے میں کامیاب نہ ہو جائے یعنے ہر طرح کی آرزوں اور تمناؤں سے خود کو خالی کر لے۔ ظاہر ہے کہ انسانی فطرت پر "بے مدعائی" کا یہ آپریشن اگر کامیاب ہو جائے تو جن معاشی مشکلات کے حل کی راہ آدمی کے باہر تلاش کی جا رہی ہے کتنی آسانی کے ساتھ خود آدمی کے اندر اس ترمیم کے ذریعہ نکل آتی ہے کہ گویا اس کے بعد آدمی، آدمی نہیں بلکہ قریب قریب فرشتہ اور فرشتوں جیسا بے حاجت بنجاتا!

اور ایک بدھ مت ہی کیا؟ سوائے اسلام کے غالباً دنیا کے تمام مذاہب میں دنیا طلبی کی مذمت کی گئی ہے کسی نے عالم کے موجودہ نظام کو "مایا" یا دام کا دانہ قرار دیا ہے کہ جیسے شکاری نے خوبصورت اور مخفی پھندوں کے درمیان بکھیر دیا ہے۔ جس نے اس پر منہ مارا اور پھنسا۔ انجیل والے تو ساری دنیا میں یہی منادی کرتے پھرتے ہیں "دولت مند کا آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے۔ بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گذر جانا اس سے آسان ہے کہ ایک دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔"

اسی طرح بجائے تعیشات کے محض "لابدی" ضروریات پر قناعت کرنے کی تعلیم کلبی مکاتب خیال کے فلاسفہ کی طرف سے مختلف ادوار تاریخ میں جو دنیا کے آگے پیش کی گئی ان سب پر اگر غور کیا جائے تو ایک حیثیت سے وہی بجائے خارجی معالجات کے معاشی مشقتوں سے نکلنے کی یہ تدبیر پیش کی گئی ہے کہ باہر اگر سلجھ نہیں سکتا تو آدمی اپنے اندر ہی کو سلجھا لے گویا ان لوگوں نے ع

تجھ پر قابو نہیں دل پر ہے تو قابو اپنا

کی راہ پر خود چلنا چاہا اور دوسروں کو بھی چلانے کی کوشش کی ۔

کاش! اگر کل نہیں تو اکثریت ہی اس نقطہ پر سمٹ آتی تو دنیا اور اس کی رونق چہل پہل کا اس کے بعد خواہ کچھ بھی حشر ہوتا لیکن "کبدیت" (معاشی مشقت) کے دکھ سے اگر بالکلیہ نہیں تو کچھ تو آدمی کو راحت میسر آتی ۔

لیکن کیا کیجئے! کہ سوچنے کی حد تک یہ مسلک کتنا ہی خوش گوار اور آسان معلوم ہوتا ہو اور کہنے کے لیے !۔

لاکھ دینے میں ایک دینا ہے
دل بے مدعا دیا تو نے

گا گا کر آدمی اپنی جھوٹی تسلی کے لفظوں کے ذریعہ سے لاکھ سامان کرے لیکن خیالی دنیا سے نکل کر آدمی جب حقیقت کے زیر اثر آجاتا ہے ۔ اور اسے آنا ہی پڑتا ہے تو فطری جذبات کی شہ زوری کا روکنا اس کے بس کی بات نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ اکثریت تو بڑی چیز ہے اقلیت اور ایسی اقلیت کے لاکھ دو لاکھ میں بھی ایک آدمی مذکورہ بالا مذہبی نظریوں پر حقیقی معنوں میں قایم نہ رہ سکا ۔

غالباً مذہبی سلسلہ کی پہلی کتاب قرآن مجید ہی ہے جس نے سب سے پہلے اس غیر فطری "نظریہ" کے متعلق جس کی تعبیر اس نے "رہبانیت" کے لفظ سے کی اس واقعی

ناقابل انکار حقیقت کا اعلان کیا کہ :۔

رهبانية ابتدعوها ما كتبناها عليهم — "رہبانیت کا مسلک انھوں نے تراشا ہے
الا ابتغاء رضوان الله فما رعوها — ہم نے اس کو ان پر فرض نہ کیا تھا صرف خدا کی رضا مندی
حق رعايتها۔ — طلب کیلئے تھے پس رعایت کی انہوں نے اس کی جیسی رعایت رکھنی چاہیئے۔"

مذکورہ بالا آیت میں رہبانیت کو قرآن ایک اختراعی نظریہ اور ایک منگھڑت خیال قرار دیتا ہے اور صاف اعلان کرتا ہے کہ انسانی فطرت کی یہ قدرتی راہ نہیں ہے قدرت نے آدمی کو اس جبلت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور نہ اس سے کسی زمانہ میں کبھی اس کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

ما كتبناها عليهم۔ — ہم نے اس کو ان پر فرض نہ کیا تھا

کے مختصر الفاظ میں یہ واقعہ ہے کہ اس نظریہ کی پوری تاریخ پوشیدہ ہے یعنی آج ہی نہیں بلکہ کسی زمانہ، کسی ملک، کسی قوم سے خدا نے کسی پیغمبر کسی ہادی کے ذریعہ سے اس مسلک پر چلنے کا حکم آدمی کو نہیں دیا بلکہ اس سے پہلے " ابتدعوها (انہوں نے تراش لیا ہے) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے انتہا پسندوں نے بقول شخصے وہی کیا جس کا اظہار اس شعر میں زاہد کے متعلق کیا گیا ہے ۔

زاہد نہ داشت تاب جمالِ پری رخاں
کنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت

فاتينا الذين آمنوا منهم اجرهم۔ (جو ایمان لائے تھے ہم نے ان کو ان کی مزدوری دی)۔ میں تو یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ رہبانیت کے جن عناصر کا اضافہ لوگ اپنی زندگی میں کرتے ہیں ان کی تو کوئی قیمت نہیں ہے لیکن اگر ان کے ساتھ ایمان و یقین بھی جن دلوں میں پایا گیا ہے ان کی مزدوری مل جاتی ہے۔ گویا جو کچھ صلہ اور اجر ملتا ہے وہ صرف ان کے ایمان کا صلہ ہے اس اجر و صلہ میں راہبانہ مجاہدہ کو کوئی دخل نہیں ہے۔ ان کا ہونا نہ ہونا

قرآن کی نگاہ میں مساوی ہے۔

وکثیر منھم فاسقون۔ (ان میں کے اکثر فاسق ہیں) اس مسلک کے اس انجام کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے جو عموماً اس طریقہ پر چلنے کے مدعیون کی راہ میں پیش آتا ہے کہ آخر میں ہمیشہ اس طبقہ کا ترک دنیا محض "حصول دنیا" کا ذریعہ بن جاتا ہے جیساکہ دوسری جگہ قرآن ہی میں ہے:

ان کثیراً من الاحبار والرھبان	یقیناً بہت سے رہبان اور احبار باطل طریقہ
لیاکلون اموال الناس بالباطل	سے لوگوں کا مال کھاتے ہیں۔

معاش کے صحیح وسائل کو ترک لے کچھ نہ دے کر یہ سادہ لوحوں سے جو کچھ وصول کرتے ہیں اور

یکنزون الذھب والفضۃ	سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ "بالباطل" حصول معاش کی اس سے زیادہ بدترین صورت اور کیا ہو سکتی ہے؛ قدرت نے حصول معاش کے جو فطری حدود مقرر کر دئے ہیں یقیناً یہ اس سے بہت دور نکل جاتے ہیں اور آخر میں ان کا "ترک دنیا" محض "حصول دنیا" کا ایک ذریعہ اور نہایت غلط ذریعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کا فیصلہ بجائے دوسروں کے شاید ان کا دل ہی خود زیادہ کر سکتا ہے اور یہی تو اس گروہ کا "معاشی فسق" ہے۔ اس کے سوا بھی "رہبانیت اور تیاگ بت" "بھکشویت" "کلبیت" وغیرہ کے پردہ میں جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے وہ "کثیر منھم فاسقون (ان میں سے اکثر فاسق ہیں) کی مسلم تاریخ ہے جس سے ہمیں یہاں بحث نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب اکثریت اور وہ بھی اتنی عظیم اکثریت کے لیے "اندر" کا یہ اپریشن صرف ناکام ہی نہیں بلکہ بالآخر مضر اور سخت مضر ثابت ہوا ہے کہ یوں عام معاشی وسائل کے ذریعہ سے اپنے معاشی مطالبات کی تکمیل کرنے والے جنھیں ان کی اصطلاح میں

"دنیا دار" کہتے ہیں وہ اپنی دینی و اخلاقی زندگی کے معیار کو بلند رکھ سکتے ہیں اور بکثرت ان میں ایسے لوگ ہیں جو بلند رکھتے ہیں لیکن رہبانیت و ترک دنیا کے مدعیوں کو محراب و ممبر پر خواہ کسی حال میں پایا جاتا ہو زیادہ تر

ے چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند

میں اکثر مبتلا دیکھا گیا ہے۔

معاشی "کلبدیت" کے اس غلط اور غیر فطری علاج کو گویا قدرت سے جنگ کے مرادف ہے اور جس کا انجام بہرحال وہی ہوتا ہے جو غیر طبعی کش مکش کا ہو سکتا ہے۔

(۱۱) قرآن کا معاشی نظام

قرآن مجید نے رہبانیت کو مسترد کر کے انسانی زندگی اور اس کی فطرت کا معاشی مسائل سے جو تعلق ہے اس کو ایک واقعی حقیقت قرار دے کر معاش کا جو نظام پیش کیا اب ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے "ہلوعیت" (بے صبری بے قناعتی) کی جو صفت آدمی میں پائی جاتی ہے یا سونے چاندی کے ڈھیر (القناطیر المقنطرۃ) کا آدمی جو دلدادہ ہے اسی طرح (الخیل المسومۃ) عمدہ گھوڑے اچھی سواریاں (الانعام والحرث) مویشی۔ کھیت باغ وغیرہ کی جو چاہت اس میں پائی جاتی ہے۔ ان کی تلاش و جستجو کا جو جذبہ اس پر مسلط ہے قرآن نے صاف لفظوں میں اس کا اعلان کیا ہے کہ آدمی کی یہ خود ساختہ خواہش اور اختیاری میلانات نہیں ہیں بلکہ جس نے اس کو پیدا کیا ہے اسی نے اس کی فطرت کو بھی پیدا کیا ہے اور اسی نے اس فطرت میں ان چیزوں کی طلب اور چاہت بھی پیدا کی۔

اگر ایک طرف قرآن اس حقیقت کو واشگاف کرتا ہے تو دوسری طرف بجائے اس کے

مجلا طلبا میں
وہ ان جذبات اور خواہشوں کی حوصلہ شکنی کرے وہ سونا چاندی ہی نہیں بلکہ جس کے
پیٹ سے سونا چاندی اور وہ ساری چیزیں نکلتی ہیں جن کے لیے سونا چاندی آدمی چاہتا
ہے یعنی خود زمین کے اس کرہ کو اٹھا کر قرآن آدمی کے آغوش میں یہ فرما کر:

هو الذی خلق لکم ما فی الارض — "وہی ہے جس نے تمہارے لیے جو کچھ زمین میں
ہے پیدا کیا۔"

اب تک "مذہب" اس کا نام تھا کہ زمین اور زمین کی پیداوار سے آدمی جہاں تک
دور رہ سکتا ہو بھاگے۔ لیکن قرآن جس مذہب کو پیش کرتا ہے وہ کھلے لفظوں
میں پڑھنے والوں پر یہ فریضہ عاید کرتا ہے کہ "زمین" اور زمین میں جو کچھ ہے جب
تک اس کی ہر ہر چیز کے متعلق یہ ثابت نہ کر لیں کہ وہ انسان کی کس ضرورت میں کام آتی
ہے ان کی آسمانی کتاب کی تفسیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

(۱۴) دنیاوی زندگی سے متعلق مذاہب کے نقاطِ نظر

مذہب کا ایک نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ اپنی زندگی کی ضرورتوں سے دنیا کی جس جس
چیز کو اپنے لیے بیکار ثابت کرو گے اسی قدر تمہارا مذہبی کمال ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں
ہی نہیں بلکہ جس ہوا میں سانس لی جاتی ہے حبسِ دم وغیرہ کی مشقتوں سے جو حواس کو
بھی بیکار قرار دے، وہی سب سے بڑا کامل مذہبی ہے۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ زمین اور زمین میں جو کچھ ہے۔ جس قدر اس کے ایک
ایک جز کو انسانیت کے لیے مفید ثابت کرو گے اسی قدر اپنی آسمانی کتاب کی صداقت
میں اضافہ کرو گے کہ

ربنا ما خلقت هذا باطلا — ترجمہ۔ خداوندا! تو نے یہ سب کچھ بے کار نہیں پیدا کیا
اندازہ کرنا چاہیئے کہ دونوں کی راہوں میں کتنا فرق ہے۔ اور زمین ہی کیا!

قرآن کو پڑھتے جائیے وہ بڑھتا ہی جائیگا اور ہر وہ چیز جس پر غلبہ و تسلط کا آدمی خواہشمند ہے وہ اس کے قدموں کے نیچے ڈالتا چلا جاتا ہے اور آخری حد اس سلسلہ کی ہمہ گیری و وسعت دامانی کی یہ ہے کہ ھوالذی سخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعًا۔

(خدا ہی وہ ذات ہے جس نے تمہارے لیے جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے مسخر کر دیا ہے)۔

کے ذریعہ سے تو اس نے زمین ہی کو کیا! بلکہ عالم محسوس کے پورے نظام کو انسانی "ہلوعیت" (بے قناعتی) کی خوراک بنا کر اس کے سامنے پھینک دیا ہے کہ زمین بھی تیری ہے۔ آسمان بھی تیرا ہے۔ ہوا بھی تیری ہے۔ پانی بھی تیرا ہے چاند بھی تیرا ہے۔ سورج بھی تیرا ہے۔ تارے بھی تیرے ہیں۔ سخر لکم الشمس والقمر (آفتاب اور ماہتاب کو تمہارے لیے مسخر کیا) اس جیسی آیتوں کی قرآن کے کس بڑی سورۃ میں کمی ہے! اگر میں تفصیلاً ان کو درج کروں تو شاید قرآن کا ایک بڑا حصہ نقل کرنا پڑے محض نقطۂ نظر کو سمجھانے کے لیے میرا اتنا بیان کافی ہو سکتا ہے۔

(۱۳) عاملین پیدائش

موجودہ عہد کے معاشیوں نے "انسانی معاش" اور اس کے اسباب و موثرات پر غور کرنا شروع کیا تو محنت، تنظیم، اور سرمایہ کے سوا ان کی ابتدائی نگاہ آدمی سے باہر جس چیز پر پڑی وہ قدرتی طور پر زمین ہی ہو سکتی تھی اس لیے معاش کے ارکان اربعہ میں چوتھی چیز اب تک "زمین" ہی سمجھی جاتی ہے۔ لیکن جوں ہی کہ ان کی نگاہ میں کچھ وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی اور محسوس ہوا کہ انسانی معاش کا دامن زمین سے آگے اور دوسرے قدرتی توانین سے بھی بڑھا ہوا ہے جیسا کہ پروفیسر الیاس برنی صاحب "پانی ہوا گرمی روشنی کے وجود خلقت اور پیدائش دولت کے لیے لازمی ہیں۔۔۔۔ ۔۔۔۔ مثلاً دریا کھیتی باڑی کو شاداب کرتے ہیں کشتیوں میں مال ڈھوئے جاتے ہیں۔

پن چکیاں چلاتے ہیں سمندر جہازوں کو تراتے ہیں۔ آبشار بجلی پیدا کرتا ہے ہوا بھی علاوہ شرط زندگی کے بادباں سے کشتی کھیتی ہے۔ پنکھا کر مشین چلاتی ہے اور ہندوستانی کسان کا غلہ برساتی ہے گرمی اور روشنی کی ضرورت بھی اظہر من الشمس ہے[1]۔

یہ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"پس ایسی چیزوں کو عاملین پیدائش میں نہ شامل کرنا کس طرح ممکن ہے" لیکن آدمی کے باہر عامل پیدائش زمین قرار پا چکی تھی آخر شرمندہ ہو کر یہ اصطلاح بنائی کہ ہم بولیں گے تو "زمین" لیکن سننے والوں کو چاہیئے کہ آئندہ زمین سے وہ سارے قدرتی قوانین سمجھ لیا کریں جنھیں پیدائش دولت میں دخل ہے لیکن ان ہی معاشیین میں بعضوں کو اپنی غلطی مان لینے میں شرم محسوس نہیں ہوئی اور وہ بجائے زمین کے جو تھے عامل پیدائش کو "نیچر" اور "قدرت" کے لفظ سے موسوم کرنے لگے چنانچہ پروفیسر الفریڈ مارشل نے زمین سے یہ مراد لی ہے:۔

"زمین سے مادہ اور وہ قوتیں مراد ہیں جو قدرت انسان کی مدد کے لیے زمین پانی، ہوا، روشنی اور حرارت کی شکل میں آزادانہ طور پر عطا کرتی ہے[2]۔ تو گویا "زمین" سے تمام "عطایائے قدرت" مراد لیے جاتے ہیں اور یہ ٹھیک وہی بات ہے جس کا اعلان قرآن میں ہر رکوع دو رکوع کے بعد مختلف الفاظ میں کیا گیا ہے بلکہ محسوسات اور مشاہدات سے آگے قدم بڑھا کر اس نے مشہور آیت استخلاف میں فسجد الملائکۃ کلھم اجمعون (پھر آدم کے سجدے میں سارے فرشتے کُل کے کل جھک گئے) کے ذریعہ سے عاملین پیدائش میں ان زندہ غیبی ہستیوں کو بھی شریک کر دیا ہے جن کے ساتھ مذہب کے بیان کی رو سے اس عالم محسوس کا نظام وابستہ ہے اور یہاں کے ہر شعبہ وجود کا تعلق غیب کی کسی زندہ قوت یعنی

---

[1] ۔ علم المعیشت صفحہ ۲۸ ۔

[2] ۔ الفریڈ مارشل: اصول معاشیات جلد اول صفحہ ۱۳۸ ۔

ملک سے ہے۔

(۱۴) حقیقی عامل پیدائش خود خدا کی ذات ہے

قرآن کی بات اسی نقطہ پر ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ "کفالت رزق" کی مشہور قرآنی آیتوں مثلاً:۔

وما من دابة فی الارض الا علی الله رزقھا۔ ترجمہ۔ اور زمین پر کوئی ایسا جاندار نہیں ہے جس کی روزی خدا نہ دیتا ہو۔

نیز "ان الله ھو الرزاق ذو القوة المتین"۔ یقیناً خدا ہی بڑا روزی دینے والا مضبوط اور استوار قوت والا ہے۔

میں عاملین پیدائش کے سلسلہ میں ایک حیثیت سے خود حق تعالیٰ نے اپنے کو بھی داخل فرما دیا ہے بلکہ پیدائش کا حقیقی عامل خود اپنی ذات مبارک ہی کو قرار دیا ہے اور سچ پوچھیے تو۔

ندیم و مطرب و ساقی ہمہ اوست
خیال آب و گل در رہ بہانہ ساخت (حافظ)

یہی عالم کا حقیقی واقعہ ہے مولانا رومؒ نے بھی اسی پیرایہ بیان کو اپنے ایک خاص انداز میں بیان کیا ہے فرماتے ہیں کہ۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ خود رند سبوکش
خود بر سر آں کوزہ خریدار بر آمد بشکست و رواں شد

قرآن نے یہ بتا کر کہ یہ سارا نظام تمہارے لیے ہے اور اس لیے ہے جیسا کہ شیخ سعدی نے خوبی سے قرآن کے مفہوم کا ترجمہ کیا ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید ہمہ در کارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

گویا اسلامی نقطۂ نظر سے یہ سارا نظام "نانے بکفٹ آری" کا نظام ہے اور یہ تو "باہر" میں ہوا۔

ان معاشی وسائل سے استفادہ کے لیے پھر انسان کے اندر

جعل لکم السمع والابصار والافئدۃ۔ "تمہارے لیے بینائی شنوائی اور دل بنائے"

نیز۔ خلقکم من ضعف ثم جعل من بعد ... "اس نے تم کو ضعف سے پیدا کیا اور ضعف سے

ضعف قوۃ ۔ (روم) پھر تم میں قوت پیدا کی"

نحن خلقنٰھم وشددنا اسرھم۔ "ہم نے انسانوں کو پیدا کیا اور ان کے رگ پٹھوں کو مضبوط کیا۔"

وغیرہ ... میں پیدائش کے ان عاملین کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن کے بل بوتے پر آدمی محنت کرتا ہے اور نہیں تو ... ان کو سوچتا ہے اور ان پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ وہ کامل انسانوں کی صفت ۔

اولی الایدی والابصار۔ "عقل و عملی قوتوں والے"

بیان کرتا ہے:

(۱۵) عطایائے قدرت سے استفادہ

پھر "اندر" اور "باہر" کے ... پر نہیں ... بتانے کے بعد قرآن یہ نہیں کہتا کہ یہ سب کچھ تمہارے سامنے اس لیے پھیلایا گیا ہے تاکہ دیکھا جائے کہ تم ان سے کس حد تک بھاگتے ہو! یا یہ قوتیں اور فکر و نظر عمل و اکتساب کی طاقتیں تم میں اس لیے بھری گئی ہیں تاکہ اندازہ ہو کہ تم ان کو کس حد تک معطل کر کے فنا ہو سکتے ہو! بلکہ جیسا کہ ہر قرآن پڑھنے والا جانتا ہے ان اندرونی اور بیرونی سامانوں کے بعد قرآن نے اعلان کر دیا کہ یہ جو کچھ ہے انسان کی اس دنیاوی زندگی کا سرمایہ اور متاع ہے وہی "القناطیر المقنطرۃ" والی آیت جس میں سونے، چاندی، کھیت، مویشی سواریوں کے ساتھ

انسان کی فطری وابستگیوں کا ذکر ہے ان سب کے متعلق فرمایا جاتا ہے: ذالک متاع الحیواۃ الدنیا (یہ تو دنیوی زندگی کا اثاثہ ہے) اور ظاہر ہے کہ ان ہی چیزوں کو سرمایہ بنا کر آدمی اس زمین پر اپنی زندگی گذار رہا ہے۔ آدم کو جب زمین پر بھیجا گیا اُس وقت بھی یہہ کہہ دیا گیا کہ (لکم فیھا مستقر ومتاع الی حین) "تمہارے لیے اس زمین میں ٹھہرنے کی جگہ خاص وقت تک کے لیے پونجی ہے۔" جب تک رہوگے اسی سرمایہ سے کام لیکر اپنی زندگی گذاروگے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ محنت، سرمایہ، تنظیم اور قدرتی قوانین جو انسانی معاش کے عوامل ہیں ان سب کا ذکر کرکے قرآن مسلسل اس کی سند بنی آدم کو عطا کرتا جاتا ہے کہ یہہ جو کچھ ہے صرف دیکھنے کے لیے یا بھاگنے کے لیے نہیں ہے بلکہ

"کلوا مما رزقکم اللہ" خدا نے جو رزق تمہیں دیا ہے کھاؤ۔

نیز

"کلوا واشربوا من رزق اللہ" خدا کے دیے ہوئے رزق سے کھاؤ پیو۔

ایسے لوگ جو اِن فراری خیالات سے متاثر ہوکر کبھی کبھی ان چیزوں سے استفادہ میں ہچکچاتے ہیں ان کی تسلی کرتے ہوئے فرمایا جاتا ہے اور کتنی شفقت اور مہربانیوں سے فرمایا جاتا ہے۔

کلوا مما رزقکم اللہ حلالاً طیباً "اللہ نے جو روزی دی ہے اسکو کھاؤ وہ حلال اور صاف ستھری ہے۔"

نیز

یا ایھا الناس کلوا مما فی الارض حلالاً طیباً۔ اے انسانو! کھاؤ جو کچھ زمین میں ہے حلال صاف اور ستھرا۔

بعض موقعوں پر قرآن کا بیان مثلاً ابر و باد بارش لہلہاتی کھیتیاں کھلکھلاتے باغوں پھلوں اور اناجوں سے لدی پھندی آدمی کے سامنے کھڑی ہیں ان سب کا ذکر کرکے عجیب شان سے

یہ سب کچھ میرے بندوں کا روزینہ ہے۔ "رزقاً للعباد"۔

فرمایا جاتا ہے اور یہ تو بطور مثال کے چند آیتیں پیش کی گئی ہیں ایسی آیتوں سے قرآن معمور ہے

اس نے صرف لابدی چیزوں کی حد تک ان لائسنسیوں کو محدود نہیں رکھا ہے بلکہ قرآن باوجود ایک مذہبی اور دینی کتاب ہونے کے اس نے بڑی فیاضی کے ساتھ زیب و زینت تعیشات کی چیزوں کے متعلق صرف استفادہ کی اجازت ہی نہیں دی ہے بلکہ ان سے استفادہ و تمتع کے متعلق جن دلوں میں کچھ دغدغہ ہے ان سے عتابی سوال کے رنگ میں پوچھتا ہے۔

قل من حرم زینة اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق۔ پوچھو تو کس نے حرام کیا ہے اللہ کی پیدا کی ہوئی زینت آرائش کی چیزوں کو؟ جسے خدا نے اپنے بندوں ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور کس نے حرام ٹھہرایا ستھری پاکیزہ غذاؤں کو؟۔

پھر خود رہنمائی کرتا ہے کہ جو چیزیں پیدا کی گئی ہیں ان میں بعضوں کا تعلق تمہاری ضروریات زندگی سے ہے اور ان ہی میں بعض تمہاری زیب و زینت جمال اور سنگھار اور آرائش میں کام آتی ہیں مثلاً مویشیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا جاتا ہے۔

والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا وزینة۔ "گھوڑوں خچروں اور گدھوں کو تمہارے لیے پیدا کیا تاکہ تمہاری سواری کا کام دیں اور زینت بنیں۔

صبح و شام آبادیوں میں مویشیوں کی آمد و رفت سے جو ایک خاص سماں پیدا ہوتا ہے ان کے جمالی پہلو پر متنبہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا جاتا ہے۔

ولکم فیھا جمال حین تریحون وحین تسرحون۔ "اور تمہارے لیے ان میں جمال رکھا ہے تاکہ تم ان سے صبح و شام فرحت حاصل کرو جب وہ آتے جاتے ہیں"۔

آدمی جس طرح سواریوں میں ذرا جمال پسندی سے فطرتاً کام لیتا ہے اس طرح لباس میں بھی اس کا فطری مذاق حسن پسندی کا واقع ہوا ہے قرآن لباس اور "ڈریس" کے اس حسن مذاق کی طرف خود ارشاد فرماتا ہے۔

یا بنی آدم! قد انزلنا علیکم لباسا "اے آدم کی اولاد! میں نے تمہارے لباس اتارے

یواری سواتکم وریشاً۔ (پیدا کیا) تاکہ تمہارے ستر کے مقامات کی سرپوشی ہو، اس سے جمال اور زینت بھی۔

ظاہر ہے کہ قرآن براہ راست معاشی کتاب تو ہے نہیں البتہ معاشیات کے متعلق غلط نظریوں نے جو خاص قسم کے غیر فطری خیالات مذہب اور دین کے رنگ میں پیدا کر دیے تھے ان کے ازالہ کے لیے اس کا اتنا بیان بالکل کافی ہو سکتا تھا۔ آگے آدمی قدرت کے ان بیرونی اور اندرونی ذرائع یعنے محنت تنظیم سرمایہ قدرتی قوانین کے ذریعہ سے کن کن شکلوں سے نفع اٹھا سکتا ہے اس کے لیے قدرت نے آدمی کو عقل و شعور دیا ہے جس سے کام لیکر وہ ان سے نفع اٹھا سکتا ہے اور اس کے لیے وحی کی زیادہ ضرورت نہیں تھی لیکن کچھ اس لیے کہ حصول معاش یا ان کے ذرائع سے استفادہ کے جو طریقے ہیں ان سے بعض اسباب کے تحت عموماً غفلت برتی جاتی ہے اور کچھ اس لیے بھی کہ غلط مشوروں نے انسان کی کلی قوتوں پر جو افسردگی طاری کر دی تھی ان کو نشاط سے بدل دینے کے لیے اس نے استفادہ کے ان ذرائع پر بحث کی ہے۔

حصول معاش کے جس ذریعہ سے عموماً غفلت برتی جاتی ہے ان کا ذکر تو اس میں صراحتاً مقصود بنا کر کیا گیا ہے اور دیگر ذرائع کی طرف مختلف طریقوں سے قرآن میں اشارے پائے جاتے ہیں میں پہلے حصول معاش یا "ابتغاء رزق" کے پہلے ذریعہ پر بحث کروں گا۔

(۱۶) خالق اور مخلوق کے تعلقات کی تصحیح

مطلب یہ ہے کہ ذرائع معاش کی عاملین پیدائش میں مخلوقات کے ساتھ چونکہ قرآن نے خالق تعالیٰ کو شریک کیا ہے ایک حیثیت سے حقیقی عامل پیدائش قرآنی تعلیم کے رو سے حق تعالیٰ ہی کی ذات ہے دوسرے مخلوقات کی حیثیت محض وسائل کی ہے اس لیے حصول معاش اور کسب رزق میں سب سے پہلا فرض جو آدمی پر عاید ہوتا ہے

وہ ان تعلقات کی تصحیح ہے جو خدا اور بندے میں ہونا چاہئے۔ خواہ دنیا کی موجودہ مادی معاشی حلقوں میں کسب اور دولت کی کمائی کے سلسلہ میں اس "ذریعہ" کو کوئی وقعت نہ دیجاتی ہو لیکن یہ علمی خیانت اور بد دیانتی ہوگی اگر اسلامی معاشیات کے مسائل کو پیش کرتے ہوئے ۱
حصول رزق کے اس اہم ترین ذریعہ کا ذکر محض اس ڈر سے نہ کیا جائے کہ اس زمانہ کا مادی آدمی اس کا مذاق اڑائے گا۔ نسل آدم کو معاشی دھمکی دیتے ہوئے قرآن پوچھتا ہے۔

امن هذا الذی یرزقکم ان امسك رزقہ۔ "کیا خدا کے سوا کوئی روزی دینے والا ہے اگر وہ اس کو روک لے؟" ۲

وہ دریافت کرتا ہے کہ

من یرزقکم من السماء والارض "تمہیں زمین اور آسمان سے کون روزی دیتا ؟"

خود ہی خبر دیتا ہے کہ خواہ لوگ کتنی ہی غفلت سے اس سلسلہ میں کام لیں لیکن انسان کی فطرت میں مرکوز کیا گیا ہے کہ اگر ذرا توجہ سے کام لیا جائے تو

فسیقولون اللہ فقل افلا تتقون۔ "پس کہیں گے کہ خدا دیتا ہے تو پھر تم اس سے کیوں نہیں ڈرتے۔"

ایسے بندوں کے متعلق جو قرآنی دستور العمل کے مطابق زندگی گذارنے کی کوشش کرتے ہیں مرد ہوں یا عورت فقط آئندہ زندگی میں ہی نہیں بلکہ اسی زندگی میں "حیات طیبہ" (صاف ستھری پاکیزہ زندگی) کی ضمانت قرآن دیتا ہے ارشاد ہے۔

من عمل صالحا من ذکر او انثیٰ وھو مومن فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ ولنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون۔ "جو اچھا کام کرے خواہ مرد ہو یا عورت اگر وہ ایمان والا ہو تو ہم اسے پاکیزہ زندگی کے ساتھ زندہ رکھیں گے ہم ان کے اچھے کاموں کا عوض دیں گے۔"

وہ ایسی آبادیوں کے متعلق جو ایمان اور تقویٰ کی زندگی گذارتے ہیں وعدہ کرتا ہے کہ ان پر معاشی سہولتوں کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

فرمایا جاتا ہے۔

ولو ان اهل القریٰ آمنوا و اتقوا لفتحنا علیهم برکات من السماء و الارض ولٰکن کذبوا فاخذناهم بما کانوا یکسبون۔ "اگر اس بستی والے ایمان لے آئیں تو زمین اور آسمان کے برکات ان پر کھول دیں گے۔ اور اگر جھٹلائیں گے تو ہم ان کی گرفت کرتے ہیں جو کچھ وہ عمل کرتے ہیں۔

ایمان و تقویٰ والوں کو وہ اسی "الحیواۃ الدنیا" کی بہتری کی بشارت سناتا ہے اور اسی کو اٹل غیر مبتدل قانون قرار دیتا ہے۔

الذین آمنوا و کانوا یتقون لهم البشریٰ فی الحیواۃ الدنیا و فی الآخرۃ لا تبدیل لکلمات اللّٰہ۔ جو ایمان لے آئے اور اچھے کام کیے تو اس کے لیے دنیا اور آخرت میں بھلائی ہے۔ خدا کے دستور کوئی نہیں بدل سکتا۔

وہ ایسے لوگوں کو جو قدرت کے قوانین کو توڑتے ہوئے جیتے ہیں اور ان کو جو ایمان و عمل صالح والے ہیں دونوں کے متعلق صحیح لفظوں میں اعلان کرتا ہے کہ ان میں صرف موت اور بعد الموت ہی فرق نہ پیدا ہوگا بلکہ ان دونوں کی زندگی بھی برابر نہیں ہوتی ارشاد ہوتا ہے۔

ام حسب الذین اجترحوا السیات ان نجعلهم کالذین آمنوا و عملوا الصالحات سواء محیاهم و مماتهم ساء ما یحکمون۔ کیا وہ لوگ جو بدکار رہے ہیں خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو مانند ان لوگوں کے بنا دیں گے جو ایمان والے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں۔ کیا ان کی زندگی اور موت برابر ہو جائے گی۔

وہ اہل کتاب کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اگر وہ اپنی کتابوں اور قرآن کی ہدایتوں کی تعمیل کرنے لگیں تو

لاکلوا من فوقهم و من تحت ارجلهم "تو وہ اوپر سے اور نیچے سے کھائیں گے۔

اس نے مختلف پیغمبروں کی زبان سے مختلف قوموں کو معاشی ذرائع کی وسعت کے متعلق خدا کے اس قانون کا اعلان کرایا ہے کہ

ویا قوم استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ "اے مری قوم! تو اپنے رب سے مغفرت چاہ
یرسل السماء علیکم مدرارا و یزدکم پھر تم پر بادلوں کو بھیجے گا موسلا دھار بارش کے
قوة الی قوتکم۔ ساتھ اور بڑھائے گا تمہاری قوت پر قوت کو۔

اس نے مبلغ قرآن خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے بھی اس قانون کا اعادہ
ان لفظوں میں کرایا۔

وان استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ یمتعکم" اگر اس سے مغفرت طلب کریں تو تمہیں پونجی
متاعاً حسنا الی اجل مسمیً و یوت کل ذی دے گا۔ ایک مدت تک۔ اور ہر فضل والے
فضل فضلہ۔ کو بڑہائی دے گا۔

اس نے مسلمانوں کو یہ دعا سکھائی:

ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة " خداوندا۔ ہمیں دنیا اور آخرت میں بھلائی
حسنة۔ دے۔

کہ وہ اپنے رب سے التجا کریں اور حصول رزق کے اس ذریعہ کو، اس نے کسب اکتساب
کا قرار دیا۔ جیسا کہ ایک موقع پر ارشاد ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ

ربنا آتنا فی الدنیا۔ "اے خداوندا! ہمیں بھلائی دے دنیا میں

اور بعض کہتے ہیں

ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة " خداوند دنیا اور آخرت میں ہمیں بھلائی دے
حسنة وقنا عذاب النار۔ اور دوزخ کے عذاب سے بھی بچا۔

پھر ہر ایک کے متعلق فرمایا جاتا ہے۔

اولئك لهم نصيب مما اكسبوا والله " ان کے لیے حصہ ہے جو وہ کمائیں اور خدا جلد
سريع الحساب۔ حساب لینے والا ہے۔

چونکہ قرآن میں حصول معاش کا یہ سب سے اہم ترین ذریعہ ہے اور اس کو ہونا بھی چاہیئے

جب قرآن کی رو سے

والیہ یرجع الامر کلہ ۔ ترجمہ ۔ تمام کام کا دارومدار اسی پر ہے ۔

بیدہ ملکوت کل شئی ۔ ترجمہ ۔ ہر چیز کی حکومت اسی کے دست قدرت میں ہے ۔

بیدک الخیر ۔ ترجمہ ۔ تیرے ہی ہاتھوں بھلائی ہے ۔

اصل واقعہ ہے تو تلاش رزق کی صحیح راہ یہی ہو سکتی ہے کہ سب سے پہلے اس کی طرف توجہ کی جائے اسی لیے قرآن میں جہاں ایجابی قانون کا اعلان کیا گیا ہے اس کے سلبی پہلو کے متعلق بھی صاف لفظوں میں معاش کے متعلق یہ اعلان فرمایا ہے کہ

من اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکاً ۔ جو کوئی میری یاد سے روگردانی کرے تو میں اس کی روزی تنگ کر دیتا ہوں ۔

اسی بنا پر قرآن نے ہر قسم کی ترقی کا پہلا ذریعہ رب کے شکر کو قرار دیا ہے اور ناشکروں کو عذاب شدید کی دھمکی دیتا ہے ارشاد ہے کہ

لان شکرتم لازیدنکم ولان کفرتم ان عذابی لشدید ۔ اگر شکر نعمت کرو تو زیادہ کروں گا اور اگر کفران نعمت کرو تو جان لو کہ میرا عذاب سخت ہے ۔

اور ایسے لوگ جو ناشکری اور کفران کی زندگی گزارتے ہوئے بظاہر صاحب مال اور اولاد نظر آتے ہیں کبھی کبھی ان کی ظاہری حالت ایسی ہوتی ہے کہ اچھے اچھوں کو ان پر رشک آتا ہے ان کے متعلق قرآن اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ

ولا تعجبک اموالھم واولادھم انما یرید اللہ ان یعذبھم بھا فی الدنیا وتزھق انفسھم وھم کافرون ۔ ان کا مال اور ان کی اولاد تجھے فریب میں نہ ڈالے ہم قطعاً جانتے ہیں کہ عذاب دیں ان کو حیات دنیا میں اور نکلے جان ان کی جب تک ناشکری کی حالت میں رہیں ۔

گویا ان کی شرارت وطغیانی سرکشی وکفران کے صلہ میں قدرت مال واولاد کے غفلت کی ٹوپی ان پر اڑھاتی ہے ان کے لیے چونکنے کا موقع جاتا رہتا ہے اور اسی مال واولاد کے انکار میں گھس گھسا کر ناشکری ہی کی حالت میں وہ مر جاتے ہیں قرآن خود کہتا ہے کہ جب ربانی تعلیم کے صحیح عناصر سے کوئی قوم اپنے کو مفلس

بنا لیتی ہے تو ان کو ادھا بنانے کے لیے کبھی کبھی معاش کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں لیکن یہ کھولنا ان کے جینے کے لیے نہیں بلکہ مرنے کے لیے ہوتا ہے۔

فلما نسوا ما ذکروا به فتحنا علیهم ابواب کل شیء حتی اذا فرحوا بما اوتوا اخذناهم بغتة فاذا هم مبلسون. فقطع دابر القوم الذین ظلموا والحمد لله رب العالمین۔	جب وہ بھول گئے اس چیز کو جسکی انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دئیے یہاں تک کہ وہ اترا گئے ان چیزوں سے جو انہیں دی گئی تھی تو ہم نے انکو پکڑ لیا۔ ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا اور حمد تو خدا کے لیے ہے۔

اور ملک کے یہی" دولت مند" بالآخر اپنی قوم اور ملک کی رفاہ و ترقی کے نہیں بلکہ تباہی اور بربادی کا ذریعہ بن جاتے ہیں جیسا کہ فرمایا۔

واذا اردنا ان نهلك قرية امرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمرناها تدميرا۔	اور جب ہم چاہتے ہیں کہ کسی آبادی کو ہلاک کریں تو ہم حکم دیتے ہیں اس کے عیش کرنے والوں کو پھر وہ عدول حکمی کرتے ہیں پس ثابت ہو جاتی ہے ان پر بات پھر ہم انہیں بری طرح کھپا دیتے ہیں۔

اور اس سے یہ نتیجہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ "معیشت ضنک" کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی ظاہری طور پر ثروت و دولت سے خالی ہو بلکہ دولت و ثروت کے ساتھ بھی "ضیق معاش" اور تنگی رزق میں قدرت جسے چاہے گرفتار کر سکتی ہے اور اس کا اندازہ بجائے دوسروں کے خود وہی زیادہ کر سکتا ہے جس پر گزرتی ہے بقول اکبر مرحوم سے

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے
خدا ہی خوب واقف ہے کسی پر کیا گذرتی ہے

بہرحال اب واقعہ کچھ بھی ہو لیکن قرآن نے معاشی نظام کی بہتری اور بدتری کا جو قانون پیش کیا ہے وہ یہی ہے اور ہمارے نزدیک "واقعہ" وہی ہے جو قرآن کہتا ہے۔

(۱۷) اکتساب دولت کے مختلف طریقے

حصول معاش کا یہ تو وہ ذریعہ تھا جس پر قرآن نے بہت زور دیا ہے لیکن اس کے سوا بھی کمانے اور کسب و اکتساب دولت کے جو عام طریقے ہیں اگرچہ یہ چیزیں براہ راست عقل سے سیکھنے کی ہیں لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا اشارتاً کنایتاً مختلف پیرایوں میں قرآن ان کی طرف بھی اشارہ کرتا چلا گیا ہے بلکہ اگر قرآن کی مشہور آیت :

لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ — انسان کو وہی ملتا ہے جو وہ کوشش کرے۔

اور اس جیسی آیتوں کو بجائے آخرت کے، دنیا و آخرت دونوں کا عام قانون قرار دیا جائے اور جیسا کہ قرآن ہی کی آیت :

للرجال نصیبٌ مما اکتسبوا — مردوں کے لیے حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کے

وللنساء نصیبٌ مما اکتسبن۔ — لیے حصہ ہے جو وہ کمائیں۔

سے بھی معلوم یہی ہوتا ہے کہ ہر شخص پر اس کی کمائی کے تناسب سے نتائج مرتب ہوتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ قرآن نے بجائے اشاروں اور کنایوں کے کسب دولت کا صراحتاً حکم صادر فرمایا ہے۔ اور یہ تو خیر عام اور مطلق باتیں ہیں قرآن باوجود غیر معاشی کتاب ہونیکے قریب قریب کسی نہ کسی پیرایہ میں "اکتساب دولت" کے عام ذرائع کا ذکر کسی نہ کسی طرح اس میں ضرور پایا جاتا ہے۔

(۱۸) زراعت

"اصول مکاسب" میں سے زراعت کے متعلق تو اس کا یہ حال ہے کہ قرآنی بیانات کا بڑا حصہ جس میں اللہ کی نشانیوں پر غور کرنیکی دعوت دی گئی ہے ان میں زیادہ تر زرعی اور باغبانی ہی کا نظام پیش کیا گیا ہے بادلوں کا آنا کھیتوں کا اگانا باغوں کا لہلہانا اور ان سے انسان کا مختلف طریقوں سے نفع اٹھانا یہ ایسی باتیں ہیں جنہیں قرآن کا امر عامہ قرار دیا جا سکتا ہے کبھی ارشاد ہوتا ہے:

افرئیتم ما تحرثون ءانتم تزرعونہٗ ام نحن الزارعون

کیا تم نے دیکھا کہ تم کھیتی کرتے ہو یا ہم کھیتی کرتے ہیں۔

کبھی فرمایا جاتا ہے:

وھوالذی انشا جنات معروشات وغیر معروشات۔ والنخل والزرع مختلفاً اکلہ والزیتون والرمان متشابھاً وغیر متشابہ۔ کلومن ثمرہٖ واٰتوا حقہ یوم حصادہٖ ولا تسرفوا انہ لایحب المسرفین۔

خدا ہی نے تمہارے لیے ٹٹیوں والے اور بن ٹٹیوں والے باغ بنائے۔ کھجور اور مختلف مزوں کی چیزیں زیتون اور انار ملتے جلتے اور غیر ملتے جلتے ان پھلوں کو کھاؤ اور فصل کٹنے کے دن مستحقین کو دو۔ فضول خرچی نہ کرو کیونکہ وہ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

کبھی فرماتا ہے۔

وھوالذی انزل من السماء ماءً فاخرجنا بہ نبات کل شیئٍ فاخرجنا منہ خضراً نخرج منہ حبًا متراکبًا ومن النخل من طلعھا قنوانٌ دانیۃٌ وجنٰت من اعناب والزیتون والرمان متشابھًا وغیر متشابہ۔ انظروا الی ثمرہٖ اذا اثمر وینعہ۔ ان فی ذالکم لایاتٍ لقومٍ یومنون۔

خدا ہی نے آسمان سے پانی برسایا اور ان سے نباتات اگائے اور ہریالی اگائی۔ اور کھجور بھرے شگوفے والے اور زیتون انگور اور انار کے باغ ملتے جلتے بھی اور غیر ملتے جلتے بھی۔ پھل جب پکیں تو انکی طرف دیکھو کہ کیسے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان تمام میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

اس قسم کی آیتوں کا قرآن میں ایک ذخیرہ موجود ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا قرآن کسی ایسی قوم میں اترا ہے اور ایسے لوگوں کو بلا رہا ہے جو کاشت کاری یا باغبانی میں مصروف ہیں "زمین" میں قدرت نے انسانی معاش کا جو سامان کیا ہے اس کا ذکر ا۔

ولقد مکنٰکم فی الارض وجعلنا لکم فیہا معایش ۔ — ہم نے تمھیں زمین میں بسایا اور اسی میں تمہاری روزی بھی بنا دی ۔

معاش کا سامان "زمین" میں کس طرح رکھا گیا ہے تو اس کے متعلق قرآن خبر دیتا ہے کہ

وقدر فیہا اقواتہا فی اربعۃ ایام ۔ — ہم نے ناپ تول کر قوت یعنی خوراک کے ذخیروں کو محفوظ کیا ہے۔

اس کے بعد

سواءً للسائلین ۔۔ — پھر ڈھونڈھنے والے کے لیے برابر کر دیا۔

کے ذریعہ سے اس کا اظہار کیا گیا ہے کہ تلاش و جستجو کرنے والوں کے لیے اسے برابر کر دیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے آدمی اور آدمی کے ساتھ دوسرے حیوانات، چرند پرند سب اس کو خرچ کر رہے ہیں مگر ہر ڈھونڈنے والے کو برابر پہنچ رہا ہے اس لیے فرمایا گیا۔

ھو الذی جعل لکم الارض ذلولاً فامشوا فی مناکبہا وکلوا من رزقہ والیہ النشور — اس نے تمہارے لیے زمین بنائی اس کی راہوں میں چلو اور اس کی روزی سے کھاؤ اور تم کو اسی کی طرف جانا ہے۔

گویا زمین کی "ذلولیت" سے آدمی نفع اٹھاتا چلا جائے تو اس کو رزق ملتا چلا جائیگا ۔

(۱۹) تجارت

اسی طرح تجارت اور ذرایع تجارت کے متعلق قرآن سے کافی مواد فراہم کیا جا سکتا ہے:

"وابتغوا من فضل اللہ" کے متعلق صحابہ کی تفسیر یہی ہے کہ ——

" تجارت میں مشغول ہو جاؤ "

لا تاکلوا اموالکم بالباطل الا ان تکون تجارۃً عن تراضٍ منکم ۔ — باطل طریقوں سے ایک دوسرے کا مال نہ کھایا کرو مگر یہ کہ تجارت یا باہمی رضامندی سے ہو ۔

کے سوا قریش کے سرمائی و گرمائی سفر تجارت " رحلۃ الشتاء والصیف " کا ذکر کر کے اس کو ان کے جوع اور بھوک کے ازالہ کا ذریعہ قرار دیا۔

(۲۰) مواصلات حمل ونقل

پھر مواصلات اور حمل ونقل یا باربرداری کے بری اور بحری راستوں کی ان سہولتوں کا ذکر کیا ہے جن سے ایک ملک کی تجارت دوسرے ملک سے ہوتی ہے غرض مقامی اور غیر مقامی قومی اور بین الاقوامی ہر قسم کی تجارتوں کا بھی ذکر قرآن مجید میں پایا جاتا ہے مثلاً چند آیتیں درج کی جاتی ہیں خشکی کے راستوں اور سڑکوں کا ذکر فرماتے ہوئے۔

۱ واللہ جعل لکم الارض بساطا لتسلکوا منھا سبلاً فجاجا۔ — خدا نے تمہارے لیے زمین کو رہنے کا مقام بنایا تاکہ تم اس کے راستوں پر چلو۔

نیز

وجعلنا فیھا فجاجا سبلا لعلھم یھتدون۔ — اور ہم نے زمین میں کشادہ راستے بنائے تاکہ لوگ راہ پائیں

خشکی کے ان راستوں کا مختلف پیرایہ میں ذکر فرمانے کے بعد سواریوں کا ذکر کیا گیا ہے جن پر ہر طرح کے گراں بار مال ومتاع کو لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بآسانی آدمی منتقل کر رہا ہے۔

"انعام" یعنی جانوروں کے ذکر میں ارشاد ہے کہ

وتحمل اثقالکم الی بلد لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس ان ربکم لرءوف رحیم۔ — "تمہارے سامانوں کو ایک مقام سے لاد کر دوسرے مقام کو پہنچاتے ہیں جن کو تم خود بغیر مشقت کے نہ لے جا سکتے تھے، بے شک تمہارا پروردگار مہربان اور رحم والا ہے۔

اسی طرح بحری راستوں کا ذکر فرماتے ہوئے ان کے ذریعہ سے جہازوں پر تجارتی مال لاد کر ایک ملک سے دوسرے ملکوں کو منتقل کیا جاتا ہے قرآن میں مختلف مقامات پر اس کا ذکر کر کے بحری تجارت پر تنبیہ کی ہے دریاؤں اور سمندروں کے ذکر میں۔

وتری الفلک مواخر فیہ ولتبتغوا — تو جہازوں کو دیکھتا ہے جو سمندر کو پھاڑ کر تیرتے ہیں

من فضلہ ولعلکم تشکرون۔ — تاکہ تم ان کے ذریعہ سے اپنی روزی کماؤ اور شکر کرو۔

نیز ترى الفلك فيه مواخر لتبتغوا من فضلہ۔ — جہازوں کو دیکھو جو سمندر کو پھاڑتے ہوئے چلتے ہیں تاکہ تم اپنی روزی کماؤ۔

الله الذى سخر لكم البحر لتجرى الفلك فيه بامره ولتبتغوا من فضلہ۔ — خدا نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کر دیا تاکہ تم اس کے حکم سے جہاز چلاؤ اور اس کے فضل سے فائدہ اٹھاؤ۔

والفلك التى تجرى فى البحر بما ينفع الناس۔ — اور جہاز جو سمندر میں چلتے اور لوگوں کو نفع پہنچاتے ہیں۔

وہ ان دیوپیکر تجارتی جہازوں کو جو سمندر کے سینوں کو چیرتے ہوئے ایک ملک سے دوسرے ممالک کی طرف پہاڑوں کی طرح تیرتے ہوئے آتے جاتے رہتے ہیں قرآن اس شکل میں بیان کرتا ہے۔

وله الجوار المنشات فى البحر كالاعلام — خدا ہی کے ہیں وہ بڑے بڑے جہاز مثل پہاڑوں کے۔

سمندر کی بے تہا موجوں میں جب زمین کا کنارہ نگاہوں سے غائب ہو تو ستاروں کے ذریعے سے صحیح سمت پر جہازوں کو چلانے کے لیے قدرت کی طرف سے ستاروں کا جو نظم ہے اور بین الاقوامی تجارتوں کا بہت کچھ دارومدار ان ہی ستاروں کی رہنمائی پر ہے قرآن ان کا ذکر مختلف مقامات پر

وبالنجم هم يهتدون۔ — اور ستاروں سے راہ پاتے ہیں۔

اور

وهو الذى جعل لكم النجوم لتهتدوا بها فى ظلمات البر والبحر۔ — اسی نے ستاروں کو پیدا کیا تاکہ تم ان کے ذریعہ سے خشکی اور تری میں تاریکی کے وقت راستہ پا سکو۔

الغرض تجارت اور تجارتی ذرائع و وسائل کے مختلف پہلوؤں پر قرآن متنبہ کرتا ہوا چلا جاتا ہے اس زمانے میں جو سواریاں آمد و رفت کے لیے تھیں وہ صرف ان ہی کا ذکر نہیں کرتا بلکہ سواریوں کے ذکر میں اضافہ فرما کر

تعلیم لیا نیوں

وخلقنا لھم من مثلہ ما یرکبون - اور ان کے لیے پیدا کیے انکے مثل جو وہ سوار ہوتے ہیں -

سے بعضوں کا دھیان خیال گیا ہے کہ عرب کے سوا دیگر ممالک میں جو سواریاں گاڑیوں اور رتھوں وغیرہ کی شکل میں تھیں یا آئندہ زمانہ میں ریل موٹر ہوائی جہاز وغیرہ جو سواریاں انسانوں کو عطا ہوئی کون کہہ سکتا ہے کہ " ما " کے لفظ کی عمومیت میں وہ داخل نہیں ہو سکتیں -

(۲) صنعت و حرفت

زراعت تجارت کے ساتھ اسی نوعیت کے اشارے قرآن میں صنعت و حرفت اور صناعی کے متعلق بھی ملتے ہیں معمولی دستکاریاں نہیں بلکہ ایسی صنعتیں جن میں لوہے کو پگھلا پگھلا کر نازک پرزے اور نازک چھوٹی چھوٹی چیزیں بنائی جاتی ہیں قرآن نے اس کا تذکرہ بھی کیا ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام کو قرآن پڑھنے والوں کے سامنے اس شکل میں پیش کرتا ہے کہ بڑی بڑی شہتیروں کو وہ جہازی تختوں کی شکل میں بدل رہے ہیں ان میں " دسر " اور لوہے کی میخیں ٹھونک رہے ہیں -

یصنع الفلک - نوح کشتی بنا رہے ہیں -

کیسی کشتی ؟

ذات الواح و دسر - میخوں اور تختوں والی

وہ حضرت داؤد پیغمبر علیہ السلام کو " ذو الاید " (دستکاری والے) کے خطاب سے مخاطب کرکے یہ نقشہ بیان کرتا ہے کہ لوہے کو گلا کر ان کو باریک تاروں میں بدل رہے ہیں اور موڑ موڑ کر ان سے زرہ کی کڑیاں بنا رہے ہیں اور حق تعالیٰ کی طرف سے اس صنعت میں ان کی راہ نمائی ان الفاظ میں ہو رہی ہے -

ان اعمل سابغات وقدر فی السرد - بناؤ لمبی ہوئی زرہیں اور کڑیاں ملانے میں صحیح اندازہ کرو

حضرت سلیمان علیہ السلام کے کارخانہ کا ذکر ہو رہا ہے اور اس میں _

یعملون لہ مایشاء من محاریب و تماثیل — جو وہ چاہتا اس کے لیئے بناتے محرابی اور مجسمے اور بڑے بڑے

و جفان کالجواب و قدور راسیات — پیالے حوض کے مانند اور بڑی بڑی دیگیں چولھوں پر چڑھی ہوئی۔

کام کرنے والے عمارت سازی تماثیل سازی ظروف سازی اور کیسے کیسے ظروف اور برتن مثلاً بڑے بڑے دیگ دیگچے مختلف کارخانوں میں بن رہے ہیں وہ سلیمانی عہد کی تعمیری ارتقاء کے متعلق یہ ذکر کرکے ان کا ایک محل

صرح ممرد من قواریر — ایک محل جس میں آئینے جڑے تھے۔

کا تماشہ شیشہ گری کی صنعت کے ارتقاء کو دیکھا تا ہے اسی طرح تعمیری صنعتوں میں سنگ تراشی، کوہ کنی، ستون سازی اور مختلف امور کا ذکر مختلف اقوام کے ذکر میں کرتا ہے مثلاً ثمود کے متعلق

و ثمود الذین جابوا الصخر بالواد۔ — اور ثمود جنھوں نے وادی میں پتھر تراشے۔

پھر ان ہی کے متعلق

تتخذون من سھولھا قصوراً و تنحتون من الجبال بیوتا۔ — نرم زمین پر محل بناتے اور پہاڑوں کو تراش کر ان میں مکان بناتے تھے۔

عاد کے ذکر میں

ارم ذات العماد۔ — جو ارم تھے ستونوں والے۔

کا ایک نقشہ دماغوں کے سامنے بے نقاب کرتا ہے۔ قصر یا شہر سازی کا نقشہ قوم سبا کے ذکر میں

لقد کان لسباء فی مساکنھم آیۃ جنتٰن عن یمین و شمال کلوا من رزق ربکم واشکروا لہ بلدۃ طیبۃ و رب غفور۔ — سبا کے محلات میں تمہارے لیے نشانیاں ہیں۔ شمال اور جنوب میں دو باغ ہیں اور خدا کے رزق سے صاف ستھری چیزیں کھاؤ اور اس کا شکر کرو۔ شہر پاکیزہ ہے اور خدا معاف کرنے والا ہے۔

ذوالقرنین کے ذکر میں لوہے کی اینٹوں اور پگھلے ہوئے رانگ کے گارے کی دیوار کا پتہ دیتا ہے۔

ید طیلانیں
آتونی زبر الحدید حتی اذا ساوی بین الصدفین قال انفخوا حتی اذا جعلہ نارا قال آتونی افرغ علیہ قطرا
لاؤ لوہے کی چادریں یہاں تک کہ جب برابر کر دیا پہاڑ کے تو کہا دھونکو کہ میں ڈالوں اس پر پگھلا ہوا تانبا۔

پارچہ بافی خیمہ سازی کی طرف

وجعل لکم من جلود الانعام بیوتا تستخفونھا یوم ظعنکم ویوم اقامتکم ومن اصوافھا واوبارھا واشعارھا اثاثا ومتاعا الی حین
مویشیوں کی کھال سے بناتے ہو۔ ڈیرے جنہیں تم اپنے سفر کے دنوں میں ہلکا پھلکا پاتے ہو۔ اور انکے اون اور ببریوں سے اور بالوں سے اشیا بناتے ہو جو تمہارے لیے خاص وقت تک کے لیے سرمایہ ہے۔

اسی طرح گرمی سے بچنے کے لباس اور جنگی لباس کا ذکر

سرابیل تقیکم الحر وسرابیل تقیکم باسکم
لباس جو تم کو گرمی میں بچاتے ہیں اور جنگ کا بچاؤ ہیں۔

ملتا ہے

ان سب صنعتوں کا ذکر بطور مثال کے کیا گیا ورنہ تلاش سے اور بھی صنعتوں کے متعلق قرآن سے اشارے نکالے جا سکتے ہیں۔ بہرحال یہ تو اہم مکاسب یعنی زراعت تجارت اور صنعت و حرفت کا ذکر تھا۔

۲۲) کان کنی وغیرہ

اس کے سوا معاش کے اور جو طریقے دنیا میں مروج ہیں مثلاً زمین یا سمندر کی گہرائیوں سے قیمتی جواہرات اور معادن کا برآمد کرنا حضرت سلیمان کے ذکر میں

واسلنا لہ عین القطر۔ اور ان کے واسطے رانگ کا چشمہ بہایا۔

پہاڑوں سے پتھر تراشے جاتے ان کی طرف

وانزلنا الحدید فیہ باسٌ شدیدٌ ومنافع للناس۔ لوہا پیدا کیا جس میں خوب سختی ہے۔ اور لوگوں کے لیے فائدے ہیں۔

اور زمین کے شکم سے چیزوں کا برآمد کرنا تو اتنا خطرناک نہیں ہے جتنا سمندر کے پیٹ سے چیزوں کا نکالنا قرآن نے سمندر کے منافع کے ذکر میں

وھو الذی سخر البحر لتاکلوا منہ لحماً طریاً وتستخرجوا منہ حلیۃ تلبسونھا۔ اس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کر دیا تاکہ تم اس سے مزہ دار گوشت حاصل کر سکو۔

ویخرج منھا اللولؤ والمرجان۔ اور زیورات نکالو جنکو تم پہنتے ہو اور سمندر سے موتی مرجان نکلتے ہیں۔

علاوہ بے جان عناصر کے جمادات نباتات اور حیوانات سے جو دولت پیدا کی جاتی ہے ان کا بھی قرآن کے مختلف مقامات میں ذکر کیا گیا ہے چنانچہ نباتات سے جو چیزیں نکالی جاتی ہیں انکی طرف

ومن الثمرات النخیل والاعناب تتخذون منہ سکرا ورزقاً حسناً۔ پھلوں سے اور کھجور اور انگوروں سے شراب بناتے ہو اور صاف ستھری روزی۔

حیوانی منافع کا ذکر تو صنعت چرم سازی کے ذیل میں "من جلود الانعام" اور صنعت لباس میں "من اصوافھا واوبارھا واشعارھا" کے ذکر میں گذر چکا مشارب کے متعلق قرآن فرماتا ہے

وان لکم فی الانعام لعبرۃ نسقیکم مما فی بطونھا من بین فرثٍ ودمٍ لبناً خالصاً سائغاً للشاربین۔ تمہارے لیے مویشیوں میں عبرت ہے ہم تم کو جو ان کے پیٹ میں ہے پلاتے ہیں خون اور گوبر کے درمیان سے خالص دودھ نکلتا ہے جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے۔

شہد کی مکھی "النحل" سے شہد اور موم کی جو دولت پیدا کی جاتی ہے۔ اس کی طرف

یخرج من بطونھا شرابٌ مختلفٌ اس کے پیٹ سے مختلف رنگ برنگی شہد نکلتی ہے

مثلاً عسل نیز

الوانہ فیہ شفاء للناس۔ اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔

سے اشارہ کیا گیا ہے۔ نباتاتی یا حیوانی چیزوں کو طبی اغراض کے لیے جو استعمال کیا جاتا ہے اس

کی طرف

فیہ شفاء للناس اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔

کے ایک جامع فقرہ سے اشارہ کیا گیا ہے۔

(۲۳) شکار

اسی طرح بری اور بحری جانوروں سے شکار کے ذریعہ سے جو معاشی سہولتیں پیدا کی

جاتی ہیں ان کا ذکر

احل لکم صید البحر تمہارے لیے سمندر کے شکار کو حلال کیا۔

نیز

واذا حللتم فاصطادوا۔ اور جب احرام کھول دو تو شکار کرو۔

شکار کے ان عام طریقوں کے ساتھ بعض خاص تدبیروں کی طرف بھی رہنمائی پائی

جاتی ہے۔ مثلاً

وما علمتم من الجوارح مکلبین اور جو تم نے شکاری جانوروں کو سدھا لیا ہے اور سکھاتے ہو

تعلمونھن مما علمکم اللہ۔ تم ان کو وہ باتیں جو اللہ نے سکھائی ہیں۔

اس آیت سے صرف شکار کا تذکرہ نہیں ملتا بلکہ جانوروں اور پرندوں کے سدھانے کے پیشہ

کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اگر اسی طرح شکار دریائی جانوروں وغیرہ کی طرح اس کا

نقشہ بنایا جائے تو ان کے نقشوں سے شاید زیادہ مکمل نقشہ تیار کیا جا سکتا ہے۔

(۲۴) محنت اور تنظیم

بہر حال ان سب کے سوا قرآن نے معاش کے اس ذریعہ کا بھی ذکر کیا ہے جس میں آدمی روزی بغیر سرمایہ کے حاصل کرتا ہے جس کی تعبیر مزدوری یا نوکری (ملازمت) وغیرہ سے کی جاتی ہے مزدوری یا اجرت کے ذکر میں تو اس نے دو پیغمبروں کی زندگی پیش کی ہے جس میں ایک کو آجر اور دوسرے کو مزدور کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ شعیب علیہ السلام۔

ان تاجرنی ثمانی حجج فان اتممت عشراً فمن عندك۔ — یہ کہ مزدوری کرو آٹھ برس اور اگر دس برس پورا کرو گے تو یہ سلوک ہوگا تمہاری طرف سے۔

کے الفاظ سے موسیٰ علیہ السلام کو اپنے مویشیوں کو چرانے کے لیے اجیر (مزدور) مقرر فرماتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام اجرت کے اس معاملہ کے جواب میں

ذالك بینی و بینك ایما الاجلین قضیت فلا عدوان علیّ۔ والله علیٰ ما نقول وکیل۔ — یہ معاملہ میرے اور تمہارے درمیان طے ہو گیا۔ جو بھی مدت چاہوں پوری کر دوں کہ مجھ پر زیادتی نہ ہونے پائے۔ بس خدا گواہ ہے۔

سے اس مزدوری کی ذمہ داری قبول فرماتے ہیں اور

فلما قضیٰ موسیٰ الاجل۔ — جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی۔

سے قرآن خبر دیتا ہے کہ باوجودیکہ مویشی چرانے کا کام عموماً معمولی اور ادنیٰ درجہ کا کام سمجھا جاتا ہے لیکن انھوں نے آٹھ یا دس سال تک ان کو چرایا۔ بکریوں کو چرانا۔ ان کو درختوں سے جھاڑ جھاڑ کر پتے کھلانا ان سب موسائی مشاغل کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ ان ہی آیتوں میں مزدور کے صفات "القوی الامین" (طاقتور اور امانت دار) اور مستاجر کے صفات

ما ارید ان اشق علیك ستجدنی ان شاء الله من الصالحین۔ — میں تم پر سختی کرنی نہیں چاہتا۔ تم مجھے نیک آدمی پاؤ گے۔

کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جس سے چاہا جائے تو اجرت دمہ داب کی پیچیدگیوں کا حل پیدا کیا جا سکتا ہے۔

...علیہما میں حضرت خضر علیہ السلام کے ذکر میں مٹی کے کام کی مزدوری کو ان کی طرف منسوب کیا

...گیا ہے جیسے

فوجدا فیها جدارا یرید ان ... (اس گاؤں میں) ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی۔

ینقض فاقامہ۔ پس انھوں نے بلند کر دی۔

...سرمایہ کے معاش کا یہ تو وہ ذریعہ ہے جس میں جسمانی قوتوں سے مزدوری کی جاتی ہے لیکن

...سرمایہ کا کام جس میں بجائے جسم کے زیادہ تر دماغ سے کام لیا جاتا ہے اور عموماً اس کو عہدداری

...سروس وغیرہ کہتے ہیں قرآن نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ذکر میں یہ فرماکر کہ بادشاہ

... ان سے خواہش کی۔

انک الیوم لدینا مکین امین۔ آج سے تم ہمارے ہاں معزز اور امانت دار ہو۔

حضرت یوسف نے نوکری کی اس درخواست کو قبول فرمایا اور پھر اپنے متعلق یہ درخواست

دی کہ

اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم۔ زمین کے خزانوں کا نگہبان مقرر کیجئے کیونکہ میں اس کاروبار کو جاننے والا ہوں اور ان کی حفاظت کر سکتا ہوں۔

جس سے ملازمت کے سوا یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنی قابلیت کے مطابق آدمی حکومتوں میں درخواست

دے سکتا ہے اور اس درخواست میں اپنے کوالیفکیشن (اسناد قابلیت) کا ذکر کبر سنن نہیں

بلکہ سنت پیغمبری ہے کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر "انی حفیظ علیم"

(حفاظت کرنے والا اور واقف کار) کا دعوی فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں مزدوری کی صفت

"القوی الامین" (طاقتور اور امانت دار) یوسف علیہ السلام کے قصہ میں "حفیظ علیم"

یہ تو خود یوسف نے کہا بادشاہ نے ان کو امین قرار دیا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مزدوری کا تعلق چونکہ

جسمانی محنت سے ہے اس لیے جسمانی قوت اس کے لیے درکار ہے ملکی انتظام کے لیے دماغی

صلاحیت کی ضرورت ہے اس لیے ان کی صفت کا اظہار کیا گیا۔ باقی امانت اور حفاظت

ہر ملازمت خواہ جسمانی ہو یا دماغی ہر حال میں ضروری ہے۔ ان چند الفاظ میں ہر قسم کی ملازمتوں کے بنیادی قاعدے درج ہو گئے ۔ اور "کسب و احتراف" اس کے مختلف اقسام کے متعلق یہ قرآنی مواد ہے۔

(۲۵) اکتساب دولت کا حدیثوں میں تذکرہ

اکتساب دولت کے متعلق حدیثوں میں جو مواد پایا جاتا ہے اجمالاً ان کا بھی ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

کھیتی اور باغبانی کے متعلق ارشادات ہیں۔ اگر کوئی شخص زمین کو تر و تازہ کرے اور پھر اس سے کوئی انسان یا جنگلی جانور فائدہ اٹھاتا ہے تو خدا اس کا اجر دیتا ہے ۔ (طبرانی)

ما من مسلم یزرع زرعاً او یغرس غرساً فیاکل منه طیر او انسان او بهیمة الا کانت له به صدقة۔	مسلمان اگر کوئی کھیت لگاتا ہے یا درخت لگاتا ہے اور اس کو اگر کوئی جانور یا پرندہ یا انسان کھانے تو اس کے لیے صدقہ ہے۔ (بخاری)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پیشہ کی طرف مسلمانوں کو کس حد تک متوجہ فرمایا ہے اس کا اندازہ اس مشہور حدیث سے ہو سکتا ہے جس میں آپ نے فرمایا

عن عائشة قالت، قال النبی صلی اللہ علیه وسلم ان قامت الساعة وبید احدکم فسیله فان استطاع ان لا تقوم حتی یغرسها فلیغرسها۔	رسول اکرم نے فرمایا ہے کہ اگر قیامت قایم ہو اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کوئی چیز ہو تو اگر اس کے بس میں ہو تو چاہیئے کہ اٹھنے سے پہلے اس کو بو دے۔

چونکہ عموماً جنگلی جانوروں اور نقصان رساں پرندوں ٹڈی دلوں کیڑوں اور چوروں وغیرہ کا خطرہ باغوں اور کھیتوں میں زیادہ رہتا ہے اور ان چیزوں سے باغبانوں کی ہمت کچھ پست ہوتی ہے پیغمبر کی نگاہ نے نقصان کے ان پہلوؤں کا ایسا نقطہ نظر پیش کیا ہے

جس کے ذریعہ سے کسان کا اور باغبان کا ہر نقصان نفع کی شکل اختیار کر لے سکتا ہے یعنے آدمی یہ نیت کرے کہ جو بھی کھائیگا وہ کوئی جاندار ہی کھائیگا اور اگر اس کے عمل سے حیاتی توانیوں میں امداد ملتی ہو تو اس سے زیادہ نفع کی بات کیا ہو سکتی ہے نفع وہی نہیں ہے جو کسی ذات کو پہنچے بلکہ اس سے بڑا نفع یہ ہے کہ ہمارے کسی فعل سے ملک کو قوم کو ابنائے جنس کو یا کسی جانور کو کچھ نفع پہنچ جائے اور ان حدیثوں کا یہی مطلب ہے جن میں آپ نے فرمایا کہ جس کھیتی یا باغ سے کوئی پرندہ کچھ کھا جائیگا تو کسان اور باغبان کو اس کا ثواب ملتا رہیگا۔ کسان اور باغبان قدرت کی پوشیدہ دولت کو باہر لاتا ہے بالفرض اگر اس کو یا اس کے خاندان کو اس دولت سے نفع نہیں پہنچ سکا تو دوسروں کو تو پہنچ چکے گا اسی لیے شیخ علاؤالدولہ کتانی کا یہ نظریہ کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے کہ باوجود استطاعت کے اگر کسی باغبان یا کسان کی کاہلی سے زمین کی پوشیدہ دولت انکی نہ حاصل ہو سکی جو کہ محنت کی صورت میں حاصل ہو سکتی تھی تو اس قسم کا کاہل کسان اور باغبان خدا کے سامنے ذمہ دار ہوگا کہ اس نے اپنے فعل سے ان منافع کو روک دیا جو کسی نہ کسی کو حاصل ہو سکتے تھے۔

کاہلی سے محنت نہ پیدا وار نہ یہ تو بڑا صیا گنہ گاری ہے

اس موقع پر ایک حدیث کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے یعنی بخاری شریف میں "ابو امامہ باہلی" کی ایک روایت ہے ابن خلدون نے بھی اس کو نقل کیا ہے اور جس طرح اس حدیث کے سمجھنے میں اکثروں کو مغالطہ ہوا ابن خلدون بھی باوجود اپنی دقت نظری کے اس سے نہ بچ سکے حدیث[۵] یہ ہے۔

عن ابی امامة الباهلی رضی الله تعالیٰ عنه انه رأی سکة وشیئا من آلة الحرث فقال سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یقول: لا یدخل هذا بیت قوم الا ادخله الله الذل۔

ابو امامہ باہلی سے مروی ہے انہوں نے کسی مکان میں ایک ہل دیکھا ابو امامہ باہلی کہتے ہیں انہوں نے رسول اکرم کو کہتے سنا کہ جب کسی گھر میں داخل ہوتا ہے تو ذلت بھی آتی ہے۔

ظاہر ہے کہ حدیث میں نہ زراعت کا ذکر تھا نہ غراست و باغبانی کا بلکہ "سکہ" یعنی ناگر (ہل) اور اسی قسم کے بعض آلات کشاورزی کسی گھر میں رکھے ہوئے تھے حضرت ابو امامہ باہلی نے ان کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل فرمایا کہ یہ آلات جس گھر میں داخل ہوتے ہیں اُن میں ذلت داخل ہوتی ہے گویا زراعت ذلیل کام ہے اور زراعت کرنے والوں کو ذلیل کرتی ہے یہ کتنی بڑی جرُت ہے کہ قرآن پاک میں حق تعالیٰ نے "نحن الزراعون (ہم زراعت کرتے ہیں) فرما کر " الزراع " کو اپنے اسماء حسنیٰ یا کم از کم اپنے صفات حسنیٰ میں داخل فرما دیا ہے ایسی منصوص صنعت الہی سے انتصاف کے متعلق یہ خیال کرنا کہ جو حق تعالیٰ کی اس صفت سے موصوف ہوگا وہ ذلیل ہو جاتا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ بات کہاں تک پہنچتی ہے پھر اسی بخاری میں زراعت کرنے والوں کے اس فعل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ شرف عطا فرماتے ہیں کہ اس کی کھیتی سے آدمی یا جانور یا پرند اگر کھائے تو اس کی جانب سے وہ حق تعالیٰ کی طرف سے مستحق اجر و ثواب اور حق تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرتا ہے ظاہر ہے کہ کسی ایک پودے کے پھلوں سے چونٹیاں اور جانور اور دوسری چیزیں جو نفع اٹھاتی ہیں ان کے پتوں سے بھی اور ان کے دانوں سے ایسا آدمی جو رضا حق کے اس مقام پر بخاری کے روایت کی بناء پر قایم ہے اس پر ذلت اور رسوائی کا عیب عاید کرنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے پھر یہ بھی تو غور کرنا چاہیئے کہ انصار جن کی عظمت اور عزت کا شاہد قرآن ہے ان میں اکثر زراعت کرنے والے تھے تو ایسے طبقہ کو جسے قرآن نے معزز قرار دیا ان کے ذلیل ہونے کا دعویٰ کرنا کس حد تک درست ہو سکتا ہے اور وہ بھی حدیث کے الفاظ کے بناء پر نہیں بلکہ اپنے خود تراشیدہ مطلب کی بناء پر یہ سارے الزامات لوگوں نے اپنے اوپر عائد کیے ورنہ جو لوگ اسلام اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مذاق شناس ہیں وہ بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ ان الفاظ نبوی کی غرض کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ صفائی اور پاکیزگی اسلام کا ایک اہم ترین جزء ہے صحیح حدیثوں میں ہے کہ الطہور شطر الایمان (ایمان کا ایک بڑا حصہ پاکیزگی اور صفائی ہے) المتطہرون کو

حق تعالیٰ نے اپنے محبوبوں میں داخل فرمایا ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ صرف جسم و لباس ہی نہیں بلکہ مسلمان اپنے گھروں کو بھی صاف ستھرا رکھیں۔ حکم تھا کہ

نظفوا افنیتکم ولا تشبھوا بالیھود۔ تم اپنے مکانوں کے صحنوں کو صاف ستھرا رکھو اور یہود کے مانند نہ بنو۔

"افنیہ" مکان کے اندرونی حصہ کو نہیں بلکہ بیرونی احاطہ اور میدان کو کہتے ہیں۔ یہودی جو مدینہ اور خیبر وغیرہ میں باغبانی اور کاشتکاری کا کام کیا کرتے تھے وہ اپنے گھروں کے احاطوں کو گھوڑوں، بکریوں اور مینڈھوں سے معمور رکھتے تھے اور چاروں طرف ان کے مکان کے ارد گرد انہی مویشیوں کی وجہ سے گندگی رہتی تھی نیز انہی کے ساتھ کاشتکاری کے آلات "مساحی" "مساحین سکہ" وغیرہ پڑے رہتے تھے جن کی وجہ سے ان کے مکانوں کے احاطے متعفن رہتے اور غلیظ رہتے تھے اور یہ ایسی بات ہے جس کا مشاہدہ آج بھی کسانوں کے گھروں کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے ان کی دلچسپیاں ان چیزوں سے اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ انہیں اپنے حال پر ترس بھی نہیں آتی پس رسول اکرم کا مقصود و مبارک بظاہر یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ کاشتکاری کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی جہاں رہے وہیں ان ساری گندگیوں کو بھی اکٹھی کر کے رکھے بلکہ کاشتکاری کے ان لوازم کے لیے کوئی علیحدہ مکان رکھنا چاہئے ٹھیک اس کی مثال ایسی ہے کہ رسول اکرم نے قریب قریب انہی کے الفاظ میں فرمایا کہ جس گھر میں کتا ہوتا ہے اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ کتوں کے پالنے کی سرے سے ممانعت تھی بلکہ کتوں کو گھروں میں اپنے ساتھ ساتھ رکھنے کی ممانعت تھی ورنہ معلوم ہے کہ

کلب غنم و حرث و صید — گلہ کی رکھوالی کرنیوالا کتا یا کھیت کی حفاظت کرنیوالا یا شکاری کتے

کی خود رسول اکرم نے اجازت دے رکھی تھی بہر حال حدیث سے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن گھروں میں آلات کشت و زراعت رکھے جاتے ہیں وہ ان لوگوں کی ذلت کا باعث بن جاتے ہیں جس سے اگر ممانعت معلوم ہوتی ہے تو ان آلات کو گھروں میں اپنے ساتھ رکھنے کی

نہ کہ زراعت جیسی صفات حسنی کو انسانیت کی ذلت کا سبب رسول اللہ کیسے قرار دے سکتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ جن کاشتکاروں کے گھروں اور احاطوں میں یہ گندگیاں بکھری ہوتی ہیں یقیناً ان کی ذلت کا سبب بن جاتی ہیں بہرحال میرے خیال میں حدیث کی غرض جو اسلام کے دوسرے کلیات کی روشنی میں متعین ہو سکتی ہے وہ تو یہ ہے واللہ اعلم بالصواب چونکہ زراعت کے متعلق حدیث کے شروح میں یہ عام مغالطہ پایا جاتا تھا اس ذیلی بحث میں کچھ طوالت سے کام لینا پڑا۔

زراعت کے بعد اب تجارت کے متعلق بھی چند حدیثیں درج کی جاتی ہیں۔ قطع نظر اس فضیلت کے کہ جلیل القدر انبیاء نبی صلی اللہ علیہ وسلم خصوصاً خلفائے راشدین بلکہ خود سرور کائنات نے تجارت کا عملی حصہ لیا جو اس کی فضیلت کے لیے کافی ہے ماسوا اس کے حدیثوں میں آیا ہے کہ

التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشهداء۔	سچا امانت دار تاجر پیغمبروں اور صدیقین کے زمرہ میں ہے۔
تسعة اعشار الرزق فی التجارة والعشرة فی المواشی۔	رزق کے دس حصوں میں سے نو حصہ تجارت میں اور دسواں حصہ مویشی کے پالنے میں ہے۔
علیك بالخیل فان الخیل معقود فی نواصیها الخیر الی یوم القیامة۔	مسلمانوں گھوڑوں کی پرورش تم پر واجب ہے کیونکہ گھوڑوں کی پیشانیوں پر بھلائی ہے قیامت کے دن تک۔
علیك بالبز فان صاحب البز یعجبه ان یکون الناس بخیر وفی خصب۔	تم کو کپڑے کی تجارت کرنی چاہیے کیونکہ تاجر پارچہ چاہتا ہے کہ لوگ اچھے خوشحال رہیں۔
ای الکسب افضل؟ قال	پوچھا گیا کونسی کمائی افضل ہے۔ فرمایا کہ

عمل الرجل بیدہ وکل بیع مبرورٌ — آدمی کا کام جو اپنے ہاتھ سے کرے (دست کاری) اور ہر وہ تجارت جو خرابیوں سے پاک ہو۔

لولا ھذہ البیوع لصرتم عالۃً علی الناس۔ — اگر یہ تجارت نہ ہوتی تو تم لوگوں پر بوجھل ہو جاتے۔

اسی طرح صنعت، حرفت و دستکاری کے متعلق جیسا کہ گذشتہ بالا حدیث میں فرمایا گیا ہے اس کے علاوہ دوسری حدیثوں میں بھی اس کے متعلق مختلف قسم کے ترغیبی کلمات پائے جاتے ہیں جن کی تشریح یوں ہے

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما اکل احد طعاماً قط خیراً من ان یاکل من عمل یدہ وان داود نبی اللہ کان یاکل من عمل یدہ۔ — حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ کسی نے بھی دستکاری کے ذریعہ سے کمائے ہوئے کھانے سے بہتر کھانا نہیں کھایا اور اللہ کے نبی داود دستکاری سے کمایا کرتے تھے۔

الکاسب حبیب اللہ۔ — کمانے والا اللہ کا دوست ہے۔

دستکاری یا صنعت کے متعلق ایک چیز کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے اس کلیہ قاعدے کے مطابق کہ

ان اللہ کتب الاحسان فی کل شئی فاذا ذبحتم فاحسنوا الذبح واذا قتلتم فاحسنوا القتل۔ — اللہ نے حسن پیدا کرنا ہر چیز میں ضروری قرار دیا ہے پھر جب تم ذبح کرو تو اس کو بھی اچھی طرح ذبح کرو اور اگر قتل کرو تو اس کو بھی اچھی طرح قتل کرو۔

رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ جہاں تک امکان میں ہو اپنی صنعتوں میں مضبوطی اور حسن پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا۔

ان اللہ یحب اذا عمل احدکم عملاً ان یتقنہ۔۔ خدا کو یہ بات پسندیدہ ہے کہ جب تم کوئی کام کرو تو اس میں مضبوطی کا خیال رکھو۔

ایک مشہور حدیث ہے کہ کسی قبر میں کچھ نشیب و فراز باقی رہ گیا تھا تو حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ اس کو درست کر دیا جائے اور آگے ارشاد فرمایا ہے کہ

من صنع منکم شیئاً فلیحسنہ۔ تم میں جو شخص کوئی کام کرے تو چاہئے کہ اسمیں حسن کاری کا لحاظ رکھے۔

طبرانی میں ہے کہ کسی نے پوچھا کہ قبر کی درستگی کیا مردے کے لیے نفع بخش ہوگی؟ آپ نے فرمایا کہ اسکو نہ نفع ہوگا نہ ضرر لیکن

تسر عین الحی زندہ کی آنکھ کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔

بہرحال صنعت میں حسن کاری کا لحاظ اور پائیداری کا خیال یہ بھی اسلامی معاشیات کا ایک جز ہے۔

باقی اجرت و مزدوری یا ملازمت یا نوکری اسکے متعلق بھی حدیثوں میں کافی ترغیبات پائے جاتے ہیں اس سلسلہ میں اتنا ہی کافی ہے کہ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔

مابعث اللہ نبیاً الا رعی الغنم فقال اصحابہ وانت؟ فقال: نعم کنت ارعاھا علی قراریط لاھل مکۃ۔ خدا کے ہر نبی نے بکریاں چرائیں صحابہؓ نے دریافت فرمایا اور آپ نے بھی؟ فرمایا۔ہاں! میں بھی چند قیراطوں پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔

اسلام نے اس ذیل میں اس حد تک اپنے پیروں کے لیے وسعت نظری سے کام لیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ خود سے فرماتے کہ میں ایک دن بھوکا تھا مزدوری کی تلاش میں چلا مدینہ کے حوالی میں ایک عورت کو دیکھا کہ اس نے مٹی کے کچھ ڈھیلے جمع کر رکھے ہیں ان پر پانی ڈالنے کے لیے مزدور کی ضرورت ہے فی ڈول ایک کھجور پر میں نے معاملہ طے کیا اور یوں سولہ ڈول کے معاوضہ میں سولہ کھجور؛ دوری میں کما کر گھر لایا۔

فاتیت الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم	ہیں رسول اکرم کے پاس آیا اور خبر دی تو آپ نے
فاخبرت فاکل معی۔	میرے ساتھ کھایا۔

[illegible] ان محنتوں [illegible] کی متعلقہ روایتیں ہیں باقی دماغی اور تنظیمی محنت

عن عائشة قالت لما [illegible] ابوبکر	بی بی عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب ابوبکر خلیفہ ہوئے
قال لقد علم قومی ان حرفتی لم تکن	تو فرمایا کہ میری قوم جانتی ہے کہ میرا پیشہ ایسا نہیں تھا کہ
تعجز عن مؤنة اهلی وقد شغلت	میرے اہل وعیال کے لیے کافی ہو اور میں مشغول ہو گیا
بامر المسلمین	مسلمانوں کے کام میں۔

یعنی [illegible] حضرت صدیق اکبر نے "احتراف" قرار دیا اور اسی بنا پر آپ نے [illegible] جاری کی اور اس کا ثبوت قرآن مجید میں بھی موجود [illegible] والعاملین علیھا کے الفاظ سے دلائی گئی [illegible] دیا گیا

ومن [illegible] [illegible] کے مطابق کما ئے۔
[illegible] تھا۔

ان پیشوں [illegible] حدیثوں میں پایا جاتا ہے ایک صحابی نے عرض کیا [illegible] نماز باجماعت سے محرومی ہوتی ہے پھر کیا کروں آپ نے فرمایا۔

نعم العمل [illegible] قبلی رسل [illegible]	[illegible] ہم سے پہلے جو پیغمبر تھے
یصطاد ویطلب [illegible]	وہ سب [illegible] کرتے تھے [illegible] شکاروں کی طلب میں
من الصلوة فی جماعة [illegible]	چلتے [illegible] ایسے ہی مکان ہے
فی طلب الرزق [illegible]	[illegible] جماعت سے روزی کی تلاش
واهلها [illegible]	[illegible] اور جماعت کی نماز پڑھنے والو نکی

اسع علیٰ اہلك وعیالك حلالاً۔ محبت اور اللہ والوں کی محبت کافی ہے اپنے اہل عیال
ان ذالك جہاداً فی سبیل اللہ۔ کے لیے تم حلال روزی کو وسعت دو کیونکہ یہی اللہ کے راستے میں جہاد ہے

زیر زمین انسان کے معاشی مواد جو مستور رہیں جن میں غلہ پھل کے سوا معدنی دولت وغیرہ سب ہی شریک ہیں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضور انورؐ فرماتے

اطلبوا الرزق فی خبایا الارض۔ روزی کو زمین کے مخفی سرمایہ میں تلاش کرو۔

اتخذوا غنما فانہا تروح بخیر وتغدوا بخیر۔ بکریاں پالا کرو کیونکہ وہ بھلائی لیکر شام اور صبح آتی اور جاتی ہیں۔

اتخذوا غنماً فانہا برکۃ۔ بکریاں پالا کرو کیونکہ برکت کی چیز ہے۔

عمل الابرار من الرجال الخیاطۃ نیک لوگوں کا کام مردوں کے لیے درزی کا کام ہے

وعمل الابرار من النساء المغزل۔ اور عورتوں میں نیک کام چرخہ کاتنا ہے۔

اس قسم کے جزئیات اگر تلاش کیے جائیں تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ امام بخاری نے اپنی مشہور صحیح میں زرگری۔ لوہاری۔ درزی کا کام یعنی خیاطی پارچہ بافی نجاری بڑھائی کا کام عطاری یا عطر فروشی وغیرہ پر صحیح حدیثوں سے روشنی ڈالی ہے۔

واقعہ تو یہ ہے کہ کسب اور حصول معاش کی جد وجہد کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو عام طرز عمل تھا مسلمان اگر اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء پر چلنے کو اپنی سعادت قرار دیں تو شاید مشکل ہی سے کوئی مسلمان بیکار یا بے روزگار رہ سکتا ہے۔ اسی بناء پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے۔

انی لاکرہ ان اری الرجل فارغاً لا فی عمل الدنیا ولا آخرۃ۔ میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ کسی آدمی کو بے کار بیٹھا ہوا دیکھوں جو آخرت کا کام کرے نہ دنیا کا۔

اور یہی وجہ ہے کہ بھیک گداگری جہاں دنیا کے بعض مذاہب میں مذہب اور مذہبی علماء کے لوازم سے ہے۔ اسلام میں کاسب سے زیادہ استحقاق اسی کو ہے جو مذہب سے جتنا

بعید نہیں
زیادہ تعلق رکھتا ہو (جیسا کہ ہمارے ملک میں برہمنوں کا حال ہے) نیز جن لوگوں نے جیسا کہ گوتم بدھ کی مذہبی تعلیمات سے غلط طور پر متاثر ہو کر ترک دنیا کو اپنا مسلک بنایا ان کے جانشینوں میں جو زیرک اور نفسیات انسانی کے عالم تھے۔ انھوں نے تو بالباطل ذرائع سے عوام کی کمائی کا پیٹ کو حصہ دار بنالیا۔ کمائے کوئی کھائے کوئی لیکن اسی گروہ میں جو بیچارے بیوقوف اور احمق تھے انھیں گداگری کو اپنا پیشہ بنانا پڑا اور رفتہ رفتہ یہ ان کا پیشہ ہو گیا کس قدر افسوس کی بات ہے کہ دوسرے مذاہب میں یہ بات پائی جاتی تھی تو اتنا تعجب نہ ہوتا لیکن اسلام جس میں ۲
آنحضرت نے بھیک کے لقمہ کو

رضفا یاکل فی جہنم۔ — جہنم کی آگ میں تپایا ہوا پتھر چبائے گا۔

قرار دیا تھا آپ فرماتے تھے جیسا کہ بخاری میں ہے۔

لاتزال المسألۃ باحدکم حتیٰ یلقی اللہ تعالیٰ ولیس فی وجھہ مزعۃ لحم۔ — بھیک مانگنے والے بالآخر ایک ایسے حد پر پہنچ جاتے ہیں کہ خدا سے ملاقات کرے گا تو اس کے چہرے پر گوشت کا کوئی ٹکڑا نہ ہوگا۔

بلکہ آپ اعلان فرماتے تھے کہ (الصدقۃ تمیت القلب) کہ صدقہ آدمی کے فطری احساسات کو مردہ کر دیتا ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ صدقہ کھانے والے خودداری۔ عزت نفس رحم وغیرہ کے جذبات سے مفلس ہو جاتے ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ یہ فرماتے جیسا کہ بخاری میں ہے۔

لان یحتطب احدکم حزمۃ علی ظہرہ خیر لہ ان یسال احداً۔ — یہ بہتر ہے کہ تم میں کوئی شخص لکڑی کا گھٹا اپنی پیٹھ پر جنگل سے کاٹ کر لائے بنسبت اسکے کہ کسی سے بھیک مانگے۔

مشہور واقعہ ہے کہ ایک انصاری نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سوال پیش کیا اور رسول اکرم نے دریافت کیا کہ تمہارے پاس کسی قسم کی کوئی چیز ہے انہوں نے کہا ہاں ایک کمبل ہے جس کا کچھ حصہ پہنتا ہوں اور اس کے کچھ حصہ کو اوڑھتا ہوں اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتا ہوں آپ نے فرمایا اسی کو لے آؤ وہ لے آئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

اپنے دست مبارک سے دونوں چیزوں کو لیکر ہراج کرنا شروع کیا ایک صاحب نے ایک درہم دام لگایا آپ نے فرمایا اس سے زیادہ دینے والا بھی کوئی ہے ؟ کسی صاحب نے دو درہم دام لگائے حضور انورؐ نے انھیں کے حوالے کر دیا۔ اور درہم لیکر سوال کرنیوالے انصاری کے حوالہ کرکے ارشاد فرمایا کہ جاؤ ایک درہم کا تو غلہ لیکر گھر کے لوگوں کو دے آؤ اور دوسرے درہم سے بازار سے ایک کلہاڑی خرید کر لاؤ۔ کلہاڑی آئی اس دنیا نے دیکھا کہ آسمان و زمین کے سردار خاتم الانبیاءؐ نے بذات خود

شد فیہ عوداً بیدہٖ ۔ اس کلہاڑی میں ایک لکڑی اپنے ہاتھ سے ٹھونکی۔

اور انصاری کے حوالے کرکے فرمایا

اذھب فاحتطب وبع ولا ارینک جاؤ اس سے جنگل جاکر لکڑی کاٹو اور اسی کو بیچو اور میں چاہتا

خمسۃ عشر یوماً ۔ ہوں کہ پندرہ دن تک تمہیں نہ دیکھوں۔

انصاری نے یہی کیا اور پندرہ دن بعد حاضر خدمت ہوئے پوچھا کہ کیا حال ہے ؟ بولے کہ اس عرصہ میں دس درہم کی آمدنی ہوئی جس میں سے چند درہم کے تو میں نے کپڑے خریدے اور چند درہم کے اناج حضور اکرمؐ نے فرمایا

ھذا خیرلک من ان تجی ومسئلۃ نکتۃ یہ تیرے لیے اس سے بہتر کہ ہے کہ اس سوال کی وجہ سے

فی وجھک یوم القامۃ ۔ تیرے منھ پر قیامت کے دن ایک داغ ہو۔

غور کرنیکی بات ہے کہ بجائے اس غریب کے کمبل اور پیالے کے یہ بھی ممکن تھا کہ خود حضور اکرمؐ یا کسی صحابیؓ سے ان کو دو درہم دلوا سکتے تھے لیکن جو آپ کی غرض تھی وہ بخوبی اس شکل میں حاصل نہ ہو سکتی تھی یعنی حتی الوسع ہر شخص اپنے پاؤں پر کھڑے ہونیکی کوشش کرے اور یہ مقصد بہترین طریقہ سے تدبیر سے حاصل ہو سکتا تھا کچھ اسی قسم کا ایک واقعہ حضرت عمرؓ کا بھی ہے مسجد میں ایک شخص یہہ کہتے ہوئے داخل ہوا کہ جہاد کرنے میں کون میری مدد کرتا ہے ؟ حضرت عمرؓ نے انکو اپنے پاس بلایا اور ہاتھ پکڑ کر مجمع سے فرمانے لگے۔

من یستاجر منی ھذا یعمل فی ارضہ ۔ اپنی زمین پر کام کرنے کے لیے اس شخص کو مزدوری پر کون لیتا ہے۔

کسی انصاری نے کہا کہ میں لیتا ہوں حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

بكم تاجرة كل شهر — تم اس کو ماہوار کیا اجرت دو گے؟

انصاری نے تنخواہ بتلائی حضرت عمرؓ نے فرمایا

احذ منه — تم اس کو نوکر رکھو ۴

بہرحال نوکر حسب وعدہ چلا گیا چند مہینوں کے بعد حضرت عمرؓ نے انصاری سے پوچھا

ما فعل اجيرنا — میرے ملازم نے کیا کیا؟

انصاری نے عرض کیا ۳

صالح یا امیر المومنین — اے امیر المومنین اچھا ہے۔

حضرت عمرؓ نے حکم دیا۔

ائتني به وبما اجتمع له من الاجرة — اس کو مع جمع کردہ اجرت کے میرے پاس لے آؤ۔

آدمی مع تنخواہ کے ۔۔۔ حاضر ہوا اس شکل میں حاضر ہوا کہ ایک تھیلی بھی درہموں سے بھری اس کے ساتھ تھی حضرت عمرؓ نے تب اس کو مخاطب کر کے فرمایا۔

خذ هذه فان شئت فاغز — یہ تھیلی اپنے پاس رکھو اب جی چاہے جا کر جہاد کرو یا گھر بیٹھو۔

وان شئت فاجلس

اس میں شک نہیں کہ مفلس اور غریب عرب کے متعلق تاریخی کتابوں میں عجیب عجیب افسانے درج ہیں ابن خلدون ہی کا بیان ہے۔

كانوا يقتاتون الضب او الحمير — عرب کے لوگ گوہ اور گدھے اور کیڑے بچھو کو خوراک

او الخنافس والعقارب واذا جاعوا — بناتے تھے اور جب وہ قحط میں مبتلا ہوتے تو العلہز

اكلوا العلهز وهو وبر الابل ممزوجا — کھاتے تھے، اونٹ کے بال جس کو خون سے ملا کر پتھر سے

بالحجارة في ازمنهم قحطهم وكان — گرم کرتے اور کوٹتے اور پھر اس کو پیتے تھے، اور قریش کا

حال القريش قريبا من ذالك — حال قریب قریب یہی تھا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بسا اوقات سینگ کے بڑے ٹکڑے آگ میں ڈال کر کھاتے تھے۔

پھر کسی عرب کو ۔۔۔ سے ۔۔۔ کیا ۔۔۔ کہ یہ تعجب انگیز انقلاب ۔۔۔ سیاسی فتوحات کا ۔۔۔ لیکن

محض یہی ایک سبب نہیں ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ جہاں زندگی کے مختلف شعبوں میں انہی راہنمائی رسول اکرم کے ذریعہ سے قدرت نے کی تھی وہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ انکو بلکہ سارے جہاں کو ایک آخری "معاشی پیغمبر" بھی دیا گیا تھا آخر غور کرنے کی بات ہے کہ جہاں دنیا کے اور پیغمبروں نے اپنی اپنی اُمتوں کے لیے مغفرت و ہدایت کی دعائیں کی تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان دعاؤں کے ساتھ ہی غریب عربوں کے لیے یہ بھی دعا فرمایا کرتے تھے۔

اللھم! انھم حفاۃٌ فاحملھم: اللھم! انھم　　پروردگار! یہ لوگ پیدل ہیں انکو سوار کر پروردگار! یہ ننگے ہیں انکو

عراۃ فاکسھم اللھم! انھم جیاعٌ فاشبعھم　　کپڑے پہنا! اے پروردگار! یہ بھوکے ہیں تو ان کو سیر کر۔

"معاشی دعا" کا اس سے بہترین نمونہ اور کیا ہو سکتا ہے حضور انور کو اگر ایک طرف عربوں کی اعتقادی و اخلاقی بربادیوں سے تکلیف ہوتی تھی اور اتنی تکلیف ہوتی کہ قرآن مجید میں حق تعالیٰ کو

لعلک باخعٌ نفسک ألا یکونوا مؤمنین۔　　کیا تم خود کو ہلاک کر دوگے اس بات پر کہ وہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔

جیسی متعدد آیتیں نازل کرنی پڑیں لیکن قریب قریب اسی قسم کی اذیت آپکے رؤف و رحیم قلب مبارک کو عربوں کے افلاس اور فاقہ سے ہوتی تھی صحیح مسلم میں ایک لمبی روایت ہے جو حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ اس حدیث کا ابتدائی حصہ یہ ہے کہ حضرت جریر فرماتے ہیں

کنا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی صدر النھار　　ہم لوگ دن کے ابتدائی حصہ میں رسول اکرم کے پاس تھے تو کچھ لوگ آئے ننگے۔

فجاء قومٌ حفاۃٌ عراۃ مجتابی النمار او العباء متقلدی　　کمل پوش تلوار گلے میں ڈالے زیادہ تر یہ لوگ مضر قبیلے کے

السیوف عامتھم من مضر بل کلھم من مضر　　تھے بلکہ کل کے کل مضری تھے۔ رسول اللہ کے چہرہ کا رنگ

فتمعر وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔　　بدل گیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر "تمعر" (رنگ بدل جانے کی) یہ کیفیت کیوں پیدا ہوئی؟ حضرت جریرؓ خود ہی اس کے بعد اس کی وضاحت فرماتے ہیں کہ

لما رای بھم من الفاقۃ۔　　بوجہ اس کے جو دیکھا رسول اکرم نے ان لوگوں کے فاقہ کی حالت کو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان کی یہ حالت اتنی ناقابل برداشت ہوئی کہ پہلے آپ اندر زنانے میں چلے گئے اور اسی پریشانی کی حالت میں باہر نکلے بظاہر گھر میں کوئی ایسا سامان نہ تھا جس سے ان کمبل پوش ننگے پاؤں والوں کی امداد فرما سکتے ہوں اسی وقت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بلائے گئے اذان دینے کا حکم ہوا

نماز ہوئی اور باوجودیکہ جمعہ کا دن نہ تھا منبر پر تشریف لے گئے اور آیت قرآنی۔

یا ایہا الناس: اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ۔ — لوگو۔ ڈرو اپنے اس رب سے جس نے تمھیں ایک شخص (آدم) سے پیدا کیا۔

تلاوت کرتے ہوئے "بنی آدم اعضای یکدیگرند" کی حقیقت کی طرف توجہ دلاکر آدمیت کے اس جسد کے ہر عضو کو بے چین فرمادیا پھر اور آیتیں تلاوت فرمائیں کہ کل لینے کے لیے آج کوئی دینا چاہے تو دے سکتا ہے۔ عطیوں کی بارش شروع ہوگئی ڈھیر لگ گیا اور وہی چہرۂ انور جو فاقہ کو دیکھ "متغیر" ہوا تھا حضرت جریر کے الفاظ میں

حتیٰ رایت وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتہلل کانہ مذھبۃ۔ — یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کو دیکھا کہ وہ چمک اٹھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کندن دمک رہا ہے۔

- ایک "معاشی روح" معاشی ان کے احساسات کیا اس سے زیادہ ہوسکتے ہیں "خوباں ہمہ دارند" کا جو تنہا مظہر اتم تھا اسکی ان باتوں پر تعجب کرنا چاہیے وہی جن کے قدم مبارک لونمازوں میں قیام کی وجہ سے لوگ متورم دیکھتے تھے یہی لوگ اس کا تماشا بھی کرتے تھے کیا آپ بازار میں جارہے ہیں غلہ کا ایک ڈھیر سامنے نظر آتا ہے۔

فادخل یدہٗ فیہا فنالت اصابعہ بللا۔ — اپنے دست مبارک انبار میں ڈالدیتے ہیں آپکی انگلیوں میں تری لگجاتی ہے۔

انبار کے مالک سے دریافت فرمایا جاتا ہے

ماھذا یا صاحب الطعام: فقال اصابتہ السماء یا رسول اللہ۔ — غلہ والے یہ کیا ہے۔ اس نے کہا اے اللہ کے رسول اس پر بارش ہوگئی۔

معاشی تعلقات کی تصحیح کے پیغمبر کی زبان مبارک سے آواز آتی ہے

افلاجعلتہ فوق الطعام حتیٰ یراہ الناس من غشنا فلیس منا۔ — پھر تم نے اس تر غلہ کو اوپر کیوں نہ رکھا جو فریب کرے وہ ہم سے نہیں ہے۔

سکھائے معیشت کے آداب اُن کو ÷ پڑھائے تمدن کے سب باب اُن کو

(مسدس حالی)

محمد یوسف الدین

ہندوستان کے وسائل حمل و نقل پر جنگ کے اثرات

ہندوستان جیسے وسیع ملک میں وسائل حمل و نقل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کی معاشی وحدت اور تجارت داخلہ کی بہبود بھی ان ہی وسائل حمل و نقل کی رہین منت ہے۔ جنگی معیشت میں تو ان وسائل کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے سپاہیوں کو ملک کے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانا پڑتا ہے۔ پھر فوجی و شہری ضروریات کی سربراہی کے لیے بھی وسائل حمل و نقل کی طلب بڑھ جاتی ہے لیکن اسی زمانہ میں ان کی قلت بھی محسوس ہوتی ہے کیونکہ مشین و انجن بنانے والے کارخانے زیادہ تر اسلحہ سازی میں مصروف رہتے ہیں بالفاظ دیگر اُن کی رسد، بڑھتی ہوئی طلب کا ساتھ نہیں دیتی ہے اور اگر اس صورت حال پر جلد قابو نہ پالیا جائے تو ملک میں معاشی بحران پیدا ہو جاتا ہے۔ اور غیر فوجی آبادی اس بحران کی سب سے پہلے شکار بنتی ہے۔ جنگ کے زمانہ میں فوجی ضروریات کی تکمیل تو بہر حال کرنی پڑتی ہے لیکن جب ملک کی عام معاشی حالت میں اختلال پیدا ہو جائے تو جنگی مساعی میں بھی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ الغرض وسائل حمل و نقل کی اہمیت کا اندازہ ملک کی موجودہ غذائی صورت حال سے ہو سکتا ہے۔ اگر ہمارے وسائل حمل و نقل ترقی یافتہ اور کارکرد ہوتے تو ملک کی غذائی صورت حال اس قدر بھیانک نہ ہوتی۔

جس طرح ہندوستان کی معاشی زندگی کے تقریباً تمام شعبے دوسروں کے دست نگر ہیں اسی طرح اس کے نظام حمل و نقل کا انحصار بھی "امداد غیر" پر ہے۔ موجودہ میکانی نظام حمل نقل میں تجارتی و معاشی نقطۂ نظر سے تین وسائل کو بہت نمایاں مقام حاصل ہے۔ ۱۔ ریل ۲۔ موٹر ۳۔ جہازرانی اور ان تینوں وسائل حمل و نقل کی سربراہی کی حد تک ہندوستان خود کفیل نہیں ہے۔ ریل کے انجن اور ڈبے، موٹر اور اس کے کل پرزے یہ سب ہندوستان میں تیار نہیں ہوتے۔ پھر اُن کی قوت محرکہ یعنی

[illegible]

کوئلہ اور پیٹرول کے لیے ہندوستان دوسروں کا محتاج ہے۔
گزشتہ جنگ عظیم کی طرح اس جنگ میں بھی ان وسائل حمل ونقل کی طلب بڑھ گئی، مگر چونکہ ان کی [illegible] نہیں [illegible] بلکہ وہ دوسروں کے دست کرم کا محتاج ہے اس لیے ان کی [illegible] گزشتہ جنگ عظیم کے بعد ملک کے با اثر افراد نے حکومت ہند کو موٹر سازی، جہاز سازی اور [illegible] سازی کی طرف متوجہ کیا لیکن حکومت کے کان پر جوں تک نہ رینگی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ [illegible] حمل ونقل کے [illegible] وجوہ معاشی مشکلات سے دوچار ہے۔
اب ہم یہ دیکھیں گے کہ ان تینوں وسائل حمل ونقل کو جنگ نے کس طرح متاثر کیا ہے۔

ریلوں پر جنگ کے اثرات:۔

جنگ کا [illegible] ریلوں پر بہت زیادہ بار پڑا۔ جنگ کا سب سے پہلا اثر تو یہ ہوا کہ انجن اور ڈبوں کی [illegible] نہیں کیا گیا بلکہ ریل کے ڈبوں اور حرکی مشینوں کی ایک کثیر تعداد [illegible] جنگ کے بعد ہی شایع ہوں گے۔ لیکن حسب ذیل اعداد [illegible] رپورٹوں سے مرتب کیے گئے ہیں، اس کا ایک ہلکا سا اندازہ ہوسکتا ہے۔

[illegible]	۱۹۳۹ء	۱۹۴۳ء	فرق
بڑی لائن کی حرکی مشینیں	۵۳ [illegible]	۵۲۱۳	۱۳
اوسط لائن کی حرکی مشینیں	۲۳۲۳	۲۲۱۲	۱۱۱
چھوٹی	۲۹۶	۲۸۱	۱۵
جملہ	۷۹۱۹	۷۸۰۶	۱۱۳
بڑی لائن کی [illegible]	۱۴۹۱۳۱	۱۴۷۹۴۷	۱۱۸۴
اوسط لائن	۵۲۲۹۹	۴۶۷۹۷	۵۵۰۲
چھوٹی	۳۵۸۷	۳۴۷۶	۱۱۱
جملہ	۲۰۵۰۱۷	۱۹۸۲۱۰	۶۷۹۷

مسٹر ٹائی سن نے نہایت وضاحت کے ساتھ اپنی کتاب¹ India Arms for Victory میں یہ بتلایا ہے کہ کس طرح ہندوستان نے مصر، لیبیا، ایران اور عراق کو حرکی مشینیں اور ڈبے روانہ کیے اور ان ممالک کی نقل و حمل میں سہولتیں پیدا کی ہیں۔ مسٹر ٹائی سن لکھتے ہیں کہ "مشرق وسطیٰ کی حمل و نقل کو وسعت دینے میں ہندوستان نے بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ عراق اور ایران میں بہت کم ریلیں تھیں اور پورے ساز و سامان سے آراستہ بھی نہیں تھیں۔ ان ریلوں کو کارکردگی کے اچھے معیار پر پہنچانے کے لیے ہندوستان نے بڑی مدد دی"۔ ہم نے وضاحت کر دی ہے کہ ہندوستان میں ریلوں کے انجن اور ڈبے وغیرہ تیار نہیں ہوتے۔ جب ہندوستان نے مشرق وسطیٰ کے لیے ان کو برآمد کیا تو ظاہر ہے کہ اس کی اپنی داخلی ضروریات کے لیے ریلوں کی کمی ہوئی ہوگی اور پھر یہ یاد رہے کہ یہ کمی اس زمانہ میں ہوتی ہے جبکہ اندرون ملک فوجی ضروریات کی وجہ سے ریلوں کی حمل و نقل میں اضافہ ہو گیا تھا۔ گویا ایک طرف انجن اور ڈبے برآمد کیے گئے اور دوسری طرف فوجی ضروریات کے لیے ان کی طلب اندرون ملک بڑھ گئی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ شہری ضروریات کی نقل و حمل میں گوناگوں دقتیں پیش آئیں۔

(۲۰) جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں جنگ کے زمانہ میں ریلوں پر زیادہ بار پڑتا ہے۔ اس لیے انجنوں ڈبوں اور عمارات اور اوزاروں کو درست کرنے کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ مگر حکومت ہند نے ان کی درستگی و مرمت کے لیے سہولتیں مہیا نہیں کیں۔ ہندوستانی ریلوے ورکشاپوں میں صرف دستی بم اور ان کے خول تیار کیے جا رہے ہیں۔ کئی ورکشاپوں کو محکمۂ رسد کے حوالے کر دیا گیا ہے اور ایسے زمانہ میں جب کہ ریلوے انجنوں، ڈبوں وغیرہ کی مرمت اور درستی کی طرف زیادہ توجہ کی جانی چاہیے، ان کی طرف سے لاپروائی برتی جا رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ "انجنوں کی ایک خاصی مقدار جنھیں معمولی ضروریات کے لیے ہمیشہ استعمال کیا جاتا تھا، اب ورکشاپوں میں

---

¹ G. W. Tyson: India Arms for Victory

بمولمیلسانیین
پڑی ہوئی ہے اور ان سے حمل ونقل کا کام نہیں لیا جا رہا ہے۔[1]

(۴) جاپان کی شرکت جنگ اور برما کی شکست کے باعث مشرقی بندرگاہیں غیر محفوظ ہو گئیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ساحلی حمل ونقل مغربی بندرگاہوں کی طرف منتقل ہو گئی اور اس طرح ریلوں پر زیادہ بار پڑا۔

(۵) جنگ کے چھڑتے ہی پٹرول کی قلت محسوس ہونے لگی اور اگست سنہ ۴۱ء میں پٹرول کی راشن بندی کے باعث موٹروں کے ذریعہ حمل ونقل کم ہونے لگی۔ اور یہ حمل ونقل ریلوں کی طرف منتقل ہوئی۔ اس طرح ریلوں پر مزید بار پڑا۔

الغرض ریل کے انجن اور ڈبوں کی درآمد بند ہوئی، پھر ان کی ایک کثیر تعداد کو برآمد بھی کیا گیا اور ان کے ساتھ ساتھ فنی ماہرین کو بھی عراق ایران مصر وغیرہ بھیجا گیا، انجنوں اور ڈبوں کی مرمت کے لیے سہولتیں بہم نہیں پہنچائی گئیں۔ ساحلی اور موٹروں کی حمل ونقل میں کمی ہوئی۔ ان تمام اسباب کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ریلوں پر زیادہ بار پڑا اور ان کی آمد و رفت میں اضافہ ہو گیا۔ ذیل کے اعداد و شمار سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

بڑی لائین کی آمد و رفت میں اضافہ[2]

سنہ	آمد و رفت	اضافہ فیصد بمقابل سنہ ۳۹-۳۸
۳۹-۳۸	۱۸ ارب ۶۲ کروڑ ٹن میل	×
۴۰-۳۹	۱۹ ارب ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ	۵ ء ۹۲
۴۱-۴۰	۲۳ ارب ۵ کروڑ ۹۰ لاکھ	۲۸ ء ۱۰
۴۲-۴۱	۲۴ ارب ۸ کروڑ ۵ لاکھ "	۲۹ ء ۱۴

---

[1] G. W. Tyson ... A ... Wo...

[2] یہ اعداد سرکاری اطلاعات سے لیے گئے ہیں۔

چھوٹی لائین کی آمد و رفت میں اضافہ[1]

سنہ	آمد و رفت	اضافہ فیصد بمقابل سنہ ۳۹-۳۸
۳۹-۳۸	۳۱۶۵۰۰۰۰۰۰	+
۴۰-۳۹	۳۳۷۲۰۰۰۰۰۰	۶٫۵۴
۴۱-۴۰	۳۴۷۸۰۰۰۰۰۰	۹٫۸۸
۴۲-۴۱	۳۷۸۵۰۰۰۰۰۰	۱۹٫۶۰
۴۳-۴۲	۳۵۵۰۰۰۰۰۰۰	۱۲٫۲۰

مال گاڑی کے بھرے جانے والے ڈبوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ ذیل کے اعداد ملاحظہ ہوں۔

بڑی لائین کے ڈبوں کی تعداد

سنہ	تعداد واگن	کمی یا اضافہ فیصد بمقابل سنہ ۳۹-۳۸
۳۹-۳۸	۴۷۰۳۱۲۸	×
۴۰-۳۹	۴۹۳۳۷۹۹	۳٫۱۷
۴۱-۴۰	۵۰۸۶۳۱۹	۶٫۳۶
۴۲-۴۱	۵۰۵۶۵۸۴	۵٫۷۴
۴۳-۴۲	۴۳۷۶۸۷۵	-۸٫۴۷

چھوٹی لائین کے ڈبوں کی تعداد

سنہ	تعداد واگن	کمی یا اضافہ فیصد بمقابل سنہ ۳۹-۳۸
۳۹-۳۸	۲۴۴۱۹۵۹	+
۴۰-۳۹	۲۵۷۵۹۱۲	+۵٫۴۹

[1] یہ اعداد مرکزی اطلاعات سے لیے گئے ہیں۔

۴۰-۴۱ء	۲۵۰۳۰۲۲	+۲٫۵۰
۴۱-۴۲ء	۲۴۴۲۸۸۵	+۰٫۰۴
۴۲-۴۳ء	۲۱۶۵۵۵۲	-۱۱٫۳۰

ان اعداد سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ۴۱-۴۲ء تک مال گاڑی کے ڈبوں کے تعداد میں ۳۸-۳۹ء کے بمقابل اضافہ ہی ہوا لیکن ۴۲-۴۳ء میں کمی ہوئی اس تخفیف کے حسب ذیل اسباب تھے۔

(۱) بندرگاہوں اور فوجی ڈپو پر ڈبے زیادہ تعداد میں پڑے رہے۔

(۲) ترجیحی آمد و رفت کے خالی ڈبوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

(۳) معمولی حمل و نقل کی حالت خراب رہی جس کی وجہ سے بنگال و بہار کی کوئلہ کی کانوں میں بہت دن تک خالی ڈبے رکھنے پڑے۔

(۴) خاص فوجی گاڑیوں کی وجہ سے انجن پھنسے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مال گاڑیوں کی معمولی نقل و حرکت میں خلل پیدا ہوا۔

(۵) چھوٹی لائین کے ڈبے مشرق وسطی کے اہم جنگی محاذ پر بھیج دیے گئے

(۶) اگست ۴۲ء کے سیاسی فسادات کی وجہ سے حمل و نقل کی عام حالت خراب رہی۔

یہ وہ وجوہات ہیں جن کی بنا پر ۴۲-۴۳ء میں مال گاڑی کے ڈبے کم تعداد میں استعمال کیے گئے۔ لیکن ان اسباب کے باوجود مال کے وزن میں اضافہ ہی ہوا۔ اعداد ذیل سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

بڑی لائین پر مال کے وزن میں اضافہ

سنہ	وزن	۳۸-۳۹ء کے بمقابل اضافہ فیصد
۳۸-۳۹ء	۸۹۳۶۵۰۰۰	×
۳۹-۴۰ء	۹۳۷۶۶۰۰۰	+۴٫۹۲

سنہ ۴۰-۴۱	۹۶۷۷۷۰۰۰	+۸٫۳۹
سنہ ۴۱-۴۲	۱۰۲۸۳۸۰۰۰	+۱۵٫۱۰
سنہ ۴۲-۴۳	۹۹۷۳۴۰۰۰	+۱۱٫۶۰

چھوٹی لائن پر مال کے وزن میں اضافہ

سنہ	وزن	سنہ ۳۸-۳۹ کے بمقابل اضافہ فیصد
سنہ ۳۸-۳۹	۳۳۹۴۶۰۰۰	×
سنہ ۳۹-۴۰	۲۵۲۰۰۰۰۰	+۵٫۲۴
سنہ ۴۰-۴۱	۲۴۵۴۷۰۰۰	+۲٫۵۱
سنہ ۴۱-۴۲	۲۵۲۰۸۰۰۰	+۵٫۲۷
سنہ ۴۲-۴۳	۲۴۱۳۷۰۰۰	+۰٫۸۰

سنہ ۴۲-۴۳ میں سنہ ۳۸-۳۹ کے بمقابل دونوں لائنوں پر زیادہ مقدار میں مال کی حمل ونقل ہوئی مگر فسادات اگست کی وجہ سے دیگر سنین کی بہ نسبت حمل ونقل میں کمی ہوئی۔

فوجی حمل ونقل کے متعلق علیحدہ اعداد وشمار مرتب نہیں کیے جاتے۔ طیران گاہوں کی تعمیر، فوجی چھاؤنیوں کے لیے سامان کی سربراہی کے اعداد علیحدہ نہیں رکھے جاتے، حالانکہ ان کا تعلق فوجی حمل ونقل سے ہی ہے۔ فوجی حمل ونقل کے متعلق علیحدہ اعداد وشمار صرف ان ہی مدات کے ملتے ہیں، جن کے اخراجات محکمہ جنگ ادا کرتا ہے۔ چنانچہ سنہ ۳۸-۳۹ میں فوجی حمل ونقل نصف ملین ٹن سے کم تھی مگر سنہ ۴۲-۴۳ میں ۱٫۲۹ ملین ٹن ہوگئی۔

مندرجہ بالا تفصیلی مباحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک طرف ہر سال فوجی حمل ونقل میں زیادتی ہوئی۔ پھر اندرون ملک مصنوعات کی ترقی کی وجہ سے بھی ریلوں کی طلب میں اضافہ ہوا۔ اور دوسری طرف ریلوں کا گردشی اصل اور دیگر سامان دفاعی ضروریات کے لیے برآمد کیا گیا اور ان کی جگہ دوسرا سامان نہ تو تیار کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی ان کی مرمت کے لیے

[illegible] ہو تیں ہم پہنچائی [illegible] نتیجہ یہ ہوا کہ ریلوں کے گردشی اصل پر بار پڑا اور غیر فوجی حمل ونقل میں تخفیف ہوئی۔

موٹروں کی حمل ونقل پر جنگ کے اثرات

[illegible] سال سے موٹروں کی اہمیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جنگ سے قبل کے [illegible] موٹروں کی [illegible] درآمد کا اوسط ۰۹۰‏،۱۱ تھا اور بسوں کی درآمد کا اوسط ۱۸۰‏،۸ [illegible] اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

[illegible] ہوئی ۱۹۴۰ء میں ان کی درآمد بند کردی گئی اور ساتھ ہی [illegible] کی طلب میں اضافہ ہوا [illegible] ان کی پابجائی کے لیے شہری ضروریات [illegible]

[illegible] پٹرول کی قلت :- جنگ سے قبل حکومت [illegible] ملین پٹرول صرف کرتی تھی۔ لیکن جنگ کے دوران میں پٹرول [illegible] بڑھ گیا یعنی ستمبر ۱۹۴۲ء تک ۲ ملین ٹن پٹرول صرف ہوا۔ ایک طرف تو پٹرول کے [illegible] میں اضافہ ہوا، دوسری طرف اس کی رسد میں کمی ہوئی، ہماری ضروریات [illegible] پٹرول درآمد کیا جاتا ہے [illegible] جنگ کی وجہ سے چونکہ جہازی حمل ونقل میں دقتیں پیدا ہو گئیں [illegible] ضروریات کے لیے پٹرول کی طلب بڑھ گئی تھی اس لیے درآمد میں اضافہ ناممکن ہوا۔ نتیجۃً حکومت ہند نے اگست ۱۹۴۰ء میں پٹرول کی راشن بندی کا آغاز کیا۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں [illegible] سے حملہ کیا جس کی وجہ سے پٹرول کی رسد میں مزید قلت پیدا ہو گئی یکم مئی ۱۹۴۲ء سے پٹرول کی راشن بندی پر سختی کے ساتھ عمل کیا جانے لگا۔ اور "کم سفر کرو" کی مہم آغاز کی گئی۔

پٹرول [illegible] کے طور پر کول گیاس کا استعمال ہونے لگا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر [illegible] موٹروں میں گیس پلانٹ لگایا جائے تو سالانہ دس لاکھ گیلن پٹرول کی بچت ہو گی۔ [illegible] حمل ونقل کی کوششوں کی وجہ سے ستمبر ۱۹۴۲ء تک آٹھ ہزار موٹریں کول گیاس سے چلنے لگیں۔ حکومت نے "گیس پلانٹ" بنانے والوں کی ہمت افزائی بھی کی۔ لیکن یہ سب کچھ بہت دیر سے ہوا۔

اگر حکومت نے بروقت قدم اٹھایا ہوتا اور گیاس پلانٹ کے استعمال و تیاری کے لیے موقع فراہم کیا جاتا تو صورت حال بڑی حد تک غیر متوازن نہ ہونے پاتی۔

(۳) موٹر کے کل پرزے، ٹائر، ٹیوب درآمد کیے جاتے ہیں۔ لیکن جنگ کی وجہ سے انکی درآمد مشکل ہوگئی۔ اے، آر، پی اور فوجی ضروریات کے لیے ان کی طلب زیادہ تھی۔ اس لیے ٹائر ٹیوب کی راشن بندی کی گئی۔

موٹروں کی طلب میں اضافہ، درآمد میں کمی، پٹرول کی قلت اور کل پرزوں کی عدم دستیابی کے باعث موٹروں کے حمل و نقل کی دقتیں پیدا ہوئیں اور ریلوں پر زیادہ بار پڑا۔

موٹر کے ٹائروں کی راشن بندی کے سلسلہ میں حکومت نے اعلان کیا کہ وہ بسوں کے چار درجے قرار دینا چاہتی ہے۔ پہلے اور دوسرے درجے کی بسوں کو ترجیح دی جائیگی، اسی طرح حکومت نے لاریوں کی بھی دو قسمیں قرار دی ہیں ایک تو ضروری اور دوسرے غیر ضروری۔ پہلی قسم کو ترجیح دی جائیگی۔

(۴) **کرایوں میں اضافہ**:۔ موٹروں کی حمل و نقل پر جنگ کا جو تھا اثر یہ ہوا کہ ان کی شرح کرایہ میں اضافہ ہوگیا۔ شرح کرایہ کے بڑھ جانے کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

(ا) پٹرول کی قلت، اور کل پرزوں کی گراں قیمت کے باعث حمل و نقل کے اخراجات میں اضافہ ہوگیا۔

(ب) فوجی نقل و حمل اور صنعتی ترقی کی وجہ سے وسائل حمل و نقل کی طلب بڑھ گئی تھی مگر ان کی رسد میں اضافہ نہیں ہوسکا اس لیے کرایہ بڑھ گیا۔

(ج) عام حالات میں ریل اور موٹر میں مسابقت ہوا کرتی تھی جس کے باعث موٹر کا کرایہ کم رہتا تھا۔ مگر اب ریلیں فوجی نقل و حمل کی خدمات زیادہ انجام دے رہی ہیں، اس لیے موٹر و ریل میں مسابقت تقریباً مفقود ہوگئی۔ اس مسابقت کی عدم موجودگی سے موٹروں کے مالکوں نے فائدہ اٹھایا اور کرایہ میں اضافہ کردیا گیا۔ چنانچہ ان مقامات کی موٹروں کے کرایہ میں زیادہ اضافہ ہوا

مجا ہیلسا نیں
جہاں متوازی ریلیں نہیں ۔
بعض مقامات پر موٹروں کے کرایہ میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے مثلاً مچھلی پٹم اور بجواڑہ کے مابین پہلے کرایہ ۸ر تھا اور اب ایک روپیہ ہو گیا ہے ۔

(۵) ریل و موٹر کی مسابقت :- تجلی کرکنس کی رپورٹ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ۴۰ فیصد ریلیں سڑکوں کے متوازی چلتی ہیں اور یہ کہ ریل و سڑک کی مسابقت کی وجہ سے ریل کا موازنہ متاثر ہوتا ہے ۔ لیکن جنگ کا ایک خوشگوار اثر یہ ہوا کہ یہ مسابقت اب تقریباً غائب ہو چکی ہے ۔ ریلوے حمل و نقل کے لیے فوجی ضروریات کی وجہ سے حکومت کی طلب میں اضافہ ہو گیا ہے اسلئے اب یہ مسابقت باقی نہیں رہی ہے ۔ بالفاظ دیگر جنگ نے ریل و موٹر کو ہم آہنگ کر دیا ہے لیکن یہ واضح رہے کہ یہ ہم آہنگی جبری ہے ۔ اور اگر مناسب تدبیریں اختیار نہ کی جائیں تو ممکن ہے کہ سابقہ حالات عود کر آئیں ۔

ساحلی حمل و نقل

جنگ سے قبل کے دس سال میں ساحلی تجارت کا سالانہ اوسط ۱۵۰٫۵ کروڑ روپیہ تھا ۔ اس سے ہندوستان کے نظام معیشت میں ساحلی حمل و نقل کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔

جنگ کی وجہ سے ساری ساحلی حمل و نقل بھی کافی طور پر متاثر ہوئی ۔

(۱) پہلا اثر تو یہ ہوا کہ جنگ کے چھڑتے ہی جن جہازراں کمپنیوں کی رجسٹری بیرون ملک ہوئی تھی ۔ ان کے جہازوں کو متعلقہ ممالک کی حکومتوں نے اپنے قبضہ میں لے لیا ۔ اور جن کی رجسٹری ہندوستان میں ہوئی تھی ، ان پر حکومت ہند نے قبضہ کر لیا ۔ اور اس طرح ساحلی حمل و نقل میں کمی ہوئی پنجاب بنگال کو سامان بذریعہ جہاز کراچی سے جاتا تھا مگر اب ریل کے ذریعہ جانے لگا ۔ گویا ساحلی حمل و نقل ریلوں کی طرف منتقل ہونے لگی ۔

(۲) جاپان کی شرکت جنگ اور برما کی شکست نے ساحلی حمل و نقل کو خطرہ میں مبتلا کر دیا جس کی وجہ سے ساحلی حمل و نقل میں کمی ہوئی ، اور ریلوں کی حمل و نقل میں

اضافہ ہوا ۔

اگر جنگ کے ابتدائی زمانہ میں حکومت نے دیسی کشتی رانی کو ترقی دی ہوتی تو صورت حال کچھ بہتر ہوتی، لیکن اس طرف توجہ کرنا تو کجا، حکومت نے بعض کشتیاں ایران کو بھیج دیں۔ جنگ کے ابتدائی زمانہ میں لکڑی آسانی سے مل سکتی تھی لیکن اب برما کی شکست کی وجہ سے اس میں دشواری پیدا ہوگئی۔ اور اس طرح کشتی رانی کو ترقی دینے کا موقع باقی نہ رہا۔

یہ تو وہ اثرات تھے جو جنگ کی وجہ سے ہمارے نظام حمل و نقل پر مرتب ہوئے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس صورت حال کا حکومت نے کس طرح مقابلہ کیا ۔

حکومت کے انتظامات :۔

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے بتلایا ہے کہ جنگ کی وجہ سے ریلوں پر زیادہ بار پڑا۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے حکومت نے حسب ذیل تدبیریں اختیار کیں ۔

(۱) پہلے پہل تو حکومت نے شہریوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی ضروریات حمل و نقل کو کم کریں۔

(۲) حکومت نے "کم سفر کرو" کی مہم کا آغاز کیا اور اس سلسلہ میں کافی پروپگنڈا کیا گیا۔

(۳) جنگ سے قبل رعایتی ٹکٹ اجراء کیے جاتے تھے لیکن اب انھیں منسوخ کیا گیا۔

(۴) شرح ٹکٹ میں اضافہ کیا گیا۔ مارچ ۴۲ء سے مسافروں کی ٹکٹ میں ۶¼٪ اور سامان کے لیے ۱۲½٪ کا اضافہ کیا گیا۔ اجناس خوردنی، کھاد اور فوجی حمل و نقل کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ نومبر ۴۲ء تک کوئلہ پر سرچارج ۱۵٪ تھا مگر نومبر ۴۲ء کے بعد سے ۲۰٪ کر دیا گیا۔ ۴۳-۴۲ء کے موازنہ میں یہ تجویز منظور کی گئی کہ اگر اجناس خوردنی کا وزن واگن سے کم ہو تو دو آنہ فی روپیہ سرچارج لگایا جائے گا اور پارسل و شخصی سامان پر سرچارج میں ۲۵٪ اضافہ کیا گیا۔

(۵) عرس اور جاتراؤں کو مقامی قرار دیا گیا اور ان کے لیے آمد و رفت کا خاص انتظام نہیں کیا گیا۔ مثلاً دسمبر ۴۱ء میں الہ آباد کے مشہور کمبھ کے میلے کے لیے خاص انتظامات کرنے سے حکومت و ریلوے نے انکار کر دیا۔

(۶) ... بکنگ بند کر دی گئی۔

محکمہ جنگی نقل و حمل کا قیام:-

اس محکمہ کا افتتاح ۹ جولائی سنہ ۴۲ کو کیا گیا۔ سر ایڈورڈ بینتھل اس کے صدر مقرر ہوئے اور ان ہی کے سپرد محکمہ ریلوے بھی کر دیا گیا۔ ان دونوں محکموں کو جنگ کے پیدا کردہ حسب ذیل تین اہم مسائل حمل و نقل کو حل کرنا پڑا۔

(۱) فوجی حمل و نقل کی ضروریات کو پورا کرنا۔

(۲) حمل و نقل کے دیگر ذرائع اختیار کرنا مثلاً پٹرول کی راشن بندی کے باعث موٹروں کی حمل و نقل کو برقرار رکھنا مشکل تھا۔ اس لیے پٹرول کا بدل دریافت کرنا اور اس کو رائج کرنا تھا۔

(۳) سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ حمل و نقل کے مختلف وسائل مثلاً ریل، موٹر، جہاز، کشتی اور بیل گاڑی وغیرہ کو اس طرح منظم کرنا کہ فوجی و شہری ضروریات احسن طریقہ پر پوری ہوں۔

چنانچہ اسی غرض سے فروری سنہ ۴۲ کو محکمہ جنگی حمل و نقل کا ادارہ قائم کیا گیا۔

ان مسائل سے نپٹنے کے لیے محکمہ حمل و نقل نے مختلف طریقے اختیار کیے ذیل میں ہم ان مختلف طریقوں کا مطالعہ کریں گے۔

(۱) ترجیحی والیق:- حمل و نقل کے بہتر انتظامات کے سلسلہ میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ سب سے پہلے فوجی ضروریات کو ترجیح دی گئی اور اس کے بعد دیگر سامان کی ترجیحی آمد و رفت کا انتظام کیا گیا۔ ابتدا میں یہ اختیارات محکمہ تجارت و رسد کے بعض عہدہ داروں کو دیے گئے تھے لیکن بعد میں ان اختیارات کو محکمہ جنگی حمل و نقل نے اپنے ہاتھ لے لیا۔ غیر فوجی سامان کی ترجیحی حمل و نقل کے انتظام کے لیے مئی سنہ ۴۲ میں انٹر ریلوے ترجیحات کا افسر دہلی میں تقرر کیا گیا۔ اور اس کا فرض یہ قرار دیا گیا کہ وہ سامان کی ترجیحی حمل و نقل کا انتظام کرے اور ریلوں میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ اس کی مدد کے لیے حلقہ واری کنٹرولرس مقرر کیے گئے۔

(۲) حمل و نقل کے بورڈ:-

ان انتظامات کے علاوہ حمل ونقل کے صوبہ واری وحلقہ واری بورڈ بھی قایم کیے گئے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ موجودہ حمل ونقل میں سہولت بہم پہنچائی جائے، ریلوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور حکومت وعوام کی ضرورتوں کا اندازہ لگایا جائے۔ یہ بورڈ پنجاب بمبئی، مدراس، صوبہ متحدہ اور سندھ میں قایم کیے گئے۔

(۳) ترجیحات کی مرکزی کمیٹی:۔ حکومت کے مختلف محکموں کی طلب میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ترجیحات کی ایک مرکزی کمیٹی قایم کی گئی۔ وزیر جنگی حمل ونقل اس کے صدر ہیں اور وزارت جنگی حمل ونقل اور متعلقہ محکمہ جات کے نمایندے اس کے اراکین ہیں۔ یہ کمیٹی اہم مسائل کو طے کرتی ہے۔

(۴) کول کنٹرول:۔ دوران جنگ میں کانوں سے بازار تک کوئلہ پہنچانے کا مسئلہ اہم ہو گیا تھا۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کوئلہ کی حمل ونقل کے انتظامات کے لیے ایک کول کنٹرولر مقرر کیا گیا۔

(۵) بعض اشیا مثلاً گیہوں، شکر، سمنٹ وغیرہ کی حمل ونقل کے انتظامات بھی پیچیدہ ہو گئے تھے ان کے لیے علحدہ علحدہ کنٹرولر مقرر کیے گئے۔

(۶) کلکتہ کی کمیٹی:۔ جاپان کی شرکت جنگ کی وجہ سے کلکتہ کی حمل ونقل کا مسئلہ اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ اس لیے وہاں ایک کمیٹی مقرر کی گئی جو ایک صدر اور محکمہ ریلوے و ولایع، حکومت بنگال اور اسٹیمر کمپنیوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔

محکمہ حمل ونقل نے ریلوے حمل ونقل کو بہتر بنانے کے لیے مزید انتظامات بھی کیے۔ درآمدات کو ساحلی علاقوں سے اندرون ملک پہنچانے کے لیے پورے ملک کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا (۱) شمال مغرب (۲) شمال شرق (۳) جنوب۔ ان انتظامات پر یکم اکتوبر ۴۲ء سے عمل ہونے لگا۔

محکمہ حمل ونقل کو غیر فوجی حمل ونقل کی اہمیت کا بھی احساس ہے چنانچہ سر اینڈورڈ بنتھال نے نقل وحمل کی مشاورتی کونسل کے ایک اجلاس میں کہا کہ "اگر ہم کسی ایک صنعت کی حمل ونقل سے انکار کر دیں، جو جنگ کے لیے ضروری نہیں ہے تو اس سے بیروزگاری کے اہم مسائل پیدا ہو جائیں گے۔"

حکومت کے ان سارے انتظامات میں طریق ترجیع کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن اس

خود طریقہ میں

طریقہ میں چند نقائص پائے جاتے ہیں۔ ذیل میں ہم ان کا ذکر کریں گے۔

طریق ترجیح کے نقائص :—

(۱) بعض عہدہ داروں کو ہنگامی اختیارات دیے گئے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ ان اختیارات کو بے جا طریقہ پر استعمال کیا جا سکے گا۔

(۲) بعض محکموں کو ترجیحی سرٹیفکٹ دینے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اس سے دوعملی پیدا ہوتی ہے۔ بعض محکمہ جات بھی ترجیحی سرٹیفکٹ جاری کرتے ہیں اور مخصوص عہدہ داران بھی۔ اس دوعملی کی وجہ سے طریق ترجیح ٹھیک طور پر کام نہیں کر سکے گا۔

(۳) ترجیحی اشیاء میں غیر سرکاری ضرورتوں کی تبدیلی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ جب تک عوام کی ضروریات اور طلب سے پوری طرح واقفیت حاصل نہ ہو طریق ترجیح پر عمل کرنے سے یہ اندیشہ ہے کہ عوام کے مفادات کو نقصان پہنچے گا۔

(۴) اجناس خوردنی کی حمل و نقل کو اگرچہ ترجیح دی گئی ہے۔ مگر چونکہ ان کی حمل و نقل خانگی طور پر ہوتی ہے اس لیے ترجیحی ضروریات کے بعد اس کا نمبر رہ گیا ہے حالانکہ موجودہ بھیانک غذائی صورتحال کے مدنظر اجناس خوردنی کی حمل و نقل یقیناً فوجی ضروریات کی حمل و نقل سے کم اہم نہیں ہے۔

گذشتہ مباحث میں ہم نے یہ بتلایا ہے کہ ہمارے وسائل حمل و نقل پر جنگ کے کیا اثرات مترتب ہوئے ہیں اور اس سلسلہ میں حکومت نے جو انتظامات کیے ہیں ان کا بھی جائزہ لیا گیا۔ اب ہم ان تدابیر کا ذکر کریں گے جو موجودہ صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے ہمارے خیال میں ضروری ہیں۔

اصلاحی تجاویز :—

ریلوے حمل و نقل کے متعلق :— (۱) ریلوے حمل و نقل کو بہتر بنانے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ڈبوں اور انجنوں کی برآمد بالکل بند کر دی جائے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی مرمت و درستگی کا معقول اور بہتر انتظام ہو۔ اس سلسلہ میں اگر تمام مقامات پر نئے ورکشاپ کھولے جائیں تو جو انجن اور ڈبے اس وقت بیکار پڑے ہوئے ہیں انہیں کام میں لایا جا سکتا ہے۔

(۲) طریق ترجیح کے نقائص کو دور کیا جائے۔ مثلاً جو ہنگامی اختیارات بعض عہدہ داروں کو

دیے گئے ہیں، ان پر پابندی عائد کیجائے۔ تر تیبی اسکیم میں غیر سرکاری نمایندے شریک کیے جائیں ۔ اجناس خوردنی کی حمل ونقل کو فوجی ضروریات سے زیادہ نہیں تو کم از کم مساوی اہمیت دی جائے ۔

(۳) خود حرکی مشینیں بنانے کے کارخانے ملک میں کھولے جائیں ۔ ۱۹۴۲ء میں ماہرین فن کی ایک کمیٹی کا خیال تھا کہ ایک خود حرکی مشینیں بنانے والی فیکٹری میں ۱۴۵ ٹن والے انجن زیادہ سے زیادہ ۵۰ بنائے جاسکتے ہیں اور اسکے علاوہ بائلر اور دیگر پرزے بنائے جاسکتے ہیں کمیٹی کا یہ بھی خیال تھا کہ ہندوستانی ریلوں کی ضروریات اس سے زیادہ ہیں تمام پرزے (سوائے چند کے) ہند میں بنائے جاسکتے ہیں فنی واہرانہ خدمات حاصل کیجاسکتی ہیں ۔ ادھار پٹے کے رضی نامہ کے تحت ضروری مشنری امریکہ سے درآمد کیجاسکتی ہے یا برطانوی وزارت پیدائش کے توسط سے دیگر ممالک سے بھی یہ مشنری حاصل ہوسکتی ہے۔ ٹاٹا کمپنی پہیے اور ٹائر تیار کرسکتی ہے ۔ (اب ٹاٹا کمپنی یہ چیزیں تیار کر رہی ہے) لیکن حکومت ہند نے اس قسم کی فیکٹری کو قایم کرنا مناسب نہیں سمجھا ۔ اگر آج یہ فیکٹری قایم ہوگئی ہوتی تو ریلوں پر اس قدر بار نہ پڑتا ۔

موٹروں کے متعلق اصلاحی تجاویز:- (۱) موٹر سازی کا کارخانہ قایم کیا جائے ۔ گذشتہ تین سال سے حکومت نے موٹر سازی کے کارخانے کی اجازت نہیں دی ۔ مسٹر والچند ہیرا چند اور سر ایم وسویسریا کا بیان ہے کہ وہ ۲۵ یا ۳۰ کروڑ کے سرمایہ سے ہر سال دس ہزار موٹر کار اور ۵ ہزار ٹرک تیار کرسکتے ہیں ۔ ابتداً بعض پرزے درآمد کرنے پڑیں گے لیکن دو سال کے بعد انھیں بھی ہندوستان میں تیار کیا جاسکتا ہے ۔ انجینیرنگ انگلستان سے ماہرانہ وفنی خدمات حاصل کیجاسکتی ہیں ۔ انکا تخمینہ ہے کہ اتنا سرمایہ لگانے کے بعد کم از کم ۱۰ فیصد منافع کی توقع کیجاسکتی ہے ۔ یہ لوگ حکومت سے تین قسم کی سہولتیں چاہتے تھے ۔ (۱) ۳۷ ½ فیصد تا مینی محصول عائد کیا جائے (۲) حکومت اس صنعت کو مساعی جنگ میں مدد دینے والی صنعت قرار دے اور اسکے لیے ڈالر مبادلات مہیا کیے جائیں اور درآمد کی پروانے عطا کرے اور ساتھ ہی ساتھ فوجی وغیر فوجی ضروریات کے لیے موٹروں کی ایک مقررہ تعداد خود خریدے (۳) حکومت اصل پر ۳ ½ فیصد کی سود کی ضمانت دے ۔ حکومت نے ان شرطوں کو قبول کرنے سے انکار کردیا ۔ حکومت کا کہنا یہ تھا کہ یہ اسکیم بہت مبہم ہے ! درجنگ کے بعد یہ صنعت پنپنے نہ پائے گی ۔ فوجی ضروریات کے لیے موٹریں خریدنے سے حکومت نے اس بنا پر انکار کردیا کہ یہ اتنی اچھی نہیں ہوں گی ۔ حکومت کے یہ تمام دلائل عذر لنگ تھے ۔ ہر اسکیم ابتدا میں مبہم ہی رہتی ہے ۔ فوجی ضروریات کے لیے حکومت ہندوستان کی بنی ہوئی بعض اشیا خرید رہی ہے قبل از قبل یہ نتیجہ قایم کرلینے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہندوستان کی بنی ہوئی موٹریں فوجی ضروریات کے لیے موزوں نہ ہونگی ۔ بہرحال حکومت نے اس اسکیم کی حامی نہیں بھری اور تعجب تو اس بات پر ہے کہ ہندوستانی صناعوں اور کاروباری ماہرین نے بھی اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنایا ۔ اب بھی وقت ہے کہ حکومت کاروباری ماہرین کی مدد سے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنائے ۔

(۲) اگر حکومت اس اسکیم کو چلانے کے لیے بالکلیہ تیار نہ ہو تو پھر یہ ضروری ہے کہ موٹروں کے کل پرزے، ٹائر اور ٹیوب درآمد کیے جائیں۔

(۳) ہم نے بتلایا ہے کہ موٹروں کا کرایہ بڑھ گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ شرح کرایہ پر نگرانی قایم کی جائے اس سے عوام کا فائدہ ہوگا۔ موجودہ زمانہ میں حمل ونقل کی جو دقتیں پیدا ہوگئی ہیں ان میں کچھ تو کمی ہوگی۔ اخراجات حمل ونقل کی زیادتی کا وجہ سے پیدائش پر برا اثر پڑتا ہے جس کی وجہ سے جنگی مساعی میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اگر کرایوں پر نگرانی ہو تو یہ دقتیں رفع ہوسکتی ہیں۔ شرح کرایہ کا تعین کچھ مشکل بھی نہیں ہے۔ حمل ونقل کے حلقہ داری بورڈ اس کا تعین کرسکتے ہیں۔ شرح کرایہ کا تعین فلستان اور ہنگری میں ہوچکا ہے۔

(۴) بیان کیا جاچکا ہے کہ جنگ کی وجہ سے ریل اور موٹر میں ہم آہنگی پیدا ہوگئی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس ہم آہنگی کو برقرار رکھا جائے۔ اس کے لیے حکومت حسب ذیل طریقے اختیار کرسکتی ہے۔

(ا) جنگ کے بعد حکومت اپنی بڑی موٹر لاریاں فوراً فروخت نہ کردے۔ (ب) حکومت کو چاہئیے کہ ریل و موٹروں کی باہمی مسابقت کی نوعیت کے متعلق تحقیق کروائے کہ ہر سڑک پر کتنی آمد ورفت ہوتی ہے جب یہ تحقیقات مکمل ہو اس وقت حکومت ایک خاص اسکیم کے پیش نظر اپنی بڑی موٹر لاریوں کو فروخت کردے۔

(ج) سڑکوں کی توسیع ہو۔

ساحلی حمل ونقل کے متعلق تجاویز:۔ (۱) حکومت جہاز سازی کی صنعت کو ترقی دے۔ بڑے پیمانہ پر کارخانے قایم ہوں جنہیں نہ صرف جہازوں کی مرمت و درستگی ہو بلکہ جہاز بھی بنائے جائیں۔ ۱۹۴۱ء میں سندھیا اسٹیم نیویگیشن کمپنی نے ایک جہاز سازی کے کارخانہ کا افتتاح کیا لیکن حکومت نے اس کارخانہ کو کافی سہولتیں بہم نہیں پہنچائیں۔ (۲) حکومت کو چاہئیے کہ ناؤ کی صنعت کو بھی ترقی دے اور چھوٹی کشتیوں کے بنانے کیلئے لکڑی فراہم کی جائے۔ ناؤ کی صنعت ہماری تجارت داخلہ میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔

دیگر تجاویز۔ یہ ظاہر ہے کہ جنگ کے غیر معمولی حالات کا مقابلہ کرنے میں ہمارے ترقی یافتہ میکانی وسائل حمل ونقل ناکام ثابت ہوچکے ہیں جنگ کی وجہ سے ان پر کافی بار پڑا ہے۔ ان حالات میں ہم کو چاہئیے کہ ہمارے دیسی حیوانی ذرائع حمل ونقل کا بھی زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔ بیل گاڑیوں کے استعمال سے صورت حال بڑی حد تک بہتر ہوسکتی ہے۔ ان علاقوں میں جہاں کہ آبپاشی نہیں ہوتی بیل کچھ عرصہ کے لیے بیکار پڑے رہتے ہیں ان بیلوں کو حمل ونقل کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے خصوصاً چھوٹے چھوٹے فاصلوں کیلئے بیل گاڑیوں کا استعمال زیادہ مناسب ہے۔ غذائی مسئلہ کو حل کرنے میں اس سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ ہمارے دیہاتوں کو ایسے حلقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جہاں اجناس خوردنی ایک حلقہ سے دوسرے حلقہ میں بیل گاڑیوں کے ذریعہ پہنچایا جاسکے اور اس طرح ریلوں پر زیادہ بار نہ ڈالا جائے۔

محمد احمد خاں

ہندوستان میں صنعتی مزدوروں کی کارکردگی

ادنیٰ کارکردگی کارکردگی سے مراد مزدور وہ تمام خصوصیات ہیں جن کی بدولت وہ اپنے مفوضہ کام کو خوبی کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔ دولت کی پیدایش کے لحاظ سے کارکردگی کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اتم دولت پیدا کرنے کے لیے جہاں اور شرائط ضروری ہیں ـــ کارکردگی کے پہلو کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

بدقسمتی سے ہندوستان میں دولت کی پیدایش کے دوسرے پہلوؤں کے علاوہ مزدوروں کی کارکردگی بھی ناقص ہے۔ کارکردگی کا اندازہ کام کی نوعیت کے لحاظ سے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اسی معیار کے پیش نظر الکزنڈر روبرٹ نے ہندوستانی شاہی زرعی کمیشن کے سامنے بیان دیا کہ انگلستان کے مزدوروں کے مقابل ہندوستانی مزدوروں کی کارکردگی بہت کم ہے کیونکہ انگلستان کا ایک مزدور تقریباً اتنا ہی کام کرتا ہے جتنا کہ ہندوستان کے چار مزدور انجام دیتے ہیں۔ دوسرے ماہروں نے بھی اپنے تخمینوں کے ذریعہ یہ واضح کیا ہے کہ انگلستانی مزدوروں کے مقابل ہندوستانی مزدور کم کارگذار ہیں۔

وہ لوگ جو ہندوستانی مزدوروں کے طرف دار ہیں یہ جواب پیش کرتے ہیں کہ انگلستان کے مزدور ہندوستانی مزدوروں کے مقابل زیادہ کام اس لیے کرتے ہیں کہ انھیں بہترین قسم کی مشنری سے مدد ملتی ہے۔ اور وہاں کا ماحول بھی اعلیٰ کارکردگی کے لیے بہت کچھ موافق ہے۔

یہ جواب بالکل درست ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر ہم ہندوستانی اور انگلستانی مزدوروں کی جسمانی حالت، صحت کے عام معیار اور اوسط عمر کا مقابلہ کریں تو ہمارے مزدوروں کی ناقص حالت نمایاں نظر آئیگی۔ ہندوستانی مزدور آئے دن طرح طرح کی بیماریوں کا شکار رہتے ہیں۔ مزاج میں عموماً سستی اور کاہلی ہوتی ہے۔ عام طور پر اسی وقت اچھا کام کرتے ہیں جب کہ موثر نگرانی رکھی جائے

تجارت بھی معمولی ہوتی ہے۔ ان حالات میں کارکردگی کا ادنیٰ ہونا لازمی ہے۔

ادنیٰ کارکردگی کے اسباب | ہندوستانی مزدوروں کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی کارکردگی ادنیٰ ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے کیا اسباب ہیں؟ ذیل میں انھیں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے:۔

(۱) ناکافی اور غیر صحت بخش غذا:۔ ہندوستان غریب باشندوں کا ملک ہے۔ ادنیٰ طبقے کے افراد کو اتنی قلیل آمدنی ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ ناگزیر احتیاجات بھی ایک اقل معیار کے ساتھ پوری نہیں کی جا سکتیں۔ لہذا مزدوروں کو نہ صرف کم پیٹ غذا ملتی ہے بلکہ اس میں قوت اور توانائی کے لیے معقول اجزائے غذائیت بھی نہیں ہوتے۔ جن لوگوں کی زندگی قلیل اور غیر متوازن غذا پر بسر ہو تو پھر ان کی کارکردگی کیونکر اچھی رہ سکتی ہے؟

(۲) ناکافی اور غیر صحت بخش مکان:۔ کارکردگی کے نقطہ نظر سے غذا کے بعد مکان کا درجہ ہے۔ صحت کے لیے ضروری ہے کہ مکانات ہوادار، روشن اور غیر مرطوب ہوں۔ ہندوستانی مزدور جن مکانوں میں رہتے ہیں حفظان صحت کے لحاظ سے عموماً ناقص ہوتے ہیں۔ روشنی اور ہوا کا اچھا انتظام نہیں ہوتا۔ افراد خاندان کی مناسبت سے گنجایش بہت کم رہتی ہے۔ بمبئی اور کلکتے میں مزدوروں کے مکانوں کی حالت خاص طور پر ناقص ہے۔ ان کی اکثریت ایک کمرے کے مکانوں میں رہتی ہے۔ فی کمرہ ۴۰۰۳ مزدور رہتے ہیں۔ فرانس، بلجیم، جرمنی اور انگلستان میں مزدوروں کے مکانات عام طور پر ایک سے زائد کمروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔

(۳) ناکافی اور غیر صحت بخش لباس:۔ کارکردگی کے تین اہم لوازمات غذا، مکان اور لباس ہیں۔ ہندوستانی مزدوروں کو تینوں چیزیں معیار کے مطابق میسر نہیں۔ غربت کی وجہ سے مزدور تن بھر لباس نہیں استعمال کر سکتے۔ کپڑوں کی تعداد محدود ہونے سے صفائی کا پورا لحاظ رکھنا مشکل ہوتا ہے۔

(۴) کارخانوں کا ماحول :- نہ صرف مزدوروں کے مکانات غیر صحت بخش ہوتے ہیں بلکہ بیشتر کارخانوں کی حالت، حفظانِ صحت کے لحاظ سے، ناقص ہوتی ہے۔ روشنی اور ہوا کا معقول انتظام نہیں ہوتا۔ کم جگہ میں زیادہ مشینیں نصب کی جاتی ہیں اور بہت سے مزدوروں سے کام لیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہوا غیر صحت بخش ہو جاتی ہے۔ جب کہ مزدور ہر روز اس قسم کے ماحول میں کام کریں تو لازمی طور پر ان کی صحت اور کارکردگی متاثر ہوگی۔

(۵) علاج کا ناقص انتظام :- ہندوستانی مزدوروں کی حیثیت کرایہ کے ٹٹوؤں سے زیادہ نہیں۔ یہ لوگ جب تک کام کرتے ہیں انھیں معاوضہ دیا جاتا ہے۔ جب کبھی بیمار ہوں اور کام کے قابل نہ ہوں تو کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا۔ سرکاری دواخانے، جہاں مزدور علاج کرا سکتے ہیں، تعداد میں بہت تھوڑے ہیں۔ سب مزدور اِن سے خاطر خواہ طور پر مستفید نہیں ہو سکتے۔ لہذا علاج کا معقول انتظام نہ ہونے کی وجہ سے، وہ دنوں بیمار رہتے ہیں جس سے اُن کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔

(۶) تعلیم کا فقدان :- کارکردگی اور تعلیم میں بہت قریبی تعلق ہے۔ صحت مند اور تندرست مزدوروں کو ضرورت کے مطابق عام اور فنی تعلیم دی جائے تو ان کی کارکردگی بہت بڑھ جاتی ہے۔ ہندوستانی مزدوروں کو لوازماتِ کارکردگی کی جہاں دوسری چیزیں میسر نہیں، یہ تعلیم سے بھی محروم ہیں۔ نہ تو عام تعلیم کا معقول انتظام ہے اور نہ حرفتی تعلیم ہی سب کو میسر ہے۔ لہذا وہ اپنے فرایض کو خوبی کے ساتھ نہیں انجام دے سکتے۔

(۷) نشہ بازی :- ہندوستانی مزدوروں میں نشہ کی عادت قدیم زمانے سے ہے۔ بالخصوص ادنیٰ درجے کے مزدور اس میں زیادہ مبتلا ہیں۔ تخمینہ کیا گیا ہے کہ یہ لوگ آمدنی کا ۱۰ فیصد حصہ نشہ بازی پر صرف کرتے ہیں۔ جس کا مضر اثر ان کی کارکردگی پر پڑتا ہے۔

(۸) قرض داری :- مختلف تحقیقاتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مزدوروں کی عظیم اکثریت مقروض ہے۔ قرض کے اہم اسباب میں موت میتی، شادی بیاہ اور دوسرے رسوم و رواج کے

اخراجات شامل ہیں۔ ابتداً قرض کی مقدار بہت تھوڑی ہوتی ہے لیکن اعلیٰ شرح سود اور لین دین کی خرابیوں کی وجہ سے برابر بڑھتی جاتی ہے۔ اکثر اس قدر زیادہ ہو جاتی ہے کہ مزدور اس کی ادائی سے قاصر رہتے ہیں۔ قرض کا بالواسطہ اثر صحت اور کارکردگی پر اس طرح پڑتا ہے کہ اس کی بدولت مزدور ایک طرف تفکرات میں مبتلا رہتے ہیں تو دوسری طرف اصل سود کی ادائی میں آمدنی کا قابل لحاظ حصہ صرف ہو جانے سے ضروریات کی تکمیل پورے طور پر نہیں ہو سکتی۔

اصلاح کی تدبیریں: ادنیٰ کارکردگی کے اسباب اوپر بیان کیے گئے ہیں۔ بہتر کارکردگی کا مسئلہ اسی وقت حل ہو سکتا ہے جب کہ حسب ذیل تدبیریں موثر طور پر اختیار کی جائیں:-

(۱) اجرتوں میں اضافہ:- مزدوروں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے ایک مکتب کا خیال ہے کہ ان کی اجرتوں میں اضافہ کیا جائے کیونکہ جب تک یہ نہ ہو مزدور صحت بخش غذا، لباس اور مکان نہیں استعمال کر سکتے۔

(۲) تعلیم کا معقول انتظام:- یہ خیال بالکل درست ہے کہ مزدوروں کی کارکردگی میں اضافے کے لیے اجرتوں میں اضافہ کیا جائے۔ اگر ہم ذرا غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ خود اجرتوں میں اضافے کے لیے مزدوروں کی کارکردگی میں اضافہ ضروری ہے۔ کیونکہ آجر، مزدوروں کی پیدا آوری کے مطابق معاوضہ دیں گے۔ مزدوروں کی پیدا آوری تو کم ہو اور آجروں سے زیادہ اجرت کا مطالبہ کیا جائے تو یہ بے معنی بات ہوگی۔ لہٰذا اجرتوں میں اضافے کے لیے مزدوروں کی پیدا آوری کو بڑھانا ضروری ہے۔

پیدا آوری میں اضافے کے لیے، دیگر امور کے علاوہ، تعلیم بہت ضروری ہے۔ اس بات کی ۸
سخت ضرورت ہے کہ حکومت اور بڑے بڑے کارخانہ داروں کی جانب سے مزدوروں کے لیے عام اور صنعتی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے مزدوروں کی کارگزاری میں اضافہ ہوگا۔ انہیں زیادہ اجرت مل سکے گی اور اس طرح، وہ غذا لباس اور مکان پر زیادہ رقم صرف کر سکیں گے۔ اعلیٰ کارکردگی سے نہ صرف مزدوروں کو فائدہ پہنچتا ہے بلکہ آجر بھی بالآخر تائید میں رہتے ہیں۔ اس لیے کہ کارگزار محنت کی پیدا آوری مجموعی طور پر زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح صارفین کو بھی فائدہ پہنچتا ہے ٦

کیونکہ انھیں چیزیں سستی ملتی ہیں ۔

(۳) دولت کا بہتر صرف :۔ مزدوروں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے اجرتوں میں اضافہ کافی نہیں۔ اسکے ساتھ آمدنی کا بہتر صرف ضروری ہے اگر آمدنی کے اضافے کو تعیشاتی احتیاجات پر صرف کردیا جائے تو اس سے مزدوروں کو فائدے کے بجائے نقصان ہوگا۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ مزدور اسراف اور نشہ بازی جیسی مضر عادتوں سے احتراز کریں۔ ان امور کی اصلاح کیلئے سماج سدھار انجمنوں کا قیام مفید ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت کی خاص امداد ضروری ہے۔ نشہ بازی زیادہ تر سماجی ماحول اور اثرات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اجتماعی تشہیر اور پروپگنڈے کے ذریعہ اس سے نجات حاصل کیجا سکتی ہے۔

(۴) حفظان صحت کی سہولتیں اور تشہیر :۔ صحت بخش غذا، لباس اور مکان کی افادیت اور اہمیت کے متعلق ایک طرف تشہیر کرنا اور دوسری طرف سہولتیں بہم پہنچانا ضروری ہے۔ مزدوروں کے لیے صاف پانی کا انتظام کیا جائے۔ انکی علحدہ نوآبادیاں قایم کی جائیں اگر یہ وقت طلب ہے تو موجودہ مکانوں میں اسطرح ترمیم کیجائے کہ روشنی اور ہوا کا بہتر انتظام ہوسکے۔ بڑے صنعتی علاقوں میں مزدوروں کی نوآبادیات قایم کرنا بہت مفید ہے کیونکہ اس کی وجہ سے مزدور آسانی کے ساتھ فراہم ہوسکیں گے۔ ایسی نوآبادیاں یا تو حکومت کی طرف سے قایم کی جائیں یا کارخانہ داروں کی جانب سے ابتداً اسکی ضرورت ہے کہ مزدوروں کو مفت یا رعایتی کرایوں پر مکانات دیے جائیں ۔

(۵) طبی امداد :۔ ہندوستان میں دواخانوں کی تعداد بہت محدود ہے۔ جب تک معیاری دواخانے ملک کی ضروریات کے مطابق نہ کھولے جائیں صحت کا عام معیار بلند نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے حکومت اور کارخانہ داروں کی توجہ ضروری ہے۔ ہر بڑے کارخانے کا ذاتی دواخانہ ہونا چاہئے تاکہ مزدور مستفید ہوسکیں۔

(۶) انجمن ہائے امداد باہمی :۔ ارزاں شرح پر قرض حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ انجمن ہائے امداد باہمی ہے۔ مزدوروں کے انتشار، غیر مستقل سکونت اور عام بے علمی کی وجہ سے یہ انجمنیں کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوئیں۔ اگر مزدور اس تحریک کے حقیقی اصول اور مقاصد سے واقف ہوں تو اس سے استفادے کے وسیع مواقع ہیں۔

حکومت کی جدوجہد اب دیکھنا یہ ہے کہ مزدوروں کی اصلاح و ترقی کے لیے حکومت کی طرف سے کس قسم کی جدوجہد کی گئی ہے۔

(۱) مزدور کمیشن کا تقرر :۔ اصلاح کے متعلق کسی عملی اقدام سے پہلے حالات اور واقعات کی مکمل طور پر

صحیح چھان بین ضروری ہے چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر ۱۹۲۹ء میں ملک معظم کے حکم سے ایک مزدور کمیشن کا تقرر کیا گیا جو عام طور پر "شاہی مزدور کمیشن" کے نام سے موسوم ہے۔ اس کمیشن کے صدر رائٹ آنریبل جے ایچ وٹلے تھے۔ اسی وجہ سے اس کمیشن کو وٹلے کمیشن بھی کہا جاتا ہے۔ کمیشن کے دائرہ تحقیق میں ہندوستانی مزدوروں کے عام حالات کی دریافت اور اصلاح کی سفارشات کے کام شامل تھے۔ جون ۱۹۳۱ء میں کمیشن کی رپورٹ شایع ہوئی۔ اس میں ہندوستانی مزدوروں کے تقریباً تمام مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ ۱۹۳۱ء کے بعد مزدوروں کی اصلاح و ترقی کے لیے جو مختلف تدابیر اختیار کی گئیں وہ زیادہ تر اسی کمیشن کی سفارشات پر مبنی ہیں۔ ہندوستانی مزدوروں کی تاریخ میں اس رپورٹ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

(۲) مکانوں کی فراہمی: صنعتی مزدوروں کے لیے بہتر مکانات کی فراہمی کے لیے حکومتوں کی جانب سے مجموعی طور پر بہت کم کام ہوا ہے۔ یہاں حکومت بمبئی کی کوششوں کی مختصر کیفیت دی جاتی ہے۔

۱۸۹۶ء میں طاعون کی وجہ سے آبادی بری طرح متاثر ہوئی لہذا ۱۸۹۸ء میں بمبئی امپروومنٹ ٹرسٹ قایم کیا گیا جس کے ذمہ نئی سڑکوں کی تعمیر، گنجان علاقوں کی کشادگی اور غریبوں کے لیے صحت بخش مکانوں کی تعمیر کے کام تھے۔ ٹرسٹ کے مالی ذرایع محدود تھے اور ٹرسٹ و کارپوریشن میں تعاون کامل نہ ہوسکنے کی وجہ سے کام کی رفتار خاطر خواہ نہ رہی تاہم اس کی کوششوں کی بدولت بعض بہت ہی مفید کام انجام پا سکے۔

۱۹۲۰ء تک امپروومنٹ ٹرسٹ کی جانب سے ۲۹۰۰ مکانات تعمیر ہوچکے تھے۔ پورٹ ٹرسٹ نے اپنے ملازمین میں سے ... کے لیے مکانات کا انتظام کیا۔ گذشتہ جنگ عظیم کے ختم کے بعد عام ترقیات کے لیے ایک نظامت قایم کی گئی۔ اسکی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ۹ کروڑ روپیہ کا قرضہ لیا گیا اور شہر بمبئی میں درآمد ہونے والی روئی پر فی گٹھا ایک روپیہ محصول عاید کیا گیا۔

(۳) قوانین کارخانجات: اواخر انیسویں صدی میں قوانین مزدوران کے نافذ کرنے کی تحریک شروع ہوئی چنانچہ ۱۸۸۱ء میں پہلا قانون نافذ کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۹۱ء، ۱۹۱۱ء اور ۱۹۲۲ء میں رد و بدل کے ساتھ دوسرے قوانین مرتب کیے گئے۔ ۱۹۳۱ء میں مزدور کمیشن کی رپورٹ شایع ہوئی لہذا ۱۹۳۴ء میں ایک اور ترمیم شدہ قانون جاری کیا گیا۔ ان قوانین کی رو سے ...

(i) مزدوروں، عورتوں اور بچوں کے لیے کام کے اوقات کا تعین کیا گیا تاکہ کارخانہ دار اپنے مفاد کے تحت بہت زیادہ دیر تک کام نہ لے سکیں۔

(ii) کارخانوں میں کام کرنے کے لیے، عمر کا تعین کیا گیا تاکہ بہت کم عمر بچوں سے کام نہ لیا جا سکے۔

(iii) کام کے دوران میں وقفے کا تعین کیا گیا تاکہ مزدوروں کو آرام کا موقعہ مل سکے

(iv) ہر ہفتے ایک چھٹی کا تعین کیا گیا۔

(v) زچگی سے پہلے اور زچگی کے بعد آرام کے لیے مقررہ مدت دی گئی۔

(vi) کارخانوں کی صفائی، ہوا اور روشنی کے عمدہ انتظامات اور مشینوں کی مناسب تنصیب کے بارے میں کارخانہ داروں کے لیے ہدایتیں مرتب کی گئیں۔ تاکہ کارخانوں کا ماحول صحت بخش رہ سکے۔

(۴) قانون معاوضہ مزدوران :- مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ۱۹۲۳ء میں ایک قانون نافذ کیا گیا جو قانون معاوضہ مزدوران کے نام سے موسوم ہے۔ ۱۹۲۶ء، ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۳ء میں اس میں تبدیلیاں کی گئیں۔ اس کی رو سے یہ لازمی قرار دیا گیا کہ اگر مزدور کام کے دوران میں مشین وغیرہ کے حادثے سے فوت ہو جائے یا بری طرح مجروح ہو تو مقررہ شرائط کے تحت آجر، مزدور کے وارثوں کو یا اُسے معاوضہ ادا کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اس معاوضے سے جانی یا عضوی نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی تاہم تھوڑی بہت امداد مل جاتی ہے جو "کچھ نہ ہونے" سے بہتر ہے۔

(۵) صنعتی جھگڑوں کا قانون :- اجرتوں کے اضافے اور اوقات کار کی تخفیف وغیرہ کے ضمن میں آجروں اور مزدوروں کے مابین آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ لہذا حکومت نے ناجائز جھگڑوں کی روک تھام اور حق بجانب جھگڑوں کے مفید سمجھوتے کے لیے ۱۹۲۹ء میں صنعتی جھگڑوں کا قانون نافذ کیا۔

(۶) قانون مزدور سبھا :- ۱۹۲۶ء میں قانون مزدور سبھا نافذ کیا گیا جس کی وجہ سے مزدور سبھا تحریک کو تقویت پہنچی اور انجمنوں کی حیثیت زیادہ منظم ہو گئی۔

آجروں کی ذمہ داری | مزدوروں کی کارکردگی کو اچھے معیار پر برقرار رکھنا بہت بڑی حد تک آجروں سے بھی متعلق ہے۔ دولت کی پیدائش کے لیے مزدور ایک ناگزیر عنصر ہیں۔ اگر آجر اُن کی صحت اور کارکردگی کی طرف سے لاپرواہی برتیں تو اس سے بالواسطہ طور پر خود انھیں نقصان اٹھانا پڑتا ہے کیونکہ ادنیٰ کارکردگی والے مزدور زیادہ دولت نہیں پیدا کر سکتے۔ ادنیٰ کارکردگی کے مزدور

یقیناً بہت کم اجرت پر دستیاب ہوتے ہیں مگر یہ چیز کسی طرح خوش آئند نہیں کیونکہ مختلف امور کو پیش نظر رکھا جائے تو ارزاں محنت ہی گراں ثابت ہوتی۔ لہٰذا آجروں کا عین مفاد اسی میں ہے کہ وہ مزدوروں کی کارکردگی کا خیال رکھیں کارکردگی اسی وقت اچھی ہو سکتی ہے جبکہ مزدوروں کو کم از کم معقول اجرتیں دی جائیں، معاشی استحصال کی کوشش نہ کی جائے، طبی سہولتیں فراہم کی جائیں، بیماریوں کے زمانے میں مناسب معاوضہ دیا جائے، بیکاری کے بیمے کا انتظام کیا جائے نیز تفریحی مشاغل کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

بعض بیدار مغز آجروں کے کارنامے شروع شروع میں ہندوستانی آجروں کو مزدوروں کے متعلق اپنے فرائض کا کوئی احساس ہی نہ تھا۔ اجرتیں ادا کرنے کے بعد انھیں مزدوروں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ گذشتہ جنگ عظیم کے بعد سے ان کے خیالات میں بتدریج ہوا فق تبدیلی شروع ہوئی۔ چنانچہ بعض بیدار مغز آجروں نے اپنے کارخانوں کے مزدوروں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے بہت مفید کام انجام دینا شروع کیا ہے۔

ٹاٹا کمپنی نے اپنے کارخانے کے مزدوروں کے لیے تعلیم کا انتظام کیا ہے جس سے بچوں کے علاوہ بڑے بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ اکثر بڑے کارخانہ داروں نے طبی امداد کا انتظام کیا ہے۔ ٹاٹا، بکنگھم اور کرناٹک ملز کی جانب سے تفریحی مشاغل کی سہولتیں بھی فراہم کی گئی ہیں۔ بعض کارخانہ داروں کی جانب سے سستے اناج کی دوکانیں کھولی گئی ہیں تاکہ مزدوروں کو ضروریات کی چیزیں کم قیمت پر مل سکیں۔ اناج کے علاوہ بعض جگہ سستے کپڑے کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ کانپور، ناگپور، احمد آباد اور مدراس میں مختلف کارخانہ داروں نے مزدوروں اور عملے والوں کے لیے مکانوں کی تعمیر کی ہے۔ مکانات رہائش کے لیے یا تو مفت دیے جاتے ہیں یا معمولی شرح سے کرایہ لیا جاتا ہے۔

ہندوستانی مزدوروں کی ترقی کے لیے کارخانہ داروں کا یہ اقدام ہر طرح مبارکباد کے قابل ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ دوسرے کارخانہ دار اس کی تقلید کریں۔ کیونکہ ہندوستان کا صنعتی مستقبل دیگر امور کے علاوہ بہت کچھ مزدوروں کی اصلاح و ترقی سے متعلق ہے۔ فقط

محمد ناصر علی

ہندوستانی معاشیات کے مبادی (بسلسلہ سابق)

چوتھا باب - صنعتی ترقی - عام سروے

صنعتی ترقی کے فوائد | اس زمانہ میں سب کا یہی مقصود ہے کہ ہندوستان ایک اہم صنعتی ملک بن جائے اس قسم کی ترقی سے ملک کو بہت سے فوائد کی توقع ہے۔

(۱) موزوں صنعتی ترقی سے آبادی مختلف پیشوں میں مناسب طور پر تقسیم ہو جائے گی اور معاشی نظام مستحکم بنیادوں پر قایم ہو جائیگا۔ مثال کے طور پر قلت بارش کی وجہ سے ہندوستان میں جو قحط پڑتا رہتا ہے اس سے صنعتی آبادی براہ راست متاثر نہیں ہوگی آبادی کا صرف وہی حصہ متاثر ہوگا جو زراعت میں مشغول ہے اور زرعی آبادی صنعتی ترقی کی وجہ سے بڑی حد تک گھٹ جائیگی۔

(۲) صنعت کی ترویج قوم کی دولت مندی میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے۔

(۳) عوام میں ادائی محصول کی بڑھتی ہوئی صلاحیت سے حکومت افادہ حاصل کریگی۔

(۴) صنعت و حرفت عوام میں مختلف النوع صلاحیتوں کے حصول کا موقع بہم پہونچاتی ہے اور ان میں جدت مستعدی اور ترقی کی امنگ پیدا کرتی ہے۔ ایک خالص زرعی ملک میں قدامت پرستی اور دماغی انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔

(۵) صنعت کی ترویج سے معشیت کے کئی جدید ذرائع مہیا ہو جاتے ہیں اور اس سے متوسط طبقہ کے مسئلہ بے روزگاری کو بڑی حد تک حل کیا جا سکتا ہے۔

(۶) اس سے لوگوں میں دولت جمع کر رکھنے کی بجائے پیدا آور اغراض میں سرمایہ لگانے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

(۷) اب تو یہ امر عام طور پر مسلم ہو چکا ہے کہ کسی ملک کی حربی کارکردگی میں صنعت کی ترویج کو بڑا دخل ہے۔

ہندوستان کی صنعتی تاریخ کی چند عہد آفریں خصوصیتیں | انیسویں صدی کی ابتدا تک ہندوستان زرعی اور صنعتی ملک بھی تھا

صنعتی انقلاب سے قبل یورپ کی جو حالت تھی وہی حالت ہندوستان کی بھی تھی جدید طرز پر پیمانہ [illegible] صنعت نہ تھی جو صنعتیں موجود تھیں ان کی نوعیت زیادہ تر گھریلو صنعتوں کی تھی۔ [illegible] صنعتی کاروبار میں مشغول تھا اور صنعتی ترقی اور ہنرمندی میں ہندوستان [illegible] مقابلہ کر سکتا تھا۔ فی الحقیقت ہندوستان کو صنعت و حرفت کے میدان میں بہت سے [illegible] فوقیت حاصل تھی۔ اس سے پہلے ان امور پر روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ کس طرح [illegible] نیچے اتر کر محض ایک زرعی ملک بن کر رہ گیا۔ یہ صورت حال [illegible] نہ تھی۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء اور ۱۹۰۱ء کے قحط کمیشنوں نے ہندوستان [illegible] پر زور دیا تاکہ ملک میں آئے دن جو قحط واقع ہوتے ہیں ان کا سدباب [illegible] جس کا ۱۹۰۵ء میں آغاز ہوا یہ سبق حاصل ہوا کہ جدید صنعت کے لئے [illegible] زیادہ مستحکم بنیادوں کی ضرورت ہے اور ایسی بنیاد مہیا کرنے کے لئے [illegible]

[illegible] صدی کے اختتام تک حکومت کی پالیسی ملک کی صنعت کے لئے معین و [illegible] صنعتی ترقی سے حکومت بے تعلق سی تھی اس پالیسی میں تبدیلی اس وقت [illegible] ۱۹۰۵ء میں محکمۂ تجارت و حرفت کا قیام عمل میں آیا لیکن [illegible] بہت جلد ایک بے عملی سی پیدا ہو گئی جبکہ ۱۹۱۰ء میں لارڈ مارلے [illegible] ذریعہ ملک کی صنعتی ترقی کے سلسلہ میں حکومت کی براہ راست [illegible] ہندوستانی ارباب اقتدار نے لارڈ مارلے کے حکم کی [illegible] کے احیاء کے لئے سودیشی تحریک کی بنا پر جو جوش عمل پیدا [illegible]

[illegible] نہ صرف معاشی بلکہ حربی اعتبار سے بھی ترویج صنعت کی [illegible] چنانچہ مانٹیگو چیمس فورڈ رپورٹ میں درج ہے کہ صنعتی اعتبار سے

ترقی یافتہ ملک کی پیداوار کو موجودہ زمانہ میں، گو بلحاظ مقدار نہ سہی لیکن بلحاظ نوعیت سامان حرب کے ساتھ اتنی قریبی مناسبت ہے کہ ہندوستان کے قدرتی ذرائع کی ترقی تقریباً فوجی ضرورت کا مسئلہ بن جاتا ہے"۔ صنعتی کمیشن نے جو ۱۹۱۶ء میں مقرر ہوا تھا ملک کی صنعتی ترقی میں حکومت کی جانب سے نمایاں امداد اور ملک کو اس خصوص میں خود مکتفی بنانے کی اہمیت پر زور دیا۔

۱۹۱۷ء میں ہندوستانی مجلس اسلحہ قایم کی گئی۔ جنگ کے کامیاب اختتام کی خاطر ہندوستانی معاشی ذرائع نگرانی اور ان کو ترقی دینا اس مجلس کا اصلی کام تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی کارخانوں میں سامان حرب کی فرمایشات اور اپنے ماہرانہ مشوروں سے ان کو معلومات فراہم کرکے یہ مجلس ہندوستانی صنعت کے ارتقاء کی موجب بنی۔

تامین اور حکومت کی امداد کی دوسری صورتیں

تامین | ہندوستانی صنعتوں کو جنگ کے زمانہ میں جو غیرمعمولی فروغ حاصل ہوا اس کی نوعیت یقیناً عارضی تھی جنگ کے بعد بیرونی مسابقت کا دوبارہ آغاز ہوا اور تامین کے مسئلہ کو بہت بڑی عملی اہمیت حاصل ہوگئی۔ ۱۹۲۱ء میں فسکل کمیشن قایم ہوا اس کمیشن نے امتیازی تامین کی پالیسی اختیار کرنے کی سفارش کی جسکے تعین کا اختیار ایک موزوں ٹیرف بورڈ کو حاصل ہو۔ یہ سفارشات منظور کرلی گئیں اور ۱۹۲۴ء میں ایک مستقل ٹیرف بورڈ قایم ہوا۔ حکومت کی ہدایت کے تحت اس بورڈ نے بہت سی ایسی صنعتوں کی جانچ پڑتال کی جو تامین کی مستحق ہیں۔ اس تحت لوہے، فولاد، کپاس، کاغذ، شکر، نمک، دیا سلائی اور دوسری صنعتوں کو تامین عطا کی گئی۔

امتیازی تامین کی اصطلاح اس امر کی جانب رہبری کرتی ہے کہ صنعتوں کے مابین اس نقطہ نظر سے فرق کیا جائے کہ کونسی صنعت کس ضروری امداد کے بغیر خودبخود ترقی کرسکتی ہے اور کونسی صنعت ضروری امداد مہیا ہونے پر ترقی کرسکتی ہے۔ یہ مسئلہ اصول معاشیات سے تعلق رکھتا ہے کہ کسی قوم کے مفاد کے پیش نظر کن حالات اور کس قسم کے تحفظات کی خاطر تامینی پالیسی اختیار کی جانی چاہیے۔ ہندوستان میں امتیازی تامین کا نفاذ ملکی حالات کے لحاظ سے ان ہی اصول کا ایک عملی انطباق ہے۔

دیگر لوازمات | ترقی پذیر اور مفید صنعتوں کو وجود میں لانے کے لئے محض تامین کافی نہیں ہے اس کے لئے جدید معاشی نظام زندگی کے بعض ناگزیر لوازمات کی نشو ونما بھی ضروری ہے مثلاً بنک کاری کی مستحکم تنظیم، ترقی یافتہ نظام حمل ونقل، ریلوے اور جہاز رانی کا ہمدردانہ طریق عمل، مارکٹنگ کی موثر تنظیم تجارتی اور صنعتی خبر رسانی کا موزوں نظام وغیرہ۔ صنعتی ترقی کے لئے دیگر امور کے علاوہ اس کی بھی سخت ضرورت ہے کہ لوگ اس کی جانب تحقیقی طور پر راغب ہوں اور اس مقصد کے حصول میں ناگزیر تکالیف برداشت کرکے اپنے خلوص کا اظہار کریں۔ اس جانب بے حسی بہت کم، خود اعتمادی اور اولوالعزمی بہت زیادہ ہونی چاہئیے۔ موجودہ زمانہ میں ان صفات کے فقدان کی ذمہ داری بڑی حد تک ہمارے ناقص طریقہ تعلیم پر ہے جو ناقص علمی ہونے کی وجہ ہم کو زندگی کے عملی حقایق سے بے بہرہ رکھتا ہے صنعتی ترقی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ فنی اور تجارتی ادارے اور کلیات بڑی تعداد میں قایم کئے جائیں تاکہ کاروباری ذہنیت رکھنے والے اشخاص کو موقع ملے کہ وہ اپنی استعداد کو ترقی دے سکیں۔ تحقیقاتی کام کی تنظیم بھی ایک دوسرا اہم مسئلہ ہے جو خاص توجہ کا محتاج ہے۔

ہندوستانی صنعتوں کی ترقی کے لئے حکومت کی سرپرستی بہت ہی اہم محرک ثابت ہوگی اس خصوص میں مستقل طور پر تدریجی ترقی ہو رہی ہے چنانچہ اس مقصد کے پیش رفت میں ایک خاص سررشتہ موسوم بہ "انڈین اسٹور ڈپارٹمنٹ" قایم کیا گیا ہے تاکہ منجانب حکومت ملکی مصنوعات کو خریداران کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ چنانچہ سالانہ تین کروڑ روپے اس سررشتہ کے توسط سے ہندوستانی مصنوعات خریدنے پر صرف کئے جاتے ہیں۔ صنعتی کمیشن کی سفارش پر صوبہ جاتی صنعت وحرفت کے سررشتے قایم کئے گئے ہیں جن کا مقصد یہ بھی ہے کہ فنی اور صنعتی تعلیم کو فروغ دیا جائے صنعتی معلومات اور مالی امداد کی فراہمی بھی ان کے فرائض میں شامل ہے۔ صنعت وحرفت کی امداد کیلئے خاص قوانین بھی منظور ہوئے ہیں مثلاً پنجاب کا قانون قرضہ ہائے صنعتی تاکہ مستحق خانگی صنعتی اداروں کو مالی امداد منظور کی جائے۔ بہرحال ان قوانین سے پیمانہ کبیر کی صنعتوں کی بجائے گھریلو صنعتوں کو زیادہ امداد پہونچ رہی ہے۔ ۱۹۲۷ء میں صوبہ متحدہ اور بنگال میں حکومتی امدادی قرضہ کی اسکیم کا نفاذ

عمل میں آیا۔

جس طرح گذشتہ جنگ عظیم کے دوران میں صنعتی ترقی کے لئے ایک نیا میدان نکل آیا تھا اسی طرح اس جنگ میں بھی صنعتی ترقی کے بہت کچھ امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ بلاکسی تامینی مسلک کے تمام صنعتی اشیاء کی درآمد بند ہو گئی ہے۔ اور حکومت نے اس کا اطمینان دلایا ہے کہ وہ آیندہ بھی ہندوستانی صنعتی ترقی کے لئے کوشاں رہے گی۔ ایک بورڈ آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کا قیام عمل میں آیا ہے اور اسی کے ساتھ ایک انڈسٹریل ریسرچ فنڈ بھی قایم کیا گیا ہے اس بورڈ کا کام یہ ہے کہ حکومت کو مشورہ دیں کہ کن نقاط پر صنعتی ترقی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔

۱۹۳۹ء میں چیٹ فیلڈ کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اور اس نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان بھی عصری فوج کے تمام متعلقہ ساز و سامان کو فراہم کرے۔ اور یہ تمام سامان جنگ ہندوستان ہی میں تیار کئے جائیں۔

۱۹۴۰ء میں حکومت برطانیہ نے ایسٹرن گروپ قائم کیا تاکہ حکومت برطانیہ کو مشرقی ماتحت ممالک زیادہ تعداد میں صنعتی اشیاء فراہم کر سکیں۔ راجر مشن نے بھی حال ہی میں ہندوستانی کارخانوں کا معائنہ کیا اور ان کی امداد و ترقی کے لئے اپنی رائے پیش کر دی ہے۔

۱۹۴۲ء میں ٹکنیکل مشن امریکہ سے ہندوستان آیا اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ ہندوستان کو مشنری اور کلیدی صنعتوں کے قیام کے لئے جن جن لوازمات کی ضرورت ہو روانہ کریگا۔

جنگی اغراض کی خاطر سامان فراہم کرنے کے لئے حکومت ہند نے ایک مجلس "وار سپلائی بورڈ" کے نام سے قایم کی ہے۔

<u>سرکار عالی اور صنعتی ترقی</u> سب سے پہلے سر سالار جنگ اول نے مصنوعات ملک کو ترقی دینے کی کوشش شروع کی۔ چنانچہ ۱۸۵۶ء میں ملکی مصنوعات کی ایک نمائش بمقام چادر گھاٹ بلدہ حیدرآباد منعقد کی گئی۔ اگرچہ کہ اس زمانہ میں بیرونی صنعتوں سے ملکی صنعتیں کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوئیں تھیں۔ ریل اور عمدہ سڑکوں کے زیادہ نہ ہونے سے بیرونی مال زیادہ مقدار میں نہ آتا تھا تمام وغیرہ کاری میں

[illegible] ملک کا بنا ہوا سامان ہی مستعمل ہوتا تھا۔ اہل ملک کا [illegible] سامان استعمال کرنے کی چنداں ضرورت نہ ہوتی تھی۔

[illegible] قایم کیا گیا۔ اس کارخانہ میں لوہے اور پیتل ڈھالنے [illegible] سالار جنگ نے یہ قاعدہ بھی جاری [illegible] تو اس کا حق ایجاد محفوظ رکھا جائے گا۔

[illegible] کی پالیسی کی وجہ سے ممالک غیر کی مصنوعات دکن میں [illegible] محصول محترفہ موقوف کردیا اور بذریعہ [illegible] کوشش کریں اور ہر سال مصنوعات کی ترقی [illegible] محصول تھا جو تمام صناعوں سے وصول [illegible] ہوا کرتی تھی اگر محصول محترفہ سے [illegible]

[illegible] وزارت تفویض کی گئی۔ انہوں نے لسمریت [illegible] کوئی شخص [illegible] کرسکتا تھا۔ اس معافی کی [illegible] ترقی ہونے لگی [illegible] ملک کا طرز تمدن بدل گیا۔ امرائے [illegible] کیا جانے لگا۔ ایک [illegible] درباری تقاریب میں [illegible] کا اثر ملکی صنعت و حرفت پر نامناسب ہوا اور وہ تباہ ہوگئی۔

عماد السلطنت [illegible] آسمان جاہ وزارت عظمی پر فائز ہوئے۔ عثمان وزارت کو ہاتھ میں لیکر انہوں نے جو [illegible] زراعت و تجارت کو جو ملک کی دولت کے [illegible] میں ترقی [illegible] صنعت و حرفت کو جس میں اب [illegible]

انحطاط نظر آتا ہے سنبھالنا" انہوں نے برطانوی ہند کے اصول پر سررشتۂ زراعت وتجارت بھی قایم کیا جس کے ذمہ صنعت وحرفت کا کام بھی تفویض کیا گیا۔ ورنگل میں ایک مدرسہ صنعت و حرفت قایم کیا گیا جو مملکت آصفیہ میں اپنی طرز کا پہلا مدرسہ تھا۔

سر آسمان جاہ کی سبکدوشی کے بعد سر وقار الامرا وزیر اعظم بنائے گئے۔ ان کے دور میں چار صوبوں میں چار صدر مجلس بنائے گئے اور ان میں صنعت وحرفت کا کام سکھایا جانے لگا۔ اس زمانہ میں قحط اور طاعون کے مسلسل حملے ہوتے رہے جسکی وجہ سے حکومت کی مالی حالت کمزور ہوگئی تھی اور تمام اصلاحی تجویزیں ملتوی کردی گئیں چنانچہ سررشتہ زراعت وتجارت وحرفت کو تخفیف کردیا گیا اور اس سررشتہ کا مفوضہ کام معتمدی مالگذاری کے تفویض ہوا۔ مختلف میلوں اور عرسوں میں جو رقم مصنوعات ملکی کی ترقی پر صرف کی جاتی تھی موقوف کردی گئی۔

اس کے بعد مہاراجہ سرکشن پرشاد مدار المہام مقرر ہوئے ۱۹۰۵ء میں لوکل فنڈ کے مصارف سے ایک نمائش مصنوعات وپیداوار بمقام باغ عام کھولی گئی۔ اورنگ آباد اور نظام آباد میں صنعت و حرفت کے مدارس قایم کئے گئے۔ بیدر میں بیدری مصنوعات اور تااین پیٹ میں پارچہ بافی کا ایک چھوٹا مدرسہ لوکل فنڈ کے مصارف سے کھولا گیا۔ مذکورہ بالا چار مدارس کے ماسوا ایک اور نیم سرکاری ادارہ وکٹوریہ میموریل آرفنج کے نام سے سرورنگر میں ۱۹۰۵ء میں گراں تر مصارف سے کھولا گیا۔ مدارس صنعت وحرفت قایم کرنے سے سرکار عالی کا یہ منشا تھا کہ اہل حرفہ کی اولاد وہ تعلیم کے ساتھ پیشوں اور حرفتوں کی تعلیم بھی حاصل کرے اور ایسی تعلیم دی جائے کہ زمانہ حال کی ترقیات اور سائنس سے استفادہ کیا جاسکے لیکن یہ مقصد پورا نہ ہوسکا۔

۱۹۰۵ء میں ممالک محروسہ کی مصنوعات پر سے محصول برآمد معاف کردیا گیا۔ اس محصول کی سالانہ مقدار تقریباً ایک لاکھ روپے ہوتی تھی۔ ۱۹۱۱ء میں سررشتہ برقی کا قیام عمل میں آیا۔

۱۹۱۶ء میں مشیروں کی ایک مجلس جس کے ۹ رکن تھے۔ چار سرکاری اور پانچ غیر سرکاری ترقی صنعت وحرفت کے معاملات میں سرکار کو مشورہ دینے کے لئے قائم ہوئی۔

۱۹۱۰ء کے اوائل میں ایک جدید سررشتۂ تجارت و حرفت قایم ہوا تاکہ مملکت کی قدیم صنعتوں کی تجدید اور ان کی امداد نیز جدید صنعتوں کو ترقی دی جائے۔ اس زمانہ میں سرکار عالی نے اس امر کو تسلیم کیا کہ بعض صورتوں میں سرکار کا خود کارخانے جاری کرنا ضروری ہے۔ خصوصاً ایسی صنعتوں میں جو دوسروں کے لئے رہنمائی کا کام دیتی ہیں تاکہ جن لوگوں کو اس سے دلچسپی ہے ان پر یہ ثابت کیا جائے کہ ان صنعتوں میں کیا امکانات ہیں۔ چونکہ مملکت آصفیہ میں روغنی تخم کثیر مقدار میں پیدا ہوتے ہیں اس لئے ۱۹۱۰ء میں صابن سازی کا کارخانہ قایم کیا گیا لیکن اس کے بعد یہ مناسب تصور کیا گیا کہ سرکاری کارخانہ صابن سازی کسی تاجر یہ کمپنی کے حوالہ کر دیا جائے۔ بہر حال ۱۹۲۰ء میں یہ کارخانہ بند کر دیا گیا۔

سررشتۂ تجارت و حرفت قایم کرنے کے چند ماہ قبل ایک کیمیائی تجربہ خانہ قایم کیا گیا اور پانچ کیمسٹ منتخب کرکے بنگلور بھیجے گئے تاکہ وہاں کے انڈین انسٹیٹوٹ آف سائنس میں تعلیم حاصل کرسکیں۔ بنگلور میں انہوں نے جو تحقیقات شروع کی اس کا سلسلہ حیدرآباد واپس آکر جاری رکھا۔

انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ ۱۹۲۰ء میں ایک کروڑ روپے کے سرمایہ سے قائم کیا گیا۔ اب یہ فنڈ ممالک محروسہ کی صنعتی ترقی میں بہت مدد و معاون ثابت ہو رہا ہے۔ چھوٹی بڑی دونوں قسم کی صنعتیں اس سرمایہ سے مستفید ہوتی ہیں۔ اس کا کچھ حصہ مقامی بڑی صنعتوں کے حصص خریدنے میں صرف کیا جاتا ہے اور اس سے جو منافع حاصل ہوتا ہے اس سے چھوٹی صنعتوں کی مالی امداد کی جاتی ہے صنعتی تعلیم حاصل کرنے کے لئے طلباء کو وظائف دئے جاتے ہیں۔ صنعتی نمائشوں اور دوسری ایسی سرگرمیوں میں حصہ لیا جاتا ہے۔ جن سے کہ ممالک محروسہ کی صنعتی ترقی میں امداد ملے۔ اس آمدنی کا کچھ حصہ تحقیقی کاموں پر بھی صرف کیا جاتا ہے۔ سررشتۂ تجارت و حرفت کی کارگزاری کو صنعتی تجربہ خانہ اور صنعتی انجنیری کے شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

صنعتی تجربہ خانہ میں اشیاء کے تجزیئے اور تحقیق کا کام انجام پاتا ہے۔ مختلف سرکاری سررشتوں اور عوام کی طرف سے وصول شدہ نمونوں کا تجزیہ کیا جاتا ہے صنعتی مسائل کی دریافت اور تحقیق کے تحت

یہ تجربہ خانہ مختلف صنعتوں پر کام کرتا ہے اس کے علاوہ ہندوستانی صنعتی تحقیقاتی مجلس کے ساتھ اشتراک عمل کیا جاتا ہے۔

صنعتی انجنیری کی جانب سے ایسے کارخانوں کی نگرانی کی جاتی ہے جن کو انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کی گنجایش سے قرضے دیئے جاتے ہیں۔ کارخانوں کے نقشے تیار کئے جاتے ہیں اور مختلف کارخانوں کی طرف سے جو نقشے پیش کئے جاتے ہیں ان میں ترمیمات کی جاتی ہیں۔

حکومت کی مقرر کردہ وار سپلائی اڈوائزری کمیٹی ممالک محروسہ سرکار عالی میں مختلف نئی صنعتوں کی تحقیقات اور ان کے قیام کا کام انجام دے رہی ہے۔ جنگ کے چھڑ جانے اور جنگی اغراض کی تکمیل کے لئے ملکی صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے حکومت صناعوں کی جو امداد کر رہی ہے اس سے ان کی کافی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ وار سپلائی اڈوائزری کمیٹی کے سفارشات کے بموجب حکومت نے لوہے، فولاد، نشاستہ کے حاصلات، سلفیورک ترشے، گیس اور ڈھلوائی وغیرہ کی صنعتوں کے قیام کی اجازت دی ہے۔ حکومت نے حسب ذیل صنعتی اداروں کے قیام کی اجازت بھی دی ہے جو اپنا کام جاری کر چکے ہیں۔

(۱) حیدرآباد ویجیٹیبل پراڈکٹس اینڈ کمپنی (۲) حیدرآباد رولر فلور ملز (۳) حیدرآباد کمیکل اینڈ فارموسٹیکل ورکس (۴) حیدرآباد ڈریسنگ ورکس (۵) حیدرآباد اسٹارچ پراڈکٹس (۶) حیدرآباد سوپ اینڈ آئیل ورکس (۷) حیدرآباد آئیل اینڈ پینٹ کمپنی (۸) پرفیومری اینڈ کاسمٹکس ورکس (۹) حیدرآباد ڈینٹل انڈسٹریز۔

صنعتی ٹرسٹ فنڈ نے ایک لاکھ ۱۰ ہزار روپیہ کی رقم جنگی رسد کے لئے بلانکٹ تیار کرنے کے واسطے منظور کی۔

۱۳۔۱۹۴۰ء میں حکومت ہند کے سررشتہ رسد کو آٹھ ہزار آٹھ سو بلانکٹس روانہ کی گئیں اور حیدرآبادی افواج کو دو ہزار تین سو بلانکٹس دی گئیں۔

فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم | ۱۳۔۱۹۴۰ء میں حکومت سرکار عالی نے فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی اشاعت و توسیع کے لئے پانچ لاکھ روپے کی منوالی اور نو لاکھ روپیوں کی غیر متوالی رقم سررشتہ تعلیمات کی

بجٹ سے منظور کی۔ اس کے علاوہ مرکزی مدرسہ فنون لطیفہ و دستکاری، مدرسہ صنعت و حرفت نسواں اور مدرسۂ تحصیل مشینیت و ملازمت کا قیام بھی عمل میں آیا۔

ہندوستانی صنعتیں

ہندوستان میں صنعتی ترقی | ہندوستانی صنعتیں دو شعبوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

(۱) گھریلو صنعتیں جو کاریگروں کے مکانات میں بنائی جاتی ہیں۔

(۲) جدید طرز کی منظم صنعتیں جو کارخانوں اور ورکشاپ میں تیار کی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے یہاں ان ہی سے بحث کی جائے گی جسکی ابتدا ان اہم جدید صنعتوں کی تفصیلات سے ہوگی جو ہندوستان میں نشو و نما پا رہی ہیں۔

مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ہندوستان کی صنعتی ترقی پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۹۳۹ء میں کارخانوں اور ان میں کام کرنے والوں کی جملہ تعداد علی الترتیب ۹ ہزار چار سو ۲۲ اور ۱۹ لاکھ ۴۰ ہزار چار سو سات تھی۔ ۱۵-۱۹۱۴ء میں مشترک سرمایہ دار کمپنیوں کی تعداد دو ہزار پانچ سو ۴۵ تھی اور ان کا ادا شدہ سرمایہ ۸۰ کروڑ روپے تھا جس کے بالمقابل ۳۸-۱۹۳۷ء میں ہندوستان میں رجسٹر شدہ کمپنیوں کی کل تعداد دس ہزار ۶ سو ۵۷ اور ان کا ادا شدہ سرمایہ ۲۷۹ کروڑ روپے تھا۔ ۱۵-۱۹۱۴ء میں بیرون ہند رجسٹر شدہ لیکن اندرون ہند کام کرنے والی کمپنیوں کی جملہ تعداد پانچ سو ستر تھی اور ادا شدہ سرمایہ دو سو ۹۰ ملین پونڈ تھا جس کے بالمقابل ۳۴-۱۹۳۳ء میں ایسی کمپنیوں کی تعداد ۹ سو ستر اور ان کا ادا شدہ سرمایہ ۷۰۶ ملین پونڈ تھا۔

مندرجۂ بالا اعداد سے صنعتی ترقی کا پتہ چلتا ہے لیکن قومی معاشی نظام میں منظم صنعتوں کا حصہ بہت کم ہے۔ ملک میں پیمانہ کبیر کی منظم صنعتیں بہت ہی قلیل ہیں۔ صرف جوٹ اور کپاس کی مصنوعات اور لوہے اور فولاد کے چند کارخانے قایم ہیں ملک کی آبادی کا صرف دو فی صدی حصہ جدید صنعتوں میں مصروف ہے۔ ۱۹۳۹ء کی جنگ کے بعد سے اس میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔

مملکت آصفیہ میں ۴۱-۱۹۴۰ء میں رجسٹر شدہ کارخانوں کی تعداد ۶۲۹ تھی جو صنعتوں میں

روزانہ سینتالیس ہزار دو سو انیس آدمی مامور بہ کار تھے۔ کاتنے اور بننے کے کارخانوں اور دوسری صنعتوں میں کام کرنے والے بچوں کی روزانہ اوسط تعداد ۴۱-۱۹۴۰ء میں علی الترتیب ۳۷۱ اور ۸۶۹ تھی۔ رجسٹر شدہ کارخانوں میں بارہ ہزار ایک سو بہتر عورتیں ملازم تھیں جن میں سے ۱۹۰۴ کاتنے اور بننے کے کارخانوں میں مامور تھیں۔

ایک سرسری اندازہ کے مطابق ممالک محروسہ سرکار عالی کی بر پیمانہ کبیر کی صنعتوں میں دس کروڑ کے قریب سرمایہ مشغول ہے جس میں معتدبہ حصہ سرکار عالی کی امداد پر مشتمل ہے۔ بیرونی رجسٹر شدہ کمپنیوں کا سرمایہ اس وقت ممالک محروسہ سرکار عالی میں مشغول ہے اس کے متعلق کوئی صحیح مواد دستیاب نہ ہو سکا لیکن ایک عام تخمینہ کے مطابق بیرونی سرمایہ کی مقدار چار کروڑ سے کچھ زائد نہیں معلوم ہوتی۔

کپاس کی صنعت | پیمانہ کبیر کی صنعتوں میں جو ہندوستانیوں کی ملک اور ان کے زیر انتظام ہیں کپاس کی صنعت کو اولیت حاصل ہے۔ انیسویں صدی کے اوسط میں سب سے پہلے بمبئی میں اس صنعت کا آغاز ہوا۔ اور آج تک بھی بمبئی اس کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ موجودہ زمانہ میں احمدآباد، شولاپور اور ناگپور اس صنعت میں تیزی کے ساتھ ترقی کر چکے ہیں۔ یہ شہر کپاس پیدا کرنے والے خطوں کے وسط میں واقع ہیں۔ اور ان کو شمالی علاقوں میں آسانی کے ساتھ بازار مہیا ہونے کے علاوہ مزدور بھی بکثرت مہیا ہو جاتے ہیں۔ موجودہ صدی کی ابتدا تک یہ صنعت صرف کتائی کی حد تک محدود تھی لیکن جب ہندوستانی دھاگے کے لئے چین کا بازار مسدود ہو گیا تو بنائی کی صنعت کو بہت ترقی ہوئی۔ حالیہ رجحان یہ ہے کہ نہایت باریک تاگہ کی ساخت کو فروغ دیا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے لانبے ریشے کی کپاس کثیر مقدار میں ممالک متحدہ امریکہ، مشرقی افریقہ اور دوسرے مقامات سے ہندوستان میں درآمد کی جاتی رہی۔ ان تمام رکاوٹوں کے باوجود جو قحط، پلیگ، بیرونی مسابقت، شرح مبادلہ کے تغیرات اور کپاس کی اعلیٰ قیمتوں کی صورت میں رونما ہوئیں صنعت کپاس کی ترقی میں توسیع ہوتی رہی۔ جنگ عظیم (۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء) کی وجہ سے اس صنعت کو بہت فائدہ پہنچا کیونکہ بیرونی درآمد بہت گھٹ گئی تھی۔ حکومت نے بھی نوتی

اغراض کے مدنظر اس صنعت کی سرپرستی کی۔ سودیشی تحریک بھی مدد و معاون ثابت ہوئی۔ لیکن عام تجارتی کساد بازاری اور ہندوستانی بازاروں میں جاپان کی مسابقت کے باعث یہ صنعت متاثر ہوئی۔ جاپان نے ہندوستانی برآمد کو نہ صرف اپنے ملک اور چین سے خارج کر دیا بلکہ ہندوستانی بازار پر بھی اپنے ارزاں سوت اور پارچہ کی درآمد کے ذریعہ قبضہ جما لیا۔ بہرحال اس تحفظ کے باعث جو ۱۹۲۷ء سے تامین کی صورت میں اسے حاصل ہے ہندوستانی صنعت اس قابل ہوئی کہ ان مشکلات پر غالب آسکے ۳۴-۱۹۳۳ء کے ہندوستانی جاپانی تجارتی معاہدے کے بعد سے جس کی ۱۹۳۰ء میں تجدید عمل میں آئی جاپانی مسابقت پر قابو حاصل کیا گیا۔ اس کی رو سے جاپانی سوتی پارچہ کی ہندوستان میں سالانہ ۲۸ کروڑ ۳۰ لاکھ گز کی مقدار تک درآمد ہو سکتی تھی بشرطیکہ جاپان ہندوستان سے سالانہ دس لاکھ روئی کی گانٹھ خریدے ۱۹۳۹ء میں ہندوستان میں سوتی کارخانوں کی تعداد ۳۸۹ اور ان میں کام کرنے والے اشخاص کی تعداد ۴ لاکھ ۴۱ ہزار تھی اس کے بالمقابل ۱۹۱۴ء میں کارخانوں کی تعداد ۲۰۱ اور مزدور ۲ لاکھ ۶۰ ہزار تھے۔ ۱۹۰۰ء میں کارخانوں کی تعداد ۱۹۳ اور مزدوروں کی تعداد ایک لاکھ ۶۱ ہزار تھی ۱۸۷۷ء میں تو صرف ۱۹ کارخانے تھے۔ ۴۰-۱۹۳۹ء میں کارخانوں میں ۴۲۶ کروڑ ۹۰ لاکھ گز پارچہ تیار ہوا ۱۴۶ کروڑ ۰۰ لاکھ گز کی درآمد ہوئی۔ اس کے بالمقابل ۰۵-۱۹۰۴ء میں ۶۷ کروڑ ۸۰ لاکھ گز پارچہ تیار ہوا ۲۲۰ کروڑ ۰۰ لاکھ گز کی درآمد ہوئی۔ اس کے بعد سے بیرونی درآمد بہت گھٹ گئی۔ ہندوستان میں جو پارچہ استعمال کیا جاتا ہے اس کا تقریباً دو تہائی حصہ دستی کرگھوں پر تیار کیا جاتا ہے اور اب ملکی پارچہ بننے کے کارخانوں میں تیار ہوتا ہے بڑی حد تک کپڑے کی مقامی طلب کو پورا کر رہا ہے ۱۹۲۵ء میں ٹیرف بورڈ کی سفارش پر انگلستانی کی درآمد پر محصول ۲۵ فی صدی سے ۲۰ فی صدی تک گھٹا دیا گیا ۱۹۳۹ء میں ہندوستانی برطانوی تجارتی معاہدے کے تحت مزید تخفیف کی گئی ہے۔ سوتی کارخانوں کی ترقی کے لئے تامین کے علاوہ اندرونی اصلاحات کی بھی ضرورت ہے۔

حیدرآباد کی صنعت پارچہ بافی | ایک صدی پیشتر تک ممالک آصفیہ میں بنے ہوئے پارچوں کی شہرت دور

دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ سیاحان یورپ ان کی تعریف میں رطب اللساں تھے۔ گذشتہ دور کی پارچہ بافی کی صنعت کا اندازہ ان پرانے اسباب کے ذخیروں سے ہوسکتا ہے جو ابھی تک امرائے عظام کے محلات میں موجود ہیں۔

یورپ کے صنعتی انقلاب نے ہندوستان کی پارچہ بافی کی صنعت کو تباہ کردیا تو اس کے اثر سے دکن بھی محفوظ نہیں رہ سکا۔ لاکھوں خوش حال جلاہے بے روزگار ہوگئے اور زراعت کو اپنا پیشہ بنالیا۔

مملکت آصفیہ میں انیسویں صدی کے اواخر پر، اورنگ آباد اور گلبرگہ میں ایک ایک پارچہ بافی کا کارخانہ قایم ہوا۔ محبوب شاہی ملز گلبرگہ کا سنگ بنیاد حضرت غفران مکان نے رکھا۔ مملکت میں واڑی ریلوے لائن اور ممناڑ حیدرآباد ریلوے لائن کے ساتھ ہی کپاس کی کاشت میں بڑی ترقی ہوگئی۔ اس لئے بعض تاجروں نے پارچہ بافی کے کارخانوں کی بجائے روئی دابنے اور گٹھے بنانے کے کارخانے قایم کردیئے۔ جس قدر سرمایہ ان روئی کے دابنے والے کارخانوں میں لگایا گیا اس سے چند پارچہ بافی کے کارخانے قایم ہوجاتے تو اس سے اہل ملک کو بہت فائدہ پہنچتا

اس وقت مملکت آصفیہ میں پارچہ بافی کے حسب ذیل بڑے کارخانے قایم ہیں

(۱) اورنگ آباد ملز (۲) محبوب شاہی ملز گلبرگہ (۳) عثمان شاہی ملز ناندیڑ (۴) اعظم جاہی ملز ورنگل (۵) حیدرآباد اسپننگ اینڈ ویونگ ملز (۶) رام گوپال ملز سکندرآباد

۱۹۲۰ء میں کپاس کی کاشت اور اس کے نقل و حمل پر بعض پابندیاں عائد کی گئیں۔

۴۱-۱۹۴۰ء میں ان کارخانوں میں ۲ کروڑ ۵۱ لاکھ پونڈ سوت تیار ہوا اور مختلف قسم کا ۲ کروڑ ۷۰ لاکھ گز کپڑا بنایا گیا۔ جنگی اغراض کے سلسلہ میں ان کارخانوں نے پارچہ کی سربراہی کے بڑے آرڈر لے رکھے ہیں۔

چند چھوٹے کارخانے مثلاً بی۔ ڈبلیو ملز، ایم ایس ملز، جیون نگر ننگ ورکس، بشیر سلک فیاکٹری اور کارخانہ ہمرو کمخواب اورنگ آباد بھی کافی ترقی حاصل کر رہے ہیں۔ عالیہ جنگ کی وجہ سے

بقیہ حاشیہ: سرکار عالی کی جانب سے معیاری پارچہ کی
پارچہ کی قیمتیں بڑھتی چلی جا رہی ہیں اس لئے سرکار عالی کی جانب سے معیاری پارچہ کی دوکانیں قایم کی گئی ہیں تاکہ غربا کو ارزاں پارچہ میسر آسکے نگرانی پارچہ پر اس کے لئے کمشنر پارچہ کا تقرر عمل میں آیا ہے۔

جوٹ کی صنعت ہندوستان میں پیمانہ کبیر کی دوسری ترقی یافتہ صنعت جوٹ ہے جو بنگال میں ۱۸۵۵ء میں وجود میں آئی اور پہلا کارخانہ سیسرام پور میں قایم ہوا۔ ابتدائی ۳۰ سال کے دوران میں اس کی رفتار ترقی سست رہی۔ جوٹ کی مصنوعات اور ان کی برآمدنا قابل لحاظ تھی گذشتہ جنگ کے زمانہ میں اس صنعت کو نمایاں توسیع ہوئی اور عروج حاصل ہوا کیونکہ مختلف محاذ ہائے جنگ کی خندقوں میں تھیلے فراہم کرنے کی ضرورت ہوئی۔ ایک عرصہ تک ڈنڈی جو اسکاٹ لینڈ میں واقع ہے جوٹ کی صنعت کا خاص مرکز تھا۔ اب کلکتہ جوٹ کی مصنوعات اور ان کی تجارت کا اہم مقام بن گیا ہے۔

۳۸-۱۹۳۷ء میں جوٹ کے کارخانوں کی تعداد ایک سو پانچ تھی اور ان میں تین لاکھ آٹھ ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ اس کے بالمقابل ۸۰-۱۸۷۹ء تا ۸۴-۱۸۸۳ء میں کارخانوں کی تعداد ۲۱ تھی اور ان میں کام کرنے والے مزدور ۳۰ ہزار ۸ سو تھے۔

جوٹ کی صنعت کو ترقی کے مقابلہ میں بعض حیثیتوں سے ترجیح حاصل ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ہندوستان کو جوٹ کا اجارہ حاصل ہے اور وہ منظم بھی ہے۔ سوتی صنعت کے برخلاف جوٹ کی صنعت کے نظام میں بہت زیادہ مرکزیت پیدا کر دی گئی ہے۔ چنانچہ کلکتہ سے چالیس میل کے رقبہ کے اندر نوّے کارخانے قایم ہیں لیکن اس صنعت کی نگرانی اور مالیہ یوروپین سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ہے۔

جوٹ کی صنعت کساد بازاری کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ یہی وجہ ہے کہ جوٹ ملز اسوسیئیشن نے اس کی رسد کو محدود کر دیا۔ حالیہ زمانہ میں جوٹ کی صنعت نے نمایاں [illegible] کے تحت [illegible] میں زیادہ ترقی ہوئی ہے ۳۹-۱۹۳۸ء میں ہندوستانی مصنوعات کی برآمد [illegible] کی جانب [illegible]

۲۶ لاکھ روپے تھی۔

لوہے اور فولاد کی صنعت | یہ ایک کلیدی صنعت ہے جس کو بڑی قومی اہمیت حاصل ہے۔ حالیہ دور ہی میں اس صنعت نے ترقی حاصل کی۔ بارا کار آئرن ورکس ۱۸۷۴ء میں بنگال کے جھاریہ کے کوئلہ کے معدنی علاقہ کے قریب قایم ہوا۔ اس کارخانے کو ہندوستان میں ایک کامیاب اولیت کا امتیاز حاصل ہوا تھا جسکو ۱۸۸۹ء میں بنگال اسٹیل اور آئرن کمپنی میں ضم کرلیا گیا۔ اس صنعت کی تاریخ کا دوسرا اہم دور اس زمانہ سے شروع ہوتا ہے جبکہ ٹاٹا اسٹیل اینڈ آئرن کمپنی کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۰۷ء میں یہ کارخانہ بمقام ساکچی قایم ہوا اور ۱۹۱۱ء میں کام کا آغاز ہوا۔ حکومت کی زمانۂ جنگ کی ضروریات اس کی مزید ترقی کا باعث ہوئیں ۱۹۲۴ء میں اس صنعت کی توسیع کی ایک بڑی اسکیم مکمل ہوئی۔ اس سال ٹیرف بورڈ کی سفارش پر لوہے اور فولاد کی صنعت کو بیرونی سابقت سے تحفظ کے لئے تامین منظور ہوئی ۱۹۲۷ء اور ۱۹۳۴ء میں پھر اس کی تجدید عمل میں آئی جسکی بدولت اس صنعت نے نمایاں ترقی حاصل کی۔ جہاں تک خام لوہے کا تعلق ہے ہندوستان خود مکتفی ہوچکا ہے۔ خام لوہے کی پیداوار بیسویں صدی کی ابتدا میں ۳۵ ہزار ٹن تھی جو ۳۹ - ۱۹۳۸ء میں بڑھکر ۱۶ لاکھ ۴۴ ہزار ٹن ہوگئی۔ فولاد کی پیداوار میں بھی قابل لحاظ اضافہ ہوا۔ چنانچہ ۱۷ - ۱۹۱۶ء کے ایک لاکھ ۳۹ ہزار ٹن کے مقابلہ میں ۳۹ - ۱۹۳۸ء میں تیار شدہ لوہے کی مقدار ۷ لاکھ ۲۶ ہزار ٹن ہوئی۔ لوہے اور فولاد کی بڑی مصنوعات اب بھی بہر حال کافی مقدار میں درآمد ہوتی ہیں۔ ساکچی (جس کا نام جمشید پور رکھا گیا) متعلقہ صنعتوں کا مرکز بن گیا ہے مثلاً ٹن کی چادریں، تار اور کیلے، ریل کے ڈبے، ولایتی کیمیائی مرکبات اور دوسری صنعتیں کوئلہ کی معدنوں کے قریب بکثرت خام لوہے کے ذخائر کی موجودگی دیگر خام پیداواروں کی مناسب فراہمی اور اندرون ملک بازار مہیا ہو جانے کے باعث اس صنعت کا مستقبل بہت روشن ہو گیا ہے۔ خصوصاً موجودہ جنگ کی وجہ سے اس صنعت کو تیزی کے ساتھ ترقی نصیب ہو رہی ہے۔

محمد عبدالمتین

حیدرآباد میں لوہے اور فولاد کی صنعت | ممالک محروسہ کے ہر ایک گاؤں میں قدیم سے لوہار موجود ہیں جو زرعی آلات، تعمیراتی ساز و سامان اور اشیائے خانہ داری تیار کیا کرتے ہیں۔ ملک میں عمدہ کاریگر اب بھی موجود ہیں۔ قدیم زمانہ سے ممالک محروسہ میں لوہے کے معادن کی وجہ سے بہت سے مقامات پر فولادی اشیاء تیار کئے جاتے تھے۔ قدیم دمشقی تلواریں جن کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے وہ دکن کے فولاد ہی سے بنائی جاتی تھیں، فولاد سے تلوار بندوق، چاقو، قینچی، سروتے اور تار تیار ہوا کرتے تھے قدیم زمانہ کی بنی ہوئی بڑی بڑی توپیں جو مملکت کے ویران قلعوں میں رکھی ہوئی ہیں اب بھی دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کر دیتی ہیں۔ ضلع بیڑ میں گپتیاں بنائی جاتی ہیں۔ ضلع عثمان آباد میں چاقو اور سروتے اچھے تیار ہوتے ہیں۔

یاقوت پورہ حیدرآباد میں گذشتہ جنگ عظیم سے قبل ایک کارخانہ موسوم بہ "صنعت ہند" آہنی سامان تیار کرنے کے لئے قائم ہوا۔ اس کارخانہ میں ستون، قنادیل، جالیاں، آہنی کرسیاں وغیرہ بہت اچھی تیار ہوتی تھیں۔ حیدرآباد آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کے نام سے ایک جدید کمپنی ۱۹۳۷ء میں قائم ہوئی لیکن زیادہ ترقی نہ کرسکی۔ اس سلسلہ میں دارالضرب سرکار عالی اور لالہ گوڑہ ریلوے ورکشاپ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

حال ہی میں آلوین میٹل ورکس کا افتتاح عمل میں آیا جہاں آہنی سامان مثلاً تجوریاں، الماریاں، آہنی فرنیچر اور چاقو وغیرہ بہترین تیار ہو رہے ہیں۔ یہ کارخانہ پندرہ لاکھ روپے کے سرمایہ سے صنعتی رقبۂ آبادی میں قائم کیا گیا ہے۔ ۱۹۴۳ء میں اس کارخانہ کو ایک لاکھ ۶۴ ہزار روپے کا خالص منافعہ حاصل ہوا۔ ابتدائی مشکلات عظیم کے باوجود کارخانہ اچھی طرح کام کر رہا ہے۔

صنعت دباغت و چرم سازی | دباغت ملک کی ایک قدیم صنعت ہے۔ کثیر مقدار میں چمڑے اور کھالوں کی دباغت ہوا کرتی تھی قدیم زمانے میں جرمنی، آسٹریا اور ممالک متحدہ امریکہ کو بمقدار کثیر ان کی برآمد ہوا کرتی تھی۔ آج کل بھی ملک میں ان سے کما حقہ استفادہ نہیں کیا جاتا۔ گھوڑوں کے ساز و سامان اور دوسری فوجی ضرورتوں کے لئے سب سے پہلے فوجی عہدہ داروں نے دباغت کے یورپی

طریقے رائج کئے۔ ۱۸۶۰ء میں ہارنس اور زین کی تیاری کے لئے کانپور میں ایک سرکاری کارخانہ قایم کیا گیا اس کے بعد خانگی کارخانے قایم ہوئے۔ اس طرح کانپور چمڑے کی تجارت کا ہندوستان میں بہت بڑا مرکز بن گیا۔ اس کے بعد بمبئی اور مدراس میں بھی اس صنعت کو قابل لحاظ ترقی حاصل ہوئی۔ جنگ کے زمانے میں اس صنعت کو ہندوستانی مجلس اسلحہ کی سرپرستی کی بدولت خوب فروغ ہوا۔ کیونکہ اس مجلس کو فوجیوں کے لئے کثیر تعداد میں جوتوں کی ضرورت تھی ۱۹۱۹ء کے بعد سے اس صنعت کو محدود تامین عطا ہوئی۔ خام چمڑے اور کھالوں کی برآمد پر پانچ فی صد محصول عاید کیا گیا ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۳ء کے دوران میں محصول ۱۵ فی صدی کردیا گیا لیکن برطانوی مقبوضات کو جانے والے سامان پر دس فی صدی محصول لیا جاتا تھا۔ ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء کے بعد سے خام کھالوں اور چمڑوں پر سے برآمدی محصول برخاست کردیا گیا ہے لیکن تامین کے ذریعہ یہ صنعت حوصلہ افزائی کی مستحق ہے۔ اس صنعت میں اندرونی اصلاح کے لئے بھی کافی گنجائش موجود ہے۔

انڈسٹریل رلیسرچ بیوریو نے ۱۹۳۹ء میں ہندوستانی صنعت چرم سازی کی سروے کی۔ موجودہ جنگ کی وجہ سے فوجی ساز وسامان کثیر مقدار میں تیار ہو رہا ہے۔ بنگال صوبۂ متحدہ پنجاب میں جدید کارخانے قایم ہوئے ہیں۔

مملکت آصفیہ میں چرم سازی | مملکت آصفیہ کے ہر گاؤں میں موچی موجود ہیں جو آب براری اور زرعی ضرورتوں کے لئے چرمی اشیا تیار کرلیتے ہیں ان کے تیار کئے ہوئے چپل اور جوتے بھی دیہاتی آبادی کے لئے کافی ہوجاتے ہیں۔ قدیم زمانے سے بیڑ کی چھاگلیں مشہور ہیں۔

۱۹۳۱ء میں انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کے سرمایہ سے صنعت دباغت اور چرم سازی کی سروے کرائی گئی۔ اس کے لئے کیپٹن اے۔ گوتری کی خدمات حاصل کی گئی تھیں جو لیدر ٹریڈ انسٹیٹیوٹ مدراس کے ایک عہدہ دار تھے۔ اس رپورٹ کے نتیجہ کے طور پر عزیز فیاکٹری کو پچاس ہزار روپے قرض دیئے گئے تاکہ چرم سازی کے لئے جدید وضع کی مشنری خریدی جاسکے۔ ہنگولی کے ایک دوسرے کارخانہ کو بھی امداد دی گئی تاکہ چرمی صندوق تیار کئے جاسکیں۔

موجودہ زمانہ میں مملکت میں صنعت دباغت کے تقریباً ۴۴ کارخانے پیمانۂ صغیر پر موجود ہیں۔ اضلاع رائچور، ورنگل، نظام آباد اور بیدر اس صنعت کے لئے مشہور ہیں۔ ۴۰-۱۹۳۹ء میں تقریباً ۳۱ لاکھ ۲۶ ہزار روپے کے چمڑے اور چرمی اشیاء ہماری مملکت سے برآمد کئے گئے۔ پنج سالہ اصلاحی اسکیم کے تحت اب صنعت چرم سازی کو ترقی دی جارہی ہے۔ اس اسکیم کے مطابق حسب ضرورت موزوں مقامات پر چند چرم خانے قائم کئے جائیں گے۔ صنعت چرم سازی کے تمام شعبوں مثلاً کھال اتارنے، نمک لگانے، چمڑا کمانے اور چرمی اشیاء بنانے کی تعلیم جدید طریقوں کے مطابق دی جائے گی۔

کیمیائی صنعتیں | کسی ملک کی عام معاشی ترقی کے لئے کیمیائی صنعتوں خصوصاً وزنی کیمیائی مرکبات مثلاً سلفیورک ترشہ، کاسٹک سوڈا، نائٹرک ایسڈ، ہائیڈروکلورک ترشہ، سوڈیم کاربونیٹ کی تیاری بہت ضروری ہے۔ یہ کیمیائی صنعتیں ہندوستان میں بہت ہی کم ترقی کرسکیں اس لئے کثیر مقدار میں بیرونی ممالک سے ان کی درآمد کرنی پڑتی ہے۔ جنگ عظیم بہت سی کیمیائی صنعتوں کی ترقی کے لئے محرک ثابت ہوئی۔ اگر مختلف معدنی تیل و دھاتوں کو موزوں طور پر استعمال کیا جائے تو ہندوستان کے ذرائع پیداوار کے وسائل وزنی کیمیائی مرکبات کی تیاری کے لئے ناکافی ثابت نہ ہوں گے۔ سلفیورک ترشہ کی صنعت میں قابل لحاظ کامیابی حاصل ہوچکی ہے جو تمام کیمیائی صنعتوں کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ ٹیرف بورڈ کی سفارش پر ۱۹۳۱ء میں اس صنعت کو تامین عطا کی گئی جو ۱۹۳۳ء میں ختم ہوگئی۔

جنگ کی وجہ سے کیمیائی صنعتوں کی اہمیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں بمقام کلکتہ ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اس صنعت کی ترقی کے امکانات پر غور کیا گیا۔

حیدرآباد میں کیمیائی صنعتیں | حکومت سرکار عالی کی امداد سے ایک انڈسٹریل کارپوریشن قائم کیا گیا ہے تاکہ کیمیائی صنعتوں کو فروغ دیا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک تحقیقاتی سائنٹفک اور صنعتی ریسرچ بورڈ بھی قائم کیا گیا ہے۔ [illegible] صنعتی کیمیا کا آغاز ہوچکا ہے۔ سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ بورڈ کی جانب سے [illegible] شائع کیا جارہا ہے۔

کاغذ سازی | ہندوستان میں کاغذ کی جدید صنعت کا آغاز ۱۸۷۰ء سے ہوتا ہے جبکہ دریائے ہگلی کے کنارے بیلی ملز قایم ہوئی۔ اس مقام کے مضافات اب تک بھی کاغذ سازی کا اہم مرکز ہیں۔ ٹیٹا گھر پیپر ملز ۱۸۸۲ء میں قایم ہوئی۔ ۳۹-۱۹۳۸ء میں ہندوستان میں کاغذ سازی کے گیارہ کارخانے تھے چار چار کارخانے بنگال اور بمبئی میں صوبۂ متحدہ، مدراس اور ٹراونکور میں ایک ایک کارخانہ قایم ہے۔ سبائی گھانس شمالی ہند میں کثرت سے پیدا ہوتی ہے جو اس صنعت کے لئے اصلی خام پیداوار ہے۔ لیکن ہندوستانی پیپر پلپ کمپنی بانس کے گودے سے کاغذ بناتی ہے۔ یہ نئی ترقی بہت امید افزا ہے۔ اس صنعت کو ۱۹۲۵ء میں تامین عطا ہوئی اور ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۹ء میں اس کی تجدید ہوئی۔ ۳۹-۱۹۳۸ء میں تقریباً تین لاکھ ۲۷ ہزار ہنڈریڈ ویٹ درآمد شدہ کاغذ اور وصلیوں کے بالمقابل ہندوستان میں ۱۴ لاکھ ۱۹ ہزار ہنڈریڈ ویٹ کاغذ تیار ہوا۔ موجودہ جنگ کی وجہ سے کاغذ کی قیمتوں میں بے حد اضافہ ہوگیا ہے جسکی وجہ سے دو نئے کارخانہ قایم ہوئے ہیں۔

مملکت آصفیہ میں کاغذ سازی | دولت آباد کے ایک محلہ موسوم بہ کاغذی پورہ کو جو اب ایک چھوٹے سے گاؤں کی حیثیت میں آباد ہے کاغذ سازی میں کئی صدیوں سے شہرت حاصل تھی۔ ہر قسم کی سرکاری خط و کتابت اور کتب کے لئے اسی مقام کا کاغذ استعمال کیا جاتا تھا۔ دولت آباد کی ویرانی اور تباہی کے ساتھ ہی وہاں کی صنعت پر اثر پڑنے لگا۔ تاہم پچاس ساٹھ سال قبل چھ سات سو گھرانے اس کی تیاری میں مصروف رہتے تھے اور اس کی بدولت خوشحال زندگی بسر کرتے تھے۔ بیرونی کاغذ کے رواج کے ساتھ یہاں کی صنعت پر تباہی آگئی اور اب صرف چار پانچ گھرانوں میں کاغذ بنا کرتا ہے۔ دولت آباد کے علاوہ کاغذ بلدہ حیدرآباد، کریم نگر، جگتیال اور کوڑلہ میں بنتا ہے۔ یہ مقامات بھی اچھی حالت میں تھے مگر اب زوال پذیر ہیں۔

۱۹۳۱ء میں مولا بخش صاحب اور خواجہ نظام الدین صاحب نے مشترکہ طور پر کاغذ سازی کے امکانات پر ایک رپورٹ تیار کی تھی اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ کاغذ سازی کے لئے موزوں ترین مقام ضلع عادل آباد ہے جہاں بانس کے گھنے جنگل موجود ہیں۔ خام پیداوار مثلاً کوئلہ اور چونا قرب وجوار میں بہ آسانی دستیاب ہوسکتا ہے۔ ان حالات کے مدنظر ۱۹۳۹ء میں مشترکہ سرمایہ سے ایک کمپنی قایم کی گئی جس کا نام سرپور پیپر ملز لمیٹڈ ہے۔ یہ کارخانہ بلہارشاہ ریلوے لائن پر بمقام کاغذ نگر واقع ہے جہاں سے حمل و نقل کی سہولتیں بھی حاصل ہیں۔ کمپنی کا منظورہ سرمایہ ایک کروڑ روپے اور اجراشدہ ۵۴ لاکھ روپے ہے اس کارخانہ میں پانچ تا چھ ہزار ٹن سالانہ کاغذ تیار کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

دوسری صنعتیں: شکر اور دیا سلائی کی صنعتیں بھی قابل ذکر ہیں جنکو موجودہ زمانہ میں تامین کی وجہ سے سرعت کے ساتھ فروغ حاصل ہورہا ہے۔ جنگ کے بعد سے سمنٹ کی صنعت وسعت پذیر ہورہی ہے۔ پورٹ لینڈ سمنٹ کی جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے برطانوی سمنٹ کے ہم پلہ ہے۔ ۱۹۱۴ء میں تیار شدہ مقدار ۹۴۵ ٹن تھی ۱۹۲۴ء میں ۲ لاکھ ۳۶ ہزار ٹن اور ۳۶-۱۹۳۵ء میں ۹ لاکھ ۹۷ ہزار ٹن تک پہونچ گئی ۳۹-۱۹۳۸ء میں درآمد شدہ سمنٹ کی مقدار ۲۱ ہزار ٹن تک گھٹ گئی۔ تیل کی گرنیوں، شیشہ سازی، پرنٹنگ، روشنائی اور ریشم جیسی صنعتوں کو بھی ترقی حاصل ہورہی ہے اور ان میں مزید ترقی کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ کوئلہ، پٹرولیم، تیل اور چائے کی صنعتوں کا اس سے قبل تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ متعدد آٹے کی گرنیاں، چاول کے کارخانے، روئی اوٹنے اور دابنے کے کارخانے، ریلوے ورکشاپ اور ٹائیل وانیٹ کے کارخانے تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ربر تیار کرنے کی صنعت خاص طور پر ٹائر بنانے میں کامیابی حاصل ہورہی ہے۔

مملکت آصفیہ کی دوسری صنعتیں: (۱) شکر سازی ۱۹۳۸ء نظام شوگر فیاکٹری بودھن کی

تعمیر تکمیل کو پہونچی جو ۳۵ لاکھ روپے کے سرمایہ سے قایم کی گئی ہے۔ نظام آباد سے بودھن تک ریلوے لائن ڈالی گئی ہے۔ سررشتہ کروڑگیری کے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کمپنی کی تیار کردہ شکر بتدریج باہر سے درآمد شدہ شکر کی جگہ لے رہی ہے۔ نیشکر کی کاشت کے لئے ایک بڑھتا ہوا رقبہ زیر کاشت آنے کی وجہ سے یہ توقع کی جارہی ہے کہ یہ کارخانہ بہت جلد اس قابل ہو جائے گا کہ حیدرآباد کو شکر کے لئے خود مکتفی بنادے۔

بودھن کے اس کارخانہ شکرسازی نے ۴۲-۴۱ء ۱۹ میں ۱۶ ہزار ۸ سو ٹن شکر تیار کی۔

شکر بنانے کے بعد شیرہ اور دوسری چیزیں جو بچ جاتی ہیں ان کو فائدہ مند طریقے سے ضمنی حاصل کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ شیرہ سے پاور الکحل حاصل کی جاتی ہے اور اب تقریباً سالانہ چار لاکھ گیالن تیار ہو رہی ہے جس کا کچھ حصہ سرکار عالی کی ریلوے کے لئے فراہم کیا جاتا ہے۔

(۲) دیاسلائی حکومت ہند کی جانب سے دیاسلائی کی صنعت کو جو تامین عطا کی گئی ہے اسکی وجہ سے مملکت آصفیہ میں بھی دیاسلائی کے کارخانے قایم ہوئے لیکن دیاسلائی پر محصول چنگی عاید کرنے کے بعد سے اس صنعت کو خصوصاً بڑے پیمانہ کے کاروبار کو ایک طرح سے دھکا لگا نیز جنگ کی وجہ سے بھی بعض کیمیائی اجزا نہ ملنے سے مشکلات پیش آرہی ہیں۔ البتہ اس کا میلان بڑھتا نظر آرہا ہے کہ چھوٹے پیمانہ کے کارخانے قایم کئے جائیں جن میں صرف دستکاروں سے کام لیا جاتا ہے اور جہاں روزانہ ایک سو گروس یا اس سے کم دیاسلائیاں تیار کی جاتی ہیں۔

اس وقت مملکت میں دیاسلائی کے تیرہ کارخانے ہیں۔ ان کارخانوں نے ۴۱-۴۰ء ۱۹ میں چار لاکھ ۶۱ ہزار گروس دیاسلائی کی ڈبیاں تیار کیں۔

(۳) سمنٹ سازی مملکت آصفیہ میں سمنٹ سازی کی صنعت ۱۹۲۵ء میں ۳۵ لاکھ روپے کے سرمایہ سے شاہ آباد ضلع گلبرگہ میں جاری کی گئی۔ ۱۹۳۶ء میں شاہ آباد سمنٹ کمپنی کا ہندوستانی اسوسی ایٹڈ سمنٹ کمپنیز لمٹیڈ کے ساتھ انضمام عمل میں آیا تاکہ کفایت سے

سمنٹ تیار کی جاسکے اور داخلی یا خارجی مسابقت کا مقابلہ کر سکے۔ شاہ آباد سمنٹ کمپنی نے ۴۱-۱۹۴۰ء میں ایک لاکھ ۵۰ ہزار ٹن سمنٹ تیار کی۔ اس موقع پر اس امر کا تذکرہ قابل دلچسپی ہوگا کہ متو ہر ڈام کی تعمیر میں شاہ آباد سمنٹ ہی استعمال کیا گیا۔ اس کارخانہ میں ۱۳۲۸ مرد اور ۹۸ عورتیں کام کرتی ہیں۔

(۴) شیشہ سازی: ۱۹۲۸ء میں دکن گلاس ورکس کے نام سے ایک کارخانہ بمقام فتح نگر (بیگم پیٹ) قایم ہوا لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے بہت جلد کارخانہ بند کر دینا پڑا لیکن اس موقع پر حکومت سرکار عالی نے اس کارخانہ کی مالی امداد کی اور نیز مملکت آصفیہ میں صنعت شیشہ سازی کے امکانات پر بھی غور کیا گیا کہ وہ نور گلاس فیاکٹری کے نام سے اس کارخانہ کی دوبارہ تجدید عمل میں آئی جو تشفی بخش طور پر ترقی کر رہا ہے۔ ۴۱-۱۹۴۰ء میں جو کانچ کا سامان تیار کیا گیا اس کی قیمت ۴۴ لاکھ ۵ ہزار روپے ہوئی۔ اس کارخانہ میں اوسطاً چار سو مزدور کام کرتے ہیں۔

حال ہی میں تاج گلاس ورکس کی بھی قانون کمپنی سرکار عالی کے تحت رجسٹری عمل میں آئی ہے اور اس کارخانہ کا کام عنقریب چالو ہوگا۔ اور نیز رحیم آباد شمس پلی میں ایک گلاس فیاکٹری بھی قایم ہوئی ہے۔

(۵) سگریٹ سازی: مملکت آصفیہ میں سگریٹ سازی کے دو کارخانے وزیر سلطان تمباکو کمپنی اور حیدرآباد دکن سگریٹ فیاکٹری بلدہ حیدرآباد میں واقع ہیں۔ سگریٹ سازی کے دونوں کارخانوں نے ۴۱-۱۹۴۰ء میں ۱۳۲ کروڑ ۴۷ لاکھ سگریٹ تیار کیے۔ ان کارخانوں میں روزانہ اوسطاً ۶۰۷ مرد اور ۹۹۵ عورتیں کام کرتی ہیں۔

مملکت کے غریب طبقوں میں بیڑی کا زیادہ رواج ہے۔ بیڑی سازی کے اہم مقامات یادگیر، نظام آباد، اور اورنگ آباد ہیں۔

(۶) تیل نکالنے کی صنعت: روغنی تخم کی پیداوار کے لحاظ سے ہندوستان میں مملکت آصفیہ کو خاص شہرت حاصل ہے اور بہت اقسام کے روغنی تخم مثلاً مونگ پھلی، ارنڈی، بنولہ، تل، السی، رائی وغیرہ ہیں لیکن بعض مقامات میں روغن کشی کے چند کارخانے قایم ہیں مگر اس روغن کو قطرہ اور صاف کرنے کا

خیال عرصہ تک پیدا نہ ہوا۔ بہت سے روغنی تخم برآمد کر دیے جاتے تھے اور روغن کشی کی صنعت بہت ہی پست حالت میں تھی اس لئے سررشتۂ تجارت و حرفت کی جانب سے ۱۹۳۰ء میں اس صنعت کی سروے کی گئی۔ اس کی تائید کی غرض سے روغن کی برآمد پر محصول کروڑگیری برخاست کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ انڈسٹریل فنڈ کی جانب سے جدید قسم کی روغن کشی کی مشنری کے لئے قرضہ بھی منظور کیا گیا۔ ان وجوہ سے مملکت میں روغن کشی کے کارخانوں میں بتدریج اضافہ ہوا اور اب یہ صنعت مستقل بنیادوں پر قائم ہو گئی ہے ۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۵ء کے درمیان مملکت میں روغن کشی آلوں کی تعداد ۷۶ اور تیل کے گھانوں کی تعداد ۹۱۷ تھی۔

۱۹۳۶ء میں روغن مونگ پھلی پر ۲½ فی صدی محصول برآمد عائد کیا گیا کیونکہ یہ صنعت کثیر منافع کے ساتھ ترقی پذیر تھی۔ مونگ پھلی کا تیل نکالنے کے مملکت میں ۶۰ کارخانے قائم ہیں اور بڑی مقدار میں مونگ پھلی کا روغن نکال کر برآمد کیا جاتا ہے۔

ارنڈی کی زیادہ مقدار بمبئی اور مدراس کی بندرگاہوں سے باہر روانہ کر دی جاتی ہے اس کے چند کارخانے جڑچرلہ، شادنگر، بھونگیر، نسیم آباد، پربھنی اور ورنگل میں قائم ہیں۔ اس کا بہت ہی کم مقدار میں یہاں تیل نکالا جاتا ہے اور تمام پیداوار برآمد کر دی جاتی ہے۔ مملکت میں بمبئی اور مدراس کے تاجروں کے ایجنٹ پھیلے ہوئے ہیں اور اپنے کاروبار کے فروغ کے خاطر یہاں روغن تیار کرنے کی صنعت جاری کرنا پسند نہیں کرتے۔ ملک کے کاروباری اور سرمایہ دار اصحاب اب اس صنعت کے فروغ میں لگے ہوئے ہیں۔

(۷) ٹین سازی۔ حیدرآباد میں ٹین سازی کا آغاز ۱۹۱۶ء سے ہوا۔ اس وقت ٹین سازی کے ۱۲ کارخانے کام کر رہے ہیں۔ جن میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔

(۱) دکن ٹین فیاکٹری (۲) بھارت ٹن فیاکٹری (۳) پریم ٹین فیاکٹری (۴) پرکاش ٹین فیاکٹری (۵) حیدرآباد دکن ٹین فیاکٹری (۶) سگری ٹین فیاکٹری (۷) پربھات ٹین فیاکٹری (۸) عوثیہ ٹین فیاکٹری۔ (۹) طاہر ٹین فیاکٹری (۱۰) خندریہ ٹین فیاکٹری

یہ کارخانے اناطل، دردھات وغیرہ کی گنڈیاں شیروانی، قمیص کے کف اور کالر کے لیے تیار کرتے ہیں۔ بعض کارخانے ایونگ چوڑیاں بھی بنا رہے ہیں۔ ملکی ضروریات کی تکمیل کے بعد تقریباً دو لاکھ روپے سے زاید مالیت کی گنڈیاں برآمد کی جاتی ہیں۔ حالیہ جنگ میں ان میں سے اکثر کارخانوں میں جنگی ضروریات کی تکمیل کے لئے آرڈر لئے ہیں۔

(۸) بسکٹ کی صنعت۔ حیدرآباد میں بسکٹ کی صنعت بھی ترقی کر رہی ہے۔ روز بسکٹ ورکس ۱۹۲۰ء میں قایم ہوا۔ ۴۱-۱۹۴۰ء میں ایک لاکھ چالیس ہزار روپے کا مال تیار ہوا۔ بسکٹ چاکلیٹ کے علاوہ مالٹہ کی مہریں، فنائل اور صابن بھی یہاں تیار ہوتے ہیں۔ اس کمپنی میں روزانہ ستر آدمی کام سے لگے ہوئے ہیں۔

(۹) پینٹ اور وارنش:۔ مملکت میں پینٹ اور وارنش کی صنعت بھی موجود ہے۔ حیدرآباد نیشنل انڈسٹریز کمپنی واقع لنگم پلی ۱۹۳۵ء میں قایم ہوئی۔ اس نے ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۲۸۲ ٹن سے زاید پینٹ اور وارنش تیار کی۔ اس کی برآمد بھی کی جاری ہے۔ جوش زدہ تیل اور پینٹ کی تیاری کیلئے اور بھی کارخانے قایم ہو رہے ہیں۔

(۱۰) پائپ سازی۔ یہاں پائپ سازی کا کام بھی جاری ہے ۴۱-۱۹۴۰ء میں انڈین ہیوم پائپ کمپنی کی حیدرآبادی شاخ نے مختلف سائز کے پائپ اور ٹائیل تیار کئے جنکی قیمت ۵۰ ہزار روپے تھی۔ اس کارخانے میں روزانہ پچاس مزدور کام کرتے ہیں۔

(۱۱) سنگ مرمر کی صنعت:۔ سنگ مرمر کی صنعت بھی قابل ذکر ہے۔ دکن ماربل اینڈ مائننگ کمپنی جو ۱۹۲۱ء میں پانچ لاکھ روپے کے سرمایہ سے قایم ہوئی اس نے صاف شدہ سنگ مرمر کی ۴۲-۱۹۴۱ء میں ۲۵ ہزار مربع فیٹ سیلن لینڈ و ونسکل میں برآمد کیں۔

(۱۲) اشیائے گلی۔ ممالک محروسہ میں کمہار قدیم زمانہ سے موجود ہیں جو عام ضرورت اور خانہ داری کی مٹی کے اشیاء تیار کرتے ہیں۔ بھونگیر (ضلع نلگنڈہ) اور آب خورے اچھے تیار ہوتے ہیں۔ اس صنعت کا سب سے بڑا مرکز تاج کلے ورکس محدود ہے یہ کارخانہ پانچ لاکھ روپے کے سرمایہ سے آغاز کیا گیا ہے جہاں پیمانہ کبیر پر تاج اینٹ، مٹی کے برتن اور دوسرے تعمیری اشیاء تیار کی جاتی ہیں۔ اس کارخانہ میں تین سو مزدور کام کرتے ہیں۔

(باقی)

تنقید و تبصرہ

(۱) **موضع دوپلی کی معاشی تحقیق**:- مصنفہ جناب ناصر علی صاحب ام۔اے (عثمانیہ) لکچرار معاشیات جامعۂ عثمانیہ۔ ناشر انجمن طیلسانیین عثمانیہ۔ بڑی تقطیع حجم ۱۰۲ صفحات بشمول ضمیمہ۔ کتابت وطباعت عمدہ قیمت ۲ روپے۔

یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جسے ام۔اے کی ڈگری کے لیے پیش کیا گیا تھا اور جس پر لائق محقق کو ام۔اے کی ڈگری عطا کی گئی ہے۔ مدیر مجلہ طیلسانیین کے تعارف، مولوی حبیب الرحمن صاحب کے پیش لفظ اور خود مصنف کے مقدمہ کے قطع نظر یہ مقالہ دس فصلوں اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے۔

پہلی فصل — زرعی آبادی:- اس فصل میں ابتداءً موضع کی آبادی کے تاریخی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے، بعد ازاں آبادی کی موجودہ نوعیت پر بحث کرتے ہوئے آبادی کو مذہب، جنس، پیشہ اور کارگذار وغیرہ کارگذار آبادی کے لحاظ سے تقسیم کیا گیا ہے۔ بلحاظ مذہب سب سے زیادہ تعداد ہندوؤں کی ہے یعنی تقریباً ۷۱ فیصد اور سب سے کم عیسائیوں کی تعداد ہے یعنی صرف ۲ فیصد بلحاظ جنس فی ہزار ذکور اناث کی تعداد ۱۰۳۵ ہے، بلحاظ پیشہ ۹۴،۴ فیصد زراعت پیشہ ہیں اور ۵،۶ فیصد غیر زراعت پیشہ۔ اس طرح کارگذار آبادی ۵۳ فیصد اور غیر کارگذار آبادی ۴۷ فیصد ہے۔

دوسری فصل۔ زرعی آبادی بسلسلۂ فصل سابق:- اس فصل میں اہل موضع کے معیار زندگی کی کیفیت بتائی گئی ہے۔ کسی جماعت یا قوم کے معیار زندگی کو جانچنے کے لیے اسکی غذا، لباس، مکان اور نوعیت تعلیم کی کیفیت کا اندازہ لگانا ضروری ہے لہذا مصنف نے اس فصل میں ان ہی لوازمات سے بحث کی ہے اور اعداد شمار سے ثابت کیا ہے کہ غذا، لباس، مکان اور تعلیم ہر لحاظ سے موضع کا معیار زندگی نہایت پست ہے۔

تیسری فصل۔ زرعی زمین:۔ اس فصل میں ہندوستانی معیشت کے ایک نہایت اہم مسئلہ تقسیم و انتشار اراضی کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ہندوستان کے دیگر مقامات کی طرح موضع زیر بحث میں بھی تقسیم و انتشار اراضی کی بیماری بہت ترقی کر چکی ہے۔ موضع میں (۵) ایکڑ سے کم وسعت والی اراضیات سب سے زاید یعنی ۸۲.۲ فیصد ہیں۔ کم و بیش یہی حال انتشار اراضی کا ہے۔

چوتھی فصل۔ زرعی محنت:۔ چوتھی فصل میں مزدوروں کی تعداد بلحاظ جنس اور بلحاظ ذات معلوم کی گئی ہے اور ان کے مشاغل اور ادائی اجرت کے طریقوں سے بحث کی گئی ہے۔ اندرون موضع مزدوروں کو بہت کم اجرت دی جاتی ہے یعنی مردوں کو ۲/۸ سے ۴/ تک اور عورتوں کو ۲/ خود مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ "موضع زیر بحث میں اطراف و اکناف کے مواضعات کے مقابل مزدوریوں کی شرح کم ہے"۔ اسی فصل کے آخر میں مزدوروں کی ادنی کارکردگی کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پانچویں فصل۔ زرعی اصل:۔ مصنف نے اس فصل کو دو شعبوں میں تقسیم کیا ہے (۱) اصل دائر (۲) اصل قایم۔ اصل دائر کے تحت (ا) مویشی (ب) آلات زراعت اور (ج) مصنوعی ذرائع آبپاشی سے بحث کی گئی ہے اور اصل دائر کے سلسلے میں کھاد اور تخم کے متعلق کیفیت پیش کی گئی ہے۔ موضع میں مویشیوں کی کثیر تعداد لاغر و کمزور اور غیر کارکرد ہے اور چارہ کا بھی خاطر خواہ انتظام نہیں ہے۔

چھٹی فصل۔ بسلسلہ فصل سابق:۔ اس فصل میں زرعی اصل کے بقیہ دوسرے اجزا سے بحث کی گئی ہے۔ آلات و اوزار کے تحت بتایا گیا ہے کہ کولھو کے سوائے جملہ آلات مستعملہ وہی قدیم اور پرانے ہیں جو آج سے کئی نسل قبل مروج تھے۔ آبپاشی کلیتاً تالابوں اور نہروں کے ذریعہ کی جاتی ہے اور مصنف کے قول کے مطابق موضع کے ذرائع آبپاشی کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہت تشفی بخش ہیں۔ جہاں تک کھاد کا تعلق ہے خشک زمینات پر کاشت کی جانے والی اجناس کو (بہ استثناء مرچ، تمباکو) کھاد نہیں دی جاتی، اور تری کی زمینات کو بھی خاطر خواہ کھاد نہیں ملتی۔ تخم بھی نہایت

ناقص استعمال کیے جاتے ہیں۔

ساتویں فصل طریقہ ہائے کاشت ۔ زرعی پیداوار ۔ زرعی فروخت :۔ طریقہ ہائے کاشت کے متعلق مصنف کا خیال ہے کہ یہ بہت ناقص ۔ غیر اصولی اور غیر حکمیاتی ہیں جن کی بنا پر فی ایکڑ پیداوار کم حاصل ہوتی ہے ۔

موضع میں چاروں فصلوں (خریف ۔ آبی ربیع اور تابی) میں برابر کاشت ہوتی ہے ۔ دھان اور جوار یہاں کی عام اجناس ہیں ۔

فروخت پیداوار کے سلسلے میں دھان کو بطور مثال لیا گیا ہے اور اس کی فروخت کے مختلف طریقے بتائے گئے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ پیداوار کو فروخت کرتے وقت کاشتکار کو کن کن مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اسے کیوں اپنی پیداوار کی حقیقی اور واجبی قیمت نہیں ملتی ۔

آٹھویں فصل ۔ زرعی مقروضیت :۔ اس فصل میں موضع کی مقروضیت کی تفصیل دی گئی ہے ۔ ابتداً مذہب اور پیشہ کے لحاظ سے قرض کی تقسیم کی گئی ہے ۔ قرضہ کا سب سے زیادہ بار ہندوؤں پر ہے کیونکہ آبادی کا بہت بڑا حصہ انہیں پر مشتمل ہے ۔ پیشہ کے لحاظ سے غیر زراعت پیشہ خاندانوں میں ۴۴ فیصد خاندان مقروض اور ۵۶ فیصد غیر مقروض ہیں ۔ اور زراعت پیشہ خاندانوں میں ۸۰ فیصد خاندان مقروض اور ۱۲ فیصد غیر مقروض ہیں ۔ مجموعی قرض کے لحاظ سے بھی زرعی قرض ۸ء ۹۵ فیصد ہے ۔ قرضہ کی ماہیت کے تحت مصنف نے بتایا ہے کہ موضع میں غیر پیدا آور بالخصوص آبائی قرضوں کی مقدار بہت زیادہ ہے ۔ اس طرح ڈارلنگ کے قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہندوستانی کاشتکار مقروض پیدا ہوتا ہے ۔ زندگی بھر مقروض رہتا ہے اور مقروض ہی مرتا ہے ۔

نویں فصل ۔ زرعی مقروضیت بسلسلۂ فصل سابق :۔ اس فصل میں قرض حاصل کرنے کے ذرائع قرض کی وجوہات اور شرح سود سے بحث کی گئی ہے ۔

مصنف نے قرضہ حاصل کرنے کے دو ذرائع بتائے ہیں ۔ (۱) سرکاری جس میں براہ راست تقاوی کے ذریعہ یا بالواسطہ انجمن امداد باہمی کے توسط سے قرضہ دیا جاتا ہے (۲) خانگی ذرائع ۔

جس میں مقامی وغیرمقامی ساہوکار اور عزیز و اقارب شامل ہیں۔

قرض کی شرحوں کے متعلق مصنف نے بتایا ہے کہ موضع میں تین قسم کی شرحیں یعنی خاص رقمی۔خاص جنسی اور مخلوط شرح مروج ہیں۔ زیادہ تر مخلوط شرح پر قرض دیا جاتا ہے بحیثیت مجموعی شرح سود کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ موضع میں کم سے کم شرح سود ۶ فیصد اور زیادہ سے زیادہ ۷۵ افیصد سالانہ ہے۔

دسویں فصل۔ اصلاحی تدابیر۔ اس فصل میں اہل موضع کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی تدابیر پیش کی گئی ہیں۔ادنیٰ معیار زندگی کی سب سے اہم وجہ آمدنی قرار دی گئی ہے لہذا اس فصل میں اہل موضع کی آمدنی میں اضافہ کرنے کی تدابیر پیش کی گئی ہیں۔

ادنیٰ آمدنی کے اسباب میں اضافۂ آبادی۔ ذرائع معاش کی غیر متناسب رفتار ترقی۔پیشوں کا فقدان اور زراعت پر زائد از ضرورت بار۔ نظام زراعت کے گوناگوں نقائص مثلاً زرعی ماحین پیدائش کی غیرمناسب حالت۔طریقہ ہائے کاشت اور طریقہ ہائے لین دین کے گوناگوں نقائص کو شامل کیا گیا ہے۔ لہذا اصلاحی تدابیر میں ان مذکورہ نقائص کو دور کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ زور تخفیف آبادی۔صنعتی ترقی اور تعلیمی ترقی پر دیا گیا ہے۔ ان بالواسطہ تدابیر کے علاوہ چند بلاواسطہ تدابیر پر عمل کرنے کی بھی سفارش کی گئی ہے۔ مثلاً تقسیم و انتشار اراضی کی اصلاح۔ زرعی اہل کی اصلاح۔مصنوعی ذرائع آبپاشی کی ترقی۔ کھاد و تخم کا مناسب و بہتر انتظام۔ فروخت پیداوار اور طریق لین دین کی اصلاح وغیرہ۔

سیّد باقر فریدی

(۲) **معاشیات کی الف۔ بے۔** از مولوی محمد ناصر علی صاحب ام۔اے (عثمانیہ) لکچرر معاشیات جامعۂ عثمانیہ صفحے ۳۶ تقطیع بڑی۔قیمت ۸/۱ ناشر انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

معاشیات کا علم یوں بھی بہت قدیم نہیں لیکن ہندوستان اور حیدرآباد میں تو یہ علم نیا ہی

رکیا جاسکتا ہے۔ ملک کے مختلف افراد سے تبادلہ خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بہت سے
ایسے ہیں جو اس علم کی شد بود سے بھی واقف نہیں۔ جنہوں نے ادھر اُدھر سے کچھ معلومات حاصل
ہیں اور اس کا غائرانہ مطالعہ نہیں کیا ہے وہ ابھی تک ٹھیک طور پر اس کی ماہیت اور اس کے
مباحث کو سمجھ نہیں سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں اب بھی اس علم کے متعلق وہی
لات پائے جاتے ہیں جو آج سے ایک دو صدی قبل یورپ کے لوگوں میں پائے جاتے تھے یعنی
اس کو دولت جمع کرنے کا علم سمجھتے ہیں۔ چونکہ ہندوستان میں روحانیت بہت زیادہ ہے
لیے عام لوگ اس کو دولت پرستی کا علم سمجھ کر اس کی طرف توجہ دینے کے لیے تیار نظر نہیں آتے۔
یہ ان حضرات کا قصور نہیں اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اُردو زبان میں اس علم سے متعلق کافی
موجود نہیں۔ ہندستانی زبان میں بہت کم کتابیں اس مضمون سے متعلق لکھی گئی ہیں۔ اسی لیے
م طور پر اس سے کم واقفیت پائی جاتی ہے۔

لیکن اس علم کی اہمیت مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ پہلے اس کو سیاسیات کی ایک شاخ سمجھا
اتا تھا اب یہ سیاسیات پر حاوی نظر آتی ہے۔ اس لیے ہر متمدن ملک کے باشندوں کا یہ فریضہ
ہے کہ وہ اس علم کا مطالعہ کریں۔

مولوی محمد ناصر علی صاحب نے اس علم کی مبادیات کو عام فہم زبان میں پیش کر کے اُردو داں
طبقہ کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

آپ نے اپنے مذکورۂ بالا رسالہ میں سب سے پہلے معاشیات کا نفسِ مضمون، اس کے
مباحث اور اس کی تقسیمیں بیان کر کے نہ صرف علم کی ماہیت کو واضح کر دیا ہے بلکہ بہت سی غلط فہمیوں
کا ازالہ بھی کر دیا ہے۔

نظری معاشیات کے بعد آپ نے عملی یا منطبقہ معاشیات کے مسائل سمجھائے ہیں۔
آپ نے اس میں ہندوستان اور حیدرآباد دکن کے معاشی مسائل کی مثالیں دیکر مضمون کی کافی
وضاحت کر دی ہے۔

علوطیف مینِ

اس کے بعد آپ نے معاشیات کو عہد حاضرہ میں جو اہمیت حاصل ہے اس کو مختصر لیکن واضح طور پر سمجھایا ہے۔

اسی سلسلہ میں ہیڈ ورن کیمنن کی کتاب پر آپ نے تبصرہ بھی کیا ہے۔ اگرچہ کہ یہ کام "اردو فاضل" کے طلباء کے لیے خاص طور پر کیا گیا تھا لیکن عام لوگوں کو بھی اس سے فائدہ ہو سکتا ہے۔

یہ رسالہ حقیقت میں ان تقاریر کا مجموعہ ہے جو مولوی صاحب موصوف نے ادارہ ادبیات اردو کی فرمائش پر ۱۳۴۹ ف میں کی تھیں۔ جن کو نظر ثانی کے بعد "مجلہ طیلسانیین عثمانیہ" میں شائع کیا گیا مجلس ادارت نے مضامین کو رسالہ کی شکل میں چھپوا کر اس علم اور باشندگان ملک کی مفید اور ضروری خدمت انجام دی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کے اور بھی رسائل و مضامین کو چھپوا کر اس سے ملک والوں کو زیادہ سے زیادہ روشناس کرایا جائے۔ امید ہے کہ ایسی کتابیں شوق و ذوق سے پڑھی جائیں گی۔

(۴) **تنظیم مابعد جنگ**۔ از ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی۔ ایم۔ اے۔ ایم۔ ایس سی پی ایچ ڈی (لنڈن) صدر شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ معمولی تقطیع صفحات ۳۲ قیمت ( ) ادارہ ادب جدید مطبوعات سال حاضرہ ۶

جنگ اگرچہ کہ تباہیوں، بربادیوں اور ناراجیوں کا پیام ہے لیکن اس تخریب میں بعض وقت تعمیر بھی مضمر ہوتی ہے۔ چنانچہ تمام متحارب ممالک تخریبی کارروائیوں کے ساتھ تعمیری منصوبے بھی تیار کر رہے ہیں۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، گو وہ بھی متحارب ممالک میں شامل ہے لیکن یہاں مسئلہ تعمیر کا نہیں بلکہ تنظیم کا ہے۔

گذشتہ جنگ عظیم کے زمانہ میں بھی ہندوستان کو صنعتی بنانے اور اس کی معاشی حالت کو ترقی دینے کے سرکاری وعدے کیے گئے تھے۔ لیکن جنگ کے بعد سب بھلا دیے گئے۔ اب کی صرف وعدے ہی نہیں کیے جا رہے ہیں بلکہ ان کو عملی طور پر رائج کرنے کی باضابطہ تدابیر بھی سوچی جا ہیں اور ان کے انتظامات ابھی سے شروع کر دیے گئے ہیں۔

جناب ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی نے مابعد جنگ تنظیم سے متعلق اپنے جو خیالات ظاہر کیے ہیں وہ بہت مفید اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ آپ نے گذشتہ حالات کی روشنی میں مستقبل سے متعلق ایسے خیالات ظاہر کیے ہیں جو محض خیالات نہیں ہیں بلکہ عملی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے اس مختصر سے مقالہ میں تقریباً تمام اہم مابعد جنگ مسائل کو پیش کر کے ان کا بہترین تجزیہ کیا ہے۔ اور اپنے عملی تجربوں کی بنا پر حکومت کو اپنی رائے سے آگاہ کیا ہے۔

یہ کتابچہ پہلے تو آپ نے انگریزی میں لکھا تھا لیکن اُردو داں طبقہ کے لیے آپ نے اس کو اردو میں بھی پیش کرنے کی زحمت گوارہ کی ہے۔ جس کو "ادارہ ادب جدید" کی طرف سے چھاپا گیا ہے امید ہے کہ اس سے لوگ زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں گے۔

(۴) **جنگ اور روپیہ** ۔ از مولوی امتیاز حسین خاں صاحب۔ بی۔ کام۔ (لندن) اُستاذ کامرس جامعۂ عثمانیہ۔

تقطیع چھوٹی۔ صفحات ۱۰۔ قیمت ۲ ار ادارۂ ادب جدید۔

معاشیات کے مسائل میں زر کے مسائل بہت خشک اور مشکل سمجھے جاتے ہیں۔ ان ادق مسائل کو عوام کی فہم کے قابل بنانا بہت مشکل کام ہے۔ ان میں دلچسپی پیدا کرنا اور بھی زیادہ دقت طلب کام ہے۔

مولوی امتیاز حسین خاں صاحب نے اپنے رسالے "جنگ اور روپیہ" میں ان مسائل کو آسان بھی بنا دیا ہے اور دلچسپ بھی۔

آپ نے اس میں "افراط زر" کے مسئلہ سے بحث کی ہے۔ یہ مسئلہ ملک کے معاشی حالات میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جن لوگوں نے گذشتہ جنگ عظیم کے حالات کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کی وجہ سے مختلف مغربی ممالک کو کس قدر پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ خصوصاً جرمنی کی حالت تو تباہ ہو چکی تھی۔ چنانچہ نازی جماعت کو اسی افراط زر کی پیداوار سمجھا جاتا ہے۔

مولوی صاحب موصوف نے ہندوستان میں موجودہ افراط زر کی حالت کا تجزیہ کرکے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس وقت ملک میں یہ مسئلہ موجود ہے آپ نے پہلے زر کے مسائل کا تجزیہ کیا ہے۔ پھر بازاری حالت کو پیش کیا ہے اور آخر میں افراط زر کو ثابت کرتے ہوئے اس کو دور کرنے کی تجاویز پیش کی ہیں۔

چونکہ ہر ایک آدمی ان حالات سے متاثر ہو رہا ہے اس لیے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اس رسالہ کو عام لوگ دلچسپی سے پڑھ کر اپنی معلومات میں اضافہ کریں گے۔

(۵) **جنگ اور مالیہ:** از امتیاز حسین خاں صاحب بی۔کام (لندن) لکچرار کامرس (جامعۂ عثمانیہ)

چھوٹی تقطیع صفحہ ۱۴ قیمت ۱۲ مطبوعات مسائل حاضرہ ۳ ادارہ ادب جدید۔

جنگ کے مسائل اہم بھی ہیں اور عام دلچسپی کی چیز بھی۔ لیکن بعض مسائل اہم ہونے کے باوجود عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ مالیت جنگ کے مسائل اسی قسم کے ہیں۔ ملک کے تمام افراد کا ان سے تعلق ہے اور ہر ایک ان سے متاثر ہو رہا ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ان سے واقف ہیں۔ ان سے واقفیت عوام کے لیے مفید ہے لیکن اس سے متعلق یا تو اردو ادب میں کوئی کتاب ہی نہیں یا اگر ہے تو اس نوعیت کی کہ عوام کی سمجھ سے باہر ہے۔

مولوی امتیاز حسین خاں صاحب نے ان ادق اور مشکل مسائل کو بہت اختصار مگر نہایت ہی واضح طور پر پیش کرکے عوام کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

آپ نے ہندوستان اور دیگر ممالک کے دوران جنگ کے مالیہ کو پیش کرکے بتایا ہے کہ کس طرح حکومت ان بڑھتے ہوئے اخراجات کی پابجائی کرتی ہے وہ تین طریقے۔ محاصل، قرضے اور افراط زر۔ جن کے ذریعہ حکومت اپنے جنگی اخراجات کو پورا کرتی ہے نہایت آسان اور واضح طریقے سے سمجھائے گئے ہیں۔ گذشتہ جنگ کی غلطیاں، موجودہ جنگ میں ان کا ازالہ، محاصل کی اولیت، قرضے کی نسبتاً کم اہمیت، اور افراط کی خرابیاں

ان سے بچنے کی تدابیران سب مسائل کو بہت صاف اور عام فہم طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔

یہ رسالہ بہت ہی مختصر مگر بڑی حد تک جامع ہے۔ امید ہے کہ اُردو داں طبقہ اس سے پورا پورا استفادہ کریگا۔

سید معین الدین قادری

(۶) **مطبوعات بزم معاشیات جامعۂ عثمانیہ :-** جامعۂ عثمانیہ میں مختلف علوم کے متعلق ذیلی بزمیں قایم ہیں چنانچہ ان میں سے ایک بزم معاشیات بھی ہے۔ گذشتہ سات سال سے یہ بزم پروفیسر ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب ام۔ اے (پنجاب) ام۔ ایس سی (لندن) پی۔ ایچ۔ ڈی (ڈبلن) صدر شعبہ معاشیات کی ماہرانہ رہنمائی میں نہایت خاموشی کے ساتھ جامعہ کے طلبا میں معاشی مسائل کے متعلق علمی اور عملی ذوق پیدا کرنے کا کام انجام دے رہی ہے۔ اس بزم کی نمایاں کامیابی سراسر ڈاکٹر قریشی صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نہ صرف خود ہر وقت تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف رہتے ہیں بلکہ انھوں نے اپنے شعبے کے ایک سے زائد محنتی اور شوقین طالبعلموں کو اپنے رنگ میں رنگ دیا ہے۔

آج سے کچھ ماہ قبل آپ نے چند طالبعلموں کا انتخاب فرمایا اور ان کے ذریعہ براہ راست اپنی نگرانی میں دور حاضر کے اہم معاشی مسائل کے متعلق ایک درجن مفید رسالے لکھوائے جن کے نام حسب ذیل ہیں :-

نمبر	نام کتاب	نام مصنف	سائز	صفحات	قیمت
۱	ہندوستان کے زر پر جنگ کے اثرات	محمد احمد خاں بی۔ اے ال ال بی متعلم ام۔ اے (آخری)	رائل $\frac{1}{16}$	۱۰۸	عــہ ۴
۲	جنگ اور غذا کا مسئلہ	شفیق الرحمن متعلم بی۔ اے (آخری)	"	۹۴	۱۲
۳	حیدرآباد کی صنعتوں پر جنگ کے اثرات	محمد نظام الدین " "	"	۸۹	عــہ
۴	حیدرآباد اور قیمتوں کی نگرانی	محمد عبدالماجد " "	"	۲۴	عــہ

۵	جنگ اور راتب بندی	سعید احمد عینانی متعلم ام۔ اے (ابتدائی)	سائز ۱/۱۶	۱۱۶	۱۴؍
۶	جنگ اور ہندوستان کا قومی قرضہ	محمد احمد خاں بی۔ اے ال ال بی متعلم ام۔ اے (آخری)	،، ،،	۷۰	۱۲؍
۷	انگلستان اور [illegible] کے منصوبے	،، ،، ،،	،، ،،	۵۲	۸؍
۸	امریکہ ،، ،،	عطاء الرحمن علوی متعلم ام۔ اے (ابتدائی)	،، ،،	۲۸	۶؍
۹	کناڈا ،،	خواجہ شمس الدین ،، ،، ،، ،،	،، ،،	۴۲	۸؍
۱۰	ہندوستان ،، ،، ،،	سعید احمد عینانی ،، ،، ،، ،،	،، ،،	۵۲	۸؍
۱۱	محصول منافع زائد	،، ،، ،، ،، ،،	،، ،،	۴۷	۸؍
۱۲	پرشوتم داس نیوتا معاشی لائحہ عمل	،، ،، ،، ،،	،، ،،	۸۰	۱۲؍

ملنے کا پتہ :۔ انڈیا بک ہاؤس۔ حیدرآباد دکن۔ عابد روڈ۔ شاہراہ عثمانی۔

انگریزی میں معاشی لٹریچر کی صدہا کتابیں موجود ہیں لیکن اُردو زبان ایسے لٹریچر سے تقریباً خالی ہے۔ پروفیسر قریشی نے مندرجہ بالا رسالے مرتب کرواکر نہ صرف اُردو داں پبلک پر بڑا احسان کیا ہے بلکہ اردو ادب کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ مندرجہ بالا ہونہار مصنفوں کی کتابیں ہر طرح قابل تحسین ہیں۔ ان کے یہ رسالے اپنی اپنی جگہ خاص معیار رکھتے ہیں اور معلومات کا اچھا ذخیرہ پیش کرتے ہیں بڑی خوشی ہے کہ جامعہ کے فرزندوں کی جانب سے ٹھوس علمی خدمت انجام دی جارہی ہے۔ امید کہ طالب علم اپنے لایق پروفیسر ڈاکٹر قریشی صاحب کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں گے اور خود میں وہ لازوال علمی ذوق پیدا کریں گے جو صاحب موصوف میں پایا جاتا ہے۔

(۷) جنگ اور اغذیہ :۔ از ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب ام۔ اے (پنجاب) ام۔ ایس سی (لندن) پی ایچ۔ ڈی (ڈبلن) صدر شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ۔ ۸۰ صفحات سائز کراؤن ۱/۱۶ قیمت ۱۵؍۔ انڈیا بک ہاؤس۔ حیدرآباد دکن عابد روڈ۔ شاہراہ عثمانی۔

ڈاکٹر قریشی نہایت پختہ مشق معاشی مصنف ہیں۔ آپ کو اُردو اور انگریزی ہر دو زبانوں پر

اچھا عبور حاصل ہے۔ آپ کی حسب ذیل چار ضخیم انگریزی کتابوں کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔

1. THE FARMER AND HIS DEBT
(London 1934)

2. AGRICULTURAL CREDIT
(London 1936)

3. THE STATE AND ECONOMIC LIFE
(Bombay 1933)

4. STATE BANKS FOR INDIA
(London 1939)

آپ کے بلند پایہ مضامین ہندوستان کے مختلف مشہور انگریزی رسالوں۔ مثلاً کامرس کیپیٹل اور السٹریٹیڈ ویکلی وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

اردو میں آپ نے آبادی کے نظریوں اور مسائل کے متعلق ایک بسیط مقالہ لکھا ہے۔ "تنظیم مابعد جنگ" اور "جنگ اور اغذیہ" آپ کے حالیہ رسالے ہیں۔

دور حاضرہ کے معاشی مسائل میں غذا کے مسئلے کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ہر پڑھا لکھا شخص جسے معاشی مسائل کے سمجھنے اور سلجھانے سے دلچسپی ہے یہ سوچتا رہتا ہے کہ ہندوستان میں قلت غذا کے کیا اسباب ہیں؟ اس مسئلہ کو کیونکر حل کیا جا سکتا ہے؟ حکومت کی طرف سے اس بارے میں کس قسم کی تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں؟ یہ تدابیر حقیقی مقصد کے حاصل کرنے میں کس حد تک کامیاب ثابت ہوئی ہیں؟ اگر نتائج زیادہ خوشگوار نہیں ہیں تو اس کے کیا اسباب ہیں؟ اس بارے میں بہتر مسلک کیا ہونا چاہئے؟

پروفیسر قریشی نے زیر تبصرہ رسالے میں مذکورہ تمام سوالات کے متعلق نہایت سیر حاصل مواد

پیش کیا ہے۔ آپ کا طرز استدلال نہایت سلجھا ہوا ہے اور نتائج بہت ہی منطقی ہیں۔ غذائی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے آپ نے جو سفارشات پیش کی ہیں ان سے مجھے بہت بڑی حد تک اتفاق ہے۔ اگر حکومت ہند آپ کی پیش کردہ تجویزوں پر پوری طرح عمل کرے تو ملک میں غذائی مسئلہ کو بہت بڑی حد تک حل کیا جا سکتا ہے۔ معاشیین کے متعلق عام اعتراض یہ کیا جاتا ہے ان کی سفارشات بیشتر نظری ہوتی ہیں لیکن لایق مصنف نے جو سفارشات پیش کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا کوئی مشورہ ناقابل عمل نہیں ہے۔ یہ رسالہ افراد اور حکومت دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔

محمد ناصر علی

اشتہارات

مجلۂ طیلسانیین کے مقاصد اور قواعد

(۱) مجلۂ طیلسانیین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا ترجمان ہے۔

(۲) اغراض انجمن کے لحاظ سے مجلہ میں:—

(i) جامعۂ عثمانیہ کے منظورہ مابعد طیلسانیین کے مقالے شائع کئے جائیں گے۔

(ii) اردو مطبوعات پر تنقید و تبصرہ کیا جائے گا۔

(iii) انجمن طیلسانیین عثمانیہ اور اس کے ملحقہ اداروں کی سرگرمیوں اور کاروبار کی تفصیلات شائع کی جائینگی۔

(iv) علمی اور مرہٹی ترقی کی معلومات و اطلاعات شائع کی جائیں گی۔

(v) سیاسیات حاضرہ اور اختلافی مذہبی امور کے متعلق مضامین وغیرہ کسی صورت میں شائع نہ کئے جائیں گے۔

(۳) حسب ضرورت مجلہ کے مختلف حصے خاص خاص علم و فن سے مختص ہونگے۔ فی الوقت مجلہ کے دو حصے ہونگے: حصۂ عام اور حصۂ حیاتیات

(۴) مجلہ بہمن، اردی بہشت، امرداد اور آبان، مطابق جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوگا۔

(۵) مجلہ کے ہر حصہ کی ضخامت کم از کم ۱۰۰ صفحے ہوگی۔

(۶) مضمون یا مقالہ نگاروں کو ان کے مضمون یا مقالہ کے ۲۵ اور ام اے کے مقالہ کے ۱۰ نسخے بلا قیمت ارسال ہونگے۔ بشرطیکہ پہلے مطلع کر دیا جائے۔ اگر اس سے زاید نسخے درکار ہوں تو کاغذ کی قیمت قبل از قبل ادا کرنے پر انتظام کیا جائے گا۔

(۷) اگر مضمون یا مقالہ نگار پہلے سے مجلہ کے خریدار نہ ہوں تو مجلہ کا وہ شمارہ جسمیں ان کا مضمون شائع ہو بلا قیمت ارسال کیا جائیگا۔

(۸) سال بھر میں کسی صاحب کے دو مضمون یا مقالے شائع ہونے کی صورت میں سال مابعد کے لئے اگر قواعد انجمن طیلسانیین عثمانیہ مانع نہ ہوں تو مجلہ بلا قیمت جاری کیا جائے گا۔

(۹) اگر مضمون یا مقالہ یا نظم قابل اشاعت قرار نہ پائے تو اس کو واپس کر دیا جائے گا۔

(۱۰) اگر کسی مضمون یا مقالہ کے لئے مجلہ اپنے خرچ سے تصاویر کے بلاکس تیار کرے تو ان کو مناسب قیمت پر، جس کا تصفیہ مہتمم مجلہ کرے گا، فروخت کیا جاسکے گا۔

(۱۱) اگر مجلہ کا کوئی شمارہ اشاعت مقررہ مہینہ تک وصول نہ ہو تو اسکی اطلاع مہتمم کو دوسرے مہینہ میں کردینی چاہیئے۔

مجلّہ طیلسانین کا چندہ

۱۔ مجلّہ چندہ دہندہ ارکان انجمن طیلسانین عثمانیہ کو مقررہ قواعد کے بموجب بلا قیمت ارسال کیا جائیگا۔

۲۔ مجلہ کا حصہ معاشیات معاشی کمیٹی انجمن طیلسانین کے ارکان کو اپنے چندہ رکنیت کے علاوہ سالانہ (عہ) روپیہ ادا کرنے پر ارسال کیا جائیگا۔ اگر ان کو مجلّہ کے دونوں حصے مطلوب ہوں تو اس کیلئے ان کو سالانہ دو روپیہ اپنے چندہ رکنیت کے علاوہ ادا کرنا ہوگا۔

۳۔ مجلّہ کے دونوں حصوں کی قیمت علاوہ محصول ڈاک خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ پانچ روپیہ سکہ عثمانیہ اور بیرون مملکت آصفیہ سے پانچ روپیہ سکہ حکومت ہند ہوگی۔

۴۔ مجلّہ کے عام حصہ کی قیمت محصول ڈاک کے علاوہ خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ (سعہ) روپے سکہ عثمانیہ اور بیرون مملکت آصفیہ سے (سے) روپے سکہ حکومت ہند ہوگی۔

۵۔ مجلّہ کے حصۂ معاشیات کی قیمت علاوہ محصول ڈاک خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ (سے) روپے سکہ عثمانیہ ہوگی اور بیرون مملکت آصفیہ سے (سے) روپے سکہ حکومت ہند۔

۶۔ مجلّہ کے ہر حصہ کی قیمت فی نسخہ [illegible] دونوں حصوں کی ایک روپیہ آٹھ آنے ہوگی۔

۷۔ تبادلہ کے طور پر اشتہارات کی اشاعت مطلوب ہو تو مراسلت کے ذریعہ تصفیہ ہوسکے گا۔

۸۔ مجلّہ کے سلسلہ میں ہر قسم کی مراسلت مہتمم مجلّہ طیلسانین دفتر مجلس ”نمائش گاہ باغ عام“ حیدرآباد دکن کے توسط سے کی جانی چاہیئے۔

۹۔ خریداران مجلّہ اپنے پتہ کی تبدیلی سے مہتمم مجلّہ کو بروقت مطلع فرمائیں۔

اشتہارات کا نرخ

صفحہ	چار بار کے لئے	ایک بار کے لئے	صفحہ	چار بار کے لئے	ایک بار کے لئے
پورا صفحہ پہلا ورق	۳۰ روپے سالانہ	۱۲ روپے سالانہ	پورا صفحہ اندرونی	۲۰ روپے سالانہ	۶ روپے سالانہ
آدھا صفحہ ″	۲۰ روپے سالانہ	۸ روپے سالانہ	آدھا صفحہ ″	۱۵ روپے سالانہ	۵ روپے سالانہ
پاؤ صفحہ ″	۱۵ روپے سالانہ	۱۰ روپے سالانہ	پاؤ صفحہ ″	۸ روپے سالانہ	۳ روپے سالانہ

سلسلہ مطبوعات انجمن طیلسانیئن عثمانیہ

نام کتاب	مصنف	قیمت
۱- عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیان ریاست	سید علی محسن ام اے (عثمانیہ)	دو روپے
۲- سلطان احمد شاہ بہمنی	ظہیر الدین ام۔ اے (عثمانیہ)	دو روپے
۳- امام غزالی کے کلامی خصوصیات	محمد غوث (محبوب نگری) ام اے (عثمانیہ)	ایک روپیہ آٹھ آنہ
۴- موضع دوپلی کی معاشی تحقیق	محمد ناصر علی ام، اے (عثمانیہ)	دو روپے
۵- دربار اودھ کا اثر لکھنو کی شاعری پر	محمد اعظم ام اے (عثمانیہ)	ایک روپیہ
۶- معاشیات کی الف بے	محمد ناصر علی ام اے (عثمانیہ)	آٹھ آنے
۷- عہد معاونت اور حیدرآباد	عزیز علی خاں ام اے (عثمانیہ)	دو روپے
۸- بلدہ سے قصبہ تک	بی اے (عثمانیہ) ایچ-سی-ایس	۴؍
۹- پاور الکحل	نظیر حسین آفندی ام ایس سی (عثمانیہ)	۴؍
۱۰- معاشی محاصل ان کے اقسام اور نوعیت	محمد فاروق بی-اے (عثمانیہ) ایچ،سی،ایس	۴؍
۱۱- ہندوستانی معاشیات کے مبادی	شرف الدین بی-اے (عثمانیہ)	(زیر طبع)
۱۲- اسلام کے معاشی نظریے	محمد یوسف الدین ام- اے (عثمانیہ)	
۱۳- پریم چند اور ان کی افسانہ نگاری	محمد اکبر الدین صدیقی ام-اے (عثمانیہ)	(زیر طبع)

سائنس

انجمن ترقی اُردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

یہ رسالہ ملکی زبان میں سائنس ... احد رسالہ ہے جس میں مختلف
مضامین کے علاوہ ... ات سائنس سے متعلق سوال
وجواب سائنس ... اور نئی کتابوں پر
تبصرے شائع ہوے ... ہنا شائع ہوتے ہیں
اُمید ہے کہ علم کے شائقین اور اُردو زبان کے بہی خواہ سرپرستی فرمائیں گے
اشتہارات کے نرخ طلب کئے جاسکتے ہیں۔

چندہ سالانہ صہ سکہ انگریزی صہ سکہ عثمانیہ
نمونہ کا پرچہ آٹھ آنے کلدار، دس آنہ عثمانیہ

المشتہر
معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

مجلہ طیلسانین

(حصہ عام)

انجمن طیلسانین عثمانیہ کا علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ

(مدیر)

محمد غوث ام۔اے۔ ال ال بی (عثمانیہ)

(مہتمم)

محمد عبدالعلی بی ایس سی ال ال بی (عثمانیہ)

سالانہ چندہ (صہ) علاوہ محصول ڈاک قیمت فی پرچہ ایک روپیہ آٹھ آنے

دفتر مجلہ طیلسانین نمائش گاہ باغ عامہ حیدرآباد دکن ٹیلیفون ۲۵۵۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجلہ طیلسانین عثمانیہ حصۂ عام

جلد ۴ شمارہ ۴ | اکتوبر ۱۹۴۴ء

فہرست مضامین

گوشوارہ حسابات باقی متعلقہ مجلس انتظامی بابت ۱۳۵۳ف



سید محمد اعظم صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ایس سی (کنٹب)
معین امیر جامعہ عثمانیہ

اداریہ

معین امیر جامعہ کا خیر مقدم

جناب سید محمد اعظم صاحب معین امیر جامعہ عثمانیہ کی شخصیت ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کے لیے کسی تعارف کی محتاج نہیں کیونکہ صاحب موصوف کی علمی اور عملی قابلیت، تقریری اور تحریری صلاحیت، طالب علموں کے لیے پدرانہ محبت، اساتذہ کے ساتھ ہمدردانہ سلوک اور عملے کے کارکنوں پر غیر معمولی عنایات سے تقریباً سب واقف ہیں۔ اپنی اعلیٰ خصوصیات کی وجہ سے آپ ہر طبقے اور جماعت میں، مذہب و ملت کی تخصیص کے بغیر، ہمیشہ ہر دلعزیز رہے ہیں۔ ملک و ملک کی خاموش خدمت آپ کا ہر وقت شعار رہا ہے۔ پروپگنڈے اور تشہیر سے آپ نے ہمیشہ احتراز کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آجکل کے شدید پروپگنڈے کے زمانے میں ملک نے آپ کی اعلیٰ خدمات سے حقیقی استفادے کی طرف بہت دیر میں توجہ کی۔

آپ کی عمر کا بڑا حصہ تعلیمی مسائل کے سمجھنے اور سلجھانے میں گذرا ہے۔ اس دوران میں آپ نے جو خدمات انجام دی ہیں اُن کی بنا پر آپ کا شمار ملک کے ماہران تعلیم میں کیا جاتا ہے۔ اس تقرر کی وجہ سے تمام عثمانئین انتہائی اطمینان محسوس کرتے اور نہایت مسرت کے ساتھ صاحب موصوف کا، اس عہدے پر، دلی خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہم حکومت کو مبارک باد دیتے ہیں کہ جامعہ کے موجودہ بحرانی دور میں اس نے اسقدر ذمہ دارانہ عہدے کے لیے ملک کی موزوں ترین شخصیت کا انتخاب فرمایا۔

ہمیں اپنے معین امیر جامعہ سے، جامعہ کی اصلاح اور ترقی کے سلسلے میں بڑی توقعات ہیں۔ امید کہ جامعہ کی موجودہ خرابیاں مکمل طور پر جلد دور ہو جائیں گی اور اس کا رتبہ بالآخر اسی قدر بلند ہوگا جو اس کے نام کے شایان شان ہے۔

اس میں شک نہیں کہ محترم معین امیر جامعہ، جامعہ کے اصلاح طلب امور سے اچھی طرح واقف ہیں اور گذشتہ چند مہینوں سے ان کی اصلاح پر غور کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ جلد یہ اصلاحات عمل میں آئیں گے۔

ایک عثمانیہ طیلسانی کو جامعہ مدراس سے ڈی، ایس سی کی ڈگری

ڈاکٹر آف سائنس یعنی ڈی، ایس سی اعلیٰ ترین علمی ڈگری ہے جس کا حاصل کرنا بلند پایہ تحقیقاتی کام کے بغیر ممکن نہیں۔ ہماری جامعہ کے ایک سے زائد طیلسانین یہ اور اسی قسم کی دوسری اعلیٰ ڈگریاں ہندوستان اور یورپ وغیرہ کی دوسری ممتاز جامعات سے حاصل کر چکے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے طیلسانین علمی معیار کے لحاظ سے کسی دوسری جامعہ کے طیلسانیوں سے پیچھے نہیں۔

ہمیں اس امکا اعلان کرتے ہوئے بڑی مسرت ہے کہ حال ہی میں ہماری جامعہ کے ایک قابل پروفیسر جناب رحیم اللہ صاحب ام ایس سی (عثمانیہ) کو جامعہ مدراس نے ان کے اعلیٰ تحقیقاتی کام کی بنا پر ڈی ایس سی کی ڈگری عطا کی ہے۔ تمام عثمانی برادری کی جانب سے ہم صاحب موصوف کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

ڈاکٹر رحیم اللہ صاحب کا تعلق حیدرآباد کے ایک ممتاز فوجی خاندان سے ہے جس نے ریاست حیدرآباد اور سرکار عظمت مدار کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ چنانچہ اس وقت بھی آپ کے چار بھائی فوج میں ملازم ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی تعلیم کا زیادہ زمانہ علیگڈھ میں گزرا جہاں سے انھوں نے حیاتیات میں بی ایس سی کی ڈگری امتیازی درجہ کے ساتھ حاصل کی (۱۹۲۵ء) اور مضمون اختیاری میں اول رہے۔ ۱۹۲۷ء میں لکچرر حیاتیات کی حیثیت سے جامعۂ عثمانیہ میں ملازم ہوئے۔ یہاں آپ کو ڈاکٹر داسس صاحب صدر شعبہ حیاتیات کی علمی صحبت کا موقعہ ملا چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے بہت جلد آپ کو تحقیقاتی راستہ پر ڈال دیا۔ آپ نے ۱۹۳۴ء میں جامعہ عثمانیہ سے ام ایس سی کی ڈگری بدرجہ اول



ڈاکٹر محمد رحیم اللہ صاحب

حاصل کی اور اس کے بعد بھی ڈاکٹر داس صاحب کی ماہرانہ رہنمائی میں تحقیقی کام انجام دیتے رہے۔ اب تک آپ کے پچاس سے زاید مقالے انگلستان، جرمنی اور ہندوستان کے تحقیقاتی رسالوں میں شایع ہو چکے ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر رحیم اللہ صاحب کی علمی کامیابی بہت بڑی حد تک ڈاکٹر داس صاحب کی رہین منت ہے اس لیے ہم انھیں بھی پرخلوص مبارک باد دیتے ہیں۔

تدریسی اور تحقیقاتی کام کے سوا ڈاکٹر رحیم اللہ صاحب کرکٹ کے مشہور کھلاڑی ہیں۔ جامعہ کی ٹیم میں کھیلنے کے علاوہ آپ چوقومی کرکٹ ٹورنمنٹ میں بھی کھیلتے رہتے ہیں۔ عرصہ تک آپ جامعہ میں کرکٹ اور اسپورٹس کے صدر رہے۔ آجکل آپ محکمہ سکلیات کے صدر ہیں اور یہاں بھی آپ کے علمی اور تحقیقاتی مشاغل برابر جاری ہیں۔ علمی تحقیق اور تجسس میں ان کی مستقل مزاجی جامعہ کے نوجوانوں کے لیے قابل تقلید ہے۔

نظام قانون اور معاشرہ

بقول لارڈ برائیس ہر ملک کا قانون اُس ملک کے خاص معاشی اور معاشرتی حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ اگر کسی نظام قانون کے مختلف ادارات کا تجزیہ کریں تو اس امر کا انکشاف ہوگا کہ ہر ادارہ کسی نہ کسی خاص معاشی یا معاشرتی ضرورت پر مبنی ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ جس طرح معاشی حالات بدلتے جائیں اُسی مناسبت سے نظام قانون میں تبدیلی کی جائے۔ ورنہ قانون اور معاشرتی حالات کے عدم تطابق کا نتیجہ انقلاب ہوا کرتا ہے۔ جو ایک بدترین صورت حال ہے۔ کون نہیں جانتا کہ انقلاب فرانس اور روس دراصل ان ممالک کے قوانین کی پیدا کردہ تباہ حالیوں کا نتیجہ تھے۔ قوانین میں بروقت تبدیلی نہیں کی گئی نتیجۃً سخت قسم کے خونی انقلابات رونما ہوئے۔ لہذا یہ بالکل ضروری ہے کہ وقتاً فوقتاً ملک کے معاشی حالات کا جائزہ لیا جائے۔ اور اُسی مناسبت سے قوانین میں ترمیم کی جائے۔ ورنہ ملک کی معاشی اور تمدنی ارتقاء میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔

اگر ہم دنیا کے کسی نظام قانون کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر دور میں اس امر کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ قوانین کو معاشرتی حالات کے مطابق بنایا جائے۔ چنانچہ قرون وسطیٰ کے انگلستان میں جبکہ جاگیرداری نظام رائج تھا، تو مزروعہ اراضی کے ساتھ ساتھ حق چراگاہ بھی حاصل تھا، لیکن جب چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کے طبقے ملک میں پیدا ہوئے تو چراگاہوں کا یہ حق زرعی ترقی کی راہ میں ممد و معاون ہونے کی بجائے ایک خطرناک رکاوٹ ثابت ہوا۔ نتیجۃً اس حق کو ختم کردیا گیا۔ ایسی مثالیں قانون روما میں بھی کچھ کم نہیں۔ چنانچہ گیس کے مجموعہ قانون اور جسٹینین کا تقابلی مطالعہ کریں تو ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ چنانچہ اصلاً پسر خاندان کو جائیدادی حقوق حاصل نہ تھے۔

لیکن بعد میں بمناسبت حالات فوجی خدمات یا ملکی خدمات کے صلہ میں جو جائداد حاصل ہو، وہ پسر خاندان کی مکسوبہ سمجھی گئی۔ اور پدر خاندان کو اس جائداد پر کوئی اختیارات حاصل نہ رہے اگر تاریخ کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں فوجی نظام کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی تھی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ روما پر خود ایک قسم کی فوجی حکومت اس زمانہ میں قائم ہو چکی تھی۔ قانون بارہ الواح کی بموجب صرف رومیوں کو حقوق شہریت حاصل تھے۔ تمام غیر رومیوں سے صوابدید پر عمل کیا جاتا تھا۔ غیر رومیوں سے جو معاہدہ کیا جاتا وہ قانوناً قابل پابندی نہ تھا۔ غیر رومیوں کے خلاف رومیوں پر کوئی تعزیری ذمہ داری عائد نہ کی جاتی تھی۔ لیکن جب ملک کے معاشی اور معاشری حالات میں تبدیلی ہوئی اور رومی شہنشاہی اقتدار اطراف وجوانب کے علاقوں پر رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور دیگر اقوام سے معاشی اور سیاسی تعلقات کی ابتدا ہوئی تو قانون روما میں اصول انصاف اور نصفت کو دخل دیا گیا۔ اور قانون اجانب کی بموجب بہت سی بنیادی تبدیلیاں کی گئیں۔ چنانچہ اس غرض کے لیے "نظام اعلانات" اور پریٹر خارجہ کا تقرر عمل میں آیا۔ جس کے بعد سے معاملات دنیاوی کے سلسلہ میں رومیوں اور غیر رومیوں میں کوئی فرق نہیں کیا جانے لگا۔ اگر اس قسم کی تبدیلی بر وقت نہ کی جاتی تو یہ تقریباً ناممکن تھا کہ رومی تہذیب و تمدن اس قدر ترقی کر جائے۔ جیسا کہ آج اس کو حاصل ہے۔ چنانچہ یہ مسلم ہے کہ رومی قانون کا اثر دنیا کے ۲/۳ ممالک کے قوانین پر پایا جاتا ہے۔

ہندو نظام قانون کا بھی مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندو قانون ہمیشہ معاشری حالات کے مطابق بدلتا رہا ہے۔

ابتدائی دور میں جبکہ قبیلہ واری نظام رائج تھا تو پسر خاندان اور عورتوں کو خاندانی جائدادیا ان کی مکسوبہ ذاتی جائداد پر بھی کسی قسم کا اختیار و تصرف حاصل نہ تھا چنانچہ منو کا یہ مشہور مقولہ ہے کہ "جو کچھ بیبہ (لڑکے) پیدا کرتے ہیں وہ انکی ملک ہوگی جس کے

یہ تابع ہوں گے قبیلہ داری نظام کی جڑیں کسی قدر کھوکلی ہوگئیں اور انفرادیت کا دور دورہ ہوا تو اس قانون میں تبدیلی کی غرض سے دو مفروضات قانونی کو پیش کیا گیا پہلا پیدائشی حق اور دوسرے مشترک ملکیت کا تصور۔

ہندو قانون کا ہر متعلم جانتا ہے کہ "پیدائشی حق" کے تصور کی بنا پر نظام قانون میں بنیادی تبدیلی کی گئی۔ نتیجۃً پسر خاندان کے حقوق میں اضافہ اور بزرگ خاندان یعنی باپ اور کرتا کے اختیارات میں نمایاں حد تک کمی واقع ہوئی۔ البتہ ہندو مقننوں نے "مشترکہ ملکیت" کے تصور کو بہت زیادہ ترقی نہیں دی نتیجۃً عورت کے حقوق میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا۔

ہندو قانون میں اصلاً خاندان مشترکہ کا تصور پایا جاتا تھا انفرادیت کے تصورات کی بنا پر "تقسیم" کی ابتدا ہوئی اس سلسلہ میں منو سمرتی میں جو منطقی استدلال تقسیم جائداد کی تائید میں پیش کیا گیا ہے قابل ذکر ہے۔

"تقسیم میں زیادہ سے زیادہ محاسن ہیں کیونکہ اشتراک خاندان کی صورت میں مذہبی فرائض، رسوم اور خیرو خیرات صرف مرکزی حیثیت سے انجام پاتے ہیں لیکن تقسیم کی صورت میں ہر رکن خاندان علیحدہ علیحدہ طور پر مذہبی فرائض انجام دیتا اور خیرات کرتا ہے یعنی تقسیم سے زیادہ سے زیادہ روحانی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ لہذا تقسیم جائز اور مذہبی حیثیت سے بہت زیادہ مستحسن ہے۔"

ان چند مثالوں سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ ہر ملک کے نظام قانون کو اس ملک کے معاشی اور معاشرتی حالات سے بہت زیادہ قریبی تعلق ہوتا ہے۔ بقول پروفیسر ایلین۔

"نظام قانون عوام کی روح ہے جس طرح قومی نظمیں وجود پذیر ہوتی ہیں۔

اسی طرح قانون بھی پیدا ہوتا ہے۔ مذہب کو جو درجۂ تقدس حاصل ہے۔ قانون کو بھی اسی قدر اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ نظام قانون زبان کی طرح پیدا ہوتا اور ترقی کرتا ہے چنانچہ اس کے ارتقاء میں مذہبی اور اخلاقی تصورات ممد و معاون ہوتے ہیں۔"

دیگر ادارات کی طرح نظام قانون میں بھی زمانہ اور حالات کے لحاظ سے تبدیلی کی ضرورت داعی ہوتی ہے۔ قوانین بھی ون بدن مرور زمانہ سے ترمیم طلب ہوتے ہیں۔ ہندو قانون میں ارتقاء اور تبدیل پذیر حالات کو بہت زیادہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ سرداری کاری کے الفاظ ہیں:۔

"ہندو قانون دراصل ایک ارتقا اور حالات کی پیداوار ہے۔ معاشی ضروریات اسکی پیدائش کا باعث ہوئے ہیں۔ ملک کی معاشی ترقی نظام قانون پر اثرانداز ہوتی رہی ہے۔ ملک کے معاشی اور معاشرتی ادارات جس نسبت سے ترقی کرتے ہیں نظام قانون بھی اسی نسبت سے ترقی کرتا رہا ہے۔ ہندو قانون کبھی حالت سکون میں نہ تھا۔ چنانچہ وششٹھ کا خیال ہے کہ ماہران قانون کے فیصلے قانون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تمام مابہ النزاع امور میں انہی کے فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ منو کا خیال ہے کہ مجالس قانون ساز جس میں تین ویدوں کے عالم ہوں یا کم از کم ایک فرد جس کا صدر ایک قابل ترین شخص ہو تمام قانونی اور واقعاتی شکوک رفع کر سکتے ہیں انکا فیصلہ قطعی ہوگا۔

ہندو قانون کی تبدیلی کے تین خصوصی ذرائع برہمنوں کو حاصل تھے جن میں پہلا تعبیر قانون دوسرا عدل گستری اور تیسرا ذریعہ نیک لوگوں کا عمل تھا اب برہمنوں کو عدالتی اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ موجودہ نظام عدل گستری اور قانون ساز اداروں کے ادارات کی بنا پر تعبیر قانون اور رواج پر بہت سی قانونی کتابیں عائد ہوتی ہیں۔ نتیجتاً ہندو قانون میں سخت قسم کی سکونی حالت پیدا ہوگئی ہے۔ ضرورت ہے کہ معاشری حالات کا جائزہ لیا جائے اور نظام قانون کو ملک کے تبدیل پذیر حالات کے مطابق بنایا جائے۔ فقط

شیخ حیدر
بی۔ اے۔ ایل ایل ایم

تاروں کی بستی

از محمد عبد الرحمن خان صاحب سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ -

(یہ تقریر نشر گاہ حیدرآباد سے بتاریخ ۱۵ آذر ۱۳۴۵ف نشر کی گئی جو باجازت شایع کیجاتی ہے)

کون ایسا شخص ہے جس نے ابر سے پاک اندھیری رات میں آسمان پر تاروں کا دلفریب منظر دیکھ کر روحانی انبساط نہ حاصل کیا ہو اور یہ نہ محسوس کیا ہو کہ روزمرہ زندگی کی حقیر فضا، سے بالاتر ایک ایسی فضا ہے جہاں انسان اپنے آپ کو اگر عالم خیال میں منتقل کر دے تو امن ہی امن موجود ہوگا۔ ہر مذہبی کتاب میں تاروں کی پرسکون چمک دمک کا حوالہ دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ ان کی طرف اشارہ کرکے اللہ تعالیٰ کی عظمت و جبروت کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ تاروں کے مطالعہ سے جو قلبی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا صحیح اندازہ وہی کر سکتا ہے جو ہیئت سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اور کم از کم اس کے مبادیات سے واقف ہو۔ ذرا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ آسمان پر مختلف سمتوں میں ستاروں کی جداگانہ تشکیل ہے۔ ان ہی کو صُوَر سماوی یا کنسٹیلیشنز ...... Constellations کہتے ہیں۔ اگرچہ ستاروں کی تعداد کئی ہزار کروڑ سے متجاوز ہو گئی ہے لیکن قدیم و جدید مشاہدات کے لحاظ سے ان کی تقسیم (۸۸) صُوَر سماوی میں کی گئی ہے۔ ان کے اکثر نام دور مسیحی سے بھی پہلے کے ہیں۔ بابل، خالدیہ، مصر، ہندوستان چین اور ایران کے گمنام منجموں نے خدا معلوم کن جذبات کے تحت ان کے نام مقرر کیے۔ اکثر تو فرضی دیوتاؤں، انسانوں کے مشہور مردوں عورتوں اور جانوروں کے ناموں سے منسوب ہیں۔ چند ایک خصوصاً جنوبی صُوَر کے نام نسبتاً جدید ہیں۔ ان میں بھی کوئی خاص ندرت یا خوبی نہیں ہے۔ ہائیڈرا نام کی ایک قدیم (پانی کے سانپ کی) صورت ہوتے ہوئے

ہائیڈرس (صیغہ مذکر) نام کی جدید صورت کیوں بنائی گئی ۔ صُوَر سماوی کے اردو یا عربی
ناموں کی تفصیل اگر مقصود ہو تو سہولت کی خاطر مجلہ عثمانیہ جلد ہفتم شمارہ دوم و چہارم
کا مضمون لعنوان نظام الکواکب مطالعہ کیا جا سکتا ہے ۔

تمام ستاروں کو ان کی قدروں یعنے ظاہری چمک کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے
نہ صرف حروف ءہ، ب، ج، د وغیرہ (مرادف α، 'B'، γ) کے ذریعہ بحوالہ صورت
سماوی ان کی شناخت کی جاتی ہے بلکہ پیمایش سے ان کے محل وقوع یعنے صعود مستقیم و
میل سماوی بھی قلمبند کیے گئے ہیں ۔ ثابت ستارے نظام شمسی سے اس قدر دور
واقع ہیں کہ سینکڑوں سال میں بھی ان کی تشکیل وغیرہ میں کوئی معتد بہ فرق نہیں پایا
گیا اسی طرح ان کی چمک یا قدر میں بھی بہت کم تبدیلی محسوس ہوئی ہے ۔ البتہ جدید طریقہ
کے آلات پیمایش اور خصوصاً فوٹوگرافی کی مدد سے ستاروں کی ظاہری قدروں اور محل وقوع
میں بھی خفیف مگر معین فرق مشاہدہ ہو رہے ہیں ۔ ستاروں کی اس تغیر پذیر اور حقیقی فضائی
حرکت Proper Motion پر ہیئت کے شیدائیوں نے گذشتہ پچاس سال میں
نمایاں کام کیا ہے ۔ متحرک کو کبی خوشوں اور کہکشاں کی گردش کا علم بھی زیادہ تر اسی قسم کی
تحقیقات سے ہو رہا ہے ۔

۳ اندھیری راتوں میں آسمان پر ایک چوڑی منور پیٹی افق تا افق پھیلی ہوئی دکھائی دیتی
ہے جس کا نام کہکشاں ہے اس میں بمقابل اور فضاء سماوی کے تاروں کا انتہائی اجتماع
ہے ۔ یہی ہمارا اپنا کوکبی نظام ہے ۔ بڑی طاقت کی دُوربینوں میں اس پیٹی کے ستارے
ایک دوسرے سے علحدہ نظر آتے ہیں ۔ زمانہ جاہلیت کے عربوں کی تیز نگاہ سے یہ حقیقت
چھپ نہ سکی چنانچہ متعدد اشعار عربی کے دستیاب ہوئے ہیں جن سے اس کا کافی ثبوت
ملتا ہے ۔

۴ ستاروں کی نہ صرف قدریں مختلف ہیں بلکہ ان کے رنگ بھی جدا جدا ہیں ۔ خالی آنکھ

دوربین کی مدد بغیر صرف چھٹی قدر کے ستاروں کو دیکھ سکتی ہے۔ بڑی دوربینوں میں بیس قدر کے کواکب بھی پہچانے جا سکتے ہیں۔ ان دوربینوں میں بعض کوکبی خوشے ایسے رنگین اور خوشنما نظر آتے ہیں کہ ان کے مقابلہ میں زمین کا بہترین منظر یا عجیب سے دلچسپ نظارہ مدھم پڑ جاتا ہے۔

رصدگاہ مونٹ ولسن کی مدد سے نہ صرف سر ولیم ہرشل کے دریافت کردہ کوکبی اور کوکبی سحابیوں Nebulae کی تعداد میں انتہا درجہ اضافہ ہوا ہے۔ بلکہ طیف نما اور فوٹوگرافی کی صنعتی کے استعمال سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ہمارے کہکشاں جیسے لکھوکھا دوسرے کہکشاں جو ہمیں کوکبی سحاب کی شکل میں دکھائی دیتے اور ہم سے اتنے دور ہیں کہ ہم تک ان کا نور باوجود اپنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ کی رفتار کے لکھوکھا سال سفر کیے بغیر پہنچ نہیں سکتا، ایک دوسرے سے حیرت انگیز تیز رفتار کے ساتھ دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ہرشل کی اصطلاح میں یہ فضائی کہکشاں جزیری کائنات کہلاتے ہیں۔ بروئے اوسط وہ ایک دوسرے سے دس لاکھ نور سال دور ہیں ان میں کروڑہا کی تعداد میں تقریباً اتنے ہی ستارے ہیں جتنے ہمارے اپنے کہکشاں میں ہیں۔ ان کے اندر بھی تاروں کے ایسے ہی کروی خوشے موجود ہیں جو ہمارے کہکشاں میں دریافت ہوئے ہیں۔ ان کے اردگرد بھی ایسے کوکبی ابر ہیں جیسے ہمارے مجلانی ابر Magellanic Clouds ان ہی مشاہدات و انکشافات سے متاثر ہو کر حیدر ربانی کے موقع پر شاعر نے کہا ہے۔

صد کہکشاں نہفتہ بہر گوشۂ فلک ہر اختر آفتاب در آغوش کہکشاں

ہیئت کے بعض شائقین کو شاید ہندوستان کی رصدگاہوں کی قلت و بے بساطی سے یہ اندیشہ ہوگا کہ کوکبی دنیا کا پورا لطف صرف امریکہ یا یورپ ہی کے باشندے اٹھا سکتے ہیں خالی آنکھ سے مشاہدہ نسبتاً بے لطف ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں ہیئت کا شیدائی اگر اپنا مشاہدہ جاری رکھے تو خالی آنکھ یا معمولی طاقت کی دوربینوں

سے بھی وہ نہ صرف تاروں کا جشن منا سکتا ہے بلکہ بڑا ہی مفید علمی کام بھی کر سکتا ہے۔ متغیر اور نئے ستاروں Novae کا مطالعہ بہت ہی دلچسپ اور سودمند مشغلہ ہے۔ بشرطیکہ مشاہدہ کرنے والا تمام ستاروں سے اچھی طرح واقف ہو۔

اکثر ستاروں کی قدر میں چند ہی سال کے اندر بہت ہی خفیف مگر قابل لحاظ فرق محسوس ہوتا ہے۔ بعض کا رنگ بھی بدلتا ہے کبھی کبھی غیر محسوس طریقہ پر نئے ستارے بھڑک اٹھتے ہیں اور پھر کچھ مدت کے بعد مدھم پڑ جاتے ہیں۔ یا خالی آنکھ سے بالکلیہ غائب ہو جاتے ہیں۔ نووے Novae یا ہنگامی ستاروں کے عنوان سے میں نے جو مضمون سائنس اینڈ کلچر کلکتہ (جلد اول نمبر ۹ ۱۹۳۶ء) میں شایع کیا ہے اس میں نہایت عام فہم طریقہ پر ان کی خصوصیات اور طبیعی حالات کا ذکر درج ہے۔ سب سے پہلے ۱۳۴ قبل مسیح میں جو نیا ستارہ مشاہدہ ہوا عام طور پر مشہور رہے کہ اسی کو دیکھ کر ابرخس Hipparchus نے اپنا مشہور کوکبی کٹیلاگ تیار کیا۔ اسی تاریخ سے کوکبی ہیئت کی باضابطہ تحقیق شروع ہوتی ہے۔ ۱۵۷۲ء سے آج تک کوئی ۷۰ نئے ستارے نوٹ کیے گئے ہیں جن میں ۱۹۰۱ء کا برسیاوش کی صورت سماوی کا نمبر (۲)، ۱۹۱۸ء کا صورت عقاب کا نمبر (۳) پہلی قدر کے تاروں سے زیادہ روشن تھے۔ ۱۹۳۴ء کا ہرقل کی صورت سماوی والا نیا ستارہ ۱۰۴۵ قدر تک چمک اٹھا۔ یقین ہے کہ حیدرآباد کے اکثر تعلیم یافتہ اشخاص نے اس کو دیکھا اور اس کے طبیعی مناظری حالات سے واقف ہونے کی کوشش کی ہوگی ۱۹۴۲ء کا سکان یعنے Puppis کی صورت سماوی کا نیا تارا بھی پہلی قدر سے زیادہ روشن تھا۔ ۱۲۔ دسمبر کو گرینچ کے اوسط وقت ۱۶ ساعت کو اس کی چمک اپنی اعظم قیمت کو پہنچ گئی۔ اور وہ نسر واقع Vega یعنے شلیاق Lyra کی صورت کے سب سے زیادہ روشن تارے سے بھی روشن تر نظر آیا۔ واضح ہو کہ نسر واقع تمام تاروں میں باعتبار ظاہری چمک تیسرا ستارہ ہے اور اسوقت شمال مغرب میں وضاحت کے ساتھ

چمک رہا ہے۔

جو ستارہ ہم کو سب سے زیادہ منور دکھائی دیتا ہے وہ شعرالشامیہ (کلام مجید کا شعرا) Sirius ہے اس کے بعد سہیل یمن Canopus - ان دنوں رات کے ساڑھے چار بجے یہ دونوں ستارے آسمان کے نہایت جاذب نظر خطہ میں خط نصف النہار کے جنوبی حصہ میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ ثوابت، خصوصاً بڑی چمک کے ثوابت کی تنویر میں جو لرزش یا سنٹیلیشن Scintillation پائی جاتی ہے اس سے ان کا حسن اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ بچپن میں فارسی کے طالبعلموں نے بوستان کی وہ نظم پڑھی ہوگی جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

شنیدم کہ طغرل شبے در خزاں ؛ گزر کرد بر ہندوے پاسباں
زباریدن برف و باران و سیل ؛ بہ لرزش درافتادہ ہمچون سہیل

سعدی جیسے مناظر قدرت کے مشاہدہ کے ماہر سے سہیل کی لرزش کیونکر چھپ سکتی تھی۔ نئے تاروں کے بھڑک اٹھنے سے بعض اوقات ان کی تنویر میں چند ہی گھنٹوں کے اندر دو ہزار گنا زیادہ حدت پیدا ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ ان کے گرد کے سیاروں پر ہماری زمین کے سے نباتات یا حیوانات ہوں تو چند منٹ ہی کے اندر جل کر خاک ہو جائیں گے تاروں کے گذشتہ حالات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر تاروں نے اپنے کروڑھا سال کی عمر میں کبھی نہ کبھی Nova کا جنم لیا ہوگا۔ یعنے ان کی تنویر میں اچانک خطرناک ترقی ہوئی ہوگی۔ بعض سربرآوردہ ہیئت دانوں کی رائے ہے کہ اس طرز عمل سے اگر ایک طرف ان کے سیاروں کے نباتات و حیوانات فنا ہو سکتے ہیں تو دوسری طرف خود سیاروں کی تخلیق کا امکان ہے۔ ہیجان کے عالم میں ان ستاروں سے جو مادّہ وقتاً نوقتاً خارج ہوتا ہے اس کے منجمد ہونے سے کیا عجب کہ بعض صورتوں میں سیارے، ومدار تارے وغیرہ پیدا ہوں۔

ہمارا آفتاب بھی درحقیقت ایک تارا ہے قربت کی وجہ سے بڑا (تقریباً نصف درجہ قطر کا) جرم اور نہایت ہی منور نظر آتا ہے۔ زمین اس کی گرمی اور روشنی سے پرورش پاتی ہے۔ ہمارے اپنے کہکشاں کے تاروں میں آفتاب چوتھی قدر کا زرد رنگ کا تارا ہے۔ پلوٹو Pluto پر اگر دیکھنے والی آنکھیں ہوں تو انھیں وہ عیوق Capella یعنے ممسک الاعنہ کی صورت کے سب سے زیادہ روشن ستارہ کی طرح زرد لیکن بدرجہا زیادہ منور تارا نظر آئے گا۔

تاروں کی ذاتی تنویر (یعنے سطحی تپش) حجم اور کثافت میں اگرچہ انتہائی اختلاف ہے ان کی کمیت یعنے مقدار مادّہ میں چنداں فرق نہیں۔ ابط الجوزا جوجبار کی صورت کا سب سے بڑا سرخ رنگ کا ستارہ ہے اتنا بڑا ہے کہ سورج اس کے اندر مریخ کا مدار لیے ہوئے سما سکتا ہے اسی طرح قلب عقرب Antares بھی ایک دیو ہیکل ستارہ ہے۔ ان کی کثافت نیون Neon گیس کی نام نہاد خلائی نلی کی کثافت سے بھی کئی لاکھ درجہ کمتر ہے۔ شعرالشامیہ کا ساتھی (جو اسکے ساتھ پھر کر ایک دوہرا ستارہ بناتا ہے) اگرچہ آفتاب کے مساوی کمیت رکھتا ہے اس کے مادّے کی کثافت پانی سے پچاس ہزار گنا بڑی ہے۔ ہمارا آفتاب گیس سے بنا ہے اور پانی سے ۱ء۴ گنا زیادہ کثیف ہے۔ زمین کی اوسط کثافت ۵ء۵ ہے۔

لیکن آفتاب کی کمیت سے سو گنا زیادہ یا سو گنا کم کمیت کے بہت کم سیارے مشاہدہ ہوے ہیں۔ آفتاب کی سطحی تپش چھ ہزار درجہ مئی ہے لیکن مرکز پر بیس ملین درجہ مئی سے کم نہیں سمجھی جاسکتی۔ بعض ایسے بھی ستارے ہیں جنکی تپش صرف ڈھائی ہزار درجہ مئی ہے۔ عموماً سفید یا نیلے رنگ کے ستاروں کی تپش بہت بلند ہوتی ہے اور نارنجی اور سرخ رنگ والونکی بہت پست۔

جس طرح سے ستارے اپنے نور اور حرارت کے اشعاع کی وجہ سے اپنی توانائی

مسلسل لاکھوں برس سے کھوتے چلے جا رہے ہیں اس سے مرعوب ہو کر چند سال پہلے تک بعض اشخاص سمجھتے تھے کہ شاید آفتاب کی تپش زمانہ دراز سے گھٹتی چلی آ رہی ہوگی اور کافی بڑی مدت کے بعد وہ اپنی حرارت غریزی کھو دے گا لیکن ارضیات کے مشاہدات اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ لکھو کھا سال سے سورج کی حرارت میں کوئی دیر پا یا معتد بہ فرق نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ سمجھی گئی ہے کہ آفتاب کے مراز پر چونکہ بیس ملین درجہ مئی سے زیادہ تپش ہے۔ اس لیے وہ اچھی خاصی فطرت کی لیبو بیٹری یا معمل ہے جہاں ہیڈروجن کے کئی ایک جوہر مل کر ایک نیا اور زیادہ وزنی جوہر والا عنصر تیار ہوتا ہے لیکن اس ملاپ سے بالالتزام خفیف سا کچھ مادہ بچ رہتا ہے اور وہ از روئے کلیہ آئن سٹائن اشعاعی توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ گویا ستاروں کے اشعاع کی توانائی اسی فاضل یا باقی ماندہ مادے کے تلاف سے حاصل ہوتی ہے۔

اکثر اشخاص نے ہمارے کہکشاں پر جب بغور نظر ڈالی ہوگی تو انہیں جا بجا سیاہ دھبے اور چوڑی لکیریں دکھائی دی ہوں گی۔ جس کی وجہ سے کہکشاں کی روشن پیٹی کے بعض وسطی حصوں میں کوئی ستارہ نظر نہیں آتا۔ یہ کیفیت ہمارے کہکشان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ جن تمام کوکبی سحابوں کے اطراف انکے مستوی میں دور تک ایک غیر منور مادے کا سحاب پھیلا ہوا ہوتا ہے ایسا ہی جیسا کہ ہمارے اپنے کوکبی سحاب یعنے کہکشان کے اطراف ہے یہ مادہ وسطی رقبا کے نور کو روک کر سحاب کے بیچ میں ایک سیاہ پیٹی بنا دیتا ہے۔ اس طرح اندازہ لگایا گیا ہے کہ کائنات کا تقریباً آدھا حصہ اس غیر منور مادے پر مشتمل ہے۔ ہر تارے کے گرد بھی ایک حد تک اس کے مماثل کیفیت پائی جاتی ہے شہاب ثاقب شہابیے اور مدار تارے غالباً اسی مادے سے پیدا ہوتے ہیں۔

ریسرچ

ریسرچ کا ترجمہ تحقیقات کیا گیا ہے۔ لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں تو اس سے پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ ریسرچ ایسی چیز ہے جس کے بغیر ترقی ناممکن ہے اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں اس کا امکان نہ ہو۔ عام طور پر لوگ ریسرچ کو خشک اور بالکل ہی علمی چیز سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ اس قدر محدود نہیں ہے۔

اگر ہم روزمرہ زندگی میں اپنی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کریں تو یہ بھی ایک قسم کی ریسرچ ہے۔ کسی نئی چیز کو معلوم کرنا یا کسی کام کو بہتر طریقے پر انجام دینا ہی ریسرچ ہے۔ اگر ہم دفتر کی مسلوں کو ترتیب دینے میں کوئی بہتر صورت نکال لیں تو یہ بھی ریسرچ کی تعریف میں شامل ہے۔ ریسرچ ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ ہم آگے بڑھ سکتے اور اپنی حالت کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

ہر ترقی یافتہ ملک میں ریسرچ پر زور دیا جاتا ہے اور ہر جگہ مختلف شعبوں کے لیے ادارے موجود ہیں جو کام کرنے والوں کے لیے ہر قسم کی سہولتیں اور آسانیاں فراہم کرتے ہیں۔ سائنس کے مختلف شعبوں میں خاص طور پر ریسرچ ہو رہی ہے اور آجکل تو دنیا ہی سائنس کی ہے۔ ہر جگہ طب اور سائنس کے مختلف شعبوں کے لیے انسٹیٹیوٹ قایم ہیں۔ سائنس میں ریسرچ کے دو پہلو ہیں؛ ایک سادہ۔ اور دوسرا اطلاقی۔ ان دونوں میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ شروع میں سادہ ریسرچ ہی سے کام کا آغاز ہوتا ہے اور بعد میں رفتہ رفتہ مختلف طریقوں پر اطلاقی ریسرچ کیجاتی ہے۔

ریسرچ تعمیری ہو سکتی ہے یا تخریبی یہ انسان کی نیت اور غرض کے تابع ہے۔ مختلف دواؤں کی تیاری، بیماریوں کے نئے نئے علاج، زراعت کے لیے مصنوعی کھاد،

انسانی غذا کو بہتر بنانا، اور اسی قسم کے دوسرے کام جن کے ذریعہ بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچے تمام تر تعمیری ریسرچ کی تعریف میں آتے ہیں۔ ہوائی جہاز سے بمباری اور اس سے زیادہ بربادی پیدا کرنے والے بم تیار کرنا، پروازی بم جو ایک جگہ سے اڑ کر دوسری جگہ جاتے اور فوجی وغیر فوجی جگہوں کے امتیاز کے بغیر تباہی پھیلاتے ہیں تخریبی ریسرچ کی مثالیں ہیں۔ اس طرح آلات حرب کے لیے ریسرچ ہوتی ہے اور پھر اسی کے ذریعہ اُن آلات کا توڑ نکالا جاتا ہے۔ مثلاً اس جنگ کے شروع میں مقناطیسی کانیں جہازوں کی تباہی کے لیے نکالی گئیں لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کا توڑ نکال لیا گیا جس کے ذریعہ وہ بیکار کردی جاتی ہیں۔ بموں سے بچنے کے لیے زیرزمین تہ خانے بنائے گئے۔ ایک قسم کے ہوائی جہاز کو زیر کرنے کے لیے دوسری قسم کے بہتر ہوائی جہاز نکالے گئے اور یہ تمام مسلسل ریسرچ کا نتیجہ ہیں اس لیے کہ کوئی کام اچانک نہیں ہوتا۔ دنیا کے بڑے بڑے آدمیوں نے ایجادیں کی ہیں لیکن یہ کسی اتفاقی بات کا نتیجہ نہیں بلکہ کام کے دوران میں کوئی بات اچانک معلوم ہو جاتی ہے اور اس کو سمجھنے کے بعد ایجادیں عمل میں آتی ہیں۔ اس مختصر سے مضمون میں تفصیل مناسب نہیں۔ اس لیے ایک عام بیان پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

غذا اور غذائیت کا مسئلہ آج کل نہایت اہم ہو گیا ہے۔ اگر نئے نئے طریقے معلوم نہ کیے جائیں تو اندیشہ ہے کہ مابعد جنگ غذا کی قلت زیادہ ہو جائیگی۔ اس لیے ماہرین خاص طور پر اس جانب متوجہ ہیں۔ نئے نئے طریقوں سے بنجر زمین سے کام لینا، مصنوعی کھاد کا استعمال وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن پر خاص توجہ دی جارہی ہے غذا کا تجزیہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔ اگر صرف ایک چیز سے پیٹ بھر لیا جائے تو یہ انسان کی بقاء کے لیے کافی نہیں۔ حالیہ ریسرچ نے یہ ثابت کیا ہے کہ مختلف غذائی اجزا کا یکجا ہونا نہایت ضروری ہے کیونکہ اکثر بیماریاں کسی غذائی جز کے کم ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بیماری کو لے سکتے ہیں جس کو بیری بیری کہتے ہیں یہ بنگال کے

اکثر حصوں میں ہوتی ہے اور چاول کھانے والوں میں پائی جاتی ہے۔ اس میں انسان پہلے سست ہونے لگتا ہے اور بعد میں اس کے ہاتھ اور پیر سوج جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ موت واقع ہوتی ہے۔ اس پر ریسرچ کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ صرف ان ہی لوگوں میں ہوتی ہے جو گرنیوں کا صاف کیا ہوا چاول کھاتے ہیں اور سبزی کا استعمال نہیں کرتے۔ لیکن وہ لوگ اس سے محفوظ رہتے ہیں جو ہاتھ سے صاف کیا ہوا چاول کھاتے ہیں۔ چاول کے چھلکے میں ایک قسم کی حیاتین ہوتی ہے جس کو حیاتین ب کہتے ہیں اور یہ گرنی کے صاف کیے ہوئے چاول سے نکل جاتی ہے۔ اس ریسرچ نے بنگال اور کئی دوسری جگہوں کے ہزاروں لوگوں کی جانیں بچائیں اور ایک بیماری جو لاعلاج سمجھی جاتی تھی اب قابو میں آگئی۔

غذائی اعتبار سے جس طرح دوسری چیزوں پر کام ہو رہا ہے اسی طرح مچھلیوں پر بھی بہت زیادہ کام کیا جا چکا ہے۔ تجزیہ سے معلوم ہوا کہ پروٹین - چربی - معدنی نمک جس میں لوہا - چونا اور فاسفورس وغیرہ شامل ہیں ان کے جسم میں پائے جاتے ہیں۔ اور ان کے علاوہ حیاتین الف جگر میں اور حیاتین د جسم کے تیل میں ملتی ہیں۔ اس طرح اگر چاول کے ساتھ تھوڑی مچھلی کھائی جائے تو بہت سی بیماریوں سے انسان محفوظ رہتا ہے۔

جنگ کے بعد غذائیت کے مسئلے کو بڑی اہمیت حاصل رہیگی اسی لیے آجکل زیادہ تیزی کے ساتھ اس پر دنیا کے مختلف حصوں میں کام ہو رہا ہے۔

جیسے جیسے زمانہ ترقی کر رہا ہے مختلف قسم کی دوائیں بھی معلوم کیجا رہی ہیں۔ ہر وقت اور زمانہ کے طریقہ کے لحاظ سے ان کا استعمال بھی مختلف ہوتا رہا ہے۔ مثلاً جڑی بوٹیوں سے اب بھی ہندوستان کے اکثر حصوں میں علاج کیا جاتا ہے۔ ریسرچ کے ذریعہ بھی جڑی بوٹیوں سے معلوم کیا گیا کہ اس میں کونسے مفید اجزاء ہیں؟ اور پھر ان اجزا کو علیحدہ کرکے زود اثر دوائیں تیار کر لی گئیں۔ اس طرح بڑے بڑے قدم [illegible] پانی کے ساتھ اس سے بہت کام انجام دیتی ہے مختلف دواؤں [illegible]

کرینیانی ہے اور اس کا اثر پہلے خرگوش یا چوہے یا کسی اور جانور پر دیکھا جاتا ہے اور جب یہ کامیاب ثابت ہوتی ہے تو پھر انسان کو دیتے ہیں۔ حالیہ زمانہ میں سلف انل امائیڈ Sulphanilamide اور اس کے مشتقات کثرت سے اور کامیابی کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں اسی طریقہ پر پینی سلن Penicillin ایسی ایجاد ہے جس نے دنیا کے طب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور زخمیوں کے لیے ایک ایسی تیر بہدف چیز مل گئی جس نے ہزاروں کی جانیں بچالیں۔

غرض ریسرچ ایسی چیز ہے جس سے آپ اپنی، اپنے ملک کی اور دنیا کی حالت سدھار سکتے ہیں۔ مفید اور مضر کام لینا قطعاً کام کرنے والوں کی نیت پر ہے۔ لوگوں کا یہ اعتراض کہ سائنس یا ریسرچ نے دنیا کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے بالکل غلط ہے اور یہ ہماری لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ ریسرچ کے ذریعہ اتنے مفید کام انجام پاتے ہیں کہ وہ تخریبی ایجادوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں وہی لوگ ریسرچ سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو اس پر روپیہ صرف کرتے اور کام کرنے والوں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں۔ ارجنٹائن سے یورپ کو جو کیلے بھیجے جاتے تھے وہ باوجود اس کے کہ سرد کمرے میں رکھے رہتے تھے ان پر ایک قسم کا دھبہ آجاتا تھا اس کی وجہ سے قیمت کچھ گر جاتی تھی۔ اس پر ریسرچ کے لیے وہاں کی برقی کمپنی نے پچیس ہزار پونڈ الگ دیے تاکہ ایسا طریقہ معلوم کیا جاسکے جس سے یہ دھبے دور ہوسکیں۔ آپ کہیں گے کہ برقی کمپنی کو اپنا روپیہ صرف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ لوگ یہ جاننا چاہتے تھے کہ اُن کے سرد کمروں میں کونسی خرابی ہے جس کی وجہ سے یہ دھبے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس پر ریسرچ کی گئی اور آخر کار کامیابی ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ روپیہ خرچ کیا گیا تھا وہ چند ہی سال کے اندر واپس مل گیا اور آئندہ فائدہ الگ ہوا۔ وہ لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں جو ریسرچ کی مخالفت کرتے یا اُس کے لیے روپیہ دینے میں کوتاہی کرتے ہیں۔ یہ دراصل ریسرچ کی اہمیت اور

افادیت سے عدم واقفیت کی نشانی ہے۔ کوئی ملک ریسرچ کو فروغ دیے بغیر ترقی نہیں کرسکتا۔

ہمیں چاہیئے کہ جس جگہ بھی ہوں ریسرچ کی جانب اپنی توجہ مبذول کریں اس لیے کہ جیسا میں نے بتایا ہے ریسرچ ہر جگہ ممکن ہے۔ اس سے آپ کا دماغ نئی نئی باتیں سوچنے کے قابل ہو جائیگا اور آپ بھی نئی ایجادیں کرنے لگیں گے۔ آپ کی ذہنی قوت بہت زیادہ بڑھ جائے گی اور آپ ملک و مالک کے لیے زیادہ بہتر ثابت ہوں گے۔

محمد رحیم اللہ

ام۔ ایس سی (عثمانیہ) ڈی ایس سی (مدراس)

مہتمم محکمۂ نباتات ممالک محروسہ سرکار عالی

مرل مچھلی

یہ ایک عام مچھلی ہے جس کو عوام بہت رغبت سے کھاتے ہیں - ہندوستان میں اس کو مرل تامل میں ورال یا ورارل اور انگریزی میں اوفیکیفیالس کہتے ہیں - اس کا سر سانپ کی مانند ہوتا ہے - جسم لانبا ہوتا ہے اور منہ میں دانت پائے جاتے ہیں - اسکی لمبائی ۲ تا ۳ فٹ ہوسکتی ہے یہ ذائقہ میں ٹھیک ہوتی ہے - اس میں کانٹے تو ہوتے ہیں لیکن پکنے کے بعد آسانی سے نکالے جاسکتے ہیں اگرچہ سردی کو کافی طور پر برداشت کرتی ہے لیکن سطح آب پر بھی دھوپ کھانے آتی ہے - یہ چٹانوں کے پیچھے چھپی رہنے کے علاوہ کبھی کبھی گھومتی رہتی ہے - اس کی غذا ایسی نہیں ہوتی جس کو ندی بہالے جائے اس لیے یہ ندی کے گڑھوں یا کنٹوں میں جہاں پانی ٹھہرا ہو پائی جاتی ہے کبھی کبھی یہ کنارے کے قریب کائی، پودوں کی جڑوں یا کسی سوراخ میں چھپی ہوئی پائی جاتی ہے اور صرف اس کی ناک باہر رہتی ہے - تب یہ دیکھتی رہتی ہے کہ کوئی چھوٹی مچھلی اس کے قریب سے تو نہیں گذر رہی ہے - کہا جاتا ہے کہ کنارے پر بڑا سوراخ کرکے نر اور مادہ قریب قریب رہتے ہیں - ان کی اس خصلت سے شکار کھیلنے والے کو بہت تکلیف ہوتی ہے کیونکہ اگر یہ گل لے کر کسی چٹان کے سوراخ میں دبک جائے تو بعض وقت ڈور ٹوٹ جاتی ہے اور مچھلی سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے - یہ گدلے پانی کو پسند کرتی ہے برخلاف اس کے مہاسیر شفاف پانی میں رہنا چاہتی ہے - ڈاکٹر ڈے نے ایک جگہ یہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ چند مچھلیاں ایک آب خانہ میں جس کا پانی شفاف تھا رکھی گئیں تو وہ ایک قسم کی بے چینی محسوس کر رہی تھیں اور ایک چپچپے مادہ کا افراز کرکے اس پر خوش نظر آ رہی تھیں - یہ صرف خود کو چھپائے رکھنے کی عادت کی وجہ معلوم ہوتی ہے

نہ کہ وہ گندگی کو پسند کرتی ہے۔ اس طرح مرل چھپ کر اپنا شکار کھیلتی ہے اس کی اس عادت سے شکار کھیلنے میں فائدہ اٹھانا چاہئے اس کے لیے بیچ ندی میں شکار نہ کھیلا جائے بلکہ کنارے پر اور ٹھہرے ہوئے پانی کے کنڈوں میں شکار کھیلنا مفید ہوگا۔

صبح یا شام میں اگرچہ شکار کھیل سکتے ہیں لیکن دوپہر میں جب وہ پانی کی سطح پر دھوپ کھاتی ہوئی نظر آتی ہے تو اس وقت اس کو بندوق سے مار سکتے ہیں۔ مقامی لوگ عام طور پر اس وقت جبکہ مچھلی اوپر آتی ہے دیکھتے رہتے ہیں اور پیچھے سے چھپ کر ہمیشہ سر پر نشانہ لگاتے ہیں سر پر نشانہ لگانے سے نہ صرف مچھلی کم زخمی ہوتی ہے بلکہ آسانی سے مر جاتی ہے اور اس کو پکڑ بھی سکتے ہیں۔ جسم وغیرہ پر نشانہ لگانے سے بعض وقت گولی لگتے ہوئے نکل جاتی ہے اس صورت میں اگر مچھلی کی پشت کی ہڈی پر نشانہ لگے اور یہ ٹوٹ جائے تو اس کا شکار ہوگا۔ سر پر نشانہ لگنے کے باوجود آپکو بعض وقت مچھلی نہیں مل سکتی کیونکہ چوٹ کھانے کے بعد وہ ڈوب جاتی ہے اور بیہوش پڑی رہتی ہے۔ اس لیے فوراً پانی میں کود کر مچھلی لانے کے لیے تیار رہنا چاہئے۔

نشانہ لگاتے وقت پانی کے انعطاف کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے ورنہ غالباً نشانہ خالی جانے کا امکان ہے کیونکہ گولی کا راستہ پانی میں بالکل سیدھا نہیں رہتا بلکہ ہوا کی بہ نسبت یہ ایک کثیف واسطہ ہونے کی وجہ سے اس کا راستہ بدل جاتا ہے اور مچھلی جتنی اوپر دکھائی دیتی ہے حقیقتاً اتنی اوپر نہیں ہوتی بلکہ اس سے کسی قدر نیچے ہوتی ہے۔ اگر مچھلی پانی کے اندر ایک فٹ کے فاصلہ پر ہو تو نشانہ خالی نہیں جا سکتا مگر اس سے زیادہ فاصلہ پر ہو تو ممکن ہے کہ خالی جائے۔

جب چھڑی اور ڈور سے مرل کا شکار کھیلنے کا سوال آتا ہے تو وہی چارہ (یعنی چمچہ، مصنوعی مچھلیاں یا چھوٹی مچھلیاں) استعمال کرنی پڑیگی۔ جو ماسیر کے شکار کی صورت میں استعمال ہوتا ہے لیکن گل کے ساتھ تانت کی بجائے ایک ایسی ڈور استعمال کیجائے جو

ریشم یا سوت سے بنی ہوئی ہو اور جس کے بیچ میں تار ہو کیونکہ اس کے منہ میں دانت ہوتے ہیں۔ اگر تانت استعمال کی جائے تو اس کے دانتوں کی وجہ سے کٹ جائیگی۔

مرل چونکہ گہرے ٹھیرے ہوئے پانی کے گڑھوں میں پائی جاتی ہے اور زندہ چارے سے بھی وہ لوگ اس کا شکار کھیل سکتے ہیں جو اس طریقۂ شکار سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ صرف ایک گل جس کے اوپر ریشمی یا سوتی ڈوری لپٹی ہوئی ہو اور جس کی جسامت لیمرک کی گل نمبر ۶، ۷، ۸، ۹ کے برابر ہو، استعمال کی جائے۔ بہتر ہے کہ ایک تیراؤ بھی استعمال کیا جائے تاکہ یہ رہ اندر نہ جا سکے یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ مرل زیادہ تر مینڈک کھاتی ہے۔

اس کا شکار سطح آب کے قریب کھیلنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی آنکھیں سر کی جانب پر نہیں ہوتیں بلکہ زیادہ تر اوپر کی طرف ہٹی ہوئی ہوتی ہیں جس کی وجہ سے یہ نیچے کی بہ نسبت اوپر اچھی طرح دیکھ سکتی ہے۔ جب یہ تہ آب رہتی ہے تو بھی دیکھتی ہے کہ اس کے سر کے اوپر سے کیا چیزیں گذر رہی ہیں۔

زندہ چارے سے شکار کھیلنے کے ۲ یا ۳ معمولی طریقے ہیں یعنی یہ کہ گل کو ٹھوڑی یا منہ کے نیچے سے یا اوپر کے ہونٹ میں سے گذارا جاتا ہے۔ اوپر کے ہونٹ میں سے گذارنا کوئی بہتر طریقہ نہیں ہے کیونکہ چارہ کو پانی میں سے نکالنے اور ڈالنے میں ہونٹ پھٹ جاتا ہے۔ نیز یہ طریقہ چارہ (چھوٹی زندہ مچھلی) کے تنفس میں بھی مداخلت کرتا ہے اور چارہ بہت جلد مر جاتا ہے۔

دوسرے طریقے کے تحت گل دم کے قریب جسم میں سے گذاری جاتی ہے لیکن یہ ایک بھدا طریقہ ہے جس سے اُس کی حرکت زیادہ غیر فطری ہو جاتی ہے اور چارہ جلد مر جاتا ہے۔

ایک تیسرا طریقہ جو انگلستان میں مروج ہے یہ ہے کہ چاقو سے خیشوم (گل پھڑے) کے قریب نیچے کی جانب جلد میں ایک شگاف کیا جاتا ہے اور ایک چارہ کی سوئی صرف جلد کے نیچے سے گذاری جاتی ہے یہاں تک کہ وہ نچلے حصہ تک پہنچ جائے۔ جب سوئی

باہر آجائے تو گل کے پھانسنے کے ساتھ اس کو اتنی دور تک کھینچا جاتا ہے کہ گل کا بالائی حصہ جلد میں دھنسا رہے اور صرف مڑا ہوا حصہ باہر نکلا رہے۔

شکار کا ایک چوتھا طریقہ بھی ہے جو ان سب سے بہتر اور آسان ہے۔ یہ طریقہ مقامی لوگ اختیار کرتے ہیں جس میں وہ دونی استعمال کرتے ہیں جس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک بڑے گڑھے یا تالاب میں مینڈک کے پچھلے حصہ کی جلد میں گل لگاکر اس کے ساتھ ڈور باندھی جائے اب اس ڈور کو کسی لٹکتی ہوئی ٹہنی کے دو شاخہ حصہ میں سے گذارا جائے اور ڈور کو نیچے کی طرف یہاں تک چھوڑا جائے کہ مینڈک پانی کی سطح پر پہنچ کر مثل زندہ حالت کے پڑا رہے اس کے بعد یہ ڈور کنارے پر کسی مقام سے باندھی جائے۔ اسی طرح ۵ ، ۲۰ اور شاخوں کے ساتھ مینڈک باندھا جائے۔ مرل مینڈک خوب کھاتی ہے اور جب کنارے پر عادتاً آتی ہے تو اس مینڈک کو زندہ حالت میں سمجھ کر پکڑ لیتی ہے۔ چونکہ ڈور ڈھیلی نہیں رہتی اس لئے یہ وہیں پھڑ پھڑاتی پڑی رہتی ہے۔ آپ کو دونیوں کے پاس ہر وقت آکر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے دور ہی سے آپ کو پھڑ پھڑانے کی آواز آتی ہے۔ چونکہ اس طریقہ شکار میں مچھلی کو کھیلنے کا موقع نہیں ملتا اس لیے جس دم وہ چارہ کو پکڑتی ہے اسی وقت شکار ہو جاتی ہے اور بھاگ نہیں سکتی۔ لہٰذا ڈور اور گل کا مضبوط ہونا ضروری ہے۔ صرف ایک گل جس کی جسامت لیمرک کی ۴ یا ۵ نمبر کی گل کے برابر ہو کافی ہے۔ یہ گل ایک مضبوط تار والی ڈور کے ساتھ باندھی جائے۔ مقامی لوگ تو تانبے یا پیتل کا تار باندھتے ہیں جو کام دے سکتا ہے۔ ڈور بھی اچھی بٹی ہوئی اور مضبوط ہونی چاہیئے اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ ڈور اور گل دونوں مچھلی کو دکھائی نہ دے سکیں۔ یہ ممکن ہے کیونکہ گل مینڈک میں گھسی ہوئی رہتی ہے اور مچھلی نیچے سے صرف مینڈک کو دیکھے گی ڈور کو نہیں دیکھ سکتی یہ طریقہ سادہ اور نہایت آسان ہے۔

ایسے تالابوں میں جن کے کنارے پایاب ہوں اور جن پر پانی میں لٹکتی ہوئی جھاڑیاں نہ ہوں اسی قسم کا طریقہ استعمال کیا جا سکتا ہے اصول ایک ہی ہے لیکن ظاہر میں کچھ فرق معلوم ہوتا ہے طریقہ

یہ ہے کہ ایک آدمی اپنے سینے تک ڈوبا ہوا پانی میں چلتا ہے اور تین بانسے کیچڑ میں نصب کر دیتا ہے جنکے قاعدے ایک دوسرے سے علحدہ رہتے ہیں لیکن راس ملے رہتے ہیں۔ اس طرح ایک تپائی بنائی جاتی ہے۔ ان تینوں بانسوں کے نقطۂ اتصال سے ایک مینڈک گرایا جاتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح کہ پانی پر لٹکتی ہوئی جھاڑی کے دو شاخہ حصے میں سے گرایا گیا تھا۔ ایک آدمی اس طرح کی تین تپائیاں بنا سکتا ہے۔ ہر دو تپائیوں کے درمیان کا فاصلہ ۲۰ یا ۳۰ گز ہونا چاہئے۔ اگر پانی میں کائی یا آبی پودوں کی جڑیں ہوں تو ان کو تھوڑی دور تک صاف کرکے تپائی قائم کیجا سکتی ہے اور مذکورہ بالا طریقہ سے مینڈک گرایا جا سکتا ہے۔ اس طریقۂ شکار میں جھینگر بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ ۳ دوفی استعمال کرنیکا ایک اور طریقہ جو حیدرآباد میں عام طور پر رائج ہے وہ یہ ہے کہ ایک لانبی ڈوری میں متعدد گلیں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے چھوٹی ڈوری کے ذریعہ باندھ دی جاتی ہیں اور ان میں سے چند میں زندہ مچھلیاں کچھ میں مینڈک اور دوسروں میں کیکڑے لگا دیے جاتے ہیں۔ مینڈکوں کے پچھلے حصے کی جلد میں ایک خول ملی یا سلائی ڈال کر اس کو ہوا پھونک کر پھلا دیتے ہیں تاکہ مینڈک اندر ڈوبنے نہ پائیں۔ شام کو یہ ڈالی اور صبح میں نکالی جاتی ہیں۔ اس طرح مرل اور دوسری مچھلیاں کافی تعداد میں پھنسی ہوئی ملتی ہیں۔

کرنل۔ ٹی۔ بیکل ایک قسم کی مرل کے متعلق جس کو کالی مرل کہتے ہیں لکھتا ہے کہ یہ تعلقہ جالنہ کے قریب کی ندیوں میں جکدار سس مکھی پر بڑی آزادی کے ساتھ جھپٹتی ہے لیکن اس مچھلی کے لیے یہ کوئی اچھا طریقۂ شکار نہیں ہے۔

مرل پانی کے باہر بہت دیر تک زندہ رہ سکتی ہے اسلئے گھر کو زندہ اور تازہ حالت میں لائی جا سکتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اسکے خیشوم کی خاص ساخت ہوتی ہے۔ خیشوم کے اوپر ایک کہفہ ہوتا ہے جسمیں پانی بھرا رہتا ہے۔ اس پانی کو خیشوم تر رہتے ہیں۔ یہ مچھلی تالابوں میں اچھی طرح پرورش کیجا سکتی ہے۔ اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اُن کے ساتھ تیرتی ہے اور ہر اس دشمن پر حملہ کرتی ہے جو اُن کو کھانے آئے۔ یہ خصوصیت اکثر مچھلیوں میں نہیں پائی جاتی۔ اس قسم کی نگہداشت یہ اس وقت تک کرتی ہے جب تک کہ بچے ۳۔ انچ لانبے نہ ہو جائیں اس کے بعد اگر یہ ادھر اُدھر منتشر نہ ہو جائیں تو پھر خود ان کو کھا جاتی ہے۔

محمد رحمت علی ہمایوں ام۔ اس سی (عثمانیہ)

پریم چند اور اُن کی افسانہ نگاری (بہ سلسلۂ سابق)

اس کے بعد رام کلی کے عادات و اطوار جس انداز میں بیان کیے گئے ہیں وہ نہایت عبرت اور سبق آموز ہیں۔ لڑکیوں کا اپنے عنفوانِ شباب سے پہلے بیوہ ہو جانا کلی کے کھلنے سے پہلے مرجھا جانے کے مرادف ہے۔ اب ایسی دیویاں ہندوستان میں ضرور ہیں جنھوں نے اپنی ساری جوانی بیوگی میں کاٹ دی اور ایسی بھی بہت سی ملیں گی جو پیٹ کے الاؤ اور نفسانی خواہشات کے مارے بیوگی کی مصیبت کو برداشت نہ کر سکیں بظاہر بیوہ رہیں اور باطن میں سہاگن۔ پریم چند سماج کو اسی عیب سے بچانے کے لیے ازدواجِ بیوگان کے حامی تھے۔

رام کلی اور پورنا دو متضاد خیالات کے کردار ہیں رام کلی کی بیوگی میں لغزش ہوتی نظر آتی ہے اور پورنا نے اپنی جوانی اپنے شوہر کے نام کی مالا جپتے ہوئے کاٹنے کا عزم کیا ہے۔ مگر کمزور عورت کے دل پر مختلف اثرات ڈالے گئے اور وہ امرت رائے (ہیرو) کی محبت کا شکار ہو گئی اور ان سے شادی کر لی۔ اسی طرح رام کلی اور اس کے ساتھ پھیمی نے بھی دوسرا عقد کر لیا۔

اس سلسلے میں پریم چند نے اور بھی بہت سی برائیوں کو آشکارا کیا ہے۔ بیوہ اور خاص طور پر نوعمر بیوہ کا سماج میں کوئی درجہ نہیں ہوتا۔ وہ نہایت حقیر اور منحوس سمجھی جاتی ہے۔ صبح اٹھنے کے بعد اس کی صورت کا نظر آنا شگون بد خیال کیا جاتا رہا ہے۔ اس کو خوشی کی تقریب میں دور دور رہنا پڑتا ہے اور یہ اس کی خودداری پر ٹھیس لگانے کے لیے بہت کافی ہے۔ اسی پر بس نہیں ہوتا بلکہ اس کی ساری دلچسپیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ سارے خاندان کی لونڈی اور خادمہ سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بعد ساس کراماً کاتبین کی طرح اس کی ہر حرکت کی نگراں ہوتی ہے اور بے قصور بھی غریب بیوہ گالیاں اور جوتیاں کھاتی رہتی ہے۔ ہندوستانی سماج میں بہت کم بیوائیں ایسی ہوں گی جنھیں ان صعوبتوں سے دوچار ہونا نہیں پڑا ورنہ نوے فیصد انھیں پابندیوں کی شکار رہیں ان تمام جزئیات کو پریم چند نے رام کلی کے مصائب میں ظاہر کیا ہے۔

یہی ناول ہندی میں "کشنا" اور کچھ اضافے سے "پرتگیا" اور "پریما" کے نام سے اور اردو میں دوسرے لباس میں "بیوہ" کے نام سے شایع ہوا لیکن زیب داستان کے لیے اس میں اکثر جگہ حاشیہ آرائی کی گئی ہے۔ کردار تقریباً وہی موجود ہیں اور اپنا اپنا کام برابر انجام دیتے ہیں۔ یہ پریم چند کی وہ تصویر ہے جس پر انھوں نے نظر ثانی کی ہے۔ اس لیے یہ نقش ثانی کا درجہ رکھتی ہے ایک خاص بات اس کتاب میں ہمیں یہ نظر آتی ہے کہ پریم چند نے اس میں ہیرو امرت رائے کو بنایا مگر ہیروئن کبھی پریما بن جاتی ہے اور کبھی پورنا اور پڑھنے والا کوئی تصفیہ کرنے نہیں پاتا۔ اس کتاب کو انھوں نے اردو میں بھی لکھا اور ہندی میں بھی۔ ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو مرتبہ لکھا۔ اس موضوع پر انہوں نے نہ صرف لکھا بلکہ اس پر عمل بھی کیا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ازدواج بیوگان کے وہ کس قدر سختی سے حامی تھے، اور طرح طرح سے اس کا پرچار کرنا چاہتے تھے۔

اُن کا ایک دلنشیں افسانہ "مالکن" (واردات) بھی ہے۔ یہ مالکن رام پیاری ہے جو اتفاق سے عین عالم شباب میں بیوہ ہو جاتی ہے۔ افسانہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

"شیو داس نے بھنڈار کی کنجی اپنی بہو رام پیاری کے سامنے پھینک دی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "بہو آج سے گرہستی کی دیکھ بھال تمہارے ذمہ ہے میرا سکھ بھگوان سے نہیں دیکھا گیا نہیں تو کیا جوان بیٹے کو یوں چھین لیتے؟"

مالکن کے احساس نے رام پیاری کا غم غلط کر دیا۔ دیہات میں مالکن بڑی با اختیار عورت ہوتی ہے۔ دکن کے دیہات میں یہ "کاروبارنی" کہلاتی ہے اور چودھری کے لیے کاروباری استعمال کرتے ہیں۔ رام پیاری کو جب یہ عہدہ ملا تو اس نے اپنے خسر اور دیور اور دیورانی (جو اس کی حقیقی بہن بھی تھی) کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن پیسے کے معاملے میں ہمیشہ محتاط رہی۔ چھوٹی بہن کو خسر کے انتقال کے بعد احساس کمتری نے ورغلایا اور وہ میاں بیوی معہ اپنے بچوں کے تلاش معیشت میں کلکتہ روانہ ہوئے اور رام پیاری نے جان چھڑائی۔

وہ اکیلی رہ گئی اور زراعتی کاروبار کے لیے اس کو کافی فرصت ملنے لگی۔ اس کا ملازم جوکھو بن بیاہا تھا۔ رام پیاری اکثر اس سے شادی کرنے کو کہتی اور جوکھو ٹال جاتا۔ آخر جب اس نے زیادہ مجبور کیا تو جوکھو نے کہا۔

"اچھا تو سنو میں چاہتا ہوں کہ وہ (میری دلہن) تمہاری طرح ہو ایسی ہی لجانے والی ہو ایسی ہی بات چیت میں ہوشیار ہو ایسا ہی اچھا کھانا پکاتی ہو ایسی ہی کفایت شعار ہو ایسی ہی ہنس مکھ ہو۔ بس ایسی عورت ملیگی تو بیاہ کروں گا نہیں تو اسی طرح پڑا رہوں گا۔" پیاری کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا پیچھے ہٹ کر بولی تم بڑے نٹ کھٹ ہو ہنسی ہنسی میں سب کچھ کہہ گئے۔" ان الفاظ پر افسانہ ختم ہوگیا ہے اور پریم چند نے باتوں باتوں میں اپنے مطلب کی بات بھی بیان کردی ہے۔

"نئی بیوی" (واردات) میں پریم چند نے بے جوڑ شادیوں کے نتائج کا اظہار کیا ہے ان شادیوں میں عورت بوڑھے شوہر سے محبت نہیں کرسکتی وہ ہمدردی کرسکتی ہے۔ بیٹی کی طرح چاہ سکتی ہے یا ملازمہ کی طرح خدمت کرسکتی ہے مگر بیوی بن کر اپنے شوہر سے محبت نہیں کرسکتی۔ یہ افسانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے اور پریم چند کی تصویریں بے حد رنگین اور دلاویز ہیں۔

حاکموں کا کردار پریم چند نے اپنے افسانوں میں عہدہ داروں اور ماتحتوں کے کردار کا بھی نقشہ نہایت صحیح انداز میں کھینچا ہے۔ مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان دونوں کے کسی پہلو کو نہیں چھوڑا۔ حاکم اور محکوم دونوں کے ذہنی تفادت کی مثالیں پریم چند کے افسانوں میں دن کی طرح روشن ہیں۔ حاکم کی فرعونیت اور بد دماغی کے ایسے ایسے واقعات نظر آتے ہیں کہ اس کے انسان ہونے پر شک ہونے لگتا ہے۔ بعض وقت ہمیں دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ افسانہ ہی تو ہے، جو کچھ لکھیں تھوڑا ہے لیکن پریم چند کے کرداروں جیسے فرعون بے سامان حاکموں کی بھی دنیا میں کمی نہیں جنھیں ملازمت کا دور سے بھی واسطہ ہے وہ ان کی فرعونیت سے واقف ہوسکتے ہیں۔

"استعفیٰ" (پریم چالیسی اول) میں ایک حاکم اور ایک محکوم کے کردار کو ظاہر کیا گیا ہے۔ فتح چند دفتر میں کلرک تھے۔ صبح کے گئے شام کو لوٹے کہ پھر چپراسی نے آکر دستک دی اور کہنے لگا

صاحب نے بلایا ہے یہ بنگلے پر پہنچے، صاحب غصہ میں بھرے ہوئے نشہ کی حالت میں بیٹھے تھے، فتح چند کو دیکھتے ہی کچھ مغلظات سنائیں اور چپراسی سے ان کا کان پکڑنے کو کہا۔ گروہ صاف انکار کر گیا۔

"صاحب اب غصہ ضبط نہ کرسکے جھنجلا کر دوڑے چپراسی نے دیکھا، یہاں کھڑے رہنے میں خیریت نہیں ہے تو بھاگ کھڑا ہوا۔ فتح چند ابھی تک بے حس و حرکت کھڑے تھے، صاحب نے چپراسی کو۔ پایا تو ان کے پاس آئے ان کے کان پکڑ کر زور سے ہلا دیئے اور کہا "تم سور۔ گست کی کرتا ہے جا کر آفس سے فائل لاؤ۔ فتح چند نے کہا کونسا فائل لاؤں حضور۔

صاحب۔ فائل فائل اور کونسا فائل تم بہرا ہے سنتا ہے ہم فائل مانگتا ہے۔

فتح چند نے کسی قدر دلیر ہو کر کہا "آپ کونسا فائل مانگتے ہیں"

صاحب۔ وہی فائل جو ہم مانگتا ہے وہی فائل لاؤ ابھی لاؤ۔

یہ ہے حاکم و محکوم کی گفتگو دونوں ایک ہی حکومت کا دیا کھاتے ہیں دونوں ایک ہی حکومت کے غلام ہیں اور دونوں پر ایک ہی قانون چلتا ہے مگر فرق صرف حاکم و محکوم کا ہے۔ حاکم سمجھتا ہے کہ اس کا محکوم اس کا زر خرید غلام ہے اور یہ ہندوستان کے نوے فیصد حاکموں کا نقشہ ہے۔

ایک جگہ پولیس والوں کے کردار کا نقشہ اس انداز میں کھینچتے ہیں۔

"یہ پولیس لائن ہے۔ یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں۔ رائٹ۔ لیپ۔ پھام پھو۔ نوری نے تصحیح کی۔ کیا کہا یہ پولیس والے پہرہ دیتے ہیں، جب ہی تمھیں بہت خبر ہے۔ اجی حضرت یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں۔ شہر کے جتنے چور ڈاکو ہیں سب ان سے ملے رہتے ہیں رات کو یہ سب ایک محلہ میں تو چوروں سے کہتے ہیں چوری کرو اور دوسرے محلے میں پکارتے ہیں جاگتے رہو جاگتے رہو۔ (عیدگاہ۔ دودھ کی قیمت)

پولیس اور رعایا دونوں میں حاکم و محکوم کا تعلق ہے۔ اور پریم چند نے اکثر مقامات پر پولیس والو کے راز بے نقاب کیے ہیں۔" (غبن) میں بھی جا بجا لطیف اشارے ہیں اور شاید ہی کوئی ایسی

بات ہو جو ان سے فروگذاشت ہوگئی ہو۔ اپنے ایک افسانے میں انھوں نے دارو غہ جی کا خاکہ کھینچا ہے۔

"داروغہ جی نہایت کارگذار افسر تھے گالیوں سے بات کرتے تھے۔ صبح کو چارپائی سے اٹھتے ہی گالیوں کا وظیفہ پڑھتے (دورے کے سلسلے میں وہ ایک گاؤں میں پہنچے) سارے گاؤں میں ہلچل پڑگئی تھی کانسٹبل اور چوکیدار راستوں پر یوں اکڑتے چلتے تھے گویا اپنی سسرال میں آئے ہیں" (اندھیر"۔ پچیسی دوم")

رشوت ستانی | اگر ہم ان واقعات کا غائر مطالعہ کریں تو اس میں صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی نظر آئے گی ان واقعات کے ساتھ ہمیں عہدہ داروں کی رشوت ستانی کا خیال آتا ہے۔ اور دست غیب سے جو حق تلفی اور ناانصافی ہوتی ہے اس کی پول کھلتی ہے۔ ادھر پریم چند ملازم ہوئے اور انھیں ملازمین سرکار کے کردار کا اندازہ ہونے لگا۔ وہ خود تو بیچارے تعلیمات میں تھے کچھ زیادہ پتہ بھی نہ چلتا مگر "سوز وطن" کی اشاعت نے انھیں بری طرح پھنسا دیا اور مختلف عہدہ داروں سے سابقہ پڑا اس میں پولیس کے لوگ بھی تھے اور مالگزاری کے بھی تعلیمات کے بھی تھے اور نظم ونسق (سیاسیات) کے بھی اس سے ان کی نظریں وسیع ہوگئیں۔ وہ رشوت کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ممکن ہے کہ ان پر انگور کھٹے ہیں والی مثل صادق آتی ہو مگر ان کے خیالات اتنے پاکیزہ ہیں کہ دل پر اثر کر جاتے ہیں وہ اس کا واحد حل یہ بتاتے ہیں کہ "جب تک چھوٹے آدمیوں کی تنخواہ اتنی نہ ہو جائے گی کہ وہ بھل منسی کے ساتھ نباہ کر سکیں تب تک رشوت بند نہیں ہوسکتی" تنخواہ بڑھنے کے بعد شاید غریب رشوت لینا بند کردے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ رشوت کیسے بند ہوگی جو بڑی تنخواہوں والے مختلف طریقوں سے اپنے نام اور تنخواہ کے تناسب کا لحاظ کرتے ہوئے لیتے ہیں۔ ان کا ایقان تھا کہ مفت کی دولت تنہا ہضم نہیں ہوتی اور اس بنیاد پر انھوں نے اپنا ایک افسانہ بھی گھڑا گیا اور یہی افسانہ بڑھتے بڑھتے "بازار حسن" بن گیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"پنڈت کرشن چند نے رشوت لی مگر انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ مال حرام تنہا مشکل سے ہضم ہوتا ہے مختار نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا اور خفیہ طور پر تحقیقات بھی ہوگئی اور عین لڑکی کی شادی کی رسموں کے آغاز کے وقت سپرنٹنڈنٹ نے کانسٹبلوں کے ساتھ آئے ایک سب انسپکٹر نے جیب سے گرفتاری کا وارنٹ نکال کر کرشن چندر کو دکھایا ان کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ایک سکتے کی حالت میں سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرہ پر خوف نہ تھا۔ ندامت تھی۔ یہ وہی دونوں سب انسپکٹر تھے جن کے سامنے وہ غرور سے گردن اٹھا کر چلتے تھے جنھیں وہ حقیر سمجھتے تھے۔ ساری عمر کی نیکنامی خاک میں مل گئی نفس نے لیا اب اپنے اعمال کا خمیازہ اٹھاؤ میں نہ کہتا تھا کہ آگ میں نہ کودو تم نے یہ کہا نہ مانا اگر تم نے کسی معمولی خاندان میں شادی کرنے پر قناعت کی ہوتی تو آج یہ نوبت کیوں آتی مگر تمہیں اپنی عزت اور وقار کی پڑی تھی تو اب اس سودائے خام کا مزہ چکھو" [1]

پریم چند نے اس سودائے خام کا مزہ بڑی بری طرح چکھایا۔ قصہ کی اصل بنیاد یہی ہے کہ پنڈت کرشن چند نے اپنی لڑکی کو زیادہ جہیز دینے کی خاطر صرف ایک دفعہ گرانقدر رشوت لی اور اس کو بچا نہ سکے۔ اس کے بعد انھیں برسوں جیل میں رہنا پڑا اور پھر لڑکیوں کی جو درگت بنی وہ الگ۔

ان کا ناول (غبن) بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے وہاں نئی بیوی کے لیے زیور بنانے کی خواہش نے رما کو زیادہ سے زیادہ رشوت لینے پر مجبور رکھا، پھر غبن کا بے بنیاد الزام اپنے سر لے کر کلکتہ بھاگ کھڑا ہوا اور دیہی دین کے گھر میں پناہ لی۔ لیکن ناول کے آخری حصہ میں رما کی بیوی کی زبان سے وہ کہلواتے ہیں۔

---

[1] بازارِ حسن اول صفحہ ۳۔

"یہ میں نہیں کہتی کہ عیش و آرام سے میرا جی بھر گیا یا گہنے کپڑے میں او پ گئی یا سیر تماشے سے مجھے نفرت ہے۔ یہ ساری تمنائیں جوں کی توں ہیں اگر تم اپنی قوت بازو سے، اپنی جانفشانی سے انھیں پورا کرسکو تو کیا کہنا، لیکن نیت کھوٹی کرکے یا ضمیر کا خون کرکے ایک لاکھ بھی لاؤ تو میں اسے ٹھکرا دوں گی"[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پریم چند نے عورتوں کو زیادہ نیک نفس بتایا ہے اور مردوں کو حریص۔

"نمک کا داروغہ" (پریم پچیسی اول) ان کا وہ افسانہ ہے جس کو وہ اپنے بہترین افسانوں میں شامل کرتے ہیں۔ اس کی بنیاد بھی رشوت پر ہے۔ داروغہ کے والد نے اپنے بیٹے بنسی دھر کو تلاش ملازمت کے لیے جاتے وقت سمجھایا۔

"ایسا کام ڈھونڈنا جہاں کچھ بالائی رقم کی آمدنی ہو۔ ماہوار مشاہرہ پورنماشی کا چاند ہے جو ایک دن دکھائی دیتا ہے اور پھر گھٹتے گھٹتے غائب ہو جاتا ہے۔ بالائی رقم بہتا ہوا سوتا ہے جس سے پیاس ہمیشہ بجھتی رہتی ہے مشاہرہ انسان دیتا ہے اسی لیے اس میں برکت نہیں ہوتی اور تم خود عالم و فاضل ہو تمہیں کیا سمجھاؤں یہ معاملہ بہت کچھ ضمیر اور قیافہ کی پہچان پر منحصر ہے۔"

بنسی دھر نمک کے داروغہ بن گئے اور جب سیٹھ الوپی دین کی گاڑیاں بغیر محصول ادا کیے جانے لگیں تو گرفتار کرلیا۔

"پنڈت الوپی دین کو مبلغ علیہ السلام کی طاقت کا پورا پورا عملی تجربہ تھا، وہ کہا کرتے تھے کہ دنیا کا ذکر ہی کیا، دولت کا سکہ بہشت میں بھی رائج ہے اور ان کا یہ قول بہت صحیح تھا، قانون اور حق و انصاف یہ سب دولت کے کھلونے ہیں جن سے وہ حسب ضرورت اپنا جی بہلایا کرتی ہے۔"

---

[1] (ضبن) صفحہ ۲۸۶ –

بے نیاز نہیں

گرانولی دین کو بنسی دھر کی دیانت نے نیچا دکھا دیا۔ انھوں نے حق و صداقت کو نہ چھوڑا اور چونکہ حق تلخ ہے، اس لیے انھیں حق کہہ کر معطل ہونا پڑا۔ لیکن اسی سانچ کو آنچ نہیں، جب الوپی دین کو مختار کل کی تلاش ہوئی تو ان کی نگاہ انتخاب بنسی دھر ہی پر پڑی۔

"شعل ہدایت" (پریم بتیسی دوم) دیہاتی افسانوں میں ان کا بہترین افسانہ ہے، مگر اس میں بھی رشوت کا ذکر ہے۔ اس کی وجہ سے دیہاتیوں کی پریشانی نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ دارونہ ذوالفقار علی خاں کا یہ کہنا کہ۔

"پولیس کے محکمہ میں جو رشوت نہیں لیتا اسے میں احمق سمجھتا ہوں۔ میں نے دو ایک سب انسپکٹر دیکھے ہیں، لیکن ہمیشہ تباہ، کبھی معتوب، کبھی معطل، کبھی برخاست"

محکمہ پولیس پر بڑی چوٹ ہے اور صداقت پر مبنی ہے۔ اور بھی کئی افسانے ہیں جن میں رشوت ستانی کے مصائب اور حاکموں کی چیرہ دستیوں کو چبھتے ہوئے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

دیہاتیوں کا کردار | ہم امیروں اور حاکموں کے کردار کا اندازہ تو کر چکے اب دیہاتیوں کے کردار بھی دیکھیں گے۔ (پریم چالیسی) میں ان کا ایک اچھا افسانہ (منتر) ہے اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

"شام کا وقت ہے۔ ڈاکٹر چڈھا گولف کھیلنے جا رہے تھے۔ موٹر دروازے کے سامنے کھڑی تھی، کہ دو کہار ڈولی لیے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ڈولی کے پیچھے ایک بوڑھا نحیف آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ڈولی مطب کے سامنے آکر رک گئی۔ بوڑھے نے دھیرے دھیرے دروازے پر آکر اندر جھانکا۔ ایسی صاف ستھری زمین پر اسے پیر رکھتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چلا نہ دے۔

ڈاکٹر صاحب نے جق کے اندر سے گرج کر کہا "کون ہے کیا چاہتا ہے"

بوڑھے نے ہاتھ باندھ کر کہا "حضور غریب آدمی ہوں میرا لڑکا کئی دن سے۔۔۔۔

۔۔۔۔" ڈاکٹر نے سگار جلاتے ہوئے کہا "کل سویرے آؤ سویرے"

آخر ڈاکٹر صاحب چلے گئے اور بوڑھے کی منتیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔ بوڑھے کا پیارا بچہ

اللہ کو پیارا ہوا۔ بوڑھا بھگت تھا۔ سانپوں کے ڈسے اس سے شفا پاتے تھے اور دور دور تک اس کی شہرت تھی۔ اتفاق کہیے کہ ڈاکٹر چڈھا کے عزیز بیٹے کا مشغلہ بھی سانپوں کو پکڑنا اور پالنا تھا۔ وہ پالتو سانپوں کو رام تو کر چکا تھا لیکن۔

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود

کے بمصداق ایک کالے ناگ نے عین تقریب کے موقع پر اس کو ڈس لیا۔ یہ اطلاع رفتہ رفتہ بھگت تک پہنچ گئی۔ اس کے ضمیر اور نفس میں کشمکش پیدا ہو گئی اور اس نے نفس کا مطیع ہو کر۔

"کواڑ لگا دیے اور پھر آ کر بیٹھا۔ مگر اس کے دل کی حالت اس کتے کی سی ہو رہی تھی جو رات کو کسی اجنبی کی آہٹ پا کر مالک کے منع کرنے پر بھی بھونکنا نہیں چھوڑتا۔ زور سے چاہے نہ بھونکے مگر آہستہ آہستہ غراتا رہتا ہے۔ بھگت کا نفس اسے اپنی پوری طاقت کیساتھ روک رہا تھا، پر اس کے وجود کا ایک ایک ذرہ ہوا کے جھونکے سے اڑے ہوئے پتے کی طرح اس بدنصیب نوجوان کی طرف اڑا ہوا جا رہا تھا، جو اس وقت مر رہا تھا اور جس کے لیے ایک لمحہ کی دیر بازیافت کے امکان کو اور ٹال رہی تھی۔"

آخر بھگت نے اپنی ضمیر کی آواز کو جو نقار خانہ میں طوطی کی طرح تھی سن لیا اور آہستہ سے کواڑ کھولے کواڑ کی آواز سے بڑھیا جاگ پڑی اور ٹوکنے لگی کہ تم پھر وہیں چلے۔ بھگت نے کہا۔

"میں وہاں سانپ کا منتر پڑھنے تھوڑا ہی جا رہا ہوں۔ ذرا دیکھوں گا لوگ کیا کرتے ہیں۔ ذرا ڈاکٹر صاحب کا رونا پیٹنا دیکھوں گا۔ کس طرح سر پیٹتے ہیں، کس طرح پچھاڑیں کھاتے ہیں، ذرا دیکھوں گا، بڑے لوگ بھی ہمیں لوگوں کی طرح روتے ہیں یا صبر کر جاتے ہیں۔ وہ لوگ تو ودوان ہوتے ہیں، من میں سمجھ کر رہ جاتے ہوں گے۔"

بڑھیا کو اس انداز میں سمجھا کر اس نے بنگلے کی راہ لی اور افتاں و خیزاں وہاں پہنچ کر ڈاکٹر چڈھا کی زندگی کے سہارے کو بچا لیا۔ بھگت اور اس کی بیوی کا تو ایقان یہ تھا کہ ان کا لال محض ڈاکٹر کی لاپروائی کی نذر ہو گیا ہے ورنہ وہ ابھی نہ مرتا۔ یہ اعتقاد رکھتے ہوئے وہ ڈاکٹر کے

دشمن تھے، لیکن ممو ناد یہاتی کسی کی موت کے وقت دشمنی اور دوستی کو بھول کر اس کی موت مٹی میں شریک ہو جاتے ہیں اگر بچانے کا موقع ہو تو اس کی بھی امکانی کوشش کرتے ہیں۔ مرنے والے کی یاد میں جو آنسو بہائے جاتے ہیں ان سے سارے داغ دھل جاتے ہیں۔ یہ دیہاتیوں کی بہت اہم خصوصیت ہے اور اس کی وضاحت منشی جی نے بڑی خوبی سے کی ہے۔

روشنی (واردات) میں وہ ایک دیہاتی بیوہ کا ایک ایسا بلند کردار پیش کرتے ہیں کہ ہندوستانی عورت کی تفسیر اس سے بہتر شاید ہی ہو سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک راجکمار شکار کرتے ہوئے راستہ گم کر چکے ہیں اور ایک طوفان میں گھر گئے ہیں۔ اس اثناء میں ایک عورت اپنے گاؤں کو نہایت تیزی سے جاتی ہے، راستہ میں راجکمار سے ملتی ہے اور ان کی رہبر بن جاتی ہے اور راستہ چلتے ہوئے راجکمار کے استفسار پر یہ بیان دیتی ہے۔

"ابھی تو کل چھ مہینے ہوئے بابو جی۔ بھگوان کی مرضی میں آدمی کا کیا بس بھلے چنگے ہل لے کر لوٹے، ایک لوٹا پانی پیا، قے ہوئی، بس آنکھیں بند ہو گئیں ......
تب سے بابو جی گھاس چھیل کر پیٹ پالتی ہوں ......"

"اس وقت مجھ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ میں آبدیدہ ہو گیا اور جیب سے پانچ روپے نکال کر اس عورت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "میری طرف سے یہ بچوں کی مٹھائی کھانے کے لیے لو۔ مجھے موقع ملا تو پھر کبھی آؤں گا"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ "نہیں بابو جی یہ رہنے دیجئے۔ میں غریب ہوں لیکن بھکارن نہیں ہوں"

"یہ بھیک نہیں ہے۔ بچوں کی مٹھائی کھانے کے لیے ہے"

"نہیں بابو جی"

"مجھے اپنا بھائی سمجھ کر لے لو"

"نہیں بابو جی جس کا بیاہ ہو اس کی عزت تو میرے ہی ہاتھ ہے۔ بھگوان تمہارا بھلا کریں"

اس فرض شناسی اور خودداری کی مثال ایسی غریب طبقہ کی معمولی عورت میں بایدوشاید نظر آتی ہے مگر دیہات میں یہ چیز عام ہے اور شہر میں چراغ لے کر ڈھونڈھنے کی ضرورت ہوگی۔ ہماری شہری تہذیب اور دیہاتی تہذیب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دیہاتی انسانوں کے کردار میں فرشتہ پن زیادہ ہے اور شہری انسان اپنی اس تہذیب میں مرا جارہا ہے جو اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کر رہی ہے" وہ باوجود تعلیم یافتہ ہونے اور مہذب کہلانے کے بھی ایسے الفاظ زبان سے نہیں نکال سکتا۔ منشی پریم چند نے اسی سلسلے میں لکھا ہے" اگر تعلیم فی الحاصل تہذیب نفس ہے اور محض اعلیٰ ڈگریاں نہیں تو یہ عورت تعلیم کے معراج پر پہنچی ہوئی ہے"

"بے غرض محسن" پریم چند کا بہت مشہور افسانہ ہے جس میں "مشعل ہدایت" کی طرح دیہات کے متعلق بہت کچھ تفصیلات بتلائی گئی ہیں۔ لیکن تخت سنگھ اور اس کی بیوی کا کردار نہایت بلند ہے۔ ریوتی رانی کے بیٹے نے تخت سنگھ پر بہت سے مظالم توڑے۔ اور اب تخت سنگھ بیمار ہے۔ یہ اطلاع ریوتی رانی کو ملی اور وہ مدد کرنے کے لیے روپیوں کی پوٹلی لے آئی۔ "روپیوں کی جھنکار سن کر اٹھ بیٹھا"۔ رانی ہم اس کے بھوکے نہیں ہے مرتے دم گنہگار نہ کرو"۔ اسی کی بیوی جب اپلے بیچ کر بیوگی کے دن گذارنے لگی، تو ریوتی رانی نے ایک دن اصل قیمت سے زائد پیسے دیدیے۔ اسی دن سے ٹھکرائن نے اس کے یہاں اپلے لانا بندکر دیا۔

یہ بلند کرداری پریم چند کے ہر دیہاتی ماحول سے متعلق افسانے میں ملے گی کوئی افسانہ ان بلندیوں سے خالی نظر نہیں آتا۔ "بانکا زمیندار" (پریم پچیسی دوم) بھی ہے تو اس کو بانکے دیہاتی مل جاتے ہیں اور زمیندار کا بانکپن بھلا دیتے ہیں۔ "مشعل ہدایت" میں دیہاتیوں کی اپنے زمینداروں کے ساتھ وفاداریاں اور ان کی سادگیاں عیاں ہیں۔ انھیں مختار عام کس طرح پریشان کرتا ہے۔ پولیس کے ہاتھوں میں وہ کیسے گرفتار ہوتے ہیں۔ یہ سب مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے سے گذرتے ہیں اور دل ہلا دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں لیڈروں کے عادات و خصائل بھی معلوم ہوتے ہیں اور ہم دیکھ لیتے ہیں کہ ان کے

قول اور فعل میں کس قدر تضاد ہے ۔

پریم بتیسی اول میں ایک افسانہ (قربانی) ہے اس میں گردھاری کی تصویر جس انداز سے کھینچی گئی ہے اس کی تعریف نہیں کیجا سکتی ۔ ایک کسان اپنے کھیتوں اور اپنے زرعی آلات ہی کو اپنی زندگی سمجھتا ہے ۔ جب یہ چیزیں چھن جاتی ہیں تو زندگی اس کے لیے اجیرن ہو جاتی ہے اور وہ دنیا کی نظروں سے اوجھل تو ہو جاتا ہے لیکن اس کے کھیت میں ہل چلانے والوں کو نظر آتا رہتا ہے ۔ پریم چند نے ان چیزوں پر بہت زیادہ وقت صرف کیا ہے ۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر ان چیزوں پر بہت گہری تھی ۔ اگر وہ کسان کے متعلق لکھتے ہیں تو قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ لکھنے والا ممکن ہے کہ کسان ہو ۔ اگر وہ زمیندار کا خاکہ کھینچتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ زمیندار ہی ہوں گے، جب ہی تو ان جزئیات سے بخوبی واقف ہیں یہی ایک ادیب کا کمال ہے کہ خود بھی اس میں جذب ہو جائے اور پڑھنے والے کو بھی جذب کر لے ۔ پریم چند مدرس تھے لیکن انھوں نے کوئی محکمہ یا طبقہ ایسا نہیں چھوڑا جس کی جزئیات کو نہ بیان کیا ہو ۔

بچوں کی نفسیات | جس طرح پریم چند نے شہریوں ۔ دیہاتیوں ۔ حاکم و محکوم اور بڑی عمر کے آدمیوں کی کردار نگاری میں کمال دکھایا ہے اسی طرح وہ بچوں کی نفسیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے ۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ ان کی زندگی کا زیادہ حصہ بچوں ہی میں بسر ہوا یوں بھی ہر شخص ان کی نفسیات سے کچھ نہ کچھ ضرور واقف ہوتا ہے، مگر پریم چند نے جہاں دوسرے کرداروں کا تفصیلی خاکہ پیش کیا ہے، اسی طرح بچوں کی حرکتوں کو بھی ظاہر کیا ہے ۔ ان کے اکثر افسانے ایسے ہیں، جن میں کردار پیدا ہو کر پروان چڑھ گئے ہیں ۔ گلی ڈنڈا (واردات) بچاری اور قزاقی (پریم چالیسی اول) اسی قبیل کے افسانے ہیں ۔

خود نوشت سوانح افسانوں میں | انھوں نے اکثر مقامات پر اپنے افسانوں میں اپنی زندگی کے حالات بھی سمو دیے ہیں اور اس طرح ان کا ادب ان کی زندگی کا آئینہ بن گیا ہے ۔ ان کے والد کا

تعلق سررشتہ ٹیپہ سے تھا۔ "قزاقی" میں انہوں نے اس تعلق کو نہایت وضاحت کے ساتھ بتلایا ہے۔ قزاقی ایک ہرکارے کا نام ہے، جو منشی ٹیپہ کے بچے سے بڑی الفت اور اُنس سے پیش آتا ہے۔ اس احساس کے متعلق وہ یوں بیان دیتے ہیں "میرا دل فرطِ مسرت سے زیادہ اچھلنے لگتا خوشی کی امنگ میں میں بھی دوڑ جاتا اور ایک لمحہ میں قزاقی کا کندھا میرا سنگھاسن بن جاتا۔ وہ مقام میری تمناؤں کا بہشت تھا۔ بہشت والوں کو بھی شاید وہ متحرک سرور نہ ملتا ہوگا جو مجھے قزاقی کے چوڑے کندھوں پر ملتا تھا"

اس کے بعد قزاقی کی برطرفی اور اس پر بچہ کا گریہ و زاری کرنا، بیسہ جمع کرنے کی ہوس، اور اس کے احساس پر خوشی۔ بڑے ہونے کے بعد اس عادت کا تبدیل ہوجانا، یہ سب چیزیں بچوں کی نفسیاتی کیفیتوں اور پریم چند کی زندگی پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔

لال فیتہ (خواب خیال) ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

"ذہانت کسی طبقہ کی میراث اور کسی اصول وراثت کی مطیع نہیں۔ مسٹر ہری بلاس اس کی مجسم دلیل تھے"۔ کیا معلوم تھا کہ منشی ٹیپہ کا بیٹا بھی کسی معمولی خدمت پر رہنے کی بجائے ہندوستان میں چوٹی کا ادیب بن جائیگا۔ اس کے بعد اور بھی کئی ایسے واقعات اس افسانے میں موجود ہیں جو پریم چند کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں مثلاً وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"مگر ہری بلاس کا شوق طلب اس گرمی اور سردی سے مستغنی تھا اس عزم قوی کے ساتھ جو اکثر نادار طلبہ کا مایۂ امتیاز ہے۔ وہ کالج میں داخل ہوگیا۔ اگرچہ وہ ایک رئیس کے لڑکے کو پڑھاکر تعلیمی مصارف نکال لیا کرتا تھا مگر وقتاً فوقتاً اسے ایک مشت روپیوں کی ضرورت ہوتی تھی"۔ اگر یہاں ہم ہری بلاس کی جگہ پریم چند کا نام رکھ دیں تو یہ سارے واقعات صحیح ہوجاتے ہیں اور افسانہ حقیقت بن جاتا ہے۔

ڈیمانسٹریشن (نجات) میں وہ لکھتے ہیں "ہر ایک کمپنی کا ایک ڈرامہ نویس بھی ہوتا ہے۔ بھلا وہ کب گوارا کریگا کہ اس کمپنی میں غیر شخص کا دخل ہو۔ وہ اس تصنیف میں طرح طرح کے

عیب نکالے گا، اور کمپنی کے مالک کو بھڑکا دیگا"۔ یہ پریم چند کا ذاتی تجربہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد اکثر جگہ انھوں نے اس کی طرف جستہ جستہ اشارے کیے ہیں۔ ادیب کی عزت (نجات) میں جب قمر کی بیوی نے اس کو اپنی صحت قایم رکھنے کے لیے سیر و تفریح کو ضروری قرار دیا تو اس نے جواب دیا۔

"میں تو قلم کا مزدور ہوں تم نے کبھی مزدوروں کو بھی ہوا کھاتے دیکھا ہے جنھیں کھانے کی کمی نہیں، انھیں ہوا کی ضرورت ہے۔ جنھیں روٹیوں کے لالے ہیں، وہ ہوا کیا کھائیں گے۔ پھر تندرستی اور لمبی عمر کی بھی انھیں کو ضرورت ہے، جن کو زندگی کے عیش و آرام میسر ہیں۔ میرے لیے تو زندگی محض بار ہے اس بار کو اور اٹھائے رکھنے کی خواہش مجھ میں نہیں۔ ... چراغ کا کام جلنا ہے۔ اس کی روشنی پھیلتی ہے یا اس کے سامنے کوئی دیوار ہے، اس سے اس کو کوئی مطلب نہیں ...... ادبی خدمت اور فریبی میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اگر کوئی ادیب موٹا تازہ ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس میں سوز نہیں۔ لوچ نہیں۔ چراغ کا کام جلنا ہے چراغ وہی لبالب بھرا ہوگا جو جلا نہیں"۔

کیا تعجب ہے کہ یہ الفاظ انھوں نے شیورانی دیوی سے کہے ہوں اور اسی پر ایک افسانہ کھڑا کر دیا ہو۔ ان افسانوں کے علاوہ جیل (نجات) تو بہ۔ ما یہ تفریح (خواب خیال) اور استعفیٰ (پریم چالیسی اول) میں انھوں نے اپنی زندگی پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

عورت کا مرتبہ اور آزادی عورت کے متعلق پریم چند کے خیالات بہت اعلیٰ و ارفع تھے۔ وہ عورت کی آزادی کو بہت پسند کرتے تھے۔ ہندوؤں کے رسم و رواج نے عورت کو جس بُری طرح کچل ڈالا ہے، اس سے وہ سخت متنفر تھے۔ ان کے تقریباً نصف سے زیادہ افسانے عورت کی ہستی کو بلند و برتر اور قابل تحریم و تکریم بتلاتے ہیں۔ اس کے اعتقادات، اس کا ایثار، اس کی محبت اور اس میں مصائب برداشت کرنے کی قابلیت، خودداری، شوہر پرستی، اور مذہب کی

پابندی کا خیال اس کے خمیر میں ہے، اور اس کی تکمیل کے لیے وہ اپنی جان کی کبھی پروا نہیں کرتی۔ جب وہ ایک سے محبت کرتی ہے تو ہمیشہ اسی کو چاہتی ہے، خواہ اس کا جسم کسی اور کے حوالے ہو جائے۔ اس کی روح اس سے بے تعلق نہیں ہوسکتی جس کو اس نے اپنا پتی تسلیم کرلیا ہے۔ ان تمام اوصاف کے مدنظر وہ قابل احترام ہستی بن گئی ہے۔ اسی لیے وہ ان تمام مراعات کی مستحق ہے، جس سے زمانے نے اس کو محروم کر رکھا ہے۔ پریم چند نے اپنے افسانے دوکسم (دودھ کی قیمت) میں اس کو آزادی نہ دینے پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"مرد کو اگر اطاعت کی آزادی ہے تو عورت کو آزادی کیوں نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کرتا ؤں نے ایک عورت کو غلام بنا دیا ہے وہ اس کے ساتھ جتنا چاہے ظلم کرے کوئی اس سے بازپرس نہیں ..... وہ جانتا ہے کہ عورت پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اسے رو رو کر مر جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اگر اسے خوف ہوتا کہ عورت بھی اس کی اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں، اینٹ سے بھی نہیں محض تھپڑ سے دے سکتی ہے، تو اسے کبھی بدمزاجی کی جرأت نہ ہوتی۔"

بازیافت (بتیسی دوم) میں عورت کے متعلق لکھتے ہیں۔

"عورت محض بچے جننے، شوہر کی خدمت کرنے، اور ایکادشی کا برت رکھنے کے لیے نہیں ہے اس کی زندگی کا مقصد اس سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ وہ انسان کی تمام مجلسی اور ذہنی ترقیوں میں برابر کا حصہ لینے کی مستحق ہے۔ وہ انسانی آزادی کی مساوی حق دار ہے۔"

غرض اس طرح انھوں نے اپنے اس خیال کی تائید کی ہے، اور عورت کو نہ صرف اس طرح قابل احترام ہستی بتلایا ہے، بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ عورت مرد کی زندگی کو چاہے تو بنا سکتی ہے اور چاہے تو بگاڑ سکتی ہے۔ لیکن ہندوستانی عورت کا زیادہ تر یہ مطمح نظر رہا ہے کہ اپنے شوہر کی زندگی کو بنائے اسی خیال کے تحت پریم چند نے لکھا ہے۔

ملیا نیین

"جب تک کہ گلے میں جوا نہیں پڑتا، سبھی کو کلیلیں سوجھتی ہیں۔ جوا پڑا اور سارا نشہ ہرن ہوا۔[1] یہی کلیلیں انسان کو قعر مذلت میں گراتی ہیں۔ اگر ایسے وقت کوئی عنان گیر ہو جائے اور رہبری کرے تو بدی کی راہ چلنے والا نیکی کا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ اس میں عورت کا بہت بڑا حصہ ہے۔

شادی کے متعلق پریم چند کا خیال | پریم چند شادی کے بارے میں اپنی رائے کا اس طرح اظہار کرتے ہیں۔

"شادی ایک مقدس فرض ہے۔ ایک روحانی معاہدہ ہے جب ہم دنیاوی ذمہ داریوں میں قدم رکھتے ہیں۔ جب ہمارے پیروں میں علایق دنیا کی بیڑی پڑتی ہے۔ جب ہم فرایض اور پابندیوں کے آگے اپنے سر جھکاتے ہیں۔ ایسی پاک رسم کا احترام کرنا ہمارا فرض ہے۔"[2]

لیکن اس رائے کے ساتھ وہ سیول میریج کے مخالف ہیں۔ پریم چالیسی اول کے پہلے افسانے (دو سکھیاں) میں چندا نے اپنی سہیلی پدما کو نصیحت کی۔

"دیکھنا، کہیں سیول میریج نہ کر لینا۔ شادی ہندو احکامات کے بموجب ہی ہو۔ ہاں تمہیں اختیار ہے کہ جو سینکڑوں بیہودہ لغویات اور بیہودہ گیاں ہیں ان کو نکال ڈالو۔ ایک قابل اور تعلیم یافتہ سنسکرت داں پنڈت کو ضرور بلانا۔ اس لیے نہیں کہ وہ بات بات پر ٹکے نکلوائے، بلکہ اس لیے کہ وہ دیکھتا رہے کہ سب کچھ شاستروں کے احکامات کے بموجب ہو رہا ہے یا نہیں۔"

پدما نے ان نصیحتوں کو نہ سنا، اور دوسرے سیول میریج کر لی۔ کچھ تلخیاں اور بدمزگیاں پیدا ہوئیں لیکن دونوں نبھاتے گئے اس سلسلے میں پدما نے چندا کو لکھا ہے۔

---

[1] غبن اول۔ [2] بازار حسن دوم صفحہ ۲۱۔

"دیکھیں ہم دونوں میں کس کی کشتی کنارے لگتی ہے۔ تم اپنی دیسی پانچ ہزار برس کی بوسیدہ و قدیم کشتی پر بیٹھی ہو، میں تیز رفتار موٹر بوٹ پر۔ موقع، کوشش اور سائنس تمام میرے ساتھ ہیں، لیکن اگر کوئی ناگہانی آفت آجائے تو میں اسی موٹر بوٹ پر ڈوبوں گی۔ سال میں لاکھوں آدمی ریل سے کٹ کر مرجاتے ہیں، مگر کوئی ریل گاڑی پر سفر نہیں کرتا۔ ریل کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے۔"

ہماری معاشرت نمود و نمائش سے بھری ہوئی ہے۔ ہم صورت دیکھتے ہیں، لیکن سیرت دیکھنے کا ہمیں موقع نہیں ملتا۔ ظاہری حالات ہمیں زیادہ فریفتہ کرتے ہیں، اور اندرونی حالات تک ہماری کوتاہ نظری پہنچنے کا موقع نہیں دیتی۔ چنانچہ انہیں چیزوں نے پدما کو رونود کا گرویدہ بنادیا اور رونود کو پدما کا۔ اس ظاہری حالت اور محبت میں ناکامی پر تنقید کرتے ہوئے چندرا نے لکھا۔

"سوانگ، آوارہ مزاج عورتوں کے لیے ہے۔ گھر والی تو اپنی محبت کا خزانہ اپنے دل میں پوشیدہ رکھتی ہیں۔ زیور، کپڑے، بننے ٹھننے میں مست رہنے والے لوگ نااہل ہوتے ہیں۔ اپنی نااہلیت کو چھپانے کے لیے یہ سوانگ بھرتے ہیں۔ کتے کو خاموش رکھنے کے لیے اس کے سامنے ہڈی کے ٹکڑے پھینکتے ہیں۔ بیچاری عورتیں اپنا سب کچھ دے کر کھلونے پاتی ہیں، اور انھیں میں مست رہتی ہیں۔ بالائے سطح ملبلے تیرتے ہیں۔ موتی سمندر کی تہہ میں رہتے ہیں۔"

اس طرح پریم چند نے عورت کو سمندر کی تہہ میں رہنے والے موتی سے تشبیہہ دی ہے۔ وہ عورت کو اتنی طاقتور بتلاتے ہیں، کہ غیر معمولی حالات میں جہاں مرد کی بھی جرأت جواب دے جاتی ہے، وہاں عورت استقلال کے ساتھ قدم جمائے کھڑی رہتی ہے۔ خواب پریشان (بتیسی دیم) میں وہ اس طرح رقم طراز ہیں۔

کنور امرناتھ ـــــ وہاں آسائشوں کی چیزیں نایاب ہوں گی درندوں کا خوف ہوگا۔

منورما — لیکن تم بھی ان تکلیفوں کی عادی نہیں ہو۔

کنور — میں مرد ہوں، انہیں بآسانی برداشت کر سکتا ہوں۔

منورما — میں موقع اور ضرورت پر آگ میں کود سکتی ہوں، عورتوں کی نزاکت مرد کا تخیل ہے، انہیں نازک کہکر زبردستی نازک بنایا جاتا ہے۔ ان کا جسم کمزور ہوتا ہے، پر دل، ارادہ اور ہمت کا وہ باندہ ہے جس پر زمانہ کے حادثات کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔"

راجپوتنیوں کی عظمت — اس ارادہ اور باندہ کی مثالیں ہم ان افسانوں میں دیکھتے ہیں جن میں راجپوتوں کی معاشرت، ان کا تمدن، ان کی تہذیب، ان کی جرأتیں اور ان کے حوصلوں کو ظاہر کیا گیا ہے۔ راجپوت کی جنگی قابلیت تاریخ جاننے والوں سے مخفی نہیں۔ یہی ایک قوم ہے جو منفرد رہ کر جنگ آزما رہتی تھی۔ اور اسی قوم کے سورماؤں نے باہر سے آنے والی قوموں کا مقابلہ کیا، اور ہندوستان کو غیر کے ہاتھوں میں جانے سے بچانے کی نا کام کوشش کی۔ ان میں اکثر راجہ اور رانیاں رستم و اسفندیار اور افراسیاب وجمشید کی طرح راجپوتوں کی قومی کہانیوں میں داخل ہو گئے ہیں — راجہ مہندر اور رانی سارندھا نے اس سلسلے میں لازوال شہرت حاصل کر لی ہے۔ پریم چند نے ان کے واقعات بیان کیے ہیں، ان کے مطالعے کے بعد ان کی عظمت و جبروت اور ان کے تقدس کا سکہ ہمارے دلوں پر بیٹھ جاتا ہے۔

"وکرمادت کا تیغہ" (پریم پچیسی اول) میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور کی ایک کہانی ہے۔ اس میں برندا ایک بیوہ عورت ہے اور اپنی دل بہلائی کے لیے گنگناتی ہوئی گھر کے کام کاج کرتی ہے۔ مہاراجہ کے فوجی سن پاتے ہیں — اور جبراً اس کو نیچے بٹھا کر اپنا کر اس کا گانا سننے میں لگ جاتے ہیں۔ وہ انتقام کی خاطر مہاراجہ کے دربار میں پہنچتی ہے اور اس کے سامنے اپنا قصہ بیان کرتی ہے۔

"میں بیوہ عورت ہوں۔ میری عزت کے پاسبان آپ ہیں۔ پتی یوگ کے ساڑھے تین سال میرے تپسوی بن کر کاٹے تھے۔ مگر آپ کے آدمیوں نے میری تپسیا خاک میں ملا دی۔

میں اس قابل نہیں کہ لوٹ کر اپنے گھر جا سکوں۔ اپنے بچہ کے لیے میری گود اب نہیں کھلتی۔ اپنے بوڑھے باپ کے سامنے میری گردن نہیں اٹھتی۔ میں اب اپنے گاؤں کی عورتوں سے آنکھیں چراتی ہوں۔ میری عزت لٹ گئی۔ عورت کی عزت کتنی قیمتی چیز ہے۔ اسے کون نہیں جانتا۔ ایک عورت کی عزت کے پیچھے لنکا کا شاندار راج مٹ گیا۔ ایک ہی عورت کی عزت کے لیے کورو بنس کا ناس ہو گیا۔ عورتوں کی عزت کے لیے ہمیشہ خون کی ندیاں بہی ہیں اور راج لٹ گئے ہیں۔ میری عزت آپ کے آدمیوں نے لی ہے۔ اس کا جواب دہ کون ہے انصاف کس کا خون چاہتا ہے۔ اس کا فیصلہ آپ کریں۔"

"گرمدا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ ایک دہقان عورت کا یہ حوصلہ، یہ خیال اور یہ جوش تقریر دیکھ کر سناٹے میں آگئے۔ کانچ کا ٹکڑا ٹوٹ کر تیز دھار والا چھرا ہو جاتا ہے، وہی کیفیت انسان کے ٹوٹے دل کی ہے!"

غریب راجپوتنی کے یہ الفاظ مہاراجا کو سکتے میں ڈال گئے اور اس کے دل پر بھی عورت کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا۔ اسی طرح رانی سارندھا کے الفاظ کی شان اور سطوت و شوکت ان لفظوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

عالمگیر کے ایک امیر ولی بہادر خاں نے رانی سارندھا کے بیٹے کا گھوڑا چھین لیا۔ رانی اس کو لینے کے لیے اپنی فوج کے ساتھ عالمگیر کے دربار میں پہنچی جہاں امیر موجود تھا۔ خان صاحب اور رانی میں سوال جواب ہوئے۔ خان صاحب نے دینے میں عذر کیا تو رانی نے کہدیا کہ اس کا فیصلہ تلواریں کریں گی۔ لیکن عالمگیر نے بیچ بچاؤ کر دیا اور رانی سے کہا کہ اس گھوڑے کو واپس کر دیا جائیگا لیکن اس کی قیمت بہت گراں ہو گی۔

رانی ـــ میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔

عالمگیر۔ جاگیر اور منصب بھی۔

رانی۔ جاگیر اور منصب کوئی چیز نہیں۔

عالمگیر ——— اپنا راج بھی۔

رانی ——— اس کی بھی میرے نزدیک کچھ ہستی نہیں۔

عالمگیر ——— ایک گھوڑے کے مقابلہ میں۔

رانی ——— جی نہیں۔ اس چیز کے مقابلے میں جو دنیا میں سب سے زیادہ پیاری ہے۔

عالمگیر ——— وہ کیا ہے۔

رانی ——— اپنی آن۔

اسی بندیل کھنڈ کی راجکماری نے جب اپنے بھائی انرده سنگھ کو اپنے ساتھیوں کو گنوا کر آتے دیکھا اور میدان کارزار کے واقعات بیان کرتے سنا تو اس کی تیوری پر بل پڑ گئے، اور غرور کی سرخی سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی۔ "بھیا۔ تم نے خاندان کی رسم کھو دی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا" انرده سنگھ لوٹ گیا، اور اس کی بیوی سیتلا دیوی ناگن کی طرح بل کھا کر اپنی نند سے کہنے لگی "رسم اتنی پیاری ہے"

سارندھا ـ ہاں

سیتلا ـ اپنا پتی ہوتا تو کلیجہ میں چھپا کر رکھ لیتی۔

سارندھا ـ نہ کلیجے میں خنجر چبھو دیتی۔

چنانچہ اس نے وقت آنے پر اپنے ہاتھ سے اپنے پتی کے حکم کی تعمیل میں اس کو قتل کر دیا اور خود بھی اسی خنجر سے اپنے آپ کو دام زیست سے چھڑا لیا۔

اس سلسلے میں بڑے گھر کی بیٹی، راجہ ہردول (پچیسی اول) راجپوت کی بیٹی۔ دھوکا، جگنو کی چمک (پچیسی دوم) وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں راجپوتوں کے خصائل اور کارنامے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں جو بعض نیم تاریخی حقیقت رکھتے ہیں۔ راجپوتوں کی عظمت کا اظہار کرنے کے لئے افسانوں میں عورت کے کردار کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جیسے کہ یہ وہ مائیں تھیں جن کے سپوت تیغ ہارنے کی بجائے موت کو زندگی گنوانے اور غلام بنے رہنے میں اپنی توہین سمجھی اور ایک عرصہ دراز تک بیرونی حملہ آوروں سے مغلوب نہیں ہوئے۔

پانچواں باب - پریم چند کا اسلوب بیان

طرز خط اور طرز بیان کی نقل | ہر شخص کا ایک خاص او رمحبوب مصنف ہوتا ہے اسی کی کتابیں زیادہ تر اس کے مطالعہ میں رہتی ہیں اور وہ امکانی کوشش کرتا ہے کہ اپنی تحریریں بھی اسی نہج پر آجائیں۔ اس کوشش میں بعض حضرات صرف تحریری طرز ہی کی مشق نہیں کرتے بلکہ طرز خط بھی اڑانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی۔ بنگال میں ٹیگور کے طرز خط کی نقل کی گئی حیدرآباد میں مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زور کے طرز خط کی بھی نقل کی اسی طرح کامیاب کوششیں ہوئیں لیکن طرز خط اور طرز تحریر دونوں میں بڑا فرق ہے۔ طرز خط کی نقل اڑانے میں کامیاب ہونا جتنا آسان ہے اسلوب بیان میں کامیابی حاصل کرنا اتنا ہی مشکل ہے۔ بعض لوگ امکانی کوشش کرتے ہیں کہ کسی خاص ادیب کے طرز تحریر اور طریق بیان کو استعمال کریں مثلاً مولوی عبدالحق نے حالی کے طرز میں لکھنے کی مشق کی اور بہت لکھتے چلے آتے ہیں۔ لیکن بعض ناکام بھی ہوتے ہیں بعض اپنے بھی طرز طریق کو چھوڑ کر دوسروں کی روش اختیار کرتے ہیں اور ناکام ہو جاتے ہیں یہ ان کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔ بعض خوش قسمت ادیب جنھیں دنیا میں اپنا نام روشن کرنا اور روشن رکھنا ہوتا ہے کسی ایک ادیب کے اسلوب کا اتباع کرتے ہوئے اپنے لیے ایک الگ راستہ قایم کر لیتے ہیں اور یہ راستہ اگر آسان ہو تو ایسا ہوتا ہے کہ آنے والی نسلیں اس پر چلنا اپنے لیے فخر سمجھتی ہیں اور اگر مشکل ہو تو ان کے انداز بیان پر واہ واہ تو ہوتی ہے لیکن تقلید نہیں ہوتی۔ ان میں آغا حید رحسن، نیاز، حسن نظامی ملا رموزی بہت نمایاں ہیں۔

اپنے اسلوب کے متعلق پریم چند کا خیال | پریم چند کا تعلق شاہراہ بنانے والے ادیبوں سے ہے انھوں نے شرر، سرشار اور ٹیگور کی تصنیف سے اپنا مطالعہ شروع کیا، اور ابتدائی تحریروں میں انھیں کا رنگ

آ تا گیا لیکن ایک دو کتابوں کے بعد ہی ان مصنفین سے بہت آگے نکل گئے اور جہاں جس طرزِ ادا اور طرزِ تحریر کی ضرورت سمجھی انہوں نے اسی کو استعمال کیا۔ ان کی تحریریں سرشار کے رنگ میں ہیں اور کہیں شرر کے کہیں ٹیگور کے اور کہیں چیٹرجی کے۔ یہ تغیرِ طرز اس امر کی شاہد ہے کہ وہ بذاتہٖ ایک صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ وہ قاری کو جس ڈگر پر لانا چاہتے ہیں، اس کی عنانِ ارادی کو اس طرف موڑ دیتے ہیں۔ قاری یہ سمجھتا ہے کہ وہ یہاں شرر کے رنگ میں ہیں اور یہاں ٹیگور کے رنگ میں انھوں نے موقع اور محل کے لحاظ سے کام کیا۔ خود ان کا بیان ہے کہ۔

"میرے طرزِ تحریر پر کسی دوسرے مصنف کے اسلوب بیان کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ لیکن پنڈت رتن ناتھ اور ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا طرز کچھ کچھ اثر انداز ہوا ہے"[۱]

ابتدائی دور میں سرشار کا اتباع | ہر مصنف خواہ وہ بڑا ادیب ہو یا معمولی افسانہ نگار، ابتدا میں ایک نمونہ اپنے پیشِ نظر رکھتا ہے، اور کوشش کرتا ہے کہ اسی کی طرزِ تحریر اختیار کرے، لیکن جوں جوں مشق بڑھتی جاتی ہے، اس میں اوریجنلٹی پیدا ہوتی ہے۔ وہ یا تو اپنے محبوب مصنف کا کامیاب مقلد بن جاتا ہے، یا اس کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتا ہے۔ پریم چند بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ ہم جب ان کے سب سے پہلے کارنامے "ہم خرما و ہم ثواب" پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سرشار کا کوئی ناول ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ان کی ہر فصل آن بان کی منظر نگاری کے ساتھ شروع ہوتی ہے اور پھر وہ مطلب پر آ جاتے ہیں۔ دوسری کتاب "حبِ وطن کے قصے یا سوزِ وطن و سیرِ درویش" ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس نے نواب رائے کو پریم چند بنایا۔ اس میں افسانوں کی ابتدا نئے انداز سے ہوئی ہے۔ یہاں شرر کی منظر نگاری تو نہیں، لیکن زبان ویسی ہی فارسی آمیز ہے۔ ان دونوں کتابوں میں زبان کی وہ لطافتیں۔ روانی۔ سادگی۔ لوچ۔ شگفتگی اور حلاوت نہیں جو آگے چل ان کی تصنیفات کی روح بن گئی ہیں۔ اس بات میں

---

[۱] - پریم چند زمانہ نمبر صفحہ ۱۹۰ -

قدامت کا رنگ ہے، مثلاً سوزِ وطن کی پہلی کہانی "دنیا کا سب سے انمول رتن" اس طرح شروع ہوتی ہے۔

"دلفگار ایک پرخار درخت کے نیچے دامن چاک بیٹھا ہوا خون کے آنسو بہا رہا تھا۔ وہ حسن کی دیوی یعنی ملکہ دلفریب کا سچا اور جانباز عاشق تھا۔ ان عشاق میں نہیں، جو عطر پھلیل میں بس کر اور لباس فاخرہ سے سج کر عاشق کے بھیس میں معشوقیت کا دم بھرتے ہیں، بلکہ ان سیدھے سادے بھولے بھالے فدائیوں میں جو کوہ و بیابان میں سر ٹکراتے اور نالہ و فریاد مچاتے پھرتے ہیں۔ دلفریب نے اس سے کہا تھا کہ اگر تو میرا سچا عاشق ہے تو جا اور دنیا کی سب سے بیش بہا شے لے کر میرے دربار میں آ۔ تب میں تجھے اپنی غلامی میں قبول کروں گی۔"[۵]

یا افسانے کی آخری عبارت کا مطالعہ ان کی ابتدائی طرز تحریر کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔

"یکایک پردہ زرنگار ہٹ گیا اور دلفگار کے روبرو ایک دربار حسن آراستہ نظر آیا۔ جس کی ایک ایک نازنین رشک زلیخا تھی۔ دلفریب بصد شان رعنائی مسند زرین کار پر جلوہ افروز تھی۔ دلفگار یہ طلسم حسن دیکھ کر متحیر ہو گیا، اور نقش دیوار کی طرح سکتے میں آ گیا کہ دلفریب مسند سے اٹھی۔ اور کئی قدم آگے بڑھ کر اس کے ہم آغوش ہو گئی۔ رقاصان دلنواز نے شادیانے گانے شروع کیے، حاشیہ نشینان دربار نے دلفگار کو نذریں گذرانیں، اور ماہ و خورشید کو بعزت تمام مسند پر بٹھایا۔"

ہمارے ذہن میں پریم چند کے طرز نگارش کے جو نقوش مرتسم ہیں ان میں ان کی تحریروں کا نقش نظر نہیں آتا۔ اس کے لیے ایک علاحدہ جگہ نکالنی پڑتی ہے۔ ورنہ یوں ہمارے ذہن ان کو پریم چند کی تحریر سمجھنے سے ابا کرتے ہیں اس لیے کہ اس دور کی تحریریں پریم چند کی فارسی کی استادانہ قابلیت

۵۔ سوزِ وطن۔

اور زبان پر اقتدار کا نمائندگی مظہر ہیں۔ فارسی کے مرکب الفاظ تشبیہیں اور استعارے ہمیں (فسانۂ عجائب) کی یاد دلاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کرداروں کے نام بھی ایرانی ہیں۔ لیکن اسی کتاب میں ہمیں ایسے بھی اشارے ملتے ہیں، جہاں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ اسلوب بیان قایم رہنے والا نہیں، اور نہ یہ خیالات ہی ٹھہرنے والے ہیں۔ وہ کبھی نہ کبھی کسی طرف دھارا کو پھیر دیں گے۔ یہ کیفیت ان کے تیسرے افسانے "یہ میرا وطن ہے" میں بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔ ساٹھ سال کے بعد ایک غریب الدیار اپنے وطن کو واپس آیا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

"لیکن یہ اللہ، میرا شکستہ جھونپڑا، جس کی گود میں برسوں تک کھیلا تھا، جہاں بچپن اور بے فکریوں کے مزے لوٹے تھے، جس کا نقشہ ابھی تک آنکھوں میں پھر رہا ہے، وہ اب ایک تودہ خاکستر ہو گیا تھا۔ مقام غیر آباد نہ تھا، سیکڑوں آدمی چلتے پھرتے نظر آتے ..... مگر ..... ان کے چہروں پر تفکر اور پژمردگی نمایاں تھی، اور وہ سب افکار دنیا سے خستہ حال معلوم ہوتے تھے۔ میرے ساتھیوں کے سے نوجوان، تندرو، سرخ و سفید نوجوان کہیں دکھائی نہ دیتے ..... اکھاڑہ کی جگہ دو دیوار شکستہ اسکول تھا۔ اس میں چند مریض صورت کمزور اور دق زدہ لڑکے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔"

اس کے بعد وہ اپنے بچپن اور جوانی کے واقعات کا اعادہ کرتا ہے اور ہم بھی اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ وہ ساٹھ سال پہلے کے دیہاتی مناظر کا نقشہ پیش کرتے ہیں، اور ہمیں ایران سے ہندوستان میں اپنے دیکھے بھالے مقامات اور اپنے وطن میں پہنچا دیتے ہیں۔ یہی ان کے خیالات کا تدریجی ارتقا ہے اگرچہ اسلوب نگارش میں نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی، مگر ہم مستقبل کی جھلک یہیں دیکھ لیتے ہیں۔

دس سال بعد کا اسلوب بیان فارسی الفاظ کی آمیزش ان کے ابتدائی افسانوں میں نظر آتی ہے اگر ہم ان کے کارناموں کو تاریخ وار تسلسل سے پڑھتے جائیں تو تین ہی چار افسانوں کے بعد یہ آمیزش غائب ہوتی نظر آتی ہے۔ "روٹھی رانی"، "عشق دنیا اور حب وطن" کے بعد سنہ ۱۹۱۱ء میں "سیر درویش"

زمانہ) میں شایع ہوئی اور یہ وہ زمانہ ہے کہ پریم چند نے اپنے ادبی زندگی کے دس سال پورے کر لیے ہیں۔ اس افسانے کے مطالعے سے اسلوب بیان کے فرق کا اندازہ ہوتا ہے۔

جب شیر سنگھ شیر سے انسان بن گئے اور مسافر نے وہاں پہنچ کر شیر سنگھ سے ودیا دھری کے شبہ کی بنیاد پوچھی تو انہوں نے اثبات میں جواب دیا اور کہا۔

"اس کا تازیانہ بہت کارگر ہوا۔ باوجود اس کفارہ کے ندامت نے ابھی تک میرا دامن نہیں چھوڑا۔ دنیا کی کسی چیز کو قرار نہیں، مگر گناہ کا داغ لافانی ہے۔ نام نیک مٹ جاتا ہے، مگر داغ گناہ نہیں مٹتا۔ میرے خیال میں ایشور بھی اس داغ کو نہیں مٹا سکتا۔ کوئی تلافی، کوئی کفارہ، کوئی تعزیر اس گناہ کے داغ کو نہیں دھو سکتی۔ شفاعت اور توبہ اور کنفشن یہ سب دنیا پرست زاہدوں کی ایجادیں ہیں۔ گناہ کی آگ روح کی عظمت اور آزادی کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔"

یا اسی افسانہ کا تقریباً آخری حصہ اس سے بھی سادہ اور دلآویز ہے اور اس رنگ پر آگیا ہے جو پریم چند نے آگے چل کر اختیار کر لیا۔

پریم بہار اجودھیا پہنچ کر پنڈت جی کو لے آئی اور ودیا دھری سے ملایا ان دونوں کے ملنے کی کیفیت پریم چند نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

"جوں ہی پنڈت جی اندر آئے، ودیا دھری اٹھ کر ان کے پیروں سے چمٹ گئی۔ دیوی نے بہت دنوں کے بعد پتی کے درشن پائے ہیں۔ آنسوؤں سے ان کے پیر پکھار رہی ہے۔ جس طرح مینہہ برسنے کے بعد گلاب کے پودے سے پانی کی بوندیں ٹپکتی ہیں، اسی طرح پنڈت جی کی آنکھوں سے آنسو کی بوندیں ٹپک رہی ہیں، دونوں کے دل مسرت سے امڈے ہوئے ہیں۔ انسان خوشی میں بھی روتا ہے، جس طرح کبھی کبھی دھوپ میں ترشح ہو جاتا ہے ...... میں نے رخصت کی اجازت چاہی ...... ودیا دھری نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں پتلیوں کی جگہ دل رکھا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ آسمان

کی طرف اٹھا کر بولی ایشور تمہیں اس نیکی کا بدلہ دے۔"
یہی وہ اسلوب ہے جس کو پریم چند نے اختیار کیا اور اس میں ترقی کرتے گئے۔
بیس سال بعد کا اسلوب | اس افسانے کے گیارہ سال بعد "لال فیتہ" شائع ہوا۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طرز تحریر میں کافی فرق ہو چکا تھا۔ وہ ایک مشاق ادیب بن چکے تھے اور زبان پر بھی انھیں پوری طرح قابو حاصل ہو چکا تھا۔ اسی افسانے سے ہم یہاں اقتباس درج کرتے ہیں۔

"تیسرے دن بابو ہری بلاس اپنے موضع میں آگئے۔ مکان بے مرمت پڑا ہوا تھا۔ چاروں طرف گھاس جم آئی تھی گاؤں والوں نے دروازے پر کھادو ۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگا دیے تھے۔ ادھر کئی سال سے بابو صاحب گھر نہ آئے تھے۔ گھر میں قدم رکھتے ہی کراہیت سی ہونی تھی ... عورتیں رنجنی کے ساتھ گھر کی صفائی کرنے لگیں۔ کئی مردوں نے تیور جلاس کو جھاڑ اور ٹوکریوں سے ہٹا دیا۔ یہ دونوں پسینے میں شرابور تھے اور سوچ رہے تھے کہ موٹا کام دنیا میں چاہے جتنا ہی دشوار کیوں نہ ہو واقعات کی دنیا میں وہ اتنا پسندیدہ نہیں۔ رام بھروسے پنڈت نے بابو ہری بلاس سے کہا "بھیا، تم نے اچھا کیا، استعفا دیدیا، دیس پردیس مارے مارے پھرتے تھے اب سکھ سے گھر میں رہو گے۔ گرمٹی میں ملا جاتا تھا، اب بس جا کر کا تیخ عید دینے کیا۔ جا کری چاہے چھوٹی ہو چاہے بڑی، چاکری ہی ہے۔ جب اللہ نے سب کچھ تمہارے گھر میں پیدا ہے تو کیوں کسی کی بندگی کرو۔

کو بر جو کیدار بولا۔ "مدا بابو جا (عہدہ) بڑا تھا۔

بھو جو کری نے کہا۔ جا تو بڑا تھا، مدا کتنے گرمیوں کا گلا ریتنا پڑتا، سینکڑوں کو جیل بھیجا ہو گا، اس لڑائی میں پر جا کو مار مار کر سرکار کو کرج دلایا ہو گا۔ دورے پر جاتے ہوں گے، تو بیگار لینا پڑتی ہو گی، ان کے ہاتھوں کتنے کسانوں کا اخراج اور بے دخلی ہوا

ہو گی۔ گھر میں دیں گے، تو اس جھنجھٹ سے تو گلا چھوٹ جائے گا۔

گو بر چوکیدار۔ ثواب کتنا تھا۔ حکومت کتنی تھی۔

جھو جو۔ ثواب بڑے سے نہیں ہوتا۔ ثواب بھل منسی سے ہوتا ہے۔ پدیا اور دھرم ہوتا ہے۔ رام بھروسے پنڈت کون بڑے والے ہیں، لیکن کیوں سب لوگ گھاٹ سے اٹھکر پا لاگن کرتے ہیں۔ تھانیدار آتے ہیں تو ان کی کتا تر ایک چلم تماکو دینا سب کو اکھرتا ہے۔ لیکن شاستری مہاراج جس کے گھر دس پانچ چیلوں سمیت آ جاتے ہیں، وہ اپنے بھاگ کو سراہتا ہے۔ ...... آج جو حکم دیں تو لوگ آگ میں کود پڑیں۔"

یہ ہے پریم چند کا زور بیان اور ان کی تہ بینی۔ وہ دیہاتیوں کی دکھتی رگ پکڑ لیتے ہیں۔ انکے طرز گفتار پر قادر ہیں، اور ان کے خیالات کو اپنے خیالات میں سمو لیا ہے اور انھیں کی زبان میں اتنی شیریں، حلاوت اور دلآویزی کے ساتھ ہمارے سامنے بیان کرتے ہیں۔ بیان کیا کرتے ہیں، گویا ان کا دل ہماری آنکھوں کے آگے رکھ دیتے ہیں۔ یہ کمال اور یہ مصوری کسی اور کے ہاں نہیں مل سکتی۔

یہ ایک بڑی تصویر ہے، اور انھوں نے جذبات کو ظاہر کرنے کے لیے ایک وسیع میدان پیدا کر لیا ہے۔ لیکن اگر ہم غائر مطالعہ کریں تو چھوٹی تصویریں بھی سینکڑوں نظر آئے گی۔ مثلاً وہ "میدان عمل" میں پانی برسنے کے بعد دھوپ نکلنے کے منظر کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

"آج کئی دن کے بعد تیسرے پہر سورج دیوتا نے زمین کی فریاد سنی، اور گویا مراقبے سے نکل کر اس نے دعائیں دست قبول بڑھا ہے ہیں، اور زمین گود پھیلائے ان کی دعاؤں کو بٹور رہی ہے۔"

یہ ایک پہاڑی علاقے کی تصویر ہے۔

"ہمالیہ کی کوہستانوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا ہرا بھرا گاؤں ہے سامنے گنگا کسی دوشیزہ کی طرح ہنستی کھیلتی، ناچتی گاتی چلی جا رہی ہے۔ گاؤں کے پیچھے ایک اونچا پہاڑ

جو جیسا نہیں

کسی بوڑھے جوگی کی طرح جٹا بڑھائے متین خیال میں محو کھڑا ہے۔"

یہی گنگا مائی تاریکی میں کرشن چندر (بازار حسن) کو خودکشی کے وقت اس لباس میں نظر آتی ہے۔ "گنگا کسی مریض کی طرح کھرے کی چادر اوڑھے کراہ رہی تھی۔ آس پاس کی تاریکی اور گنگا میں صرف روانی کا فرق تھا۔ یہ رواں تاریکی تھی۔ چاروں طرف ایسی اداسی چھائی تھی، جو کسی کی وفات کے بعد گھر پر چھا جاتی ہے۔"

اس سے آگے ہم نے کئی ایسے جملے نقل کر دیے ہیں جن میں چشم بصیرت نئی نئی تصویریں دیکھے گی۔

ہندی الفاظ کی آمیزش | پریم چند نے اپنا ابتدائی دور سرشار اور شرر کی صحبت میں بسر کیا، اس لیے ان کی تحریریں فارسی آمیز ہیں۔ لیکن جب وہ سنہ ۱۹۱۲ میں "سرسوتی اور لکشمی" کے لیے ہندی میں کہانیاں لکھ کر مشہور ہونے لگے تو ہندی کے الفاظ بھی انھوں نے اردو میں ملانے شروع کیے۔ لیکن یہ آمیزش کھانے میں نمک کے مانند تھی ان لفظوں کو دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی کہیں کہیں استعمال کرنا شروع کیا۔ ان الفاظ کی مثالیں حسب ذیل ہیں

بنتی کرنا، درشن دینا، تپسیا، پردان، دھن، بل، ودیا، کل، سیوا، سیوک، ودیادان یا وردان، بلوان، اچھا، جگ جگ جینا، من موہت کرنا، تیاگ، بھگتی، اشیرباد، رسوئی وغیرہ۔

اس کے بعد بعض ایسے الفاظ کو بھی انھوں نے اردو ادب میں داخل کرنے کی کوشش کی، جو عوام کی فہم سے بالاتر تھے۔ انھیں ابھی تک دیگر افسانہ نگاروں نے بھی استعمال نہیں کیا، اور وہ قبول عام کی سند حاصل نہ کر سکے۔ مثلاً

اشٹ بھجی، اُتم پدارتھ، اُپکار، دھنیہ، بدھی، اُپاسنا، دھرم ویر، جس کا نام نکلنا، رکشا، نوران، سماچار، دکشنا، نیوچھاور، پرادھ، اگرہ، آلہا، کلیان کرنا، کشٹ لالسا، گپھا، دوج، شرادھ، بھیتہ وغیرہ۔

اول الذکر الفاظ کا استعمال پریم چند نے بہت کیا ہے اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں ۷.

جن سے زبان کی شیرینی، سلاست، سادگی اور حسن میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ لیکن موخر الذکر الفاظ جہاں انھوں نے استعمال کیے ہیں، وہ پڑھنے والے کے ذہن پر ضرب لگاتے ہیں، اور اس کو سلاست اور شیرینی زبان کا عادی رہ کر یکایک زجر و توبیخ بھی سہہ لینی پڑتی ہے اور وہ دو وصلی گا کی دولاتیں بھی سہی، کہکر خاموش ہو جاتا ہے۔

ٹیگوریت | عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ پریم چند نے ابتداً ٹیگور تتبع کیا، جس کا خود انہیں بھی اعتراف ہے۔ ٹیگور کے طرز کو صاحب "تاریخ ادب اردو" نے خیالی یعنی ٹیگوری اردو کے نام سے موسوم کیا ہے اور یہی وہ طرز ہے جس کو ٹیگور نے گیتان جلی میں اختیار کیا تھا۔ اس میں شاعرانہ جذبات کو شاعرانہ نثر میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی دوسری خصوصیت اس کا مختصر مفید ہونا ہے۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنے پیدا کیے جاتے ہیں، گویا اس پر دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی مثل صادق آتی ہے۔ اس لحاظ سے پریم چند اردو ادب میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کے مختصر جملے جن میں زیادہ سے زیادہ معنے پنہاں ہوتے ہیں، اور جن پر افسانے اور ناولوں کی بنیادیں رکھی جا سکتی ہیں، ان کے افسانے اور ناولوں میں کثرت سے ہیں۔ یہ جملے انھیں بنانے نہیں پڑے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا برف کے ٹیلوں یا ٹکڑوں کو اپنے ساتھ لیے بہا چلا جا رہا ہے ان میں اکثر جملے ایسے بھی ہیں جو مستقبل قریب میں ضرب المثل بن جائیں گے اور ان کی بھی وہی حالت ہوگی جو اب بعض ضرب الامثال کی ہے کہ ہم ان کے مصنفین کے متعلق کوئی معلومات نہیں رکھتے لیکن ان کے جملوں کو بلا تکلف استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان کے چند جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

۱۔ کثیف برتن سے صاف پانی بھی گندہ ہو جاتا ہے نفرت سے بھرا ہوا دل پاک مذاق بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ (بیوہ)

۲۔ جلتے ہوئے دل سے دھوئیں کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے (بیوہ)

۳۔ حسد کی آگ محسود کی ترقی اور بہتری کے ساتھ تیز اور مشتعل ہوتی جاتی ہے، اور

اسی وقت بجھتی ہے، جب محسود کی زندگی کا چراغ بجھ جاتا ہے۔ (جلوۂ ایثار) بوجھ نہیں

۴ - شاعر وہ شعبدہ باز ہے جس کی پٹاری میں بجائے سانپوں کے دل بند ہوتے ہیں (جلوۂ ایثار)

۵ - بوڑھے بچے جلدی سو جاتے ہیں اور یہ ہے کاریگنا سن کر جاگ اٹھتے ہیں (منتر)

۶ - تیوہار، تماشہ دیکھنے، عمدہ عمدہ چیزیں کھانے اور بڑھیا بڑھیا پوشاکیں پہننے کا نام نہیں ہے۔ یہ برکت ہے، یہ تپسیا ہے، اپنے بھائیوں سے محبت و ہمدردی جتانا تیوہاروں کا خاص مقصد ہے۔ کپڑے سرخ کرنے سے پہلے خون کو سرخ بنا لو۔ سفید خون پر یہ سرخی زیب نہیں دیتی۔ (آنسوؤں کی ہولی)

۷ - ہندوستان میں مروت کی پوجا لکشمی کی ناراضی کے مرادف ہے۔ (ادیب کی عزت)

۸ - جس طرح سوکھی لکڑی جل اٹھتی ہے، اسی طرح بھوک سے باولا انسان ذرا ذرا سی بات پر تنک جاتا ہے۔ (بڑے گھر کی بیٹی)

۹ - عورت گالیاں سہتی ہے، مار بھی سہتی ہے، مگر میکے کی نندا اس سے نہیں سہی جاتی۔ (بڑے گھر کی بیٹی)

۱۰ - دلوں کا میل دھونے کے لیے آنسوؤں سے زیادہ کارگر کوئی چیز نہیں۔ (بڑے گھر کی بیٹی)

۱۱ - جو پسینہ بہائیں، وہ روٹیوں کو ترسیں، اور جنھوں نے حرام کاری کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے، وہ ہماری محفلوں کی زینت بنیں۔ میں یہ جور و ستم نہیں دیکھ سکتا۔ (راج ہٹ)

۱۲ - مکار آدمی کو اپنے جذبات پر جو قدرت ہوتی ہے، وہ کسی درویش کو بھی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کا دل روتا ہے، مگر ہونٹ ہنستے ہیں، دل مسرت کے مزے لیتا ہے، مگر آنکھیں روتی ہیں۔ دل حسد کی آگ سے جلتا ہے، مگر زبان سے قدر و شکر کی ندیاں بہہ نکلتی ہیں۔ (آمہ)

۱۳ - پجاری کا کام تو پوجا کرنا ہے۔ دیوتا اس کی پوجا قبول کرتا ہے یا نہیں یہ سوچنے کی

اسے فرصت کہاں ہے۔ (کسم)

۱۴۔ مرد دوں کے لیے دنیا ویران ہے (کسم)

۱۵۔ مردوں کے لیے بیوی پیر کی جوتی، اور عورت کے لیے مرد دیوتا ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ طلوع شعور کے ساتھ ہی وہ شوہر کے نام پر بک جاتی ہے۔ (کسم)

۱۶۔ ایشور تمام باتیں دے مگر جھوٹا غرور نہ دے۔ (دو سکھیاں)

۱۷۔ تنہائی رنج کو اور بھی جان گسل کر دیتی ہے۔ (مجبوری)

۱۸۔ تفریح جدت کی غلام ہے اور جدت کو تقویم پارینہ سے نفرت۔ (مجبوری)

۱۹۔ اعتقاد عورت کا وصف ہے۔ (مجبوری)

۲۰۔ جس گھر میں کوئی نہیں رہتا اس میں چمگادڑ بسیرا لیتے ہیں۔ (مجبوری)

۲۱۔ سیاسیات کے رموز حال تنقید نہیں ہوتے۔ (لیلی)

۲۲۔ جب دل پر چوٹ لگتی ہے تو دلیلوں سے آدمی کی تشفی نہیں ہوتی۔ (مزار الفت)

۲۳۔ نفرت دلیلوں کی محکوم نہیں۔ (مزار الفت)

۲۴۔ گھر سے نکلی ہوئی عورت، تھان سے بھاگی ہوئی گھوڑی ہے، جس کا کچھ بھروسہ نہیں۔ (ابھاگنی)

۲۵۔ چوٹ کی گرمی میں درد کا احساس نہیں ہوتا۔ زخم ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو ٹیس ہونے لگتی ہے۔ (گھاس والی)

۲۶۔ کسی کی تضحیک کرنا، اس کی نگاہ میں اپنا وقار کھونے کا نہایت آسان نسخہ ہے۔ (بازیافت)

۲۷۔ صورتِ افلاس، افلاس سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ (بازیافت)

۲۸۔ یہاں حرارت اس نقطہ پر ہے، جہاں آگ لگ جاتی ہے۔ (بازیافت)

۲۹۔ صبر کا باندھ جب ٹوٹ جاتا ہے، تو خواہش کا بہاؤ قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ (بوڑھی کاکی)

۳۰۔ صنف لطیف کے سامنے ہم فیاضی اور شرافت کے پتلے بن جاتے ہیں۔ (بنک کا دیوالہ)

۳۱۔ مایوسی محال کو ممکن بنا دیتی ہے۔ (بنک کا دیوالہ)

۳۲۔ ہمارے جذبات پیش بینیوں کے تابع نہیں ہوتے (سوتیلی ماں)

۳۳۔ نفس کے سامنے ایک بار سر جھکا دینے کے بعد پھر سنبھلنا مشکل ہوتا ہے۔ گناہ کی اتھاہ دلدل میں پھسل کر ہم دم بدم نیچے ہی ہوتے جاتے ہیں۔ (ایمان کا فیصلہ)

۳۴۔ گناہ کے قابو میں آیا ہوا دل خزاں کا مارا ہوا پتہ ہے جو ہوا کے جھونکے سے گر پڑتا ہے۔ (ایمان کا فیصلہ)

۳۵۔ ندی کی لہریں چاروں طرف چلتی ہیں، لیکن دھارا اپنا راستہ نہیں چھوڑتی۔ (درگا کا مندر)

۳۶۔ مصیبت پڑنے پر انسان کچھ ضعیف الاعتقاد ہو جاتا ہے۔ دواؤں سے مایوس ہو کر ہم دیوتاؤں کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ (درگا کا مندر)

۳۷۔ اجڑا ہوا گاؤں، گھریا ہوا اعتبار ہے۔ (بانکا زمیندار)

۳۸۔ غمناک خیالات تنہائی کے منتظر رہتے ہیں۔ (مرہم)

۳۹۔ کمزور ارادہ ہمیشہ سوال اور دلیل کی آڑ لیا کرتا ہے۔ (غیرت کی کٹار)

۴۰۔ مردوں کے دل پر حسن ظاہر کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے وہ دل کی قدر کرنی جانتے ہی نہیں۔ (شکست کی فتح)

۴۱۔ خودی جب بیدار ہوتی ہے، تو دل کی کمزوریاں اس کے قریب آتے ڈرتی ہیں۔ (خودی)

۴۲۔ کوڑیوں سے روپیہ بنانا بیوپاریوں کا کام ہے۔ بابو لوگ تو روپیے کی کوڑیاں بناتے ہیں۔ (غبن صفحہ ۹۰)

۴۳۔ دل پر چوٹ لگتی ہے، تو آدمی کو کچھ نہیں سوجھتا۔ (غبن)

۴۴۔ محبت اپنے معراج پر پہنچ کر پرستش بن جاتی ہے۔ (ضمن صفحہ ۲۴۵)

۴۵۔ انسان کی زندگی میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب اسے اپنی نیکیوں پر پچھتانا پڑتا ہے۔ (بازارحسن کی پہلی سطر)

۴۶۔ آج کل دھرم ریاکاروں کا اڈہ بنا ہوا ہے۔ (بازارحسن صفحہ ۳۸)

۴۷۔ فیشن وہ شاعرانہ خیال ہے، جو خون دل پی کر لیتا ہے، مگر حاصل بجز واہ واہ کے اور کچھ بھی نہیں۔ (بازارحسن صفحہ ۹۴)

۴۸۔ حکام کی آنکھیں نہیں ہوتیں صرف کان ہی ہوتے ہیں۔ (بازارحسن صفحہ ۱۴۹)

۴۹۔ برسات کی آخری بوندوں کی طرح انسان کی آخری نصیحتیں بیکار نہیں جاتیں۔

ایسے سینکڑوں جملے ان کتابوں میں ملیں گے۔ کوئی افسانہ ایسے جملوں سے خالی نہیں اردو ادب کے بہت کم ادیب ہوں گے جن کے پاس ان جواہر ریزوں کی اس قدر فراوانی ہوگی۔

پریم چند کی تشبیہیں | پریم چند نے نئی نئی تشبیہیں اچھوتے استعارے اور نادر الفاظ بھی استعمال کیے ہیں اور اپنی طرف سے نئے الفاظ بھی بنائے ہیں ان کے ثبوت میں چند جملے یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ بجلی کی روشنی سے سارا میدان برق قایم بنا ہوا تھا۔ (منتر)

۲۔ آج دس سال سے ضبط کر رہا ہوں۔ اپنے سینے کے اندر ایک کرہ نار چھپائے بیٹھا ہوں (خانہ برباد)

۳۔ جواہر نگار خول کے اندر جیسے تیز تلوار چھپی رہتی ہے اس طرح عورت کا نازک دل صبر اور استقلال کو اپنی گود میں چھپائے رہتا ہے۔ غصہ جیسے تلوار کو باہر کھینچ لیتا ہے، اسی طرح الفت عورت کے صبر اور استقلال کو بیدار کرتی ہے۔ (ماں)

۴۔ وہ شاعر کے تخیل کی طرح مسرت اور آرزو کی چیز تھی۔ (لیلی)

۵۔ اگن دیوتا اپنی آتشیں زبانوں سے دھرم ویر کا جس گا رہے ہیں۔ (جہاد)

۶۔ سانسیں اپنی تاثیر الزادہ ہو دُوں کو پہنچ آجاتی ہیں۔ (خواب پریشان)

۷۔ جوتشی کی تقدیرخوانی، تقدیر سے بھی زیادہ مبہم، اور ان کے الفاظ مبالغے سے بھی زیادہ وسیع المفہوم۔ (خواب پریشان)

۸۔ اس کے رخصت ہوتے ہی ہوا کے مرور جھونکے چلنے لگے۔ (ماہ خدمت)

۹۔ معلوم نہیں کہ اس نے میرے کتنے ذرّے لگائے۔ یہاں تک کہ قیمی کو مجھ پر رحم آگیا۔ وہ پھٹ کر ٹوٹ گئی لکڑی کا کلیجہ پھٹ گیا، مگر انسان کا دل نہ پگھلا۔ (خون حرمت)

۱۰۔ چٹان سے ذرا دور ایک گھنا پاکھر کا درخت تھا، جس کی جڑیں خشک پتھروں سے چمٹ کر ان سے قوت نمو یوں حاصل کرتی تھیں، جس طرح کوئی مہاجن مفلس آسامیوں کو جکڑ کر ان سے سود کے روپئے وصول کرتا ہے۔ (مرہم)

۱۱۔ جب کشتی کروٹ لیتی، تو لوگوں کے دل اچھل اچھل کر لبوں تک آجاتے۔ (غبن صفحہ ۳۶۰)

۱۲۔ سب اس عورت پر مرمٹے جاتے تھے۔ کاش اور حیف سب کے چہرہ پر کھنچا ہوا تھا۔ (بازارِ حسن صفحہ ۵۰)

۱۳۔ اس کی ہمت برف کی طرح پگھلی جاتی تھی۔ (بازارِ حسن صفحہ ۸۳)

۱۴۔ چکر بصر تصویر لے کر اپنے کمرے میں گئے، اور اس کو آنکھوں سے لگاتے لگے۔ (پردۂ مجاز صفحہ ۱۷)

۱۵۔ شباب کی امید پیال کی آگ ہے جس کے جلنے اور بجھنے میں دیر نہیں لگتی یا کسی نادار کا وقار جو شام کو بنتا اور صبح کو بگڑ جاتا ہے۔ (بازارِ حسن صفحہ ۲۱۴)

پریم چند کی زبان | ان جملوں میں نہ صرف ندرت بیان۔ صنائع الفاظ اور شاعرانہ خیالات سموئے گئے ہیں بلکہ دلگداز اثر بھی شامل ہے۔ اگر یہ اثر ان چھوٹے چھوٹے جملوں میں نہ ہوتا، تو یہ سارے کے سارے جملے بھونڈے، بے جان اور جاپانی مال کی طرح نمائشی ہو کر ٹھٹھر جاتے، اور ان کے افسانے میں وہ خوبی، بلند معیاری اور دلآویزی پیدا نہ ہوتی جو ان کا خاص وصف ہے۔

الفاظ کے ساتھ اصوات کی ہم آہنگی بھی ان کی دلکشی کا سبب ہے، اور یہ چیز ان کے زبان پر قابو رکھنے کی شاہد ہے۔ وہ غیر معمولی قلب و دماغ کے آدمی تھے۔ انھوں نے زبان کو بعض اور مشہور ادیبوں کی طرح مطیع ہو کر نہیں بلکہ قابض ہو کر استعمال کیا اور اپنی شخصیت کی خصوصیات کو نمودار کیا۔ ان کی زبان فطری اور سلیس ہے وہ جہاں اس میں درد بھرنا چاہتے ہیں بھر دیتے ہیں اور جہاں ظرافت کی ضرورت ہوتی ہے؛ ہاں ظرافت۔ لیکن ظرافت سے زیادہ ان کی درد کی تصویریں کامیاب اور معیاری ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ وہ بہت دور اندیش اور باریک بین تھے اور ان کی عمر کا وہ حصہ جو غور و فکر کا زمانہ ہوتا ہے، دیہات میں بسر ہوا۔ دیہات کی آبادی کسان اور مہاجن ہی پر مشتمل ہوتی ہے، اور کبھی کبھی ارباب اقتدار گاؤں کی چوپال میں آجاتے ہیں، تو ایک ہما ہمی پیدا ہو جاتی ہے، اور دار و گیر کا ہنگامہ بلند ہوتا ہے۔ پریم چند دیکھتے ہیں، کہ اگر دار وغہ آئیں تو کسان ہی ان کی بیگار بھتے ہیں۔ مہاجن کے تو وہ بندۂ بے دام ہیں، اور آبا و اجداد کے رسم و رواج پر سختی سے کار بند، ان کو دیکھنے کے بعد دردمند دل روئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پریم چند کا دل نہ صرف خود روتا ہے بلکہ ان کی قوت بیان اوروں کو بھی رلاتی ہے۔ حالانکہ ان کی زندگی ان کی اس خیالی زندگی سے بالکل برعکس تھی وہ زندگی کے معنے ہنس بول کر گذارنے کے لیتے تھے اور اپنی زندگی ایسی ہی بسر کرتے تھے بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی چار کے سامنے مسکراتے، ہنستے، بلکہ قہقہے لگاتے تھے۔ ایسا قہقہہ جو انھیں لوگوں کو دیوانہ سمجھنے پر مجبور کر دے۔ لیکن وہ جب قلم کے دھنی ہو کر بیٹھتے ہیں تو دل میں ٹیسیں پیدا کرتے ہیں، لیکن علامہ راشد الخیری کی طرح نہیں بلکہ رشید احمد صدیقی کے مزاح کے متضاد کہ وہ ہمارے لبوں تک تبسم کو کارفرما کرتے ہیں اور پریم چند ہمارے دل کو کپکپا دیتے ہیں۔ یا مقبول احمد پوری کے الفاظ ہیں۔

"راشد الخیری مرحوم دل کو پکڑتے ہیں تو بغیر دکھائے اور رلائے نہیں چھوڑتے۔ پریم چند کو جب کہیں ایسا موقع آجاتا ہے تو دل کی رگوں پر اس طرح انگلیاں رکھتے ہیں گویا

ستار کے تار ہیں۔"

ان تمام چیزوں پر بحث کرنے کے بعد ایک آخری چیز رہ جاتی ہے وہ یہ کہ پریم چند نے حالات حاضرہ کے ادب کو تو متاثر کیا مگر خود کسی قسم کا اثر نہیں لیا۔ ہمارا جدید ادب اب جنسیات اور عریانیت کا پلندہ بنتا جا رہا ہے، لیکن پریم چند اس سے بہت دُور رہے۔ طالب الٰہ آبادی کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ

"پریم چند کی ایک خصوصیت مجھے اور نظر آتی ہے کہ ان کے کسی ناول میں رموز جنسی کے فلسفہ کی چھاؤں ہے اور نہ لبیں عریانی۔ درحقیقت فحش اور سُوقیانہ انداز تحریر سے اُن کا دامن قلم کبھی آلودہ نہیں ہوا ہے"

یہ خصوصیت صرف ناولوں کے لیے ہی باعث امتیاز نہیں، بلکہ افسانے بھی اسی صف میں آجاتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند عصر حاضر کے نفسیاتی سیلاب میں نہیں بہہ گئے بلکہ نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ اس منجدھار میں کھڑے ہوکر دوسروں کو بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ اس لحاظ سے ان کا سرمایہ ادب، اردو کے افسانوی ادب کی جان ہے۔

شاہد لطیف نے اپنے مضمون (ترقی پسند افسانوی ادب) میں لکھا ہے کہ

"اس نئے ادب سے بھوک اور نفسانیت کو نکال لیا جائے تو بہت کم باقی بچے گا۔"

پریم چند کے افسانوں میں بھوک کی کمی نہیں لیکن ان کے کرداروں کا معیار اخلاق اتنا بلند ہے کہ وہ اپنی بھوک کو ظاہر نہیں ہونے دیتے، اور اس طرح شاہد صاحب کے کلیہ سے مستثنیٰ قرار پاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ صاحب مضمون نے پریم چند کو ترقی پسند ادیبوں میں شمار ہی نہ کیا ہو لیکن وہ ان کی کانفرنس کی صدارت کر چکے تھے اور انھیں خیالات کے حامی تھے، جو ترقی پسند ادیبوں میں پائی جاتی ہیں۔ البتہ آنکھیں اور زبان وہ نہ تھی جو آجکل کے بھوکے ادیبوں کے کیچڑ اچھالنے والے ادیبوں کی ہے۔

---

۲۶۱ پریم چند نمبر ۲۲۰، ۱۵۳۔ ۳۔ اردو اکتوبر ۱۹۳۶۔

چھٹا باب افسانہ نگاری کے علاوہ پریم چند کی دیگر خدمات

پریم چند کی ناول نگاری پریم چند نے جس طرح افسانوی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کر لیا وہ ناول نگاری میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہندوستانی تہذیب و تمدن اور معاشرت کے بیان کرنے میں موجودہ دور کے ناول نگاروں میں کسی نے زیادہ حصہ لیا ہے تو وہ پریم چند ہیں۔ ان کی ادبی زندگی ناول نگاری سے شروع ہوئی اور ناول نگاری ہی پر ختم ہوئی "ہم خرما و ہم ثواب" سے پہلے ان کا کوئی ناول اردو میں منظر عام پر نہیں آیا اور ہندی میں بھی اسی کے ترجمے (کشنا) سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس سے دو تین سال پہلے انھوں نے چند کہانیاں لکھیں اور وہ تعداد میں اتنی نہیں ہوئیں کہ ان کا کوئی مجموعہ شایع کیا جا سکتا۔ اس طرح ان کی ابتدا ہوئی۔ ان کی انتہا بھی اس طرح ہے کہ ان کا قلم (گئودان) لکھ کر ہمیشہ کے لیے رک گیا۔ (ہم خرما و ہم ثواب) سے لیکر (گئودان) تک اردو میں بارہ اور ہندی میں گیارہ ناول لکھے جن میں اکثر ایک دوسرے کے ترجمے ہیں یوں تو ہر ناول بجائے خود مکمل ہے لیکن (بازارِ حسن) اور (چوگان ہستی) لاجواب ہیں (چوگان ہستی) کو اردو دنیا شاہکار مانتی ہے اور پریم چند بازار حسن کو اپنا شاہکار سمجھتے ہیں۔ ہم یہاں ہر ناول کے متعلق سرسری طور پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

ہم خرما و ہم ثواب ۱۹۰۴ء اس کے متعلق ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ یہ ان کا سب سے پہلا ناول ہے اور اس کو انھوں نے بلحاظ مکالمہ و منظر نگاری شرر کے رنگ میں اور بلحاظ زبان سرشار کے انداز میں لکھا ہے۔ یہ ان کی پہلی کوشش ہے۔ اس لیے ہر لحاظ سے اس میں خامیاں ہیں۔ کہیں وہ ایک بڑے ادیب کی تقلید کرتے ہیں، کہیں دوسرے کی۔ کسی ایک کی طرز پر نہیں لکھے

ہیں لیے اس ناول میں ان کی انفرادیت پیدا ہونے نہ پائی۔ اس ناول کی غائت اس دور کے عام ناولوں سے ہٹکر عشق و محبت کی اشاعت سے زیادہ قومی خدمت ہے۔ بیواؤں کی تکلیفات کا خاکہ کھینچا ہے اور دولتمندوں اور خوشامد پسندوں کی فطرتوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک چیز جو خاص طور پر ان کے افسانوں اور ناولوں میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ پریم چند اپنے قاری کو نتیجے کے انتظار میں نہیں رکھتے۔ ناول کا پہلا باب۔ افسانہ کا پہلا فقرہ یا اس کے پہلے جملے یا کتاب یا افسانے کے نام ہی سے وہ نتیجہ کا اظہار کر دیتے ہیں۔ لیکن پڑھنا خود طلب ہوتا ہے۔ (ہم خرما و ہم ثواب) کا مطالعہ بتادے گا کہ قومی خدمت اور عشق و محبت دونوں ساتھ ساتھ کارفرما ہیں۔ دونوں اپنے راستوں سے بھٹکتے نہیں بلکہ اپنی منزل کی طرف برابر گامزن ہیں اور کامیابی کے ساتھ جا پہنچتے ہیں۔ اب یہ (ہم خرما و ہم ثواب) سے زیادہ اچھا کیا نام تجویز کرتے۔

جلوۂ ایثار یہ سنہ ۱۹۱۲ء میں شایع ہوا۔ یہ دوسرا ناول ہے اور ابھی وہ مشاق ناول نگار نہیں ہوئے لیکن پہلے ہی باب میں ان کا زور قلم ہمیں متحیر کر دیتا ہے، اور ہم اس کے مطالعے کے بعد اپنے آپ کو ایک مقدس اور پُر عظمت مقام پر محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس میں مکالمہ کی شان بہت بڑھی ہوئی ہے۔ سبا ما اور دیوی کی گفتگو کا ایک ایک لفظ ہم اسی انداز میں پڑھتے ہیں گویا مخاطبت ہمارے سامنے ہو رہی ہے۔ پھر پریم چند کی عظمت ہماری نگاہوں میں زیادہ ہو جاتی ہے جبکہ وہ سبا ما کی زبان میں دیوی سے سپوت بیٹا طلب کرتے ہیں اور سپوت کی تعریف یہ ہے " جو اپنے دیس کا اُپکار کرے "۔

نئی نئی تشبیہیں اور نئے نئے استعارے استعمال کیے ہیں۔ پامال اور فرسودہ ترکیبیں اور تشبیہیں بہت کم ہیں۔ ہر جگہ ان کی طبیعت کی جولانیاں زور دکھاتی ہیں۔ بعض جگہ جنسی لطافتوں کو انہوں نے قایم نہیں رکھا اس لیے واقعاتی نقطۂ نظر سے ناول غیر فطری ہو گیا ہے، لیکن سرسری طور پر پڑھنے والے کی نظر اس پر نہیں پڑتی۔ وہ تو ایسا اونٹ ہوتا ہے جس کی مہار

مصنف کے ہاتھ میں ہو۔ اس ناول میں اور اس کے علاوہ دو ایک اور ناولوں میں بھی پریم چند نے بعض ایسے واقعات لکھ دیے ہیں، جنھیں ہم مافوق الفطرت کہتے ہیں یا جن کا تعلق صرف عقاید سے ہے۔ ایسے واقعات اس میں شک نہیں کہ ہیرو کے اوصاف میں اضافہ کرتے ہیں اور اس کے کردار کو بلند کر دیتے ہیں لیکن ان کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ ناول کے اختتام تک تو ان کی زبان کی شیرینی اور حلاوت ہمیں لاپروا نہیں ہونے دیتی، لیکن اس کے بعد ان واقعات پر تنقیدی نظر پڑنے لگتی ہے۔

فنی نقطۂ نظر سے یہی نہیں بلکہ اکثر ناولوں میں پلاٹ غائب نظر آئیں گے۔ تدریجی ارتقاء بھی بعض ناولوں میں بسرعت ممکن ہو گیا ہے اور بعض جگہ بہت دیر میں، اس طرح ہماری ذہنی کشمکش تشنہ رہتی ہے اور ہم پوری طور پر لطف اندوز نہیں ہونے پاتے۔ (ہم خرما و ہم ثواب) کے مقابلے میں اس کی زبان غنیمت ہے لیکن پھر بھی دیگر ناولوں کے جیسی نہیں، اور ہندی یا سنسکرت کے الفاظ تو (ہم خرما و ہم ثواب) سے زیادہ ہیں۔ شاید یہ بالالتزام کے کارن ہوں۔ اس وجہ سے بھی بعض جگہ زبان ثقیل ہو گئی ہے۔

نرملا ایک المیہ ناول ہے، جس میں ایک خاندان کی مصیبتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک ہی خاندان پر ان مسلسل مصائب کے پہاڑوں کا ٹوٹنا قیاس میں تو نہیں آتا، لیکن پریم چند کی زبان ہے ایسی کہ الفاظ دل میں اور واقعات آنکھوں میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ سارے ناول کے مطالعے کے بعد بھی ان کے کرداروں سے ہمدردی نہیں پیدا ہوتی بلکہ وہ کھٹکتی پھرتی ہے۔ زبان میں دوسرے ناولوں کی طرح شوخی اور شیرینیِ الفاظ کا ترنم اور گھلاوٹ نہیں اور ڈرامائی انداز تحریر میں بعض جگہ پھیکا پن پیدا ہو گیا ہے۔ اس کا سبب اس کی طوالت ہے۔ پریم چند جزئیات کی تفصیل میں جانے کے لیے قاری کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں اور اس طرح عبارت میں روانی باقی نہیں رہتی۔

پردہ اس ناول کے متعلق ہم وضاحت کے سلسلے میں ذکر کر چکے ہیں۔ ہمارے ہندستانی گھروں

ایسے گھروں کی بہتات ہے، جہاں بیوائیں موجود ہیں۔ وہاں کے معمولی سے معمولی واقعات پر بھی پریم چند کی دوررس نظریں جا پڑتی ہیں۔ ان کا طرز بیان انہیں واقعات کو ایسا دلپذیر اور دلاویز بنا دیتا ہے، کہ فنی نقائص نکتہ چین کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔ گھر والوں کی آپس کی کشیدگیاں، رسم و رواج کی پیچیدگیاں اور زندگی کے چند مسرت بخش لمحے سب ہی اس میں موجود ہیں۔ امرت رائے اور پورنا کا کردار جس خوبی سے بیان کیا گیا ہے، اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ بِدھوا آشرم کے انتظام کا خاکہ جس ماہرانہ انداز میں ڈالا گیا ہے، وہ قوم کے لیے مشعل راہ ہے۔ پریم چند کی زبان بھی اس ناول میں بہت سلیس ہو گئی ہے۔ اور فارسی کے الفاظ کی جگہ ہندی کے سہل اور گھل مل جانے والے الفاظ نے لی ہے۔

بازارِ حسن | یہ وہ ناول ہے جس کو پریم چند اپنا شاہکار سمجھتے تھے اور اگر چوگان ہستی ان کی تصانیف میں نہ ہوتی تو واقعی یہی شاہکار سمجھا جاتا۔ زبان اور دلچسپیوں کے لحاظ سے اس ناول کا معیار بہت بلند ہے۔ اور ناول کا موضوع، پریم چند کا وہی مطمح نظر، قوم کو سدھارنا اور نیکیوں کی طرف راغب کرنا ہے۔ وہ اس ناول میں اپنے کرداروں کو گناہوں کے سمندر میں ڈھکیل دیتے اور پھر کافی غوطے کھلانے کے بعد ان کی پاپ کی نیا کو نیکی کے دھارے پر لا ڈالتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصود دعوتِ عمل ہے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، کہ انسان لغزشوں کے بعد ہی سنبھلتا ہے، اور ٹھوکریں کھا کر ہی سیدھا راستہ چلتا ہے۔ ایک اور چیز یہ بھی نظر آتی ہے کہ وہ حسن کو صرف لٹانے کی دولت نہیں سمجھتے، بلکہ اس سے بڑے بڑے کام لیتے ہیں ان کے "زادِ راہ" کے ایک افسانے "وفا کی دیوی" میں ان کا یہ مقصد ابلا پڑتا ہے۔ ان کا ایقان ہے کہ انسان کے حسن میں ذوقِ عمل کو اکسانے اور بیدار کرنے کی طاقت ہے۔ وہ جہاں چشم و ابرو کے اشاروں سے قتالِ عالم بن سکتا ہے، وہیں انسان سے ایسے مافوق الفطرت کام بھی کروا لیتا ہے، جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آتے۔ ان کے کرداروں میں خدمتِ خلق کا عزم اتنا استوار ہوتا ہے کہ کسی کردار سے آخر تک لغزش ہونے نہیں پاتی۔

اور اس طرح وہ سماجی حالات کے درست کرنے کے لیے خاکہ بھی پیش کردیتے ہیں۔

چوگان ہستی اہم اس کتاب کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرنے کی بجائے صرف دو آراء پر اکتفا کرتے ہیں، اس لیے کہ چوگان ہستی ہی وہ کتاب ہے جس کو بیسویں صدی کے ربع اول کا بہترین ناول تسلیم کیا گیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی فرماتے ہیں۔

"سب سے بڑھ چڑھ کر ان کی ضخیم کتاب دو جلدوں میں ایک ہزار صفحہ کا ناول چوگان ہستی ہے، کہیں سے بھی کھول لیجئے یکساں دلچسپ۔ شروع کر دینا شرط ہے، ختم کیے بغیر جی اٹھنے کا نہیں۔ آورد اور تصنع کہنا چاہئے کہ ان کا قلم جانتا ہی نہیں۔ جو صفحہ بھی الٹ کر دیکھئے سادگی، بے ساختگی اور آمد کے لحاظ سے خط گلزار جس حصہ کا بھی انتخاب کیجئے دلکشی دلاویزی اور جاذبیت کے اعتبار سے نمونہ بہار ہے"[1]

طالب الہ آبادی اسی کے متعلق رقمطراز ہیں۔

"اگر پریم چند نے ساری عمر میں صرف یہی ایک ناول لکھا ہوتا تو بھی ان کو دنیا کے کامیاب افسانہ نویسوں کی صف میں عزت کی جگہ مل جاتی . . . . . . چینی، جاپانی، مرہٹی، جرمنی اور ہندی سبھی زبانوں میں اس کے ترجمے یکساں مقبول ہیں۔ "لانف از اے اسٹیج" اور "ورلڈ از لائے تھیٹر" ایسے کامیاب ناول بھی اس کے ساتھ تولے جائیں تو شاید ہلکے ٹھیریں۔

اردو ناول کا یہ پہلا قدم ہے، جہاں فطرت اور اخلاق نے رسمی شان و شکوہ کو ٹھکرا دیا ہے، اور جہاں "درد" اور "خدمت" کو اس کی اصلی جگہ ملی ہے۔

اس ناول میں نفسیاتی خوبیاں بھی ہیں اور زور بیان کا لطف بھی ہے۔ اس کی ہر چیز اپنے سے بھری ہوئی ہے۔ طوالت ضرور ہے لیکن ایسی نہیں کہ ناظرین کا نہیں سے دل گھبرا جائے۔ لفظ

---

[1] - یادگار پریم چند صفحہ ۲۲۴ ۱۹۵۰ء -

یہی ہیں، جو ہم آپ ہر وقت بولتے ہیں پر جوہری کے ہاتھوں میں ان کا رنگ کچھ اور ہی ہے
. . . . وہ ایسے نگینے بن گئے ہیں، جن کے ہر زاویے سے نور کی جوت نکلتی ہے۔[۳]

پردۂ مجاز | ساری کتاب عجیب و غریب واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ہر جگہ حیرت ہوتی ہے کہ پریم چند فطرت نگار ہو کر مافوق الفطرت چیزیں کیسے لکھ گئے۔ مثال کے طور پر جگدیش پور کے راجہ کے تین جنم اور ہر جنم کی پوری یادداشت۔ تاریک گھاٹی میں محل کا وجود جہاں چار ہزار سال پہلے کے آلات بھی موجود ہیں۔ ہوائی جہاز بھی ہے "جو بادوباراں میں مستقل انداز سے اڑا جاتا ہے۔ گویا فطرت کی طاقتوں پر فتح کا نقارہ بجا رہا ہو"۔ بیوی کا دومرتبہ اعادہ شباب اور رانی دیو پریا کا کیرکٹر حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی ہیں۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز چیز جو ہمیں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ چکردھر یا تو دھنا سنگھ کے الفاظ میں "دیا اور دھرم کا پتلا بنا ہوا تھا اور دروگہ کو بچانے کے لیے اپنی چھاتی پر سنگین روک لی تھی" یا پھر اپنے راج میں آکر دیہاتی کے ساتھ برا سلوک کیا۔ یہ واقعہ کچھ اس طرح اچانک پیش آتا ہے کہ ناول کا پڑھنے والا اس کے سننے کے لیے تیار نہیں رہتا۔ پریم چند ایک طرح سے یقیناً کامیاب ہیں کہ ان کا قاری ہمیشہ مستقبل کا منتظر رہتا ہے، اور پڑھتا چلا جاتا ہے، لیکن پردہ مجاز کو ختم کرنے کے بعد یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ چند چیزیں ایسی بھی باقی رہ گئی ہیں جو محتاج اظہار رہیں اور انہیں کھلنے کا موقع نہیں ملا۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول مسئلہ تناسخ کی تشریح اور ویدانت فلسفہ کی توضیح کے لیے لکھا گیا ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان کو مکتی حاصل کرنے کے لیے بے لوث محبت اور بے غرض خدمت کی ضرورت ہے ایسی محبت اور خدمت جس میں نفسانی اور شہوانی جذبات کا قطعاً وجود نہ ہو۔

کتاب دو حصوں پر منقسم ہے۔ پہلی اگرچہ تمہید ہے لیکن دلچسپ، مربوط اور نہایت

۳۔ ملاحظہ ہو سابقہ فٹ نوٹ

سلیس و صاف ہے۔ لیکن دوسری جلد غائت تصنیف کا اظہار، مسائل کی وضاحت، مسئلہ تناسخ کی پیچیدگیوں اور محیر العقول کارناموں سے معمور ہے۔ لیکن دلچسپی کا اس لیے فقدان نہیں کہ پریم چند ہمیں اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔

غبن | موضوع کے سلسلہ میں ہم کہہ آئے ہیں کہ ہندوستانی عورت کا زیور کا شوق اور اس کی تکمیل کے لیے شوہروں کو دست غیب کی امداد اور پھر قرضہ کا بار یہ ساری چیزیں بنیاد افسانہ ہیں لیکن بات بڑھتی گئی اور افسانہ طول کھینچتا گیا جیسا کہ ندی پہاڑوں سے نکلتے وقت تو چھوٹی سی تھی لیکن سمندر سے ملنے تک اس میں ہزاروں ہی نالے اور ندیاں آکر مل گئیں۔ واقعات ایک حد تک فطری ہیں، مگر بعض جگہ کھٹکتے بھی ہیں۔ امیر اور غریب، مقیم اور مسافر کسبی اور شریف زادی، پولس اور مظلوم، سبھی کی کیفیتیں اس میں موجود ہیں۔ پولس کے ہتھکنڈوں کا بیان نہایت تفصیلی ہے۔ تبدیل مکانی کی وجہ سے ناول میں دلچسپی تو پیدا ہوگئی لیکن فنی نقطہ نظر سے نقص پیدا ہوگیا۔ جالپا کی شوہر پرستی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ اور ہندوستانی عورت سے ایسے واقعات کا سرزد ہو جانا تعجب خیز بھی نہیں۔ خود زہرہ اس کے کردار کا صحیح نقشہ ان الفاظ میں کھینچتی ہے "وہ اوپر سے موم ہے اور اندر سے پتھر۔ جو اتنی نازک ہوکر بھی اتنی مضبوط ہے۔"[1] آخر میں ایک چیز "بازارِ حسن" کی طرح یہاں بھی ملتی ہے پریم چند حسن سے ذوق عمل کو بیدار کرتے ہیں اور رما اپنا بیان دیتے ہوئے اجلاس پر کہتا ہے" جالپا کی بےنفسی، حق پسندی اور استقلال نے میری آنکھیں کھولیں اور اس سے بھی زیادہ زہرہ کی دلجوئی اور خلوص نے۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس طرف سے روشنی ملی جدھر اوروں کو تاریکی ملتی ہے۔"

گوشۂ عافیت | زبان۔ مکالمہ۔ سیرت نگاری اور واقعاتی لحاظ سے یہ ایک مکمل ناول ہے سماج کی پابندیاں۔ رسم و رواج کے قوانین۔ ہندوستانی مادیت اور روحانیت مغربیت اور مشرقیت ان تمام چیزوں کو خوبی کے ساتھ سمویا ہے اور ان سے جو نقصانات قوم کو

---

[1] غبن صفحہ ۳۱۲۔

اٹھانے پڑ رہے ہیں، انھیں بھی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ نفسیاتی باریکیاں بھی نہایت فن کارانہ ہیں اس کے دوسرے حصہ کا معیار اتنا بلند نہیں جتنا کہ پہلے کا، بلکہ دوسرا اتنا ہی پست نظر آتا ہے۔ بعض واقعات بھی حقیقت سے بُعد رکھتے ہیں۔

میدان عمل اور ناولوں کی طرح اس میں بھی سماج کے نقائص کو منظر عام پر لایا گیا ہے، اور انکے دور کرنے کے علاج بتلائے گئے ہیں۔ جس طرح ابتدائی ذ: یعنے "ہم خرما وہم ثواب" اور "بیوہ" وغیرہ میں عقد بیوگان اور ودھوا آشرم کے قیام پر زور دیا گیا ہے اس میں اچھوت تحریک، دیہات سدھار، تخفیف لگان، تنظیم مزدور پارٹی وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس طرح ایک لحاظ سے یہ ناول ہمارے گذشتہ دس پندرہ سال کے سیاسی رجحانات کی تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے فن کار قلم سے کردار نگاری کا بھی کمال دکھاتے ہیں اور نفسیاتی باریکیاں بھی ہر جگہ جھلکی پڑتی ہیں۔ ہمارے رہنمایانِ قوم اپنے آپ کو کس طرح خدائے ملت سمجھتے ہیں، اور مہاجن کس طرح غریبوں کا خون چوستے ہیں، ان کی تصویریں نہایت ماہرانہ انداز میں کھینچی گئی ہیں۔ پلاٹ کی ترتیب اور خوبی۔ قصہ کا ارتباط اور تسلسل اس کا تدریجی ارتقا، سیرت نگاری اور وہ تمام نزاکتیں اور لطافتیں جو لزوم افسانہ ہیں اس میں موجود ہیں۔ زبان سب ناولوں سے زیادہ اچھی اور دلکش ہے۔ چونکہ یہ انسانی کارنامہ ہے اس لیے واقعاتی نکتہ نظر سے اس میں معمولی نقائص ہیں جو درخور اعتنا نہیں۔

گئودان نام کچھ عجیب سا ہے۔ اردو خوان طبقہ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کتاب میں کیا ہوگا اصل کتاب ہندی میں ہے اور اس کا بھی یہی نام ہے لیکن جس طرح پریم چندنے پریم آشرم اور کرم بھومی وغیرہ کے نام بدلے، اگر اس کا بھی موزوں نام دیا جاتا تو مناسب ہوتا۔

یہ ناول دیہاتی مناظر اور غریبانہ زندگی کا مرقع ہے۔ ہندوستان کی حقیقی تصویر ہماری نظروں کے سامنے آتی ہے۔ غریب کسان کی زندگی، اس کا چھوٹا سا جھونپڑا، اس کے جانور، اس کے کھیت اور اس کے فاقہ کش جسم میں سے اس کی ہڈیاں ابھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

ہمارے سماج میں عورت کی کیا حقیقت ہے، اور اس کو مشرقی عورت کا کس طرح نمونہ بننا چاہئے اس کی بھی مثالیں دی گئی ہیں۔ اس کے مطالعہ کے بعد ہم پریم چند کے پیشے کے متعلق سوچتے ہیں کہ اگر وہ وکیل ہوتے تو کتنے کامیاب ہوتے۔ اس لیے نہیں کہ انھیں ساہوکارانہ گُر یاد ہیں، بلکہ اس لیے کہ انھیں کسی چیز کے اثبات کے لیے دلائل اور براہین کی کمی نہیں ہوتی۔ ان کی قوت استدلال کے جوہر جا بجا ابلے پڑتے ہیں۔ وہ نہایت آسانی سے بحث کرتے اور اپنی رائے کے استحکام کے لیے ثبوت پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ افسانہ در افسانہ کے لیے پریم چند نے اس میں غریبوں کی زندگی کے ساتھ امیروں کی زندگی کو بھی مدغم کر دیا ہے۔ یہ ان کی عادت سی ہے، کہ وہ اپنے افسانوں میں دونوں قسم کے کرداروں کو ساتھ ساتھ لے چلتے ہیں۔ نقائص اس میں بھی ہیں۔ ان کے کردار قصہ ہمیشہ اپنا رنگ بدلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کتاب چونکہ خاصی طویل ہے اس لیے اکثر جگہ رکاوٹیں ہیں اور بندش میں چستی باقی نہیں رہی۔

اب تک ہم نے پریم چند کی ان خدمات کا ذکر کیا ہے جو صرف ادب سے تعلق رکھتے تھے اور چونکہ ان کے ادب کا تعلق پوری طور پر ہماری زندگی ہمارے سماج اور ہمارے ملک سے ہے اس لیے وہ ادبی لیڈر کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان کے ادبی کارنامے اپنے دور کے تمدن کی تاریخ ہیں، جو مستقبل پر بھی کہیں کہیں روشنی ڈالتے ہیں۔ پریم چند ادیب کی حیثیت سے اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوئے، اس کے علاوہ انھوں نے دیگر خدمات بھی انجام دی ہیں۔

پریم چند سوداگر۔ ابتدائی دور میں رسالہ (زمانہ) میں "رفتار زمانہ" لکھ کر پریم چند نے ہمارے سیاسی شعور کو بیدار کیا اس سے ان کی سیاسی معلومات اور مدبرانہ قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ کانگریس کی سرگرمیوں سے بھی متاثر ہوئے۔ ملازمت سے استعفا اسی اثر کا نتیجہ ہے۔ ملازمت سے استعفاء کے بعد انھوں نے ایک نئی زندگی شروع کی۔ انھیں اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ بھرنا تھا۔ اس لیے تجارت شروع کی لیکن ادیب صرف ادیب ہوتا ہے کاغذ اور قلم کا دھنی، اس کو ان تجارتی بکھیڑوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ تاجر کی حیثیت بھی

بادشاہ کی سی ہوتی ہے اور شعرا ادیب کی بھی۔ یہ فقیر ہوتے ہیں لیکن دماغوں میں بادشاہت بسی ہوئی ہوتی ہے اور کیوں نہ ہو وہ ہمارے دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں اور ہمارے خیالات کی رَو ان کے قبضۂ اقتدار میں ہوتی ہے۔ اس طرح ایک انسانی دماغ میں دو بادشاہ، ادیب اور تاجر نہیں سما سکتے۔ پریم چند کو بھی تجارت میں ناکامی ہوئی اور وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔

مدیر پریم چند تجارت کے بکھیڑوں سے نجات حاصل کرکے انھوں نے ایڈیٹری شروع کی۔ مریادا، مادھوری، ہنس اور جاگرن سب ان کی ادارت میں نکلتے رہے اس میں تاجرانہ ذہنیت کو روبہ عمل لانا تھا اس لیے انتظامی قابلیت کے لحاظ سے تو وہ ناکام رہے لیکن ادیبانہ حیثیت سے ان رسالوں کا معیار بہت بلند کر دیا۔ اس سلسلے میں بھی انھیں سخت تلخ تجربات اٹھانے پڑے انھوں نے اپنے افسانوں، ناولوں، خطوط اور مضامین میں جگہ جگہ ایڈیٹر اور ان کے فرائض وغیرہ کے متعلق لکھا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ

"رسالے کے ایڈیٹر کو ذاتی رجحانات اور دوستانہ تعلقات سے بالاتر رہنا چاہیے۔"

اور اس قانون کے وہ پابند ہے۔ وہ ایڈیٹر کو قوم کا خادم اور بہی خواہ دیکھنا چاہتے تھے اور اخبار کو ملک و ملت کا ترجمان۔ گویا ایڈیٹر اخبار ایک لیڈر ہے جو در پردہ قوم کے دلوں میں گھر کرتا جاتا ہے اور قوم اس سے غائبانہ محبت کرنے لگتی ہے۔ لیکن یہ بات اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ ایڈیٹر کا معیار بلند اور مقصد پاک اور بے لوث ہو۔ یہ پریم چند کے خیالات ہیں اور انھوں نے ان پر چلنے کی بہت کوشش کی سب پرچوں سے انھوں نے بجائے فائدہ کے نقصان اٹھایا، مقروض ہو گئے، اور فلم کمپنی کی ملازمت کو جو طوق گلو سے کم نہ تھی اس نقصان کی پابجائی کے لیے قبول کیا۔

پریم چند فلمی دنیا میں ان کا فلم کمپنی میں کام کرنا فلمی دنیا کے لیے تو فال نیک تھا لیکن خود ان کیلئے وبالِ جان ثابت ہوا۔ مالک فلم کمپنی اور اداکاروں کی نکتہ چینیوں نے ان کی تصویروں کے خد و خال کو مسخ کر دیا۔ چنانچہ دو فلم بھی نہ بننے پائے تھے کہ پریم چند اس زندانی زندگی سے تنگ آ کر بنارس چلے گئے۔ اگر وہ کچھ دن اور ٹھیر جاتے تو شاید ان کے ڈراموں میں اضافہ ہو جاتا۔

پریم چند ڈرامہ نگار کی حیثیت سے: ڈرامہ نگار کی حیثیت سے پریم چند کا ادب میں کوئی مقام نہیں۔ بلکہ بہت کم لوگ واقف ہیں کہ انھوں نے دو تین ڈرامے بھی لکھے اجنتا سانیٹوں کو وسیے ہوئے ڈراموں کے علاوہ ان کا ایک ڈرامہ جو کتابی صورت میں شایع ہوچکا ہے "کربلا" ہے اس ڈرامہ کی شان نزول خود پریم چند کی زبانی سنیے۔

"میں نے حضرت حسینؓ کا حال پڑھا۔ ان سے عقیدت ہوئی ان کے ذوق شہادت نے مفتون کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ڈرامہ تھا۔۔۔۔۔ ڈرامے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قرات کے لیے، ایک اسٹیج کے لیے۔ یہ ڈرامہ محض پڑھنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ کھیلنے کے لیے نہیں"[1]

زبان کے متعلق بھی پریم چند ہی کی تنقید سنئے۔

"میں نے کبھی ادیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ مجھے لوگ زبردستی انشاپرداز اور سحر نگار اور الم غلم لکھ دیا کرتے ہیں میں بات کو سیدھی زبان میں کہہ دیتا ہوں۔ رنگ آمیزی اور انشاپردازی سے میں قاصر ہوں"[2]

یہ ایک خط کے اقتباسات ہیں جو پریم چند نے مدیر زمانہ کے نام ان کے چند سوالات کے جواب میں لکھا تھا۔ اس کے علاوہ "شب تار" بھی ہے۔ افسانہ کی کتابوں میں بھی ایک دو مختصر ڈرامے ہیں لیکن چنداں قابل ذکر نہیں۔

معلم پریم چند: پریم چند کی زندگی تعلیمات کے محکمے سے شروع ہوئی۔ وہ بچوں کو تعلیم دینے لگے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے بچوں سے بڑوں کو اور مدرسہ کی ایک محدود جماعت سے نکل کر ہندوستانی قوم کو تعلیم دی۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے افسانوں اور ناولوں نے اپنے مقصد میں کہاں تک کامیابی حاصل کی۔ یہ ضرور ہے کہ اکثر قدیم رسم و رواج ٹوٹ رہے ہیں۔ قید و بند کی

---

[1] ۔ یادگار پریم چند صفحہ ۱۰۰۔

بیڑیاں کٹ رہی ہیں۔ لیکن معلوم نہیں کہ یہ انھیں ناولوں اور افسانوں کا اثر ہے یا انگریزی تعلیم، فیشن اور رواج کا یا ان دونوں کا۔ البتہ ہم یہ ضرور کہیں گے کہ پریم چند نے اپنے موضوع سے ہندوستانی معاشرہ کے جمود کو توڑا، اور اپنی تقلید کرنے والے لوگ پیدا کیے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے افسانوں نے بھی ہمارے سماج اور معاشرہ کے بندھنوں کو توڑنے میں ضرور ہاتھ بٹایا ہے۔ اور انسانی آزادی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح ہم پریم چند کی خدمات کو سامنے رکھتے ہوئے انھیں متعلم، معلم، ناول نگار، افسانہ نگار اور فن کار مصلح قوم سمجھنے میں تامل نہیں کرتے۔

ساتواں باب ۔ پریم چند کا اثر اردو افسانہ نگاروں پر

پریم چند کا موضوع ہندستانی عوام تھے ۔ انیسویں صدی کے ختم تک ہمیں ایسا کوئی افسانہ نگار نظر نہیں آتا جس نے براہ راست ہماری زندگی، ہمارے تمدن اور ہمارے معاشرے کے تار و پود کو اپنے افسانوں میں بکھیر کر رکھدیا ہو ۔ افسانہ کا تو وجود و عدم ہی مساوی تھا البتہ چند ایسے ناول نگار ضرور تھے جو ایک مخصوص طبقہ کی ترجمانی کر رہے تھے لیکن اُن کی یہ ترجمانی بھی عوام سے کوئی تعلق نہ رکھتی تھی۔ پریم چند ہی اس میدان میں پہلے شخص نظر آتے ہیں جنھوں نے ہندوستانی عوام کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ۔

یہ دور انگریزی تعلیم کا تھا ۔ لوگ انگریزی ادب پر عبور حاصل کرنے کے بعد اس کوشش میں تھے کہ انھیں چیزوں کو یا تو اپنی زبان میں منتقل کیا جائے یا ایسا ہی ادب پیدا کیا جائے۔ گورکی، ترجینف، گوگول چیخوف اور دستوفسکی ... ان کے پڑھنے والے تو تھے لیکن ایسا ادب پیدا کرنے کی کسی نے کوشش نہیں کی ۔ البتہ کبھی کبھی ان کے ترجمے رسالوں میں نظر آتے تھے ۔ پریم چند ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ادب برائے زندگی کی تحریک اپنے افسانوں میں بڑی شدت کے ساتھ ظاہر کی ۔ وہ ادب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں

"ادب کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے ۔ ادب چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو یا افسانہ کی یا شعر کی اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے"[1]

وہ کہتے ہیں کہ ۔

"ہمارا مذاق بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے ۔ ادب محض دل بہلاؤ کی چیز نہیں ہے ۔ دل بہلاؤ کے سوا اس کا کچھ اور بھی مقصد ہے ۔ وہ اب محض عشق و عاشقی کے راگ نہیں الاپتا

---

[1] ۔ نیا ادب کیا ہے ؟

"بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے ان کا محاکمہ کرتا ہے ان کو حل کرتا ہے - یہ ادب تحریک یا ابہام کے لیے حیرت انگیز واقعات تلاش نہیں کرتا یا قافیہ کے الفاظ کی طرف نہیں جاتا بلکہ اس کو ان مسائل سے دلچسپی ہے جن سے سوسائٹی یا سوسائٹی کے افراد متاثر نظر آتے ہیں"[1]

اب اس نظریہ کی روشنی میں اگر ہم پریم چند کے کارناموں پر تنقید کریں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے ادب کی جیسی تعریف کی، اس کے مطابق وہ لکھتے رہے اور سوسائٹی اور سماج کے وہ بدنما داغ جو کلنک کا ٹیکہ بنے ہوئے ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اپنے افسانوں کا پس منظر دیہات سے لیا اور کسان اور ان سے بالراست یا بالواسطہ تعلق رکھنے والے ان کے افسانے کا موضوع بن گئے۔

چونکہ نئی چیز کو دیکھنا اور اس کو حاصل کرنا یا اس کی نقل اتارنا انسانی جبلت ہے اس لیے بعض جدید افسانہ نگاروں نے اپنے آپ کو تخیلی حیثیت سے پریم چند کا شاگرد سمجھا۔ وہ ان کے ادب سے متاثر ہوئے اور ہر شخص نے بقدر ظرف پریم چند سے اکتساب فیض کیا کسی نے ان کے افسانے کے موضوع کا انتخاب کیا۔ کسی نے ان کے تمثیلی انداز کا۔ کسی نے اسلوب بیان کو اڑانے کی کوشش کی، اور اکثر افسانہ نگاروں نے ان کی تقلید میں روس، فرانس، ترکی، امریکہ، اور انگلستان کو چھوڑ کر ہندوستان کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اور اپنے افسانوں میں مقامی رنگ کو خاص جگہ دی۔

پریم چند کے مقلدین | سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی، ایم اسلم، عظیم بیگ چغتائی، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، اور احمد ندیم قاسمی، پریم چند سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اس طرح اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ موجودہ دور کے مشہور افسانہ نگاروں میں نصف سے

---

[1] نیا ادب کیا ہے؟

زیادہ کا تعلق پریم چند سے ہے۔ ان میں بعض افسانہ نگاروں نے پریم چند کے قومی جذبہ کی تقلید کی اور اکثروں نے دیہات کو موضوع سخن بنایا۔

عظیم بیگ چغتائی | سدرشن اور عظیم بیگ مرحوم نے قومی جذبہ کو اکسایا۔ سدرشن نے تاریخی قصوں کو نیم تاریخی افسانوں کی حیثیت دی اور عظیم بیگ نے راجپوتوں کے عادات و اطوار۔ طریق بود و ماند اور ان کی آن بان اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں بیان کرکے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ اس سلسلے میں ان کا افسانہ" سوانگ کی ردیں" اور ناول "چکی" قابل مطالعہ ہیں۔

سدرشن | سدرشن کی زبان پریم چند کی طرح بہت سلیس ہے وہ تشبیہیں اور استعارے بھی لطیف اور مقامی استعمال کرتے ہیں وہ اپنے قصہ کا مواد صرف دیہات سے نہیں لیتے بلکہ کبھی کبھی شہر کے گلی کوچوں یا کارخانوں میں آجاتے ہیں۔ پریم چند کے کرداروں کی طرح سدرشن کے کردار بھی واقعیت سے قریب ہوتے ہیں اور بالکل ہم ہیں کے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ سدرشن نے ہمارے جذبات کو بہت زیادہ اکسایا ہے اس لیے "مصور جذبات" بن گئے۔ راجپوتوں کی عظمت کا اظہار ان کے بھی افسانوں سے ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے "عورت کی محبت" اور "محبت کا انتقام" قابل مطالعہ ہیں۔ سدرشن نے افسانوں اور ڈراموں کی تقریباً پچیس سے زائد کتابیں شایع کیں اور اب تھکے تھکے معلوم ہوتے ہیں۔

اعظم کریوی | اعظم کریوی نے گذشتہ سال اپنے افسانوں کا مجموعہ (شیخ و برہمن) کے نام سے شایع کیا ہے۔ اس مجموعہ کو پیش نظر رکھ کر ہم انھیں پریم چند کا مقلد نہیں کہہ سکتے البتہ ان کی اور دو کتابیں "پریم کی چوڑیاں" اور "کنول" پریم چند کے انداز تحریر اور اسلوب بیان کی غمازی کرتی ہیں۔ وہ دیہات کے مناظر کا بڑی خوبی سے خاکہ کھینچتے ہیں۔ دیہاتیوں کی تہذیب و تمدن کو نہایت اچھے پیرایہ میں ظاہر کرتے ہیں۔ اور بالکل پریم چند کی طرح جزئیات کی تفصیلات میں کھو جاتے ہیں اور اپنے ساتھ قاری کو بھی لیے لیے پھرتے ہیں۔ لیکن ان کے خیالات میں تنوع نہیں دو چار کہانیاں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اس کہانی کو پڑھ لیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ

غور و فکر کم کرتے ہیں اور ایک ہی حالت پر لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کرپوی پریم چند کی تقلید تو کرتے ہیں لیکن پریم چند کے افسانے جس جوش و اثر کو اپنے دامن میں لیے ہوتے ہیں اس کا کرپوی کے ہاں فقدان ہے۔ پریم چند کی طرح وہ بھی ہندی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اس کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ وہ ہندی کے شاعر ہیں اور "ہندی شاعری" کی تصنیف کے دوران میں اس زبان کا اثر ان کی زبان اور ادب پر کافی پڑ گیا ہے۔

علی عباس حسینی | "رفیق تنہائی"۔ "آئی سی ایس"، "باسی پھول" اور "کچھ ہنسی نہیں ہے" کے مصنف دن بدن عروج پر ہیں۔ نقش اول سے نقش ثانی بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ سیرت نگاری اور کردار نگاری کی خصوصیات میں پختگی آ رہی ہے اور ان کا بھی موضوع دیہات ہے۔ وہ حقیقت نگاری کی طرف زیادہ راغب ہیں۔ پریم چند بھی آخری دور میں حقیقت نگار ہو چلے تھے۔ کرداروں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ وہ ہم میں سے ہیں اور کہیں باہر نہیں لیے گئے، اس لیے ہمیں زیادہ اپیل کرتے ہیں۔ ان کی زبان پریم چند کی زبان کی طرح شیریں اور سبک ہے۔ اور انھیں الفاظ پر پورا قابو حاصل ہے۔ ابتداءً اکثر انھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ پریم چند کی طرح اپنے افسانوں کا اختتام بھی پُرشکوہ جملہ پر کریں۔ اب وہ شکوہ باقی نہیں رہا بلکہ سیدھے سادے طور پر چبھتے ہوئے اور دردمندانہ انداز میں افسانہ ختم ہوتا ہے۔ اب ان کے افسانوں میں ماہرِ نفسیات کی باریک بینیاں داخل ہو رہی ہیں اور صنعی پہلو کا اثر بھی نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ اور ان چیزوں کی وجہ سے جاذبیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ایم اسلم | ایم اسلم کے بعض افسانے خاص طور پر مجموعہ "کارزارِ حیات" اور "تغیرِ حیات" دیہاتی مناظر، دیہاتیوں کا کردار اور ان کے مصائب اور مشکلات اور ان کے باوجود بلند اخلاق اور مہمان نوازی وغیرہ کا اظہار کرتے ہیں۔ ایم اسلم نے کہنے کو تو بہت کچھ لکھا، لیکن اگر اچھے افسانے جمع کیے جائیں تو مشکل سے ایک دو کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایم اسلم لکھے جانا چاہتے ہیں، خواہ کچھ ہو، اور کسی معیار کا ہو۔ ان کے معیاری افسانوں کے

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ دیہات کی تلخ حقیقتوں کو انھوں نے ایک نئی شکل میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اس لیے کہ ایم اسلم زمیندار ہیں اور ان کی تحریر کے انداز میں بھی زمینداری کی بو آتی ہے۔ وہ رہتے شہر میں ہیں لیکن دورے کے واقعات لکھتے ہیں اور اس سلسلے میں ایک ایک دو دو چیزوں کا اظہار کر جاتے ہیں جس سے افسانے میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا انداز تحریر زیادہ تر ڈرامائی ہے ان کے اشخاص قصہ ہی اکثر واقعات بیان کرتے ہیں اور ان کے کرداروں پر روشنی پڑتی ہے۔

کرشن چندر کرشن چندر نے بھی حقیقت پسندی پر زور دیا ہے۔ "ہوائی قلعے" اور "طلسم خیال" سے زیادہ "نظارے" اس کے شاہد ہیں اپنا مطمح نظر واضح کرنے کے لیے انھوں نے ترقی پسند ادیبوں کے افسانوں کو "نئے زاویے" کی شکل میں پیش کیا ہے۔ حال ہی میں ان کا ایک اچھا ناول "شکست" شایع ہوا ہے اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ بھٹکاتے ہوئے پیچیدگیوں میں رکھ کر سیدھا راستہ بھی بتلاتے ہیں۔ انھیں کاروباری زندگی پسند نہیں جس میں من و تو کے جھگڑے کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ پریم چند کا بھی یہی حال ہے۔ وہ شخصی فائدہ سے زیادہ قومی فائدہ کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کا ہیرو کبھی ذاتیات سے بحث نہیں کرتا۔ وہ حقیقت نگار زیادہ ہیں اور رومان نگار کم۔ لیکن کرشن نے ایک قدم آگے بڑھا کر ان دونوں چیزوں کو اپنی تحریروں میں مدغم کر دیا ہے۔ موجودہ سماج سے باغی ہیں۔ پریم چند کی طرح کہیں کہیں مزاحیہ رنگ بھی جھلکتا ہے وہ انسانی نفسیات کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں۔ اس خصوصیت میں وہ پریم چند کے دوش بدوش چل رہے ہیں۔ ان کے افسانے "زندگی کے موڑ پر" اور "دو فرلانگ لمبی سڑک" ہر لحاظ سے کامیاب ہیں اول الذکر بقول صلاح الدین احمد کے "انسانی روح کی پکار کا ایک حیرت انگیز ریکارڈ ہے جس میں آرٹسٹ نے سوز و غم کے نغمے قہقہوں اور مسکراہٹوں میں چھپا چھپا کر بھرے ہیں"[1]

---

[1] ۔ سالنامہ ادبی دنیا [illegible] صفحہ ۲۵ (اسی میں پہلا افسانہ بھی شایع ہوا ہے)

اوپندرناتھ اشک | اشک اسی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے بھی فطرت انسانی کا دقیق نظر سے مطالعہ کیا ہے، اور کرشن چندر سے زیادہ پریم چند سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے سماج کی ایسی تصویروں کو بے نقاب کیا ہے جو ہر کس و ناکس کو نظر نہیں آتیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعے "کونپل" "ڈاچی" اور "ستاروں کے کھیل" شایع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی فن کاری کی بدولت بہت کم مدت میں محفل ادب میں اپنے لیے جگہ پیدا کر لی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی | بیدی بھی سماج کے بھیدی ہیں، اور اسی لیے وہ باغی ہیں "دانہ و دام" اور "گرہن" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے تجربات کو نئی، اور موثر شکل میں پیش کرتے ہیں ان کے افسانے پنجاب کی زندگی کا عکس ہیں اس لیے وہ محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ زبان اتنی رواں، سلیس اور اچھی لکھتے ہیں کہ ان میں تصنع اور آورد کا دخل نظر نہیں آتا۔

احمد ندیم قاسمی | ندیم بھی نو واردوں میں ہیں "چوپال" "بگولے" اور "گرداب" کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں اس کا تعلق دیہاتی زندگی اور کسانوں کی دنیا کے مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ اس پر ان کی نظر کافی گہری ہے۔ اگر یہی رفتار رہے تو پریم چند کے بعد دیہاتی زندگی کے مصور یہی ہوں گے۔

ان تمام افسانہ نگاروں کے علاوہ دوسرے اور افسانہ نگاروں نے بھی سماج کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ بہت کم تعداد ایسی ہے جو دیہات کے متعلق لکھتی ہے۔ ان میں اکثر و بیشتر افسانہ نگاروں نے پریم چند سے فیض حاصل کیا ہے۔ سماج کے معمولی معمولی واقعات کو صفحہ کاغذ پر لایا جا رہا ہے اور ان سے دور رس نتائج نکالے جا رہے ہیں اس سے ہندوستان کا بے حس معاشرہ بھی کروٹ لیتا نظر آتا ہے۔ دیہاتی اور سماجی زندگی کے رموز و نکات کو پریم چند نے بہت تفصیل کے ساتھ آشکارا کیا ہے۔ انکی کہانیوں میں کوئی تصنع اور نمود و نمایش نظر نہیں آتی۔ وہ جو کچھ دیکھتے تھے لکھ دیتے تھے ان کا مطالعہ زندگی اور مشاہدہ فطرت اتنا صحیح تھا کہ انھیں اس کے ثبوت کے لیے دلائل ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ان کی شخصیت بھی نہایت شگفتہ تھی۔ ان کے افسانوں نے اردو افسانہ نگار

کی تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اور ہندوستانی افسانہ نگاروں کے رجحانات میں کافی تبدیلی پیدا کی اور انھیں اپنے ماحول، اپنے وطن، اپنے سماج اور اپنی سوسائٹی کا مطالعہ کرنا سکھایا۔ اور مشاہدہ کو بیان کرنے کی طاقت عطا کی۔ اس سے نہ صرف ہمارے سماج کو فائدہ پہنچا بلکہ ملک بھی نحوست کی بندشوں سے آزاد ہوتا جا رہا ہے۔ فقط

فہرست تصانیف منشی پریم چند

اردو افسانے

۱۔ سوز وطن دیسر ودلیش۔	افسانوں کی تعداد	۵	گیلانی الکٹرک پریس لاہور
۲۔ پریم پچیسی حصہ اول	〃 〃	۱۲	دارالاشاعت پنجاب لاہور
۳۔ پریم پچیسی حصہ دوم	〃 〃 〃	۱۳	〃 〃 〃
۴۔ پریم بتیسی اول ۵۔ 〃 〃 دوم		۳۲	〃 〃 〃
۶۔ پریم چالیسی اول	〃	۲۰	گیلانی الکٹرک پریس لاہور
۷۔ 〃 دوم	〃	۲۰	〃 〃 〃
۸۔ خواب وخیال	〃	۱۴	〃 〃 〃
۹۔ خاک پروانہ	〃	۷	〃 〃 〃
۱۰۔ فردوس خیال	〃	۱۱	انڈین پریس الہ آباد
۱۱۔ دودھ کی قیمت	〃	۹	عصمت بک ڈپو دہلی
۱۲۔ زاد راہ	〃	۱۲	حالی پبلشنگ ہاوس دہلی
۱۳۔ واردات	〃	۱۳	جامعہ ملیہ دہلی
۱۴۔ نجات	〃	۱۳	لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور
۱۵۔ دیہات کے افسانے۔	شایع شدہ افسانوں کا انتخاب۔		دارالاشاعت پنجاب لاہور۔

اردو ناول

۱۔ ہم خرما وہم ثواب	ہندوستانی پریس لکھنو
۲۔ روشنی رانی	زمانہ پریس کانپور
۳۔ جلوۂ ایثار	انڈین پریس الہ آباد
۴۔ بازار حسن دو جلدوں میں	دارالاشاعت پنجاب لاہور
۵۔ چوگان ہستی	〃
۶۔ گوشۂ عافیت	
۷۔ پردۂ مجاز	لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور۔

۸ - نرملا
۹ - غبن دو جلدوں میں
۱۰ - بیوہ
۱۱ - میدان عمل
۱۲ - گئو دان

لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور

سرسوتی پریس بنارس
جامعہ ملیہ دہلی

اُردو ڈرامے

۱ - شب تار
۲ - کربلا
۳ - روحانی شادی

زمانہ پریس کانپور

عصمت بک ڈپو دہلی

ہندی افسانوں کی کتابیں

۱ - پریم دواشی
۲ - پریم پرتما
۳ - پریم تیرتھ
۴ - پریرنا
۵ - پانچ پھول
۶ - مان سرور دو جلدوں میں
۷ - کفن اور دوسرے افسانے
۸ - سپت سروج
۹ - پریم پچیسی
۱۰ - پریم پورنما
۱۱ - نو ندھی
۱۲ - پریم پرسون
۱۳ - اگنی سمادھی
۱۴ - سمر یاترا

ہندی ناول

۱ - سیوا سدن
۲ - پریم آشرم
۳ - بردان
۴ - پریما (پرتگیا)
۵ - رنگ بھومی - دو جلد
۶ - غبن
۷ - کرم بھومی
۸ - نرملا
۹ - کایا کلپ
۱۰ - گئو دان
۱۱ - منگل سوتر

ہندی ڈرامے

۱ - کربلا
۲ - سنگرام
۳ - پریم کی ویدی

بچوں کے لیے

۱ - بالکوں کے وشن
۲ - رام چرچا
۳ - کتے کی کہانی
۴ - جنگل کی کہانیاں
۵ - من مودک
۶ - شیخ سعدی
۷ - درگا داس

ہندی ترجمے اور تالیفیں

۱ - آزاد کتھا (فسانۂ آزاد کا خلاصہ)
۲ - چاندی کی ڈبیہ
۳ - ہڑتال } گالزوردی کے ڈرامے کے ترجمے
۴ - نیائے
۵ - آہنکار - اناطول فرانس کے ڈرامے کا ترجمہ
۶ - سکھ داس
۷ - ٹالسٹائی کی کہانیاں
۸ - پتا کے پتر پتری کے نام
۹ - سرشٹی کا آرمبھ (تخلیق کائنات)
۱۰ - قلب سوچیہ -
۱۱ - قلب رتن -

صلیبی جنگیں

(بسلسلہ سابق)

یعنی کل مغربی یورپ کی ایک تحریک کی حیثیت سے خود صلیبی جنگوں کا اس مقام پر پڑے ہوئے پورے عام اثر کا سوال جہاں ان کی ابتدا و اشاعت ہوئی تھی۔ یہ دوسرا اور وسیع تر سوال ہمارے موضوع کی حدود سے خارج ہے، لیکن یہاں بطور ضمیمہ و خاتمہ چند امور کا اضافہ کرنا بیجا نہ ہوگا خصوصاً ان محاربات کے ان عام نتائج کی طرف توجہ مبذول کرانا جنھوں نے مشرق و مغرب کے تعلقات کو متاثر کیا ہے۔

حروب صلیبیہ نے مغربی یورپ کی نصرانی دولت عامہ کو کم و بیش چار طرح متاثر کیا ہے۔ (الف) سب سے پہلے تو انہوں نے کلیسا اور خصوصاً پاپائی نظام کو متاثر کیا۔ (ب) دوسرے انھوں نے متعدد جاگیروں میں سے ہر جاگیری علاقہ کی داخلی زندگی اور معاشی حالت پر اثر ڈالا: ہم اس اثر کا اندازہ کچھ تو حکومت (اصلی "مملکت") کے کاموں میں خود اس اثر کے اظہار سے لگا سکتے ہیں اور کچھ تو دو غیر مذہبی جماعتوں کے موقف میں اس اثر کے ظاہر ہونے سے کر سکتے ہیں؛ یہ دو جماعتیں امرا اور عوام کی تھیں اور زیادہ خصوصی طور پر شہروں کے عوام کی (ج) تیسرے انھوں نے مختلف جاگیری علاقوں کے بیرونی تعلقات کو متاثر کیا: اس اثر کا سراغ ان جاگیروں کے اضافی وزن و اہمیت کی تبدیلیوں اور اتحاد (کنسرٹ) یا نظام یورپ کے عام ارتقا دونوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ (د) سب سے آخر اس طرح کہ ان جنگوں نے یورپ سے براعظم ایشیا کے تعلقات کو متاثر کیا۔ تیرھویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی عیسوی کے اختتام تک تلاش و جستجو کی جو لہریں وسیع سے وسیع تر ہوتی گئیں ان میں ہم اس تحریک کے مسلسل مدارج کا پتہ لگا سکتے ہیں جن کو ابتداً حروب صلیبیہ نے جاری کیا تھا۔

کلیسا اور پاپائی نظام

اساقفہ ایک بین الاقوامی جماعت تھی اور ان کا رئیس پوپ ایک بڑی یورپی شخصیت تھی۔

حروب صلیبیہ جیسی بین الاقوامی اور یورپی مہم کی قسمت میں پادریوں اور پوپوں کے زیر اقتدار آجانا اور اسی طرح مذہبی رجحان کو بلند کرنا، جو گریگوری کی تحریک میں پہلے ہی سے نمایاں تھا، قدرتی معلوم ہوتا تھا۔ اربن دوم کا تصور یہ تھا کہ پوپ اس مقدس جنگ کا بحری و بری سپہ سالار ہو، حروب صلیبیہ پاپائی نظام کی خارجی حکمت عملی ہو جو پوپ کے اشاروں پر چلا کرے، اور ایک پاپائی نمائندہ خدائی فوجوں کے ساتھ رہے اور اس پر حکومت کرے۔ حالات کے لحاظ سے اس منصوبہ کا عملی جامہ پہننا بہت بعید تھا۔ معمولی حکمرانوں کی دنیاوی امنگ نے، جو پہلی ہی صلیبی جنگ میں نہ صرف کافی نمایاں بلکہ بلاشبہ غالب بھی تھی، پادریوں کی مذہبی حکومت کی بجائے جس کا انھوں نے خواب دیکھا تھا، سنہ ۱۱۰۰ء میں بیت المقدس میں ایک دنیاوی بادشاہت قائم کردی جو بجائے خود اہم ہے۔ دوسری اور تیسری صلیبی جنگوں میں مغرب کے ایسے شہنشاہوں اور بادشاہوں نے جو پہلی جنگ میں حاضر نہیں تھے، نمایاں حصہ لیا ہے۔ دیکھنے کا بھی موقع ملے گا کہ یروشلم پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے دنیاوی حکومت نے کس طرح خود اپنا نظام محصول اندازی قائم کیا۔ تاہم دنیاوی راہ نمائی اور دنیاوی میلان کے باوصف جو کہیں اتنا زیادہ نمایاں نہیں رہا جتنا کہ چوتھی صلیبی جنگ میں، حروب صلیبیہ کا تعلق اصلاً پاپائی نظام سے آخر تک باقی رہا۔ پوپوں ہی نے ان مہموں کی تبلیغ و تنظیم کی تھی اور پوپ ہی نہ صرف مشرق کے مسلمانوں کے خلاف ان جنگوں کی راہ نمائی کر سکتے تھے بلکہ فریڈرک دوم کے عہد میں ایسا زمانہ بھی آیا جب کہ ایک پوپ ان جنگوں کا رُخ ایک شریر شہنشاہ کے خلاف پھیر سکا۔ صلیبی جنگیں صرف پاپائی حکمت عملی ہی کا ہتھیار نہیں تھے۔ وہ پاپائی مالیات کا بھی ایک جزو تھے۔ اگر دنیاوی مملکت صلاح الدینی عشر عائد کر سکتی تھی تو پوپ بھی خاص اپنا عشر عائد کر سکتا تھا؛ اور یہ تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز کے بعد سے حروب صلیبیہ کے نام پر مذہبی مالگزاریوں کے عشر آمدنی پر برابر عائد کرتے رہے: یہ کام پہلے تو کونسلوں اور بعد ازاں

پوپ کے اقتدار سے لیا گیا۔ انگلستان میں اثرات دور اصلاح تک جاری رہے۔ جس طرح صلیبی جنگوں نے کلیسا کی آمدنی میں اضافہ کیا تھا اسی طرح انھوں نے نئے حلیفوں کی تعداد میں بھی اضافہ کیا؛ اور مہم جوؤں اور خدائی فوجداروں نے اس قاعدہ کے اتباع میں، جو کلیسائی ضوابط پر مبنی تھا، یورپ کو جنگ جو پادریوں کا نیا تماشہ دکھایا جنھوں نے رہبانیت کے ضوابط کو پیشہ ور سپاہی کے اصول زندگی میں ضم کر دیا۔

جنگجو طبقوں کی مخلوط خصوصیات سے ان جنگوں کی ملی جلی خصوصیات کی بڑی اچھی طرح وضاحت ہوتی ہے، جن کی وجہ سے یہ لڑائیاں بیک وقت پوپوں کی موافقت میں تھیں اور ان کے خلاف بھی۔ اسی طرح پادریوں کے موافق و مخالف دونوں تھیں اور کلیسا کی حمایت کے ساتھ ساتھ اس کی بنیادوں کے نیچے سرنگ بھی لگتی جاتی تھی۔ حروب صلیبیہ نے اگر مقدس و غیر مقدس، دینی و دنیوی، مادی و روحانی کے قدیم واضح فرق کو پوری طرح اٹھا نہ دیا تو کم سے کم اس فرق کو کم ضرور کر دیا۔ یہ نہیں جنگ کرنے والے عام آدمی کے لیے مذہبی عہدہ پانے کی رسم تھی اور ایک لحاظ سے یہ جنگ عوام کی نجات کا باعث ہوتی۔ مذہبی جنگ پر جانے والے عام آدمی کا ایک حد تک پادری ہو جانا لازمی تھا، اور صلیبی جنگ کے مقاصد سے متحد ہو کر دنیوی ریاست کسی قدر تقدس کی شان حاصل کر سکتی تھی۔ یہ تحریک دوسرے دنیاوی میلانات سے نکلی اور ایسے زمانے میں پیدا ہوتی تھی جو بظاہر مذہبی اقتدار کی طرف رواں تھا لیکن وہ دنیوی اسپرٹ اور دنیوی اقتدار کے نشوونما میں امدادی قوت ثابت ہوتی۔ مشرق میں مسلمانوں کے آئے دن کے تعلقات سے وہاں نصرانیوں سے مسلمانوں کے تعلقات بڑھنے لگے؛ اس تعلق سے بے تکلفی پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ رواداری بھی جو بے تکلفی ہی پیدا کر سکتی ہے؛ غرض اس تعلق نے نصرانیت اور غیر نصرانیت سے قدیم اختلاف کو کمزور کیا ٹھیک اسی طرح جس طرح صلیبی جنگوں نے خود نصرانیت کی حدود کے اندر دینی و دنیوی

فرق کے بندھن ڈھیلے کر دیے تھے۔ فریڈرک دوم پوپ کے خلاف اسلامی فوج استعمال کرتا تھا، عرب عالموں سے خط وکتابت کرتا تھا اور مسلمان حاکموں سے ایسے وقت نازبیاہ کرتا رہتا تھا جب کہ خود بیت المقدس زیر بحث تھا، مگر تیرھویں صدی عیسوی میں تمام آدمی فریڈرک دوم کی روش کے نہیں تھے۔ لیکن عالموں نے بہر طور عرب حکماء سے فیض حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کی، بعض نے عربی ادب کا مطالعہ شروع کر دیا اور وسیع الخیالی کی نئی روح پیدا ہوئی۔۔ ایک ابتدائی زمانہ کے پس ماندہ سینٹ لوئی اور جامعہ پیرس میں فرق ہے۔ اول الذکر کسی غیر نصرانی سے اپنی تلوار اس کے جسم میں بھونک کر بحث کریگا اور آخر الذکر ارسطو کی طبیعیات و مابعد الطبیعیات کے لیے اسلامی اسپین سے رجوع کریگا۔ لیکن یہ بات وسیع الخیالی کے جدید دور ہی میں ممکن ہوسکتی تھی —— جس کے پیدا کرنے میں حروب صلیبیہ نے بھی حصہ لیا تھا —— کہ مدرسیت ارسطو کی دنیاوی حکمت اور انجیل و کلیسا کے مسلمہ روایات میں تطبیق دینے کے عظیم الشان کام کی کوشش کرسکے۔

مملکت اور دنیاوی ریاستیں

مغربی ریاستوں کی اندرونی زندگی میں صلیبی جنگوں کا سب سے زیادہ سادہ اور سب سے زیادہ واضح نتیجہ محصول اندازی کی ایک نئی قسم کا ارتقاء ہے۔ اب تک تحصول کا بار زمین پر تھا؛ صلیبی جنگوں کے ساتھ ہی ہم کو جائداد منقولہ پر محصول اندازی کی ابتداء کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ساتواں لوئی پہلا شخص تھا جس نے سنہ ۱۱۴۶ء میں ارض یروشلم کی دیری کے باعث نیا محصول عائد کیا۔ اس نے سنہ ۱۱۶۳ء میں پھر اس کا اعادہ کیا اور انگلستان کے ہنری دوم نے سنہ ۱۱۶۶ء میں اس مثال کا اتباع کیا اس لیے کہ اس نے جائداد منقولہ اور آمدنی کا لحاظ کرکے بلا امتیاز تمام طبقوں سے اسی سال فی پونڈ دو پنس اور بعد کو چار سال تک ہر سال ایک پنی محصول عائد کر دیا تھا۔ سنہ ۱۱۸۸ء میں فلپ آگسٹس اور ہنری دوم

اپنے اپنے ممالک محروسہ میں آئندہ تین سال تک اس قسم کا محصول عائد کرنے راضی ہو چکے تھے۔ گو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس راضی نامہ پر عمل نہیں ہوا۔ سقوط بیت المقدس کے بعد ۱۱۸۸ء میں دونوں بادشاہوں نے صلاح الدینی عُشر عائد کر دیا۔ انگلستان میں بھی بہرحال اپنے پیشرو کو نہیں بھولا گیا اور تیرھویں صدی عیسوی میں مال و اسباب و آمدنی پر محصول اندازی کو قومی نظام مالیات کی مروجہ خصوصیت بنا دی گئی۔ کہا گیا ہے کہ "موجودہ محصول اندازی مقدس سرزمین کی ضرورتوں سے پیدا ہوئی ہے"[1]

مغربی بادشاہتوں کی دینوی ریاستوں پر حروب صلیبیہ کے اثرات نسبتاً مشکوک اور کم واضح ہیں۔ کہا گیا ہے کہ جاگیرداری نظام کو درہم برہم کرنے اور جاگیری ریاست کو کمزور کرنے میں ان جنگوں کا حصہ بھی رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ شام میں نئی جاگیریں پیدا کرنے یا قومی جنگوں کے رکن بننے کے لیے ان مہمات نے آمادہ فساد افراد کو مشرق کی طرف ڈھکیل دیا؛ ان کا شاید یہ نتیجہ بھی نکلا کہ کچھ جائدادیں فروخت ہوئیں اور خطابوں کی اصلیت میں کچھ گڑبڑ پڑ گئی؛ لیکن پندرھویں صدی کے آخر تک بھی جاگیری ریاست اپنی زندہ قوت محسوس کراتی رہی اور اس کے ارکان پر حروب صلیبیہ کا اثر ان کے اعزاز میں کمی بیشی ہونے سے زیادہ ان کے جنگ کے نئے طریقوں اور فنون سپہ گری کی نمایشوں کے بڑھتے ہوئے رواج اور نوابی کروفر میں زیادہ نمایاں ہے جس کے متعلق ہم اوپر گفتگو کر آئے ہیں۔ اسی طرح شہری آزادی کے عروج کو اکثر حروب صلیبیہ سے اور شہری منشوروں کے عطیوں کو صلیبی امرا کے لیے زر نقد کی ضرورت سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہاں پھر احتمال ثبوت پر غالب آ گیا ہے؛ لیکن اگر ہم صرف یہ کہیں تو زیادہ محفوظ بنیاد پر رہیں گے کہ جہاں تک صلیبی جنگوں نے تجارت و سوداگری کی ترقی میں مدد دی ہے وہ لازماً شہروں کی ترقی میں ممد و معاون رہے

---

[1] ۔ کارٹری کی کتاب خلیفہ دوم اگسٹ جلد دوم صفحہ ۵۰۰ ۔ اس کے استفسارہ پولیان صفحہ ۵۰ اور بعد کے صفحات دیکھیے

بلاشبہ اپنی ابتدائی مرفہ الحالی کے لیے عظیم الشان اطالوی بندرگاہیں بہت کچھ صلیبی جنگوں ہی کی رہین منت ہیں، اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں تجارت کا وہ اندرونی راستہ جس کے ذریعہ سے وہیں کا مال و اسباب دریائے رہائن اور وہاں سے بحیرہ بالٹک و بحیرۂ شمال تک جایا کرتا تھا، صرف آزاد شہروں اور ہم پیشہ افراد کی آزاد جماعتوں کی ترقی ہی کا رستہ نہیں تھا بلکہ انکی توجہ کا مرکز بھی تھا۔

ریاستوں کے بیرونی تعلقات اور یورپ کا نظام

حروب صلیبیہ نے یورپ کے نظام کو صرف کلیسا اور اس کے عام موقف پر اپنا اثر ڈال کر ہی متاثر نہیں کیا بلکہ یورپی اتحاد کی ایک نئی لڑی مہیا کر کے بھی کہہ سکتے ہیں کہ ۱۰۹۶ء کے بعد متحدہ مغربی یورپ کا تخیل صرف مقدس شہنشاہی رومائی رسمی تجویز ہی میں نہیں ظاہر ہوا بلکہ وہ ایک مشترک نصرانی صلیبی جنگ کے حقیقی واقعہ میں بھی ظاہر ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ یورپی ریاستوں کے فرماں روا جب کسی صلیبی جنگ کے سلسلہ میں جمع ہوئے تو وہ صرف اختلاف کرنے جمع ہوئے؛ یہ بھی صحیح ہے کہ قومی رقابت نے قومی اختلافات کو بڑھا دیا جو مثلاً تیسری صلیبی جنگ ہی میں نمایاں رہے۔ تاہم اتحادِ اغراض اور مشترک مقصد کا احساس بالکلیہ کبھی بھی محو نہیں ہوا۔ مشرق کے مسلمانوں کو متحد کرنے کے لیے بغداد سے کوئی عام راہ نمائی ہوئی اور نہ خلافت نے اس غرض کے لیے اپنی آواز بلند کی، زیادہ سے زیادہ یہ کہ موصل میں ایک حقیقی اقتدار موجود تھا اور مقابلہ کے لیے کسی نورالدین کا مضبوط ایمان یا کسی صلاح الدین کا جوش و ولولہ آگے بڑھا۔ مغربی نصرانیت کے پاس اس کا پاپائی نظام اور صلیبی جنگ کے لیے پوپ کی راہ نمائی موجود تھی، گویا دشمنوں کے خلاف ایک مشترکہ اقدام کو بین الاقوامی بنا دیا گیا تھا۔ ایک یورپی دولتِ عامہ کا خیال ــــــ یعنی ایسی یکجہتی دولت عامہ کا تخیل جو

ترکوں کے خلاف مدافعت یا حملے کے مسیحی کام میں مصرف ہے ـــــ صدیوں سے اب تک چلا آرہا ہے۔ ایک ولندیزی عالم ترمیولن نے "بین الاقوامی نظام کا تصور" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے، اس میں فاضل موصوف نے ان مختلف تجویزوں کا پتہ لگایا ہے جو دوبے کے زمانے سے لیکر یا ترے اور کانٹ کے زمانہ تک پیش ہوتی رہیں اور جن کا مقصد یورپین اتحاد یا مجلس بین الاقوام کی کسی تجویز کی ابتدا کرنا تھا۔ تقریباً ہر تجویز میں جو دلیل بطور اساس پیش کی گئی ہے وہ ترکوں کے خلاف متفقہ کارروائی کی ضرورت ہے؛ اس طرح تقریباً ہر تجویز میں ہم صلیبی جنگوں کے رفتہ رفتہ محو ہونے والے تخیل کی باقیات کا سراغ لگا سکتے ہیں۔

حروب صلیبیہ اور ان کی ترقی کے دوران میں یورپی ریاستوں کا توازن بدل چکا تھا۔ مغرب کی شہنشاہیت کے خلاف سیاسی ترازو میں بازنطینی شہنشاہیت کا وزن باقی نہیں رہا تھا۔ ۱۲۰۴ء میں اس کا بھی خاتمہ ہوگیا؛ اور اگر تیرویں صدی عیسوی تک قسطنطنیہ اور طرابزون میں کوئی شہنشاہت تھی تو اس کی حیثیت صرف ایک بڑے نام کے سائے سے زیادہ نہیں تھی۔ یورپ کا توازن اب مغرب میں قایم ہوچکا تھا۔ مغربی مملکتوں میں فرانس کو تسلط حاصل ہوچکا تھا؛ اور اس کے حصوں میں حروب صلیبیہ نے اپنا حصہ لیا تھا۔ فرانسیسی سرزمین پر ان کی تبلیغ کی گئی تھی؛ فرانسیسی نبرد آزماؤں نے اس میں حصہ لیا تھا؛ یہ فرانس ہی تھا جس نے سینٹ لوئی کی ذات میں مکمل قسم کا صلیبی مجاہد پیدا کیا۔ فرانسیسی آبادکار یروشلم کی بادشاہت میں قیام پذیر ہوچکے تھے۔ اور جب وہ ہاتھ سے جاتی رہی تو قبرص میں ہجرت کرگئے اور جزیرہ موریہ و اشینہ کے جاگیری علاقے میں جابسے۔ چودویں صدی عیسوی کا ایک فرانسیسی مورخ لکھتا ہے: "دنیا کی بہترین شجاعت موریہ کی شجاعت: وہاں ایسی اچھی فرانسیسی بولی جاتی ہے جیسی کہ پیرس میں"۔ ساحل فلسطین کی عام زبان "فصیح فرانسیسی" نہیں ہوتی۔ جہاں تک فرانسیسی زبان کے

لاطینی ماخذ کا تعلق ہے۔ اس نے یہ ماخذ جنیوا اور بندقیہ کے اطالوی تاجروں سے
حاصل کیا۔ گو شرقی بحیرۂ متوسط میں فرانسیسی زبان باقی نہیں رہی لیکن وہاں
فرانسیسی زبان کی شمع کبھی کامل بجھی نہیں ہوئی۔ سولویں صدی عیسوی میں مقامات
مقدسہ کی محفوظہ ریاست کو فرانسس اول کی حمایت حاصل ہوئی؛ معاہدوں نے
مسیح کے مقام پیدائش اور بیت المقدس میں مزار مسیح پر لاطینیوں کو قبضہ دلا دیا؛
انیسویں صدی عیسوی میں بھی ان معاہدوں پر اس حد تک عمل ہوتا تھا کہ جنگ
کریمیا کے اسباب میں سے یہ بھی ایک سبب ہوا بلکہ آج بھی شام پر فرانسیسی
انتداب کو ہم حروب صلیبیہ ہی کا ایک عطیہ شمار کر سکتے ہیں۔

یورپ اور ایشیا کے تعلقات

آخر میں یورپ اور براعظم ایشیا کے تعلقات کے اس نئے نظام کے متعلق گفتگو کرنا باقی ہے
جس کی ابتدا حروب صلیبیہ سے ہوئی تھی۔ یورپ کو ان جنگوں میں صرف اپنے اندر ہی اتحاد کی
ایک نئی شکل دریافت نہیں ہوئی اور نہ صرف اس نے اپنی باطنی زندگی پر ایک نیا اثر محسوس کیا
بلکہ ان کے ذریعہ سے یورپ نے دنیا کا ایک نیا اور نہایت وسیع نقطہ نظر حاصل کیا۔ نظر و بصر
کی یہ وسعت، جس کے ساتھ تحقیق و جستجو اور جغرافیائی علم کی ترقی ہوتی رہی، حروب صلیبیہ کے نتیجوں
میں آخری اور باعتبار وسعت سب سے زیادہ عظیم الشان نتیجہ ہے۔ زائروں کی راہ نمائی کے
لیے بارھویں صدی عیسوی ہی میں جغرافیہ کا ایک پر از معلومات ہو چکا تھا؛ اب اس میں رستوں اور
متبرک مقاموں نیز حربی اہمیت رکھنے والے علاقوں کی جہاں اس وقت جنگ جاری تھی — خصوصاً
فلسطین، مصر اور میانی رقبہ۔ فوجی دیکھ بھال سے متعلقہ معلومات مکمل طور پر ملتی تھیں۔ ان
میں ایشیائے کوچک کے صرف ساحلی کناروں کے حالات بیان ہوتے تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے
ایک موقعہ پر توجہ دلا چکے ہیں ستر ہویں صدی عیسوی میں تحقیق و تجسس نے اپنا رخ بڑے ایشیا بعید
کی طرف پھیر دیا تھا۔ ایشیا کی دریافت کا عظیم الشان زمانہ جو سولہویں صدی عیسوی میں امریکہ

۵۔ زائروں کے لیے رہنما: ... دیکھیے جو یروشلم کا راستہ ... لاطینی کلیسا ... فلسطین ... ملاحظہ ہو۔

دریافت کے زمانہ کے مساوی نہیں تو متوازی ضرور ہے، قریباً ۱۲۴۰ء سے شروع ہوا اور ایک صدی بعد ختم ہوگیا۔ اس صدی میں ایشیا مغل شہنشاہت کے تحت متحد تھا لیکن اس اتحاد کی کڑیاں مضبوط نہیں تھیں اس لئے کہ مغل شہنشاہت کی حدیں کریمیا و تبریز سے لیکر بخارا و سمرقند سے ہوتے ہوئے کمبالوک (پیکن) اور کناسائی (ہانگ جو) تک پھیلی ہوئی تھیں۔ منگول جو پہلے قدیم شامانی مذہب پر قائم تھے دوسرے مذہبوں سے رواداری برتتے تھے، گو وہ خود نصرانی نہیں تھے لیکن اپنی مملکت میں نصرانی عناصر کو پناہ دیا کرتے تھے اس لئے نصرانی جوش تبلیغ نے انکو نصرانی بنانے کی توقع قائم کی اور تجارتی سرگرمی نے ان کی سلطنت میں سے ہوکر مشرقی تجارت کے سرچشموں تک پہنچنے کا راستہ دریافت کرلیا۔ منگولوں کے پاس جو تبلیغی جماعت بھیجی گئی تھی اس کا مقصد ایک حد تک اس بات پر بھی مبنی تھا کہ منگولوں کے نصرانی ہوجانے سے اب بھی صلیبی جنگوں کے مقاصد آخرکار حاصل کیے جاسکتے ہیں اور ارض مقدس کی بازیافت مستقلاً عمل میں آسکتی ہے، لیکن حروب صلیبیہ سے اس کا تعلق ہونے کے باوجود یہ جماعت ان کے حدود سے آگے ہوگئی۔ ایسے لوگ بھی تھے جو ال لس کی طرح یقین رکھتے تھے کہ تبلیغی جماعت کو صلیبی جنگ کی جگہ لے لینی چاہیئے اور پرامن تبلیغ، جنگی مہمات کا بدل ہوسکتی ہے؛ اور اس قسم کے مقاصد کی وجہ سے ایشیا کے مذہب کی تبدیل کرانا بجائے خود ایک مقصد قرار پایا ـــــ جس طرح سمندر پانی سے بھرپور رہتا ہے اس طرح دنیا کو علم الٰہی سے معمور کردینا۔ منگولوں کی رواداری اور ایشیا میں نسطوری فرقے کے نصرانیوں کی موجودگی سے مدد حاصل کرکے یہ مشن بہت آگے بڑھ گئے اور چودہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں پیکن میں لاطینی کلیسا کا بانی جان شہر مونٹ کا اسقف اعظم بن گیا اور فرانسکن فرقے کے بنی آدم اس کے ماتحت مقرر ہوئے جس طرح اطالوی بندرگاہوں کے جہاز ران پہلی صلیبی مہم کے ساتھ ساتھ گئے تھے اس طرح نصرانی تبلیغی جماعت کے ساتھ اطالوی تاجر روانہ ہوئے اور نہ صرف پولو ہی بہت سے لوگوں نے بڑی بڑی سیاحتیں کیں جو بجائے خود ایک مضبوط ارادہ کی نشانی ہے بلکہ اہل جنیوا کی ایک شرکت نے بحیرہ اسود کے بانیوں میں جہاز رانی کی اور تبریز میں ایک بند می سفیر مقرر کیا۔ تمام بڑی بڑی امیدیں اسی ایک معاملہ کی وجہ سے پس پشت ڈال دی گئیں، اور حروب صلیبیہ کا مقصد منگولوں کے بڑے ہیولی تبدیل مذہب کی رو میں بہہ کر غائب ہوگیا۔ مذہب کی یہ تبدیلی نصرانی ایشیا اور نصرانی یورپ ختم کردیتی اور اسلام ایک چھوٹے سے دین تک گھٹا دیتی جو ایشیا کے ایک حصہ میں ٹھہرا رہتا یا افریقہ کے کسی کونے میں پڑا رہتا۔ فارس خانوں نے ۱۳۱۶ء میں اسلام قبول کرلیا: چودہویں صدی کے وسط تک وسط ایشیا نے بھی یہی راہ اختیار کیا ۱۳۲۱ء سے

سنہ ۱۳۷۴ء تک منگولوں کا مقامی خاندان تخت نشین رہا جس نے اجنبیوں پر چین کے دروازے بند کر دیے۔ آخر کار نصرانیت ختم ہو گئی اور اسلام نے وسعت اختیار کی اور ترکوں کی ترقی سے اسلام کو مزید وسعت حاصل ہوئی لیکن غیر متوقع مغرب کے امید کی پھر ایک نئی کرن دکھائی دی۔ اور یہ نئی امید یہ تھی کہ ایک ایسا زبردست انقلاب پیدا کیا جا سکے جس کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اگر نصرانیت کے لیے خشکی کے رستے مسدود تھے تو وہ سمندری رستے کیوں نہ اختیار کرے، اوقیانوس پار کر کے مشرق کیوں نہ پہنچے اور مسلمانوں کو پیچھے ڈال دے۔ بیت المقدس کو فتح کرنے کے لیے بغیر لڑے بھڑے کیوں نہ حاصل کرے؟ بڑے بڑے جہاز رانوں کا یہی خیال تھا جو اپنے سینوں پر صلیب لگائے بڑے وثوق سے اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ وہ ارض مقدس کی بازیافت کے لیے یہ مشقت جھیل رہے ہیں، اور اگر کولمبس نے کیا تھے[1] کی بجائے بحر و کرابی (عربی میں بحر ظلمات) میں داخل ہو جاتا تو بہر طور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب جو اہل صومعوں کی تمنا تھی، نصرانیت کے لیے ایک براعظم فتح کر لیا، اور مغرب ان طاقتوں پر جنہیں اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا آخر کار اپنی مدافعت کیلئے توازن قائم کر لیا۔

اگر حروب صلیبیہ کے وسیع تر میدان کا لحاظ کریں اور طویل ما بعدی سلسلوں کو پیش نظر رکھیں جو ابتدائی مقصد کے بعد پیدا ہوئے تو ہم ان جنگوں کو ناکام نہیں کہہ سکتے۔ ورنہ وہ اپنے ابتدائی مقصد ہی میں پوری طرح ناکام ہوئے مشرقی بحیرہ متوسط میں اسلامی خطرے کے خلاف عامۃ نصرانیت کا دفاع۔ یہ صحیح ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ حروب صلیبیہ سلجوقی ترکوں کے زمانے سے شروع ہو کر حدود ایشیا میں بمقام نیقیا پینے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے، ان جنگوں کا خاتمہ عثمانی ترکوں پر ختم ہوا جنہوں نے خود یورپ میں اپنے گھوڑوں کو دریائے ڈینیوب کا پانی پلایا۔ مزید برآں ایک دوسرے نقطۂ نظر سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تقریباً پانسو سال بعد ہر چیز اسی طرح ختم ہوئی جس طرح شروع ہوئی تھی البتہ فرنگی ایسے علاقے میں جہاں مسلمان حکمراں تھے، مقدس مقاموں کی ایک مختصر ریاست قائم کر سکے لیکن علاوہ ان سب کچھ نہیں ہے، اور جو کچھ نقشہ پر بتایا جا سکتا ہے، جو حروب صلیبیہ نے حاصل نہیں کیا بلکہ اگر انکو برقرار بھی نہیں رکھ سکے تب بھی انہوں نے دوسری چیزیں حاصل کی یا انکو برقرار رکھا اور یہ چیزیں زیادہ غیر محسوس لیکن کم حقیقی نہیں ہیں۔ حروب صلیبیہ نے قرون وسطی میں تمدن کی ترقی کے فیصلہ کن دور میں مغربی نصرانیت کی مدافعت کی، انہوں نے اس کو خود غرضانہ مقامیت سے بچا لیا، انہوں نے اسکو زندگی کا مطمح نظر بخشا[2] جس قوم کا کوئی مطمح نظر نہیں ہوتا وہ فنا ہو جاتی ہے اور قرون وسطی کی مغربی قوموں کے لئے حروب صلیبیہ کا مطمح نظر کسی نہ کسی طرح ایک نجات دہندہ تصور تھا کو اس تصور پر جب کہ توجہ دی گئی تو ان کو بحیثیت مجموعی اس پر کبھی غور ہی نہیں ہوا۔ **ابو النصر خالدی**

---

[1] [illegible] کا معروف نام۔ اہل یورپ کو اس نام سے مشہور اطالوی سیاح مارکو پولو نے روشناس کرایا۔

تعلیم سے متعلق شہریوں کے فرائض

آج کل دنیا اپنی تاریخ کے نہایت ہی نازک دور سے گذر رہی ہے ۔ وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جو خود کو زمانے کے ضروریات اور حالات کے مطابق بنالے ورنہ وہ زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے بہت پیچھے رہ جائیگی اور رفتہ رفتہ اس کا نام و نشان تک مٹ جائیگا ۔ اس خلفشار میں اور مستقبل کی دنیا کو درست کرنے کے لیے ہر ایک کی نظر مدارس پر پڑتی ہے اس لیے کہ ہر ایک مہذب قوم اپنے نوجوانوں کی تعلیم کو اپنی قومی، سماجی، معاشی صنعتی اور جسمانی ترقی کی اساس سمجھتی ہے ۔ جنگ عظیم کے بعد سے ہر ایک کو شدت سے اس کا احساس ہوا کہ قومی فلاح اور نئے دنیا کی تعمیر میں تعلیم کا بڑا حصہ ہے ۔ عہد نامۂ ورسائی کے بعد جس نئی دنیا نے جنم لیا تھا اس نے تعلیم کو اپنی سلامتی کی بنیاد سمجھ کر اس پر پوری توجہ کی ۔ جدید روس اور اٹلی نے جو انقلاب کی پیداوار تھے محسوس کیا کہ وہ تعلیم ہی کے ذریعہ اپنے اعلیٰ قومی مقاصد حاصل کر سکتے ہیں ۔

جنگ عظمیٰ اور حالیہ جنگ سے جو سبق حاصل ہوا ہے وہ دراصل فرد کی قدر و قیمت سے متعلق ہے اور یہ اس احساس کا نتیجہ ہے کہ خطرے کی وقت ہر ایک کی خواہ وہ مرد ہو یا عورت ۔ بچہ ہو یا بوڑھا، اہمیت ہوتی ہے یہ بھی محسوس کیا گیا کہ قابلیت کسی ایک جماعت یا گروہ کا اجارہ نہیں اور مختلف جماعتوں میں جو زبردست ذہنی ذخائر پوشیدہ ہیں انہیں ظاہر ہونے کا پورا موقع دینا چاہئیے اور اسی لیے ہر ایک سماجی نظام کو کافی تعلیمی مواقع فراہم کیے جائیں اور نصاب، مواد تعلیم اور طریقہائے تعلیم کی پوری طرح جدید تنظیم کی جائے اور اس میں اگر ایک طرف احساس آزادی، اختراعیت اور اولیت کے نشو و نما پر زور دیا جائے تو دوسری طرف باقاعدگی اور ضبط، پر اور ساتھ ہی عام ضروریات اور جانچ کے قابل معلومات بھی فراہم کیجائیں ۔

تعلیمی نظام کی نوعیت کے تعین میں جو سیاسی اور سماجی اثرات کام کرتے ہیں اور اسمیں ہر ایک شخص خصوصاً شہری کو جو حصہ لینا پڑتا ہے اسکا اظہار پیریکلس نے آج سے تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل اپنے ایک خطبہ میں یوں کیا ہے " ہر شخص کو جو پبلک معاملات میں دلچسپی نہ لے ہم لوگ صرف بے ضرر ہی نہیں سمجھتے بلکہ بیکار آدمی بھی ۔ تو ہم میں سے چند ہی لوگ پالیسی کا تعین کرتے ہیں مگر سب کے سب اسکے اچھے جانچنے اور پرکھنے والے ہیں "۔

تعلیم کی اہمیت کے مد نظر اسکے ماحول پر ہر اس نقطہ نظر سے غور کرنا ضروری ہے جسمیں کہ فرد رہتا اور کام کرتا ہے ۔ فرد محض ایک صناع ، سرکاری ملازم یا معمولی مزدور ہی نہیں بلکہ وہ سماج کے مختلف گروہوں کا ایک رکن بھی ہے اور اسکو مختلف حیثیتوں سے مختلف فرائض انجام دینے پڑتے ہیں ۔ وہ ایک شہری بھی ہے اور اس حیثیت سے بہت سے حقوق و مراعات کے ساتھ اسکے فرائض اور ذمہ داریاں بھی ہیں ۔ موجودہ شہریت کا تخیل ایک وسیع اور جامع تخیل ہے ۔ یہ صرف شہر کی چار دیواریوں تک محدود نہیں بلکہ دیہات بھی اسمیں شامل ہیں ایک مثالی شہری صرف موجودہ زمانے کی حد تک اپنے فرائض کی انجام دہی پر قانع نہیں ہوتا بلکہ مستقبل کے متعلق بھی وہ اپنے فرائض کو محسوس کرتا ہے ۔ وہ انسانیت کا خادم ہوتا ہے اور سماج کی بہبود اور ہر ایک کے لیے انصاف رسانی کی کوشش کرتا ہے اسلئے اعلیٰ قسم کی شہریت خدمت کے جذبے اور سماج کی بہبود کے لیے مسلسل کوشش کا مطالبہ کرتی ہے ۔ شہریت ایک قسم کا نہایت ہی مشکل ضبط ہے اور اسمیں بڑے ایثار سے کام لینا پڑتا ہے اسلیے کہ ہر ایک کو شہرت حاصل نہیں ہوتی ۔ اکثر اچھے شہری خاموش طریقے پر بغیر کسی نام و نمود کے نہایت ہی صبر کے ساتھ ملک کے لیے ٹھوس خدمات انجام دیتے ہیں ۔ بعض اپنے فرائض کی انجام دہی میں ایسے منہمک ہوتے ہیں کہ انہیں اس امر کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ ملک کے لیے کتنی بڑی خدمت کر رہے ہیں ۔ مسٹر شاستری کے قول کے مطابق اخلاقی نقطۂ نظر سے اچھی شہریت کا مفہوم یہ ہے کہ شہری میں ایثار اور عوام کی خدمت کا جذبہ ہو " اور جب اپنے ذاتی مفاد اور عوام کے فائدے کا سوال پیش ہو تو وہ ہمیشہ عوام کے فائدے کو اپنے ذاتی مفاد پر ترجیح دے "۔

شہریت کا نہایت ہی اہم اور اولین اصول یہ ہے کہ آخر میں چلکر فرد ہی اپنے طبقے اور سماج کی بہبود کا ذمہ دار ہے سوسائٹی دراصل خاندان کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے ۔ اگر خاندان کے کسی فرد کو کوئی تکلیف ہو تو

دوسرے افراد بھی اسکو لازمی طور پر محسوس کرتے ہیں اگر خاندان کا کوئی فرد کسی متعدی مرض میں مبتلا ہو تو خاندان کے دوسرے افراد بھی خطرے میں رہتے ہیں اسیطرح اگر سماج کا کوئی حصہ جاہل اور ان پڑھ رہے تو پورے سماج پر اسکا اثر پڑنا ضروری ہے، اگر کسی محلے میں غلاظت و کثافت کے باعث کوئی متعدی مرض پھوٹ پڑے تو ظاہر ہے کہ اس سے تمام آبادی کو خطرہ لاحق ہوگا اور شہر کا شہر پریشان ہوجائیگا۔ اور اسکا تجربہ ہم کو متعدد مرتبہ ہوچکا ہے۔ یہ ایک پرانا مقولہ ہے کہ شہر پر ایسے ہی حاکم حکومت کرتے ہیں جیسکے شہری قابل ہوں اسلئے یہ شکایت بیجا ہے کہ ہمارے انتظام میں خرابیاں ہیں ہمارے شہر کے بعض حصے اور مواضع کثیف و ناصاف ہیں۔ ہمارا کثیر آبادی جاہل ان پڑھ ہے قصور دراصل ہمارا ہے۔ ہم میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا پورا احساس نہیں۔ ہم خود کوئی کام نہیں کرنا چاہتے ہر چیز کیلئے ہماری نظر حکومت کی طرف اٹھتی ہے۔ بالفاظ دیگر ہم اچھے شہری کہلانے کے مستحق نہیں اور خراب شہریوں کو مختلف تکالیف و صعوبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ جہالت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ اگر ہم اپنی آبادی کے کثیر حصے کو علم کی روشنی سے بے بہرہ رکھیں، اور ان کو انکی پست حالت سے ابھرنے کے مواقع فراہم نہ کریں، انکی صحت اور اخلاق کو درست نہ کریں تو اسکا خمیازہ ہمیں کسی نہ کسی شکل میں بھگتنا پڑیگا۔ اسلئے ہر ایک کے لیے ایک اچھی اور موزوں تعلیم کے انتظام کی کوشش ہر شہری کا فرض اولین ہے اور اچھی تعلیم کا مفہوم محض پڑھنا لکھنا یا کسی پیشہ کو سیکھ لینا نہیں۔ اصل تعلیم وہ ہے جسکے ذریعہ فرد کی ایسی ذہنی تربیت کیجائے کہ وہ مشکلات پر قابو پاسکے، اپنی مدد آپ کرے، اسمیں اپنے خود اعتمادی، خودداری، ایمانداری اور صبر و استقلال پیدا ہو۔ وہ محض دوسروں کا مقلد نہ بنے بلکہ خود اپنی ایک مستقل رائے رکھتا ہو اور اپنے طور پر سوچ بچار کرسکتا ہو۔ وہ ایک اچھی صحت کا مالک ہو اور اپنے اوقات فرصت کو موزوں مشاغل اور عمدہ طریقے سے صرف کرسکتا ہو۔

ہم میں سے اکثر اپنے بچوں کو مدرسے بھیج کر یا ان کے لیے کسی خانگی مدرس کو مقرر کرکے یا کبھی کبھار کسی غریب طالبعلم کی کچھ امداد کرکے اور بعض وقت مدرسے کے کسی جلسے میں شریک ہوکر سمجھتے ہیں کہ تعلیم سے متعلق ہم نے اپنے فرائض کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ ہم میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جو اپنے بچوں کو مدرسے اسلیے بھیجتے ہیں کہ گھر میں انکی شرارتیں ناقابل برداشت ہوتی ہیں انکو قابو میں رکھنا مشکل ہوتا ہے اور ہر چھوٹا بڑا ان سے تنگ رہتا ہے۔ وہ اپنے سر کی بلا مدرس کے سر ٹالنا چاہتے ہیں اور اسلیے بچہ گھر سے جتنی زیادہ دیر مدرسے میں رہے وہ اسے غنیمت سمجھتے ہیں۔ اور تقریباً سبھی ایسے ہیں جو بچے کو مدرسے بھیجکر سمجھتے ہیں کہ وہ اسکی تعلیم، تربیت صحت اور اخلاق کی درستی سے متعلق ہر ایک فرض سے سبکدوش ہوچکے ہیں۔ مدرسہ ان میں سے ہر ایک کا پوری طرح ذمہ دار ہے اور اسمیں کوئی کمی یا نقص رہ جائے تو

صدر مدرس سے لیکر مدرسے کا ہر ایک مدرس ان کے پاس سخت مجرم بلکہ قابل گردن زدنی قرار پاتا ہے۔ یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تصور غلط اور یہ خیالات محض بیجا ہیں۔ دن کے پانچ چھ گھنٹے جو بچے مدرسے میں مدرسین اور اپنے ہم جماعت طلبہ کے ساتھ گذارتا ہے انکی روزانہ زندگی کے چوتھائی حصہ سے بھی کم ہے اگر وہ اپنی روزانہ زندگی کا تین چوتھائی حصہ ایسے ماحول میں گذارے جو انکی تعلیم و تربیت کیلئے غیر موزوں ہو اور جہاں انکے ضدی خود سر، شریر، حریص اور ایسی ہی بہت سی بری عادتوں کا شکار ہونے کے پورے مواقع ہوں تو ظاہر ہے کہ انکی اصلاح مدرسہ کے بس کی بات نہیں بلکہ الٹا اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں مدرسے کی فضا ایسے بچوں کی وجہ سے خراب نہ ہو جائے۔ اسلئے جب تک طلبا کے والدین اور سرپرست گھر میں انکی تعلیم و تربیت، اخلاق و عادات پر پوری نگرانی نہ کریں اور ان کو ایک اچھا ماحول فراہم کر کے، مدرسے کے ساتھ پورا تعاون نہ کریں اسوقت تک اچھے اور خاطر خواہ نتائج حاصل ہونے کی امید نہیں رکھنی چاہئے۔ اچھے شہری کی حیثیت سے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کی صحت کا خیال رکھے انکے لیے موزوں غذا کا بروقت انتظام کرے۔ انکے بروقت مدرسہ جانے کیلئے ضروری سہولتیں بہم پہنچائے۔ تعلیم کے اوقات میں انہیں دوسرے کاموں پر نہ لگائے تا کہ ان کا تعلیمی ہرج نہ ہو۔

انکی تعلیمی رپورٹوں کو غور سے پڑھے، اور وقتاً فوقتاً اساتذہ اور صدر مدرس سے ملکر شخصی طور پر انکی تعلیمی ترقی کی رفتار سے واقف ہونے کی کوشش کرے۔ اگر بعض مضامین میں کمزوری پائی جائے تو انکے اسباب کو معلوم کر کے انکو دور کرنے کی کوشش کرے، اگر تعلیمی ترقی اطمینان بخش ہو تو مناسب تعریف اور موزوں انعامات سے بچوں کی ہمت افزائی کرے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ طلبہ کی تعلیمی حالت نہایت ہی کمزور ہے اور انکے امتحان میں بری طرح ناکامیاب ہونے کے باوجود بھی ان کے سرپرست انہیں اوپر کی جماعت میں ترقی دلانیکی کوشش کرتے ہیں اور اگر صدر مدرس اسپر رضامند نہ ہو تو انکو مختلف طریقوں سے مجبور کیا جاتا ہے، ہر قسم کی سفارش پہنچائی جاتی ہے، مختلف طریقوں سے اسپر دباؤ ڈالا جاتا ہے اور افسران بالا کے پاس انکی فرضی شکایتوں کی متعدد درخواستیں بھیجی جاتی ہیں۔

غرض سالانہ امتحان کے بعد جماعتی ترقی کا زمانہ صدر مدرس کے لیے بڑی آزمایش کا زمانہ ہوتا ہے اور طلبہ کے کم سمجھ سرپرستوں کے باعث اس کی جان بڑے عذاب میں ہوتی ہے۔ ایک اچھا شہری نہ صرف ایسی ناروا کوششوں سے باز رہیگا جس میں کہ بچے کا نقصان ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک عمدہ اصول کے ٹوٹنے کی وجہ سے انتظام میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور دوسروں کے لیے ایک بری مثال قایم ہو جاتی ہے بلکہ وہ کوشش کریگا کہ صدر مدرس پہنچ

اصول سے ہٹنے نہ پائے اور مدرسہ کا ضبط و نظم اپنے اعلیٰ معیار پر قایم رہے۔

ایک مثالی شہری محض اپنے بچوں کے لیے اچھی تعلیم نہیں چاہتا بلکہ اسکی خواہش ہوتی ہے کہ ملک کے ہر نوجوان کیلئے اچھی اور موزوں تعلیم کا انتظام کیا جائے، وہ کسی خاص طبقے یا فرقے کے لیے سہولتیں اور مراعات نہیں مانگتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ قوم کے ہر بچے کے لیے حصول تعلیم کے مناسب مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ اسکی قابلیت اور اعلیٰ فطری صلاحیتوں سے ملک پوری طرح استفادہ کرسکے۔ اسلیے وہ تعلیم کے اصل مقصد اور اسکے پورے نظام کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آیا اس سے ملک کی ضروریات بدرجہ اتم پوری ہو رہی ہیں یا نہیں، تعلیم میں جو اسقام ہوں وہ انکے نمایاں کرنے سے نہیں ڈرتا اور انتظام میں غیر ضروری مداخلت کیے بغیر تعلیمی پالیسی کی ایک اعلیٰ اصول پر تشکیل اور اس طرح اسکو ملک کی ضروریات اور بدلے ہوئے حالات کے مطابق بنانے پر اصرار کرتا ہے۔ اسکو ارباب تعلیم اور مدرسین کی مشکلات سے ہمدردی ہوتی ہے، اور اپنے اور اپنے حلقہ اثر تک انکو دور کرنے اور تعلیمی ترقی کیلئے ان کے ساتھ اشتراک عمل کرنے پر وہ ہر وقت آمادہ رہتا ہے۔ وہ ذاتی طور پر مدرسہ کی فضا، اسکے ماحول، طلبہ کی صحت اور ان کے اخلاقی معیار سے واقف رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ نہ صرف نصاب تعلیم اس کے پیش نظر ہوتا ہے بلکہ وہ یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ آیا تعلیم اصولی طور پر دیجارہی ہے یا نہیں۔ آیا مدرسے سے متعلق ہر ایک شخص اپنے فرایض کو عمدہ طور پر ادا کر رہا ہے یا نہیں۔ چھوٹے بچوں کے ساتھ مدرسہ کا سلوک کیسا ہے، آیا ان کے ساتھ بیجا سختی تو نہیں کیجاتی، آیا ان سے انکی عمروں کے لحاظ سے زیادہ سخت اور مشکل کام تو نہیں لیا جاتا؟ اگر ان میں سے کوئی بھی اسقام پائی جائیں تو وہ مناسب طریقے سے ارباب متعلقہ کو ان کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اسکا مقصد ہر وقت تعمیری ہوتا ہے، تخریبی نہیں۔ وہ مدرس کی اسکے پیشے کی اہمیت کے لحاظ سے بڑی عزت کرتا ہے، اور ہر وقت اور ہر طریقے سے اسکی مدد کرتا ہے تاکہ وہ اپنے کام کو اچھی طرح انجام دے سکے اور سماج میں اپنا اصلی اور اونچا مقام حاصل کرلے۔ اسلئے کہ جب مٹی اور چونے کی عمارتیں بنانے والوں کو مالا مال کیا جاتا ہے اور سماج میں انکی بڑی عزت ہوتی ہے تو پھر وہ لوگ جن پر انسان کو اصلی معنوں میں انسان بنانے کی ذمہ داری ہے اس دولت و عزت کے مستحق کیوں نہ قرار پائیں۔ اگر وہ متمول ہے تو اپنے خرچ پر مدارس اور کتب خانے قایم کرکے عوام کو تعلیم اور مطالعہ کی

سہولتیں بہم پہنچاتا ہے اور اس طرح اپنے سرمایہ سے ملک، قوم اور علم کی صحیح خدمت انجام دیتا ہے۔ اور یہ سب کس لیے صرف، اس لیے کہ ایک اچھے شہری کے پیش نظر صرف اپنا ذاتی مفاد نہیں ہوتا۔ وہ محض اپنے ضروریات، اپنی دلچسپیوں اور اپنی مسرتوں کے خیال ہی میں نہیں رہتا بلکہ اسکے پیش نظر دوسروں کا مفاد بھی ہوتا ہے، وہ ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی پوری کوشش کرتا ہے اور ان کے آرام و ضروریات کا ہر ممکن خیال رکھتا ہے۔ جہاں ہم نے شہریوں کے اتنے فرائض گنائے ہیں وہاں ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم مدارس اور ارباب تعلیم کی ذمہ داریوں پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔ صدر مدرس کو چاہئے کہ وہ جلسوں اور دیگر تعلیمی تقاریب کے ذریعہ وقتاً فوقتاً ایسے مواقع فراہم کرتے کہ طلبہ کے سرپرست مدرسین سے مل سکیں اور وہ مدرسے کے کاموں اور بچوں کی تعلیم میں دلچسپی لینے لگیں۔ مدرسے کے جلسوں میں محض مقامی عہدہ داروں اور غیر متعلقہ لوگوں کو بلانا اور طلبہ کے سرپرستوں کو نظر انداز کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ مناسب تو یہ ہے کہ ہر مدرسہ میں سال میں دو ایک مرتبہ والدین یا سرپرستوں کا دن منایا جائے اور طلبہ کے سرپرستوں کو دعوت نامے بھیجکر بلایا جائے اور ان کو نہ صرف بچوں کا سال بھر کا کام (ان کی کاپیاں، ان کے بنائے ہوئے نقشے وغیرہ) بتایا جائے بلکہ مدرسے کو کام کرتے ہوئے بھی دکھایا جائے یعنی یہ لوگ مدرسوں اور جماعتوں میں جا کر اسباق کو ملاحظہ کریں، خواندگی اور زبانی اعداد کو سنیں، دستی کام کرتے ہوئے بچوں کو دیکھیں، نقشہ کشی اور ڈرائنگ وغیرہ کا مشاہدہ کریں اور جملہ کاموں کو دیکھکر مدرسہ کے مقاصد اور طریقہ تعلیم سے متعلق اپنی رائے قائم کریں۔ جلسہ کے ختم پر صدر مدرس ایک تقریر کرے جسمیں گھر اور مدرسے کے قریبی تعلق اور اتحاد عمل پر زور دیا جائے، سرپرستوں کی ضروری امداد، مدرسہ کے کاموں میں انکی دلچسپی کا خیر مقدم کیا جائے اور انکے بچوں کی تعلیم سے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنے میں انکو ہر قسم کی سہولت فراہم کرنے کا وعدہ کیا جائے۔ اور بچوں کی تعلیمی ترقی کی خاطر صدر مدرس اور مدرسین کے مشوروں پر توجہ دینے اور ان پر عمل کرنے کی ان سے اپیل کیجائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ماہانہ یا میقاتی رپورٹ نہایت ہی پابندی سے بھیجی جائے۔ اسلئے کہ اس سے بچوں کے سرپرست انکی تعلیم سے ہمیشہ باخبر رہتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ اسکی خانہ پری نہایت ہی دیانت سے کیجائے اور سرپرست کے دستخط کے بعد اسکو واپس منگوا کر محفوظ رکھا جائے۔

بعض وقت مدارس کے جلسوں کے ختم پر والدین یا سرپرستوں کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا جاتا ہے انکے سوالات کا تشفی بخش جواب دیا جاتا کہ انھیں تعلیم اور اپنے بچوں کے متعلق اپنے معلومات میں اضافہ کرنیکا موقع ملے۔ فقط

خواجہ محمد یوسف الدین
ایم اے، ایل ایل بی، ایم ایڈ (ایڈنبرا)
وائس پرنسپل ٹیچرز ٹریننگ کالج



محمد یسین زبیری صاحب
ام ۔ بی ۔ بی ایس (عثمانیہ) ڈی ۔ پی ۔ ایچ (کلکتہ)
میڈیکل پراکٹیشنر

خطبۂ استقبالیہ

جو طیلسانین عثمانیہ کی گیارھویں سالانہ کانفرنس میں پڑھا گیا

عالیجناب فضیلت مآب صدر اعظم بہادر امیر جامعہ۔

برادرم محمد عبدالرؤف صاحب، برادران جامعہ۔

خواتین و حضرات!

عثمانیہ برادری نے آج مجھے جو اعزاز بخشا ہے کہ میں کانفرنس کی اس میقات میں معزز مہمانوں اور محترم مندوبین کا بحیثیت صدر استقبالیہ خیر مقدم کروں۔ اس کے لیے میں اپنے محترم بھائیوں کا صمیم قلب سے ممنون و شکر گذار ہوں۔ یقیناً اس خدمت کے لیے بہت دوسرے بھائی مجھ سے زیادہ اہل ہیں۔ اس لیے میں اس اعزاز کو محض آپ کی عنایت و محبت کا اثر سمجھتا ہوں۔ اور اس کے لیے اپنے قلب کو شکر گذاری کے جذبات سے مملو پاتا ہوں۔

عظیم الشان مملکت کے اس عظیم الشان دار السلطنت میں آپ حضرات کو مرحبا و خوش آمدید کہتے ہوئے میں جو مسرت اور جو خوشی محسوس کرتا ہوں اُس کے اظہار کے لیے الفاظ نہیں پاتا۔ اور اچھی طرح یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ حضرات کو زحمت تشریف آوری اور عدیم الفرصتی کے باوجود کانفرنس میں شرکت کے مقابلہ میں میری ممنونیت ایک غیر اہم سی چیز ہے۔

حیدرآباد اپنی مخصوص روایات اور اپنی خاص تاریخ کے ساتھ ایک نمایاں مقام کا مالک ہے یہاں جس طرح مختلف ثقافتوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا اور ان کے باہمی امتزاج سے جس طرح ایک عمدہ اور دلفریب نظام ثقافت نے یہاں نشو نما پائی ہے وہ تاریخ عالم کی پیشانی پر ایک چمکتا ہوا ستارا ہے۔ یوں تو ہر زمانہ میں حیدرآباد نے دنیا کے لیے ایسے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ اعلیٰحضرت جلالت الملک خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کے

عہد زریں میں حیدرآباد نے جو نمایاں ترقی کی وہ ہر طرح قابل رشک ہے۔

اس عہد میں تعلیم پر خاص توجہ کی گئی۔ اور اس کی سب سے بڑی مثال ہماری جامعہ ہے جسے اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کے نام نامی و اسم گرامی سے انتساب کا شرف حاصل ہے۔ یہاں سب سے پہلی مرتبہ کامیاب تجربہ ہوا کہ مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم دینا جزیرہ نمائے ہند کے لیے بھی مفید ترین طریقہ اور انگریزی زبان میں تعلیم دینا ایک غیر ضروری بوجھ ہے۔

خواتین و حضرات۔ آپ سب واقف ہیں کہ موجودہ عالمگیر جنگ نے ہم کو ایسی ہولناکیوں سے دوچار کر رکھا ہے جس کی مثال سابق میں نہیں ملتی۔ ہم آج کل دنیا کی تاریخ کے ایک نہایت دشوار گذار دور سے گذر رہے ہیں آج کل تمام دنیا کی نظریں اس جنگ پر لگی ہوئی ہیں جو چند دن قبل تک ہمارے دروازوں کے قریب آتی سنی جاتی تھی تو آج ہمارے گھروں تک پہنچ چکی ہے لہذا ہم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ اس بلائے ناگہانی سے حتی الامکان بچنے کے ذرایع استعمال کرے۔ باوجودیکہ ہم اس وقت غذا، کپڑے و دیگر ضروریات زندگی کے لیے بڑی دقتوں کا سامنا کر رہے ہیں لیکن ہم کو مزید ایثار کے لیے تیار رہنا ہے۔ بنگال۔ آسام و اڑیسہ کی حالیہ فاقہ کشی اور اموات ہماری اصل حالت کی آئینہ دار ہیں۔ جاپان کی جنگ میں شرکت اور ہندوستان پر اس کے دھاووں نے ملک کے گوشہ گوشہ میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ اس طوفان اور بھونچال سے بچنے کی تدابیر میں حصہ لینا ہم سب کا فریضہ ہے۔ حیدرآباد نے اپنی بساط سے زیادہ اس وقت تک جانی و مالی امداد کی ہے اور کرنے کو تیار ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے وفادار ضیعت اور اس کی رعایا کو اس کا معقول صلہ ملے اور اگر اس صلہ کا پیشتر ہی سے اطمینان ہو جائے تو موجودہ امداد سے کئی گنا زائد امداد جنگ کے سلسلہ میں مل سکتی ہے۔

آپ اس دار السلطنت میں ان حالات کے تحت جمع ہیں تاکہ مادر جامعہ کی ترقی اور ملک کے دیگر مسائل پر غور و خوض کریں اس وقت آپ کے پیش نظر سینکڑوں اہم حل طلب مسائل ہیں۔ بہ حیثیت صدر استقبالیہ میرا یہ فریضہ نہیں ہے کہ میں آپ کے لیے کوئی راہ عمل متعین کروں۔

جناب صدر اس سلسلہ میں آپ کی رہنمائی فرمائیں گے۔ میں صرف چند ایسے مسائل کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانے پر اکتفا کروں کا جن کا ہماری علمی زندگی اور ہماری مادر جامعہ سے گہرا تعلق ہے۔

جامعہ کی عام حالت | گذشتہ چند سال سے یہ بات واضح ہے کہ جامعہ کی انتظامی، تعلیمی، اخلاقی و معاشرتی حالت دن بدن بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی ہے جامعہ سے متعلق روزمرہ کی "طلباء میں" دار ہے اور دیگر ذرایع ان حالات کا بین ثبوت ہیں۔ افسوس ہے کہ ایک ایسا مرکز جس کی فضا میں سوائے علم، اخلاق، اتحاد و نظم و ضبط کے اور کچھ نہ ہوتا، ایک ایسا گہوارہ جس میں صرف ملک کے نوجوانوں کو آئندہ کے بہترین شہری بننے کی تربیت دی جاتی اور ایک ایسی عمارت جس میں سوائے تعمیر کے تخریب کی کوئی گنجایش نہ ہوتی، وہاں آج بے اطمینانی بے چینی اور بدگمانی کا دور دورہ ہے۔ اتحاد کی جگہ نفاق پھیلتا جا رہا ہے۔ نوجوان پستی اور کم ہمتی کا سبق سیکھ رہے ہیں اور جامعہ کے میدان کشتیوں کے دنگل اور لڑائیوں کے اکھاڑوں کی شکل اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے یہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جامعہ کی یہ زبوں حالی کیوں ترقی پر ہے؟ اس کے کیا اسباب ہیں؟ آیا صرف طلبا جامعہ ہی اس حالت کے ذمہ دار ہیں یا جامعہ کے انتظامی حالات اور منتظمین اس کے باعث ہیں؟ یا کوئی اور تیسری چیز یہاں کارفرما ہے؟ ضرورت ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو ان امور کے سدباب کی کوشش کی جائے تاکہ جامعہ کے ماتھے پر جو کلنک کا ٹیکہ لگ گیا ہے کہ وہاں کی فضاء بڑی مکدر ہے اس کو جلد سے جلد دور کیا جا سکے۔ اور جامعہ اصلی معنوں میں جامعہ کہلائی جا سکے۔

اساتذہ و طلباء کے تعلقات | ہمیں یہ دیکھ کر اور سن کر صد درجہ افسوس ہوتا ہے کہ جامعہ کی فضاء میں اساتذہ و طلباء کے تعلقات دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ اساتذہ کا فرض صرف کلاس روم تک نہیں ہے بلکہ طلباء کی اصلی تعلیم اساتذہ کے طرز عمل، ان کے عادات و اطوار اور ان کے اخلاق پر مبنی ہے۔ ماں باپ اپنے بچوں کو اپنی تربیت کے بعد اساتذہ کے

حوالہ اسی لیے کرتے ہیں کہ ان کے ذریعہ وہ دیگر امور زندگی سے واقف ہوں اور اچھے کردار کے حامل ہوں۔ سابقہ زمانہ میں تعلیم آج کل کی سی تعلیم نہ ہوتی تھی کہ طلبا چند کتب چند اساتذہ سے پڑھ لیں بلکہ اساتذہ کی دیرینہ صحبت، ان کا ذاتی علم، ان کی ہدایات اور ان کا عمل ان کو بہرہ مند کرتا تھا۔ اور ایسے افراد پیدا ہوتے تھے جن کی مثال ملنی مشکل ہے اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اساتذہ وطلبا کا ملنا جلنا تو در کنار آپس میں تبادلہ خیال بھی ممکن نہیں ہے۔ طلبا کے صحیح راہ عمل اور اچھے اخلاق کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ اپنے طرز عمل میں تبدیلی پیدا کریں اور طلبا میں جو ہیجان پیدا ہو گیا ہے اس کو دور کرنے کی کوشش فرمائیں۔ جامعہ کے موجودہ حالات نے ان حالات کو بالکل جداگانہ نوعیت کا کر دیا ہے۔ جس کے لیے طلبا جس قدر ذمہ دار ہیں۔ اس سے زائد اساتذہ کی ذمہ داری ہے۔

اقامت خانوں کی زندگی | اساتذہ وطلباء کے تعلقات کا دوسرا مظاہرہ کلاس روم کے بعد اقامت خانوں میں ہوتا ہے۔ جہاں اساتذہ کی ذمہ داریاں اور زیادہ اہم ہو جاتی ہیں یہاں طلبا اپنی آئندہ زندگی کی ہر جہتی تعلیم حاصل کرتے ہیں جس کا پورا دارومدار مودب پر ہوتا ہے اگر مودب خود صحیح اصولوں کے پابند نہ ہوں اور خود اعلیٰ کردار نہ رکھتے ہوں تو ناممکن ہے کہ وہ مقیمین کی زندگی کو صحیح راہ عمل پر ڈال سکیں۔ جامعہ عثمانیہ کے اقامت خانوں میں صرف ایسے ہی مودب رہنے چاہئیں جن کے عادات، اطوار اور جن کی زندگی عدیم المثال ہو تاکہ آئندہ نسل کی خاطر خواہ تربیت ہو سکے۔ ارباب جامعہ کو بہت جلد اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

تعلیمی حالت | جامعہ عثمانیہ کی تعلیمی حالت کا صحیح اندازہ ہم کو سال گذشتہ اور ماقبل کے افسوسناک نتائج سے ہوتا ہے کسی جامعہ کے نتائج امتحان ہی اس کی تعلیمی حالت کا معیار ہوتے ہیں۔ اس کی جتنی ذمہ داری طلبا پر ہوتی ہے اسی قدر بلکہ اس سے کسی قدر زیادہ ہی اساتذہ اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں اس لیے کہ اساتذہ کا طریقۂ تعلیم طلبا کو علم کی ترغیب دیتا اور اس کی طرف مائل کرتا ہے۔ زائد سے زائد طلبا کا امتحانوں میں ناکام رہنا طلبا پر تو

کچھ زیادہ اثر انداز نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ ان کا عزیز وقت اور روپیہ ضائع ہوتا ہے لیکن اس کا بیشتر اثر جامعہ کے علمی وقار اور وہاں کے اساتذہ کی قابلیت پر پڑتا ہے اور عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ غالباً طلبا کی تربیت ٹھیک نہیں ہوئی اس لیے وہ امتحانات میں اس معیار پر نہ اتر سکے جس پر اُن کو اترنا چاہئے تھا۔ ورنہ کیا وجہ کہ وہی طلباء جو پہلے زیادہ سے زیادہ تعداد میں کامیاب ہوتے تھے اب اسی جامعہ کی فضا میں تعلیم حاصل کرکے ناکامی کی طرف مائل ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ چند طلباء کند ذہن بھی ہوں گے لیکن بہ یک وقت اس قدر کثرت سے طلباء کی ناکامی کا سبب یقیناً ناقص تعلیم ہی ہو سکتا ہے دنیز۔۔۔۔۔ ایک بڑی وجہ کم قابلیت کے لوگوں کو کم مشاہرہ پر مامور کیا جانا بھی ہے جس کا مظاہرہ ہم جامعہ میں گذشتہ کچھ عرصہ سے دیکھ رہے ہیں کہ سررشتہ کی بچت کی خاطر ارباب جامعہ بلا لحاظ معیار تعلیم جدید تقررات کے وقت اساتذہ کو بجائے مقررہ مشاہروں پر مامور کرنے کے کم ماہوار پر مامور کر رہے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک اعلیٰ قابلیت کا انسان جس نے سالہا سال کی کوششوں کے بعد کسی خاص شعبہ میں خصوصی صلاحیت حاصل کی ہو وہ جامعہ کی فضاء سے کوسوں دور رہ کر کم سے کم مشاہرہ پر اپنی تمام ضروریات زندگی کو پورا کر سکے۔ لامحالہ اس کا اثر اس کی حاصل کردہ کامیابی پر، اس کی معیار قابلیت پر، اس کی صحت پر اور اس کے حوصلوں پر پڑیگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ طلباء کو اس معیار کی تعلیم نہیں دے سکے گا جس کی اس سے امید کی جاسکتی تھی۔ ترقی یافتہ ممالک کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ جس شخص سے جس معیار کا کام لینا چاہتے ہیں اس کے لیے اسی قسم کی سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں جن کے ذریعہ وہ شخص اپنا زائد سے زائد وقت بے فکری و اطمینان کے ساتھ اسی کام کے لیے دے سکے۔ ضرورت ہے کہ جامعہ کے علمی معیار کو بڑھانے کے لیے وہی انتظامات کیے جائیں جن کی وہاں ضرورت ہے ورنہ موجودہ حالات میں جامعہ کا تعلیمی معیار بجائے بڑھنے کے دن بدن گھٹتا ہی چلا جائے گا۔

جامعہ کی اسناد اور ان کی قدر افزائی | جوں توں کرکے جو لوگ جامعہ عثمانیہ سے اسناد حاصل کر لیتے ہیں

ان کو زندگی کی جدوجہد میں جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے ان کا تفصیلی ذکر تو ناممکن ہے لیکن اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ دیگر جامعات سے اسناد حاصل کرنے والوں کے مقابلہ میں ان کو بے حد شرمندگی، درحقیقت کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ ہماری جامعہ کے ارباب مقتدر ہی کا یہ تصفیہ شدہ امر ہے کہ ملک کی اعلیٰ خدمات کے لیے بیرون حیدرآباد کے طیلسانوں کو انھیں کے مقابل سند رکھنے والے جامعہ عثمانیہ کے طیلسانئین پر ترجیح دی جائے چنانچہ آئے دن ہم دیکھتے رہتے ہیں کہ اکثر محکہ جات میں یہی عمل ہو رہا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں تعلیم پانے والے سخت غلطی کرتے ہیں کہ وہ اپنا عزیز وقت، اور روپیہ اور محنت کو یہاں برباد کرتے ہیں اور زندگی کے آئندہ مراحل میں ان کو بیرون حیدرآباد کے طیلسانین کے مقابلے میں حقیر ہونا پڑتا ہے خصوصاً ایسی حالتیں جبکہ عثمانین کے لیے بیرون حیدرآباد ترقی کے کوئی مواقع نہیں ہیں۔ طیلسانین عثمانیہ کے لیے یہ حالات نہایت ہی افسوس ناک اور ناقابل برداشت ہیں ان حالات کے ازالہ کے لیے طیلسانین عثمانیہ کو بڑی سخت مہم اور شدید احتجاج کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ارباب جامعہ اپنے فیصلوں پر نظر ثانی فرمائیں میں سمجھتا ہوں کہ کسی قوم کے زوال اور اس کی پستی کی انتہا ہوتی ہے کہ اس قوم کے افراد کو اپنے اوپر بھروسہ نہ ہو اور وہ دوسروں کے آسرے اور سہارے کے بغیر اپنی زندگی کو دوبھر سمجھنے لگیں۔ بالکل اسی کیفیت کا مظاہرہ ہم جامعہ عثمانیہ کے مقتدر اصحاب اور ان کے فیصلوں میں بھی پاتے ہیں۔ ہماری جامعہ کے طیلسانین کی قابلیت کا ثبوت وہ افراد ہیں جنھوں نے بیرون ہند جاکر دوسری جامعات کے طیلسانین کے دوش بدوش تعلیم حاصل کرکے ان سے بڑھ کر اسناد اور خراج ہائے تحسین حاصل کیے ہیں اور جن میں سے بعض نے بین الاقوامی شہرت بھی حاصل کی ہے ایسی جامعہ کے طیلسانین کے لیے اس قسم کی نامناسب تجاویز کسی طرح مناسب نہیں ہیں۔

ذریعۂ تعلیم | جیسا کہ میں ابتدا میں لکھ چکا ہوں کہ ہماری جامعہ ہندوستان کی وہ پہلی جامعہ ہے جس نے اپنے ملک کی مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا حضرت سلطان العلوم خسرو دکن کے

دورِ سلطنت کا یہ ایک معجزہ ہے کہ جس چیز کا وہم و گمان بھی نہ تھا، جس چیز کو لوگ خواب سمجھتے تھے، اور جس چیز کو لوگ ناممکن خیال کرتے تھے اس کو حضرت جہاں پناہ نے اپنے ایک اشارہ سے عملی جامہ پہنا کر دنیا پر واضح کر دیا کہ خود ہندوستانی زبان ہی جو تمام ملک کی مشترکہ زبان ہے صحیح معنی میں جامعی تعلیم کے لیے سہل ترین، اعلیٰ ترین اور موزوں ترین زبان ہو سکتی ہے۔ اس خواب کو عملی جامہ پہنانے میں جو کاوشیں اور دقتیں شروع شروع میں واقع ہوئی ہیں ان پر عبور حاصل کر کے گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں ہماری جامعہ اوجِ کمال کو پہنچ چکی ہے۔ اور اس کی افادیت مسلّم ہو چکی ہے۔ اس کی تعلیم اور اس کا معیار اس درجہ پر پہنچ چکا ہے کہ اس کے فرزندان زندگی کی ہر جہت میں دیگر جامعات کے مماثل اپنی اہلیتوں کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اندرون و بیرون ہندوستان کے تمام ماہرینِ علم نے اس تجربہ خانہ کی تعریف و توصیف کی ہے۔ برخلاف اس کے اہل ملک و اربابِ مقتدر کا یہ خیال کہ اردو ذریعہ تعلیم ہونے کی وجہ سے جامعہ عثمانیہ کے طیلسانین انگریزی جامعات کے طیلسانین سے قابلیت میں کم ہوتے ہیں توجہ کا محتاج ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو ملک میں اردو جامعہ کے اردو جاننے والوں ہی کو مقابلتہً ہر موقع پر ترجیح دی جائے۔ تاکہ ان کی ہمت افزائی ہو اور قیامِ جامعہ کا مقصد پورا ہو۔

جامعہ کی انتشاری حالت: پچیس سال کی محنت و کاوش سے سینچی ہوئی یہ ہری بھری بار آور کھیتی گذشتہ چند سال سے کچھ ایسے طوفانی جھونکوں کا شکار ہو رہی ہے کہ جس کی وجہ سے اس کی نیک نامی بدنامی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ ہماری جامعہ کے لیے یہی اتہامات کیا کم تھے کہ اس کا ذریعہ تعلیم ٹھیک نہیں ہے، اس کا معیار اچھا نہیں ہے، اس کے فرزند نااہل ہیں، اس کی جڑیں کھوکھلی ہیں وغیرہ کہ اب وہاں کی بدنظمیوں کی وجہ سے اس کے وقار کو ٹھیس لگ رہی ہے۔ آئے دن طلباء و اساتذہ کے مناقشات، ان سے اربابِ جامعہ کے مقابلے، ان پر حکومت کی سختیاں، ان پر کمیشنوں کے طومار، ان پر قواعدِ چال و چلن کا نفاذ، ان پر کنٹرولرس کا تسلط، ان کو غنڈے پن کے خطابات، ان پر لاٹھی چارج اور ان کو بیجا سزائیں جامعہ کی فضا کو دن بدن

کمزور کرتی چلی جا رہی ہیں اور دشمنان و بدخواہان جامعہ کے لیے ان کے الزامات کو تقویت دینے میں یہ امور مزید امداد دے رہے ہیں ۔ ان سب امور کا باعث کیا ہو سکتا ہے؟ سوائے اس کے کہ جامعہ کے انتظامات میں مرکزیت اور موزونیت نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جامعہ کا انتظام ایک ایسی ہستی کے سپرد ہونا چاہئے جو جامعہ کے ہر طالب علم کو اپنی اولاد کے برابر سمجھے، اس کے ہر فعل کی ضامن ہو، اس کے اخلاق و کردار کی مصلح ہو، اس کی خوشی کو اپنی خوشی اور اس کے رنج کو اپنا رنج سمجھے۔ مگر جامعہ کی فضا میں آجکل ان امور کا بالکل فقدان ہے۔ میں تو اس حد تک خوف زدہ اور مشتبہ ہوں کہ ممکن ہے کہ ہماری جامعہ کے دشمن ہی ان امور کا باعث ہوں جو جامعہ کی صف میں گھس کر اپنے ارادوں میں کامیاب ہوتے نظر آتے ہیں ۔ اس نقطۂ نظر سے جامعہ کے حالات کی چھان بین نہایت ضروری ہے ۔ تاکہ جو لوگ اس کھیل میں ہاتھ بٹا رہے ہیں ان کی گرفت ہو سکے اور جامعہ کا یہ مکدر جلد سے جلد خوشگوار فضا میں بدل جائے ۔

طالب علم بہر حال طالب علم ہوتا ہے ۔ اس کی ناتجربہ کاری اور اس کی آزاد خیالی بعض وقت اس کو شرارتوں کی طرف مائل کر دیتی ہے ۔ مقابلہ کیجئے تو دیگر جامعات میں ہماری جامعہ سے کہیں زیادہ ایسے واقعات پیش آتے ہیں ۔ دور کیوں جائے علی گڈھ و بنارس ہی کو لے لیجئے ۔ اکثر مواقع پر وہاں کے طلبا نے ایسی فاش غلطیاں کی ہیں کہ جن کی سزائیں سخت سے سخت ہو سکتی تھیں ۔ مگر ارباب جامعہ کے تدبر اور تجربہ نے طلبا پر کبھی آنچ نہیں آنے دی ۔ ان کی جامعی تنبیہ اور تدارک ضرور کیا گیا ۔ لیکن ان کو پولیس یا کسی حکومت کے حوالہ کبھی نہیں کیا گیا ۔ اور نہ کبھی ان کو کورٹ آف لا میں جواب دہ ہونا پڑا ۔ جس سے ان کے اشتعال میں اضافہ ہوتا ۔ ان مواقع پر ارباب جامعہ کو ایسی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن سے حالات پر فوراً قابو پایا جا سکے نہ کہ اپنی معذوری کا اظہار کر کے پیچیدگیوں میں مزید اضافہ کرنا ۔ قواعد و قوانین سے زیادہ ان کا تدبر اور طریقۂ عمل ان موقعوں پر کارآمد ثابت ہو سکتا ہے ۔ چال و چلن کے قواعد وغیرہ طلبا کے ذہن پر بڑا اثر کرتے ہیں ۔ اور ان کے حریت پرستوں کے لیے تحقیر کا باعث

ہوتے ہیں کہ نہ معلوم جامعہ کی فضا کیسی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلبا ر حیدرآباد بتدریج دیگر جامعات میں شرکت کے کوشاں ہو رہے ہیں۔ قبل اس کے کہ اس رجحان میں اضافہ ہو حالات کو درست کرنے کی ازحد ضرورت ہے۔

جامعاتی کمیشن: جامعات کے معاملات میں کمیشنوں کا تعین بھی ہندوستان ہی کی خصوصیت ہے۔ اور اب حیدرآباد بھی اس سے فیض یاب ہو رہا ہے۔ جامعات کے معاملے نہ کبھی کمیشنوں کے ذریعہ طے ہوئے ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ طلبا ر اور اساتذہ کے تفرقوں میں اضافہ ہو، جامعہ کی فضا میں بدامنی بڑھے اور تعلیمی انتظامات میں خلل واقع ہو۔ ہماری جامعہ سے متعلق اب تک دو کمیشن بیٹھ چکے ہیں۔ ہر دو میں جامعہ اور ریلوے کا مسئلہ سب سے پہلے قابل غور تھا۔ لیکن پہلے کمیشن کا تو کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ اس نے کیا طے کیا اور دوسرے کمیشن کے نتیجہ میں اب تک صرف طلبا ر کے لیے ان سے وعدوں کے خلاف سخت ترین سزاؤں کا نفاذ عمل میں آیا ہے۔ باقی کی حد تک ہم تشنہ ہیں بالخصوص ریلوے کے مسئلہ کے متعلق جو اصل وجہ مخاصمت پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ ایک طرف سزاؤں کا فیصلہ کر کے کمیشن نے نہایت سختی ..... سے کام لیا ہے۔ دوسری طرف ارباب جامعہ نے ان سزایافتہ طلبا ر کو آخر تک مغالطہ میں رکھا اور تیسری طرف انھوں نے سزا کے اعلان کے وقت تفرقہ کن پالیسی اختیار کی۔ علاوہ ازیں اصحاب کمیشن کا طلبا ر کو غنڈے پن سے خطاب کرنا اہل ملک کے لیے باعث رسوائی ہے۔ اس لیے کہ انھیں کے نونہال جامعہ کے طالب علم بھی ہوتے ہیں۔ طالب علموں اور ان کے سرپرستوں کے لیے یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ ان کو ملک کے اخباروں میں غندوں سے خطاب کیا جائے اور اخبار فروش سڑکوں پر "جامعہ عثمانیہ کے طلبا ر میں غنڈاپن" پکارتے پھریں۔

انجمن اتحاد: جامعہ کی تعلیم کا ایک اہم ترین جز طلبا کی انجمن بھی ہوتی ہے جہاں اُن کو آپس میں اتحاد، مسائل حاضرہ پر بحث مباحثے مشاہیر عالم کے خیالات سے استفادہ کرنے کے مواقع اور علمی سرگرمیوں سے دلچسپی پیدا کرنے کے ذرائع حاصل ہوتے ہیں۔ انجمن ہی وہ جگہ ہوتی ہے جہاں سے

ملک کے لیے بہترین لیڈر۔ عمدہ مقرر اور موزوں شہری پیدا ہوتے ہیں۔ یورپ میں آکسفورڈ، کیمبرج کی جامعات کی انجمنیں اپنی آپ مثال ہیں۔ اور ہندوستان کی بھی اکثر جامعات کی انجمنوں نے وہ ہستیاں پیدا کی ہیں جن کا شہرہ چہار دانگ عالم میں ہے۔ انجمن طلبا ہی وہ ادارہ ہوتا ہے جہاں سے قابل افراد نکلتے ہیں۔ ہر جگہ کی انجمنوں میں قسم قسم کی شرارتیں اور شور و غل بھی ہوتے ہیں، انہیں کے عہدہ داروں کے اشاروں پر ہڑتالیں بھی ہوتی ہیں اور انہیں کے نمایندے بڑے بڑے پیچیدہ مسائل بھی حل کرتے ہیں مگر کسی انجمن کا وجود کبھی معرض خطر میں نہیں آیا۔

جامعہ عثمانیہ ہی پر یہ بھی ایک سیاہ دھبہ ہے کہ وہاں کی انجمن اتحاد ایک عرصہ سے مسدود ہے جس کی وجہ سے طلبا میں ایک سخت قسم کا ہیجان ہے۔ جس کا وہ اظہار نہیں کر سکتے اس لیے کہ انھوں نے اپنے آقائے ولی نعمت حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ کے آگے سر تسلیم خم کیا ہے۔ ورنہ طلبا، جامعہ کے اس ذہنی ارتقا، ادبی ماحول، علمی فضا اور مباحثی مرکز کے ختم کر دینے پر ان کے لیے جامعہ میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ ارباب جامعہ کو جلد سے جلد انجمن اتحاد طلبا کے دوبارہ قایم کرنے کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

<u>طلبا سے اپیل</u> برادران جامعہ۔ جامعہ عثمانیہ میں آپ کی تعلیم کا مقصد صرف جماعتوں کی چار دیواری میں چند کتابوں کا درس اور چند اساتذہ کا لکچر سنا نہیں ہے۔ بلکہ جامعہ سے آپ کو اپنی سیرت و کردار اور اپنی آئندہ زندگی کا لائحہ عمل تیار کرکے نکلنا ہے۔ آپ میں اتحاد و اتفاق، نظم و ضبط، اور غیرت و خودداری کے احساس کی ضرورت ہے۔ جامعہ کا معاملہ کسی کی ذات یا فرقہ کا معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ حیدر آبادی قوم کا معاملہ ہے۔ لہذا جامعہ کے معاملات میں آپکو ہمیشہ یکجان دو قالب رہ کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ آج کے طالب علم ہیں تو کل کے شہری۔ اگر آپ میں غیرت و خودداری نہو گی تو آپ ہمیشہ ذلیل و رسوا رہیں گے، اگر آپ متفق و متحد نہ ہوں گے تو آپ ہمیشہ اپنے مقاصد میں ناکام رہیں گے،

اگر آپ میں نظم و ضبط نہ ہوگا تو آپ ہمیشہ ٹھوکریں کھاتے پھریں گے۔ آپ کو چاہیے کہ آپ صرف حصول علم کو اپنا نصب العین بنائیں، اعلیٰ اخلاق و کردار کو حاصل کریں، اپنی شرافت کو ہاتھ سے جانے نہ دیں اور اپنے اساتذہ کی عزت و احترام کریں اور ان کے درجہ کو متزلزل نہ ہونے دیں۔ یہی امور آپ کو ترقیوں کے اعلیٰ زینوں پر پہنچائیں گے، اور آپ کی جامعہ کے وقار کو بڑھانے میں مدد دیں گے۔

خطاب بہ فرزندان جامعہ | جامعہ عثمانیہ کی زبوں حالی اور اس کی اصلاح کی بڑی ذمہ داری جامعہ کے فرزندوں پر بھی اسی حد تک عائد ہوتی ہے جس حد تک کہ ارباب جامعہ اور حکومت پر۔ فرزندان جامعہ کا یہ اولین فرض ہے کہ جس جامعہ سے وہ فیض یاب ہوئے ہیں اس کے وقار اور اس کی افادیت کو برقرار رکھنے کی حتی الامکان کوشش کریں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ جامعہ سے نکلنے کے بعد فرزندان جامعہ ایک ہی جامعہ کے سپوت ہونے کی حیثیت سے ایک مضبوط تنظیم میں منسلک ہوں اور اپنے حاصل کردہ علم و تجربہ سے متحدہ طور پر جامعہ کی اصلاح و ترقی کے مسائل میں ہاتھ بٹائیں بالخصوص ایسے وقت جب کہ جامعہ عثمانیہ کی اندرونی حالت طلباء اور ارباب جامعہ کے ناگفتہ بہ تعلقات کی وجہ سے ایک نازک درجہ پر پہنچ گئی ہے۔

انجمن طیلسانین | انجمن طیلسانین کے اغراض و مقاصد کا ایک اہم جز یہ بھی ہے جس کو روبہ عمل لانے اور اس کی آواز کو موثر بنانے کے لیے انجمن کی رکنیت میں وسعت پیدا کر دینے کی ضرورت ہے۔ فی الوقت ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کی انجمن ہونے کے لحاظ سے ملک میں اس کی جو اہمیت ہے، اس کا اندازہ انجمن کی سابقہ کارگذاری سے مل سکتا ہے۔ اس کی تاریخ شاہد ہے کہ طیلسانین کی یہی واحد انجمن ہے جس نے ملک کے معاشی سماجی اور اصلاحی مسائل کو ترقی دینے میں پہلا قدم اٹھایا اور بڑی حد تک کامیاب رہی۔ جامعہ عثمانیہ کے موجودہ مسائل سے بھی انجمن بے خبر نہیں ہے۔ جس کا ثبوت انجمن کی ذیلی کمیٹی کی وہ یادداشت ہے جو اس نے کمیشن کے سامنے پیش کی۔

جامعہ عثمانیہ کے حالیہ اختلافات | جامعہ عثمانیہ میں حالیہ جدید انتظام ارباب جامعہ کا ایک نہایت

خوش آئند اقدام ہے جس کے بعد ہم امید کرتے ہیں کہ جن حالات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ بہت جلد درست ہو جائیں گے۔ جناب سید محمد اعظم صاحب کی شخصیت ملک کے تعلیمی مسائل میں ایک اہم مقام رکھتی ہے اور آپ کے تجربہ و تدبر سے امید ہے کہ جامعہ عثمانیہ جلد سے جلد اپنا وہ مقام حاصل کرے گی جس کے ہم متمنی ہیں۔

میں معافی کا خواستگار ہوں کہ میں نے آپ کی بے حد سمع خراشی کی مگر میں چاہتا تھا کہ مختصراً آپ کے سامنے گذشتہ سال بھر کے واقعات کو پیش کر دوں تا کہ آپ ان پر اپنی آراء کا رہنمائیوں میں تحریر کریں۔

برادر محترم محمد عبدالرؤف صاحب ہماری اس کانفرنس کی صدارت فرما رہے ہیں جن کا استقبال کرتے ہوئے مجھے خاص خوشی محسوس ہوتی ہے۔ موصوف ہماری ہی جامعہ کے فارغ التحصیل ہیں آپ کی زندگی بزمانہ تعلیم بھی نہایت مصروف و کارآمد رہی ہے و نیز ایک آزاد پیشہ کو اختیار کر کے آپ نے اپنی زندگی کو بھی خدمت خلق کے لیے وقف کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ موصوف اپنے وسیع تجربہ کی بنا پر انجمن طیلسانین کے لیے صحیح راہ عمل متعین فرمائیں گے۔

میں پھر ایک مرتبہ آج کے مہمانوں کا اور بالخصوص عالیجناب فضیلت مآب سر صدر اعظم بہادر امیر جامعہ کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں کہ موصوف نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود فرزندان جامعہ کی انجمن کی سالانہ کانفرنس کے افتتاح کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا۔

محترم امیر جامعہ کا ہمیشہ ملک کے علمی اداروں سے نہایت پُرخلوص تعلق رہا ہے۔ اور آپ نے نوجوانان ملک کی درخواستوں کو شرف قبولیت بخش کر ہمیشہ ان کی ہمت افزائی فرمائی ہے۔

میں آخر میں اپنے ان ساتھیوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی امداد و تعاون اس کانفرنس کے انعقاد کے سلسلہ میں حاصل رہا اور عالیجناب امیر جامعہ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کانفرنس کا افتتاح فرمائیں۔

محمد یسین زبیری ام۔بی بی ایس (عثمانیہ)
ڈی پی ایچ (کلکتہ) میڈیکل پریکٹیشنر

خطبۂ صدارت

جو طیلسانین عثمانیہ کی گیارہویں سالانہ کانفرنس میں پڑھا گیا۔

عالیجناب امیر جامعہ، ڈاکٹر یسین زبیری، خواتین و حضرات!

انجمن طیلسانین کی صدارت پر میرا انتخاب ایک اتفاقی واقعہ ہے۔ اسے اتفاقی واقعہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے اپنی کوئی کابینہ نہیں پیش کی تھی لیکن میرے طیلسانی بھائیوں نے مجھے ایک کابینہ کے ساتھ بہ اتفاق آراء منتخب کر دیا۔ میں اس کا اہل نہ تھا یہ میں زیادہ بہتر جانتا تھا، لیکن آپ کے خلوص نے بہرکیف مجھے منتخب کر دیا۔ انتخاب اس گرانگری میں ہوا جب کہ میرے مخلص ساتھی ڈاکٹر رضی الدین کی کوششیں فرزندان جامعہ عثمانیہ کی برادری کو متحد کرنے میں کامیاب ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھیں اور یہی ایک بڑی وجہ تھی جس نے مجھے اس اہم ذمہ داری کو قبول کرنے پر مجبور کیا۔ آج مجھے اس کانفرنس کی صدارت کا فخر حاصل ہوا ہے جس کے لیے میں آپ کا شکر گذار ہوں۔

حالات حاضرہ | حضرات! انجمن طیلسانین کی یہ گیارہویں کانفرنس اپنے دامن میں تلخیوں کو لیے ہوئے آ رہی ہے۔ قبل اس کے کہ میں کچھ اور کہوں اس واقعہ کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سرزمین دکن کا مایۂ ناز فرزند ہم سے جدا ہو گیا۔ جامعہ عثمانیہ کی ترقی اور استحکام کا وہ متمنی تھا وہ جانتا تھا کہ قوم کی آئندہ کی سربلندی جامعہ عثمانیہ ہی پر منحصر ہے۔ اس کی نگاہیں ہمیشہ جامعہ عثمانیہ ہی کی طرف رہتی تھیں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ نواب بہادر خاں مرحوم جامعہ اور جامعی معاملات سے کس قدر قریب تھے آج ہم اس نعمت سے اپنی محرومی پہ جتنا بھی رنج کریں کم ہے۔

یہ کانفرنس ۲۳ امرداد کو ہونے والی تھی لیکن اس سانحۂ عظیم سے ہم میں اتنی سکت باقی نہیں رہی تھی کہ ہم اپنے مسائل پر غور کر سکیں خطبہ تیار ہو کر پریس جا چکا تھا۔ اس دوران میں جامعہ عثمانیہ میں ایک اہم تبدیلی ہوئی معین امیر جامعہ کو نائب امیر جامعہ کا لقب عطا ہوا اور نائب معین امیر جامعہ کا عہدہ برخاست کر کے، نائب معین امیر جامعہ کو معین امیر جامعہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔

حضرات! بعض محرکات بیک وقت مختلف اشخاص کے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کو حسن اتفاق ہی کہیے کہ میں نے اپنے اس خطبہ میں ایک ہمہ وقتی معین امیر جامعہ کی ضرورت پر بحث کی تھی اور بتایا تھا کہ منشور خسروی میں اس کی گنجائش ہے کہ عہدۂ صدر المہامی تعلیمات سے معین امیر جامعہ کے فرایض کو علحدہ رکھا جائے حکومت کے اعلامیہ کو دیکھ کر کہ اس میں انہیں الفاظ میں اس ضرورت کو ظاہر کیا گیا ہے مجھے یقین ہو گیا کہ جب قدرت کسی عمل کو ضروری سمجھتی ہے تو اس خیال کو مختلف دلوں میں پیدا کر دیتی ہے۔ موجودہ تبدیلی کے باوجود اہم مسائل اب بھی اس سلسلہ میں قابل توجہ ہیں جن کا میں معین امیر جامعہ کے عنوان کے تحت ذکر کروں گا۔

اس سے پہلے بھی جامعہ عثمانیہ کے مسائل پیدا ہوئے لیکن آج جب کہ یہ کانفرنس منعقد ہو رہی ہے ایک طرف سارا عالم جنگ کی ہولناکیوں سے متاثر اور اس میں مبتلا ہے۔ عالمگیر جنگ کی وجہ وقفہ وقفہ سے نئے میدان کارزار یا خطوط مدافعت قایم ہوتے جا رہے ہیں تو دوسری طرف ملک میں ناتہ بیریوں اور نا اہلیوں نے ایسے مسائل پیدا کر دیے ہیں کہ انسانی دل و دماغ کو سکون نصیب نہیں ہے۔

تاسیس جامعہ | حضرات! ۱۶ر ذیحجہ ۱۳۳۶ھ تاریخ دکن بلکہ تاریخ عالم میں وہ یادگار دن ہے جب کہ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے منشور خسروی عطا فرما کر جامعہ عثمانیہ کو وجود بخشا اور اپنے نام نامی اور اسم گرامی سے موسوم کر کے اس کو معتز و سربلند فرمایا اور یہ بھی

ایک وجہ ہے کہ حضرت جہاں پناہی کو اس جامعہ پر غیر معمولی شفقت اور اس سے محبت ہے۔
جامعہ کے قیام کے متعلق بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے لیکن میں نے اس عظیم واقعہ
کی یاد اس وجہ سے تازہ کر دی کہ اس منشور خسروی میں بعض اہم اور اساسی مسائل کا حل موجود ہے۔
مخالف قوتوں میں جب کہ ہندوستان کی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان کو
ادب، سائنس اور فنون میں سارے عالم کی ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پایہ کرنے کی کوشش
بعضوں کے نزدیک ایک خام خیال اور دل میں تڑپ رکھنے والوں کے لیے ایک کامیاب
تجربہ کی ابتدا ایک مبارک فال تھی۔ جامعہ عثمانیہ کو ابتدائی دور میں اپنی عظمت کو قایم کرنے
کے لیے کن کن قوتوں کا مقابلہ کرنا پڑا اس وقت میرا مبحث نہیں ہے وہ لوگ جو اس نقصان مایہ
اور شماتت ہمسایہ کے دورسے گذر چکے ہیں اس کو خوب جانتے ہیں۔ مادر جامعہ نے نونہال
پودوں کو ایسے ہی زمانہ میں سینچا مضحکہ اڑانے والوں اور اس تجربہ کو ناکام سمجھنے والوں کی
نظریں اگر آج بھی نیچی نہیں ہو سکیں تو ان کی غیرت مندی کے متعلق مجھے کچھ نہیں کہنا ہے اور
شاید اسی قسم کے لوگ ہیں جو آج بھی جامعہ عثمانیہ کے متعلق کوئی بُری خبر سُن لیتے ہیں تو خوش
ہو جایا کرتے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کا موجودہ دور | حضرات! غیر اہم واقعات کو غیر صحیح پروپگنڈے سے نقصان پہنچانے والوں
کی ابھی کمی نہیں۔ آفتاب پر دُھول اڑا کر خوش ہونے والوں کو خوش ہونے دیجئے لیکن ہم بھی
اپنے طور پر ایک پیہم یورش اور ایک مسلسل حملہ اور مادر جامعہ کی ہمدردی کے پردے میں
اس کو نقصان پہنچانے کی کوششوں کے اسباب پر غور کریں اگر ہم یہ محسوس کریں کہ فی الواقعی
جامعہ عثمانیہ کے قیام میں ایسی خامیاں رہ گئی ہیں یا اس کی اساس میں ایسی خرابیاں ہیں کہ
اب اس کی ناکامی کا دور شروع ہو گیا ہے تو ہم یقیناً اس کا حق رکھتے ہیں کہ اس جامعہ کے
سرپرست، بانی اور محسن اعظم حضرت اقدس و اعلیٰ کی بارگاہ میں معروضہ پیش کریں کہ جامعہ کو،
اُس جامعہ کو جس کے نام پر ہم کو فخر حاصل ہے جس نے ہماری زندگی سنواری خرابی اور ناکامی سے

سمجھائیں اس کی اساس میں ایسی تبدیلی فرمادیں کہ وہ زیادہ مستحکم بنیادوں پر قایم ہو جائے۔
حضرات : جامعہ عثمانیہ کی اساس اور بنیاد جن اعلیٰ نظریات وجذبات پر قایم کی گئی اس کا
اس قسم کا نقص رہ جانا جس سے جامعہ کے وجود کو بجائے خود نقصان پہنچ جائے اور اس کے
لیے خطرہ پیدا ہو جائے ناممکن ہے اگر تجربہ میں بعض اصلاحات کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے
تو اُن کو بآسانی نافذ کیا جا سکتا ہے مگر جو شکایات اب تک پیدا ہیں ان میں سے ایک کا بھی
تعلق اساسی اور بنیادی غلطیوں کے متعلق نظر نہیں آتا اس کا ابتدائی دور جن امنگوں اور کامرانیوں
کے ساتھ گذرا اس کو کون نظر انداز کر سکتا ہے ؟ آج ملک کی ہر جہتی فلاح میں کوشاں اور علم وادب
کو زیادہ فروغ دینے والے اسی مادر جامعہ کے فرزند ہیں اور ان ثبوتوں کو دیکھنے کے بعد
کون کہہ سکتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ میں کوئی بنیادی یا اساسی خرابی ہے ۔

حضرات ! میں پورے ایقان کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ سارے انتشار، ہیجان،
بے چینی، خدشات اور خطرات انتظام اور صرف انتظام کی خرابی کا نتیجہ ہیں میں کسی شخصیت
کی طرف اشارہ کیے بغیر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اتنے بڑے اور ذمہ دارانہ نظام کو زیادہ اچھی
طرح چلانے کی ضرورت ہے اس خرابی کی تفصیلات تو بہت ہیں اور ایسے موقع پر جب کہ رائل
کمیشن کی رپورٹ بھی ابھی سامنے نہیں آئی ہے میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا لیکن اتنا واضح
کر دینا ضروری ہے کہ معلم ومتعلم سرپرست اور اولیا، سب بے چین ہیں تعلیم یافتہ اہل ملک
کے قلوب جامعہ عثمانیہ کے متعلق مختلف اندیشوں سے معمور ہیں اور بُرے انجام کے
تصورات ہمارے قلوب کو بے چین کر رہے ہیں جامعہ کی مشنری میں چند پُرزوں کی خرابی اس مشین
کے تباہ کرنے کا باعث ہو رہی ہے ۔ اگر اب بھی ان پُرزوں کو درست نہیں کیا گیا تو
فولادی مشین کو نقصان پہنچ جائیگا ہمیں شکایت تو ان میکانکوں سے ہے جو پُرزوں کو درست
کرنے کی بجائے خود مشین کو خراب ہوتا ہوا دیکھ کر خاموش ہیں ۔ فوری اسباب پر غور کرتے
ہوئے کبھی ان بنیادی اسباب پر بھی غور کیا گیا جو ساری ہنگامہ خیزیوں کا باعث ہوئے

اگر رائل کمیشن نے ان مسائل پر غور کیا ہے تو غنیمت ہے ۔

مالیہ واقعات اور رپورٹ کمیشن | حضرات ! اس سال کا بہ تعلق جامعہ سب سے زیادہ اہم واقعہ بدبختی سے ایک قدیم کشمکش کا اعادہ تھا ۔ ابھی گذشتہ واقعات کے سلسلہ میں سر سبارائو کمیشن کی رپورٹ شایع نہ ہونے پائی تھی کہ ایک چھوٹا سا واقعہ بڑا سانحہ بن گیا پھر وہی دو حکومتوں کا تعلق، وقار، ڈسپلن، جامعہ عثمانیہ، مملکت آصفیہ کا موقف، کے مباحث پیدا ہوگئے غرض ہم اس کو اپنی بدبختی سمجھتے ہیں کہ معاملے نے جو رنگ اختیار کیا وہ بلاواسطہ اور بالواسطہ جامعہ عثمانیہ کے متعلق کئی ایک مسائل کا پیدا کرنے والا ثابت ہوا ۔ جامعہ سے باہر قصور کرنے والے لڑکے کو جامعہ نے سزا دی ۔ عدالت نے مجرم قرار دیکر ایک نوجوان طالب علم کو قانونی رعایت کا مستحق سمجھا اور چند طالب علموں کو عین امتحان کے وقت شرکت امتحان سے محروم کر دیا گیا ۔ فیصلہ جو کمیشن کی رپورٹ اور رائے کی توثیق ہے دلائل کے نقطۂ نظر سے کتنا وزن دار ہے اس کے متعلق کچھ نہ کہنا ہی بہت بہتر ہے ۔ واقعات اور فیصلہ دونوں آپ کے سامنے ہیں لیکن صحیح طریقہ یہ ہوتا کہ کمیشن کی پوری رپورٹ ہمارے سامنے ہوتی تاکہ ہم کمیشن کی اس رائے کے جواز یا عدم جواز پر غور کر سکتے ۔ اگر اس عمل سے ہمارے دل میں شبہات پیدا ہو رہے ہیں تو ایسے شبہات ہر طرح جائز ہیں ۔ جہاں تک اصول کا تعلق ہے بارگاہ خسروی سے شرف صدور لائے ہوئے احکام کی بنیاد پر معزز باب حکومت نے جو دائرہ تحقیقات معین فرمایا تھا اس کا تو اعلان ہوا لیکن حکومت سرکار عالی کے اعلامیہ سے جو ۱۴ر خورداد ۱۳۵۳ف کے اخبارات میں شایع ہوا یہ معلوم کرکے ہمارے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اس مُعلنہ دائرہ تحقیقات کے سوا خاص طلباء کو سزا دینے کے خاص احکام سے متعلق کمیشن سے خواہش کی گئی تھی کہ دوران تحقیقات میں اس سلسلہ میں جو معلومات حاصل ہوں وہ ان کی روشنی میں علیحدہ اپنی رائے مجلس اعلیٰ کو بھیج دے ۔

حضرات! ظاہر ہے کہ اس اعلامیہ کی رو سے چند خاص طلباء کے نام حکومت کی جانب سے کمیشن کو بھیجے گئے تھے تاکہ کمیشن ان خاص طلباء کو سزا دینے کے مسئلہ میں تحقیقات نہ کرے بلکہ احیاناً جو معلومات امور مفوضہ کی تحقیقات کے سلسلہ میں حاصل ہو جائیں ان کو پیش نظر رکھ کر علحدہ رائے حکومت کے سامنے نہیں بلکہ جامعۂ عثمانیہ کی مجلس اعلیٰ کے سامنے پیش کرے۔ معزز کمیشن کی رائے میں اساتذہ کی رائے کا بھی ذکر کیا گیا ہے ایسی رائے صرف اساتذہ ہی دے سکتے تھے۔ معزز کمیشن کو شہادت یا دستاویز طلب کرنے کا عدالتی اختیار عطا فرمایا گیا تھا اگر یہ اختیار تحقیقات کی اغراض کے لیے ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا کہ جامعۂ عثمانیہ کی فضا کو بگاڑنے والے طلباء کے مقابلہ میں اپنے محاذ کو مستحکم کرنے والے بعض اساتذہ پر جرح کا موقع دیا جاتا۔

حضرات! زمانہ کتنا بدل گیا شفیق استاد ماں باپ کے برابر کا استاد آج استغاثہ کر رہا ہے کہ بچوں کو سزا دی جائے یہ ہیں آج کل کے اساتذہ۔ ان اساتذہ میں ہم شفقت کو ڈھونڈتے ہیں کیا یہ ہماری غلطی نہیں ہے؟ ممکن ہے معزز کمیشن نے ان اساتذہ کا بھی ذکر کیا ہو اور اگر یہ ثابت ہو کہ ہنگاموں کا باعث وہ تغافل یا خود غرضی ہے جس کو ان اساتذہ نے جائز رکھا تو حکومت سے یہ بجا طور پر عرض کرنے کا حق ہے کہ ان کو سزا دینے کے لئے اس مسئلہ کو مجلس اعلیٰ کے سپرد کر دیا جائے۔

انجمن طیلسانین نے جامعۂ عثمانیہ کے حالات پر غور کر کے معزز کمیشن کے سامنے یادداشت پیش کر دی ہے جس میں ان حالات اور اسباب پر روشنی ڈالی ہے جس پر کمیشن کو توجہ فرمانی چاہیے۔ کمیشن میں معلوم ہوتا ہے کہ منظم طریقہ پر اساتذہ کی جانب سے شہادت ہوئی اگرچہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بلا حلف کے تھی طالب علموں میں سے صرف وہی پیش ہوئے جن سے کمیشن کچھ مخصوص سوالات پوچھنا چاہتی تھی غرض کمیشن نے رائے یقیناً اس روداد پر قایم کی ہوگی جو یکطرفہ اس کے سامنے آئی اور غالباً یہی وجہ ہے کہ رائے کے قایم کرنے میں

کمیشن کو بھی تسامح ہوا۔ مثلاً ایک طالب علم کے معاملہ میں جو بیان کمیشن کا تھا اس کی تردید فوراً اس طالب علم نے کردی اور یہی تردید اس کے اخراج کی ایک وجہ ہوگئی۔

حضرات! مجلس اعلیٰ سے ہمیں شکایت ہے کہ اخراج کی سزا دو آتشہ ہوگئی جب کہ ایک طرف طلبا سے امتحان کی شرکت کی فیس لے کر ان کو امتحان میں شرکت کی اجازت دے دی گئی تھی اور اس عمل سے طالب علموں کو محنت کرنے کا موقع دیا گیا تھا اور دوسری طرف عین امتحان کے موقع پر ان کو شرکت امتحان سے روک دیا گیا۔

مجلس اعلیٰ اپنے وسیع ترین اختیارات کے لحاظ سے سب کچھ کر سکتی ہے لیکن عین ایسے وقت میں جب کہ طلبا امتحان کے ہال میں جا رہے ہوں اس خبر نے دلوں پر جو اثر پیدا کیا اس سے مجلس اعلیٰ کے ارکین ناواقف نہیں رہ سکتے تھے۔ اس موقع پر طلبا کا ضبط و نظم یقیناً قابل تعریف ہے اگر طلبا جذبات میں بہہ جانے والے ہوتے تو اس موقع سے زیادہ جذبات کو برانگیختہ کرنے والا کوئی واقعہ نہ تھا مجلس اعلیٰ کی اس میں کیا مصلحت تھی آج تک ہم اس کے وجوہ تلاش کر رہے ہیں لیکن مطمئن نہیں ہو سکے۔

حضرات! جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا کہ جامعۂ عثمانیہ کے اساسی اور بنیادی مقاصد میں کوئی ایسا نقص نہیں ہے جس کی وجہ آج یہ کہا جا سکے کہ جامعہ عثمانیہ ناکام ہو رہی ہے میں یقین دلاتا ہوں کہ جامعہ عثمانیہ قطعاً ناکام نہیں ہے وہ کامیابی کے راستہ پر گامزن ہے، وہ ترقی کر رہی ہے اور اس کو ترقی کرنا ہے منزل تک پہنچنے میں راستے کی خرابی تیز و تُند ہوا کے جھونکے طوفان باد و باراں اس کی منزل کو کھوٹا تو کر سکتے ہیں لیکن جادۂ منزل سے ہٹا نہیں سکتے۔ یہ مسلمہ ہے کہ جو بھی خرابی ہے وہ تنظیمی قوتوں کی کمی کا نتیجہ ہے ناخداؤں کے غلط عمل سے کشتی ڈگمگانے لگتی ہے۔ لیکن ایک اچھی ہوا کا جھونکا اور ایک صحیح لمحۂ فکر اس ڈگمگاتی کشتی کو سیدھے راستے پر لے جا سکتے ہیں۔ اس میں کشتی کا کیا قصور ہے؟ کشتی کے بیٹھنے والوں کی کیا غلطی؟ لیکن ناخدا کی غلطی بہرحال اس کو خطرہ میں ڈال سکتی ہے

آیئے ہم احتجاج کریں اور اس کشتی کے بنانے والے سے خواہش کریں کہ اس کشتی کو پار لگانا ہو تو ملاحوں کو بدل دے۔

ملک میں عام طور پر جامعۂ عثمانیہ کے متعلق مختلف خیالات کا اظہار ہو رہا ہے اگر کمیشن نے ان غلط راستوں سے چلانے والے ملاحوں کو بدل دینے کی رائے دی ہے اور اس رائے کو مجلس اعلیٰ اور حکومت اسی قدر وقیع سمجھ کر منظور کرے جیسا کہ طلباء کے متعلق کیا گیا تھا تو ہم سمجھتے ہیں کہ جامعہ کا بیڑا پار ہوگا۔

مولوی سید محمد اعظم صاحب جو خود بھی رائل کمیشن کے ایک رکن تھے ان کو معین امیر جامعہ بنا کر جامعہ کے انتظامات کے لیے غالباً اسی ضرورت کو پورا کرنے بھیجا گیا ہے اس کو ہم ایک مبارک فال سمجھتے ہیں ہمیں یقین ہے کہ مولوی سید محمد اعظم صاحب اپنی انتظامی قابلیت سے پیدا شدہ مسائل کو سلجھانے میں مفید ثابت ہوں گے۔

حضرات! بے موقع شفقت اور بے محل سختی کالج کے طالب علم کے لیے برابر کے خطرناک اثرات پیدا کرتی ہے۔ ہم اس کے قائل ہیں کہ جامعہ میں ڈسپلن قایم رکھنے کے لیے ایسے طلباء کو ضرور سزا دینی چاہئے جو اس ڈسپلن میں رخنہ اندازی کرتے ہوں اور یہی وجہ ہے کہ نظم و ضبط کو قایم رکھنے کے لیے اس سے پہلے طالب علموں کو سزا دی گئی تو کبھی اس پر ناراضگی کا اظہار نہیں کیا گیا لیکن یہ بھی درست نہ ہوگا کہ جامعی وقار اور عزت نفس کو دوسروں کی غلطی سے پھسلتا ہوا دیکھ کر طالب علم کو موت کی خاموشی پر مجبور کیا جائے۔ اگر کالج کی فضا نے طالب علم کو عزت نفس کا سبق نہیں پڑھایا تو پھر ایسی تعلیم جو ذہنی غلامی میں مبتلا کرتی ہو بے سود ہے۔

موجودہ واقعات کے جواز یا عدم جواز پر روشنی ڈالے بغیر ہم نے ایک اصولی بات کہہ دی۔ جامعہ میں اگر استاد طالب علم کا خیال رکھے تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ کوئی طالب علم اپنے استاد یا جامعہ کی کسی ہستی کا اتنا ہی احترام کرے گا جس کا وہ مستحق ہے۔

اس لیے ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ کالج سے ایسے اشخاص علٰحدہ کر دیے جائیں جو اعلیٰ ملازمتوں کی تلاش میں طالب علموں سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں یا جن کے دیگر کاروبار اور نفع اندوزی یونیورسٹی کالج کے لیے بدنما دھبہ بن کر استاد سے طالب علم کو متنفر کرتی چلی جا رہی ہے

حضرات! کمیشن کے تقرر اور اس کی رپورٹ مرتب ہو جانے کے بعد کوئی موقع نہیں ہے کہ میں حالیہ واقعات کے اسباب و علل آپ کے سامنے بیان کروں لیکن میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ہر واقعہ اپنے پیچھے ایک تاریخ رکھتا ہے اور چند واقعات کا حامل ہے اور بعض ناتجربہ کاریوں اور ناعاقبت اندیشیوں کا نتیجہ مجھے کہنے دیجیے کہ یونیورسٹی میں نہ تو طالب علم کے قلوب مطمئن ہیں اور نہ پروفیسروں کے ضمیر۔ طلبا کی اس سے زیادہ اور کیا بدبختی ہو سکتی ہے کہ فرمان مبارک کا نام لے کر ان کی انجمن اتحاد کے دستور کو ان سے چھین لیا گیا اور آج تک ذمہ دار ارباب جامعہ نے اتنی بھی پروا نہیں کی کہ طالب علم کے اس حق کو واپس دلایا جائے اس سے کون انکار کرے گا کہ طلبا میں انتشار پیدا کر کے اور ان کے اتحاد کو توڑ کر ارباب جامعہ کا یہ خواب کہ وہ قوت حاصل کر کے یونیورسٹی میں ڈسپلن قایم کریں گے غلط ہے اگر وہ طالب علم سے مل کر اور ان کے اتحاد کو مستحکم کر کے ڈسپلن قایم کرنا چاہیں تو بہت آسان ہے ورنہ دونوں کی منافرت کی خلیج بڑھتی ہی جائیگی یاد رکھیے کہ اخلاق قواعد کے ذریعہ سے نہیں سکھلائے جا سکتے۔ طالب علم کو مزنے کے بھوت سے ڈرا کر درست نہیں کیا جا سکتا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طالب علموں کے معصوم قلوب بڑوں کی شفقت و التفات کے طالب ہیں تاکہ ادب اور تعمیل حکم کا فریضہ پورا کیا جا سکے کتنے مواقع ایسے آئے کہ ذمہ دار ارباب جامعہ کی ایک ہمدردانہ حرکت اور ایک مشفقانہ [illegible] [illegible] [illegible] اس بدبختی کو کیا کریں کہ صحیح مقام پر صحیح اشخاص کے منتخب نہ ہونے کی غلطی طالب علموں کو [illegible] کالج سے باہر [illegible] کو [illegible] پر مجبور کرتی رہی۔

[illegible]

ضروری مسائل پر آپ کی توجہ منعطف کرانا ضروری سمجھتا ہوں۔

معین امیر جامعہ عثمانیہ

حضرات! تاسیس جامعہ کے تعلق سے منشور خسروی کے ایک مسئلہ کے متعلق جو اس نازک موقع پر بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے میں آپ کی توجہ کا طالب ہوں اگرچہ امیر جامعہ جہاں تک کہ جامعہ کی نگرانی اور اس کو چلانے کا تعلق ہے سب سے بڑے اقتدار کے حامل ہیں لیکن صدر اعظم باب حکومت کو اس عہدہ پر بحیثیت عہدہ سرفراز کیے جانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ باوجود وسیع ترین اقتدار کے جامعہ کو عملاً چلانے کا کام معین امیر جامعہ عثمانیہ کے ذمہ ہے اور یہ عہدہ اسی لیے قایم کیا گیا ہے کہ منشور خسروی اور اس کی بنا پر قایم کیے ہوئے ضوابط کی تعمیل کرائی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ معین امیر جامعہ کو وزارت کے ساتھ مختص نہیں فرمایا۔ باوجود وسیع اختیارات معین امیر جامعہ کو دیے گئے ہیں اور جو ذمہ داریاں ان پر عائد کی گئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جامعہ کی حکومت کی مشنری کامیاب طور پر چلانے کے لیے معین امیر جامعہ سب سے زیادہ ذمہ دار ہیں۔ نواب سر مہدی یار جنگ بہادر اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ جامعہ عثمانیہ کو چلانے میں پوری پوری توجہ فرماتے رہے ہیں جس کا سب کو اعتراف ہے لیکن وزارت کی گراں بار ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس عظیم الشان کام کے لیے کوئی وزیر تعلیمات اپنا پورا وقت کیسے دے سکتا تھا۔ جامعہ کا نظام ایک ہمہ وقتی معین امیر کا طالب تھا۔ اس لیے یہ خواہش بیجا نہ تھی کہ جامعہ عثمانیہ کے لیے جب کہ وہ ایک نازک دور سے گذر رہی ہے ایک ہمہ وقتی معین امیر کا تقرر فرمایا جانا ضروری ہے اور اس عمل سے بہت سے مسائل حل ہو جائیں اور بیشتر مسائل جو صدر اعظم بہادر کے امیر جامعہ اور ان کے رفیق وزیر تعلیمات (معین امیر جامعہ) اور اسی نسبت سے نائب معین امیر جامعہ کے باہمی تعلق سے سرکاری بن جایا کرتے تھے جامعہ ہی میں حل ہوں اور جس تمنا سے جامعہ قایم ہوئی تھی وہ پوری ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری بار بار کی آواز نے اثر کیا اور حکومت نے اس مسئلہ پر بروقت توجہ کی اور معین امیر جامعہ کو وزارت تعلیمات کے گراں بار فرائض سے سبکدوش

کرکے ایک ہمہ وقتی معین امیر جامعہ مقرر فرمایا اور جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ وزیر تعلیمات نواب سر مہدی یار جنگ بہادر کو بجائے معین امیر جامعہ کے نائب امیر جامعہ کا عہدہ دیا گیا جو مجلس اعلیٰ کی صدارت فرمائیں گے۔ نائب امیر کے عہدہ کے قیام کی ضرورت کیوں باقی رہی یہ ہم پر واضح نہ ہوسکا۔ بجز اس کے کہ امیر جامعہ کی بجائے اُن کی عدم موجودگی میں صرف مجلس اعلیٰ کی صدارت مقصود ہے۔ بحیثیت عہدہ اس جائداد پر تقرر سے کوئی اہم دستوری سوال نہیں پیدا ہوتا لیکن ہم یہ ضرور واضح کردینا چاہتے ہیں کہ معین امیر جامعہ کو بہت زیادہ آزاد ہونا چاہیئے اور مولوی سید محمد اعظم صاحب سے کمیشن کے رکن کی حیثیت سے بڑی توقعات تھیں ہم نہیں جانتے کہ کہاں تک وہ پوری ہوئیں لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ بحیثیت معین امیر جامعہ انہوں نے ایسے وقت میں جائزہ لیا ہے جب کہ بے چینی پیدا ہے۔ جامعہ کی تنظیم کے نقائص کو تفصیل سے جانچنے کی ضرورت ہے۔ بحیثیت رکن کمیشن سید محمد اعظم صاحب نے جو معلومات حاصل کیں اکثر و بیشتر ایسی ہوں گی جس کا تطابق اصلی واقعات سے نہ ہوسکتا ہو۔ غرض طالب علم کے عزت نفس اور اساتذہ کے فرائض یہ وہ اہم عنوانات ہیں جس سے بہت سی خرابیوں کا علاج کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں یہ بھی یقین ہے معین امیر جامعہ اپنے تدبر سے طالب علم کے کسی معاملہ کو سرکاری نہیں بننے دیں گے اور ہمہ وقتی معین امیر جامعہ کے عہدہ صدرالمہامی تعلیمات سے علحدہ کیے جانے کا ایک بڑا فائدہ ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں۔

<u>انجمن طیلسانین و انجمن طلبائے قدیم</u> حضرات! دوسرا اہم مسئلہ جس کے متعلق توجہ دلانی ہے یہ ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے باہر جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی دو جماعتیں ہیں جن کے تصفیہ نامرضیہ کو ختم کرکے ایک کرنے کا احساس تو سب میں موجود ہے لیکن ڈاکٹر رضی الدین کی انتھک کوشش اور باوجود اس کے کہ دونوں جماعتوں کے جلسہ ہائے عام نے اس قصہ کو ختم کرنے کا قطعی تصفیہ کیا تھا آج تک دونوں جماعتیں ایک بن کر عثمانین کی متحد اور مستحکم جماعت نہ بنا سکیں

جز طلبانین
میں اپنی صدارت انجمن طلبا نین کو ناکام سمجھوں گا اگر میں ایسے اتحاد کی جس کی خاطر میں نے
صدارت قبول کی ہے تکمیل نہ کر سکوں مجھے کسی کے متعلق کچھ کہنا نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی
بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ ہمارے فکر و عمل میں یکسانیت پیدا کر دے۔ ابھی دونوں انجمنوں
کے لیے یہ مسئلہ اہمیت رکھتا ہے لیکن تاویلات کی ہمیشہ گنجایش ہے یہ سوال نیتوں کا ہے
اگر ہمارا خلوص اور عمل ہم آہنگ ہو تو اتحاد بہت آسان ہے کیا اچھا ہو کہ ہم سب مل کر
ایک ہو جائیں اور کام تقسیم کر کے ایک مقصد کے لیے آگے بڑھیں۔

ذرایع آمد و رفت حضرات ! جامعہ عثمانیہ کے واقعات کے رونما ہونے کا ظاہری سبب
آمد و رفت کا مسئلہ ہے۔ ریلوے کے حدود اور شہر حیدرآباد کے مختلف مقامات سے جامعہ عثمانیہ
کو پہنچنے کے حدود۔ ریلوے اسٹیشنوں میں سرکار عالی کا قانون نافذ نہیں ہے نہ صرف
پولس بلکہ عدالت بھی برطانوی ہند کے قانون کی پابند ہے اور مقدمات سکندرآباد کی
عدالت میں پیش ہوتے ہیں جس کی وجہ سے جو مسائل دونوں حکومتوں کے مابین پیدا ہوتے ہیں
وہی غیر اہم واقعات کو اہم بنا دیتے ہیں جہاں تک آمد و رفت کے ذرایع کا سوال ہے
یہ تصور کہ صرف ریلوے ہی کی جانب سے انتظام ہو سکتا ہے غلط ہے محکمہ ریلوے منافع ہی
سے اس کام کو چلاتا ہے جب بہ تعلق ریلوے دو حکومتوں کے مابین مسائل پیدا ہو جاتے ہیں تو
کوئی وجہ نہیں ہے کہ خود جامعہ عثمانیہ کی جانب سے ایک شعبہ قایم کر کے اس اہم ضرورت
کو پورا نہ کیا جائے۔ یہ بجائے خود مستقل اور اہم مسئلہ ہے کہ ہماری حکومت اور ہماری عدالتوں
کو ان حدود میں بھی اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ موجودہ اغراض کے لیے مجھے اس پر بحث
کرنی نہیں ہے۔ اگر جامعہ عثمانیہ کے ذمہ دار اصحاب اس شعبہ کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے
لیے تیار نہیں ہیں تو بہت آسان ہے کہ ملک کے دوسرے اشخاص کے ذمہ یہ کام کر دیا جائے
اور اس پر راست نگرانی جامعہ اور طلبہ کی رکھی جائے اس مسئلہ کو اس قدر مشکل سمجھا جا رہا
ہے کہ انسدادی تدابیر پر تو بڑی خیال آرائیاں کی جاتی ہیں لیکن کبھی جدید انتظامات آمد و رفت کے

امکان پر غور نہیں کیا جاتا۔ اسی سلسلہ میں جامعہ کے وقار اور اس کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے جامعہ یا اس کے طلباء کے مسائل اور واقعات کو دوسری عدالتوں کے سپرد کرنے اور عوام کے ہاتھوں میں دینے سے پہلے یونیورسٹی کورٹ میں ایسے مسائل طے پانے چاہئیں جس کے قیام کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی ہے جس پر باوجود وعدے کے اب تک جامعہ نے غور کرنے کی تدابیر اختیار نہیں کیں۔

جامعہ عثمانیہ میں اقامتیت کے مطالبات

حضرات! تعمیر دارالاقامہ کے مسائل گذشتہ دور میں ہر موقع پر زیر بحث رہے ہیں انجمن طیلسانین اور اس کے کانفرنسوں میں اس کے متعلق احتجاج ہوتا رہا اور انتظام کا فقدان اس کی بڑی وجہ ظاہر کی جاتی رہی لیکن یہ مسئلہ مختلف شکلوں میں رونما ہوتا رہتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اکثر جامعات میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کا انتظام یونیورسٹی کالج سے علیحدہ طور پر کیا جاتا ہے لیکن جامعہ عثمانیہ میں نہ تو ابتداء سے یہ مسئلہ پیش نظر تھا اور نہ اس کا کوئی موقع ہے اس لیے کہ جو کثیر اور بے شمار رقم جامعہ عثمانیہ کی عمارت کی تعمیر کے لیے صرف ہوا اور صرف ہو رہا ہے وہ یقیناً ایک محسن بادشاہ اور فیاض حکومت کی توجہ کا نتیجہ ہو سکتا ہے جس اچھی فضا کے پیدا کرنے اور اہل ملک کو جامعی اقامتی فضا سے مستفید ہونے کے مواقع پیدا کیے گئے آج ان کو باوجود عظیم الشان عمارات تیار ہو جانے کے اس استفادہ سے محروم کیا جا رہا ہے ہم نہیں جانتے کہ اس میں کیا مصلحت ہے لیکن ذمہ دار اصحاب سے جب اس کے متعلق گفتگو کی گئی تو وہ ہم کو مطمئن نہیں کرا سکے۔ جامعہ کی بیش قیمت عمارات یقیناً اس لیے نہیں ہیں کہ باہر سے آنے والوں کو معائنہ کرا کر جامعہ کی تعریف کرائی جائے تعمیر کاری اور حسن کاری کے نقطۂ نظر سے ایک تعمیر کار اور حسن کار کے لیے یہ دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں لیکن جو لوگ تعلیمی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں انھیں اس کا ضرور احساس ہو لیتا ہے کہ طلباء کی رہائش کے لیے بیش قیمت اور عظیم الشان اقامت خانے طلباء کی کثیر تعداد کو اس کے استفادہ سے محروم کر رہے ہیں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی وجہ انتظام کی بڑی وجہ

آمد و رفت کے ذرائع اور اقامت خانوں کی کمی کا مسئلہ ہے دوران جنگ میں یہ مناسب ہے کہ جو عمارات تعمیرات کی اغراض کے لیے حدود جامعہ میں حاصل کی گئی ان کو اقامت خانوں کی شکل میں مبدل کر دیا جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ سستی قسم کی عمارات جس میں شان سے زیادہ آرام ہو اقامت خانوں کے لیے تعمیر کی جائیں اور ان میں اخراجات خورد و نوش کم سے کم رکھے جائیں ابھی ہمارے دوسرے شہری کالج، عمارات، کتب خانے اور کھیل کے میدانوں کے لحاظ سے اس قابل نہیں ہیں کہ ان میں طلباء کی کثیر تعداد تعلیم پا سکے جلتی ماہرین فن ہی اس کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں کہ چادر گھاٹ کالج کی عمارت جس گنجان محلہ میں ہے اس میں بڑی تعداد میں طلباء اور اساتذہ کا دن بھر رہنا مناسب ہے یا نہیں غرض میں سمجھتا ہوں کہ دونوں وجوہ بھی ایسے ہیں جن کا انتظام بآسانی کیا جا سکتا ہے۔

طیلسان حاصل کرنے تک یقیناً چار سال کا زمانہ ایسا ہو سکتا تھا جس کو جامعی ماحول سے استفادہ کرنا کہا جا سکتا ہے ہم مجلس اعلیٰ سے یہ خواہش کریں گے کہ ان مسائل کی طرف توجہ فرما کر کثیر تعداد میں طلباء کو اچھے استادوں کی صحبت اور اچھے کھیل کے میدانوں اور اچھے کتب خانے سے استفادہ کا موقع دیا جائے اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ اس سے طلباء کی یک جہتی اور اتحاد میں اضافہ ہوگا جو اچھی تنظیم کی موجودگی میں جامعہ کے لیے ایک نعمت ہے۔ اسی سلسلہ میں اس کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اساتذہ کو جامعہ کے حدود ہی میں مقیم رہنے کا پابند کیا جائے یہ سن کر تعجب ہوگا کہ خود مودب حدود جامعہ میں نہیں رہتے اس اقامتی طریقہ سے جو صحبت کالج کے اوقات کے سوا طلباء کو اچھے پروفیسروں کی مل سکتی ہے اس کی افادیت سے کون انکار کرے گا۔

اساتذہ کے غیر جامعی مشاغل حضرات! ایک زمانہ سے جامعہ عثمانیہ کے پروفیسروں میں ایک عجیب قسم کی امنگ پیدا ہو گئی ہے۔ ان میں سے بیشتر پروفیسر ہونے سے زیادہ کسی محکمہ کا ناظم ہونا پسند کرنے لگے ہیں اور یہ بدبختی اس درجہ پہنچ گئی ہے کہ جو لوگ خاص طور پر

سرکاری وظایف یا قرضہ سے کسی خاص فن کی تعلیم حاصل کر کے آتے ہیں ان کے تقررات ایسی جگہ کر دیے جاتے ہیں جن کا اُس شعبہ سے کوئی تعلق نہیں رہتا اور جامعہ اُن کے فیضِ علم سے محروم کر دی جاتی ہے۔

اعلیٰ عہدوں کے حصول کی دوڑ میں اب بہت لوگ نظر آنے لگے ہیں اور جو لوگ اس طرف مائل نہیں ہیں اُن میں سے بعض تو صنعتی کاروبار کرنے لگے ہیں اور بعض سُود بٹہ پر روپیہ چلاتے ہیں استاد کے متعلق یہ تصور ہے کہ اس کی زندگی حصول علم کی جویا ہوا کرتی ہے ایک طرف وہ معلم ہوتا ہے تو دوسری طرف متعلم۔ اس کی زندگی کے قیمتی لمحات علم کی پیاس بجھانے میں صرف ہوا کرتے ہیں نہ وہ مکانات بنا بنا کر زیادہ قیمت میں فروخت کرنے کا عادی ہوتا ہے نہ اُس کو اس کی فرصت۔ نہ وہ کمپنیاں قایم کر سکتا ہے اور نہ وہ چلا سکتا ہے نہ وہ پیروی کر سکتا ہے اور نہ حصولِ علم کی بجائے حصول زر کی اس کو خواہش ہوتی ہے۔ ایسے ہی استاد صحیح معنوں میں استاد ہوا کرتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ عزت کے مستحق ہوتے ہیں جس کی ہم کو آرزو ہے۔ ہم حکومت سے متوقع ہیں کہ جامعۂ عثمانیہ کے اساتذہ کو اس امر کا پابند کیا جائیگا کہ بجز پروفیسری کے وہ کوئی اور پیشہ انجام نہیں دیں گے یا کاروبار نہیں کریں گے اور کسی اور محکمہ میں کسی عہدہ کو قبول نہ کر سکیں گے ورنہ اس کے تو کوئی معنی نہ ہوں گے کہ ایک زمانہ کے بعد پروفیسر تجربہ کا حامل ہوتا ہے اور طلبہ کے حالات اور جامعہ کی فضا سے واقف ہونے لگتا ہے اور اس قابل ہوتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں پروفیسر کہلا سکے تو اس کو کسی انتظامی عہدہ پر بھیج دیا جائے ایک عہدہ دار کا مہیا ہونا تو آسان ہے لیکن ایک اچھے پروفیسر کا دستیاب ہونا مشکل۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جامعۂ عثمانیہ کے پروفیسروں کی تنخواہ کے مسئلہ پر بھی غور کرنا ضروری ہے یہ رجحان کہ ہر مخلوعہ جائداد کی تنخواہ کم کر دی جائے صحیح نہیں ہے پروفیسروں کے لیے ایسے ذرایع اور وسائل مہیا کیے جانے چاہئیں جن کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ دوسرے عہدوں کو

وصول کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

قوم تعلیم کی ترقی۔ حضرات! تاسیس یونیورسٹی کے موقع پر اعلیٰحضرت سلطان العلوم نے اپنے منشور عطا فرماتے ہوئے سب سے پہلے فقرہ میں اس امر کا اظہار فرمایا تھا کہ وفادار رعایا کی خوشحالی و بہبودی اصل مقصد ہے اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے ہماری موجودہ تعلیم کو بیرونی جامعات کے اثر سے قبل ملاحظہ تاب آزاد کر دیا جائے اور خود ملک ہی میں مقامی ضروریات اور حالات کے لحاظ سے ملکی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اس فرمان مبارک کا منشاء یہ تھا کہ جو ان سے قوت سے جن میں مملکت آصفیہ میں اعلیٰ تعلیم ناممکن ہے ہر صورت میں یہاں کی تعلیم کو باہر کی جامعات کے اثر سے آزاد رکھا جائے۔ نظام کالج کا مسئلہ اس سے پہلے کئی بار اٹھا اور ہر جگہ سے احتجاج ہوا لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں آج تک اس کی جانب توجہ نہیں کی گئی بجز اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک تعلق خاطر ہے جو ارباب حل و عقد کو اس مسئلہ پر غور کرنے سے روک رہا ہے ورنہ نظام کالج میں کسی شعبہ کی ایسی تعلیم تو نہیں دی جاتی جو دوسرے ملحقہ کالجوں میں نہ ہوتی ہو۔

حضرات! میں نے موجودہ حالات کو مختصراً آپ کے سامنے پیش کیا یہاں میں سمجھتا ہوں کہ جامعہ کے موجودہ انتظامات میں ایک انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اساتذہ کے مشاغل علمی اور جامعاتی مشاغل نہیں رہے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ اپنے چھوٹے بھائیوں کو بھی اس ذمہ دار مقام سے کچھ کہوں۔

برادران عزیز! اور جامعہ آپ کے اور میرے پاس بڑے احترام کی مستحق ہے اس کا وقار آپ کے طرز عمل سے قائم ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں اور میں اچھی طرح محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو بہت سی شکایتیں ہیں اور آپ کے غیر مطمئن دل آپ کو بے چین کر دیتے ہیں جامعہ کے حالات پر آپ کا دل دکھتا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے بلند سیرت اور عملی نظم و ضبط کی ضرورت ہے

اس لیے آئیے آپ ہم عہد کریں اور اپنی جامعہ کا واسطہ دے کر عہد کریں کہ ہم کوئی حرکت اپنی تعلیمی یا کالج کی یا کالج کے باہر کی زندگی میں ایسی نہ کریں گے جو اس جامعہ کے وقار کے خلاف ہو اپنی خانگی زندگی میں بھی ہر طالب علم کا فرض ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ وہ جامعہ کا تربیت یافتہ ہے آپ کا یونیفارم اس لیے نہیں ہے کہ صرف آپ میں یکرنگی پیدا کی جائے بلکہ وہ علامت ہے اس بات کی کہ آپ جہاں کہیں اس کو پہنے ہوئے ہیں آپ جامعہ سے اپنے تعلق کا اظہار کر رہے ہیں جامعہ ہم طلبا سے ایک اعلیٰ سوسائٹی چاہتا ہے ہم میں سے ہر ایک کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے خواہ اسٹیشنوں پر ہوں یا کھیل کے میدانوں میں خواہ سماجی محفل میں ہوں یا کہیں اور رہیں ہر وقت ہم دوسروں کے دلوں میں یہ احساس پیدا ہونے دیں کہ ہم جامعہ سے تعلق رکھتے ہیں آپ ہی بتائیے کہ تہذیب و شائستگی کی توقع آپ تعلیم یافتہ نوجوانوں سے رکھتے ہیں یا ان پڑھ عوام سے آپ نمونہ بن کر عوام کی شائستگی کے معیار کو بلند کیجئے آپ کی کالج کی زندگی اس قدر معیاری ہو کہ کبھی کسی کو اس کی جرأت نہ ہو سکے کہ آپ کی حق تلفی کرے آپ کے مطالبات صحیح ہیں اور جب تک ان کو نہ منوا لیں ہم خاموش نہ بیٹھیں گے یقیناً آئینی طریقوں سے ہم ان کو منوا کر ہی چھوڑیں گے ہماری طالب علمانہ شان اس کی مقتضی ہے کہ ہم اپنا محاسبہ کریں اور اپنے عیوب کو دور کرنے کی کوشش کریں میں یقین دلاتا ہوں کہ ہماری صداقت ہم کو کامیاب بنائے گی ۔ یونین ہم کو مل کر رہے گی ۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی انجمن اتحاد کے دستور کو آپ سے چھین لیا گیا ۔ روایات کے خلاف آپ کو ایسے دستور کے قبول کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے جس کو آپ قبول نہیں کر سکتے ۔ آپ خود رکھئے آپ کا دستور آپکو ملے گا آپ کی یونین آپ سے چھینی نہیں جا سکتی ۔ آپ میں [illegible] پیدا کرنے کی اور ان اختلافات سے فائدہ اٹھا کر تنظیم کو قائم کرنے کی تمام کوششیں ناکام رہیں گی آپ جس عزت نفس کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ مل کر رہے گی آمین ۔

پہلے خود دار تو مانند سکندر ہولے

پھر جہاں میں ہوس شوکت دارائی کر

حضرات ! میں آپ کا مکرر شکریہ ادا کرتے ہوئے بارگاہِ ربُ العزّت میں آپکے ساتھ دست بہ دُعا ہوں کہ

خدایا ! حضرت آقائے ولی نعمت ظلِ سبحانی سُلطان العلوم جن کو اپنی وفادار رعایا اور وابستگان دولت سے ہمیشہ محبت رہی ہے اور جن کے ایک حکم محکم نے جامعہ کو قائم کرکے ہماری زندگی سنواری ہمارے سروں پر تادیر قایم وسلامت رکھ اور حضرت والاشان ولیعہد پرنس آف برار وحضرت والاشان معظم جاہ بہادر و دیگر خانوادہ آصفی کی عمر میں ترقی عطا فرما۔ آمین

محمد عبدالروف بی۔ اے ال ال بی (عثمانیہ)

ایڈوکیٹ

روئیداد گیارویں عثمانیہ طیلسانین کانفرنس

گیارویں عثمانیہ طیلسانین کانفرنس کے اجلاس بتواریخ ۳ و ۴ رشہریور ۱۳۵۳ف بصدارت مولوی محمد عبدالرؤف صاحب بی۔ اے ال ال بی عثمانیہ ایڈوکیٹ صدر انجمن طیلسانین منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر لیسلین زبیری ام۔ بی۔ بی۔ ایس عثمانیہ ڈی۔ پی۔ ایچ کلکتہ نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ فضیلت مآب نواب صدر اعظم بہادر نے کانفرنس کا افتتاح فرمایا اور اپنے خطبہ بصیرت افروز میں ملک کی ہر جہتی ترقی اور حکومت کے آئندہ عزائم پر روشنی ڈالی۔

مولوی عبدالرؤف صاحب نے خطبۂ صدارت سنایا اعلیٰ حضرت فضیلت مآب خسرو دکن و برار سے قرار داد عقیدت کی منظوری کے بعد صدر کانفرنس نے طیلسانین عثمانیہ کے جانب سے مولوی سید محمد اعظم صاحب معین امیر جامعہ کو مبارک باد دی اور ان سے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور پھول پہنائے۔ مولوی محمد اعظم صاحب نے طیلسانین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس امر کا یقین دلایا کہ وہ جامعہ عثمانیہ کے مسائل کو بہتر طریقے پر حل کریں گے اس کے بعد صدر کانفرنس کی خواہش پر مولوی محمد اعظم صاحب معین امیر جامعہ نے عثمانین کی تصنیفات و تالیفات کی نمائش کا افتتاح فرمایا جو مولوی شرف الدین صاحب بی۔ اے عثمانیہ معتمد نمائش نے ٹاؤن ہال کے ایک گوشہ میں نہایت سلیقہ سے ترتیب دی تھی۔ کانفرنس کا یہ پہلا اجلاس نہایت کامیاب رہا اس کے علاوہ کانفرنس کے تین اور اجلاس مولوی عبدالرؤف صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئے جس میں معلومات آفریں مقالوں کے علاوہ تقریباً بالیس مفید تحریکات بھی منظور کی گئیں۔ کانفرنس اپنی کامیابی کے لیے مقامی صحافت اور انجمن کے سرگرم اراکین کے علاوہ نواب معین نواز جنگ بہادر کی بطور خاص مشکور ہے۔ کانفرنس کے اختتام پر ٹاؤن ہال

باغ عامہ میں ایک پُرتکلف عشائیہ بھی ترتیب دیا گیا تھا۔ راجہ بہادر پنڈت بشیشور ناتھ میر مجلس عدالت العالیہ اس عشائیہ کے مہمانِ خصوصی تھے۔ عشائیہ کے ختم پر راجہ بہادر بشیشور ناتھ نے اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی کی صحت کا جام تجویز فرمایا جس کو حاضرین محفل نے بکمال عقیدت نوش جان فرمایا۔ مولوی سید محمد اعظم صاحب معین امیر جامعہ عثمانیہ مولوی محمد عبدالرؤف صاحب مولوی ابوالحسن سید علی صاحب ایڈوکیٹ ڈاکٹر یسین زبیری مولوی محمد فاروق صاحب مولوی خواجہ محمد احمد صاحب اور معتمد کانفرنس نے دلچسپ تقریریں کیں اور صمد رضوی صاحب ساز نے دلگداز نظمیں سنائیں۔ نہایت قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ اس وقت پر معین امیر جامعہ کے محاذی صدر و معتمد انجمن اتحاد جامعہ عثمانیہ کے لیے وہ کرسیاں خالی چھوڑ دی گئی تھیں جو طیلسانین عثمانیہ کے اس اجلاس کے ترجمان تھیں اور جن [illegible] نہیں۔ اس عثمانیہ کے [illegible] کامیابی کا سہرا [illegible] شکر گزار ہے۔

[illegible] خاص طور پر وہ

[illegible]

ریاض احمد
معتمد کانفرنس

مجلس نمائش معاشی کمیٹی حیدرآباد دکن

حساب آمدنی و خرچ ختم ۳۱ / امرداد ۱۳۵۴ ف

اخراجات	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
تنصیب اسٹال						
ادا شدہ	۴۴۱۸	۱۳	-			
ادا شدنی	۲۱	۰	-	۴۴۳۹	۱۳	-
اخراجات برقی روشنی				۶۷۴۸	۱۰	
تشہیر و طباعت						
ادا شدہ	۲۸۸۵	۱۳	۶			
ادا شدنی	۱۲	۰	-	۲۸۹۰	۳	۶
تفریحات						
سررشتہ ریلوے ۲۲۴۵ ۲۰۱۴						
مجلس نمائش ۶۰۶ - ۷ - ۹						
اداشدہ شعبۂ بازار ۹-۴-۴۰۵۸	۷۱۶۰	۱۰	۰			
امداد جنگ بتوسط سررشتہ ریلوے						
حیدرآباد فنڈ ریلیف کمیٹی	۱۰۰۰	-	-			
ٹروپ انٹرٹینمنٹ	۲۰۰	-				
احمد محی الدین فٹ بال ٹورنمنٹ	۴۰	۱۰	۱			
	۱۲۴۵	۴	۰			
کمی آمدنی	۸۲۷۲	۹	۴	۱۵۶	۱۱	۴
شعبہ فنون لطیفہ				۴۱۲	۱۰	۰
معاشی کانفرنس				۴۰	-	-
مظاہرات				۳۹۱	۲	-
اخراجات یوم خواتین				۶۳۶	۱۱	۱۰
امداد صناعان				۲۴۲	۱۳	۴
انعامات صناعان				۱۳۴۳	۸	۴
طعام رضاکاران						
ادا شدہ	۹۱۵	۱۰	۲			
ادا شدنی	۱۰	۰	۰	۹۲۶	۲	۲

اخراجات	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
اخراجات یوم افتتاح				۱۲۹۰	۱۰	۰
نمائش گلب				۱۰۰	۰	۰
[illegible] شو				۴۴		
نمائش اطفال				۵۰۰		
اخراجات (متفرقہ) سائنس اکاڈمی				۲۱۰		
انتظامات دفتر				۴۰۳۸	۶	۱۱
عملہ				۱۰۵۸	۴	۰
انعامات						
ادا شدہ	۱۱۰۱	۹	۰			
ادا شدنی	۱۳۸	۰	۰	۱۲۳۹	۹	۰
آبپاشی و آبرسانی				۴۰۰	۳	۰
روشنی				۷۲۵	۴	۶
متفرق				۱۴۰	۱	۲
فیس تنقیح حسابات				۳۰۰	۰	۰
بقایا ناقابل حصول				۱۶۰۸	۰	۶
مطالبات [illegible]				۶۴۳	۵	۰
زائد آمدنی بر اخراجات منتقلہ ذخیرہ عام				۱۱۶۲۳	۱۰	۳
میزان				۴۲۵۵۵	۵	۱۰

حسابات کی جانچ کی گئی درست پائے گئے فقط

دستخط (ڈی۔ کے۔ ڈھنگے اینڈ کمپنی)

رجسٹرڈ اکونٹنٹ اینڈ آڈیٹر

حیدرآباد دکن

مورخہ ۱۹ آذر ۱۳۵۵ف م ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۵ء

آمدنی	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
فروخت ٹکٹ داخلہ				٢٥٦٢٦	٨	٨
فیس شرکت وکرایہ اسٹال						
وصول شدہ	٦٣١٦	١٥	٠			
وصول شدنی	١٢٥۴	٩	٠	٧٥٧١	٨	٠
امداد از انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ				٨٠٠٠	٠	٠
عطیہ جات				٦١۴	٠	٠
چندہ رکنیت				٣٣٩	٠	٠
سود ومنافع						
وصول شدہ	٣٠٦					
وصول شدنی	٩٨	٥	٢	۴٠۴	٥	٢
میزان				۴٢٥٥٥	٥	١٠

فرد حاصل باقی بتاریخ ۳۱ امرداد ۱۳۵۳ف

مدات دیوانی	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
ذخیرہ عام						
باقی بتاریخ یکم شہریور ۱۳۵۲ف	۲۶۷۱۲	۲	۵			
اضافہ آمدنی بر اخراجات	۱۱۶۲۳	۱۰	۳	۳۸۳۳۵	۱۲	۴
ملی اخراجات				۶۹۵	۲	۰
منہا توضیعات اور شدنی				۴۹	۱۰	۰
صدر میزان				۳۹۰۸۰	۸	۴

ہم نے ۱۳۵۲ف کی باقی کی تنقیح مجلس کے دفاتر اور حسابات کی مدد سے کی ہے اور اس سلسلہ میں وہ سب معلومات اور کیفیتیں حاصل کی ہیں جن کی ہم کو ضرورت تھی ہماری رائے میں یہ فرد حاصل باقی مکمل صحیح اور قانون کے مطابق مرتب ہوئی ہے اس کی ہم نے علٰحدہ رپورٹ بھی پیش کی ہے۔ ہم نے ناظم صدقات مجلس کے دستخطات اور بیانات کے ذریعہ اس امر کا اطمینان کرلیا ہے فقط

(دستخط) وی۔ کے۔ [illegible] اینڈ کمپنی

رجسٹرڈ اکاؤنٹنٹس اینڈ آڈیٹرس

حیدرآباد دکن

مورخہ ۱۶ آذر ۱۳۵۳ف مطابق ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۳ء

نواب [illegible] صدر نشین — سید اکبر علی صاحب رکن مجلس عاملہ — مشتاق احمد خان صاحب نمائندہ معاشی کمیٹی ،،

اے کے [illegible] صاحب نائب صدر ،، — محمد [illegible] صاحب ،، — محمد عبدالرؤف صاحب ،،

شریف الدین صاحب معتمد اعزازی — سید علی صاحب ممبر ،، — خواجہ حمید احمد صاحب ،،

[illegible] صاحب نائب معتمد ،، — میر محمود علی صاحب ،، — حبیب الرحمان صاحب نمائندہ سررشتہ تجارت و حرفت

راجہ [illegible] صاحب خازن ،، — خواجہ محمد احمد صاحب ،، — خان بہادر احمد محی الدین صاحب صدر سال ماسبق

اثاثہ جائداد و سامان	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
نقد در دست و بنک						
نقد در دست	۱۷۹	۳	۳			
انجمن امداد باہمی طیلسانین عثمانیہ	۵۰۰					
حیدرآباد کوآپریٹو ڈومینین بنک لمیٹڈ ۱	۱۲۰۱۸	۱۴	۱۰	۱۲۶۹۸	۲	۱
تعمیر عمارت				۲۳۵۶	۰	۰
متفرجات و ڈاک ٹکٹ				۱۳۲	۱۲	۰
سرمایہ مشغول						
۱۰۲ حصص حیدرآباد اسٹیٹ بنک						
فی یک صد روپیہ مالیتی ۱۰۲۰۰ روپیہ	۱۴۱۲۶	۸				
۳ ٪ والے دس قطعہ پرامیسری نوٹس	۱۰۸۸	۸	۰	۱۵۲۱۴		
فی یک صد روپیہ مالیتی ۱۰۰۰ روپیہ						
فرنیچر						
ابتدائے سال میں ۱۷۱۳-۱۵-۲						
اضافہ بوجہ خرید سال حال ۱۱۷-۰-۰	۱۸۳۰	۱۵	۲			
کمی بوجہ مطالبات فرسودگی ۱۰ فی صدی	۱۸۳	۰	۲	۱۶۴۷	۱۵	۰
فلم البم اور تصاویر						
ابتدائے سال میں ۱۷۷۹-۱۱-۰						
اضافہ بوجہ خریدی سال حال ۲۰۰-۰-۰	۱۹۷۹	۱۱	۰			
کمی بوجہ مطالبات فرسودگی ۱۲ فی صدی	۲۳۷	-	۰	۱۷۴۲	۴	

اثاثہ جائداد و سامان	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
اشیائے گودان						
ابتدائے سال میں ۹۰۰۔۳۰۳						
کمی بوجہ فروخت ۱۲-۵-۶	۱۶۶	۱۳	۸			
مطالبات وصول ۱۰ فیصدی	۱۶	۱۱	۸	۱۵۰	۲	۰
پارچہ اور پردے						
ابتدائے سال میں	۴۲۲	۱۰	۲			
کمی بوجہ مطالبات وصول ۵۰ فیصدی	۲۰۶	۲	۲	۶۱۸	۸	۰
کتب						
ابتدائے سال میں	۱۰۳	۰	۰			
اضافہ بوجہ خرید دوران سال	۰۹	۵	۰	۲۹۲	۱۳	
حاشیہ ادب (قیمت کتب)				۴۰۲	۳	۲
پیشگی بمد مصنوعات				۴۴۵	۸	
ذمہ جات						
رقوم واجب الوصول	۳۳۵	۰	۰	۱۷۲	۸	۰
بابت سال حال	۵۵	۲	۱۱	۲۰۰	۲	۱۱
بیرونین دار						
[illegible]	۵۵	۱۱	۶			
[illegible]	۱۰	۰	۰			
[illegible]	۱۹	۸				
عبدالصمد صاحب	۲۹	۱	۰	۱۳۳	۴	۶
دیگر رقوم واجب الوصول شدنی						
بابت ۳۱ء	۴۵۳	۹	۰			
۳۲ء	۶۹۰	۱۲	۱۰			
۳۳ء	۱۴۷۲	۸	۰	۲۶۱۷	۱۳	۱۰
منافع وصول شدنی				۹۰	۵	۲
میزان				۲۹۰۰۰	۸	۸

حصۂ معاشیات

انجمن طیلسانین جامعہ عثمانیہ کا علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ

مدیر

محمد غوث ام ۔ اے ال ال بی (عثمانیہ)

مہتمم

محمد عبد العلی بی ایس سی ال ال بی (عثمانیہ)

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ آٹھ آنے

دفتر مجلہ طیلسانین نمائش گاہ باغ عامہ حیدرآباد دکن فون نمبر ۲۵۵۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجلہ طیلسانین حصۂ معاشیات

جلد ۵ شمارہ ۴ | اکتوبر ۱۹۴۴ء

فہرست مضامین

اشتہارات

جنگ کے معاشی وسائل

معاشیات جنگ کے مختلف مباحث کے سلسلہ میں قومی آمدنی کا تخیل بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ مختصراً یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ قومی آمدنی سے کیا مراد ہے اور اس کا اندازہ کس طرح لگایا جاتا ہے؟ ماہرین قومی آمدنی کی تعریف مختلف طریقوں سے کرتے ہیں اور یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس کو معلوم کرنے میں بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آسانی کی خاطر یہ کہا جاسکتا ہے کہ قومی آمدنی سے مراد حکومت کی آمدنی نہیں بلکہ جماعت کی مجموعی آمدنی ہے جس کا ایک حصہ حکومت بھی اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے حاصل کرتی ہے۔ کسی جماعت کی سال بھر کی مجموعی پیداوار اسکی قومی آمدنی ہوسکتی ہے۔ لیکن پیداوار میں صرف اشیاء کی تیاری ہی کو شامل نہیں کیا جاتا بلکہ وہ خدمات بھی شامل کی جاتی ہیں جو مقررہ مدت میں انجام دی گئی ہوں مثلاً ڈاکٹر، وکیل، پروفیسر، کلرک اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں کی خدمات کو بھی قومی آمدنی کا اندازہ کرتے وقت شمار کرنا پڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قومی آمدنی میں جماعت کے ہر فرد کی پیدا کردہ اشیاء اور انجام دی ہوئی خدمات شامل کرنا چاہیئے۔ جب کبھی جماعت کا کوئی فرد کوئی چیز پیدا کرتا یا خدمت انجام دیتا ہے اور اسکے صلہ میں اسے روپیہ حاصل ہو تو وہ قومی آمدنی میں اضافہ کرتا ہے۔ غرض قومی آمدنی میں جماعت کی ہر مفید اور قابل قدر جد وجہد شامل کی جاتی ہے۔

قومی آمدنی کا اندازہ لگانے کے لئے ماہرین شماریات عموماً دو طریقے استعمال کرتے ہیں۔ پہلے طریقہ میں جسکو پیدائش دولت کی شماری کا طریقہ کہا جاسکتا ہے ایک سال کے اندر جماعت کے تمام افراد جتنی بھی چیزیں پیدا کریں اور خدمات انجام دیں انکو شمار کرکے ایک طویل فہرست تیار کی جاتی ہے۔ اس طرح سے مجموعہ معلوم کرنے کے بعد زر کی شکل میں ہر چیز اور خدمت کی قدر ظاہر کی جاتی ہے۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے کے لئے پیدائش دولت کے مختلف شعبہ جات کی بڑی حد تک صحیح صحیح شماری

ہونی چاہئے۔ پیدائش دولت کے اعداد و شمار معلوم کرنے میں بہت سی دقتیں پیدا ہوتی ہیں اور
اخراجات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لئے بہت کم ایسے ممالک ہیں جہاں قومی آمدنی کو معلوم کرنے کے
سلسلہ میں اس طریقہ کو اختیار کیا گیا ہے۔ البتہ سویڈن اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں شماری طریقہ کو
اختیار کیا گیا ہے اور اعداد و شمار کی صحت کی وجہ سے صحیح نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ اکثر ممالک میں
پیدائش دولت کے اعداد و شمارات صحیح نہیں ہیں اس لئے ان ممالک میں دوسرے طریقہ یعنی طریقہ
آمدنی کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس طریقہ میں جماعت کے تمام افراد کی آمدنی کو معلوم کر کے مجموعی آمدنی
کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اس طریقہ [illegible] مختلف طبقات اور افراد
کی آمدنی کے صحیح صحیح اعداد و شمار معلوم ہو جاتے ہیں۔ انگلستان میں یہی طریقہ رائج ہے۔ وزارت
مزدوران مزدور طبقہ کی آمدنی کے اعداد و شمار تیار [illegible] مزدوروں کے علاوہ دوسرے
لوگوں کی آمدنی کا [illegible] انکم ٹیکس کے ذریعہ سے لگایا [illegible] کم لوگ رہ جاتے ہیں جو
ان دونوں گروہ [illegible] قومی آمدنی کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے
دوسرا طریقہ زیادہ آسان [illegible] معلوم ہو جاتا ہے قومی آمدنی اور قومی پیداوار
اصل میں ایک ہی چیز ہیں اس لئے دونوں [illegible] ہوتے ہیں۔

امن کے دنوں میں [illegible] قومی آمدنی یا قومی مقسوم کی تیاری میں
مصروف رہتے ہیں۔ معاشیین [illegible] ایک دو چیز بیان کر دیا
جنکی مدد سے قومی آمدنی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے [illegible] اور افراد کے درمیان اسکی
صحیح طریقہ پر تقسیم ہو سکے۔ [illegible] حالت میں تو [illegible] اشیا پیدا کی [illegible] پر
صرف کیا جاتا ہے اور باقی آمدنی [illegible] ترقی پذیر
معاشرہ میں قومی آمدنی کا ایک [illegible] غرض سے مختص کر دیا جاتا ہے
تاکہ مستقبل میں ان کی مدد سے قومی مقسوم کو [illegible] ضروریات اور
تعیشات کو پورا کرنے کا ذریعہ [illegible] کو پورا کرنے کے کام میں لایا جاتا ہے

ضروریات کے بعد جو کچھ بچے اس کے ذریعہ سے عوام کا معیار زندگی بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اچھی غذا استعمال کرسکیں، بہتر لباس پہن سکیں اور عمدہ مکانات میں رہ اور تعلیم حاصل کرسکیں، جنگ کے دوران میں قومی آمدنی کے اس حصہ سے جس کے ذریعہ سے معیار زندگی بلند کرنے کا کام لیا جاتا ہے جنگی ضروریات پوری کی جاسکتی ہیں۔

جنگ میں شریک ہونے والی اقوام کو اپنے بیکار عاملین پیدائش کو کام پر لگا کر قومی آمدنی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہاں ایک بات کا تذکرہ کرنا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ قومی آمدنی کا اندازہ زر کی شکل میں لگایا جاتا ہے اور یہی زر ایسا ذریعہ ہے جس کو اس سلسلہ میں اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اگر عام طور پر [illegible] اضافہ ہوجائے تو قومی آمدنی بھی خود بخود بڑھ جائے گی۔ لیکن حقیقی قومی آمدنی میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوگا۔ حقیقی قومی آمدنی سے مراد اشیاء اور خدمات ہیں۔ حقیقی قومی آمدنی میں اضافہ کے لئے اشیاء اور خدمات کا بڑھنا ضروری ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ جنگ میں شریک ہونے والی اقوام کو جہاں تک ہوسکے قومی آمدنی بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیئے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ حقیقی چیزوں اور خدمات میں اضافہ کیا جائے۔ آئندہ صفحات میں بعض مثالوں کے ذریعہ سے واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ کس طرح سے جنگ کی وجہ بعض اقوام کی حقیقی آمدنی بڑھی ہے یعنی چیزوں کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ ہندوستان کے اعداد و شمار کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے۔ ہندوستان کی قومی آمدنی قیمتوں کی سطح بلند ہونے کی وجہ سے محض زر کی شکل میں بڑھی ہے چیزوں اور خدمات میں تو کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا ہے۔

قومی آمدنی کے متعلق بعض بنیادی باتیں معلوم کرنے کے بعد جنگ جاری رکھنے کے لئے معاشی وسائل حاصل کرنے کے مختلف ذرائع سے بحث کی جائے گی۔ جنگ کے دوران میں بھی کسی ملک کے انسانی اور مادی وسائل وہی ہوتے ہیں جو امن کے زمانوں میں تھے۔ مقصد کی تبدیلی کی وجہ سے انکو ایک دوسری [illegible] تحویل پذیر کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ جنگ کے لئے معاشی وسائل چار مختلف ذرائع سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

(۱) پیدائش دولت میں اضافہ کے ذریعہ سے

(۲) عوام کے صرف میں زیادہ سے زیادہ کمی کر کے۔

(۳) اندرونی سرمایہ میں کم سے کم اضافہ اور اشیاء پیدائش کی اچھی طرح سے نگہداشت نہ کرنے سے

(۴) دوسرے ممالک میں لگے ہوئے دیسی سرمایہ کی تمسکات کو فروخت کر کے اور بیرونی ممالک کے افراد اور اداروں سے قرضے حاصل کر کے۔

(۱) پیدائش دولت میں اضافہ کا انحصار اس پر ہے کہ جنگ سے پہلے کس مقدار میں مختلف عاملین پیدائش بیکار تھے یا اپنی پوری مستعدی سے کام پر نہیں لگے ہوئے تھے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ امن کے وقتوں میں ہر ملک میں مزدوروں کی خاصی تعداد بے روزگار رہتی ہے یا بہت سے مزدور ایسے کام انجام دیتے ہیں جس کے لئے وہ زیادہ موزوں ثابت نہیں ہوتے اگر ان سے کوئی دوسرا کام لیا جائے تو پیدائش دولت کے نقطۂ نظر سے زیادہ مفید ثابت ہونگے۔ موجودہ جنگ شروع ہونے سے پہلے انگلستان میں بیکار مزدوروں کی تعداد ۱۵ لاکھ تھی۔ چونکہ جرمنی بہت پہلے جنگی تیاریاں شروع کر چکا تھا اسلئے وہاں اس قسم کے بے روزگار مزدور پائے نہیں جاتے تھے۔ ہندوستان میں بیکار مزدوروں کی کوئی حد نہیں ہے۔ بیکار مزدوروں کو کام پر لگا کر پیدائش دولت میں بہت کافی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ بعض دوسرے طریقوں کو بھی اختیار کر کے مزدوروں کی قوت پیدا آوری بڑھائی جا سکتی ہے۔ اوقات کار میں اضافہ کر دیا جائے۔ تعطیلات میں کمی کر دی جائے۔ مزدوروں کی رسد کو بڑھانے کے لئے عورتوں اور وظیفہ یاب مزدوروں کو بھی مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ بھی جنگی کاموں میں مدد دیں۔ جماعت کے ایسے افراد سے بھی جو معمولی حالات میں کسی قسم کا کام انجام نہیں دیتے اور اپنا وقت مختلف قسم کی تفریحات میں گذارتے ہیں قانوناً کام لیا جا سکتا ہے۔ لڑکے اور لڑکیوں کو وقت سے پہلے تعلیم ترک کر کے قومی نقطۂ نظر سے اہم کاموں پر لگایا جا سکتا ہے۔ مختلف قسم کے مزدوروں کی فنی تربیت کے ذریعہ سے انکی کارکردگی بڑھا کر انکی قوت پیدا آوری میں بھی بڑی حد تک اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح سے جنگ کے دوران میں دوسرے عاملین پیدائش سے زیادہ بہتر طریقہ پر کام لیکر

پیدائش دولت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ بیکار مشینوں کو کام پر لگایا جا سکتا ہے۔ کسی بدلی طریقہ کو اختیار کرکے ایک ہی مشین سے زیادہ دولت پیدا کی جا سکتی ہے۔ صنعتوں کی عقلی تنظیم اور ارتکاز کی پالیسی اختیار کرکے بھی پیدائش دولت بڑھائی جا سکتی ہے۔ اس پالیسی کے تحت صنعتوں کی نئی تنظیم کی جاتی ہے اور مختلف صنعتوں میں چھوٹے پیمانوں کی بجائے موزوں پیمانے قائم کئے جاتے ہیں۔ بیکار زمینوں سے بھی زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے۔ مندرجہ بالا طریقوں کو جنگ کے دوران میں پیدائش دولت اور قومی آمدنی کی سطح کو زیادہ سے زیادہ بلند کرنے کے سلسلہ میں اختیار کیا جاتا ہے۔

پیدائش دولت میں اضافہ کرکے جنگ کے لئے وسائل حاصل کرنے کا طریقہ ہر لحاظ سے مفید ثابت ہوتا ہے۔ پیدائش دولت میں اضافہ کی حد تک قوم کو جنگی بار سے نجات مل جاتی ہے۔ عوام کو اپنے صرف میں کسی قسم کی کمی نہیں کرنی پڑتی البتہ انہیں جنگ میں کامیاب ہونے کی غرض سے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ عاملین پیدائش سے ان کی صلاحیت کے لحاظ سے کام لیا جاتا ہے اور معاشرہ میں کامل روزگاری کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ جنگ کے بعد بھی اگر ان حالات کو قائم رکھا جا سکے تو اضافہ شدہ دولت سے عوام کا معیار زندگی بہتر کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے۔

(۲) جنگ کے دوران میں پیدائش دولت کے لئے ہر ممکنہ کوشش کرنی چاہیئے۔ لیکن صرف اضافہ شدہ دولت جنگی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ مجبوراً مختلف طریقوں سے لوگوں کو اپنے صرف میں کمی کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اگر لوگ اچھی غذا کھانا چھوڑ دیں، نئے کپڑے نہ بنائیں اور زیادہ تر پرانے کپڑوں سے کام نکالیں تفریحات کو ترک کر دیں اور سفر وغیرہ میں کمی کر دیں تو معاشی وسائل جنگی ضروریات پوری کرنے کے لئے آزاد ہو جائینگے اور حکومت آسانی سے ان وسائل کو حاصل کر سکے گی۔ صرف میں کمی کرنے پر لوگوں کو یا تو اختیاری یا جبری طور پر تیار کیا جا سکتا ہے۔ اختیاری طریقہ میں جنگ کی قومی اہمیت کا احساس پیدا کرکے عوام کے قومی جذبات کو ابھارا جاتا ہے۔ مختلف طریقوں سے یہ ترغیب دلائی جاتی ہے کہ اگر وہ اپنے صرف میں کمی کر دیں تو وہ ایک بہت بڑے

قومی فرض کو انجام دیں گے۔ عوام کو اسکے ساتھ ساتھ اسکے لئے بھی آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ حقیقی طور پر بچتیں کرکے حکومت کو قرض دیں۔ اختیاری قرضوں کا طریقہ خاص طور پر ایسے ممالک میں جہاں قومی حکومتیں قائم ہوں اور عوام اور حکومت کے درمیان تعاون اور اعتماد پایا جائے بہت زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ صرف میں کمی کرنے کے لازمی طریقے میں محاصل کی شرحیں بڑھا کر اور نئے نئے محاصل عائد کرکے لوگوں کو قربانیاں ادا کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اسی سلسلہ میں لازمی قرضہ کے طریقہ کو بھی اختیار کیا جاتا ہے۔

یہ ضرور صحیح ہے کہ لوگوں کے صرف میں کمی کرنے کا اثر انکے معیار زندگی پر پڑتا ہے۔ اسلئے جنگ کے لئے وسائل حاصل کرنے کا یہ طریقہ بہت اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن لوگوں کے صرف میں کمی کے بغیر چارہ نہیں اور جب تک عوام زیادہ سے زیادہ قربانیاں کرنے کے لئے تیار نہ ہوں دشمن کے خلاف کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ صرف میں کس حد تک کمی کی جا سکتی ہے اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ قوم کا معیار زندگی کیا ہے۔ مالدار اور خوشحال اقوام عارضی طور پر کچھ سالوں کے لئے اپنے معیار زندگی کو گھٹا کر زیادہ وسائل جنگ پر صرف کر سکتی ہیں۔ ایک قوم جسکے افراد کو پہلے ہی سے پیٹ بھر کھانا اور تن ڈھانکنے کو کپڑا میسر نہ ہو زیادہ وسائل جنگ کے دیوتا کی نذر نہیں کر سکتی جنگ پر وسائل صرف کرنے کی صلاحیت کا اندازہ لگانے کے لئے مختلف متحارب اقوام کی مادی اور معاشی بہبودی کو دیکھنا چاہئے۔ اقوام کی مادی خوشحالی کا اندازہ لگانے میں بڑی دقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ بڑی حد تک صحیح اندازہ فی کس قومی آمدنی سے کیا جا سکتا ہے۔ فی کس قومی آمدنی معلوم کرنے میں بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر ملک کا نظام زر جدا جدا ہے۔ مختلف ممالک کے زر کو کسی ایک زر میں تبدیل کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ممالک میں قومی آمدنی معلوم کرنے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ بہت سے ایسے ممالک بھی ہیں جنکی قومی آمدنی معلوم کرنے کی کوئی کوشش حکومت کی طرف سے نہیں کی گئی ہے۔ البتہ بعض افراد نے اپنے طور پر کوشش ضرور کی ہے اور ظاہر ہے انکے اندازے اتنے زیادہ مفید اور معتبر ثابت نہیں ہو سکتے۔ ان تمام دقتوں کے

باوجود مسٹر کولن کلارک نے اپنی کتاب "کنڈیشنز آف اکنامک پروگریس (۱۹۴۰ء) میں مختلف اقوام کی فی کس حقیقی آمدنی کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد بعض مفید اعداد پیش کئے ہیں یہ اندازے ایک فرضی بین الاقوامی زر ڈالر میں کئے گئے ہیں۔ مسٹر کلارک کے اندازے کے مطابق مندرجۂ ذیل ممالک کی فی کس آمدنی حسب ذیل ہے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ	۱۳۸۱	جرمنی	۶۴۶
کناڈا	۱۳۳۷	جاپان	۳۵۳
نیوزی لینڈ	۱۲۰۲	پولینڈ	۳۵۲
برطانیہ	۱۰۶۹	اٹلی	۳۴۳
آسٹریلیا	۹۸۰	روس	۳۲۰
فرانس	۶۸۴	جنوبی افریقہ	۲۷۶

مسٹر کلارک اپنی تصنیف میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہندوستان اور چین کے متعلق معتبر اعداد نہیں پیش کئے جاسکتے البتہ غیر سرکاری تحقیقات کی بنا پر یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ برطانوی ہند کی فی کس آمدنی ۲۰۰ اور چین کی ۱۰۰ – ۲۰۰ کے درمیان ہوگی۔ ان اعداد سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ کی فی کس آمدنی ہندوستان کی فی کس آمدنی کا سات گنا ہے، انگلستان کی تقریباً پانچ گنا، کناڈا اور نیوزی لینڈ کی چھ گنا ہے ہندوستانی معاشین مسٹر کلارک کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔ انکا خیال ہے کہ آمدنی کا تناسب انگلستان اور ہندوستان میں بیس اور ایک ہوگا اور امریکہ اور ہندوستان میں تیس اور ایک۔

مندرجۂ بالا اعداد سے اس بات کا ضرور اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صنعتی اقوام زرعی اقوام کے مقابلہ میں جنگ پر زیادہ وسائل صرف کرسکتی ہیں اس کی مخصوص وجہ یہ ہے کہ صنعتی اقوام کا معیار زندگی زیادہ بلند ہوتا ہے اور عارضی طور پر چند سالوں کے لئے وہ اپنے معیار کو کم کرسکتی ہیں۔ یہ اعداد

اس کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ اتحادی ممالک کے پاس محوری اقوام کے مقابلہ میں زیادہ وسائل پائے جاتے ہیں۔

(۳) جنگ کے نئے وسائل حاصل کرنے کا تیسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ اشیاء پیدائش میں کوئی اضافہ نہ کیا جائے اور موجودہ اشیاء پیدائش کی ٹھیک طرح سے نگہداشت بھی نہ کی جائے۔ ہر ملک میں قومی آمدنی کا ایک خاص حصہ اشیاء پیدائش کی فرسودگی پر صرف کیا جاتا ہے اور اگر معاشرہ ترقی پذیر ہے تو ایک حصہ ان کی متعدار میں اضافہ کرنے کے لئے بھی مختص کر دیا جاتا ہے۔ وہ وسائل جو ان دو مدات پر صرف کئے جاتے ہیں جنگ کے دوران میں جنگی ضروریات پوری کرنے کے کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ ہر ترقی پذیر معاشرہ میں ہر سال نئے نئے مکانات تیار کئے جاتے ہیں نئی نئی مشین بنائی جاتی ہیں اور نئے کارخانے قائم کئے جاتے ہیں۔ اسی قسم کی دوسری اشیاء پیدائش میں ہر سال اضافہ کیا جاتا ہے۔ جنگ شروع ہوتے ہی حکومت سرمایہ کاری پر تسلط قائم کر دیتی ہے۔ اس پالسی کے تحت لوگوں کو نئے مکانات کارخانے وغیرہ قائم کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی مسٹر کلارک نے اپنی دوسری تصنیف میں اندازہ پیش کیا ہے کہ انگلستان میں ۰۰۵ ملین پونڈ سالانہ اشیاء پیدائش میں اضافہ کرنے پر صرف کیا جاتا ہے۔

اسی طرح سے پرانی اشیاء پیدائش کی جگہ نئی اشیاء تیار نہ کرنے اور پرانی کو اچھی حالت میں نہ رکھنے سے بھی جنگی ضروریات پوری کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ وسائل ضرور حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ مختلف قسم کی اشیاء کے ذخیروں کو کام میں لایا جائے اور ان کی جگہ نئی چیزیں تیار نہ کی جائیں۔ ریل سڑک اور کارخانے کی مشینوں سے خوب کام لیا جائے اور ان کی مرمت پوری طرح سے نہ کی جائے۔ اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ریلوں کے ڈبے اور انجن جنگی ضروریات پوری کرنے کے لئے دوسرے ممالک کو روانہ کر دئیے جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے ڈبے اور انجن تیار نہیں کئے جاتے۔ بعض ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ جنگ سے پہلے ہر سال انگلستان میں پرانی اشیاء پیدائش کی مرمت اور ان کی جگہ یعنے کے لئے نئی چیزیں تیار کرنے پر

۴۰ ملین پونڈ صرف کئے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ۴۰۰ ملین پونڈ کے برابر وسائل جنگ پر نہیں لگائے جا سکتے۔ جنگی اہمیت کا تقاضہ ہے کہ ملک کی ریلیں سڑکیں اور کارخانے وغیرہ بھی حالت میں کام دیتے رہیں تاکہ جنگی ضروریات کی تکمیل میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ ہو اسلئے ہر سال ان پر کچھ نہ کچھ ضرور صرف کرنا پڑے گا۔ اسکے باوجود اس مد سے جنگی ضروریات پوری کرنے میں تھوڑی بہت مدد ضرور حاصل کی جا سکتی ہے۔

وسائل حاصل کرنے کا مندرجہ بالا طریقہ کچھ بہت اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اسکو اختیار کرنیکی وجہ سے جنگ کے دوران میں اشیاء پیدائش کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ انکو اچھی حالت میں لانے کے لئے جنگ کے بعد آنے والی نسلوں کو قومی آمدنی کا بڑا حصہ صرف کرنا پڑتا ہے اور انہیں اپنی ضروریات کو کچھ دنوں کے لئے ملتوی کرنا پڑتا ہے۔

(۴) بیرونی ممالک میں لگے ہوئے دیسی سرمایہ کی تمسکات کو فروخت کرکے اور بیرونی ممالک سے قرضے لیکر بھی جنگ کے لئے وسائل حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ تمسکات فروخت کرکے بیرونی زر حاصل کیا جاتا ہے جسکے ذریعہ سے دوسرے ممالک میں جنگی ضروریات کی چیزیں خریدی جاتی ہیں۔ ایسا صرف وہی اقوام کر سکتی ہیں جو صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ ہوں اور جنکے پاس اپنی ضروریات سے زیادہ سرمایہ جمع ہو گیا ہو۔ زرعی قوم اس طریقہ کو اختیار نہیں کر سکتیں۔ موجودہ جنگ سے پہلے انگلستان کے لوگوں اور اداروں کے پاس ۰۰۰ ملین پونڈ کی بیرونی تمسکات موجود تھیں جن میں سے ۷۵ ملین پونڈ کی امریکی تمسکات تھیں۔ دوسرے ممالک سے وسائل حاصل کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ ان سے قرضے لیکر جنگی ضروریات کی چیزیں خریدی جائیں۔ اس طرح سے جنگ جاری رکھنے کیلئے وسائل مل جاتے ہیں اور جنگ کے دوران میں انکے بدلے میں چیزیں نہیں دینی پڑتیں۔ تمسکات فروخت کرکے اور قرضے لیکر وسائل حاصل کرنے میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں اس سالانہ آمدنی میں جو دوسرے ممالک سے حاصل ہوتی ہے کمی ہو جاتی ہے اور دوسرے طریقہ میں قرض کی ادائیگی اور اسکے سود کی ادائی کی وجہ سے قومی آمدنی کا ایک حصہ دوسروں کے سپرد کرنا پڑتا ہے۔

پیدائش دولت میں اضافہ کرنے اور عوام میں کمی کرنے کی وجہ سے موجودہ نسلیں جنگ کے بار کو اٹھاتی ہیں۔ پہلے طریقہ میں لوگ زیادہ محنت کرتے ہیں لیکن اضافہ شدہ دولت کو اپنی ذاتی ضروریات پر صرف نہیں کرتے بلکہ یہ دولت جنگ کے دیوتا کی بھینٹ کردی جاتی ہے۔ صرف میں کمی کا فوری اثر عوام کے معیار زندگی پر پڑتا ہے اور انہیں مختلف قسم کی تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ البتہ تیسرے اور چوتھے طریقہ کو اختیار کرنے سے جنگ کے بار کو گذشتہ اور آئندہ نسلوں پر منتقل کیا جاسکتا ہے۔

انگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی قومی آمدنی اور مصارف جنگ کے بعض اعداد کے ذریعہ سے اس مسئلہ کی مزید تشریح کی جائے گی کہ مصارف جنگ کن ذرائع سے پورے کئے جاتے ہیں۔ یہ اعداد اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ ان ممالک میں پیدائش دولت اور قومی آمدنی میں کتنا اضافہ ہوا ہے، لوگوں کے صرف میں کتنی کمی ہوئی ہے اور اشیاء پیدائش کی نگہداشت وغیرہ نہ کرکے مصارف جنگ کی پابجائی میں کتنی مدد مل رہی ہے۔

موجودہ جنگ شروع ہونے کے بعد حکومت برطانیہ نے اعداد و شمار کا ایک مرکزی محکمہ قائم کیا ہے جس کی طرف سے پارلیمنٹ میں بجٹ پیش کئے جانے کے ساتھ ساتھ قومی آمدنی اور اسکی تقسیم، حکومت کی آمدنی اور خرچ اور اسی قسم کے بعض دوسرے اہم مسائل کے متعلق سفید کتاب (وائٹ پیپر) کی شکل میں بہت ہی معتبر اور مفید اعداد و شمار شائع کئے جاتے ہیں۔

سنہ ۱۹۴۲ء کے بجٹ کے ساتھ ساتھ جو سفید کتاب شائع کی گئی تھی اسکے اعداد کا تجزیہ کرنے کے بعد لندن کے مشہور ہفتہ وار جریدہ اکانمسٹ نے چند نتائج اخذ کئے ہیں اور ان نتائج کو اپنی اپریل سنہ ۱۹۴۲ء کی ایک اشاعت میں شائع کیا ہے۔ نتائج اخذ کرتے وقت سنہ ۱۹۳۸ء کو بنیادی سال قرار دیا گیا ہے اور یہ بھی فرض کیا گیا ہے کہ قیمتوں کی سطح سنہ ۱۹۴۰ء میں ۱۵ فیصد سنہ ۱۹۴۱ء میں ۲۵ اور سنہ ۱۹۴۲ء میں ۳۰ فیصدی بڑھی تھی۔ قیمتوں میں اضافہ کا یہ مفروضہ بڑی حد تک صحیح ہے اسطرح سے قیمتوں میں اضافہ کا خیال کرنے کے بعد قومی آمدنی کے اعداد سنہ ۱۹۳۸ء کے پونڈ کی قوت

خرید میں پیش کئے گئے ہیں۔ یہ اعداد حسب ذیل ہیں :—

(ملین پونڈ)

	۱۹۳۸	۱۹۴۰	۱۹۴۱	۱۹۴۲
(۱) لوگوں کا صرف	۴۰۲۵	۳۵۵۱	۳۴۰۰	۳۴۰۸
(۲) حکومت کے اخراجات	۸۴۵	۲۶۶۰	۳۲۵۵	۳۵۴۵
(۳) داخلی سرمایہ کی نگہداشت بلحاظ فرسودگی اور کمی	۷۶۲	۳۹۵	۲۲۰	۲۳۲
(۴) دیگر ممالک میں لگے ہوئے دیسی سرمایہ میں کمی	-۵۵	-۶۵۸	-۶۲۸	-۴۸۵
(۵) خام قومی آمدنی	۵۵۸۷	۵۹۴۸	۶۳۴۵	۶۷۰۰

مندرجہ بالا جدول یہ ظاہر کرتا ہے کہ برطانوی حکومت جنگ جاری رکھنے کے لئے کس طرح سے معاشی وسائل حاصل کر رہی ہے۔ ۱۹۴۲ء میں حکومت برطانیہ نے ۱۹۳۸ء کے پونڈ کی قدر میں ۳۵۴۵ ملین پونڈ خرچ کئے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں حکومت برطانیہ کے کل اخراجات ۸۴۵ ملین پونڈ تھے اسطرح ۱۹۴۲ء میں ۲۷۰۰ ملین پونڈ کا اضافہ ہوا۔ یہ زائد مصارف جنگی ضروریات پوری کرنے کی وجہ سے کرنے پڑے اور اسلئے انکو مصارف جنگ تصور کیا جاسکتا ہے۔ زائد رقم جن مختلف ذرائع سے حاصل کی گئی ان کو مندرجۂ ذیل جدول ظاہر کرتا ہے۔

(۱) پیداشدہ دولت میں اضافہ (نمبر ۵ میں اضافہ) ۱۱۱۳ ملین پونڈ

(۲) عوام کے صرف میں کمی (نمبر ۱ میں کمی) ۶۲۷ "

(۳) داخلی سرمایہ میں کمی (نمبر ۳ میں کمی) ۵۳۰ "

(۴) بیرونی ممالک میں دیسی سرمایہ میں کمی (نمبر ۴ میں کمی) ۴۳۰ "

کل میزان ۲۷۰۰ ملین پونڈ

مندرجۂ بالا اعداد کا تجزیہ کرنے کے بعد اکانمسٹ نے تین اہم نتائج اخذ کئے ہیں۔

(۱) سنہ ۱۹۴۲ء میں حکومت برطانیہ کے مصارف جنگ سنہ ۱۹۳۸ء کی قومی آمدنی کے تقریباً آدھے کے برابر ہوئے تھے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ اس سال برطانوی قوم نے جنگ سے پہلے کی اپنی مجموعی پیداوار کا تقریباً نصف حصہ جنگ پر صرف کیا۔

(۲) ان مجموعی مصارف کا ½ حصہ پیدائش دولت میں اضافہ کے ذریعہ سے پورا کیا گیا ہے پیدائش دولت میں اضافہ کا اندازہ ۲۰ فیصد کیا گیا ہے۔ ایک تہائی سے کچھ کم عوام کے صرف میں کمی کر کے اور ۱/۶ حصہ اندرونی سرمایہ میں کمی یا اشیاء پیدائش کو اچھی حالت میں نہ رکھکر یا بچائی کی گئی۔ باقی مصارف بیرونی ممالک میں دیسی سرمایہ کی تمسکات کو فروخت کر کے اور دوسرے ممالک سے قرضے حاصل کر کے پورے کئے گئے تھے۔

(۳) جنگ کے معاشی بار کا ۲/۳ حصہ موجودہ نسل پر صرف میں کمی اور زیادہ محنت کرنے کی شکل میں پڑا اور صرف ایک تہائی حصہ گذشتہ اور آئندہ نسلوں پر منتقل کیا جا سکا تھا۔

اکانمسٹ کے اندازے کے مطابق سنہ ۴۲ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں مصارف جنگ زیادہ تر پیدائش دولت اور قومی آمدنی میں اضافہ کر کے پورے کئے گئے۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں امریکہ کی قومی آمدنی ۰۰ ملین ڈالر تھی۔ سنہ ۴۲ء کی قومی آمدنی کا اندازہ ۱۲۳ ملین ڈالر کیا گیا ہے۔ اس طرح سے قومی آمدنی میں تقریباً ۱۵ فیصد اضافہ ہوا۔ سنہ ۳۹ء میں حکومت کے اخراجات ۱۵ ملین ڈالر تھے اور سنہ ۴۲ء میں بڑھکر ۵۶ ملین ڈالر ہوگئے۔ دو سالوں کی قومی آمدنی اور حکومت کے اخراجات کا آپسمیں مقابلہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جنگی اخراجات پورے کرنے کی غرض سے اندرونی سرمایہ پر صرف تھوڑی سی کمی کرنی پڑی تھی۔ عوام کو اپنے صرف میں کمی کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہوئی اسکے برخلاف انکے صرف میں اور زیادہ اضافہ ہوا اسکی محض وجہ یہ ہے کہ جنگ سے پہلے کے مقابلہ میں پیدائش دولت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ جنگ شروع ہوتے وقت امریکہ میں پیدائش دولت میں اضافہ کے بہت زیادہ مواقع موجود تھے۔ ملک بہت

بڑا ہے اور عاملین پیدائش بڑی مقداروں میں پائے جاتے ہیں۔ جنگ سے پہلے بہت سے عاملین پیدائش بیکار تھے یا پھر اپنی پوری صلاحیت سے کام پر نہیں لگے ہوئے تھے۔ اسکے علاوہ امریکی کارخانے اور کھیت وغیرہ براہ راست جنگی حالات مثلاً ناکہ بندی، ہوائی حملے، عمل تاریکی سے محفوظ ہیں اسلئے کارخانوں اور کھیتوں میں زیادہ دولت پیدا کی جاسکی۔

افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ملک کے متعلق ایسے اعداد و شمار نہیں ملتے جن سے صحیح صحیح اندازہ لگایا جاسکتا کہ جنگ کی وجہ سے پیدائش دولت کے مختلف شعبہ جات میں کسقدر ترقی ہوئی ہے اور قومی آمدنی کتنی بڑھی ہے۔ جنگی مصارف قومی آمدنی میں اضافہ کرکے کس حد تک پورے کئے جارہے ہیں اور عوام کو اپنے صرف میں کمی کرکے جنگ میں فتح پانے کے لئے کیا کچھ قربانیاں ادا کرنی پڑرہی ہیں۔ حکومت کی طرف سے قومی آمدنی کا اندازہ لگانے کی اب تک کوشش نہیں کیگئی ہے البتہ مختلف اوقات میں افراد نے اپنے طور پر ہندوستان کی مجموعی آمدنی اور فی کس آمدنی معلوم کرنے کی بعض کوششیں ضرور کی ہیں۔ ان غیر سرکاری اندازوں کی مدد سے ہمارے ملک کے بہت سے معاشی مسائل سمجھنے میں بہت کافی مدد ملتی ہے۔ اس قسم کا آخری اندازہ ڈاکٹر راؤ پروفیسر معاشیات جامعہ دہلی نے سنہ ۱۹۳۱-۳۲ کے متعلق لگایا تھا اور وہ مختلف قسم کے اعداد و شمار کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ مجموعی قومی آمدنی ۱۶,۶۱۶ ملین روپے تھی اور فی کس آمدنی ۶۵ روپے سالانہ۔ ابھی حال میں پروفیسر موصوف نے سنہ ۴۲-۴۳ء میں ہندوستان کی قومی آمدنی کے مندرجہ ذیل اعداد پیش کئے ہیں۔

زرعی آمدنی	۱۰۵۳۱	ملین روپے
منظم صنعتوں کی آمدنی	۵۵۰۳	"
غیر منظم صنعتوں کی آمدنی	۲۹۳۹	"
دیگر مدات سے آمدنی	۶۹۵۹	
مجموعی آمدنی	۳۴۲۲۹	ملین روپے

مندرجہ بالا اعداد میں مجموعی آمدنی ۶۱۶،۱۶ ملین روپے سے بڑھکر ۳۲۹۳۲ ملین روپے بتلائی گئی ہے اور اس طرح سے فی کس آمدنی ۱۱۴ روپے سالانہ ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہئیے کہ اس عرصہ میں قیمتوں کی سطح ۳۲-۱۹۳۱ء کے مقابلہ میں دوگنے سے بھی زیادہ بڑھ چکی تھی اسلئے اگر ۴۳-۱۹۴۲ء کی قومی آمدنی کا اظہار ۳۲-۱۹۳۱ء کے ذریعہ سے کیا جائے تو مجموعی آمدنی ۲۰،۷۰۱ ملین روپے رہ جاتی ہے اور فی کس آمدنی صرف ۶۹ روپے سالانہ ہوتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ گیارہ بارہ سال کے عرصہ میں حقیقی آمدنی میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا ہے جنگ کے حالات نے ہمارے یہاں کی پیدائش دولت میں بہت تھوڑا سا اضافہ کیا ہے۔ وسائل بہت کافی موجود ہیں لیکن اب تک ان سے پوری طرح سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اگر ہندوستانی معشیت کی اہم خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی اور اسکی نئے سرے سے تنظیم کی جاتی تو پانچ سال کے عرصہ میں قومی آمدنی کو دوگنا بڑھایا جاسکتا تھا۔ ہندوستان اتحادی ممالک کے لئے وسائل حاصل کرنے کا بہت بڑا ذخیرہ بن سکتا۔ ہندوستانی جنگی معاشیت کی خصوصیات قلت اور گرانی ہے۔ پیدائش دولت میں اضافہ نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام کو اپنے صرف میں بہت زیادہ کمی کردینی پڑی ہے اکثر لوگوں کو مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اکثر علاقوں میں فاقوں تک کی نوبت پہونچ گئی ہے۔ اسکے علاوہ ہندوستان کی اشیاء پیدائش سے بھی بہت زیادہ کام لیا جارہا ہے۔ سڑکوں، ریلوں اور کارخانوں کی مشینوں کی حالت تباہ ہوچلی ہے۔

امتیاز حسین خاں بی۔ کام آنرس (لندن)
پروفیسر کامرس جامعۂ عثمانیہ

دیسی ریاستیں اور تنظیم مابعد جنگ

اب جب کہ جنگ کے سیاہ بادل ہٹتے جارہے ہیں اور افق عالم پر متحدین کی فتح کی روشنی نمودار ہوگئی ہے یہ سوال مفکرین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے کہ کن تصورات کی بنیادوں پر ان کی عمارت کھڑی کیجائیگی اور کس طرح آیندہ ہماری تہذیب کو تخریبی قوتوں سے محفوظ رکھا جائیگا؟

اب دنیا اس حقیقت سے روشناس ہوچکی ہے کہ قومیت ہی ان تمام فسادات یعنے نسلی تعصبات اور معاشی رقابتوں کا سرچشمہ ہے جو ہر ربع صدی کے بعد ایک عالمگیر آویزش کی صورت اختیار کرلیتے ہیں اور انسان کی تمام ترقیوں اور تہذیبی کارناموں کو ملیامیٹ کردیتے ہیں۔ اسی لئے اقوام عالم تعمیر و تخریب کے ایک مہلک چکر میں پھنس کر ہمیشہ ترقی کے ابتدائی دائروں میں گردش کرتی رہتی ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ بین الاقوامی کشمکش محض تعمیر عالم کے لئے وقف ہوتی!!

موجودہ جنگ بڑی حد تک تصورات کی جنگ ہے۔ اسلئے عمومیتوں کی فتح درحقیقت ان تصورات کی فتح ہوگی جن پر دنیا کی بہترین توقعات مرکوز ہیں اور یہی تصورات ہمارے آیندہ نظام حیات کے تشکیلی عناصر ہونگے۔

تنظیم مابعد جنگ کی ضرورت اور اہمیت کا احساس گزشتہ جنگ عظیم کے بعد پیدا ہوا جبکہ دنیا کے معاشی توازن کے بگڑنے کی وجہ سے ایسے لاینحل مسائل رونما ہوگئے تھے جن کی یاد اور تصور سے آج بھی دنیا کانپ اٹھتی ہے۔ جنگ کی تباہ کاریوں کے قطع نظر امن کے انتشار اور بدنظمیوں نے بھی فاتح اور مفتوح دونوں اقوام کو طرح طرح کے مصائب میں مبتلا کردیا تھا۔ بین الاقوامی تجارت پر پابندیاں۔ نظام زر کا انتشار۔ مختلف اقوام کی معاشی

علق العنانیت اور عالمگیر بے روزگاری اور افلاس یہ وہ ہولناک تجربات تھے جن کو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ نتیجہ یہ کہ معاشی استحکام، معاشرتی استقامت اور سیاسی اقتدار کو خطرات لاحق ہو گئے جس کے باعث اکثر قومیں تباہ و برباد ہو گئیں اور انقلابات کے رونما ہونے سے نئی مملکتیں اور جدید معاشی و معاشرتی نظام معرض وجود میں آئے۔ اگر اقوام عالم پہلے ہی سے تنظیم مابعد جنگ کا لائحہ عمل مرتب کر لیتیں اور جنگ کے بعد اسے روبہ عمل لاتیں تو توی توقع تھی کہ یہ خطرناک صورت حال پیدا نہ ہوتی۔

ابھی دنیا کے جسم پر گذشتہ جنگ کے زخم مندمل نہ ہونے پائے تھے کہ موجودہ جنگ نے انہیں پھر ہرا کر دیا۔ اس جنگ کے آغاز کے ساتھ ہی مختلف ممالک نے تنظیم مابعد جنگ کا کام شروع کر دیا جو اب بڑی سرگرمی کے ساتھ انجام پا رہا ہے۔ برطانیہ میں سرکاری اور خانگی ادارے اس کام میں مصروف ہیں۔ چنانچہ بیوریج اسکیم کو عالمگیر شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں تقریباً ۲۰۰ ادارے تنظیم مابعد جنگ کے کام میں منہمک ہیں۔ یہی حال تقریباً دیگر ممالک کا ہے۔

یہاں یہ امر قابل یادداشت ہے کہ اگرچہ تمام ممالک میں تنظیم مابعد جنگ کی اسکیمات قومی ضروریات کے لحاظ سے مرتب کئے جا رہے ہیں تاہم بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کے سلجھانے میں عالمی اتحاد عمل لازمی ہے جیسے ہوابازی، جہازرانی، لاسلکی نشریات، بعض بڑے پیمانہ کی صنعتیں، اشیائے خوردنی و خام کی پیدائش و تقسیم زر، مبادلات خارجہ، بین الاقوامی قرضے، بین الاقوامی تجارت، انتقال مقام اور نوآبادیات، ان پیچیدہ اور پریشان کن معاشی مسائل کی منصفانہ تکمیل دائمی امن کے قیام کے لئے ضروری ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ جغرافیائی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی سرحدات کے تصور کو کم از کم معاشی معاملات کے تصفیہ کی حد تک ذہن سے خارج کیا جائے۔ چنانچہ مابعد جنگ جنگ زدہ ممالک کو اپنی اصلی حالت پر لانے اور مالی امداد فراہم کرنے، ہوابازی اور بین الاقوامی زر کے بارے میں برطانیہ اور امریکہ متحدہ طور پر اپنا لائحہ عمل

مرتب کر رہے ہیں اور دیگر عالمگیر مسائل بھی ان ممالک کے مدبرین کا موضوع بحث بنے ہوئے ہیں۔
ہندوستان کے تنظیم مابعد جنگ کے مسائل، نوعیت کے لحاظ سے دیگر ممالک کے مسائل سے مختلف ہیں۔ خوش قسمتی سے ہندوستان اب تک جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ ہے۔ اسلئے فی الحال جنگی معیشت کو امن کی معیشت میں متبدل کرنے کے علاوہ معاشی پسماندگی کو دور کرنے کے مسائل بھی شامل ہیں جن کو حل کرنے کی ضرورت و اہمیت جنگ سے قبل بھی اتنی ہی تھی جتنی کہ جنگ کے بعد ہوگی۔

چنانچہ تنظیم مابعد جنگ کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے حکومت ہند نے جون سنہ ۱۹۴۳ء میں ایک کمیٹی تنظیم مابعد جنگ کے قیام کا اعلان کیا تھا جس کے تحت بعد میں متعدد ذیلی کمیٹیاں مختلف مسائل پر غور کرنے اور تجاویز مرتب کرنے کے لئے قایم کی گئیں اور یہ کام اب سرگرمی کے ساتھ انجام پا رہا ہے۔

حکومت ہند کی رہنمائی میں مختلف صوبہ جاتی حکومتوں نے بھی مختلف کمیٹیاں قائم کی ہیں اور دیسی ریاستیں بھی اس خصوص میں غافل نہیں ہیں۔

دیسی ریاستوں میں تنظیم مابعد جنگ کے مسائل اور بھی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اسلئے کہ یہ معاشی نقطۂ نظر سے برطانوی ہند کے مقابلہ میں پسماندہ ہیں اور انہیں صنعتی ترقی کے میدان کا بہت کچھ حصہ عبور کرنا ہے۔ انکے اچھوتے اور قدرتی وسائل سے استفادہ کرنا ان کے معاشی احیا کے لئے ناگزیر ہے۔ ذیل میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی تنظیم مابعد جنگ سے متعلقہ سرگرمیوں کی ایک روئداد درج کی جاتی ہے تاکہ ان کے مسائل کی نوعیت کا صحیح اندازہ ہوسکے۔

حیدرآباد: جنگ کے اختتام پر جن مسائل سے حیدرآباد کو دوچار ہونا پڑیگا ان کی اہمیت اور اس ریاست ابد مدت کی صنعتی و زرعی ترقی کے بارے میں تنظیمی تجاویز کو مرتب کرنے کی ضرورت کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے اعلیحضرت بندگانعالی نے بذریعہ فرمان مبارک مورخہ ۲۰ جمادی الاول سنہ ۱۳۶۲ھ باب حکومت کی اس تجویز کو شرف منظوری بخشا کہ مسائل تنظیم مابعد

جنگ کی تحلیل کے لئے ایک مجلس تنظیم مابعد جنگ اور ایک معتمدی کا قیام عمل میں لایا جائے۔

مابقی ہندوستان کی طرح حیدرآباد کیلئے بھی بحیثیت ایک علیحدہ سیاسی وحدت کے یہ ضروری ہوگا کہ وہ مابعد جنگ کے معاشی حالات سے مطابقت پیدا کرے اور زراعت اور صنعت وحرفت کو فروغ دیکر عوام کی قوت خرید میں اضافہ کرے تاکہ وہ ایک معقول معیار پر اپنی زندگی بسر کرسکیں لیکن یہ کام ریاست ہذا کیلئے نسبتاً دشوار ہے اسلئے کہ اسے اکثر صوبہ جات ہند کے مقابلہ میں زرعی وصنعتی ترقی کے میدان کا بہت کچھ حصہ عبور کرنا ہے۔ زراعت کو جو ریاست ہذا کے باشندوں کا اصلی ذریعہ معاش ہے، فروغ دینے کے لئے آبپاشی کی بڑی اسکیمات کس ترتیب اور فروخت پیداوار اور اجتماعی واتحادی کاشت کے ترقی یافتہ طریقوں کی ترویج لازمی ہوگی۔ برقی قوت کی صنعت کو ترقی دینا ہوگا تاکہ نہ صرف صنعتوں کی توسیع بلکہ دیہاتوں اور دیہی صنعتوں کی برقابی کے لئے بھی ارزاں برقی قوت بکثرت دستیاب ہوسکے۔ خام مواد کی دستیابی کی وجہ سے حیدرآباد کا نصب العین یہ ہوسکتا ہے کہ وہ سوتی پارچہ بافی، تیل اور غذائی صنعتوں کو کم از کم معاشی خود اکتفائی کی حد تک ترقی دے۔ علاوہ ازیں زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لئے کھاد سازی اور صنعتی وزرعی ضروریات کی تکمیل کے لئے مشینی آلات بنانے کی صنعتوں کو ترقی دیجائے۔ نئی صنعتوں کو جاری کرنے اور فرسودہ مشینری کو بدلنے کے لئے جو جدید مشنری درکار ہوگی اسکے متعلق قبل از قبل تجاویز مرتب کرلی جائیں تاکہ اس کے حصول کے لئے پہلے ہی سے آرڈر دیئے جاسکیں۔ سائنسی اور صنعتی تحقیق کو آگے بڑھانے کی تحریک ضروری ہے اور اس کا دائرہ صرف ہماری ہی خام اشیا کی حد تک محدود ہونا چاہیئے۔ ریاست ہذا کے معدنی وسائل کا ایک عام جائزہ لیا جائے تاکہ انہیں صنعتی اغراض کے لئے استعمال میں لایا جاسکے۔ تمام ملک میں ذرائع رسل ورسائل کی توسیع ضروری ہے تاکہ خام مواد اور تیار شدہ اشیا کی حمل ونقل ہوسکے۔ زرعی وصنعتی ترقی کے لئے جس عملہ کی ضرورت ہوگی اس کی تربیت اور جنگ کے بعد تخفیف شدہ عملہ کو ضروری تربیت کے بعد زراعت اور حرفت میں مصروف کرنے کے انتظامات عمل میں لائے جائیں۔

س کے بعد ناخواندگی اور خرابی صحت کے مسائل ہیں جن کی تحلیل دیہی اور شہری دونوں رقبوں میں ضروری ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جب تک عوام کو تعلیم یافتہ نہ بنایا جائے اور ان میں اپنے مفوضہ کام کی انجام دہی کے لئے جسمانی موزونیت نہ پیدا کی جائے اس وقت تک معاشی ترقی کی کسی اسکیم کو کامیابی کے ساتھ نافذ کرنا ممکن نہیں ہے۔ آخر میں یہ مسئلہ حل طلب رہ جاتا ہے کہ ان تمام اسکیمات کو روبہ عمل لانے کے لئے جو کثیر رقم کی ضرورت ہوگی وہ کس طرح فراہم کی جائیگی۔ یہ بلاشبہ ایک مشکل کام ہے لیکن پھر بھی فراہمی رقم میں چاہے کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ پیش آئیں ان کو دور کرنا ریاست ہذا کے مفاد کے تحت نہایت ضروری ہے۔

مذکورہ بالا مسائل کی تحلیل کے لئے ایک مجلس تنظیم مابعد جنگ اور ایک عہدہ معتمدی کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اس مجلس کے اراکین سرکاری اور غیر سرکاری افراد پر مشتمل ہیں۔ اس کے تحت بارہ کمیٹیاں، جو سرکاری و غیر سرکاری اراکین پر مشتمل ہیں۔ قائم کی گئی ہیں تاکہ وہ حسب ذیل مسائل پر غور کرکے تجاویز مرتب کریں:—

(۱) آبپاشی و قوت برقی۔

(۲) عام صنعتیں جو کمیٹی نمبر ۳ اور (۴) الف سے متعلق نہیں ہیں۔

(۳) چھوٹے پیمانہ کی صنعتیں۔ دیہی اور گھریلو صنعتیں

(۴)۔ الف۔ سوتی پارچہ بافی۔ اونی پارچہ بافی۔ تیل۔ خزفی اور برقی سامان کی صنعتیں۔

ب۔ معدنی وسائل۔

(۵) کارہائے سرکاری اور رسل و رسائل ماسوائے ریلوے۔

(۶) سائنسی و صنعتی تحقیق۔

(۷) تعلیمات بالخصوص پیشہ ورانہ و زرعی تعلیم۔

(۸) صنعتی عملہ کی تربیت۔

(۹) الف۔ دیہی تنظیم۔

ب۔ زراعت

(۱۰) قوت انسانی

(۱۱) صحت عامہ

(۱۲) مالیات۔ زر بنک کاری۔ تبادلہ زر اور تجارت۔

جو تجاویز مذکورہ بالا کمیٹیاں مرتب کرینگی وہ تین قسم کی ہونگی۔

(۱) وہ تجاویز جن کو بدوران جنگ روبہ عمل لایا جائیگا۔

(۲) وہ تجاویز جن کو اختتام جنگ کے بعد ہی روبہ عمل لایا جائیگا۔

(۳) وہ تجاویز جن کو ایک طویل مدت میں روبہ عمل لایا جائیگا۔

ان کمیٹیوں کو یہ حق عطا کیا گیا ہے کہ وہ مشورہ یا رکنیت کے لئے بیرون حیدرآباد کے ممتاز اور قابل اشخاص کی خدمات حاصل کریں۔

بحمد اللہ یہ کمیٹیاں موجودہ صدر المہام بہادر فینانس اور عالیجناب معتمد صاحب تنظیم مابعد جنگ کی بہترین رہنمائی میں نہایت سرگرمی سے اپنا کام انجام دے رہی ہیں اور ان کے معاشی پروگرام کو بروقت نافذ کیا جائیگا۔

میسور اس ترقی یافتہ ریاست نے مسائل مابعد جنگ کی تحلیل کیلئے اپنے ادارہ معاشی کانفرنس کو جو ۱۹۱۱ء میں قائم اور مالی مشکلات کی وجہ سے ۱۹۳۱ء میں بند کردیا گیا تھا، نئی زندگی بخشی ہے۔ اس کے تحت چار مجالس قائم کئے گئے ہیں جو زراعت تعلیمات۔ حرفت و تجارت اور رشیم سازی سے متعلق ہیں۔ ان کے درمیان اشتراک عمل پیدا کرنے کے لئے ایک مرکزی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جو سرکاری اور غیر سرکاری اراکین پر مشتمل ہے کمیٹی مذکور کے پہلے جلسہ میں جو بتاریخ ۵ اگست ۱۹۳۵ء منعقد کیا گیا تھا۔ دیوان میسور نے جو تقریر کی تھی اس سے میسور کے آیندہ منصوبوں کا پتہ چلتا ہے جن کی صراحت ذیل میں کی جاتی ہے۔

مجلس زراعت کے ذمہ یہ کام ہے کہ وہ مابعد جنگ زرعی ترقی کا ایک پروگرام مرتب کرے

اس خصوص میں پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اشیائے خوردنی کے بارے میں خود اکتفائی حاصل کی جائے اگرچہ جنگ کے بعد ریاست ہذا کو گیہوں اور دالیں باہر سے درآمد کرنی ہونگی تاہم اس امر کی کوشش کی جائیگی کہ جن رقبہ جات میں موزوں زمین اور آبپاشی کی سہولتیں موجود ہوں وہاں ان اجناس کی کاشت کی جائے۔ اس طرح یہاں چاول کی رسد اس کی طلب کے مقابلہ میں بہت کم ہے لہذا اس کمی کی تلافی ممکنہ حد تک کی جائیگی۔ جنگ نے اشیائے خوردنی کی حد تک خود مکتفی ہونے کی خواہش فطرتاً ملک میں پیدا کردی ہے۔ لہذا حکومت میسور نے بھی اس مقصد کو اپنے مقاصد مابعد جنگ میں شامل کردیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ریاست ہذا کی ترقی یافتہ سوتی پارچہ بافی کی صنعتوں کے لئے کثیر مقدار میں روئی کی ضرورت ہے۔ لہذا اس امر کی کوشش کیجائیگی کہ جن رقبہ جات میں ابتک بہتر قسم کی روئی کی کاشت نہیں کی گئی ہے وہاں اس کی کاشت کی جائیگی۔ تیسرے یہ کہ غذائی اور تجارتی فصلوں کے درمیان ایک صحیح توازن قایم کیا جائیگا۔ چوتھے یہ کہ حکومت میسور اپنے جنگلاتی وسائل سے سائنسی طریقہ پر کما حقہ استفادہ کرنا چاہتی ہے تاکہ تعمیر امکنہ اور دیگر ضروریات کی تکمیل ہوسکے۔ پانچویں یہ کہ ربڑ اور سنکونا کی کاشت کی تجاویز بھی اس کے زیر غور ہیں۔ چھٹے یہ کہ اس کے پیش نظر اعلیٰ قسم کے مویشی پیدا کرنے اور بالخصوص ان کی تعداد بڑھانے کا بھی مسئلہ ہے اسلئے کہ آجکل فوج کی ضروریات کی تکمیل کیلئے ان کی ایک بڑی تعداد کام میں آچکی ہے۔ ساتویں یہ کہ زرعی قرضداری کے مسئلہ کو پوری طرح حل کیا جائیگا اسلئے کہ یہ زمین گروی بنکوں کے قیام۔ انسداد ربا اور مہاجنوں پر پابندیاں عاید کرنے سے متعلق قوانین کی موجودگی کے باوجود ابھی پوری طرح حل نہ ہوسکا۔ اب جبکہ زرعی پیداواروں کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ کی وجہ سے کاشتکاروں کی مالی حالت درست ہوچکی ہے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاکر زرعی قرضداری کی تحلیل کے لئے ایک زبردست مہم شروع کی جائیگی۔

مجلس حرفت و تجارت کے تفویض حسب ذیل کام ہیں:-

۱۔ جو صنعتیں جنگ کے دوران میں قائم ہوئی ہیں انہیں جنگ کے بعد بھی برقرار رکھا جائے۔
اس خصوص میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ حکومت میسور کو اس امر کی طمانیت حاصل ہے کہ مختلف کمپنیوں نے

اپنے زمانۂ جنگ میں حاصل کئے ہوئے غیر معمولی منافعوں کو اپنے مدات محفوظ کے استحکام کیلئے وقف کردیا ہے تاکہ مابعد جنگ بیرونی مسابقت کی قوت کا مقابلہ کیا جاسکے اور فرسودہ مشنری کی ترمیم وتجدید عمل میں لائی جاسکے۔

۲۔ باقہارت مزدوروں کو روزگار فراہم کرنے کے لئے جنگلاتی اور معدنی وسائل سے کماحقہ استفادہ کیا جائے اور جاگ کے آبشار سے برقی قوت حاصل کرنے کی سکیم کو روبہ عمل لایا جائے۔

۳۔ میسور کی اہم صنعتوں یعنے لوہے اور فولاد اور کیمیائی مرکبات کے کارخانوں میں جو اشیاء مکمل طور پر تیار نہیں کیجاتیں انہیں جنگ کے بعد مکمل طور پر تیار کرنے کا انتظام کیا جائے۔

۴۔ موجودہ ہندوستان ایرکرافٹ کمپنی کو جنگ کے بعد قائم رکھنے اور اسے ریاست ہذا کے مفاد کے تحت چلانے کے لئے تجاویز مرتب کی جائیں۔

۵۔ موجودہ صنعتوں کی توسیع اور صنعتوں کے قیام کے لئے جو مشنری درکار ہوگی اس کے حصول کیلئے ابھی سے تدابیر اختیار کئے جائیں۔

۶۔ صنعتی ترقی کے لئے ایک علحدہ فنڈ کا قیام۔

حکومت میسور کی ہمیشہ سے یہ پالیسی رہی ہے کہ اندرون ملک مختلف صنعتوں کو فروغ دیاجائے چنانچہ اس نے اکثر صنعتیں اپنے ہی سرمایہ سے جاری کی ہیں اور صناعوں کو قرضے مہیا کئے ہیں لیکن اس امر کے مدنظر کہ صنعتوں کی قیمتوں کو ریاست ہذا کے تغیر پذیر موازنہ سے وابستہ کرنا مناسب نہیں ہے، حکومت نے یہ تہیہ کرلیا ہے کہ جنگ کے بعد صنعتی ترقی کے لئے ایک علحدہ فنڈ قایم کرے اور اس خصوص میں برطانوی ہند کے مختلف بنکوں جو اس ریاست میں کارگزار ہیں، نیز خانگی بنک کاروں یعنے ملتانیوں اور مارواڑیوں کی امداد حاصل کرے۔ اس طرح صنعتوں کے لئے سرمایہ فراہم کرنیکا مسئلہ حل ہوجائیگا۔

صنعت ریشم سازی میسور کی مشہور صنعت ہے۔ قابل فخر بات یہ ہے کہ اس نے بیرونی اور بالخصوص چین اور جاپان کی مسابقتی قوت کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ جنگ کی وجہ سے

ہوائی چھتریوں کے لئے ریشم کی طلب میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے جس کے باعث اس صنعت نے کافی ترقی کر لی ہے۔ چنانچہ اب شہتوت کا زیر کاشت رقبہ ۷ ۵ ہزار ایکڑ ہے۔ تجویز یہ ہے کہ جنگ کے بعد اس کی مزید توسیع عمل میں لائی جائے اور اسے عصری اصول پر چلایا جائے۔ یہ کام مجلس ریشم سازی سے متعلق کر دیا گیا ہے۔

مجلس تعلیمات صنعتی اور فنی تعلیم کی اسکیمیں بنانے میں مصروف ہے تاکہ جنگ کے بعد مختلف صنعتوں کے لئے عملہ دستیاب ہو سکے۔

علاوہ ازیں دیگر اور مسائل بھی ہیں جن پر حکومت میسور سنجیدگی کے ساتھ غور کر رہی ہے وہ یہ ہیں:—

(۱) میسور میں آجکل لوہے۔ سمنٹ اور چوبینہ کی قلت کی وجہ سے عمارات اور سڑکوں کی تعمیر کا کام رک گیا ہے۔ نیز موجودہ عمارات اور سڑکیں جنگی اغراض کے لئے مستعمل ہونیکی وجہ سے خراب ہو گئی ہیں۔ لہذا جنگ کے بعد تعمیرات عامہ کے کام کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گی۔ چنانچہ سڑکوں کی تعمیر کے علاوہ شہروں اور تمام اضلاعی و تعلقہ جاتی مستقروں میں عمارات بنانے کا ایک وسیع پروگرام مرتب کیا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں ریلوے کی توسیع۔ رولنگ اسٹاک کی تبدیلی اور نواحی ریلوے کے قیام اور برقابی کے مسائل بھی زیر غور ہیں۔

(۲) خیال یہ ہے کہ جنگ کے بعد فوجی رقبہ جات خانگی افراد کو واپس کرنے کی بجائے صنعتی۔ سکونتی اور نخل بندی کے اغراض کے لئے وقف کر دیا جائیگا۔

(۳) توقع کی جاتی ہے کہ جنگ سے واپس شدہ اشخاص کو روزگار فراہم کرنے اور جنگی سامان کو کام میں لانے کا مسئلہ صنعتی اور فنی تعلیم کی اسکیمیں روبہ عمل لانے سے خود بخود حل ہو جائیگا۔

(۴) تنظیم مابعد جنگ کی تمام تجاویز اور اسکیموں کو روبہ عمل لانے کیلئے ایک کثیر رقم کی ضرورت ہے جس کی فراہمی کے لئے حکومت میسور دانشمندی سے کام لے کر جنگ کی غیر متوقع آمدنیوں کو صنعتی ترقی آبپاشی اور تعمیرات کے فنڈ میں جمع کر رہی ہے۔ علاوہ ازیں ریاست ہذا میں اسیران

جنگ اور فوجوں کی موجودگی کی وجہ سے کثیر رقومات صرف کی جارہی ہیں اور فوجی گتہ واروں اور دیگر کاروباری اشخاص کو غیر معمولی منافعے حاصل ہورہے ہیں۔ چنانچہ حکومت اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے کہ کس طرح ان کثیر رقومات کو ملک ہی میں محفوظ کر کے جنگ کے بعد مختلف صنعتوں میں مشغول کیا جا سکتا ہے۔

کشمیر۔ حکومت جموں اور کشمیر کی تنظیم مابعد جنگ کی سرگرمیوں کو مندرجہ ذیل سات حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) برقی قوت: اس صنعت کو فروغ دینے کے لئے ایک بڑے فرم کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جس کی رپورٹ اب حکومت کے زیر غور ہے۔ چونکہ اس غرض کے لئے ضروری مشنری جنگ کے باعث درآمد نہیں کی جا سکتی لہذا حکومت نے اس کام کو بزمانہ مابعد جنگ انجام دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔

(۲) صنعت و حرفت: ریاست ہذا میں بعض صنعتیں معدنی وسائل کے استحصال میں معروف ہیں۔ مزید برآں حال ہی میں حکومت نے چند اور صنعتیں قائم کی ہیں جو معدنیات۔ ظروف سازی وغیرہ سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں جپسم (Gypsum)۔ باکزائیٹ (Bauxite) بوریاکس (Borax) وغیرہ جیسی دھاتیں بکثرت پائی جاتی ہیں اسلئے ان کے صنعتی استحصال کے بارے میں غور کیا جا رہا ہے۔

(۳) زراعت اور آبپاشی: ریاست ہذا کے مختلف حصوں میں غیر مزروعہ رقبوں کی کثرت کا خیال کرتے ہوئے حکومت کے پیش نظر زرعی ترقی کا ایک وسیع پروگرام ہے جس میں میوؤں کی پیدائش اور تحفظ بھی شامل ہے۔ لیکن حکومت پنجاب سے آبپاشی کے بارے میں جو معاہدے کئے گئے ہیں وہ اس خصوص میں رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں اسلئے کہ ان معاہدوں کے تحت کشمیر اور پنجاب کے جو مشترک دریا ہیں ان کے پانی کی تقسیم میں اول الذکر سے مساویانہ برتاؤ نہیں کیا گیا ہے۔ لہذا حکومت کشمیر محسوس کرتی ہے کہ ان معاہدوں کی نظر ثانی کی جائے۔ صوبہ لداکھ کی معاشی و زرعی ترقی کی ایک سکیم بھی زیر غور ہے جس کے تحت جنگ سے واپس شدہ فوجیوں کو علاقہ مذکور میں آباد کیا جائے گا۔

علاوہ ازیں آبپاشی کی سہولتوں کی فراہمی کے لئے حکومت نہریں تعمیر کروانا چاہتی ہے۔

(۴) جنگلات: اس امر کے مد نظر کہ زمانہ مابعد جنگ میں چوبینہ کی طلب بڑھ جائے گی حکومت نے اپنے قابل لحاظ جنگلاتی وسائل سے استفادہ کے لئے ایک پروگرام مرتب کیا ہے جسمیں پیدائش صحرا اور چراگاہیں بنانے سے متعلق اسکیمیں شامل ہیں۔ اسی طرح کوہستانی علاقوں میں دریا کی تربیت (River Training) کے مسئلہ کی جانب خاص توجہ کی جارہی ہے۔

(۵) ذرائع رسل ورسائل: ریاست ہذا میں ذرائع رسل ورسائل کی ترقی دشوار اور گراں خرچ ہے اسلئے کہ یہاں کوہستان بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اسکے باوجود دخانی اور برقی ریلوں کی تعمیر حکومت کشمیر کے پیش نظر ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ کوئلہ کی کان کنی کو فروغ دیا جائے اور ارزاں برقی قوت حاصل کیجائے۔

(۶) تعلیمات: نظری اور فنی تعلیم کا ایک پروگرام زیر غور ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ابتدائی اور ثانوی مدارس بتدریج قائم کئے جائیں اور فنی تربیت کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

(۷) صحت عامہ: اس امر کے مد نظر کہ صحت عامہ کے اداروں کی توسیع موزوں معیار قابلیت کے اشخاص کی دستیابی پر منحصر ہے۔ حکومت مذکورہ معیار کے اشخاص کی فراہمی کے بارے میں غور کررہی ہے۔

ٹراونکور: حکومت ٹراونکور نے تنظیم مابعد جنگ کے اغراض کے لئے ایک فنڈ قائم کیا ہے جس کیلئے فی الحال ۸۰ لاکھ روپیے مختص کئے گئے ہیں اور منشا یہ ہے کہ ختم جنگ تک حکومت کے موازنہ میں جتنی بچت ہوگی وہ سب اس میں جمع کردی جائیگی۔

حکومت جنگ کے بعد ایک ایسا معاشی نظام قایم کرنا چاہتی ہے جس میں زراعت اور حرفت دونوں ترقی یافتہ حالت میں ہوں اور ان کے مابین ایک بہتر توازن قایم رہے۔

سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ کم ازکم اشیائے خوردنی کی حد تک خود اکتفائی حاصل کی جائے افسوسناک امر یہ ہے کہ ریاست ہذا اپنے مطلوبہ اشیائے خوردنی کا ۶۰ فیصدی باہر سے درآمد

کرنے پر مجبور ہے۔ لہٰذا اس پریشان کن صورت حال کی اصلاح کے لئے یہ ضروری ہے کہ جنگ کے بعد زراعت کو ترقی دینا ہے۔ بدقسمتی سے ریاست ہٰذا میں قابل کاشت رقبہ محدود ہے۔ تاہم زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لئے حسب ذیل تدابیر اختیار کرنی ضروری ہیں۔

سائنسی اور مجموعی کاشت کے طریقہ پر عمل پیرائی، ارزاں کیمیائی کھاد کی تیاری، ارزاں قوت برقی کا حصول، ترقی یافتہ ذرائع آبپاشی کی تعمیر، فصلوں کی باقاعدہ پلاننگ اور زمین کی زرخیزی سے متعلق تجربات۔ چنانچہ اس خصوص میں عملی قدم بھی اٹھایا گیا ہے۔ مثلاً کھاد سازی کا ایک کارخانہ ایک کروڑ روپیے کے سرمایہ سے قائم کیا گیا ہے جس میں سے فی الحال ۲۵ لاکھ روپے کا سرمایہ اجرا کیا گیا ہے اور شہروں اور قصبات کے فضلہ اور کوڑے کرکٹ کو مرکب کھاد میں تبدیل کرنے کے بارے میں ایک مہم کا آغاز کیا گیا ہے۔ جامعہ ٹراونکور کے ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں زمین کے کیمیائی اجزا کے بارے میں تحقیق کا کام جاری ہے اور بالخصوص دھان کی بہتر اقسام دریافت کی جارہی ہیں۔ اسی طرح تقسیم و انتشار اراضی اور تشخیص زر مالگزاری کے مسائل بھی زیر غور ہیں۔ تجویز یہ ہے کہ چونکہ تشخیص زر مالگزاری کا موجودہ طریقہ غیر حکیمانہ اور غیر منصفانہ ہے اسلئے اراضی کی بار بار پیمایش اور بندوبست پر کثیر متوالی اخراجات لاحق ہوتے ہیں، لہٰذا اس کی بجائے زرعی آمدنیوں پر محصول عائد کرنے کا طریقہ رائج کیا جائے اور انتشار اراضی کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی ایک حد مقرر کی جائے جس کے باہر محصول عائد کیا جائے۔ اگر اراضی کی تنظیم رضاکارانہ اساس پر نہ ہوسکے تو قانون سے مدد لی جائیگی۔

زرعی ترقی کے ساتھ صنعتی ترقی کا پروگرام بھی مرتب کیا جارہا ہے۔ چونکہ ٹراونکور کے کارخانے برقی قوت سے چلتے ہیں لہٰذا جنگ کے بعد پلی وسال ہائیڈرو الکٹرک پراجکٹ کی توسیع عمل میں لائی جائیگی اور دیگر آبشاروں سے برقی قوت حاصل کرنے کے لئے مختلف اسکیموں کو عملی جامہ پہنایا جائیگا۔ علاوہ ازیں ریاست ہٰذا میں جو صنعتیں مثلاً مٹی کی صفائی، ظروف گلی، ربر، شکر سازی کیمیائی مرکبات۔ چٹائی وٹاٹ۔ کاغذ سازی۔ سوتی پارچہ بافی۔ المونیم اور شیشہ سازی وغیرہ قائم ہیں

ان کے علاوہ اور صنعتیں جیسے سمنٹ سازی، شکرسازی۔ کاسٹک سوڈا۔ سلفورک ایسڈ۔ پوٹاشیم کلورائٹ۔ امونیم سلفٹ، اسٹیک ایسڈ اور کیلسیم کاربونیٹ کی صنعتیں بھی قائم کی جائینگی۔ نیز دھاگہ فراہم کرنے کے لئے کتائی کے کارخانوں کے قیام اور روئی کی کمی کی تلافی کے لئے مصنوعی ریشم کی تیاری کے بارے میں تدابیر اختیار کی جارہی ہیں۔ مختصر یہ کہ تنظیم مابعد جنگ کا ایک مکمل پروگرام مرتب کیا جارہا ہے جس کے تحت زرعی جنگلاتی۔ معدنی اور آبی قوت کے وسائل سے پورا استفادہ کیا جائیگا اور ایسی کوئی بڑے پیمانے کی صنعت قائم نہ کی جائیگی جس کی مسابقت سے گھریلو صنعتیں تباہ و برباد ہوجائیں۔

مزید برآں ذرائع حمل ونقل (جن میں ساحلی آمدورفت کے ذرائع بھی شامل ہیں) کی توسیع و ترقی کے بارے میں بھی تجاویز مرتب کی جارہی ہیں۔ منشا یہ ہے کہ نئی سڑکیں تعمیر کی جائیں جن میں سے اکثر سڑکیں کانکریٹ سے بنائی جائینگی۔ جہازوں کا ایک بیڑہ حاصل کیا جائیگا تاکہ بحری حمل ونقل کے کاروبار باشندگان ریاست ہی کے ہاتھوں میں رہیں۔ حکومت نے اجناس کی حمل ونقل کے لئے متعدد جہاز تیار کئے ہیں اور مساعد حالات پیدا ہونے کے بعد بادبانی جہازوں کو برقی قوت سے چلنے والے جہازوں میں بدل دیا جائیگا۔

چونکہ ترقی کا کوئی پروگرام بغیر تعلیمی ترقی کے کامیاب نہیں ہوسکتا اسلئے تعلیمات سے متعلق ایک کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جو مروجہ نظام تعلیم کی تنقیح کرکے اسکو ضروریات مابعد جنگ کے مطابق بنانے کے بارے میں اپنی تجاویز پیش کریگی۔

حکومت مذکور مابعد جنگ معاشرتی تنظیم جدید کے مسائل پر بھی غور کررہی ہے۔ جنگ کی وجہ سے اعلیٰ وادنیٰ دونوں طبقوں کے درمیان ایک ارتباط پیدا ہوگیا ہے اور نئی معاشرتی قوتوں کے نمودار ہونے سے سوسائٹی کے مطمح نظر میں ایک غیر معمولی تغیر رونما ہوگیا ہے۔ لہذا اقتضائے وقت کا لحاظ کرتے ہوئے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ جنگ کے بعد ادنیٰ طبقوں کو معاشرتی قیودات سے آزاد اور پست اقوام کی معاشی حالت کو درست کیا جائے۔

آج سے سات سال قبل مہاراجہ ٹراونکور نے اچھوتوں کو مندر میں داخلہ کی اجازت دیکر سماج سُدھار کی جانب قدم اٹھایا تھا۔ بعد ازاں پست اقوام کی ترقی کے لئے مختلف تدابیر عمل میں لائی گئیں جیسے زمینات اور تعلیمی مراعات کا عطا کیا جانا اور اصول امداد باہمی پر صنعتوں کا قیام۔ منشا یہ ہے کہ مذکورہ بالا معاشرتی و معاشی پروگرام تنظیم مابعد جنگ کے عام پروگرام میں چند موزوں تبدیلیوں اور ترمیمات کے ساتھ ضم کیا جائے۔

گوالیار حکومت گوالیار نے تنظیم مابعد جنگ کے بارے میں اسکیمات مرتب کرنے کیلئے چھ کمیٹیاں قائم کی ہیں جن سے حسب ذیل موضوعات متعلق کئے گئے ہیں۔

۱۔ جنگ سے واپس شدہ اشخاص کے لئے روزگار کی فراہمی

۲۔ فروخت، سربراہی اور خریداری۔

۳۔ کارہائے عامہ، رسل و رسائل، آبپاشی اور تعمیرات۔

۴۔ صنعت و حرفت

۵۔ زراعت

۶۔ معاشرتی خدمات

کمیٹی نمبر (۱) جنگ سے واپس شدہ اشخاص کو زراعت یا دیگر پیشوں میں مصروف کرنے کے بارے میں اپنی سفارشات پیش کرے گی۔ ان میں جو میکانی یا فنی تربیت حاصل کر چکے ہیں انہیں صنعتی کارخانوں اور محکمۂ تعمیرات میں جذب کیا جائیگا۔

جب بزمانۂ مابعد جنگ وہ کارخانے جو اب کارہائے جنگ میں مصروف ہیں بند کئے جائینگے اور ان کی کارآمد مشین اور کل پرزے فروخت کئے جائینگے تو اس وقت حکومت اور مقامی صنعتی اداروں کو چاہئے کہ وہ دیسی صنعتوں کی ترقی کے لئے مشین اور آلات حاصل کریں۔

کمیٹی نمبر (۲) کا کام یہ ہے کہ وہ ان میں سے مفید مطلب مشینوں جیسے ریلوے انجن، برقی قوت پیدا کرنے والے پلانٹ، اسٹیم رولر، ٹریکٹر وغیرہ کا انتخاب کرکے انہیں کمترین قیمت پر حاصل کرنیکی

تدابیر پر غور کرے۔

کمیٹی نمبر (۳) کے تفویض یہ کام ہے کہ وہ ٹرنک اور دیہی دونوں قسم کی سڑکوں کا ایک پروگرام مرتب کرے جس میں خزانہ ہائے آب برائے آبپاشی اور نہروں کی تعمیر، ڈرینج، آبرسانی، ہائیڈرو الکٹرک اور دیہاتوں میں روئی اوٹنے وغیرہ کے کارخانوں اور گھریلو صنعتوں کے لئے برقی قوت کی فراہمی سے متعلق اسکیمات بھی شامل ہونگی۔

کمیٹی نمبر (۴) ریاست ہذا کے قدرتی وسائل کو ترقی دینے کے بارے میں تجاویز پیش کرے گی۔ جنگلاتی اور معدنی وسائل سے استفادہ کیلئے کیمیا کے محققین کی خدمات حاصل کی جارہی ہیں۔ ریاست ہذا میں اعلیٰ قسم کی ابرک پائی جاتی ہے جس سے ریڈیو کنڈنسر وغیرہ بنانے کی تجویز زیر غور ہے۔ اسی طرح رنگین مٹی کی دستیابی کی وجہ سے پینٹ اور وارنش کی نیا کٹری کا قیام عمل میں لایا جارہا ہے۔ علاوہ ازیں کھاد سازی، کیمیائی مرکبات کی تیاری، جنگلاتی پیداوار کے صنعتی استعمال، روغن سازی، کاغذ سازی اور شیشہ سازی کی صنعتوں کے قیام کے امکانات کی تحقیق کیجارہی ہے۔ مزید برآں بیرون ٹریننگ اسکیم کے تحت متعدد اشخاص کو میکانی اور فنی تربیت کیلئے بیرونی ممالک کو روانہ کیا گیا ہے اور جنگ کے بعد تمام صنعتوں میں انکی خدمات سے استفادہ کیا جائیگا۔

کمیٹی نمبر (۵) ریاست ہذا کی زرعی دولت میں اضافہ کرنے کے لئے ماہرین زراعت، نظریات وحشراتیات کی خدمات حاصل کر رہی ہے۔ تنظیم دیہی کی ایک بڑی اسکیم مرتب کی گئی ہے جس کے لئے ایک کروڑ روپے مختص کئے گئے ہیں۔ جنگ کے بعد زرعی ترقی اور تنظیم دیہی کا کام اس ادارہ کے سپرد کیا جائیگا جو اب "غلہ زیادہ اُگاؤ" کی مہم کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں نل دار باؤلیوں کی تعمیر، افزائش نسل مویشی، مرغبانی، مگس پروری، ریشم سازی، سگریٹ سازی کیلئے ورجینیا تمباکو کو خشک کرنے وغیرہ سے متعلق اسکیمیں مرتب کی جارہی ہیں۔

کمیٹی نمبر (۶) کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ تعلیمی اور طبی سہولتوں کی فراہمی اور معاشرتی خدمات کی اصلاح و ترقی کے بارے میں تجاویز پیش کرے۔

جے پور | حکومت جے پور نے ماہ جولائی ۱۹۴۳ء میں ایک تنظیم مابعد جنگ کی کمیٹی قائم کی تھی جس کے تحت چار ذیلی کمیٹیاں زراعت، صحت عامہ و اغذیہ، تعلیمات اور صنعت و حرفت سے متعلق قائم کی گئی تھیں۔ اوّل الذکر تین ذیلی کمیٹیوں نے اپنی رپورٹ پیش کر دی ہے اور چوتھی ذیلی کمیٹی کی رپورٹ عنقریب مکمل کیجائیگی۔

ذیلی کمیٹی نمبر (۱) نے زراعت سے متعلق ایک پنج سالہ لائحہ عمل مرتب کیا ہے۔ اس کے تحت ۱۲ لاکھ بیگھے قابل کاشت غیر مزروعہ اراضی زیر کاشت لائی جائیگی جسکے مصارف ۲½ کروڑ روپیے ہونگے۔ یہ زمین جنگ سے واپس شدہ فوجیوں اور تعلیم یافتہ اشخاص کو دیجائیگی اور اس غرض کیلئے نو آبادیاں قائم کیجائینگی علاوہ ازیں غذائی اور تجارتی فصلوں کے درمیان ایک صحیح توازن قائم کیا جائے گا تاکہ ریاست ہذا کی حقیقی ضروریات کی تکمیل اچھی طرح ہوسکے۔ حکومت کی جانب سے تخموں کی تقسیم کا اہتمام کیا جائیگا اور زرعی آلات بنانے کا ایک کارخانہ قائم کیا جائیگا۔ اسی طرح مویشیوں کے امراض کو دور کرنے اور ان کی نسل کی اصلاح کی جانب زیادہ توجہ کی جائیگی اور چارہ کے ذخیرے قائم کرنیکی سہولتیں بہم پہنچائی جائینگی۔ اجناس کی پیدائش فروخت اور کاشت اصول امداد باہمی کے تحت ہوگی اور مہاجنی لین دین کی نگرانی اور رسومات پر مسرفانہ صرفہ کی تحدید کیلئے قوانین نافذ کئے جائینگے۔ اسی طرح جنگلاتی وسائل کو ترقی دیجائیگی۔ منتخبہ رقبوں میں مثالی دیہات قائم کئے جائینگے۔

کمیٹی نمبر (۲) نے صحت عامہ سے متعلق ایک وسیع پروگرام مرتب کیا ہے جو تعمیر امکنہ، طبی امداد اور تبلیغ صحت کے مدات پر مشتمل ہے، دیہاتیوں کی صحت کے معیار کو بلند کرنے میں پنچایتوں سے امداد حاصل کیجائیگی اور محصول صحت بھی عائد کیا جائیگا۔ صحت بخش غذا کی فراہمی کے لئے فصلوں کی ایسی تنظیم عمل میں لائی جائیگی جس کے تحت اجناس کی مقدار اور خوبی میں اضافہ ہو جائیگا۔ کمیٹی مذکور نے، آلو، والیں، سویابین، دودھ میوے اور ترکاریوں کو پیدا کرنے کے بارے میں سفارشات پیش کی ہیں۔ اس خصوص میں ایک طویل المیعاد غذائی پالیسی اختیار کیجائیگی اور ممکن ہو تو اس غرض کے تحت ایک علحدہ محکمہ اغذیہ کا قیام عمل میں لایا جائیگا علاوہ ازیں بہتر اور متوازن غذا کے بارے میں صحیح معلومات کتابچوں کے ذریعہ فراہم کئے جائینگے۔

کمیٹی نمبر (۳) نے تعلیمات سے متعلق ایک لائحہ عمل مرتب کیا ہے جسکے تحت ابتدائی تعلیم کو ہمالی کی

مدت میں عام کیا جائیگا۔ اس ضمن میں جو اخراجات لاحق ہونگے ان کی پابجائی ایک حد تک محصول تعلیم سے کیجائیگی۔ تجویز یہ ہے کہ ہر سال ۲۰۰ نئے مدارس قائم کئے جائیں۔ مدرسین کی تربیت کا خاص اہتمام کیا جائے اور تعلیم بالغان کے وسیع انتظامات عمل میں لائے جائیں۔ جنوبی ہند کیلئے ایک جامعہ کا قیام بھی زیر غور ہے جس کے تحت پیشہ ورانہ کلیات بھی قائم کئے جائینگے۔ اس جامعہ میں علمی تحقیق کو نمایاں حیثیت دی جائیگی اور اس خصوص میں جامعہ، ترقیات عامہ سے متعلق سرکاری محکموں اور بڑے بڑے خانگی صنعت گروں کے درمیان اشتراک عمل قائم کیا جائیگا۔ دہلی کی طرح یہاں بھی مختلف قسم کی فنی تربیت کیلئے ایک پالی ٹکنک (Polytechnic) کا قیام عمل میں لایا جائیگا۔

کمیٹی نمبر (۴) ایک وسیع صنعتی پروگرام مرتب کر رہی ہے۔ اس کی سفارشات دو حصوں میں منقسم کی جاسکتی ہیں قلیل المیعاد اور طویل المیعاد۔ پہلے حصے میں وہ سفارشات ہیں جو جنگ کے بعد فوجیوں اور حربی کارخانوں کے فنی عملہ کو مختلف صنعتوں میں جذب کرنے سے متعلق ہیں۔ اس غرض کے لئے کارہائے عامہ کا پروگرام نافذ کیا جائیگا اور اس سلسلہ میں جو غیر معمولی مصارف لاحق ہونگے ان کی ادائی کے لئے قرضے حاصل کئے جائینگے۔ دوسرے حصے میں وہ سفارشات ہیں جو ریاست ہذا کی عام صنعتی ترقی سے متعلق ہیں۔ تجویز یہ ہے کہ صنعتیں خانگی افراد کے ہاتھوں ہی میں رہیں اور حکومت ان کی امداد مختلف ذرائع سے کرے۔ کمیٹی مذکور نے بڑے پیمانے کی صنعتوں کی تنظیم کے بارے میں عام اصول پیش کئے ہیں اور ان صنعتوں کی ایک فہرست بھی مرتب کی ہے۔ گھریلو صنعتوں کے بارے میں ایک وسیع اسکیم مرتب کی گئی ہے جو حسب ذیل تجاویز پر مشتمل ہے:۔

۱۔ حکومت کی جانب سے ادارۂ مصنوعات ملکی اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اس کی شاخوں کا قیام

۲۔ صناعوں کی تربیت اور ان کے کام کو صارفین کی ضروریات اور مذاق کے مطابق بنانے کے لئے ایک پالی ٹکنک کا قیام۔

۳۔ فراہمی سرمایہ اور فروخت پیداوار کے لئے انجمن ہائے امداد باہمی کا قیام (۴)

۴۔ زرعی صنعتوں اور بالخصوص اون، افزائش نسل مویشی اور دستی دھاگہ صنعتوں کا قیام۔
اس کے علاوہ معدنیاتی اور برقی قوت کی صنعتوں کی ترقی، سڑکوں کی تعمیر، مختلف ذرائع حمل و نقل کے درمیان اشتراک عمل پیدا کرنے کے لئے ایک مجلس کے قیام، قوانین مزدوران بالخصوص بیمۂ بیماری کی اسکیم کے نفاذ کے بارے میں بھی سفارشات پیش کی گئی ہیں۔
کمیٹی مذکور نے اس امر کی بھی سفارش کی ہے کہ معاشیین اور شماریین کا ایک مختصر سا عملہ مستقل طور پر متعین کیا جائے جس کو معاشی معلومات کی فراہمی اور تجزیہ اور معاشی معاملات میں حکومت کو مشورہ دینے کا کام سپرد کیا جائے۔

بھرت پور: یہ ایک چھوٹی سی ریاست ہے جس کا سالانہ موازنہ صرف ۳۲ لاکھ ہے۔ اس کے موازنہ پر قرضہ کا بار ہے اور ہر سال اس مد کے تحت ۵ لاکھ روپے ادا کئے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود حکومت بھرت پور نے تنظیم مابعد جنگ کا ایک وسیع لائحہ عمل مرتب کیا ہے جس کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(الف)۔ مالیات۔ (۱) مذکورہ بالا قرضہ جلد از جلد ادا کرنے کی کوشش کی جائیگی۔
(۲) جن کارہائے عامہ کی تکمیل فی الحال ضروری نہیں ہے ان کا پروگرام بزمانۂ مابعد جنگ نافذ کیا جائیگا تاکہ جنگ سے واپس شدہ فوجیوں کو روزگار فراہم ہو سکے۔
(۳) تنظیم مابعد جنگ کیلئے ایک فنڈ قائم کیا گیا ہے جس میں فی الحال ۵ لاکھ روپیے جمع کئے گئے ہیں۔
(۴) زمینداروں کو ایک مہم کے ذریعہ ترغیب دیجائیگی کہ وہ اپنی زاید پیداوار کو فروخت کرکے اپنی رہن شدہ زمینات واپس حاصل کرلیں اور
(۵) بزمانۂ مابعد جنگ شرح سود کو گھٹانے کے لئے ایک معین پالیسی اختیار کیجائیگی۔

(ب)۔ آبپاشی۔ (۱) جمنا کی نہروں کی توسیع عمل میں لائی جائے تاکہ ان سے ریاست ہذا مستفید ہو سکے اور اسکے معاوضہ میں حکومت صوبۂ متحدہ کو محصول ادا کیا جائے۔
(۲) جہاں کہیں ممکن ہو وہاں تالابوں کے تمام بندوں کو مستحکم اور پختہ بند تعمیر کئے جائیں اور

(۳) آبپاشی کے بڑے کنوؤں کی تعمیر کے لئے ارزاں شرح سود پر قرضے مہیا کئے جائیں۔

(ج)۔ اصلاح اراضیات۔

۱۔ جن رقبوں میں شورہ دار مٹی ہے انہیں قابل کاشت بنانا ۲۔ جن رقبوں میں ریت پائی جاتی ہے انہیں قابل کاشت بنانا ۳۔ ناقابل کاشت رقبوں میں جنگل اگانا اور قابل کاشت رقبوں کو درختوں جنگلوں اور چراگاہوں سے پاک کرنا۔

(د) امیوانی۔ اور دیسی قسم کے مویشیوں کی اصلاح ۲۔ دودھ کی صنعت کو فروغ دینا ۳۔ مرغبانی کے مزرعوں کا قیام اور ۴۔ علاج حیوانات کے مزید پانچ دواخانوں کا قیام۔

(ھ) زراعت۔

۱۔ مظاہرہ کنندوں کی تربیت ۲۔ تخم کی اصلاح ۳۔ باغاتی پیداوار، خوشبودار پودوں اور پھولوں کی کاشت ۴۔ کھاد سازی کی تربیت ۵۔ فصل کا بیمہ ۶۔ تمس پروری اور ۷۔ لاکھ کی کاشت۔

(و) ۱۔ بھرت پور کی صوبہ متحدہ کے برقی گرڈ سسٹم میں شرکت ۲۔ بانات استفادہ کیلئے بھاری کیمیائی صنعت کا قیام ۳۔ تیل کے کارخانوں کا قیام ۴۔ صنعت کاغذ سازی اور تختہ سازی کا قیام ۵۔ صنعت شیشہ سازی کا قیام ۶۔ صنعت رنگ سازی کا قیام ۷۔ دودھ اور مکھن کو ٹن میں محفوظ کرنا ۸۔ میوؤں کو ڈبوں میں محفوظ کرنا ۹۔ انڈوں سے مختلف اشیاء تیار کرنا ۱۰۔ خس، پھولوں اور خوشبودار پودوں سے تیل نکالنے کے لئے ایک کارخانہ کا قیام ۱۱۔ گھریلو صنعتوں جیسے کتائی، دستی دستکاری، ادنی بنائی، سندل اور ہاتھی دانت کے پنکھے اور چوڑیاں، ہاتھی دانت کی چٹائیاں، پارچہ پر چھاپہ لگانے، کھلونے اور چوڑیاں بنانے کی صنعتوں کا قیام۔

(ز) رسل و رسائل

۱۔ بھرت پور۔ الور ریلوے کی تعمیر اور ۲۔ سڑکوں کی تعمیر کا کام جو تجاویز پر وگرام میں داخل ہے

(ح) صحت عامہ

۱۔ بھرت پور کے لئے ایک دواخانہ کا قیام۔ ۲۔ مزید دس دواخانوں کا قیام۔ ۳۔ مزید پانچ زچگی خانوں کا قیام۔ ۴۔ ۳۰ دیوان کا تقرر۔ ۵۔ ایک محکمۂ صحت عامہ کا قیام۔ ۶۔ بھرت پور ڈگ اور بایانہ کیلئے صاف کئے ہوئے آب نوشیدنی کی سربراہی۔ ۷۔ انسداد ملیریا کے تدابیر پر عمل پیرائی۔ ۸۔ مکانات کو مچھروں سے محفوظ رکھنے کیلئے ماسکٹو پروف کا استعمال۔ ۹ مٹھائیوں اور اشیائے خوردنی کو مکھیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے فروشندوں کو فلائی پروف کی فراہمی۔ ۱۰۔ صلیب احمر کی مستقل کارگزاری۔

(ط) تعلیمات:

۱۔ بھرت پور کے کالج کی توسیع اور فنی جماعتوں کا قیام۔ ۲۔ ڈگ اور بایانہ کے مقامات پر دو مدارس فوقانیہ کا قیام۔ ۳۔ بھرت پور میں ایک فوقانیہ نسواں کا قیام۔ ۴ تعلیم بالغان کی مہم کا آغاز۔ ۵۔ دار المطالعوں کا قیام۔

مندرجہ بالا پروگرام کی تفصیلات پیش کرنے کے لئے مختلف کمیٹیاں قائم کی جا رہی ہیں صنعتی اسکیموں کے نفاذ کے لئے متعدد مشترک سرمایہ دار کمپنیوں کی رجسٹری مقامی طور پر ہو چکی ہے اور اب صرف حکومت ہند کی تصدیق اور مشنری اور سامان کی درآمد کی سہولتیں فراہم کئے جانے کا انتظار کیا جا رہا ہے اس کے علاوہ فوج کی بہبودی کے لئے مقامی طور پر جو فنڈ قائم کیا گیا تھا اس میں مزید پانچ لاکھ روپے جمع کئے جائینگے اور اس میں وہ رقومات بھی شامل کی جائینگی جو حکومت ہند کے فوجی تنظیم جدید کے فنڈ سے عطا کی جائیں اور یہ فنڈ جنگ کے بعد فوجیوں کی فلاح اور بہبود کے لئے وقف کر دیا جائے گا۔

سید محمد تقی ہاشمی ام۔ اے (معاشیات) ام۔ اے (انگریزی)

سترہویں صدی کی ابتداء میں ہندوستان کی آبادی

آبادی کی تعداد: ہندوستان میں پہلی مردم شماری ۱۸۷۲ء میں ہوئی۔ اس کے بعد سے اب تک، ہر دس سال کے وقفے سے، مختلف مردم شماریاں ہوتی رہی ہیں۔ ان کی مدد سے ہم آبادی کے مختلف پہلوؤں کا آسانی کے ساتھ مطالعہ کرسکتے ہیں۔ لیکن سترہویں صدی کی ابتداء میں یہ بتانا کہ اُس وقت، مختلف نقاط نظر سے، ہندوستانی آبادی کی کیا حالت تھی بہت مشکل کام ہے۔ کیونکہ ہمیں اُس دور کی آبادی کے اعداد نہیں ملتے۔ ہم عصر تاریخی کتابوں میں زیادہ تر رزمیہ کارناموں اور سیاسی تبدیلیوں کا ذکر کرسکتا ہے۔ اس دقت کے باوجود مورلینڈ نے، حسب ذیل دو طریقوں سے، اُس زمانہ کی آبادی کا تخمینہ پیش کیا ہے۔

(۱) جنوبی ہند کی آبادی :- دکن اور وجیانگر کی آبادی کا تخمینہ کرنے کے لئے مورلینڈ نے فوج کی تعداد سے مدد لی ہے۔ اُس نے بتایا ہے کہ ۱۹۱۴ء میں جب کہ فرانس اور جرمنی کی آبادی بالترتیب ۴۱ اور ۳۲ ملین تھی تو ان ملکوں نے ایک ایک ملین (دس لاکھ) فوج کو متحرک کیا تھا۔ مختلف تاریخی حوالوں سے اُس نے اندازہ لگایا ہے کہ دکن اور وجیانگر سے مجموعی طور پر ایک ملین فوج میدان جنگ میں اُتاری جاسکتی تھی۔ لہذا وہ کہتا ہے کہ دکن اور وجیانگر سے ایک ملین فوج تیار کئے جاسکنے کے یہ معنیٰ ہیں کہ یہاں کی آبادی بھی ۳۰ ملین کے لگ بھگ ہوگی۔

(۲) شمالی ہند کی آبادی :- شمالی ہند کی آبادی کا تخمینہ کرنے کے لئے مورلینڈ نے فوج کی تعداد سے مدد نہیں لی کیونکہ اُسے یہاں کی فوجوں کا تشفی بخش مواد نہیں مل سکا۔ اس دقت کے پیش نظر اُس نے شمالی ہند کی آبادی کے تخمینے کے لئے زراعت کے حالات سے مدد لی ہے۔ کثرت

کاشت کو کثرت آبادی کا معیار قرار دیتے ہوئے اندازہ لگایا ہے کہ شمالی ہند کی آبادی ۴۰ ملین ہوگی۔ مگر اس تخمینے میں بنگال، گجرات اور بعض دوسرے حصوں کی آبادی شامل ہے۔ ان علاقوں کی آبادی کو شامل کرنے کے بعد وہ کہتا ہے کہ شمالی ہند اور دوسرے ملحقہ علاقوں کی آبادی ۷۰ ملین ہوگی۔

(۳) کل ہند آبادی :- جنوبی اور شمالی ہند کے تخمینوں (۳۰ ملین + ۷۰ ملین) کے لحاظ سے ہندوستانی آبادی کی کل تعداد ۱۰۰ ملین یعنی دس کروڑ بتائی گئی ہے۔ مورلینڈ نے اس کی صراحت کی ہے کہ آبادی کا تخمینہ اس طور پر کیا گیا ہے کہ ۱۰۰ ملین سے آبادی کے کم ہو جانے کا بہت کم امکان ہے۔ البتہ اس کے بڑھ جانے کے امکانات بہت قوی ہیں۔

(۴) مورلینڈ کے تخمینے پر اعتراضات :- اوپر جو تخمینہ پیش کیا گیا ہے اس پر مختلف اعتراضات کئے جا سکتے ہیں : پہلا یہ کہ فرانس، جرمنی اور ہندوستان کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات مختلف ہیں اس لئے ان ممالک کے تخمینوں کو ہندوستان پر منطبق کرنا درست نہیں۔ دوسرے یہ کہ فرانس اور جرمنی کے اعداد ۱۹۱۴ کے ہیں۔ انہی اعداد کا اطلاق سترہویں صدی کے ہندوستان پر کرنا کس حد تک درست ہے؟ تیسرے یہ کہ یہ تخمینہ اس مفروضے پر مبنی ہے کہ فرانس، جرمنی اور ہندوستان میں فوجی بھرتی کا ایک ہی معیار تھا حالانکہ مقامی حالات کی مناسبت سے اس میں بہت کچھ اختلاف ہو سکتا ہے۔ چوتھے یہ کہ شمالی ہند کے بارے میں زرعی حالات کی مدد سے جو تخمینہ کیا گیا ہے اس کی کوئی مدلل بنیاد نہیں پیش کی گئی۔ ان حالات میں مورلینڈ کے تخمینے سے اختلاف کی بڑی گنجائش نکلتی ہے۔ چنانچہ اس نے اس تخمینے کے متعلق بہت سرسری ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

شہری آبادی : مختلف سیاحوں اور مورخوں کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے اکثر شہر گنجان تھے۔ جوردین کہتا ہے کہ آگرہ دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں سے ایک تھا۔ تھیونوٹ نے لکھا ہے کہ آگرہ ایسا ہی آباد تھا جیسا کہ ایک بڑے شہر کو آباد ہونا چاہیے۔ رالف فنچ نے بتایا ہے کہ آگرہ اور فتح پور سیکری — ان میں سے ہر ایک لندن سے

بڑا تھا۔ برنیر نے لکھا ہے کہ دہلی پیرس سے کچھ کم نہیں تھی اور آگرہ دہلی سے بڑا تھا
ڈ تھی۔ لاول نے سورت کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بھی مثل دوسرے شہروں کے بہت آباد تھا
گجرات کے متعلق بھی گنجان آبادی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ۱۴۰۰ء میں کونٹی نے وجیانگر کے
بارے میں لکھا ہے کہ "یہاں لوگوں کی تعداد یقین سے بالاتر تھی"۔ ایرانی سفیر عبدالرزاق نے
جو تقریباً اسی زمانہ میں وجیانگر میں موجود تھا، لکھا ہے کہ "اس سلطنت میں اسقدر زیادہ
آبادی تھی کہ اس کا کوئی اندازہ بیان میں آنا ممکن نہیں"۔ ایک صدی بعد پیس نے
یہ رائے ظاہر کی ہے کہ تمام ملک شہروں، قصبوں اور دیہات سمیت کثرت کے ساتھ
آباد تھا۔ دکن کے دوسرے علاقوں کے متعلق بھی گنجان آبادی کے بیانات ملتے ہیں۔ اکبر کی
وفات کے نصف صدی بعد تھیونوٹ نے اورنگ آباد سے گولکنڈہ تک آبادی کی
کثرت دیکھی۔ دکن میں ٹیورنیر کی سیاحتوں کے تذکروں سے بھی گنجان آبادی کا ثبوت
ملتا ہے۔

مورلینڈ نے تخمینہ کیا ہے کہ شہروں کی آبادی ڈھائی اور پانچ لاکھ کے درمیان
ہوگی۔ دیہاتی آبادی کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ شہری آبادی کے مقابلے میں اسکا
تناسب آجکل سے بہت زیادہ ہوگا کیونکہ دورحاضرہ میں حمل ونقل اور ذرائع خبررسانی
کی ترقی کی وجہ سے شہری آبادی کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔

آبادی کی مذہبی تقسیم (۱) ہندو:— موجودہ دور کی طرح ہندوں کی اکثریت تھی بالخصوص
دیہاتوں میں تقریباً تمام آبادی ہندو تھی۔ ذات پات کے طریقے پر آج کل سے بہت زیادہ
عمل ہوتا تھا۔

(۲) مسلمان:— اس دور کے مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:
(i) ساحل کے عرب و ایرانی اور (ii) شمالی ہند کے مسلمان۔
(i) ۱۰۰۰ء کی ماسبق صدیوں میں عربوں اور ایرانیوں نے مغربی ساحل سے بیکرا بنائے

ملاکا تک ۔ بحر ہند کی تجارت پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہندوستان کے دونوں جانب بندرگاہوں پر انھوں نے اپنی بستیاں قائم کی تھیں۔ یہ لوگ تجارت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ بھی کرتے تھے۔ چنانچہ بندرگاہوں پر نومسلموں کی چھوٹی بڑی جماعتیں پائی جاتی تھیں سولھویں صدی کی ابتداء میں پرتگالیوں نے ان سے وہ زبردست تجارتی تفوق چھین لیا جو انہیں بحیرۂ ہند میں حاصل تھا۔

(ii) شمالی ہند کے مسلمان دو حصوں میں منقسم تھے: ایک وہ جو مغلوں سے پہلے ہندوستان میں آ چکے تھے۔ دوسرے وہ جو مغلوں کے ساتھ ہندوستان آئے۔ بابر اور ہمایوں کے خلاف جو لڑائیاں ہوئیں ان میں پہلی قسم کے مسلمانوں نے بالعموم ہندوستان کا ساتھ دیا۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ شمالی اور جنوبی ہند میں مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد تھی۔

(۳) دوسرے مذہب کے لوگ:۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذہب کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں مثلاً یہودی، ارمینی، پارسی اور پرتگالی۔ یہودی اور ارمینی تعداد میں بہت تھوڑے تھے لیکن تجارتی زندگی میں انہیں کافی اہمیت حاصل تھی۔ ۱۶۱۶ء میں پارسیوں کے متعلق ٹیری نے لکھا ہے کہ ان کا عام پیشہ کاشتکاری تھا۔ اس کے کچھ عرصے بعد منڈی نے لکھا ہے کہ وہ کھجور کے درختوں کی کاشت کرتے تھے۔ جہاں تک پرتگالیوں کا تعلق ہے یہ سولھویں صدی کی ابتداء سے ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہوئے۔ مغربی ساحل اور آبنائے ملاکا میں اپنی تجارتی بستیاں قائم کیں۔ گوآ کا شہر ان کا صدر مقام تھا۔ سینٹ تھومی اور دوسرے مقامات میں ان کے قدم جمے ہوئے تھے۔ لاہور اور بعض دوسرے علاقوں میں ان کے نمائندے تجارت کی غرض سے جاتے تھے۔ پرتگالی، تجارت کے علاوہ اپنے مذہب کی تبلیغ بھی کرتے تھے۔

پیشوں کے لحاظ سے آبادی کی تقسیم | (۱) زراعت:۔ ہندوستان میں زراعت کو بہت قدیم زمانے سے

اہمیت حاصل ہے۔ جب کبھی ہندوستان کی قدیم صنعتی عظمت کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس زمانہ میں زرعی آبادی کے مقابلے میں صنعتی آبادی زیادہ تھی۔ تعداد کے لحاظ سے زرعی آبادی کو ہندوستان میں ہر وقت اہمیت حاصل رہی ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ دور حاضرہ میں آبادی کے اضافے اور غیر زراعتی پیشوں کی کمی کی وجہ سے زراعت پر بہت زیادہ بار ہو گیا ہے۔ سترھویں صدی میں بھی لوگوں کا عام پیشہ زراعت تھا۔ دیہات بہت زیادہ خود مکتفی حیثیت رکھتے تھے۔ آجکل کی طرح حکومت کی آمدنی کا بڑا ذریعہ مالگذاری تھی۔

(۲) جنگلات :۔ جنگلات کی حفاظت اور ان سے استفادے کا باضابطہ انتظام نہیں تھا۔ حمل و نقل کے ذرائع بہت ناقص ہونے کی وجہ سے گھنے جنگلوں تک پہنچنا مشکل تھا۔ درندوں اور دوسرے خونخوار جنگلی جانوروں کا ڈر بہت زیادہ تھا۔ ان دقتوں کی وجہ سے بہت کم لوگ جنگلات سے روزی حاصل کرتے تھے۔ کاشتکار اور دوسرے دیہاتی عموماً ذاتی طور پر جنگلوں سے لکڑی فراہم کر لیتے تھے اسلئے جنگلاتی پیداوار کی تجارت بھی مقابلتاً بہت محدود تھی۔

(۳) ماہی گیری :۔ زراعت کی طرح ماہی گیری بھی ہندوستان کا بہت قدیم پیشہ ہے۔ آئین اکبری میں لکھا ہے کہ مچھلی بنگال۔ اڑیسہ اور سندھ کے باشندوں کی غذا کا ایک اہم جزو تھی۔ مختلف سیاحوں نے بتایا ہے کہ وہ جنوبی ہند میں بھی عام طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ بعض مرتبہ اسے سکھا کر جہازوں کی اشیائے خوراک میں شریک کیا جاتا تھا۔ سندھ میں مچھلی کا تیل تیار کیا جاتا تھا۔ ۱۶۱۶ء میں تھیونوٹ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سندھ میں مچھلی، کھاد کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ ان حوالوں کی موجودگی میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ آجکل کی طرح سترھویں صدی میں بھی ماہی گیری کے کام میں بہت سے لوگ مشغول تھے۔ بالخصوص دیہی اور ساحلی علاقوں میں خاصی آبادی کا

مستقل پیشہ ماہی گیری تھا۔

(۴) کان کنی:۔ (i) سونے کی پیدائش بہت تھوڑی تھی۔ جنوبی ہند کے سیاحوں نے اس بارے میں سکوت اختیار کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میسور میں سونے کی کانوں پر ابھی کام نہیں شروع ہوا تھا۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ شمالی ہند کے بعض حصوں میں دریائی ریت کو دھو کر سونا نکالا جاتا تھا۔

(ii) چاندی بہت تھوڑی مقدار میں حاصل ہوتی تھی۔ ابوالفضل نے بیان کیا ہے کہ آگرے میں ایک کان تھی مگر اس پر کام کرنا نفع بخش ثابت نہیں ہوا۔ بعض بیانوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دریاؤں کی ریت کو چھان کر چاندی نکالی جاتی تھی۔

(iii) پارہ ہندوستان میں نہیں پیدا کیا جاتا تھا۔ مقامی اغراض کے لئے اس کی درآمد باہر سے ہوتی تھی۔ سیسے اور جست کی کچھ مقداریں راجپوتانے سے حاصل کی جاتی تھیں لیکن ان کی سربراہی زیادہ تر باہر سے ہوتی تھی یہی حال ٹین کا تھا۔ شمالی ہند میں تانبا مقامی کانوں سے نکالا جاتا تھا لیکن جنوبی ہند میں اس کی درآمد سمندری علاقوں سے ہوتی تھی۔

(iv) لوہے کی حد تک سارے ملک کو اپنے وسائل پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ جنوبی ہند سے لوہے کی برآمد پابندی کے ساتھ ہوتی تھی۔ شمال کے بارے میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ بنگال، الہ آباد، آگرہ، بہار، گجرات دہلی اور کشمیر میں یہ دھات پیدا کی جاتی تھی۔

(v) نمک کی پیداوار کو کافی اہمیت حاصل تھی۔ مقامی صرف کے لئے باہر سے کچھ زیادہ درآمد کے حوالے نہیں ملتے۔ جھیل سانبھر، پنجاب کی کانوں اور سمندر کے پانی سے نمک حاصل کیا جاتا تھا۔

(vi) شورے کی پیداوار بھی اہمیت رکھتی تھی۔ سہاگہ، پیلی مٹی اور پھٹکری بھی نکالی جاتی تھی لیکن ان چیزوں کی پیداوار بہت محدود تھی۔ جن حصوں میں عمارت کا پتھر پایا جاتا تھا اس کی کھدائی کی جاتی تھی، مگر حمل و نقل کی دقتوں کی وجہ سے دور دراز مقامات تک

اس کی منتقلی بہت مشکل تھی۔

(vii) دکن میں ہیرے کی کانوں پر کام ہوتا تھا چنانچہ ٹیورنیر نے اس کی مکمل کیفیت بیان کی ہے۔ اس نے ان کانوں پر کام کرنے والوں کی تعداد ۶۰ ہزار بتائی ہے مگر مورلینڈ اسے مبالغہ تصور کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہیرے نکالنے کے کام میں بہت سے لوگ مصروف تھے۔

مجموعی طور پر کان کنی کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ اس زمانے میں یہ کام ابتدائی حالت میں تھا تاہم اس کے ذریعہ ملک کی قابل لحاظ آبادی کو روزگار ملتا تھا۔

(۵) صنعت و حرفت، تجارت اور حمل و نقل کے کاموں میں، بحیثیت مجموعی آبادی کا معقول حصہ مصروف تھا۔ ملک کے مختلف حصوں میں قسم قسم کی دستکاریاں جاری تھیں۔ مقامی اور بیرونی طلب کی وجہ سے صناعوں کی بڑی سرپرستی ہوتی تھی۔ صنعتی آبادی کسی خاص حصے تک محدود نہیں تھی بلکہ مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ البتہ شہروں میں باکمال صناع زیادہ تعداد میں پائے جاتے تھے۔ اس کی اہم وجہ دربار او، امیروں کی سرپرستی تھی۔ ایسا کوئی مواد نہیں مل سکا جس کے ذریعہ صنعت، تجارت اور حمل و نقل کے کاروبار میں مصروف افراد کی تعداد کا اندازہ پیش کیا جا سکے۔

(۶) ملازمت :۔ آجکل کی طرح سترھویں صدی کے ہندوستان میں سرکاری اور خانگی ملازمین کی کافی تعداد پائی جاتی تھی۔ مورلینڈ نے سہولت کی خاطر، ملازمت پیشہ افراد کو چند حصوں میں تقسیم کیا ہے: (i) شاہی عہدہ دار (ii) معمولی عہدہ دار (iii) فوجی ملازمین (iv) غیر فوجی سرکاری ملازم (v) دماغی پیشے اور مذہبی فرائض انجام دینے والے افراد۔ (vi) خانگی ملازم اور غلام۔

(i) شاہی عہدہ دار :۔ شاہی عہدہ داروں میں بڑے بڑے منصبدار شامل ہیں۔ اکبر کے زمانے میں منصبوں کا طریقہ بہت عام تھا۔ سب سے بڑا معمولی منصب پنج ہزاری تھا لیکن شہزادے اس سے بلند تر منصبوں پر فائز ہو سکتے تھے۔ دس سپاہیوں کی کمانڈری کے ادنیٰ ترین منصب سے لیکر

چار سو کے منصب تک، ہر کمانڈر منصبدار کہلاتا تھا۔ پانچ سو سے دو ہزار پانچ سو تک امیر اور جسکا منصب تین ہزار سے اوپر ہوا سے امیرِ اعظم یا عمدہ کہا جاتا تھا۔ ہر عہدہ دار کو ایک یا ایک سے زاید گاؤں کی مالگزاری عطا کی جاتی جس سے اس کی مقررہ تنخواہ وصول ہوتی تھی۔ منصبداروں کے لئے فوج کی معینہ تعداد رکھنی ضروری تھی۔ شہنشاہ کو جب کبھی فوج کی ضرورت ہوتی تو ان سے طلب کی جاتی تھی۔ آئین اکبری میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ دس سے پچاس پانچ سو، ایک ہزار، تین ہزار اور پانچ ہزار کی منصبیں تین تین حصوں میں منقسم تھیں: درجہ اول، دوم اور سوم۔ گریڈ کی مناسبت سے منصب داروں کی تنخواہوں کے معیار میں فرق تھا۔ ذیل میں ایک تختہ دیا جاتا ہے۔ اس سے مختلف گریڈ کے منصب داروں کی ماہانہ تنخواہوں کا اندازہ ہو سکتا ہے:-

ماہانہ تنخواہ (اکبری روپیوں میں)

منصب	درجہ اول	درجہ دوم	درجہ سوم
۵۰۰۰	۳۰۰۰۰	۲۹۰۰۰	۲۸۰۰۰
۳۰۰۰	۱۷۰۰۰	۱۶۸۰۰	۱۶۷۰۰
۱۰۰۰	۸۲۰۰	۸۱۰۰	۸۰۰۰
۵۰۰	۲۵۰۰	۲۳۰۰	۲۱۰۰
۵۰	۲۵۰	۲۴۰	۲۳۰
۱۰	۱۰۰	۸۲½	۷۵

منصب داروں کی تنخواہوں کے جو اعداد اوپر درج کئے گئے ہیں وہ خام آمدنی کے ہیں خالص آمدنی کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ ان میں سے وہ تمام مصارف منہا کر دئیے جانے چاہئیں جو ہر منصبدار کو اپنے ذمے کی فوج ہتیار رکھنے کے سلسلے میں لاحق ہوتے تھے۔ مورلینڈ نے مختلف امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ۵۰۰۰ کا منصبدار کم از کم ۱۸۰۰۰ روپے ماہانہ خالص آمدنی کی توقع کر سکتا تھا۔ اسی طرح ایک ہزار کا منصبدار ماہانہ ۵۰۰۰ روپیے

خالص آمدنی پانے کی توقع کر سکتا تھا۔ مورلینڈ نے یہ بھی تخمینہ کیا ہے کہ اکبری دور کا ایک روپیہ ۱۹۱۴ء کے ۵ تا ۶ روپیوں کے مساوی تھا۔ لہٰذا اکبری دور کا ایک منصبدار جس کی ماہانہ ۵۰۰۰ خالص آمدنی ہو ضروریات کی اتنی ہی چیزیں خرید سکتا تھا جتنی کہ ۱۹۱۴ء میں ۲۵ یا ۳۰ ہزار روپیوں میں خریدی جا سکتی تھیں۔ زر کی اعلیٰ قوت خرید اور تنخواہوں کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے سرکاری ملازمت انتہائی نفع بخش اور باعزت پیشہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دور دراز ممالک کے قابل ترین ہمت آزما اشخاص شاہی خدمات کے شوق اور امید میں کشاں کشاں چلے آتے تھے۔

مورلینڈ نے سرکاری ملازمین پر بُری طرح تنقید کی ہے۔ اس نے انہیں دولت صرف کرنے والے طبقوں میں شامل کرتے ہوئے "مفت خوروں" کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ ملک کی آمدنی کا بہت بڑا حصہ انھیں پر صرف ہوتا تھا لیکن یہ "بجز ایک نامکمل اور غیر یقینی حفاظت جان و مال کے ملک کی مشترکہ دولت میں کوئی اضافہ نہیں کرتے تھے"۔ یہ خیال درست ہے کہ سرکاری ملازمین کو معقول تنخواہیں ملتی تھیں اور زر کی قوت خرید اعلیٰ ہونے کی وجہ سے وہ نہایت آرام کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن محض اس خصوصیت کی بنا پر انہیں دولت صرف کرنے والے طبقوں میں شامل کرنا یا "مفت خوروں" کے نام سے تعبیر کرنا انصاف پر مبنی نہیں۔ کیونکہ کسی ایک طبقے کے لوگوں کو نہ تو کلیتہً دولت پیدا کرنے والے افراد میں شامل کیا جا سکتا ہے اور نہ دولت صرف کرنے والے اشخاص میں۔ ہر شخص ایک طرف پیدا کنندے کی حیثیت رکھتا ہے تو دوسری طرف صارف کی۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ زراعت، صنعت یا تجارت پیشہ افراد براہ راست پیدائش کے کام میں مشغول ہوتے ہیں اور ملازمین سرکار بالواسطہ طور پر اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ سرکاری عہدہ دار اور دوسرے ملازمین کو کلیتہً "مفت خور" نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ پر آشوب اور فتنہ و فساد کے ماحول کی وجہ سے وہ ملک کی ترقی میں ایسا حصہ نہ لے سکے ہوں جس کی کہ عام طور پر توقع جاتی ہے۔ تعمیری کاموں کی طرف حکومت کی توجہ اسی وقت مبذول ہو سکتی ہے جب کہ طویل المیعاد امن اور چین نصیب ہو مگر اس زمانے میں یہ چیز حاصل نہیں تھی۔

(ii) معمولی عہدہ دار :- ہر اعلیٰ عہدہ دار کے تحت متعدد معمولی عہدہ دار ہوتے تھے ان کی دو قسمیں تھیں: ایک وہ جو شہنشاہ کی حضوری میں رہتے تھے۔ دوسرے وہ جن کے ذمے متفرق کام تھے۔ اکبر کے زمانے میں تخصیص کا اصول نہیں تھا۔ ایک ہی عہدہ دار کو کبھی فوجی خدمات کے لیے مامور کیا جاتا تو کبھی غیر فوجی خدمات کے لئے۔ شہنشاہ کے فوری خدمت گاروں میں احدی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ تقریباً ایسے ہی فرائض انجام دیتے تھے جو موجودہ زمانے کے ایڈی کانگ انجام دیتے ہیں۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ ان میں سے اکثر ماہانہ ۵۰۰ روپے سے زاید تنخواہ پاتے تھے۔

(iii) فوجی ملازمین :- معمولی فوجی ملازمین میں پیدل سپاہی، سوار، بندوقچی، شمشیر زن اور پہلوان شامل ہیں۔ پیدل فوج میں کاشتکاروں اور شہریوں کے معمولی طبقوں سے بھرتی کی جاتی تھی لیکن سواروں میں پٹھان اور راجپوت غالب ہوتے تھے۔ پیدل اور سوارہ فوج دو قسم کی تھی: ایک وہ جو براہ راست شہنشاہ کی جانب سے رکھی جاتی تھی اور دوسری وہ جسکو امیر اُمرا رکھتے تھے۔ اس طرح ملک کی قابل لحاظ آبادی کو فوجی خدمات کے ذریعہ روزی مل جاتی تھی۔ مورلینڈ کا خیال ہے کہ فوجوں کی وجہ سے ملک کی قومی آمدنی پر جو بار عاید ہوتا ہے وہ زمانہ مابعد (۱۹۱۴ء) کے مقابلے میں زمانہ ماسبق میں نسبتاً بہت زیادہ تھا۔

(iv) غیر فوجی ملازمین :- اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانے کی طرح اکبر کے دور میں نظم و نسق کے وسیع انتظامات نہیں تھے تاہم مختلف انتظامی کاروبار میں آبادی کا معقول حصہ مشغول تھا۔ نظم و نسق کے مختلف صدر مقامات پر محرروں کے بڑے بڑے عملے موجود ہوتے تھے۔ محرری کی خدمتوں کے علاوہ تشخیص و تحصیل مالگزاری کے ضمن میں بھی بہت سے لوگوں کو روزگار ملجاتا تھا۔

(v) دماغی پیشے اور مذہبی فرائض انجام دینے والے افراد :- آئین اکبری کے مطابق اُس زمانے کے مستقل دماغی پیشے طبابت، درس تدریس، ادبیات، مصوری، خوش نویسی اور موسیقی پر مشتمل تھے۔ اکبر کا زمانہ ان پیشوں کے حق میں بہت موافق تھا۔ شہنشاہ ہر بات میں دلچسپی لیتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک فیاض سرپرست بھی تھا۔ یہ سرپرستی کبھی تو عطائے منصب کے ذریعہ

کبھی نقد انعام کے ذریعہ اور کبھی وظیفوں کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ طبیبوں، معلموں، ادیبوں، مصوروں، خوش نویسوں، شاعروں اور مغنیوں کی ہمت افزائی کے علاوہ مذہبی فرائض انجام دینے والوں مثلاً زاہدوں اور تارک الدنیا لوگوں کی بھی وقتاً فوقتاً سرپرستی کی جاتی تھی۔

(۱۷) خانگی ملازمین اور غلام:۔ اکبری دور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ شخصی جذبات بجا لانے میں بہت زیادہ لوگ مصروف تھے۔ آئین اکبری میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ . . . ۵۰ سے زیادہ بیگمات تھیں اور ہر ایک کے لئے جداگانہ محل ہوا تھی۔ نوکروں کا کافی عملہ ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا اور ان کی نگرانی کے لئے متعدد نگہبان عورتیں، خواجے راجپوت اور دروازوں پر دربان مقرر رہتے تھے۔ شاہی کیمپ میں سوار پہرہ داروں کے علاوہ دو تین ہزار کے درمیان ملازم مقرر کئے جاتے تھے۔ خاص کر ایک خیمہ ایسا تھا جس کو نصب کرنے کے لئے ایک ہفتہ تک . . . آدمی در کار ہوتے تھے۔ شہنشاہ جہاں کہیں رہیں استعمال کے لئے پانی گنگا سے آتا تھا۔ برف روزانہ ڈاک گاڑیوں کے ذریعہ برف پوش پہاڑوں سے لائی جاتی تھی۔ میوہ پابندی کے ساتھ کشمیر، کابل، بلوچستان اور سمرقند سے لایا جاتا تھا۔ اصطبل بڑے اہتمام سے رکھے جاتے تھے۔ ہر معمولی ہاتھی کے لئے چار ملازم رکھے جاتے تھے۔ شاہی ہاتھی کے لئے سات نگہبان ہوتے تھے۔ کھیل کود اور تفریح کے ضمن میں بھی کافی عملہ رکھا جاتا تھا۔ ایک ہزار شمشیر زن و [illegible] پہلوان ہر وقت دربار میں حاضر رہتے تھے۔ شکار اور بندوق بازی کے لئے جداگانہ [illegible] تھا۔ باز بازی، کبوتر بازی، مینڈھا بازی اور مکڑی بازی کے لئے بہت سے ملازم تھے۔ دربار کی تقلید میں امیر بھی اپنی حیثیت کے مطابق مذکورہ نوعیتوں کے [illegible] ملازمین رکھتے تھے۔

سرکاری ملازمین کے علاوہ کثیر التعداد خانگی ملازم [illegible]

ملازمین عام طور پر چونکہ شان و شوکت کے دل دادہ ہوتے تھے اس لئے مختلف کاموں کی بجا آوری کے لئے متعدد ملازمین رکھے جاتے تھے۔ ملازم دو قسم کے تھے: ایک آزاد اور دوسرے غلام۔ اکبر کے زمانہ میں غلامی کا طریقہ جاری تھا۔ غلاموں کی باضابطہ خرید و فروخت ہوتی تھی۔ ملکی غلاموں کے مقابلے میں غیر ملکی غلاموں کی قیمت زیادہ تھی۔ قحطوں کے زمانے میں غلام بہت سستی قیمت میں دستیاب ہو جاتے تھے۔ شہری غلاموں کے علاوہ دیہاتی غلام بھی ہوتے تھے جن سے کاشتکاری میں مدد لی جاتی تھی۔

مجموعی طور پر سرکاری اور خانگی ملازمت کے ذریعہ بہت سارے افراد کی پرورش ہوتی تھی۔ مورلینڈ نے تمام ملازمت پیشہ افراد کو دولت صرف کرنے والے طبقوں میں شامل کیا ہے۔ دولت پیدا کرنے والے طبقوں میں زراعت، صنعت اور تجارت پیشہ افراد کو شامل کیا ہے۔ یہ تقسیم ٹھیک نہیں کیونکہ کوئی طبقہ قطعی معنیٰ میں دولت صرف کرنے یا پیدا کرنے والا نہیں کہلایا جا سکتا۔ سب لوگ خواہ وہ ملازمت پیشہ ہوں یا زراعت، صنعت یا تجارت پیشہ، بالواسطہ یا بلاواسطہ دولت کی پیدائش میں مشغول ہیں اور سبھوں کا تعلق بالآخر صرف سے بھی ہے۔

محمد ناصر علی ام۔ اے عثمانیہ لکچرار معاشیات

ہندوستانی معاشیات کے مبادی

(بہ سلسلہ سابق)

کوئلہ | سنگارینی کولریز کمپنی ۱۹۰۶ء سے کوئلہ کی صنعت کا کام انجام دے رہی ہے ۔ کوئلہ کی یہ کانیں تعلقہ یلندو ضلع ورنگل میں واقع ہیں۔ ڈورناکل جنکشن سے ریلوے کی ایک شاخ ۱۶ میل تک ڈالی گئی ہے جو ان معدنوں تک پہونچتی ہے۔ سنگارینی میں دو کانیں ہیں پہلی ۵۷۰ فیٹ گہری ہے جس سے روزانہ ۱۲۵۰ ٹن کوئلہ برآمد ہوتا ہے ۔ دوسری کان ۴۵۰ فیٹ گہری ہے جس سے روزانہ ۷۵۰ ٹن کوئلہ نکالا جاتا ہے۔

تانڈور کولیریز کا کام ۱۹۲۷ء سے آغاز کیا گیا۔ یہ معدن تعلقہ آصف آباد میں واقع ہیں بیلم پلی جو قاضی پیٹ بلہارشاہ ریلوے لائن پر واقع ہے اس معدن سے ملاتی ہے۔ تانڈور میں کوتھاگوڈم کی کوئلہ کی کان بھی خاص اہمیت رکھتی ہے ۔

۱۹۴۱ء میں مذکورہ بالا کانوں سے ۱۴ لاکھ ٹن کوئلہ برآمد ہوا جس سے حق شاہی کے بابت ۲ لاکھ ۴۰ ہزار روپے کی رقم وصول ہوئی ہندوستان کی کل پیداوار کا تقریباً پانچ فی صدی مملکت آصفیہ سے برآمد ہوتا ہے ۔

ان تمام معدنوں میں جدید مشنری سے کام لیا جا رہا ہے ۔ کوئلہ صاف شدہ اور اچھی قسم کا ہوتا ہے ۔ حادثات سے محفوظ رہنے کے لئے معدنوں میں کام کرنے والوں کو خاص ٹرینِنگ دی جاتی ہے۔ انکو روزانہ آٹھ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے ان معدنوں کے ساتھ برقی اور میکانیکل ورکشاپ بھی قائم ہیں جہاں مشنری کی درستی اور تیاری کا کام انجام دیا جاتا ہے۔ اب حکومت سرکار عالی کی ملکیت میں کوئلہ کی کھدائی سے متعلق ہوگئی ہے کیونکہ انہی سنگارینی کالریز کی حاصل کرلئے گئے ہیں۔

گھریلو صنعتوں کی بقاء | مشین کے ساختہ اشیاء کی مسابقت بعض قدیم گھریلو صنعتوں کی تباہی باعث بن چکی ہیں ۔ گھریلو صنعت کے جدید طریقوں کو اگر قدیم طریقوں پر فوقیت حاصل ہوچکی ہے تو ان کی ترویج ضروری ہے ۔ جو لوگ قدیم وضع کی گھریلو صنعتوں میں مشغول ہیں ان کی سہولت اور آسائش کی منظم کوشش عمل میں لائی جانی چاہیئے گو یہ صورت جدید صنعتی نظام کی ترویج اور ترقی میں کسی حد تک

کیوں نہ حائل ہو۔ یہاں ان قدیم صنعتوں سے بحث نہیں کی جائے گی جو جلد یا بدیر معدوم ہونے والی ہیں۔ صرف ان صنعتوں کا ذکر کیا جائے گا جن میں جدید حالات کے باوجود اپنی بقاء اور ارتقاء کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ صنعتیں جن کے لئے سادہ آلات کی ضرورت ہے اور جن کا تعلق زراعت سے ہے ان کو کارخانوں میں تیار شدہ اشیاء سے کوئی اندیشہ نہیں ہے ایسی بھی مثالیں موجود ہیں جہاں کاریگروں نے بہتر خام پیداوار اور بہتر آلات کے استعمال کا طریقہ معلوم کرکے جدید حالات کے ساتھ کامیاب توازن پیدا کر لیا ہے۔ جلاہے کارخانے کا سوت، انگریزی رنگ کے مرکبات، کسان دھاتی پترا اور لوہا آسانی سے مڑنے والا لوہا استعمال کر رہے ہیں۔ اور ہر صورت میں صناع فائدہ حاصل کر رہے ہیں اور مصارف پیدائش میں تخفیف ہو رہی ہے اور ساتھ ہی بازار بھی وسیع ہو رہا ہے۔ درزی بھی سینے کی مشین استعمال کر رہے ہیں۔ اور شہری کاریگر یورپ اور امریکہ کے بنے ہوئے ترقی یافتہ آلات خرید رہے ہیں بعض صورتوں میں ایسی اشیاء تیار کی جاتی ہیں جن کے لئے مشینری اور پیدائش بڑے پیمانہ میں کی احتیاج نہیں پائی جاتی۔ بازار کی قربت اور صارفین کی ضروریات سے خوبی واقفیت حاصل ہو جائے تو گھریلو صناعوں کی آمدنی میں مزید اضافہ کا موقع ہے۔ جدید کارخانوں میں تیار شدہ اشیاء کی وجہ سے بعض قسم کی دریاں دھوتیاں اور ساڑیاں جنکو ملکی جلاہے تیار کرتے تھے معدوم نہیں ہو گئے۔ ڈھاکہ، مرشد آباد، مدورا اور بنارس کے جلاہے لکھنو اور دہلی کے کارچوبی کام کرنے والے سورت کے لیس باف ایسی اشیاء تیار کرتے ہیں جن کی طلب اس ملک میں ابھی تک باقی ہے۔ مشینری میں بنی ہوئی اس قسم کی اشیاء کے مقابلہ میں انکو بہر حال ترجیح حاصل ہے۔ دھات کا کام کرنے والے نقش ساز، سنار، درزی، جلاہے ۱۰ اور دوسرے کاریگر اسی زمرہ میں شامل ہیں اور ان کی تیار کردہ مصنوعات کو بھی کوئی خوف نہیں ہے مختلف گھریلو صنعتوں میں کام کرنے والوں کی تعداد ابھی تک منظم صنعتوں میں کام کرنے والوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کیساتھ گھریلو صنعتوں کی اہمیت ملک کی آئندہ صنعتی اسکیم کے ضمن میں بہت بڑھ گئی ہے۔ جیسے کہ ۱۹۳۰ء میں کانگریسی وزارتوں نے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اب ہم بعض گھریلو صنعتوں کی حالت کا جائزہ لینگے۔

دستی پارچہ بافی | صنعت پارچہ بافی سے تقریباً ۶۰ لاکھ افراد کے لئے اسباب معیشت مہیا ہو جاتے ہیں۔ ان صناعوں کے مقابلہ میں جو عمدہ نازک یا حسن کاری کی دار اشیاء تیار کرتے ہیں جلاہوں کی حالت زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ مشنری کی مسابقت کے سلسلہ میں وہ اپنے مفاد کا تحفظ کر سکتا ہے۔ دستی پارچہ بافی سے ہندوستان کی کل طلب کا تقریباً ۲۵ فی صدی حصہ مہیا ہو جاتا ہے۔ ۱۹۲۲ء کے بعد سے بیرونی مسابقت اور ہندوستانی پارچہ بافی کے کارخانوں کی وجہ سے جلاہے کثیر نقصان برداشت کر رہے تھے۔ اب جنگ کی وجہ سے دستی پارچہ بافی کی طلب میں اضافہ ہو گیا ہے۔

اونی صنعت | مغلوں کے عہد میں اونی قالینوں کی صنعت درجہ کمال کو پہنچ گئی تھی۔ صنعت قالین بافی کا وجود موجودہ زمانہ میں ممالک غیر کی طلب پر منحصر ہے۔ تقریباً کل پیداوار کا نوے فی صدی اسی طلب کی تکمیل میں صرف ہو جاتا ہے۔ قالین بافوں کا افلاس ان پڑھ ہونے اور ان کی عدم تنظیم کے باعث اونی صنعت زوال پذیر حالت میں ہے۔ بعض مقامات میں اب قالین بافی کا کام ہو رہا ہے۔

ایک اور اونی صنعت جس کا یہاں بکثرت استعمال ہوتا ہے وہ کھروری کمبل ہے۔ چرواہوں اور کاشتکاروں نے اس صنعت کو ذیلی پیشے کے طور پر اختیار کر لیا ہے۔ مرحدہ ملک میں خام پیداوار کے حصول میں جو سہولت ہے اور اندرون ملک بازار جو فراہم ہے اس کے پیش نظر اس صنعت کی ترقی کے نئے امکانات ہیں جن کی کامل احتیاط کے ساتھ تحقیق ضروری ہے۔

سلک اور ریشمی مصنوعات | ریشم سازی کی صنعت بنگال کشمیر اور میسور میں کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ صوبہ متوسط، بہار اور آسام میں اونی قسم کا سلک پیدا ہوتا ہے۔ انگلستان کے پارچہ بافوں کی مخالفت کے باعث ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنی ان مساعی سے دست بردار ہونا پڑا جو ہندوستان کی ریشمی مصنوعات کی برآمد کے لئے اختیار کی گئی تھیں۔ ریشمی مصنوعات کے حق میں کمپنی کی مابعد مخالفانہ پالیسی نے پارچہ بافی کی ملکی صنعت کو بہت نقصان پہونچایا۔ زد ہے اور خود ملک میں طلب کی نوعیت میں تبدیلی، یورپ میں ریشمی پارچہ بافی کی ترقی اور اس کے بعد جاپان، چین اور ممالک متحدہ امریکہ کی مسابقت دوسرے مخالف اثرات تھے جس کی وجہ سے اس صنعت کو نقصان اٹھانا پڑا۔ ہندوستان میں

ریشم سازی اور ریشمی مصنوعات کی اچھی حالت نہیں ہے۔ بہت سا ریشم کویا کی صورت میں برآمد کر دیا جاتا ہے کیونکہ ہندوستان میں اس کے لپیٹنے کا کام بہت ہی بُری طرح انجام پاتا ہے۔ خود ہندوستانی پارچہ باف بیرونی ریشم کو ملک کے تیار شدہ ریشم پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہندوستانی ریشم کو بہتر بنانے کے لئے اب صوبۂ بنگال میں کوشش کی جاری ہے۔ اسی صوبے کے سررشتۂ زراعت کے تحت ریشم سازی کے دو مدارس کا قیام عمل میں آیا ہے اور کثیر تعداد میں مزرعے بھی قایم ہو چکے ہیں۔ سرکاری مدارس میں جو طلباء زیر تربیت ہیں ان کو انعامات عطا کئے جاتے ہیں اور سرکاری مزرعوں سے تخم بھی مہیا کئے جاتے ہیں۔ صنعت ریشم سازی کو ترقی دینے کے لئے آسام، میسور اور کشمیر میں بھی کوششیں جاری ہیں۔ صنعت ریشم سازی کے فروغ کی خاطر مختلف صوبہ جات کی امداد کی غرض سے لائحہ عمل کی ترتیب اور اس کے نفاذ کے لئے حکومت ہند کی جانب سے بھی امداد کی جا رہی ہے۔ ریشمی مصنوعات کے لئے ہندوستان میں بعض خاص سہولتیں ہیں۔ اس لئے اس صنعت کو کامیابی حاصل ہونا چاہئیے۔ لیکن پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے لئے اس کو کپاس سے زیادہ مشکلات حائل ہیں اور ابھی تو ہندوستان میں اس صنعت کا آغاز ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بہ لحاظ نوعیت ریشمی مصنوعات کا آسائشی اشیاء میں شمار ہوتا ہے جن کی ساخت میں تنوع کو بہت بڑا دخل ہے۔ اس لئے یہ گھریلو صنعت کے لئے بہت موزوں ہے۔ بیرونی مصنوعات کی درآمد پر بھاری محصول عاید کیا جاتا ہے۔

<u>دوسری گھریلو صنعتیں</u> باب دوم میں بعض دیہی صنعتوں کی موجودہ حالت کا ذکر کیا جا چکا ہے نیز زراعت کی ذیلی صنعتوں پر بحث ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ متعدد گھریلو صنعتیں ہیں مثلاً کار چوب فرنیچر، دھاتی کام، چھری کانٹے، گوٹہ سازی، برتن سازی، صابن سازی، ٹوپی سازی اور بوٹ کا کام ان میں سے ہر صنعت کو ترقی دینے کے لئے جو طریقۂ کار اختیار کیا جانا چاہئیے وہ ان کی مکمل تحقیقات کے نتائج پر مبنی ہوگا۔

<u>مملکت آصفیہ کی گھریلو صنعتیں</u> (۱) مملکت کی سب سے اہم گھریلو صنعت دستی پارچہ بافی ہے۔ اس صنعت کا درجہ اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے زراعت کے بعد ہے۔ مجموعی آبادی کے تین فی صد حصے نے اس صنعت کو

اختیار کیا ہے۔ اور اس میں سالانہ ۶۴ لاکھ روپیہ کا درآمد شدہ سوت صرف ہوتا ہے اور تقریباً نصف دیہی آبادی کا پارچہ مہیا کرتا ہے۔ درآمد شدہ خام اشیاء کے علاوہ مقامی گرنیوں کا کتا ہوا تقریباً ۲۰ لاکھ روپے کا سوت اور ہاتھ سے بنا ہوا دو لاکھ روپے کا سوت اس میں استعمال ہوتا ہے۔ جو لوگ اس دستی پارچہ بافی کی صنعت میں لگے ہوئے ہیں وہ ہندوؤں میں شالی اور مسلمانوں میں مومن کہلاتے ہیں بحیثیت مجموعی جلاہے غیر تعلیم یافتہ، غریب، مقروض اور قدامت پرست ہیں۔ موجودہ جنگ کے باعث مملکت حیدرآباد کے دستی پارچہ بافوں کو سوت حاصل کرنے میں بڑی دقت پیش آرہی ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو کپڑے کی گرنیوں میں سوت کی کھپت پہلے سے زیادہ ہونے لگی اور دوسری طرف سوت کی جو مقدار درآمد کی جاتی تھی وہ بہت کچھ گھٹ چکی ہے جس سے سوت کی قیمت میں قابلِ لحاظ اضافہ ہو گیا ہے۔ ان حالات سے دستی پارچہ بافوں کے روزگار پر سخت ضرب لگی۔ ان پریشانیوں کو رفع کرنے کے لئے سررشتہ تجارت وحرفت تجاویز مرتب کر رہا ہے۔

(۲) نانڈیڑ کے سیلے اپنی ساخت اور نفاست کے لحاظ سے صنعت گری کے کمال میں شہرۂ آفاق ڈھاکہ ململ کے لگ بھگ ہیں لیکن ان کی گراں قیمتی کی وجہ سے ان کی نکاسی بہت کم ہوتی جارہی ہے۔

(۳) دکن کے ریشمی پارچوں کی شہرت قدیم زمانہ سے دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ صنعت ریشم سازی میں چار ہزار کارگھے مصروف ہیں۔ اورنگ آباد کے ہمرو، مشروع اور کمخواب جو مصنوعی ریشم سے تیار کئے جاتے ہیں نسبتاً ارزاں ہیں۔ آرمور، سنگاریڈی اور نارائن پیٹ اور سدی پیٹ کے ریشمی پارچے بہت مشہور ہیں۔ ساڑیاں اور تورجوڑ جو پٹن میں تیار ہوتے ہیں بہت دلکش ہوتے ہیں۔ یہ صنعت اب صرف چھ خاندانوں میں باقی رہ گئی ہے۔

(۴) کمبل دکن کے ہر ایک گاؤں میں بنے جاتے ہیں جو غربا کا ضروری لباس ہے مویشیوں سے اُون بہ آسانی دستیاب ہو جاتی ہے۔ تقریباً چودہ ہزار پیچے صنعت کمبل سازی میں استعمال ہوتے ہیں تین لاکھ دس ہزار روپے کی کملیں باہر بھیجی جاتی ہیں۔

(۵) صنعت رنگ سازی پارچہ بافی ہی سے متعلق ہے بلکہ اس کا تتمہ ہے۔ ممالک محروسہ کے

مختلف مراکز پارچہ بافی میں رنگ سازی کا کام ہوتا ہے۔ اس کے لئے تقریباً نو لاکھ روپے سالانہ کے رنگ اور کیمیائی مرکبات کی درآمد ہوتی ہے۔

(۶) قالین سازی مملکت کی مشہور ترین صنعت ہے جو کئی صدیوں سے اپنی شہرت قائم کئے ہوئے ہے۔ دکن میں یہ ایجاد ایک مسلمان کاریگر کے نام سے منسوب کی جاتی ہے۔

۱۹۳۰ء میں ورنگل میں قالین سازی کے ۸۰ کارخانے تھے در اصل یہ صنعت اس وقت تنزل کی حالت میں تھی۔ اس کے بعد حکومت نے قالین سازی کا ایک آزمائشی کارخانہ قائم کیا جس کی کوششوں سے کارگھے کی تعداد اس وقت ۴۵۰ ہو گئی ہے اور سالانہ ایک لاکھ بیس ہزار روپے کے قالین اور دریاں باہر بھیجی جاتی ہیں۔ حالانکہ اس سے قبل صرف تیس ہزار روپے کی قیمت کا مال برآمد ہوتا تھا۔ ورنگل کے قالین تمام ہندوستان میں بلحاظ خوبی، دباغت اور نقش و نگار بہترین سمجھے جاتے ہیں۔

(۷) بیدری صنعت کا نام اپنے مقام کی نسبت سے رکھا گیا ہے۔ ممالک محروسہ کے مشہور مصنوعات میں بیدری برتن داخل ہیں۔ بہمنی بادشاہوں کے زمانہ میں اس صنعت کو بہت ترقی ہوئی اور یورپ تک میں اس کی قدر ہونے لگی۔ بیدری برتنوں کی صنعت میں جو چیزیں استعمال ہوتی ہیں ان میں تانبے اور جست کی آمیزش ایک خاص تناسب کے ساتھ ہوتی ہے۔ جو ڈیزائن ان میں استعمال ہوتے ہیں وہ مختلف النوع اور بے نظیر ہیں۔ ان میں سے بہت زیادہ دلکش وہ ہیں جو قلعہ بیدر اور اطراف کے گنبدوں کی آرائش و زیبائش سے لئے گئے ہیں۔ بیدری برتن ابتداً حقے، پاندان، صراحیوں، رکابیوں، ڈبیوں اور مختلف مقاصد کے لئے استعمال کئے گئے۔ اب تو نئے ڈیزائن نکل رہے ہیں اور جدید استعمال کی چیزیں بنائی جا رہی ہیں مثلاً سگریٹ کیس، گلدان، چوڑیاں، گھنڈیاں، بٹن اور بے شمار دوسرے اشیاء۔

اب بیدر میں تاج دکن اور گلزار دکن کے نام سے دو تین کارخانے موجود ہیں۔

(۸) نرمل کے کھلونوں کی صنعت بہت مشہور ہے۔ پردے، شطرنج کے سٹ، گنجفے، میوے اور ترکاریوں کے سٹ، پرندے اور حیوانات وغیرہ مشہور چیزیں ہیں جو یہاں تیار ہوتی ہیں۔

(۹) کریم نگر میں چھ خاندان چاندی کے نازک اور باریک کام میں مصروف ہیں۔ چاندی کے دوسرے اشیاء کے علاوہ ہر سال یہ خاندان نازک اور باریک چاندی کے کام کی اشیاء پانچ ہزار کی قیمت کے تیار کرتے ہیں۔

(۱۰) چوڑی سازی۔ حیدرآباد کی چوڑیوں کی صنعت بیرون ملک میں بڑی شہرت رکھتی ہے اس کی کافی تعداد میں برآمد کی جاتی ہے۔ بلدہ حیدرآباد اور ضلع محبوب نگر چوڑی سازی کی صنعت کے لئے مشہور ہیں۔ حیدرآباد میں چوڑیوں پر متعدد وضع کا طلائی اور نقرئی کام نفاست سے کیا جاتا ہے۔

مگر ملحوظ رہے کہ امداد کے طریقے استعمال کرنے سے پہلے یہ امر تصفیہ طلب ہے کہ وہ کونسی قدیم صنعتیں ہیں جو موجودہ حالات کے تحت کامیاب ہو سکتی ہیں اور کونسی نئی صنعت کامیابی کے ساتھ جاری کی جا سکتی ہے۔ دوسرا اہم مسئلہ دستکاروں کی امداد کے ذرائع پر غور کرنا ہے تاکہ ان کا کاروبار مستحکم ہو جائے۔ دستکاری کی مفید ابتدائی ٹریننگ کا انتظام بھی ایک اہم ضرورت ہے۔ صوبہ بمبئی کے مدارس پارچہ بافی کے مماثل خصوصی مدارس صنعتی کا قیام بھی ضروری ہے اچھی قسم کی ارزاں خام پیداوار کی فراہمی، عملی مظاہروں اور دوسرے ذرائع سے مفید آلات و اوزار کی ترویج بھی خصوصی توجہ کی محتاج ہے۔ فنی مشوروں سے دستکاروں کی مدد کی جا سکتی ہے اور ان کو نئے نئے وضع کے نمونے فراہم کئے جا سکتے ہیں جن کی عوام میں مقبولیت کا امکان ہو۔ صنعتی بنکوں اور انجمن ہائے امداد باہمی کے ذریعہ دستکاروں کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کی کوشش بھی ضروری ہے۔ دیگر امور کی طرح ایک منظم مارکٹنگ تنظیم کو بھی بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لکھنؤ، لاہور اور مدراس کے آرٹس اور کرافٹس امپوریا کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ صوبہ واری مارکٹنگ بورڈز، اجازت یافتہ گودام اور امداد باہمی کے تھوک فروشی گوداموں کے قیام سے بھی بہت مدد مل سکتی ہے۔ امداد باہمی کے اصول پر صوبہ بمبئی کے اہم مراکز میں بیاعات داری اداروں کا قیام عمل میں آیا ہے تاکہ دستی مصنوعات کی فروخت میں سہولتیں مہیا کی جائیں۔ بہت سے صوبوں میں صنعت و حرفت کی امداد کے قوانین منظور ہو چکے ہیں حکومت متحدہ گھریلو اور دوسری صنعتوں کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ یہ حکومت بمد پانچ لاکھ دس ہزار روپے نومبر ۱۹۴۴ء سے

پانچ سال کے لئے صوبہ واری حکومتوں کو اس غرض سے عطا کئے۔ ان رقموں کی مدد سے مختلف اسکیمیں دستی پارچہ بافی کی صنعت کی ترقی کے لئے نافذ ہوئی ہیں۔

۱۹۳۹ء میں نیشنل پلاننگ کمیٹی نے بھی اس خصوص میں غور کرنا شروع کیا تھا۔

سرکار عالی اور گھریلو صنعتیں

سررشتۂ صنعت و حرفت سرکار عالی کا یہ کام مرکز تعلیم مصنوعات دیہاتی اضلاع کی مظاہراتی جماعتوں، فروخت گاہ مصنوعات ملکی، ادارہ پارچہ بافی پٹن اور کارخانہ قالین بافی ورنگل پر مشتمل ہے۔

(۱) مرکز تعلیم مصنوعات دیہاتی کا ۱۹۳۰ء میں اعلحضرت بندگانعالی نے افتتاح فرمایا تھا اور یہ ارشاد ہوا تھا کہ

"میں دیکھتا ہوں کہ دنیا کے تمام ممالک میں گھریلو مصنوعات کی خریدی کا رجحان پایا جاتا ہے خواہ وہ ایسے عمدہ نہ ہوں جیسی کہ درآمد شدہ اشیاء ہوا کرتی ہیں۔ لہذا کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ میری قلمرو میں بھی اس عالمگیر فطری رجحان پر کیوں نہ عمل کیا جائے ایسی حالت میں جبکہ میں خود حتی الامکان اپنے ہی قلمرو کی مصنوعات کی خریدی اور اس کا استعمال کرتا ہوں تو میرا خیال ہے کہ میرا یہ عمل بہ لطف میری رعایا پر اثر انداز ہوگا وہ مجھ سے اور میرے ملک سے اس قدر محبت رکھتی ہے کہ اس مسئلہ پر اس کو میری تقلید پر آمادہ کرنے کے لئے کسی مزید ترغیب کی ضرورت نہ ہوگی"۔

اس ادارہ نے پانچ سال کے عرصہ میں چھ سو طلبہ کو ٹریننگ دی اور مندرجۂ ذیل شعبوں میں طلبہ کو تعلیم دی جاتی ہے۔

(۱) پارچہ بافی (۲) رنگ سازی اور پرنٹنگ (۳) کارچوبی کام (۴) بید بافی (۵) لاکھ سازی (۶) کمبل بافی (۷) ریشم سازی

اس ادارہ نے ۳۶-۱۹۳۷ء میں ۲۳ ہزار روپے قیمت کی مصنوعات تیار کیں اور ۱۸ ہزار روپے کی اشیاء فروخت کیں۔

(۲) اضلاع کی مظاہراتی جماعتوں کی تعداد سات ہے جنکو حسب ذیل مرکزوں میں متعین کیا گیا ہے۔

(۱) نارائن پیٹ (۲) کریم نگر (۳) مانزت (۴) رائچور (۵) گلبرگہ (۶) آرمور (۷) جوگی پیٹ

یہ مظاہراتی جماعتیں اپنے اپنے علاقوں کے مختلف حصوں، جاترا، میلہ اور ہفتہ صحت میں بافندگی اور رنگ ریزی کے ترقی یافتہ آلات و اوزار کے عملی مظاہرے کرتی ہیں۔ اسکیم جدید کے تحت مظاہراتی پارٹیوں سے اضلاع کے پیداواری مراکز کی نگرانی کا کام لیا جارہا ہے۔

(۳) فروخت گاہ مصنوعات ملکی۔ بلدہ حیدرآباد میں ساٹھ ہزار روپے کے صرفہ سے ملکی مصنوعات کی فروخت گاہ قائم کی گئی ہے۔ اس فروخت گاہ نے ۱۹۳۶-۳۷ء میں ۵۵ ہزار روپے کی اشیاء خریدیں اور ۶۱ ہزار روپے کی اشیاء فروخت کیں۔ فروخت گاہ کے کاروبار میں حسن کارانہ اور تجارتی حیثیتوں سے مدد دینے کے لئے خواتین کی ایک مشاورتی کمیٹی قائم ہے اور ایک شعبۂ نسواں بھی قائم ہے۔ کلکتہ اور بمبئی کے شوروم کو اب یہاں سے سامان روانہ کیا جارہا ہے۔

(۴) ادارہ پارچہ بافی پیٹھن دو خاص مقاصد کو پیش نظر رکھکر قائم کیا گیا ہے ایک تو یہ کہ مقامی جلاہوں کو اس امر کی ترغیب دی جائے کہ نفاذی شنل سیلے اور ڈابی رکھنے والے ماک پر نگر و ونٹ کی ساڑیاں تیار کریں اور دوسرے یہ کہ پیٹھن کی پگڑیاں اور سنہری تور کی ساڑیاں بننے کی صنعت کو پھر سے زندہ کیا جائے۔ ۱۹۴۰-۴۱ء میں اس ادارہ نے ۶۱ ہزار کا مال فروخت کیا۔

(۵) کارخانہ قالین بافی ورنگل کا قیام ۱۹۳۰ء میں عمل میں آیا۔ ۱۹۳۶-۳۷ء میں اس کارخانہ میں ۲۵ کاریگر جن میں سے اکثر خاص طور سے اعلیٰ درجہ کے قالین بنانے کی مہارت حاصل کئے ہوئے ہیں مامور کئے گئے۔ کارخانہ قالین بافی کے زیر نگرانی سوتی قسم کے قالین اور دریاں بھی تیار کئے جا رہے ہیں۔

صنعتی مزدور

ہندوستانی مزدوروں کی خصوصیات اب ہندوستان کے صنعتی مزدوروں کے بعض اہم پہلوؤں پر بحث کی جائے گی۔ ہندوستانی کارخانوں کے مزدوروں کی حالت مغربی ممالک کے کارخانوں کے اجرت یاب مزدوروں کی طرح نہیں ہے۔

مغربی ملکوں میں خالص صنعتی کام کرنے والے مزدوروں کو ایک مستقل طبقہ کی حیثیت حاصل ہے اس طبقہ کو زراعت سے کوئی تعلق نہیں ہوا کرتا۔ اس کے برخلاف ہندوستانی مزدور دیہات کے باشندے ہوتے ہیں اور وہ ہمیشہ اپنے تعلقات دیہات سے برقرار رکھتے ہیں جہاں اس کا گھر بار ہوتا ہے اور جہاں اس کی کچھ نہ کچھ زمین بھی ہوتی ہے جس کی حفاظت اس کے خاندان کے لوگ کرتے ہیں۔ مزدور وقتاً فوقتاً دیہات کو جایا کرتے ہیں۔ اگر حسب خواہش رخصت کا موقع نہ ملے تو پیرانہ سالی کا انعام یا وظیفہ حاصل کرنے کے بعد تو ضرور یہ اپنے اپنے دیہاتوں کو واپس چلے جاتے ہیں۔ وہ شہر کو اس لئے واپس آتا ہے کہ دیہات میں ذرائع معاش کا حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے ورنہ شہر ان کے لئے جاذب توجہ نہیں ہوا کرتے اگر دیہات میں ان مزدوروں کو بقدر ضرورت غذا اور کپڑا مل جائے تو وہ دیہات میں گذر بسر کر لینگے۔ مزدور کا شہر کی ملازمت سے مستقل طور پر دلچسپی نہ لینے کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اسی بنا پر لیبر کمیشن نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ موجودہ حالات کے تحت دیہات سے شہر کے تعلق کو گویا نعمت تصور کرنا چاہئے۔ اس کو کمزور کرنے کی بجائے مقصد یہ ہونا چاہئے کہ اس کو قوی اور باقاعدہ بنایا جائے۔

<u>مزدوروں کی قلت</u> بعض اوقات شکایت سنی جاتی ہے کہ ہندوستان میں مزدوروں کی قلت ہے۔ جہاں تک ہنرمند مزدوروں کی فراہمی کا تعلق ہے یہ شکایت درست ہے۔ مواصلات اور ذرائع حمل و نقل کی سہولتوں کے ساتھ ساتھ دیہات میں زرعی زمینات سے پیداوار میں جو کمی ہو رہی ہے اس کی وجہ سے دیہاتیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد شہروں کی جانب روانہ ہونے پر آمادہ ہو گئی ہے تاکہ قابل حصول ذرائع معیشت سے استفادہ ہو سکے۔

اس سلسلہ میں مزید تحقیق اس کی ممکن ہے کہ براہ راست کارخانوں کے منیجر مزدوروں کی بھرتی کیا کریں بجائے اس کے کہ یہ کام درمیانی اشخاص یا جابرس کے سپرد کیا جائے۔ دلال چونکہ ملازمت کے حصول میں واسطہ ہوتا ہے اس لئے اس کو غیر تعلیم یافتہ اور بے بس مزدوروں کے مقابل وسیع اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں جن کا وہ عموماً ناجائز استعمال کرتا ہے۔ اب کارخانوں کے آجر براہ راست بھرتی کے

مسئلہ کی جانب توجہ کر رہے ہیں۔

قانون سازی

مزدوروں کی مفاد کے لئے مزدوروں میں کارکردگی پیدا کرنے اور ان کو قناعت پسند بنانے کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ شہروں کی زندگی اور محنت کو خوش گوار بنایا جائے۔ اس کا اطمینان بخش انتظام قانون سازی سے ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ آج کل قانون کے ذریعہ مزدوروں کیلئے آسانیاں بہم پہنچانے کے لئے مسلسل کوششیں ہو رہی ہیں۔ قانون کارخانہ جات بابتہ ۱۹۳۴ء[1] کے تحت روزانہ اور ہفتہ واری کام کے اوقات متعین کر دیئے گئے ہیں۔ روزانہ دس گھنٹوں اور فی ہفتہ ۵۴ گھنٹوں سے زیادہ کام دوامی کارخانہ جات میں نہیں لیا جا سکتا۔ بچوں سے روزانہ پانچ گھنٹوں سے زیادہ کام نہیں لیا جا سکتا۔ ہفتہ میں ایک روز کی تعطیل اور آرام کے لئے وقفہ بھی دیا جانا چاہئے۔ یہ قانون بعض شرائط مثلاً روشنی، ہوا اور حرارت کی فراہمی پر بھی زور دیتا ہے تاکہ مزدوروں کی صحت کا تحفظ ہو اور انہیں کوئی جسمانی تکلیف نہ پہنچنے پائے۔

کارخانوں میں جو عورتیں کام کرتی ہیں ان کے مفاد کی خاطر بعض صوبہ جات مثلاً بمبئی، صوبہ متوسط اور مدراس نے خاص قوانین منظور کئے ہیں جس کی رو سے زچگی سے قبل اور اس کے بعد ایک مقررہ مدت کے لئے ایک مناسب الاونس کے ساتھ رخصت منظور کی جاتی ہے۔ ہر صوبہ میں فیاکٹری انسپکٹر مقرر ہیں۔ وہ فیاکٹری کے منیجروں کو مجبور کر سکتے ہیں کہ مزدوروں کو مشنری پر حفاظتی پردے لگانے سے جو حادثات یا نقصانات ہو سکتے ہیں اس کے لئے مناسب تدابیر اختیار کریں۔ مزدوروں کے مفاد کے لئے بعض صوبوں کی حکومتوں نے قرار دیا ہے کہ خود کارخانوں میں طبی امداد اور مرہم پٹی کا سامان بھی مہیا رکھا جائے۔

قانون معاوضہ مزدوران ۱۹۲۳ء میں منظور ہوا اور اس کے بعد ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۳ء میں جو ترمیمات ہوئیں ان کی رو سے مزدوروں یا اس کے خاندان کا یہ حق تسلیم کیا گیا کہ کوئی حادثہ یا موت واقع ہو تو اس کو مقررہ شرح سے معاوضہ دیا جائے۔

---

[1] ابتدائی قوانین کارخانہ جات ۱۸۸۱ء، ۱۸۹۱ء، ۱۹۱۱ء اور ۱۹۲۲ء میں منظور ہوئے تھے۔ معدنوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے لئے علیحدہ قوانین معدنیات نافذ ہیں۔

قانون ادائی اجرت بابتہ ۱۹۳۶ء کے تحت ادائی اجرت میں باقاعدگی اور اجرت میں طریقہ وضعات پر پابندیاں عاید ہوئیں۔

قانون کارخانہ جات سرکار عالی کارخانہ جات میں کام کرنے والوں کے متعلق یہ قانون ۱۹۲۷ء میں منظور کیا گیا۔ اور ۱۹۳۱ء میں اس میں مزید بہبودی کی ترمیم کی گئی۔ اس کی وجہ سے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت میں بہت کچھ اصلاح ہوئی ہے۔

اس قانون کے لحاظ سے کارخانہ سے مراد وہ مقام ہے جس میں یا جسکے حدود کے اندر سال میں کسی ایک دن کم از کم بیس اشخاص ایک ساتھ کام پر لگائے جائیں اور جہاں کسی شئے یا شئے کے کسی جزو کو بھاپ، پانی یا کسی قسم کی کل کی قوت یا برقی قوت سے تیار نو بنایا جائے۔

کارخانوں میں کام کرنے والوں کی صحت اور ان کی حفاظت کے لئے ہر کارخانہ دار پر لازم کیا گیا ہے کہ مندرجہ ذیل امور کی پابندی کی جائے۔

کارخانہ میں صفائی کا انتظام رکھے۔ کارخانہ میں کام کے وقت کام کرنے والوں کی اتنی کثرت نہ ہو کہ جوان کی تندرستی کے لئے خطرناک یا مضر ہو۔ کارخانہ میں ہوا اور روشنی کے داخل اور خارج ہونے کا انتظام کیا جائے۔ ہوا میں مصنوعی طریقہ سے اتنی زیادہ نمی پیدا نہ کی جائے جس سے کارخانہ میں کام کرنے والوں کی صحت کو نقصان پہنچے۔ کارخانہ دار پر لازم ہے کہ کلوں کے گرد کٹہرا لگایا جائے۔ قانون کارخانہ جات کے تحت اس کی بھی ممانعت ہے کہ کسی عورت یا طفل سے کارخانہ میں کلوں کی صفائی کا کام لیا جائے جبکہ وہ بھاپ یا پانی کی قوت یا قوت برقی کسی اور قوت محرکہ سے چل رہی ہوں۔ ہر کارخانہ میں کام کے دن ہر کام پر لگائے ہوئے شخص کو زیادہ سے زیادہ چھ گھنٹے کے کام کے بعد کم از کم ایک گھنٹہ کا وقفہ آرام کے لئے دیا جائے۔ کسی کارخانہ میں جمعہ کے دن کسی شخص سے کام نہ لیا جائے بجز اس کے کہ جمعہ سے قبل کے یا بعد کے تین دنوں میں سے کسی ایک دن اسکو پورے دن کی تعطیل دی گئی ہو۔ کوئی طفل کسی کارخانہ میں کام پر نہ لگایا جائے گا۔ تاوقتیکہ اس کی عمر بارہ سال سے متجاوز نہ ہو۔ کسی کارخانہ میں صبح ساڑھے پانچ بجے سے پہلے یا شام کے سات بجے کے بعد کسی طفل یا عورت سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ کسی طفل سے کسی دن

چھ گھنٹے سے اور کسی عورت سے دس گھنٹہ سے زیادہ کسی کارخانہ میں کام نہیں لیا جا سکتا۔ قانون کارخانہ جات کے تحت کسی کام پر لگائے ہوئے شخص سے فی ہفتہ ۶۰ گھنٹے سے زیادہ کسی کارخانہ میں کام نہیں لیا جا سکتا اور کسی کام پر لگائے ہوئے شخص سے کسی ایک دن گیارہ گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لیا جائے گا۔

عالمی جنگ کی وجہ سے جو غیر معمولی حالات پیدا ہو گئے ہیں ان کی وجہ سے حکومت نے کارخانہ داروں کو مزدوروں سے کام لینے کے سلسلہ میں بعض سہولتیں اور رعایتیں بہم پہونچائی ہیں۔ اور ایک محکمہ مہتممی برائے مزدوران کا قیام عمل میں آیا ہے۔

قانون معاوضۂ مزدوران سرکار عالی بابتہ ۱۹۳۹ء

قانون معاوضہ مزدوران ممالک محروسہ سرکار عالی ہے یہ مقصد ہے کہ آجرین سے مزدوروں کو ایسی مضرت کا معاوضہ دلایا جائے جو کسی حادثہ سے وقوع میں آئے مزدور کو اس کے کام کی وجہ سے اور اس کے دوران میں کسی حادثہ کے ذریعہ جسمانی مضرت پہنچے تو آجر پر لازم ہے کہ مضرت کا معاوضہ مزدور کو ادا کرے۔ مضرت سے موت واقع ہو تو بالغ ہونے کی صورت میں مزدور کی اُجرت کی شرح کے لحاظ سے اس کے بیوی بچوں کو معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اگر مزدور کی ماہانہ اجرت دس تا پندرہ روپے ہو تو پانچ سو روپیہ معاوضہ دیا جائے گا۔ مزدور اگر نابالغ ہو تو اس صورت میں دوسو روپے دئیے جائینگے۔ اگر مضرت سے مستقل کامل معذوری لاحق ہو تو بالغ کی صورت میں مزدور کی اُجرت کی شرح کے لحاظ سے یعنی اگر مزدور کی ماہانہ اجرت دس تا پندرہ روپے ہو تو چار سو ستر روپے دئیے جائینگے۔ نابالغ ہونے کی صورت میں بارہ سو روپئے دئیے جائینگے۔ ان کے برعکس بالغ کی جزوی معذوری کی صورت میں ہر پندرھویں روز ادا شدنی معاوضہ پانچ روپے ہوگا۔

قانون امداد برائے مصارف زچگی

زنان مزدور پیشہ کو زچگی سے کچھ مدت قبل اور کچھ مدت بعد کارخانہ جات میں کام کرنے سے باز رکھنے اور ان کے مصارف زچگی کی سبیل کرنے کے متعلق یہ قانون ۱۹۳۹ء میں حیدرآباد میں نافذ کیا گیا۔ اس قانون کی رو سے کوئی مالک کارخانہ دانستہ اپنے کارخانہ میں کسی مزدور پیشہ عورت کو اس کی زچگی سے چودہ دن بعد تک کام پر نہیں لگا سکتا اور ایسا مالک کارخانہ

جس کے ذمہ اس عورت کے مصارف زچگی تحت قانون عاید ہوتے ہوں ایسی عورت کو زچگی کے بعد بشمول یوم زچگی چار ہفتہ تک کام پر نہیں لگا سکتا۔

زچگی سے عین ماقبل ایام غیر حاضری کی بابت جسکی انتہائی مدت تین ہفتہ ہوگی اور زچگی سے چار ہفتہ بعد تک مالک کارخانے سے بحساب آٹھ آنہ روزانہ مصارف زچگی پانے کی مستحق ہوگی بشرطیکہ کم از کم نو مہینہ قبل سے مسلسل کام کر رہی ہو۔

مملکت آصفیہ میں مسودہ قانون ٹریڈ یونین اور مسودہ قانون ادائی اجرت مزدوران مجلس وضع قوانین میں زیر تصفیہ ہیں۔

مکانات: صنعتی مراکز میں مزدوروں کے لئے مکانات کی فراہمی کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہے۔ مزدوروں کی قیام گاہوں کی موجودہ حالت بہت ہی ابتر ہے۔ بمبئی جیسے صنعتی شہروں میں مزدوروں کی آبادی خطرناک حد تک بہت زیادہ گنجان ہوگئی ہے۔ اور ان کو اتنی بھی جگہ میسر نہیں آتی جتنی کہ گوداموں کے لئے فراہم کیگئی ہے۔ مزدوروں کی کثیر تعداد کی زندگی صرف ایک کمرہ میں بسر ہوتی ہے جو گندہ اور مضر صحت ماحول میں واقع ہوتا ہے۔ ان حالات کے تحت مزدوروں کے لئے یہ ناممکن ہے کہ معمولی طور سے خوش حال گھریلو زندگی بسر کریں۔ اس لئے بہت سے مزدور اپنے اہل و عیال کو دیہات ہی میں چھوڑ دینے پر مجبور ہیں۔ امپروومنٹ ٹرسٹ بلدی ادارے اور بعض آجروں نے اس نقص کی اصلاح کی فرداً فرداً کوشش کی ہے لیکن اس مشکل کا اطمینان بخش حل حاصل کرنے کے لئے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

مملکت آصفیہ میں کارخانوں کے مالکوں نے مزدوروں کی رہائش کے مسئلہ سے دلچسپی لینی شروع کی ہے چنانچہ سوت کاتنے اور کپڑا بننے اور سمنٹ تیار کرنے والے کارخانوں، کاغذ اور شکر بنانے والے کارخانے اور دوسرے بڑے کارخانوں نے اپنے محلے اور مزدوروں کے لئے مکانات فراہم کئے ہیں۔ کپاس اوٹنے اور دبانے کے کارخانے اگرچہ کہ موسمی ہوتے ہیں اور سال میں صرف تین مہینے جاری رہتے ہیں تاہم ان میں سے بھی متعدد کارخانوں نے مزدوروں کے لئے پختہ اور صحت بخش مکانات بنانے شروع کردیئے ہیں۔

رفاہی کام: متذکرہ صدر مسائل کے علاوہ دوسرے امور بھی ہیں جن کا مقصد اصلاح صحت، تحفظ جان اور

مزدوروں کی صنعتی کارکردگی میں افزایش پیدا کرنا ان امور کو رفاہی کاموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بعض روشن خیال آجروں نے اپنے مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لئے بطور خود رفاہی کاموں کی اسکیمیں مرتب کی ہیں۔ بعض ادارہ جات مثلاً وائی ایم سی اے۔ سوشیل سرویس لیگ۔ پست اقوام مشن سوسائٹی سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی نے رفاہی امور کی انجام دہی میں آجروں کی بیش بہا اعانت کی ہے یا خود انفرادی طور پر اس کام کو انجام دیا ہے۔ یہ ان کارفاہی کام تعلیم، طبی امداد، زچگی کی سہولتوں تفریحات (مثلاً گیمس، سینما، فانوسی تقاریر۔ شراب اور قمار خانوں کی ترغیب مخالف کے طور پر) فراہمی مکانات، علاوہ پارچہ کی دکانوں، مزدوروں کی انجمن ہائے امداد باہمی، چائے گھر اور طعام خانوں سے متعلق ہے

حیدرآباد کے رفاہی کام حیدرآباد میں چند چھوٹے پیمانہ کے موسمی کارخانوں سے قطع نظر دوسرے تمام کارخانوں میں عام صحت و صفائی کی حالت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بڑے بڑے دوامی کارخانوں کے مالک کام کرنے والوں کے رہائشی مکانات کی تعمیر کے مسئلہ میں دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ رفاہ عام کے کاموں میں توجہ کی جا رہی ہے۔ مزدوروں کی طبی امداد کے لئے ڈاکٹر مقرر ہیں۔ بعض مقامات میں کلب بھی موجود ہیں۔ مزدوروں کے بچوں کی تعلیم کے لئے مدارس بھی قائم ہیں۔ بچوں کی پرورش گاہ دایہ خانے اور زچگی و دو جنت کے ادارے قائم کئے جا رہے ہیں۔ آرام گاہیں اور تفریح گاہیں بھی بنائی جا رہی ہیں۔ نظام اسٹیٹ ریلوے کے قطع نظر مملکت آصفیہ میں کوئی مزدور سبھا قائم نہیں ہے۔

تحریک مزدور سبھا ان تمام رفاہی امور کی ابتدا اور تکمیل دراصل مزدوروں ہی کو کرنی چاہیے۔ دوسروں پر تکیہ کرنے کی بجائے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر مزدور اپنی مدد آپ بہتر کر سکتے ہیں۔ مغربی ممالک میں مزدوروں کی خود اپنی طاقتور اور منظم انجمنیں ہیں جو ہر ممکنہ طریقہ سے اپنے اراکین کے مفاد کی حفاظت کرتی ہیں۔ یہ ایک فال نیک ہے کہ ہندوستان میں بھی اس قسم کی تحریک کا آغاز ہو چکا ہے ۱۹۱۸ء میں صوبہ مدراس میں اس کی ابتدا ہوئی لیکن اس تحریک کو اتنی ترقی حاصل نہیں ہوئی جتنی کہ اس نے مغربی ممالک میں حاصل کی۔ ہندوستانی مزدور سبھاؤں کی قیادت ہنوز متوسط طبقہ کے افراد تک محدود ہے۔ اگرچہ کہ ان کی نیت نیک ہوتی ہے لیکن مزدور طبقہ کی آئے دن کی مشکلات اور ضرورتوں سے

پوری طرح واقف نہیں ہوتے۔ بعض اوقات مزدوروں کے مفاد کے علاوہ ان کے سامنے سیاسی اور دوسرے مقاصد بھی ہوتے ہیں۔ صنعتی شہروں میں مزدور طبقہ کی عدم یکسانیت ہندوستان میں مزدور سبھا تحریک کی ایک دوسری کمزوری ہے۔ ایک ہی مرکز میں کام کرنے والے مزدوروں کا مختلف مقامات سے وطنی تعلق ہوتا ہے۔ یہ لوگ مختلف زبانیں بولتے ہیں اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان حالات میں ان کا موثر ارتباط بہت مشکل ہوتا ہے۔ عام طور پر مزدوروں کی ناخواندگی بھی دوسری بڑی کمزوری ہے سب سے آخر میں ہندوستانی مزدوروں کی ایک اور خصوصیت کا ذکر بھی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جب کوئی مزدور اپنے دیہات کو چھوڑ کر برسوں شہر میں آباد ہو جاتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ ابتدا سے انتہا تک ایک ہی کارخانہ میں کام کرتا رہے۔ وہ اس عرصہ مدت میں کئی دفعہ اپنے آجر بدلتا رہتا ہے اور جب یوں کوئی مزدور ایک کارخانہ سے دوسرے کارخانہ میں تبدیل ہوتا رہے تو وہ مزدور سبھا یا کسی اور ادارہ کا کارآمد رکن ثابت نہیں ہو سکتا

بہرحال ہندوستان میں متذکرہ صدر امور کی تدریجی اصلاح کی امید کی جا سکتی ہے۔ قانون مزدور سبھا بابتہ ۱۹۲۶ء مزدور سبھاؤں کے ارتقاء کا باعث ہوا۔ کیونکہ اس کے نفاذ کا منشا مزدوروں کے مفاد کا تحفظ ہے۔ جن مزدور سبھاؤں کی اس قانون کے تحت رجسٹری ہوتی ہے ان پر سرمایہ کا باقاعدہ انتظام رکھنا اور کاروبار کو صحیح اصول پر چلانے کے قیود عاید کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ان کو چند ایسی مراعات بھی عطا کی جاتی ہیں جو غیر رجسٹر شدہ انجمنوں کو حاصل نہیں ہیں مثلاً رجسٹر شدہ انجمنوں کے جائز مقاصد کی پیش رفت میں کام نے والے تمام عہدہ داروں کا اس قانون کے تحت دیوانی اور فوجداری ذمہ داریوں سے تحفظ عمل میں لایا گیا ہے۔

ایک طاقتور مزدور سبھا کا قیام نہ صرف مزدوروں کے مفاد کی نگرانی کے لئے لازمی ہے بلکہ اس سے صنعت کی منظم ترقی کا مقصد بھی حاصل ہوتا ہے۔

آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے تحت ۱۹۴۰ء میں ۱۹۱ یونین اور ارکین کی تعداد تین لاکھ ۵۴ ہزار پانچ سو اکتالیس تھی۔

ہندوستانی مزدوروں کی کارکردگی کا نقص

مزدوروں کے موجودہ حالات کی اصلاح جن طریقوں پر ہونی چاہئیے ان کی جانب اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ ان اصلاحوں کے عمل میں آنے سے ایک زیادہ قابل مزدور جماعت کا وجود عمل میں آسکتا ہے۔ اس سے ہندوستانی مزدوروں کی کارکردگی میں بھی اضافہ ہوگا — ہندوستانی مزدور مغربی مزدوروں کے مقابلہ میں کام کی کمتر صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یوروپین مزدور بڑھیا اجرت پاتا ہے۔ لیکن کام کی نوعیت کے لحاظ سے وہ اس اجرت کا حقدار بھی ہے۔ اس کے ساتھ اس کا بھی خیال رکھنا چاہئیے کہ کارکردگی کا یہ فرق اختلاف ماحول کی بناء پر ہے نہ کہ نسلی اعتبار سے ہندوستانی مزدور میں یوروپین مزدور کے مقابلہ میں وہی کارکردگی پیدا کی جاسکتی ہے بشرطیکہ ترقی کے لئے ضروری ماحول مثلاً تعلیمی سہولتیں، حفظان صحت کے موثر ذرائع بہتر مکانات وغیرہ مہیا کئے جائیں۔ ان کی کارکردگی کو بڑھانے کے لئے اجرتوں کے اضافہ پر بھی احتیاط سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

صنعتی ہم آہنگی

موجودہ دور میں ہندوستان کے صنعتی تنازعات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آجروں اور مزدوروں کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کی جانب خود حکومت متوجہ ہے۔ قانون تنازعات مزدوران ۱۹۲۹ء میں منظور ہوا اور ۱۹۳۴ء میں اسکو زیادہ مستقل صورت میں نافذ کیا گیا۔ اس قانون کی رو سے حکومت کو تحقیقاتی عدالت (جو بیرونی اور غیر متعلقہ اشخاص پر مشتمل ہوتی ہے) اور مصالحتی بورڈ (جو فریقین کے نمائندوں پر مشتمل ہوتا ہے) کے قائم کرنے کا حق دیا گیا تاکہ اختلافی امور کی کامل وضاحت ہو جائے۔ اور عوام آسانی کے ساتھ تنازعات کی واجبیت یا عدم واجبیت کا اندازہ کر سکیں۔ یہ تنازعات جبری طور پر طے نہیں کئے جاتے بلکہ قیام امن کے لئے رائے عامہ کی قوت پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

مختلف صوبہ جاتی حکومتوں نے خصوصی عہدہ دار مقرر کئے ہیں جن کا فرض یہ ہے کہ صنعتی تنازعات کے انسداد کی ممکنہ کوشش کریں۔ صنعتی تنازعات کے انسداد کے لئے جو ذرائع مہیا کئے گئے ہیں ان کو تقویت پہنچانے کے لئے مجلس قانون ساز بمبئی میں ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۸ء میں قوانین منظور ہوئے۔ حکومت بمبئی کے صنعتی قانون تنازعات بابتہ ۱۹۳۸ء کی رو سے جبری تصفیہ کیا جاتا ہے لیکن اس کے برخلاف مرکزی حکومت کے قانون کے تحت مجھوتہ فریقین کی صوابدید پر منحصر رکھا گیا ہے۔

باب ۵ ۔ حمل و نقل اور تجارت

حمل و نقل کی اہمیت | بری ، بحری اور ہوائی حمل و نقل کے ذرائع کے مناسب اور موزوں نظام کو کسی قوم کی مرفہ الحالی کی اہم شرطوں میں شمار کیا جانا چاہیئے ۔ اس سے ملک کے مختلف اقطاع کے مابین بیگانگت دور ہوجاتی ہے اور شہر و دیہات میں ربط بڑھتا ہے جو دونوں کے لئے مفید ہے ۔ حمل و نقل کے ذرائع تجارت کی روح رواں اور زراعت و صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے محرک ثابت ہوتے ہیں ۔ لوگوں اور اشیاء کی آزادانہ نقل و حرکت ، خام پیداوار ، مصنوعات اور وسائل ملک سے پوری طرح مستفید ہونے کے لئے حمل و نقل اور آمد و رفت کے ترقی یافتہ ذرایع بہت ضروری اور اہم ہیں ۔ موجودہ زمانہ میں ریلوے ، موٹر اور حمل و نقل کے دوسرے ذرایع کی وجہ سے آمد و رفت کی مشکلات بڑی حد تک دور ہوچکی ہیں ۔

ہندوستان ایک نیم براعظم ہے ۔ اس لئے ایک خطہ سے دوسرے خطہ میں جانے کے لئے بڑی بڑی رکاوٹیں پیش آئیں تو کوئی تعجب نہیں ۔ بارش کے زمانہ میں آمد و رفت اکثر بند ہوجاتی ہے ۔ قدرتی آبی راستوں کی ہندوستان میں انگلستان کی بہ نسبت کم اہمیت ہے ۔ انیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان میں آمد و رفت کے ذرایع عصری معیار کے اعتبار سے بہت ناقص تھے ہندوستانی حکمرانوں خصوصاً مغلوں کے زمانہ میں بڑی شاہ راہیں ضرور تعمیر ہوئی تھیں ان پر مسافروں کی آسایش کے لئے ضروری انتظامات کافی اہتمام کے ساتھ عمل میں لائے جاتے تھے ۔ بہت سے اندرونی اقطاع میں داخل ہونے کا ذریعہ لدو جانور ہوا کرتے تھے ۔ دکن میں ناہموار پہاڑی علاقوں اور آبی گزرگاہوں کی کمی کی وجہ سے بجز و ساحلی مقامات کے ذرایع حمل و نقل کی حالت اور بھی ناقابل اطمینان تھی ۔ اس سے قبل بیان کیا جاچکا ہے کہ ہندوستانی دیہات کی خود مکتفی زندگی صرف نامکمل ذرایع آمد و رفت کا نتیجہ تھی ۔ لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ میں ریلوں اور سڑکوں کی تعمیر کے بعد سے موجودہ زمانہ کا اصلی عمرانی اور معاشی انقلاب رونما ہوا ۔

حمل و نقل کے ذرایع کے سلسلہ میں چار اہم عنوانوں کے تحت غور کیا جاسکتا ہے ۔

(۱) ریلوے (۲) سڑکیں (۳) آبی راستے (۴) ہوائی جہاز

ریلوے

ہندوستانی ریلوے کی تاریخ کو مندرجہ ذیل چھ دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) قدیم ضمانتی نظام ۱۸۴۴ء تا ۱۸۶۹ء ریلوں کی تعمیر کی پہلی تجویز ۱۸۴۴ء میں ہوئی۔ کلکتہ اور بمبئی کے قریب دو ریلوے لائنوں کی تعمیر کے لئے ایسٹ انڈیا ریلوے کمپنی اور گریٹ انڈین پنشلا ریلوے کمپنی کو علی الترتیب ٹھیکے دیے گئے۔ لیکن حقیقی ترقی کی بنیادیں لارڈ ڈلہوزی نے ڈالیں جبکہ اس نے ۱۸۵۳ء میں ریلوں کی توسیع کے متعلق ایک مشہور تجویز مرتب کی اس تجویز کی رو سے حکومت کی پالیسی میں ایک قطعی تغیر پیدا ہو گیا اور ریلوے کمپنیاں جو انگلستان میں رجسٹر ہوئی تھیں ان کے توسط سے ریل کی تعمیر مناسب خیال کی گئی۔ حکومت نے ان کمپنیوں کو ایک مقررہ کم سے کم منافع یا مشغول سرمایہ پر شرح سود کا یقین دلایا۔ لارڈ ڈلہوزی نے اس بات پر زور دیا کہ ریل کی مسلسل طویل لائنوں کی تعمیر سے ملک کو عمرانی، سیاسی اور تجارتی فوائد حاصل ہونگے۔ خیال یہ کیا گیا کہ ہندوستان میں اس زمانہ میں ریلوں کی تعمیر کے لئے خانگی سرمایہ ہمیا نہیں ہو سکیگا۔ اس لئے ضمانتی نظام اختیار کیا گیا۔ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۶۰ء کے درمیان ہندوستان کے مختلف حصوں پر ریلوں کی تعمیر اور انتظام کے لئے آٹھ کمپنیوں سے معاہدے کئے گئے اور حکومت ۴½ فی صدی سے ۵ فی صدی تک سود کی ضامن ہوئی۔ حکومت کی جانب سے کمپنیوں کو بلا معاوضہ اراضی عطا کی گئی اور اس نے اپنے لئے نگرانی کے بعض اختیارات نیز پچیس یا پچاس سال کے اختتام پر ریلوے لائن خرید لینے کا حق چند شرائط کے تحت محفوظ کر لیا۔ مقررہ شرح سود ادا کرنے کے بعد جو زائد منافع حاصل ہو اس کے متعلق یہ طے پایا تھا کہ اس کو مساوی طور پر حکومت اور کمپنیاں تقسیم کر لیں۔ لیکن اس نظام کے ابتدائی نتائج بہت مایوس کن رہے اور حکومت کے ذرائع آمدنی پر یہ نظام بار ثابت ہونے لگا۔ چونکہ حکومت نے کچھ منافع کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی اس لئے کمپنیوں کو اپنے اخراجات میں احتیاط اور کفایت برتنے کی ترغیب نہیں ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش تھی اس لئے کسی فوری منافع کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ کمپنیاں سال بہ سال معمولی شرح سود کے حاصل کرنے میں بھی ناکام رہیں اس طرح سے اس کمی کی تلافی سرکاری خزانہ سے کرنی پڑی۔

(۲) حکومت کی جانب سے تعمیر اور انتظام ۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۹ء | مندرجۂ بالا وجوہ کی بنا پر حکومت نے تصفیہ کیا کہ نئی ریلوے لائن بطور خود تعمیر کرکے خود نفع حاصل کرے اور تعمیر میں کفایت کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس پالیسی کے تحت سندھ اور پنجاب میں ریلوے لائن تعمیر کئے گئے۔ لیکن روپے کی قیمت میں تخفیف ۱۸۷۴ء اور ۱۸۷۹ء کے قحط اور سرحدی لڑائیوں کی وجہ سے مالی مشکلات پیدا ہوئیں جن سے تنگ آکر حکومت نے اپنی یہ پالیسی ترک کردی۔

(۳) جدید ضمانتی نظام ۱۸۷۹ء تا ۱۹۰۰ء | حکومت نے دوبارہ تصفیہ کیا کہ ضمانتی کمپنیوں کے توسط سے استفادہ کیا جائے چنانچہ بنگال ناگپور ریلوے کمپنی اور مدراس اینڈ سدرن مرہٹہ ریلوے کمپنی سے معاہدات کئے گئے اس دور میں کمپنیوں نے جو ریلوے لائین تعمیر کیں وہ حکومت کی ملکیت قرار دی گئیں۔ حکومت نے اپنے لئے یہ اختیار حاصل کیا کہ ۲۵ سال کے بعد اصل ادا کرکے ٹھیکہ ختم کردے۔ ضمانت کی میعاد کے دوران میں شرح سود ۳½ فی صدی قرار دی گئی۔ منافع کی بچت کا ایک بڑا حصہ ¾ حکومت نے اپنے قبضہ میں رکھنا شروع کیا۔ حکومت نے کمپنیوں کو جو سرمایہ فراہم کیا تھا ان پر سود لگایا گیا اس جدید ضمانتی طریق کے تحت جن شرایط پر ٹھیکے دئے گئے وہ ہر اعتبار سے حکومت کے حق میں ابتدائی نظام کے مقابلہ میں زیادہ نفع بخش تھے۔ ریلوے لائنوں کی تکمیل کے بعد کمپنیوں کو انتظام سپرد کردیا گیا۔ بعد ازاں جبکہ قدیم اور جدید ٹھیکے کے معاہدوں کی مدت ختم ہوگئی تو حکومت نے یا تو لائن خرید لیں اور ان کو راست حکومت کے انتظام میں لے لیا گیا جیسے کہ ایسٹرن بنگال ریلوے اور سندھ پنجاب ریلوے یا دوبارہ ان ہی کمپنیوں کے انتظام میں ان کو رہنے دیا گیا جیسے کہ ایسٹ انڈیا ریلوے اور جی۔ آئی۔ پی ریلوے۔ اس طرح بڑی بڑی ریلوے لائنیں حکومت کے قبضہ میں آگئیں۔ حال حال تک انتظام کمپنیوں کے تفویض تھا اور حکومت ایک ریلوے بورڈ کے ذریعہ نگرانی کرتی تھی جو ۱۹۰۵ء میں قائم ہوا تھا۔ سب سے آخر میں بنگال ناگپور ریلوے کا ٹھیکہ ہے جو ۱۹۵۰ء میں ختم ہوگا۔ اس عرصہ میں ذیلی ریلوے لائنوں کی کمپنیاں بھی قائم ہوئیں اور ہندوستانی ریاستوں کو اپنے اپنے علاقوں میں ریلوے کی تعمیر پر آمادہ کیا گیا۔ ۱۹۲۵ء کے بعد سے حکومت نے پھر اپنا ذاتی سرمایہ لگانے کا تصفیہ کیا ہے۔

(۴) ریلوں کی توسیع اور منافع کی ابتدا ۱۹۰۰ء تا ۱۹۱۴ء ماقبل جنگ کی چودہ سالہ مدت کے دوران میں ترقی و توسیع کے ساتھ ساتھ منافع کی بھی ابتدا ہوئی ۔ ۱۹۰۰ء میں یہ نظام العمل اختیار کیا گیا کہ حکومت آیندہ کے لئے سالانہ ۱۲½ ملین پونڈ ریلوے کے معیاری اخراجات کے لئے مختص کر گئی ۔ اس مقصد کے لئے انگلستان میں حصول قرضہ کا طریقہ جاری کیا گیا ۔ ملک کی عام معاشی ترقی اور کچھ پنجاب اور سندھ میں کارہائے آبپاشی کی توسیع کے باعث منافع حاصل ہونے لگا ۔

(۵) ریلوے نظام میں رخنہ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۲۱ء اس دور میں کچھ تو جنگی کاروبار کی وجہ سے اور کچھ تو مقررکردہ نظام العمل کے تحت سرمایہ لگانے میں تخفیف کی بدولت ریلوے نظام میں بڑا رخنہ پیدا ہو گیا ۔

اکورتھ کمیٹی اور اس کے بعد کے حالات ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم کا اختتام ہو گیا تو حکومت ، ریلوے سے متعلق امور کی تحقیقات کے لئے ایک خاص کمیٹی سر ولیم اکورتھ کی صدارت میں مقرر کی ۔ اس کی سفارشات کی بنا پر ۲۱ - ۱۹۲۰ء میں سررشتہ ریلوے کے طریق عمل میں تبدیلیاں کی گئیں ۔ کمیٹی نے ریلوں کی سرکاری ملکیت اور ریلوے لائنوں کی سرکاری توسط سے تعمیر کی تائید کی ۔ ہندوستانی رائے عامہ کمپنیوں کے انتظام کی شدت سے مخالفت کرتی رہی ۔ اس منافع کے قطع نظر جو کمپنیاں ہندوستان سے حاصل کیا کرتی تھیں ۔ یہ الزام بھی ان پر عائد کیا گیا کہ کمپنیوں کو ہندوستانی قومی مفاد سے کوئی ہمدردی نہیں ہے ۔ اس سے ہندوستانی صنعت و حرفت اور تجارت کو بھی کوئی امداد نہ ملتی تھی ۔ اس کے علاوہ درجہ سوم کے مسافروں کے آرام کی جانب بہت کم توجہ برتی جاتی تھی ۔ حالانکہ اسی درجہ کے مسافرین سے ریلوے کی آمدنی کا بڑا حصہ وصول ہوا کرتا ہے ۔ جدید پالیسی کے تحت گریٹ انڈین پینسلا ، ایسٹ انڈین اور سدرن پنجاب ریلوے کمپنیاں سرکاری انتظام کے تحت لے لی گئی ہیں ۔ ریلوے بورڈ کی بھی جدید تنظیم کی گئی جو چیف کمشنر ، فینانشیل کمشنر اور تین اراکین پر مشتمل ہے ۔ اسی بورڈ کے ذریعہ سے حکومت ہند ملک کی تمام ریلوں کی موثر طریقہ پر نگرانی کرتی ہے ۔ ریلوے کے اخراجات کے لئے بھی بڑی بڑی رقمیں فراہم کی گئیں ۔ اکورتھ کمیٹی کی اہم سفارش کے مطابق ریلوے کے موازنہ کو عام موازنہ سے ۱۹۲۵ء میں علحدہ کر دیا گیا تاکہ ریلوے کے کاروبار کو تجارتی نقطۂ نظر سے چلایا جائے ۔ اس نئے انتظام کے تحت ریلوے کے لئے یہ امر ضروری قرار دیا گیا کہ عام موازنہ کیلئے

سالانہ رقمی امداد دیا کرے۔ تجارتی کساد بازاری کی وجہ سے ریلوے کی آمدنی میں نقصان ہوا اس لئے ۲۲-۱۹۲۱ء تا ۳۷-۱۹۳۶ء میں ریلوے مالی رقم کے ادا کرنے سے قاصر رہی۔ اس کے بعد سے مالی حالات اصلاح پذیر ہوگئی ۱۹۳۶ء میں انڈین ریلوے انکوائری کمیٹی کا انعقاد عمل میں آیا۔ اور سر الف ویجوڈ اس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ جون ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی جس میں ریلوے کی کارکردگی میں اضافہ اور اخراجات میں کمی کرنے کی سفارشات کی گئیں۔ اس کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی کہ ریلوے کی جانب سے مرکزی موازنہ میں جو امداد دی جاتی ہے وہ بند کر دی جائے۔ ریلوے ورکشاپ اور تجارتی شعبہ میں یوروپین کے خدمات حاصل کئے جائیں۔ اس کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ ریلوے کا عوام سے ربط بڑھایا جائے اور ریلوے کی جانب سے سررشتۂ اطلاعات کا قیام عمل میں لایا جائے۔

۱۹۳۹ء کے اختتام پر ریلوے لائین ۴۱۱۳۴ میل تھی اور ان پر تقریباً ۸۰۰ کروڑ روپے صرف ہوا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں وار ٹرانسپورٹ بورڈ کا قیام عمل میں آیا تاکہ تمام ذرائع نقل و حمل میں ارتباط قائم کیا جائے اور مفاجاتی صورت آمد و رفت پر نگرانی رکھی جائے۔

<u>ریلوں کے معاشی اثرات</u> ریلوں سے ملک کو مخصوص فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ عام نظم و نسق کی کارکردگی اور فوجی مدافعت کے علاوہ اس سے ملک کی ثقافتی ترقی میں بھی اضافہ ہوا۔ ان کے معاشی اثرات بھی مساوی طور پر اہم ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں امداد قحط کا کام ریلوے کے ہی ایک باقاعدہ نظام پر مبنی ہے تاکہ قحط زدہ مقامات پر غلہ جلد مہیا کیا جا سکے۔ ملک بھر میں معاشی ترقی، قیمتوں کی یکسانیت روزگار کے نئے ذرائع اور آبادی کی مساوی تقسیم کا امکان ریلوں ہی کے باعث حاصل ہوتا ہے۔ ریلوں کی ترقی سے دیہاتوں کی معاشی انفرادیت اور وہاں کا خود مکتفی نظام زندگی تہ و بالا ہو گیا۔ زراعت کو اب تجارتی اصول پر چلایا جا رہا ہے جس سے کاشتکار نہ صرف اپنے قوت لایموت کی حد تک غلہ پیدا کرتا ہے بلکہ وسیع بازاروں میں اپنی پیداوار کی فروخت سے منافع بھی حاصل کرتا ہے یہ موقع ریلوں کی توسیع کے باعث ہی وجود میں آسکا۔ ریل سے جلد جلد حمل و نقل کا جو ذریعہ مہیا ہو گیا ہے اس کی بدولت بندرگاہوں تک مال و اسباب کے پہنچانے اور وہاں سے اندرون ملک تجارتی اشیاء کی تقسیم میں سہولتیں پیدا ہوئیں ان کی وجہ سے نہ صرف

قومی تجارت کو فروغ حاصل ہوا ہے بلکہ دوسرے ممالک سے تجارتی تعلقات کے قیام میں بھی مدد ملی۔ اس کے ساتھ ریلوے کے وجود سے بعض ناگوار نتائج بھی پیدا ہوئے مثلاً سب سے بڑا نقصان ملکی صنعتوں کی فوری زوال کی صورت میں نمودار ہوا کیونکہ مشین کی بنی ہوئی اشیاء سے سخت مسابقت شروع ہوئی کیونکہ یہ چیزیں ریلوں کے ذریعہ ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچنے لگیں۔

ریلوں کی مزید ترقی کی ضرورت | بہ حیثیت مجموعی ریلوں کے فوائد کے مقابل نقصانات کو نظرانداز کردیا جاسکتا ہے اور جہاں تک مستقبل کا تعلق ہے دیہی رقبوں میں جہاں ریل کا جال بہت کم بچھایا گیا ہے خصوصیت کے ساتھ ریلوں کی مزید ضرورت پائی جاتی ہے۔ ریلوں کی ترقی میں ہندوستان دوسرے ممالک سے بہت پیچھے ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ میں فی سو مربع میل ۸،۲ میل ریلوے لائن ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان میں فی سو مربع میل میں صرف ۲،۲ میل ریلوے لائن ہے۔ ریلوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اسکی بھی ضرورت ہے کہ ریلوں سے متعلقہ صنعتوں کو ترقی دی جائے۔ ریلوے کے کرایہ اور اخراجات حمل و نقل کی پالیسی کا اصلی مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ملک کی عام صنعتی ترقی میں مدد ملے۔ ریلوے کرایہ کی مشاورتی کمیٹی قائم ہے جو متعدد شکایات مثلاً بے جا ترجیح، بڑھیا شرح، تجارت کی ضروری سہولتوں سے محرومی وغیرہ کی تحقیقات کرتی ہے اور ان معاملات سے متعلق حکومت کے پاس سفارشات پیش کرتی ہے۔

مملکت آصفیہ میں ریلوے

ریلوے کی ابتدائی تاریخ | مملکت آصفیہ میں ریلوے لائن کی تعمیر کا خیال پہلے پہل ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوا تاکہ بمبئی اور مدراس کو ریلوے سے ملحق کردیا جائے۔ چنانچہ سکندرآباد اور واڑی کے درمیان پہلی ریلوے لائن ۱۸۷۴ء کو جاری کی گئی۔ جو ۱۱۷ میل لانبی تھی۔ اس کے لئے ۹۷ لاکھ روپے کا سرمایہ سرکار عالی اور رعایائے سرکار عالی سے فراہم کیا گیا۔ رقم کافی نہ ہونے سے پانچ لاکھ پونڈ کا قرضہ انگلستان سے بعض صدی منافع کی ذمہ داری سے حاصل کیا گیا۔ ریلوں کی تیاری اور انتظام جی۔آئی۔پی ریلوے کے سپرد کیا گیا ابتدائی سالوں میں سرکار عالی کو منافع ملنا تو درکنار رعایائے ملک کے حصص کی ذمہ داری منافع میں معتدبہ رقم مملکت کو ادا کرنی پڑی۔ اس کے بعد چار سال تک ریلوے کی تعمیر کی رفتار بہت تیز رہی ۶۰ میل میں

سکندرآباد تا ورنگل ریلوے لائن جاری کی گئی اس کی لانبائی ۸۷ میل تھی۔ ۱۸۸۸ء میں ورنگل تا ڈورنگل ریلوے لائن ڈالی گئی اس کا فاصلہ ۳۵ میل تھا۔ اسی سال ۱۶ میل تک ڈورناکل تا سنگرینی کالیریز کو ریلوے سے ملحق کر دیا گیا۔ ۱۸۹۹ء میں حیدرآباد گوداوری وایلی ریلوے لائن سکندرآباد تا منماڈ کی تکمیل ہوئی۔ اس کی تعمیر سے مملکت آصفیہ کے علاقہ مرہٹواڑہ کے زرخیز خطہ کو آباد کرنے میں مدد ملی اور یہاں کی پیداوار کو بمبئی کے بازاروں تک پہنچانے میں سہولت ہوگئی۔ اس ریلوے کی تعمیر کے بعد سے مملکت میں نئی ریلوں کی تعمیر کا مسئلہ ایک عرصہ تک ملتوی رہا۔

۱۹۱۲ء میں پونا ہنگولی ریلوے لائن پایۂ تکمیل کو پہونچی اس تعمیر کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی چھوٹی پٹری کی ریلوں میں اتصال قائم کیا جائے لیکن جس غرض سے اس لائن کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا وہ پورا نہیں ہوا ۱۹۱۶ء میں سکندرآباد تا کرنول ریلوے لائن کی تعمیر کا کام آغاز ہوا اور ۱۹۱۷ء تک ونپرتی روڈ تک ریلوے لائن ڈالی گئی۔ جنگ عظیم اور اس کے بعد مالی مشکلات کے مدنظر یہ کام ملتوی رہا۔ ۱۹۲۸ء میں ونپرتی روڈ سے ڈورناچلم تک ریلوے لائن ملا دی گئی اس سے جنوبی ہند کی چھوٹی پٹری کی ریلوں سے اتصال پیدا ہوگیا۔ قاضی پیٹھ بلہارشاہ ریلوے لائن کی ابتدا بھی اسی زمانہ میں ہوئی اس کی وجہ سے شمالی اور جنوبی ہند کے درمیان بڑی پٹری کی ریل سے قریب ترین راستہ مہیا ہوگیا۔ اس ریلوے لائن کا افتتاح ۱۹۲۸ء میں حضرت اقدس و اعلیٰ نے بہ نفس نفیس فرمایا ۱۹۲۹ء میں پربھنی تا پرلی ویجناتھ ریلوے لائن کی تکمیل ہوئی جو چالیس میل لانبی ہے مانجرا کی زرخیز وادی میں ریل کے ذریعہ حمل و نقل کی سہولت ۱۹۳۰ء میں ہوئی اور وقارآباد تا بیدر تک ریلوے لائن ڈالی گئی جسکی مسافت ۵۷ میل ہے۔

اس موقع پر اس امر کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ ۱۹۱۲ء کے بعد سے ریلوے کی تعمیر سرکار عالی کے سرمایہ سے ہوئی۔ البتہ ان کی تعمیر اور انتظام نظام گارنٹیڈ اسٹیٹ ریلوے کمپنی کے تفویض رہا۔ ریلوے کی تاریخ کا ایک نیا باب یکم اپریل ۱۹۳۰ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ ن۔ جی۔ ایس ریلوے کمپنی سے مملکت آصفیہ کی تمام ریلیں سرکار عالی نے خرید لیں۔ ۱۹۳۳ء میں بیدر سے پرلی ویجناتھ تک کی ریلوے

لائن مکمل ہوئی۔ ۱۹۴۰ء میں نظام آباد سے بودھن تک ۱۲ میل کی ریلوے لائن ڈالی گئی تاکہ کارخانہ شکرسازی بودھن کی ضرورت کی تکمیل کو پورا کرے۔ اسی سال مدکھیڑ سے عادل آباد کی ریلوے لائن کی تعمیر شروع کی گئی تاکہ ملک کے ایسے غیر ترقی یافتہ حصوں کے راستے کھل جائیں جو قدرتی اور صنعتی وسائل سے معمور ہیں۔ لیکن موجودہ جنگ کی وجہ سے پٹریاں دستیاب نہیں ہو رہی ہیں اس لئے فی الحال مٹی کا کام احاطہ بندی اور آب رسانی سے متعلق انتظامات مکمل کئے جا رہے ہیں۔

۴۔ موجودہ زمانہ میں مملکت آصفیہ میں ریلوے لائن کا مجموعی طول ۱۳۶۰ میل ہے جس میں ۶۸۸ میل چوڑی پٹری اور ۶۷۲ میل چھوٹی پٹری ہے۔ ان میں سے ۵۰ میل کی ریلوے لائن حکومت ہند کی جانب سے بیرون ملک سرکار عالی تیار کی گئی ہے۔

ٹرک اور ریلوے میں اشتراک عمل ہماری ریلوے کی حالیہ تاریخ میں ایک امتیازی چیز ریل اور ٹرک کے حمل ونقل میں باہمی اشتراک عمل ہے۔ ہندوستان میں یہ ایک نئی چیز ہے اس لئے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اس بارہ میں سرکار عالی کی ریلوے نے ہندوستان کے دوسرے ریلوں کی رہنمائی کی ہے۔ اس اقدام سے بڑی حد تک ریلوے اور روڈ ٹرانسپورٹ سرویس کی مسابقت کا خوف جاتا رہا۔ جون ۱۹۳۲ء میں آزمائشی طور پر ۲۷ بسوں سے بعض خاص راستوں پر ابتدا کی گئی۔ اس اسکیم کے لئے ساڑھے چار لاکھ روپے منظور کئے گئے۔ منظم اور آرام دہ ریلوے بسوں کا مقررہ کرایہ اور مقررہ نظام الاوقات میں چلنے کی وجہ سے بہت جلد ہر دل عزیز ہو گئے۔ اس سے پہلے خانگی بس سرویس جاری تھی لیکن یہ غیر آرام دہ ہونے کے علاوہ مقررہ اوقات میں بھی نہ چلتی تھیں اور ریلوے سے ان کی مسابقت کا خطرہ تھا۔ اس پالیسی کے مالی نتائج اس قدر حوصلہ افزا ثابت ہوئے کہ روڈ ٹرانسپورٹ سرویس میں مزید توسیع کی حکمت عملی قبول کرلی گئی۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء کے ختم پر ریلوے کی بس سرویس کا فاصلہ ۱۳۶۲ میل اور ۱۱۸ ریلوے بس چلتی رہیں ۱۹۳۷ء میں اہم اسٹیشنوں پر اس امر کا انتظام کیا گیا کہ تاجروں کے گودام سے اسٹیشن تک اور وہاں سے گودام تک اشیاء کا حمل ونقل لاریوں کے ذریعہ ہوسکے ۱۹۴۰-۴۱ء کے ختم پر بس سرویس ۵۷۰۴ میل کے طول پر حمل ونقل کا کام انجام دیتی رہی یہ ۲۹۴ بسوں موٹروں اور ۴۴ سامان کی لاریوں

مشتمل تھیں۔ مملکت آصفیہ کے شوارع کے تقریباً [illegible] مجموعی فاصلہ پر بس سروس جاری رہی۔ ۴۲-۱۹۴۱ء کے ختم پر اس سروس پر ۶۵ لاکھ ۴۱ ہزار روپے کلدار کا سرمایہ لگایا گیا۔ اس سال خالص آمدنی ۳۶ لاکھ ۵۷ ہزار روپے کلدار ہوئی اور اخراجات ۳۱ لاکھ ۵۶ ہزار روپے کلدار ہوئے اور خالص منافع ۵ لاکھ ۱ ہزار روپے کلدار ہوا۔ اس طرح کل سرمایہ پر ۸ فی صدی منافع حاصل ہوا۔

۱۹۳۶ء میں ریلوے کی تنظیم جدید کی گئی اور اس کے دو شعبے کر دیئے گئے ایک صیغہ تجارتی اور دوسرے ٹرانسپورٹ صیغہ تجارتی ریلوے سے متعلقہ تجارتی مسائل، کرایہ جات، بیرونی ریلوے سے معاہدات تشہیر اور تصفیہ مقدمات و مطالبات کا کام انجام دیتا ہے۔ شعبۂ ٹرانسپورٹیشن کا کام ٹرینوں کے کنٹرول اور نقل و حرکت پر نگرانی کرنا ہے۔ یہ جدید تنظیم بہت ہی کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ ہندوستان کے لئے ویجوڈ کمیٹی نے بھی اسی کی سفارش کی تھی۔ مسافروں کو آرام اور سہولت پہونچانے کے لئے ریلوے کی ایک مشاورتی کمیٹی بھی قائم ہے۔ حیدرآباد ریلوے بورڈ ۱۹۴۱ء سے لندن سے حیدرآباد میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

ریلوے کے سررشتہ کو اپنے ملازمین کے آرام اور سہولت کا خیال رہا ہے۔ چنانچہ ان کے لئے رہائشی مکانات اور تفریح کے سامان فراہم کئے گئے ہیں۔ بچوں کے لئے تعلیمی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ طبی امداد بھی حاصل ہے۔ ریلوے کے بالغ ان پڑھ ملازمین کے لئے اضلاع میں جماعتیں قائم کی گئی ہیں تاکہ ان کی کارکردگی میں اضافہ ہو سکے۔ بمقام لالہ گوڑہ ایک مرکز بہبودی اطفال اور زچگی خانہ قائم کیا گیا ہے۔

واڑی، قاضی پیٹھ اور بیدر تک ڈیزل کار چلانے کا انتظام کیا گیا ہے یہ درجہ سوم کے مسافرین کے لئے بڑی سہولت مہیا کرتے ہیں جو ہندوستان میں پہلی مثال ہے۔

موجودہ زمانہ میں ریلوے ورکشاپ میں سامان جنگ بنانے کا کام بڑھتی ہوئی رفتار سے انجام پا رہا ہے۔ ہندوستانی افواج کے لئے میکانکس ڈرائیوروں کی تربیت کی اسکیم میں عملی توسیع کی گئی ہے۔

سڑکیں

سڑکوں کی مالیہ تاریخ انیسویں صدی کے وسط تک بھی ہندوستان میں اچھی سڑکیں بہت کم تھیں۔

لارڈ ولیم بنٹنک نے شمالی ہند کو بنگال سے ایک شاہراہ کے ذریعہ ملانے کی تجویز کی تجدید کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پشاور سے دہلی اور دہلی سے کلکتہ تک ایک وسیع شاہراہ "گرانڈ ٹرنک روڈ" تعمیر ہو گئی۔

لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ سے سڑکوں کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا اور سڑکیں تعمیر کرنے کی ایک مستحکم پالیسی کی ابتدا ہوئی۔ مرکزی محکمۂ تعمیرات کا قیام عمل میں آیا اور ملٹری بورڈس کی بجائے (جو سڑکوں کی نگرانی کیا کرتے تھے) ۱۸۵۵ء میں ہر صوبہ میں تعمیرات کے سررشتے قائم کئے گئے۔ جب ریلوے کی تعمیر تیزی کے ساتھ شروع ہوئی تو سڑکوں کی تعمیر ضروری ہوئی تاکہ ریلوے کو اس سے مدد حاصل ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے ریلوں سے مسابقت مقصود نہ تھی۔ تاہم طویل مسلسل سڑکوں کی تعمیر کی جانب بہت کم توجہ کی گئی۔ کیونکہ حکومت ریلوں کے زیادہ نفع بخش کاموں کی طرف زیادہ مشغول تھی۔ لارڈ میو اور لارڈ رپن کے زمانہ میں مقامی حکومت خود اختیاری کی تدریجی پالیسی جو اختیار کی گئی اس کے باعث مقامی امور پر مقامی باشندوں کو اختیار حاصل ہوا جس سے سڑکوں کی تعمیر میں بھی بڑی ترقی ہوئی اور اس کے مجموعی طول میں مستقل طور پر اضافہ ہوا یہاں تک کہ ۱۹۳۶-۳۷ء میں ۲۴۱۷۱ میل سڑکیں تیار ہو گئیں۔ اس طرح اگر روزانہ موٹر کے ذریعہ دو سو میل سفر کیا جائے تو چار سال سے زاید مدت درکار ہو گی۔

<u>ہندوستانی سڑکوں کی اہم خصوصیت</u> ہندوستانی سڑکوں کی اہم خصوصیات مختصراً حسب ذیل ہیں۔ ملک میں چار بڑی شاہراہیں موجود ہیں جن سے ذیلی سڑکیں ملائی گئی ہیں۔

(۱) سب سے مشہور شاہراہ ملک کے شمالی حصہ میں خیبر سے کلکتہ تک جاتی ہے جو قدیم زمانہ میں فوجی شاہراہ تھی۔ (۲) کلکتہ سے مدراس تک (۳) مدراس سے بمبئی تک (۴) بمبئی سے دہلی تک۔

۱۹۳۶-۳۷ء میں برطانوی ہند میں پختہ سڑکیں ۸۲۲۹۹ میل تھیں ان میں پانچ ہزار میل کی مندرجہ بالا چار بڑی شاہراہیں بھی شامل ہیں۔ جنوبی ہند اپنی سڑکوں کی تعداد اور اپنی ذیلی سڑکوں کی عمدگی کی وجہ سے بہت قابل رشک ہے۔ سڑکوں کے لحاظ سے راجپوتانہ، سندھ، پنجاب کے کچھ حصے، اڑیسہ اور بنگال بہت پس ماندہ ہیں۔ بنجر مقامات آبادی کے فاصلہ کی درازی، دشوار گذار

ناقابل عبور آبی گذرگاہیں میدانوں کی مشکلات (جیسا کہ ہمالیہ کے دامن میں ہے) سڑکوں کی تعمیر میں تعمیری اشیاء کا فقدان وغیرہ وہ چند مشکلات ہیں جو فوری ترقی میں مانع ہیں۔ اس کے علاوہ بڑی تعداد میں کچی سڑکیں بھی ہیں۔ ۳۷-۱۹۳۶ء میں ان کا طول ۸۲۳۱۸ میل تھا۔ بعض کچی سڑکیں بھی موسم گرما میں موٹر کے عبور و مرور کے لئے موزوں ہیں۔

مزید سڑکوں کی ضرورت | رقبہ کے لحاظ سے ہندوستان میں بہت ہی کم سڑکیں ہیں۔ سڑکوں کی قلت اس وجہ سے بھی محسوس ہو رہی ہے کہ موٹر کے ذریعہ حمل و نقل میں سرعت کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اس سے سڑکوں کی تعمیر اور نگہداشت کے متعدد مسائل پیدا ہو چکے ہیں۔ ممالک متحدہ امریکہ میں ایک لاکھ نفوس کی آبادی میں پچیس ہزار میل کی سڑکیں ہیں تو ہندوستان میں صرف ۴۸ میل کی سڑکیں ہیں دیہاتی علاقوں میں جہاں مزید اور بہتر سڑکوں کا مطالبہ کیا جا رہا ہے موجودہ سڑکوں ہی کو اچھی حالت میں قائم رکھنے میں مشکلات حائل ہو رہی ہیں ان سڑکوں کی حالت خصوصیت کے ساتھ بڑی ہے جو مقامی مجالس کی نگرانی میں ہیں۔ کیونکہ ان مجالس کے ذرائع اور وسائل نہایت محدود ہیں ملک کی وسیع داخلی اور خارجی تجارت کا بوجہ احسن انتظام کرنے، زرعی پیداوار سے متعلقہ مصنوعات کی تیاری و نشو و نما اور جنگلات کے مفید وسائل سے مستفید ہونے کے لئے ضرورت ہے کہ ملک بھر میں شاہراہوں اور ذیلی سڑکوں کا جال بچھا دیا جائے۔

ریلوے لائن اور سڑکوں کے مابین ارتباط | سڑکوں کی ترقی سے ریلوں پر مضر اثر نہ پڑنا چاہیئے۔ حقیقت میں ریلیں ذیلی اور الحاقی سڑکوں سے قابل لحاظ فائدے حاصل کرینگی۔ جہاں تک کم فاصلہ اور قلیل التعداد افراد کے سفر کا تعلق ہے موٹروں کو ریلوے پر فوقیت حاصل ہے لیکن دور دراز فاصلے کے سفر و زنی اشیاء کے حمل و نقل کے لئے ریلیں نسبتاً زیادہ آرام دہ اور کم خرچ ذریعہ حمل و نقل ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی سڑکیں اور ریل مسابقت سے زیادہ ایک دوسرے کے لئے مدد و معاون ہونا چاہیئے۔ موجودہ زمانہ میں ریل اور سڑک کے ذریعہ حمل و نقل میں ہم آہنگی پیدا کرنے پر زیادہ توجہ کی جا رہی ہے شملہ میں روڈ ریل کانفرنس جو منعقد ہوئی اس میں اس مسئلہ پر بحث کی گئی اور ۱۹۳۷ء میں ایک چھوٹا انکوائری

کمیٹی نے بھی تحقیقات کی۔ اس کمیٹی کی سفارشات پر ۱۹۳۹ء میں قانون سواری ہائے موٹر مرکزی مقننہ میں منظور ہوا۔ موٹر لاریوں اور بسوں کے قواعد بھی مرتب ہوئے تاکہ ان کو مفاد عامہ کی خاطر استعمال کیا جاسکے۔ انہی قواعد کے تحت صوبہ واری حکومتوں کو سڑکوں پر نقل و حمل کی نگرانی کا اختیار دیا گیا ہے تاکہ ریلوں اور سڑکوں میں نامناسب مسابقت نہ ہونے پائے۔ اس نئے قانون کے نفاذ کے بعد توقع ہے کہ نقل و حمل کے ذرائع میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔

<u>سڑکوں کی جدید پالیسی</u> | ہندوستان کے سڑکوں کی ترقی کے مسائل پر غور کرنے کے لئے ۱۹۲۷ء میں ایک خاص روڈ کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ کمیٹی نے سڑکوں کی ایک وسیع پالیسی اختیار کرنے اور مقامی مجالس سے ربط قائم کرنے پر زور دیا۔ اس کمیٹی نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ سڑکوں کو ترقی دینے کا کام صوبہ جاتی حکومتوں اور مقامی مجالس کے مالیاتی حدود سے متجاوز ہو رہا ہے۔ قومی مفاد کا مسئلہ ہونے کے باعث اس کا تعلق بڑی حد تک مرکزی حکومت کے مالیات سے ہونا چاہیئے۔ روڈ کمیٹی نے اس کی بھی سفارش کی کہ صوبوں کی آمدنی سے مقامی مجالس کو فیاضانہ امداد عطا کی جانی چاہیئے۔

روڈ کمیٹی کے سفارشات کے بموجب مارچ ۱۹۲۹ء میں پٹرول پر درآمدی محصول اور چنگی چار آنہ سے بڑھا کر چھ آنے فی گیالن کر دی گئی۔ اس زائد محصول کی آمدنی سڑکوں کی ترقی کے لئے محفوظ کر دی گئی اور ایک علیحدہ کھاتہ میں اس رقم کا اندراج ہونے لگا۔ اس رقم سے حکومت ہند کا سالانہ حصہ ۱۵ فی صدی علیحدہ کرنے کے بعد (اس کی مقدار ۱۹۳۴ء تک دس فیصدی تھی) ہر صوبہ کو اس کے پٹرول کے صرفہ کے تناسب سے رقم سالانہ تقسیم کر دی جاتی ہے۔ یہ رقم ان اسکیموں پر صرف کیجاتی ہے جس کو مرکزی مقننہ کی سڑکوں کی مجلس قائمہ کے مشورہ سے گورنر جنرل باجلاس کونسل کی منظوری حاصل ہو۔ سڑکوں سے متعلق مسائل میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے صوبہ جاتی حکومتوں کے نمائندے مذکورہ صدر مجلس قائمہ کے مشاورتی اجلاسوں میں شرکت کرتے ہیں۔ ۱۹۳۴ء میں اس پالیسی کو مستقل صورت دی گئی۔ اگر کوئی صوبہ واری حکومت اپنے حدود کے اندر موٹر گاڑیوں کے حمل و نقل کی تنظیم یا اس پر نگرانی رکھنے سے قاصر رہ جائے تو قرارداد بابتہ ۱۹۳۰ء کی رو سے

حکومت ہند کو مجاز گردانا گیا ہے کہ پٹرول کے محاصل میں اس کا حصہ رسدی [illegible]ے۔

سررشتۂ تعمیرات کی تنظیم | ہندوستان میں تعمیرات کے حسب تفصیل ذیل چار شعبے ہیں۔

(۱) کارہائے عسکری (۲) ریلوے (۳) آب پاشی (۴) عام سیول ورکس مثلاً سڑکیں اور عمارات

اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے کہ لارڈ ڈلہوزی نے صوبہ واری سررشتہ ہائے تعمیرات کے علاوہ مرکزی محکمۂ تعمیرات بھی قایم کیا۔ اس انتظام سے قبل ہر ایک صوبہ میں تعمیرات کے ان چاروں شعبوں کی نگرانی ملٹری بورڈس کیا کرتے تھے۔ ریلوں کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے مدنظر ۱۹۰۵ء میں ریلوے کو ایک جداگانہ مجلس کی نگرانی میں لیا گیا۔ وائسرائے کی کونسل میں اس مجلس کی نمایندگی شعبۂ تجارت و حرفت کے رکن کے ذریعہ عمل میں آتی تھی۔ اس زمانہ میں مرکزی محکمۂ تعمیرات اور محکمہ ہائے مالگزاری اور زراعت کے ساتھ ضم کر دیا گیا۔ اس محکمہ کو صوبہ جاتی امور پر نگرانی کا اقتدار حاصل ہے لیکن ۱۹۱۹ء کے اصلاحات کی رو سے صرف اہم اور گراں قدر مصارف کے پراجکٹ پر اس مجلس کی نگرانی قایم ہے۔ بعض صوبہ جات میں سڑکوں کے حمل ونقل کی اہمیت کے مدنظر علیحدہ روڈ بورڈ قایم کیے گئے ہیں۔ مقامی ادارہ جات مثلاً بلدیات مقامی مجالس اور ہنگامی مجالس اپنے اپنے کاموں کی خود نگرانی کرتی ہیں اور ایک خاص عملہ خود مقرر کرتی ہیں۔

حیدرآباد میں سڑکیں | تمام اہم شہروں اور اضلاع کے مستقر اور بلدہ حیدرآباد کے مابین آمد و رفت کا ذریعہ قایم کرنے کے لئے ۱۹۱۲ء میں ایک پروگرام مرتب کیا گیا جسکی رو سے ۱۲۱ میل کے سڑکوں کی درستی اور ۲،۲۰ میل کے جدید سڑکوں کی تعمیر ہوئی۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۱ء تک ۵۲۷ میل کی جدید سڑکیں مکمل ہوئیں اور تجارت کے لیے کھل گئیں جس سے ان سڑکوں کی مسافت جن کی نگہداشت ختم ۱۹۲۱ء پر منجانب سررشتۂ تعمیرات ہوئی ۲۶۲۵ میل ہوتی ہے۔

اضلاع عادل آباد اور محبوب نگر اور بعض اقطاع ورنگل، اور کریم نگر میں گھنے جنگل موجود ہیں۔ ان مقامات میں جو سڑکیں بنائی گئی ہیں وہ نہ صرف دیہی ترقیات کے لئے بلکہ جنگلات کی پیداوار مثلاً بانس اور چوبینہ وغیرہ کی برآمد کے لئے تعمیر کئے گئے ہیں۔ نظام ساگر، ویرا اور پالیر کے خزانۂ آب کے تحت جو آب پاشی کے بڑے بڑے رقبہ جات ہیں یہاں خاص طور سے سڑکوں کی ضرورت ہے تاکہ کثیر

مقدار میں زرعی پیداوار بازار اور ریلوے کے مقامات تک روانہ کی جاسکے۔ ان اضلاع میں سڑکیں زیر تعمیر ہیں۔ مملکت آصفیہ میں جہاں سونے، کوئلہ اور چونے وغیرہ کی معدنیں موجود ہیں وہاں سڑکیں تعمیر ہو چکے ہیں اور مزید سڑکیں زیر تعمیر ہیں۔

مملکت کے شمال مغربی حصے میں سطح مرتفع کا علاقہ ہے اُن پر گھاٹ روڈ تعمیر کئے گئے ہیں۔ دولت آباد، ایلورہ اور اجنٹہ کے گھاٹ روڈ تعمیر کے بہترین نمونے ہیں۔

مملکت کی زراعت اور صنعت و حرفت کو ترقی دی جانے کے لئے مزید سڑکوں کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے حکومت ہند کی طرف سے محصول پٹرول کا ایک حصہ سالانہ حکومت سرکار عالی کو ملا کرتا ہے جو ترقی شوارع کی مد کے لئے مختص کر دیا گیا ہے۔ ۴۰-۱۹۳۹ء میں جو رقم اس گنجائش سے وصول ہوئی اس کی مقدار ۲ لاکھ ۸۶ ہزار روپے کلدار تھی اس گنجائش سے بہت سی سڑکوں کی تعمیر پر روپیہ صرف کیا گیا۔ موٹر گاڑیوں کے محصل سے جو رقم وصول ہوتی ہے اس کی گنجائش سے بھی سالانہ دو لاکھ روپے سڑکوں اور پلوں کی تعمیر و اصلاح کے لئے مختص کر دیئے جاتے ہیں۔

تعلقوں کے اہم قصبات اور تجارتی مرکزوں کو اضلاع کے مستقروں اور بلدہ حیدرآباد سے ملانے اور جہاں کہیں ہوان کے لئے ریلوے کا راستہ قریب تر کر دینے موجودہ سڑکوں پر نالے، سنگ بستہ لتے اور پل تعمیر کرنے نیز موٹروں کی بڑھتی ہوئی آمد و رفت کے خیال کرتے ہوئے موجودہ مورم سڑکوں کو شمولی انداز سے زیادہ مضبوط بنانے کا لائحہ عمل بدستور پیش نظر ہے۔

۴۱-۱۹۴۰ء کے ختم تک سررشتۂ تعمیرات نے جن سڑکوں کی دیکھ بھال اور مرمت کی ان کی مجموعی لانبائی ۵۲۲۲ میل تھی۔ سررشتۂ لوکل فنڈ کی جانب سے جو سڑکیں بنائی جاتی ہیں وہ اس کے سوا ہیں۔ مملکت کا جملہ رقبہ ۸۲ ہزار ۶ سو مربع میل ہے اور یہاں ۵۲۲۲ میل کی پختہ سڑکیں ہیں اس لحاظ سے تقریباً پندرہ مربع میل میں ایک میل کی پختہ سڑکیں ہیں۔

حیدرآباد میں روڈ پروگرام کی جدید اسکیم مرتب کر لی گئی ہے اور حالیہ موازنہ میں اس کے لئے رقم مہیا کی گئی ہے۔

مملکت میں سڑکوں کی قلت کو دور کرنے کے لئے پلوں کی تعمیر بھی ضروری ہے تاکہ آسانی سے نقل وحمل ہوسکے۔ حکومت سرکار عالی کی جانب سے بڑے بڑے دریاؤں پر پل تعمیر کئے گئے ہیں۔ دریائے گوداوری جو مملکت میں سات سو میل تک بہتی ہے اس پر نو مقامات پر پل تعمیر کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ دریائے مانجرا، بھیما، پین گنگا، تنگبھدرا اور موسی پر بھی پل تعمیر کئے گئے ہیں۔ بہرحال یہاں مزید پلوں کی ضرورت ہے۔ مملکت کے پایۂ تخت میں سمنٹ اور ڈامبر کی سڑکیں بھی تعمیر کی گئی ہیں۔ ہندوستان میں حیدرآباد اگرچہ چوتھا بڑا شہر ہے لیکن سمنٹ کنکریٹ کی سڑکیں جدید وضع کی سب سے زیادہ طول تعمیر کی گئی ہیں۔ ان کی تعمیر سے نہ صرف شہر کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا ہے بلکہ گرد آلود سڑکوں سے جو بیماریاں پھیلتی ہیں ان کا انسداد ہوچکا ہے۔

<u>سررشتۂ تعمیرات</u> سررشتۂ تعمیرات سرکار عالی کی ترتیب پہلے پہل ۱۸۶۸ء میں عمل میں آئی اور ہر ایک ضلع میں ایک ڈسٹرکٹ انجنیر مقرر ہوا اور ان کی ہدایت کے لئے ایک مجموعہ قواعد مرتب ہوا۔ چیف انجنیر اس سررشتہ پر عام طور پر اقتدارات عمل میں لاتے تھے اور کل خرچ کی تنقیح بھی انہیں سے متعلق تھی۔ ۱۸۷۵ء میں سررشتۂ تعمیرات کو دو شاخوں میں تقسیم کیا گیا یعنی انتظامی اور تعمیلی۔ ۱۸۸۷ء میں شاخ امکنہ وشوارع شاخ آب پاشی سے علحدہ کردیا گیا۔ ۱۸۹۶ء میں قحط کی وجہ جب یہ معلوم ہوا کہ بڑے بڑے تالابوں کو نہ صرف وسیع طور پر ترمیم کرنے کی بلکہ ان کی اصلی حالت پر لانے کی ضرورت ہے تو ایک چیف انجنیر کے تحت ایک علحدہ سررشتۂ آبپاشی قایم کیا گیا۔ سررشتۂ آبپاشی کی توجہ ابتداً قدیم تالابوں اور کنٹوں کی جانب منعطف رہی اور اس کے بعد خزانۂ آب تعمیر کئے جانے لگے۔

۱۹۳۶-۳۷ء میں تعمیرات کی تنظیم جدید کے مسائل پر غور وخوض کرنے کیلئے حیدرآباد میں انجنیروں کی کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس نے سررشتۂ تعمیرات کی تنظیم جدید کی تجویزیں مرتب کیں تاکہ اس کی کارکردگی میں اضافہ کیا جاسکے۔

آب راہوں کے ذریعہ حمل ونقل

اندرون ملک کی آب راہیں ریلوں کے وجود سے قبل وزنی اشیاء کے لانے لے جانے میں آب راہوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ آجکل بھی اندرون ملک تجارت میں اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تاہم ریلوں کے وجود میں آنے کے بعد سے اندرونی تجارت میں آب راہوں کا استعمال ان کے بعض فوائد اور ارزانی کے باوجود بہت کچھ گھٹ گیا ہے۔ آب راہوں کے ذریعہ حمل ونقل کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) اندرونی آب راہیں (۲) بحری حمل ونقل۔

شمالی ہند کے بڑے بڑے دریاؤں کے ذریعہ کافی حمل ونقل ہوتی ہے۔ دریائے سندھ، گنگا اور برہم پتر تمام سال سینکڑوں میل تک جہاز رانی کے قابل رہتے ہیں۔ دریائے سندھ کے معاون چناب اور ستلج میں بھی تمام سال کشتی رانی ہوتی ہے۔ دکن کے دریا عام طور پر جہاز رانی کے قابل نہیں ہیں کیونکہ وہ سال بھر نہیں بہتے اور پہاڑی حصوں میں سے گذرتے ہیں لیکن مہاندی، گوداوری اور کرشنا کے بالائی حصے کشتی رانی کے قابل ہیں اندرونی جہاز رانی جس کا قدیم زمانہ میں رواج تھا (چنانچہ دریائے گنگا دریائی تجارت کا بہت بڑا ذریعہ رہا ہے) ریلوے کے وجود میں آنے کے بعد سے متاثر ہو چکی ہے صنعتی کمیشن بابتہ ۱۹۱۸ء نے ریلوے اور آب راہوں کے نظم ونسق میں ہم آہنگی پیدا کرنے پر زور دیا تھا تاکہ ریلوے نظام کی خامیوں کو دور کر کے ملک میں پیمانۂ صغیر کی حمل ونقل کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے۔

بحری حمل ونقل ہندوستان قدرتاً جہاز رانی کے لئے موزوں ہو سکتا ہے اور جہاز رانی کے ذریعہ دنیا میں ترقی یافتہ ملک ہونے کی بجا طور سے توقع کر سکتا ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا تک ہندوستان ایک بحری ملک کہلایا جا سکتا تھا۔ جہاز رانی کی صنعت ترقی یافتہ حالت میں تھی اور تجارتی اشیاء کی ایک بڑی مقدار ہندوستان میں بنے ہوئے جہازوں میں بار کی جاتی تھی۔ لوہے کے جہازوں کی ایجاد بحری ساز وسامان کی ساخت میں اصلاح وترقی اور انگریز جہازران طبقہ کی رقابت کے باعث ہندوستانی جہاز سازی کی صنعت تباہ ہو گئی۔ ساحلی تجارت میں ہندوستان کا حصہ ۲۵ فی صدی اور بیرونی تجارت میں تو

صرف چار فی صدی ہے۔ کاروبار میں منافع کا یہ بڑا شعبہ موجودہ زمانہ میں بیرونی جہاز ران کمپنیوں کے زیر نگرانی ہے جن کی مسابقت ایک ہندوستانی تجارتی بحریہ کی فوری ترقی میں مانع ہے۔ گلو تراش مقابلہ، کم کرایہ اور سامان کے حمل ونقل کے اخراجات میں تخفیف جیسے مسابقتی تدابیر ہندوستانی جہازی کمپنیوں کی ترقی میں حائل ہیں۔

ہندوستانی تجارتی جہاز رانی | تجارتی جہاز رانی کمیٹی بابتہ ۱۹۲۳ء نے ہندوستانی تجارتی جہاز رانی کی ترقی کے لئے بہت زور دیا تھا۔ اس کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ ساحلی تجارت کا حق ان جہازوں کے لئے محفوظ کر دیا جائے جو ہندوستانیوں کی نگرانی میں ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں مسٹر ایس۔ این۔ حاجی نے مرکزی مقننہ میں ایک مسودہ قانون پیش کرنے کی بے فائدہ کوشش کی کہ ساحلی تجارت کا حق صرف ہندوستانی جہازوں کو دیا جائے۔ ۱۹۳۷ء میں بھی اس طرح کی ایک اور کوشش کی گئی۔ ہندوستانی تجارتی جہاز ران کمیٹی کی سفارش پر بہرحال حکومت نے جہاز رانی کی تربیت پانے والے ہندوستانی اُمیدواروں کے لئے ایک تربیتی جہاز موسوم بہ ڈفرن مہیا کیا ہے۔

وزاگاپٹم میں جہاز سازی کا کارخانہ | تجارتی جہاز ران کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی تھی کہ کسی ہندوستانی کمپنی اور حکومت کی مدد سے جہاز رانی کا کارخانہ ہندوستان میں قایم کیا جائے۔ موجودہ جنگ کی وجہ سے اس بات کی اہمیت بہت زیادہ ہوگئی ہے کہ ہر بحری ملک کو اپنے جہاز اپنے ہی ملک میں تیار کرنے چاہیئے۔ بہرحال وزاگاپٹم جیسے موزوں مقام پر جہاز سازی کا کارخانہ قایم ہوچکا ہے جہاں آٹھ ہزار سے بارہ ہزار ٹن کے جہاز تیار ہو رہے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس صنعت میں تین ہزار سے چار ہزار مزدوروں کی کھپت ہوگی اور ہر سال سولہ جہاز تیار ہونگے۔

ہوائی جہاز | ۱۹۱۴۔۱۸ء کی جنگ کے بعد ہوابازی نے مغربی ممالک میں خصوصاً زیادہ ترقی کی ہے جسکی وجہ سے حمل ونقل کے ذرایع میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔

ہندوستان میں غیر فوجی ہوابازی کا شوق اس وقت ہوا جبکہ کراچی اور بمبئی کے درمیان ہوائی ڈاک کا افتتاح عمل میں آیا۔ اس کے بعد انگلستان اور کراچی کے درمیان ہوائی ڈاک اور

ہوائی آمد و رفت قایم کی گئی۔ حکومت ہند نے ایک ناظم ہوائیہ کا بھی تقرر کیا۔ پرواز کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے مدنظر بتدریج ترقیاں ہوئیں اور اس کے خانگی کلب بھی قایم ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں یہاں ایسے دس کلب قایم تھے۔ حکومت کی جانب سے ان کی امداد بھی کی جاتی ہے تاکہ نوجوانوں کو ہوابازی کی ٹریننگ دی جائے۔ ٹاٹا کمپنی نے حکومت ہند کی سرپرستی اور امداد سے کراچی اور بمبئی و نیز بمبئی اور مدراس کے درمیان ہوائی سرویس قایم کی جس سے نہ صرف مسافروں کی آمد و رفت کے لئے ایک نیا ذریعہ پیدا ہوا بلکہ ڈاک کو زاید خرچ ادا کرنے کے بعد جلد تر بھیجنے کا امکان بھی ہوا۔

سیٹھ وال چند ہیراچند نے بنگلور میں چار کروڑ روپیہ کے مشترکہ سرمایہ سے طیارہ سازی کا ایک کارخانہ قایم کر دیا ہے۔ بنگلور کا مقام اس لئے پسند کیا گیا ہے کہ یہاں ارزاں قوت برقی اور بھدراوتی کے کارخانہ سے اعلیٰ درجہ کا فولاد حاصل ہوتا ہے۔ حکومت ہند نے سالانہ کم از کم پچاس طیارے اس کارخانہ سے خریدنے کا وعدہ کیا ہے اور ضروری مشنری باہر سے خریدنے میں مدد دے گی۔ اس کارخانہ میں دو ہزار سے زاید ماہر فن کاریگر کام پر لگائے گئے ہیں جو دو سو سند یافتہ انجنیروں کی راست نگرانی میں کام کرتے ہیں۔

<u>حیدرآباد میں ہوائی حمل و نقل</u> | حکومت سرکار عالی کے قبضہ میں کوئی بندرگاہ موجود نہیں ہے اس لئے یہاں ہوائی حمل و نقل میں ترقی کے امکانات موجود ہیں۔ بیگم پیٹ میں ہوائی بندرگاہ کی عمارت کا سنگ بنیاد نومبر ۱۹۳۶ء میں رکھا گیا۔ ٹاٹا اینڈ سنس کی ایرمیل سرویس بھی قایم کی گئی۔ اورنگ آباد، ورنگل، رائچور، بیدر، محبوب نگر، عادل آباد، عثمان آباد، مومن آباد اور دیورکنڈہ میں ہوائی اسٹیشنوں کی تعمیر کے لئے پیمائش کی جا چکی ہے۔ سررشتہ فضائی واقع بیگم پیٹ وسیع پیمانے پر ہندوستانی فضائی فوج کے ہوابازوں کی ٹریننگ کے اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔

خارجی تجارت

<u>ہندوستان کی خارجی تجارت کی تاریخ</u> | تین سو سال قبل مسیح سے ہندوستان نے بابل، مصر، روما، یونان، چین، ایران اور عرب سے تجارتی تعلقات قائم کر لئے تھے۔ قدیم زمانہ کی یہ تجارت بیشتر کمیاب اشیا کی

ہوتی تھی۔ برآمدی اشیاء میں قیمتی پارچے، دھاتی برتن، ہاتھی دانت، عطر، رنگ، گرم مسالے وغیرہ شامل تھے۔ اس کے مقابل پیتل، ٹن، جست، شراب، گھوڑے وغیرہ کی درآمد ہوا کرتی تھی۔ سونا بھی کثیر مقدار میں درآمد ہوتا تھا۔ اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ سونے کی برآمد کے مقابل درآمد زیادہ تھی جو ہمیشہ سے ہندوستانی خارجی تجارت کی خصوصیت رہی ہے۔ مسلمانوں کے زمانہ میں شمال مغربی سرحد سے ہو کر ایران اور دوسرے شمالی ممالک کے ساتھ ہندوستان کے جو تعلقات قائم … وہ بیرونی تجارت کا مزید موجب ہوئے۔ پندرھویں صدی کے اختتام پر واسکوڈی گاما نے احمد بن ماجد کی ناخدائی میں راس امید سے ہو کر ہندوستان کا بحری راستہ … دریافت کیا اور اس طرح مغرب اور مشرق کے مابین عہد آفریں تعلقات قائم ہو گئے۔ پرتگال، ہالینڈ، انگلستان اور فرانس نے ہندوستان سے تجارتی اجارہ کے لئے جد و جہد کی۔ آخر کار انگلستان نے دوسری قوموں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۶۰۰ء میں قائم ہوئی۔ اس نے ہندوستان کی تجارت پر اپنا قبضہ جما لیا اور بالآخر یہاں سیاسی اقتدار بھی حاصل کر لیا۔ انیسویں صدی کی ابتدا سے ملکی صنعتوں کا زوال بعض معاشی اور سیاسی اسباب کی بنا پر جو عمل میں آیا اور دیہاتی زندگی کی ترقی کا تذکرہ اس سے قبل کیا جا چکا ہے اس کے نتیجہ کے طور پر ہندوستان کی خارجی تجارت کی نوعیت میں تبدیلی واقع ہوئی اور ملک سے بڑی مقدار میں خام پیداوار اور اشیائے خوراک برآمد ہونے لگے اور درآمد خاص طور پر مصنوعات کی ہونے لگی۔

دکن کی تجارت سلطنت آصفیہ کے دور میں: دکن پر آصفی پرچم لہرانے کے ساتھ ہی ہندوستان بھر میں طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ ہر طرف خانہ جنگی کا زور تھا۔ اقوام یورپ کو جدا کشورکشائی کا خیال پیدا ہوا۔ ان امور کا اثر تجارت پر پڑا۔ یوروپی اقوام کی تجارتی مسابقت اور جنگ و جدل کی وجہ سے ایران، افغانستان اور وسط ایشیا کی تجارت ختم ہونے لگی۔ اب تجارتی منڈیاں سواحل کے شہر بننے لگے۔ دکن کے قدیم تجارتی بازار اجڑ گئے اور ہر جگہ یوروپین تاجر پھیل گئے۔

آصف جاہ اول کے دور میں فرانسیسی اور ڈچ تاجروں کا زور تھا بعد وہ انگریزوں کے تجارتی

کاروبار کو نقصان پہونچانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ اس زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی عرضیاں دربار آصفی میں امداد و حمایت کی غرض سے آتی تھیں۔ اور یہاں ان کی فریاد رسی ہوتی تھی۔

آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے ایک تجارتی معاہدہ ۱۸۰۲ء میں ہوا جس کی رو سے سرکار عالی نے تمام تجارتی محاصل موقوف کر دیئے۔ پانچ صد سے زاید محصول تجارت کسی چیز پر بلا رضامندی فریقین معاہدہ نہ لینے کا اقرار کیا گیا۔ انگریز بلا مزاحمت تجارت کرنے کے مجاز کئے گئے۔ کمپنی نے اس کے عوض یہ معاہدہ کیا کہ رعایائے سرکار آصفیہ کو بلا کسی روک ٹوک کے ممالک ہند میں حق تجارت حاصل ہے۔ علاوہ بریں سرکار عالی کو حق ہے کہ تجارتی جہازی بیڑا بنائے اور ان پر اپنا پرچم لہرائے مچھلی بندر میں تجارتی کوٹھی قایم کرے ایجنٹوں کو مقرر کرے۔ بحری تجارت سواحل ہند پر آزادی کی جائے۔ سرکار عالی کے ملک سے برآمد ہونے والے مال پر بھی پانچ فی صد سے زاید محصول نہ لیا جائے گا۔

مذکورہ بالا معاہدہ قلمرو آصفی کی تاریخ میں ایک اہم چیز ہے۔ تمام تجارتی انتظامات اور محاصلات سرکاری اب اسی کی پابندی سے جاری ہیں۔

اس عہدنامہ سے سرکار عالی اور اس کی رعایا نے ایسا کوئی نمایاں فائدہ حاصل نہیں کیا جس طرح دوسرے فریق معاہدہ اور اس کی رعایا نے حاصل کیا۔ تجارتی جہازی بیڑا بنانے اور مچھلی بندر میں تجارتی کوٹھی قائم کرنے کا ارادہ کبھی قوت سے فعل میں نہ آسکا۔ کہا جاتا ہے کہ سرکار عالی کے چند جہاز گذشتہ صدی میں سمندروں میں چلتے تھے۔ لیکن وہ صرف حاجیوں کے لانے لے جانے کے ہی کام میں آتے رہے اور ناکارہ ہوجانے پر فروخت ہوگئے۔

لارڈ کیننگ وائسرائے ہند نے آصف جاہ خامس سے بذریعہ عہدنامہ جدید ایسٹ انڈیا کمپنی وغیرہ کے معاہدات کی تجدید کی تو اس میں ایک فقرہ تجارتی پالیسی کے متعلق بھی حسب ذیل داخل کیا گیا۔

جہاز رانی دریائے گوداوری اور اس کی شاخوں میں جہاں تک حدود سرکارین واقع ہیں بلا مزاحمت ہوا کرے گی اور کوئی محصول راہداری دونوں فریق معاہدہ وصول نہ کریں گے اور نہ انکی رعایا بھی دریائے مذکور پر آمد و رفت میں کوئی محصول حاصل کریگی۔ سابقہ معاہدات کی تجدید کے بعد ۱۸۶۲ء میں سررشتہ کروڑگیری قایم کیا گیا اور بجائے سررشتہ کروڑگیری کے محصول خانے اور چوکیاں قایم کی گئیں اور تجارتی محصول زمانہ حال کے

مروجہ اصول پر لیا جانے لگا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت اور سرکاری آمدنی میں اضافہ شروع ہوا۔

ہندوستان کی خارجی تجارت کا ارتقاء ہندوستان کی خارجی تجارت میں ۱۸۶۹ء کے بعد سے سرعت کے ساتھ ترقی ہوئی جبکہ نہر سویز جہاز رانی کے لئے کھول دی گئی۔ ملک میں ریلوں اور سڑکوں کی تعمیر کے باعث خارجی اور داخلی تجارت میں ترقی ہوئی۔ ۶۵-۱۸۶۴ء تا ۶۹-۱۸۶۸ء کے درمیانی پانچ سال کی مدت میں برآمدی کی سالانہ قیمت کا اوسط ۵۵ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے تھا تو ۲۵-۱۹۲۴ء تا ۲۹-۱۹۲۸ء کے پانچ سال کی مدت میں ۳۵۳ کروڑ روپے سالانہ ہوگیا۔ اسی مدت میں درآمد ۳۱ کروڑ ۷ لاکھ روپے سے بڑھکر ۲۵۱ کروڑ روپے کی ہوگئی۔ ملک میں امن و امان کا قیام، ذرائع حمل و نقل میں اصلاح جس میں بمبئی اور سویز کے درمیان آبدوز تار بچھانے سے مزید سہولت حاصل ہوئی۔ جہازوں کی ساخت میں اصلاح اور دوسرے ملکوں میں تجارتی جہاز رانی میں بسرعت ترقی ہونا نیز ہندوستان میں داخلی محاصل اور محاصل راہ داری کی موقوفی اور آزاد تجارت کی پالیسی اس اضافہ کے خاص اسباب تھے۔ ایک عرصہ تک برطانیہ کو ہندوستانی بازار میں غلبہ حاصل رہا۔ انیسویں صدی کے اختتام پر جرمنی، جاپان ممالک متحدہ امریکہ اور دوسرے ممالک برطانیہ کے حریف بن گئے۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں جاپان اور ممالک متحدہ امریکہ ہندوستان کی خارجی تجارت میں بڑا حصہ لینے لگے۔ موجودہ جنگ سے قبل جاپانی اشیاء نہ صرف برطانوی ساخت کی اشیاء کو بلکہ ہندوستانی ساختہ اشیاء کو بھی خود ہمارے ہی بازاروں میں نیچا دکھا رہے تھے۔ گزشتہ جنگ عظیم کی وجہ سے ہندوستان کی خارجی تجارت میں خصوصاً درآمد کو عارضی طور پر نقصان پہنچا۔ لیکن برآمدی تجارت اسی تناسب سے متاثر نہیں ہوئی کیونکہ ہندوستان کی اہم درآمدی اشیاء کی طلب بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ جنگ کے اختتام کے بعد دیگر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی تجارتی گرم بازاری کا دور دورہ رہا جو بالآخر کساد بازاری پر منتج ہوئی۔ ایک عارضی بحالی کے بعد پھر ۱۹۲۹ء سے دنیا ایک طویل سخت اور عدیم النظیر معاشی کساد بازاری سے گذری۔ جس نے ہندوستان کی خارجی تجارت کو بری طرح متاثر کردیا۔ اشیاء برآمدی کی تجارت کے بالمقابل درآمدی اشیاء کی تجارت کو زیادہ نقصان ہوا کیونکہ خام پیداوار اور اشیائے خوراک کی قیمتیں دیگر مصنوعات کے مقابلہ میں نسبتاً بہت گھٹ گئی تھیں

اور ہندوستان کی اہم اشیائے برآمد کی طلب بھی کم ہو چلی تھی۔ ۳۳-۱۹۳۲ء میں خارجی تجارت ۱۳۶ کروڑ روپے کی مالیت تک گھٹ چکی تھی اور ۳۳-۱۹۳۲ء میں اشیائے درآمد کی تجارت ۱۱۷ کروڑ روپے کی جیسی قلیل مقدار تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے بعد سے کسی قدر ترقی ہوئی چنانچہ ۳۸-۱۹۳۷ء میں ۱۸۱ کروڑ روپے کے مال کی برآمد اور ۱۷۳ کروڑ روپے کے مال کی درآمد ہوئی ہندوستان کا توازن تجارت جو پہلے ہندوستان کے موافق رہتا تھا ۳۳-۱۹۳۲ء میں تین کروڑ روپے تک کم ہو گیا۔ جس میں اب جزوی طور پر اصلاح ہو رہی ہے۔ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۲۱۳ کروڑ روپے کی برآمد اور ۱۶۸ کروڑ روپے کی درآمد ہوئی۔

موجودہ زمانہ میں ہندوستان کی درآمد اور برآمد پر بعض پابندیاں عاید کر دی گئی ہیں جن ممالک سے دوستانہ تعلقات قایم نہیں ہیں ان ممالک سے تجارت ممنوع کر دی گئی ہے۔

ہندوستان کی خارجی تجارت کی نمایاں خصوصیات

مندرجۂ ذیل دو جدولیں ۴۰-۱۹۳۹ء اور سالہائے ماقبل کے دوران میں برطانوی ہند کی اشیائے درآمد و برآمد کی تقابلی اہمیت کو واضح کرتی ہیں۔

ہندوستانی تجارت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کی برآمد زیادہ تر اشیائے خوردنی اور خام پیداوار اور درآمد کا بیشتر حصہ مصنوعات پر مشتمل ہے۔ جنگ عظیم کے بعد صنعتی ترقی کی وجہ سے مصنوعات کی برآمد کے فی صدی تناسب میں تدریجی اضافہ ہو رہا ہے جس کا ثبوت اس سے مل سکتا ہے کہ ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۶، ۳۷ فی صدی درآمد جزاً یا کلاً تیار شدہ مصنوعات پر مشتمل تھی اس کے بالمقابل جنگ سے قبل اس کا تناسب ۶، ۶۷ فی صدی تھا اور تقریباً ۳۷ فی صدی برآمد خام پیداوار اور اشیائے خوردنی پر مشتمل تھی اور جنگ سے قبل ۶۱۹، ۷ فی صدی۔

ہندوستانی تجارت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ درآمد میں قسم قسم کی چیزیں شامل ہیں مگر برآمد نسبتاً چند اہم اشیاء مثلاً خام کپاس، جوٹ چائے، روغنی تخم اور غلہ تک محدود ہے۔

تیسری قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان کی خارجی بالخصوص درآمد تجارت میں

انگلستان کا نمایاں حصہ شامل ہے لیکن ہندوستان کی برآمد کا جہاں تک تعلق ہے انگلستان کو اہم ترین واحد خریدار ہے لیکن اس تجارت میں دوسرے ممالک بھی حصہ دار ہیں۔

ہندوستانی تجارت کی آخری اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ برآمد زیادہ اور درآمد کم ہے ہم بہت زیادہ قیمت کا مال بھجواتے ہیں اور نسبتاً کم قیمت کا مال منگواتے ہیں۔

مندرجۂ ذیل جدول کے ذریعہ ان اہم اشیاء کی تقابلی اہمیت واضح کی گئی ہے جو ۱۹۳۲-۳۳ء، ۱۹۳۶-۳۷ء، ۱۹۳۷-۳۸ء اور ۱۹۳۸-۳۹ء ۱۹۳۹-۴۰ء میں برطانوی ہند میں درآمد کی گئیں۔

لاکھوں روپے میں

اشیاء	۱۹۳۲-۳۳	۱۹۳۶-۳۷	۱۹۳۷-۳۸	۱۹۳۸-۳۹	۱۹۳۹-۴۰	۱۹۳۹-۴۰ میں تجارت جملہ درآمد کا فی صدی تناسب
(۱) کپاس اور پارچہ	۳۴۰۸	۲۱۴۵	۲۷۶۸	۲۲۶۶	۲۲۱۰	۱۳٫۴۷
(۲) روغنیات	۸۰۰	۱۶۱۶	۱۸۷۰	۱۵۶۲	۱۸۶۲	۱۱٫۲۷
(۳) مشنری کارخانہ کی مصنوعات	۱۰۵۴	۱۲۷۶	۱۷۱۵	۱۹۰۵	۱۴۶۷	۸٫۸۸
(۴) دھاتیں اور کچ دھاتیں	۹۷۳	۹۱۰	۱۳۳۹	۱۰۸۷	۱۰۸۷	۶٫۵۸
(۵) غلہ دالیں اور آٹا	۷۱	۱۴۱۹	۱۲۱۷	۱۲۷۶	۲۱۸۱	۱۳٫۱۹
(۶) سواریاں	۳۸۲	۶۲۲	۸۹۲	۶۶۸	۶۸۷	۴٫۱۶
(۷) آلات و اوزار	۳۰۵	۴۹۷	۶۱۳	۵۰۵	۵۵۸	۳٫۳۷
(۸) مصنوعی سلک	۴۱۶	۳۷۰	۴۸۷	۲۲۴	۴۵۹	۲٫۷۸
(۹) اون (خام اور تیار شدہ)	۲۹۶	۲۶۶	۴۱۵	۲۰۲	۲۱۶	۱٫۳۱
(۱۰) کاغذ اور مقوے	۲۰۶	۲۶۰	۴۱۵	۳۲۳	۳۳۶	۲٫۰۹
(۱۱) رنگ اور اشیائے دباغت	۲۵۰	۳۰۷	۳۹۴	۳۱۱	۳۴۱	۲٫۱۸

(۱۲) کیمیائی اشیاء	۲۶۱	۲۵۳	۳۳۳	۳۰۵	۲۵۲	۲،۱۷۳
(۱۳) آہنی سامان	۲۹۹	۲۶۴	۳۳۱	۲۵۷	۲۲۷	۱،۳۷
(۱۴) لکڑی اور چوبینہ	۵۱	۲۴۹	۲۹۸	۲۸۷	۲۷۰	۱،۰۶۳
(۱۵) سلک خام اور تیار شدہ	۴۳۳	۲۳۸	۲۸۶	۱۹۴	۱۸۲	۱،۱۰
(۱۶) اشیائے خوردنی اور کھانے	۲۹۳	۲۲۷	۲۶۰	۲۴۸	۲۶۳	۱،۵۹
(۱۷) ادویات	۱۸۶	۱۹۸	۲۳۶	۲۲۱	۲۶۱	۱،۵۸
(۱۸) دیسی شراب	۲۲۶	۲۱۵	۲۳۰	۲۱۱	۲۱۹	۱،۲۲
(۱۹) ربر کی مصنوعات	۱۹۸	۱۹۶	۱۸۹	۱۴۱	۱۴۸	۶۹۰
(۲۰) مسالے	۱۷۳	۱۹۰	۱۸۳	۲۶۳	۲۵۵	۱،۵۴
(۲۱) کھاد	۰	۰	۸۰	۱۰۵	۱۲۵	،۷۶
(۲۲) میوے اور ترکاریاں	۱۱۷	۱۵۴	۱۵۸	۱۳۴	۱۲۱	،۷۴
(۲۳) شیشہ اور کانچ کا سامان	۱۴۲	۱۲۰	۱۵۲	۱۲۵	۱۰۲	،۶۲
(۲۴) ہتیار گولی بارود وغیرہ	۴۴	۶۰	۱۲۸	۵۰	۴۹	،۳۰
(۲۵) قیمتی پتھر موتی اور نگینے	۸۴	۸۹	۱۲۴	۱۱۵	۸۸	،۵۳
(۲۶) سامان مصوری	۹۲	۹۲	۱۰۲	۸۹	۱۰۳	،۶۲
(۲۷) تمباکو	۹۷	۸۳	۸۵	۱۰۵	۱۱۷	،۷۱
(۲۸) نمک	-	-	۵۶	۲۸	۶۲	،۳۸
(۲۹) صابن کا سامان	۷۲	۶۹	۸۱	۶۷	۶۵	،۳۹
(۳۰) چائے کے چوبی صندوق	۰	۰	۷۲	۹۰	۸۳	،۵۰
(۳۱) سامان سنگھار	۰	۰	۶۸	۶۶	۶۵	،۳۹
(۳۲) [illegible]	۰	۰	۷۰	۶۲	۵۷	،۲۴

(۳۳) کتب وغیرہ	۰	۰	۶۲	۵۹	۵۴	ر۳۲
(۳۴) دھاتی پتر	۰	۰	۶۰	۴۹	۵۳	ر۳۲
(۳۵) سینے کی مشین	۰	۰	۶۴	۴۷	۴۳	ر۲۶
(۳۶) سامان کارچوب	۰	۰	۶۸	۴۸	۳۸	ر۲۳
(۳۷) چرخیاں	۰	۰	۴۳	۳۸	۳۸	ر۲۳
(۳۸) گھڑیاں اور ان کے کل پرزے	۰	۰	۵۲	۴۳	۳۶	ر۲۲
(۳۹) چینی کے برتن	۰	۰	۴۸	۳۹	۳۶	ر۲۲
(۴۰) کھلونے اور سامان گیمس	۰	۰	۴۴	۳۷	۳۳	ر۲۰
(۴۱) دوسری متفرق اشیاء	۰	۰	۱۳	۱۰۶۵	۱۱۱۶	۹ر۷۶
درآمد کی کل قیمت			۱۷۴۷۹	۱۵۲۳۳	۱۹۵۲۷	۱۰۰

از ریویو آف دی ٹریڈ آف انڈیا بابتہ ۳۳-۱۹۳۲، ۳۷-۱۹۳۶، ۴۰-۱۹۳۹ء

جدول نمبر (۲) برآمد

مندرجہ ذیل جدول کے ذریعہ ان اہم اشیاء کی اہمیت واضح کی گئی ہے جو ۳۳-۱۹۳۲ء ۳۷-۱۹۳۶ء ۳۸-۱۹۳۷ء، ۳۹-۱۹۳۸ء اور ۴۰-۱۹۳۹ء میں برطانوی ہند سے برآمد کی گئیں

اشیاء	۳۳-۱۹۳۲ء	۳۷-۱۹۳۶ء	۳۸-۱۹۳۷ء	۳۹-۱۹۳۸ء	۴۰-۱۹۳۹ء	۴۰-۱۹۳۹ء میں تجارت کی جملہ برآمد کا فیصدی تناسب
(۱) خام جوٹ	۹۷۳	۱۴۷۷	۱۴۷۲	۱۳۴۰	۱۹۷۳	۹ر۷
(۲) جوٹ کی مصنوعات	۲۱۷۱	۲۹۱۰	۲۹۰۸	۲۶۲۶	۴۸۶۹	۲۳ر۹۳
(۳) خام کپاس	۲۰۷۰	۴۳۹۴	۲۹۷۷	۲۴۶۷	۳۱۰۴	۱۵ر۲۶
(۴) کپاس کی مصنوعات	۳۲۹	۷۰۲	۹۲۹	۷۱۲	۸۵۸	۴ر۲۲
(۵) چائے	۱۶۱۵	۲۰۲۱	۲۴۳۹	۲۳۲۹	۲۶۰۸	۱۱ر۸۲

(۶) تخم	۱۱۳۱	۱۸۶۰	۱۴۱۹	۱۵۰۹	۱۱۹۰	۵،۸۵
(۷) غلہ دالیں اور آٹا	۱۶۰۸	۹۵۷	۹۴۹	۷۷۴	۵۰۷	۲،۴۹
(۸) چمڑا	۴۷۶	۷۴۳	۷۲۵	۵۲۸	۷۶۹	۳،۷۸
(۹) دھاتیں اور کچ دھاتیں	۴۴۸	۳۶۸	۶۱۳	۴۹۱	۶۴۵	۳،۱۷
(۱۰) خام چمڑے اور کھالیں	۲۷۷	۴۲۸	۵۰۴	۳۸۵	۴۰۹	۲،۰۱
(۱۱) خام اور تیار شدہ اون	۱۷۸	۳۷۶	۲۷۲	۳۸۵	۴۰۴	۱،۹۹
(۱۲) کھلی	۱۹۷	۱۷۶	۲۴۳	۳۰۱	۲۰۳	۱،۰۰
(۱۳) میوے اور ترکاریاں	۷۰	۱۹۷	۲۰۸	۲۲۷	۲۳۷	۱،۱۶
(۱۴) تمباکو	۷۷	۱۷۷	۲۰۰	۲۷۶	۲۵۳	۱،۲۴
(۱۵) لاکھ	۱۲۳	۲۳۴	۱۶۲	۱۲۷	۱۸۹	،۹۳
(۱۶) ابرک	۳۲	۹۴	۱۳۸	۱۱۴	۱۷۳	،۸۵
(۱۷) ناریل کا ریشہ (ناریل)	۶۰	۷۸	۱۰۴	۹۶	۱۲۵	،۶۳
(۱۸) روغنیات	۵۴	۱۰۴	۱۰۱	۱۰۳	۱۳۷	،۶۸
(۱۹) کوئلہ اور کوک	۴۴	۶۳	۹۹	۱۳۶	۱۹۳	،۹۵
(۲۰) مسالے	۷۲	۷۸	۹۳	۷۹	۱۰۸	،۵۳
(۲۱) خام ربر	۹	۵۲	۸۴	۷۲	۹۴	،۴۶
(۲۲) سن	۳۲	۶۹	۷۵	۷۲	۸۶	،۴۲
(۲۳) مچھلی	۴۶	۶۹	۶۹	۶۹	۷۰	،۲۴
(۲۴) کھاد	۲۰	۵۰	۶۹	۳۷	۴۸	،۲۴
(۲۵) رنگسازی اور دباغت کا سامان	۷۵	۶۰	۶۷	۵۹	۷۱	،۳۵
(۲۶) اشیاء خوردنی	۳۳	۶۰	۶۳	۵۹	۷۱	،۳۵

(۲۷) کافی	۱۱۰	۸۶	۵۵	۷۵	۴۳	۱٫۳۶
(۲۸) پیرافینی موم	۲۰۲	۱۳	۵۱	۳۶	۳۳	۱٫۱۶
(۲۹) ہڈیاں صنعتی اغراض کیلئے	۳۵	۴۶	۳۴	۲۴	۲۳	٫۱۱
(۳۰) لکڑی اور چوبینہ	.	.	۳۰	۲۷	۲۱	٫۱۰
(۳۱) شورا	.	.	۱۱	۱۱	۱۷	٫۰۸
(۳۲) زردوزی کارچوبی سامان	.	.	۱۲	۱۳	۱۵	٫۰۷
(۳۳) ریشے برائے برش	.	.	۲۰	۱۲	۱۳	٫۰۷
(۳۴) رسی	.	.	۹	۸	۱۱	٫۰۵
(۳۵) شکر	.	.	۴۰	۲۴	۸	٫۰۴
(۳۶) پالتو جانور	.	.	۹	۸	۸	٫۰۴
(۳۷) سلک خام وتیار شدہ	.	.	۷	۴	۸	٫۰۴
(۳۸) چارہ بھوسہ	.	.	۹	۹	۵	٫۰۲
(۳۹) چربی اور موم	.	.	۴	۳	۳	٫۰۲
(۴۰) سینگ وغیرہ	.	.	۴	۲	۱	٫۰۱
(۴۱) دوسری متفرق اشیاء	.	.	۶۱۵	۵۷۸	۶۰۷	۲٫۹۸
کل قیمت			۱۸۰۹۲	۱۹۲۷۹	۲۰۳۴۴	۱۰۰

از ریویو آف دی ٹریڈ آف انڈیا بابتہ ۳۳-۱۹۳۲ء، ۳۷-۱۹۳۶ء اور ۴۰-۱۹۳۹ء

اہم اشیاء درآمد و برآمد اگرچہ کہ ہندوستان میں صنعت پارچہ بافی کی ترقی اور حالیہ سیاسی ہیجان کی وجہ سے سوتی مصنوعات کی کل درآمد کا فی صدی تناسب کچھ گھٹ گیا ہے لیکن درآمدی اشیاء میں سوتی مصنوعات کی اب بھی قدر باقی ہے سیارچہ کی درآمد زیادہ تر لنکا شائر سے ہوتی ہے۔ موجودہ جنگ سے قبل جاپان ہندوستانی بازار پر چھا گیا تھا اور لنکا شائر اور ہندوستانی کارخانوں کا گویا حریف بھی بن گیا تھا۔

خام کپاس کی درآمد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے کیونکہ ہمارے کارخانوں میں عمدہ لمبے ریشے والی کپاس کا استعمال بڑھ رہا ہے پارچہ جات کے بعد درآمدی اشیاء میں معدنی تیل، مشنری، کارخانوں کی مصنوعات دھاتیں اور کچ دھاتیں اس میں لوہے اور فولاد کی اشیاء، ریلوے دخانی انجن، الومنیم پتیل، تانبا، جرمن سلور وغیرہ کو اہمیت حاصل ہے۔

جاوا سے آنے والی شکر جس کا شمار کچھ عرصہ قبل دوسرے درجہ پر تھا موجودہ زمانہ میں بہت کچھ گھٹ گیا ہے کیونکہ ۳۲-۱۹۳۱ء کی تامین کے بعد سے شکر کی ملکی پیداوار میں اضافہ ہوگیا۔

درآمد کی دوسری قابل ذکر اشیا حسب ذیل ہیں۔

غلہ، آٹا، سواریاں (خصوصاً موٹریں) آلات و اوزار، اونی و ریشمی مصنوعات، رنگ، آہنی اشیاء، اشیائے کیمیائی، کاغذ، شیشہ ادویات، او مصنوعات ربر وغیرہ۔

برآمدی اشیاء میں کپاس اور جوٹ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ موجودہ جنگ سے قبل جاپان خام کپاس کا سب سے بڑا خریدار تھا۔ برطانیہ ممالک متحدہ امریکہ اور چین چھوٹے خریدار ہیں۔ ہندوستان سے جاپان کو خام کپاس کی برآمد، ۱۹۳۷ء کے تجارتی معاہدے کے ذریعہ ہوتی تھی۔ ہندوستانی سوتی مصنوعات کی برآمد ایران، عرب، عراق، لنکا وغیرہ کو ہوتی ہے۔

کپاس اور جوٹ کے بعد چائے کا درجہ ہے۔ ہندوستان کی کل پیداوار کا ۹۷ فی صدی حصہ برآمد کردیا جاتا ہے۔ چائے زیادہ تر برطانیہ کو جاتی ہے۔ ۴۰-۱۹۳۹ء میں کل برآمد کا ۸۰ فی صدی سے زیادہ حصہ برطانیہ نے خریدا تھا۔

روغنی تخم کو ۴۰-۱۹۳۹ء میں ہندوستان کی برآمد میں جو تھا درجہ حاصل تھا۔ السی مونگ پھلی، کھوپرا زیادہ تر براعظم یورپ کو روانہ کیا جاتا تھا۔ اوٹاوا کے معاہدہ کی بناء پر برطانیہ کو السی کی برآمد میں دس فی صدی کا اضافہ عمل میں آیا ہے۔

اس کے بعد اشیائے غلہ کا درجہ ہے اس میں گیہوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بعد چاول، دال پھر چرم بعد ازاں دھاتوں اور کچ دھاتوں کی برآمد کو اہمیت حاصل ہے۔

کل کچ دھاتوں کی ۲۶ فی صدی قیمت کا میگنیز ہندوستان سے برآمد کیا جاتا ہے۔

برطانیہ اور ممالک متحدہ امریکہ کو چمڑے اور کھالیں روانہ کی جاتی ہیں۔ ہندوستانی چمڑے، اور کھالوں کی یورپین بازاروں میں اتنی طلب باقی نہیں رہی جیسے کہ پچھلے سالوں میں تھی۔ خام اون، لاکھ کھلی، تمباکو، مسالے، میوے، کافی اور ابرک کو بھی برآمدی اشیاء میں کچھ اہمیت حاصل ہے۔

<u>ہندوستانی تجارت کا رُخ</u> اب ہم ہندوستان کی کل درآمدی تجارت میں بیرونی ملکوں کے فی صد تناسب پر غور کرینگے۔

برطانیہ کا حصہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں ۶۴ فی صدی تھا تو ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۲۵،۲ فی صدی ہوگیا اٹاوے کے معاہدہ ترجیح کا مقصد برطانیہ کے حصہ میں اضافہ کرنا تھا۔ ۱۴-۱۹۱۳ء میں جاپان کا حصہ ۲،۶ فی صدی تھا تو موجودہ جنگ سے قبل ۱۰ فی صدی ہوگیا تھا۔ ۳۷-۱۹۳۶ء میں جرمنی کا حصہ ۹،۷ فی صدی تھا۔ ۱۴-۱۹۱۳ء میں ممالک متحدہ امریکہ سے ۲،۶ فی صدی کی برآمد ہوئی تھی تو ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۶،۵ فی صدی ہوگئی۔ ۳۰-۱۹۳۶ء میں بلجیم کا حصہ ۲،۶، جاوے کا ۲،۱ فرانس کا ۰،۹ اور لنکا کا ۴،۰ فی صد تھا۔

اشیائے برآمد کی تجارت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ برطانیہ ہمارے مال کا سب سے بڑا خریدار ہے جنگ عظیم سے قبل ہماری کل تجارت میں برطانیہ کا حصہ ۲۳،۴ فی صدی تھا۔ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۳۵،۱ فی صدی ہوگیا۔ جاپان نے کل برآمد کا ۱۵ فی صدی خریدا تھا۔ ممالک متحدہ امریکہ نے ۱۲ فیصدی کی خریداری کی جنگ عظیم سے قبل جاپان ۹،۱ فی صدی اور ممالک متحدہ امریکہ ۷،۰ فی صدی خریدا کرتے تھے۔ جرمنی ۱۴-۱۹۱۳ء میں ۱۰،۶ فی صدی خریدا کرتا تھا۔ ۳۷-۱۹۳۶ء میں صرف ۷،۴ فی صدی خریدا۔ [illegible] میں لنکا نے ۲،۰ اٹلی نے ۲،۴ فرانس نے ۲،۹ بلجیم نے ۳،۶ اور آسٹریلیا نے ۱،۶ فی صدی خریدا تھا۔

<u>باز برآمدی</u> چونکہ ہندوستان مشرقی نصف کرہ کے وسط میں واقع ہے اس لئے وہ سامان تجارت کے لئے تقسیمی مرکز کا کام بھی انجام دیتا ہے۔ ایسے ایشیائی ممالک جہاں بندرگاہیں نہیں ہیں ان کا مال پہلے ہندوستان آتا اور پھر یہاں سے ممالک غیر کو بھیجا جاتا ہے۔ یہ باز برآمدی تجارت تیار شدہ مصنوعات

خاص کر پارچوں وغیرہ کی ہوتی ہے جو مغربی ممالک سے درآمد کیے جاتے ہیں۔ اس مال کے خریدار ایران، مسقط اور مشرقی آفریقہ ہیں۔ مغربی ممالک کو جو سامان باز برآمد کیا جاتا ہے اس میں خام اون اور چمڑے کو اہمیت حاصل ہے۔ یہ مال ہندوستان میں خشکی کے سرحدی راستے سے درآمد ہوتا ہے اور زیادہ تر برطانیہ عظمیٰ کو روانہ کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی تجارت ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۹ کروڑ ۶۴ لاکھ روپے اور اس کے بالمقابل ۱۴-۱۹۱۳ء میں ۴ کروڑ ۶۲ لاکھ روپے کی ہوئی تھی۔

ہندوستان کا توازن تجارت جیسا کہ اس سے قبل وضاحت کردی گئی ہے کہ ہندوستان کی خارجی تجارت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ برآمد زیادہ اور درآمد کم ہے یعنی ہم بہت زیادہ قیمت کا مال باہر بھجواتے ہیں اور نسبتاً کم قیمت کا مال منگواتے ہیں۔ ہندوستان کا موافق توازن تجارت جنگ عظیم کے قبل کے پانچ سالوں میں ۷۰ کروڑ جنگ کے پانچ سالوں میں ۷۶ کروڑ اور مابعد جنگ کے پانچ سالوں میں ۵۳ کروڑ روپے تھا۔ اس کے بعد کی پانچ سالہ مدت میں یہ توازن ۱۱۳ کروڑ روپے تک بڑھ گیا اور اس کے بعد کے پانچ سالوں ۳۳-۱۹۳۲ء کے اختتام پر ۴۳ کروڑ روپے تک گھٹ گیا۔ ۳۳-۱۹۳۲ء میں توازن تجارت کا تناسب صرف تین کروڑ روپیہ تھا۔ اس کے بعد سے اس تناسب میں اضافہ ہورہا ہے۔ چنانچہ ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۷۰ کروڑ روپے تک یہ توازن پہنچ گیا۔ اشیاء درآمد کی تجارت میں اضافہ اور برآمدی تجارت میں کمی اور ہندوستان سے برما کی علیحدگی کے باعث توازن تجارت ۳۸-۱۹۳۷ء میں ۱۵ کروڑ روپے تک گھٹ گیا۔ ۴۰-۱۹۳۹ء میں توازن تجارت ۳۰ کروڑ روپے تھا۔ ستمبر ۱۹۳۱ء سے ڈسمبر ۱۹۳۹ء کے درمیانی آٹھ سالوں میں سونے کی کثیر مقدار یعنی ۳۵۱ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے کی برآمد کے ذریعہ توازن تجارت کو برقرار رکھا گیا۔ اور اس طرح ہندوستان مادراء بحر کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوسکا۔ برآمدی تجارت کی تجدید موجودہ زمانہ کا ایک اہم ترین معاشی مسئلہ ہے تاکہ توازن تجارت برقرار رہ سکے اور ان تجارتی ذمہ داریوں کی تکمیل ہوسکے جو ممالک غیر کی طرف سے ہندوستان پر عاید ہوتی ہیں۔

نظریہ مطالبات درآمد کے مقابلہ میں ہندوستان کی کثیر برآمد نظریہ مطالبات کا موجب ثابت ہوئی۔ اس کو کسی وقت ملک کے معاشی مباحث میں بڑی اہمیت حاصل تھی بعض لوگوں کی نظر میں یہ برآمد ...

کثرت ایک قسم کا خراج تھا جو اپنے سیاسی تعلقات کی بنا پر ہندوستان انگلستان کو ادا کیا کرتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان اپنے مختلف مصارف کے مقابلہ میں غیر مرئی تجارت مثل غیر ممالک سے حاصل کردہ قرض کے سود، غیر ملکی عہدہ داروں کی تنخواہوں اور وظائف بنک کاروں اور بیمہ کمپنیوں کے منافعے سے تھوڑا بہت معاوضہ حاصل کرلیتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا یہ معاوضہ کسی صورت میں بھی کافی تصور کیا جاسکتا ہے؟ معاشیات کی اس ابتدائی کتاب میں اس موضوع کے مالہ وما علیہ پر بحث کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ مطالبات وطن میں تخفیف کی جائے اور اس کا انتظام یوں کیا جائے کہ ممالک غیر میں قرضے کم حاصل کئے جائیں اور دیوانی و فوجی خدمات پر ہندوستانیوں کا زیادہ سے زیادہ تقرر عمل میں لایا جائے اور ملک ہی میں اس کی اپنی بنک کاری، جہاز رانی اور بیمہ کی تنظیم کا بندوبست کیا جائے۔

سرحدی تجارت | ہندوستان کی وسیع الاضی سرحد تقریباً چھ ہزار میل تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود اس کی سرحدی تجارت بہت محدود ہے۔ کیونکہ صرف چند درّے اور گذرگاہیں ہیں جن سے ہوکر دوسرے ہمسایہ ممالک کو جاسکتے ہیں مثلاً شمال مغربی سرحد میں درّہ بولان۔ قدیم زمانہ سے سرحد پار تجارت بعض ملکوں سے چلی آتی ہے مثلاً افغانستان، وسطی ایشیا، ایران، نیپال اور تبت ان ممالک سے غلہ، میوے، ترکاریاں، مغزیات، خام اون، خام ریشم اور پالتو جانوروں کی درآمد ہوتی ہے۔ خاص برآمدی اشیاء میں پارچہ جات، شکر، خام کپاس، چائے اور چمڑے کی مصنوعات شامل ہیں۔

ملکت آصفیہ کے اہم اشیائے درآمد و برآمد | ملکت آصفیہ کے درآمدی اشیاء میں حسب ذیل کو اہمیت حاصل ہے۔

(۱) پارچہ جات (۲) غلہ اور دالیں (۳) روغنیات (۴) نمک (۵) میوہ جات و سبزی (۶) سینما فلم (۷) چائے (۸) بوٹ و شوز (۹) شراب (۱۰) صابن (۱۱) دیاسلائی (۱۲) عطریات (۱۳) شکر (۱۴) موٹر کار (۱۵) ادویات (۱۶) مشنری

(باقی)

تجارتی چکر

تمہید معاشی تحقیق میں "تجارتی چکر" کی اصطلاح حال حال میں مروج ہوئی ہے۔ پچھلے معاشیین اور کاروباری لوگوں کی توجہ زیادہ تر بحرانوں، کاروباری دہشت، سراسیمگی اور کساد بازاریوں پر مبذول رہتی تھی۔ انہیں یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ یہ دور کسی خاص نظام کے تابع ہیں جب سے معاشیات میں اعداد و شمار کا کثرت سے استعمال ہونے لگا ہے تو معاشی تحقیق کو تقویت پہنچی ہے۔ اس وقت سے ہمیں پتہ چلنے لگا ہے کہ کاروبار فوری خوشحالی یا کسی جھٹکے یا دھماکے سے بدحالی کے گڑھے میں نہیں گرتا بلکہ کاروبار اور صنعتیں مسلسل مخصوص لہروں اور چکروں کی طرح بڑھتی گھٹتی رہتی ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پیدائش، فروخت اور قیمتوں کے میدان میں یہ لہری اتار چڑھاؤ ہر رنگ میں پایا جاتا ہے، اور یہ چکر کاروبار میں صنعت اور مالیات میں پائے جاتے ہیں۔ ان کا رجحان لوہے اور کوئلے جیسی بنیادی صنعتوں میں بھی ملتا ہے۔ عمارتوں کے بننے میں بھی، تجارت درآمد و برآمد میں بھی اور مزدوروں کی تعداد میں بھی جو برسر کار رہتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان اشیاء کی مقدار میں جو ریلوں کے ذریعہ سے لائی جاتی ہیں۔ اشیاء کی چلر اور تھوک قیمتوں میں، مزدوریوں میں، صرافوں میں تمسکات اور خرید و فروخت میں بھی یہ رجحان ہم کو ملتا ہے۔ مالیات کے شعبہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ قرضوں، امانتوں، ذخیروں اور سود کی شرحوں میں، عندالطلب قرضوں، بنکوں کے چکوں کے تصفیوں میں بھی یہ رجحان پایا جاتا ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ کاروبار کے ان جملہ شعبوں میں لہروں کی طرح اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔

کاروبار میں اسی طرح لہری اتار چڑھاؤ سے ہی ہم یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے کہ یہ اتار چڑھاؤ ایک چکر کی صورت میں ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ اتار چڑھاؤ گاہے ماہے بغیر کسی خاص تعین کے ہو تو اسے ہم تجارتی چکر نہیں کہہ سکتے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان مختلف لہروں کی لمبائی کم و بیش [illegible]

اور اس اُتار چڑھاؤ میں ایک خاص تعین پایا جاتا ہے ۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ لہریں خاص اور مخصوص اسباب کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں جن سے تجارتی چکر رونما ہوتے ہیں۔

<u>تجارتی چکر کے مختلف منازل</u> تجارتی چکر کے مختلف منازل ہیں۔ جن کو حسب ذیل طریقے سے تقسیم کیا جاتا ہے ۔ (۱) خوشحالی کی منزل (۲) بحران کی منزل (۳) بدحالی کی منزل (۴) بحالی کی منزل۔ پہلی اور تیسری منزل کو گرم بازاری اور سرد بازاری کی منزل بھی کہا جاتا ہے ۔ اب ہم ان منازل کی وضاحت کرینگے۔

(۱) گرم بازاری کی منزل : — گرم بازاری کی منزل میں ہم دیکھتے ہیں کہ قیمتیں چڑھاؤ پر ہوتی ہیں۔ کارخانے داروں کی ساختہ اشیاء اور تاجروں کے مال کی قیمتیں مصارف پیدائش سے زیادہ سرعت کے ساتھ بڑھنے لگتی ہیں۔ مزدوریاں، ٹھوک قیمتوں میں اضافہ کے کہیں بعد (تقریباً ۶ تا ۹ ماہ کے بعد) بڑھنی شروع ہوتی ہیں۔ کاروبار کے جملہ نافعل اخراجات تقریباً معین رہتے ہیں۔ کرایہ بھی طویل المدت معاہدوں کی وجہ سے معین رہتے ہیں۔ قرضے کے تمسکات جو عموماً دس ۔ بیس اور تیس برس تک کے لئے ہوتے ہیں ان کی شرح بھی معین رہتی ہے ۔ تنخواہوں میں بھی اضافہ کچھ دیر کے بعد کیا جاتا ہے ۔ ریل کے کرائے، برقی قوت اور روشنی کے اخراجات جن کی شرحیں نیم سرکاری ادارے مقرر کرتے ہیں۔ ان میں اضافہ بھی قیمتوں کے چڑھاؤ کے زمانہ میں کافی دیر کے بعد ہوتا ہے اور وہ بھی حالات و واقعات کے تناسب سے نہیں ہوتا۔ اس عرصہ میں اگرچہ خام مال کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی آجروں کو کافی منافع وصول ہوتا رہتا ہے۔ اس دوران میں کارخانہ داروں، ٹھوک اور چلر تاجروں کے مال کی مالیت دن بدن بڑھتی رہتی ہے ۔ جس کی وجہ سے مصارف پیدائش اور مصارف فروخت میں خلیج بڑھتی جاتی ہے، منافع نہ صرف دونوں اخراجات میں فرق کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے بلکہ زیادہ پیدائش اور زیادہ فروخت کی وجہ سے بھی منافع بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے ۔ بڑھتے ہوئے منافعوں کی شرح مزید ترغیب عمل دیتی ہے ۔ نئے نئے کارخانے کھلنے لگتے ہیں۔ چلر فروشوں، تاجروں اور کارخانہ داروں کے حوصلے بڑھتی ہوئی قیمتوں اور بڑھتی ہوئی مانگ کی وجہ سے بڑھ جاتے ہیں۔ اور وہ اپنے مال کے ذخیرے بڑھانے لگتے ہیں۔ بڑھاؤ پھیلاؤ کی ایک عالم لہر دوڑ جاتی ہے ۔ بڑھتی ہوئی قیمتیں

مقابلتاً گھٹے ہوئے مصارف پیدائش، بڑھتا ہوا منافع اور مال کا بڑھتا ہوا ذخیرہ خوشحالی کے چکر کی نمایاں نشانیاں ہیں۔

لیکن وہ وقت بھی جلد آن پہنچتا ہے کہ کارخانے اپنی انتہائی قوت پیدائش پر پہنچ جاتے ہیں اور پیدائش کی مزید مقدار غیر ممکن ہو جاتی ہے۔ لیکن اشیاء کی خریدی اور اس کے ساتھ محنت کی طلب جاری رہتی ہے کیونکہ اس زمانہ میں بنک بھی اپنے ہاتھ کھلے چھوڑ دیتے ہیں۔ اور زر کی جملہ مقداروں میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال کو دوسرے لفظوں میں ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ باوجود طلب کے اشیاء کی مزید پیدائش نہیں ہوتی لیکن زر وافر تعداد میں موجود رہتا ہے۔ اس سے دو نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ قیمتیں اور بڑھنے لگتی ہیں۔ اور اشیاء کے لئے جو فرمائشیں چلر اور تھوک فروشوں کی طرف سے ہوتی ہیں۔ وہ بڑی حد تک شرمندہ تکمیل نہیں ہوتیں۔ چکر کے اس دور میں ہر قسم کی طلب کے جدول میں اضافہ ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ طلب بالخصوص تاجروں کی طرف سے بڑھتی رہتی ہے اور وہ اس قدر اشیاء کے لئے پہلے سے اور زیادہ قیمتیں دینے کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔ اس میں بنک ان کی مدد کرتے ہیں اور قرض خواہوں کی جرأتیں فراخ دلی سے بڑھاتے ہیں۔ بنکوں کے کاروبار کی حالت اس لئے بہتر ہوتی ہے کہ ان کی امانتوں کی تعداد اس زمانہ میں روبہ اضافہ رہتی ہے۔ معاشرہ کی جملہ قوت خرید زر کی شکل میں اس دور میں زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن اس اضافہ کی بھی حد ہوتی ہے۔ بنکوں کے ذخیرے کم ہونے شروع ہوتے ہیں اور آخرکار اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں جو کم سے کم مقدار قانون نے مقرر کر رکھی ہے۔ ان حالات میں بنکوں کے لئے مزید قرض دینا مشکل ہو جاتا ہے اور قرضوں کا یہ پھیلاؤ آخر ختم ہونے لگتا ہے۔ بنکوں کے ہاتھ رکتے ہی بڑھتی ہوئی قیمتیں دینے کے لئے تاجروں کے ہاتھ رکنے لگتے ہیں۔ کیونکہ ان کی قوت خرید جو زیادہ تر بنکوں کی مرہون منت تھی اب روبہ انحطاط ہونے لگتی ہے۔ قیمتوں کے بڑھنے کے راستے میں اب رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ تاجر جن کے پاس اشیاء کے ذخائر موجود رہتے ہیں گھبرانے لگتے ہیں اور اس ڈر سے کہ اب قیمتیں گھٹنے نہ لگیں، مال فروخت کرنے لگتے ہیں

ایک تاجر کو دیکھ کر دوسرا اور دوسرے کو دیکھ کر تیسرا یہی عمل شروع کرتا ہے۔

سراسیمگی اور بحران:- جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک وقت میں اچھا خاصہ ذخیرہ فروخت کے لئے بازاروں میں آجاتا ہے اور بڑھتی ہوئی رسد کی وجہ سے قیمتیں گرنے لگتی ہیں۔ اب رجائیت کے جذبات کم ہونے لگتے ہیں۔ اور قنوطیت کی بھیانک شکلیں اپنے سائے ڈالنے لگتی ہیں، اور آہستہ آہستہ بحران کی صورت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اشیاء کی طلب میں اضافہ کی بجائے کمی ہونے لگتی ہے پہلے تو قیمتیں اس دور میں اس طرح نہیں بڑھتیں جس طرح کہ پہلے بڑھ رہی تھیں۔ اور اس کے بعد گرنی شروع ہوتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ باقی اخراجات جو اس بڑھاؤ کی رفتار میں پیچھے رہ گئے تھے۔ اس منزل کے قریب تر پہنچتے جاتے ہیں۔ اگرچہ قیمتوں میں پہلا سا اضافہ موقوف ہو جاتا ہے، لیکن اجرتیں بڑھنے کی طرف مائل رہتی ہیں۔ اور بڑھتی رہتی ہیں۔ شرح سود بھی بڑھنے لگتی ہے۔ مشینیں اور کارخانوں کا دوسرا سامان جو اس بڑھاؤ کے دور میں بڑھی چڑھی قیمتوں پر خریدا گیا تھا اب قیمتوں کے گرنے کی وجہ سے ان کی قدر کم ہونے لگتی ہے۔ اور ان کے اخراجات کا بوجھ زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ تنخواہیں، کرائے اور دیگر ایسے اخراجات جو پھیلاؤ کے ابتدائی دور میں نہیں بڑھے تھے۔ لیکن بعد میں ان میں اضافہ ہوا تھا اب قیمتوں کے کم ہونے کے باوجود اسی طرح اعلیٰ شرحوں پر قائم رہتے ہیں۔ جب بازار تنگ ہونے لگتے ہیں اور قیمتیں گرنے لگتی ہیں تو یہ مصارف تاجروں کی راہ میں سنگ گراں کی طرح حائل معلوم ہوتے ہیں۔ بڑھتے ہوئے مصارف پیدائش اور گرتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے نہ صرف منافع بالآخر غائب ہو جاتا ہے بلکہ گھاٹے کی صورت رونما ہوتی ہے اور آجروں اور تاجروں کے سامنے اس وقت نفع کمانے کا نہیں بلکہ نقصان سے بچنے کا سوال پیش رہتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کو تو اپنی ساکھ بچانے کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ چونکہ بحران کا انھوں نے خیال نہیں کیا تھا۔ اس لئے بڑھتی ہوئی قیمتوں کے زمانہ میں وہ مختلف اشیاء کی خریدی کے ایسے معاہدے کر چکے تھے جن کو اب پورا کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ ان کو اپنے قرضے ادا کرنے ہوتے ہیں۔ ورنہ دیوالے کا خوف رہتا ہے۔ قرضوں کی ادائیگی کے لئے ان کو مجبوراً مال فروخت

کرنا پڑتا ہے۔ اور اس بھاگڑ کی فروخت سے قیمتیں اور زیادہ گر جاتی ہیں۔ اور ان سے اکثر اتنی رقم بھی وصول نہیں ہوتی کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر سکیں۔ اس دوران میں بنکوں سے مزید قرضوں کا مطالبہ اور گذشتہ ادائیگیوں کے لئے مہلت کی درخواست کی جاتی ہے۔ تاجر دوہری مصیبت میں پھنس جاتے ہیں۔ کیونکہ بنک ایسی درخواستیں ایسے وقت میں منظور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اور جہاں سے ان کو وصولی کرنی تھی۔ وہاں سے وصولی نہیں ہوتی۔ اسی طرح قرضے منجمد ہو جاتے ہیں۔ اور ادائیاں نہیں ہوتیں۔ آہستہ آہستہ شدید کفایتوں اور بچتوں سے صورت بہتر ہونے لگتی ہے۔ قرضخواہ، قانون کی دھمکی دے کر مقروضین کو ادائیگی کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ جس سے ادائیگیاں ہونے لگتی ہیں یا دوسرے لفظوں میں منجمد قرضے پگھلنے لگتے ہیں۔ یہ بے باقی کی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ کاروبار کی صورت بحران سے گذر کر کساد بازاری تک پہنچ جاتی ہے۔

جب کاروباری لوگ ان نئے حالات سے پوری طرح آگاہ ہو جاتے ہیں اور جب ان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بازاروں کی تحدید اور قیمتوں کی کمی کی وجہ سے ان کی توقعات پوری نہیں ہو سکتیں تو ان کے سامنے پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی حالت کو سنبھالیں اور اپنی ساکھ کو برقرار رکھیں۔ یہ بحران کے زمانہ کی نمایاں خصوصیت ہے اور یہ زیادہ تر ایک مالی مسئلہ ہے۔

کساد بازاری کی منزل:۔ جب بتدریج کاروبار بحران سے گذر کر کساد بازاری کے دور میں داخل ہوتا ہے تو پھر پیدائش اور فروخت کا مسئلہ اہم ہو جاتا ہے۔ کارخانہ دار یہ دیکھتے ہیں کہ قیمتیں گر رہی ہیں۔ ہر نئی طلب کم قیمت پر ہو رہی ہے۔ لیکن ان کے مصارف پیدائش اس زمانہ میں بڑھی ہوئی اعلیٰ اجرتوں۔ گذشتہ قرضوں کی اعلیٰ شرح سود، اعلیٰ کرایوں، اعلیٰ تنخواہوں اور اعلیٰ محصولوں کی وجہ سے اخراجات زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ اپنا کاروبار جاری رکھیں تو یہ ڈر ہوتا ہے کہ قیمت فروخت سے مصارف پیدائش بھی وصول نہ ہو سکیں گے۔ ان حالات میں بظاہر آسان ترین علاج یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے کاروبار کو کلیتاً بند کر دیں۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا کرنے سے

اس کو تمام مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کو کاروبار بند کرنے سے روزانہ اجرتوں کی ادائیگی نہیں کرنی پڑے گی اور کچھ غیر ضروری تنخواہ دار ملازمین کو بھی علیحدہ کردیا جائیگا۔ لیکن یہ اس کے لئے آسان کام نہیں کہ وہ اپنے اعلیٰ کاریگروں اور دوسرے ذمہ دار ملازمین کو کلیتاً برطرف کردے۔ پھر ٹیکسوں، کرائوں اور سود کی ادائیگیوں سے اسے کسی طرح نجات نہیں مل سکتی۔ اس کے علاوہ اس کے پاس خام اجناس کا بھی ایک ذخیرہ ہوتا ہے جس کی قیمت کا رجحان گھٹاؤ کی طرف ہوتا ہے۔ اس کو بھی کہیں ٹھکانے لگانا ضروری ہوتا ہے ہر ممکنہ کفایت ایسے دور میں برتی جاتی ہے۔ غیر ضروری ملازمین کو علیحدہ کیا جاتا ہے کاروبار کا پیمانہ گھٹایا جاتا ہے۔ اور ہر طرف برخاست اور تخفیف کا دور دورہ شروع ہوجاتا ہے۔

تاجروں کو بھی اسی قسم کے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے جن سے کارخانہ دار کو سابقہ پڑا تھا۔ جب قیمتیں گرنے لگتی ہیں تو تاجروں کے لئے ایک اہم سوال یہ ہوتا ہے کہ مال کے ان بڑے ذخیروں کو کیا کیا جائے جو اعلیٰ قیمت پر خریدے گئے تھے۔ پہلے تو وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ مال کو سابقہ قیمتوں پر بیچیں لیکن جب ان قیمتوں پر مال طلب نہیں کیا جاتا اور نقد روپے کی ضرورت انہیں زیادہ شدت سے محسوس ہوتی ہے تو زیادہ ضرورت مند تاجر اپنے ذخیرے فروخت کرنے لگتے ہیں۔ جب یہ صورت پیدا ہوتی ہے اور دوسرے تاجر دیکھتے ہیں کہ ان کے مال کی قیمت پڑے پڑے کم ہو رہی ہے تو انہیں بھی مجبوراً اپنا مال فروخت کرنا پڑتا ہے۔ نتیجۃً ہر نیا آنے والا مال کم قیمت پر فروخت ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے خردہ فروشوں کو بھی اپنی قیمتیں کم کرنی پڑتی ہیں۔ کارخانہ داروں کی طرح تاجر بھی اس دور میں اپنے اخراجات کو ہر ممکنہ طریقہ سے کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب کاروبار پورے طور پر کساد بازاری کی منزل میں داخل ہوجاتا ہے۔ بنک قرضہ کم کردیتے ہیں ادائیوں کی وجہ سے بنکوں کے ذخیرے بڑھنے لگتے ہیں اور جوں جوں کساد بازاری کا دور ترقی کرتا جاتا ہے بنکوں کی قرضے دینے کی قوت بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن اس دور میں تاجر قرضہ لینے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔ محض بنکوں کی

طرف سے قرضہ دینے کی آمادگی کاروبار کو ترقی دینے کے لئے اور انہیں اُبھار کو بڑھاؤ کی طرف مائل کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ آجر اس وقت تک قرضہ لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے جب تک ان کو اس امر کا یقین نہ ہو جائے کہ ان قرضوں سے وہ منافع حاصل کر سکینگے۔ اسی طرح بنک بھی ایسے لوگوں کو قرضہ نہیں دیتے جن سے وصولی کی اُمید نہ ہو۔ اور بنکوں کی وصولیابی آسانی سے اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ آجر و تاجر ایسے کاموں کے لئے قرضہ لیں جن میں منافع کی توقع ہو۔ اس عدم توازن کی صورت کو جس میں مصارف پیدائش قیمت فروخت سے بڑھتے رہتے ہیں۔ درست ہونا ہی چاہیئے اور بیشتر اس کے کہ کاروبار کے حالات پھر موافق ہو جائیں، چلر فروشوں، تھوک فروشوں اور آجروں کے ذخائر کو کم کرنا پڑتا ہے۔ اس عرصہ میں طلب موجود رہتی ہے۔

بحالی کی منزل:— لیکن گذشتہ رسد میں اس تناسب کے ساتھ اضافہ نہیں ہوتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ صارفین کی خریدی کی وجہ سے یہ ذخائر کم ہونے لگتے ہیں۔ آخر کار بعض چلر فروش نئی فرمائشیں کرنے پر مجبور ہونے لگتے ہیں۔ اوّل اول تو یہ نئی فرمائشیں فوری ضرورت کی حد تک محدود ہوتی ہیں کیونکہ چلر فروشوں کو یہ ڈر ہوتا ہے کہ قیمتیں اور زیادہ کم نہ ہو جائیں۔ جوں جوں یہ فرمائشیں بڑھنے لگتیں ہیں، قیمتیں استوار ہونے لگتی ہیں۔ اب چلر فروش یہ محسوس کر کے کہ قیمتوں کی انتہائی پستی ختم ہو چکی ہے۔ زیادہ بھاری مقدار میں فرمائشیں کرنے لگتے ہیں۔ تھوک فروشوں کی فرمائشیں آجروں کے پاس بڑھنے لگتی ہیں۔ اسی طرح فرمائشوں کے بڑھاؤ کا دور مختلف میدانوں میں ترقی کرنے لگتا ہے۔ بالخصوص ان تمام فرمائشوں کی وجہ سے ریلوں اور حمل و نقل کے کاروبار کو تقویت پہنچتی ہے۔ اشیاء کی اس بڑھتی ہوئی مانگ کا اثر چلر فروشوں سے لے کر آجروں تک اور آجروں سے لے کر کاشتکاروں تک ہوتا ہے۔ اور قوت خرید میں مجموعی اضافہ ہو جاتا ہے۔ سب مال پس اندوختہ سرمایوں سے خریدا نہیں جا سکتا اس لئے بنکوں سے قرضوں کی فرمائشیں ہونے لگتی ہیں۔ بنک اس عرصہ میں کافی ذخیرے جمع کر چکے ہوتے ہیں اور وہ اچھے تاجروں کو معمولی شرح سود پر قرض دینے کے لئے تیار ہی نہیں بلکہ خواہشمند ہوتے ہیں۔

ان قرضوں کی وجہ سے آجروں اور تاجروں کی قوت خرید میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس بڑھی ہوئی قوت خرید کی وجہ سے زیادہ فرمائشیں کرنے اور مال خریدنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں کارخانوں میں اب پھر رونق شروع ہونے لگتی ہے۔ مزدوروں کی بھرتی شروع ہوتی ہے۔ اور مزدوروں کی مانگ بڑھتی رہتی ہے۔ اس سے مزدور پیشہ طبقہ کی قوت خرید میں اضافہ ہو جاتا ہے چنانچہ بنکوں کی مدد سے آجروں اور تاجروں کی قوت خرید میں جو اضافہ ہوا تھا اب اس کا اثر صارفین تک جا پہنچتا ہے۔ جن کا اثر تمام کاروبار پر بہت اچھا پڑتا ہے اور ہر چیز کی مانگ ہونے لگتی ہے۔ بڑھتی ہوئی فروخت اور عمدہ شرح منافع کی وجہ سے مستقبل روشن نظر آنے لگتا ہے قنوطیت نہ صرف دب جاتی ہے بلکہ ایک بار پھر رجائیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ کاروباری لوگ زیادہ خام مال خریدنا شروع کر دیتے ہیں۔ کاروبار کا پیمانہ بڑھا کر زیادہ مزدوروں کو کام پر لگاتے ہیں اور اپنے کاروبار کو مزید وسعت دینے کے درپے ہوتے ہیں۔ ان تمام تحریکات کا ایک ایسے معاشرہ میں جس کی ہر چیز ایک دوسرے سے بہت گہری طرح وابستہ ہے بہت دوررس اثر ہوتا ہے اور ہم پھیلاؤ اور بڑھاؤ کے دور سے گزر کر پھر گرم بازاری کے دور میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور یہ چکر اسی طرح چلتا رہتا ہے۔

یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کاروبار میں اس قسم کے چکر کیوں آتے رہتے ہیں؟ اور قیمتوں میں اس طرح کیوں گھٹاؤ بڑھاؤ ہوتا رہتا ہے؟ ان کی تشریح کے لئے بہت سے نظرئے پیش کئے گئے جن کی تفصیلات اس مجلہ کی کسی آیندہ اشاعت میں پیش کی جائیگی۔

سی۔ وی۔ رام راؤ ام۔ اے (عثمانیہ)

آدم اسمتھ

(۱) زندگی: آدم اسمتھ اسکاٹ لینڈ کے ایک دیہات کرکالڈی (فائف شائر) میں ۵ رجون ۱۷۲۳ء کو پیدا ہوا۔ اس کا باپ اس کی پیدائش سے چند ہفتے پہلے مرچکا تھا۔ ماں نے اس کی بڑی تن دہی سے پرورش کی۔ اس کی ابتدائی تعلیم مقامی گرامر اسکول میں ہوئی۔ ۱۷۳۷ء میں یہ گلاسگو یونیورسٹی میں داخل ہوا جہاں تین سال تک ریاضی اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کرتا رہا پھر یہاں سے آکسفورڈ چلا گیا اور وہاں چھ سال تک علم الاخلاق اور سیاسیات کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے آبائی وطن واپس آیا دو سال بعد اڈنبرا میں دو لکچر دیئے۔ اسی اثنا میں اسکی دوستی انگلستان کے مشہور فلسفی ڈیوڈ ہیوم سے ہوگئی۔ ۱۷۵۱ء تک اسکی ایسی شہرت ہوئی کہ گلاسگو یونیورسٹی نے اسکو اپنے یہاں منطق کا پروفیسر مقرر کیا اور پھر دوسرے سال ہی فلسفہ کی پروفیسری عطا کی۔ چنانچہ اس خدمت کے سلسلے میں اس نے جسقدر بھی لکچر دیئے ان کے اکثر حصوں کا خلاصہ اسکی مشہور تصنیف "دولت اقوام" میں شریک ہے۔ آدم اسمتھ اپنی اس مدت ملازمت کو اپنی زندگی کا بہت ہی کارآمد اور مسرت بخش زمانہ قرار دیتا ہے۔

۱۷۵۹ء میں اس نے اپنا ایک مشہور مقالہ "نظریہ جذبات اخلاق" شائع کیا جو بہت مشہور ہوا ۱۷۶۴ء میں پروفیسری کی خدمت سے علیحدہ ہوکر ڈیوک آف بکلوک کے ہمراہ یورپ کی سیاحت کے لئے روانہ ہوا۔ یہاں فرانس میں اسکی ملاقات خطر آئینیوں کے سرگروہ ڈاکٹر کینے اور دیگر علمائے معاشیات و فلسفہ مثلاً ٹرگو اور والٹیر سے ہوئی۔

یورپ کی سیاحت سے وطن واپس آنے کے بعد ۱۷۶۷ء میں اس نے تصنیف کا کام شروع کیا جو تقریباً چھ سال میں مکمل ہوگیا مگر اسکی اشاعت عمل میں نہ آسکی۔ اس نے اپنی سکونت انگلستان منتقل کردی اور یہاں ۱۷۷۶ء میں اسکی یہ عہد آفرین تصنیف جو عام طور پر "دولت اقوام" کے مختصر نام سے مشہور ہے "دولت اقوام کی ماہیت و اسباب کی تحقیق" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ جس نے

مصنف کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے ۔ ۱۷۷۰ء میں اسکاٹ لینڈ کے کمشنر آف کسٹمز کے عہدے پر اسکو مامور کیا گیا ۔ پھر ۱۷۸۰ء میں اسکا انتخاب گلاسگو یونیورسٹی کے لارڈ وکٹر کی حیثیت سے ہوا اور بالآخر اپنی زندگی کے سینسٹھ سال گذار کر ۱۷ جولائی ۱۷۹۰ء کو اس دنیا سے چل بسا۔

(۲) دولت اقوام | آدم اسمتھ نے اپنا جو کچھ بھی علمی سرمایہ چھوڑا ہے وہ

(۱) نظریہ جذبات اخلاق (۲) اصول قانون یا خطبات متعلق عدالت، پولیس، مالگذاری اور فوج (۳) دولت اقوام پر مشتمل ہے ۔ ان میں سب سے زیادہ اہم اور مشہور موخرالذکر ہے اس لئے کہ معاشیات سے متعلق تمام تر نظریئے اس کتاب میں مرتب اور جامع شکل میں پیش کئے گئے ہیں ۔ لیکن دولت اقوام میں جن خیالات و نظریوں کو آدم اسمتھ نے پیش کیا ہے ان کو بیان کرنے سے پہلے ان چند مصنفین کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جن کا اثر اسمتھ کے خیالات پر پڑا ۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل ذکر نام ہچیسن کا ہے جو گلاسگو میں اسمتھ کا استاد بھی رہ چکا تھا ۔ مباحث کی جو تقسیم ہچیسن نے کی تھی وہی کم و بیش اسمتھ نے بھی رکھی اور اس کے مختلف مشہور نظریئے جو دولت اقوام میں پیش کئے گئے ہیں وہ ہچیسن کی تصنیف "طریق فلسفۂ اخلاق" میں پائے جاتے ہیں جو ۱۷۵۵ء میں شائع ہو چکی تھی ۔ تقسیم عمل کی اہمیت زر کی ابتدا اور اس کی قدر میں اختلاف پر جو خیالات اس کتاب میں ظاہر کئے گئے ہیں وہ بہت کچھ دولت اقوام سے ملتے جلتے ہیں ۔

آدم اسمتھ کے معاشی خیالات خصوصاً اس کے عام فلسفہ پر ایک اور دوسرے شخص کا جو گہرا اثر پڑا وہ ڈیوڈ ہیوم ہے ۔ اس نے مختلف معاشی مسائل مثلاً زر، تجارت خارجہ اور شرح سود وغیرہ پر مضامین لکھے تھے جو اسکے دیگر مضامین کے ساتھ ۱۷۵۴ء میں "سیاسی مکالمات" کے عنوان کے تحت شائع ہوئے ۔ ہیوم نے تجاریت کے مسلک پر سخت تنقید کی تھی جس کا اثر آدم اسمتھ کے عقیدے پر بھی پڑا۔

مذکورہ بالا دونوں فلسفیوں کے علاوہ اسمتھ کے خیالات پر مینڈیول کی مشہور نظم "بوی فیبل آف دی بیز" کا بھی اثر پڑا جو مختلف تشریحات کے ساتھ ۱۷۱۴ء میں شائع ہو کر بہت مقبول

ہوئی اور ایک ایسی ہل چل مچادی کہ حکومت نے بالآخر اسکو ضبط کرلیا۔ اس میں مصنف نے یہ بتلانے کی کوشش کی تھی کہ تہذیب و تمدن انسان کی نیکیوں کی بجائے برائیوں کا نتیجہ ہے خوشحالی عیش و آرام اور زندگی کی تمام مسرتیں انسان کی فطری احتیاج سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسمتھ نے اپنے نظریہ جذبات اخلاق میں اس پر سخت نکتہ چینی کی لیکن باوجود اس کے اسمتھ پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ اسکے علاوہ فطرائینی فلسفہ نے بھی خصوصاً جہاں تک عدم مداخلت کے بنیادی اصول کا تعلق ہے آدم اسمتھ کو بہت متاثر کیا۔

غرض اسمتھ نے اپنی اس مشہور تصنیف میں معاشیات سے متعلق جو کچھ بھی لکھا ہے وہ بالکل نئی چیز یا اور اسکے ذاتی خیالات کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ اکثر بڑے مصنفین کی طرح دوسروں کے خیالات سے ماخوذ ہیں لیکن اسمتھ کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی اپج، وسیع مطالعہ، ذہانت اور قوی مشاہدہ کی بناء پر ان کو مختلف دلائل، اور علمی دنیا کی مثالوں کے ساتھ کانٹ چھانٹ کر کچھ ایسے بہتر اسلوب اور دلکش علمی انداز میں پیش کیا ہے کہ جدید معلوم ہوتے ہیں۔

دولت اقوام ایک مختصر تمہید کے ساتھ پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دو حصے جن مباحث پر مشتمل ہیں وہ معاشیات کی موجودہ اصطلاح کے لحاظ سے پیدائش دولت اور مبادلہ دولت سے متعلق کہے جاسکتے ہیں یعنی ان میں پہلے محنت کی اہمیت اور تقسیم عمل کے فوائد بتاتے ہوئے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ کس طرح سالانہ قومی دولت کا انحصار محنت پر ہوتا ہے اور تقسیم عمل کے ذریعہ کیونکر محنت کی پیداآوری بڑھتی اور بالآخر قومی دولت کے اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ تقسیم عمل کی وجہ سے مبادلہ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے لہذا زر اور قدر و قیمت اور اس سلسلے میں اجرت، منافع اور لگان سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرا حصہ تاریخی ہے جس میں مختلف قوموں کی ان معاشی مسلکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو مختلف معاشی نظریوں کے پیدا ہونے کا باعث بنے یعنی تجاریت اور فطرائینیت جن پر چوتھے حصے میں تنقید کی گئی ہے۔ پانچواں حصہ مالیات عامہ سے متعلق ہے۔

اسمتھ نے اپنی اس کتاب میں جن اہم نظریوں پر روشنی ڈالی ہے وہ مختصراً حسب ذیل ہیں۔

محنت و تقسیمِ عمل فطرائیوں نے جو ساری اہمیت زمین کو دی تھی اور یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ زمین ہی دراصل تمام دولت کا سرچشمہ ہے اسمتھ نے اسکی تردید کی اور اس کی بجائے انسانی محنت کو دولت کا ماخذ قرار دیا چنانچہ دولت اقوام کی ابتدا ہی وہ اس جملے سے کرتا ہے کہ "ہر قوم کی سالانہ محنت ہی ایسا ذخیرہ ہے جس سے زندگی کی تمام ضرورتوں اور سہولتوں کے سامان دراصل مہیا ہوتے ہیں اور یہ سامان یا تو اس محنت کی راست پیداوار پر یا اس پیداوار کے ذریعہ دوسری قوموں سے جو چیزیں حاصل کیجاتی ہیں ان پر مشتمل ہوتے ہیں"۔ اس سلسلے میں وہ فطرائیوں کے اس خیال کی بھی حمایت نہیں کرتا کہ صرف زرعی محنت ہی پیدا آور ہے اور بقیہ دوسری محنت غیر پیدا آور ہے۔ البتہ وہ یہ ضرور تسلیم کرتا ہے کہ "تاجروں اور صناعوں کے مقابلے میں کسانوں اور زرعی مزدوروں کی محنت زیادہ پیدا آور ہے" "لیکن ایک خاص قسم کی محنت کی زیادہ پیدا آوری دوسری قسم کی محنتوں کو بیکار اور غیر پیدا آور قرار نہیں دے سکتی"۔ لیکن باوجود اسکے آگے چل کر وہ اپنے اس خیال سے ایک غلط مبحث پیدا کر دیتا ہے کہ "ایسے تمام کام جس کا نتیجہ مادی شکل میں نمودار نہ ہو غیر پیدا آور ہے"۔ واضح رہے کہ آدم اسمتھ کے خیالات میں اکثر تضاد اور تشنگی بھی موجود ہے لیکن پھر بھی ہم کو اس کے عام نظریوں کے معلوم کرنے میں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا نہیں ہوتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ جدید نظریوں کی روشنی میں اسکے خیالات پر اعتراضات کئے جا سکتے ہیں۔ اب رہا اس سلسلے میں تقسیم عمل پر جو روشنی ڈالی گئی ہے وہ بالکل واضح ہے اسکی کتاب کا دراصل یہی بنیادی اور مرکزی مسئلہ ہے۔ تقسیم عمل اور اس کے جو کچھ بھی فوائد اس نے بتائے ہیں وہ آج بھی مسلمہ اور اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسمتھ کے نزدیک تقسیم عمل کی وجہ سے محنت کی قوت پیدا آوری میں اضافہ ہوتا ہے جس کے تین وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ جب ایک شخص ایک خاص قسم کا ہی کام کرتا ہے تو اسکی مہارت بڑھ جاتی ہے۔ دوسرے وقت کی کفایت ہوتی ہے اور تیسرے ایجاد و اختراع ممکن ہو جاتی ہے۔ لہذا پیدائش کے کاروبار میں جسقدر تقسیم عمل سے کام لیا جائے گا محنت کی قوت پیدا آوری بڑھے گی اور بالآخر قوم کی سالانہ دولت میں اضافہ ہوگا۔ لیکن اس نے اسکے ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ تقسیم عمل میں بازار کی محدودیت اور اصل کی مقدار کی موجودگی سے رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ جسقدر بازار محدود ہوگا۔

طلب کی کمی سے زیادہ پیداوار کی کھپت مشکل ہو جائے گی۔ نیز جسقدر سرمایہ میں کمی ہو گی مشین کا استعمال محدود ہو جائیگا اور تقسیم عمل میں رکاوٹ ہو گی۔ آدم اسمتھ نے ساری توجہ تقسیم عمل کے فوائد کی طرف کی ہے اس کے نقصانات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے شاید اس لئے کہ فوائد کے مقابلے میں نقصانات محض برائے نام ہوتے ہیں۔

قدر و قیمت | اسمتھ نے قدر و قیمت کے سلسلے میں پہلے دو مفہوم کی وضاحت کی ہے ایک "قدر استعمال" دوسرے "قدر مبادلہ"۔ اول الذکر سے اسکی مراد محض افادہ ہے لہذا اسکو خارج از بحث قرار دیتا ہے البتہ ثانی الذکر میں قدر مبادلہ کو قابل ذکر سمجھتا ہے جو دراصل اسکے نزدیک اشیاء کی "قوت خرید" کے مرادف ہے۔ اس کے بعد اس نے قدر و قیمت سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اسقدر متضاد اور تذبذب آمیز ہیں کہ ان سے کسی ایک قطعی نظریہ پر پہنچنا مشکل ہے البتہ ان خیالات کا تجزیہ کرنے کے بعد دو نظریے ہاتھ آتے ہیں چنانچہ ایک نظریہ تو یہ ہے کہ کسی چیز کی حقیقی قدر کا انحصار محنت کی اس مقدار پر ہوتا ہے جو اس کے پیدا کرنے میں صرف ہوتی ہے لہذا محنت ہی تمام اشیاء کی قدر کا اصلی سرچشمہ اور حقیقی پیمانہ ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں قدر کا یہ وہی نظریہ ہے جسکو کارل مارکس نے اسنادی معاشیات کے خلاف ایک کامیاب حربے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ اسمتھ نے اس نظریے کو ایک غیر ترقی یافتہ قدیم معاشرے کے حالات کے لئے موزوں سمجھا ہے اس لئے کہ صرف ایسے معاشروں ہی میں کسی شئے کو حاصل کرنے کے لیے صرف محنت کافی ہوتی ہے وہ بہ ترقی یافتہ جدید قسم کے معاشرے میں صرف محنت کے عمل سے کوئی شئے پیدا نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے ساتھ زمین اور سرمایہ بھی درکار ہوتا ہے۔ لہذا کسی چیز کی قدر کا نہ تو محنت ہی واحد ماخذ قرار دی جا سکتی ہے اور نہ پیمانہ۔ چنانچہ اسمتھ نے اسکے ساتھ ہی ساتھ دوسرا نظریۂ "مصارف پیدائش" کا پیش کیا ہے۔ یعنی کسی چیز کی حقیقی قیمت نہ صرف اسی محنت پر منحصر ہے جو اسکے حاصل کرنے کے لئے صرف ہوتی ہے بلکہ محنت کے ساتھ ساتھ اصل اور زمین کے معاوضے پر بھی مشتمل ہے۔ گویا یہ وہ نظریہ ہے جس پر بڑی حد تک اسنادی معاشیین اتفاق کرتے ہیں لیکن خود اسمتھ ان دونوں نظریوں کے پیش کرنے میں قطعی فیصلے سے قاصر ہے کہ ان کا نظریہ صحیح ہے۔ لیکن اسکے ساتھ ساتھ یہ چیز قابل ذکر ہے کہ اسمتھ کے نزدیک کسی چیز کی ایک تو "حقیقی قیمت" ہوتی ہے اور دوسرے بازاری قیمت۔ اول الذکر میں اجرت مکان اور منافع شامل ہیں۔ لہذا اگر بازاری قیمت اتنی ہو کہ

اُجرت یا لگان اور منافع پورے پورے طور پر نکل آئیں تو یہ حقیقی قیمت کے مساوی ہوگی ورنہ حقیقی قیمت سے بازاری قیمت زیادہ ہوگی یا کم اور یہ اکثر ہوتا ہے کیونکہ اسکا انحصار طلب و رسد کے حالات پر ہے۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسمتھ کے پیش نظر حقیقی قیمت معلوم کرنا تھا۔ قدر و قیمت کا تعین کس بنا پر ہوتا ہے اس پر اس نے غور نہیں کیا۔

<u>اجرت</u> اسمتھ نے اُجرت کا کوئی مستقل نظریہ پیش نہیں کیا۔ بلکہ اس نے اس سلسلے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے اب تک اُجرت کے جسقدر نظریئے بھی معاشیوں نے پیش کئے ہیں سب پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً اس عبارت سے اجرت فنڈ کے نظریئے کا پتہ چلتا ہے کہ "ان لوگوں کی طلب جو اجرت پر اپنی زندگی بسر کرتے ہیں اس فنڈ سے جو اجرت ادا کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہے زیادہ نہیں بڑھ سکتی" البتہ اسی سلسلے میں اسکے ذہن پر اجرت صحیحہ اور اجرت متعارفہ کا تخیل پایا جاتا ہے۔

<u>منافع اور سود</u> اسمتھ کے نزدیک اصل کے استعمال سے جو پیداوار حاصل ہوتی ہے وہ منافع ہے اور سود منافع کا ایک حصہ ہے جو قرضدار اصل حاصل کرنے کے معاوضہ کے طور پر ادا کرتا ہے۔ پھر بھی اس کے ذہن میں کوئی خاص نظریہ منافع اور سود کا نہیں ہے۔

<u>لگان</u> اس کے خیال میں لگان سے مراد وہ معاوضہ یا قیمت ہے جو زمین کے استعمال کے لئے ادا کی جاتی ہے اور اس میں زرخیزی اور محل وقوع کے لحاظ سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔

<u>زر</u> زر کی ابتداء اور استعمال کی تشریح کے سلسلے میں اس نے اسکا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یہی ہے کہ زر "پیمانۂ قدر" اور "آلۂ مبادلہ" ہے لیکن زر کے ان دونوں فرائض کی بنا پر عام طور سے خصوصاً تجاریوں کا جو یہ خیال تھا کہ دولت زر یا سونے اور چاندی پر مشتمل ہے اسمتھ نے اسکی تردید کی ہے اور یہ بتایا کہ کسی قوم کی حقیقی دولت نہ صرف اس کے سونے چاندی پر مشتمل ہے بلکہ زمین لگان اور ان تمام مختلف اقسام کی اشیاء پر بھی ہے جو جو صرف میں آتی ہیں۔ اور جو زمین اور معاشرے کی محنت کی پیداوار ہیں۔ زر کا کام اس دولت کو محض گردش میں لانا ہے

<u>مالیات عامہ</u> اسمتھ نے حکومت کی آمدنی پر بحث کرتے ہوئے محاصل بندی کے ان چار مشہور و مسلم قوانین کی تشریح کی ہے جو (۱) مساوات (۲) یقین (۳) سہولت (۴) کفایت سے موسوم کئے جاتے ہیں اور عام طور

خود اسمتھ سے منسوب ہیں۔ گرچہ محاصل کے یہ چاروں اصول یوستی نامی مشہور جرمن معاشی کے بیان کردہ چھ اصولوں میں شریک ہیں۔

معاشی آزادی اور عدم مداخلت انسان کی فطری آزادی کا اسمتھ بڑا حامی تھا اس بنا پر اس کا یہ خیال تھا کہ ہر شخص کو معاشی کاروبار اور جد وجہد میں آزادی ہونی چاہیئے۔ تاکہ وہ اپنے ذاتی مفاد اور دلچسپی کی بنا پر کاروبار کو کامیابی کے ساتھ چلا سکے۔ حکومت کو معاشی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔ حکومت کے فرائض جن کو وہ بہتر طور پر اور کامیابی کے ساتھ انجام دے سکتی ہے وہ صرف تین ہیں ایک ملک کی حفاظت کرنا دوسرے عدل و انصاف کا انتظام کرنا اور تیسرے ایسے رفاہ عامہ کے کام کرنا جو افراد سے بڑھ کر جماعت کے لئے مفید ہوتے ہیں مثلاً تعلیمات وغیرہ لیکن یہ واضح رہے کہ اسمتھ ہر قسم کے معاشی کاروبار میں مطلق آزادی کا قائل نہ تھا۔ دراصل اس کے نزدیک کوئی معاشی کاروبار اسی وقت تک کامیاب اور معاشرے کے لئے مفید ہو سکتا ہے جب تک کہ کاروباری شخص کو ذاتی فائدے کی ترغیب ہو اور اسکی جد وجہد مسابقت کے ذریعہ انصاف کے حدود سے باہر نہ ہونے پائے۔ جہاں یہ دونوں باتیں نہ ہوں گی عوام کو اس سے اس قدر نقصان پہنچ سکتا ہے جسقدر کہ حکومت کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے۔ چنانچہ اس بنا پر بعض معاملات میں اسمتھ حکومت کی مداخلت کو ضروری قرار دیتا ہے۔ مثلاً شرح سود کا تعین۔ ڈاک کا سرکاری انتظام وغیرہ اس طرح اجارہ اور مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں کا سخت مخالف ہونے کے باوجود بنکوں اور بیمہ کمپنیوں کو مستثنیٰ قرار دیتا ہے۔

بایں ہمہ بحیثیت مجموعی وہ افراد کی معاشی آزادی کا بہت بڑا حامی ہے۔ وہ آزاد تجارت کو مفید قرار دیتا ہے اور حکومت کی مداخلت اور تامین کو نہ صرف بیکار بلکہ بعض صورتوں میں مضر بھی سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تجارتی مسلک کا سخت مخالف ہے اور اس پر اس نے بڑی نکتہ چینی کی ہے۔

دولت اقوام کی مقبولیت اور اثرات اس کتاب کی جو مقبولیت ہوئی اور اس کا اثر معاشی خیالات اور عمل پر جو کچھ بھی پڑا اس پر تبصرہ کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ اتنا کہدینا کافی ہے کہ خود مصنف کی زندگی میں اسکے پانچ ایڈیشن شائع ہوئے۔ یورپ کی مختلف زبانوں میں اسکا ترجمہ کیا گیا۔ وہ کافی مقبول ہوا۔ مختلف معاشی مسائل کی نظری اور عمل بحث میں اس کتاب کے جملے بطور سند پیش کئے جانے لگے۔ تجارتی مسلک کے

اختیار کرنے اور قوانین نافذ کرنے میں اسمتھ کے خیالات نے عملی اثرات مرتب کیے چنانچہ انگلستان کا مشہور وزیر اعظم پٹ جس نے فرانس کے ساتھ سب سے پہلے آزاد تجارت کے معاہدے پر دستخط کیے اور مختلف قوانین کے نفاذ کا باعث بنا وہ اسمتھ سے خاص طور پر متاثر تھا۔ اس نے مالیاتی مسلک پر تبادلۂ خیالات کرنے کے لیے ایک سے زیادہ مرتبہ اسمتھ سے ملاقات کی۔ شاید اسی بناء پر اسمتھ نے اس کے متعلق ایک مرتبہ یہ کہا کہ "پٹ کس قدر غیر معمولی شخص ہے! وہ میرے خیالات کو مجھ سے بڑھ کر سمجھتا ہے۔"

اسمتھ کے خیالات اور نظریوں کو کچھ ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ نہ صرف ہیوم، گبن اور کارلائل جیسے انگریز علماء اس کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں بلکہ یورپ کے اکثر علماء اور مشاہیر نے بھی خراج تحسین ادا کیا ہے۔

بظاہر یہ چیز ضرور تعجب خیز معلوم ہو سکتی ہے کہ جب اسمتھ نے اپنا ذاتی کوئی خاص نظریہ پیش نہیں کیا بلکہ بہت کچھ دوسرے لوگوں کے ماخوذ خیالات کا مرہون منت ہے اور بعض خیالات میں جبکہ تضاد اور نقص بھی پایا جاتا ہے تو پھر اس قدر غیر معمولی مقبولیت اور شہرت کیوں ہوئی۔ بات یہ ہے کہ اسمتھ نے دوسروں کے خیالات بالکل اپنی اصلی شکل میں پیش نہیں کیے ہیں بلکہ اس میں بہت کچھ اصلاح و ترمیم بھی کی ہے اس کے علاوہ ان تمام خیالات کی ایک خاص نقطۂ نظر سے شیرازہ بندی کی ہے اور اس طرح معاشی اصولوں کو ایک خاص فلسفے کے تابع کیا ہے۔ اور ان میں جامعیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ فطرائین اور ان کے سرتاج ڈاکٹر کینے نے معاشی مسائل کو چند عام اصولوں اور نظریوں کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی ان کو نسبتاً زیادہ مربوط و منظم صورت دے کر آدم اسمتھ نے دولت اقوام میں پیش کیا لیکن فطرائیت میں ساری اہمیت زراعت کو دی گئی تھی اور معاشیات کو محض زراعت پیشہ طبقے کے مفاد پر مبنی رکھا گیا تھا اس کے برخلاف اس نے معاشرے کے تمام طبقے یعنی کاشتکار، صناع اور تاجر تمام کے مفاد کو پیش نظر رکھا۔ اور اسی طرح معاشیات کے اصول اور نظریوں کو بہت زیادہ عام بنانے کی کوشش کی۔ تجاریت اور فطرائیت جو دراصل معاشیات کے دو ایسے فریق تھے جن میں بہت کچھ خرابیاں اور نقائص تھے آدم اسمتھ نے ان کو الگ کر کے ان کی خوبیوں کے امتزاج سے اپنے اصول معیشت کی بنیاد قائم کی اور ایسے نظریے پیش کیے جن کی بناء پر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اسمتھ کے ہاتھوں معاشیات کا مطالعہ "طریق" کے دائرے سے نکل کر "علم" کے دائرے میں شریک ہو گیا۔ اور اسی طرح دولت اقوام دیگر تصانیف کے مقابلے میں علم معیشت پر ایک باضابطہ کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ غرض یہی وجہ ہے کہ اسمتھ کے نظریوں کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ لوگ اسے معاشیات کا باوا آدم کہنے لگے۔

سید فخر الحسن ایم اے (عثمانیہ) لکچرار معاشیات و عمرانیات

تنقید و تبصرے

"ہندوستان کے معاشی مسائل" از محمد ناصر علی صاحب ایم۔اے (عثمانیہ) لکچرار معاشیات جامعہ عثمانیہ بڑی تقطیع صفحات ۳۰۰ سرورق رنگین و دیدہ زیب — ناشر ادارہ معاشیات۔ حمایت نگر فاطمہ منزل حیدرآباد دکن قیمت چار روپیہ۔

زیر نظر کتاب مولوی محمد ناصر علی صاحب ایم۔اے (عثمانیہ) لکچرار معاشیات جامعہ عثمانیہ کے اُن بلند پایہ مضامین کا مجموعہ ہے، جو وقتاً فوقتاً ملک کے مشہور اخبارات و رسائل میں شایع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعہ میں ہندوستان کی معاشی زندگی کے اکثر اہم مسائل مثلاً ہندوستانی آبادی، ہندوستان میں تقسیم و انتشار اراضی، ہندوستان میں فروخت پیداوار، زمین گردی بنک، دیسی بنک کاری، اور ریزرو بنک وغیرہ پر نہایت سلیس زبان اور دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعض عصری مسائل مثلاً "ہندوستان میں قیمتوں پر جنگ کے اثرات" "ضروریات زندگی پر جنگ کے اثرات" "ہندوستانی کاشتکاروں پر جنگ کے اثرات" "جنگ اور ہندوستان کے صنعتی جھگڑے" وغیرہ بھی شامل ہیں۔ مملکت حیدرآباد سے متعلق تین مضامین (۱) حیدرآباد کی آبادی (۲) منڈی میر عالم کی معاشی تحقیق (۳) شہر حیدرآباد میں گوشت کی سربراہی درج ہیں۔ کتاب کے آخر میں "جاپان کی تجارت خارجہ" "جاپان کے مقاصد جنگ" اور "اجرت کے نظریے" "استحصال" کے عنوان سے چار مضامین ہیں، جو اگرچہ کتاب کے عنوان سے میل نہیں کھاتے، لیکن موجودہ زمانہ میں ان کی اہمیت اور افادیت واضح ہے۔

مولوی ناصر علی صاحب کے نام سے حیدرآباد کی علمی و ادبی دنیا ناواقف نہیں ہے۔ آپ نے عوام کو علم معاشیات سے واقف کرانے کے سلسلہ میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اس سے قبل آپ نے "معاشیات کی الف، بے" لکھ کر عامۃ الناس کو معاشیات کے

نظریوں اور اصولوں سے روشناس کرایا تھا۔ پیش نظر کتاب کی تالیف سے آپ نے عوام کو عملی معاشیات سے واقف کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے زبان اس قدر سلیس اور انداز بیان اتنا سلجھا ہوا ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی ہندوستان کی معاشی زندگی کے اہم اور پیچیدہ مسائل کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ اور طلباء کی ضروریات تو اس کتاب سے بدرجہ اتم پوری ہوسکتی ہیں، کیونکہ قابل مولف نے امتحانی نقطۂ نظر سے معاشیات ہند کے اہم سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔

"منڈی میر عالم کی معاشی تحقیق" اور "شہر حیدرآباد میں گوشت کی سربراہی" یہ دو بہت ہی بلند پایہ تحقیقی مضامین ہیں۔ ان مضامین کی تیاری میں لایق مولف نے نام نہاد محققین کی رپورٹوں اور کتابوں سے مدد نہیں لی ہے، بلکہ اپنے ذاتی مشاہدہ اور تحقیق و تفحص کے بعد انہیں سپرد قلم کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مولوی ناصر علی صاحب کو جامعۂ عثمانیہ کے معاشی محققین میں "پائینر" کا درجہ حاصل ہے ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب نے بالکل صحیح فرمایا کہ ان میں علمی تحقیق کی وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو ایک سچے طالب علم میں ہونی چاہیں۔ انکے ان مضامین کو پڑھنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ معاشیات میں "خطوط خمدار کی نمایش" کس حد تک ہوتی ہے —— اور کس حد تک یہ علم عملی زندگی کے مسائل کو حل کرتا ہے !!۔

ادارہ معاشیات قابل مبارک باد ہے کہ اس نے اس کتاب کے اشاعت سے علم و ادب کی نہایت ہی مفید خدمت انجام دی ہے۔ ہم ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب صدر ادارہ معاشیات و معاشی مشیر حکومت سرکار عالی کو پُرخلوص مبارکباد دیتے ہیں کہ انہوں نے اپنے طلباء میں علم و ادب کی خدمت کا صحیح ذوق پیدا کر دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب جیسے ماہر معاشیات کی ہدایت و سرپرستی اور امداد و تعاون سے اُردو ادب کا دامن علم معاشیات کے جواہر ریزوں یوں ہی مالا مال ہوتا رہے گا۔

"ا۔ خ"

سائنس

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

یہ رسالہ ملکی زبان میں سائنس کا واحد رسالہ ہے جس میں مختلف مضامین کے علاوہ ہر ماہ دلچسپ معلومات سائنس سے متعلق سوال وجواب سائنس اور صنعت سے متعلق تازہ ترین خبریں اور نئی کتابوں کے تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں امید ہے کہ علم کے شائقین اور اردو زبان کے بہی خواہ سرپرستی فرمائیں گے

اشتہارات کے نرخ طلب کئے جاسکتے ہیں۔

چندہ سالانہ صہ سکہ انگریزی ۱۴؍ صہ سکہ عثمانیہ

نمونہ کا پرچہ آٹھ آنے کلدار دس آنہ عثمانیہ

المشتہر

معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

اشتہارات

مجلۂ طیلسانیئن کے مقاصد اور قواعد

(۱) مجلۂ طیلسانیئن عثمانیہ حیدرآباد دکن کا ترجمان ہے۔

(۲) اغراضِ انجمن کے لحاظ سے مجلہ میں :—

(i) جامعۂ عثمانیہ کے منظورہ مابعد طیلسانیئن کے مقالے شائع کئے جائیں گے۔

(ii) اردو مطبوعات پر تنقید و تبصرہ کیا جائے گا۔

(iii) انجمن طیلسانیئن عثمانیہ اور اس کے ملحقہ اداروں کی سرگرمیوں اور کاروبار کی تفصیلات شائع کی جائینگی۔

(iv) علمی اور ہر جہتی ترقی کی معلومات و اطلاعات شائع کی جائیں گی۔

(v) سیاسیات حاضرہ اور اختلافی مذہبی امور کے متعلق مضامین وغیرہ کسی صورت میں شائع نہ کئے جائیں گے۔

(۳) حسب ضرورت مجلہ کے مختلف حصے خاص خاص علم و فن سے مختص ہونگے۔ فی الوقت مجلہ کے دو حصے ہونگے: حصۂ عام اور حصۂ معاشیات

(۴) مجلہ بہمن، اردی بہشت، امرداد اور آبان، مطابق جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوگا۔

(۵) مجلہ کے ہر حصہ کی ضخامت کم از کم ۱۰۰ صفحے ہوگی۔

(۶) مضمون یا مقالہ نگاروں کو ان کے مضمون یا مقالہ کے ۲۵ اور ام، اے کے مقالہ کے ۱۰ نسخے بلا قیمت ارسال ہونگے بشرطیکہ پہلے مطلع کر دیا جائے۔ اگر اس سے زیادہ نسخے درکار ہوں تو کاغذ کی قیمت قبل از قبل ادا کرنے پر انتظام کیا جا سکیگا۔

(۷) اگر مضمون یا مقالہ نگار پہلے سے مجلہ کے خریدار نہ ہوں تو مجلہ کا وہ شمارہ جسمیں ان کا مضمون شائع ہو بلا قیمت ارسال کیا جائیگا۔

(۸) سال بھر میں کسی صاحب کے دو مضمون یا مقالے شائع ہونے کی صورت میں سال مابعد کے لئے اگر قواعد انجمن طیلسانیئن عثمانیہ مانع نہ ہوں تو مجلہ بلا قیمت جاری کیا جائے گا۔

(۹) اگر مضمون یا مقالہ یا نظم قابل اشاعت قرار نہ پائے تو اس کو واپس کر دیا جائے گا۔

(۱۰) اگر کسی مضمون یا مقالہ کے لئے مجلہ اپنے خرچ سے تصاویر کے بلاکس تیار کرے تو ان کو مناسب قیمت پر، جس کا تصفیہ مہتمم مجلہ کرے گا، فروخت کیا جا سکے گا۔

(۱۱) اگر مجلہ کا کوئی شمارہ اشاعت کے مقررہ مہینہ میں وصول نہ ہو تو اسکی اطلاع مہتمم کو دوسرے مہینہ میں کر دینی چاہیئے۔

مجلّۂ طیلسانیئن کا چندہ

۱۔ مجلّہ چندہ دہندہ ارکان انجمن طیلسانیئن عثمانیہ کو مقررہ قواعد کے بموجب بلا قیمت ارسال کیا جائیگا۔

۲۔ مجلّہ کا حصہ معاشیات معاشی کمیٹی انجمن طیلسانیئن کے ارکان کو اپنے چندہ رکنیت کے علاوہ سالانہ (عہ) روپیہ ادا کرنے پر ارسال کیا جائیگا۔ اگر ان کو مجلّہ کے دونوں حصے مطلوب ہوں تو اس کیلئے ان کو سالانہ دو روپیہ اپنے چندہ رکنیت کے علاوہ ادا کرنا ہوگا۔

۳۔ مجلّہ کے دونوں حصوں کی قیمت علاوہ محصول ڈاک خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ پانچ روپیہ سکۂ عثمانیہ اور بیرون مملکت آصفیہ سے پانچ روپیہ سکہ حکومت ہند ہوگی۔

۴۔ مجلّہ کے عام حصہ کی قیمت محصول ڈاک کے علاوہ خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ (سے) روپے سکۂ عثمانیہ اور بیرون مملکت آصفیہ سے (سے) روپے سکہ حکومت ہند ہوگی۔

۵۔ مجلّہ کے حصۂ معاشیات کی قیمت علاوہ محصول ڈاک خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ (سے) روپے سکۂ عثمانیہ ہوگی اور بیرون مملکت آصفیہ سے (سے) روپے سکہ حکومت ہند۔

۶۔ مجلّہ کے ہر حصہ کی قیمت فی نسخہ ایک روپیہ اور دونوں حصوں کی ایک روپیہ آٹھ آنے ہوگی۔

۷۔ تبادلہ کے طور پر اشتہارات کی اشاعت مطلوب ہو تو مراسلت کے ذریعہ تصفیہ ہوسکے گا۔

۸۔ مجلّہ کے سلسلہ میں ہر قسم کی مراسلت مہتمم مجلّہ طیلسانیئن دفتر مجلس نمائش گاہ باغ عام" حیدرآباد دکن" کی معرفت کی جانی چاہیئے

۹۔ خریداران مجلّہ اپنے پتہ کی تبدیلی سے مہتمم مجلّہ کو بروقت مطلع فرمائیں۔

اشتہارات کا نرخ

صفحہ	چار بار کے لئے	ایک بار کے لئے
پورا صفحہ پہلا ورق	۳۰ روپے سالانہ	۱۲ روپے سالانہ
آدھا صفحہ ״	۲۰ روپے سالانہ	[illegible] روپے سالانہ
پاؤ صفحہ ״	۱۵ روپے سالانہ	۱۰ روپے سالانہ

صفحہ	چار بار کے لئے	ایک بار کے لئے
پورا صفحہ اندرونی	۲۰ روپے سالانہ	۶ روپے سالانہ
آدھا صفحہ ״	۱۵ روپے سالانہ	۵ روپے سالانہ
پاؤ صفحہ ״	۸ روپے سالانہ	۳ روپے سالانہ

سلسلہ مطبوعات انجمن طیلسانیئن عثمانیہ

نام کتاب	مصنف	قیمت
۱۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیان ریاست	سید علی محسن ام اے (عثمانیہ)	دو روپے
۲۔ سلطان احمد شاہ بہمنی	ظہیر الدین ام۔ اے (عثمانیہ)	دو روپے
۳۔ امام غزالی کے کلامی خصوصیات	محمد غوث (محبوب نگری) ام اے (عثمانیہ)	ایک روپیہ آٹھ آنے
۴۔ موضع دوپلی کی معاشی تحقیق	محمد ناصر علی ام، اے (عثمانیہ)	دو روپے
۵۔ دربار اودھ کا اثر لکھنو کی شاعری پر	محمد اعظم ام اے (عثمانیہ)	ایک روپیہ
۶۔ معاشیات کی الف بے	محمد ناصر علی ام اے (عثمانیہ)	آٹھ آنے
۷۔ عہد معاونت اور حیدرآباد	میر مخدوم علی خاں ام اے (عثمانیہ)	دو روپے
۸۔ بلدہ سے قصبہ تک	محمد فاروق بی اے (عثمانیہ) ہچ۔سی۔ایس	۴ر
۹۔ پاور الکمل	نظیر حسین آفندی ام ایس سی (عثمانیہ)	۴ر
۱۰۔ مقامی محاصل ان کے اقسام اور نوعیت	محمد فاروق بی۔اے (عثمانیہ) ہچ،سی،ایس	۴ر
۱۱۔ ہندوستانی معاشیات کے مبادی	شرف الدین بی۔اے (عثمانیہ)	(زیر طبع)
۱۲۔ اسلام کے معاشی نظریے	محمد یوسف الدین ام۔ اے (عثمانیہ)	۔۔۔
۱۳۔ پریم چند اور ان کی افسانہ نگاری	محمد اکبر الدین صدیقی ام اے (عثمانیہ)	(زیر طبع)

سیاست

علوم معاشری کا سہ ماہی رسالہ

جو

مارچ، جون، ستمبر اور دسمبر میں شائع ہوتا ہے

اس کا مقصد یہ ہے کہ سیاسی اور دیگر علوم معاشری کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعہ اردو داں طبقہ میں مقبول بنایا جائے۔ اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہو اسے اردو میں منتقل کیا جائے۔ یہ خالص علمی رسالہ ہے جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانبداری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا مسلک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ عملی اور بعض اوقات مختلف فیہ مسائل پر بھی ہمارے صفحات میں جو بحث ہوگی وہ علمی انداز میں ہوگی۔

مضامین اور تبصرہ کتب کے متعلق معتمد مجلس ادارت محمد عبدالقادر، لکچرار شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے۔

اور

رسالہ کی خریداری، اجرت اشتہارات اور دوسرے انتظامی امور کے متعلق شریک معتمد مجلس ادارت امتیاز حسین خاں لکچرر کامرس، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے مراسلت کی جائے۔

مقامی خریداروں سے قیمت (صہ) روپے حالی سالانہ

بیرونی خریداروں سے قیمت (صہ) روپے کلدار "

فی پرچہ ۱۴؍

اہل ملک کی دیرینہ سرپرستی کا حامل
خوش پوشاک اصحاب کے لئے تحفہ

اہل ملک کی توجہ خاص کا

مرکز

ہر وضع اور ہر قسم کا نفیس سلک

اہل ذوق کی خوشی کا سامان

اورنگ آباد سلک

پتھر گٹی حیدرآباد دکن


آپکے غسل و ٹائیلٹ کیلئے بہترین صابن
صندل سوپ
Sandalwood
نو عمر نوجوانوں کی نازک جلد کے طبعی حسن کو برقرار
رکھنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ جلد کو باقاعدہ طور پر صندل سوپ
سے صاف رکھا جائے۔ اسکی کثیر جھاگ جلد کی گہرائیوں میں نفوذ کر کے
ہر قسم کی آلائشوں کو قطعاً دور کر دیتی ہے۔ یہ صابن بالکل نباتی
روغنیات سے تیار کیا گیا جو نوجوانوں کی جلد کو ملایم اور چمک دار
رکھتا ہے اور اسکا مقوی اثر میل مٹی داخل ہونے سے روکنے
کیلئے مسامات کو کس دیتا ہے۔ ہمارا صندل سوپ نہانے کے بعد
جسم میں اسکی بھینی بھینی خوشبو بہت دیر تک قائم رہتی ہے
یہ خوشبو فرحت بخش بھی ہے اور مرغوب بھی۔
تیار کردہ
دی حیدرآباد سوپ اینڈ آئل ورکس لمیٹڈ
(مشیرآباد)

تحفۂ نمائش

نمائش مصنوعات مملکت آصفیہ کے موقع پر حضرت جلالت
مآب مدظلہم العالی خلد اللہ ملکہ کی رونق افروزی اراکین
مجلس نمائش کی سرفرازی کی موجب رہی۔ عام رعایائے صنعی
کیلئے بھی یہ رونق افروزی احسان عظیم کی مترادف ہی مجلس نمائش
نے ہر سال ورود شاہانہ سے متعلق فوٹو تیار کرلئے ہیں اور ہر سال کے
وقائع تشریفات شاہانہ کو بڑی تفصیل سے قلمبند کیا ہے چنانچہ
اس سال ایک مصور تحفہ نمائش کی طباعت و اشاعت نمائش
مصنوعات مملکت آصفیہ کے افتتاح کے موقع پر عمل میں آئی ہے۔

قیمت .... ۱ روپیہ ۱ آنے

ملنے کا پتہ دفتر مجلس نمائش باغ عام حیدرآباد دکن